بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۵۷واں سال

جلد ۵۷
شمارہ ۱

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

زر سالانہ ۴۰ روپے
معاونین سے ۱۰۰ روپے
تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے
ممالک غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)
قیمت ۴ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاعر"
مکتبہ قصر الادب
بمبئی سنٹرل پوسٹ آفس
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۲۶
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ہریانہ ـــــــ درخشاں مستقبل کی جانب گامزن

آج ہریانہ ۲۳ ویں گن تنتر دوس کے یوم مبارک پر اس قومی تہوار میں ذوق شامل ہو رہا ہے۔ زراعت، آبپاشی، صنعت پینے کے پانی کی سہولیات، صحت، بجلی کی فراہمی جیسے شعبوں میں ہریانہ کی بے مثال حصولیابیاں منصوبہ بند ترقی کی مظہر ہیں سبھی دیہات اور ہریجن بستیوں کو بجلی میسر کروانے کے میدان میں اول ہے۔ اپنے سبھی دیہات کو پکی سڑکوں سے جوڑنے کے معاملے میں بھی اولیت حاصل ہے۔ ترقی کی اس منزل کو حاصل کرنے کی ہماری قابل قدر نیف رفتار دوسروں کے لئے اب رشک کا موضوع بن گئی ہے یہ ترقی شریمتی اندرا گاندھی کی محرک رہنمائی سے ممکن ہوئی ہے جنھوں نے ہریانہ کی ترقی میں ہمیشہ دلچسپی لی۔ سبھی ترقیاتی کاموں کی رہبری ہمارے نوجوان اور پرعزم وزیراعظم شری راجیو گاندھی کی قیادت میں ہم تیزی اور راذی منزل میں حاصل کرنے کیلئے پرعہد ہیں یقیناً ہماری منصوبہ بندی کے نشانہ میں

- ۱۹۶۶ میں صرف ۲۶ لاکھ ٹن اجناس کے مقابلے ۷۰ لاکھ ٹن کی ریکارڈ پیداوار سے اب راجیہ مرکزی ذخیرے میں قابل قدر حصہ ڈال رہا ہے۔
- ۴۲ ہزار چھوٹی صنعتی اکائیاں مختلف قسم کا سامان تیار کرتی ہیں جبکہ ۱۹۶۶ میں ایسی صرف ۴۵۱۹ اکائیاں تھیں۔ گرام ادیوگ یوجنا کے تحت قائم ۲۲۶۷ چھوٹی صنعتیں تقریباً ۶۰ ہزار افراد کو روزگار فراہم کرتی ہیں جن میں سے ۶۰ فی صد سماج کے کمزور طبقوں سے ہیں۔
- صنعتی اشیا کی سالانہ برآمد ۲۰۰ کروڑ روپئے تک بڑھ گئی ہے جبکہ ۱۹۶۶ میں یہ صرف ۴ کروڑ ۵ لاکھ روپئے تھی۔
- آبپاشی صلاحیت ۱۹۶۶ میں ۱۷ لاکھ ۳۶ ہزار ہیکٹیر سے بڑھ کر ۳۶ لاکھ ہیکٹیر ہو گئی ہے۔
- بجلی کی پیداواری صلاحیت اب ۱۴۴۶ میگاواٹ ہے جب کہ ہریانہ کے عالم وجود میں آنے کے وقت یہ صرف ۳۴۳ میگاواٹ تھی۔

- صحت کی سہولیات پر فی کس خرچ ۱۹۶۶ میں صرف ایک روپیہ ۳۳ پیسے سے بڑھ کر ۴۹ روپئے ۹۲ پیسے ہو گیا ہے۔
- ۶۷۹۰ دقت والے دیہات میں سے ۳۲۶۶ دیہات کو پینے کے میٹھے پانی کی سہولت میسر کروائی جا چکی ہے۔ باقیماندہ دیہات کو ساتویں پلان کے آخر تک یہ نعمت میسر کروا دی جائے گی۔

- طلبا کو پرائمری، مڈل، ہائی، ہائر سیکنڈری اور کالج سطح کی تعلیمی سہولیات باسانی دستیاب ہیں۔

- کمزور طبقوں کے ۴۲۰۵۸ افراد کو ایک لاکھ ۳۷ ہزار ایکڑ فالتو اراضی الاٹ کی گئی ہے۔ تین لاکھ بے گھر افراد کو ۱۰۰۰۰۰ مربع گز کے پلاٹ دئے گئے ہیں۔ ۴ لاکھ ۴۵ ہزار خاندانوں کو غریبی سطح پار کرنے میں مدد دی گئی ہے
- ۳۰۲۴ بسوں میں روزانہ ۱۱ لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں اور یہ بسیں ۸ لاکھ ۹۰ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ بھارت کے پلاننگ کمیشن نے ہریانہ روڈ ویز کو ملک میں اولین ٹرانسپورٹ قرار دیا ہے۔

ہمیں ہریانہ کے پرعزم اور محنت کش عوام پر فخر ہے جنہوں نے ہمیشہ ہمارے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں پوری تائید اور تعاون دیا ہے۔ آیئے! آج کے اس مبارک دن پر ہم خیر سگالی اور امن و آشتی کے ماحول میں اپنی طاقت تخلیقی کاموں میں صرف کرنے اور خوشی و خوشحالی کے نئے باب کی شروعات کرنے کا عہد لیں۔

بھجن لعل ـــــ وزیر اعلیٰ ہریانہ

جنوری ۱۹۸۶ء

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

ڈراما

ماضی بعید غزلیں

جرعات

بساط سخن

بازیافت

آثار لفظ

چہرہ چہرہ یادیں

بہ صورت گر

مکاتیب

شمارہ ۴

مشاعرے اور سیمناروں میں فرق نہیں

اردو مشاعروں کی ایک شاندار تاریخی روایت رہی ہے، معیاری اور غیر معیاری مشاعروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اردو اور ہندوستان دونوں ہی کا تہذیبی حصہ اور ورثہ ہے۔ پورے ہندوستان میں سال بھر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ مشاعروں کی اس کثرت نے اس کے معیار کو ختم کر دیا ہے۔ مشاعروں کے ساتھ ساتھ اب اردو سیمینارز بھی مشاعروں کی ڈگر پر چل نکلے ہیں، کبھی جو معیاری سیمینار ز گاہے بگاہے ہو جایا کرتے تھے اب سال بھر ان کا بازار بھی گرم رہنے لگا ہے۔ اس طرح مشاعرے اور سیمینار ز ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود جس طرح میکانیکی اور تجارتی نوعیت کے ہو گئے ہیں اور وہ وبائیں اور بدعتیں جو مشاعروں اور شعرا میں در آئی ہیں رفتہ رفتہ وہی کچھ سیمناروں میں بھی ہو رہا ہے۔ فرق صرف سامعین کا ہے۔ مشاعروں کو زیادہ سے زیادہ سامعین میسر ہیں اور سیمنارز کو کم سے کم اور ان دونوں انتہاؤں کو معیار تصور کیا گیا ہے۔ مشاعرے اور سیمنارز میں جو مماثلتیں پیدا ہو گئی ہیں وہ بے حد دلچسپ ہیں ایک سرسری سا تقابلی مطالعہ ملاحظہ کیجئے۔

- مشاعرے کے منتظمین اردو کی خدمت کے دعویدار سیمنارز اپنے آپ میں اردو زبان و ادب کی خدمت کا اظہار۔
- مشاعروں میں نظامت اس کی کامیابی اور ناکامی کی ذمہ دار۔ سیمنارز میں بھی ناظم ایک اہم کردار کی حیثیت کا حامل۔
- مشاعروں میں شعرا اسٹیج سے لاتعلق رہتے ہیں۔ سیمنارز میں مقالہ نگار اپنے علاوہ باقی سب سے لاتعلق رہتے ہیں۔
- مشاعروں میں بیاض کو ہاتھ میں رکھ کر کلام سنانے والے اپنی اور مشاعرے کی ناکامی کا سبب بنتے ہیں۔ سیمنارز میں تحریری مقالہ پڑھنے والے بوریت کا سبب بنتے ہیں۔
- مشاعروں میں گلا پھاڑنے اور گا کر کلام سنانے والے شعرا بے حد مقبول ہوتے ہیں کسی اچھے مقرر کی خصوصیات والے مقالہ نگار اپنے موضوع کو تقریر بنا کر پیش کرتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں۔
- مشاعروں میں زیادہ تر شعرا ایک ہی کلام کو بار بار پڑھنے کو عیب نہیں جانتے۔ سیمناروں میں ڈمی مقالوں کا رواج بڑھ رہا ہے۔
- مشاعروں میں وہ شعرا زیادہ مقبول ہیں جو گھر سے براہ راست اسٹیج پر آ جاتے ہیں۔ درمیان میں ایک خلا ہے مگر یہ لوگ اسٹیج کے اچھے کرتب باز ہوتے ہیں۔
- معتبر شعرا تو ایک دو ہی مدعو کئے جاتے ہیں۔ سیمنارز میں وہ مقالہ نگار شریک ہوتے ہیں جن میں سے اکثر اپنی زبان میں تخلیق ہونے والے ادب اور رسائل سے ناواقف ہوتے ہیں۔
- مشاعروں کے شعرا میں سے چند ایک ادبی رسائل کو خریدنے اور مطالعہ کرنے کو نمائشی مجبوری جانتے ہیں۔ سیمناروں میں شریک ہونے والے مقالہ نگاروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ادبی رسائل کا ان سے تعارف کروایا جائے تو وہ بھی گہری دلچسپی کے ساتھ کسی ادبی رسالے کا خریدار بن جاتے ہیں مگر مطالعے کی فرصت دونوں کے پاس نہیں۔
- جس طرح مشاعروں میں پڑھے جانے والے کلام کے گلدستے شائع ہوتے ہیں اسی طرح سیمناروں میں پڑھے جانے والے مقالوں پر مشتمل کتابیں بھی گاہے بہ گاہے شائع ہوتی رہتی ہیں مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ شعرا کے پاس کلام بار بار کا شائع شدہ اور مقالہ نگار حضرات سیمنار کے بعد بھی مقالہ نہیں ارسال کر پاتے۔
- جس طرح مشاعروں میں معتبر شعرا کی شمولیت ایک مسئلہ بنی رہتی ہے اسی طرح سیمناروں میں بھی بہت اہم اور معتبر ادبا کی شمولیت مسئلہ بنتی ہے۔
- مشاعروں کو ذریعۂ معاش بنانے والے شعرا منتظمینِ مشاعرہ سے برابر رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ سیمناروں میں دلچسپی رکھنے والے مقالہ نگار بھی ایسی ہی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔
- مشاعروں کے مقبول شعرا کسی بھی بڑے مشاعرے کی فہرست پر ہر طرح سے غالب رہتے ہیں۔ سیمناروں میں بھی یہی ہوتا ہے۔ کہاں کیا ممکن ہے؟ فہرست کیا بنی ہے؟ کون سا گروپ حاوی ہے؟ کسے مدعو کرنا ہے اور کسے فہرست سے خارج کر دینا ہے۔
- مشاعروں کے انعقاد کے لئے چھوٹی بڑی تجوریوں کو اعزازی جالوں میں کسا جاتا ہے سیمناروں کے لئے یونیورسٹیوں کا "شعبہ"، یو جی سی، اردو اکاڈمیاں اور بعض بڑے ادارے کفالت کرتے ہیں۔

اب اردو سیمنار مشاعروں کی ڈگر پر تیزی کے ساتھ دوڑ رہے ہیں۔ پہلے نثر نگاروں کو شعرا پر رشک آتا تھا۔ اب شعرا کو نثر نگاروں پر رشک آنے لگا ہے۔ اردو زبان جس طرح بکھراؤ کی زد پر ہے اسی طرح اردو مشاعرے اور سیمنارز بھی بکھراؤ کی زد پر ہیں۔ میکانیکی طریقۂ کار کے زیر اثر معیار اور خدمت دونوں ہی اپنی روح کھو چکے ہیں۔

[signature]

بازیافت

احسن القواعد فارسی تالیف مولوی نجف علی خاں، اصلاح و ترمیم اور تقریظ مولوی محمد احسن مدرس اول عربی و فارسی بریلی کالج مطبوعہ ۱۸۹۶ء مطبع مجتبائی دہلی صفحات ۲۰۸، سائز ۲۰×۲۰/۱۶۔ فارسی قواعد کی یہ کتاب اس وقت کے یونیورسٹی طلبہ کے لئے بطور خاص ترتیب دی گئی تھی۔ کتاب میں سوال و جواب کے ذریعہ دس ابواب کے عنوانات میں صرف، نحو، مخففات و مصدرات، اوزان مصادر، ضرب الامثال، تشبیہات و مناسبات، محاورات و اصطلاحات اقسام نظم و نثر اور عیوب شعر، صنائع بدائع اور عروض کے ساتھ ذیلی سرخیاں صفحے کے حاشیہ پہ دی گئی ہیں۔

بلراج کومل — کرامت علی کرامت — تخت سنگھ

مظفر حنفی — شہریار — رام ناتھ اسیر

زبیر رضوی — رضوان احمد — شفق

چہرہ چہرہ یاد ہیں

جشن سی سالہ شاعر منعقدہ بمبئی ۱۹۹۰ء کی ایک یادگار تصویر جس میں سلام مچھلی شہری مرحوم سرمستی کے عالم میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اسی تصویر میں دائیں سے بائیں سکندر علی وجد مرحوم، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، حکیم مرزا حیدر بیگ مرحوم، شمیم کرہانی مرحوم، عتیق احمد عتیق، حامد الانصاری غازی، سراج الدین ظفر مرحوم اور شاہد صدیقی مرحوم کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۳ء کی اس تصویر میں دائیں سے بائیں کوثر چاندپوری، عشرت قادری، اعجاز صدیقی مرحوم، عزیز گوالیاری اور شفا گوالیاری مرحوم

بلراج کومل

لہو کی سلطنت

سفر سے قبل
اس کی آنکھ میں
پُرسکار جنگل تیرتے تھے
وہ شکاری، منحنی سا جانور
آواگون کے سلسلوں میں
رنگ و نسل و قوم کی
طغیانیوں میں
اک لیطسے کی طرح
پرّاں رہا تھا
دستِ نشتر سے
وہ بندر کی سعادت سے گذر کر
دیدۂ جاسوس بن کر جی رہا تھا

میں اسے کل پھر ملا تھا
ساحلی قصبے کے
چورا ہے پہ وہ طرار اور سرشار
خنجر بیچتا ہے

تالیوں، مہتابیوں کی شام کو
سارے سگانِ شہر
اس کو
سجدۂ تعظیم کرتے ہیں
اسے چشم و دل و جاں سے
ہم تسلیم کرتے ہیں
لہو کی سلطنت
پھیلی ہوئی ہے
اب سوادِ شہر سے آفاق تک شاید
وہ کابوسی
امیرِ شہر بن کر جی رہا ہے
سلطنت میں
خون ارزاں ہے
وہ روز و شب مسلسل پی رہا ہے۔

ریوڑ

ہمارے قصبے میں
قید و بندِ حیات سے
دُور جانے والوں کا
ہر تناسب ہے منصفانہ
وہ فرقہ وہ قوم
جنس و درجہ و حیثیت
ظلم اور تشدد کے جانے پہچانے
سب تقاضوں پر پورے اترے
جو مردِ جبرِ حیات سے ماورا گیا
اس کی ہم سفر
اس کے نقشِ پا کی
دریدہ عصمت کی آندھیوں میں
بکھر گئی تھی
چراغِ خانہ بس ایک انبوہِ استخواں نما
ہوا تھا تقسیم
صاحبانِ ضیا میں
ہفتے کی شام کو

آج پیر کے روز
خاک و خون سے

میں قریہ و شہر لکھ رہا ہوں
شبِ مضافات لکھ رہا ہوں
عجیب برباد رات ہے۔
صرف ایک روشن حسین ستارے کی آرزو میں
لہو لہو بانجھ ہو چکی ہے۔
سیاہ کاروں کا
ایک ریوڑ ہے دور تک
ایک بنتِ معصوم
رہ گذاروں پہ
اپنی بادل، سپید، نوریں
سپید، نوریں سی ماں
کو پہروں تلاش کرتی تھی
موجِ موہوم تھی
وہ شاید
جلے ہوئے شہر کی پناہوں میں
کھو گئی ہے۔

ای — ۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی

اُردو تحقیق — موضوع و مسائل

ڈاکٹر تنویر احمد علوی ● ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

دس بارہ سال ہو گئے جب ڈاکٹر محمد حسن نے اساتذہ اردو جامعات ہند کی ایک کانفرنس کے تحقیقی سیشن میں اہل اردو کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اردو تحقیق کو اپنے مقاصد اور نشانات کا تعین کرنا چاہئے اور اس کے لئے مختلف یونیورسٹیوں کو جہاں ڈاکٹریٹ کے لئے اردو شعبوں سے وابستگی کے ساتھ تحقیقی کام ہو رہا ہے ان مقاصد کے تعین کی کوشش اور اس کی روشنی میں اپنے دائرہ کار کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہئے تاکہ غیر ضروری عنوانات پر تحقیقی کام اور غیر علمی انداز کے تحقیقی مقالوں کی بر آورد کو رد کیا جا سکے جو اکثر و بیشتر غیر معیاری بھی ہوتے ہیں۔

وقت آگے بڑھ گیا لیکن اس مشورہ اور اس پر سنجیدہ غور و فکر کی اہمیت و ضرورت ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور بڑھ گئی۔ موجودہ دور میں تحقیق کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اسے شدہ شدہ غیر علمی اور غیر ادبی مفادات کے حصول کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا اس کی ایک وجہ تو ادبی سیاست اور شعبہ جاتی مسائل کا دباؤ ہو سکتا ہے لیکن اس سے گذر کر بھی کچھ باتیں ہیں جن کا تعلق خود ہمارے اساتذہ کی غیر ذمہ دارانہ روش، سہل نگاری اور ناکردہ کاری سے ہے۔ نیز جو مقالے تیار ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں جو تھیسیس THESIS لکھے جاتے ہیں اور جو سیکڑوں کی تعداد میں امتحان کی منزل سے گزر کر اب یونی ورسٹی لائبریریوں میں پڑے ہوئے ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں مختلف موضوعات پر کیا کام ہو چکا ہے اور وہ کس معیار کا ہے اور اب اس موضوع یا PROJECT پر کام کی کیا اور کتنی گنجائش ہے اور بات کہاں تک آگے جا چکی ہے اور کون کون سے حقائق اور تنقیدی تعبیرات سامنے آ چکی ہیں جس کی وجہ سے ایک ہی موضوع پر بغیر اس کی حدود کا تعین کئے ہوئے کام ہوتا رہتا ہے اور دہرانے کا عمل جاری ہے جبکہ اردو میں تحقیق کی روایت کوئی ایسی نئی اور اجنبی روایت بھی نہیں کہ ہم پہلے پہل اس سے واقف ہو رہے ہوں اور ہماری یہ واقفیت بالکل ادھوری ہو۔

فورٹ ولیم کالج کے تصنیفی کاموں میں اردو زبان میں تحقیقی روایت کا کھوج لگایا جا سکتا ہے سرسید کی معروف تصنیف آثار الصنادید کو بھی ہم اردو تحقیق کا ایک نشان منزل قرار دے سکتے ہیں اردو کے مناظراتی ادب میں تو تحقیق اور تحقیقی رویہ کے بہت سے پہلو اور مسائل سامنے آتے ہیں، تحقیقی سطح پر متنی تنقید TEXTUAL CRITICISH کی تو بنیاد ہی اردو میں مناظراتی ادب کے زیر اثر نمو پذیر ہوئی۔

تحقیق تو اپنی جگہ پر حقائق کی جستجو اور حقیقت رسی کی سنجیدہ علمی کوشش ہے جس کے دو بنیادی طریقے یا اساسی ضابطے ہیں استخراجی طریق کار اور استقرائی طریق تجزیہ دونوں میں نتائج اخذ کئے جاتے ہیں حقایق کا تعین ہوتا ہے اور جس حد تک کسی علمی کاوش کے ثمرات کے طور پر ممکن ہوتا ہے کسی قطعی یا قابل قبول نتیجہ تک پہنچنے کی سعی کی جاتی ہے اور اس کے ثبوت اور شہادت کے مستند علمی حوالے پیش کئے جاتے ہیں، ہر تحریر یا ثبوت قابل اعتبار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ علمی یا منطقی طور پر لائق اعتنا اور قابل قبول نہ ہو۔

اس آسمان کے نیچے کوئی بھی عالم الکل نہیں ہوتا اس لئے تحقیقی طریق کار اور سنجیدہ علمی مطالعہ کے نتیجہ میں جن حقایق تک رسائی ممکن ہو جائے ان کو بغیر کسی رنگ آمیزی کے بے کم و کاست پیش کر دینا ہی بڑی بات ہوتی ہے۔

ہم جانتے ہیں سرسید نے وہ کارنامے بھی انجام دئے جو استخراجی تحقیق کے ذیل میں آتے ہیں اور جن کے وسیلے سے حقایق کے حتمی تعین کی سطح ہموار ہوتی ہے یا اس تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، انھوں نے اخذ نتائج کے سلسلہ میں استقرائی طریق فکر کی بعض بہت عمدہ مثالیں پیش کی ہیں ان کے نامور رفقا کے یہاں بھی تحقیقی طریق رسائی سے استفادہ اور علمی تنقید کے ذریعہ فیصلہ کن نتائج تک پہنچنے کا رجحان بہت واضح ہے بالخصوص حالی اور شبلی

کے یہاں اگرچہ گاہ گاہ یہ تنقیدی تسامحات کا شکار بھی ہوئے ہیں جس سے اہل تحقیق اور ارباب تنقید میں کوئی مشکل ہی سے بچ سکتا ہے نشان راہ دکھلانے والے ان محقق اور ناقدین نے ادب و شعر پر تاریخ و تہذیب کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جس سے اردو تحقیق و تنقید کی تاریخ میں تہذیبی مطالعہ اور تجزیاتی تنقید کی بنیاد پڑی ہے۔

شبلی اسکول کے علمائے زبان و ادب نے اردو زبان و ادب کو تاریخ و سوانح کے موضوعات پر بہت کچھ دیا بالخصوص سید سلیمان ندوی نے ان بزرگوں کی تحریروں میں جن کے سلسلۃ الذہب میں ابوالکلام آزاد کا نام کسی سے دوسرے درجہ پر نظر نہیں آتا بیشتر عربی زبان اور اس سے متعلق موضوعات کو لے کر کام کیا اور طریق تحقیق و رسائی سے اردو ادبیات کے RICHNESS میں گراں قدر اضافوں کا باعث ہوئے لیکن خالص تحقیقی مزاج اور معیار پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے علمی مقالات اور تحقیقی تصانیف میں سامنے آیا اسی سے ان کو اردو میں تحقیق کا "معلم اول" کہا گیا ہے ان کے علمی سطح پر بلند قامت معاصرین میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر عندلیب شادانی اور ان کے ساتھ آنے والوں میں قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام تحقیق کے بڑے ناموں میں سے ہے۔

ان اکابرین علم و تحقیق کے بڑے کارناموں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے تحقیقی کاموں کی انجام دہی کے لئے اصول و ضوابط کے تعین کی طرف بھی دھیان دیا جن سے ان کے بعد آنے والوں نے بڑے نتائج اخذ کئے اور جن کی علمی نمائندگی اب ڈاکٹر نذیر احمد اور ان کے شریک عمر محققین اردو کرتے ہیں جن سے ہمارے علمی حلقے بخوبی واقف ہیں۔

اردو زبان میں، ایک صدی کیا تقریباً دو صدیوں پر پھیلی ہوئی علمی و تحقیقی روایت نے ہماری بہت سی دشواریوں کو دور بھی کیا ہے اور اسی کے ساتھ نئے مقاصد اور ان سے وابستہ مشکلات و مسائل کا احساس بھی دلایا ہے جس کی روشنی میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اردو کے اہل علم اور تصنیفی ادارے اور مختلف یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر قائم اردو شعبہ جات اپنے لئے علمی تحقیق اور تحقیقی تنقید کے دائروں کے تعین کی کوشش کریں اس طرح انفرادی طور پر اپنی اپنی پسند کے کام ہونگے اور ہوتے رہیں گے لیکن منصوبہ بند کاموں کو اگر منضبط طریقے پر آگے نہیں بڑھایا جائے گا تو اردو میں علمی تحقیق سے وابستہ بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے اور خاص طور پر دہرانے یا دہرائے جانے کے عمل کو نہیں روکا جاسکتا ہے۔

تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں چار بڑے دائرے ہیں جو تحقیق کے مقاصد کا بھی تعین کرتے ہیں اور اس دائرہ کار کا بھی جو مختلف یونیورسٹیاں اور ان سے متعلق اردو شعبے اپنے لئے خصوصاً طے کرسکتے ہیں ضروری نہیں کہ ہر دائرہ پتھر کی لکیر بن کر رہ جائے اگر انداز کارکردگی اور رسائی و نارسائی کا جائزہ لیا جاتا رہے تو مناسب ترمیم و اضافے کے ساتھ کام کے مختلف سلسلوں کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

ایک بڑا دائرہ اردو لغت کی تاریخ، اس کی تحقیقی تنقید اور لسانیاتی تجزیہ سے متعلق ہے جس کے ساتھ املائی، صوتیاتی اور علاقائی مسائل بھی وابستہ ہیں۔ لغت کسی بھی زبان کے مروّج و متروک الفاظ اور توصیفی لفظیات کا ایک بہت بڑا منضبط اور محفوظ خزانہ ہوتا ہے جس کی طرف ادب کے تفہیمی مطالعہ کے دوران بھی رجوع کیا جاسکتا ہے اور زبان و ادب کے ارتقائی عمل اور تاریخی و تہذیبی موثرات کو سمجھنے کے لئے اس سے رجوع ممکن ہے اور اس سے چارہ نہیں۔

مختلف وقتوں میں جو لغات مرتب کئے گئے ان میں علاقائی یا ادارتی سطح پر کیا ضوابط پیش نظر رہے، اپنی املائی شکل، ضبط تلفظ اور اپنے مختلف معنوں کے لحاظ کسی لغت میں شامل الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں آیا وہ اپنے عہد کی لفظی اور تلفظاتی روایتوں کی نقل میں یا تقابلی طور پر بعض امتیازات و اضافات کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اردو زبان میں املائی شکلیں بدلتی اور ان میں جزئیاتی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں جن کے گوناگوں نمونے اردو مخطوطات اور قدیم مطبوعات میں ملتے ہیں جو کہ صرف املائی مسائل سے متعلق ہیں یا پھر ان کا تعلق صوتیات اور علاقائی تلفظ سے بھی ہے نیز جن زبانوں کے حلقہ میں یہ مستعمل رہے یا ہیں یا جن اہل علم کو ان الفاظ کو مرتب یا مدون کرنے کا موقع ملا خود ان کا علمی یا لسانی حلقہ کیا تھا اس ضمن میں یہ پہلو بھی نظر انداز کئے جانے کے لائق نہیں اس سے

اختلاف روایت کی نوعیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اردو املا کے سلسلہ میں تو اردو میں اچھا خاصہ کام ہوا ہے اور کافی دلوں پہلے اس کی بنیاد پڑ چکی ہے لیکن اردو املا کی ارتقائی تاریخ اور علاقائی، امتیازات پر ابھی کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔

املائی تغیرات، ان کے بدلتے ہوئے صوتی نظام اور اختلاف معنی در روایت کے اسباب و وجوہ پر کام ہونا ابھی باقی ہے جس کی روشنی میں نئے نتائج کا اخذ و استنباط بھی ممکن ہوگا اس کی مدد سے ہم اپنی زبان اس کے بدلتے ہوئے معاشرتی اور علاقائی رشتوں اور اس کی تاریخ ارتقا پر ان کے اثرات کو بھی سمجھ سکیں گے۔

لفظ صرف ایک لغوی یا لسانیاتی حقیقت ہی نہیں ہوتا، ایک تہذیبی روایت علمی اصطلاح اور ایک ادبی مرقع بھی ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اس کے الگ الگ معنیاتی دائرے اور معنوی پرتو SHADES ہوتے ہیں اس لحاظ سے الفاظ کی لغات میں شمولیت اور موجودگی اپنے الگ الگ حلقے اور دائرے بھی قائم کرتی ہے ہمارے یہاں بعض ایسے لغات بھی مرتب ہوئے لیکن اب ان کی طرف کما حقہ توجہ دہی کم بلکہ نسبتاً بہت کم ہے قدیم لغات کی تدوین کا مسئلہ الگ ہے، ملایالم، دکنی، گجراتی اور اب مہاراشٹری اردو کے الفاظ پر مشتمل چھوٹی بڑی کچھ لغتیں سامنے بھی آتی ہیں لیکن اس سلسلہ کا بہت سا تنقیدی اور تجزیاتی کام باقی ہے۔

اردو کا لسانیاتی لغت ہنوز مرتب نہیں کیا گیا نئے مروج الفاظ اور مصطلحات کی جمع آوری کا کام باقی ہے ادبی اصطلاحات، معاشرتی روایتوں تحقیقی و تنقیدی اصطلاحوں سے ہم کام لے رہے ہیں مگر ان کی دائرہ بندی لغت سازی اور معنی نگاری کے کام کو بھولے ہوتے ہیں محاورات اور کہاوتوں کے قاموس بھی جو نئے علمی اور تحقیقی ضابطوں کے ساتھ مرتب ہوں تحقیقی توجہ کے تقاضہ سنج ہیں اور ایک ساتھ کئی زبانوں میں مرتب ہونے والے لغات بھی۔

لغت کے مختلف دائرہ ہائے کے ماسوا تحقیق کا ایک اور بڑا دائرہ اردو زبان کی قواعد ہے۔ اردو زبان کی قواعد مرتب کرنے کی طرف پہلی بار مستشرقین نے توجہ دی، اور اس میں قواعد نویسی کے جدید ضابطے بھی ان کے پیش نظر رہے لیکن اردو جیسی ترقی پذیر اور علاقائی اثرات کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے والی زبان کی قواعد مرتب کرنا آسان کام نہ تھا مگر یہ بات ان کے ذہن میں رہی کہ اردو زبان کی قواعد اپنی ساخت اور شناخت کے اعتبار سے عربی اور فارسی ہی سے نہیں سنسکرت اور قدیم پراکرتوں سے بہت کچھ مختلف ہے اس کا اساسی ڈھانچہ BASIC STRUCTURE پراکرتوں سے ماخوذ ہے اور ان پراکرتوں کا اثر و نفوذ اس کے ہر دور کے لسانی ساختوں اور قواعدی تشکیل میں دیکھا جاسکتا ہے میر انشاء اللہ خاں نے اب سے تقریباً دو صدی پیشتر اس کی طرف واضح اشارے کر دیے تھے اور بنیادی خطوط متعین ہو گئے تھے جن پر اردو قواعد نویسی کے کام آگے بڑھنا چاہئے تھے ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے بعد کوئی کام نہ ہوا ہو لیکن نئے لسانیاتی مطالعوں اور ساختیاتی STRUCTURAL سطح جتنی اور جیسی ہونی چاہئے تھی وہ ابھی زمانہ محققین کے ذہنوں کا انتظار کر رہی ہے تو علمی اصطلاحوں اور ان سے متعلق موضوعی دائروں کا تعین ہونا باقی ہے۔

صرفی اجزا کے ساتھ نحوی ساخت اور اس کی ترکیبی ہیئتوں کا مسئلہ بھی ہے نیز مرتب الفاظ مرکب افعال کا بھی جن کے بارے میں بہت کام باقی ہے یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندی، دکنی اور گجراتی پر نظر داری کے بغیر اس کام کی انجام دہی مشکل ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں برج قاعدے سے جمع نہیں بنائی جاتی جب کہ اس کی متعدد مثالیں ہیں جو قدیم اور متوسط دور کی اردو شاعری میں مل جاتی ہیں" مجھ" کی ضمیر کھڑی بولی کے ایک علاقہ میں ضمیر فاعل کے طور پر استعمال ہوتی ہے" نے" صرف علامت فاعل ہے لیکن کھڑی کے علاقہ میں علامت مفعول بھی ہے یہ مثالیں صرف تاریخی اور تقابلی روایتوں پر توجہ دہانی کے لئے پیش کی گئی ہیں مقصد یہ ہے کہ تحقیق کے ذریعہ جن کاموں کو آگے بڑھنا چاہئے ان میں قواعد سے متعلق موضوعات بے حد اہم ہیں جو کام اب تک ہو چکا ہے اس کی عیارگیری کے ساتھ ہی آگے قدم بڑھایا جاسکتا ہے۔

تیسرا بڑا دائرہ اردو کی ادبی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے ذیل میں بہت سا کام آتا ہے علاقائی ادب، سوانح عمریاں، خطوط،

سفر نامے، تذکرے، نثری و شعری اصناف کا تاریخی و تنقیدی جائزہ تاریخ ادب کی تکمیل کے لئے اجزائے ترکیبی کی جمع آوری اور ترکیب دہی کا حکم رکھتا ہے۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ کبھی تذکروں کی صورت میں مرتب کی جاتی تھی گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی کے ترجمہ نے اردو ادب کی تاریخ کو ایک نیا رُخ دیا، بعد ازاں رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" ایک نئی ترتیب کے ساتھ سامنے آئی علی گڑھ تاریخ ادب اردو کا منصوبہ اپنی مکمل صورت میں بروئے کار نہ آسکا یوں بھی وہ مختلف اہل علم کے مقالات کا مجموعہ تھا جسے تاریخ کی صورت میں مرتب کیا گیا تھا، جمیل جالبی ہماری ستائش خاص کے مستحق ہیں کہ انھوں نے زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کا ڈول ڈالا جس کی دو جلدیں چھپ کر سامنے آچکی ہیں، ڈاکٹر محمد صادق نے بھی جواب مرحوم ہو چکے ہیں انگریزی میں نسبتاً اختصار کے ساتھ اردو ادب کی تاریخ مرتب کی تھی لیکن سچ پوچھئے تو ان تاریخوں کے سامنے آنے کے بعد کام مکمل نہیں ہوتا آگے بڑھتا ہے۔

ابھی تک چونکہ اردو کے علاقائی ادب اور اس کی مختلف اصناف پر کافی و شافی کام نہیں ہوا اس لئے ہماری ادبی تاریخ بھی ان حدوں کو نہیں چھو سکتی جن تک ہماری اردو شاعری پھیلی ہوئی ہے اردو میں عوامی ادب اور اس کی مقبول اصناف کی جمع آوری و ترتیب دہی کا کام تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی شروع بھی نہیں ہوا اور جتنا کچھ سامنے آیا وہ حد بھرنا کافی ہے شمالی ہند میں خسرو سے لیکر ولی تک اردو شاعری کا سلسلہ کیوں بند رہا اور واقعتاً بند رہا بھی یا نہیں اس پر تحقیقی کام ابھی نہیں کیا گیا بھکتی تحریک کا شمالی اور وسطی ہند میں اردو ادب کی تاریخ سے کیا رشتہ ہے اور اس کے زیر اثر جو شعری یا ادبیاتی ذخیرہ فراہم ہوا ہے اس میں اس ہندوی یا ہندوستانی کا کتنا اور کیا حصّہ ہے جسے ہم آج اردو کہتے ہیں اس پر ہم نے کوئی بھی تو قابل ذکر کام نہیں کیا۔

دکن، گجرات، بہار، مشرقی یوپی، پنجاب، سندھ، راجستھان اور ہریانہ میں اردو کے لسانی اور ادبی ارتقا کی تاریخ خود یہاں کی بولیوں کی تاریخ سے بھی وابستہ ہے مختلف سطحوں پر اور متنوع حیثیتوں سے ان زبانوں کے کلاسیکی اور عوامی ادب میں اردو زبان اور اس کے تہذیبی اور ادبی رجحانات کس حد تک دخیل ہیں اس کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ بھی اردو زبان و ادب کی توسیعی تاریخ کا حصّہ ہے۔

دوسری ہندوستانی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کے تہذیبی رشتوں اور علاقائی ادب سے اس کے زمینی اور ذہنی رابطوں کا مسئلہ بہت اہم ہے اردو زبان کے محققوں اور تحقیقی نقادوں کی طرف سے اس کے (صحیح معنی میں تحقیقی) تجزیے کی روشنی ہی میں انہیں سمجھا جا سکتا ہے اور ان کی توجیہہ ممکن ہو سکتی ہے۔

اردو قصوں کہانیوں، داستانوں اور اس میں مروّج اصناف سخن کا تہذیبی مطالعہ ہماری جتنی بڑی ضرورت ہے اتنا ہی اس کی طرف سے ہم ذہنی غفلت اور عملی بے توجہی کا شکار ہیں۔ عہد بہ عہد اور علاقہ بہ علاقہ اردو غزل اردو قصیدہ، اردو مثنوی اور اردو مرثیہ کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ بڑے دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے اب تک اردو میں یہ کام نہ ہونے کے برابر ہوا ہے۔

اردو شعر و ادب کے غیر ادبی ماخذ بھی زیادہ تر ہماری توجہ سے محروم رہے تاریخی اور طبی کتابوں نیز سفر ناموں اور سوانحی تصانیف میں اردو کی ادبی کاوشوں کا کتنا بڑا حصہ موجود ہے اور اس کے ذریعہ کن حقائق کی بازیافت اور کن جہتوں کی تلاش ممکن ہے اس کی طرف ہماری توجہ کچھ یونہی سی مبذول ہوئی اور وہ بھی گاہ گاہ۔

مخطوطات اور قدیم و نادر مطبوعات کی تحقیق تصحیح و ترتیب اور فرہنگ کتنا بڑا کام اور کتنا اہم مسئلہ ہے جس کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ ہم تحقیقی سطح پر کوئی حکم لگا سکیں۔

ہمارے تذکرے ہوں یا دواوین یا اہم قصّے اور مجموعہ ہائے کلام ان سے استفادہ تو خیر ممکن ہے لیکن علمی استناد تحقیقی تصحیح کے ساتھ مرتب کئے ہوئے متون ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

صدہا قلمی بیاضیں بھی بغیر تحقیقی اور تقابلی مطالعہ کے پڑی ہیں ان کی تعداد بھی بڑی ہے اور ان میں موجود مواد بھی [کثیر الجہت] ہے اور یہ بھی تحقیق کا ایک بڑا دائرہ ہے۔

اردو میں علمی اصطلاحات کا ادبی و تنقیدی مطالعہ اپنے کچھ الگ تقاضے رکھتا ہے اچھے خاصے بڑے پیمانہ پر ان کی فرہنگ سازی فوری [illegible]

بشیر بدر

کچھ تو پاس بچا کر رکھو سب کچھ کاروبار نہ جانو
دل کے دروازے مت کھولو اس گھر کو بازار نہ جانو

مانا رستہ بہت کٹھن ہے پھر بھی سایہ دار شجر ہیں
ٹہنی کو تلوار نہ سمجھو، آنچل کو دیوار نہ جانو

سب کچھ اس کو دے آیا ہوں سب کچھ اس سے لے آیا ہوں
میری جیت کو جیت نہ سمجھو میری ہار کو ہار نہ جانو

دن بھر دھوپ میں چلتے چلتے ہم دونوں کی شام ہوئی ہے
تھک کر بانہوں میں سو جانے کو تم جسمانی پیار نہ جانو

تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر غزل ہے
لفظوں کی میناکاری کو الہامی اشعار نہ جانو

○

سلگتی دھوپ گھنی چاندنی سی ہوتی ہے
تمہارے ساتھ یہ دنیا نئی سی ہوتی ہے

خوشی کے نام پہ افسردگی سی ہوتی ہے
کبھی کبھی تو بڑی بے دلی سی ہوتی ہے

گلے میں اس کے خدا کی عجیب برکت ہے
وہ بولتا ہے تو اک روشنی سی ہوتی ہے

وہ گنگناتا ہے بیلے کے پھول کھلتے ہیں
تمام گھر میں کبھی چاندنی سی ہوتی ہے

کرن نکلنے سے پہلے گلاب دیکھے ہیں
تمہاری یاد میں وہ تازگی سی ہوتی ہے

میں بولتا ہوں تو الزام ہے بغاوت کا
میں چپ رہوں تو بڑی بے بسی سی ہوتی ہے

وہ مسکراتی ہوئی دھوپ جیسی آنکھوں میں
گھنیری پلکوں کے پیچھے نمی سی ہوتی ہے

مری غزل کسی پردہ نشیں کا قصہ ہے
اگر سناؤں تو بے پردگی سی ہوتی ہے

○

ہر بات میں مہکے ہوئے جذبات کی خوشبو
یاد آئی بہت پہلی ملاقات کی خوشبو

چھپ چھپ کے نئی صبح کا منہ چوم رہی ہے
ان ریشمی زلفوں میں بسی رات کی خوشبو

موسم بھی حسینوں کی ادا سیکھ گئے ہیں
بادل میں چھپائے ہوئے برسات کی خوشبو

دل درد میں ڈوبا ہوا پھولوں کا بدن ہے
سانسوں میں رچی ہے تری سوغات کی خوشبو

گھر کتنے ہی چھوٹے ہوں گھنے پیڑ ملیں گے
شہروں سے الگ ہوتی ہے قصبات کی خوشبو

○

اب کسے چاہیں کسے ڈھونڈا کریں
وہ بھی آخر مل گیا اب کیا کریں

ہلکی ہلکی بارشیں ہوتی رہیں
ہم بھی پھولوں کی طرح بھیگا کریں

آنکھ موندے اس گلابی دھوپ میں
دیر تک بیٹھے اسے سوچا کریں

دل، محبت، دین، دنیا، شاعری
ہر دریچے سے تجھے دیکھا کریں

گھر نیا، برتن نئے، کپڑے نئے
ان پرانے کاغذوں کا کیا کریں

○

راہوں میں کون آیا گیا کچھ پتہ نہیں
اس کو تلاش کرتے رہے جو ملا نہیں

بے آس کھڑکیاں ہیں ستارے اُداس ہیں
آنکھوں میں آج نیند کا کوسوں پتہ نہیں

میں چپ رہا تو اور غلط فہمیاں بڑھیں
وہ بھی سُنا ہے اس نے جو میں نے کہا نہیں

دل میں اسی طرح سے ہے بچپن کی ایک یاد
شاید ابھی کلی کو ہوا نے چھوا نہیں

چہرے پہ آنسوؤں نے لکھی ہیں کہانیاں
آئینہ دیکھنے کا مجھے حوصلہ نہیں

○

ان کو آئینہ بنایا، دھوپ کا چہرہ مجھے
راستہ پھولوں کا سب کو، آگ کا دریا مجھے

چاند، چہرہ، زلف۔ دریا، بات، خوشبو، دل، چمن
اک تمہیں دے کر خدا نے دے دیا کیا کیا مجھے

جس طرح واپس کوئی لے جائے اپنی چٹھیاں
جانے والا آج کتنا کر گیا تنہا مجھے

تم نے دیکھا ہے کسی میرا کو مندر میں کبھی
ایک دن اس نے خدا سے اس طرح مانگا مجھے

میری مٹھی میں سلگتی ریت رکھ کر چل دیا
کتنی آوازیں دیا کرتا تھا یہ دریا مجھے

○

دکھلا کے یہی منظر بادل چلا جاتا ہے
پانی سے مکانوں پہ کیسے لکھا جاتا ہے

اس موڑ پہ ہم دونوں کچھ دیر بہت روئے
جس موڑ سے دنیا کو اک راستہ جاتا ہے

دونوں سے چلو پوچھیں، اس کو کہیں دیکھا ہے
اک قافلہ آتا ہے، اک قافلہ جاتا ہے

میں جاگتا رہتا ہوں ان چاندنی راتوں میں
آواز مجھے دے کر کوئی چلا جاتا ہے

اک شمع جلاتے ہو اک شمع بجھاتے ہو
یہ چاند اُبھرتا ہے دل ڈوبتا جاتا ہے

دنیا میں کہیں ان کی تعلیم نہیں ہوتی
دو چار کتابوں کو گھر میں پڑھا جاتا ہے

○

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے، خوبصورت لوگ ہوتے ہیں

یہی انداز ہے میرا سمندر فتح کرنے کا
مری کاغذ کی کشتی میں کئی جگنو بھی ہوتے ہیں

فرشتوں کی ہزاروں مہرباں آنکھیں چمکتی ہیں
جہاں بھی رات آتی ہے ستارے ساتھ ہوتے ہیں

پرانے موسموں کے نام نامی مٹتے جاتے ہیں
کہیں پانی، کہیں شبنم، کہیں آنسو سے دھوتے ہیں

کسی نے جس طرح اپنے ستاروں کو سجایا ہے
غزل کے ریشمی دھاگوں میں یوں موتی پروتے ہیں

سُنا ہے بدرؔ صاحب محفلوں کی جان ہوتے تھے
مگر ایسے ہوئے پتھر نہ ہنستے ہیں نہ روتے ہیں

○

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو تجھے اپنا کوئی پتہ نہ ہو

وہ ہزار باغوں کا باغ ہو تری برکتوں کی بہار سے
جہاں کوئی شاخ ہری نہ ہو جہاں کوئی پھول کھلا نہ ہو

ترے اختیار میں کیا نہیں مجھے اس طرح سے نواز دے
یوں دعائیں دل کی قبول ہوں، مرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

کبھی دھوپ دے کبھی بدلیاں دل و جاں سے دونوں قبول ہیں
مگر اس محل میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو

کبھی ہم بھی اس کے قریب تھے دل و جاں سے بڑھ کے عزیز تھے
مگر آج ایسے ملا ہے وہ کبھی پہلے جیسے ملا نہ ہو

○

خواب کی وادیوں سے نکلتا ہوا
چاند سو کر اٹھا آنکھ ملتا ہوا

ہاتھ پر دھوپ کی پتیاں رکھ گیا
کوئی پھولوں کی چادر بدلتا ہوا

شیش محلوں میں شیشوں سے ٹکرا گیا
پتھروں سے وہ اترا سنبھلتا ہوا

میں بھی آ ہی گیا تیرے بازار تک
اور چہرے پہ چہرا بدلتا ہوا

شام تک ہو گا سورج ہماری طرح
کوئی سوکھا ہوا پیڑ جلتا ہوا

ایک آہٹ سی نزدیک آتی ہوئی
لان میں شام کا پھول کھلتا ہوا

○

راتوں کے مسافر ہو اندھیروں میں رہو گے
جگنو کی طرح دن میں جلو گے نہ بجھو گے

سب لوگ سمجھتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو
تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہو گے

کیا ان کہی غزلوں کی کتابیں ہیں وہ آنکھیں
جب پڑھ نہیں سکتے ہو تو کیا خاک لکھو گے

خوشبو کی حویلی ہے عجب دل کی زمیں پر
وعدہ کرو اک روز مرے ساتھ چلو گے

دلی ہو کہ لاہور کوئی فرق نہیں ہے
سچ بول کے ہر شہر میں ایسے ہی رہو گے

● ڈی۔ ۱۲۰ شاستری نگر میرٹھ (یوپی)

○

پاس سے دیکھو جگنو آنسو، دور سے دیکھو تارا آنسو
میں پھولوں کی سیج پہ بیٹھا آدھی رات کا تنہا آنسو

میری ان آنکھوں نے اکثر غم کے دونوں پہلو دیکھے
ٹھہر گیا تو پتھر آنسو۔ بہہ نکلا تو دریا آنسو

پیار عجیب تلوار ہے جس پر ہم دونوں کے نام لکھے ہیں
ننھی ننھی کلیاں آنسو، پتھر پتھر جھرنا آنسو

اپنے بچپن کا قصہ ہے اک تصویر دکھائی اس نے
مہندی والے ہاتھ رچے تھے بیچ ہتھیلی ٹپکا آنسو

موسم کی خوشبو میں اکثر غم کی خوشبو مل جاتی ہے
آموں کے باغوں میں کیسے ساون ساون برسا آنسو

اک گاؤں میں دو باراتیں شاید دولہا بدل گیا ہے
میری آنکھ میں تیرا آنسو، تیری آنکھ میں میرا آنسو

○

اک تصویر چھپی تھی دل میں آن بسی ہے آنکھوں میں
شاید ہم نے آج غزل سی بات لکھی ہے آنکھوں میں

اس رومال کو کام میں لاؤ اپنی پلکیں صاف کرو
میلا میلا چاند نہیں دھول جمی ہے آنکھوں میں

بڑھتا جایہ منظر نامہ زرد عظیم پہاڑوں کا
دھوپ کھلی پلکوں کے اوپر برف جمی ہے آنکھوں میں

میں نے اک ناول لکھا ہے آنے والی صبح کے نام
کتنی راتوں کا جاگا ہوں، نیند بھری ہے آنکھوں میں

کاغذ اور قلم شاہد ہیں لفظوں کی امت جھوٹی ہے
آدھی رات کا تنہا آنسو پاک نبی ہے آنکھوں میں

گیس چیمبر

رضوان احمد
روزنامہ عظیم آباد اکسپریس، بانکی پور - پٹنہ - ۴

میرا دم گھٹ رہا ہے۔

جیسے میرے سینے میں زہریلا دھواں بھر گیا ہے۔ جو لمحہ لمحہ میرا دم گھونٹ رہا ہے۔

میں اخبار پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اس کے کالموں میں صرف لاشیں جڑی ہوتی ہیں ـــ بھوپال میں مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک ہزار، ڈیڑھ ہزار، ۲ ہزار، ڈھائی ہزار، لاتعداد لاشیں، بے شمار لاشیں جانے کتنے لوگ گیس کی زہرناکی سے ہلاک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی ان لاشوں کا پرسان حال نہیں۔ بس نفسی نفسی کا عالم ہے۔

میرا ابھی دم گھٹ رہا ہے۔ شاید میرے کمرے میں بھی زہریلی گیس بھر گئی ہے۔

کہیں سکون نہیں ہے۔

میں گھٹن سے گھبرا کر بالکنی میں آکر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ سڑک پر بہت سے لوگ آجا رہے ہیں مگر سب کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار ہیں۔ چہرے کی سلوٹیں بتا رہی ہیں ان کے ذہن میں بھی تناؤ اور اندر گھٹن کا احساس ہے۔ سب کے چہرے دھواں دھواں ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ نیچے کے کرایہ دار گپتا صاحب کھلے میں بیٹھ کر اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ان کا چہرہ بھی فق ہے۔ میں سیڑھیاں اتر کر ان کے پاس آتا ہوں وہ چونک کر مجھے دیکھتے ہیں۔ جیسے انہیں میں کوئی اجنبی معلوم ہو رہا ہوں۔ "ارے یہ تم کو کیا ہوا؟ تمہارا چہرہ تو بالکل بدلا ہوا لگ رہا ہے۔ نامعلوم کیسی حیرت ناک تبدیلی آگئی ہے۔"

"گپتا صاحب صبح سے میرا دم گھٹ رہا ہے جیسے میرے کمرے میں بھی زہریلی گیس بھر گئی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر آپ کے چہرے پر بھی کرب کے آثار ہیں۔"

"ارے میاں جب پاپ سنسار میں اس قدر بڑھ جائیں تو اور ہونا کیا ہے۔ ہر آدمی صرف پاپ کر رہا ہے اور پاپ کے سہارے زندہ ہے۔ تمام شریف آدمی بیوقوف کہے جاتے ہیں۔ سب لوگ انہیں احمق سمجھتے ہیں۔ یہ تو کلجگ ہے گھور کلجگ ـــ اس کے علاوہ اور ہونا ہی کیا ہے ـــ دم تو میرا بھی گھٹ رہا ہے، مگر کہاں جا سکتا ہوں کیا کہیں جائے اماں ہے؟ میں تو اسپتال سے دوا لے آیا ہوں، میری مانو تو تم بھی اسپتال چلے جاؤ اور دوا لے لو کیونکہ یہ پتا نہیں کتنے دنوں کی ہے۔"

"مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ اسپتال میں اس کی کوئی دوا بھی ہے میں ابھی جا کر دوا لے آتا ہوں ورنہ میرا دم واقعی گھٹ جائے گا۔"

اسپتال وہاں سے چند فرلانگ کی دوری پر تھا۔ مگر قدم من من بھر کے ہوتے چلے جا رہے تھے جیسے میں منزل نہیں ہفت خواں طے کر رہا تھا۔ اتنے میں اچانک مجھے پیچھے سے شور سنائی دیا میں اچھل کر سڑک کے کنارے آگیا۔ ایک ٹرک بھیانک آواز نکالتا ہوا تیزی سے گزر گیا۔ اگر میں اچھل کر کنارے نہ آیا ہوتا تو یہ یقیناً پل بھر میں مجھے چٹنی بنا دیتا۔ لیکن اس کے گزر جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو سڑک پر ایک لاش تڑپ رہی تھی۔ ڈرائیور ٹرک بھگاتا ہی چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں لاش کے قریب آیا لیکن مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بھری پری سڑک پر سینکڑوں افراد چل رہے تھے مگر کسی نے لاش کی جانب توجہ نہیں

دی جیسے یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہی نہ ہو۔

مجھے فکر لاحق ہوئی کہ اس شخص کو اسپتال پہونچایا جائے شاید اس میں زندگی کی رمق باقی ہو اور اسے بچایا جا سکے۔ مگر وہاں پر کوئی شخص متوجہ ہی نہیں ہو رہا تھا اور میں تنہا یہ کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں تو اپنے آپ کو ہی لاش کی طرح گھسیٹ رہا تھا۔

ایک سن رسیدہ شخص میرے قریب آیا۔ اور سرگوشی کے انداز میں بولا "پاگل ہو گئے ہو کیا۔ کیا تم نے اس سے قبل کبھی لاش نہیں دیکھی ہے۔ یہاں سے جلد سے جلد بھاگ جاؤ ورنہ پولیس آکر تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔"

"مگر میں نے کیا کیا ہے۔ میں تو اسے بچانا چاہتا ہوں"

"اسے بچانے کی کیا ضرورت ہے یہ تو اپنی غلطی سے مرا ہے۔ غلطی ٹریفک والے کی نہیں اس کی اپنی تھی۔ جاؤ جلدی سے بھاگ جاؤ اس سے قبل کہ پولیس آکر تمہیں دبوچ لے۔"

میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میں بزدل انسان ہوں اس لئے تڑپتی ہوئی لاش وہیں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی۔ میں نے ہمدردی کے جذبات کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ پھر دم اور شدت سے گھٹنے لگا۔ مگر کسی طرح سے گرتے پڑتے اسپتال پہونچا تو وہاں بھی بے حد گھٹن تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل اور بھی بیٹھ گیا کہ بیماروں کی لائن بہت لمبی تھی۔ میں بھی اس لمبی لائن میں پیچھے کھڑا ہو گیا۔

جیسے ہر شخص کا دم گھٹ رہا تھا۔

میرے قریب کے شخص نے مجھ سے کہا "یہ تو ہونا ہی تھا۔ لوگ بڑھ چڑھ کر یہ کہہ رہے ہیں مجھ کو بھگوان رجنیش نے لکھا تھا کہ ان سب لوگوں کے دم گھٹ جائیں گے۔ سو ان کی بات درست ثابت ہو رہی ہے۔"

رجنیش کی کتابیں تو میں نے بھی پڑھی ہیں مگر میں انہیں بھگوان نہیں مانتا۔ ان کے یہاں گھٹن کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کے یہاں آزادی ہی آزادی اور شادکامی ہی شادکامی ہے صرف بھوگ ولاس ہے۔ پھر یہ گھٹن کی بات ان کے یہاں کہاں سے آگئی" میں نے اپنے مطالعہ کی دھونس جمانی چاہی۔

"جناب میں ان کا چیلا ہوں۔ انہوں نے یہ بات مجھے ایک خط میں لکھی تھی۔ شادکامی ہی شادکامی بھی تو گھٹن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آج مغربی ملکوں میں کیا ہو رہا ہے، کیا آپ کو اس کا علم نہیں۔ شاید اب وہاں کے حکمراں کو اس گھٹن کا احساس ہو رہا ہو۔"

میں اس کی بات سن کر لاجواب ہو گیا۔

ایک اور شخص اپنی بات سے دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا "دیکھو بھائی یہ کوئی بہت گہری بین الاقوامی سازش ہے کہ تیسری دنیا کے عوام سکون سے جینے نہ پائیں اور گھٹ گھٹ کر مر جائیں۔ اس میں یقیناً غیر ملکی ہاتھ ہے ایسے غیر معمولی واقعات یونہی رونما نہیں ہو جاتے ہیں۔ لوگ کیڑے مکوڑوں اور چوہے بلیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ انسانی جان کی کوئی قیمت ہی نہیں رہی۔"

"مگر بھائیو یہ تو بتاؤ کہ اتنی لمبی لائن کبھی ختم بھی ہوگی۔ کیا ہم یوں ہی لائن میں گھٹ کر مر جائیں گے؟"

میری یہ بات سن کر کسی جانب سے ایک شخص دوڑ کر میرے پاس آیا۔

"شاید آپ ڈاکٹر کے پاس جلد پہونچنا چاہتے ہیں۔

وہ میرے کانوں میں پھسپھسایا

"ہاں بھائی! میرا دم گھٹ رہا ہے اتنی لمبی لائن میں رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہونچوں گا تو میرا دم گھٹ چکا ہوگا۔

اچھا آپ یہاں سے نکل کر میرے ساتھ آیئے میں آپ کو راستہ بتاتا ہوں۔

میں نے لائن سے نکل کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اس آدمی کی شکل میں فرشتۂ رحمت بھیج دیا۔ شاید اب میری جان بچ جائے۔

اس نے ایک گوشے میں لے جا کر میرے کان میں کہا "آپ ڈاکٹر کے پاس جلد پہونچنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں بھائی اسی لئے تو میں آپ کے ساتھ آیا ہوں۔"

"مگر اس کے لئے تو سفارش کی ضرورت پڑتی ہے۔"

لیکن میں تو معمولی آدمی ہوں میرے پاس کوئی سفارش نہیں۔'

"آپ بہت بھولے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں آج کل بغیر سفارش کے کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔

"مگر میرے پاس کوئی پیروی سفارش نہیں ہے یہ بات آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں بتادی تھی۔ میرا تعلق کسی اثر و رسوخ والے آدمی سے نہیں ہے میں تو کسی کو جانتا تک نہیں۔"

اسی دم کئی جانب سے آوازیں آنی شروع ہوگئیں ارے یہ تو گر پڑا...... شاید ختم ہوگیا۔"

سب اس جانب متوجہ ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی قطار سے گر کر ختم ہوگیا تھا: شاید وہ گھٹن کی تاب نہیں لاسکا۔

اس شخص نے پھر میرا شانہ ہلایا کیا آپ نے کبھی لاش نہیں دیکھی ہے؟ جو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے بھی زیادہ دیر کی تو یہی حشر آپ کا بھی ہوسکتا ہے۔

'لیکن سفارش؟'

'روپیہ سب سے بڑی سفارش ہے کیا آپ کے پاس روپئے نہیں ہیں'

'اچھا کیا روپیہ دینے سے کام چل سکتا ہے؟'

'اجی روپیہ ہی تو سب سے بڑی سفارش ہے۔'

'میری جیب میں کچھ روپئے تو ضرور پڑے ہوئے ہیں جو میں نے کسی ضرورت کے تحت ڈال لئے تھے۔"

'اب اس سے بڑی ضرورت کیا ہوسکتی ہے آج آپ کو اپنی جان بچانی ہے کہ نہیں؟ جان سے بڑھ کر اور کیا ہے"

"اجی! جان تو بچانی ہی ہے مگر کتنے روپے کافی ہوں گے؟"

"سو سے کام چل جائے گا۔"

"میرے پاس اتنے روپئے تو نہیں ہیں میں پچاس دے سکتا ہوں۔"

"اچھا آپ کی جان جارہی ہے تو اس لئے اتنے ہی کام کر دیتا ہوں آخر ہم لوگ بھی تو کچھ پیسہ کمالیں۔"

میں نے پچاس روپے اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اس نے جلدی سے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔

"دیکھئے ہمارے ڈاکٹر صاحب بہت دیالو ہیں۔ دیوتا سمان ہیں ان کے ہاتھوں میں شفا ہے۔ وہ صرف عوام کی خدمت کے لئے اس پیشے سے وابستہ ہیں ورنہ ان کے پاس کیا نہیں ہے۔ خدمت ہی ان کی زندگی کا مشن ہے۔"

اس نے ایک پچھلے دروازے سے مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں پہونچا دیا۔

وہاں پر دو تین مریض اور تھے۔

ان سے نپٹنے کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہوئے اور بڑی گہرائی سے پوچھا "آپ کو کیا ہوا ہے؟"

"میرا دم گھٹ رہا ہے ڈاکٹر صاحب۔"

"اوہ یہ بھی کوئی بیماری ہے سب یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کا دم گھٹ رہا ہے مگر کسی کا دم نہیں گھٹتا سب اچھے ہیں۔ بھلے چنگے ہیں میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں آپ کا دم گھٹ تو نہیں چکا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ اگر میرا دم گھٹ چکا ہوتا تو میں یہاں تک کیسے آتا۔"

"آپ کو کیا معلوم کتنے لوگ دم گھٹ جانے کے باوجود زندہ ہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں یہ باتیں تو میں ہی جانتا ہوں۔"

اس نے ایک دو منٹ ہی میں مجھے نپٹا دیا اور نسخہ لکھ کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا ــــ اس میں صرف ایک دوا ہے دن میں تین بار آنکھوں میں ڈالنے کی۔"

"مگر ڈاکٹر میرا تو دم گھٹ رہا ہے اور آپ آنکھوں میں ڈالنے کی دوا دے رہے ہیں۔" میں چیخ پڑا۔

چیخنے کی ضرورت نہیں ۔ آپ کو کیا معلوم جب آپ کچھ دیکھ نہیں سکیں گے تو اچھے بُرے کی تمیز کیوں کر سکیں گے اس لئے سب سے ضروری بینائی ہے ۔
—— دیکھئے میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے ۔ میں آپ کی ہر بات کے جواب کا پابند بھی نہیں ہوں اگر آپ کو اتنے ہی سوال و جواب کرنے ہیں تو میرے پرائیویٹ کلینک میں آیئے وہاں آپ کی تشفی ہو جائے گی ۔ خیراتی اسپتال میں آکر ایسے سوال و جواب نہیں کئے جاتے ، یہاں تو میں محض وقت گذاری کے لئے آجاتا ہوں اس لئے مغز پچی نہیں کر سکتا ۔"
' اب آپ جاسکتے ہیں "۔
" میں وہی نسخہ لے کر کمرے سے باہر آجاتا ہوں ۔ کیوں کہ اب گھٹن میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے ۔
راستے میں ایک کیمسٹ کی دکان میں داخل ہو کر میں اسے نسخہ دیتا ہوں ۔ نسخہ پڑھ کر وہ بھی کچھ پس و پیش میں پڑ جاتا ہے ۔
میں اس سے دریافت کرتا ہوں " کیا بات ہے کیا اس تشخیص پر آپ کو حیرت ہے ۔"
" ہاں میں تعجب میں پڑ گیا ہوں "۔
" بھائی حیرت تو مجھے بھی ہے مگر مجھے وہی دوا لینی ہے ۔ جو ڈاکٹر نے لکھی ہے "۔
" کیا آپ نے یہ نسخہ خیراتی اسپتال میں لکھوایا تھا "۔
" جی ہاں ! مگر اس سے کیا ہوا ؟"
" ایسا ہے کہ خیراتی اسپتال میں تو ڈاکٹر روا روی میں نسخہ لکھ دیتے ہیں مگر اپنے ذاتی کلینک میں توجہ سے دیکھ کر صحیح تشخیص کرتے ہیں "۔
" لیکن خیراتی اسپتال کیا وہاں بھی تو مجھے دکھلانے کے لئے پچاس روپے دلال کو دینے پڑ گئے ۔ اب پرائیویٹ کلینک میں دکھلانے کے لئے دو سو روپے کہاں سے لاؤں آپ مجھے وہی دوا دے دیجئے جو ڈاکٹر نے لکھی ہے ۔ میں اسے ہی استعمال کر لوں گا یہ میری قسمت "
اس نے دوا کی شیشی میرے حوالے کر دی ۔
بلڈنگ میں قدم رکھتے ہی گپتا صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی ۔
" ارے آپ تو بہت لکی ہیں کہ اسپتال میں آپ کو اتنی جلدی فرصت مل گئی "۔
گپتا جی ایسے ہی فرصت تھوڑی ملی ہے اس کے لئے پورے پچاس روپے صرف کرنے پڑے ہیں آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل سفارش پیروی یا رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ہے "۔
" اچھا اچھا وہ پھر اخبار کے کالموں میں لاشوں کا شمار کرنے لگے ۔
میرا سانس بُری طرح پھول رہا تھا مجھے سیڑھیاں چڑھنا ایک امر محال لگتا ہے ۔ میں جلد سے جلد اپنے بستر پر پہنچ کر دوا کا اثر آزمانا چاہتا تھا ۔
کسی طرح گرتے پڑتے اپنے کمرے تک آیا ۔ پھر میں نے دوا کے چند قطرے آنکھوں میں ڈالے ۔
—— پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دونوں آنکھوں میں کسی نے گرم گرم سیخیں ڈال دی ہیں ۔ آگ کے شعلے سے بھڑک رہے ہیں ۔ جیسے پورا وجود آگ میں جل رہا ہے ۔
" یا خدا ! یہ کس گناہ کی پاداش ہے ۔ —— اگر یہی دوزخ ہے تو پھر حقیقی دوزخ کیا ہوگی ۔ !
' میں بے حس ہو کر بستر پر گر پڑا '۔
آنکھیں جل رہی تھیں اور سانس سینے میں گھٹ رہا تھا ۔ دم گھٹ رہا تھا ۔
ساری جان سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھی ۔
میری نظروں کے سامنے موت ناچ رہی تھی —— زہریلی گیس کی گھٹن سے سڑتی ہوئی سینکڑوں لاشیں ۔
—— سڑک سے کچل کر خون سے لتھڑی ہوئی لاش
—— قطار اندر قطار لاشیں ۔ گرتی ہوئی ۔ مگر سب لوگ ان کی جانب سے بے توجہ اور ان لاشوں کے گرد منڈلاتے ہوئے آدم خور لالچی گدھ

[باقی صفحہ ۴۸ پر دیکھئے]

تخت سنگھ

جشنِ تسکینِ جاں مناؤ

جو کچھ بھی دل میں بھرا ہوا ہے
اسے اِسی وقت اوندھا کر کے
انڈیل دو تم
کہ خالی پن کے لطیف احساس میں بھی
اپنا ہی اک مزہ ہے
در آچلا ہے جو کچھ بھی ادراک کی حدوں میں
اسے پکڑ کر حدوں سے باہر
دھکیل دو تم
کہ حسِ باطن سے مخلصی میں بھی
ایک اپنا ہی ذائقہ ہے
جو ہو سکے
اپنے بس میں رکھو جفاکشی کی
نکیل کو تم
کہ کچھ نہ کرنے کی کیفیت کا شعور بھی
اک لذیذ و پُر لطف تجربہ ہے
جب اونگھتی سوچ خالی خالی ہو
آپ ہی آپ آنکھوں آنکھوں میں
میٹھا میٹھا سا مسکراؤ
لبوں کی جنبش کے ساز پر کوئی
دھیما دھیما سا گیت گاؤ
ہر ایک موئے بدن سے چھینٹے ٹپک کے
آکاش تک اڑاؤ
کہیں نہ جاگ اٹھیں نیند سے
زندگی کے گھاؤ
مزے سے چپ چاپ
جشنِ تسکینِ جاں مناؤ

● ۴۰۴-۲ اگوار گجراں، جگراؤں ڈسٹرکٹ لدھیانہ [پنجاب]

شہریار

گذرے تھے حسینؑ ابنِ علیؑ رات اِدھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

اس بات پہ کس واسطے حیران ہیں آنکھیں
پت جھڑ ہی میں ہوتے ہیں جدا پتے شجر سے

سنتے ہیں بہت نام، کبھی دیکھتے ہم بھی
اے موجِ بلا! تجھ کو گذرتے ہوئے سر سے

تو یوں ہی پشیماں ہے، سبب تو نہیں اس کا
نیند آتی نہیں ہم کو کسی خواب کے ڈر سے

تھکنا ہے ٹھہرنا ہے بہرحال سبھی کو
جی اپنا بھی بھر جائے گا اک روز سفر سے
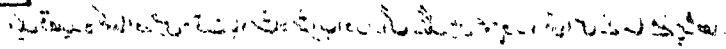
● ۱۳-سی، میڈیکل کالج کیمپس
علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

غزل اُس نے چھیڑی

عمیق حنفی

۲ اے ، ۲۲۳ پنڈارا روڈ - نئی دہلی - ۳

انسان جسمانی اور حسی اعتبار سے دیگر مخلوقاتِ عالم سے کمزور تر واقع ہوا ہے لیکن ان تمام تر احتیاجوں اور کمزوری کی تلافی اتوانے عقلیہ اور چھٹی حس کی بخشش کے ذریعہ کر دی گئی ہے۔

اس عہد کا ممتاز اور متنازعہ فیہ ماہر ترسیلیات مارشل میکلوہن MARSHALL MCLOHAN تمام وسائل ترسیل اور ذرائع تبادلۂ اطلاعات وخیالات کو "توسیع حواس" کے زمرے میں رکھتا ہے۔

انسانی تبادلۂ خیالات میں اظہار اور بیان (خطابت یا RHETORICS) دو طریق کام میں آتے ہیں۔ اظہار فطری، پہلے سے بے سوچا سمجھا اور غیر منصوبہ بند ہوتا ہے جبکہ بیان (بالخصوص خطابت) میں سوجھ بوجھ، تدبیر و ترتیب، منصوبہ بند ترکیب اور منطقی تواتر و تسلسل کا ہونا لازمی ہے۔ اظہار جذب کیفیت اور تاثر سے اور بیان عقل فکر اور خیال سے متعلق ہوتا ہے۔

ایک امتیاز کا دھیان میں رہنا اور ضروری ہے کہ ہنر زیادہ کارآمد مفید اور روزمرہ کے استعمال کی شے ہے جبکہ فن ذوقِ جمال کی تسکین کرتا ہے فن آرائش، زیبائش اور تفننِ طبع کے لئے ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کارآمد اور استعمال میں آنے والی چیز کو بھی اس وقفے کے لئے ذرا قرینے اور سلیقے سے سجا دیا جائے جس وقفے میں اس کا استعمال نہیں ہوتا ہے۔

گانا بجانا جب کسی رسم کی ادائیگی یا تقریب منانے کے لئے ہوتا ہے تو اس میں فنی خوبیوں اور خرابیوں پر اتنا دھیان نہیں دیا جاتا جتنا اس وقت دیا جاتا ہے جب وہ برائے خود ہوتا ہے۔ محفل سماع چونکہ تصوف کی ایک تقریب تھی، اس لئے قوال کی آواز کے عیب و ہنر پر دھیان نہ دینے کی ہدایت بیشتر صوفیائے کرام نے کی ہے۔ بقول داتا گنج بخش:

> و باید کہ قوال اگر خوش خواند نگوید کہ خوش میخوانی واگر ناخوش و ناموزوں گوید و طبع را خارج کند نگوید بہتر خوان
>
> وبدل بر وی خصومت نکند و دیرا اندر میانہ نبیند حوالۂ آن بحق کند و راست شنود
>
> (کشف المحجوب - ژوکوفسکی - ص ۵۲۵)

سماع اور غزل کا بڑا دیرینہ تعلق ہے۔ قصیدہ اور غزل کی شکل و صورت اور ناک نقش میں کوئی فرق نہیں۔ غزل آخر قصیدے کا چہرہ جو ٹھہری۔ قصیدہ سراپا ہے تو غزل PORTRAIT FACE تاریخ غزل کی ابتدا کا نقطہ اس واقعے کو تسلیم کرتی ہے جسے حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں صفحہ دس پر نقل کیا ہے:

> ایران کے مشہور شاعر رودکی کا قصہ مشہور ہے کہ امیر نصر بن احمد سامانی نے جب خراسان کو فتح کیا اور ہرات کی فرحت بخش آب و ہوا اس کو پسند آئی تو اس نے وہیں مقام کر دیا اور بخارا کو جو سامانیوں کا اصلی تخت گاہ تھا اس کے دل سے فراموش ہو گیا۔ لشکر کے سردار اور اعیان و امرا جو بخارا میں عالی شان عمارتیں اور عمدہ باغات رکھتے تھے ہرات میں رہتے رہتے اکتا گئے اور اہل ہرات بھی سپاہ کے زیادہ ٹھہرنے سے گھبرا اٹھے۔ سب نے استاد ابوالحسن رودکی سے یہ درخواست کی کہ کسی طرح امیر کو بخارا کی طرف مراجعت کرنے کی ترغیب دے۔ رودکی نے

ایک قصیدہ لکھا اور جس وقت بادشاہ شراب اور راگ رنگ میں محو ہو رہا تھا اس کے سامنے پڑھا۔

بوئے یار مہرباں آید ہمے — یاد جوئے مولیاں آید ہمے

ریگ آموئے و درشتیہائے او — پائے مارا پرنیاں آید ہمے

آب جیحون وشگرفیہائے او — خنگ مارا تامیاں آید ہمے

اے بخارا شاد باش وشاد زی — شاہ سویت میہماں آید ہمے

شاہ ماہ است و بخارا آسماں — ماہ سوئے آسماں آید ہمے

شاہ سرد است و بخارا بوستاں

سرد سوئے بوستاں آید ہمے

اس قصیدہ نے امیر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ جی جمائی محفل چھوڑ کر اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر مع لشکر کے بخارا کو روانہ ہو گیا اور دو کوس پر جا کر پہلی منزل کی۔

قصیدے کی منقولہ بالا تشبیب بلا شبہ غزل کی تعریف میں آتی ہے اور موقع و محل کی مناسبت سے اس میں جو بے پناہ جذباتی تاثیر پیدا ہوئی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ بطور جملہ معترضہ عرض ہے کہ رودکی امیر نصر ثانی بن احمد سامانی (۹۱۴-۴۲) کا ملک الشعراء تھا اور "آدم الشعراء" اور "سلطان الشعراء" کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ وفات ۹۵۴ء میں ہوئی ولادت کے بارے میں ۳۰ برس کا اختلاف ہے یعنی کہا جاتا ہے ۸۷۰ سے ۹۰۰ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پیدائشی نابینا تھا مگر بعض نکتہ داں اور پارکھی رودکی کی شاعری میں رنگوں کی صحیح شناخت پا کر اسے پیدائشی اندھا تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں۔

جس طرح غزل گو کا تعاقب کم از کم دسویں صدی عیسوی تک بآسانی کیا جا سکتا ہے اسی طرح غزل گا کا پیچھا بھی وقت کے اسی نقطے تک ہو سکتا ہے۔ غزل ہو کہ ترانہ (رباعی) دونوں لفظوں کی موزوں ترکیب سے مرکب ہیں اس لئے جہاں تک ان کے گائے جانے کا سوال ہے نغمہ یا ترنم ایقاع یا تال لفظوں کی بندش اور باہمی نفسیاتی جذباتی اور فکری تعلق پر مبنی ہے۔ گویا غزل گانا اس کا غنائی اور موزوں ترجمہ پیش کرنے کے مترادف ہے۔

ترک ایرانی موسیقی اتر آہنگ (بلند آہنگی، اونچے سروں) پر زیادہ زور دیتی تھی اور سوز و ساز دونوں کا توازن قائم رکھتی تھی۔ پنچم سے گانے کا رواج اس موسیقی کے رواج سے پہلے کم تھا۔ نالہ و فریاد، آہ و بکا، چیخ پکار ٹیپ پر جانا اس گانے بجانے کی خصوصیات تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ مغنی یا مغنیہ محض الفاظ کی مختلف ادائیگیوں اور رنگ و آہنگ کی پیش کش پر اکتفا کر کے بس کر لے۔ لحن کے پیچ و خم زیر و بم موڑ توڑ لٹکے جھٹکے ریزہ کاری زمزمے حرکتیں اور غوطہ خوری و موجزنی کے کمالات بھی دکھاتا تھا۔ جیسے جیسے شاعری زیادہ سنجیدہ، معنی آفریں فکر آمیز، باریک خیال اور حلقۂ دام خیال میں الجھی ہوئی بنتی گئی مغنیوں نے ہلکی پھلکی، رنگین عاشقانہ، دل سے نکل کر دل تک پہنچنے والی، گدگدانے والی غزلوں میں غنائی چابکدستیوں کا اظہار اختیار کرنا شروع کر دیا۔ مستی و سرمستی شوخی و طراری تعیش و تلذذ کے عناصر بڑھتے گئے اور شاعری کی ترجمانی پر اظہارِ کمالِ ہنر غالب آتا گیا۔ جس نے استاد فیاض خاں کی گائی ہوئی "پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے میں" سنی ہے وہ گواہی دے گا کہ تین تال جیسی تال میں، جو غزل کے لئے محال سمجھی جاتی ہے، یکی موسیقی کے تمام کمالات کے ساتھ، موسیقی کے لوازمات پر اشعار کے الفاظ و معانی کو جس طرح تیز چکری جھولے پر گھمایا گیا ہے اس کی داد کس سطح پر دی جائے۔ جن کے لئے گائیکی مقصود بالذات ہے ان کے لئے تو یہ غزل ایک عجوبۂ روزگار ہے، کرشمہ ہے [۱]

غزل کی گائیکی پر مروجہ غنائی اسالیب کا اور عوام و خواص کی پسند و ناپسند کا بھی اثر پڑتا رہا ہے اور ایسا اثر پڑنا لازمی اور فطری بھی ہے۔

---

[۱] امیر خسرو نے بھی جلد تالہ چار ضرب کا بحر رمل مثمن محذوف سے مشابہ استعمال کیا تھا [فاعلاتن (سم) فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن (خالی)]

عہد سلطنت یعنی مملکت مغلیہ سے پہلے ایسے قوالوں کا ذکر آتا ہے جو غزلیں قوالی کے انداز میں پیش کرتے تھے۔ تورمتی خاتون جیسی مغنیہ غزل کا نام لیا جاتا ہے۔ محافل سماع میں بعض غزلیں عارفانہ سطح کی بلندیوں پر جام شہادت بدست ثابت ہوئیں۔ بعض نے بزرگ ترین صوفیائے کرام و شیوخ کبار کو بے حال کر دیا اور مستی و بے خودی کے عالم میں رقص آمادہ کر دیا!

خدا بھلا کرے شہاب سرمدی کا اور ان کے زیر نگرانی تحقیق کرنے والوں کا کہ انھوں نے راگ اور مقام ہمپتک اور اشتک، قول، قلبانہ، غزل، ترانہ، گرنتھ اور گائیکی کے بہت سے تنازعات اور قوالی اور خیال کے بہ ظاہر انمل بے جوڑ میں ایک فنی اور ثقافتی رشتہ ڈھونڈنے کی نہایت بھرپور کوشش کا رخ اب تک کامیابی کی طرف ہے۔

غزل گائیکی بھی آواز و الحان کی تہذیب کا نام ہے۔ راجہ نواب علی خاں مصنف "معارف النغمات" کے الفاظ میں مرزا جعفر حسین آواز کی تعریف اپنی کتاب "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" میں نقل کی ہے آپ بھی محظوظ ہوں:

"آواز ایک ارتجاج ہے ہوائے محیط الابدان کا جو بسبب تصادم و اصطکاک لینیہ و صلبیہ کے پیدا ہو"

جب آواز کے اتار چڑھاؤ سمٹاؤ اور پھیلاؤ بھاری اور ہلکے پن آفاقی اور عمودی توسیع موٹے پن اور باریک پن ارتعاشات اور استقامت کا اظہار مقصود ہو اور ناف و سینہ، سینہ و حلق، حلق و تالو اور تالو اور جبڑے سے آواز کا جادو پیدا کیا جائے اور لے اور تال آہنگ و ایقاعات سے نغمہ اور سُر کا ارتباط لفظ و معنی کی ترجمانی پر آواز کے رنگ و آہنگ اور کیفیت و تاثر کا کمال ظاہر کرنا مقصود ہو تو گانا بجانا پکا کہلاتا ہے اور اس میں کلاسیکی نظم و ضبط کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اور جب معاملہ برعکس ہوتا ہے معنی کے باریک سے باریک لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک پہلو کو نمایاں کرنا مطلوب ہوتا ہے اور الفاظ و آواز کے لحن و ترنم میں تناسب و توازن برقرار کرنا ہوتا ہے آواز کی قوت اور زور کے بجائے اس کی لطافت، نفاست اور نزاکت عیاں کی جاتی ہے اور عارفانہ محاورہ غنائیہ محاورہ بن کر سامنے آتا ہے، تال محض آہنگ کی زمین تیار کرتی ہے اور آواز کو ایک متعین اور مقرر دائرے تو جہ زاد HYPNOTISED کیفیت میں باندھ دیتی ہے اور تکرار سے حسن پیدا کرتی ہے تو ایسی موسیقی ہلکی پھلکی کہلاتی ہے اور راگ راگنی سے زیادہ دھن کے قریب رہتی ہے۔

موسیقی ایک عالمگیر اور آفاقی فن ہے۔ بعض لوگوں کی عادت تو نثر کو بھی لحن و ترنم سے پڑھنے کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت و قرأت کے احکام تو غیر متنازعہ ہیں اور سات قرأتیں ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ "ہسٹری آف دسارا سین" کے مورخ سید امیر علی اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں کہ اسلام کے فقہا نے آٹھویں صدی عیسوی تک موسیقی کو حرام قرار نہیں دیا تھا اور طبقہ شرفاء و امرا کے مرد و زن اس فن میں زبردست دستگاہ و مہارت رکھتے تھے۔

فارابی (۹۵۰ ـ ۸۷۰) نے موسیقی کو بہ اعتبار تاثیر تین اقسام میں منقسم کیا تھا۔ مضحک (جس کی تاثیر سامع کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دے) مبکی (جسے سُن کر سامع کی ہچکیاں بندھ جائیں اور آنسو نہ تھمیں) اور منوم (جسے سن کر سننے والا غنودگی محسوس کرے اور کچھ ہی دیر میں اسے گہری نیند آجائے) ابن خلکان اور شہرزوری جیسے اکملا نے فارابی کو موسیقی کا حکمت ور عالم کامل اور باقدرت ماہر فن قرار دیا ہے۔

شہاب سرمدی اور ان کے رفقائے تحقیق نے قول، قلبانہ، نقش و گل، ترانہ، غزل وغیرہ کی کھدائی بہت دور تک کی ہے اور کلاسیکی فنون موسیقی سے کمتر درجہ نہیں دیا ہے۔ آچاریہ برہسپتی کا بیان ہے کہ پنڈتوں نے مسلمانوں (اجنبیوں) سے اپنے مقدس اسرار فنون کو پوشیدہ و پنہاں رکھنے کی نیت سے انھیں چھپا لیا اور اپنے گرنتھوں اور پوتھیوں کو غائب کر دیا۔ وسط ایشیا اور مغربی ایشیا سے آنے والے اجانب کے کان میں وہی سُر اور وہی دھنیں پڑیں جنھیں عام مواقع، رسوم، تقریبات یا غیر رسمی اوقات میں لوگ گاتے گنگناتے تھے۔ اس لئے آچاریہ جی کا یہ الزام کہ مغربی اور وسطی ایشیا سے آنے والی اقوام ہندوستانی موسیقی کے شدھ اور صحیح اصولوں اور داؤ پیچ سے واقف نہ تھے الزام نہیں بلکہ اظہار واقعی بن کر رہ جاتا ہے!!

پوتھی تو حافظہ ہے، اصل شے تو کریا (عمل) ہے۔ گانے بجانے والے متعصب نہیں ہوتے اور نہ ان میں فرقہ پرست ہوتے ہیں۔ ایک ہی گانے والا بھجن کیرتن گاتا ہوا ملے گا اور نعت و منقبت بھی۔ شیو اور شکتی کی ڈیوڑھی پر ماتھا ٹیکتے ہوئے ملے گا اور کسی پیر فقیر کے آستانے پر سجدہ ریز بھی۔ اس لئے کسی گہری کادمیائی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ گانے بجانے کی روایت موسیقی کے اصول ضابطے اور صرف و نحو کی پابندی اتنی نہیں کرتے جتنا اثر دہ مروجہ مقبول رنگ و آہنگ سے قبول کرتے ہیں۔ اب دیکھئے غزل میں ہارمنی آگئی ہے، اسکیل تبدیل کرنے کا رواج ہو گیا ہے۔ گٹار، مینڈولن، پیانو، ہارمونیکا وغیرہ کا استعمال مغربی انداز سے ہونے لگا ہے۔ اسے فیشن کہئے یا وقت کا تقاضہ۔ فن کے ساتھ محض دل و دماغ نہیں جیب و شکم کا بھی تعلق ہے۔ مقبولیت ہو گی تو آمدنی ہو گی اور آمدنی ہو گی تو آسائشیں اور خوشحالی کا ہونا یقینی ہے۔ دربارِ اودھ میں انگریزی باجوں کا استعمال ہندوستانی موسیقی کے سلسلے میں بھی شروع ہو گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک تکان مٹانے سستانے اور تفریح و تفنّنِ طبع کا سوال ہے بہت پیچیدہ اور ریکی استادانہ موسیقی کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی اور پھر ایسی استادانہ موسیقی سے محظوظ ہونے کے لئے بھی موسیقی کے فلسفے، نظریئے، اصول، صرف و نحو، تاثر اور آہنگ کے مسلمات سے آگاہی بہت ضروری ہے۔ ہلکی پھلکی موسیقی میں لفظ اور وزن میں چھپے ہوئے ترنم و لحن کی دریافت اور اس میں رنگارنگی کی تلاش کافی ہے۔ تکرار کا حسن بھی مزا دیتا ہے اور ایک حال کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ سُر کے لگاؤ کا جمالیاتی اور نفسیاتی ہونا زیادہ ضروری تھا بجائے اس کی صرفی اور نحوی صحت کے۔

سماع اور دربار کی راگ رنگ کی محفلوں کا انداز کچھ مختلف تھا۔ مزا لینے اور لطف اٹھانے کے علاوہ باریک بینی، نکتہ رسی راگ راگنیوں اور تالوں کی نزاکتوں اور غنائی چابکدستیوں سے واقفیت لازمی تھی۔ "تیر و بھاؤ" اور "اُدِر بھاؤ" کی چالاکیوں سے چوکنا رہنا ناگزیر تھا۔ جبکہ ہلکی پھلکی موسیقی کے لئے موزونیٔ طبع اور کیفیت کافی تھی۔

یہ بھی عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ گانے کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبی سامعین کو آبدیدہ کرنا تھا۔ ساز کے ذریعے سوز کا پیدا کرنا موسیقار کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ کفن، دفن، لاش، قبر، مقتل، قاتل، ذوقِ قتل، خونِ ناحق غزل کی پسندیدہ تمثالات بن گئی تھیں اور موت کو دلہن اور محبوبہ سے تشبیہہ دی جاتی تھی۔ غزل گائیکی میں سُر کا بھاری بھرکم ہونا یعنی اس کے طبعی وزن اور اصولی صحت پر اس کی اثرانگیزی، شیرینی، سچائی اور سوزناکی کو فوقیت حاصل تھی۔ فنونِ لطیفہ اور جمالیاتی مزاج کا مطالعہ بین الضوابط تقابل کی بنا پر زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ بھاری بھرکم، بلند و بالا، مضبوط اور سنگین و عریض دیواروں کے دورِ تعمیر کی ہم عصر موسیقی بھی دھرپد دھمار ہوری کی مردانہ اور پہلوانی موسیقی تھی۔ لطیف، نازک، نفیس، پتھر میں تراشی گئی پھول پتیوں اور سبک میناروں اور محرابوں کے دور میں خیال کا چلن بڑھا اور جب پتھروں کی جگہ لکھوری اینٹوں نے لی تو ٹھمری، دادرا کجری چیتی کا رواج ہوا۔ غزل ہر دور میں مقبول رہی، کبھی ثابت قدمی اور مستانہ خرامی تو کبھی لغزشِ مستانہ اور سبک خرامی اسکی روش رہی۔

امیر خسرو کو آچاریہ برہسپتی اندر پرستھ مت اور مقام پدّھتی کا بانی نہ سہی پیشرو ضرور مانتے ہیں کہ آچاریہ جی کی پسندیدہ مورچھنا پدھتی، بقول خود، امیر خسرو کے نظام موسیقی کی نذر ہو گئی۔ اور پھر سپتک کے اشٹک بن جانے سے مدھیم کی پوزیشن سرگم (سپتک) میں درمیانی نہ رہی! امیر خسرو کو موسیقی میں دخل تھا بھی یا نہیں اس پر بحث اب تک گرم ہے۔ ایک طرف رشید ملک ہیں جو انھیں موسیقی کے علم و ہنر سے بے داغ قرار دیتے ہیں۔ اور شہاب سرمدی اور پروفیسر ممتاز حسین امیر خسرو کو علم موسیقی سے سراسر معصوم نہیں بتاتے۔

امیر خسرو کے معاصر ضیاء الدین برنی کا معتبر مقولہ ہے:

(کہ امیر خسرو) در علم موسیقی گفتن و ساختن کمال داشت۔

موسیقی کو امیر خسرو ایک مجلسی ہنر قرار دیتے تھے۔ موسیقی تابعِ شعر تھی لہٰذا اس کی حیثیت یا اہمیت شاعری سے کمتر اور ثانوی تھی خسرو کی نگاہ میں مجرد موسیقی یا نغمۂ خالص کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

در کنے مطرب یسے ہاں ہاں وہوں ہوں در سرود　　　　چوں سخن نبود ہمہ معنی او ابتر بود

شہاب سرمدی نے امیر خسرو کے قول کو نقل کیا ہے :

ان دونوں طبیعتوں کا میلان زیادہ تر غزل کی جانب ہے۔ میں نے بھی جس روز سے دیکھا کہ ارضِ فارس میں راویانِ سخن سنگلتی غزل کی چنگاری سے مجلسوں میں آگ لگا رہے ہیں اور ادھر اپنی طبیعت کو بھی بہتے پانی کی طرح کثافتوں سے پاک پایا... تو برطبق چہار عناصر غزل کو بھی چار طبیعتوں پر تقسیم کر دیا...

اول وہ غزل جو مٹی کی طرح ٹھنڈی ہوتی ہے

دوم وہ غزل جو پانی جیسی رواں دواں نظر آتی ہے

سوم وہ غزل جو جلی بھنی ہو، اور

چہارم وہ غزل جو بالکل ہی آگ ہو (ماخوذ از دیباچہ 'بقیہ نقیہ' بعمر ۶۵ سال)

خسرو کے لئے سُر کا پھکا ہوا ہونا بہت ضروری تھا۔ سوز و سوزش غزل خوانی کے روح رواں تھے۔ سُر پر لفظ کو طاری کر کے گانے کا چلن اور بھی زور پکڑ گیا۔" آج بھی اچھا غزل خواں وہی ٹھہرتا ہے جو سُر پر لفظ کو طاری کرے ۔ ' لفظ پر سُر کو طاری نہیں کرتا۔ غزل کے شعر میں لہجے کی خوبی یہی ہے کہ ہر لفظ صاف صاف صحیح صحیح اور واضح پڑھا جاتے اور لحن میں ایک غنائی جمال، ایک کیفیت، ایک تاثر، ایک موڈ ضرور ہو لیکن استادانہ اور فنکارانہ داؤں پیچ کی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ہوں۔ راگ کی آنچ اور سُر کی آگ ایسی مقبول ہوئی کہ مومن بھی پکار اٹھے :

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک　　　　شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اور دور نہ جا سکیں تو نہیں کم از کم سامانیوں کے دور دورے سے غزل کی مشعل روشن ہے۔ کبھی یہ شمع محفل رہتی ہے، کبھی مشعلِ جلسہ اور کبھی گھنے وحشی درندوں اور قزاقوں سے بھرے ہوئے جنگل میں مختلف پڑاؤں کے بیچ لپکتے ہوئے الاؤ کی مانند نور و حرارت اور حفاظت کا سرچشمہ۔ غزل کا آتش کدہ پچھلی کم از کم دس صدیوں میں کبھی سرد نہ ہوا۔ بظاہر دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد تفریح و تفننِ آزادی اعمال و اظہار اور ایک قلبی اور نفسی پربیت کے وقفے کی ضرورت انسان نے ہمیشہ سے محسوس کی ہے GAY ABUNDANCE کا یہ لطف و سکون سے معمور بے حجاب یا کم حجاب لمحہ TRANQUILIZER ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال لطف و سکون کا یہ عالم لاپرواہی، آزادی اور خودنمائی کے احوال ہی میں ممکن ہے۔

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل　　　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

دربارکے آداب اور سماع کے قیود نے یہاں بھی لگام کھینچے رکھی اور جشنِ عیش و مستی اور اسواق قبلِ اسلام کے کلچر میں نہ کرنے دیا۔

اہلِ تصوف اور اہلِ سلوک کے لئے سماع کے ذریعے "جمع" کا احساس اور "مع اللہ" ہونے کا تصور و مقصد لازمی تھا۔ ذوالنون مصری نے فرمایا ہے کہ سماع وہ واردالحق ہے جو دل میں جستجوئے اللہ تعالیٰ کا رجحان (بلکہ ہیجان) پیدا کرتا ہے۔ جو سماع کو بحق سنتے ہیں وہ تحقیق تک پہنچتے ہیں اور جو اسے بالنفس سنتے ہیں وہ تذبذب میں گرتے ہیں۔ شبلی کہتے ہیں کہ سماع بظاہر فتنہ ہے اور بباطن عبرت، جو بھی اشارت کو سمجھتا ہے سماع سے مشروع عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ سماع سے اللہ کی معیت و قربت حاصل ہو تو مقصد پورا ہو گیا اور غفلت و غیریت ملے تو تضیع اوقات۔

سماع میں الفاظ کا اطلاق بھی مجازی نہیں حقیقی ہونا ضروری ہے۔ سماع کی غزل کا محبوب ہونا ماسوائے رسولِ خدا یا محبوبِ رسولِ خدا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ سماع میں گائے گئے بیشتر اشعار نے بہت سے پہنچے ہوئے شیوخ اکابر کو ابہام و تفہیم کی اس انتہائی منزل تک پہنچا دیا جہاں سے ان کا واپس آنا ممکن نہ تھا۔ اس کے برخلاف بڑے بڑے باریش علمائے کبار کو قدحِ شراب میں اپنی متبرک داڑھیوں کو تر بتر کر کے رقاصاؤں اور مغنیاؤں کے قدموں پر شراب کا چھڑکاؤ کرنے پر مجبور کر دیا۔ بہرحال لفظ جب سُر اور وزن پر پوری طرح سوار ہو گیا

گویا تو جان لے گیا یا ایمان! یہ کمال اکثر غزل کے اشعار ہی نے دکھایا ہے۔

ایک تاریخی واقعہ اور سُن لیجئے۔ ۱۸۷۲ عیسوی یعنی ۱۲۸۹ ہجری میں سیّد کریم علی نے تاریخ مالوہ لکھی تھی۔ ہمایوں اور بہادر شاہ گجراتی کی جنگ کا بیان کیا ہے۔ بہادر شاہ گجراتی اس جنگ میں پسپا ہوا تھا۔ جنگ شادی آباد مانڈو، دار الحکومت مالوہ، میں ہوئی تھی۔

بیجو نائک، سرائندہ، باربد سے بھی گانے میں زیادہ، سلطان بہادر شاہ گجراتی کا مقرب، جب بہادر شاہ بھاگ گیا مانڈو میں رہ گیا۔ ہمایوں بادشاہ نے بعد فتح کے سرخ لباس زیب بدن کیا اور حکم قتلِ عام دیا۔ اتفاقاً بیجو نائک کو ایک مغل نے پایا۔ اس کے قتل کا ارادہ کیا۔ اس بے چارے نے منت لجاجت کی مغل کی بہت خوشامد کی اور کہا میرے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا۔ اگر مجھے نہ مارے گا ہموزن اپنے تجھے سونا دوں گا۔ مغل نے جب زر کا نام سُنا اپنے ہاتھ کو تھام لیا۔ ایک گوشہ میں لے جاکر بٹھایا۔ اتفاقاً ایک راجہ ہمایوں بادشاہ کا متوسل وہاں آیا وہ نایک بیجو کو پہچانتا تھا۔ نایک کو اپنے ہمراہ لے چلا مغل بھی تلوار سونتے پیچھے ہو لیا۔ بادشاہ کے روبرو سب آئے آداب بجا کے کھڑے ہوئے۔ مغل نے بآوازِ بلند کہا جہاں پناہ اس قیدی مقرب درگاہ بہادری کو میں قتل کرتا تھا راجہ مجھ سے چھین لایا۔ خوش حال بیگ قورچی اکثر بہادر شاہ کے پاس آتا تھا۔ نایک کو اس نے دیکھا تھا۔ قورچی نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ یہ قوال شاہ مطرباں ہے۔ سرود سرائی میں بے مثل و بے نشان ہے۔ بادشاہ نے بیجو کو واسطے نغمہ سرائی کے ارشاد کیا۔ یہ بیت بیجو گانے لگا۔

کسے نماند کہ اور ابہ تیغ ناز کشی	مگر تو زندہ کنی خلق راد باز کشی

ایسا گایا کہ بادشاہ کی آگ غضب کو بجھایا تاثیر پیدا ہوئی۔ بادشاہ نے فوراً پوشاک بدلی سرخ لباس پہنے تھا سبز لباس پہنا۔ نایک سے فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے۔ نایک نے زمینِ خدمت کو چوم کر عرض کی اب کوئی قتل نہ ہو، غلام کی یہ تمنا ہے۔ بادشاہ نے لفظ امان منہ سے نکالا۔ نایک کی بدولت قتل بے گناہوں کا موقوف ہوا۔

مراۃ سکندری ص ۲۱۲ پر نایک منجو کے نام سے یہی واقعہ لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بیجو اور منجو ایک ہی نام ہے جو فارسی رسم خط کے مغالطے کی وجہ سے دو پڑھے جاتے ہیں۔ بہرصورت یہ واقعہ مئی ۱۵۳۵ء کا ہے اور قتلِ عام تین دنوں جاری رہنے کے بعد بیجو نایک کی غزل سرائی کے زیر اثر ختم ہوا۔

غزل بہر دور و بہر عہد دلکشا اور غم غلط ثابت ہوتی رہی ہے۔ غزل کی مقبولیت کسی دور میں کم نہیں ہوئی۔ غزل کی غنائیہ ساخت دو "تکون" یا "دو چرنوں" یعنی استھائی اور انترا۔ چھوٹی اور منجھولی تالوں میں لفظوں کی معنویت اور کیفیت کی توسیع و توضیح کرنے والا یہ اسلوب موسیقی سے زیادہ لحن و ترنم سے قریب ہے۔ یوں بھی پوری موسیقی کی تاریخ بھاری بھرکم، پختہ، استادانہ، پیچیدہ، تہہ دار و پرکار طرز سے سبک، نازک، لطیف اور سادہ اسلوب کی جانب رواں دواں ہے۔ صنفِ خیال کی ابتدا خواہ امیر خسرو کے زمانے سے مانی جائے اور حسین شاہ شرقی کے عہد میں تشکیل پانے والے خیال کو اس خیال سے ذرا مختلف مانا جائے جسے محمد شاہ رنگیلا کے زمانے میں پروان چڑھایا۔ قرین قیاس ہے عہد سلطنت میں غزل گانے کا انداز ترک ایرانی موسیقی کے اصولوں کا پابند ہوگا۔ مقامات بارہ ہیں اور ہر ایک کی تاثیر جداگانہ ہے۔ کوچک، بزرگ، زنگولہ، رہاوی اور راست حزنیہ اور آشفتگیٔ خاطر سے خصوصاً متعلق ہیں۔ میاں شوری کا زمزمہ اور تحریر یعنی آواز کو مرتعش کر کے ریزہ ریزہ کرنے کی ترکیب گانے میں برتی گئی۔ تان کی معدومیت کو تحاسین اور زوائد کی برت سے پورا کیا گیا۔ بارہ مقامات کے علاوہ چھ آوازہ، چوبیس شعبہ اڑتالیس گوشہ اور تینتیس الحان وغیرہ کے اثرات یقیناً طاری رہے ہونگے اور پیشہ ور ہندوستانی مطربوں نے چلتی کا نام گاڑی رکھا ہوگا۔ گانے والا وہی لوگ گائے گا جسے سننے والا سننا چاہے گا اور خوش ہو کر انعام بخشے گا۔ ملتان، اچہ، ٹھٹھہ، لاہور، پانی پت، دہلی، اودھ، بہار، بنگال، راجستھان، گجرات، مالوہ، خاندیش، دکن ہر علاقے کے اپنے اپنے گیت سنگیت نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالا ہوگا۔ یہ الگ تحقیق کا موضوع ہے۔

بہت سے شاعر اصولِ موسیقی میں کاملانہ درک رکھتے تھے۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ کونسی غزل کا رنگ کس راگ یا راگنی میں کھلے گا۔

خواجہ میر درد زبردست سنگیت یار بھی تھے۔ مومن کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ موسیقی کے اسرار سے واقفیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں غالب کا ایک خط خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو انھوں نے نواب امین الدین احمد خاں بہادر کے نام لکھا تھا:

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان۔ سلامت

وکیل حاضر باش دربار اسد اللہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہوکر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آکر میں بھی سن لوں گا۔ والسلام مع الاکرام۔

نجات کا طالب غالب

چہارشنبہ ۲/ربیع الاول ۱۲۸۲ھ

(مکتوب ۴۰۳ اردوئے معلیٰ)

میں ہوں مشتاق جفا، مجھ پہ جفا اور سہی	تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لئے، اے غیرتِ ماہ!	ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی
تم ہو بت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟	تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی	آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا	کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ!	خُلد بھی باغ ہے، خیر آب ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں، یارب!	سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں	زہر کچھ اور سہی، آب بقا اور سہی
مجھ سے، غالب، یہ علائی نے غزل لکھوائی	ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

کھماج ٹھاٹھ (کامبوجی میل) کی آروہی سمپورن راگنی جھنجھوٹی رکھب کو وادی اور پنچم کو سموادی (بعض کے مطابق گندھار کو وادی اور کھرج کو سموادی) بنا کر گائی جاتی ہے۔ (دوسرے نقطہ نگاہ میں تکلیف یہ ہے کہ اوروہی میں گندھار لگانے سے راگنی کا سروپ بگڑ جاتا ہے گا کہ اس کی سرگم میں اوروہی میں گندھار ہے ہی نہیں۔ اور اس طرح اوروہی میں وادی سُر لگے گا ہی نہیں۔)

(آروہی) سارے ماپا دھاسا (اوروہی) سانی دھاماپا گارے سا۔ جھنجھوٹی اور پہاڑی میں بڑی مماثلت ہے اور اکثر ٹھمریوں اور غزلوں میں دونوں کو ملا کر گایا جاتا ہے۔ مہدی حسن کی گائی ہوئی "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے" اور فریدہ خانم کی "میرے قابو میں نہ پہروں دل ناشاد آیا" جھنجھوٹی کے سروں میں ہیں۔ اور الفاظ اور غزل کی کیفیت سے بڑی مناسبت رکھتی ہیں۔

موسیقی میں سبکی، نفاست، لطافت، نزاکت کا چلن دراصل پورب اور دربار اودھ سے فروغ پانے لگا۔ ہندوستانی موسیقی میں مغربیت کا دخل بھی اسی دور سے ہوا۔ ویسے قدیم و جدید میں امتیاز و اختلاف کا بیّن خط ۱۹۳۰ء سے کھینچا جاسکتا ہے۔ رؤسا کی محفلیں ہوں یا طوائفوں کے مجرے جانِ عالم واجد علی شاہ کی رائج کردہ طرز مقبول تھی جس کو پکا گانا کہا جاتا ہے۔ (قدیم لکھنؤ کی آخری بہار: مرزا جعفر حسین)

بطور جملہ معترضہ یہ عرض کرنا تضیع اوقات نہ ہوگا کہ مشرق اور مغرب کے فنی رویّوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مغربی فنکار کا زور اظہار پر اور مشرقی کا ابلاغ پر ہوتا ہے۔ مغرب کا رخ اونچائی اور گہرائی کی طرف تو مشرق کا وسعت اور تفصیلات کی جانب ہوتا ہے۔ مشرقی مصوری میں شیڈ ٹنگ سے کام نہیں لیا جاتا، اور خطوط اور اقلیدسی زاویوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ مشرق کی موسیقی ہارمنی اور سمفنی کو تسلیم نہیں کرتی۔ مشرقی ڈرامہ منظر کو طبعی طور پر یعنی پردوں یا روشنی کی تبدیلی سے بدلنے کے بجائے بعض مفروضات کی بنا پر بدلنے کی عادی تھی۔ مشرقی شاعری میں بیان

RHETORIC NARRATION STATEMENT

سے کام لیا جاتا تھا۔ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، رمز، تمثال، علامت وغیرہ بیان کے آلات و وسائل تھے مقصود بالذات نہ تھے۔ مغرب سے مرعوب ہو کر آپ کا جی چاہے تو مشرقی جمالیات اور تصورِ فن کو آپ گھٹیا اور کمزور قرار دے سکتے ہیں مگر یہ فراموش نہ کیجئے گا کہ مشرق کا اپنا ذوق و شوق اپنا قلب و ذہن اور اپنا مذاق و مزاج ہے۔ اس کی اپنی ثقافت ہے جو مغرب سے دو تین ہزار سال پرانی ہے۔

لکھنؤ نے نہ صرف ٹھمری، دادرا، ٹپہ، خیال، ترانہ، کجری، چیتی، بارہ ماسا، رہس، کتھک، نقالی، بھانڈ کے تماشوں اور نوٹنکی کو مقبول کیا وہیں بھیرویں، جھنجھوٹی، پوربی، سوہنی، کھماج، پیلو اور ایسے ہی ہلکے پھلکے راگ راگنیوں کو سر چڑھایا اور راگ مالاؤں کے جلسوں کو اور میلوں کو رواج دیا۔ کتھکیوں، کشمیری بھانڈوں اور پریوں کے ٹولوں کی تعلیم تربیت کے اہتمام کئے گئے اور یہی کلچر کلکتہ کے مٹیا برج میں ٹرانسفر ہو گیا۔

> طوائفیں آئے دن کسی نہ کسی رئیس کے یہاں تقاریب کے مواقع پر مجرے کرتی تھیں جس میں محلے کے عوام کو شرکت کے لئے اجازت رہتی تھی۔ مرد اور عورت سب ہی نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ منچلے اور خوش گلو نوجوان طوائف کی زبان سے جو غزل سن لیتے تھے اسی دھن اور سُر میں باآواز بلند گلیوں اور کوچوں میں الاپا کرتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لکھنؤ کی آخری بہار شعر و نغمہ میں سرشار تھی اور در و دیوار سے ترنم اور موزونیت ٹپکا کرتی تھی۔
>
> (قدیم لکھنؤ کی آخری بہار: مرزا جعفر حسین ص ۲۱۳)

طوائفوں کے نام چھپن چھری، رشک منیر، ماہ منیر ہوا کرتے تھے اور ان کے کوٹھوں کی تہذیب روٴسا کے لئے لائقِ تقلید ہوا کرتی تھی۔

> واجد علی شاہ کو اس فن میں اساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ صاحبِ کمال تھے لیکن اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ ان کے عامیانہ مذاق نے لکھنؤ میں موسیقی کو سبک اور عام فہم بنا دیا۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کر نفیس طبیعتیں رکھنے والے گویوں نے بھی راگ راگنیوں کی مشکلات کو آکھ کر کے چھوٹی چھوٹی سادی دلکش اور عام چیزوں پر موسیقی کو قائم کیا۔ عوام میں غزل، ٹھمری کا چرچا ہو گیا اور دھرو پد ہوری وغیرہ جو نہایت ثقیل اور مشکل چیزیں ہیں، ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔ کھماچ، جھنجھوٹی، بھیرویں، سیندورا، تلک کامود، پیلو وغیرہ چھوٹی چھوٹی مزید ار راگنیاں اہل مذاق کے تفنن کے لئے منتخب کی گئیں اور یہی چیزیں بادشاہ کو بالطبع مرغوب تھیں۔
>
> (گذشتہ لکھنؤ: عبدالحلیم شرار ص ۲۳۲)

لکھنؤ میں فنِ موسیقی کے زوال و ابتذال کو سارے ملک پر نہیں تھوپا جا سکتا اور نہ ہلکی پھلکی موسیقی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو موسیقی کا زوال و ابتذال قرار دیا جا سکتا ہے۔ غزل گانے کا ایک فن تھا، اسلوب تھا، تہذیب تھی، اصول تھے، تکنک تھی۔ چھجو خاں، غلام رسول خاں، شوری، شکر، مکھن، بڑے محمد خاں یہ سب لکھنؤ کے مشہور مغنیوں میں صاحبِ طرز گویوں میں شمار ہوتے تھے۔ زہرہ (مٹیا برج) مشتری جونے والی حیدر، سحر آفریں مغنیہ تھیں۔

رات رات کی محفلوں کا دور ختم ہوا۔ نہ دماغ نہ فرصت۔ ساڑھے اور سات منٹوں کی چوڑی والا گراموفون ریکارڈوں کا چلن شروع ہوا۔ درباروں، شاہی مجلسوں اور روٴسا کی محفلوں کی جگہ کانفرنسوں اور عوام کے جلسوں کا رواج شروع ہوا۔ الکٹرک اور الکٹرونک وسائل نے بہت طویل فاصلے سیکنڈوں میں طے کر لئے۔ نہ صرف دوریاں مٹا دیں بلکہ VOCAL CHORDS پر سے بے جا زور ختم کر دیا اور صوت و صدا کی لطیف سے لطیف اور نفیس سے نفیس حرکات کو سماعت کی حدود میں لا کر کھڑا کر دیا۔

کالو قوال کلکتے والے، کملا جھریا، جدن، کجن، زہرہ بائی امبالے والی، اور خیالیوں میں سے بہت سے مشاہیر غزل گانے میں کمال دکھاتے تھے۔ موسیقی کوٹھوں اور چکلوں سے دھیرے دھیرے نکل کر شرفاء کے گھروں میں داخل ہو گئی اور شرفاء بھی اس فن میں دستگاہ حاصل کرنے لگے۔ غزل کو فروغ اور مقبولیت دینے میں تھیٹر اور فلم نے بھی بہت اہم حصّہ لیا ہے۔

غزل کی گائیکی میں بیگم اختر، ملکہ پکھراج، فریدہ خانم، نورجہاں، برکت علی خاں، جے پور اور نگینہ کے افضل حسین، محمد یعقوب، مہدی حسن، غلام علی وغیرہ نے انقلاب آفریں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ چترا سنگھ اور جگجیت سنگھ، پنکج ادھاس، رونا لیلیٰ، انوپ جلوٹہ، طلعت عزیز، محمد حسین و احمد حسین اور نہ جانے کتنے نوجوان و نوآموز فنکار طبع آزمائی کر رہے ہیں اور نئے نئے گلدستے سجا رہے ہیں۔

غزل کی گائیکی دراصل اشعار کی خوش الحان پیشکش ہے۔ مصرعے اور شعر کی فطری روش و رفتار کو قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ شکستِ ناروا، تعقید حشو و زوائد کی تکرار، ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن پڑھنا، لہجے اور تلفظ کی غلطی، الفاظ کی بندش کو سُر یا تال کی سہولت کے لئے ان کی فطری روانی اور رشتوں کو توڑ کر پڑھنا فکِ اضافت یا اضافۂ اضافت عطف و اضافت کی ضرورت یا بے وجہی کا خیال نہ رکھنا یہ عیوب غزل سرائی کی معنی آفرینی اور اثر انگیزی کو بری طرح مجروح کرتے ہیں۔

غزل گانے والوں میں وہی بازی مار لے جاتے ہیں جو غزل کے الفاظ، بندش، محاورہ، الفاظ کے محل استعمال، الفاظ کے تلفظ اور ادائگی معنوی اکائیوں اور وقفوں سے پوری طرح واقف ہو۔ اگر شاعر نے لفظ "بجَرِیا" باندھا ہے تو گویّے کو حق نہیں پہنچتا کہ "بزریا" پڑھے۔ میر تقی میر نے "مسجد" کو عوام و جہلاء کے تلفظ کے مطابق "مسیت" باندھا ہے۔ اول تو تصحیح غیر واجب ہے اور اگر کی بھی جائے تو ناموزوں ہوگی۔

اس صدی کے ربع اول تک غزل گانے والے سُر کو لفظ پر سوار کر دیتے تھے اور اس الٹی چال سے لفظ کی جو گت بنتی تھی سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ غزل میں بول بانٹ، تہائی، تکرار وغیرہ بھی جب تک مزاج معنوی کے تابع نہ ہو بڑی تمسخر آمیز ہو جاتی ہے۔

استاد برکت علی خاں مرحوم نے غزل کی گائیکی کو شاعری اور تاثیر سے ہم آہنگ کیا اور اس میں موسیقی کی استادی کو سُریلے پن اور اثر انگیزی کے ماتحت رکھا۔ استاد ٹھمری دادرا اور پنجابی انگ کی شوخ و شنگ گائیکی پر قادر تھے۔ آرائش اور زیبائش کے لئے مرکیاں کھٹکے، چھوٹی چھوٹی تانیں غزل میں لگاتے ضرور تھے مگر برمحل۔ گائیکی غزل کو سجاتی سنوارتی تھی اس کا حلیہ نہیں بگاڑتی تھی۔

آواز کے ارتعاش کے تسلسل کو خوبی مانا جاتا تھا۔ سَم پر آنے کے پہلے آواز لرزتی تھرتھراتی رہتی تھی اور گمک کے کرشمے دکھاتی رہتی تھی۔ بعد میں غنا کا یہ انداز ناپسندیدہ ٹھہرا اور سُر کے بناؤ، لگاؤ اور ٹھہراؤ کو ایک قدر تسلیم کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ خالص اور اعلیٰ مہذب موسیقی محض آواز کی موزونیت، غنائیت، زیر و بم اور پیچ و خم سے اظہار مطالب کرنے پر قادر ہوتی ہے۔ ہلکی پھلکی موسیقی لفظ میں ترنم اور غنائیت کی تلاش کرتی ہے اور شعر کی قرارت میں ایک غنائی جہت پیدا کرتی ہے۔ موسیقی کی تخلیقی صلاحیت لوک سنگیت، ہلکی پھلکی موسیقی، نیم کلاسکی اور کلاسکی موسیقی میں درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہے۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ بقول ہیگل افضل ترین فن وہ ہے جو اپنا مواد خارج سے، اپنے باہر سے، کم از کم بلکہ بالکل نہیں اخذ کرے۔ اس پیمانے پر فنون کی درجہ بندی اس طرح ہوگی (۱) فن تعمیر (۲) مجسمہ سازی (۳) مصوری (۴) موسیقی (۵) شاعری۔ موشگافی کی جائے تو برائے بحث کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کا مواد زبان ہے زبان الفاظ کا مجموعہ ہے الفاظ کسی نہ کسی تجربے کے ترجمان ہوتے ہیں اور تجربہ بیشتر خارج سے اخذ کیا جاتا ہے!

آج کی غزل ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہے جو اسے STATUS SYMBOL مانتے ہیں! ایک مہذب قسم کی تفریح تصور کرتے ہیں! جو اس بے جان سے ایک موذی پرستانہ تعیش گردانتے ہیں جو رنگ آلودہ الفاظ کی جھبن عطا کرتی ہے اور شام و شب کے اچھی صحبت میں گنے جانے کو مسکّنات میں شمار کرتے ہیں۔ یہ ایک تفریحی تجارت بن گئی ہے۔ غزل کا فیشن STATUS SYMBOL اور تجارت بن جانا بطور فن اس کی ترقی میں حارج ہے۔ اب دیکھئے نہ کتنے برس ہو گئے مہدی حسن اور غلام علی سے آگے غزل بڑھ ہی نہیں رہی ہے۔ ہندوستان میں چترا اور جگجیت نے عوام و خواص میں غزل کا ذوق پیدا کیا اور اس سلسلے میں دورِ قدیم کے خاتمے کے بعد انھیں اولیت بھی حاصل ہے۔ غزل اور اردو کی مقبولیت بڑھانے میں ان کا زبردست کارنامہ ہے۔ وہ بہت اچھا گاتے ہیں اور غزل میں جان ڈال دیتے ہیں لیکن ابھی تک وہ بھی مقبولیت کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکے۔

جب تک ہمارے فنکار غزل کے غنائی امکانات کی پرخلوص تلاش نہیں کریں گے غزل فیشن اور تجارت سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

فیشن اور تجارت قابلِ تحقیر نہیں بلکہ ترقیٔ فن کے کارآمد اور مفید وسائل بن سکتے ہیں۔ صنعت اور تجارت نے ہماری کئی ثقافتی اصناف کو ایک نئی تازہ اور شگفتہ شکل دے دی ہے۔ نئی غزل سرائی میں اداکاری کو زبردست دخل ہو گیا ہے اور ویڈیو اور ٹیلی وژن پر تو کیمرے اور روشنی اور سائے کو بالادستی حاصل ہے۔

ایک ہی مصرعے یا اس کے کسی ایک ٹکڑے کو کئی انداز سے کئی طریقوں اور لحنوں میں پیش کرنے کا اپنا ہی لطف ہے۔ اس سے شاعری کی رنگا رنگی بے شک دو بالا ہو جاتی ہے لیکن کبھی کبھی مصرعے یا شعر کا رُخ اور جہت اس درجہ تبدیل ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات مصرعے دو لخت ہو جاتے ہیں یا شاعر کے مافیہ میں بعد شرقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے مصارع یا ان کے محاوروں معنی اجزا کی غنائی جہتوں کی رنگا رنگی کے متفرق انداز دکھانا اسی حد تک جائز ہو سکتا ہے جس حد تک شاعر کے مافیہ میں فرق نہ آئے اور شعر کی معنویت اور کیفیت تبدیل نہ ہو۔

گوٹا کناری لگی ہوئی چنری، تڑک بھڑک والی چولی، جگمگاتی ہوئی پیشواز، جھومر، گلوبند، گھنگھرو خواہ اب نہ رہے ہوں لیکن ان کی جگہ نئی تراش خراش کے دل کش لباس، نئی آرائشات، نئے انداز و ادا اور نئے زاویوں نے لے لی ہے جن کا تعلق پیش کش سے زیادہ اور گائیکی سے کم ہے۔

آج کل درباری سرپرستی اور رئیسانہ ذوق و شوق تو رہے نہیں اور شاہانہ اور جاگیردارانہ اعلیٰ مہذب طبقے کی جگہ نو دولتیہ طبقے نے لے لی ہے جو دولت شراب و شاہد کے وسائل کا استعمال کر کے نئے اشرافیہ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ لے اور سُر پر اس کی گردن ہلنے لگی ہے۔ ساقی، صہبا، عشق، وصال، بہار، چمن، غنچہ جیسے الفاظ، اس کے لئے کلیشے ہیں یا فیٹش FETTISH زبان، بیان دھن اور نغمے کی سادگی اس کے لئے لازمی ہے۔ ان سامعین کا ۹۰ فی صد سے زائد حصّہ اردو زبان و شاعری سے واقف ہوتا ہے اور نہ اسے موسیقی اور نہ غزل کلچر سے اسے کچھ لینا دینا ہوتا ہے۔ مردوں کے ہاتھوں میں پیمانے ہوتے ہیں اور خواتین کے ہاتھوں میں

؎ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے —— اقبال بانو

فریدہ خانم نے غزل کو ایک نیا کلچر عطا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ بیگم اختر کے گلے میں پتی لگتی تھی مگر ایک باشعور فنکار کی حیثیت سے انھوں نے اس عیب کو ہنر بنا لیا تھا۔ انھوں نے غزل کے فطری ترنم اور لہجہ و لحن کی غنائیت کو قایم رکھتے ہوئے موسیقی اور الفاظ میں توازن پیدا کیا تھا اور الفاظ کی واضح اور صاف ادائیگی شفاف تلفظ اور غنائیانہ اوصاف پیدا کئے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل کے گانے والے مکھڑے (مطلع) پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے تھے۔ اور بہت زیادہ تکرار سے جی اُبا دیتے تھے۔ بعد کے مغنیوں نے تناسب و توازن سے کام لیا۔

مہدی حسن نے غزل کی گائیکی کی ایک نئی چمن آرائی کی اور نئے غزل سراؤں کی بہت بھاری اکثریت نے ان کی روش اختیار کرنے کو اپنا مایۂ امتیاز سمجھا۔ مہدی حسن نے شعر میں چھپی ہوئی اداؤں کو بے حجاب کرنا شروع کیا اور سچے معنی میں شعر کی غنائی تفسیر و توسیع کے کامیاب تجربے کئے۔

غلام علی کا نام بھی آج کے غزل سراؤں میں بہت اعلیٰ اور افضل مرتبے پر رکھا جاتا ہے۔ وہ استاد برکت علی خاں کے شاگردِ رشید ہیں اور پنجابی انگ ان پر غالب ہے۔ برکت علی خاں نے غزل کے سنگار میں سرگم کا استعمال بھی روا رکھا۔ مہدی حسن کے مقابلے میں غلام علی زیادہ تیز رو ہیں۔ مہدی حسن اور غلام علی نے ہمارے دور میں غزل گائیکی کو اعتبار، احترام اور وقار عطا کیا ہے دونوں نے راگ راگنیوں کو آدھار بنایا ہے اور دونوں اپنی ودیعت کئے گئے فطری سوز و ساز سے آراستہ آوازوں پر اعتماد کرتے ہیں۔

ہندوستان میں چترا اور جگجیت سنگھ نے لیے چوڑے ساز ینے کے ساتھ غزل گانے کی روش اختیار کی۔ دونوں کو دلکش اور موثر آواز ودیعت ہوئی ہے۔ دونوں نے نئی نئی روشوں کو برتا ہے اور سادہ و موثر بلکہ زود اثر غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے انداز میں شوخی

[باقی صفحہ ۱۶۱ پر دیکھئے]

لاکھوں افراد کیلئے روزگار، پیاسے ماروں کیلئے پانی

حالات پر قابو پانے کے لئے حکومت کے اقدامات

مہاراشٹر کے ۲۷ اضلعوں کے ۶۵۱۶ دیہاتوں میں خشک سالی چھائی ہوئی ہے خریف فصل کے نقصان کا اندازہ ۵۰۰ کروڑ روپے ہے کچھ علاقوں میں ربیع فصل کو بھی نقصان پہنچا ہے ۱۱۰۰۰ دیہات پانی کی قلت کا شکار ہیں۔ ریاست کے کچھ حصوں کے کسان مویشیوں کے چارے کی قلت سے دوچار ہیں

اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے

روزگار کے مواقع

* ضمانت روزگار اسکیم کے تحت ۱۰،۴۰۰ کاموں سے بھی زیادہ کام ۱۰ لاکھ ۶۰ ہزار مزدوروں کو مہیا کئے جارہے ہیں۔ ۱،۷۶ لاکھ سے بھی زیادہ مزدوروں کو منافع بخش روزگار فراہم کیا گیا ہے
* پیداواری کاموں کو ترجیح۔

فصلوں کی حفاظت کے لئے اقدامات

* ۶،۲۸ کروڑ روپے کی گنجائش سے خریف کے تحت ۲،۷۵ لاکھ ہیکٹر اور ربیع کے تحت ۵،۴ لاکھ ہیکٹر میں خصوصی فصل کی حفاظت کے اقدامات کئے گئے۔
* متوسط اور چھوٹے مالکان اراضی کو مفت کھاد اور بیج کی تقسیم۔

پینے کے پانی کی فراہمی

* دسمبر ۱۹۸۵ء کے آخر تک ۳۵ کروڑ کی تخمینی لاگت سے ۱۹۱۶ دیہاتوں کو پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے مستقل اقدامات اس پروگرام کے تحت مارچ ۱۹۸۶ء تک ۲،۵۰۰ دیہاتوں کو فراہمی آب کے لئے منتخب کیا گیا ہے بہی فراہمی آب اسکیم کے تحت مارچ ۱۹۸۶ء کے آخر تک

حکومت کے تعاون سے ۵۰۰۰ بورکنوؤں کے لئے الیکٹرک پمپوں کی تنصیب۔

مویشیوں کے لئے چارہ

* ایک ایمرجنسی پروگرام کے تحت ۲،۱۵ لاکھ ٹن چارہ کی پیداوار کی جائے گی
* ۲۰۰ روپے تک کسانوں کو ۴۰۰ روپے کی شرح سے فی مویشی چارہ فراہم کیا جائے گا۔ اس اسکیم کیلئے ۶،۵۰ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے

مویشیوں کا کیمپ

* ضرورت محسوس ہونے پر مویشیوں کا کیمپ لگایا جائیگا جہاں مویشیوں کے لئے چارہ کی تقسیم کا انتظام کیا جائیگا۔

ڈائرکٹوریٹ جنرل برائے اطلاعات و رابطہ عامہ

حکومت مہاراشٹر

کرامت علی کرامت

ہائیکو

ہائیکو جاپان کی ایک کلاسیکل صنف سخن ہے جو بین الاقوامی ادب میں رفتہ رفتہ مقبولیت حاصل کرنے لگی ہے۔ ہائیکو نظم تین مصرعوں پر مشتمل ایک مختصر نظم ہوا کرتی ہے۔ جس میں غزل کے شعر کی طرح اختصار، ایجاز وارتکاز بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب "ساقی" کا "جاپان نمبر" نکلا۔ تو اردو میں اس صنف کا چرچا ہونے لگا۔ نیاز فتح پوری اور کلیم الدین احمد جیسے نقادوں نے اس صنف سخن کی داد دی۔ اس وقت اردو کے چند شعرا متوجہ ہوئے۔ لیکن پھر یہ سلسلہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب اردو کے نئے شعرا نے دیکھا کہ انگریزی اور دیگر بین الاقوامی ادب میں یہ صنف سخن مقبول ہو رہی ہے تو ان لوگوں نے اس میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ اس طرح کی نظمیں ہندستان میں کم لکھی گئیں۔ پاکستان میں زیادہ۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے یہ نئے شاعر ہائیکو کے بنیادی اصول سے واقفیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ تین مصرعوں پر مبنی مثلث یا آزاد نظم کہہ دیتے ہیں۔ اور اسے ہائیکو سمجھتے ہیں۔ دراصل ہائیکو کے تینوں مصرعے مساوی الوزن نہیں ہوتے۔ بلکہ ان میں SYLLABLES کی تعداد اس طرح متعین ہوتی ہے۔

پہلا مصرع ۵ + دوسرا مصرع ۷ + تیسرا مصرع ۵ = ۱۷ (میزانِ کل)

اردو میں دو طرح کے سیلبل مستعمل ہوتے ہیں (۱) طویل سیلبل LONG SYLLABLE اور (۲) خفیف سیلبل SHORT SYLLABLE جہاں حرکت کے ساتھ ساتھ سکون مل جائے (یعنی ـ ٮ) اسے ایک طویل سیلبل اور جہاں صرف ایک حرکت ہو، اسے خفیف سیلبل کہا جاتا ہے۔

کبھی کبھی سکون تنہا رہ کر حرکت کا کام دیتا ہے، مثلاً لفظ "آمْ" کے "م" پر جزم ہونے کے باوجود اس میں حرکت چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ لفظ ایک طویل اور ایک خفیف سیلبل پر مشتمل کہا جائے گا۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ذیل کی ہائیکو نظمیں کہی ہیں۔ تاکہ قارئین کرام کو اندازہ ہوسکے کہ اردو میں ہائیکو کی شکل کیا ہونی چاہیے۔

اب سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ جب ہم نے اردو میں سانیٹ کو اپنایا تو فارم تو وہی برقرار رکھا۔ لیکن سیلبل کی پابندی کو نظر انداز کر دیا۔ اس لئے کیا ضروری ہے کہ ہائیکو میں سیلبل کی پابندی کو برقرار رکھا جائے۔؟ اس سلسلے میں میرا کہنا یہ ہے کہ اختصار ہی ہائیکو جیسی صنف کی روح ہے۔ [وہ بھی اس طرح کہ اس اختصار کی حد متعین ہے] سانیٹ میں یہ بات نہیں۔ دراصل متعدد ہائیکو نظمیں کہنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس نظم میں اوسطاً دس سے بارہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں سے کم از کم چار، پانچ الفاظ فعل اور حرفِ جار وغیرہ کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح شاعر کو صرف چھ سات لفظ ملتے ہیں جن کی مدد سے وہ مصوری کر سکتا ہے اور یہ مشکل امر ہے۔

میں اپنی ذیل کی ہائیکو نظمیں اپنے باشعور قارئین کی نذر کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ اردو کے نئے لکھنے والے مندرجۂ بالا اصول کے تحت صحیح معنوں میں ہائیکو لکھنے اور اس کے نئے نئے امکانات دریافت کرنے کی جانب متوجہ ہوں گے۔

_____ کرامت علی کرامت

(۱)

لمحوں کی تتلی
میرے من کے آنگن میں
جانے کیوں آئی

(۲)

زندگی ہے کیا
پوچھتی ہے شاعری
آگہی ہے کیا

(۳)

شامِ غم، تو آ
برف دل پہ جم گئی
مجھ کو شال اڑھا

(۴)

ایک پل صدی
اور صدی ہے پل میں گم
سوچیے کبھی

(۵)

من میں تیرا غم
بکھری رُوح اُداس
اور آنکھیں پُرنم

(۶)

پھول کھل اٹھا
کتنے بھنورے آگئے
شہد لاپتا

(۷)

تو نہیں تو کیا
شامِ غم لُبھا گئی
دل بہل گیا

● صدر شعبۂ ریاضی۔ کھالی کوٹ کالج، پوسٹ آفس برہم پور
ڈسٹرکٹ گنجم (اڑیسہ)

زوال

شفق ● کبیر گنج ۔ سہسرام (بہار)

وہ کئی دنوں سے آواز پر کان لگائے ہوتے تھے۔

ان کے دل دھڑک رہے تھے اور وہ یقین اور بے یقینی کا عذاب جھیلتے ہوئے محوِ سفر تھے۔ راستہ چلتے چلتے سرگوشیوں پر چونک پڑتے، ٹھٹھک کر رک جاتے اور رک کر چلنے لگتے۔ آواز کے وقت چائے خانوں میں، پان کی دکانوں پر بھیڑ بڑھ جاتی اور آواز ختم ہونے کے بعد دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹ جاتے۔

بھینچے ہوئے ہونٹ کھلتے، پہلے دھیرے دھیرے، پھر تیز تیز، ان کے چہرے رنگ بدلنے لگتے اور آنکھیں گہری خاکستری ہو جاتیں، تب ان میں سے ہی کوئی بیچ بچاؤ کی کوشش کرتا۔ اگر آپ اس آواز پر یقین نہیں رکھتے تو رات آنے دیجئے، ہم سن لیں گے کہ باہر والے کیا کہتے ہیں۔

ہاں، اب یہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی سچائیاں دوسروں کے منہ سے سن کر یقین کرتے ہیں۔ کیا ڈوب مرنے کی بات نہیں ہے۔

ہم جس آواز کو سننے کے لئے بے چین ہیں وہی ڈوب مرنے کے لئے کافی ہے، یہ سب کس کی غلطی سے ہوا اور خمیازہ کون بھگت رہا ہے، ان سوالوں پر غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ یا تو سب کچھ غلط ہو رہا ہے یا ہم غلط سمجھ رہے ہیں۔

میں آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں، مخالفت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ساری غلطیاں ایک ہی کے سر تھوپ دی جائیں۔

اور یہ بھی تو فیشن بن گیا ہے کہ مخالف کی سچی باتوں کو نظر انداز کر دو کہ یہ مخالف آواز ہے۔

اب چاہے غلطی کسی کی رہی ہو، مصالحت کرانے والے نے پھر دخل دیا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم غیر محفوظیت کی جس منزل پر ہیں، اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس پر وہ خاموش اور خوفزدہ ہو گئے کہ وہ خطرہ عقیدہ نہیں کان دیکھتا تھا، کان پہچانتا تھا اور اسے مختلف کانوں میں بڑی تمیز تھی اس لئے حادثوں کے وقت بھیڑ میں کان چھانٹ لئے جاتے تھے اور پھر گمبھیر آواز ایک سرے سے دوسرے سرے تک شور مچاتی چلی جاتی تھی اور سننے والے خوف سے دروازے بند کر لیتے، کیا پتہ کب ان کے دروازے کی کنڈیاں کھٹکھٹائی جائیں اور جب وہ دروازہ کھولیں تو... وہ اندھا اور بہرہ آسیب صرف حادثوں کو جنم دیتا ہے اسے اس کی پرواہ نہیں کہ معتوب قصوروار تھا یا بے قصور۔

کئی سال پہلے، پچھم کی طرف آسمان نے رنگ بدلا تھا اور چودھویں رات کے چاند میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوا تو لوگوں نے اسے اپنی آنکھوں کا قصور سمجھا۔ کچھ تو افسردہ ہو گئے کہ ان کے پاس علاج کے پیسے نہیں تھے اور کچھ چشموں کی دکانوں کی طرف دوڑ گئے اور اپنی ننگی آنکھوں کے لئے چشمہ خرید لیا۔ مگر وہ نقطہ نہ صرف گھٹتے بڑھتے چاند میں موجود رہا بلکہ دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔

لوگ اس نقطہ کو تشویش کی نظروں سے دیکھتے اور ان کے دل انجانے خوف سے دھڑکتے رہتے۔

کچھ ہونے والا ہے ــــ وہ ایک دوسرے سے کہتے۔ مگر کیا ــــ؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کمزور نظر والے اسے واہمہ سمجھتے اور تیز نظر والے بے بسی سے چپ ہو جاتے کہ اپنی بات کے ثبوت کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

مگر جب رات ہوتی اور در و دیوار چاندنی میں نہا جاتے تو ان کے بےچین قدم کھڑکی کی طرف بڑھ جاتے، دھیرے دھیرے کھڑکی کے پٹ کھولتے اور چمکنے والے چاند کو دیکھنے لگتے، دیکھتے رہتے اور پھر ایک دن انھوں نے محسوس کیا کہ دھبہ کلبلا رہا ہے جیسے اس میں ہاتھ پاؤں نکل رہے ہوں۔

انھوں نے گھبرا کر نظریں ہٹا لیں، مگر ان کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔

یہ کیا ہو رہا ہے ـــــ؟ صبح میں وہ دروازوں پر نکل آئے تھے، کیا رات آپ نے کچھ محسوس کیا؟

تو کیا یہ حقیقت ہے کہ وہ ... میرا بچہ اچانک بیدار ہو کر رونے لگا تھا اس لئے میں یہ سمجھا تھا کہ .....

چاند صرف ہمارا تو نہیں، اگر یہ دھبہ خطرے کی علامت ہے تو سب کے لئے ہوگا، آخر ہم ہی کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔

یہ بات صحیح ہے، مگر سوال یہ ہے کہ خطرے کا الارم صرف ہمارے ذہنوں میں کیوں بج رہا ہے، کہیں اور سے اس کی اطلاع کیوں نہیں آتی؟ کسی اور کو یہ دھبہ نظر کیوں نہیں آتا؟

ہم دیوی سے بھی کہہ نہیں سکتے کہ جب ہم میں سے بہتوں کو ہی خطرے کا احساس نہیں تو ہماری بات میں کیا وزن ہوگا، اس لئے کیوں نہ ہم بھی لاپرواہ ہو جائیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

اس فیصلے پر بظاہر وہ مطمئن ہو گئے تھے اور یہ عہد بھی کیا کہ چاہے ہمارے اندر والا کھڑکی کھولنے کو کتنا ہی چیخے، چاند نہ دیکھیں گے تو خطرے کا احساس بھی نہ ہوگا آخر ہمارے اور بھی تو مسائل ہیں جن پر سوچنا ہے ان کا حل ڈھونڈنا ہے۔

اس رات انھوں نے سویرے سونے کی کوشش کی اور سو بھی گئے مگر جب آدھی رات گزری تو ان کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔

بچہ بھی نہیں رو رہا تھا، کہیں پڑوس میں ٹیپ ریکارڈر بھی نہیں بج رہا تھا، کہیں سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی پھر آنکھیں کیسے کھلیں؟

انھوں نے بند دروازے اور کھڑکیوں کو دیکھا اور سر جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگے، مگر ان کے اندر بےچین لہریں مچل رہی تھیں' نہ جانے چاند میں کیا ہو رہا ہوگا ہمیں دیکھنا چاہیئے۔

وہ بستر سے پاؤں لٹکا کر سلیپر ڈھونڈنے لگے، مگر کیوں دیکھنا چاہیئے، دماغ نے سوال کیا تو انھوں نے پاؤں کھینچ لئے۔

اگر میں نے کوئی تبدیلی دیکھ لی تو دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاؤں گا، جواز خود بخود ذہن میں پیدا ہوا۔ وہ مجھے کریدیں گے اور میں فخر سے بتاؤں گا کہ .....

وہ بستر سے اتر کر ننگے پاؤں کھڑکی تک گئے اور دھیرے سے پٹ کھول دیا۔

چاند ہنس رہا تھا اور وہ دھبہ بھی متحرک ہو گیا تھا، ایک چہرہ، خونی آنکھیں، مڑے ہوئے نکیلے دانت اور سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا نصف چہرہ .....

خوف کی لہر ان کے ہونٹوں پر مضطرب ہو گئی۔

کیا ہوا؟ بیویاں گھبرا کر اٹھ گئیں، کیا بات ہے؟

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، خطرہ مجسم بن رہا ہے، ہمیں دیکھ رہا ہے۔

کیا بک رہے ہیں، کیسا خطرہ ... کس کا ڈر ...؟

دیکھو تم بھی دیکھو اور گواہ رہنا کہ صرف میں نے ہی نہیں تم نے بھی دیکھا تھا۔

کہیں کچھ بھی تو نہیں ہے، وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگیں' وہ تو شاید کتا بھاگ رہا ہے۔

میں تمھیں چاند دیکھنے کو کہہ رہا ہوں اور تم سڑک دیکھ رہی ہو۔

ہٹیئے بھی، اب ہماری عمر چاند اور چاندنی دیکھنے کی رہ گئی ہے، بچے بڑے ہو رہے ہیں۔

افوہ، تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، چاند سے ایک چہرہ جھانک رہا ہے۔

جھانکا ہی کرتا ہے، وہ مسکرانے لگیں۔ بچپن ہی میں دادی ماں نے بتا دیا تھا کہ چاند میں بڑھیا چرخا کاتتی ہے آپ اب دیکھ رہے ہیں۔
وہ چرخا کاتنے والی بڑھیا نہیں ہے، انھوں نے زچ ہو کر سر تھام لیا، وہ ایک خبیث کا چہرہ ہے انتہائی ڈراؤنا۔
پریشان لہجے اور چہرے کی وحشت سے وہ سنجیدہ ہو کر چاند دیکھنے لگیں، دیکھتی رہیں پھر پلٹ کر شوہر دل کو دیکھا اور ان کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا، چہرے پر تشویش کے سائے پھیل گئے۔
تم نے دیکھ لیا نا ——— ؟ انھوں نے پر شوق لہجے میں پوچھا۔
آپ پر ضرور آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ ان کے لہجے میں دبا دبا سا خوف تھا۔ چاند پہلے جیسا ہی ہے آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟
وہ دھم سے بستر پر گر گئے ——— تو اب ہماری ذہنی حالت مشتبہ ہو گئی۔
ایک تکلیف دہ سناٹے نے انھیں محصور کر لیا، عورتوں نے مزید الجھنوں سے بچانے کے لئے خموشی اختیار کر لی اور وہ اس سوچ میں ڈوب گئے کہ کیا واقعی ہم آسیب زدہ ہو گئے ہیں؟ ہماری نظریں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ دوسروں کو نظر کیوں نہیں آتا؟ جب ہم اپنی پرچھائیوں کو ہم خیال نہ بنا سکے تو دیوی کو کیسے مطمئن کریں گے؟ اور اگر اس خطرے کا تدارک نہ کیا گیا تو .....
بیویاں سو گئی تھیں مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، آخر کیا کریں، کس سے کہیں، کیا کہیں کہ اپنے احساسات کی ترجمانی اور مضبوط دلائل کے لئے الفاظ کے بھنڈار خالی تھے اور خطرہ مجسم بن رہا تھا اب کیا.....
تب ہی بیویوں کے حلق سے خرخراہٹ جیسی آواز نکلنے لگی جیسے ان کا گلا دبایا جا رہا ہو۔
وہ بستر سے اچھل پڑے، دلوں کی دھڑکنیں بڑھ گئیں، حلق سوکھنے لگے اور مساموں سے پانی پھوٹ پڑا۔
انھوں نے تڑپتی ہوئی بیویوں کو دیکھا اور لرزتے ہاتھوں سے شانے ہلائے۔
اٹھو... اٹھو... کیا بات ہے؟
خرخراہٹ کی آواز بند ہو گئی اور انھوں نے سرخ سرخ آنکھیں کھول دیں، کچھ دیر تک اپنے اوپر جھکے ہوئے چہروں کو اجنبی نظروں سے دیکھتی رہیں، پھر ان میں شناسائی کی چمک جاگی اور وہ بے اختیار گلوں میں باہیں ڈال کر سینوں سے چمٹ گئیں۔
بچائیے۔ مجھے بچائیے۔
وہ ان کی پشت سہلاتے رہے، ڈرو نہیں شاید تم نیند میں ڈر گئی ہو؟
نیند میں... مگر میں سوئی کہاں تھی، میں نے تو صرف آنکھیں بند کی تھیں اچانک کھڑکی کھلی اور چاند نظر آنے لگا، جس پر ایک بہت لمبے آدمی کا عکس لہرا رہا تھا، خدا کی پناہ اس کی لمبائی اور اس کا چہرہ... اس نے لرز کر سینے میں منہ چھپا لیا۔
پھر... پھر کیا ہوا؟ ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔
پھر وہ سایہ کہنے لگا، مجھے پہچانو، میں ہی تمہارے شوہر کو ڈرا رہا ہوں اور اب نیچے آ کر.... اس کے میلوں لمبے پاؤں دھرتی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ تمام رات جاگتے رہے، ہر آہٹ پر کان کھڑے کر لیتے، ذہن میں سوالوں کا ہنگامہ انھیں بے چین کئے ہوئے تھا۔
وہ ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟ ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے، ہم تو یہاں روزی روٹی کے لئے آئے ہیں، ہم نے کسی کی حق تلفی نہیں کی، زندہ رہنے کا سب کو حق ہے۔ ہم زندگی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں، ریگ زار میں خون سے سینچائی کر کے سبزی اگانے کی کوشش کیا جرم ہے؟
اور صبح ہوئی تو گمبھیر آواز فضا میں گونج رہی تھی اور وہ اندر ہی اندر سمٹے جا رہے تھے۔
وہ اپنے کمروں میں سوتے تھے کہ دروازے کھلے اور جس کو پایا اس کی شہ رگ دانت سے کاٹ دی، کوئی دیکھ نہ سکا پہچان نہ سکا، پڑوسیوں نے صرف گھرگھراہٹ کی دور ہوتی آواز سنی تھی۔

خوف کا پرندہ امرود اور شریفوں کی ڈالیوں پر بیٹھ چکا تھا، وہ حسرت بھری نظروں سے اپنے بچوں کو دیکھتے، بیویوں کو دیکھتے، شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو دیکھتے اور پھر دروازوں کو، کواڑ بند ہیں تو کیا ہوا؟ وہ جب چاہے گا آجائے گا اور پھر بچوں کی نظروں میں خوف میں لتھڑی ہوئی تصویر منجمد ہو جائے گی۔

ہم کیا کریں —— وہ سب ایک جگہ جمع ہوتے، کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ سب ایک ہی جیسی کیفیت سے دوچار تھے۔

اب آخری سہارا ہے، ہمیں دیوی سے ملنا چاہیے۔

دیوی —— ان کی جھکی ہوئی نظریں اوپر اٹھیں اور ان میں امید کی کرن پھوٹی، چلو جلدی چلو، یہ کام تو ہمیں پہلے ہی کرنا چاہیے تھا۔

کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا، دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں، زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر جنتر منتر کی کتابیں اور انسانی کھوپڑیاں سجی ہوئی تھیں، وہ گیروے رنگ کی ساڑی باندھے گلے میں بڑے دانوں کے رودرا کچھ کی مالا پہنے انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوئی منتر پڑھ رہی تھی۔

ان لوگوں کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں، چمکیلی آنکھیں جن میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔

میں جانتی ہوں تم کیوں آئے ہو، کچھ دیر تک ان کو دیکھنے کے بعد وہ بولی، اس کا لہجہ پرسکون تھا، میں نے خطرے کے تدارک کیلئے مؤکل بھیج دئے ہیں، جاؤ اطمینان سے کام کرو ... بس ...

اس نے پھر آنکھیں بند کر کے منتر پڑھنا شروع کر دیا اور جب وہ اپنی بند مٹھی آگ پر کھولتی تو بھک کی آواز کے ساتھ دھوئیں کے مرغولے اٹھنے لگتے۔

وہ لوٹے تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی، اب ہمیں بے فکر ہو جانا چاہیے کہ مؤکل جا چکے ہیں، وہ آسیب کو گھیر لیں گے اور ...

ہمیں یقین تھا کہ دیوی غافل نہ ہو گی، انھوں نے بیویوں سے کہا، اب دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے کی ضرورت نہیں کہ آسیب ادھر کا رخ نہیں کرے گا، وہ گھیرا جا رہا ہے، بہت جلد اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مگر بہت سے دن گزر گئے، گمبھیر آواز کانوں میں زہر انڈیلتی رہی، حادثوں کی خبریں ملتی رہیں، خوف و ہراس پھیلاتی رہیں، انکی امید بھری نظریں مؤکلوں پر مرکوز تھیں جو حیران و پریشان اس پناہ گاہ کو دیکھ رہے تھے جس تک ان کی رسائی نہ تھی، لکشمن ریکھا پار کرنا ان کے بس میں نہ تھا اور نہ جانے کب کیسے وہ پناہ گاہ سے نکلتا اور شکار کو دبوچ کر اس کی شہ رگ کاٹ دیتا، جب تک مؤکل چیخ پر ہوشیار ہوتے وہ قہقہہ لگاتا ہوا غائب ہو جاتا۔

گلیوں اور شاہراہوں پر موت کے سائے پھیل گئے، کھیت کھلیانوں میں بھوت رقص کرنے لگے، کل کارخانوں کو نیند آنے لگی اور خوف کا پرندہ ان کے سروں کا چکر لگاتا ہوا چیخ رہا تھا —— مگر انھیں باہر نکلنا پڑتا کہ بچوں کے لئے سبزیوں کی ضرورت تھی اور سبزیاں بازار میں ملتی ہیں گھر سے نکلتے وقت وہ بچوں کو غور سے دیکھتے، نہ جانے پھر دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو، اور عزیزوں کی نظروں میں حسرت ہوتی، کہیں یہ آخری سفر نہ ہو۔

دیوی کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں، آگ پوری طرح پھیل گئی ہے، شعلے دروازے اور کھڑکیوں کو چھو رہے ہیں، سڑکوں، گلیوں اور کھیتوں میں کچلی ہوئی لاشیں سڑ رہی ہیں اور کسی بھی وقت آخری دھماکہ ہو سکتا ہے۔

تب اس نے اپنی بند آنکھیں کھولیں، عمل پورا ہو چکا تھا، کچھ دیر تک سرخ انگاروں کو گھورتی رہی، شعلوں کا عکس اس کے چہرے کو گلنار بنا رہا تھا، پھر اس نے اپنی بند مٹھیوں کو کھول دیا۔

تب اس نے تالی بجائی اور دراز قد مؤکل حاضر ہوا۔

سنو، پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، اب ضروری ہے کہ لکشمن ریکھا کو پار کر کے پناہ گاہ پر قبضہ کیا جائے، اب تمہارے عمل کا وقت شروع ہوا ہے، جاؤ اور سب کچھ فنا کر دو۔

اور تب لوگ گھروں سے نکل کر چائے خانوں اور پان کی دوکانوں پر گئے تھے اور گمبھیر آواز سے خوش خبری کا انتظار کرنے لگے، ایک دن۔ دو دن۔ تین دن ...

پھر ان کے سینوں میں رکی ہوئی سانس ایک چیخ کے ساتھ باہر آگئی۔ وہ ناچنے لگے، گانے لگے، دیوی کی پوجا کرنے لگے۔

ہم بچ گئے، ہم زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، آسیب کا خاتمہ ہوگیا، اب ہم سکون سے سوسکیں گے، دیوی ماں زندہ باد...

اس رات انہیں نیند نہیں آئی، خوشی کے اظہار کے سارے ذرائع ختم ہو گئے تھے مگر ان کی طبیعت نہیں بھری، وہ جشن منا رہے تھے۔

مگر دوسری صبح خبر ملی، بہت سے مؤکل پاگل ہو گئے ہیں اور اس طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

رات ایک طویل القامت سایہ ان کے خیموں پر لہرایا تھا اور ان کے دماغ الٹ گئے اور انھوں نے اپنے چیف کو مار ڈالا۔

پھر دوسری جگہ سے ایسی ہی خبر آئی، پھر تیسری، پھر چوتھی۔

ہر جگہ سے تصدیق ہوئی تھی کہ اندھیری رات میں بھی وہ ہیولا صاف نظر آرہا تھا جس کی پیشانی سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور جس خیمے پر اس کا سایہ پڑتا وہاں کے مؤکل پاگل ہو جاتے۔

پھر وہ پردیس میں ظاہر ہوا اور پاگلوں نے ایک تنظیم بناکر دیوی کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔

پھر وہ اڑتے ہوئے جہازوں میں نمودار ہونے لگا اور جہازوں کے رُخ بدل گئے۔

پھر وہ منہدم پناہ گاہ کے پاس لاکھوں کے اجتماع میں ظاہر ہوا اور اس کی جے جے کار ہونے لگی۔

پھر وہ تین آنکھوں والوں کے گھروں میں نمودار ہوا اور ان کا شعور سو گیا اور لاشعور میں چھپے راز طشت از بام ہو گئے۔

سازش کیا تھی؟ قصور کس کا تھا؟ ہوس کیا ہوتی ہے؟

وہ دیکھ رہے تھے کہ ہوا سے راکھ اڑ رہی ہے اور راکھ کے نیچے دبی چنگاریاں شعلے بن رہی ہیں، راہیں پرخطر ہو رہی ہیں، دروازے غیر محفوظ ہو رہے ہیں اور خوف کا پرندہ بھی اڑانیں کرنے لگا ہے۔

وہ سوچ رہے تھے، کچی ہوئی لاشوں کے زخم ہرے ہو گئے تھے، عظمت کا بت ٹوٹ رہا تھا، یقین کی دیواریں منہدم ہو رہی تھیں، ڈرامے کے انجام سے پردہ اٹھ رہا تھا۔

وہ سوچ رہے تھے اور ان کی نظروں کے سامنے سے تصویریں گزر رہی تھیں۔

عزیزوں کی لاشوں کی تصویر... آسیب کی تصویر... دیوی کی تصویر...

دیوی کی تصویر... آسیب کی تصویر...

دیوی کی تصویر، جس کے آنچل سے انگیٹھی کے شعلے لپٹ چکے ہیں۔ ■■

بقیہ صفحہ ۱۲۔ گیس چیمبر

اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ہوئی لاشیں۔

میرا سانس رک رہا ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے

زہریلی گیس میرے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔

اب میں مرنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ جینے سے بڑی کوئی سزا نہیں ہے ■■

بقیہ صفحہ ۱۴۔ اردو تحقیق موضوع و مسائل

یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کرنے والے عام طور پر تنقیدی مطالعہ کے دائرہ سے باہر نہیں آتے جبکہ تحقیقی تنقید عام تنقید سے مختلف ہوتی ہے تنقیدی طریق رسائی کی ضرورت ادبی مطالعوں میں ان کی کوئی بھی سطح ہو ضرور پیش آئے گی لیکن اس تنقید کے استخراجی نتائج سے استقرائی نتائج کی طرف بڑھنا ہے جو خود اپنی جگہ ایک ادبی دریافت اور علمی بازیافت ہوتی ہے۔ ■■

مظفر حنفی

(۱)

جام دیا ہے چوم کر اور سرور بڑھ گیا
خون میں پھول کھل گئے، آنکھ میں نور بڑھ گیا

خوب اُڑا ایسا غبار، گھوم چکے ہر اک دیار
فائدہ دل کو کچھ نہیں، درد ضرور بڑھ گیا

ہاتھ خطا کا تھام لے، عفو و عطا سے کام لے
بندش و احتساب سے، جرم و قصور بڑھ گیا

اُس نے نگاہ پھیر کر، راستہ دے دیا مجھے
بوجھ وہیں اتار کر میں بھی حضور، بڑھ گیا

حال مظفر آپ کا، غیر تھا یوں ہی عشق میں
اور بنامِ شاعری، اک فتور بڑھ گیا

(۲)

یہ لہجہ، وہ تاثیر۔ پہچان کر — مظفر نہیں میر۔ پہچان کر
جنوں کے بلاوے پہ وحشی ترے — چلے آئے زنجیر پہچان کر
شکاری پڑے ہیں شش و پنج میں — اٹھاتے ہیں نخچیر پہچان کر
عجب چیز ہے جذبۂ عشق بھی — سپر ہے کہ شمشیر پہچان کر
نشانہ غلط ہے۔ مگر فرضِ دل — تڑپنے لگا تیر پہچان کر
پلک پر ستارے لرزنے لگے — لفافے کی تحریر پہچان کر

رسالے سے غزلیں تراشی گئیں
مظفر کی تصویر پہچان کر

(۳)

یوں تو دنیا کی نظر نان و نمک پر ہوگی — نیّت اپنوں کی مرے باغِ فدک پر ہوگی
زخم کو یوں ہی ہرا رکھیو کرائے کرمکِ شب! — اک زمانے کی نظر تیری چمک پر ہوگی
ہم کو برسات نے محروم رکھا ملنے سے — سات رنگوں کی ملاقات دھنک پر ہوگی
روشنی کے تو میاں چند ہی سرچشمے ہیں — وہ کہیں نوکِ قلم شاخِ پلک پر ہوگی

شہر میں کل سے صفائی کی مہم جاری ہے
کوئی لڑکی تھی؟ کسی اور سڑک پر ہوگی

(۴)

کیا کرتا میں، ہم عصروں نے تنہا مجھ پر چھوڑ دیا
سب نے بوسہ دے کر سچ کا بھاری پتھر چھوڑ دیا
ڈھیلا پڑتا تھا سُولی کا پھندا اُس کی گردن میں
میرے قاتل کو منصف نے فدیہ لے کر چھوڑ دیا
دریا کے رُخ بہنے والی مچھلی مُردہ مچھلی ہے
اس کشتی کی خیر نہیں ہے جس نے لنگر چھوڑ دیا
شعلوں کی اس ہمدردی پر دل میں لاوا اُبلتا ہے
جب ساری بستی پھونکی تھی کیوں میرا گھر چھوڑ دیا
سورج نے بھی سوچ سمجھ کر جال بچھائے کرنوں کے
شبنم شبنم ڈاکہ ڈالا اور سمندر چھوڑ دیا
سارا گھر سوتا ہے، دو گھنٹے میں آئے گا اخبار
آج مظفر پانچ بجے ہی کیسے بستر چھوڑ دیا

● ۳۵۸ ٹبلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

تشنہ فریاد

ڈاکٹر ستیہ پرکاش سنگر ● ۳۰۱۲ - سیکٹر ڈی - ۲۸ - چنڈی گڑھ

یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا کمرہ۔ بھاری بھرکم جسم کے مالک لالہ مالک رام، جرمن سے منگوائی گئی اسپرنگ والی ریوالونگ کرسی پر ڈٹے ہوتے ہیں۔ ناروے سے خریدی ہوئی شاندار میز کے سرے پر فائلیں پڑی ہیں۔ دائیں ہاتھ پر گودریج کا ریک دھرا ہے، اس پر بھی فائلیں سجی ہوتی ہیں۔ سامنے دیوار پر راشٹرپتی، اُپ راشٹرپتی اور پردھان منتری کی بڑی بڑی تصاویر لٹک رہی ہیں۔ کمرے کے بیچ دو نئے قیمتی صوفہ سیٹ ہیں اور درمیان میں پڑی چھوٹی میز پر طشتریوں میں سجے بسکٹ، کاجو کشمش، بادام گری، برفی، گلاب جامن اور رس گلّے رکھے ہیں۔

چپراسی: (کمرے کے اندر آکر) صاحب! آپ سے ملنے کے لئے سر پر لمبی چوٹی رکھے ایک پنڈت جی آئے ہیں۔

وی۔سی: میرے پاس ہر کسی سے ملنے کا وقت نہیں ہے۔

نووارد: (کمرے کے اندر گھستے ہوئے) لیکن مجھ سے ملنے کے لئے وقت دینا ہی ہوگا۔

وی۔سی: (ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے) آپ کے لئے بلا اجازت اندر آنا مناسب نہیں تھا۔ آپ کی تعریف؟

نووارد: میرا نام نارد ہے۔

وی۔سی: اوہ! نارد مُنی! بیکنٹھ کے واسی۔ یہاں پدھارنے کی کیونکر زحمت گوارا کی؟

نووارد: بھارت کی یونیورسٹیوں کے خلاف برہما جی کے پاس شکایتوں کے انبار لگے ہیں۔ صوبہ پرستی، فرقہ پرستی، اقربا پسندی، اِن ڈسپلن اور کرپشن کے بیسیوں چارج ہیں۔ ان کی جانچ کرنے، حالات کا جائزہ لینے، اور ان پر رپورٹ پیش کرنے کے لئے، برہما جی نے مجھے بھیجا ہے۔

وی۔سی: تو یہاں ہی کیوں تشریف لائے؟

نارد: فی الحال بڑے بڑے تعلیمی اداروں کا جائزہ لیا جائے گا۔ ہاں۔ برہما جی کا آدیش ہے کہ سوالات کا جواب دینے میں آپ راست گوئی سے پیش آئیں گے اور دروغ گوئی نیز غلط بیانی کو نزدیک بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔

وی۔سی: لیکن .....

نارد: لیکن ویکن کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے، جب تک میں یہاں بیٹھا ہوں، کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔

وی۔سی: میرا اسٹینو بھی نہیں؟

نارد: وہ بھی نہیں۔ بات چیت کو ریکارڈ کرنے کے لئے میرے پاس اپنا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ یہاں سے گئے ہوئے سائنس دانوں نے ماڈرن سائنس کی جدید ترین تحقیقات سے جنت نشینوں کو بھی مستفید کرا دیا ہے۔

وی۔سی: تو میں اپنے انٹرنل فون پر اپنے سکریٹری کو آگاہ کئے دیتا ہوں۔

(فون کا سوئچ آن کر کے) مسٹر گنگن لال! ایک گھنٹہ کے لئے سبھی انٹرویوز بند ہیں۔ یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں (سوئچ آف کرتے ہیں)

ہاں، مہاراج! شروع کیجئے۔

نارد : آپ کا نام ؟

وی.سی : مالک رام ۔ مالک رام ورما۔

نارد : اپنے نام کے ساتھ مذہب، ذات یا گوتر کا دُم چھلا لگانا سیکولرازم کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہیں ؟

وی.سی: ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ لیکن پر دھان منتری سے لے کر پٹواری تک ہر کوئی دُم چھلا لگانا فخر گردانتا ہے۔ ہر صوبے کے ہر منتری کے نام کے پیچھے شکلا، مشرا، شرما، ورما، اگریوال، گل، ماتھر، شری واستو، ملہوترا اور مہرا لگا ہوگا۔ نارد جی! یہ پُرا نا روگ جڑ پکڑ گیا ہے۔ یہی حال افسران کا بھی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہی معمول ہے۔

نارد : آپ تعلیم یافتہ ہیں ؟

وی.سی: اس کے بغیر اتنے عظیم تعلیمی ادارے کی صدارت کے فرائض کیسے دے سکتا ہوں ؟

نارد : آپ کی کوالیفکیشن ؟

وی.سی: بی۔ اے لندن۔

نارد : لندن! بی اے کی ڈگری تو بھارت میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

وی.سی: یہاں حاصل نہ کرسکا، وہاں جاکر خرید لی۔

نارد : یہ میں کیا سُن رہا ہوں! آپ نے ڈگری خریدی اور وہ بھی بی۔ اے کی!

وی.سی : اس سے بڑی ڈگری کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

نارد : لیکن یونیورسٹی میں پڑھانے والے معلّم ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔

وی.سی: ہوتے رہیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے ؟ صوبوں پر حکومت کرنے والے منسٹر اور صوبائی اسمبلیوں کے قانون ساز ممبران اکثر ان پڑھ ہوتے ہیں وہ تعلیمی اداروں پر بھی حکومت کرتے ہیں۔ جب منسٹروں، چیف منسٹروں اور ممبرانِ اسمبلی کے لئے اعلیٰ تعلیمی ڈگریوں کی ضرورت نہیں تو بے چارے وائس چانسلر کے لئے اِن کی کیا خاص اہمیت ہے ؟

نارد : اس لئے کہ اسے اعلیٰ ڈگری یافتہ لوگوں سے رابطہ پڑتا ہے۔

وی.سی: اسی وجہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ناکام ثابت ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ کامیابی نیز چالاکی سے کام کرنے کے لئے مجھ سا شخص ہی مناسب ثابت ہوتا ہے۔

نارد : آپ کی دیگر کوالیفیکیشنز کیا ہیں ؟

وی.سی: کچھ خاص قابلِ ذکر نہیں۔ سب سے پہلے میں نے پرائمری اسکول میں مدرّسی کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر مڈل اور ہائی اسکول میں پڑھانے لگا۔ کئی سالوں کے بعد ایک انٹر کالج اور بعدازاں ایک ڈگری کالج میں لیکچرار مقرر ہوا۔ اسی دوران سیاست کے میدان میں پوری سرگرمی دکھلاتا رہا۔ یونیورسٹی کی سیاست میں حصّہ لیتا اور بہت سی کمیٹیوں کا ممبر بنا۔ اب میں ایک پرائیویٹ کالج میں پرنسپل مقرر ہوگیا۔

نارد : کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے آپ کی کامیابی کا کیا راز تھا ؟

وی.سی: میری اپنی سی۔ آئی۔ ڈی ۔

نارد : پرنسپل کے لئے کالج کے اندر سی۔ آئی۔ ڈی ؟

وی.سی: باہر بھی۔ کالج کے پروفیسران ایک دوسرے پر نگرانی رکھتے اور ایک دوسرے کی نقل و حرکت کی مجھے خبر دیتے۔

نارد : کالج کے پروفیسران ایسا کام کرتے ہیں ؟

وی.سی : جی جناب۔ سب کے لئے ہفتے میں دِن اور ٹائم مقرر تھا جب وہ لوگ مجھے ملتے اور ہر قسم کے واقعات اور بات چیت سے مجھے باخبر رکھتے۔ لنچ اور ڈنر کی ہوئی ساری باتوں کی تفصیل سے مجھے آگاہ کرتے۔ میرے خلاف کی گئی ہر بات سے مجھے مطلع کرتے۔

نارد : علاؤالدین خلجی کے جاسوسی محکمہ کی طرح ؟

وی سی: شاید اس سے بھی زیادہ۔ مجھے ہر بات کی فوراً خبر مل جاتی۔

نارد : اس سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا ؟

وی سی: انہیں اپنے آفس میں بلا کر جب میں اُن کے خفیہ رازوں کا انکشاف کرتا تو وہ ششدر رہ جاتے۔ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنے کے لئے طرح طرح کے بہانے تراشتے۔ میرے شکوک کو رفع کرنے کے لئے اپنی وفاداری کی قسم کھاتے۔ قصہ کوتاہ وہ میرے گرویدہ بن جاتے۔ کالج نیز یونیورسٹی کی ماتحتی میں میری لیڈری قبول کرتے، ہر کام میں میری سرپرستی کو تسلیم کرتے۔ نتیجہ کے طور پر یونیورسٹی کی سیاست میں میرا اپنا مضبوط گروپ قائم ہو گیا اور وہاں میرا اقتدار جم گیا۔

نارد : آپ کے لیکچرارز جاسوسی ہی کرتے تھے۔ پڑھاتے نہیں تھے ؟

وی سی: جاسوسی کا کام پڑھانے کے علاوہ تھا جس کے لئے انھیں معقول معاوضہ ملتا تھا۔

نارد : کیا ؟

وی سی: کالج کے پرنسپل کے پاس ماتحت اسٹاف کو عوضانہ دینے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ ان کی سروس کے سبب میرے کام ہلکے ہو جاتے۔

نارد : اور آپ کو پڑھنے پڑھانے کے لئے کافی وقت مل جاتا ہوگا۔

وی سی: کالج کا پرنسپل اس قسم کی فضول ذمہ داریوں سے مبرّا ہوتا ہے۔

نارد : پڑھنا پڑھانا فضول ذمہ داریوں میں شامل ہے ؟

وی سی: پرنسپل کے لئے۔ اتنے اساتذہ بھی کام تو کرتے ہیں۔ اسی کام کی تنخواہ پاتے ہیں۔

نارد : اور آپ کیا کرتے ہیں ؟

وی سی: کالج کو چلانے کے علاوہ میں سیاست میں حصّہ لیتا۔ یونیورسٹی اور صوبے کی سیاست میں۔

نارد: چناؤ لڑتے تھے؟

وی سی: لڑاتا تھا۔ چناؤ سے پیشتر امیدوار کی مدد کرتا، بعد ازاں بمعہ سود قیمت وصول کرتا۔ ساتھ ہی صوبے کے چیف منسٹر نیز دیگر وزرا کو خوش رکھتا اور ان کے اشاروں پر ناچنے میں فخر محسوس کرتا۔

نارد : اتنے موٹے جسم کے ساتھ بھی آپ ناچ پاتے ؟

وی سی: ہاں جی۔ جسم ساکن رہتا، من ناچتا۔ نارد جی ! ساری سیاست ہی ناچنے نچانے کا کھیل ہے۔

نارد : مثلاً۔

وی سی: مثلاً ایک منسٹر کے اشارہ پر میں نے علاقائی زبان کا مسئلہ اٹھا کر ایک زبردست آندولن شروع کیا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ جیل گیا۔ معاملہ ہاتھ سے نکل جانے اور حالات کے دگرگوں ہونے پر چیف منسٹر نے آدھی رات کے وقت مجھے اپنے بنگلے پر بلایا اور پبلک میں معافی مانگنے نیز آندولن واپس لینے کا مشورہ دیا۔

نارد : آپ نے اس مشورے کو ماننے سے انکار کر دیا ہوگا۔

وی سی: میں نے اسے فوراً مان لیا۔ آندولن بند ہو گیا۔

نارد : لوگ آپ سے بے حد ناراض ہوتے ہوں گے ؟

وی سی: ضرور ہوتے۔ لیکن پبلک ناراضی کی کون پرواہ کرتا ہے ؟ پبلک یادداشت دیرپا کہاں ہوتی ہے ؟

نارد : پبلک کا ذہن لوگوں کے ساتھ اس طرح کی دھوکہ بازی سے آپ کو کیا حاصل ہوا ؟

وی سی: وائس چانسلری !

نارد : غدّاری کا عوضانہ ؟

ڈی سی : سروس کا صلہ۔ مُنی جی مہاراج ! ہم کلجگ میں نہیں۔ کریگ میں رہ رہے ہیں۔ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔ یہاں سودا دست بدستی ہے۔ کوئی دیر نہیں، کوئی اندھیر نہیں۔ ہماری دنیا میں ہر شے کی قیمت چکانی ہوتی ہے۔

نارد : وائس چانسلری کے لئے بھی ؟

ڈی سی : ہر پوسٹ کے لئے۔ مغلوں کے زمانے میں صوبے کی گورنری اور ضلع کی فوجداری مول بکتی تھی اور اسی طرح باقی عہدے بھی۔ افسران بادشاہ کو قیمت چکاتے اور پبلک سے وصول کرتے۔

نارد : لیکن اب تو جمہوری دور ہے۔

ڈی سی : لچک دار۔ لچیلا۔ حالات کے مناسب رنگ اختیار کرنے والا۔

نارد : بڑی بڑی اسامیوں کے لئے قیمت چکانی ہوتی ہے ؟

ڈی سی : چھوٹی اسامیوں کے لئے بھی۔

نارد : تو آپ نے بھی قیمت وصول کی ؟

ڈی سی : پوری۔

نارد : کتنے سال کے لئے ڈی۔سی مقرر ہوتے ؟

ڈی سی : تین سال کے لئے۔

نارد : تین سال کب پورے ہو رہے ہیں ؟

ڈی سی : چھ سال قبل پورے ہو چکے۔ دو بار توسیع مل چکی ہے۔

نارد : اس کے لئے بھی قیمت چکانی پڑی ؟

ڈی سی : آپ درست فرماتے ہیں۔

نارد : چیف منسٹر کو ؟

ڈی سی : نئے بوس کو۔

نارد : براہِ راست

ڈی سی : وساطت سے۔

نارد : کس کی ؟

ڈی سی : اس کی بیوی کی۔

نارد : قیمت کس شکل میں ادا کی ؟

ڈی سی : قیمتی تحائف کی شکل میں۔ نقد بھی

نارد : وہ ناراض تو نہ ہوئیں ؟

ڈی سی : قیمتی تحائف نہ ملنے پر۔

نارد : قیمتی تحائف سے آپ کی مراد سونے سے زیورات سے ہے ؟

ڈی سی : ہیروں سے جڑے ہوتے۔

نارد : آپ انھیں کہاں سے لیتے ؟

ڈی سی : اپنے ماتحتوں سے۔

نارد : اور وہ ؟

وی بی : اپنی جیب سے۔

نارد : وہ ایسا کیوں کرتے ؟

وی بی : ترقی پانے کے لئے۔ بھائی بھتیجوں کو ملازمت دلوانے کے لئے۔

نارد : تو یونیورسٹی بھائی بھتیجوں ہی سے پُر ہے ؟

وی بی : اور نہیں تو کیا دشمنوں سے پُر ہوگی ؟

نارد : کیا آپ کے ماتحت اور دوسرے لوگ آپ کو کُھلم کُھلا تحائف پیش کرتے ہیں ؟

وی بی : بیوی کس مرض کی دوا ہوتی ہے ؟ اس کے لئے دوسرا کیا کام ہوتا ہے ؟

نارد : وہ تحائف کو واپس نہیں کرتی ؟

وی بی : محض گھٹیا اور کم قیمت والے تحائف کو۔

نارد : اشیائے خوردنی کس زمرے میں شامل ہیں ؟

وی بی : خود اپنے زمرے میں۔

نارد : کیسے ؟

وی بی : آج کل زمانہ آٹے، دال اور گھی دودھ کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ لہٰذا یہ اشیا معمولی نہیں گردانی جاتیں۔

نارد : تو آپ انھیں بھی قبول کر لیتے ہیں ؟

وی بی : میں نہیں میری گھر والی۔

نارد : آپ کی رضامندی ہی سے ؟

وی بی : دیکھئے مہاراج اگر کوئی شخص آکر یہ کہے کہ وہ گیہوں اور چاول اپنے کھیت سے، دودھ گھر کی بھینس کا اور گھی اس کے دودھ سے لایا ہے اور ان اشیا کو بڑی عاجزی اور انکساری سے بھینٹ کرے اور آپ اسے نامنظور کر دیں، تو اس غریب کی کتنی دل شکنی ہوگی۔

نارد : تو آپ لوگ ان اشیا کو رحم دلی کے جذبے سے محرک ہو کر قبول فرماتے ہیں ؟

وی بی : ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ خود غرضی کے زیرِ اثر ایسا کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہر روز ہمیں چار کلو دودھ بھیجتے اور کہتے کہ ان کی اپنی بھینس کا ہے، حالانکہ وہ بکری تک پالنے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ اُن کے پڑوس کی بیوی، گوالوں کے محلے میں جا کر اپنے سامنے نکلوا کر چھ کلو تازہ دودھ لاتی اور اس میں سے گھی بنا کر ہر ہفتہ ہمیں بھجواتی حالانکہ ان کی اپنی دودھ کی کھپت دو کلو روزانہ سے زائد نہ تھی۔ یہی حال دوسرے لوگوں کا ہے۔

نارد : آپ ان فالتو اشیا کو کیا کرتے ؟

وی بی : زائد اشیا کو اپنی لڑکی کے گھر بھجوا دیتے۔

نارد : اس کے باوجود بھی اگر بچ جائیں تو ؟

وی بی : انھیں بازار میں بیچ دیتے ہیں۔

نارد : شیو۔ شیو۔ شیو۔ بازار میں بیچ دیتے ہیں !

وی بی : نارد جی ! آپ لوگ اتنے بڑے رشی ہو کر ایک سادھارن سی بات کو نہیں سمجھتے۔ بھارت کی پراچین روایات کے مطابق بڑے آدمیوں سے ملنے کوئی خالی ہاتھ تو نہیں جاتا۔ مغلوں کے زمانے میں بادشاہ سلامت سے ملنے کے لئے تحفہ پیش کرنا ضروری تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین بادشاہ کو پیش کش کے طور پر دینے کے لئے انگلینڈ سے تحائف منگواتے۔ پیش کش لفظ ہی انگریزی لغت کا جزو بن گیا تھا۔

نارد : تو اس زمانہ کا وائس چانسلر بھی مغل اعظم ہے ؟

دی سی : کیوں نہ ہو ؟ وہ ایک معمولی سلطنت پر حکمرانی نہیں کرتا۔ اس کے وسیع اختیارات ہیں۔ اس سے ملنے کے لئے ملاقاتیوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ اُن میں سے بیشتر مطلب برآوری کے لئے آتے ہیں اور کبھی خالی ہاتھ تو نہیں آتے۔ اکثر وہ مٹھائی کے ڈبے لاتے ہیں، پھلوں کی پیٹیاں لاتے ہیں۔ ان اشیاء سے گھر کا بڑا کمرہ بھر جاتا ہے۔ چیزوں کی بہتات سے دل اکتانے لگتا ہے۔ کمرے نیز من کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے ان اشیاء کا نپٹارا کرنا لازم ہو جاتا ہے حلوائی کو بلا کر مٹھائی اور پھل فروش کے ہاتھ پھل بیچ دیے جاتے ہیں۔

نارد : شِو۔ شِو۔ شِو۔

دی سی : مہاراج ! کیا بھولی بات کرتے ہیں ! میری سمجھ دار پتنی تو تصویروں کے فریم اور شیشے تک بیچ دیتی ہیں۔

نارد : فریم اور شیشے ؟

دی سی : سال کے اندر سینکڑوں فوٹو کھینچے جاتے ہیں۔ فریم اور شیشے باہر پھنکوانے کے بجائے بیچنے میں کیا حرج ہے ؟ پھر آپ جانتے ہیں کہ رُوحانی جذبات سے پرے اس دیش کی ناریاں عملی رجحان کی مالک ہوتی ہیں۔ کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتیں۔

نارد : تو عملی رجحان کی مالک آپ کی شریمتی جی یونیورسٹی کی اسامیوں کے تقرر میں تو دخل نہیں دیتیں۔ ؟

دی سی : دراصل یہ کام وہی انجام دیتی ہیں۔

نارد : پروفیسران کے تقرر کا کام بھی ؟

دی سی : جی جناب۔

نارد : امیدواروں کی کوالیفکیشنز پر دھیان نہیں دیا جاتا۔

دی سی : اتنی فرصت کسے ہوتی ہے مہاراج ؟

نارد : بڑے ظلم کی بات ہے ! اتنی ذمہ دار پوسٹ پر سرفراز ہو کر بھی سلیکشن کے وقت آپ امیدواروں کی کوالیفکیشنز کو نظرانداز کر دیتے ہیں !

دی سی : اس میں ظلم کی کون سی بات ہے ؟ بڑی سیدھی سادھی بات ہے۔ ایک شخص کے پاس زیادہ کوالیفکیشنز ہیں۔ دوسرے کے پاس کم ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی جیب سے آٹھ دس ہزار خرچ کرتا ہے۔ تو اسی کا پلّہ بھاری ہوا نا ؟ یہ تو سادہ اور سادھارن گنتی کی بات ہے جسے معمولی پڑھا لکھا شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ترجیح تو پیسہ خرچ کرنے والے کو دی جائے گی چاہے وہ پیسہ سلیکشن کمیٹی کے کسی معزز رکن کی نذر ہو، یا میری بیوی کی۔

نارد : اور جس کے پاس اتنا پیسہ نہ ہو ؟

دی سی : وہ جائے جہنم میں۔ کسی اور جگہ دوسری پوسٹ کے لئے کوشش کرے۔ آخر کار دنیا کے سبھی لوگ تو پروفیسر نہیں بنتے۔ ان لوگوں کی گنتی ہی محدود ہوتی ہے۔ پھر ہم لوگوں نے سبھی امیدواروں کو جذب کرنے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے۔

نارد : لیکن وائس چانسلر کو تو ہمیشہ غیر جانبدار اور ایماندار ہونا چاہئے۔ پروفیسران کے تقرر میں غیر جانبداری برتنی چاہئے۔

دی سی : ضرور برتنی چاہئے۔ میں بھی اپنے بھاشنوں میں یہی اُپدیش دیتا ہوں۔ لیکن علامہ اقبال کی طرح میں بھی گفتار کا غازی ہوں۔ کردار کا غازی پہلا ہی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصلیت اور آدرش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں نے ہماری صحیح رہنمائی کر کے ملک پر بھاری احسان کیا ہے۔ خوب بلند آدرش کی باتیں کرو لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے کا خیال ترک کر دو۔ آدرش کو بھول کر بھی حقیقت مت سمجھو۔

نارد : حقیقت کیا ہے ؟

دی سی : یہ کہ دی سی کی پوسٹ سیاسی پوسٹ ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ ڈگریوں کی نہیں، دوسرے اوصاف کی ضرورت ہے۔ اس پوسٹ پر ڈٹے رہنے کے لئے اوصافِ حمیدہ کی ضرورت ہے۔ یہاں نہ ریسرچ کام آتی ہے، نہ ریسرچ کی ڈگریاں۔ یہاں محض تکڑم کی حاجت ہے۔ پوسٹ ہتھیانے میں، اسے برقرار رکھنے میں تکڑم ہی خاص ہتھیار ہے۔ جن سیاسی رہنماؤں کی بدولت اس پوسٹ پر سرفراز ہوئے، یونیورسٹی

کے جملہ تقررات میں ان کی سفارش کو تسلیم کرنا ہمارا فرضِ اوّلین بن جاتا ہے۔ ایسا نہ کرنا، ناحق خطرہ مول لینے کے مترادف ہے۔

نارد : لیکن آپ تو فرما رہے تھے کہ تقررات میں بیوی کا ہاتھ ہوتا ہے۔

وی سی : میں کب انکار کرتا ہوں؟ بیوی کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ سارا حساب کتاب اسی کے پاس ہوتا ہے۔ اب مجھے کیا خبر کہ کس شخص نے کتنی بھینٹ چڑھائی ہے۔ پھر رشتہ داروں کو بھی خوش رکھنا پڑتا ہے۔

نارد : کوئی مجبوری نہیں۔

وی سی : کیسے نہیں؟ اس دن بیوی کا ماموں زاد بھائی، بڑی تنخواہ پر، پروفیسر کی پوسٹ کے لئے بضد ہو گیا۔

نارد : آپ نے کیا کیا؟

وی سی : جو بیوی کو منظور تھا۔

نارد : پوسٹ کے لئے کوالیفائڈ تھا۔؟

وی سی : اگر ہوتا تو یہاں کیوں آتا؟

نارد : مناسب کوالیفیکشنز کے بغیر آپ نے اس کا تقرر کیسے کیا؟

وی سی : سلیکشن کمیٹی کی سفارش پر۔

نارد : کمیٹی کس نے نامزد کی؟

وی سی : میں نے۔

نارد : ممبران بھی رشتہ دار ہوں گے؟

وی سی : ایکسپرٹ لوگ۔

نارد : انھوں نے سارا فیصلہ آپ کے اشارے پر کیا ہوگا؟

وی سی : آپ جو سمجھیں۔

نارد : یونیورسٹی میں شور نہیں مچا؟

وی سی : یہاں کس بات پر شور نہیں مچتا؟ وی سی کو اس شور کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ رہنا اور اسے جذب کرنا ہوتا ہے۔

نارد : اور کسی خاص بات پر بھی شور مچا؟

وی سی : کیوں نہیں؟ میری لڑکی کے نتیجہ پر۔ اس کے ایم۔ اے میں اٹھانوے فی صد نمبر آئے اور ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

نارد : بی۔ اے میں اس کے کتنے نمبر تھے؟

وی سی : تھرڈ کلاس۔ میٹرک میں بھی۔ لیکن پہلے امتحانات کے ساتھ موازنہ کرنا، اسٹوڈنٹ کے ساتھ ناانصافی ہے۔

نارد : الزام کیا لگایا گیا؟

وی سی : کہ لڑکی کی آنسر بک بعد میں دی گئی۔ ڈپٹی رجسٹرار ہوائی جہاز میں ممتحن کے پاس گوہاٹی پہنچا اور اسے بھاری رشوت دے کر اس کے مارکس کو بڑھایا گیا۔ یہی نہیں ان لوگوں نے اخبارات میں کاپی کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بھی چھپوا دیں۔

نارد : تب تو چارج معقول تھا۔ ایسے سنگین الزام کے بعد آپ کو فوراً مستعفی ہو جانا چاہئے تھا۔

وی سی : یہی تو وہ لوگ چاہتے تھے۔ لیکن میں کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ استعفیٰ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شور شرابہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ معاملہ اپنے آپ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

نارد : ڈپٹی رجسٹرار کو آپ نے ضرور سزا دی ہوگی۔

وی سی : اسے پروموشن دے کر رجسٹرار بنا دیا۔

نارد : اس پر اور بھی شور مچا ہوگا۔

وی.سی: ضرور مچا۔ لیکن ہمارا رجسٹرار ڈھولک پر کاش بھی پورا ڈھولک ہے۔ نعرہ باز، مخالف مظاہرین کے مقابلہ پر اس نے اپنے گروپ کے آدمیوں کو کھڑا کر دیا۔

نارد : تب تو ہنگامہ برپا ہونا چاہیئے تھا۔

وی.سی: یہی تو میں چاہتا تھا۔ ایک دو سرپھروں نے جھگڑا شروع کر دیا۔ ایک دوسرے کے خلاف نعروں کے شور کے درمیان، لڑائی کا بازار گرم ہو گیا۔ پولیس کو بلانا لازم تھا۔

نارد : اور مخالفین کو قابو میں کرنا آسان ہو گیا۔

وی.سی: آپ بجا فرماتے ہیں۔

نارد : تقرّرات کے لئے آپ نے ابھی سیلیکشن کمیٹی کی بات کی تھی جو کہ عموماً آپ کے اشارے پر ناچتی ہے کیا تدریس محکمات میں اساتذہ کی ترقی کے لئے بھی کمیٹی ہوتی ہے ؟

وی.سی: کیوں نہیں ؟

نارد : وہ کس بنا پر ان کی ترقی کی سفارش کرتی ہے ؟

وی.سی: ان کی سروس کی بنا پر۔

نارد : کس کی سروس ؟

وی.سی: میری۔ میری بیوی کی۔

نارد : ان کے کام کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔؟

وی.سی: یونیورسٹی میں آج کے اساتذہ کا یہی کام ہے۔

نارد : واہ وائس چانسلر صاحب ! آپ نے تو تعلیم کے جملہ اصولوں ہی کو طاق پر رکھ دیا۔

وی.سی: اس لئے کہ طاق پر سے دیکھنا آسان ہے۔ عمل میں لانا تو مشکل ہی ہوتا ہے۔

نارد : اعلیٰ تعلیم پر آپ نے شاید اچھا لٹریچر نہیں پڑھا۔؟

وی.سی: مہاراج ! پڑھنے کی بات تو پرانی ہو گئی۔ میں تو اعلیٰ تعلیم پر بھاشن دیتا ہوں۔

نارد : آپ بھاشن دے سکتے ہیں ؟

وی.سی: کیوں نہیں ؟ میں نے نصف درجن لیکچرس تیار کر رکھے ہیں۔

نارد : خود ؟

وی.سی: خود لیکچر تیار کرنے کے لئے وائس چانسلروں اور منتریوں کے پاس کہاں وقت ہوتا ہے ؟ پھر پی۔ اے کس مرض کا علاج ہے ؟

نارد : آپ کا پی۔ اے کہاں تک تعلیم یافتہ ہے ؟

وی.سی: میٹرک پاس کرنے کے بعد، اس نے پرائیویٹ طور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔

نارد : اور ایسا شخص لیکچر تیار کرنے کا کیسے اہل ہے ؟

وی.سی: اسے کون سی تلوار چلانی ہے ؟ دو چار اسٹینڈرڈ کتابوں میں سے نقل کرنا مشکل نہیں۔

نارد : اور آپ اس کا لکھا ہوا لیکچر پڑھ کر سنا دیتے ہیں ؟

وی.سی: نا مہاراج ! اُسے خوب یاد کرتا ہوں کئی دن تک اسے حفظ کرنے کی پریکٹس کرتا ہوں۔ اور ایک خاص یہ احتیاط برتتا ہوں کہ لیکچر دیتے وقت اپنے پی۔ اے کو اپنے سامنے بٹھلاتا ہوں۔

نارد : وہ کس لئے ؟

وی۔سی : اُدھر وہ لیکچر کو ہونٹوں میں گنگناتا ہے، اِدھر میں اشارہ پاکر بولتا جاتا ہوں۔ ہونٹوں کی حرکت میری یاوری کرتی ہے۔

نارد : سامعین کو اس بات کا علم ہو جاتا ہوگا ؟

وی۔سی : ہرگز نہیں۔ اس راز کی کسی دوسرے کو خبر نہیں۔

نارد : یونیورسٹی میں ریٹائرمنٹ کی کیا عمر ہے ؟

وی۔سی : جدا جدا۔ وی۔سی۔ کی ریٹائرمنٹ کی کوئی عمر نہیں۔ پڑھانے والا اسٹاف ساٹھ سال پر، دفتر کے لوگ باسٹھ اور انجینئرنگ اسٹاف پینسٹھ سال کی عمر پانے پر ریٹائر ہوتا ہے۔

نارد : وہ کیوں ؟

وی۔سی : پروفیسر لوگ لیکچر بازی اور نکتہ چینی کے علاوہ کچھ کام نہیں کرتے، رجسٹرار کے دفتر کے لوگ ان سے اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن انجینئرنگ اسٹاف والے تو خاص کام کے آدمی ہیں۔

نارد : کیسے ؟

وی۔سی : ہمارے مکانوں کی مرمت کے لئے۔ کمروں کی توسیع اور ڈبل اسٹوری کے لئے یہی لوگ کارآمد ہیں۔ گورنمنٹ سروس سے ریٹائر شدہ اسٹاف کو ہم اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ انہیں کام کے بارے میں سمجھانا نہیں پڑتا۔ ان کا پختہ نیز بیش قیمت تجربہ ان کے خوب کام آتا ہے۔

نارد : تو آپ ان سے بھی غلط کام کراتے ہیں۔ اپنی پوسٹ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پبلک کے خزانہ سے انھیں تنخواہ دے کر اپنا پرائیویٹ کام کراتے ہیں۔

وی۔سی : یہاں ہر کوئی ایسا ہی کرتا ہے۔

نارد : آپ کی رُوح کی آواز آپ کو روکتی نہیں ؟

وی۔سی : ہا۔ہا۔ہا۔ نارد جی مہاراج ! اس تین من وزنی جسم میں آپ کو رُوح دکھلائی دیتی ہے ؟ میری بیوی تو مجھ سے کہیں زیادہ صحت مند ہیں۔ ان کا شریر سینکڑوں رُوحوں کو نگل سکتا ہے۔ آج کے دور میں رُوح جیسی شے اعلیٰ پوسٹوں پر کام کرنے والے اشخاص کے نزدیک تک نہیں پھٹک سکتی۔ اگر غلطی سے کسی کے جسم میں داخل ہو گئی ہے تو وہ گونگی بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی آواز کسی کے کان تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن رُوح موٹے اور باریک جسم میں امتیاز نہیں کرتی۔ میرا سکریٹری ستّر سال کی عمر پر پہنچ کر بھی رُوح کے بغیر کام چلا رہا ہے۔

نارد : ستّر سال کی عمر میں بھی ریٹائر نہیں ہوا ؟

وی۔سی : یہاں آنے سے پیشتر کئی بار ریٹائر ہوا۔ یہاں وہ ہمیشہ وی۔سی کے ساتھ ہی ریٹائر ہوتا ہے۔

نارد : تو آپ کی یونیورسٹیوں میں کوئی قاعدہ قانون نہیں ؟

وی۔سی : ترقی یافتہ اور آگے بڑھنے والی یونیورسٹیوں میں قاعدہ قانون رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

نارد : آپ کی یونیورسٹی میں گھومتے ہوئے میں نے کچھ ناموں کی پلیٹوں پر نئے نئے محکموں کے نام پڑھے ہیں۔ مثلاً باباجمال چیئر۔ بھائی دسوندھا ل چیئر۔

وی۔سی : یہ نیا فیشن ہے۔ یونیورسٹی میں ترقی پانے سے محروم کچھ جاہ طلب، بوالہوس نیز آرزومند لوگ منتریوں کی سفارش سے نئے محکمات کھلوا لیتے ہیں اور انھیں چیئر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور وہ نام عموماً ان کے اپنے جنّت نشیں پُرکھوں کے ہوتے ہیں۔ اس کام کے لئے وہ آباؤ اجداد کا نام استعمال کرتے ہیں۔

نارد : ان کی تنخواہ کون دیتا ہے ؟

وی۔سی : سرکار۔ اور اس طرح ہماری یونیورسٹی میں اس معاش کے کم از کم ایک درجن پروفیسران ہیں۔

نارد : آپ کی وساطت سے ہی چیئر میں مقرر کئے گئے ہوں گے ؟

وی۔سی : بلاشک و شبہ۔ ورنہ وزرا اور سیاسی نیتاؤں کو ناراض کرنا، اپنی کرسی سے ہاتھ دھونا ہے۔ اور بھارت میں کوئی بڑا شخص ہی ایسی جرأت کر سکتا ہے۔

نارد : باہر سے عظیم الشان دکھوئی دینے والے تعلیم کے سب سے بڑے اداروں کی صدارت کرنے والے آپ جیسے اشخاص اتنی من مانی اور دھاندلی کر سکتے ہیں،

تو دیش میں تعلیم کی حالت تو ناگفتہ بہ ہوگی۔

وی۔سی : آپ بجا فرماتے ہیں۔

نارد : اور تعلیم تو گراوٹ کی حد تک پہنچ گئی ہوگی۔

وی۔سی : کوشش تو یہی کی جا رہی ہے۔

نارد : شیو۔ شیو۔ شیو۔ وائس چانسلر جی! آج جب میں اس طرف آ رہا تھا تو ایک شخص گا رہا تھا:

ع دل جگر تشنۂ فریاد آیا

وی۔سی : مہاراج! یہ گزشتہ صدی کے ایک معروف اردو شاعر مرزا غالب کا کلام ہے۔ اور مرزا کی زبانی میں بھی حضور سے التماس کرتا ہوں کہ :

ع پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق۔

مجھے سزا دینے سے قبل اس بات کا دھیان رکھئے گا کہ :

ع آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا۔

نارد : اچھا اب چلتے ہیں۔ برہما جی کے پاس رپورٹ پیش کرنی ہے۔ ■■

زبیر رضوی

وہ کہہ رہا تھا
ننگے پیڑوں سے سایہ نہ مانگنا
ریت میں مٹی کا ذائقہ نہ ڈھونڈنا
کنگال صحبتوں اور بنجر رفاقتوں کو
اپنی تابندہ ساعتوں کا اثاثہ نہ دینا
اکھڑی ہوئی سانسوں کو اپنا ہم سفر نہ بنانا
اپنے آبنوسی بدن کو
گندے پیکروں کے لمس سے مٹ میلا نہ کرنا
پرنالوں سے گرتے ہوئے
بارش کے پانی میں غسل نہ کرنا
وہ کہہ رہا تھا
گنگا سمندر سے ملی تو کھاری ہو گئی
تم ایسا نہ کرنا
اپنے ہی ساحلوں کے بیچ بہتے رہنا
کہ تمہاری پہچان کے رنگ میلے نہ ہوں۔

وہ کہہ رہا تھا
تمہیں زندگی کے پہلے سفر پہ
الوداع کہہ کر رخصت کرنے والے
ہوا میں ہلتے ہوئے ہاتھ اور رومال
ابھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے
تم ابھی رات کے بستر سے سو کر اٹھے ہو
یہ تمہاری زندگی کا پہلا سویرا ہے

وہ کہہ رہا تھا
تم سورج کی سنہری کرن تھام کر
اپنے طویل سفر کا آغاز کرنا
اور جب تم اپنے سفر سے واپس لوٹو
تو چاند کو اپنا ہم سفر بنا کر لوٹنا
کہ تمہارے سفر کے آخری پڑاؤ کا نام
چاند نگر ہے۔ !

۱۹۵۷ ، ترکمان گیٹ ، دہلی ـ ۶

قبر

تصنیف : انتون چےخف
ترجمہ : احمد جمال پاشا ● نشاط افزا، سیوان - (بہار)

ایک خوشگوار صبح کو وہ کالج کے سکریٹری کارنی ایونودچ دے ولولزن کو دفن کر رہے تھے۔ سکریٹری کی موت دو بیماریوں سے ہوئی تھی۔ دونوں مادرِ وطن میں وبائی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ ایک شراب دوسری ہوا سے لڑنے والی بیویاں۔

جس وقت جنازہ گرجا سے قبرستان لے جایا جا رہا تھا مرحوم کا ایک دوست پوپلاوسکی کرایہ کی گاڑی دوڑاتے ہوئے، اپنے ہر دلعزیز نوجوان دوست گریگری پتر دیچ زپوکن کے گھر پہنچا۔ زپوکن شادیوں، برسیوں اور آخری رسوم کی ادائیگی، تقریبات میں فی البدیہہ تقریر کے فن کا بے مثل ماہر تھا۔ وہ کسی بھی وقت، کسی بھی حالت میں تقریر کر سکتا تھا۔ بے اختیار چلتے چلتے، تیز بخار میں پھنکتے ہوئے، خالی پیٹ، شراب کے نشے میں دُھت، اس کی تقریروں میں بڑی فصاحت ہوتی، معلوم ہوتا کہ جیسے پانی بہہ رہا ہے، بالکل اسی بہاؤ اور روانی سے وہ بولتا چلا جاتا۔ کسی گندی سرائے کی جوؤں سے بھی زیادہ پریشان کن الفاظ اس کے ذہن میں اظہار کے لئے کلبلاتے رہتے۔ غرض وہ ہمیشہ بڑی روانی سے بولتا اور اتنی زیادہ دیر تک بولتا رہتا کہ اکثر دکانداروں کے یہاں شادی کی تقریب میں اُسے چپ کرانے کے لئے پولیس بلانا پڑتی۔ پوپلاوسکی نے اس کے گھر پہنچ کر اس سے کہا۔

" لڑکے! اس وقت مجھے تم جیسے معقول آدمی کی ضرورت ہے۔ جلدی سے کپڑے پہنو، سیدھے میرے ساتھ چلو، میرے دفتر کا ایک بھلا آدمی مر گیا ہے۔ ہم اسے فوراً ہی دوسری دنیا کو پارسل کر رہے ہیں۔ اس موقع پر ایک دھواں دھار تقریر ضروری ہے تاکہ ہم اسے احترام سے رخصت کر سکیں۔ اس وقت تم ہی ہماری واحد اُمید ہو۔ اگر مرنے والا کوئی معمولی آدمی ہوتا، تو ہم تمہیں تقریر کی زحمت کبھی نہ دیتے "

زپوکن نے جماہی لیتے ہوئے کہا ــــ " سکریٹری! وہ جو شرابی تھا؟"

" ہاں! وہ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ وہاں مزیدار کیک اور افراط سے کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی۔ تمہاری ایک پائی نہ خرچ ہو گی۔ میرے عزیز اب ہمیں چل دینا چاہئے، جب ہم قبرستان پہنچیں تو تم بولنا شروع کر دینا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دینا، بس پھر اس مجمع میں تم سب سے اہم شخصیت ہو گے "

زپوکن بخوشی جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے بالوں کو پریشان کیا، کچھ حلیہ بگاڑا، اور دنی صورت بنائی اور پوپلاوسکی کے پیچھے پیچھے سڑک پر چلنے لگا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

" میں تمہارے سکریٹری کو جانتا ہوں۔ بدمعاش، دغاباز، خدا، اسے جنّت سے محفوظ رکھے! اُس جیسے تو کم ہوں گے "

" ہائیں ہائیں! بھلے آدمی، تم سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ مرنے والے کی غیبت کرو "

" ہاں! میں جانتا ہوں کہ مُردوں کا ذکر بھلائی کے سوا نہ کرنا چاہئے۔ لیکن مرحوم پکّا بدمعاش تھا "

پڑوسی گھروں سے نکل کر جنازے میں شامل ہو چکے تھے۔ کفن اتنی زیادہ سُست رفتاری سے پہنایا جا رہا تھا کہ وہ خاموشی سے شراب خانے کے تین چکر لگا چکے تھے۔ تاکہ ان کے شراب و کباب سے رخصت ہونے والی رُوح کچھ سکون حاصل کر سکے۔

قبر پر آخری دعا کے بعد رسمِ زمانہ کے مطابق مرحوم کی خوبیاں بیان کر کے بیوہ، ساس اور سالی نے رونا شروع کر دیا۔ قبر میں آخری دیدار کے لئے جیسے ہی مُردے کے مُنہ پر سے کفن سرکایا گیا، مرحوم کی بیوہ زور سے چلّائی " مجھے بھی ان کے ساتھ دفن کر دو "

لیکن شاید تنشن کے خیال سے اس نے اصرار نہیں کیا۔ زپوکن خاموشی بحال ہونے کا منتظر تھا۔ آخر وہ آگے بڑھا۔ سب کی آنکھیں اس پر لگ گئیں ۔

وہ شروع ہوگیا :

" کیا ہم اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین کر سکتے ہیں ؟ کیا یہ قبر ہمیں ہے ، یہ روتے ہوئے چہرے ، یہ آہ و بکا ، سسکیاں اور رونا کسی خوفناک خواب کا حصّہ تو نہیں ؟ افسوس ! یہ خواب نہیں ہے ۔ ہماری آنکھیں ہمیں دھوکا نہیں دے سکتیں ! وہ جسے کبھی ہم نے جوانی کے خمار میں تر و تازہ اور شگفتہ دیکھا تھا۔ وہ جو کچھ دیر قبل ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ ایک سرگرم شہد کی مکھی کی طرح ، اپنے شہد کا وزن اٹھائے ، شاہی بہبود کے عوامی چھتے میں آخر دم تک پہنچاتا رہا۔ اب خاک میں مل گیا۔ مادی سراب ہوگیا۔ بے رحم موت نے اسے اپنے ہاتھوں سے لٹا دیا۔ گو کہ اب عمر کے ساتھ موٹا ہوگیا تھا۔ پھر بھی ابھی اس کے پھلنے پھولنے کے دن تھے۔ وہ ابھی تک قوتِ حیات سے سرشار تھا۔ امیدوں سے پُر تھا۔ یہ تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ اس کی جگہ ہم میں سے کون لے گا ؟ ہمارے یہاں بہت سے لائق افسر ہیں۔ لیکن پرد کوفی اوسی پچ بے مثل تھا۔ فرائض کی انجام دہی میں وہ اپنے آپ کو تن من دھن سے وقف کئے ہوتے تھا۔ کبھی اس نے اپنے آپ کو فرصت نہ دی ۔ اس نے بے خواب راتیں گزاریں۔ وہ بے لوث اور ایماندار تھا۔ رشوت دینے کی کوشش کرنیوالوں سے اسے نفرت تھی ۔ اسے طرح طرح کی لالچ دی جاتی ۔ مگر وہ جھکنے والا نہیں تھا۔ یقیناً ! ہماری آنکھوں کے سامنے پرد کوفی اوسی پچ نے اپنی قلیل تنخواہ اپنے غریب ساتھیوں میں تقسیم کی تھی ۔ آپ نے ضرور اس مجمع میں یتیموں اور بیواؤں کی سسکیاں سُنی ہوں گی۔ وہ ان کی مدد کرتا تھا۔ اس نے گھریلو زندگی کی سہولت تک سے اپنے آپ کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہ زندگی بھر تنہا رہا۔ اس کی جگہ ، ہم میں سے ، اس کے رفیق کی حیثیت سے کون سنبھال سکتا ہے ؟ جیسے کہ ابھی وہ میرے سامنے کھڑا ہو۔ میں اسے کلین شیو الم ناک چہرے کے خد و خال دیکھ سکتا ہوں۔ وہ خوش مزاجی سے مسکرا کے مجھے دیکھ رہا ہے۔ جیسے وہ مجھ سے باتیں کر رہا ہو۔ میں اس کی نرم ، ہمدرد ، دوستانہ آواز سُن سکتا ہوں۔ تمہاری ہڈیوں کو سکون میسّر ہو پرد کوفی اوسی پچ ۔ ! تم آرام کرو ، ایماندار ، شریف اور جفاکش انسان ! "

زپوکن کا بیان جاری تھا۔ لیکن ، سامعین میں کانا پھوسی شروع ہوگئی ۔ سب نے اس کی تقریر پسند کی۔ کچھ کے آنسو بھی نکل پڑے ، مگر کچھ مضحکہ خیزی بھی تھی۔ یہ تقریر ، شروع ہی سے کچھ بے تکی سی تھی ۔ مقرر بار بار مرنے والے کا نام پرد کوفی اوسی پچ لے رہا تھا۔ جبکہ متوفی کا نام کارتل ایونو وچ ولے ولونوف تھا۔ دوسرے سب جانتے تھے کہ مرنے والا زندگی بھر بیوی سے لڑتا رہا۔ اس لئے وہ کنوارا نہیں تھا۔ اس کے سرخ گھنی داڑھی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی شیو نہ کیا تھا۔ یہ واضح نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ اُسے " کلین شیو " کیوں کہہ رہا ہے ؟ سامعین تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھ اور کندھے جھٹک رہے تھے۔

مقرر نے جذباتی انداز سے قبر کی جانب دیکھ کر کہا۔ " پرد کوفی اوسی پچ ، تمہارے خد و خال بالکل معمولی تھے ۔ بدصورتی کی حد تک ، تم تنہا تھے ۔ اور بالکل خشک مزاج ۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ تمہاری کھال کے اندر ایک سچا اور مہربان دل دھڑکتا تھا " اچانک سامعین نے دیکھا کہ مقرر عجیب و غریب حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ صرف قبر کو گھورے جا رہا تھا۔ اچانک اس نے بڑی گھبراہٹ اور بدحواسی میں تقریر ختم کر دی ۔ اس کا حیرت سے مُنہ کھلا ہوا تھا وہ پوپلا وسکی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا ۔

" دیکھو ! دیکھو ! وہ زندہ ہے " اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔

" کون زندہ ہے ؟ "

" پرد کوفی اوسی پچ ! وہ قبر سے باہر نکل آیا ہے ۔ ! "

" جناب ! لیکن یہ تھوڑی مرا ہے ۔ مرا تو کارتل ایونو وچ ولے ولونوف ہے "

" لیکن تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ تمہارا سکریٹری مر گیا ہے "

" کارتل ایونو وچ ولے ولونوف ہمارا سکریٹری تھا۔ مسخرے تم نے سب گڑبڑ گھٹالا کر دیا۔ پرد کوفی اوسی پچ بھی ہمارا سکریٹری ہو سکتا تھا ۔ لیکن دو سال پہلے چیف کلرک کی حیثیت سے اس کا دوسری جگہ تبادلہ ہوگیا تھا "

" میں یہ بات نہ سمجھ سکا تھا "

" تم رک کیوں گئے ؟ تمہارا بیان جاری رہے "

زپوکن قبر کی جانب مڑا۔ اس نے ادھوری تقریر مکمل کرنے کے لئے زبان کا گھوڑا سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا۔ قبر کے پاس ہی بوڑھا قبر کلین شیو پرد کوفی ادسی پچ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اِس بے لگام مقرر پر ایک قہرناک نظر ڈالی۔

جب وہ قبرستان سے زپوکن کے ساتھ واپس لوٹ رہے تھے تو پولا دیسکی نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

" آپ نے ایسا کیوں کیا ؟ آپ نے تو آج ایک زندہ آدمی کو دفن کر دیا !"

پرد کوفی ادسی پچ غرّایا۔

" نوجوان ! آپ نے بہت بڑی غلطی کی۔ ممکن ہے یہ تقریر کسی مرے ہوئے آدمی کے لئے مناسب ہو۔ لیکن ایک زندہ آدمی کے لئے یہ محض مسخرا پن تھا۔ جناب ! اس قسم کی باتیں کہتے وقت، بے لوث ! ایماندار ! کبھی رشوت نہیں لی ! کسی زندہ آدمی کے لئے یہ تو اسی وقت کہا جاسکتا ہے۔ جب کہ اسے چڑانا ہو ! آخر آپ سے یہ کس نے کہا تھا کہ آپ میرے چہرے پر ! معمولی اور بدصورت ! جیسے فقرے چسپت کریں ! ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو ! لیکن سب کے سامنے اس طرح کیوں کہتے۔؟ یہ تو نہایت توہین آمیز ہے جناب۔ ■■

زرِ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری   کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ۔ ہم روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدیدِ خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

رامناتھ اسیرؔ

○

کاش میرے ڈوبنے کا وہ بھی منظر دیکھتا
لیکن اس کو کیا پڑی تھی کیوں پلٹ کر دیکھتا

دشمنوں سے خوف کھاتا عمر بھر میں بھی اگر
دوستوں کی آستینوں میں نہ خنجر دیکھتا

شہر سے نکلے ہیں ہم کس جرم کی پاداش میں
یہ تو اس کو دیکھنا تھا۔ وہ ستمگر دیکھتا

میں تماشا ہیں سب کی نظریں تھیں مری پرواز پہ
کون اب آکر مرے ٹوٹے ہوئے پر دیکھتا

میکشی کا ہم پہ گر الزام ہے۔ تو ہو اسیرؔ
کوئی ایسے زندگی بھر زہر پی کر دیکھتا

○

ہم تو دن رات اسی سوچ میں مر جائیں گے
تجھ سے بچھڑیں گے تو کس حال میں گھر جائیں گے

ہاں! اسی پیڑ کے نیچے میں لہو رویا تھا
لوگ اس راہ سے گذریں گے، تو ڈر جائیں گے

ہم ہیں حساس بہت ہم کو بچا کر رکھنا
پھر نہ سمٹیں گے، جو اک بار بکھر جائیں گے

اب تو صحرا بھی گلستاں ہے۔ بہار آنے پر
شہر کو چھوڑ کے دیوانے کدھر جائیں گے

آنکھ کی نیند لُٹے۔ بھول بھی جائے گا اسیرؔ
آگیا صبر مجھے۔ زخم بھی بھر جائیں گے

○

وہ مرے دل میں رہے یا دیدۂ تر میں رہے ۔۔۔ دونوں گھر اس کے ہیں، چاہے وہ کسی گھر میں رہے

ان کے پیچھے داستانیں تھیں، کوئی پیکر نہ تھے ۔۔۔ رات دن ڈوبے ہوئے جو لوگ ساغر میں رہے

ہم پہ پتھر پھینکنے والے تھے ساحل کے مکیں ۔۔۔ اور ہم کہ عمر بھر گہرے سمندر میں رہے

زندگی ہم نے گذاری جس طرح پردیس میں ۔۔۔ اجنبی بن کر اسی صورت ہی ہم گھر میں رہے

ہم کہ ٹھکرائے گئے ہر اک زمانے میں اسیرؔ
اور زمانے ہم سے درویشوں کی ٹھوکر میں رہے

○

تجھے اچھا، بُرا، جیسا لگا ہوں ۔۔۔ وہ تیرا عکس ہے، میں آئینہ ہوں

اگر میں ایک ننھا سا دیا ہوں ۔۔۔ ہوا کی زد پہ کیوں رکھا گیا ہوں

میں اک اک سانس کٹ کٹ کر جیا ہوں ۔۔۔ میں جینے کا سلیقہ جانتا ہوں

میں اپنے آپ ہوں خود اپنا قاتل ۔۔۔ میں اپنے آپ اپنا مرثیہ ہوں

سبھی دیوانے کہتے ہیں اسیرؔ اب
کہ اُن میں مَیں ہی اک سلجھا ہوا ہوں

○

چار سُو دریا ہی دریا تھے یہ کس کو پوچھتے
کون سا دریا تھا جس کو پار کرنا تھا ہمیں

ریت کا اک گھر نہ ساحل پر بناتے تو اسیرؔ
اتنے گہرے پانیوں میں کیوں اترنا تھا ہمیں

○

دل ہے کہیں، دماغ کہیں اور نظر کہیں
اک شخص مجھ کو اس طرح تقسیم کر گیا

● بلاک ایجوکیشن آفیسر، انبالہ۔۲ انبالہ کینٹ (ہریانہ)

مکتوبات

شمارہ نمبر ۷

ابوالکلام قاسمی ———— شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میرے اس خط کا بنیادی محرک شاعر کا شمارہ ۵-۶ ہے جس میں "نیا افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر" کے عنوان سے نارنگ صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے۔ ممکن ہے میری یہ بات آپ کو پسند نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ اس رسالے سے معیار کی سطح پر جس تبدیلی کی توقع تھی اس پر گذشتہ شمارے تمام و کمال پورے اترتے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نئے افسانے پر اس مضمون نے آپ کے رسالے کی بہت سی کمیوں کی تلافی کی ہے نارنگ صاحب نے پہلے بھی افسانے بالخصوص جدید افسانے پر بہت اہم مضمون لکھے ہیں مگر ان کا یہ مضمون نئے افسانے کی تفہیم اور تعبیر کی ایسی کوشش ہے جس کو اردو افسانے کی تنقید میں ہمیشہ امتیاز حاصل رہے گا۔ اس مضمون کی سب سے بڑی صفت تجزیاتی طریق کار، ٹھوس بنیادوں پر جدید افسانے کی تعبیر اور تمثیل، تجرید اور علامت جیسی اصطلاحات کی گتھیاں نئے افسانے کے حوالے سے سلجھانے میں مضمر ہے۔ اس مضمون کے لئے نارنگ صاحب تو قابلِ مبارک باد ہیں ہی۔ آپ بھی قابلِ ستائش ہیں کہ آپ کی نظرِ انتخاب اب خوب سے خوب تر کی جستجو میں مصروف ہے۔

شمارہ نمبر ۸/۹

فضا ابن فیضی ———— مئوناتھ بھنجن (یوپی)

گوشۂ یگانہ پر مشتمل، شاعر کا موقر شمارہ بدست ہوا شکریہ۔ شاعر کی ہر تازہ اشاعت ایک خوش آئند و قیع باب کا تحفہ لے کر سامنے آتی ہے اور مطالعہ کی پیاس بڑھ جاتی ہے شاعر کے صفحات پر مواد میں قابلِ قدر اضافوں اور تنوع و طرفگی کی افزائش کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے۔ وہ بڑا مفید اور بے حد مستحسن ہے۔ مذکورہ خصوصی گوشے کے وسیلے سے یگانہ چنگیزی کی یگانۂ روزگار، البیلی اور دلکش ادبی شخصیت اور اس کے فکر و فن کے مخصوص تیور اور کیچ کلاہانہ اسلوب کے رموز و خطوط کے مطالعہ میں آسانی ہوگی خصوصی گوشوں کا یہ سلسلہ نہ صرف چراغِ راہ بلکہ نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے زیرِ بحث شخصیات کی زندگی اور ان کے فن کی تفہیم و توضیح میں یقیناً مدد ملے گی۔ اسے مناسب سطحوں پر جاری رکھئے۔ اللہ آپ کو توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔

حامدی کاشمیری ———— ۳۹۶- جواہر نگر، سری نگر، (کشمیر)

شاعر کا تازہ شمارہ بیحد وقیع اور قیمتی ہے مبارک باد قبول کیجئے۔ آپ نے شاعر کے ذریعہ بعض نایاب اور نادر کتابوں کی اشاعت کا جو پروگرام بنایا ہے، وہ لائقِ ستائش ہے۔ آپ نے یگانہ کی رباعیات (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) کو اپنے مدلل نوٹ کے ساتھ شاملِ اشاعت کرکے نہ صرف ان کے ایک اہم شعری کارنامے کو منظرِ عام پر لایا ہے، بلکہ شاعر کے وقار میں بھی اضافہ کیا ہے۔ نیر مسعود صاحب کا مقالہ بے حد معلوماتی ہے انہوں نے بڑی معروضیت کے ساتھ اپنی معلومات کو قلمبند کیا ہے۔ زیب غوری کا خط اور غزل (خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی) چند اور غزلیں شائع کرکے آپ نے مرحوم کو بہت اچھا خراجِ تحسین ادا کیا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زیب غوری نئی غزل میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی بے وقت موت سے اردو شاعری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے اقبال مجید کا رپورتاژ دلچسپ ہے۔ شاعر کے دیگر مندرجات بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

علی احمد فاطمی ———— ۴۸- مرزا غالب روڈ، الہ آباد (یوپی)

شاعر کے تازہ شمارے میں اقبال مجید کا سفرنامہ پڑھا کیا خوب صورت شروعات ہے لیکن جیسے جیسے آگے بڑھے ہیں جلدی کرتے گئے ہیں اور جلدی

ختم کردیا۔ پاکستان کتنے لوگ گئے۔ سفرنامے بھی لکھے گئے لیکن یہ سفرنامہ منفرد ہو سکتا تھا اگر اقبال مجید صاحب اسے پورے انہماک کے ساتھ لے چلتے۔ ان کی خدمت میں مبارک باد۔

یگانہ پر ان دنوں بہت زور ہے ابھی حال میں پاکستان سے شائع ہونے والے کئی رسائل میں اور بالخصوص تخلیق، ادب میں یگانہ پر بھرپور مواد ہے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنے دور میں کچھ جائز اور کچھ ناجائز ہنگامے کئے ہیں انہیں پھر سے روشنی میں لایا جا رہا ہے تاکہ کلچر کے مزاج سے قدرے ہم آہنگی ہو سکے اور کچھ اس طرح کسی ہنگامہ کی برپا ہو سکے۔ پاکستان میں محمد حسن عسکری پر بھی بہت زور ہے آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا لیکن کیا اس سے عسکری کی شخصیت اپنے قدرے زیادہ بلند ہو سکے گی۔ دیکھنا ہے

نیر مسعود صاحب کے مضمون کے ذریعہ یگانہ کی شخصیت اور ذہانت کے بارے میں خوب خوب پتہ چلتا ہے لیکن مجھے صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا صفی، ثاقب، عزیز وغیرہ اتنے ہی متین و معزز تھے جتنا کہ نیر صاحب نے ظاہر کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی رہا ہو۔

آپ نے اس طرح کے سلسلوں کا جواز پیش کر دیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ آئندہ گوشہ کیا رہتا ہے۔ زیب غوری کی غزلیں اور دو ایک افسانے واقعی ایسے ہیں جو مزہ دیتے ہیں اور رسالے کے حسن و معیار میں اضافہ کرتے ہیں۔ پورا رسالہ نہایت جامع اور بھرپور ہے آپ جس طرح محنت کر رہے ہیں قابلِ ستائش ہے۔ خدا آپ کی محنتوں کا اجر دے۔

بلراج ورما ______ ۴۴۔ ڈی، پاکٹ ۳، میور وہار (دہلی)

شاعر کے نئے شمارے میں ایک بڑی اور اہم چیز جسے میں تمہاری ایڈیٹوریل اختراع کا نام دوں گا، اردو کے عظیم شاعر یاس یگانہ چنگیزی کی رباعیوں کی شمولیت ہے۔ اس عمدہ، خوش سلیقہ اور انوکھی اپج کے لئے تم اردو دنیا کے سلام کے مستحق ہو۔ اس قابلِ قدر تحقیقی کاوش کے لئے میرا سلام قبول کرو۔

احمد کمال پروازی ______ ۹/۶۔ اہلیہ بائی مارگ، اجین (ایم۔پی)

آپ کا اداریہ بے حد داخلی ہے۔ اور جب کوئی داخلی کرب الفاظ کے توسط سے اپنی تجسیم مکمل کر لیتا ہے تب وہ اظہار نثر کی ہیئت میں ہوتے ہوئے بھی شاعری کے نام سے اپنی شناخت قائم کرتا ہے اور شاید اسی ناامیاتی مگر داخلی اظہار کے سبب نثری نظم وجود میں آئی ہوگی۔ آپ کا پورا کا پورا اداریہ ایک بہترین نثری نظم ہے۔ اور اس نظم میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جنھیں بطور نثری نظم DEFINE کیا جا سکتا ہے۔

"نذرِ زیب غوری" سے وابستہ صفحات پر دقت اور دل پر اثر کرتے ہیں۔ مرحوم نے آپ کو اور مکرمی راج نرائن راز صاحب کو بیک وقت ایک ہی دن خط لکھے ہیں۔ دونوں خطوط کی تاریخ ۱۵۸۸ ہے اور شروع شروع کا مواد بھی یکساں ہے۔ ہفت روزہ "ہماری زبان" دہلی آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اس میں راج نرائن راز صاحب کو اس طرح مخاطب کیا ہے "تم ڈرو نہیں مروں گا نہیں"، یہ چھ لفظ وقت جیسے سنگ بے نیاز پر ثبت ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاعر کی چار اور ہماری زبان کی ایک پانچوں غزلوں کا زیب غوری عارفانہ فکر و نظر سے معمور نظر آتا ہے۔ ان غزلوں کی بافت میں وہ استقلال نظر آتا ہے جو کسی شاعر کے مرنے کے بعد پرورش پاتا ہے۔ ان ہی غزلوں کا شاعر "زرد زرخیز" والے شاعر سے مختلف ہے۔ بانی، شاذ تمکنت کے بعد یہ تیسرا اہم شاعر تھا جس کی موت سے اردو شاعری کو بڑا صدمہ پہونچا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ شاعر اپنا ایک ایک خصوصی شمارہ ان گذرے ہوئے مسافروں کے نام کر دے۔ یقیناً آپ بھی میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ شاعر ادب کی صالح اقدار کا پیامبر ہے آپ کی مساعی نے ان محرکات کو پروان چڑھایا ہے جو ادب میں سنجیدہ اضافے کا حکم رکھتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو زیب غوری کے دوسرے مجموعے "دو چاک" کا انتظار ہو لیکن شاذ اور بانی کے لئے تو تاخیر کا شاید کوئی سبب نہ ہو۔

گستاخی معاف جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ یگانہ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رباعیوں سے قبل محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی رباعیوں کی اشاعت کیا معنی؟ کیا یگانہ کی طرح فاروقی صاحب بھی کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے۔

اقبال مجید صاحب کا سفرنامہ تاج محل جائے۔ بہت دلچسپ اور ایک ہی سانس میں پڑھ جانے کا وصف اپنے اندر سموئے ہے۔

دیگر سفرناموں کی طرح یہ سفرنامہ واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ فکشن کی وہ صفت ہے جس میں کئی چھوٹی بڑی کہانیاں مزید پھیل جانے کا کام کرتی ہیں۔ نثری حصے میں مضامین کا فقدان ہے۔ لیکن رباعیوں کی کثرت نے اسے محسوس نہیں ہونے دیا ہے یگانہ کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رباعیوں کو شائع کر کے آپ نے متعلقین کو بہت سہولتیں بہم پہنچائی ہیں میری جانب سے مبارک باد قبول کیجئے۔

(یو پی)
مسرت حسین آزاد ________ بنگلہ آزاد خان رام پور

اس شمارہ میں یاس یگانہ کو نمایاں مقام دے کر آپ نے ثواب کمایا یا عذاب، یہ تو خدا ہی بہتر جانے لیکن ادبی نقطۂ نظر سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ صرف رباعیوں کی حد تک محدود ہے اور حیرت کی بات یہ ہے ۳۲۶ رباعیوں میں نے چند ہی ایسی نظر آئیں کہ جو کسی قدر داد کے مستحق ہو سکتی ہیں باقی تو ان کے مخصوص تخریبی ذہن کی عکاسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ کچھ غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہوتیں تو یاس یگانہ کی شاعرانہ شخصیت کا بھرپور تعارف ہو جاتا اور اگر ان کی بعض مخصوص تحریریں اور خطوط بھی شریک کر لیے جاتے تو پڑھنے والے پوری طرح خوش ہو جاتے۔

میرے خیال میں یاس یگانہ کی شہرت اور انفرادیت کا تجزیہ اس حیثیت سے مناسب نہیں کہ وہ فنکار کتنے بڑے تھے بلکہ اس نقطۂ نظر سے زیادہ اہم رہے گا کہ انھوں نے اپنے ہم عصروں کو، خدا، رسول اور قرآن کو برا بھلا کہنے میں اپنے فن کا کس خوبی کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے اور اگر کو بخشا ہے تو صرف بیگم کو اور حضرت علیؑ کو بخشا ہے حالانکہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ان دونوں ہستیوں پر قلم اٹھاتے وقت ان کے وہ مخصوص ذہنی سوتے کیوں خشک ہو گئے تھے۔

نیر مسعود صاحب کا مضمون یگانہ پر بھرپور اور معتدل ہے لیکن یگانہ کے جنازہ کا آنکھوں دیکھا حال بھی لکھ دیتے تو مضمون بالکل ہی مکمل ہو جاتا۔ افسانوں میں شکستہ مکان اور کرزن مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مقصد کو پورا کرتے ہیں لیکن متوازی لکیریں جو اوم کرشن راحت کی تخلیق ہے کئی لحاظ سے پسند آئی۔ عنوان بھی اچھوتا ہے اور سماج کے دو نمائندہ طبقوں کے جنسی معاملات کی تصویر کشی بڑے اچھے ڈھنگ سے کی گئی ہے اور یہ بھی کم قابلِ تعریف بات نہیں کہ ایک مخصوص پلاٹ پر دو ڈھائی گھنٹے کی پکچر دیکھنے کے بعد یا کوئی طویل ناول پڑھنے کے بعد ایک قاری کو جو لطف میسر آسکتا ہے وہ چند منٹوں کے اس افسانے سے بھی حاصل ہو جا سکتا ہے۔

شعرائے کرام کے واسطے بھی شاعر نے کئی صفحے مخصوص کر رکھے ہیں اور بہترین شعر اسی سرمایہ سے منتخب ہیں۔

وہ حق گو چڑھ گیا سولی پہ آخر — یہ سرخی کل کے اخباروں میں لکھنا ________ ایم اخلاق

آؤ ان سے تجربوں کی وسعتیں مانگ لیں — جو روایت کے اجالے اس صدی تک آ گئے ________ نصیر پرواز

فقیہہ شہر کا خانہ خراب کیسے ہوا — بتاؤ اتنا بڑا انقلاب کیسے ہوا ________ رونق نعیم

اس شمارہ کی نمایاں شخصیت زیب غوری مرحوم کی ہے جو کراچی خسر کی عیادت کو تشریف لے گئے تھے اور خود ہی دل کے دورہ میں مبتلا ہو کر وہاں وفات پا گئے۔ مرحوم کی چار غزلیں شریک اشاعت ہیں لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے ان غزلوں کے مقابلہ میں ان کا خط بہت زیادہ پسند آیا کیونکہ اس میں شاعر نے اپنے دلی جذبات کا اظہار بڑے سیدھے سادے الفاظ میں کیا ہے۔ مرحوم کی شخصیت کی شان و شوکت تصویر سے عیاں ہے میرے لئے ذاتی طور پر اس خط میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ قبل بیس سال کے ایک دوست پروفیسر جمیل احمد کا نام آگیا ہے۔

شمارہ نمبر ۱
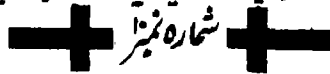
(یو پی)
مسرت حسین آزاد ________ بنگلہ آزاد خان رامپور

اکتوبر کے شمارہ میں شاعری کا حصہ بہت کمزور نظر آیا آپ نے سوچا ہوگا کہ علی سردار جعفری کا نام بس کافی ہے مولانا حسن قادری کا نام حامد حسن ہی ہے آپ نے فٹ نوٹ میں حامد حسن قادری کر دیا میں نے ان کی کئی کتابیں دیکھیں تو حامد حسن ہی نظر آیا۔

کالی داس گپتا رضا صاحب نے غالب پر لکھنے کے واسطے نیا پہلو خوب نکالا۔ کچھ روشنی بھی ملی ہے۔ اس مضمون میں نواب یوسف علی خاں کا بھی ذکر ہے۔ کاتب صاحب ایک جگہ تو یوسف دلی خاں لکھ گئے ہیں۔ انہی یوسف علی خاں پر علی گڈھ سے ذکیہ جیلانی کا تحقیقی مقالہ کلیات ناظم کے عنوان سے اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس میں غالب اور ناظم کے تعلقات پر تفصیلی بحث ہے جس میں عرشی زادہ کے نقد

[illegible] کو تقویت پہنچانے کی سعی کی گئی ہے۔ شیخ اکرام نے اپنے ایک مضمون کے ذریعہ کلام ناظم کے کچھ حصہ کو غالب کا ثابت کرنا چاہا تھا لیکن عرشی زادہ نے کافی محنت اور مشوروں کے بعد شیخ صاحب کے اعتراضات کا جواب دیکر ادبی حلقوں کو مطمئن کر دیا تھا۔

ڈاکٹر گیان چند نے ابو محمد سحر کے مقالہ "اردو کے ہم صورت حروف" کا جواب دیا ہے۔ گیان چند کی علمیت اور ذہانت کا کون قائل نہیں وہ اپنے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کی وجہ سے اردو ادب میں ایک اہم مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر بھی کم قابل نہیں ہیں لیکن وہ بہت جلد محض تعلقات کو نبھانے کے لئے بھی کم اہم موضوعات پر قلم اٹھا لیتے ہیں۔ یہاں جواباً ڈاکٹر گیان چند نے لسانیات پر اپنے محدود مطالعہ کا اعتراف کرتے ہوئے مضمون لکھا ہے اس سے گو کہ ان کے غور و فکر اور معتدل انداز فکر پر اچھی روشنی پڑتی ہے تاہم مضمون کی ٹیکنیک انھیں اس عنوان پر مزید لکھنے کو مجبور کرے گی اور خاص طور سے یہ نکتہ تو اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ترکی میں ک۔ پ ح سے بدل جاتا ہے اور اللہ اکبر کے بجائے وہاں کے لوگ اللہ اچبر کہتے ہیں۔ اس کے صاف معنی ہیں کہ سارے قرآن میں جہاں جہاں بھی حرف ک آیا ہے اسے چ پڑھا جاتا ہوگا۔ لیکن عملی طور پر یہ سب کچھ نہیں ہے اور اگر وہ اپنی رائے کو درست سمجھتے ہیں تو اس موضوع پر کافی وضاحت کی ضرورت ہے۔

جوگیندر پال کی پاکستان یاترا بڑی دلچسپ اور پر از معلومات ہے اور خاص طور سے ان قارئین نے اس طویل تحریر کو بڑی چاہت سے پڑھا ہوگا کہ جن کے کچھ شناسا چہرے اس میں موجود ہیں۔ جوگیندر پال ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو نئے الفاظ وضع کرکے موجودہ اردو لغات کو ناکارہ بنانے پر تلا ہوا ہے اور شاعر کا دامن ایسے مضامین کے واسطے کچھ زیادہ ہی کشادہ نظر آتا ہے۔

عبد الواسع خان کا مکتوب پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مقالے نیا افسانہ پر اچھا خاصہ ایک تنقیدی مضمون ہو گیا ہے۔ وہ وارث علوی اور باقر مہدی کی حمایت میں بڑے اچھے اور ہمدردانہ احساسات رکھتے ہیں۔ میں ان کی ان تمام دلیلوں سے کہ جو نارنگ صاحب پر تنقید کے واسطے انہوں نے اِدھر اُدھر سے جمع کی ہیں پوری طرح متفق ہوں لیکن اس بدقسمتی کا کیا جواب کہ انہیں اردو میں استعمال ہونے والے عربی فارسی کے میز، کرسی اور کمرہ جیسے الفاظ اطالوی زبان کے نظر آنے لگے۔

صابر حسن رئیس ———————— مسجد گول ٹونک

"وادیہ" پڑھ کر بے اختیار زبان سے "آمین" نکل گیا سردار جعفری صاحب کی نظم "بہ جہکر" کے بارہویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "واشارے" کی جگہ کوئی اور لفظ ہوگا۔ شاید کاتب کے سہو قلم سے ایسا کچھ ہو گیا ہے۔ ذرا اوریجنل سے میلان کرکے دیکھ لیں۔ اسی نظم کے پندرہویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں "شبنم نوک خار" کی ترکیب مولانا جامی کی "شبنم بہ نوک خار" کی اپ بھرنش سی لگی۔ سولہویں شعر کا دوسرا مصرعہ چار ایسے لفظوں میں مشتمل ہے جن میں سردست کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ ہاں کچھ دن ساتھ رہنے کے بعد شاید کچھ ربط پیدا ہو جائے [اس نظم میں کتابت کی کئی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ ادارہ] کالی داس گپتا رضا صاحب کا مقالہ غالبیات کے باب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اور محترم ڈاکٹر گیان چند صاحب کا مقالہ "اردو کے ہم صوت حروف" اس بات کا ثبوت ہے کہ موصوف کے پاس اس موضوع پر معلومات کا ذخیرہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جہاں انھوں نے گذشتہ شمارے میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرما کر ایک ایسے مقالے کا اضافہ کیا جس میں بیشتر دلائل اپنی جگہ باوزن ہیں وہیں انھوں نے ڈاکٹر گیان چند صاحب کو بھی عرصۂ دراز کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر گیان چند صاحب کا مقالہ بھی بہت وقیع ہے۔ ان کے ایک احتجاج سے میں اختلاف کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میری رائے کے مطابق ڈاکٹر سحر صاحب نے اپنے مضمون میں اب سے انیس سال پہلے لکھے ہوئے مضامین کے حوالے دیکر کوئی ایسی غلطی نہیں کی ہے جو قابلِ گرفت ہو۔ آج بھی لوگ حسب ضرورت ارسطو کی بوطیقا کو زیر بحث لے آتے ہیں۔ اس کے نظریات سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔

جوگندر پال کا پاکستان کا سفرنامہ بہت دلچسپ ہے خصوصاً اس لئے کہ انہوں نے اس مختصر سے سفرنامے میں پاکستان کے بیشتر ادیبوں سے ہماری ملاقات کرا دی۔ نیز یہ کہ پورا سفرنامہ صحیح معنوں میں ایک ادیب کا سفرنامہ لگتا ہے اور "شاعر" کے خالص اور معیاری ادبی

مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

جتیندر بلو کی کہانی ہجری ادب کا ایک اچھا ادب پارہ ہے۔ مہدی ٹونکی کی کہانی "اس گھر کے پاگل لوگ"، ان کی فطری صاف گوئی کا نمونہ ہے۔ اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی اسی قدر حق گو اور صفائی کی حد تک بے باک واقع ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ خود کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں برتتے۔

اگر آپ مجھے جانبداری کا الزام نہ دیں تو عرض کروں کہ اس بار غزلوں میں سب سے اچھی غزل ارشد عبدالحمید کی ہے۔ ان کے علاوہ نامی انصاری، ہلال فرید، شکیل جمالی اور عالم خورشید کی غزلیں بھی پسند آئیں۔ منظومات سبھی اچھی ہیں۔ اور منظومات کے منظوم تراجم میں "وہ چاہتے ہیں"، بہت پسند آئی۔

مکتوبات میں خانزادہ عبدالواسع خاں کا خط خاصا طویل ہے۔ ان کے طرز نگارش سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط انہوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ذہنی انتشار کی حالت میں لکھا ہے ویسے تو اس خط میں ان کی بہت سی لغزشیں ایسی ہیں جو قابل گرفت ہیں۔ لیکن ان سب سے قطع نظر، میں صرف حضرت بسمل سعیدی مرحوم کے بارے میں ان کے اس انکشاف کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کہ (بقول ان کے) بسمل ٹونکی اَن پڑھ تھے اور لکھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ اگر بسمل ٹونکی سے ان کی مراد بسمل سعیدی مرحوم ہی سے ہے تو یہ بات سراسر غلط ہے اور گمراہ کن ہے اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ضرورت سمجھیں تو مجھے حکم دیں۔ میں بسمل صاحب مرحوم کے چند خطوط کے عکس آپ کو ارسال کر دوں گا۔ میری خواہش ہے کہ اس سلسلے میں آپ شاعر کے آئندہ شمارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔

ادارہ شاعر کو اس تسامح کا بے حد افسوس ہے کہ عبدالواسع خاں صاحب کے خط میں بزرگ شاعر مرحوم بسمل سعیدی [ٹونکی] سے متعلق ایک ناشائستہ غیر تحقیق شدہ جملہ شائع ہو گیا۔ ہم اپنے ان تمام قارئین سے معذرت خواہ ہیں جنہوں نے اس جملہ کی طرف توجہ دلائی۔

"شاعر" کے لئے نایاب تصویریں، تحریریں اور خطوط ارسال کیجیے۔ ہم آپ کے شکریے کے ساتھ انہیں شائع کریں گے اور بہ حفاظت آپ تک پہنچا دیں گے۔

بقیہ صفحہ ۳۲ غزل اس نے چھیڑی

وتندہ دلی بہت ہے۔ ان کی دھنیں اتنی دلکش ہوتی ہیں کہ سامعین بھی دست و پا سے تال ہی نہیں دینے لگتے بلکہ ہمنوا بھی ہو جاتے ہیں۔

پنکج اُدھاس، طلعت عزیز، پی تارہ مسانی، انوپ جلوٹہ، محمد حسین احمد حسین وغیرہم کتنی نئی نئی آوازیں محفلِ غزل میں نئی نئی شمعیں روشن کر رہے ہیں۔

غزل کی مقبولیت میں فلم کا عطیہ بھی کسی درجہ ناقابل فراموش نہیں۔ نوشاد، خیام، غلام محمد، روشن، کلیان جی آنند جی، جے دیو اور کئی ایسے ہی باکمال میوزک ڈائرکٹرز اس سلسلے میں آسمانِ فن پر روشن ہیں۔

غزل گائیکی کی مزید مقبولیت کا انحصار شعراء کی توجہ پر بھی ہے۔ اعلیٰ خیالی اور احساسِ نازک کے معنی یہ نہیں کہ بھاری بھرکم الفاظ بھی دور از کار تراکیب ہوں اور شکستِ ناروا والے مصرعے یا ارکان ہوں۔ "راہ ہائے سبک" اور "چھوٹی منجھولی" تالوں کی واپسی ضروری ہے۔ بقول خسرو:

نظم را حاصل عروسی دان و نغمہ زیورش
نیست عیبی گر عروسِ خوب بے زیور بود

رفتار ـــــ ادبی اور تہذیبی خبریں

خبر نامہ

○ لندن میں مقیم اردو کے ادیبوں اور خدمت گزاروں نے مشترکہ طور پر طے کیا ہے کہ پہلی بین الاقوامی اردو کانفرنس لندن میں منعقد کی جائے جس کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آچکی ہے۔ خیال ہے کہ یہ عالمی کانفرنس جولائی ۱۹۸۶ء میں منعقد کی جائے گی جس کے آٹھ اجلاس ہوں گے اور تین روز تک جاری رہیں گے۔ کانفرنس کے سلسلے میں ایک ہفتہ تک مختلف ادبی پروگرام بھی ہوں گے جن میں شامِ غزل، شامِ افسانہ، انشائیوں کی شام اور نہایت وسیع پیمانے پر عالمی مشاعرہ منعقد کیا جائے گا جس میں ہند و پاک اور برطانیہ کے اردو شعراء کے علاوہ کئی دوسرے ممالک کے شعراء بھی مدعو کئے جائیں گے۔

○ نئی قومی تعلیمی پالیسی کے موضوع پر سہ روزہ سیمینار منعقدہ لکھنؤ میں حکومتِ ہند کی مرتب کردہ تعلیمی پالیسی کے تمام گوشوں پر تفصیل سے مباحثہ ہوا۔ عبدالسلام صدیقی نے کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اس کمیشن نے اردو کی حیثیت کو کل ہند سطح پر قبول کیا ہے لہٰذا ہر سطح پر اس زبان کی تعلیم کی ہمت افزائی کی جانی چاہئے۔ درجہ ۱ سے درجہ ۸ تک رائج سہ لسانی فارمولے کو اس کی اسپرٹ کے خلاف نافذ کیا گیا ہے یعنی ہندی اور انگریزی کے بعد تیسری زبان کا درجہ ایک کلاسیکی زبان سنسکرت کو دیا گیا ہے جبکہ سنسکرت کی تعلیم ہندی کے ساتھ تقریباً لازمی ہی ہے۔ کوٹھاری کمیشن کے آٹھویں باب کے ۴۸ ویں پیراگراف میں یہ بات درج ہے کہ کمیشن سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت یا کسی دوسری کلاسیکی زبان کو شامل کرنے کے خلاف ہے۔ اس کی رائے میں فارمولے کو جدید ہندوستانی زبانوں تک ہی محدود رہنا چاہئے۔

○ حکومتِ ہند وزارتِ تعلیم کے تحت ترقی اردو بورڈ نے سید احمد دہلوی کے مشہور ضخیم لغت "فرہنگ آصفیہ" کو چار جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اس لغت کا پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا تھا۔ اس کی زبردست مانگ کے پیشِ نظر ترقی اردو بورڈ اس لغت کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہا ہے۔

○ یومِ تاسیس آندھرا پردیش تقاریب کے سلسلے میں مشاعرہ، شامِ غزل اور قوالیوں کا پروگرام رویندر بھارتی ہال میں عمل میں آیا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر شنکر دیال شرما گورنر آندھرا پردیش نے کہا کہ اردو زبان محبت اور رواداری کے جذبے کے تحت پھیلی اور یہ زبان اخوت ہی کے ذریعہ سے پھیلے گی۔ وزیر اعلیٰ این ٹی راما راؤ نے شستہ اردو میں تقریر کی اور دورانِ تقریر اقبال کے دو شعر بھی سنائے۔

○ الطاف حسین حالی کی مشہور تصنیف مقدمۂ شعر و شاعری کو تاجک سائنس اکاڈمی کا پبلشنگ ہاؤس "دانش" شائع کرے گا۔ مقدمۂ شعر و شاعری کا روسی ترجمہ تاجک سائنس اکاڈمی کے ادارۂ مشرقی مطالعات کے سینئر ریسرچ اسکالر "شرف جان پلانووا" نے کیا ہے۔

○ آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کیلئے سالانہ دس لاکھ روپئے کی گرانٹ منظور کی گئی ہے۔

○ اڑیسہ میں اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے جس کے صدر اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ شری جے بی پٹنائک ہوں گے۔ اکاڈمی کے ممبروں کی تعداد ۱۲ ہوگی ان میں سے ایک کو اس کا سکریٹری مقرر کیا جائے گا۔ سالِ رواں میں اکاڈمی کے فوری اخراجات کے لئے ایک لاکھ روپئے کی رقم اکاڈمی نے منظور کی ہے۔

○ ریاستی اردو اکاڈمیوں کی رابطہ کمیٹی کا تیسرا اجلاس ترقی اردو بیورو اور دہلی اردو اکاڈمی کے تعاون سے غالب اکاڈمی نئی دہلی میں منعقد ہوا اس موقعہ پر ریاستی اردو اکاڈمیوں اور ترقی اردو بورڈ کی کتابوں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ترقی اردو بورڈ کے تحت کتابت اور خطاطی کے مراکز کے بہترین نمونوں کو بھی پیش کیا گیا تھا۔

○ ترقی پسند ادیبوں کی نیشنل فیڈریشن کی جانب سے اپریل ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ میں جشنِ زریں اور کانفرنس منعقد ہوگی۔

○ ساہتیہ اکاڈمی ہریانہ کے زیرِ اہتمام پانی پت میں ۳ ۲، ۲۴ دسمبر کو منعقد ہوئے دو روزہ مولانا حالی سیمینار میں وزیرِ اعلیٰ ہریانہ نے ہریانہ اردو اکاڈمی کے قیام کا اعلان کیا جو حالی اردو اکاڈمی کے نام سے ہوگی۔

○ بنگلور میں محبانِ اردو نے اردو زبان کے فروغ اور تحفظ کے لئے ایک اردو فنون و تہذیب اکاڈمی قائم کی ہے۔ اس اکاڈمی کا مقصد اردو ذریعۂ تعلیم کے رہائشی اسکولوں اور اردو یونیورسٹی کا قیام اور اردو خطاطی و فنون کے مراکز قائم کرنا ہے۔ بنگلور میں جون ۱۹۸۶ء میں ایک عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

○ اقبال اکاڈمی حیدرآباد کی جانب سے ۱۸ تا ۲۱ اپریل کو علامہ اقبال پر ایک عالمی سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے جس میں ہندوستان اور بیرونِ ملک امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی، یونان، فن لینڈ، ملیشیا، سوویت یونین، جاپان، فرانس، پاکستان اور بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے ممتاز اسکالرز اور نقادوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال بھی اس سیمینار میں شرکت کریں گے۔ مجلسِ استقبالیہ کے صدر جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست ہیں۔

انعامات

○ لیو کلب احمد آباد کی جانب سے "ایک شام ممتاز راشد کے نام" منعقد کی گئی، شامِ غزل کے اس پروگرام میں ونگ اد عباس نے ممتاز راشد کی غزلیں پیش کیں۔ حکومتِ گجرات کے وزیرِ مالیات اروند منگولی نے ممتاز راشد کو ایک شال اور ۵۱ ہزار روپے کا کیسٹ نذر پیش کیا۔

○ مشہور افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو کو ۱۹۸۵ء کا سوویت دیس نہرو ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ موصوفہ کے افسانوی مجموعے "پرایا گھر" پر دیا گیا ہے۔ یہ انعام ساڑھے سات ہزار روپے اور سوویت یونین کی دو ہفتے کی سیر پر مشتمل ہے۔

○ نیشنل کانفرنس ان چائلڈ ایجوکیشن منعقدہ سری فورٹ آڈیٹوریم نئی دہلی ۹ نومبر ۱۹۸۵ء کے موقع پر اردو کے مشہور شاعر، نقاد اور معلم ڈاکٹر مظفر حنفی کو قومی اعزاز سے نوازا گیا۔

وفیات

○ مشہور ناول نویس اور فلمی کہانی کار گلشن نندہ کا ۱۶ نومبر کو بمبئی کے بریچ کینڈی ہسپتال میں گردے کے عارضے کے سبب انتقال ہوگیا۔ وہ ۵۵ برس کے تھے۔ کئی سال قبل انھوں نے امریکہ میں گردے کی تبدیلی کا آپریشن کروایا تھا۔

○ اردو کے معروف شاعر سید علی افسر کا ۱۳ نومبر کو حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی دو کتابیں محمد نامہ اور خلافت نامہ بہت مقبول ہیں۔

○ تیج دیکلی کے چیف ایڈیٹر لالہ دھرم پال گپتا وفا کا مختصر علالت کے بعد ۱۵ نومبر کو نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔

○ ممتاز مرثیہ گو شاعر محمد مرزا مہذب لکھنوی کا طویل علالت کے بعد ۱۴ نومبر ۱۹۸۵ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ ۳۲ کتابوں کے مصنف کا بہت بڑا کارنامہ "مہذب اللغات" ہے جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہیں حکومت ہند نے پدم شری کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔

کتب و رسائل

● **نوائے دیر و حرم** ۔ بزرگ شاعر رنگاچاری رنگا الہ آبادی کا اوّلین شعری مجموعہ کلاسکی مزاج کی حامل شاعری میں عصری کرب کو سمونے کا تخلیقی عمل اور پرانی علامتوں، تراکیب اور لفظیات سے اپنی بات کہنے کی کوشش اس شعری مجموعے کی ہر غزل سے نمایاں ہے۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت ۱۸ روپے۔ پتہ: پرسیل پبلی کیشن، ۱۷ ایم آئی جی، باگھمبری آواس یوجنا، اللہ پور۔ الہ آباد۔

● **سیپ** (ماہنامہ) شمارہ ۴۸ سہ ماہی اشاعتِ خاص ضخامت ۲۹۰ صفحات۔ قیمت ۲۰ روپے۔ فکرِ نو کا ترجمان۔ ماہنامہ سیپ کے تازہ شمارے میں ۵ اہم مضامین۔ ۱۵ افسانے اور خاکے۔ یرو شیما پر ۱۱ غیر ملکی شعراء کی نظمیں۔ ترجمہ تبسم کاشمیری اور محمد امین۔
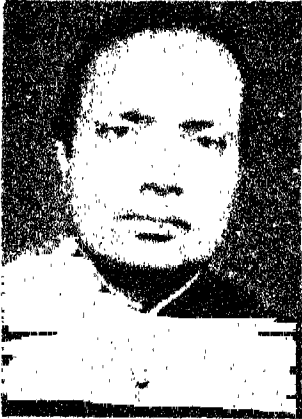
شاعر
دھنک رنگ لہجے / غزل رنگ خواب
دیوانِ غالب کے دو تاریخی نسخے۔ سیّد حامد حسین کی تحقیقی کاوش
غالب شناس کالی داس گپتا رضا کا ایک اور تحقیقی کارنامہ۔ توقیتِ غالب
جلد - ۵۷ -
قیمت ۴ روپے
شمارہ نمبر ۳

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

شمارہ ۳

مقالات

غزلیں

کہانیاں

نظمیں

جرعات

بساطِ سخن

بازیافت

آثارِ لفظ

چہرہ بہ چہرہ یادیں

بے صورت گر

رفتار

ادب کے قارئین کون؟

ادب اور ادبی رسائل کے بارے میں عام طور پر ایک مفروضہ یہ ہے کہ ادب صرف خواص کیلئے تخلیق ہوتا ہے اور ادبی رسائل صرف اور صرف تخلیق کار کیلئے ہوتے ہیں، گویا ادب اور ادبی رسائل کے قارئین کا پہلے سے تعین کر لیا گیا ہے، اس طرح جہاں ادب حلقہ بند ہوا وہیں اس کے پڑھنے والے بھی محدود ہوئے۔ اس مفروضے کو مسلسل تکرار نے جو نفسیاتی فضا بندی کی ہے اسی کا پیش منظر وہ ادبی رسائل ہیں جو آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں، ان میں وہ معیاری ادبی رسائل بھی ہیں جو کسی تحریک یا وقتی سنسنی کے تحت شائع ہوتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹ گئے اور نئے رسائل اپنی فرسودہ نہج کے ساتھ نہایت ہی گاڑھی اور غیر تخلیقی تربیت و تہذیب میں پیلے ہوئے متذکرہ مفروضے کو اپنی منزل بنائے ہوئے ہیں۔

یہ مفروضہ ذاتی رسائل سے اکاڈمیوں کے تحت شائع ہونے والے ادبی رسائل تک یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے۔ اگر اس مفروضے کو صحیح مان لیا جائے تو بھی کوئی نقصان دہ بات نہیں کیوں کہ ایک بات بے حد مشہور ہے کہ ہندستان کی موجودہ آبادی سے کہیں زیادہ اردو کے شعراء پائے جاتے ہیں۔ ان میں چند لاکھ تو ضرور ایسے ہوں گے جو ادبی رسائل کے پڑھنے کو ناگزیر جانتے ہوں گے لیکن کیا ایسا ہوتا ہے؟ جبکہ کوئی ادبی رسالہ پانچ سو، ہزار سے زیادہ شائع نہیں ہوتا۔ اگر ادب لکھنے والوں ہی کے لئے مخصوص ہے تو کیا لکھنے والے ختم ہوگئے جو ادبی رسائل پڑھ سکیں۔ ادب انحطاط پذیر ہے وہیں اس کے پڑھنے والے بھی محدود سے محدود تر ہوگئے ہیں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہمارے قلم کاروں نے بے جان اور بے معنی ادب کی تخلیق کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور ملک بھر کی اردو اکاڈمیاں علاقائیت کو جنم دے رہی ہیں وہیں چھوٹے چھوٹے قلم کاروں کا دماغ بھی خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اپنا ادب، ادبی رسائل اور اپنے اسلاف سے گریز خود ساختہ "عظیم" بن جانے کے عمل نے ادب اور ادبی رسائل کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ آج جب کہ انگریزی اور ملک کی دیگر اہم زبانوں کے رسائل اور کتابیں اعلیٰ درجے کی طباعت اور گٹ اپ کیساتھ بک اسٹالس پر نظر آرہی ہیں وہیں اردو کے رسائل اور کتابیں گھٹیا اور غیر معیاری طباعت اور گٹ اپ کا مظاہرہ کرتی ہوئی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ خاص طور پر ادبی رسائل اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس مفروضے کے محور پر ہمارے ادبا، شعراء اور ادبی رسائل اور ہماری اکاڈمیاں گردش کر رہی ہیں، وہ محور ہی غلط ہے۔

شاعر جب سے آفسٹ پر شائع ہو رہا ہے اور اس کے گٹ اپ وغیرہ میں جو غیر معمولی تبدیلی آئی ہے اس نے بہت سے مفروضے رد کر دئے ہیں ہمیں اپنے نامعلوم قارئین کا اندازہ نہیں ہے، ہم نے جن لوگوں پر ادب کی تبلیغ و ترسیل کا تکیہ کر رکھا ہے وہ ایک حقیقت ہوتے ہوئے بھی کسی سراب سے کم نہیں اور ہمیں جن لوگوں کی تلاش ہونی چاہئے ہم ان سے قصداً فاصلہ بنائے رکھنے پر مصر رہتے ہیں۔

ہمیں جو خطوط اپنے قارئین سے موصول ہوتے ہیں ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو رسائل و کتب کی نکاسی کا کام کرتے ہیں یعنی وہ کتب فروش جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک خط کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

> "...... پرچہ مقبول ہو رہا ہے، دکان پر ہی تمام کاپیاں فروخت ہو جاتی ہیں، خریدار منتظر رہتے ہیں کسی ادبی پرچے کی طلب اس کے مقبول ہونے کی ضامن ہے، یہ تمام پرچے عام خریدار خریدتے ہیں، شعراء اور ادبا صرف ایک نظر ڈال جاتے ہیں، اگر یہ لوگ پرچے خریدنا شروع کر دیں تو ادبی رسائل کی فروخت کئی گنا بڑھ جائے، مگر ان لوگوں کی شریعت میں خرید کر پڑھنا شاید بدعت میں شامل ہے......" آزاد کتاب گھر، ساکچی بازار جمشید پور

یہ اور اس نوع کے کئی خطوں سے ایک بات بالکل صاف ہے کہ ہمارے یہاں خرید کر پڑھنے کا رجحان کم سے کم ہوتا جا رہا ہے لیکن نامعلوم قارئین بہر حال موجود ہیں اور وہ ادب بھی پڑھتے ہیں دوسرے یہ کہ ہمارے ادبا و شعراء ادبی رسائل نہیں خریدتے تاوقتیکہ ان کی کوئی تخلیق اس رسالے میں شائع نہ ہوئی ہو۔ ادبی رسائل کے باقی نہ رہنے کی کئی وجوہ ہیں لیکن یہ بھی ایک اہم اور بہت بڑی وجہ ہے۔

ہمیں جہاں اس بات کی خوشی ہے کہ ہم اپنے نامعلوم قارئین تک اپنا ادب پہنچا رہے ہیں وہیں یہ دکھ بھی ہے کہ ہمارے قلم کار چھپنے چھپانے کے دائرے سے باہر کیوں نہیں آتے۔ کیا ادب تخلیق کرنا ہی ان کا کام ہے؟ کیا مطالعہ کرنا ان کے لئے ضروری نہیں؟ کیا ادبی رسائل صرف اس لئے شائع ہوں کہ وہ تمام تر زیاں اٹھاتے ہوئے صرف اور صرف تخلیق کاروں کو شائع کرتے رہیں اور قلم کار تمام باتوں سے بے نیاز رہے۔ یہاں یہ بات بھی ابھر کر آتی ہے کہ اگر ادبی رسائل اچھی طباعت و گٹ اپ کے ساتھ تنوع بھی پیدا کریں تو مقبول بھی ہو سکتے ہیں۔

بازیافت

بیاضِ رفعت [قلمی] کے دو صفحات کا عکس از مولانا ابوالفضل محمد عباس شروانی رفعت [پ : ۳۰ر مئی ۱۸۲۶ء بنارس م : ۱۳۱۵ھ / ۹۸-۱۸۹۷ء بھوپال] بیاض کا سائز ۵"×۹" ہے اور صفحات ۲۰۸ ہیں۔ بیاض کے صفحہ نمبر ۲۷ پر رفعت نے اپنے استاد مرزا غالب کے دو تاریخی قطعات اپنے قلم سے درج کیے ہیں جو انہوں نے کسی اخبار سے لئے تھے یہ قطعات غالب کے متداول کلام میں شامل نہیں۔ جناب کالی داس گپتا رضا نے اپنی کتاب متعلقات غالب [مطبوعہ ۱۹۷۸ء] میں پہلی بار یہ قطعات شائع کیے تھے۔ ان قطعات کا ماخذ اول غالب کے قلم کی تحریر ہے جو کتب خانہ رضا میں محفوظ ہے۔ بیاض رفعت پر رضا صاحب نے شاعر (بمبئی) اور اپنی کتاب "غالبیات" چند عنوانات [مطبوعہ ۱۹۸۲ء] میں تفصیلی مضامین تحریر کئے ہیں۔
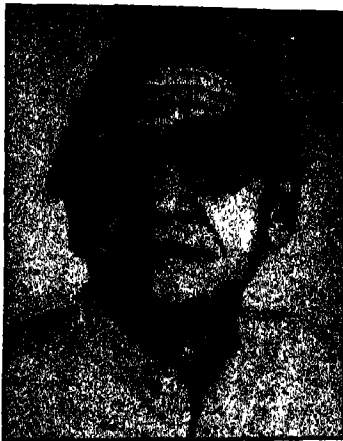
از کلام استاد فرخ نہاد جنت آرامگاہ مرزا اسداللہ خان غالب دہلوی علیہ الرحمہ الہامات دردو کہ تہنیت از کلک ضیا نقل

تاریخ تولد فرزند نواب منعم سیرت

جواب فرزند بخشیدہ ایزد — شدم طالب اسم تاریخ آن

جوابم سخن سنج غالب بگفتا کہ — بماناد سید عنایت علی خان

ولہ علیہ الرحمہ ۱۲۹۳

زہی نواب بابا خان سالار — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حسن نعیم

احمد رئیس

منصور سبزواری

مرزا حامد بیگ

سرشار بلند شہری

رحمت امروہوی

ساجد رشید

نسیم محمد جان
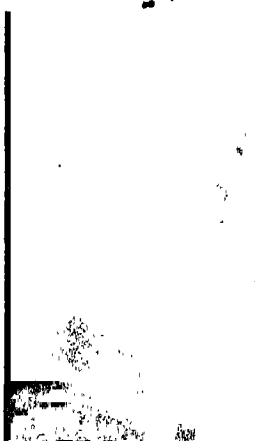
شکیب رضوی

خامۂ غالب کی گوہر افشانی

بخطِ غالب البم سے چار نادر تحریریں

اکبر علی خاں عرشی زادہ
پھلوار۔ رام پور۔ ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

غالب سے دلچسپی رکھنے والے حلقے بخوبی واقف ہیں کہ تقریباً ۱۹۵۹ء سے میں غالب کی اصل تحریروں کے عکس جمع کر رہا ہوں اور انہیں بخطِ غالب عنوان سے دیباچے اور ضروری حواشی کے ساتھ ایک البم کی شکل میں مرتب اور شائع کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ دیوان غالب بخطِ غالب نسخۂ عرشی زادہ اس سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر ۱۹۶۹ء میں اہلِ علم کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔

دوسری جلد مکاتیب اُردو و فارسی پر مشتمل ہونا تھی جس میں نوابان رام پور کے نام تمام مکاتیب کے علاوہ دیگر خطوط کے عکس بھی شامل ہیں لیکن اس کے معتدبہ حصے کے نگیٹو ایک صاحب نے مجھ سے انلارجمینٹ تیار کرنے کے بہانے حاصل کیے اور پھر مرقع غالب کے نام سے شائع کر دیا۔ اس طرح کئی برس کی میری محنت کو تو ان صاحب نے ضایع کیا ہی اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ انہوں نے جگہ جگہ غالب کی اصل تحریروں میں تحریفات کرنے سے بھی تامل نہ کیا۔ چنانچہ اس دخل در معقولات کے باعث املائے غالب ہی نہیں متنِ غالب بھی بُری طرح مجروح ہو گیا۔ اور عکس جو ایک قابلِ اعتبار ذریعہ ہے انتہائی ناقابلِ اعتبار شکل میں اہلِ علم تک پہنچا۔ چنانچہ اس گمراہ کن اشاعت سے بعض اہلِ قلم خوب خوب گمراہ ہوئے اور انہوں نے غلط در غلط نتائج نکالے اس لئے کہ یہ حضرات غالب کی اصل تحریروں کی خصوصیات سے قطعاً ناواقف تھے اور انہوں نے مرقع غالب کو معتبر جان کر اپنی تحقیق کی بنیاد بنا لیا تھا جس کا حال یہ تھا کہ اگر اسے کوئی دیکھ کر غالب کے بارے میں کہے کہ خط غلط معنی غلط املا غلط انشا غلط تو کچھ بے جا نہ ہوگا بہر حال یہ معاملہ تو رفت گزشت ہوا۔

غرض مدعا یہ ہے کہ میرے پاس غالب کی سیکڑوں اصل تحریروں کے عکس موجود ہیں چونکہ مستقبل قریب میں ان کی اشاعت کا سامان متوقع نہیں اس لئے اس ذخیرے سے فی الوقت چار نمونے پیشِ خدمت ہیں۔

سب سے پہلے غالب کے دو فارسی شعر ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے اپنے مرشد معنوی مرزا عبد القادر بیدل کی دو مثنویوں محیط اعظم اور طور معرفت کی تعریف و توصیف میں نظم کرکے ان مثنویوں کے مخطوطوں پر بقلم خود درج کر دیے تھے چونکہ ان دونوں اشعار کے آخر میں ان کی اوّلین مہر مثبت ہے اس لئے میں ان اشعار کا زمانۂ نظم ۱۲۳۱ھ بھی قرار دیتا ہوں جو مہر میں کندہ ہے اس طرح یہ دو شعر غالب کے قدیم فارسی کلام کا ایک نمونہ بھی ہیں۔ مذکورہ دونوں مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

بحفظِ غالب البم کی تیاری کے دوران میں نے ہر ممکن کاوش سے کام لیا ہے اس سلسلے میں کبھی کبھی عجیب اتفاق بلکہ حُسنِ اتفاق کا سامنا ہوا جو قطعاً غیر متوقع تھا کئی برس کی بات ہے۔ میں کسی کام سے دہلی گیا ہوا تھا۔ اتوار کے دن مجھے ایک صاحب سے ملنے جامع مسجد کے علاقے میں جانا ہوا۔ واپسی میں ایڈورڈ پارک سے گذرتے ہوئے سڑک کے دونوں جانب کباڑی بازار میں پرانے سامان اور پرانی کتابوں کے انبار لگے نظر آئے۔ جو ہر اتوار کو یہاں لائے جاتے ہیں۔ کتابوں کے ایک ڈھیر پر میں نے بھی نگاہ ڈالی جہاں اردو کے عام پسند رسائل اور کتابیں بڑی تعداد میں رکھی تھیں۔ ان میں میری نظر ایک مختصر سے پیکٹ پر ٹھہر گئی۔ یہ دبیز کاغذ کا ایک پرانا لفافہ تھا جس کے اندر ایک دو کتابیں موٹی ڈورے بندھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لفافہ لندن کی مشہور مشرقی کتابوں کی فرم لوزاک کا تھا اور اس پر انگریزی میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ۲۲۔ اے میور روڈ الٰہ آباد پتہ ٹائپ کیا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس ٹائپ شدہ پتے کو قلم زد کر کے کسی ڈاکٹر صدیقی مرحوم ہی نے مولوی مہیش پرشاد مرتب خطوطِ غالب کا نام اپنے قلم سے لکھ دیا تھا چونکہ میں صدیقی صاحب مرحوم کے اندازِ خط سے واقف ہوں اس لئے مجھے معاً خیال آیا ہو نہ ہو اس لفافے میں غالب سے متعلق کوئی کتاب وغیرہ ہے جو مہیش پرشاد کو ڈاکٹر صدیقی نے بھیجی ہو گی اور اُفتادِ زمانہ نے اسے کباڑ میں لا پھینکا میں نے لفافہ کھولا تو اس میں کتابوں کی جگہ ایک لائن اور ایک ہاف ٹون دو بلاک رکھے ہوئے نکلے۔ مجھے انہیں دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اس لئے کہ یہ دونوں غالب کی اصل تحریروں کے عکس تھے شاید پانچ روپے میں میں نے انہیں خرید لیا یہ گمان غالب یہ دونوں بلاک مولوی مہیش پرشاد کے مُرتب خطوطِ غالب کی دوسری جلد کے لئے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے تیار کرائے تھے اور مہیش پرشاد کے ذخیرے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو علی گڈھ منتقل ہو گئے تھے میں نے جس زمانے میں انہیں خریدا اس وقت انجمن علی گڈھ سے منتقل ہو کر دہلی آ چکی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو ساز و سامان غیر ضروری جان کر انجمن سے خارج کیا گیا انہیں میں یہ دونوں بلاک بھی انجمن سے جدا ہو کر بازار میں آ گئے۔ یہ بہانہ ہوا گدڑی کے لعل مجھ تک پہنچ جانے کا۔

رام پور واپس آ کر میں نے خطوطِ غالب کے مجموعوں میں ان خطوں کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ ان میں ایک مطبوعہ اور دوسرا غیر مطبوعہ ہے۔

(۲) مطبوعہ خط کا جو عکس علاوہ اصل خط کا محض ایک حصّہ ہے اسے پہلے بخطِ غالب ملاحظہ کیجئے۔

بھائی سے دو سوال ہیں ایک تو یہ کہ
مجموعۂ نثر کے خاتمہ کو کیا کروں وہ مبنی تھا
اس حقیقت پر کہ نولکشور نواب ضیاء الدین خان
سے واسطۂ انطباع کے لیگیا جب یہ واقع ہوا
تو اب اسکو نکال ڈالوں اور اسکے جو کچھ
نثریں اور ہیں وہ لکھ دوں ۱۲

اوراق اشعار مرحومی زین العابدین خاں مستعار
ہیں اس واسطے تم اپنے ہاں کے مجموعہ سے
تصحیح اسکی کرلو پھر یہ امر واقع ہوا یا ہونے
والا ہے ۱۲
ترجمۂ ابوالفدا کی جلد واپس پہنچی ہے ۱۲
جواب کا طالب غالب ۱۲

غالب کے اس خط کے عکس کو موجودہ املا میں نقل کیا جاتا ہے۔

دو بھائی سے دو سوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعۂ نثر کے خاتمے کو کیا کروں وہ مبنی تھا اس حقیقت پر کہ نول کشور نواب ضیاء الدین خان سے واسطۂ انطباع کے لئے گیا۔ جب یہ واقع ہوا تو اب اس کو نکال ڈالوں اور اس کی جو کچھ نثریں اور ہیں وہ لکھ دوں ۱۲

اوراق اشعار مرحومی زین العابدین خاں مستعار ہیں۔ اس واسطے کہ تم اپنے ہاں کے مجموعے کی تصحیح اس سے کرلو پھر یہ امر واقع ہوا یا ہونے والا ہے ۱۲
ترجمۂ ابوالفدا کی جلد واپس پہنچی ہے ۱۲

جواب کا طالب غالب ۱۲

جہاں تک میرے علم میں ہے اصل تحریر ایک زمانے میں مختار الدین احمد آرزو صاحب کے پاس تھی۔ پھر ان سے مالک رام صاحب کے پاس پہنچی۔ اور کم سے کم غالب صدی تقریبات تک انہیں کے پاس رہی۔ اب بمبئی کے کسی صاحب(۹) کے پاس ہے ڈاکٹر صدیقی نے اسے کہاں سے حاصل کیا یہ بتانا ان کے بعد ممکن نہیں رہا شاید آرزو صاحب کچھ روشنی ڈال سکیں۔

دوسرا خط جو تا حال شائع نہیں ہوا۔ ایک مختصر سا رقعہ ہے جو میری رائے میں معرکۂ قاطع برہان کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔ اس کے مکتوب الیہ علاؤ الدین خاں علائی یا ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں ہو سکتے ہیں جن کے کتب خانوں سے غالب بالعموم استفادہ کیا کرتے تھے۔ گذشتہ دنوں ڈاکٹر خلیق انجم نے خطوطِ غالب کی تدوینِ نو کا آغاز کر دیا ہے ان سے ان خطوط کا تذکرہ آیا تو انہوں نے اپنے زیرِ ترتیب مجموعۂ خطوط کے لئے ان کی فرمائش کی۔ اس فرمائش کی تعمیل تو میں نے کر دی ہے اور آئندہ کسی جلد میں یہ شامل بھی ہو جائیں گے مگر ایک تو ابھی یہ نہیں معلوم کہ جس مجلّہ میں انہیں شامل ہونا ہے وہ کب شائع ہوگی دوسرے غالبیات کے نوادر کے ایسے شیدائی بھی ہو سکتے ہیں جن کی نظر سے کتاب نہ گذر سکے اس لئے خلیق انجم سے اجازت کے ساتھ کہ اوّلین حق انہیں کا تھا اسے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مکتوب کا بخطِ غالب عکس ملاحظہ ہو:

صاحب میں کل تمہارا مسہل سمجھے ہوئے تھا اس وقت میر غالب علی
سے معلوم ہوا کہ تم مسہل پیئے ہوئے بیٹھے ہو خدا فضل
کرے بشرط بقائے حیات آخر روز میں بھی آؤنگا
فرہنگ جہانگیری مسترد پہنچی ہے ہفت پیکر دشت بہشت
اگر دونوں ہوں تو دونوں معًا اور اگر دونوں نہوں تو
جو ہو وہ نیاز علی حامل رقعہ کو حوالہ کرو غالب ۱۲

"صاحب"، میں کل تمہارا مسہل سمجھے ہوئے تھا۔ اس وقت میر غالب علی سے معلوم ہوا کہ تم مسہل پیے ہوئے بیٹھے ہو۔ خدا فضل کرے۔ بشرطِ حیات آخر روز میں بھی آؤں گا۔ فرہنگ جہانگیری مسترد پہنچی ہے۔ ہفت پیکر دشت بہشت اگر دونوں ہوں تو دونوں معًا اور اگر دونوں نہوں تو جو ہو وہ نیاز علی حاملِ رقعہ کو حوالے کرو۔

غالب ۱۲

نیاز علی کا تذکرہ غالب کے ہاں اور جگہ بھی آیا ہے مگر فی الوقت میر غالب علی کے بارے میں کسی دوسرے حوالے کی نشاندہی ممکن نہیں۔
امید ہے کہ صاحبانِ ذوق خامۂ غالب کی گوہر افشانی کے ان نمونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور محفوظ رکھیں گے۔

چہرہ چہرہ یادیں

مولانا حالی کی "یادگارِ غالب" ۱۸۹۷ کو غالب کی شاعری کا اولین تنقید نامہ قرار دیا جا سکتا ہے، اس طرح غالب شناسی کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غالب کے وہ دوسرے نقاد ہیں جنہوں نے مشرقی تنقید کے بجائے مغربی تنقید کے تناظر میں غالب کے کلام کا جائزہ لیا۔ غالب پرست بجنوری کا یہ جملہ: "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک مقدس وید اور دوسرا دیوانِ غالب"۔ آج بھی نیا اور بے حد پرجوش معلوم ہوتا ہے۔ شاعر، نقاد بجنوری نے "نسخۂ حمیدیہ" کے لئے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا وہ بعد میں "محاسنِ کلامِ غالب" ۱۹۲۱ء کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری
۱۸۸۸ ○ ۱۹۱۸

حسن نعیم

ہم تمہاری زندگی میں کچھ خوشی سی لائے ہیں
اس اندھیرے میں کوئی شئے روشنی سی لائے ہیں

جس ستارے کی روش سے ہو گئی دنیا اُداس
ہم وہیں سے اک تمنا چاند سی لائے ہیں

جن کی قسمت رنگ و بو ہے، اُنمیں رہ کر کچھ دنوں
بے دلی کی انجمن میں، تازگی سی لائے ہیں

سوچئے کیا، دوستوں نے کس طرح غمگیں کیا
دیکھئے کس کس طرح وہ خوش دلی سی لائے ہیں

سب کی نظروں سے پرے تھا، سبزہ و دریا نعیم
ہم کسی ویران نگر سے کچھ نمی سی لائے ہیں

یاں ستم سے لڑنے والا ہے، ستمگر سے بڑا
خاک و خوں میں مل کے بنتا ہے وہ لشکر سے بڑا

تجربوں کی روشنی میں سب نظر آیا مجھے
داغ سجدہ ہو گا اک دن ماہ و اختر سے بڑا

تنگ دل کچھ کر دیا ہے، دشت کے حالات نے
ورنہ میرا دل بھی آگے تھا سمندر سے بڑا

کل جو دست سنگ ساراں میں بہت ناچیز تھا
اب لہو میں ڈوب کے ہے سارے پتھر سے بڑا

اپنے سائے، اپنے پھل سے محترم ہے وہ نعیم
اس زمیں پر پیڑ بھی ہے اپنے جوہر سے بڑا

● سی۔۳۹، شالیمار، یوگ نگر، دہیسر، بمبئی نمبر ۶۸

توقیتِ غالب

کالی داس گپتا رضاؔ ● ۲ لے جل درشن، ۴۳ اے، چوتھا منزل نیپنسی روڈ، بمبئی - ۶

۱۷۵۰ء تقریباً میرزا قوقان بیگ خان ـــ غالب کے دادا کی سمرقند سے ہندستان میں آمد [چندن لاہور میں رہے] شاہ عالم کے عہد میں دلی پہنچے۔ شاہی ملازم پھر مستعفی ہو کر مہاراجہ جے پور کے ہاں نوکری۔ آگرہ میں قیام۔

۱۷۵۸-۵۹ء قتیل کی ولادت شاہ جہاں آباد میں۔

۱۷۹۷ء [۲۷ دسمبر] [محمد] اسد اللہ [بیگ] خان [غالبؔ] کی آگرے میں ولادت۔

[قوقان بیگ خان کے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خان کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی افسر خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی عزت النسا بیگم سے ہوا۔ یہ اسد اللہ خان [غالب] کے والدین تھے]

۱۷۹۹ء ـــ ۱۸۰۰ء یوسف علی [بیگ] خان [غالب کے چھوٹے بھائی] کی ولادت۔

۱۷۹۹ء [۴ مئی] ٹیپو سلطان کی شہادت۔

۱۸۰۲ء سالِ ولادت لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف [برادرِ غالبؔ]

۱۸۰۲ء میرزا عبداللہ بیگ خان [غالب کے والد] کا ریاست الور کی ملازمت میں انتقال۔

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست ۔۔۔ درخاک راج گرھ پدرم را بود مزار [غالبؔ]

اسد اللہ خان اور ان کے خاندان کا نصر اللہ بیگ خان [عبداللہ بیگ خان کے برادرِ خرد] کی سرپرستی میں آنا [نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلع دار تھے ۱۸۰۳ء میں انھوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔ اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو مشاہرے پر ۴۰۰ سواروں کے رسال دار مقرر ہو گئے]

۱۸۰۳ء [۱۸ اکتوبر] آگرہ پر انگریزوں کا قبضہ۔

۱۸۰۶ء [؟ اپریل] نصر اللہ بیگ خان کا ہاتھی سے گر جانے سے زخمی ہونا اور انتقال [نوابؔ احمد بخش خان والیِ فیروز پور جھرکا ولوہارو کی ہمشیر نصر اللہ بیگ خان کے عقد نکاح میں تھی]

۱۸۰۶ء [۴ مئی] احمد بخش خان کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خان کے پس ماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپیہ [پہلا شقہ]۔ [اس وظیفہ میں نصر اللہ بیگ خان کی والدہ، تین بہنیں، اسد اللہ خان اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی [بیگ] خان حصہ دار تھے]

۱۸۰۶ء [۷ جون] وظیفہ کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی۔ [دوسرا شقہ] غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپئے سالانہ [اس شقہ کی رو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وظیفے میں دو ہزار سالانہ کا حصہ دار قرار دیا گیا تھا]

۱۸۰۶ء [۲۸ نومبر] جلال الدین شاہ عالم ثانی کا انتقال۔

	معین الدین اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔
۱۸۰۷ء-۱۸۰۸ء تقریباً	شعرگوئی کا آغاز۔ اسد تخلص۔ ایک اور شاعر میر امانی اسد تھے۔ چونکہ لوگ اس کا کلام ان سے منسوب کرنے لگے تھے، انھوں نے اسد تخلص ترک کرکے [تقریباً ۱۸۱۶ء میں] اس کی جگہ غالب کرلیا تاہم کبھی کبھی اسد تخلص بھی روا رکھا۔
۱۸۰۹ء-۱۸۱۰ء	قلندر بخش جرأت کی لکھنؤ میں وفات۔
۱۸۱۰ء	اسداللہ خان کی مولوی محمد معظم کے مکتب [آگرہ] میں تعلیم [بحوالہ معیار الشعراء از خوب چند ذکا؛ گلستانِ بے خزاں از قطب الدین باطن۔ بعد میں حالی وغیرہ]
۱۸۱۰ء [۹ اگست]	الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے دلی میں نکاح۔ [الٰہی بخش خان، نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ نکاح کے وقت غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی۔ معروف کا نامکمل دیوان چھپ چکا ہے، مکمل مخطوطہ میرے کتب خانے میں موجود ہے]
۱۸۱۰ء [۲۰ ستمبر]	میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات۔
۱۸۱۲ء-۱۸۱۳ء	غالب کی دلی میں آمد اور مستقل سکونت۔
۱۸۱۴ء [۹ اگست] سے [۲۸ جولائی] ۱۸۱۷ء تک	کسی بھی سال میں مرزا یوسف کی شادی۔ [یقینی دن، تاریخ اور مہینہ۔ دوشنبہ [سہ شنبہ؟] ۲۲ شعبان]
۱۸۱۶-۱۵ء	اسداللہ خان عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ غالب کی پہلی مُہر [۱۲۳۱ھ] غالب کی عمر ۱۹۔۲۰ برس کی تھی یعنی ان کے عیش و نشاط کا زمانہ تھا۔ غالب کی دوسری مُہر اسداللہ الغالب ۱۲۳۱ھ [یہ دونوں مُہریں ایک ہی سال میں بنوائی گئیں] اس مُہر کی بنا حضرت علی کا لقب ہے اور یہ بطور سجع ہے۔ بعد میں تبدیلِ تخلص کے وقت یہی سجع کام آیا اور اسد کی جگہ غالب تخلص قرار پایا۔
۱۸۱۶ء	غالب تخلص کا باقاعدہ استعمال۔
۱۸۱۷ء [۱۹ مئی]	انشا کی لکھنؤ میں وفات۔
۱۸۲۳-۲۲ء	محمد اسداللہ خان ۱۲۳۸ھ غالب کی تیسری مُہر۔ یہ مُہر انیسویں صدی کے ربع اوّل میں دلی کے علماء میں ایک بہت بڑے مذہبی مباحثے سے پیدا شدہ رجحان کی دین ہے، جس میں فضل حق خیرآبادی کے اصرار پر غالب کو بھی ایک مثنوی کہنی پڑی تھی۔
۱۸۲۵-۲۴ء	مصحفی کی لکھنؤ میں وفات۔
۱۸۲۵ء	خواجہ حاجی کا انتقال [انتقال شاید ۱۸۲۵ء کے شروع میں ہوا ہوگا۔ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کی پنشن کی درخواست میں غالب نے لکھا ہے کہ خواجہ حاجی کا انتقال تین برس ہوئے جذام کے مرض سے ہوا۔]
۱۸۲۵ء [مئی۔ جون]	فیروزپور جھرکا کا سفر۔ نواب احمد بخش خان کی خدمت میں بسلسلۂ حقِ پنشن۔ یہ بات جنرل اختر اولی کے انتقال

[۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء] سے کچھ پہلے کی ہے۔

۱۸۲۵ء [نومبر، دسمبر] میرزا یوسف علی [بیگ] خان کی شدید بیماری، دیوانگی کا آغاز۔

۲۵-۱۸۲۶ء قرض خواہوں کے تقاضوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ایضاً نواب احمد بخش خان کے ساتھ بھرت پور کا سفر۔ مقصد سر چارلس مٹکاف سے ملنا تھا۔

" واپسی پر ایک لمبے عرصے تک فیروزپور جھرکا میں نواب احمد بخش کے ساتھ قیام۔

۱۸۲۶ء الٰہی بخش خاں معروفؔ [غالبؔ کے خسر] کا انتقال۔

۱۸۲۶ء [۱۳ر اکتوبر] نواب احمد بخش خان کی فیروزپور جھرکا اور لوہارو کی حکومت سے دست برداری [نواب شمس الدین احمد خان والیِ ریاست]

۱۸۲۶ء [دسمبر] [الف] قرض خواہوں کے ڈر سے دلی نہ گئے، اس لیے فیروزپور جھرکا ہی سے کلکتہ کے سفر کا آغاز ہوا۔

[ب] چونکہ نواب احمد خان نے غالبؔ کو سر چارلس مٹکاف سے نہ ملایا۔ اس لیے غالبؔ مایوس ہو گئے۔ پھر گورنر جنرل کے ورود [کانپور؟] کی خبر پھیلی۔ غالبؔ نے سوچا کہ کانپور چلا جائے، وہاں سر چارلس مٹکاف بھی ضرور جائیں گے، اس لیے واپسی پر ان کی معیت میں ان سے مل لوں گا، چنانچہ اس ارادے سے فرخ آباد اور کانپور کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر کانپور میں سخت بیمار ہو گئے اور وہیں سے خاطر خواہ علاج نہ ہونے پر پالکی میں لکھنؤ چلے آئے، اور وہاں پانچ مہینے سے اوپر رہے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا راس نہیں آئی۔ یہاں سے باندہ گئے، اور لگ بھگ چھ مہینے نواب باندہ کے مکان پر رہے اور شفا پائی۔

[ج] باندہ سے خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتہ کا سفر جاری۔ دو تین ملازم ساتھ تھے۔

۱۸۲۷ء [اکتوبر] نواب احمد بخش خان کا انتقال۔ غالبؔ کو یہ خبر سفرِ کلکتہ کے دوران مرشد آباد میں ملی۔

۲۷-۱۸۲۸ء فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز [اس سے پہلے کا سرمایۂ فارسی شعر ناقابلِ اعتنا اور مقدار میں بہت کم ہے] گلِ رعنا میں شامل فارسی انتخاب اس پر شاہد ہے کہ ۱۸۲۸ء [۱۲۴۴ھ] تک ان کے پاس ۲۷ غزلوں سے زیادہ فارسی کلام نہ تھا۔ اور وہ بھی اسی سفرِ کلکتہ کے دوران کہا گیا تھا۔ غالب کے قدیم ترین خطی نسخہ میں بھی اردو کا تو مکمل مرتب دیوان ہے مگر فارسی کی صرف ۱۳ رباعیاں ہیں۔

۱۸۲۸ء [۲۱ فروری] کلکتہ میں ورود۔ اسی روز شملہ بازار متصل چیت پور میں گردتالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں رہنے کو مکان مل گیا۔

۱۸۲۸ء [۲۸ر اپریل] پنشن کے مقدمے کا آغاز۔

[سرکاری درباروں میں کرسی نشینی کا آغاز۔ گلِ رعنا کی ترتیب و تدوین]۔ [یہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب انھوں نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا]

ایضاً۔ پنشن کی درخواست میں مذکور ہے کہ "میرا نام محمد اسد اللہ خاں ہے" [اس کے سامنے وہ خط بنام تفتہ بھی دیکھیے جس میں غالب نے لکھا ہے کہ وہ اب "محمد" کا لفظ مبارک اپنے نام کے ساتھ اس لیے نہیں لگاتے کہ لوگوں نے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے بھی موقوف کیا۔]

ایضاً۔ غالب نے درخواست میں لکھا کہ آج ان پر بیس ہزار روپیہ قرضہ ہے۔

۱۸۲۹ء [۲۹ نومبر] تین برس کی غیر حاضری کے بعد دلی واپس۔ سفرِ کلکتہ ختم۔

۱۸۳۰ء۔ راجا رام موہن رائے کا سفر انگلستان۔ ۱۸۳۰ء ۱۰ اگست نظیر اکبرآبادی کی وفات ۱۸۳۱ء۔ ۲۷ جنوری مقدمۂ پنشن خارج

[اس کے بعد وہ اپیل کرتے رہے۔ جس کا سلسلہ ۱۸۴۴ء تک رہا۔ لیکن یہ ابتدائی فیصلہ قائم رہا]

۱۸۳۳ء [۱۶ر اپریل]	دیوانِ متداول [اُردو] کی تاریخ ترتیب۔
۱۸۳۴ء [تقریباً]	شیفتہ کی غالب سے پہلے پہل جان پہچان۔
ایضاً۔	پہلی بار ہندوستانی مجسٹریٹوں کا تقرر، انگریزی عہد میں۔
۱۸۳۴ء [۱۸ر اکتوبر]	کریم خاں مصاحب شمس الدین خاں کی اَنیا میواتی کے ساتھ دلّی میں انگریزوں کے ایجنٹ ولیم فریزر کے قتل کے لیے دلّی میں آمد۔ تین مہینے دلّی رہا مگر ناکام لوٹا۔ پھر دلّی واپس آیا۔
۱۸۳۵ء [۲۲ر مارچ]	ولیم فریزر کا قتل۔ کریم خاں دار وغۂ شکار نواب شمس الدین احمد خان کی گرفتاری۔
۱۸۳۵ء [۱۸ر اپریل]	نواب شمس الدین احمد خان کی الزامِ قتل میں گرفتاری۔
۱۸۳۵ء [۲۶ر اگست]	کریم خان کو بجرمِ قتل پھانسی کی سزا۔
۱۸۳۵ء [۸ر اکتوبر]	نواب شمس الدین احمد خان کو بالزامِ اعانتِ مجرمانہ پھانسی۔
	[اس پر فیروزپور جھرکا کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد غالب کی پنشن ساڑھے سات سو روپے سالانہ، ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی خزانے سے ادا ہونے لگی]
۱۸۳۷ء	شمالی ہند میں قحط۔
۱۸۳۷ء [۲۹ر ستمبر]	معین الدین اکبر شاہ ثانی کا انتقال۔
۱۸۳۷ء [۳۰ر ستمبر]	سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی۔
۱۸۳۷ء [۲۰ر نومبر]	راج دربار سے فارسی زبان خارج کرنے کا حکم۔
۱۸۳۸ء	ناسخ کا لکھنؤ میں انتقال۔
۱۸۳۸ء	شاہ نصیر کا حیدرآباد میں انتقال۔
۱۸۳۹ء	مہاراجا رنجیت سنگھ کا انتقال۔
۱۸۴۰ء [؟]	غالب کی والدہ کی علالت اور انتقال۔
	[ایک فارسی تحریر کے پیشِ نظر وہ ۳۰ جنوری ۱۸۴۰ء تک زندہ تھیں]
ایضاً۔	دلی کالج میں مدرّسِ فارسی کے عہدے کی پیشکش اور غالب کا انکار۔
۱۸۴۱ء [اگست]	غالب کی گھر پر جوّا خانہ کے قیام میں گرفتاری۔
	[عدالت نے سو روپیہ جرمانہ کیا، عدم ادائیِ جرمانہ کی صورت میں چار مہینے قید۔ جرمانہ ادا کر دیا گیا]
۱۸۴۱ء [اکتوبر]	دیوانِ اردو کا پہلا ایڈیشن [مطبع سید الاخبار، دلّی۔ دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتب ہو چکا تھا]
۱۸۴۲ء - ۱۸۴۴ء	بعہدِ لارڈ ایلن برا گورنر جنرل، خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر کا غالب کو اعزاز۔
۱۸۴۴ء	میر نظام الدین ممنون کا دلّی میں انتقال۔
۱۸۴۵ء	دیوانِ فارسی [میخانۂ آرزو سرانجام] کا پہلا ایڈیشن [مطبع دار السّلام دلّی] دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا۔
۱۸۴۵ - ۱۸۴۶ء	سکھوں اور انگریزوں کی پہلی لڑائی۔
۱۸۴۷ء [؟]	غالب کا پہلا اردو خط [بنام تفتہ]
ایضاً [۱۳ر جنوری]	آتش کا لکھنؤ میں انتقال۔

تاریخ	واقعہ
۱۸۴۷ء	زین العابدین خان عارف کے بڑے بیٹے، باقر علی خان کی پیدائش ۔
۱۸۴۷ء [مئی]	دیوانِ اردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت [مطبع دار السلام دلی]
۱۸۴۷ء [۲۵ مئی]	گھر پر جوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب کی گرفتاری ۔ [فیصلہ میں چھ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ مشقت غالبؔ پچاس روپے ادا کر کے معاف ہو گئی ۔ وہ صرف تین مہینے قید میں رہے، اس کے بعد رہائی ہو گئی]
۱۸۴۸ء [۹ مارچ]	غالب کا پہلا اردو خط [بنام نبی بخش حقیر]
۴۸-۱۸۴۹ء	سکھوں اور انگریزوں کی دوسری لڑائی ۔
۱۸۴۹ء [اگست]	پنج آہنگ [فارسی] کا پہلا ایڈیشن [مطبع سلطانی، لال قلعہ، دلی]
۱۸۵۰ء	زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خان کی پیدائش ۔
۱۸۵۰ء [۴ جولائی]	تیموری خاندان کی تاریخ [مہر نیمروز] لکھنے پر تقرری، خلعت اور خطاب، نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ [تاریخ نویسی کی تنخواہ چھ سو روپے سالانہ مقرر ہوئی]
۵۰-۱۸۵۱ء	حافظ عبد الرحمان خان [حافظ جیو] احسان دہلوی کا دلی میں انتقال
ایضاً ۔	غالب کی چوتھی مہر۔ [مہر: نجم الدولہ، دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷ھ] غالب کو یہ خطاب بہادر شاہ ظفر نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو دیا تھا۔ جو ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کے مطابق ہے ۔ مہر ۱۲۶۷ھ میں بنوائی گئی جو ۶ نومبر ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے ۔
۱۸۵۲ء [اپریل]	زین العابدین خان عارف [امراؤ بیگم کے بھانجے] کی وفات [عارف کی وفات کے بعد اُن کے دونوں لڑکوں کو امراؤ بیگم نے پالا] قبر مرزا غالب کے قریب کونے میں ہے ۔
۱۸۵۲ء [۱۴ مئی]	مومن کا دلی میں انتقال ۔
۵۲-۱۸۵۳ء	غالب کی پانچویں مہر۔ [مہر: یا اسد اللہ الغالب ۱۲۶۹ھ] غالب حضرت علی کو مشکل کشا مانتے تھے۔ شاید یہ مہر ان کے سقیم حالات کی نشان دہی کرتی ہے ۔
۱۸۵۳ء [اپریل]	پنج آہنگ کا دوسرا ایڈیشن [مطبع دار السلام، دلی]
۱۸۵۳ء	بمبئی سے تھانہ [مہاراشٹر] تک پہلی ریلوے لائن ۔
۱۸۵۳ء	کلکتہ سے آگرہ تک ٹیلی گراف ۔
۱۸۵۴ء	حالی پہلی مرتبہ دلی آئے ۔ بعمر ۱۸ برس، ڈیڑھ برس کے بعد اواخر ۱۸۵۵ء میں واپسی پانی پت ۔ سال بھر حصار میں ملازمت کی ۔
۱۸۵۴ء [۱۵ نومبر]	شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ [استادِ ظفر کا انتقال] غالب استادِ ظفر
۵۴-۱۸۵۵ء	مہر نیمروز کی طباعت و اشاعت [فخر المطابع، دلی] ۔ [یہ اسی سال میں کم از کم تین بار چھپی ۔ یہ سب ایڈیشن جو پہلا ایڈیشن ہی کہلاتے ہیں ۔ میرے کتب خانے میں موجود ہیں]
۱۸۵۶ء	قادر نامہ کی اشاعتِ اوّل [مطبع سلطانی، لال قلعہ دلی] ۔ [یہ نظم انھوں نے عارف کے دونوں بچوں کو فارسی اور اردو پڑھانے کے لیے لکھی تھی]

۱۸۵۶ء الحاقِ اودھ۔

۱۸۵۷ء [۱۰ جولائی] غلام فخرالدین عرف مرزا فخرو [ولی عہد بہادر شاہ ظفر] کا انتقال۔

۱۸۵۷ء [۲۸ جنوری] غالب نے مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی تحریک پر والیِ رامپور نواب محمد یوسف علی خان کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔

۱۸۵۷ء [۵ فروری] غالب کا تقرر بطورِ استاد نواب یوسف علی خان، ناظمؔ والیِ رامپور

۱۸۵۷ء [مارچ اپریل] غالب کے رازدارانہ خطوط بنام والیِ رامپور قوی گمان ہے کہ یہ سیاسی امور پر مشتمل تھے۔ اس لیے غالب کی ہدایت پر یہ خطوط ضائع کر دیے گئے۔

۱۸۵۷ء [۱۰ مئی] سنہ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے [غدر] کا میرٹھ میں آغاز۔

۱۸۵۷ء [۱۱ مئی] دیسی فوج [تلنگوں] کا دلّی میں داخلہ: انگریزی تسلط کا خاتمہ، دیسی اقتدار کا قیام؛ غالب کے قلعہ کی تنخواہ اور انگریزی پنشن بند۔

۱۸۵۷ء [۲۰ ستمبر] انگریزوں کی فتح اور دلّی پر دوبارہ قبضہ۔

۱۸۵۷ء [ستمبر] غدر کے بعد دلّی پر دوبارہ انگریزی قبضے کے دوران امام بخش صہبائی انگریزی گولی کا نشانہ ہوئے۔

۱۸۵۷ء [۱۸-۱۹ اکتوبر] میرزا یوسف علی [بیگ] خان [برادرِ غالب] کی وفات۔ [وہ انگریزی گولی کا نشانہ بنے، اگرچہ غالب نے مصلحتاً لکھا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی]

۱۸۵۸ء [نومبر] دستنبو کی اشاعتِ اوّل [مطبع مفید خلائق، آگرہ]

۱۸۵۹ء سکّہ کا الزام۔ خط بنام حسین مرزا، نوشتہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء۔ لیکن گوری شنکر مخبر نے سکّہ کی رپورٹ [منسوب بہ غالب] ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء ہی کو انگریزوں کو پہنچا دی تھی۔

۱۸۵۹ء [۱۰ جولائی] والیِ رامپور سے مستقل وظیفے کی درخواست اور اسی مہینے سے سو روپے مہینہ بطور وظیفہ مقرر۔

۱۸۶۰ء [جنوری] گورنر جنرل کی یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دلّی میں آمد۔ غالب ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ جواب ملا کہ "فرصت نہیں" اور کہ "تم" باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے"۔

حقیقت یہ تھی کہ یہ سکّہ حافظ ویرآن شاگردِ ذوقؔ کا کہا ہوا تھا جو صادق الاخبار کے ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ [مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا]

۱۸۶۰ء [۱۹ جنوری] رامپور کا پہلا سفر ـ ۲۷ جنوری کو رامپور پہنچے۔

۱۸۶۰ء [۲۴ مارچ] رامپور سے واپسی۔ [۱۷ مارچ کو رامپور سے روانہ ہوئے تھے]

۱۸۶۰ء [مئی] انگریزی پنشن کا دوبارہ اجرا۔

[تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے وصول ہوا]

۱۸۶۱ء [۲۹ جولائی] دیوانِ اردو کا تیسرا ایڈیشن [مطبع احمدی، دلّی]

۱۸۶۱ء [۱۹ اگست] مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا جزیرۂ انڈیمان میں انتقال۔

۱۸۶۱-۶۲ء غالب کی چھٹی مہر۔

غالب
۱۲۷۸ھ

یہاں سے غالب کی زندگی کا انتہائی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مختصر عالم ان کی انا کا نقطۂ عروج ہے۔ سات سال بعد ان کا انتقال ہوا۔ یہ ان کی آخری مہر تھی۔ گویا ان کی انا کا مظاہرہ ان کے انتقال تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔

۱۸۶۲ء قاطع برہان کی طبع اول [مطبع نولکشور، لکھنؤ]

۱۸۶۲ء [۲ مارچ] انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجراء۔

۱۸۶۲ء [جون] دیوانِ اردو کا چوتھا ایڈیشن [مطبع نظامی، کانپور]

۱۸۶۲ء [یکم اکتوبر] لاڈو بیگم بیوہ مرزا یوسف کی حکومت سے درخواست، گذارے کے لیے۔

۱۸۶۳ء دیوانِ اردو کی پانچویں اور آخری اشاعت [مطبع مفید خلائق آگرہ]

۱۸۶۳ء [جولائی] یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے ۲۰ روپے مہینا خیراتی پنشن بنام لاڈو بیگم زوجہ مرزا یوسف مرحوم، جاری۔

۱۸۶۳ء [مئی۔جون] دیوانِ فارسی [کلیاتِ نظم فارسی] کا دوسرا ایڈیشن [مطبع نولکشور، لکھنؤ]

۱۸۶۴ء مثنوی ابرِ گہربار کی اشاعت [اکمل المطابع، دلی]
[یہ مثنوی کلیاتِ نظم میں شامل تھی، لیکن اب الگ سے شائع ہوئی]
قاطع برہان کے جواب میں محرقِ قاطع برہان مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت [مطبع احمدی، دلی]

۱۸۶۴ء قادر نامہ کی دوسری اشاعت [مجلس پریس، دلی]

۱۸۶۴ء محرقِ قاطع برہان از سید سعادت علی کی اشاعت۔

۱۸۶۴ء لطائفِ غیبی [اگرچہ نام میاں دادخان سیاح کا ہے مگر اُس کے اصل مصنف غالب ہی ہیں

۱۸۶۵ء دافع ہذیان مصنفہ سید محمد نجف علی جھجری کی اشاعت۔

۱۸۶۵ء سوالاتِ عبدالکریم از عبدالکریم کی اشاعت [اکمل المطابع، دلی] [دوسرے کے نام سے شائع ہوئی لیکن یہ بھی غالب کی اپنی تصنیف ہے]

۱۸۶۵ء ساطع برہان از مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی کی اشاعت۔

۱۸۶۵ء غالب نے حکومت سے تین مطالبے کیے۔ کہ انھیں شاعرِ دربار مقرر کیا جائے، پہلے سے اونچی جگہ ملے اور دستنبو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ غدر میں غالب کا رویہ کیا تھا۔ رپورٹ ہوئی کہ ان سے سکہ منسوب ہے۔ سب درخواستیں رد ہو گئیں۔ غالب پر سکے کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہوا۔

۱۸۶۵ء [۲۱ اپریل] نواب یوسف علی خان والیِ رام پور کا انتقال۔ نواب کلب علی خان کی جانشینی۔

۱۸۶۵ء [اگست] غالب کے رسالے نامۂ غالب بجوابِ ساطع برہان کی اشاعت [مطبع محمدی، دلی]

۱۸۶۵ء میرزا غالب کا رام پور کا دوسرا سفر۔
۱۲۔ اکتوبر کو رام پور پہنچے۔

۱۸۶۵ء دستنبو کا دوسرا ایڈیشن [مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی]

۱۸۶۵ء برطانوی ہند کا یورپ کے ساتھ ٹیلی گراف کے ذریعہ براہِ راست رابطہ۔

۱۸۶۵ء [دسمبر] قاطع برہان کی طبع ثانی بعنوان درفشِ کاویانی کی اشاعت [اکمل المطابع، دلی]

۱۸۶۵ء [دسمبر] رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی۔
[۲۸ دسمبر کو رامپور سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچے]

۱۸۶۶ء قاطع برہان کے جواب میں مؤید برہان مصنفہ مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت [مطبع مظہر العجائب، کلکتہ]

۱۸۶۶ء قاطع برہان کے جواب میں قاطع القاطع مصنفہ امین الدین امین دہلوی کی اشاعت [مطبع مصطفائی، دہلی]

۱۸۶۷ء [۹] دعائے صباح۔ فارسی منظوم ترجمہ [مطبع نولکشور لکھنؤ]
[اس کا آج تک ایک ہی مطبوعہ نسخہ دریافت ہوا ہے جو میرے کتب خانے میں ہے]

۱۸۶۷ء — تیغِ تیز کی اشاعت [اکمل المطابع، دلی]
[غالب نے یہ مختصر رسالہ مؤید برہان کے جواب میں لکھا تھا]

۱۸۶۷ء [فروری] — نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب کی اشاعت [مطبع سراجی، دلی] پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر میجر فلر نے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو مختصر رسالے قلمبند کیے۔

۱۸۶۷ء [۱۱ اپریل] — ہنگامۂ دل آشوب [۱] کی اشاعت [مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ]
[قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے کے منظومات]

۱۸۶۷ء [اگست] — سبدِ چین کی اشاعت [مطبع محمدی، دلی]

۱۸۶۷ء [۲۵ ستمبر] — ہنگامۂ دل آشوب [۲] کی اشاعت [مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ]

۱۸۶۷ء [۲ دسمبر] — مولوی امین الدین دہلوی مصنف ساطع برہان کے خلاف مقدمۂ ازالۂ حیثیتِ عرفی۔

۱۸۶۸ء [جنوری] — کلیاتِ نثرِ فارسی [غالب] کی اشاعت [مطبع نولکشور لکھنؤ]
[اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں، پنج آہنگ، مہرِ نیم روز، دستنبو شامل ہیں]

۱۸۶۸ء [۲۳ مارچ] — مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست برداری کا راضی نامہ۔

۱۸۶۸ء [۱۶ جولائی] — مفتی محمد صدر الدین آزردہ کا دلی میں انتقال۔

۱۸۶۸ء [۲۷ اکتوبر] — عودِ ہندی، مجموعۂ مکاتیبِ غالب کی پہلی اشاعت [مطبع مجتبائی، میرٹھ]

۱۸۶۹ء [۱۵ فروری] — غالب کی وفات۔ بستی نظام الدین، خاندانِ لوہارو کی حظیرہ میں تدفین۔
[اگرچہ بہت دن سے مختلف امراض کا شکار تھے، لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ۱۴ فروری دوپہر کو بیہوش ہو گئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔ آخری وظیفہ بابت جنوری ۱۸۶۹ء، منجانب نواب رامپور، غالب کی وفات سے صرف ایک گھنٹہ پہلے موصول ہوا تھا]

۱۸۶۹ء [۶ مارچ] — اردوئے معلیٰ [مجموعہ مکاتیب اردو] کی پہلی اشاعت [اکمل المطابع، دلی]

۱۸۶۹ء [ستمبر۔ اکتوبر] — نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا انتقال۔

۱۸۶۹ء — شمشیرِ تیز تر از مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت [مطبع نبوی، کلکتہ]
[یہ قاطع برہان کے سلسلے کی آخری کتاب غالب کی تصنیف تیغِ تیز کے جواب میں ہے جو میرزا کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اگرچہ اس کی طباعت ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی]

۱۸۷۰ء [۴ فروری] — بیگم غالب امراؤ بیگم کا انتقال۔
[مزارِ غالب کی مشرقی دیوار کے باہر کی طرف مدفون ہیں]

۱۸۷۴ء — حکیم آغا جان عیش کا دلی میں انتقال۔

۱۸۷۶ء [۲۵ مئی] — باقر علی خان [فرزندِ اکبر زین العابدین خان عارف] کا انتقال
[فارسی میں تخلص باقر تھا اور اردو میں کامل۔ مدفن سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائینی قاسم جانیوں کی حظیرہ میں ہے]

۱۸۸۰ء [۷ ستمبر] — حسین علی خان، زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے کا انتقال۔ اردو میں شاداں تخلص کرتے تھے، فارسی میں خیالی]

[باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھیے]

احمد رئیس

لکھو تو شاخِ گلاب لکھو
شجر شجر رنگ و آب لکھو

بدن بدن پر ہیں سو خراشیں
بدن بدن کا حساب لکھو

زمیں کی تقدیر میں ہمیشہ
نہ اس قدر قحطِ آب لکھو

گذر چکا ہے جو وقت ان کو
عذاب لکھو، سراب لکھو

عداوتوں کی نہ فصل کاٹو
محبتوں کا نصاب لکھو

بشر بشر کو نوید جاں دو
زمیں زمیں انقلاب لکھو

ہنروروں کو جو راستہ دے
اسی کو رحمت کا باب لکھو

چھٹک رہی ہے یہ دھوپ جس کی
اسی کو اک آفتاب لکھو

ہمیشہ اظہارِ حق کرو تم
ہمیشہ سچ بے حجاب لکھو

مصوّر سبزواری

(۱)

نفس کے ساتھ غبارِ ہوس بھی آئے گا
وہ اب کے آیا تو اگلے برس بھی آئے گا

سجائے رکھو یونہی خارِ خار جنگل کو
جمالِ آتشِ خاشاک و خس بھی آئے گا

یتیم خیموں کو دینے لہو بھرا پُرسہ
وہ دشتِ خاک سے چل کر فرس بھی آئے گا

دکھائی دیتی ہے وصل اور فصل کی سرحد
یہیں پہ مرحلۂ پیش و پس بھی آئے گا

وہ دسترس سے بہت دُور جا چکا ہوگا
وہ دن کہ جب مجھے خود پر ترس بھی آئے گا

زبان چاٹتی ان تتلیوں کو دو مژدہ
نمی ہواؤں میں پھولوں میں رس بھی آئیگا

(۲)

دل بجھ گیا تو چاند کا دربار کس لئے
خواہش بغیر رونقِ بازار کس لئے

راس آگئی تجھے تو نئے ہم سفر کی چھاؤں
بن کر کھڑا ہوں رستوں میں چھتنار کس لئے

مٹی میں اعتبارِ طلب ڈھونڈتے ہیں کیوں
پانی کی سب اٹھاتے ہیں دیوار کس لئے

میں سنگِ آب کی طرح ساکت پڑا رہا
دریا اٹھاتے زحمتِ بے کار کس لئے

اب حوصلہ بڑھانے کی ساعت تو ڈھل چکی
دم توڑتی سپاہ کو تلوار کس لئے

جب خامشی ہی کرنے لگے حادثے رقم
لفظوں سے رکھیں رشتۂ اظہار کس لئے

● نوح ضلع گڑگاؤں (ہریانہ)

اخبار کا آخری صفحہ

رام لعل

شانتی نکیتن، ڈی - ۲۹۰، اندرا نگر، فیض آباد روڈ، لکھنؤ - ۱۶

ہم جو اخبار منگواتے ہیں اس کے آخری صفحے پر مقامی خبروں کے علاوہ اکثر کھوئے ہوئے اور متوفی لوگوں کے فوٹو شائع کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس صفحے کا سارا لکھا ہوا میٹر پڑھا جائے۔ ہوتا یہ ہے کہ جہاں نگاہ جم گئی اسے سرسری طور پر پڑھ لیا ورنہ اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔

آج اخبار کے آخری صفحے پر کالے حاشیے میں ایک بڑھیا کی فوٹو چھپی ہے جس کے نیچے لکھا ہے "ہم تمہیں پانچ سال کے بعد بھی نہیں بھولے۔ آج ہی کے دن تم پرلوک سدھاری تھیں، ہم ہیں تمہارے بیٹے، بہوئیں، بیٹیاں، داماد، پوتے، پوتیاں، نواسے اور نواسیاں۔"

ناموں کی لمبی فہرست میں میرا ایک جانا پہچانا نام سُریندر سنگھ سیٹھی کا ہے جس نے کچھ سال پہلے ہمارے محکمے کی نئی ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے لئے اینٹیں سپلائی کرنے کے لئے ٹینڈر بھرا تھا۔ اس کے ریٹ باقی سب سے کم تھے اس لئے میں نے اسی کا ٹھیکہ منظور کر لیا تھا۔ سروس سے ریٹائر ہونے سے پہلے میرا یہ آخری سرکاری کام تھا بلڈنگ کی تعمیر اب تک چل رہی تھی۔ سُریندر سیٹھی اب بھی راستے میں کہیں مل جاتا ہے تو میری خیریت پوچھنے کے لئے فوراً گاڑی روک لیتا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ جس بزرگ خاتون کی فوٹو اخبار میں شائع ہوئی ہے وہ اس کی ماں تھی۔ اور وہ برسوں سے اسی شہر میں مقیم تھی۔ چہرہ مجھے آناً فاناً راولپنڈی پہنچا دیتا ہے۔ خیال کی پرواز آواز، روشنی اور ہوا سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ اس تھیوری پر آئن اسٹائن نے کیوں کام کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا جبکہ بنی نوع آدم روز اوّل سے اسی کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔

میں اُنیس سو چوالیس کی ایک سرد ترین رات میں اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ پنڈی جا رہا تھا۔ ریلوے کے ایک لمبے تیسرے درجے کے ڈبے کے کونے میں ہم ایک دوسرے سے شرمائے شرمائے سے آمنے سامنے کی سیٹوں پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اسی ڈبے کے ایک اور کونے میں ہندکو بولنے والے چار مرد در پٹھان بھی ہم لوگوں سے بالکل بے تعلق بیٹھے تھے۔ کسی فنکار کے بارے میں جو ان کا مالک تھا گفتگو تھے۔ میں ان کمبل پوش پٹھانوں کی طرف کبھی کبھی اس لئے بھی دلچسپی سے دیکھ لیتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کا پیش کیا ہوا خوشبودار تمباکو نچلے ہونٹ میں رکھ لیتے اور وقفے وقفے سے دائیں بائیں بڑی بے تکلفی سے تھوکنے لگتے تھے۔ اُنہی لوگوں کی وہاں موجودگی کی وجہ سے میں نے خود کو سمترا کے ساتھ پیار بھری باتیں کرنے سے باز رکھا تھا۔ بس سلیٹی شال میں سے جھانکتا ہوا اس کا خوبصورت چہرہ ہی رات بھر تاکتا رہا تھا۔ وہ اتنی پُرکشش تھی کہ گاڑی کا سفر اگر کئی روز تک اسی طرح جاری رہتا تو میں اس کی طرف تاکتے رہنے سے کبھی نہ اُکتاتا۔

اگلی صبح کہرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رات بھر کی ٹھنڈ کھا کر سمترا چھینکیں مار رہی تھی اور اس کی خوبصورت ناک سُرخ ہو گئی تھی۔ ہم ایک تانگے میں سوار ہو کر آریہ محلہ میں رہنے والی میری بڑی پھوپھی کے گھر کی جانب چل پڑے۔ پھوپھی کے سسرال کے لوگوں کا نسلی رشتہ یقیناً اولین آریائی قبائل سے ملتا ہوگا لیکن خدا جانے کن سے آریوں نے اس محلے کو آباد کیا تھا کہ ہزاروں سال بیت جانے کے بعد بھی وہاں کے باسی خود کو دوسروں سے برتر اور اعلی النسل کا تصور کرتے تھے۔ شاید بہادری، اخلاق، تہذیب اور اقتصادی طور پر بھی کامیاب ہونے کی بنا پر۔

جب ہم پھوپھی کے دو منزلہ مکان کے سامنے اترے تو اسے فوراً باہر آکر حسب عادت میرا اور سمترا کا سر بار بار چوما اور بلائیں لیں۔ ان کا مکان واقعی بہت بڑا اور شاندار تھا۔ وہ جب بھی اپنے مائکے آئی تھیں انہوں نے اپنے مکان کی بہت تعریف کی تھی۔ اتنے کمرے ہیں، اتنے برآمدے اور غسل خانے اور رسوئیاں اور دالان اور چھت پر بنے ہوئے چوبارے وغیرہ ساس گھر کو دیکھے بغیر ہی میں نے اس کا پورا جغرافیہ جان لیا تھا جس زمانے میں پھوپھی میری ملازمت کے لئے اپنے ہی شہر میں کوشش کرا رہی تھیں تو انہوں نے مجھے اپنے ہی گھر میں رہائش اختیار کرنے کی بھی پیشکش کر دی تھی۔ اور ملازمت مل جانے کے بعد شروع کے کچھ

ہفتوں میں انہی کے ساتھ رہا تھا۔ لیکن جب میں اپنی بیوی کو بھی وہاں لے کر پہنچا تو میری چھوٹی بہن نے مجھے بتا دیا اب ہمارے لئے وہاں جگہ نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میرے پھوپھی زاد بھائیوں اور بہنوں نے جو ابھی تک ایک یا دو کمروں میں ساتھ ساتھ رہتے آئے تھے اب اچانک الگ الگ کمرے سنبھال لئے تھے بلکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ میری والدہ کا میرے ساتھ بعض گھریلو باتوں پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ میری شادی کے کچھ ہی روز بعد۔ انہوں نے اگرچہ بیشمار لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد ہی میرے لئے دلہن بننے والی لڑکی کا انتخاب کیا تھا اور اپنے انتخاب پر پھولی نہیں سمائی تھیں کہ ان کی بہو لاکھوں میں ایک ہے لیکن میری بیوی اپنے مائکے سے جہیز کی صورت میں اپنے ساتھ جو کچھ بھی لے کر آئی تھی اسے دیکھتے ہی میری والدہ نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔ اس زمانے میں نچلے متوسط طبقے میں اپنی بیٹی کو سسرال بھیجتے وقت والدین چند جوڑے کپڑوں کے، تھوڑا سا سونا، اور کھانے پکانے کے دو چار برتنوں کے علاوہ ایک ہی پلنگ اور ایک آدھ کرسی بھی دے دیتے تھے۔ چونکہ ہمارے شہر میں بجلی آچکی تھی اس لئے میری والدہ یہ بھی توقع رکھتی تھیں کہ میری بیوی اپنے ساتھ بجلی کا پنکھا بھی لے کر آئے گی۔ اسے نہ دیکھ کر میری والدہ نے اپنی خفگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اگرچہ یہ بہت معمولی سی چیز تھی اور میرے سسر نے بعد میں ایک ٹیبل فین خرید کر بھجوا بھی دیا لیکن ان کی خفگی کا سلسلہ کئی دوسری چیزوں کی کمی تک پھیلتا چلا گیا۔ جس کا انتقام انہوں نے میری بیوی سے اس طرح لیا کہ شادی کے موقعہ پر پہنائے ہوئے اپنے زیورات اس سے واپس لے لئے۔ اس کے لئے بری کے لئے بنوائے ہوئے جوڑوں میں سے کچھ کپڑے رکھ لئے۔ ایسا سلوک دیکھ کر میری بیوی بہت دکھی ہوئی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اگرچہ میں نے اسے بہت دلاسہ دیا کہ میری ملازمت سلامت، تمہیں ہر چیز پھر سے لے دوں گا۔ بلکہ اور بھی بہت کچھ، جس جس چیز کی تم فرمائش کرو گی! لیکن عورتیں تو جس چیز پہ ایک بار اپنا حق سمجھ لیتی ہیں ان کی ملکیت سے پھر کبھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ ان کی بازیافت کے لئے ہمیشہ لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔ اس معاملے پر ہمارے گھر میں جو کہا سنی ہوگئی تھی اس سے ناراض ہو کر سمترا شادی ہونے کے ایک ہی ماہ کے اندر اپنے میکے میں جا کر بیٹھ رہی تھی۔ اب میں ہی دو ایک بار اس سے مل آیا تھا۔ اس جھگڑے میں میری پھوپھی نے میری والدہ ہی کی طرفداری کی تھی۔ اسے پنڈی میں رہتے ہوئے بھی ہمارے گھریلو معاملات کی ایک ایک بات خطوں کے ذریعہ معلوم ہوتی رہتی تھی۔

میں اپنی بیوی کو اس کے میکے ہی سے لیکر راولپنڈی گیا تھا۔ میرے لاکھ سمجھاتے بجھانے پر بھی سمترا شہر چھوڑنے سے پہلے میری والدہ سے جا کر ملنے کے لئے تیار نہیں ہوئی تھی۔ اور راولپنڈی پہنچتے ہی اسی بات کے لئے مجھے پھوپھی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑ گیا تھا۔ جب اسے مطمئن نہ کر سکا تو پھوپھی نے صاف صاف کہہ دیا۔

"ایسی دلہن کے لئے میرے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ جو اتنی نک چڑھی ہے کہ یہاں آنے سے پہلے اپنی ساس کے پاؤں تک نہیں چھو کر آئی۔ اس سے میں عزت کی کیسے امید رکھوں گی؟ بیٹا کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ دو اسے رکھنے کے لئے!"

اس کورے جواب سے مجھے بہت صدمہ پہونچا۔ سمترا بھی بہت دکھی تھی۔ اس روز وہاں ایک چھوٹی سی پوجا کی تقریب تھی۔ ان کی بہو پہلی بار امید سے ہوئی تھی اسے پھر سے ایک دلہن کی طرح سجایا سنوارا گیا تھا۔ اور وہ بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے حد خود اعتمادی اور غرور کی جھلک تھی میری بیوی اگرچہ اس سے کہیں زیادہ حسین تھی لیکن وہ نسوانی خودداری سے یکسر محروم کر دی گئی تھی۔ اس لئے وہ بے حد ملول و رنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہزیمت کی سی کیفیت تھی۔ لگتا تھا، وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی۔

اسی شام کو ہمیں آریہ محلے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر مل گیا۔ اگرچہ وہاں رہنے کے لئے ایک ہی کمرہ تھا پھر بھی سمترا خوش تھی کہ اب وہ گھریلو جھگڑوں کی تکلیف دہ فضا سے دور رہ سکے گی۔ میرے ساتھ شادی ہونے کے بعد اسے ابھی تک آزادی کا ایک بھی لمحہ نصیب نہیں ہو پایا تھا۔ صحیح معنوں میں ہمارا ہنی مون اب شروع ہو رہا تھا۔ ہم سارا دن مل کر اپنے کمرے کو سجاتے رہے۔ سامان کو کبھی ایک کونے میں رکھتے کبھی دوسرے کونے میں۔ میں بازار سے بھاگ کر تھوڑی اور کیلیں لے آیا تھا۔ اور ایک اسٹول پر چڑھ کر کلنڈر اور تصویریں لٹکائی تھیں۔ ساری تصویریں میرے اسکول اور کالج کے زمانے کی تھیں۔ جب میں نے اسپورٹس کے مقابلے میں ایک کپ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اور جب ہمارے اسکول میں کلکٹر آیا تھا تو اس موقعہ پر سینئر اسٹوڈنس اور ٹیچرز کے ساتھ ایک گروپ فوٹو لیا گیا تھا۔ ایک بہت پرانی فوٹو میرے بچپن کی تھی جس میں میرے والدین اپنے بچوں کو گود میں لئے بیٹھے تھے۔ مجھے دو بہنوں اور تین بھائیوں کی درمیانی اولاد ہونے کی وجہ سے پیچھے کی صف میں ایک کرسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ بے حد شرارتی ہونے کی وجہ سے میں نے فوٹو گرافر کے بار بار کہنے پر بھی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور پیار تھا کرنے کے انداز میں اچانک دونوں ہاتھ جوڑ لیے تھے۔ اس حرکت سے انجانے ہی میں میری قمیص کا دامن میرے دونوں ہاتھوں میں الجھ کر رہ گیا تھا لیکن میں بالکل ننگا نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے اسٹول پر کھڑے کھڑے سمترا کو اپنے ساتھ لپٹا کر کہا۔ "ہماری ابھی تک کوئی فوٹو نہیں اتاری گئی ہے نا! اگلی تنخواہ پر راجہ بازار کے ایک

فوٹو اسٹوڈیو میں جا کر کھنچوا لیں گے۔ اور اسے بھی یہاں لٹکا دیں گے۔"

اسی لمحے ہماری مکان مالکن اچانک اندر آگئی۔ اسے دیکھتے ہی میری بیوی گھبرا کر الگ ہو گئی۔ مکان مالکن نے ہمارے کمرے میں ایک ہی پلنگ دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "تمہارے پاس دوسرا پلنگ نہیں ہے۔ میرے یہاں سے ایک چارپائی لے لو۔ اوپر چھت پر رکھی ہے۔"

جب میں چارپائی لے آنے کے لئے باہر نکل رہا تھا تو وہ سمترا کو سرزنش کرنے کے انداز میں کہہ رہی تھی "ساری ساری رات مرد عورت کا ایک ہی پلنگ پر سوتے رہنا بڑا پاپ مانا جاتا ہے۔"

وہ مکان کے اوپر والے حصے میں رہتی تھی۔ اس کی نصیحت سن کر میں نے سمترا کی طرف دیکھا اور شرارت سے آنکھ ماری۔ پھر جب مکان مالکن چلی گئی تو میں نے تنہائی پا کر اس سے کہا "یہ کون دیکھے گا کہ دوسری چارپائی خالی پڑی رہے گی۔"!

لیکن اس وقت مجھے اپنے دادا کی بھی دی ہوئی ایک نصیحت یاد آ گئی جو انہوں نے مجھے میری شادی سے چند روز پہلے کی تھی "اپنی زنانی کے ساتھ رات بھر کبھی مت سونا۔ یہ صحت کے بھی اصول کے خلاف ہے۔ اس سے آدمی جلدی ختم ہو جاتا ہے۔"

جن باتوں کا شادی سے پہلے کبھی تصوّر تک نہیں کیا تھا، وہ اچانک میری گھر ابندی کرنے لگی تھیں۔ میرے والد نے جو ہمیشہ رسوئی میں میری والدہ کے پاس بیٹھ کر گرم گرم کھانا کھانے کے عادی تھے اور اس کے ہاتھ سے پکائے ہوئے پراٹھوں کی کبھی تعریف کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے انہی کے سامنے بٹھا کر مجھے سمجھایا تھا "عورت مرد کی بہت بڑی ساتھی ہوتی ہے لیکن اسے سر پر کبھی مت چڑھانا ورنہ تمہارے قابو سے باہر ہو جائے گی۔"

میری شادی سے کچھ مہینے پہلے میں نے اپنی والدہ کو اپنے زیورات کی صندوقچی کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا تھا جن میں سے کچھ زیورات کو زرگر کے حوالے کر کے وہ آنے والی دلہن کے لئے نئے زیورات بنوا لینا چاہتی تھیں۔ اس صندوقچی میں سے انہوں نے چاندی کی دو چھوٹی چھوٹی پازیبیں بھی نکال کر مجھے دکھائی تھیں اور کہا تھا "جب تم نے چلنا سیکھا تھا تو یہ تمہارے نانا لے کر آئے تھے، انہیں پہن کر تم چلتے تھے تو میرا رواں رواں خوش ہو اٹھتا تھا۔ اب انہیں میں نے تمہارے بیٹے کے لئے ہی سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اُسے اپنے ہاتھوں سے ہی پہناؤں گی۔"

ماں کی ممتا کا یہ روپ دیکھ کر میں جذبات سے گلوگیر سا ہو گیا تھا۔ لیکن میری شادی کے موقعہ پر میری جو بڑی بہن آئی تھی اس کے بچے نے انہی دنوں پہلی بار چلنا شروع کیا تو والدہ نے چاندی کی وہ پازیبیں اسی کو پہنا دی تھیں۔

پتہ نہیں، گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں میری روح کے زخم کیوں بننے لگی تھیں! لگتا تھا یہ زخم کبھی مندمل نہیں ہو سکیں گے۔ میں جب بھی اپنی بیوی کے ساتھ ذرا سے بھی التفات سے پیش آیا تو میری والدہ کے چہرے پر خفگی ابھر آئی تھی۔ لیکن میں ان سے اس بات کا سبب نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اُن کے اسی رویّے کی وجہ سے میری اپنی بیوی کے ساتھ ہمدردی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا تھا۔ اسی قسم کے سلوک نے جو میری پھوپھی نے کیا تھا مجھے اپنی بیوی کے اور قریب کر دیا تھا لیکن ہم پھوپھی کو بھی نہیں بھول پاتے تھے جو ہمارے کرائے کے مکان سے چند گلیاں اور اپنے عالیشان مکان میں رہتی تھی۔ انہوں نے ابھی تک ایک بار بھی آ کر نہیں دیکھا تھا کہ ہم کس طرح رہ رہے تھے۔ سمترا نے ایک بار اچانک آبدیدہ ہو کر کہا تھا "اپنے بچوں کا گھر بسانے میں تو بزرگ عورتیں ہی ہاتھ بٹاتی ہیں۔"

اس وقت وہ رسوئی کی دیواروں پر خود ہی لوہے کی بڑی بڑی کیلیں ٹھونک کر برتن لگا رہی تھی۔ میں نے اس کی مدد کرنا چاہی تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا "بیٹھے، آپ کو کیا معلوم مجھے کون سی چیز کہاں لٹکانی ہے۔ جائیے اپنا کام کیجئے۔"

اس نے کپڑے سکھانے کے لئے بھی خود ہی آنگن کے آر پار ایک مضبوط رسّی باندھ لی تھی۔ جس پر تازہ دُھلی ہوئی میری پتلونیں، بشرٹیں اور پاجامے لٹک رہے تھے۔ گھر میں کوئلے کی بڑی انگیٹھی سلگانا بہت مشکل کام تھا جس پر بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ ایک شام کو میں دفتر سے لوٹا تو دروازے پر بیوی کو کوئلوں پر مٹی کا تیل ڈال ڈال کر لگاتے اور ایک چھوٹے سے پائپ کو منہ کے قریب لے کر پھونکیں مارتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بھی بہتے جا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے سائیکل کو ڈیوڑھی میں رکھ دیا اور اس کے پاس جا کر پائپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ دھوئیں اور پانی سے بھری ہوئی آنکھیں اپنے دوپٹے سے پونچھتی ہوئی ایک طرف جا کر کھڑی ہو گئی۔ ہنستی بھی رہی — اوپر سے مکان مالکن بھی آ گئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے پُتر کو آج کام پر لگا دیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا کروں؟ مانتے ہی نہیں۔ آپ ہی سمجھائیے نا انہیں، ماسی!"

میرے دو چار بار ہی پھونکیں مارنے سے کوئلوں کے نیچے رکھی ہوئی لکڑیاں جل اٹھی تھیں۔ میں پائپ کو ایک طرف رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا" لے، جب تک تو کھانا تیار کرے گی میں لپک کر ذرا پھوپھی کے درشن کر آؤں۔ کئی روز سے انہیں دیکھا نہیں ہے۔ آج دن بھر یاد آتی رہیں مجھے۔"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آج ہی ماسی ان سے مل کر آئی ہیں۔" سمترا چہک کر بولی۔

"ہاں پتر جی۔ آج گوردوارے میں وہ مل گئی تھی مجھے۔ میں نے تم دونوں کی خیر خبر سنائی تو مجھ پر لال پیلی ہو کر برس پڑی۔"

"کیوں!۔ کیوں!" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

سمترا نے کہا" وہ ماسی سے بھی بہت خفا ہیں۔ اس بات پر کہ انہوں نے ہمیں رہنے کے لئے اپنا مکان کیوں دیدیا!"

"نہیں۔ پھوپھی ایسا کبھی نہیں سوچ سکتیں۔ میں نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔" وہ ہم سے لاکھ خفا ہوں، پھر بھی اپنی ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ کیا وہ چاہیں گی کہ ہمیں گلی میں پھینک دیا جائے۔

"ہاں سچی تیری پھوپھی نے بالکل یہی کہا مجھ سے۔ ان لوگوں کا سامان اٹھا پھینک دو باہر اور پھٹکنے دو انہیں دَر دَر۔!"

یہ سنتے ہی میرا دل بیٹھ گیا۔ میرے بچپن کا بہت سا زمانہ پھوپھی کی گود میں گذرا تھا۔ جب تک ان کی شادی نہیں ہو گئی وہ مجھے بغل میں اٹھائے اٹھائے گھوما کرتی تھیں۔ میرے بنا تو ایک پل نہیں رہ پاتی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں اور رات کو اپنے ساتھ ہی سلاتی تھیں۔ ان کی سنائی ہوئی کتنی لوریاں اور کہانیاں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ جب ان کا بیاہ ہوا تب میں تین چار سال کا تھا۔ رواج کے مطابق مجھے ہی اُن کی ڈولی میں اُن کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ پھوپھی کی سسرال ہمارے شہر سے دس بارہ میل دور ایک گاؤں میں تھی۔ وہاں پہنچ کر میں نے خود کو بے حد اجنبی اور اکیلا محسوس کیا۔ اس لئے میں ایک لمحے کے لئے بھی پھوپھی سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ صرف وہی ان کے قریب رہیں۔ جب رات ہوئی اور مجھے اس کمرے میں نہیں جانے دیا گیا جہاں پھوپھی کو سُلایا گیا تھا۔ میں اونچی آواز میں پھوپھی کو پکار پکار کر رونے لگا تو مجھے پھوپھی کے پاس لے جایا گیا۔ روتے روتے انہی کی گود میں سو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی اور میں نے پھوپھی کو ایک اور آدمی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو مجھے غصہ آگیا۔ اگرچہ وہ میرا پھوپھا تھا لیکن میں نے اسے کمرے سے باہر نکل جانے کے لئے کہہ دیا۔ پھوپھی سے اصرار کیا کہ وہ اپنے گھر لوٹ چلیں۔ اس گھر کے لوگ اچھے نہیں ہیں۔ میری ایسی ہی باتوں پر وہاں کی بڑی بڑھیا کھل کھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔

مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ اپنی والدہ سے مجھے اتنا پیار دُلار کبھی نہیں ملا جتنا اپنی اسی پھوپھی سے ملا تھا۔ والدہ سے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی تو اس بات کو پھوپھی ہی کے سامنے جا کر کہہ دیتا تھا۔ اکثر وہ میرے لئے میری والدہ سے لڑتی جھگڑتی تھیں۔ لیکن اب ان کی شفقت بھرے تعلقات کا موسم کتنا بدل چکا تھا۔ صرف بیوی کے آجانے سے۔ جب کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کوئی دوش تھا تو صرف اتنا کہ وہ بہت زیادہ خوبصورت تھی اور میں اسے دل و جان سے چاہنے لگا تھا۔ اور اسے ایک ایسا پرسکون ماحول دے دینا چاہتا تھا جس میں رہ کر وہ خود کو محفوظ اور مسرور محسوس کرتی۔

موجودہ ماحول بھی اتنا خوشگوار نہیں بن پایا تھا کیونکہ اس پر ابھی تک پھوپھی کی خفگی کا سایہ موجود تھا۔ پھر بھی ہمارے لئے مکان مالکن کا دم غنیمت تھا کہ وہ میری بیوی کی دمساز بن گئی تھی۔ اس نے سمترا کو رسوئی میں کام آنیوالی کتنی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں تحفوں کے طور پر دیدی تھیں جو اس کے پاس فالتو پڑی تھیں۔ جیسے چمٹا، انگیٹھی کو سلگانے والا پائپ، فرش پر بیٹھ کر کام کرنے کے لئے لکڑی کی چوکی اور دھوئے جانے والے کپڑوں کو پیٹنے والا شیشم کا مضبوط سونٹا۔ اس کے سلوک سے خوش ہو کر میری بیوی نے بھی اس کے لئے ایک سوئٹر بُننا شروع کر رکھا تھا۔ مکان مالکن بلا ناغہ صبح سویرے اپنے پتی کے ساتھ گوردوارے جاتی تھی۔ اُسی کی وجہ سے میری بیوی بھی جانے لگی۔ مکان مالکن بہت خوش تھی اس کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں بھی بازار سے گرونانک دیو کی ایک بہت بڑی فریم شدہ تصویر لے آیا اور اسے اپنے کمرے میں لٹکا دیا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں اور بھی اپنائیت پیدا ہو گئی۔ اور اس نے ہم دونوں کو کلائی پر پہننے کے لئے دو فولادی کڑے بھی لا کر دے دیے۔

ایک دن ہمارے دفتر میں چھٹی تھی۔ ہم میاں بیوی چھت پر بیٹھے دھوپ کا مزہ لے رہے تھے۔ سمترا میرے پاس بیٹھی مکان مالکن کے لئے سوئٹر بن رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کے حسن و سلوک کی تعریف بھی کرتی جاتی تھی۔ اس روز اس نے اپنے بال دھوئے تھے جو اس کی پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ چمکیلی دھوپ اور اندرونی مسرت نے اس کے چہرے کو بالکل گلنار بنا دیا تھا۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ عورت ہر وقت کبھی خوبصورت نہیں ہوتی۔ بس خاص خاص

لمحوں ہی میں اچانک اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ جسے دیکھ کر آدمی بے اختیار اسے گلے سے لگا لینے کے لئے بے تاب ہو اٹھتا ہے۔ میں نے بھی اس وقت اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کی اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھ دی کہ تھوڑی دیر کے لئے نیچے جا کر اپنے کمرے میں لیٹیں۔ یہ سن کر مسکراتے کے چہرے پر اور زیادہ چمک آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں یک بیک ایک ایسی شوخی بھر گئی جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن اس نے ادھر ادھر محتاط ہو کر دیکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "بھرے دن میں! کوئی ملنے آگیا تو؟"

لیکن میں کسی کی پروا کیے بغیر اسے نیچے کمرے میں لے گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ابھی کچھ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ اچانک ہمارے دروازے کو کسی نے بڑے کھٹکھٹانا شروع کیا۔ اور ہم دونوں دم بخود سے رہ گئے۔ کئی لمحوں تک بالکل بے حس و حرکت پڑے رہے لیکن دروازے پر ہونے والی کھٹ کھٹ اور تیز ہو گئی جیسے کوئی بہت ضروری کام سے اسے پیٹ رہا ہو۔

میں تو نیند کا بہانہ کر کے لیٹا رہا لیکن میری بیوی کو طوعاً و کرہاً بستر سے نکلنا ہی پڑ گیا۔ وہ جلدی جلدی کپڑے درست کر کے اپنے کھلے ہوئے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی ہوئی دروازے کی طرف لپک گئی۔ سامنے مکان مالکن کھڑی تھی بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہا نہیں بس الٹے قدموں لوٹ گئی۔ میری بیوی دروازے کو اب کھلا چھوڑ کر میرے پاس آئی اور بڑی خفگی سے بولی ۔۔۔ "آپ نے تو مجھے کہیں کا نہیں رکھا! اب میں ماسی کے ساتھ آنکھ تک نہیں ملا پاؤں گی۔"

میں اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا کہ اس نے اچانک نازل ہو کر مجھے ایک بہت بڑی ذاتی مسرت سے محروم کر دیا تھا۔ بیوی سے کہا: "جا کر پوچھو نا اس سے ــ کوئی ضروری کام ہوگا۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں نہیں جاؤں گی اب اس کے پاس۔" اور اون کا گولا اور سلائیاں اٹھا کر پیر پٹختی ہوئی پھر چھت پر چلی گئی۔

اس کے بعد بھی ایسے کئی موقعوں پر مکان مالکن نے ہمارا دروازہ زور زور سے پیٹا تھا۔ دن کے وقت وہ ہمیں اندر سے دروازہ بند کر کے سونے کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ جیسے دن کی روشنی میں میرا اپنی بیوی پر سارا حق ہی ختم ہو جاتا تھا۔ وہ مجھے گھر پر دیکھ لیتی تو کسی نہ کسی بہانے سے مسرا کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ رسوئی یا آنگن میں بیٹھ کر اسے ادھر اُدھر کی باتوں میں لگا لیتی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں اس کے خلاف ایک بیزاری سی پیدا ہونے لگی۔ پہلے اس کا سامنا ہوتے ہی میں اسے بے اختیار ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہہ دیتا تھا۔ اب میں اس کے سامنے جانے سے ہی بچنے کی کوشش کرتے لگا۔ لیکن میری بیوی کے دل میں اس کے لئے ذرا سی بھی ناراضگی نہ پیدا ہو سکی۔ وہ حسبِ معمول صبح سویرے اشنان کر کے اس کے ساتھ گوردوارے چل دیتی۔ مجھے گھر پر تنہا پا کر یا تو اسے اپنے پاس بلا لیتی یا خود ہی کسی بہانے سے اس کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس نے خود کو ایک ایسی مشین کی طرح ڈھال لیا جو صرف رات کو ہی میرے قریب آ سکتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے کوئی بہت ہی قیمتی چیز کھو بیٹھا ہوں۔ گھریلو جھگڑوں کی فضا میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ لیکن اب اس کے نزدیک میری رفاقت کی اہمیت کم ہو چکی تھی۔ جب کہ میں ابھی تک خود کو اکیلا محسوس کرتا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جسے پا کر میں لاہور میں رہنے والی اپنی محبوبہ کو بھول بیٹھا تھا۔

جس زمانے میں اپنے محکمے کی طرف سے ایک تربیتی کورس کر رہا تھا اور ایک محلے میں کرائے کے ایک کمرے میں رہتا تھا اسی مکان میں رہنے والی ایک نرس کی لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔ اسے فلمی رسالے پڑھنے کا بہت چسکا تھا جو میرے پاس بکثرت موجود تھے۔ اس کا یہ شوق دیکھ کر میں لنڈا بازار کے ایک ردی والے سے ڈھیروں رسالے سستے داموں خرید کر لے آتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی آمد و رفت میرے کمرے میں بڑھ گئی تھی۔ اس نے فلمی رسالوں سے فلمی اداکاروں کی تصاویر کاٹ کاٹ کر میرے کمرے کی دیواروں پر چسپاں کر دی تھیں۔ اس کی ماں جب تک اسپتال میں ڈیوٹی پر رہتی وہ سارا وقت میرے ہی پاس گزارتی تھی۔ جب اس بات کی بھنک اُس کی ماں کو ملی تو اس نے ایک دن میرے پاس آ کر مجھے بہت ڈانٹا۔ جیسے میں ہی اس کے لئے ذمہ دار تھا۔ میں بڑی خاموشی سے اس کی ڈانٹ سنتا رہ گیا۔ اپنے تحفظ میں زبان تک نہ کھولی۔ اُس واقعے کے کچھ روز کے بعد وہ لڑکی ایک دن اچانک میرے پاس پھر آ گئی۔ بہت اداس تھی۔ لیکن بڑے فیصلہ کن لہجے میں بولی: "میں تمہارے ساتھ ہی شادی کروں گی۔"

میں نے اپنے معاشقے کے اس پہلو پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے چہرے پر پنجاب کے روائتی قصوں کی سی شدید محبت کرنے والی نوعمر لڑکیوں کی سی سنجیدگی تھی جو اپنے قول و اقرار پر اٹل رہتی ہیں اور جان تک دے دینے میں اپنے عاشقوں پر سبقت لے جاتی ہیں۔ میں نے اسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "لگتا ہے، تم ہی بارات لے کر مجھے بیاہ لے جانے کے لئے آ جاؤ گی!"

اسنے اسی سنجیدگی سے سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "اگر ایسا زمانہ آیا تو اس میں ہرج ہی کیا ہوگا۔ اصل مقصد تو ساتھ رہنے کا ہے۔ عورت کو مرد کے بجائے وہی اسے اٹھا کر لے جائے!"

اس کے سارے رویّے ابھی تک سمجھ ہی پر حاوی ہونے والے نظر آئے تھے۔ لیکن میں اچانک اس سے دور چلا آیا تھا۔ تربیت ختم کر کے گھر لوٹا تو مجھے سمترا کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ پھر میں لاہور کبھی واپس نہ جا سکا۔ سمترا ایک اچھی اور خوبصورت بیوی ضرور تھی لیکن وہ محبت کا اظہار کرنے میں اس لڑکی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، جو مجھے اب بہت یاد آنے لگی۔ مکان مالکن نے اپنی پُر وقار شخصیت کا بہت گہرا سایہ میری بیوی پر ڈال دیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر ایسا محسوس ہونے لگا وہ میری محبت کے جذبات کو کبھی نہیں سمجھ سکے گی اور رفتہ رفتہ مجھ سے دور ہوتی چلی جائے گی۔

ایک دن اچانک میں دفتر سے لوٹتے وقت اپنی پھوپھی کے گھر چلا گیا۔ اس کے پاؤں پکڑ کر پچھلی ساری باتوں کی معافی مانگی، جن کے لئے اگرچہ میں ہی تنہا ذمہ دار نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سمجھا، ایسا کر کے میں اس کے دل میں پھر سے جگہ پا سکتا ہوں۔ میں نے وعدہ کیا، گھر جا کر اپنی والدہ سے بھی معافی مانگوں گا۔ میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اس نے آنسو بھر کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور دلہن کی خیریت پوچھی۔ میرے دل میں مکان مالکن کے خلاف جتنا غبار تھا اسے بھی ہلکا کرنا ضروری ہو گیا۔ میں نے پھوپھی کو بتا دیا کہ وہ کس طرح وقت بے وقت ہمارے دروازے پر دستک دینے لگتی ہے اور اب تو اسنے سمترا کو پوری طرح اپنے جنگل میں پھنسا لیا ہے۔

یہ سنتے ہی میری پھوپھی کے غصے کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔ چلّا کر بولی "میں ابھی جا کر اس کی خبر لیتی ہوں۔ اس کے پوتوں سوتوں تک کو نہیں بخشوں گی۔ پورے محلے کے سامنے اسے ننگا نہ کر دیا تو پھر میں بھی اپنے باپ کی اولاد نہیں۔ میں جانتی ہوں اس کی بہوئیں کیوں اس کے ساتھ نہیں رہتیں۔ یہ اسی طرح ان کے دروازے بھی دن میں کھٹکھٹاتی تھی۔"

اس شام کو ہماری گلی میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ محلے بھر کے لوگوں کے درمیان دو بزرگ عورتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ ایک دوسرے کو بال نوچ نوچ کر صلواتیں سُنا رہی تھیں۔ دونوں کے کپڑے جگہ جگہ پھٹ گئے تھے۔ بالآخر میری پھوپھی ہی اُسے گرا کر اس پر چڑھ بیٹھی تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں الگ کر دیا۔ لیکن اس جھگڑے کی وجہ سے مجھے بڑی خفت اُٹھانا پڑی۔ اس لئے کہ ہمارے بارے میں بہت سی غلط سلط باتیں لوگوں کی زبان پر آ گئیں۔ لیکن ایک اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ پھوپھی ہماری اس وقت ہمارا سامان اٹھوا کر اپنے گھر لے گئی۔ ہمیں اپنا سب سے اچھا کمرہ رہنے کے لئے دیدیا۔ اور اس کے بعد وہ ہمیشہ ہم پر صدقے واری ہوتی رہی۔ انہوں نے میری والدہ کو وہیں بلوا لیا تھا۔ دونوں نے مل کر ہمارا نیا گھر بسانے میں پوری پوری مدد دی تھی۔

مگر یہ خوشی بھی عارضی ہی تھی۔ اُنہی دنوں آزادی کی جدوجہد چل رہی تھی۔ آزادی ملی تو دونوں ملکوں میں فسادات پھوٹ پڑے اور ہزاروں بے گناہ موت کی بھینٹ چڑھ گئے ان میں میری والدہ اور پھوپھی بھی تھیں اور میں پنڈی سے سینکڑوں میل دور لکھنؤ آ بسا تھا جہاں آنے کا میں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔

اس وقت اڑتیس برسوں کے بعد اچانک اخبار میں چھپی ہوئی بڈھی والی خاتون کا فوٹو دیکھ کر مجھے بھولی بسری باتیں یاد آ جاتی ہیں تو میں اخبار بیوی کی طرف بڑھا دیتا ہوں جو بڑے اطمینان سے ٹی وی کا کوئی پروگرام دیکھنے میں کھوئی ہوئی ہے "لے بھلی لوک، دیکھ تو یہ عورت پہچانی ہوئی ہے؟"

وہ نظر کا چشمہ چڑھا کر بڑے دھیان سے اخبار دیکھنے لگتی ہے۔ پہچان نہیں پاتی۔ سر اٹھا کر بڑی بے تعلقی سے پوچھتی ہے "کون ہے؟"

وہ جھُریوں کے جال کے پیچھے چھپا ہوا چہرہ نہیں پہچان پائی تو اچھا ہی ہوا ہے۔ اب اس کے اپنے چہرہ پر بھی جھریوں کا ایک جال سا تن گیا ہے۔ اگر میں اس عورت کی نشاندہی کر دوں تو اس کے چہرے پر یک بیک ایک نئی روشنی آ جائے گی۔ وہ مجھے بھول کر اسی کی یادوں میں کھو جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونک کر کھڑی ہو جائے اور اپنے گرد شال لپیٹ کر کہہ اٹھے۔ کیا وہ اتنے برسوں سے یہیں رہ رہی تھی؟ اسی شہر میں! چلو چلو اس کے بچوں سے شوک پر کٹ کر آئیں۔ بیچاری کتنی اچھی تھی۔ میں تو اسے ماسی کہہ کر بلاتی تھی!"

بقیہ صفحہ ۱۸ لوقیتِ غالب

۵۴۹۱ء [۱۰ مئی] حشمت زمانی بیگم عرف بگا بیگم زوجہ باقر علی خان کامل [فرزند اکبر زین العابدین خان عارف] کا انتقال۔

بگا بیگم ۱۲ سال کی عمر میں کامل کی دُلہن بن کر مرزا غالب کے گھر میں آئیں۔

۲۴ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ اور ۶۹ سال بیوگی کے عالم میں گذار کر بعمر ۹۳ سال فوت ہوئیں۔

فخرالدین علی احمد مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند ان کے نواسے تھے۔

رحمت امروہوی

غزل ہوئی ہے نہ کچھ شعر ہی کہے اب کے
یوں ہی گذار دیئے ہم نے رت جگے اب کے

گذشتہ سال تو مدفون ہو گئے تھے ہم
ہم اک عہد بنیں گے اگر جیئے اب کے

پتہ نہیں کہ وہ غارت گرِ بہار تھا کون
چمن سے نوچ لئے پھول ادھ کھلے اب کے

غمِ حیات سے ملتی اگر ہمیں فرصت
تو اس کے بارے میں کچھ ہم بھی سوچتے اب کے

ہم اپنے عہد کی تاریخ لکھنے والے ہیں
بہت طویل ہیں یادوں کے سلسلے اب کے

ہمیں سنبھالنا ماضی کا آئینہ ہیں ہم
حضور ٹوٹ چکے ہیں کچھ آئینے اب کے

خموش وہ بھی ہیں رحمت خموش ہیں ہم بھی
شکایتیں ہیں نہ شکوے نہ کچھ گلے اب کے

صدیق مجیبی

اے سکوتِ شام بتلا کیا ہوئے تیرے پرندے
ڈالیوں میں گنگناتے گیت گاتے تھے پرندے

کیوں نظر آتے نہیں آغازِ موسم کے سفیر اب
جانے کس دشتِ عدم کو جا بسے سارے پرندے

آج کل کیا شہر، کیا جنگل کہاں راحت میسّر
موت کے قاصد ہیں انسانوں کے سکھلائے پرندے

اب کسی طوطی کو مت سکھلایئے آیاتِ دانش،
کیسے طوطا چشم نکلے ہاتھ کے پالے پرندے

میں کہ اک زخمی سپاہی جسم و جاں مجھ پر اذیت
میرے چاروں اور منقارِ ہوس کھولے پرندے

میں لہو میں تربتر ہوتا ہوا اندر ہی اندر
شور کرتے روح میں بے چین سے اندھے پرندے

لے گئی اب کے خزاں اک ایک برگ رنگ و رامش
شاخ سے چمٹے ہوئے ہیں خوف کے مارے پرندے

ہے زوال آمادہ احساسِ جمال ایسا مجیبیؔ
"غیاث" سچ کہتے تھے رہ جائیں گے پتھر کے پرندے

● شعبہ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی بہار

سرشار بلند شہری

کھیلتے ہیں چند بچے دھوپ میں
ہنس پڑے پیڑوں کے سائے دھوپ میں

اک ندی کا پل ہواؤں تن گیا
اونچے نیچے کھیت پھیلے دھوپ میں

لوگ پھر پگڈنڈیوں پر آ گئے
راستوں نے ہیرے اگلے دھوپ میں

چاند نکلا بولے سارس رات میں
راستوں پہ مور ناچے دھوپ میں

ذہن میں کوئی نوکیلی یاد تھی
ہو گئے منظر رسیلے دھوپ میں

دیکھتے ہیں گاؤں کا منظر ابھی
سر اٹھا کے اونچے ٹیلے دھوپ میں

● جوہر مل کی چال ددّیشور روڈ، احمد آباد

دیوانِ غالب کے دو تاریخی نسخے

"نسخۂ بھوپال" اور "نسخۂ حمیدیہ"

ڈاکٹر سید حامد حسین

ای ۱۸۴/۲، پروفیسرز کالونی، بھوپال - ۲

۲۶ سال قبل ۱۹۶۹ء میں پوری اردو دنیا میں غالب صدی بڑے اہتمام سے منائی گئی تھی۔ اس وقت اردو کے اس عظیم شاعر کے شایانِ شان کئی منصوبے بنائے گئے تھے۔ ان میں سے کئی تکمیل تک پہنچے اور سامنے آئے اور کچھ ایسے بھی رہے جو تکمیل تک پہونچنے کے بعد بھی سامنے نہ آسکے۔ اُن میں سے ایک "دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ" کا نیا ترمیم شدہ ایڈیشن تھا۔ کئی سال کی عرق ریزی کے بعد میں نے نہ صرف جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں غالب کے اس تاریخی دیوان کو مرتب کر لیا تھا بلکہ ایک مبسوط مقدمے میں "نسخۂ حمیدیہ" میں شامل غیر مطبوعہ کلام کے ماخذ "نسخۂ بھوپال" اور مطبوعہ "نسخۂ حمیدیہ" کی کیفیت اور اُن کی تاریخ سے تعلق رکھنے والی تفصیلات کو بھی یکجا کر دیا تھا۔ گذشتہ نصف صدی کے تحقیقی نتائج پر مبنی اس تصحیح شدہ دیوان کے چھپنے کی تو نوبت نہیں آئی لیکن گذشتہ سال مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی نے بصرفِ کثیر "نسخۂ حمیدیہ" کے قدیم نسخے کو نہ صرف قدیم اغلاط کے ساتھ بلکہ بعض اُلجھن میں ڈالنے والی ترمیمات سمیت چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔

"نسخۂ حمیدیہ" کی خصوصیت : ۱۹۲۱ء میں آگرہ کے مفید عام اسٹیم پریس میں چھپ کر مفتی محمد انوار الحق کا مرتب کیا ہوا "دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ" شائع ہوا۔ یہ دیوان غالبیات کی تاریخ میں کئی لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دیوان کے ذریعے پہلی بار ایسے تقریباً ساڑھے سولہ سو اشعار سامنے آئے جنھیں غالب نے اپنا دیوان منتخب کرتے وقت حذف کر دیا تھا۔ اس طرح اس اشاعت کے ساتھ ساتھ غالب کا سرمایۂ شاعری لگ بھگ دوگنا ہو گیا۔ پھر کیونکہ ان غیر مطبوعہ اشعار کا ماخذ دیوانِ غالب کا وہ قلمی نسخہ تھا جو اس وقت تحریر کیا گیا تھا جب غالب کی عمر ۲۴ سال کے قریب تھی، ان اشعار نے ناقدین کو غالب کی ابتدائی شاعری کے بارے میں محاکمے کے لیے ہی مواقع بہم نہیں پہنچائے بلکہ ان میں موجود فکری پختگی اور فنی کمال نے غالب کی شاعرانہ عظمت میں مزید اضافے کی بنیاد بھی فراہم کی۔ "نسخۂ حمیدیہ" میں قلمی دیوان میں شامل اشعار کے علاوہ متداول دیوان میں موجود سارے کلام اور دوسرے ماخذ سے حاصل ہونے والے غالب کے غیر مروج اشعار کو بھی جگہ دی گئی۔ اس لحاظ سے "نسخۂ حمیدیہ" پہلا ایسا مکمل دیوان تھا جس میں غالب کا نودریافت اور متداول سارا کلام یکجا کر دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کلامِ غالب میں ترمیم و اضافے کی جانب جا بجا نشان دہی کر کے "نسخۂ حمیدیہ" نے دیوانِ غالب کی محققانہ انداز سے تدوین کی داغ بیل ڈالی۔

"نسخۂ بھوپال" کی کیفیت۔ دیوانِ غالب کا وہ قلمی نسخہ جس سے غیر متداول کلام "نسخۂ حمیدیہ" میں شامل کیا گیا بھوپال کے سرکاری کتب خانے "حمیدیہ لائبریری" میں محفوظ تھا۔ یہ قلمی دیوان جس کے لیے محققین "نسخۂ بھوپال" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تقریباً ۴۶ سال قبل گم ہو چکا ہے۔ لیکن "نسخۂ حمیدیہ" کی اشاعت نے اس قلمی نسخے میں غالب شناسوں میں جو دلچسپی پیدا کی تھی اس کے نتیجے میں محققین نے مختلف وقتوں میں اس نسخے سے استفادہ کیا ہے اور اس کی کیفیت بیان کی ہے۔ چنانچہ مخطوطہ کی عدم موجودگی میں ان بیانات سے اصل نسخے کی کیفیت کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

جن لوگوں نے اس قلمی دیوان کو دیکھا اور اس کی تفصیل بیان کی ہے ان میں جناب سید ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر عبداللطیف، پروفیسر حمید احمد خان، اور مولانا امتیاز علی عرشی شامل ہیں۔ وسط اگست ۱۹۱۸ء میں اس قلمی دیوان کی خصوصیت کا علم ہونے کے فوراً بعد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی جانب سے (مولوی عبدالحق کے نمائندے کی حیثیت سے) سید ہاشمی بھوپال آئے تھے اور انھوں نے اس نسخہ کو دیکھا تھا اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں سورت کے اجلاس میں رپورٹ

پیش کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے اس قلمی دیوان کے بارے میں جو تفصیل بیان کی تھی وہ غالباً سید ہاشمی کی ہی رپورٹ پر مبنی تھی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے جب کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے بھوپال سے اس نسخے کو حیدرآباد منگوایا اور یہ نومبر ۱۹۲۷ء سے جنوری ۲۸ء تک اُن کے پاس رہا۔ پروفیسر حمید احمد خان نے حیدرآباد سے لاہور لوٹتے ہوئے اواخر اگست ۱۹۳۸ء میں کچھ عرصے کے لیے بھوپال میں قیام کیا اور حمیدیہ لائبریری میں بیٹھ کر "نسخۂ حمیدیہ" اور قلمی نسخے کے اندراجات کا مقابلہ کیا۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے انجمن ترقی اردو کے اجلاس ناگپور سے واپسی میں (غالباً ۱۹۴۴ء) بھوپال میں دو دن قیام کیا، مخطوطے کو دیکھا اور مطبوعہ نسخے سے اس کا مقابلہ کیا۔

ان اصحاب کے بیانات سے قلمی نسخے کی درج ذیل تصویر مرتب ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے صفحات کی تعداد ۲۲۶ بتائی ہے[۱]۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنے مضمون میں متن ۵۰ ورقوں پر مشتمل بتایا ہے[۲]۔ اور تحریر کیا ہے کہ دونوں جانب چار چار ورق اسی قسم کے کاغذ کے ہیں جو متن کا ہے اور جو کہ ہندستان میں ہاتھ کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دو، دو ورق اور ہیں جو انگریزی کاغذ کے ہیں۔ ابتدا میں یہ ورق اوراق ۲ اور ۳ کے درمیان اور آخر میں ۵۲ اور ۵۳ کے درمیان ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عبداللطیف کے مطابق کل اوراق کی تعداد ۸۷ (یعنی ۱۷۴ صفحات) معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبداللطیف نے یہ بھی بتایا کہ ہر صفحے پر دس سے گیارہ تک ابیات تحریر ہیں۔ اس لحاظ سے دیوان میں شامل اشعار کی تعداد دیکھتے ہوئے مولوی عبدالحق نے صفحات کی جو تعداد بتائی ہے وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مولانا عرشی مخطوطے کا کاغذ عمدہ کشمیری بتاتے ہیں جس کا ناپ ۲۲ × ۲۹/۸ ہے[۳]۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے اوراق کا ناپ "½11 × "7 تحریر کیا ہے۔ مولانا عرشی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جدولیں رنگین اور طلائی اور باریک لاجوردی ہے۔ روشنائی سیاہ اور عنوانات شنجرفی ہیں۔" حمیدیہ لائبریری بھوپال کے قدیم ریکارڈ میں بھی اسے خوشخط اور مطلا تحریر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے بیان کیا کہ "ابیات صاف نستعلیق خط اور چینی روشنائی میں لکھی گئی ہیں۔" مولانا عرشی نے صراحت کی ہے کہ دیوان میں قصائد اور غزلیات کے لیے دو الگ الگ رنگین اور طلائی لوحیں ہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے بتایا ہے کہ سارا متن سنہری حاشیے کے خط سے آراستہ ہے۔

دیوان کے شروع میں چار قصیدے درج ہیں جن میں سب سے پہلے فارسی زبان میں فاتحۃ الکتاب "بہر تراویح جناب والی یوم الحساب" شامل کیا گیا ہے۔ ورق ۱۵ ب سے غزلیات شروع ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے غزلیات کی تعداد ۲۷۶ بتائی ہے لیکن مفتی انوار الحق اور پروفیسر حمید احمد خاں کے مطابق یہ تعداد ۲۷۵ ہے۔ مولانا عرشی نے نشان دہی کی ہے کہ دو غزلوں کے درمیان ایک سطر سادہ چھوڑی گئی ہے جس پر معمولی خط میں جگہ جگہ "ولہ" لکھا گیا ہے۔ غزلیات کے بعد گیارہ رباعیات ہیں۔

رباعیات کے خاتمہ پر بقول مولانا عرشی شنجرفی روشنائی میں اور بقول پروفیسر حمید احمد خاں سُرخ روشنائی میں یہ ترقیمہ درج ہے۔

"دیوان من تصنیف مرزا صاحب۔ وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم دبہم، علیٰ ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۱ھ من الہجرۃ النبویہ صورت اتمام یافت"۔

دیوان کے شروع اور آخر میں جو اوراق لگائے گئے ہیں ان پر بھی تحریریات ہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف کے مطابق "ورق ۱ الف کے بائیں گوشے کے سرے پر ۱۶۶ درج ہے اس سے ایک حرف نیچے سرخی سے ادب اردو ۱۱ اور پھر کچھ نیچے ۵۸ء اور اس کے قریب ہی شکستہ خط میں محمد حسین لکھا ہوا ہے۔" ورق ۳ الف پر اس غیر منقوط فارسی خط کی، بقول ڈاکٹر عبداللطیف "کسی قدر ناصاف شکستہ خط" اور بقول پروفیسر حمید احمد خاں "بدخط" نقل شروع ہوتی ہے جو غالب نے مولانا فضل حق خیرآبادی کو لکھا تھا۔ یہ نقل ورق ۳ ب پر جاری رہتی ہے اور اس کے بعد ورق ۸۶ الف اور ب پر مسلسل ہے۔ خط کے آخر میں "محمد اسد واللہ" درج ہے اور ڈاکٹر عبداللطیف کے الفاظ میں "یہاں نام میں حرف داؤ

---

[۱] رپورٹ انجمن ترقی اردو از مولوی عبدالحق مشمولہ رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۱۸ء۔ ص ۱۰۵۔

[۲] "دیوان غالب قلمی، ۱۲۳۱ھ"۔ اردو ترجمہ از سید محمد مجلہ مکتبہ (حیدرآباد) شمارہ ۶، جلد ۳۔ ص ۵۴۔

[۳] امتیاز علی عرشی: "دیوان غالب اردو، نسخۂ عرشی"۔ (نقش ثانی)۔ دیباچہ ص ۸۶۔

کا اضافہ قابلِ غور ہے۔" ورق ع۳ اور ورق ع۶ کے درمیان دو ورق انگریزی کاغذ کے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلے ورق کے دوسرے رُخ پر یعنی ورق ع۴ ب پر شمسے کے اندر یہ عبارت درج ہے

"دیوانِ ہٰذا مِن تصنیف میرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانۂ سرکار فیض آثار عالیجاہ عالمپناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ قلمی خوشخط"۔

ورق ۵۔ الف پر شمسے کے اندر فوج دار محمد خاں کی بڑی مہر ثبت ہے اور انگریزی چکنے کاغذ سے محفوظ کی گئی ہے۔ مولانا عرشی کے مطابق مہر پر بخط طغرا "فوج دار محمد خاں بہادر" اور ۱۳۶۱ھ منقوش ہے۔ ان ابتدائی چھ ورقوں میں سے اوراق ع۱ ب۔ ع۲ الف، ع۳ ب، ع۴ الف اور ع۵ ب خالی ہیں۔

دیوان کے آخر میں جو چھ اوراق بڑھائے گئے ہیں ان میں سے پانچ صفحوں پر پروفیسر حمید احمد خاں کے الفاظ میں "بدخط اور غلط نگار کاتب" نے ردیف ی کی سات غزلیں تحریر کی ہیں۔ مولانا عرشی نے نشان دہی کی ہے کہ ان غزلوں کے اختتام پر لکھا ہے

تمام شد۔ کارِ من نظام شد۔ ربِّ یسّر و تمم بالخیر۔

مفتی انوار الحق کے شمار کے مطابق قلمی دیوان میں شامل اشعار کی تعداد حسب ذیل ہے۔

۴ قصائد	۲۶۶	شعر
۲۷۵ غزلیات	۱۸۸۳	شعر
۱۱ رباعیات	۴۴	شعر
کل اشعار	۲۱۹۳	

لیکن پروفیسر حمید احمد خاں کے مرتبہ دیوان سے اشعار کی حسب ذیل تعداد معلوم ہوتی ہے۔

متن میں شامل اشعار :

۴ قصائد	۲۶۶	شعر
۲۷۵ غزلیات	۱۸۷۵	شعر
۱۱ رباعیات	۴۴	شعر
	۲۱۸۵	

حاشیے پر مندرج اشعار :

۱۶ غزلیات	۱۴۱	شعر
متفرق	۱۳۹	شعر
	۲۸۰	

آخری اوراق پر مندرج اشعار :

۷ غزلیات	۷۱

قلمی دیوان میں شامل کل اشعار ۲۵۳۶۔

مفتی انوار الحق نے اپنے شمار کو بڑی حد تک متن میں شامل اشعار تک محدود رکھا ہے اور اس لحاظ سے پروفیسر حمید احمد خاں کے دیوان میں شامل اشعار کے شمار سے صرف ۸ شعروں کا فرق ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حاشیے کے اشعار کو اپنے شمار میں بالعموم شامل نہ کرنے کے باوجود انھوں نے حاشیے کے ۸ شعروں کو شمار میں لے لیا ہے۔

نسخۂ بھوپال" کی دریافت سے جو غیر مطبوعہ اشعار پہلی بار سامنے آئے یا جن متداول اشعار کی ابتدائی غیر اصلاح شدہ شکل دیکھنے کو

ملی، اُن کی تعداد درج ذیل ہے۔

	غیر مطبوعہ اشعار	غیر اصلاح شدہ اشعار
غزلیات	۱۴۶۵	۱۱۱
قصائد	۱۶۳	۴۲
رباعیات	۱۲	۲
کل	۱۶۴۰	۱۵۵

اس لحاظ سے "نسخۂ بھوپال" نے ۱۷۹۵ شعروں کے بارے میں نئی معلومات فراہم کیں۔

قلمی دیوان کے متن اور حاشیوں میں جا بجا اصلاحیں اور اضافے ہیں۔ بعض جگہ الفاظ قلمزد کر کے متن میں ہی ترمیم کی گئی ہے اور بعض اوقات ترمیم شدہ مصرع یا شعر حاشیے میں کئی ایسے شعر درج کیے گئے ہیں جو متن میں شامل غزلوں میں نہیں ہیں اور کہیں کہیں پوری غزلیں حاشیے میں درج ملتی ہیں۔ ایسی غزلوں کی تعداد ۱۶ ہے۔ دو غزلیں "نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا" اور "باعث درماندگی ہے عمر فرصت جو مجھے" حاشیے اور متن دونوں جگہ ملتی ہیں۔ غزل "جہاں زندانِ موجستانِ دلہائے پریشاں ہے" کے تین شعر، "ہجوم نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے" کا ایک شعر، "اثر سوز محبت کا قیامت بے محابا ہے" کے ۵ شعر اور "بہ بزم مے پرستی حسرتِ تکلیفِ بے جا" کے ۵ شعر حاشیے پر بھی درج ہیں۔ گو کہ بعض مقامات پر متن اور حاشیے کے اندراجات میں خفیف اختلاف ہے۔

متن اور حاشیے پر مندرج اصلاحات و اضافے کئی مختلف خطوں میں ملتے ہیں۔ اس اختلاف کو پروفیسر حمید احمد خاں نے باریک قلم خوش خط، باریک قلم شکستہ خط، موٹا قلم خوش شکستہ، موٹا قلم بدخط شکستہ، موٹا قلم شکستہ، موٹا قلم شکستہ مگر بدخط نہیں، موٹا قلم بدخط، موٹا قلم شکستہ خط کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ قلم، روشنائی اور روشِ خط کے اس اختلاف سے مولانا عرشی نے صحیح اندازہ لگایا ہے کہ اصلاح و اضافے کا یہ کام مختلف اوقات میں انجام دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا خیال ہے کہ حاشیے کے اضافے دو مختلف ہاتھوں کے ہیں۔ ان میں سے ایک صاف نستعلیق اور دوسرا شکستہ خط ہے۔ مولوی عبدالحق، مفتی انوارالحق، پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی بعض مقامات پر ترمیم و اضافے کے خط کو غالب کے خط سے مماثل بتاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبداللطیف حیدر آباد کے محکمہ اسناداتِ تاریخی کے ماہرین کے مشورے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اصلاحات و اضافے غالب کے خط سے ذرا بھی مشابہ نہیں۔

بعض جگہ بدنما خط میں کی گئی ترمیمات میں املا کی سخت غلطیاں نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ مولانا عرشی نے نشان دہی کی ہے "تقاضا" کو "تقضا"، "مضائقہ" کو "مضاعقہ"، "ذرّہ" کو "زرہ"، "تہک" کو "ٹھک" اور "بھاگیں گے" کو "بھاگے نگے" تحریر کیا گیا ہے۔ مولانا عرشی نے اس پر سخت حیرت کا اظہار کیا ہے کہ غالب جیسا شخص ۲۵ سال کی عمر میں اس قسم کی غلطیاں کر سکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبداللطیف نے ان غلطیوں کو اصلاحات کے بخطِ غالب نہ ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "یہ اغلاط غالب جیسے محتاط مصنّف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جا سکتیں۔" پھر چند مصرعے حاشیے پر ایسے بھی درج ملتے ہیں جو پروفیسر حمید احمد خاں کی نشان دہی کے مطابق ساقط الوزن ہیں اور اِن حالات میں اُن کے بقول "موٹے قلم کے شکستہ اندراجات کو غالب کی تحریر ماننا ناممکن معلوم ہوتا ہے"۔ دیوان کے آخر میں سادہ اوراق پر جو غزلیں نقل کی گئی ہیں اُن میں غلط نگاری کی اور بھی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ کئی مصرعوں میں الفاظ کی ترتیب بدل گئی ہے۔ بعض جگہ الفاظ لکھنے سے چھوٹ گئے ہیں اور املا کی غلطیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

بہر حال یہ واضح ہے کہ کلامِ غالب میں ترمیمات اور اضافوں کے پیشِ نظر دیوان کو مکمل بنانے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں چنانچہ اس وقت دستیاب مکمل ترین دیوان سے مقابلہ کر کے ترمیمات اور اضافے کیے گئے ہیں۔ غزل "لب خشک در تشنگی مردگاں" کے اوپر حاشیے میں "مقابلہ کردہ شد" تحریر ہے۔ اسی طرح جب مقابلہ کرنے والے کاتب نے کسی غزل کو نئی سمجھ کر حاشیے پر درج کر لیا ہے اور اس کے بعد اُسے وہی غزل یا اس کے بعض اشعار متن میں درج ملے ہیں تو اُس نے متن والی غزل پر "مکرر نوشتہ شد" لکھ دیا ہے۔

مولانا عرشی نے یہ بھی بتایا ہے کہ "کچھ غزلوں کے آغاز کی سادہ جگہوں میں لفظ غلط لکھا گیا ہے اور بعض غزلوں میں حرف 'غ' اس طرح لکھا ہے۔ کہ اس کا سر مطلع کے دونوں مصرعوں کے بیچ میں آیا ہے اور دائرے نے ساری غزل کو گھیر لیا ہے۔ یہ سب غزلیں وہ ہیں جو نسخۂ شیرانی میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔" پروفیسر حمید احمد خاں کی صراحت کے مطابق جن غزلوں پر "غلط" تحریر ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ تیشہ و آتشیں رخ پر نور۔

۲۔ بینش بسعی ضبط جنوں نو بہار تر۔

۳۔ میں ہوں سراب یک تپش آموختن ہنوز۔

۴۔ ولا عبث ہے تمنائے خاطر افروزی۔

۵۔ محو آرامیدگی سامان بے تابی کرے۔

۶۔ یہ سرنوشت میں میری ہے اشک افشانی۔

قلمی دیوان پر بعض اصحاب کے دستخط بھی ثبت نظر آتے ہیں۔ ان میں سے عبدالعلی کے دستخط ردیف الف اور ردیف غین کی دو دو غزلوں پر ملتے ہیں۔ بعض جگہ انھوں نے پسندیدگی کا اظہار صرف "ص" تحریر کر کے کیا ہے۔ لیکن ردیف غین کی غزلوں میں انھوں نے "پسند عبدالعلی منہ" اور "پسند خاطر عبدالعلی" کے الفاظ بھی تحریر کیے ہیں[1]۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا قیاس ہے کہ دیوان میں صاف نستعلیق خط میں کیے گئے، اضافے اور اصلاحات عبدالعلی کے ہاتھ کے ہیں۔ مولانا عرشی ورق ۲۹ رالف کے حاشیے میں باریک کے اندر "محمد عبدالصمد مظہر" لکھا ہوا بتاتے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے اس اندراج کو "محررہ عبدالصمد مظہر" پڑھا ہے اور اسے غزل "بہار رنگ خون گل ہے سامان اشک باری" کا" کے ساتھ حاشیے پر لکھا بتایا ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے ان دستخطوں کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا[2]۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے ایک اور دستخط "آغا علی" کی نشان دہی کی ہے جو کہ غزل "گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ" کے مطلع ثانی کے مقابل نشان "ص" بنا کر ثبت کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے ان دستخطوں کا ذکر نہیں کیا ہے اور مولانا عرشی کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ "عبدالعلی" کے دستخطوں کو ہی "آغا علی" پڑھ لیا گیا ہے[3]۔

"نسخۂ بھوپال کی تاریخ"۔ جیسا کہ قلمی دیوان کے ترقیمے سے ظاہر ہوتا ہے، مخطوطے کے متن کی کتابت ۵ رصفر ۱۲۳۷ھ یکم نومبر ۱۸۲۱ء کو مکمل ہو چکی تھی۔ اس وقت غالب (ولادت ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء) کی عمر تقریباً ۲۴ سال کی تھی۔ اور جیسا کہ مخطوط کی رنگین اور طلائی لوحوں اور پورے دیوان میں طلائی جدولوں سے ظاہر ہوتا ہے نوجوان شاعر نے اس دیوان کو بڑی خصوصیت، اور اہتمام کے ساتھ تیار کرایا تھا۔

ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو پایا ہے کہ غالب نے اس کو کس لیے تیار کرایا تھا اور یہ کس طرح بھوپال پہنچا۔ اس سلسلے میں کئی قیاسات ظاہر کیے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے تحریر کیا ہے کہ اس نسخہ کو غالب نے خود میاں فوج دار محمد خاں کو نذر کیا تھا[4]۔ مفتی انوار الحق کی رائے بھی یہی ہے کہ "یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں کے بیٹے میاں فوج دار محمد خاں کے لیے لکھا گیا تھا۔" بھوپال کے ایک اور ادیب

---

[1] یہ عبدالعلی تونگر (۱۸۲۰ء تا ۱۸۸۳ء) ہو سکتے ہیں جو مومن کے شاگرد سید عبدالواحد خاں مسکین کے صاحبزادے تھے۔ نواب سکندر بیگم کے عہد میں بھوپال ریاست کے میر دبیر رہے اور خود بھی شاعر تھے۔

[2] محمد عبدالصمد مظہر (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۱ء) نواب سلطان جہاں بیگم کے ملٹری سکریٹری تھے۔ ۱۹۲۲ء میں حیدر آباد گئے، معتمد فوج اور معتمد دفاع رہے اور نواب صمد یار جنگ کا خطاب پایا۔ انھوں نے غالباً مخطوطے کا مطالعہ اس وقت کیا جب ڈاکٹر عبداللطیف نے اُسے حیدر آباد منگوایا تھا اور ڈاکٹر عبداللطیف کے استفادے کے بعد ہی غالباً اس پر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔

[3] مزید ملاحظہ فرمایئے راقم الحروف کا مضمون "دیوان غالب (نسخۂ بھوپال) پر ثبت دستخط اور مہریں"۔ "شاعر" جولائی ۱۹۶۹ء۔ (باقی صفحہ دیگر)

سید محمد یوسف قیصر سے یہ روایت منسوب ہے کہ میاں فوج دار محمد خاں نے خود اپنا کاتب بھیج کر اس نسخے کو تیار کر کے منگوایا تھا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ۱۸۲۱ء میں جب یہ نسخہ تیار ہوا میاں فوج دار محمد خاں (ولادت ۱۸۱۱ء) کی عمر صرف دس سال کی تھی [۹]۔ اور اُنھیں یہ دیوان نذر کیا جانا یا ان کا کسی کاتب کو بھیج کر دیوان نقل کرانا قطعاً قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا عرشی نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ تحریر فرمایا ہے کہ "فی الحقیقت یہ میرزا ہی کے لیے لکھا گیا تھا"۔ لیکن اس رائے کی توثیق کسی حتمی شہادت سے نہیں ہوتی بلکہ قلمی دیوان کی رنگین اور مذہّب لوحیں اور پورے دیوان کی مطلّا جدولیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہ دیوان کسی شاعر کی نجی بیاض یا ذاتی استعمال کے لیے تحریر دیوان سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

اس مخطوطے میں جس طرح وقتاً فوقتاً اصلاحات و اضافوں کا اندراج ہوتا رہا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ کسی ایسے شخص کے پاس رہا ہے کہ جو نہ صرف کلامِ غالب میں ترمیمات اور اضافوں میں گہری دلچسپی رکھتا ہو بلکہ اس کو ایسے مواقع بھی حاصل ہوں کہ اشعارِ غالب کی تازہ ترین کیفیت سے باخبر رہ کر اُس کی نقل بھی لیتا رہا ہو۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے ایک مضمون "غالب کے دو قلمی دیوان اور میر علی بخش خاں رنجور" [۱۰] میں اس قیاس کا اظہار کیا ہے کہ یہ قلمی دیوان غالب نے نواب احمد بخش خاں کو پیش کیا تھا جن سے یہ غالب کے برادرِ نسبتی میرزا علی بخش رنجور کے پاس آیا اور اُنھوں نے اس میں وقتاً فوقتاً ترمیمات و اصلاحات کیں۔ یہ نسخہ رنجور کے پاس غالباً "نسخۂ شیرانی" کی کتابت تک رہا۔ ("نسخۂ شیرانی" کی تقریبی تاریخ کتابت ۱۸۲۶ء بیان کی جاتی ہے۔)

قرائن اس کی تصدیق نہیں کرتے کہ یہ خطّی دیوان فوج دار محمد خاں کے کتب خانے میں براہِ راست غالب سے پہنچا ہو۔ لیکن اس کے ثبوت موجود ہیں کہ فوج دار محمد خاں کو ہر فن پر اچھی کتابیں یکجا کرنے کا شوق تھا۔ اُن کے کتب خانے کی ایک فہرست میں جو کہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں تیار کی گئی تھی تقریباً ایک ہزار اردو، فارسی اور عربی کی اور تین سو سے زیادہ سنسکرت کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا اندراج ہے۔ اسی فہرست میں "دیوان اسد غالب قلمی خوش خط" بھی مندرج ہے۔ فوج دار محمد خاں وقتاً فوقتاً جن لوگوں کی معرفت اپنی کتابیں منگاتے رہتے تھے ان میں سے تین اشخاص مولوی سید محمد نواز، میاں قطب الدین اور قاضی محمد حنیف کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے [۱۱]۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ خطّی نسخہ بھی فوج دار محمد خاں کے پاس اسی قسم کے کسی ذریعہ سے پہنچا ہو۔

اس وقت بھوپال کی مولانا آزاد سنٹرل لائبریری میں فوج دار محمد خاں کے کتب خانے کی جو کتابیں موجود ہیں ان کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ۱۲۴۸ھ، ۱۲۵۵ھ اور ۱۲۸۱ھ کی چھوٹی مہریں اور ۱۲۶۱ھ کی بڑی مہر ثبت ہیں۔ کیونکہ "نسخۂ بھوپال" پر ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۶۱ھ کی مہریں پائی جاتی ہیں اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ فوجدار محمد خاں کے پاس ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء اور ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء کے درمیان کسی وقت پہنچا۔ فہرست کتب میں اندراج کے پیشِ نظر اس امر میں تو بہر حال کوئی شک نہیں کہ وہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں کتب خانۂ فوجدار محمد خاں میں موجود تھا۔

۱۸۶۵ء میں فوجدار محمد خاں کے انتقال کے بعد اُن کا کتب خانہ اُن کے صاحبزادے یار محمد خاں شوکت کے پاس رہا۔ ۱۹۱۲ء میں یار محمد

[بقیہ صفحہ کا]

[۹] عبدالحق: گنجینۂ عصر، اضافہ شدہ ایڈیشن، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۶ء۔ ص ۳۷۸۔

[۱۰] ملاحظہ فرمایئے راقم الحروف کا مضمون "میاں فوجدار محمد خاں اور غالب"۔ "سب رس" [حیدرآباد]۔ غالب نمبر۔ ستمبر ۱۹۶۹ء۔

[۱۱] مطبوعہ سہ ماہی "اردو" کراچی۔ غالب نمبر حصہ دوم، اپریل، مئی، جون ۱۹۶۹ء۔ یہ مضمون راقم الحروف کے مجموعۂ مضامین "تحقیق اور حاصلِ تحقیق" [مطبوعہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال، ۱۹۸۲ء] میں بھی شامل ہے۔

[۱۲] ملاحظہ فرمایئے راقم الحروف کا مضمون "دیوانِ غالب [نسخۂ بھوپال] کی کہانی کتابت سے گمشدگی تک"۔ "اردو ادب" [علی گڑھ] غالب نمبر۔ شمارہ ۱، ۱۹۶۹ء۔

خاں کا انتقال ہوگیا جس کے بعض کتب خانے کی کتابیں والیہ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے محل پر منگوائیں۔ اسی سال بھوپال میں حمیدیہ لائبریری کا قیام عمل میں آیا جس کا افتتاح لارڈ ہارڈنگ نے کیا۔ غالباً اسی موقع پر دیوانِ غالب کا یہ نسخہ بھی حمیدیہ لائبریری میں منتقل ہوا

وسط ۱۹۱۸ء میں عبدالسلام ندوی بھوپال آئے۔ وہ اپنی تصنیف "شعر الہند" کی تیاری کے سلسلے میں قدیم دواوین کا مطالعہ کر رہے تھے۔ حمیدیہ لائبریری میں موجود دیوانِ غالب کے اس قلمی نسخے کا جب انھوں نے مطالعہ کیا تو ان پر منکشف ہوا کہ اس میں بڑی مقدار میں ایسا کلام محفوظ ہے جو مروجہ دیوان غالب میں شامل نہیں ہے۔ اس انکشاف نے دنیائے ادب میں ایک سنسنی پیدا کردی اور ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے جو اس وقت بھوپال میں مشیر تعلیم کے عہدے پر فائز تھے اور انجمن ترقی اردو کے لیے دیوان غالب کی تدوین میں مصروف تھے، اس قلمی نسخے کو اپنے پاس منگوا لیا۔ لائبریری سے اس دیوان کا ڈاکٹر بجنوری کے نام ۴ر اگست ۱۹۱۸ء کو اجرا ہوا۔ ۷ر نومبر ۱۹۱۸ء کو ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد یہ نسخہ مفتی انوار الحق کے پاس رہا جس کی مدد سے انھوں نے "نسخہ حمیدیہ" تیار کیا۔ مفتی صاحب کے پاس سے یہ قلمی دیوان ۹ر مارچ ۱۹۲۴ء کو حمیدیہ لائبریری میں واپس آیا۔

۱۹۲۷ء میں حیدر آباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے غالب کے کلام کو تاریخی ترتیب کے ساتھ مدوّن کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے سر اکبر حیدری کی معرفت قاضی ولی محمد معتمد ریاست بھوپال کو ایک خط کے ساتھ مطبوعہ "نسخہ حمیدیہ" کی ایک جلد روانہ کروائی تاکہ اس میں ان اشعار پر نشان لگا دیے جائیں جو "نسخہ بھوپال" کے حاشیے پر درج تھے۔ اس کے جواب میں قاضی ولی محمد نے "نسخہ بھوپال" حیدر آباد روانہ کیا۔ اس مقصد سے مخطوطے کا حمیدیہ لائبریری سے ۳ر نومبر ۱۹۲۷ء کو اجرا کیا گیا اور یہ ۲۱ر جنوری ۱۹۲۸ء کو لائبریری میں واپس پہنچا۔

اس کے بعد جن اصحاب نے اس مخطوطے سے کسی حد تک تفصیلی طور پر فائدہ اٹھایا ان میں لاہور کے پروفیسر حمید احمد خاں اور رامپور کے مولانا امتیاز علی عرشی شامل ہیں۔ ان اصحاب نے مختصر وقت کے لیے بھوپال میں رک کر قلمی نسخے کا مطالعہ کیا اور اس کے نتیجے میں انھوں نے جو اشارات قلم بند کیے وہ ان کے مرتبہ دواوین میں مندرج ہیں۔

اس وقت حمیدیہ لائبریری کو اس مخطوطے کی اہمیت کا پورا اندازہ ہوچکا تھا اور اس کو ایک ایسی الماری میں منتقل کر دیا گیا تھا جو نادرات کے لیے مخصوص تھی۔ ۱۹۴۸ء میں بھوپال ریاست کے ہند یونین میں انضمام کے بعد نادرات کی یہ الماری کہاں منتقل ہوئی اس کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا ہے، گو کہ اس مخطوطے کو گم ہوئے ۳۶ سال کا عرصہ ہوچکا ہے پھر بھی یہ توقع ہے کہ وہ ضائع نہیں ہوا ہے اور جلد یا بدیر وہ منظر عام پر آسکے گا۔

نسخۂ حمیدیہ۔ "نسخہ حمیدیہ" کی اہمیت بلاشبہ اس بنا پر ہے کہ اس میں پہلی بار "نسخہ بھوپال" میں موجود کلام کو شائع کیا گیا۔ لیکن ایک ایسے دیوان کو شائع کرنے کا پروگرام "نسخہ بھوپال" کی دریافت سے پہلے ہی بنایا جاچکا تھا جس میں غالب کا متداول اور غیر متداول کلام پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد شامل کیا گیا ہو۔ شروع ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو نے یہ طے کیا تھا کہ وہ غالب کے اردو دیوان کا ایک نفیس اور صحیح ایڈیشن طبع کرے گی۔ اس سلسلے میں یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ نامور انشا پردازوں سے غالب کی حیات اور اُن کے فن کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھوا کر دیوان کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ اس تجویز کے جواب میں صرف مولوی عبدالحلیم شرر اور رضا علی وحشت نے مضامین لکھنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تھا اور بعد میں صرف وحشت نے اس سلسلے میں اپنا مضمون بھیجا تھا۔

دیوان کی تیاری کا کام سید ہاشمی کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے موجود متن کی صحت پر توجہ دینے کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوا غالب کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کیا۔ انجمن کو نواب احمد سعید خاں غالب سے دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ بھی حاصل ہوگیا تھا جسے نواب ضیاء الدین خاں نیر نے لکھوایا تھا اور غالب کی نظر سے گذر چکا تھا۔ اس کی مدد سے ۱۹۱۵ء تک انجمن کے دیوان کا مسودہ تیار ہوگیا تھا اور اس میں مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والے غیر مطبوعہ کلام کو شامل کر لیا گیا تھا۔ دیوان کو "الناظر" (لکھنؤ) کے ایڈیٹر مولوی ظفر الملک علوی کو باغرض طباعت کے لیے بھی بھیج دیا گیا تھا۔ لیکن اسی زمانے میں نظامی پریس بدایوں سے دیوان غالب چھپ گیا اور دیوان کی اشاعت کے سلسلے میں انجمن

کی سرگرمی میں کمی آگئی۔

جب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری یورپ سے لوٹے تو انھوں نے دیوان غالب کی اشاعت میں انجمن کی ازسرنو دلچسپی پیدا کی اور دیوان کے لیے مقدمہ لکھنے اور دیوان کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ چنانچہ انجمن نے سید ہاشمی کا مرتبہ دیوان ان کے سپرد کر دیا اور ۱۹۱۶ء کے آخر میں بھوپال پہنچنے کے بعد ڈاکٹر بجنوری نے مقدمہ کی تیاری کے ساتھ ساتھ سید ہاشمی کے دیوان میں شامل غیر متداول کلام کے بارے میں چھان بین کا کام شروع کر دیا۔ بہتر طباعت اور دیوان کو آراستہ کرنے کے بھی انھوں نے منصوبے بنائے۔

چنانچہ انھوں نے دیوان کو فوٹو بلاک کے ذریعہ طبع کروانے کے امکان کا پتہ چلایا اور غالب کی قبر کی تصویر حاصل کرنے کے علاوہ وہ غالب کے بعض اشعار پر تصاویر تیار کرانے کا بھی بندوبست کر رہے تھے۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جب "نسخۂ بھوپال" ڈاکٹر بجنوری کے پاس پہنچ گیا تو انھوں نے فوراً مولوی عبدالحق کو اس دیوان کے بارے میں مطلع کیا انجمن کی جانب سے اس قلمی نسخے کو دیکھنے اور ڈاکٹر بجنوری سے مشورہ کرنے سید ہاشمی بھوپال آئے وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جابجا سے مرزا صاحب نے خارج کر دئے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے تھے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا تاکہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم و جدید کلام کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔ یہ بھی امید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے۔ لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا"[1]۔

ڈاکٹر بجنوری اس دیوان کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں "ڈاکٹر بجنوری نے اس اصل نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے، اعلیٰ درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کے لیے چابکدست مصوّروں کی تصویروں کی فرمائش"[2]۔ اسی اہتمام کا ایک پہلو ایسے نوادر کی تلاش تھی جنھیں اس نئے دیوان کے ساتھ شائع کیا جا سکتا۔ ایک ایسی ہی نادر چیز "خود مرزا کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انھوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے"[3]۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے یہ بھی اطلاع دی کہ ڈاکٹر بجنوری دیوان کے آخر میں قلمی نسخے کا عکس بھی شائع کرنا چاہتے تھے[4]۔

لیکن "نسخۂ بھوپال" کی دریافت کے تین ماہ بعد ہی ڈاکٹر بجنوری کا انتقال ہو گیا اور مفتی انوار الحق کو اس دیوان کی تدوین کا کام سپرد ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری اس دیوان کو انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع کرنا چاہتے تھے اور اسی بنا پر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر بجنوری کے دوسرے احباب بڑی سرگرمی سے اس دیوان کی تیاری کے لیے ضروری کوششیں کر رہے تھے۔ لیکن انجمن کو اس دیوان کی اشاعت کا موقع نہیں مل سکا۔ دراصل دیوان کی اشاعت کے مسئلے پر "نسخۂ بھوپال" کی دریافت کے فوراً بعد ہی بھوپال کے علمی و انتظامی حلقوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ قلمی نسخے کے ڈاکٹر بجنوری کے پاس پہنچنے کے دو ہفتے کے بعد ہی انھوں نے مولوی عبدالحق کو لکھا تھا:

جس دن سے وہ نسخۂ دیوانِ غالب کا میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل مچی ہے۔ آدھا بھوپال میرے

---

[1] "تبصرہ نسخۂ حمیدیہ" از سید ہاشمی۔ "اردو" اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ ص ۷۰۴ و ۷۰۵۔

[2] "ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری" مشمولہ "چند ہم عصر" از عبدالحق کراچی ۱۹۶۹ء۔ ص ۳۷۸۔

[3] "مرزا غالب کی خودنوشتہ سوانح عمری کا ایک ورق" از عبدالحق "الشجاع" [کراچی] ۔غالب نمبر ۱۹۶۹ء۔

[4] "معارف" اکتوبر ۱۹۱۹ء۔ ص ۳۱۵۔

خلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔ مولوی سلیمان ندوی صاحب نے بھی ایک حملہ فرمایا تھا۔ لیکن میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ جان جائے۔ اب نسخہ نہیں جاتا۔ انشاءاللہ جتنا جھوٹ آج کل بول رہا ہوں، عمر بھر موقع نہیں ہوا تھا۔"[1]

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طبقہ یہ چاہتا تھا کہ قلمی دیوان بھوپال ہی میں رہے اور بھوپال کو ہی اس کی اشاعت وغیرہ کا سہرا ملے لیکن ڈاکٹر بجنوری کا اصرار تھا کہ دیوان انجمن ترقی اُردو ہی چھاپے گی۔ ان کے انتقال سے صورتِ حال بدل گئی اور ریاست بھوپال کی طرف سے ایسے احکامات جاری ہوئے جن کے تحت مفتی محمد انوار الحق ناظمِ تعلیمات ریاست بھوپال[2] کو دیوان کی ترتیب و تدوین کا کام سونپا گیا تاکہ دیوان کو ریاست کی جانب سے شائع کیا جاسکے۔ اس لیے اس طبقہ کو تو اطمینان ہوا جو نسخۂ بھوپال کو ریاست سے باہر جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے نتیجے میں ڈاکٹر بجنوری کے دوستوں اور خیرخواہوں میں بے چینی پیدا ہونا فطری تھی۔ بجنوری کی کوششوں سے دیوان کی طباعت کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور اس کے لیے مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو اپنے سارے وسائل استعمال کر رہے تھے مثلاً دیوان کی کتابت کا کام شروع ہو چکا تھا۔ حالانکہ ریاست نے پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے یہ طے کیا تھا کہ دیوان نواب زادہ حمید اللہ خاں کے نام سے شائع ہوگا اور اُس کی حیثیت ڈاکٹر بجنوری کی یادگار کی ہوگی لیکن یہ بات بجنوری کے اُن احباب کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہ تھی جو اس دیوان کو بجنوری کی ہدایتوں کے مطابق انجمن ترقی اُردو کے زیرِ اہتمام اشاعت کے لیے ہمہ تن مصروف تھے۔

چنانچہ ریاست کے فیصلے سے بجنوری کے احباب کو کتنی مایوسی ہوئی اور انھیں کیا اندیشے پیدا ہوئے اس کا اندازہ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے "معارف" میں مولانا سید سلیمان ندوی کے اس نوٹ سے ہوتا ہے:

> "اُمید تھی کہ اُن (بجنوری) کے احباب و انجمن ترقی اردو، مرحوم کی یادگار میں اس نسخے کو چھاپ کر شائع کرے گی۔
> لیکن مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی یہ محنت و کاوش ریاستوں کی پولیٹیکل کشمکش میں ضائع ہونا چاہتی ہے۔"[3]

لیکن حقیقت یہ تھی کہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں دیوان کی ترتیب کا کام سنبھالنے کے ... فوراً بعد مفتی انوار الحق نے تدوین کا کام پوری تندہی سے شروع کر دیا تھا اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں نہ صرف اس کو مرتب کر لیا تھا بلکہ اس کی کتابت و طباعت کا کام بھی شروع کر دیا تھا چنانچہ "معارف" کے مندرجہ بالا نوٹ کی اشاعت کے فوراً بعد مفتی صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور نومبر میں مولانا نے تحریر کیا:

> "چند روز ہوئے ہمارے محترم دوست مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے ناظمِ تعلیمات بھوپال کا ایک مفصل خط آیا جس کو پڑھ کر خوشی ہوئی کہ دیوانِ مذکور نہایت خوبی کے ساتھ جناب مفتی صاحب کے زیرِ اہتمام و تحشیہ چھپ رہا ہے۔ آٹھ صفحے چھپے ہوئے انھوں نے بھیجے ہیں اور یہ دیکھ کر اور بھی زیادہ مسرت ہوئی کہ لکھائی، چھپائی، کاغذ۔ ہر حیثیت سے قابلِ تعریف ہے۔ مفتی صاحب یہ یقین دلاتے ہیں کہ چھ مہینے میں یہ نسخہ شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ اشاعت کے تمام مصارف جناب نواب زادہ حمید اللہ خاں بہادر بی، اے اپنی طرف سے ادا کر رہے ہیں اس عظیم الشان ادبی خدمت پر ہم اس علم پرور ریاست اور اس کے ارکان کو مبارکباد دیتے ہیں۔"[4]

---

[1] مکتوب مورخہ ۷ر اگست ۱۹۱۸ء۔ دیکھیے "بابائے اُردو کے نام ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کا خط" از خیر بہوروی۔ "فروغ اردو" لکھنؤ۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۵ء۔ ص ۵۸۔

[2] ملاحظہ فرمائیے "نسخۂ حمیدیہ کے مرتب مفتی محمد انوار الحق"۔ "شاعر" غالب نمبر ۱۹۶۹ء۔

[3] "معارف" اکتوبر ۱۹۱۹ء۔ ص ۶ و ۳۰۷۔ [4] "معارف" نومبر ۱۹۱۹ء۔ ص ۳۲۵۔

اس نوٹ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کے وسط ۱۹۲۰ء تک چھپ جانے کی توقع تھی۔ لیکن دیوان ۱۹۲۱ء میں جاری ہو سکا۔ اس تاخیر کی مفتی صاحب نے یہ وجہ بتائی کہ وہ اس دیوان کو ڈاکٹر بجنوری کی یادگار کی حیثیت سے شائع کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ دیوان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے حالاتِ زندگی بھی پیش کریں۔ لیکن اس سلسلے میں بجنوری کے اعزا اور احباب سے وعدوں کے باوجود کوئی مدد نہ ملی۔ یہاں تک کہ اُن کے پاس بجنوری کے مقدّمے کی جو نقل اور اُن کی جو تصویر تھی وہ بھی واپس لے لی گئیں۔

ادھر کیونکہ مولوی عبدالحق وغیرہ ریاست کے ذریعے شائع ہونے والے دیوان کے ساتھ بجنوری کا نام کسی طرح وابستہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے جیسے ہی انجمن ترقی اُردو نے اپنا سہ ماہی "اُردو" نکالنے کا فیصلہ کیا، اس کے پہلے ہی شمارے (بابت جنوری ۱۹۲۱ء) میں سرِ فہرست بجنوری کا مقدّمہ محاسن کلامِ غالب کے نام سے شائع ہوا اور سال بھر کے اندر اندر اسے کتابی شکل میں بھی طبع کر کے جاری کر دیا گیا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مفتی صاحب نے بھی "نسخۂ حمیدیہ" کی چند جلدیں ۱۹۲۱ء میں بلا بجنوری کے مقدمے کے محض اپنی تمہید اور بجنوری پر اپنے مضمون کے ساتھ جاری کر دیں۔ بعد میں جب انھیں بجنوری کا مقدمہ اور تصویر دستیاب ہو گئے تو اُن کے اضافے کے ساتھ انھوں نے مزید جلدوں کا اجرا کیا۔

"نسخۂ حمیدیہ" کی خامیاں۔ اس طرح یہ واضح ہے کہ "نسخۂ حمیدیہ" کو بڑی عجلت کے ساتھ ترتیب دے کر طبع کروایا گیا۔ خود مفتی انوارالحق کے بارے میں یہ علم ہے کہ ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد مفتی صاحب کو سکریٹری تعلیمات اور مشیر تعلیم کی وہ ذمّہ داریاں بھی سنبھالنا پڑیں جو کہ پہلے ڈاکٹر بجنوری کے پاس تھیں۔ مفتی صاحب اس وقت تک بحیثیت ناظمِ تعلیمات کام کر رہے تھے۔ یہ مزید ذمّہ داریاں ان کی انتظامی مصروفیتوں میں اضافہ تھیں۔ نئی ذمّہ داریوں میں شہر بھوپال میں جبری تعلیم کی نئی اسکیم کا نفاذ تھا جس کی جانب ظاہر ہے انھیں خصوصی توجہ دینا پڑی ہوگی۔ ان حالات میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کے لیے یہ ناگزیر ہو گیا کہ وہ "نسخۂ حمیدیہ" کی تیاری میں اہل کاروں سے مدد لیں۔ کسی قلمی نسخے کا ایڈٹ کرنا بجائے ایک خاص تربیت اور مہارت چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس قلم کے عملے کو "نسخۂ حمیدیہ" کی تدوین سونپی گئی اسے ایسے ذمّہ دارانہ کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جناب نادم سیتاپوری بتاتے ہیں کہ "نسخۂ حمیدیہ" کی تیاری میں ڈاکٹر وارثی کا بھی ہاتھ تھا[1]۔ اگر یہ وہی ڈاکٹر ایس سلیم وارثی تھے جن کا نام "مخزن" [لاہور] کے اگست دسمبر ۱۹۱۳ء کے شماروں میں ایڈیٹر کی حیثیت سے شائع ہوا تھا تو اُن کی کم علمی اور ڈھونگ پر مولانا محمد علی نے ۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے "کامریڈ" میں ایک اداریہ رقم کیا تھا [صفحات ۲۷۲ و ۲۷۴] اور ۱۵ نومبر ۱۹۱۳ء کے "کامریڈ" میں شیخ عبدالقادر نے ڈاکٹر وارثی کی علمی کم مائیگی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اُن کے تقرر سے خود کو بے تعلق ظاہر کیا تھا [ص ۴۳۲]۔

اس قسم کے معاونین کے کام کے نتیجے میں "نسخۂ حمیدیہ" میں ہر قسم کی غلطیاں در آئیں۔ کیونکہ ریاست کے باہر یہ خیال عام ہو رہا تھا کہ شاید یہ نسخہ کبھی منظرِ عام پر نہ آئے گا۔ اس لیے ریاستی حکام نے اُسے جلد از جلد چھپوا کر شائع کر دینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ نہ تو کاپیاں پڑھی گئیں۔ نہ اُن میں صحت کی گئی اور نہ دیوان کے آخر میں کوئی غلط نامہ شامل کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ بعد میں جن محققین نے اصل قلمی نسخے اور مطبوعہ "نسخۂ حمیدیہ" کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے جا بجا طرح طرح کی غلطیاں پائیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی دونوں کی متفقہ رائے ہے کہ "نسخۂ حمیدیہ" کو کلامِ غالب کا معتبر ماخذ نہیں سمجھا جا سکتا۔ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے: "افسوس ہے کہ قلمی دیوان سے انحراف کی جتنی مختلف قسمیں تصوّر میں آ سکتی ہیں وہ نسخہ میں موجود ہیں۔" مولانا عرشی نے "نسخۂ عرشی" کے پہلے ایڈیشن میں "نسخۂ حمیدیہ" کو مجموعۂ اغلاط کہا تھا اور یہ تنبیہ کی تھی کہ اُسے دوبارہ شائع کرنا ایک ادبی جرم ہوگا۔

اس انتباہ کے باوجود مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے "نسخۂ حمیدیہ" کا عکسی ایڈیشن شائع کیا ہے اور گزشتہ نصف صدی کی تحقیق سے چشم پوشی کر کے پرانی گمراہ کن غلطیوں کو دہرایا ہے۔

---

[1] "ڈاکٹر بجنوری کے چند خطوط"۔ "جامعہ" [دہلی] جنوری ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۹۔

سب سے زیادہ سنگین غلطی "نسخۂ حمیدیہ" کے صفحہ ۲۴۷ سلہ پر نظر آتی ہے۔ جہاں بلا کسی صراحت کے امیر مینائی کا مندرجہ ذیل شعر کلام غالب کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا ہے۔

دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا — دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

"نسخۂ حمیدیہ" میں غالب کا متداول کلام بھی شامل ہے اور اس میں کس کس قسم کی تحریفات عمل میں آئی ہیں اُن کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ قابلِ توجہ حصّہ بریکٹ میں تحریر کیا گیا ہے۔

۱۔ حمیدیہ: گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری [خوشامد سے]۔
متداول: گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی۔
۲۔ حمیدیہ: مشکلیں [اتنی پڑیں مجھ پر] کہ آساں ہو گئیں۔
متداول: مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں۔
۳۔ حمیدیہ: بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم غیر [کوئی] اُٹھائے کیوں۔
متداول: بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں۔
۴۔ حمیدیہ: چپک رہا ہے [لہو سے بدن پہ] پیراہن۔
متداول: چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن۔
۵۔ حمیدیہ: جس کو ہو [جان] و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں۔
متداول: جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں۔
۶۔ حمیدیہ: خاک میں کیا صورتیں ہوں گی [جو] پنہاں ہو گئیں۔
متداول: خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔
۷۔ حمیدیہ: پاتے نہیں جب راہ تو [رُک] جاتے ہیں نالے۔
متداول: پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے۔

ظاہر ہے کہ جب متداول اشعار کو اس بے توجہی کے ساتھ "نسخۂ حمیدیہ" میں نقل کیا گیا ہے تو قلمی دیوان کی تحریر کو پڑھ کر انھیں منتقل کرتے کیا کچھ کمالات نہ دکھائے گئے ہوں گے۔

یہاں مثال کے طور پر چند نمایاں غلطیوں کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔ بریکٹ میں صحیح شکل دی جا رہی ہے۔

طباعت کی غلطیاں ۔ ص ۲۔ مطاع [متاع]۔ ص ۵۔ بوے وگل [بوئے گل]۔ ص ۱۰۔ ڈھونڈے سے [ڈھونڈے ہے]۔ ص ۱۲۔ بے ماما نی [بے سامانی]۔ ص ۱۴۔ وحشت کدو [وحشت کدہ]۔ ص ۲۷۔ گل گیا [گل کیا]۔ ص ۲۹۔ رنبور [زنبور]۔ ص ۳۲۔ دابستہ [وارستہ]۔ ص ۳۵۔ بحرِ گریباں [بہرِ گریباں]۔ ص ۳۹۔ نستر [بستر]۔ ص ۴۵۔ شعلۂ حسن [شعلہ خس]۔ ص ۶۲۔ خانلاں [غافلاں]۔ ص ۹۲۔ نقطعہ [نقطہ]۔ وغیرہ۔

قرأت کی غلطیاں ۔ ص ۲۔ چوں صبح [جوں صبح]۔ ص ۵۔ بیم جنوں مائل [ستم جنوں مائل]۔ ص ۲۹۔ سرمو [سرمہ]۔ ص ۴۹۔ ریختی [ریختے]۔ ص ۵۳۔ اختر گنی [اختر گنے]۔ ص ۶۲۔ تیمار دار [بیمار دار]۔ ص ۹۶۔ اضارا [نصارا]۔ ص ۹۹۔ سبکباری [سبکساری]۔ ص ۱۲۳۔ موجِ درد [موجِ دود]۔ ص ۱۵۸۔ طور [تور]۔ وغیرہ۔

کئی اشعار میں ترمیم و اصلاح کی کیفیت "نسخۂ حمیدیہ" میں نہیں بتائی گئی ہے۔ مثلاً ان اشعار میں۔

سلہ یہاں اور آگے صفحات نمبر "نسخۂ حمیدیہ" کے پہلے ایڈیشن کے حصّہ نظم سے تعلق رکھتے ہیں۔

ص ۱۵۔ فلک کو دیکھ کے ۔۔۔ ص ۱۹۔ لبقدر ظرف ہے ۔۔۔ ص ۲۳۔ ہے اسد بیگانۂ افسردگی ۔۔۔ ص ۳۱۔ بہ دہن شرم ۔۔۔ ص ۸۱۔ تو اور آرائش ۔۔۔ ص ۹۲۔ وقتِ خیالِ جلوہ ۔۔۔ ص ۱۰۹۔ تھی وہ اک شخص ۔۔۔ ص ۱۲۳۔ یہ کس ناامیدکی ۔۔۔ ص ۱۹۷۔ ہم نشیں مت کہہ۔۔۔ ص ۱۹۸۔ افسردگی نہیں ۔۔۔ وغیرہ۔

"نسخۂ حمیدیہ" میں جہاں قلمی نسخے اور متداول دیوان کے متن کے اختلاف کو ظاہر کیا گیا ہے۔ وہاں قلمی متن کو اوپر اور مطبوعہ متن کو نیچے لکھا گیا ہے۔ لیکن بعض جگہ یہ ترتیب بلاکسی اشارے کے اُلٹ دی گئی ہے مثلاً ان اشعار میں۔

ص ۱۹۔ جاں درہوائے ۔۔۔ ص ۸۱۔ اسے ترا غمزہ ۔۔۔

کئی اشعار کی ابتدائی اور ترمیم شدہ شکلوں کو یکجا نہیں رکھا گیا۔ اس کی مثالیں صفحات ۱، ۸، ۱۲، ۱۵، وغیرہ پر ملتی ہیں۔

مولانا عرشی نے بتایا ہے کہ قلمی نسخے میں درج ذیل شعر شامل تھا جو "نسخۂ حمیدیہ" میں نہیں لیا گیا:

عالم طلسم شہرِ خموشاں ہے سربسر　　　یا میں غریب کشورِ گفت و شنود تھا۔

اسی طرح پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی نے یہ بھی نشان دہی کی ہے کہ قلمی نسخے کے حاشیے یا اس کے آخر میں لگے سادہ اوراق پر درج آٹھ اشعار "نسخۂ حمیدیہ" میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے　　　ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

وہ بات چاہتے ہو کہ جو بات چاہیئے　　　صاحب کے ہم نشیں کو کرامات چاہیئے

دے داد، اے فلک، دلِ حسرت پرست کی　　　ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے

زندگی میں بھی رہا ذوقِ فنا کا مارا　　　نشہ بخشا غضب اس ساغرِ خالی نے مجھے

بسکہ تھی فصلِ خزاں چمنستانِ سخن　　　رنگ شہرت نہ دیا تازہ خیالی نے مجھے

جلوۂ خور سے فنا ہوتی ہے شبنم غالب　　　کھو دیا سطوتِ اسمائے جلالی نے مجھے

دل تو ہوا اچھا نہیں ہے گر دماغ　　　کچھ تو اسبابِ تمنا چاہیئے

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں لیکن　　　کبھی زمانہ مرادِ دلِ خراب تو دے[1]

قلمی اور مطبوعہ دیوان میں مشترک اشعار کو ظاہر کرنے کے لیے "نسخۂ حمیدیہ" میں شعر کے محاذ میں "م" کا اشارہ تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن قلمی دیوان کے ایسے کئی اشعار کے ساتھ یہ اشارہ نہیں ملتا حالانکہ وہ مطبوعہ دیوان میں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح صفحہ ۸ پر مقطع:۔ نہ بندھے تشنگیٔ ذوق ۔۔۔ اس طرح درج کیا گیا ہے گویا وہ قلمی دیوان میں شامل تھا لیکن پروفیسر حمید احمد خاں اور مولانا عرشی اس پر متفق ہیں کہ وہ قلمی دیوان کا نہیں ہے اور صرف مطبوعہ دیوان میں ملتا ہے۔

اس طرح "نسخۂ حمیدیہ" سرکاری جلد بازی کا ایک کرشمہ ہے لیکن شاید کلامِ غالب کے ساتھ ایک "سرکاری" جفا شعاری کم نہ تھی کہ دورِ حاضر میں اس کو ایک اور سرکاری ستم کاری سے دوچار ہونا پڑا۔ مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی نے "نسخۂ حمیدیہ" کا جو عکسی ایڈیشن شائع کیا ہے اس میں پرانی غلطیوں کا ازالہ تو دُور رہا، نئی اُلجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اصل ایڈیشن میں حصّۂ نثر اور حصّۂ نظم کے جدا جدا صفحات نمبر تھے۔ نئے ایڈیشن میں نہ صرف اب اضافہ کیے گئے نئے صفحات کو سلسلۂ نمبرات میں شامل کر لیا ہے بلکہ اصل ایڈیشن کے حصّۂ نظم کے صفحات نمبر کو حصّۂ نثر سے جوڑ کر مسلسل کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو وہ سارے حوالے جو محققین نے ابھی تک اصل ایڈیشن کے لحاظ سے دے رکھے ہیں اُن کا موجودہ عکسی ایڈیشن میں تلاش کرنا دردِ سر ہو گیا ہے اور دوسری جانب یہ مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ جہاں جہاں "نسخۂ حمیدیہ" کے حاشیوں میں آگے یا پیچھے کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں حاشیے میں تو پرانا اندراج موجود ہے لیکن صفحات کی

---

[1] اس شعر کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین نے انکشاف کیا ہے کہ یہ غالب کا نہیں ہے۔ ["رموزِ غالب"۔ ص ۵۲]۔

پیشانی پر دوسرا سلسلہ نمبر ہے۔ مثلاً نئے ایڈیشن کے صفحہ ۳۳۲ کے حاشیے میں درج ہے۔ "ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱۱"۔ لیکن درحقیقت یہ حوالہ موجودہ ایڈیشن کے صفحہ ۲۱۱ سے نہیں بلکہ صفحہ ۳۵۰ سے متعلق ہے۔ اس قسم کی غلط فہمیاں کئی جگہ پیدا ہوتی ہیں۔

اس "عکسی" ایڈیشن میں چھوٹا سائز کر کے فوٹو لینے کے نتیجے میں بعض دوسری قباحتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ بعض مقامات پر جہاں جگہ کی کمی کی وجہ سے اشعار کی گنجلک کتابت ہوئی تھی وہاں کم سائز ہونے کی وجہ سے اب الفاظ ایک دوسرے سے مل گئے ہیں اور غالب کے ابتدائی کلام میں جہاں غریب الفاظ و تراکیب کی بہتات ہے، الفاظ بگڑ جانے کی وجہ سے قرات کی دشواری پریشان کن حد تک بڑھ جاتی ہے۔ حواشی کے پڑھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ بعض جگہ حروف بالکل اڑ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ صفحہ ۲۴۱ کا حاشیہ پورا غائب ہو گیا ہے۔

اصل ایڈیشن کی ایک خصوصیت اس میں شامل تین تصاویر تھیں جنھیں نئے ایڈیشن میں خاموشی کے ساتھ حذف کر دیا گیا ہے۔ ایک نہایت ضروری بلاک قلمی نسخے کے ایک صفحے کے عکس کا تھا۔ ایک اور بلاک غالب کی ایک نادر قلمی تصویر کا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی بھی ایک تصویر شامل تھی۔ ان تصاویر کو تلاش کر کے اس ایڈیشن میں شامل کرنا نہایت ضروری تھا۔ اگر انھیں براہِ راست "نسخۂ حمیدیہ" کے کسی نسخے سے حاصل کرنے میں دشواری تھی تو بعض ثانوی ذرائع سے یہ تصاویر حاصل ہو سکتی تھیں مثلاً قلمی نسخے کے صفحے کا عکس رسالہ "فروغ اردو" [لکھنؤ] کے غالب نمبر میں شائع کیا گیا تھا۔ غالب کی قلمی تصویر جناب مختار الدین آرزو کی کتاب "احوالِ غالب" میں شامل ہے اور بجنوری کی تصویر "نیرنگ خیال" [لاہور] کے اقبال نمبر میں موجود ہے۔

"نسخۂ حمیدیہ" کی تاریخی اہمیت ابھی بھی برقرار ہے لیکن اصل ایڈیشن کی غلطیوں اور فرو گذاشتوں کے پیشِ نظر اس کے ایک صحیح ایڈیشن کی بھی ضرورت باقی ہے۔

بقیہ صفحہ ۴۲ مکتوبات

"شاعر"، دو شمارے (۱۱ اور ۱۲) ساتھ ساتھ ملے۔ جی خوش ہو گیا۔ شاعر کے نئے انداز کو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے کہ آپ اردو کے چند اری صحافیوں میں شمار کیے جائیں گے۔ کم سے کم رسائل کے ساتھ بہتر سے بہتر شمارہ شائع کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ شمارہ نمبر ۱۱ میں جیلانی بانو، فرخندہ لودھی، آمنہ ابوالحسن، زاہدہ حنا اور بنت مسعود سبھی کی کہانیاں اچھی ہیں۔ شمارہ ۱۲ میں ۲۵ شاعروں کے سوانحی اشارے اور تخلیقات پڑھ کر مسرت ہوئی "امکانات" کے تحت ان شاعروں کے بارے میں ایسی باتیں کہہ دی گئی ہیں کہ جو "تحسین و آفریں" کا پورا پورا حق ادا کرتی ہیں۔

بازیافت کے تحت مولانا سیماب اکبرآبادی کے کت پیچے کا تعارف کرا کر آپ نے سیماب شناسی کی طرف مائل کیا ہے۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کا سارا سرمایہ آپ کے گھر میں موجود ہے جس میں سے بہت سا غیر مطبوعہ ہے۔ کاش آپ اس کی اشاعت کی فکر کریں۔ بعض چیزیں قسطوں میں شاعر میں شائع کی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ کسی وجہ سے فی الحال اس طرف توجہ نہ کر سکیں تو اس شعری سرمائے کا تھوڑا سا حصہ کسی اور اردو کے شیدائی کو دیدیجئے۔ وہ اس کی تدوین و ترتیب کا حق ادا کرے گا۔ آخر وہ سرمایہ کب تک یوں ہی رکھا رہے گا۔

نامی انصاری ——— ۹۷/۱۷ پریڈ، کانپور

"شاعر" کے دونوں شمارے مل گئے ہیں۔ نئے شاعروں کو جس فراخدلی سے آپ نے اردو دنیا سے متعارف کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے ورنہ ادبی رسائل کے ایڈیٹر تو نئے شاعروں کی تخلیقات چھاپنے سے بھی گریز کرتے ہیں چہ جائیکہ فوٹو، حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور نمونۂ کلام۔ یہ ایک اچھی روش ہے اور شاعر کی روایات میں ایک نیا اضافہ بھی۔

عشرت دھولپوری

تو سخی ہے تو مرے نام یہ دولت لکھ دے
چھین لے یا مرے کشکول میں وسعت لکھ دے

پیاسے ہونٹوں سے دعا مانگ رہا ہوں یارب
کوئی خنجر مری گردن پہ شہادت لکھ دے

میرے ہاتھوں سے مٹا میری مشقت کے نشاں
اور پھر میری جبیں پر مری قسمت لکھ دے

سر کے زخموں سے جبیں پر ہیں لکیریں خوں کی
جیسے اُنگلی سے فرشتہ کوئی آیت لکھ دے

پیار شرمندۂ تحریر نہ ہونے پائے
دل کے کاغذ پہ نگاہوں کی عبارت لکھ دے

بیٹھ اتنا بھی نہ گھر بس کہ تجھے بھی اے دوست
وقت آثارِ قدیمہ کی عمارت لکھ دے

● ایگزیکیٹیو آفیسر، میونسپل بورڈ، پالی (راجستھان)

مضطر مجاز

یہ غلط ہے کہ تھا گلاس میں سانپ
چھپ کے بیٹھا تھا میری پیاس میں سانپ
آستیں سے بھی اب نکلتے ہیں،
پہلے ہوتے تھے صرف گھاس میں سانپ
مختصر یہ کہ ہوشیار رہو —!
جانے کب آئے کس لباس میں سانپ
کھولے پھن کس مزے سے بیٹھا ہے!
پیکرِ یار کم لباس میں سانپ
شرِ خناس فی صدور الناس!
کلبلاتے ہوئے حواس میں سانپ
اور تو کیا یہاں وہاں کا ذکر!
آسمانوں کی بزمِ خاص میں سانپ

● ۲۱-۹-۱۶، رحمت نگر، حیدرآباد -۲۴

امین صدیقی

آنکھوں کا نور اور لبوں کی ہنسی گئی
بے چہرگی کا کرب لئے اک صدی گئی

پیاسا ہے فرد فرد اور اس سخت دھوپ میں
سوکھی زمین آنکھ کے آنسو بھی پی گئی

لوٹے جو رزم گاہ سے ٹوٹا بدن لئے
اک چیخ دشمنوں کی صفوں میں سنی گئی

تم نے جہاں لہو سے جلائے چراغ زیست
ہم کو بھی اس مقام سے آواز دی گئی

اس شہر بے صدا کا یہ دستور ہے امین
لب کھل سکے اگر تو زباں کھینچ لی گئی

● ۲۲- نیا پورہ، مالیگاؤں (ناسک)

جلیس نجیب آبادی

کیسے گلاب، بجھ گئے سرسوں کے پھول تک
ڈھونڈیں گے اور کل نہ ملیں گے ببول تک

بعد از غروب گھر سے نکلتے نہیں ہیں لوگ
اس فصل میں ہوئے ہیں متاثر اصول تک

دو پل کی فرصتیں بھی غنیمت ہیں دوستو
کل آپ دھو نہ پائیں گے چہروں کی دھول تک

اب تک مجھے یقیں ہے کوئی فاصلہ نہیں
محراب زلحق ولفظ سے باب قبول تک

اندیشۂ سحر سے لرزتے رہے ہیں دل
بھی پرتو فراق نشاطِ حصول تک

مجھ سے نہ کر گلاب سے جسموں کی گفتگو
میرے نصیب میں نہیں کاغذ کے پھول تک

● پٹھان پورہ، نجیب آباد، یوپی

ملاقات

مرزا حامد بیگ ● گورڈن کالج - راولپنڈی - (پاکستان)

یہ ایک صبح کا قصہ ہے جب وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

رات نے جاتے جاتے انتہائی دھیرج کے ساتھ اس پر سے اپنی تاریک چادر سمیٹنا چاہی تو اس نے جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس کی بوجھل پلکوں سے نیند کا خمار اٹھائے نہ اٹھتا تھا پھر بھی اس نے لیٹے لیٹے بڑے جتن سے بستر پر کروٹ بدلی۔ اس کی پائنتی کی طرف کھلنے والی اکلوتی کھڑکی سے صبح کے ماند پڑتے ہوئے تارے نے جاتے جاتے اپنی بوجھل پلکیں جھپکیں تو لحظہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں بھی نیند کا غبار چھا گیا اور وہ اونگھ گیا۔ لیکن پھر یکایک اُسے یوں لگا جیسے کوئی ہے۔

اس سرد اور ویران کمرے میں کسی کے ہونے کا احساس نیا نیا تھا، وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف نگاہ کی۔

وہاں کوئی بھی تو نہیں تھا۔

اب وہ پوری طرح جاگ گیا تھا۔ پھر بھی وہ تقریباً لڑکھڑاتا ہوا کھڑکی تک چل کر گیا، اور لکڑی کے چوکٹے کو مضبوط ہاتھوں سے تھام کر باہر کی جانب جھک گیا۔ باہر کھلے میں، اس نے ہر طرف نگاہ کی جہاں ملگجے اندھیرے اور ہلکی ہلکی خنکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا وہ دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ وہ اپنے سرد اور ویران کمرے میں ایک عرصے سے تنہا تھا اور اپنے کام میں مگن۔

باہر کھلے میں قطار اندر قطار کھڑے درختوں میں ہوا رکی ہوئی تھی اور دور دور تک کسی ذی نفس کا نام ونشان تک نہیں تھا لیکن ایسے میں اسے یقین سا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے اُس کے آس پاس کوئی تھا۔

یہ کون تھا، جو اس کے ارد گرد منڈلا رہا تھا؟

اُس نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن سوائے کسی ذی نفس کی موجودگی کے احساس کے وہ کچھ بھی جان نہ پایا۔

دن روشن ہوتا گیا اور ایک ایک کر کے اس کے سامنے درختوں کے دو رویہ قطاروں میں سے گذرتی ہوئی پھول والوں کی ہنستی بولتی ٹکڑیاں آبادی کی طرف پلٹ گئیں۔ وہ تھک ہار کر کھڑکی سے ہٹ آیا اور بغیر ناشتہ کئے اپنے کام میں جُت گیا۔

وہ دن بھی غیر متوقع طور پر بہت مصروف گذرا اور وہ رات گئے تک الجھا رہا۔ جب تھک کر سونے کے لئے لیٹا تو صبح کے واقعہ کو وہ پوری طرح بھول چکا تھا۔

لیکن اگلے روز پھر وہی ہوا۔ پو پھٹے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کی پلکیں بوجھل تھیں، پر اُسی لمحے اُسے یوں لگا جیسے کوئی ہے۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف نگاہ کی اور کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا پر کوئی بھی تو نہیں تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑکی تک آیا اور پھول والے لڑکے لڑکیوں کی واپسی تک وہیں ٹھہرا رہا۔ تاوقتیکہ پھولوں کے گلدستے تھامے اور آپس میں چہلیں کرتے وہ سب گذر گئے کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اس سرد اور ویران کمرے کی طرف نہیں دیکھا۔ سب اپنی اپنی دُھن میں تھے، گذر گئے۔

آج اسے یہ احساس کل سے کہیں زیادہ تھا کہ اس کے آس پاس کوئی ہے، کوئی ذی نفس، جو اس کی طرف بڑھنے کا جتن کر رہا ہے۔

اس نے اپنے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا، ہر چیز الٹ پلٹ ڈالی۔ باہر کھلنے والا دروازہ بند تھا اور چٹخنی لگی تھی۔ کھڑکی البتہ کھلی تھی، لیکن وہ باہر کی سمت سطح زمین سے خاص بلندی پر تھی پھر کسی کو کیا پڑی تھی کہ کھڑکی کے راستے اس کے کمرے تک آتا۔ اس نے اس خیال کو اپنا واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا اور کام میں لگ گیا۔

اس کا یہ دن بھی بہت مصروف گذرا۔ رات گئے جب وہ سونے کے لئے لیٹا تو صبح کا واقعہ اسے اچھی طرح یاد تھا لیکن گذشتہ کئی روز کی بے خوابی کے سبب وہ جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

اگلے روز پھر وہی کچھ ہوا۔

وہ جب چونک کر جاگا تو سب سے پہلے اسی کا دھیان کھڑکی کی طرف گیا۔ آج وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح تھا۔ آج اسے یقین سا تھا کہ واقعی کوئی ہے، جو رہ رہ کر اس کی طرف بڑھنے کا جتن کر رہا ہے لیکن جب وہ جاگ اٹھتا ہے تو وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے دور ہٹ جاتا ہے اور اپنا کوئی بھی نشان چھوڑ کر نہیں جاتا۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ جہاں گہرائی میں دیوار کے ساتھ رات کی رانی کا مہکتا ہوا جھاڑ خاموش کھڑا تھا۔ وہ سخت حیران ہوا کہ اتنے عرصے تک وہ اتنے خوشبودار پودے کی وہاں موجودگی سے بے خبر رہا۔ اس کی مصروفیت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کام میں جُتا رہتا اور رات گئے تھک ہار کر سو رہتا۔

وہ کھڑکی سے باہر کے منظر کو تکتے تکتے جب اکتا گیا تو پیچھے ہٹ آیا۔ عین اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔

اب اُسے یقین سا ہو چلا تھا کہ جیسے کوئی آتا ہے اور اس کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے پلٹ جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ دروازے پر دستک بھی دیتا ہو اور وہ اپنے کام میں انہماک کے سبب نہ سُن سکتا ہو۔ اس نے سوچا۔

سو، اُس نے فیصلہ کیا کہ صرف ایک روز وہ اپنے معمول سے ہٹ کر دن گذارے گا اور باہر کا دھیان رکھے گا اور یہ کہ گذشتہ کئی راتوں سے وہ مسلسل جاگ رہا تھا اور اس روز اس نے وقت پر سو جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

کچھ یہی سبب ہے کہ آج ایک مدت بعد اس نے ٹھکانے کا ناشتہ کیا۔ دیر تک چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتا رہا۔

اس کے سامنے میز پر رکھے طشت میں بھیگے ہوئے رنگ ابھی نہیں سوکھے تھے۔ کمرے میں آئل پینٹ کی بو مدھم پڑ چکی تھی اور چھوٹی بڑی تپائیوں پر آدھ خالی اور بھرے ہوئے رنگوں کے ڈبے بے ترتیبی کے ساتھ پڑے تھے۔ آج اس نے برش کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور کینوس کو اسی طرح ڈھکا رہنے دیا۔

آج اس نے اپنے معمول سے ہٹ کر دن گذارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے آج اُسے کام کی کوئی فکر نہیں تھی۔ کیوں نہ کمرے میں پڑی اشیاء کی ترتیب بدل دی جائے۔ اس نے سوچا۔

وہ اس یکسانیت کے احساس ہی کو ختم کر دینا چاہتا تھا پر کیا کرتا، ایک دن میں یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی تک چلا آیا۔ باہر کا منظر اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہی درختوں کی دور تک نکل گئی دو رویہ قطار اور گہرا سکوت۔

دوپہر تک اس سے ملنے کوئی نہ آیا اور وہ یونہی بیکار اپنے بیتے دنوں کی یادوں میں کھویا رہا۔

کبھی اس سرد اور ویران کمرے میں وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک شفقت بھرے وجود کا ہر دم ساتھ تھا ـــــ وہ بچپن کے دن جب سامنے کے درختوں میں وہ دن بھر اپنے آپ کو کھویا رہتا اور جب تھک ہار کر سونے لگتا تو ماں اپنے سر کی اوڑھنی سے اس کا چہرہ ڈھانپ دیتی۔ ایسے میں اُس شفقت بھرے وجود کی خوشبو اور لوریوں کے ہلارے اس کے مضمحل وجود میں گرتے رہتے۔ وہ اونگھتا رہتا اور وہ نیک بخت ہواؤں سے باتیں کرتی رہتی ـــــ کبھی کہتی، اے ہواؤ جاؤ اور اُسے کہنا کہ کبھی آئے اور صورت دکھا جائے۔ لیکن ہوائیں تھیں کہ دا فریاد سے بے پرواہ بس گذرتی رہتیں۔

جانے والا کیسے آتا ـــــ لام لگی ہوئی تھی اور دھرتی کے چاروں اطراف میں گھمسان کا رَن پڑا تھا۔

وہ نیند کی وادیوں میں گرتا سنبھلتا اُس جا کر نہ آنے والے کو ڈھونڈتا پھرتا، لڑائی کے میدانوں میں نکل جاتا اور دھول مٹی سے اَٹے ہوئے چہروں میں اُسے کھوجنے کا جتن کرتا۔ جاگ اٹھنے پر جب وہ اپنے الجھے ہوئے خوابوں کی ڈور سلجھاتا تو اس نیک بخت کے چہرے پر رونق آجاتی اور وہ اسے اپنی کمر پر اٹھائے اٹھائے لوگوں سے خوابوں کی تعبیریں پوچھتی پھرتی ـــــ وہ ہواؤں سے باتیں کرتی تھی اور ہنستے ہنستے رَو رَو پڑتی تھی۔

یہ ہوائیں بھی کیا ہیں؟ اُس نے خیال کیا۔

سارے زمانے کی تنہائیاں، محبتیں اور نفرتیں اپنے اندر سمیٹے ہر طرف رواں ہیں۔ وہ اپنے خیال کی رَو میں بہتا چلا گیا تھا۔

یکلخت اس نے اپنا سر جھٹکا اور کھڑکی سے پیچھے ہٹ آیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ ہر شے اور ہر جذبے کا آخر ایک انت ہے اور یہ کہ جانے والا لڑائی کے میدانوں تک واپس پلٹنے کے لئے نہیں گیا تھا۔

اب سہ پہر ہو چلی تھی اور اُس سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سارا دن یونہی بیکار بیٹھا رہا تھا اور اس کی طبیعت خاصی بوجھل ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کچھ دیر کے لئے باہر ہو آئے۔

اس نے سب کچھ ویسے کا ویسا رہنے دیا اور کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل آیا۔ وہ کسی بھی سمت نکل جانا چاہتا تھا، سو اپنے اطراف و جوانب سے بے پروا سر جھکائے چلتا رہا۔ وہ جا رہا تھا کہ یکایک سامنے سے آتے ہوئے ایک سفید بالوں والے رعشہ زدہ وجود نے اسے روک لیا۔ خاکی وردی میں اس کی داڑھی بے طرح بڑھی ہوئی تھی اور اس کی پشت پر سامان بندھا تھا۔ بوڑھے نے کانپتے ہوئی آواز میں پوچھا:

"کیوں برخوردار ـــــ وہاں ـــــ اُس درختوں کے جھنڈ میں ـــــ ایک لشکری رہتا تھا ـــــ اس کی ایک بیوی اور بیٹا بھی تھا ـــــ کیا وہ لوگ اب بھی وہیں "

"ہاں وہ لشکری ـــــ جو لام پر گیا ہوا تھا، اس کو پوچھ رہے ہیں آپ؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں ہاں ـــــ بیٹے تم بھی۔ یہیں کہیں رہتے ہو؟ تمہارے باپ کا نام ـــــ" "جی اپنا نام تو بتا سکتا ہوں آپ کو ـــــ باپ کا نام کیا کریں گے پوچھ کر ـــــ یہ چابیاں ہیں، لے جائیے ـــــ وہاں سے پوچھ لیجیئے گا۔"

اس نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی چابیاں اس نووارد کو تھما دیں اور اُسی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

آج اس نے اپنے معمول سے ہٹ کر دن گذارنے کا فیصلہ کیا تھا، اس لئے وہ کسی بھی سمت نکل جانا چاہتا تھا اور ہوا سنکی ہوئی تھی۔

نووارد کچھ دیر تک اس سرد اور ویران کمرے کی دہلیز پر ٹھہرا رہا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں دُور دُور تک کوئی نہ تھا درختوں کی دو رویہ قطاریں خاموش تھیں اور اُن میں ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تالا کھولا اور دروازے کو دھکیل کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

اب کمرے میں آئل پینٹ کی بُو برائے نام رہ گئی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں اس نے دیکھا کہ ہر طرف کٹی پھٹی تصویروں کے انبار لگے تھے چھوٹی بڑی تپائیوں پر آدھ خالی اور بھرے ہوئے رنگوں کے ڈبے بے ترتیبی کے ساتھ دھرے تھے۔ میز پر دُھلے ہوئے بُرش۔ رنگوں بھرے طشت کے ساتھ یکجا پڑے تھے اور ڈھکے ہوئے کینوس پر ٹنگی ہوئی تصویر ایک لشکری کی تھی جو لام کے میدانوں سے منزلیں مارتا ہوا اس سرد اور ویران کمرے تک پہنچا تھا۔ ◆◆

ڈاکو

ساجد رشید ● ۲۰/۸۰۸ باپوراؤ جگتاپ مارگ ۔ بمبئی ۔ ۱۱

سپرنٹنڈنٹ آف پولس کی جانب سے تھانیدار کو کبھی کبھار کام کرنے والے وائرلیس پر اُس وقت اطلاع ملی جب وہ سج کر بازار کا گشت لگانے کے لئے نکل رہا تھا۔ گاؤں کے لوگوں کو یہ خبر گاؤں کے چوکیدار نے چیخ چیخ کر دی تھی۔ گاؤں کے لوگ ایسے سہم گئے تھے جیسے ان کے سروں پر آسمان گرنے والا ہو۔
ڈاکوؤں کے سردار کو بھیڑوں میں پولس کے ایک سپاہی نے خبر دی تھی اور اپنا انعام لے کر چلا آیا تھا۔
تھانیدار نے ایس پی کے احکامات پر غور کرنے کے بعد منشی کو ہدایت کی کہ ایس پی صاحب کو رپورٹ بھیج دی جائے کہ وہ نیا گاؤں میں کیمپ ڈالتے جا رہے ہیں
ایس پی کچھ زیادہ ہی پریشان تھا کیونکہ اسے یہ "سوچنا" محکمہ داخلہ سے ملی تھی۔ ایس پی کی بیوی نے اپنے شوہر کو اُس وقت بھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا جب ودھان سبھا میں اُس پر چار سیاسی قیدیوں کو مڈبھیڑ دکھا کر گولی مار دینے کے الزامات لگائے جا رہے تھے... ایس پی نے ناشتہ بڑی بے دلی سے کیا تھا
ایس پی سوچ رہا تھا کہ یہ خبر محکمہ داخلہ کو کیسے مل گئی؟ ضرور انٹلی جنس نے دی ہوگی! اسے اس بات کی زیادہ فکر تھی کی ضابطے کی کارروائی کے لئے اب سے ذرا ذرا سی بات کی رپورٹ محکمہ داخلہ کو بھیجتے رہنا ہوگی۔ وہ بس اسی بات سے پریشان تھا اور ایسی نہ جانے کتنی "سوچناؤں" کو وہ شام کی دارو کے ساتھ پی جاتا تھا۔
گاؤں کے لوگ بہت خوفزدہ تھے جیٹھ بیساکھ کا موسم آتے ہی اُن کا خوف لو برساتے سورج کی طرح لگتا تھا۔ یہی موسم تو بھاری ہوتا تھا کسانوں کے جب وہ گرمی اور گھٹن سے تنگ آ کر گھر سے باہر چارپائی ڈال کر سوتے اور صبح جب اٹھتے تو آس پاس کے گاؤں سے بڑی بڑی خبریں سننے کو ملتیں۔ اب چوکیدار نے جو ڈگی بجائی تو سب کے ہوش اڑ گئے۔

"ڈاکو آئے رہے ہیں بابو!"
"ڈاکو آ رہے ہیں ہوشیار!!"

تھانیدار نے اپنے وردی پوش سپاہیوں کو جیپ پر سوار ہونے سے قبل قطار میں کھڑا کر کے ان کا معائنہ کیا اور سب کو سختی سے اپنے پھولے ہوئے پیٹوں کو اندر سمیٹ کر سینہ نکال کر اٹینشن کھڑے رہنے کی تاکید کی لیکن تھانیدار خود ہی اپنی اس تاکید پر عمل کرنے سے قدرتی طور پر قاصر تھا! سب نے ایڑیاں بجا کر اپنی تھری ناٹ تھری کی ان رائفلوں کو کندھوں پر رکھ کر سیلوٹ کیا جو انگریزوں سے انہیں تحفے میں ملی تھیں اور انگریزوں نے ان رائفلوں کو اس لئے رد نہیں کیا تھا کہ ابنا اوادی جب انہی رائفلوں سے مر رہے تھے تو جدید ہتھیار پر وہ پیسہ کیوں خرچ کرتے! وہ سب کے سب جیپ پر لد کر بازار سے نکلے تو غریب پھٹے حال لوگ ذلتوں کی مار سے زیادہ جیپ کے پہیوں کی دھول سے سہم گئے۔

"ڈاکو آئے رہے ہیں بابو"
"ڈاکو آئے رہے ہیں ہوشیار"

جیپ جب گاؤں پہنچی تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا گھسے۔ ان کے دل کھڑکیوں اور کواڑوں کی جھریوں میں دھڑک رہے تھے اور چوکیدار شور مچا رہا تھا

"ڈاکو آئے رہے ہیں بابو"
"ڈاکو آئے رہے ہیں ہوشیار"

بیساکھ کا سورج ٹھیک سر پر کھڑا تھا۔ تھانیدار نے آس پاس نظر دوڑائی۔ دھوپ سے جھلسے سفید مٹی سے پُتے کچے گھر آنکھوں کو چوندھیا رہے تھے۔ گلی سے کتے تک بھاگ کھڑے ہوئے تھے بس مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہی سنائی دے رہی تھی۔ اس بھنبھناہٹ سے دھیرے دھیرے ایک آواز اُبھری۔

"ڈاکو آ رہے ہیں بابو"

"ڈاکو آ رہے ہیں ہوشیار"

آواز قریب آنے لگی اور پھر بوڑھا چوکیدار جس کی جلد سورج نے نہیں زمانے نے جھلسائی تھی کسی کھڑکھڑاتے ڈھانچے کی طرح ایک سنسان گلی سے نمودار ہوا۔ ہتھیلی سے آنکھوں کو چھجہ دے کر اس نے سامنے کھڑے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کی آیا وہ ڈاکو ہیں یا پولس والے؟ عمر کے ساتھ جہاں اس کا تجربہ بڑھا تھا وہیں آنکھ کی بینائی بھی کمزور ہو ئی تھی اس لئے وہ ایک فاصلے سے ڈاکو اور پولس میں تمیز نہیں کر پاتا تھا! وہ جب کچھ قریب ہوا تو جن چہروں پر اسے ڈاکوؤں کا گمان ہوا تھا ان کے جسم پر پولس کے چمکتے بلّوں کو دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور بڑبڑایا۔

"بھگوان تیری کرپا ہے۔ ڈاکو نہیں پولس والے ہیں..."

اب اس نے اپنی پکار بدل دی اور زور لگا کر گوہار لگائی۔

"تھانیدار آئے ہیں بابو تھانیدار..."

دھیرے دھیرے کھڑکیاں اور کواڑ کھلنے لگے۔ مکھیوں کی مکروہ بھنبھناہٹ میں پورے گاؤں کا شور اُبھرا۔ لوگ اپنے دلوں میں تحفظ کی جوت جگا کر گھروں سے نکلے۔ کہیں سے بھیلی آئی، کہیں سے ٹھنڈا پانی۔ کہیں سے مٹھا آیا تو کہیں سے پان۔ کہیں سے سگریٹ آئی کہیں سے چارپائی کہیں سے دری آئی تو کہیں سے... وہ سب پھیل کر چارپائی پر پسر گئے۔

"چوکیدار! تھانیدار نے رعب دار آواز میں پکارا

" چوکیدار نے وہی ہاتھ جوڑ دیے جو اس کا باپ اسے کاٹ کر ورثے میں دے گیا تھا۔ جسے وہ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے جوڑا کرتا تھا۔

"کیا ہم ایسے ہی بیٹھے رہیں گے، کوئی ناؤن ہمارا گوڑ دھونے نہیں آوے گی؟" تھانیدار کی آواز میں حکم نہیں دھمکی تھی۔

" ایسے کیسے ہو سکتا ہے حجور ابھی بلواتے ہیں۔ ناؤن گوڑ تو کا آپ جو کہیں گے وہ دھوئے گی...!"

"ڈاکو آ رہے ہیں بابو، ڈاکو آ رہے ہیں ہوشش..."

اپنی اس ہانک پر چوکیدار کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے زبان کو دانتوں سے کاٹ کر خود کو سزا دی اور ہانک لگائی "تھانیدار آئے ہیں بابو، تھانیدار!" سنتے ناؤ کی نئی نویلی بہو لوٹے میں پانی لے کر لجاتی ہوئی آئی۔ تھانیدار کے پیروں کے پاس بیٹھ کر اس کے جوتے موزے اتارے اور اس کے پیروں کو خوب مل مل کر دھونے لگی۔ تھانیدار کی ہوسناک آنکھیں کانچ کی گولیوں کی طرح سنتے کی بہو کے گریبان سے پھسل کر سینے کی سنولائی ہوئی گولائیوں میں گر پڑیں۔ اور اس وقت تک گری رہیں جب تک کی سنتے کی بہو آنچل کو سینے پر ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"ڈاکو گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے والے ہیں" تھانیدار کی آنکھیں جب اسے واپس ملیں تب اس نے پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹے کھنکھر جسموں کو اپنے سامنے عاجزی سے کھڑا دیکھا اور کڑک کر کہا۔ "ہم لوگ تم لوگوں کی سرکھشا کے لئے یہاں پر دو چار روز کیمپ کریں گے۔ دیکھتے ہیں ڈاکو سالے آنے کی کیسے ہمت کرتے ہیں؟"

ڈکوں کے خوف سے سہمے لوگوں نے احسان مند نظروں سے اپنے محافظوں کو دیکھا جو اپنے بھاری جسموں کو لے کر دس قدم بھی بمشکل دوڑ سکتے تھے۔

"بہت گرمی ہے۔ کہیں سے مٹھا منگواؤ۔" تھانیدار نے لب انگلی سے ٹپکاتے ہوئے کہا۔

"ابھی لائے حجور" چوکیدار اپنی جگہ سے لاٹھی تھام کر اُٹھا۔

"سنو کسی اہیر کے یہاں سے مت لانا کسی بھابھی کے گھر کا ہونا چاہی" تھانیدار نے تنبیہ کی۔

بھابھی جو خود دھارمک ادھیکاروں کے نام پر مانگ کر کھاتا ہو وہ بھلا کسے کیا کھلائے گا۔ چوکیدار نے چار پانچ اہیروں کے یہاں سے پیتل کی ایک بالٹی میں مٹھا بٹورا.. مٹھا پیتے ہوئے اور رات میں بھجنگ پاسی کی جوان بیٹی کو کھیت میں گھماتے ہوئے تھانیدار نے اس کی ذات نہیں پوچھی تھی...!

بھجنگ پاسی نے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اپنے آنگن میں پھنسے کالے آکاش کو نمناک آنکھوں سے دیکھا اور سب کچھ اس پر ڈال دیا جس نے مسیح کو تنہا چھوڑ دیا تھا!

ناشتے کے لئے چوکیدار نے خوب چوکھا انتظام کروا دیا تھا۔ بوڑھی کرمن انڈوں کو بیچ کر اپنا گذر بسر کر رہی تھی۔ چوکیدار نے اس سے آٹھ انڈے جھٹک لئے تھے۔ وہ اپنی عادت کے مطابق گالی بھی نہ دے سکی تھی۔ دوپہر کے کھانے کی فرمائش بکرے کے گوشت کی تھی، سو جمن نے سنیچر بازار میں کاٹنے کے لئے جو بکرا چار سو میں خریدا تھا کاٹ ڈالا۔ تھانیدار نے اُسے بتا دیا تھا کہ بنا سرکاری اجازت نامے کے جانور کاٹنا جرم ہے۔ جمن نے ہر ہفتے جرم سے بچنے کے لئے آج یہ جرم پولس والوں کے لئے کر دیا تھا۔

رات کے کھانے میں مرغ بھی اسی طرح کٹے تھے۔ رات کے کھانے میں مرغ ہوں اور مہوہ کی شراب نہ ہو، شراب بھی آگئی۔ خوب شاہانہ دعوت رہی۔

اتنے عمدہ کھانے اور پہلی دھار کی شراب کے بعد بیساکھ کی گرم رات میں پیاس سے آنکھ تو کھلنی ہی تھی، سو کھلی۔ پانی کے لئے جو گھر سامنے پڑا تھا تھانیدار اسی میں گھس گیا۔ بیوہ عورت کا آسمان پر کوئی ہوتا ہے نہ زمین پر۔ آسمان پر کوئی ہوتا تو وہ عین جوانی میں بیوہ ہی کیوں ہوتی؟ زمین پر تو وہ سب کی بھابھی رہتی ہے۔ ماں یا بہن کہنے والے شاید وہ ہوتے ہیں جن کے مخصوص اعضاء جواب دے جاتے ہیں! نقو کرمی کی بیوہ بھی ایسے ہی جی رہی تھی اپنے دو معصوم بچوں کے ساتھ۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ دروازہ کھولنے کو اٹھی۔ آسمان پر نظر ڈالی۔ رات کا تیسرا پہر چڑھ رہا تھا کوئی اور موقع ہوتا تو خوف سے دروازہ نہ کھولتی لیکن گاؤں میں پولس کا حفاظتی دستہ ہو تو ڈر کیسا!

دروازہ کھلا۔ تھانیدار نے نقو کی جوان بیوہ کو دیکھا تو پیاس کچھ اور چمک اٹھی... آنگن میں برسوں سے کھڑے نیم کے پیڑ نے اس حادثے کا گواہ بننے کے ڈر سے اپنی پتیوں کو سمیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پیاس بجھا کر تھانیدار جب لوٹا تو سسکیوں کو سننے کے لئے اس کے پاس کان کہاں تھے۔

چوتھے روز وہ دل جن میں تحفظ کی جوت جگی تھی اب پھر کواڑوں اور کھڑکیوں کی جھریوں میں دھڑکنے لگے تھے۔ بیساکھ کا سورج ٹھیک سر پر کھڑا تھا۔ تھانیدار نے آس پاس نظر یں دوڑائیں۔ دھوپ سے جھلسے سفید مٹی سے پُتے کچے گھر آنکھوں کو چوندھیا رہے تھے۔ گلی کے کتے تک بھاگ کھڑے ہوئے تھے بس مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہی سنائی دے رہی تھی۔

تھانیدار نے چاروں طرف کسی فاتح کی طرح دیکھا اور کہا۔

"ہمارے یہاں رہتے ڈاکو آنے کی کیا ہمت کریں گے۔"

"ہاں حضور" چوکیدار نے حسب عادت ہاتھ جوڑ دیے۔

"دیکھو کیسا امن چین ہے سب طرف، لوگ دن میں بھی تان کے سو رہے ہیں" تھانیدار سر پر کیپ جماتے ہوئے بولا اور جیپ میں جا کر بیٹھ گیا۔ سپاہیوں نے اس کی تقلید کی لیکن انہیں پیچھے آلو اور جھیلی سے بھرے بوروں پر بیٹھنا پڑا جو انہوں نے گاؤں والوں سے نذرانے میں منگوائے تھے۔

"ایس پی صاحب کو ابھی لیٹر بھجواتے ہیں کہ گاؤں میں پولس کے مستعد بند و بست کی وجہ سے ڈاکو حملے کی ہمت نہ کر سکے۔" اس نے مسکرا کر ونڈ اسکرین سے ویران گاؤں کو دیکھتے ہوئے اکڑ کر کہا۔ "چلو بڑھاؤ جیپ!"

جیپ اپنے پیچھے گرم دھول اڑاتی ویران گلی میں سے گذر کر پکی سڑک پر مڑ گئی اور بوڑھے چوکیدار کا بوسیدہ جسم گلی کے بیچوں بیچ اپنے باپ کا کٹا ہوا ہاتھ جوڑے بت بنا کھڑا تھا۔ ◆◆

جعفر عسکری

دلوں کے گلشن خزاں زدہ ہیں نہیں کوئی لالہ زار روشن
بجھا کے طاقِ نظر پہ رکھو چراغِ فصلِ بہار روشن

وہی ہے کوچہ، وہی دریچہ، وہی مکان و مکیں ہیں پھر بھی
نظر نہ آیا وہ ماہِ تاباں کہ جس سے تھا یہ دیار روشن

غبارِ شب ہے کہ بڑھتا جاتا ہے رہگزاروں پہ رفتہ رفتہ،
اگرچہ راہوں میں قمقمے ہیں قطار اندر قطار روشن

درخشاں منزل کی جستجو میں اُٹھا سفر کی اذیتیں بھی
کہ جانفشانی کے بعد ہوتا ہے جادۂ اعتبار روشن

گئے ہیں تاراج بستیوں میں ہنوز آتش زنوں کے لشکر
کہ پھر فضاؤں میں ہم نے دیکھا دھوئیں کا اٹھتا غبار روشن

پناہ گاہوں میں چھپ کے بیٹھیں کے لوگ کب تک کہ چار جانب
قدم قدم پہ ہلاکتوں کی ہے آتش کار زار روشن

خیال کے بے نشاں بیاباں میں گشت کرنا عبث ہے جعفرؔ
سراب ہستی میں ہم نے دیکھا رواں دواں آبشار روشن

ممتاز محل کمپاؤنڈ، گولہ گنج، لکھنؤ

سرور حسن سرورؔ

یا کہ آوازوں کے صحرا میں اتر جانے کا خوف
یا خموشی کی حدوں کو پار کر جانے کا خوف

یا کہ وہ بچتا رہا تا عمر ہر احساس سے
یا کسی کے واسطے جاں سے گذر جانے کا خوف

یا کہ صندوقوں میں بھر رکھنا زمانے بھر کے غم
یا سنہرے فرش پہ موتی بکھر جانے کا خوف

یا کوئی لمحہ اسے ساحل نے فرصت ہی نہ دی
یا اسے کشتی کی نظروں سے اتر جانے کا خوف

یا کہ سڑکوں پر نکل آنا سلاسل توڑ کر،
یا سلیقے سے بندھی زلفیں بکھر جانے کا خوف

یا اسے بجھتے چراغوں کا دھواں پینے کا شوق
یا کہ خاموشی سے خالی ہاتھ گھر جانے کا خوف

یا کسی صورت نہیں ممکن رفیقوں سے فرار
یا اسے غیروں کی خاطر گھٹ کے مر جانے کا خوف

جی۔ ۸ ، سیکٹر ۲۳، راج نگر، غازی آباد (یوپی)

ارشد نظر

خود کو ہوا کے زد سے بچاتے کہاں کہاں
ظلمت میں ہم چراغ جلاتے کہاں کہاں

ہر لمحہ آئینہ ہے ہماری حیات کا
بے چہرگی کا داغ چھپاتے کہاں کہاں

بے قدر زندگی کی طرف مڑ رہا ہے شہر
اس کے خلاف شور مچاتے کہاں کہاں

سب موسموں نے چھین لی باغوں کی رونقیں
زخموں کی تتلیوں کو اڑاتے کہاں کہاں

لائیں کہاں سے زیست میں لمحوں کی بہلتیں
ہیں الجھنیں ہزار سناتے کہاں کہاں،

شبنم، ستارے، رنگ اور خوشبو کے سلسلے
خالی تھے ہاتھ مانگنے جاتے کہاں کہاں

سر پہ ہے آفتاب کا جلتا ہوا سفر
سائے کی چادروں کو بچھاتے کہاں کہاں

لوٹا نہیں وہ لمحہ کہ صدیاں گذر گئیں
اک بحر تھا سراغ لگاتے کہاں کہاں

سیکٹر نمبر ۱۶۳، پلاٹ نمبر ۳۲، عباس نگر، مالیگاؤں،

کامران نجمی

سفر ہوا ہے کہاں ختم چشمِ حیراں کا
بڑا طویل ابھی سلسلہ ہے امکاں کا

خیال تھا کہ ہوا رُخ بدل چکی، لیکن
سفینۂ غمِ دل منتظر تھا طوفاں کا

بس اپنی پیاس کی شدت سے باخبر تھے سب
کسی نے حال نہ پوچھا سحابِ گریاں کا

بجھا کے شمعیں اندھیروں کی ہو گئی دمساز
ہوا کے ساتھ تعاون تھا دستِ لرزاں کا

نواحِ جاں میں بکھرنے کا حوصلہ دے کر
مجھے حریف کیا اُس نے تیغِ عُریاں کا

۴۔ اکبر مارکیٹ، دودھپور
علی گڑھ ۔ (یوپی)

نیلا پتھر

صدیقہ عالم • کمرشیل ٹیکس آفیسر، رادھا بازار چارج، بلیا گھاٹا روڈ، کلکتہ ۱۵

میگی دریا کے ریتیلے کنارے اپنی ایڑیوں اور کولھوں کے بل بیٹھی پتھر کے ٹکڑے جمع کر رہی تھی۔

میگی کے پاس کرنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ متواتر فیل کرتے رہنے کے سبب وہ اسکول سے نکال دی گئی تھی۔ مگر وہ امتحان میں کیوں ناکامیاب ہوتی تھی، وہ خود بھی نہیں جانتی۔

"میگی اب بچی نہیں رہی۔" اس نے ایک دن ممی کو کہتے سنا تھا۔ اس وقت ڈیڈی گلاس کے اندر رم کی سرخی کو محویت سے تاک رہے تھے۔ یوں میگی کے جوان ہونے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے، میگی کے معاملے میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے نہیں کہ میگی DROP - OUT ہے، یا میگی کی ذہنی عمر اس کی جسمانی عمر کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہیں، بلکہ اس لئے کہ میگی ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔

"میگی کو جوان ہو کر کیا لینا ہے؟" ڈیڈی نے رم کا گھونٹ حلق سے نیچے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ "میگی جیسی بھی ہے، اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تم صرف پھاٹک پر نظر رکھنا کبھی کبھار میگی اسے کھول کر باہر نکل جاتی ہے۔"

رات کبھی اگر میگی کی آنکھ کھل جاتی، تو وہ ڈیڈی کو ممی کے بستر پر پا کر حیران رہ جاتی۔

میگی نے پتھر کا ایک نیلا، بیضوی ٹکڑا اٹھا کر پتھروں کے ڈھیر کے اوپر سجا دیا اور مسکرا کر آسمان پر نظر ڈالی۔ اسے یہ سوچ کر تعجب ہوا کہ آسمان دراصل اس کا وہم ہے۔ دراصل وہاں کچھ بھی نہیں ہے جس طرح تمہاری پانچوں انگلیوں کے درمیان کچھ نہیں ہوتا۔

دریا کا بچا کھچا پانی پتھروں کے ڈھیر سے ٹکراتا ہوا بہہ رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے پتھر تیزی سے پانی کے اندر ڈوبنے لگے۔

"میگی، اوپر بھاگ آؤ۔ بند ھ کا پانی چھوڑ دیا گیا ہے۔" بہت اوپر سے قمر انکل کی آواز آئی۔

میگی جب قمر انکل کے پاس پہنچی تو اس کے ٹخنے اور گھٹنے چھل گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ نیچے پانی میں ہر چیز غرق ہو گئی تھی۔ اس کے پتھروں کا ڈھیر بھی۔

"اس میں ایک نیلا پتھر تھا جس میں سرخ دانے ابھرے ہوئے تھے۔" اس نے قمر انکل سے کہا۔ "میں کل صبح اسے تلاش کروں گی۔ کل پھر صبح ہوگی نا انکل؟"

قمر انکل ہنسے۔ ان کے دانت سگریٹ کے دھوؤں کے سبب زرد پڑ گئے تھے۔ خود میگی کے سامنے کا ایک دانت سڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے ڈیڈی سے کہا تھا کہ وہ یہ دانت اکھڑوا دے، ورنہ اس سے گنگرین ہو جانے کا خدشہ ہے۔

قمر انکل کا جواب میگی سن نہ سکی کیوں کہ تارکول کی سڑک پر ایک کتا کچلا پڑا تھا اور گرچہ اسے دم توڑے اچھا خاصا وقت گذر چکا تھا مگر وہ اس کے کپکپانے کی آواز صاف سن رہی تھی۔ اپنے کوارٹر کے پھاٹک تک میگی مڑ مڑ کر کتے کی لاش کی طرف تاکتی رہی۔

کوارٹر کے اندر سناٹا تھا۔ قمر انکل پھاٹک پر راکی کی گردن سہلا رہے تھے، راکی جو زنجیر سے بندھا ہوا تھا اور اپنی تھوتھنی لکڑی کے جنگلے سے رگڑ رہا تھا۔ میگی شست ہو کر کچن کے باہر سیڑھی پر بیٹھ گئی اور اس کی دراڑوں سے اُگی ہوئی گھاس کی پتیوں کو نوچ نوچ کر دانتوں سے کچلتے ہوئے ماں کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جب قمر انکل ماں کے ساتھ اوپر برآمدے کی طرف آتے دکھائی دیے تو پھاٹک پر شام ہو چکی تھی۔

"میگی!" ممی بولی۔ "میگی ڈارلنگ!"

گرم پانی سے میگی کے زخم دھو کر ممی آیوڈین لگانے لگی۔ میگی قمر انکل کی طرف مسکراتی نگاہوں سے تاک رہی تھی جو چائے کی خالی پیالی کے سامنے، سر پر ہاتھ دئے بیٹھے، سامنے پلنگ کے پائتانے گھورتے ہوئے بڑے مضحکہ خیز نظر آرہے تھے۔ باہر چاندروشن تھا اور یوکلپٹس کے پیڑ سرسرا رہے تھے۔
قمر میگی کو ٹیوشن دیا کرتا تھا مگر کچھ دنوں سے میگی ٹیوشن کے لائق نہیں رہ گئی تھی۔ میگی اسکول میں اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھی سوچا کرتی اسے قمر انکل ماترتے کیوں نہیں۔ اور جب وہ اپنی سہیلیوں سے ٹیوٹر کی پٹائی کے قصے سنتی تو اسے رشک آتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے قمر انکل نے اس سے اسی کے حصے کی کوئی چیز چھین رکھی ہے۔ ایک دن وہ صرف فراک پہنے قمر انکل کے پاس بیٹھ گئی تھی، اس طرح کہ اس کی کمر سے نیچے کا حصہ شرمناک حد تک ننگا نظر آرہا تھا۔ اس نے سوچا تھا آج قمر انکل ضرور اس کی پٹائی کریں گے۔ مگر قمر انکل نے پہلے پہل اسے دیکھا ہی نہیں۔ پھر انہوں نے فراک اسی کے گھٹنوں سے نیچے کھینچ دی تھی۔

"WHATS THE TRICK, GIRL?" انہوں نے ہنس کر کہا تھا۔ "لڑکی میں تمہیں بائبل کا ایک قصہ سناتا ہوں۔"
"انکل" میگی ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئی۔ "انکل وہ واقعہ سنائیے جب کرائسٹ نے مردوں کو زندہ کر دیا تھا۔"
"نہیں" قمر انکل بولے۔ "میں تمہیں وہ واقعہ سناؤں گا کہ کیسے کرائسٹ نے ایک عریاں عورت پر اپنا عبا پھینک کر اس کی آبرو بچائی تھی۔"
ممی کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ قمر انکل نے ایک لمبا سا سگریٹ سلگا لیا تھا۔ کھڑکی پر چاند نے درختوں کے ساتھ مل کر سائے کے بے شمار جھومر بچھا دئے تھے۔
"کلا را، حرامزادی" پھاٹک پر ڈیڈی گرج رہے تھے۔ "ہمارا راکی تو سڑک پر کچلا پڑا ہے۔"
"بف، بف" کتے نے بھونک کر اپنے زندہ ہونے کا اعلان کیا۔ مگر ڈیڈی ہتے ہوئے تھے۔ اندر آکر انہوں نے قمر انکل کو نظر انداز کر دیا۔ "کلارا، ہمارا راکی۔"
ممی کچن سے باہر نہیں آئی، تو ڈیڈی تھک کر لوہے کے صوفے پر بیٹھ گئے اور اسکے ہتھے سے اٹھے ہوئے پلاسٹک کے تاروں کو نوچنے لگے۔
"میگی، پھر باہر گئی تھی تو؟" انہوں نے میگی کی طرف غضبناک نظروں سے تاکتے ہوئے کہا۔
"میگی، ماں کے پاس جاؤ۔" قمر انکل بولے۔ مگر میگی باہر برآمدے میں ہی کھڑی رات کے آسمان کو تکتی رہی۔ اندر ڈیڈی قمر انکل کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ پھر قمر انکل باہر آئے۔ انہوں نے میگی کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔
"سوئٹ میگی۔ اندر مت جانا۔"
"اندر کیا ہے؟" میگی بولی۔ اس نے کچن کے دروازے پر ماں کو دیکھ لیا تھا۔ قمر انکل اس کی بات کا جواب دیے بغیر پھاٹک کی طرف چلے گئے پھاٹک پران کا ہیولا پل بھر کے لئے تھم گیا۔ شاید وہ راکی کو پیار کر رہے تھے۔ پھر وہ باہر سڑک پر درختوں کے جھلملاتے ہوئے سائے میں غائب ہو گئے۔
راکی باہر سڑک پر آفس اور اسکول کی طرف آتے جاتے راہگیروں پر بھونک رہا تھا۔ صبح صبح کسی نے پھاٹک کے اندر ہاتھ بڑھا کر سگریٹ سے اس کی تھوتھنی جھلس دی تھی۔ دن روشن تھا اور کوارٹر کے اندر ڈیڈی نہیں تھے۔
اچانک آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا اور میگی اپنے آپ کو دریا کے کنارے پا کر حیران رہ گئی۔
دریا ایک بار پھر پہلے کی مانند شانت ہو چکا تھا۔ میگی دریا کے ڈھلوان کناروں پر کچھوؤں کی پشت کی مانند ابھری ہوئی چٹانوں کے درمیان بھاگنے لگی۔ اس کے پتھروں کا ڈھیر جانے دریا کے کس کونے میں جا چھپا تھا۔ اسے سخت غصہ آیا اور اس نے اپنے پیروں سے دریا کو کچل دینا چاہا مگر پانی اس کے ٹخنوں اور کائی لگی چٹانوں کے درمیانی حصے پر مسکراتا ہوا بہتا رہا۔ شاید وہ میگی کے گم شدہ پتھروں کے اسرار سے واقف تھا۔ ایک کھنڈر نما، غیر مستعمل مندر کے صحن سے ایک شخص سگریٹ پیتا ہوا نیچے آیا۔ اس نے مسکرا کر میگی کے دونوں ہاتھ اٹھا لیے اور اس کا داہنا گال سہلانے لگا۔
"میں، تم کیا ڈھونڈتا ہے؟"
میگی نے اس کی طرف توجہ دئے بغیر کہا۔
"اس میں ایک نیلا پتھر بھی تھا جس میں سرخ دانے ابھرے ہوئے تھے۔"

"وہ پتھر ہم کو معلوم ہے کدھر ہے۔"
"اچھا۔" میگی نے پہلی بار آنکھیں اٹھا کر ادھیڑ عمر کے اس آدمی کا جائزہ لیا جس کے سامنے کے کچھ دانت گر جانے کے سبب منہ میں بڑا سا شگاف ہو گیا تھا۔ "مگر وہ پتھر میرا ہے۔"
"ہاں، بالکل، بلکہ پوری طرح تمہارا ہے۔" وہ شخص مسکرایا اور میگی کا ہاتھ تھامے ہوئے مندر کی طرف بڑھ گیا جس میں اب کسی بھگوان کا بسیرا تھا، بلکہ پرانی منہدم شدہ آڑی ترچھی دیواروں پر چار کول سے فحش تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ صحن پر، ان تصویروں کے مصوّر، چار آدمی بیٹھے برج کھیل رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر انہوں نے تاش کھیلنا بند کر دیا اور اٹھ کر میگی کے گرد جمع ہو گئے۔
"وہ نیلا پتھر!" میگی بولی۔
دن چڑھے جب قمر انکل میگی کو ڈھونڈتے ہوئے مندر کے اوپر پہنچے تو انھیں آنکھیں بند کر لینی پڑیں۔
میگی پولس کو کچھ بیان نہ دے سکی۔
"اس کا گینگ ریپ ہوا ہے۔" ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد کہا "مگر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ زخمی تو ہے، مگر یہ زخم بھر جائیگا اور اتنی کم عمر لڑکی کے لئے یہ حیرت کی بات ہے۔"
"میگی، میگی" امی اسے سینے سے لگا کر روتی رہی۔ راکی چاٹک کے قریب اپنی زنجیر سے بندھا کھڑا تھا۔ میگی ایک ہفتے کے بعد اسپتال سے لوٹی تھی اور آج اسے پھر بخار آ گیا تھا۔ باہر سڑک پر دن ڈوب چکا تھا۔ "میگی، میگی" ممی اس کا منہ چومتے ہوئے بولی۔ ڈیڈی ابھی تک شراب پی کر نہیں لوٹے تھے۔ کچن میں خاموشی تھی۔ آج قمر انکل چپ چاپ کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ "میگی، سوئٹ میگی" ماں اسے بستر پر لٹاتے ہوئے بولی۔
رات کس نے میگی کے بستر پر ایک پیالہ دودھ رکھ دیا۔ میگی نے اس ہاتھ کو نہیں دیکھا تھا۔ گر وہ جاگی ہوئی تھی۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی بہت سارے کتے ایک کمزور سے پلے کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ پلا چیخنا چاہ رہا تھا، مگر خوف کے سبب وہ چیخ بھی نہیں پا رہا تھا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے گرم گرم سلاخیں لحاف کے اندر جلد پیوست ہو رہی ہوں۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی اور خوف سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ شاید اس نے بستر گیلا کر دیا تھا پھر لحاف اڑتا ہوا چھت سے جا لگا اور اسے سامنے دیوار پر ایک سایہ چلتا نظر آیا۔ آہ، وہ سایہ، کتنے سارے ہاتھ تھے اس کے، جیسے کوئی انسان نما اکٹوپس چل رہا ہو۔ اسے بہت سارے بدبودار دانتوں کا احساس ہوا، اکٹوپس کا منہ اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور لحاف چھت سے الگ ہو کر اس کے جسم پر آ گرا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ اس کے زخم ٹیس سی ابھرنے لگی اور وہ نیند سے جاگ پڑی تھی۔
کمرے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ وہ یہ سوچ کر حیران رہ گئی کہ رات سونے سے پہلے جانے کب اس نے دودھ کی پیالی الٹ دی تھی جس سے بستر کا کونا بھیگ گیا تھا۔ پھر اسے دوسرے پلنگ پر ڈیڈی دکھائی دیے، ممی پر جھکے ہوئے۔ اور جیسے اسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو
"ممی!" اس کی چیخ باہر سڑک تک پھیل گئی تھی۔ وہ اپنے ڈیڈی کے نیم عریاں جسم سے لپٹی ہوئی، ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔
"چھوڑ دو، ممی کو چھوڑ دو۔ وہ نیلا پتھر مجھے نہیں چاہیے۔ کرائسٹ، مجھے کچھ نہیں چاہیے، مگر ممی کو چھوڑ دو، ممی کو چھوڑ دو۔" ◆◆

◎

زرِ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری فروری ۸۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ ازراہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۔۲۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

نصف گھنٹے کی بات

نسیم محمد جان ● گورنمنٹ کالج - چھپرا (بہار)

ہاں پانچ بج گئے چلو ایک دن تو گذر گیا۔ اگر دیوار گھڑی اعلان نہ کرتی تو نہ جانے کب فرصت ملتی۔ لوگوں نے سورج کو بھی بس میں کر لیا ہے۔ اب سورج دیوار پر لٹکا رہتا ہے۔ کلائی پہ بندھا ہوتا ہے ـــــ مگر سورج، سورج بھلا کبھی قید ہوا ہے جو ہو گا ـــــ لگتا ہے ریل گاڑی سے سفر کرتا ہوا کسی غلط اسٹیشن پر اتر گیا ہوں ـــــ اور ـــــ اور اب غیر مانوس اجنبی اسٹیشن منہ پھاڑے سوال کر رہا ہے۔ کہاں آ گئے تم؟ ـــــ یہ دفتر ہے ـــــ یہ گھر ـــــ ہر جگہ ایک خونخوار کتا میرا پیچھا کرتا ہے ـــــ کبھی کبھی تو میں یہ بھی نہیں سنتا کہ میرا بوس کیا کہہ رہا ہے مگر جب یہ احساس ہوتا کہ مجھ سے کچھ کہا گیا ہے تو اپنی ہی آواز سننے کو ملتی یس سر، کل ہی کی تو بات ہے صاحب کا صاحب آ گیا تھا۔ اور یس سر سننے والا بس یس سر یس سر ہی کہے جا رہا تھا ـــــ شاید دفتر نام ہے یس سر کہنے والوں کا ـــــ حاکم محکوم کیا فرق پڑتا ہے۔ صرف وقت کی بات ہے ـــــ مجھے جانے کیوں دفتر میں ہمیشہ دم ہلتی ہوئی نظر آتی ہے ـــــ ہلتی دم اور وفاداری میں کچھ رشتہ ہے بھی یا نہیں ـــــ؟ مگر صاحب ہے بڑا ہوشیار آدمی ـــــ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ لیکن کہتا سچ ہے ـــــ یہ دفتر ہے ـــــ کام کرنے کی جگہ ـــــ مشین بن جاؤ جب تک یہاں رہو ـــــ خلوص محبت، مروت کا استعمال صرف کام کرانے کے لئے ہونا چاہیے ـــــ میں اب سڑک پر آ گیا ہوں ـــــ جب میں سڑک پر ہوتا ہوں تو مجھے ایک مقصد مل جاتا ہے ـــــ گھر سے دفتر آنے کا ـــــ دفتر سے گھر لوٹنے کا ـــــ اور پھر وہ کتا جو دفتر اور گھر میں میری بوٹیاں نوچتا رہتا ہے، یہاں ایک دم غائب ہو جاتا ہے۔ اگر ساری بوٹیاں جسم سے الگ ہو گئیں تو کون مجھے پہچان سکے گا، شاید میں اپنے آپ کو بھی نہیں ـــــ لیکن میں نے ہڈیوں کے ڈھانچوں کو چلتے پھرتے، لڑتے جھگڑتے، ایک دوسرے کو نگلتے اور دفتروں میں کام کرتے دیکھا ہے۔ اب اگر کوئی یقین نہ کرے تو میں کیا کروں ـــــ ارے یہ موٹر تو بالکل میرے قریب سے نکل گئی۔ اچھی قسمت تھی جو بچ گیا، ذرا ادھر ادھر ہوتا تو ـــــ کیا فرق پڑتا۔ روز ہی لوگ مرتے ہیں ـــــ ایکسیڈنٹ تو ہوتے ہی رہتے ہیں ـــــ میں تو اس طرح کی خبریں اخبار میں پڑھتا بھی نہیں ـــــ صرف عنوان دیکھ کر ہی چھوڑ دیتا ہوں ـــــ کل میرے منہ سے چیخ نکل جاتی تو کیا ہوتا ـــــ؟ لوگ کیا کہتے ـــــ بڑے صاحب کی بیٹی کا برتھ ڈے تھا دفتر کے تمام لوگ، ان فرموں کے مالکان جن کا تعلق ہمارے دفتر سے ہے، کتنے جولی موڈ میں تھے۔ جیسے سب کی بیویاں بیس سال سے لاولد تھیں اور بغیر نوٹس کے یکایک ان میں سے ہر ایک کی گود میں ایک ایک منا آ گیا ہو ـــــ تحفوں کا ڈھیر ـــــ روشنیوں کا میلہ ـــــ مسکراتے ہونٹوں سے برستے پھول ـــــ بہار اپنے پورے شباب کے ساتھ ہال میں داخل ہو گئی تھی۔ ہاں ان کوٹھیوں میں سال بھر صرف ایک ہی موسم رہتا ہے ـــــ لوگ ہر ایکشن سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ جیسے ہونٹوں سے نہیں دل سے خوش ہوں ـــــ ہلکی ہلکی موسیقی ـــــ مگر مجھے کیا ہو گیا تھا ـــــ میں دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ بے شمار کتے بھی گھس آئے تھے۔ دم ہلا ہلا کر ہر آدمی کی بوٹیاں نوچ رہے تھے ـــــ کتنے خوفناک تھے ان کے دانت ـــــ کتوں نے سب کچھ نوچ لیا ـــــ کپڑے ـــــ بوٹیاں ـــــ میں شیشے میں اپنے آپ کو دیکھ کر ڈر گیا ـــــ اور میں اب صرف ایک ہی قسم کے ڈھانچے دیکھ رہا تھا۔ جو اچھل رہے تھے۔ ناچ رہے تھے ـــــ تالیاں بجا رہے تھے ـــــ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کہہ رہے تھے ـــــ کہاں ہے منظر صاحب ـــــ کنھیا صاحب کدھر بیٹھے تھے ـــــ کون تھا ان میں ورما صاحب ـــــ میں ان تمام لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں ـــــ سب کے سب صاحب کو گالیاں دیتے ہیں ـــــ صاحب بھی تو سارا کمیشن مار لیتا ہے ـــــ سب ڈھانچے اچھل رہے تھے ـــــ وہ تو اللہ نے بچا لیا ـــــ یکایک موسیقی بند ہو گئی ورنہ میری تو چیخ ہی نکل جاتی ـــــ اگر چیخ پڑتا تو ـــــ؟ "صاحب! ذرا کنارے سے چلئے دھکا لگ جائے گا"

——— میں اور کنارے پر آگیا ہوں ——— یہ عورت روز ہی یہاں بیٹھی رہتی ہے۔ نصف انگلیاں دکھا دکھا کر بھیک مانگتی ہے۔ ناک بھی آدھی رہ گئی ہے لوگ دس پانچ پیسوں میں جنت خریدتے ہیں۔

"شامو بھیا! زندہ باد، زندہ باد"

لگتا ہے کوئی جلوس جا رہا ہے۔ شاید لوگ الیکشن کے نام زندگی کے پرچے داخل کر کے لوٹ رہے ہیں۔ جھنڈیاں لئے جیپ، موٹر، ٹرک سب تیزی سے گذر گئے ——— کسی نے اس عورت کی نصف انگلیوں کو نہیں دیکھا۔ دراصل ہوتا یہی ہے ——— تیزی سے گذرنے والی سواری پر بیٹھا آدمی پاس کی چیزوں کو نہیں دیکھ پاتا ہے ——— سڑک پر ہر چیز دوڑ رہی ہے ——— سب ایک دوسرے کو اوور ٹیک کرتے میں لگے ہیں۔ اب ان لوگوں کو کون سمجھائے ——— زندگی کو بھی کہاں پھنسا دیا ہم لوگوں نے ——— ساری زندگی صرف زندگی گذارنے کے لئے بہتر سے بہتر تیاری میں گذر جاتی ہے ——— دیوار پر لٹکے سورج کے ہاتھ صرف دائرے میں چکر لگا سکتے ہیں۔ ہزاروں کیلو میٹر کا سفر کیا ہوگا اس نے مگر بیس سال سے میں اسے وہیں دیکھ رہا ہوں۔ ہاں بیس سال گذر گئے ——— گھر سے دفتر ——— دفتر سے گھر۔ اس مدت میں تو شاید سارا یورپ، پورا امریکہ ——— کم سے کم ایشیا کے تمام ممالک کی سیر تو کر ہی لیتا ——— دنیا بہت بڑی ہے میں نے بھی نقشہ دیکھا ہے ——— مگر مجھے اس نے کہا ——— میں تو یہ جانتا ہوں یہ دفتر ہے ——— یہ گھر ہے ——— یہ بازار ہے ——— اور یہ سڑک انھیں جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری بوٹیاں کچتی رہتی ہیں ——— سڑک یہاں سایہ دار درختوں کے بیچ سے گذرتی ہے تو کس قدر حسین ہو جاتی ہے۔ سبز سبز نرم گھاس پر ننگے چلنے کی خواہش، مگر نہ جانے کیوں ایسا آج تک نہ کر سکا۔ لوگ کہتے ہیں بڑے درختوں کے نیچے کچھ نہیں اُگتا۔ مگر یہاں تو ——— شاید پیڑ جب بہت اونچا ہو جاتا ہے تو دوسرے درختوں کو پنپنے کی اجازت دیتا ہے ——— یہ سڑک مجھے نصف گھنٹے میں گھر پہونچا دیتی ہے ——— سڑکوں پر چلنا مجھے بہت پسند ہے ——— لوگ میرے لئے اجنبی ہوتے ہیں ——— اور ہم سب کے درمیان صرف ایک رشتہ ہوتا ہے ——— آدمی ہونے کا ——— نصف گھنٹے پیدل چل کر گھر پہونچ جاتا ہوتا۔ اگر سواری کر لی جائے تو یہ رشتہ چند منٹوں میں طے ہو سکتا ہے۔ مگر میرا تعلق اس طبقے سے ہے جس کے لئے وقت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جیب میں پڑے چند سکے جتنی دیر رہ سکیں اچھا ہے ——— ایک اور بات ہے۔ میں اس سڑک پر بے خوف ہو کر چلتا ہوں۔ جب تک یہاں رہتا ہوں وہ کتا بوٹیاں نہیں نوچتا ——— مگر گھر یا دفتر پہنچتے ہی ——— میں یہ کسی قیمت پر نہیں چاہوں گا کہ نصف گھنٹے کی مسرت منٹوں میں سمٹ جائے ——— میرا گھر سامنے ہے ——— میں ہر بار کچھ دیر رک کر اپنی نیم پلیٹ ضرور دیکھ لیتا ہوں ———

"بہت دیر ہو گئی اشو کے پاپا"

"نہیں تو"

"دیر سے انتظار کر رہی ہوں آج ——— تنخواہ مل گئی؟"

"ہاں گن لو"

"ارے تم کھڑی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو اشو ——— پاپا کے لئے چائے بناؤ۔"

"ہاں بیٹی تم بہت اچھی چائے پلاتی ہو ——— تمہارے ہاتھ کی چائے"

——— اور مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں اوپر چھت کی طرف دیکھ رہا ہوں ——— کون جانے کہیں بوٹیاں نوچنے والا کتا میری کرسی کے نیچے بیٹھا نہ ہو۔ ◆◆

سلطان شاہد

مجھ کو کیا ملتا "انا" کے چاہنے والوں میں تھا
جنگ ہو یا امن ہو، میں ہارنے والوں میں تھا

میری ہی تلوار میرے خوں سے رنگ آلود تھی
ایک منظر بے حسی کا سامنے والوں میں تھا

تھا عجب منظر کہ اس نے کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ
خواب کے پیکر میں خود کو ڈھالنے والوں میں تھا

شام کی دہلیز تک آتے ہی تھک کر سو گیا
وہ بھی شب کی فصلِ غم کو کاٹنے والوں میں تھا

اک اذیت ناک محرومی مقدر ہے مری -!
میں کہ اپنی خواہشوں کو مارنے والوں میں تھا

● ۲۰۰ منگلوار وارڈ، مالیگاؤں

عمران عظیم

وہ کوئی خوبصورت سا بہانہ کر بھی جائے گا
مجھے معلوم ہے الزام میرے سر بھی جائے گا

مری آنکھو! مجھے کچھ دیر تو محفوظ ہونے دو!
جھپک لوں گا اگر پلکیں تو یہ منظر بھی جائے گا

زمانہ بیتنے پر بھی وہ اپنی خو نہ بدلے گا،
چھپا کر آستیں میں وہ کوئی خنجر بھی جائے گا

جسے اک حادثے ہی نے کئی ویرانیاں دی ہوں
وہ خود پر مسکرائے گا مگر پھر ڈر بھی جائے گا

سبھی انداز آتے ہیں عظیم اُس دشمنِ جاں کو
اشارے پر نظر کے دل تو دل ہے سر بھی جائے گا

● ۱۸، مولانا حالی ہوسٹل، ایم ایم ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شعیب نظام

عجب طلسم ہے اُس حُسنِ جاودانی کا
کہ ٹوٹتا ہی نہیں نشہ خوش گمانی کا

یہ کیا ہُوا مرے چہرے پہ برف جمنے لگی
یہ کیسا ذکر ہے موسم کی مہربانی کا

سفر تمام ہُوا جب سراب کا تو کھُلا
کہ کیسا ذائقہ ہوتا ہے ٹھنڈے پانی کا

زبان کھولی نہ میں نے کہ خوب جانتا تھا
جواب ہے بھی کہاں اُس کی بے زبانی کا

سیاہ دشت میں چمکا کے لمس کے جگنو
وہ بھول بیٹھا ہے قصہ بھی بے مکانی کا

وہ آج اپنے ہی لفظوں کے پھیر میں گم ہے
جو شہریار تھا اس شہرِ خوش بیانی کا

● پریس انفارمیشن بیورو، لال باغ لکھنؤ

جمال اویسی

زرد چاند آکاش میں اُگتا ہُوا
چہرۂ آفاق مُرجھایا ہُوا

میں رہا ساحل پہ تنہا رات تک
تھا سمندر شام سے بپھرا ہُوا

ٹوٹ کر بکھری نہیں پر کوئی شئے
منتشر کمرہ کا سناٹا ہُوا،

کتنے تارے آسماں میں بجھ گئے
میں کہاں دنیا سے پوشیدہ ہوا

اک نگاہِ یاس ڈالی ہر طرف
زیست کا غم جب کبھی تازہ ہُوا

● محلہ فیض اللہ خان، دربھنگہ (بہار)

بڑا کام

شکیب رضوی ● لکچرار، کرائسٹ چرچ کالج، کانپور

وہ دن بھی بیت گئے۔ جو اس کی بے تکان مشغولیت کا محور تھے۔ اور وہ وقت بھی آ گیا جس کا اس کو انتظار تھا۔ شام کے دھندلکے نے فضا میں سیاہی گھولنی شروع کر دی پیڑوں پر چڑیاں بسیرے کے لئے آنے لگیں۔ روشنی کی علامتیں مغرب میں غرق ہو چکی تھیں۔ مگر آسمان پہ ڈوبتی ہوئی زردی ان کے وجود کا یقین دلا رہی تھیں مچھلی پکڑنے والوں کے ٹھیے سنسان تھے۔ دھوبی بھی اپنے سوکھے ہوئے کپڑوں کی گٹھریاں اٹھا کر اپنی اپنی منزلوں کی طرف چل دیے تھے اور ساحل پر ان کے پاٹ دن بھر کی زد و کوب سے نجات پا کر گہری نیند میں ڈوب چکے تھے۔ جب اسے پورا یقین ہو گیا کہ اب گھاٹ پر کوئی اسے دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ندی کے کنارے کی طرف چل دیا۔ کنارے پر پہنچنے کے بعد تھوڑا سا پانی میں اتر کر وہ اس ریت کے ٹیلے پر پہنچ گیا۔ جہاں وہ ڈھانچہ پڑا تھا۔ وہ ڈھانچے کو اٹھا کر ٹاٹ میں لپیٹنے ہی والا تھا کہ قریب کی آواز نے چونکا دیا۔

"خبردار اس کو ہاتھ نہ لگانا یہ ڈھانچہ میرا ہے۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس سے مخاطب تھا۔

یہ تمہارا کیسے ہے۔ کیا تم اس لاش کے وارث ہو؟

نہیں میں اس لاش کا وارث نہیں ـــ ان لاشوں کا وارث کوئی نہیں ہوتا۔

اور جن لاشوں کا وارث کوئی نہیں ہوتا ان کے ہی ڈھانچے ندی کے کنارے پائے جاتے ہیں۔

پھر تم اس ڈھانچے کے مالک کیسے ہوئے۔

اس لئے کہ میں چار دنوں سے اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔

مگر میں نے تو تم کو کبھی لاش کے پاس نہیں دیکھا۔

پاس آنے کا وقت تو اب آیا ہے۔ میں روزانہ اس پیڑ کے پیچھے سے اس کی نگرانی کرتا تھا کہ کتے اور گدھ اپنی پوری غذائیں لاش سے حاصل کر لیں۔ اس کے بعد میں اس ڈھانچے کو اٹھا کر فروخت کرنے کے لئے لے جاؤں۔

"مگر صرف نگرانی ہی ملکیت کی شرط نہیں۔ یہی کام میں بھی چار دنوں سے کر رہا ہوں"

مگر ڈھانچہ پھر بھی میرا ہے کیوں کہ اس سال کو میں نے اس کے پچھلے نگراں سے خریدا ہے۔ وہ بھی میری طرح کنگال تھا۔ اور پہلے یہی کام کرتا تھا۔ مگر اب اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے اور بڑا کام کرنے لگا ہے۔

"بڑا کام!"۔ کیا کوئی بڑا کام بغیر پیسوں کے بھی ہوتا ہے؟

ہاں اکثر بڑے کام بغیر پیسوں کے بھی ہوتے ہیں۔ ایک فون پر لاکھوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔

اچھا تو وہ کون سا کام کرتا ہے؟

وہ اب انسانی سروں کا سوداگر ہے۔

کیا تم بھی اپنے سر کا سودا کرنا چاہتے ہو؟ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

اس نے شکست آگیں مایوس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنا ٹاٹ اٹھا کر وہاں سے چل دیا۔

اس کی چار دنوں کی محنت رائیگاں ہو چکی تھی۔ نامرادی کے سائے اس کی آنکھوں کے سامنے منڈلا رہے تھے۔

اب کون سا کام کیا جائے۔ پرانی نوکری چھوڑے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا نئی ملازمت ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ لوگ اس کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ محنت مزدوری کو وہ اب بھی اپنی شایان شان نہیں سمجھتا تھا ڈھانچوں کا کاروبار بھی وہ خفیہ طور پر ہی کرنا چاہتا تھا۔

"بڑا کام" اس کے ذہن سے برابر ٹکرا رہا تھا۔ بڑا کام تو وہ کر بھی چکا تھا۔ مگر اس کو پیشہ بنانے کی جسارت اس میں نہ تھی۔

انھیں خیالات میں گم وہ اپنے کہنہ بوسیدہ مکان میں پہونچ کر لیٹ گیا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ بھوک اور الجھن نے اس کی نیند اڑا رکھی تھی وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔

آدھی رات کے قریب وہ اٹھا۔ کونے سے لوہے کا بیلچہ اٹھایا۔ اور تیز قدم گھر سے باہر نکل گیا۔ تاریک فضا پر سناٹا پوری طرح مسلّط تھا۔ دور تک کوئی راہگیر دکھائی نہ دیتا تھا کبھی کبھی دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ جاتیں۔ وہ بستی کے قبرستان میں داخل ہو کر ایک جانی پہچانی قبر پر پہونچ گیا۔ جس کے بارے میں اسے علم تھا کہ بہت پرانی تھی اور جس میں ایک مرد کا جنازہ دفن کیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اب اس میں ڈھانچے کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

قبر کے پاس بیٹھ کر وہ اسے کھودنے لگا۔ اور جلد ہی کچھ ٹوٹے اور کچھ گلے ٹکڑے ہٹا کر اس میں اتر گیا۔ ماچس جلا کر اس نے قبر کا جائزہ لیا اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اتنی پرانی قبر میں اتنی تازہ لاش وہ بھی ایک جوان عورت کی جس کا کفن بھی ابھی میلا نہ ہوا تھا، ماچس کی تیلی کی آخری مدھم روشنی میں عورت کے چہرے پر اس کی نظر پڑی۔ عورت کی آنکھوں میں چمک اور حرکت تھی اور اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ فوراً پہچان گیا۔ کہ یہ اس کی بیوی تھی۔ جس کو اس نے برسوں پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں اسکا کریا کرم کر کے اس کی موت پر مصنوعی سوگ کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اپنے اس جرم کے لئے اس کو اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اور پندرہ سال کی قید بھی۔

اس کو دیکھ کر اس پر عجیب قسم کے جذبات طاری ہونے لگے اس کے سینے میں آگ کی جوالا بھڑک اٹھی۔

میں نے اپنے ہاتھوں تجھے پھونک کر تیری استھیاں ندی میں تیرائی تھی۔ تو پھر بھی زندہ ہے۔؟

یہ کہہ کر پھرتی سے اس نے بھاری بیلچہ اٹھایا۔ اور اس کے سر پر اپنی پوری طاقت سے مار دیا مگر بیلچے کے سر پر پڑتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ جیسے اس کا بیلچہ کسی سوکھی ہڈیوں والے ڈھانچے کے سر پر پڑا ہو جس کی کرچیں قبر میں بکھر گئی تھیں۔ ◆◆

بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات ماہنامہ شاعر بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴ ۔ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت	بمبئی	قومیت	ہندوستانی
پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی	ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
پتا	دینا تھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴	قومیت	ہندوستانی
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی		
پتا	دینا تھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴		
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ		

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔ ۲۸ر فروری ۱۹۸۶ء

دستخط ناظر نعمان صدیقی

جینت پرمار

گجراتی کی دلت نظمیں

ماضی میں سنسکرت زبان، ویدک فلسفہ اور ورن ویوستھا کے نام پر دمن چکر، سرمایہ دارانہ نظام پر ورن ویوستھا CASTE SYSTEM برقرار رکھنے کے لیے کئی کاوشوں کے ساتھ ساتھ لوک میڈیا نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی نظام کی بنا پر ہزاروں سال تک دلت نظام کے شکار ہوتے رہے۔ اس ویوستھا کے خلاف پڑھے لکھے دلت ورگ میں آکروش پیدا ہوا۔ دلت احساس شبد سے اچھوتا تھا۔ آج تک اس پیڑھا [درد] کی بھاشا نہیں تھی۔ چپ رہنے پر مجبور کیا جاتا رہا تھا اور اس ظلم کا احساس بھی اچھوتوں کو نہیں تھا۔ اس مڈینتر کا پتہ چلتے ہی دلت شعرا کو شبد کی شکتی کا گیان ہوا اور انھوں نے اپنے سنگھرش میں شبد کو ہتھیار بنا لیا

مراٹھی کے مشہور دلت ادیب لکھتے ہیں:

"ہمارے سماج میں ایک جاتی کے دکھ کا پتہ دوسری جاتی کو نہیں ہوتا۔ سمویدنا کا آدان پردان ہی یہاں نہیں ہوا ہے۔ ساڑھے تین فی صد لوگوں کے لکھے گئے ادب میں سماج کے دلت ورگ کا ذکر ہوا ہی نہیں ہے۔" یہی حال ہندوستان کی دیگر زبانوں کا ہے۔ گجراتی میں دلت ادب کا آغاز کب، کیسے اور کس سے ہوا یہ ایک تحقیقی موضوع ہے۔ لیکن چھٹی دہائی میں مراٹھی میں دلت ادب کا رجحان شروع ہوا۔ مراٹھی کے دلت ادب نے نئی پڑھے لکھے نوجوانوں کو نہ صرف دلت ادب تخلیق کرنے کی تحریک دی بلکہ انھیں اپنی شناخت کا ایک نیا احساس بھی بخشا اور اس کے زیر اثر ۱۹۷۰ء میں دلت پنتھر نے آکروش رسالہ شروع کیا۔ آکروش، کالا سورج، نیا مارگ جیسے میگزین کے ذریعہ پانچ سات سالوں سے نئی پیڑھی نے توڑ پھوڑ کا ادبی آندولن چلایا۔ اس کے ساتھ ساتھ سماج کو نظر انداز کرنے والی گجراتی ساہتیہ پریشد کے سیمینار اور کانفرنس کے خلاف نسری ناٹک STREET PLAY، مشاعرے اور نعروں کے ساتھ ساتھ منظوم مخالفت شروع کی۔ ادبی تہذیب کے مٹھ اور گڑھ کے سامنے دلت شعرا نے احتجاج کیا۔ گجراتی میں دلت ادب کی شروعات شاعری کے ذریعہ ہی ہوئی۔

دلت ادب دلت MOVEMENT کا ایک حصہ ہے۔ یہاں انسان مرکز میں ہے۔ ان شعرا کے پاس جو کس تخلیقی وژن ہے۔ ویدنا کی آنچ پہلی بار اتنی تیز ہو کر سامنے آئی ہے۔ دلت ادب آج کے انقلابی عہد کے شعور کا نتیجہ ہے۔ دلت شاعری ۴۲ ماتراؤں کی ۱۴، ۲۱ مصرعوں کی فٹ پٹی سے بنی تلی صاف ستھری جومیٹری جیسی قائم اور دائم نہیں۔ اور نہ ہی وہ ۶۵ ۳- ۲۴- ۶ ۳ جیسی رومانی فارمولوں میں قید ہو سکتی ہے اس کی کمان چھاڑنی پیجنیں، اس کا آگ اگلتا وردہ اپنا راستہ خود بنائے گا۔

دلت شاعر بہت حساس ہے۔ اپنے عذاب اور پیڑھا کے اظہار کے لیے اسے ادھار کے استعارہ علامتیں راس نہیں آئیں گی۔ اسے تو منو کی جڑوں کو اکھاڑ کر پھینک دینا ہے جو پورے ہندو سماج میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مہاکاویہ EPIC کا راستہ بھی اس کے لیے بہت چھوٹا پڑے گا اتنی یاتنائیں ہیں اس کی! مسلسل یاتناؤں سے کھنڈ ہوتی زندگی کی ترجمانی ہے دلت شاعری۔ وسپھوٹ کے دیباچہ میں مشہور دلت شاعر بالکرشن آنند لکھتے ہیں:

"ہمارا رشتہ جتنا شاعری کے ساتھ رہا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ "سماج" کے ساتھ رہا ہے۔ نقاد ان کے اسٹھتو سکوپ کے ذریعہ دلت شاعری کو ایمان داری سے پرکھیں اور سماج کے ساتھ اس کے اٹوٹ رشتہ کی دھڑکنیں بھی سنیں"

میں نے گجراتی میں شائع شدہ چند نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں میری اپنی نظمیں بھی شامل ہیں جو گجراتی میں شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمہ شدہ ان نظموں سے دلت شاعری کے فکری رویوں کا اندازہ عصری شاعری کے تناظر میں لگایا جا سکتا ہے۔ ◆◆

ماگشر کی ایک رات

راج چوہان

جاناں! کچھ بھی یاد نہیں
گانوں کا تالاب مرمر گنگناتا ہے
ماگشر ٹھٹھرتا ہے تیری آغوش میں
ادھ ننگا۔
اور میں
ہتھیلی پہ منہ لٹکا کر
کس کس کو دوش دوں؟
جاناں ٹھنڈ لگتی ہے؟
قریب تو آ
پرا اوڑھیں گے کیا؟
آکاش یا دھرتی
تیرے بدن میں تو ماگشر
کب سے کانپ رہا ہے
فجر کے سناٹے میں
ڈگڈگی بجاتی تیری ٹھوڑی
اور چھپروں کی بھنبھناہٹ میں
کتنے ماگشر ابھی باقی ہیں جاناں؟
انگنت ہیں، جاناں
آسماں کے ستارے
اور ......
تیرے میرے ایمان!
تالاب کے پانی میں کھلا ہوا
اپنا چہرا
تو نے دیکھا ہے کبھی؟
آئینہ کہاں سے لاؤں؟
اس کی طلب میں کئی پہاڑوں کو گھول کر
پی گئے ہیں ہم!
تیرے چہرے کی جھریاں گن سکوں تو کہوں
جاناں!
تیری پیٹھ کے زخم کو سہلاتا ہوں
جنم جنم کے ساتھی ہونے کی
صرف ایک نشانی یاد ہے مجھے
میری پیٹھ کے یہ نشان
کیا تجھے یاد ہیں؟ ●

سوال

پروین کمار اشک

تم کہتے ہو:
کل تک
ہم گردن پہ کلڑی اور پیٹھ پر
جھاڑو لٹکا کر
پانچ ہزار سال سے مسلسل چلتے تھے
اندر پرستھ اور ایودھیا کی شاہراہوں پر
ایک بار بھی تم کو
گردن پہ لٹکتی کلڑی چھوڑ کر
اُن کے چندن راکھ سے ملے ہوئے
سخت چہروں پہ تھوکنے کی ہمت نہ ہوئی؟
پیٹھ پر لٹکتی جھاڑو پھینک کر
اپنے ہی سایوں کو ریزہ ریزہ کر کے
ان لوگوں پہ پھینک نہ سکے؟
مردہ بیل کے سینگ سے
بنا نہ سکے ایک بار بھی ہتھیار؟
خدا نے تمہیں بنانے کو دیے تھے
پانچ ہزار سال
اِتہاس کے کتنے کورے ورق دیے تھے؟
ایسا ڈکس کے لہو رستے انگوٹھے کی چھاپ نہ لگا سکے تم؟
کلہاڑی سے تم نے جنگل مٹا دیے
پہاڑوں کے میدان بنائے
ایک بار بھی جگمگاتے سورج کے سامنے
اپنی کلہاڑی اُٹھا نہ سکے؟
اور اب وقت کہاں ہے؟
اب باقی نہیں رہا اِتہاس کا کوئی کورا ورق
زمیں کے ساحل سے
ڈیناسور کی طرح ختم ہو جاؤ
چونکہ ڈاروِن سنہتا میں تو
MIGHT IS RIGHT ہے! ●

کلڑی — ایک چھوٹا سا برتن جسے ہریجن جاتی کے لوگ اپنی گردن پر لٹکاتے تھے اور اسی میں تھوکتے تھے۔

بال کرشن آنند

ایک نظم

ہزاروں سال سے
گڈ مڈ پڑے ہوئے
میرے سشبدوں کو جگا کر
شانتی کو بدلتی ہے
کرانتی میں
تہذیب اور تمدن کی ارتھی کو
بیچنے چلا ہوں دنیا کی منڈی میں
انصاف کی دیوی
جنم سے اندھی نہیں
اُس کی آنکھوں پہ ستم گروں نے
باندھی ہیں پٹیاں
[طرفداری نہیں سچائی نہ دیکھ سکے اس لیے]
اور سارے دیس میں سازش رچا کر
بھٹیار گلی میں مروڑی جاتی مرغے کی گردن
جیسے بکری کی گردن پہ چھرا پھرے !
دَلت کا گلا گھونٹ دیا گیا
[چپ چاپ ۔۔۔۔ اس کی کوئی سنتا نہیں]
ادھار لالی
بغیر لپ پاؤڈر کی
اس دلت کویتا کو
[کالے لباس ہی میں سہی]
"یو این او" میں بھیجنا ہے
سمجھے ۔۔۔۔۔۔
پتو نسکوں میں ایشور بھی
پیدا نہیں ہوگا !!

کالے لہو کی کویتا

شاعر دوستو :
ازل سے
وا لتسائن کی گیتا ہی لکھنے میں
مصروف رہے تم ؟
مرتال کے منہ سے نکلتی بھٹیار گلی کی گندھ کو
موگرے کی خوشبو کہتے
ستوں کو کمپاس سے ناپتے
تمہارے دماغ پر سوار بھوت کو
قلم سے انڈیل کر
زندگی کے مسئلوں کا حل پانے کے لیے
تڑپتے رہے تم
لیکن دوستو :
ہمارے قلم سے جھڑتی ہیں چیخیں
ہماری ہتھیلی پہ کھنچی ہوئی
کالے لہو کی ریکھائیں
دبی کچلی آہیں
مُکتی کے آکروش کا پیغام لیے
میدان میں اتری ہیں ۔
اس نئی پیڑھی کے لیے
ہماری کویتا
جنگ کے میدان میں
بھائی بھائی کا خون
پیتے ہتھیاروں کو
بھون دینے کے لیے عظیم پیغام
بن گئی ہے ہماری کویتا

پروین گڑھوی

نظم

ٹھہرو !
نیوٹران بم کی کھوج کا
ابھی انت نہیں ہوا
ہم ایک ایسا بم بنائیں گے
کہ جس سے
انسان کا بدن رہے گا ویسا ہی
صرف قتل ہوگی اُس کی آتما ۔
جو مہابھارت کے اٹھارویں دن بھی
قتل نہیں ہوئی تھی !

پروفیسر نرسینھ پرمار

مرحوم چھیتا ونگر

کتّے کا اک ٹانگ جیسا
منڈالا کا چھیتا ونگر !"
ہتھیار سے کاٹ دیا جائے تو بھی کیا ؟
آگ میں بھون دیا جائے تو بھی کیا ؟
ہمیں کیا ؟ تمہیں کیا ؟ منڈالا کو کیا ؟
یہ تو اخبار میں پڑھا تو جانا
یوں تو کئی کتوں کی ٹانگیں
کٹ جاتی ہوں گی
زندہ دفن ہو جاتے ہوں گے
اس کا کوئی حساب ہے ؟
حساب رکھنے جیسا بھی ہے ؟
تین ٹانگوں والا کتّا دم پٹپٹاتا
لنگڑا لنگڑا چلے گا !
----چلتا رہے گا
ہمارے لیے تمہارے لیے منڈالا کے لیے
چونکہ وہ کتّا ہے
[شاید یہی اس کی خوش قسمتی ہے
اور بدنصیبی بھی !]

وہ باگھ نہیں
وہ انسان نہیں
وہ کچھ بھی نہیں ●

منگل راٹھور

بورژوا

آئسکریم کا
ذائقہ چکھ کر
یہ سورج بھی
پاپی ہو گیا ہے سالا
بے حیا بورژوا
مسلسل ہنستا ہے
چلچلاتی دوپہر میں
سوکھے ہونٹ پر
جیبھ پھیرتا ہے
ایک یتیم بچے کے سامنے ●

جینت پرمار

ورثہ

ماں سے سُنا تھا میں نے :
باپ کے مرنے کے بعد
کُلڑی اور بہاری
مجھے ورثہ میں ملی تھیں
[میری پہچان کے لیے !]
گردن پہ لٹکتی پہاڑ جیسی کُلڑی
پھینک دی ہے میں نے خلاؤں میں !
اور پیٹھ پہ لٹکتی بہاری میں
لگا دی ہے آگ !
تاکہ میرے بعد
یہ ورثہ میرے بچّوں کو ---- ●

جینت پرمار

وہ طمانچہ شعلہ بن کے بھڑک اٹھتا ہے

چلچلاتی دھوپ میں
اسکول سے چھوٹا
بغل میں بستہ دبا کر
سیدھا گھر کی طرف بھاگا
پیاس گلے میں کھٹک رہی تھی
رستے میں اک پیڑ کے نیچے
پانی والی بڑھیا کو دیکھ
اس کی طرف لپکا
اور بڑھیا کے سامنے کھڑا رہ گیا
سوالیہ نشان کی طرح
اس نے میری ذات پوچھی
میں نے خشک آواز میں کہا:
"ڈھیڑ"*
پانی کے جواب میں اس نے مجھے
زور سے طمانچہ دے مارا
آج بھی جب اس پیڑ سے گذرتا ہوں
تو بھوت کی طرح منو* مجھے گھورنے لگتا ہے
اور میرے دائیں گال پہ
وہ طمانچہ شعلہ بن کے بھڑک اٹھتا ہے!

* منوسمرتی کا خالق

پیڑ*

آسماں پہ گدھوں کا جھنڈ منڈلایا تھا
پنکھ اور چونچ کی آوازوں نے
کھڑکی کھڑکی دستک دی
"بیل مرا ہے! بیل مرا ہے!!"
ہوا سی پھیل گئی خبریں
گلی گلی کے کانوں میں
ساری بستی کے چہرے پہ رونق تھی
نکل گئے سب اپنے گھروں سے
میں ہاتھوں میں پتھر لیکر گدھ پہ پھینکا کرتا تھا
اُن کو دور بھگاتا تھا
گدھ بھی ہم پر غصہ کرتے تھے
مجھ کو برابر یاد ہے اب تک:
جن گدھوں کو میں نے پتھر مارے تھے
اور جنھیں بھوکا رکھا تھا
آج وہ میری موت کی خوش خبری سُن کر
میری لاش پہ ٹوٹ پڑے ہیں
اور میرے اندر کے بیل کی
بوٹی بوٹی نوچ کے
مجھ سے بدلا لیتے ہیں!

* مرا ہوا جانور جیسے ڈھیڑ جاتی کے لوگ کانوری سے اٹھالے آتے ہیں اور اسکی کھال اُدھیڑ کر کھانے کے لیے اس کا مانس لے آتے ہیں۔

پورٹریٹ

میں اس کی پسلیاں ٹھیک سے گن سکتا ہوں
گلی کوچوں میں جھاڑو لگا کر
گِھس گئی ہیں
اس کی ریڑھ کی ہڈیاں
سنہری خواب کچرے کے کوڑے میں دفن ہو گئے
وہ ساری عُمر ادھ ننگا رہا
———— رکھا گیا
پھر بھی
کِسی نے اسے
HALF NACKED MAN نہیں کہا!
انگنت ظلم کے چیتھڑے لگے ہیں
اس کی زندگی کی قمیص پر
جیتے جی
وہ مرا کئی بار
اس کی موت اگر میں گننا چاہوں
تو کئی جنم لینے پڑیں گے مجھے!
اب تک وہ چپ چاپ ظلم سہتا رہا
لاتیں کھاتا رہا
لیکن آج
اس کے پسینے سے مجھے
آتی ہے بارود کی گندھ

اے/۲۰۰، اسبالی خلیا، مرکی وارڈ، شاہ پور، احمد آباد (گجرات)

مکتوبات

عبداللہ کمال ـــــــــ شام جی بلڈنگ، دوسرا منزلہ، فورباغ۔ ڈونگری، بمبئی ۹

"شاعر" میں چھپتے ہوئے غالباً دوسری دہائی پوری ہونے کو آرہی ہے۔ اس دوران پرچے کے بارے میں کچھ لکھنے کا خیال بھی دل میں نہیں آیا اور یہ خیال آتا بھی کیوں؟ "شاعر" اردو کا مکمل ادبی کا جریدہ تھا اور قبلہ اعجاز صاحب (مرحوم) تک آتے آتے اس کی حیثیت اردو کے معیاری اور متوازن ادب کے ایک معتبر استعارے کی سی ہوگئی تھی۔ اس پرچے نے اپنے طویل ارتقائی سفر میں ادب کی ہر نئی جہت سے اپنے قاری کو باخبر رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے نہ کبھی پرانی اقدار کی پامالی کی حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی نئی قدروں کی اجنبی آہٹوں کو نظر انداز کرنے کی مجرمانہ غفلت ـــــ اس کی یہ پالیسی آج تک برقرار ہے۔

قبلہ اعجاز صاحب (مرحوم) کے بعد تم لوگوں (برادرم تاجدار احتشام، مانی بھائی اور تم) نے لاخلاف توقع "اس کے سربلند پرچم کو زمیں بوس نہیں ہونے دیا۔ بدقسمتی سے تاجدار بھائی ہم سے بہت جلد جدا ہوگئے مگر تمہارے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

آزادی کے بعد ہندستان سے اردو کے کتنے ہی بڑے بڑے رسائل نکلے اور بند ہوگئے مگر سخت سے سخت ناسازگار اور نامساعد حالات کے باوجود "شاعر" کی اشاعت میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ بات اوروں کے لئے باعثِ حیرت ہو سکتی ہے اُن لوگوں کے لئے نہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ تم کتنی کڑی ریاضت کی بھٹی سے تپ کر نکلے ہو، صبر، برداشت اور قناعت کی کن کن منزلوں سے گذرے ہو اور کیسی کیسی تہذیبی اور اخلاقی تربیتوں سے تمہارا ذہنی اور فکری پس منظر عبارت ہے۔

اس لئے میں نے شاعر کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ کیا لکھتا؟ رسمی مراسلہ بازی میرا مزاج نہیں۔ مدیروں کو خوشامدی خطوط لکھ کر غزل چھپوانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تم تو خیر دوست ہو، یونہی چھاپ دیتے ہو۔ اس تعلق خاطر سے تم پر دوست نوازی کا! لزام بھی آسکتا ہے... مگر مجھے تو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ قبلہ اعجاز صاحب (مرحوم) بھی میری غزلیں پسند خاطر رکھتے تھے اور اکثر دو تین شماروں کے وقفے سے حکم دے کر مجھ سے غزلیں منگوا لیتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں، یہ نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی اور اعلاظرفی تھی، بلکہ جوہر شناسی بھی تھی۔

تو میرے بھائی، میں تمہیں خط کیوں لکھتا ـــ؟ قبلہ اعجاز صاحب (مرحوم) کے بعد بھی تم لوگوں نے اپنے قاری کو کسی کمی کا احساس کہاں ہونے دیا؟ تم اگر چاہتے تو حالات سے کوئی بھی مفید مطلب سمجھوتا کر کے "شاعر" کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی حالات بھی درست کر سکتے تھے کہ بمبئی جیسے ملٹی نیشنل سٹی میں ایسا کچھ ناممکن بھی نہیں تھا مگر تم آج بھی ۲۰×۱۰ کے اسی تنگ کمرے میں اپنے اہل خاندان اور "شاعر" کے ساتھ مقیم ہو، جہاں اعجاز صاحب قبلہ تمہیں چھوڑ گئے تھے ـــ (اب "شاعر" کی حیثیت بھی تو تمہارے خاندان کے ایک فرد کی سی ہے؟) مگر تم نے اپنے پیش رو بزرگوں کی طرح اپنی اخلاقی اور تہذیبی روایات کو روشن رکھا۔ اپنی انا کو فنا نہیں ہونے دیا۔ تمہاری اس ادا پر ایک شعر یاد آرہا ہے۔ میرا ہی ہے۔ تمہاری نذر کر رہا ہوں:

اک انا ہے، سو ہے نیزے کی انی پر لیکن   حُرمتِ حرف بھی ہے فتح کے پرچم کی طرح

نیزے کی انی پر رقصِ انا پیش کر کے ہی حرمتِ حرف کو فتح سے ہم کنار کرنا ممکن ہے۔ حرمتِ حرف کا یہ سربلند پرچم ہی ایک شاعر کی بنیادی شناخت ہوتی ہے اور تمہارے "شاعر" کی بھی یہی شناخت رہی ہے۔ تمہارے بزرگوں نے بھی اسے قائم رکھا اور یہی ورثہ بطور امانت تم تک پہونچا۔ ظاہر ہے، تمہارے دست و بازو تمہارے بزرگوں سے زیادہ تازہ کار و توانا ہیں۔ مجھے یقین ہے تم بھی اسے سربلند رکھنے میں سرخ رو ہوگے لیکن یہ پرچم کیا تم اپنے بعد کی نسل تک بھی اسی اعتماد کے ساتھ پہنچا سکتے ہو، جس طرح یہ تم تک پہنچا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کے جواب کی ذمہ داری تم پر ہی نہیں، ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے، جس کا اردو سے ذرا سا بھی تعلق ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں، کوئی بھی اردو والا اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ کسی زندہ زبان کے لئے اس سے بڑی شرم کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی کہ اس کے دعوے دار مردہ لوگ ہیں۔ کھوکھلی نعرے بازیوں کی ریت میں منہ چھپا کر تحفظ کا فریب کھانے والے بے حوصلہ لوگ۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے اس زبان کو اپنی زبان کہنے کا جبکہ ہم اس زبان میں شائع ہونے والے صرف ایک پرچے کی زندگی کی ضمانت بھی نہیں دے سکتے۔ ہماری بے حسی کی اس سے زیادہ شرم ناک مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے پاس اردو کا ایک بھی باقاعدہ ادبی جریدہ نہیں، سوائے ایک "شاعر" کے اور... وہ بھی ہمارا مرہونِ منت نہیں۔ میں یہ اعتراف کرتے ہوئے

محسوس کرتا ہوں افتخار، کہ گذشتہ ۷۰ سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا "شاعر" اب صرف تمہارے ہی وقار کا مسئلہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اور تم تنِ تنہا اپنے وقار کی یہ جنگ لڑ رہے ہو۔ حالانکہ آج اسے ہندوستان کے تمام اردو والوں کے وقار کا مسئلہ ہونا چاہیے تھا، بلکہ اس کی گذشتہ طویل ترین خدمات کے پیش نظر قومی سطح پر پورے ملک کے وقار کا مسئلہ بن جانا چاہیے تھا۔

اردو کی ترویج و ترقی کے لئے اردو اکادمیاں حکومت کی معاونِ کار کے طور پر سرگرم عمل ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نہ صرف مہاراشٹر اردو اکادمی بلکہ تمام ریاستوں کی اردو اکادمیاں اپنے سالانہ بجٹ کا ایک معقول حصہ "شاعر" جیسے پرچے کے لیے مختص کر دیتیں۔ کیونکہ "شاعر" اسی اردو کا پرچہ ہے، جو ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی امانت دار ہے اور یہ اردو اکادمیاں اسی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

میں تمہیں "شاعر" سے متعلق لکھتا بھی کیا پیارے، کہ اس ذیل میں جب بھی کوئی چھوٹی موٹی توجہ طلب بات نظر آئی، تو اس پر ذاتی ملاقاتوں ہی میں تم سے گفتگو ہو گئی اکثر ذرا ذرا سی خامیوں پر میں نے سخت سے سخت تبصرے بھی کئے۔ یہ تمہارا ظرف ہے کہ تم نے کبھی ان جارحانہ تبصروں کا برا نہیں مانا بلکہ ان پر توجہ دی۔ ظاہر ہے کہ تم میری خلوص نیتی سے واقف تھے اور میرا مقصد بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ماضی میں "شاعر" نے اپنا جو امیج بنایا تھا، وہ برقرار رہے۔ اس کا ایک ایک صفحہ، ایک ایک سطر ایک ایک لفظ درجۂ اعتبار و استناد کو پہنچ جائے۔

مگر، ادھر گذشتہ چند برسوں سے میں "شاعر" سے متعلق کچھ لکھنے کے امکان پر بھی غور کر رہا تھا۔ "ایک شمارہ ۶۸۰ کے نام"، نثری نظم اور آزاد غزل نمبر، گوشۂ کالیداس گپتا رضا" وغیرہ مجھے بُری طرح TEMPT کر رہے تھے مگر اپنے مزاج، مصروفیت اور فطری کاہلی کے سبب بات ہمیشہ ٹلتی ہی چلی گئی۔ حالانکہ آفسیٹ کی طباعت سے تم نے "شاعر" کے نئے دور کا آغاز کر دیا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ کم از کم ہندوستان کی حد تک کہ جہاں ہماری حکومت اردو کی بقا کے لئے ایک طرف اردو اکادمیاں قایم کرتی اور دوسری طرف کسی باسو دیو سنگھ کو شہ دے کر اردو کی شہ رگ پر چھُری رکھ دیتی ہے۔ ایسے حوصلہ شکن حالات میں اردو کے کسی ادبی پرچے کا نہ صرف ۵۶ سال تک مسلسل زندہ رہنا، بلکہ جدید دور کی جدید ترین طباعتی تکنک سے استفادہ کرنا یقیناً ایک غیر معمولی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے انگریزی کی یہ کہاوت تمہاری ان کاوشوں پر پوری طرح صادق آتی ہے:

"WE DONT WAIT MIRACLE, WE MAKE MIRACLE" (ہم معجزہ دیکھنے کا انتظار نہیں کرتے۔ ہم معجزہ دکھاتے ہیں۔)

اس معجزے کے بعد بھی میں نے مبارکباد کا کوئی خط نہیں لکھا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا، تم کسی بھی لفظی پذیرائی یا مبارکباد کی FORMALITIES سے بلند ہو۔

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام را

پھر تم نے غیر متوقع طور پر چپکے سے ایک دھماکا کر دیا۔ "نئے شاعری نئے نام"... میں اچھل پڑا اور سوچا کہ اب تو تمہیں کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑے گا مگر ان ۲۵ منتخب ناموں میں میرا نام آڑے آگیا اور میرا کچھ لکھنے کا جوش ایک بار پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔ حالانکہ میں یہ لکھنا چاہتا تھا کہ تم نے اردو کے ادبی رسائل میں ایک نئے سلسلے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ ہندوستان میں گو اس قسم کے کچھ کام پہلے بھی ہوئے ہیں... "نئے نام"، "چار دوں اور"، "نئی نظم نئے دستخط" وغیرہ مگر ان کی حیثیت بڑی حد تک مستقل کتابوں کی سی تھی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، "شاعر" جیسے کسی ریگولر ماہانہ رسالے نے پہلی بار اس مکمل انداز میں ایسا کام کیا ہے۔ مکمل انداز سے میری مراد... ایک شاعر کی تخلیقات اس کی تصویر اور مختصر سوانحی کوائف کے علاوہ اس کے فن اور شخصیت سے متعلق چھوٹے چھوٹے تعارفی نوٹس سے بھی ہے۔ اردو کی ادبی صحافت میں یہ ایک نیا مگر قابلِ تقلید قدم ہے۔ یہ خوبصورت سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اس طرح نامحسوس طور پر ایک اور ایسا اہم کام ہو جائے گا، جس کے لئے اب تک متعدد افراد و ادارے اپنی اپنی کوششیں کر کے ہار چکے ہیں یعنی ایک مفصل اور مکمل ادبی ڈائرکٹری کی تدوین، جس کی کمی ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ تمہاری اس سعیٔ مشکور سے یہ کام آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔

یوں تو "شاعر" اپنے معنوی حسن کے لئے مشہور تھا ہی لیکن آفسیٹ پر آنے کے بعد سے اس کے صوری حسن پر بھی نکھار آیا ہے۔ اس پہ مستزاد اس کے "ماتوی تجز" یعنی اپنے مانی بھائی (ناظر نعمان صدیقی) کی حسن کاری... زیر نظر شمارہ اس کی خوبصورت مثال ہے۔

نئے شمارے سے تم نے کتابوں پر تبصرے کا بھی از سرِ نو آغاز کیا ہے۔ یہ بھی ایک نیک شگون ہے۔ تبصرے اگرچہ مختصر ہیں، مگر تمہاری نپی تلی مبسوط تحریر اس اختصار کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ (میرا بھی ایک عرصے سے لائق میں ہے۔ دیکھنا ہے اس کا نمبر کب آتا ہے؟)

۷ عدد شعری مجموعوں پر تمہارے تبصرے اور ۲۵ عدد شاعروں پر تعارفی نوٹس پڑھنے کے بعد یہ اندازہ پختہ ہو جاتا ہے کہ تم جلد ہی ادب کے

سر پر تیغ بے اماں بن کر لٹکنے والے جو سے اب تمہیں نقاد بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

میں اب بھی اسی الجھن میں ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں، تعریف لکھنے کا میں قائل نہیں، تنقید کا تم موقع نہیں دیتے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس بار تم سے ایک چوک ہو ہی گئی چلو! اس کی نشاندہی کر دیتا ہوں۔ "نئی شاعری نئے نام" کے ۲۵ ناموں کے انتخاب میں صرف ایک نام غیر ضروری ہے وہ نام ہے... عبداللہ کمالی!

حسن نعیم ــــــــــــــــــــ سی۔۲۹ شالیمار، نوپنگ نگر، دہسر بمبئی

آپ نے "شاعر" کو عصری ادب کا آئینہ بنانے اور اس کی شکل و صورت کو دلکش بنانے پر جو توجہ صرف کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے، یہ رسالہ پہلے صرف "شاعر" تھا اب آپ نے اسے محقق اور نقاد بھی بنا دیا ہے، مبارک باد!

میری ذاتی رائے ہے کہ آپ محض "آپ سے گزارش ہے کہ..." جیسی اپیل پر اکتفا نہ کیجیے بلکہ رسالے کے فروخت کے جدید طریقوں سے بھی فائدہ اٹھائیے، ایسی کئی اخبار فروش ایجنسیاں ہیں جو مصور یا اچھے گٹ اپ کے ماہناموں کو فروخت کرتی ہیں، اس کے علاوہ اردو کے مقتدر روزناموں میں نئے شماروں کی جھلک دکھایئے ضرور تعدادِ اشاعت میں اضافہ ہوگا! شمارہ نمبر ۱۱ خواتین افسانہ نگاروں کی بہت عمدہ نمائندگی کرتا ہے یوں تو سبھی افسانے تر و تازہ اور "خوب سیرت" ہیں لیکن زاہدہ حنا کا افسانہ "تتلیاں ڈھونڈنے والی" اپنے سیاسی شعور اور حقیقت بینی کے باعث یاد رکھنے کے قابل ہے۔

ڈاکٹر خورشید سمیع کا مضمون نئی افسانوی روایت محنت سے لکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں "رسائلی تنقید" کی سطح سے اوپر نہیں اٹھتا، مضمون ایک مناسب تمہید کے بعد منٹو کے کارناموں کی تفصیل و تعریف سے شروع ہوتا ہے اور محض چند مشاہیر نو کے غیر تنقیدی ذکر کے بعد پھر منٹو کے قصیدے پہ ختم ہو جاتا ہے، ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین سے لے کر عبید قمر تک صاحب مضمون کے جتنے ممدوح ہیں ان میں آخر خامیاں کیا ہیں جو انہیں منٹو بننے سے روکتی ہیں، اور یہ تو چلے کہ انہوں نے کن روایتوں کو افسانوی ادب میں رائج کیا جو اس سے پہلے موجود نہ تھیں۔ ان مشاہیر نو کی وہی تعریفیں اور وہی افسانے زیر بحث آتے ہیں جن کا ذکر رسائل میں آچکا ہے، کیا راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اور غلام عباس وغیرہ کا اس نئی افسانوی روایت سے کوئی رشتہ نہیں؟ اور نہیں تو صاحب مضمون کے پاس اس کا کیا جواز ہے؟ پروفیسر وارث علوی بیدی پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا ایک باب انہوں نے بمبئی یونیورسٹی کے ایک جلسے میں سنایا تھا، انہوں نے گہرے اور عالمانہ تجزیے کے بعد ثابت کیا ہے کہ بیدی اپنے تمام ہم عصروں میں ہی نہیں بلکہ اردو افسانے میں سب سے اونچا مقام رکھتے ہیں، ان سے اختلاف ممکن ہے، لیکن بات تو کسی مقام اور تنقیدی اصول کے مطابق کہی ہے، اور ہاں ہندوستان کے اہم افسانہ نگاروں میں شوکت حیات، احمد یوسف، حسین الحق اور محمد اشرف وغیرہ کا ذکر تک نہیں ہے، کیا نئی افسانوی روایت کی تشکیل میں ان کا کوئی حصہ نہیں؟ اسی شمارے میں کالی داس گپتا رضا کا یگانہ والے شمارے کے تعلق سے ایک نہایت معنی خیز خط چھپا ہے۔ آپ نے بیشک یگانہ اور ترانہ کے بارے میں بہت کام کی باتیں لکھی ہیں اور یگانہ کے پورے کلام کے مطالعہ کے بارے میں کچھ مفید تنقیدی اشارے بھی کئے ہیں، خاص کر یگانہ کی کل کائنات شعر کی جائزہ لینے کی بات اور یہ بھی کہ ان کا ہمارے عہد سے کیا RELEVANCE ہے، اس میں تو کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں میں بطور غزل نگار سب سے قابل مطالعہ اور صرف نگاہ ہیں لیکن کیا ان کے کلام میں وہ شعریت اور آفاقیت جو جنگ و جدال، سے پہلے تھی، باقی رہی تھی؟ اس بات میں مجھے بھی شک ہے، میں انہیں روایتی افکار کا شاعر سمجھتے ہوئے بھی ان کی مکمل شخصیت، تنقیدی نگاہ اور باغیانہ لہجے کو آنے والی غزل کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ بہرحال آپ نے یگانہ پہ اتنا مواد ایک شمارے میں پیش کیا ہے کہ سوائے "تخلیقی ادب" (کراچی) کے کہیں اور پیش نہیں ہوا تھا۔

شمارہ نمبر ۱۲ پڑھ کر جی بے حد خوش ہوا، اس اطلاع سے مزید مسرت ہوئی کہ جو نئے شعراء اس میں شامل نہیں ہو سکے ان کے لئے اسی نوعیت کے ایک دو شمارے اور بھی شائع ہوں گے۔

جن ۲۵ نئے شعراء کی نظمیں اور غزلیں آپ نے شائع کی ہیں وہ سب کے سب اس مدیرانہ سلوک کے مستحق تھے اور ان پر جو تاثراتی تجزیے آپ نے تحریر کئے ہیں وہ ان کی شناخت میں معاون ہوں گے،

ان غزلوں اور نظموں سے نہ صرف ان شعراء کا تعارف ہو جاتا ہے بلکہ کن خطوط پر آج کے ہنرمند سوچ رہے ہیں اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، بہرحال اس شمارے میں شائع شدہ تخلیقات کی بنا پر جن شعراء کے کلام نے مجھے زیادہ متاثر کیا ان میں فاروق شفق، مظفر ایرج، عبدالاحد ساز، منور رانا، جنید صدیقی، شبیر رسول، اسعد بدایونی اور حامد اقبال کے کچھ اشعار یاد رہ گئے،

عنوان چشتی ــــــــــــــــــــ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، جامع ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

رفتار ـــــــ علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

● **بارشِ سنگ**۔ اردو کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو نے "ایوانِ غزل" کے بعد ایک اور ناول "بارشِ سنگ" تخلیق کیا ہے۔ بندھوا مزدوروں کی زندگی پر یہ اردو کا پہلا ناول ہے معیاری اور دلچسپ۔ قیمت ۴۰ روپئے، پتہ اردو مرکز، ۱۷۸-اے، معظم پورہ، حیدرآباد

آمد۔ اردو دنیا کے سب سے مقبول شاعر کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔ پتہ: مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک لکھنؤ [یو پی]

● **صاعقۂ طور**۔ کلیم الدین احمد مرحوم کے باطل تنقیدی نظریات کی تفتیح، تاج پیامی کے قلم سے۔ صفحات: ۲۳۲۔ قیمت: ۴۵ روپئے۔ پتہ: تاج پیامی، دارالادب، مہادیوا محلہ، آرہ (بہار)

● **افکار** (دو ماہی) سرزمینِ بندہ نواز، دیارِ علم و فن گلبرگہ سے دو ماہی ادبی رسالے کا اجراء عمل میں آرہا ہے۔ رسالہ طباعت کے مراحل میں ہے۔ مدیر: محمد ذوالفقار الدین پرواز فی شمارہ دو روپئے پچاس پیسے۔ پتہ: دو ماہی افکار، روضہ بزرگ، گلبرگہ (کرناٹک)

● **پیاسے لوگ**۔ اردو کے جواں سال افسانہ نگار ممتاز شارق کے افسانوں کا اولین مجموعہ طباعت کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ ناشر: تنویر افروز روحانی ادارہ "بزم"، آزاد نگر، جمشید پور

● **لمحے لمحے**۔ بشر بدر اور زبیر رضوی کے بعد "لمحے لمحے" کے شمارہ نمبر ۸ میں "گوشۂ مظہر امام" ملاحظہ کیجئے۔ صفحات ۲۰۰، قیمت فی شمارہ دس روپئے پتہ۔ حبیب سوز، مدیر لمحے لمحے، امام باڑہ، علی پور، بدایوں (یو پی)

● **ٹھنڈی آنچ کا سورج**۔ مغربی بنگال میں اپنی نوعیت کی اولین کتاب "اردو افسانے کا سفر" جو ایک افسانوی انتخاب بھی ہے اور تاریخ بھی اور اس کے بعد اب "ٹھنڈی آنچ کا سورج" جس میں عشرت بیتاب کے ۱۴ نمائندہ اور معیاری افسانے شامل ہیں۔ بہت جلد یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ پتہ: پہچان پبلی کیشنز، معدی محلہ، آسنسول [بہار]

● **اندیشہ** [سہ ماہی] "مناظر عاشق ہرگانوی نمبر"۔ جس میں مناظر عاشق بہ حیثیت ناقد، محقق، افسانہ نگار، شاعر طنز و مزاح نگار، صحافی، بچوں کے ادیب، مترجم، تبصرہ نگار، دیباچہ نگار اور بہ حیثیت مضمون نگار شخصیت اور کارنامے کا بھرپور احاطہ، متعدد تصاویر۔ ایک پُر اعتماد تجزیہ پیش کش۔ مدیران: ارشد رضا، قیصر جمالی۔ رابطہ: سہ ماہی اندیشہ، اردو لائبریری حسین پور، بھاگل پور [بہار]

● **شبنم کے موتی**۔ بچوں کے نوجوان کہانی کار غنی غازی نے بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کا ایک اور مجموعہ پیش کیا ہے جس میں دس چھوٹی چھوٹی کہانیاں شامل ہیں۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت، صفحات ۴۸، قیمت ۶ روپئے۔ پتہ: صبح امید پبلی کیشنز، بلاسس روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

● **نگاہ**۔ معروف شاعر اختر سعید خاں کا نیا شعری مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔ اس میں شامل ۱۰۸ غزلیں اور ۲۸ متفرق اشعار جذبہ و فکر کا نہایت ہی دل پذیر امتزاج لئے ہوئے ہیں جہاں کلاسیکی رچاؤ اپنے عصر کی پوری دھمک بھی لئے ہوئے ہے۔ ایک معیاری شعری مجموعہ جو دیدہ زیب بھی ہے اور خوب سیرت بھی ہے۔ صفحات ۱۶۱۔ قیمت ۲۰ روپئے۔ پتہ: ـ مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی۔ ڈی ۱/۱ پروفیسرز کالونی۔ بھوپال۔

● **دستاویز**۔ سال میں دو بار شائع ہونے والی منتخب تحریروں کا نیا سلسلہ ۴۴۵ صفحات کے ضخیم شمارۂ اولیں میں الف کے تحت ۷ مضامین، فیض پر ۳ مضامین، ج۔ بیدی پر ۲ اور منٹو پر ایک مضمون۔ د۔ دو اہم کتابوں پر مضامین۔ ہ۔ ۷ مضامین عصری ادب پر۔ عالمی ادب کے باب میں الف۔ جدید کی ادب ب۔ پابلو نرودا کا سوانحی خاکہ اور نظموں کے تراجم۔ ۶ شعراء کی ۲۲ نظمیں فکشن کے باب میں الف۔ افسانے اور ایک رپورتاژ، ب۔ ۵ نئے افسانہ نگاروں کے ۶ افسانے۔ غزلوں کے باب میں ۱۲ شعراء کی ۴۱ غزلیں ب ۱۹ نئے شعراء کی ۲۷ غزلیں۔ اس طرح یہ ضخیم شمارہ اپنے مشمولات سے دستاویزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مجلس ادارت: رشید امجد، احمد جاوید، ابرار احمد۔ قیمت ۷۰ روپئے۔ پتہ: اثبات پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۱۴۸۴، راولپنڈی پاکستان

پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکردوار، بمبئی ۲ میں چھپوا کر وہیں سے شائع کیا

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

مقالات

غزلیں

کہانیاں

نظمیں

جرعات

بساطِ سخن

بازیافت

آثارِ لفظ لفظ

چہرہ چہرہ یادیں

بہ صورت گر

رفتار

قاضی فراز احمد

شبیر آصف

سید بشارت علی

منصور اعجاز

محسن رضا رضوی

میناکشی
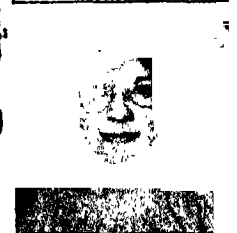
جمیلہ نشاط

اُردو کی اصنافِ شاعری کا زوال

اردو شاعری میں ہیئت کے تجربوں کا ایک سلسلہ غزل سے نثری نظم تک ہے۔ اصناف اور ہیئتوں کی یہ شاندار روایت آج غزل اور آزاد یا نثری نظموں پر ٹھہر گئی، کوئی ادبی یا نیم ادبی رسالہ، معیاری یا غیر معیاری شعری مجموعہ اٹھا لیجئے، غزل یا آزاد اور نثری نظموں کے علاوہ نظم کی کوئی اور صنف یا ہیئت نہیں ملے گی۔ پہلے شعراء غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتے تھے، آج کا شاعر آزاد نظموں یا پھر نثری نظموں سے شاعری کا آغاز کرتا ہے، وہ زیر مشق کلام جو ریاضت، محنت اور توجہ کے بعد صرف اور صرف تلف کر دیے جانے کے قابل ہوتا ہے، اسی کو شعری مجموعہ بنا دیا جاتا ہے، گویا سو، پچاس غزلوں اور اتنی ہی آزاد نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ شاعر ہونے اور شاعر باور کروانے کے لیے کافی ہے، جب تخلیقی اظہار اس قدر محدود ہو جائے تو اسلوب، لفظیات، تکنیک، ہیئت اور تجربے از خود سمٹ جائیں گے۔

شعرائے متقدمین اور متوسطین کے یہاں غزل ایک غالب صنف سخن تھی۔ غزل کی روایت اپنی مخصوص خارجی ساخت یا ہیئت میں نت نئے داخلی تجربوں کی ایک شاندار تاریخ رکھتی ہے، اس کے باوجود ماضی میں دیگر اصناف شاعری پر بھی بھرپور توجہ دی گئی تھی، ہر عہد میں غزل نے اپنے پورے عصر کو جذب کرنے کا سلیقہ دیا ہے، غزل کا اپنا ایک کلچر ہے اور اس کلچر کی تدوین عہد بہ عہد ہوتی رہی ہے لیکن ہمارے مشاہیر شعراء نے اپنے شدت آثار تخلیقی اظہار کو غزل کے علاوہ دیگر اصناف اور شعری ہیئتوں میں سمویا تھا یعنی موضوع و مواد اپنے ساتھ ہیئت بھی لائے، اس طرح تخلیقی عمل کی یہ اکائی ماضی میں بڑی شاعری کے جوہر دکھا چکی ہے۔

بعض اصناف اور ہیئتیں، وقت کے ساتھ یا تو بدل جاتی ہیں یا پھر اپنے وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں جیسے "ریختی" اور "واسوخت" وغیرہ لیکن مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی، شہر آشوب وغیرہ وہ اصناف ہیں جو ماضی میں بے حد مقبول تھیں اور اب بھی بعض شعراء کبھی کبھار ان اصناف کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح آج غزل کا روپ سروپ اپنے لغوی معنیٰ تبدیل کر چکا ہے اسی طرح دوسری اصناف کے موضوع و مواد میں بھی تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے۔ مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور نظم کی دوسری زندہ اصناف کو آج کے تناظر میں دیکھا اور برتا جا سکتا ہے۔ آج کے پُر آشوب دور کو صرف غزل کے حوالے سے نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ آج کے شدت آمیز تخلیقی عمل و اظہار کے لیے متذکرہ اصناف اور ہیئتوں کی ضرورت کل سے زیادہ ہے۔ ماضی میں مشاہیر شعراء نے غزل میں تمام تر امکانات کو تخلیقی جہتیں عطا کرنے کے باوصف دیگر اصناف نظم کو اپنایا اور مختلف ہیئتوں میں بڑی شاعری کی جبکہ آج بڑی شاعری کے امکانات محدود ہو گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اُردو میں اصنافِ سخن اور شعری ہیئتوں کا جو تنوع ہے اور اس میں کیے جانے والے نت نئے تجربوں میں مغربی اور ملکی ہیئتیں بھی شامل ہو گئی ہیں مگر غزل اور نظم معریٰ اور نثری نظموں کے مقابلے میں اب یہ بھی خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

بڑی نظمیہ شاعری کے لیے اظہار کے سانچے بھی بڑے اور مختلف ہوتے ہیں۔ اقبال، چکبست، سیماب، جوش، عظمت اللہ خاں اور فیض وغیرہ کی شاعری کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں موضوع اور مواد کا کینوس بے حد وسیع ہے اور پابند نظمیہ شاعری میں تجربوں کے لیے سیماب، عظمت اللہ خاں اور حفیظ و ساغر وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ پابند نظم نگاری میں تجربے کرنے والوں کی فہرست میں کئی اور نام بھی آتے ہیں۔ آج کے نامور نظم گو شعراء میں سے کتنے نام ہیں جو اس فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں؟ زوال پذیر نظمیہ شاعری میں اصناف اور ہیئتوں کے برتنے والے اب کتنے ہیں۔ آج صنف رباعی کی طرف توجہ تو کی گئی ہے مگر رباعی گو شعراء کی فہرست میں کتنے نام ہیں؟ کیا آج شہر آشوب کی ضرورت نہیں رہی؟ مثنوی کی اہمیت ختم ہو گئی؟ مرثیہ اس عصر کے ساتھ میل نہیں کھاتا؟ گذشتہ نصف صدی میں جن شعراء نے ان اصنافِ شاعری کی طرف توجہ دی، ان کی حوصلہ افزائی کیوں نہیں ہوئی؟ بڑی شاعری کی تنقید کا محور اقبال ہیں لیکن ہمارے تنقید نگار "ذکرِ اقبال" کے تناظر میں معریٰ اور آزاد نظموں پر تنقید لکھتے ہیں، تو کیا اصناف اور ہیئت کے بجائے صرف موضوع و مواد کی اہمیت ہے؟ اردو شاعری کا تشخص غزل سے بنا ہے یا پھر پابند نظمیہ شاعری سے، آج غزل تو ہے لیکن نظم کہاں ہے؟

ولہ

مہ تابان جاتا ہے ہر شب بر آئینہ کو — دیکھتا ہے تو اگر وقت سحر آئینہ کو

یون خجل کرتا ہے وہ رشک قمر آئینہ کو — زشت و خوب جیسے نادم دیکھکر آئینہ کو

عاشقون کا دھیان جو ہے جانتا ہے وہ صنم — شانہ کو تو سینہ چاک اور چشم تر آئینہ کو

یون ہے آئینہ دل کو نہ تو دیوے زنگ — دوست رکھتے ہین جس لیے فتنہ گر آئینہ کو

عکس انکا اب کبھی بھولے سے بھی ہوتا نہین — وہ صنم حیران ہاتا دیکھکر آئینہ کو

دلمین رکھتے ہین کدورت جو کہ ظاہر مین صاف — زنگ مین آلودہ پایا بیشتر آئینہ کو

پہنے بیٹھے ہین وہ جوہر کی اپنے جسم پر — ہے ترے تیر نگہ کا خوف ہر آئینہ کو

گر صفائی دل تجھے منظور ہے کر حبس دم — دم سے ہوتا ہے ارے غافل ضرر آئینہ کو

پڑ گیا گر عکس اوسکے شعلۂ رخسار کا — جا ہی جوہر ہاتھ آئینگے شرر آئینہ کو

دیکھتا ہو نہین فقط آئینۂ رخسار یار — ڈھونڈھتا ہے اک جہان [illegible] آئینہ کو

وہ پری مجنون ہوا ہے اپنی صورت دیکھکر — سنگ طفلان سے بنایا ہے مگر آئینہ کو

پڑ گیا ہے اوسکو اب دیدار جانان کا مزا — خانۂ زندان کیون ہو جا گھر آئینہ کو

توڑ کر زنجیر جوہر لی طلب نے راہ ہند — جبکہ تیرے حسن کی پہنچی خبر آئینہ کو

چشم جوہر سے تری فرقت مین رویا اسقدر — ہو گیا اندھا نہین آتا نظر آئینہ کو

امام بخش ناسخ [پ ۱۷۷۲ء م ۱۸۳۸ء] کے ایک دیوان [اوّل، دوّم یکجائی] "دیوانِ ناسخ" کے ایک صفحے کا عکس۔ مطبوعہ اگست ۱۸۷۲ء مطبع منشی نول کشور۔ دیوانِ اول اور دوم کے صفحات کا نمبر شمار الگ الگ اس ترتیب سے ہے۔ دیوانِ اوّل صفحہ ۱ تا ۱۴۸، دیوانِ دوّم صفحہ ۱ تا ۲۴۴۔

قتیل شفائی

اویس احمد دوراں

وقار واثقی

رفعت سروش

ندا فاضلی

سلطان اختر

جمال قریشی

ارتضیٰ کریم

سردار احمد علیگ

چہرہ چہرہ یادیں

۶ راپریل ۱۹۷۸ء کو فلم ڈویژن [بمبئی] میں لی گئی اس یادگار تصویر میں

دائیں سے بائیں علی سردار جعفری، فیض احمد فیض مرحوم اور سکندر علی وجد مرحوم

بشکریہ فیاض رفعت
آل انڈیا ریڈیو بمبئی

جگر مرادآبادی مرحوم کے اس خط پر کوئی تاریخ اور سنہ درج نہیں ہے اور نہ ہی مکتوب الیہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ پوسٹ آفس کی مہر سے ۶ر جنوری ۱۹۴۴ء ظاہر ہوتا ہے۔ یہ خط گونڈہ سے تحریر کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں ناگپور میں اردو کانفرنس اور مشاعرہ ہوا تھا، مولانا خیر بہوروی اس کے کنوینر تھے لہذا قیاس ہے کہ مکتوب الیہ بھی مولانا خیری ہوں گے۔ جگر مرحوم کے اس خط سے مشاعرے اور منتظمین مشاعرہ کے متعلق ایک معاملات اور رویوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ [بشکریہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ (علیگڑھ)]

انجمن ترقی اُردو (ہند)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

مورخہ............

خیر بہوروی، نمائندہ خصوصی

مقام............

....

نہ بہ نالۂ سحری خوشم نہ بہ آہ نیم شبی خوشم

جگر مرادآبادی مرحوم کی ایک فارسی غزل کا عکس۔ یہ غزل مولانا خیر بہوروی مرحوم [م ۱۷ جولائی ۱۹۷۱ء] کے لیٹر پیڈ پر تحریر کی گئی تھی جس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ مولانا خیر، مولوی عبدالحق کے زمانے سے ۱۹۵۷ء تک انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ رہے تھے۔ یہ عکس تحریر ڈاکٹر محمد انصاراللہ [علی گڑھ] کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

فضا ابن فیضی

ہنر کے اور کچھ امکاں، ہنر میں رکھ آؤں
میں اپنے لفظ، کفِ کوزہ گر میں رکھ آؤں
پڑا ہے سنگ پناہوں سے واسطہ اپنا
یہ آئینہ بھی سکندر کے گھر میں رکھ آؤں
ملی شفق کو بصیرت، اسی حوالے سے
یہ شام، کاسۂ اہلِ سحر میں رکھ آؤں
جبیں سے لپٹی ہوئی دھند منظروں کی ہے
کچھ اور گردِ تماشا، نظر میں رکھ آؤں
یہ دیکھنا ہے وہ سنجیدہ طبع ہے کتنا
خلل دماغوں کا سب اس کے سر میں رکھ آؤں
ملے بدن کی روایت کو اک نظام نیا
چھپا کے خود کو قبا سے ہنر میں رکھ آؤں
خود اس کے سایوں نے یخ بستہ کر دیا ہے اسے
یہ دھوپ دھوپ سا موسم، شجر میں رکھ آؤں
عجب ہے گردشِ حالات، اب یہ سوچا ہے
کوئی پہاڑ تری رہ گذر میں رکھ آؤں
وبالِ دوش ہے اب، رختِ رستخیزیِ جاں
وجود کو بھی عدم کے سفر میں رکھ آؤں
سنائی دے گی ذرا لو بھی خواب کی دستک
میں نیندیں باندھ کے، زنجیرِ در میں رکھ آؤں
اکھڑ رہی ہیں طنابیں، پرانے لفظوں کی
فضاؔ کو خیمۂ حرفِ دگر میں رکھ آؤں

● مئوناتھ بھنجن (یو، پی)

قتیل شفائی

(۱)

پہلے تو مجھے دل کی گرہ کھول کے دیکھو
پھر جھومتے منظر میرے ماحول کے دیکھو

گر ایک بھی دھڑکن کا ملے فرق تو کہنا
تم دل کو مرے دل سے ذرا تول کے دیکھو

بہتر تو مرا دل ہے مگر شہر میں پھر کر
کچھ اور کھلونے بھی اسی مول کے دیکھو

گر جاننا چاہو مری نظروں میں ہو کیا تم
سیماب میں سورج کی کرن گھول کے دیکھو

ہوتے ہیں قتیلؔ اس میں نہ الفاظ نہ آواز
یہ پیار کی بولی بھی ذرا بول کے دیکھو

(۲)

کون کس کے ہاتھ آیا اور کھلونا ہو گیا
چھوڑیئے اس بات کو، جو بھی تھا ہونا ہو گیا

اس کے کوچے کی زمیں جس دن سے میں نے اوڑھ لی
آسماں اس روز سے میرا بچھونا ہو گیا

دیکھ لوں تو دیر تک لیتی ہے چٹخارے نظر
ذائقہ اب اس کے چہرے کا سلونا ہو گیا

شام کے سورج نے جب ترچھی نگاہیں ڈال دیں
اپنے سائے کے مقابل میں تو بونا ہو گیا

میری قیمت صرف پیتل کے برابر تھی قتیلؔ
چھو کے اس پارس بدن کو میں تو سونا ہو گیا

● قتیل شفائی اسٹریٹ - غالب کالونی، سمن آباد - لاہور ۲۵ (پاکستان)

اُردو حُروفِ تہجّی

ڈاکٹر ابو محمّد سحر ● ۳۹ مالویہ نگر، بھوپال - ۴۶۲۰۰۳

لسانیات میں زبان کی شناخت صرف قواعدی ساخت کی بنا پر کی جاتی ہے۔ الفاظ کے سرمائے اور اسالیب بیان کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس طریقے سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ زبان کی نوعیت کیا ہے، اس کا تعلق زبانوں کے کس خاندان سے ہے اور اس میں اور دوسری زبانوں میں اختلاف یا مماثلت کی کیا شکل ہے۔ لیکن خزانۂ الفاظ اور اسالیب بیان وغیرہ کے اعتبار سے زبان کے آغاز و ارتقا کا اگر کوئی تصور اندازہ ہے تو اس کا پورا علم حاصل نہیں ہوتا۔ لسانیاتی مفہوم میں ممکن ہے مختلف زبانوں کے اشتراک سے کوئی نئی زبان نہ بن سکتی ہو لیکن عملی نقطۂ نظر سے زبان کا ایک نیا روپ ضرور پیدا ہو سکتا ہے۔ اُردو کا آغاز و ارتقا چونکہ ایک ایسی ہی صورتِ حال کا نتیجہ ہے اس لیے اس کی شناخت ذخیرۂ الفاظ اور اسالیب بیان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

انگریزی میں ایسی مخلوط زبان کو جس کے ذریعے سے مختلف زبانوں کے لوگ کسی علاقے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں لنگوا فرینکا LINGVA FRANCA کہتے ہیں۔ بحر روم کے مشرقی علاقے لیوانٹ LEVANT میں اطالوی، فرانسیسی، یونانی اور ہسپانوی سے مرکب زبان رائج تھی۔ مشرقی افریقہ میں سواحلی ایک ایسی ہی مرکب زبان ہے۔ اردو اس قسم کی زبان کا ایک نہایت ترقی یافتہ نمونہ ہے۔ انشا نے دریائے لطافت میں اسے "عطر زبان ہائے دیگر" کہا ہے[1] اسے مخلوط زبان ہمیشہ سے مانا جاتا ہے اور بار ہا ہندستانی کی لنگوا فرینکا کہا گیا ہے۔ اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ، اسالیب بیان اور روایات نے جو شکل اختیار کی ہے وہ دنیا کی عام زبانوں سے جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ لسانیات، اُردو کے ہوں یا دوسری زبانوں کے، اکثر اس کی انفرادیت کی پہچان میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے بلکہ بعض تو اسے ایک علاحدہ زبان تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ماضی میں اُردو کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریے رہے ہیں جو ایک ایک کر کے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ اردو اور دوسری زبانوں کے اہل لسانیات اب اس نظریے پر بہت بڑی حد تک متفق ہیں کہ اردو کھڑی بولی سے نکلی ہے بلکہ کھڑی بولی ہی کا ایک ارتقا پذیر روپ ہے۔ فراق گورکھپوری اکثر کہا کرتے تھے "کھڑی بولی کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ روپ اردو میں ملتا ہے"۔ اردو کی انفرادیت اس وقت رونما ہوئی جب کھڑی بولی میں دوسری زبانوں خصوصاً فارسی اور فارسی کے توسط سے عربی الفاظ کی آمیزش ہوئی۔ حالانکہ اس نے اپنے آپ کو فارسی اور عربی الفاظ کے بغیر بھی بنایا اور سنوارا ہے لیکن یہ ہر زمانے میں فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش اور کثرت استعمال سے پہچانی گئی ہے۔ آج بھی اس کی پہچان یہی ہے۔

ذخیرۂ الفاظ کے علاوہ اردو کی دوسری بنیادی پہچان اس کا مروّج رسم الخط ہے۔ اس کی ابتدائی کیفیت کے متعلق حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے:

---

[1] دریائے لطافت از سید انشاء اللہ خاں انشا دہلوی مرتبہ مولوی عبد الحق، انجمن ترقی اردو، طبع اول [الناظر پریس لکھنؤ]، ص ۵۔

"فارسی خط زمانہ قدیم سے ہندی اصوات اور ہندی السنہ کے لکھنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ابتدا میں خط نسخ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے مخصوص تھا۔ چنانچہ پشتو، سندھی اور پنجابی آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں۔ عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں نستعلیق رائج ہو گیا۔ خاص ہندی اصوات کے لیے علیٰحدہ علامات مقرر کی گئی ہیں اور مختلف زبانوں میں مختلف طریقوں سے لکھی جاتی ہیں۔" [1]

اردو اپنے ذخیرۂ الفاظ کی وجہ سے ایک ترکیبی مزاج کی حامل تھی۔ اسی کا کرشمہ تھا کہ اسے ایک ترکیبی رسم الخط بھی خوب راس آیا۔ یہ رسم الخط اپنی اصل کے اعتبار سے عربی ہے لیکن براہِ راست عربی سے نہیں لیا گیا۔ اردو کے لیے اسے ایک ایسے مرحلے پر اپنایا گیا جب یہ فارسی زبان کی ضرورتوں کے مطابق ترمیم اور اضافے سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ اس نے زبانوں کے آریائی اور سامی خاندانوں کے اسی اشتراک پر اکتفا نہیں کیا جو ایران میں ظہور پذیر ہوا تھا بلکہ ہندوستان میں آریائی زبانوں کی تقریباً سبھی آوازوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ حروف تہجی میں پ، چ، ژ اور گ کا اضافہ فارسی میں ہو چکا تھا۔ مزید آوازوں کے لیے تین نئے حروف ٹ، ڈ اور ڑ بڑھائے گئے۔ ہائے مخلوط کی حیثیت سے دو چشمی ہے [ھ] کا استعمال اتنا قدیم نہیں لیکن ایک عرصے سے یہ بھی اردو رسم الخط کا ایک اہم جزو ہے اور ہائیہ آوازیں اس کی مدد سے لکھی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے اردو رسم الخط نہ عربی ہے اور نہ فارسی بلکہ ایک آزادانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے حروف تہجی اتنے جامع اور ترقی یافتہ ہیں کہ ان کا مقابلہ بہت کم زبانوں کے حروف تہجی کر سکتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں:

"ان میں ہر قسم کی آواز کے ادا کرنے کی گنجائش ہے اور اس خیال سے اردو ابجد کو دنیا کی بہت سی زبانوں پر ایک طرح کا تفوق حاصل ہے۔" [2]

اردو حروف تہجی کے ذریعے سے اکثر دوسری زبانوں کے الفاظ کو ان کے حروف کی اصلی آوازوں کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اُن کا جاننے والا جب دوسری زبانیں سیکھتا ہے تو ان زبانوں کے حروف کی ادائیگی میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

اردو کے حروف تہجی اس اعتبار سے بڑے مکمل ہیں کہ انسانی نطق سے نکلنے والی اکثر لسانی آوازیں ان میں مقید ہیں۔ اردو کے اہل زبان میں تلفظ کی درستی جو ایک بڑی خوبی ہے اسی کی بدولت پائی جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی متفقہ طور پر ستائش کی جاتی لیکن اردو ایک عجیب زبان ہے۔ اس کے رسم الخط پر اعتراضات کی بوچھار حروف تہجی ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسے حروف پر جن سے اردو حروف تہجی کی صوتیاتی جامعیت عبارت ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا اعتراض ملاحظہ ہو:

"آج ہم اردو زبان کا صحیح تصور اس وقت تک قائم نہیں کر سکتے جب تک کوئی شخص ز، خ، ف، غ وغیرہ کو صحیح مخرج سے ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ ق کے بارے میں جبیں پر شکنیں پڑ جائیں گی لیکن یہ بھی اسی صف میں آتا ہے۔" [3]

مطلب یہ ہے کہ مذکورہ حروف پر فخر نہ کیجیے کیونکہ اکثر لوگ ان کو ادا نہیں کر سکتے۔ لیکن اردو حروف تہجی پر یہ وار نہ تو منصفانہ ہے اور نہ دیانت دارانہ۔ اسی قبیل کے حروف میں ایک حرف "ق" بھی ہے جس کے لیے دیوناگری رسم الخط میں ایک نہیں دو حرف موجود ہیں۔ اردو میں جب تلفظ کی بات کرتے ہیں تو "ق" کے ساتھ "ش" کو بھی شامل کرتے ہیں اور تلفظ کے درست نہ ہونے کو شین قاف درست نہ ہونا کہتے ہیں

---

[1] پنجاب میں اردو، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص ۲۷۔

[2] قواعد اردو از مولوی عبدالحق، ص ۱۱۔

[3] اردو صوتیات کا خاکہ از ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ۱۹۷۱ء، ص ۳۔

فرہنگ آصفیہ میں "شین قاف درست نہ ہونا" کے ایک معنی "سکہ سر وا بولنا" لکھے ہیں[1] جس سے اردو تلفظ میں "ش" کی اہمیت اور بھی نمایاں ہے۔ یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ بہت سے ہندی داں "ش" کا تلفظ نہیں کر پاتے۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ وہ "ش" کے تلفظ پر قادر نہیں ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہ "ش" کی جگہ "س" اور "س" کی جگہ "ش" بول جاتے ہیں۔ مثلاً شادی کو سادی، سیر [وزن] کو شیر، شبنم کو سبنم، اور ادس کو اوشن کہتے ہیں۔ یہی کیفیت کئی دوسرے حروف میں دیکھنے میں آتی ہے، یعنی یوں نہیں ہے کہ لوگ ان کے تلفظ پر قدرت نہیں رکھتے، بس جہاں جو تلفظ چاہیے وہ نہیں کرتے، آواز ہر حرف کی نکال سکتے ہیں۔ مثلاً تاج محل کے بجائے "تاز محل"، جہاز کے بجائے "زہاج"، نیل کے بجائے "پھیل"، پھول کے بجائے "فول"، انقلاب کے بجائے "انکلاب"، ابوالکلام کے بجائے "ابوالقلام"، جلیل [نام] کے بجائے ذلیل، ذلیل کے بجائے "جلیل"، زمین کے بجائے "جمین" اور جنت کے بجائے "زنت" وغیرہ بولتے ہیں۔ لیکن یہ زبان کو بولنے اور سیکھنے کی ایک سطح ہے۔ انھیں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہندی اور ہندی میں مستعمل دوسری زبانوں کے الفاظ کا تلفظ درستی کے ساتھ کرتے ہیں۔

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا زیادہ مشکل نہیں کہ مذکورہ حروف میں سے اکثر حروف کو ادا کرنے کی قدرت ہندوستانی نطق میں ہے لیکن اردو کو چھوڑ کر دوسری ہندوستانی زبانوں میں ان کے لیے حروف نہ ہونے کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ میں خلفشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ہندی میں "پھر" جیسے معمولی لفظ کو بکثرت "فر" بولتے ہیں، حالانکہ حروف تہجی میں اصلاً ف کے لیے کوئی حرف نہیں ہے۔ گجراتی میں اوجھا [نام] اوزا ہے اور جیم کے بجائے زے کثرت سے بولتے ہیں۔ بعض علاقوں کے شہروں کے نام بھی زے کی آواز کا پتہ دیتے ہیں مثلاً تبز پور، آنزول اور وزیہ نگرم۔ اردو کے جن حروف کو ہندوستانی مزاج کے منافی قرار دیا گیا ہے ان کو احاطۂ تلفظ اور ضبط تحریر میں لانے کے لیے خود دیوناگری میں نقطے لگا کر حرفوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جن حروف کی گنجائش دیوناگری رسم الخط میں نکالی گئی ہے ان کی بنا پر اہل اردو کو کسی الجھن یا شرمندگی میں مبتلا کیا جائے۔

یہ ہمیشہ سے معلوم ہے کہ اہل پنجاب عام طور پر قاف کا تلفظ نہیں کر پاتے اور اس جگہ کاف بولتے ہیں۔ دکن میں قاف اور کاف دونوں خے میں بدل جاتے ہیں۔ بعض علاقوں میں ایک دو اور حرفوں کی ادائیگی میں دشواری پائی جاتی ہے۔[2] اس کے باوجود یہ باتیں نئی نہیں اور ماضی میں مختلف علاقوں میں اردو کی تعلیم اور علمی و ادبی ترقی میں مانع نہیں ہوئی ہیں، اہل لسانیات انھیں بہت نمایاں کرتے ہیں۔ انتہا یہ کہ اردو حروف تہجی کے صوتیاتی تجزیے میں ان کے یہاں علاقائی اختلافات، اردو بولنے والوں کی "اکثریت" کا تلفظ اور، کم سے کم ایک حرف کے سلسلے میں، الفاظ کی قلت کا خیال در آتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو حروف تہجی کی صوتیاتی جدول میں قاف اور ژے کو مشکل سے جگہ دی ہے۔[3] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس ادراک کے باوجود کہ ق اور ک "مخرج کے اعتبار سے دو مختلف اصوات ہیں" ق کے متعلق کسی قدر مجبوری سے لکھا ہے:

"اُسے اردو کی بنیادی آواز یعنی فونیم تسلیم کرنا پڑے گا۔"

ان کی تحریر سے ق کے بارے میں بعض دوسرے اہل لسانیات کی یہ رائے معلوم ہوتی ہے:

"...بعض ماہرین لسانیات ق اور ک کو ایک فونیم تسلیم کرتے ہیں ۔۔۔۔ اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد چونکہ ق کے تلفظ پر قادر نہیں اور اسے غشائی ک میں بدل دیتی ہے، اس سے ق کو ک

---

[1] فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، ص ۲۰۴

[2] بعض حروف کے تلفظ میں علاقائی اختلاف یا معذوری کے لیے دیکھیے اردو میں دخیل آوازیں از ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق ص ۳۶، اور اردو رسم الخط اور اس کے تعلیمی مسائل ادب اور لسانیات از ڈاکٹر ایس۔ اے۔ صدیقی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۹۰۔

[3] دیکھیے اردو حروف تہجی کی صوتیاتی ترتیب۔ اردو زبان اور ادب از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ۱۹۷۴ء، ص ۱۷۵، ۱۷۶۔

کی ذیلی صوت ماننے پر زور دیا جاتا ہے۔" [1]

ژ کا انھوں نے بالکل صفایا کر دیا ہے:

"ژ کی آواز اپنی اصل شکل میں اردو میں مستعمل فقط چند الفاظ میں ملتی ہے مثلاً مژدہ، ژالہ، ژرف، پژمردہ، مژہ، مژگاں، ژولیدہ ۔۔۔۔ اردو میں اکثر و بیشتر اسے ز سے بدل کر بولا جاتا ہے اور چونکہ ایسا کرنے سے معنی کا فرق لازم نہیں آتا ژ کو اردو کی فونیم یعنی بنیادی آواز تسلیم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔" [2]

اہل لسانیات اور بعض دوسرے حضرات کے اس طرز فکر کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ٹھیٹھ اردو یا ہندی کی آوازوں کو تو اردو کی آوازیں مانتے ہیں لیکن اردو کے عربی الاصل اور فارسی نژاد حروف کو دخیل آوازیں سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ فارسی اور عربی الفاظ کو دخیل الفاظ کہتے ہیں اور اردو، فارسی اور عربی الفاظ کو الگ الگ قاعدوں سے دیکھتے ہیں۔ دخیل الفاظ اور آوازوں کا یہ تصور ان زبانوں کے لیے موزوں ہے جن میں دوسری زبانوں کے تھوڑے سے الفاظ ہیں اور معدودے چند آوازیں ملتی ہیں۔ لیکن اردو میں ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح آوازیں بھی زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ الفاظ اور آوازیں ابتدائے آفرینش سے اس میں داخل ہیں۔ اس لیے ان میں اصل اور دخیل الفاظ اور آوازوں کا فرق درست نہیں۔ یہ سب الفاظ اور آوازیں ہیں اور ہندستانی ہیں کیونکہ اردو کی ابتدا اور نشو و نما انھیں الفاظ اور حروف کے ساتھ اسی سرزمین پر ہوئی ہے۔ ان کے لسانی ماخذ کا مطالعہ مقصود ہو تو اور بات ہے ورنہ ان میں اردو اور غیر اردو، مقامی اور غیر مقامی یا دیسی اور بدیسی کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ اس طرز فکر کا دوسرا بڑا سبب اہل زبان کو نظر انداز کرنے کا رجحان ہے۔ زبان کی آوازوں کے تجزیے میں اس رجحان کو داخل کر کے اردو کے ساتھ اچھی خاصی زبردستی کی جا رہی ہے اور اس کا بوجھ مزید زیادتی کے ساتھ حروف تہجی پر ڈالا جا رہا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کی مثال لی جائے، اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ جن حروف کے تلفظ پر اہل زبان قادر نہیں ان کو نہ تو حروف تہجی سے خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ مشتبہ نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

کسی زبان کے حروف کے بارے میں یہ سمجھنا کہ ان کو اپنے ملک کے مختلف علاقوں یا دوسرے ممالک کے لوگ ہمیشہ اہل زبان کی طرح ادا کر سکتے ہیں درست نہیں۔ آب و ہوا وغیرہ کا اثر انسان کی ساخت پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے مختلف علاقوں اور دوسرے ملکوں میں رہنے والے ہر آواز کی ادائیگی پر قدرت نہیں رکھتے۔ خاص طور سے کسی علاقے یا ملک کی مادری زبان میں کوئی آواز نہیں ہوتی یا اس آواز کے لیے حرف نہیں ہوتا تو اس کی ادائیگی اس علاقے اور ملک کے لوگوں کے لیے ناممکن یا دشوار ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اہل زبان کو دوسرے علاقوں یا ملکوں کے لوگوں کے تلفظ کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا پڑتا ہے۔ انگریزی کے ہر حرف کی آواز ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے۔ چین، جاپان، ایران اور عرب ممالک کے باشندے انگریزی حرف ٹی (T) کو ادا نہیں کر سکتے اور اس کی جگہ "تی" بولتے ہیں۔ کئی ملکوں کے انگریزی دانوں میں ڈی (D) کے سلسلے میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ دور کیوں جائیے، کیا ہندوستان میں غیر ہندی علاقوں کے لوگ ہندی کے ہر حرف کی ادائیگی پر قادر ہیں؟ تلفظ کے دیگر اختلافات سے قطع نظر، بنگال میں سَ (स) شَ (ष ، श) سے اور زَ (ज) وغیرہ [ہندی میں اس کے لیے کوئی مفرد حرف نہیں ہے] سے بدل جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کی زبانوں میں تَ (त) کے لیے کوئی حرف نہیں ہے۔ عام طور پر ٹَ (ट) بولتے ہیں۔ تامل میں ہائیہ آوازوں کے لیے حروف نہیں ہیں۔ ان کا تلفظ غیر ہائیہ حروف کی طرح کیا جاتا ہے۔ اس طرح مختلف علاقوں میں ہندی کے کئی حروف کی

---

[1] اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ طبع دوم، ۱۹۶۲ء، ص ۳۶، ۳۷۔

[2] ایضاً، ص ۴۲۔

ادائیگی یا تو ہو ہی نہیں پاتی یا بہت دقت طلب ہوتی ہے۔ خود ہندی کے علاقوں میں مقامی بولیوں کے زیر اثر چند حروف کا تلفظ صحیح اور یکساں طور پر نہیں کیا جاتا۔ ش (ष ، श) کی ادائیگی میں دشواری عام ہے۔ ड़ اور ण کو عموماً ن (न) کی طرح ادا کرتے ہیں۔ ب (ब)، اور و (व)، اور ج (ज) اور ی (य) کا ادلا بدلا ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگوں کے لیے ہندی کے کئی حروف کو ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ان وجوہ سے انگریزی یا ہندی کے حروف تہجی میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی اور نہ اس طرح کی ترمیم قرین قیاس اور قابلِ عمل خیال کی جا سکتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ کسی زبان کو ایک ہی ملک کے مختلف علاقوں اور دوسرے ملکوں کے لوگ اہل زبان کی طرح ٹھیک ٹھیک نہیں بول سکتے تو نہ بولیں لیکن اس کا لکھنا اہل زبان ہی کی طرح سیکھنا پڑتا ہے اور اس طرح حروف تہجی اپنی اصلی حالت میں برقرار رہتے ہیں۔

بعض علاقوں میں جب لوگوں کی مادری زبانیں بولی کی سطح سے اوپر نہیں اٹھتیں یا کم ترقی یافتہ ہوتی ہیں تو لوگ کسی دوسری زبان کو بھی بمنزلہ مادری زبان یا اپنے شوق کی دوسری زبان کی حیثیت سے اختیار کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی لسانی یا تہذیبی مناسبت کی وجہ سے بھی ترقی یافتہ مادری زبان کے علاقے میں کوئی دوسری زبان اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ آزادی سے قبل کے پنجاب میں پنجابی اور اردو کی یہی کیفیت تھی۔ پنجابی میں قاف کی آواز نہیں ہے۔ اہل پنجاب اس کی جگہ عموماً کاف بولتے ہیں۔ کچھ لوگ کوشش سے یا اس کے بغیر قاف کا تلفظ کر لیتے ہیں لیکن انھیں مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ رشید احمد صدیقی کو علامہ اقبال کی زبان سے قاف کے بجائے کاف سن کر کچھ دھکا سا لگا تھا لیکن یہ ردِ عمل جذباتی بھی تھا اور وقتی بھی۔ رشید احمد صدیقی نے خود ہی لکھا ہے:

> "اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر جو اثر
> جس درجہ ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ
> ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ، بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا گو منتظر
> نہ تھا۔" [۱]

کچھ اصحاب علامہ کی حجازیت اور اردو فارسی شاعری کی حیثیت سے ان کی عظمت کا یہ کہہ کر مذاق اڑاتے سنے گئے ہیں کہ وہ حقّہ کو حکّہ کہتے تھے اور خود اپنا نام صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں لے سکتے تھے۔ ان کے کلام کی مشکلات اور تلفظ کے انداز کی وجہ سے ان کے مصرع کی یہ تحریف کہ "اک بال بھی اکبال سے آگاہ نہیں ہے" اس کی ایک پرانی مثال ہے۔ لیکن اسے معمولی ہنسی مذاق سے زیادہ کبھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اسے اقبال کی شاعری کے صوتی آہنگ کے مطالعے میں داخل کیا ہے۔ ایک غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سات شعر کی اس مختصر سی غزل میں ق تیرہ بار آیا ہے اور چونکہ خاتمے پر زیادہ تر ہے،
> اس لیے اہل زبان تک کے حلق میں ادائیگی کے وقت گرہ پڑ جاتی ہے۔" [۲]

علامہ اقبال جو قاف کا تلفظ نہیں کر سکتے تھے سات شعروں میں تیرہ بار اس کے الفاظ نظم کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر مسعود حسین خاں

---

[۱] گنج ہائے گراں مایہ از رشید احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

[۲] اقبال کی نظری اور عملی شعریات از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ۱۹۸۳ء، ص ۷۸۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اقبال کے کلام میں بھ، دھ اور گھ کے الفاظ کے تجزیے کی بنیاد بھی اس پر رکھی ہے کہ یہ آوازیں پنجابی زبان میں نہیں ہیں۔ اقبال ان آوازوں کو بھی نہ سن سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے۔ لیکن گورمکھی کے قاعدے میں بھ، دھ اور گھ ہیں۔ ان کو ببّا دھدّا اور گھگّا کہتے ہیں۔ چونکہ پنجابی میں دوسرے ہائیے موجود ہیں اس لیے بھ، دھ اور گھ کا تلفظ زیادہ دشوار نہیں۔ اس کا کوئی ثبوت یا روایت بھی نہیں کہ اقبال ان آوازوں کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ اس غزل کو پڑھنے میں اہلِ زبان تک کے حلق میں ادائیگی کے وقت گرہ پڑجاتی ہے"۔ یہ اہلِ زبان پر محض ایک اتہام ہے۔ انشا کے ایک قصیدے [اے خداوندِ مہر و ثریا و شفق] میں قافیوں میں قاف کے الفاظ چوالیس مرتبہ اور دوسرے موقعوں پر چھتیس مرتبہ آئے ہیں۔ اقبال کی غزل کے وزن اور قافیوں میں جوش ملیح آبادی کی بارہ شعروں کی ایک نظم "دعائے سحری" ہے اس میں بارہ مرتبہ قافیوں میں اور چھ مرتبہ دوسرے موقعوں پر قاف کے الفاظ آئے ہیں۔ بارہا پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ حلق میں کوئی گرہ ورہ نہیں پڑتی۔

قاف کے تلفظ کے سلسلے میں اقبال کی معذوری ان کے اردو سیکھنے اور اردو کا عظیم شاعر بننے اور تسلیم کیے جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں بنی۔ اردو کے سیکڑوں ادیبوں، شاعروں، عالموں، صحافیوں اور زباں دانوں وغیرہ کا تعلق پنجاب سے ہے۔ یہ علاقہ اردو کی تعلیم، علم و ادب کی ترقی، صحافت کی گرم بازاری اور عام ترویج و اشاعت کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ محض قاف کا تلفظ اس کے راستے میں مزاحم نہیں ہوا دراصل اس طرح کے اختلافات کسی زبان کی ترقی میں رکاوٹ بنتے بھی نہیں ہیں۔ اردو کے حروفِ تہجی صوتیاتی اعتبار سے بڑے ہمہ گیر ہیں۔ ان کی اس خصوصیت کی دل سے قدر کرنا چاہیے اور اسے محفوظ رکھنا چاہیے۔

اردو حروفِ تہجی کا ایک اور مسئلہ جس کا تعلق بھی صوتیاتی پہلو سے ہے دو چشمی ہے [ھ] کے اشتراک سے لکھے جانے والے دو حرفوں، [بھ، دھ، گھ وغیرہ] کو منفرد حروف ماننے اور ان کو حروفِ تہجی میں داخل کرنے کا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ بھی خواہ مخواہ پیدا کیا گیا ہے اور بعض اہلِ اردو کی بے اصولی اور ضعیف الاعتقادی کا مظہر ہے۔ صوتیاتی اعتبار سے ہائیہ آوازیں منفرد ہیں لیکن اردو میں ان کی تحریری علامت دو حروف کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان تحریری علامتوں کو نہ منفرد حروف کہا جا سکتا ہے اور نہ حروفِ تہجی میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ ان مخصوص عربی حروف کا ہے جو اردو تلفظ میں واضح آوازیں نہیں رکھتے۔ یہ حروف ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ع ہیں۔ جب ایسے حروف کے بارے میں شکوک پیدا کیے گئے ہیں جو صوتیاتی اعتبار سے منفرد ہیں تو ہم صوت حروف کی لعنت و ملامت میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ ایک تو عربی الاصل دوسرے ہم صوت، کریلا اور نیم چڑھا۔ بعض لوگوں کے کام و دہن میں کڑواہٹ کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ مجموعی حیثیت سے ان حروف کو ترک نہ کرنے کا تعلق عربی و اردو کا لسانی رشتہ ثابت یا قائم رکھنے یا اہلِ اردو کی دقیانوسیت وغیرہ سے نہیں بلکہ عملی پہلوؤں سے ہے۔ ماضی کے ناکام تجربات کے باوجود ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، کی املا کمیٹی [۱۹۷۴ء] نے ان پہلوؤں کو نہ معلوم کیوں پس پشت ڈال دیا اور غالباً انھیں لوگوں کی تسلی کے لیے جو عربی سے اردو کا رشتہ ثابت رکھنا چاہتے ہیں اصلاحِ املا کے رہنما اصولوں میں یہ "اصول" سامنے رکھا۔

> "اردو کے ہم آواز حروف اردو کی لسانی میراث کا جز بن چکے ہیں۔ انھیں کی بدولت ہزاروں الفاظ کی بیش بہا دولت ہمیں ودیعت ہوئی ہے جو ہماری زبان کا جزو لاینفک ہے۔"[1]

اوّل تو یہی غور طلب ہے کہ ہم آواز حروف کی بدولت الفاظ آئے ہیں یا الفاظ کی بدولت ہم آواز حروف، دوم یہ اندراج اصول کے بجائے محض ایک بیان معلوم ہوتا ہے جس سے املا کے تعلق سے کوئی قطعی بات نہیں نکلتی۔ ان حروف کے ترک کرنے سے املا میں تبدیلی ہو گی لیکن زبان سے وہ عربی الفاظ خارج نہ ہوں گے جن میں یہ حروف آئے ہیں۔ اس لیے لسانی میراث یا موجودہ لسانی سرمائے کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اصل سوال ہمیشہ سے یہی ہے کہ ان حروف کو ترک کر کے اردو املا کے ماضی و حال میں تسلسل یا مناسبت کیونکر باقی رہ سکے گی اور اس ترمیم پر ہر شخص اور ہر ادارے کے عمل کرنے کی ضمانت کس طرح حاصل ہو گی۔ اگر ان حروف کے برقرار رکھنے پر ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کو یقینِ کامل تھا تو اصلاحِ املا کے رہنما اصولوں میں اس اندراج کی ضرورت نہ تھی کسی وجہ سے ان حروف کا ذکر کرنا ہی تھا تو صاف صاف کہنا چاہیے تھا کہ ان کو ترک کرنا ناقابلِ عمل ہے۔

لاعلمی اور سہو و نسیان تقاضائے بشریت ہیں۔ ہم صوت حروف یا دوسری مقررہ تحریری علامتوں کی وجہ سے املا کی غلطیاں صرف اہلِ اردو سے نہیں بلکہ ہر زبان کے لکھنے والوں سے ہوتی ہیں۔ اردو میں ہم صوت حروف کی تخفیف کے مطالبے کو تسلیم کر لیا جائے تو اس

---

[1] املا نامہ [سفارشات املا کمیٹی، ترقی اردو بورڈ] مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مئی ۱۹۷۴ء، مقدمہ، ص ۲۶۔

طرح کے اور مطالبے بھی کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے صحیح لکھا ہے۔

"اگر ث، س، ص میں تخفیف بعض لوگوں کی دشواری کے خیال سے کی گئی تو تخفیف کا ایک
سلسلہ لا متناہی شروع ہو جائے گا۔ تخفیف مسئلے کا حل نہیں ہے۔" [1]

مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ جن الفاظ میں یہ حروف آتے ہیں ان کے املا کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ ایسے مروّج الفاظ کی تعداد اگر کم نہیں تو بہت زیادہ بھی نہیں۔ ان کے املا کو ذہن نشین کیا اور کرایا جا سکتا ہے۔ جو اردو داں کسی تعداد غیر مروّج یا زیادہ مشکل عربی و فارسی الفاظ استعمال کرتے ہیں یا کرنا چاہیں گے وہ خود ہی ان کو صحیح حروف کے ساتھ لکھنے کی لیاقت بہم پہنچائیں گے۔

ان حروف کو غیر ملکی کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن یہ برصغیر کی بعض دوسری زبانوں کے رسم الخط میں بھی ہیں۔ دنیا کے اکثر رسم الخط کسی ملک یا علاقے میں محدود ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر رسم الخط اپنے ملک یا علاقے میں بندی رہے۔ متعدد رسم الخط دوسرے علاقوں اور ملکوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں یا ان کے لیے مانوس عناصر رکھتے ہیں۔ اردو رسم الخط اگر اپنے ملکی کردار کے ساتھ بین الاقوامی عناصر رکھتا ہے تو یہ اس کی ایک خوبی ہے۔ رہ گئی محدود وطن پرستی اور تعصب تو اس کے جواب میں سچی وطن دوستی اور وسیع النظری کا پیغام دینا چاہیے۔

اردو حروف تہجی کی ترتیب بڑی حد تک صوری ہے۔ اگر ہم شکل حروف ایک ساتھ رکھ دیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی ترتیب میں صوتی مناسبت بھی ہے لیکن یہ جدید صوتیات کے اصول پر پوری نہیں اترتی۔ دوسری زبانوں کے حروف تہجی کی ترتیب بھی صوتیات کے مطابق نہیں ہے۔ بات یہاں تک رہتی تو شاید اردو کو معاف کر دیا جاتا لیکن سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اردو حروف کی ترتیب دیوناگری حروف کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ چونکہ بعض اہل لسانیات کی رائے میں اردو کی ہر وہ خصوصیت جو ہندی کے مطابق نہیں ہے ناقابل معافی ہے اس لیے اردو حروف تہجی کی ترتیب پر بھی اسی زاویے سے اعتراض کیا گیا ہے:

"مسلمانوں کے داخلہ ہند کے فوراً بعد سے یہ مسئلہ ماہرین زبان کے سامنے رہا ہے کہ عربی
رسم الخط کو جس کا ایرانی جامہ تیار ہو چکا تھا ہندوستانی زبانوں کے گوں کا کس طرح بنایا جائے
اردو حروف تہجی کا صوری انداز صوتیاتی نقطۂ نظر سے ناقابل معافی ہے۔ اگر انھوں نے ذرا
بھی کاوش ذہنی سے کام لے کر دیوناگری [ہندی] رسم الخط کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو عربی رسم الخط
کی کورانہ تقلید سے باز رہتے۔" [2]

اردو رسم الخط کی داغ بیل ڈالنے والوں نے ضرورت کے مطابق اسی رسم الخط میں چند حروف کا اضافہ کیا تھا جس سے وہ واقف تھے۔ بقول سید احتشام حسین:

"ہندوستانی رسم خطوں میں سے کوئی رسم خط اختیار نہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہاں اس
وقت کوئی معیاری اور عام رسم خط مستعمل نہ تھا، جو تھے بھی ان میں بہت سی وہ صوتی علامتیں
موجود نہ تھیں جو اردو زبان کی تشکیل میں شامل ہو چکی تھیں۔" [3]

جو صوتی علامتیں اس رسم الخط میں نہ تھیں ان کا انھوں نے اضافہ کیا۔ یہ اضافہ بڑا معنی خیز تھا۔ اگر وہ عربی رسم الخط کی کورانہ تقلید کرتے تو ان حروف کا اضافہ نہ کرتے۔ [عربی حروف تہجی میں آج تک کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ دوسری زبانوں کی ان آوازوں سے جو عربی میں نہیں ہیں عربوں کا برابر سابقہ پڑتا رہا ہے]۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا عربی حروف تہجی کی ترتیب اصلاح کے مرحلے سے گذر چکی تھی اور وقت کی کسوٹی پر کھری اتری تھی۔ اس میں رد و بدل کرنا ان کا منشا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے فارسی میں جب نئے حروف

---

[2] اُردو حروف تہجی کی صوتیاتی ترتیب۔ اردو زبان اور ادب از ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ۱۹۷۴ء، ص ۱۷۰۔
[3] اردو رسم خط چند خیالات از سید احتشام حسین۔ شب خون، الہ آباد ۵۴، اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۱۔
[1] اردو کے حروف تہجی از ڈاکٹر محمد انصار اللہ، ۱۹۷۲ء، ص ۴۹۔

کا اضافہ کیا گیا تھا تو ترتیب نہیں بدلی گئی تھی ۔ صوری انداز ترتیب کو ناقابل معافی کہنا سراسر زیادتی ہے ۔ رہ گیا ذرا بھی کاوش ذہنی سے کام نہ لینے کا خیال تو اگر انھوں نے بعض اہل لسانیات کی طرح اس وقت ہندی رسم الخط اور زبان کی خوبیوں کو سمجھ لیا ہوتا تو اردو وجود ہی میں کیوں آتی ۔

آریائی اور سامی، دنیا کی زبانوں کے دو بڑے خاندان ہیں ۔ حروف تہجی کی ایجاد سامی خاندان کی ایک شاخ یعنی آرامی زبان میں ہوئی ۔ عربی رسم الخط خط نبطی کے توسط سے آرامی خط سے ماخوذ ہے ۔ آریائی خاندان کی اکثر زبانوں کے رسم الخطوں کی تشکیل بھی آرامی خط کے زیر اثر ہوئی ہے ۔ ہندوستان کے قدیم رسم الخط براہمی کے بارے میں اگرچہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں آزادانہ طور پر وجود میں آیا تھا لیکن زیادہ قابل قبول خیال یہ ہے کہ خروشتی کی طرح براہمی خط کا سرچشمہ بھی آرامی خط ہے ۔ خروشتی خط آرامی کی طرح داہنی طرف سے بائیں طرف کو لکھا جاتا تھا ۔ یہ صرف خط تھا کوئی زبان نہیں اور غالباً براہمی کی مدد سے تکمیل کو پہنچا تھا ۔ ناگری رسم الخط براہمی سے نکلا ہے ۔ دیوناگری کا نام اٹھارویں صدی میں دیا گیا چنانچہ دیوناگری کا سلسلہ بھی آرامی خط سے ملتا ہے[1] اردو اور عربی رسم الخط کا تعلق زیادہ قریبی اور واضح ہے لیکن دیوناگری رسم الخط بھی کسی نہ کسی شکل میں سامی خاندان السنہ کا رہین منت ہے ۔

عربی حروف تہجی کا صوری انداز ترتیب کچھ ایسا عجیب وغریب یا ناقص نہیں ہے ۔ یہ صوتیاتی انداز ترتیب کی مشکلات کے تجربے کے بعد وجود میں آیا تھا ۔ ابتدا میں عربی حروف تہجی کی ترتیب آرامی ابجد یعنی ابجد ہوز، حطی، کلمن، سعفص اور قرشت کے مطابق تھی ۔ ان میں ثخذ اور ضظغ کا اضافہ کیا گیا ۔ یہ ترتیب نہ صوری تھی اور نہ صوتیاتی ۔ خلیل بن احمد نے ان کو حلقی [صوتیاتی] انداز پر ترتیب دیا لیکن اس سے دشواریاں دور نہیں ہوئیں خصوصاً حروف کے یاد رکھنے میں آسانی نہیں ہوئی ۔ بالآخر ابن مقلہ نے حروف تہجی کو صوری انداز سے ترتیب دیا اور یہ ترتیب جو ترتیب ابتث کہلاتی ہے اس قدر مقبول ہوئی کہ ابجدی اور حلقی ترتیبیں ختم ہو گئیں[2] اس سے ظاہر ہے کہ صوری انداز ترتیب کا سیکھنا زیادہ آسان ہے ۔ اس کے علاوہ ترتیب ابتث مجموعی حیثیت سے صوری ہے لیکن تمام تر صوری نہیں مثلاً الف کی شکل طا اور ظا سے اور واؤ کی شکل دال اور ذال سے ملتی جلتی ہے لیکن ان کی ترتیب مختلف ہے ۔ اس میں صوری انداز ترتیب کے ساتھ ساتھ ایک عام مفہوم میں صوتی پہلو کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے ۔

حروف تہجی کے ناموں میں الگ الگ صوتی حسن ہے تو چھوٹے بڑے گروہوں میں ان کی ترتیب میں ایک باہمی صوتی مناسبت ہے ۔ ان خصوصیات کی وجہ سے ان حروف کے زبانوں پر چڑھنے اور ترتیب وار یاد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے ۔ چونکہ فارسی اور اردو میں حروف کا اضافہ اسی انداز سے کیا گیا ہے اس لیے یہ خصوصیات اردو حروف تہجی میں پائی جاتی ہیں ۔ حروف تہجی کی ترتیب کے مجموعی صوری انداز کی وجہ سے ان کا سیکھنا اور باہمی صوتی آہنگ کی وجہ سے ان کو ترتیب وار یاد رکھنا بہت آسان ہے ۔ دیوناگری حروف تہجی میں حلقی ترتیب اور تمام تر حلقی تلفظ کی وجہ سے بڑی دشواری ہوتی ہے ۔

جس طرح اردو کے حروف تہجی صوتیاتی اعتبار سے جامع ہیں اسی طرح ان کی ترتیب بھی ایک خاص درجہ تکمیل پر فائز ہے ۔ ان کی ترتیب میں ردوبدل ان کے سیکھنے اور یاد کرنے میں دشواری کا باعث ہو سکتا ہے ۔ اس سے تبدیلی سے قبل کے لغات سے استفادہ بھی مشکل ہو جائے گا ۔ سید محمد سلیم نے اردو رسم الخط کی نمایاں خصوصیات اور نشوونما کو ایک حد تک مثبت انداز میں بیان کیا ہے لیکن جیسا کہ اس موضوع پر لکھنے میں ایک رواج سا ہو گیا ہے کچھ اصلاحیں بھی تجویز کی ہیں ۔ یا تو ایک طرف بعض لوگوں کو صوری ترتیب پر سخت اعتراض ہے یا دوسری طرف انھوں نے حروف کو تمام تر صوری انداز سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اس میں ان کو ن، ی، ل اور ق کی شکلوں میں تبدیلی بھی تجویز کرنا پڑی ہے ان کی تجویز حسب ذیل ہے :

---

[1] دیکھیے تاریخ خط و نوشتہ ہائے کہن افغانستان از پوہاند عبدالحئی حبیبی، کابل، ۱۹۷۱ء، ص ۱۲، ۲۱، ۹۱، اور ۸۳، اور اردو رسم الخط از سید محمد سلیم، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۵، ۱۶ ۔

[2] اردو رسم الخط از سید محمد سلیم، ص ۲۵، ۹۱، ۹۲

"ا ط ظ ب پ ث ت ٹ ٹ ف ث، ی ے ے ا ل ک گ، د ڈ ذ، ر ز ژ ڑ
ج چ ح خ، س ش ص ض، ع غ، م ہ ھ ء" [1]

یہ تجویز صوری ترتیب کو اس کے منطقی نتیجے تک پہنچانے اور عملی پہلوؤں کو نظر انداز کر دینے کا نمونہ ہے۔ اس میں موجودہ ترتیب کے حروف کا باہمی صوتی آہنگ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اس کارروائی سے پڑھنا اور یاد رکھنا دونوں بہت مشکل ہیں۔ ن، ق اور ل کی ترمیم شدہ شکلیں بھی غیر واضح ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے بعض حالتوں میں دوسرے حروف سے التباس یقینی ہے۔

اردو حروف تہجی اپنی قائم صورتوں میں نہایت صاف اور سادہ ہیں۔ ان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ اس لیے ان کو پہچاننا اور لکھنا بہت آسان ہے ملواں شکل میں ان میں سے اکثر اپنی شکل بدلتے ہیں اور مختلف قسم کے جوڑ قبول کرتے ہیں جس سے بعض دوسرے رسم الخطوں کی طرح کچھ دشواری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی ان کی شکلیں پیچیدہ نہیں ہوتیں اور جگہ تو اس سے بھی کم لیتی ہیں جتنی مفرد حروف لیتے ہیں۔ اس کو اردو رسم الخط کے معترضین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جگہ کم لیتا ہے اور جلد لکھا جاتا ہے۔ ملواں شکل میں اکثر حروف کا سرا یا درمیانی حصہ مختصر کر کے لکھا جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا حرف لکھا جاتا ہے۔ کوئی حرف صوتی اعتبار سے نصف نہیں لکھا جاتا اور نہ کوئی حرف دوسرے حرف کے نیچے پورا یا آدھا جوڑا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی حرف صحیح کے متبادل کے طور پر کوئی نشان یا خط نہیں لگایا جاتا۔ ان امور کی وجہ سے دیوناگری رسم الخط میں جو مخصوص دشواریاں پائی جاتی ہیں ان سے اردو رسم الخط محفوظ ہے۔

بعض حضرات نے اردو حروف تہجی پر اعتراضات کو بڑھاوا دینے میں ذرا جارحانہ رنگ اختیار کر لیا ہے ورنہ انگریزوں اور دیوناگری رسم الخط کے پرستاروں کے زیر اثر ماضی میں بھی کچھ اہل اردو نے دبے الفاظ میں اعتراضات کیے ہیں۔ اس قسم کا ایک اعتراض حروف تہجی کے ناموں سے متعلق ہے۔ سید احمد دہلوی جو فیلن کے لغت کی ترتیب میں مددگار رہ چکے تھے فرہنگ آصفیہ میں الف کے ذیل میں ایک حاشیے میں لکھتے ہیں :

> "اردو زبان کے لکھنے پڑھنے میں جو الف آتا ہے وہ عربی، فارسی، ہندی سب سے مشترک ہے۔ ہماری رائے میں اس کی آواز اس کے نام سے علاحدہ ہے۔ اس سبب سے نو آموز طلبہ اور غیر زبان والوں کو اس کے تلفظ میں دھوکا ہوتا ہے۔ اگر اس کا نام صرف اَ ہوتا تو بہتر ہوتا۔" [2]

مؤلف موصوف نے صرف الف کا ذکر کیا ہے ورنہ بادی النظر میں یہ اعتراض کئی دوسرے حروف پر بھی وارد ہوتا ہے۔ اوروں کا کیا ذکر، مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ان ناموں سے سادہ آوازوں کا کچھ بھی خیال پیدا نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو :

> "اردو فارسی، عربی حروف پر اگر نظر ڈالی جائے تو دیکھنے میں مختلف آوازوں کی علامتیں ہیں، لیکن ان حرفوں کے ناموں سے کوئی سادہ آواز پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ خاصے الفاظ ہیں۔ مثلاً الف، عین، جیم وغیرہ حروف نہیں بلکہ پورے لفظ ہیں۔ ان سے سادہ آوازوں کا کچھ بھی خیال پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک حرف کئی کئی آوازوں سے مرکب ہے۔" [3]

اس سے پہلے یہ دیکھ لینا بہتر ہوگا کہ اردو حروف تہجی کے ناموں کی کیفیت کیا ہے۔

[1] الف، جیم، دال، ڈال، ذال، سین شین، صواد، ضواد، عین، غین، قاف، کاف، گاف، لام، میم، نون، اور واؤ یعنی اٹھارہ

---

[1] اردو رسم الخط از سید محمد سلیم، ص ۹۴ اور استدراک ص ۹۸۔

[2] فرہنگ آصفیہ، جلد اول، حاشیہ، ص ۴۷۔

[3] قواعد اردو از مولوی عبدالحق، ص ۸۔

حروف کے نام پر پورے پورے لفظوں میں ہیں۔ ان کے تلفظ میں حرف کی پہلی آواز کے ساتھ کچھ دوسری آوازیں شامل ہو جاتی ہیں مثلاً الف میں لام اور فے کی آواز، جیم میں یے اور میم کی آواز اور دال میں الف اور لام کی آواز وغیرہ وغیرہ۔ حروف کے ان ناموں میں پہلی آواز حرف کی اصل آواز ہے اور اتنی واضح ہے کہ اگر کسی کو غلط فہمی ہو جائے تو بہت آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

حرفوں کے ناموں کا یہ انداز ان زبانوں کے علاوہ جن کا رسم الخط عربی سے ماخوذ ہے یورپ کی زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً یونانی میں اے (A) کو الفا ALPHA اور بی (B) کو بیٹا BETA کہتے ہیں۔ الفابٹ ALPHABET بمعنی حروف تہجی انھیں سے بنا ہے۔۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یونانی حروف تہجی کا ماخذ بھی آرامی ابجد ہے۔ انگریزی حروف تہجی میں KLMN اور Q R S T آرامی اور عربی کے کلمن اور قرشت کے عین مطابق ہیں اور ABCD ابجد سے مماثل ہیں۔ [1]

[۲] اٹھارہ دوسرے حروف: بے، پے، تے، ٹے، ثے، چے، حے، خے، سے، ڈے، ذے، ژے، طو، ظو، فے، ہے، یے [ی] اور یے [ے] میں سے سولہ میں۔ یے اور دو میں واؤ شامل ہیں لیکن ان کے نام اتنے مختصر اور اپنی اپنی آوازوں سے اتنے قریب ہیں کہ ان پر پورے لفظ کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

[۳] ایک حرف دو چشمی ہے [ھ] کا نام اس کی صورت کی بنا پر ہے، تاہم اس سے اس کی آواز بھی سیدھے طریقے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

[۴] ایک حرف کا نام ہمزہ [ء] ہے۔ اس کے نام اور آواز میں کوئی مناسبت نہیں لیکن پڑھنے والے کو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس آواز کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس طرح کل بیس حروف کے نام ایسے ہیں جن پر پورے پورے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے [۱، ۳، ۴]۔ ان میں سے اٹھارہ کے ناموں میں آوازوں کی رعایت موجود ہے [۱]۔ بقیہ انیس حروف کے ناموں سے ان کی آوازیں براہ راست نمایاں ہو جاتی ہیں [۲، ۳]۔

اردو حروف تہجی کے ناموں کو اگر کسی ہندوستانی اور بیرونی زبانوں کے حروف کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی قباحت نظر نہ آئے گی کیونکہ ان کے نام یا تو ایسے ہی ہیں یا ان میں کسی طرح کی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں۔ اعتراض کا پہلو دیوناگری حروف تہجی کے تلفظ کے پیش نظر پیدا ہوتا ہے، اور وہ بھی، جیسا کہ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے تفصیل سے بیان کیا ہے، ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ سرسری طور پر خیال ہوتا ہے کہ دیوناگری حروف کا تلفظ مجرد آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے لیکن فی الحقیقت اس سے ایک نوع کی متحرک آوازیں سامنے آتی ہیں۔ اردو کی کیفیت اس سے مختلف اور زیادہ معقول ہے۔ ایک تو اردو حروف کے نام صوتی مناسبت سے عاری نہیں، دوسرے ان کے نام ان علامتوں کے نام ہیں جو مجرد آوازوں کے لیے مقرر ہیں:

> "اردو میں الف آ کی آواز کا نام نہیں ہے بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جو آ، اَ، اِ، اِی، اُ، اُو، اِے، اَے، اُو، اَو میں مشترک ہے۔ یہ سب صورتیں ایک ہی آواز کی مختلف حرکتوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس مجرد آواز کی علامت 'ا' ہے اور اس علامت کا نام الف ہے۔ یہی حالت اور سب حرفوں کی ہے۔" [2]

دیوناگری حروف کا تلفظ حلقی یا صوتیاتی ہے۔ اس کی وجہ سے دیوناگری میں، صحیح معنوں میں، حروف کے نام جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف آوازیں ہیں۔ چونکہ مجرد آواز کا ادا کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے ہر حرف زبر کی حرکت کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ اس طرح دیوناگری میں ہر حرف کے ساتھ زبر کی حرکت وابستہ ہو گئی ہے اور زبر کے لیے کوئی حرکت نہیں ہے۔ سکون کے لیے بھی کوئی حرکت نہیں ہے۔ دہی حروف

---

[1] کلمن اور قرشت کے لیے دیکھیے لسان مطالعے از ڈاکٹر گیان چند، ص ۱۴، ۱۵ اور ابجد کے لیے ادب اسانیات از ڈاکٹر ایس۔ اے۔ مستوفی، ص ۱۰۳۔

[2] اردو زبان اور اس کا رسم خط از سید مسعود حسن رضوی ادیب، ۱۹۴۸ء، ص ۴۸۔

جو زبر کی حرکت کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں جب سکون کے موقع پر آتے ہیں تو اپنی مقررہ مفتوحہ آواز کے خلاف ساکن پڑھ لیے جاتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص نظام ہے لیکن اس سے یہ بات بالکل صاف ہے کہ دیوناگری میں جس طرح لکھتے ہیں اس طرح پڑھتے نہیں ہیں مثلاً سب (सब) میں سَ (स) متحرک ہے اور بَ (ब) ساکن، اور بس (बस) میں بَ (ब) متحرک ہے اور سَ (स) ساکن، لیکن ان کو سَبَ اور بَسَ پڑھنے کے بجائے سَبْ اور بَسْ ہی پڑھتے ہیں۔ اسی طرح की کو کِ (क) کے تلفظ کے مطابق "کی" پڑھنا چاہیے لیکن "کی" پڑھ لیتے ہیں۔ اردو حروف کے ناموں کی وجہ سے حروف میں کوئی حرکت لازماً شامل نہیں ہے۔ وہ ہر حرکت قبول کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ بقول سیّد مسعود حسن رضوی ادیب:

"اردو میں دنیا کی اور زبانوں کی طرح متحرک اور ساکن دونوں طرح کی آوازیں ہیں اور حروف غیر متحرک آوازوں کی علامتیں ہیں۔ اس لیے حرفوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جو آوازوں کی کسی حرکت کو ظاہر نہیں کرتے۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ اردو حروف کے ناموں میں کوئی ایک حرکت نہیں آتی بلکہ حرکات بدلتی رہتی ہیں۔ کچھ حروف کے ناموں کی ابتدا میں زبر ہے کچھ میں زیر اور کچھ میں پیش۔ اس طرح ان ناموں میں تینوں بنیادی حرکات شامل ہیں۔ حروف پر حرکات اس وقت لگائی جاتی ہیں جب ان کا اظہار مقصود ہوتا ہے مثلاً اَ، اِ، اُ یا رَ، رِ، رُ۔ یہی طریقہ ایک حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ ملانے میں رہتا ہے۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ الف کے نام کی ابتدا میں زبر ہے تو اس پر زبر نہ لگایا جائے گا یا رے کے نام کی ابتدا میں زیر ہے تو اس کے نیچے زیر نہ لگایا جائے گا۔ اسی طرح اردو کے حروف چونکہ غیر متحرک آوازوں کی علامت ہیں اس لیے سکون کی صورت میں انھیں ساکن پڑھنے یا ان پر ساکن کی علامت لگانے میں کوئی الجھاؤ نہیں پیدا ہوتا۔

اگر اردو حروفِ تہجی کے موجودہ ناموں کو بدل دیا جائے اور حلقی یا صوتی اعتبار سے ان کا تلفظ متعین کیا جائے تو ان کو زبر، زیر اور پیش میں سے کسی ایک اعراب کا تابع کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں اردو رسم الخط کو اسی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا جو دیوناگری رسم الخط میں درپیش ہے۔ ماضی میں بعض افراد اور اداروں نے اردو حروفِ تہجی کے ناموں کی معنویت پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ انھیں اب کیا کہا جائے۔ لیکن جو اب بھی ان کے ناموں پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کو بدلنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں ان سے یہی گذارش کی جاسکتی ہے کہ وہ اس سے باز رہیں۔

اردو حروفِ تہجی پر بعض اہلِ اردو کے اعتراضات سے صرف یہی بات سامنے نہیں آتی کہ انھوں نے ضروری غور و فکر سے کام نہیں لیا بلکہ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ انھیں اپنے حروفِ تہجی سے لگاؤ نہیں ہے۔ ایسے حضرات اکثر اعتراضات کو درست سمجھتے ہیں، اپنے نئے اعتراضات کرتے ہیں اور اپنی دھن میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ ایک مثال سے اندازہ ہوگا کہ اردو کے فارغ التحصیل اردو حروفِ تہجی کی تنقیص میں کس حد تک جاسکتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں نصیر احمد زار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ تمہید میں یہ پیش بندی کرنے کے بعد کہ سب سے بڑا تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ اردو کی جملہ آوازوں کا تعین کر کے ان آوازوں کے حامل حروف کو اردو حروفِ تہجی کا نام دیا جائے، "زار" نے حروفِ تہجی سے وہ بیزاری دکھائی ہے کہ نہ پوچھیے:

"ممکن ہے بعض پرانے لوگوں کو احساس نہ ہو لیکن وہ مظلوم لوگ جن کے سپرد ابجد خوانوں کی مظلوم تر جماعت ہے وہ ہر وقت اس گتھی سے دوچار ہوتے ہیں اور کبھی اپنا سر پیٹتے ہیں اور کبھی معصوم ابجد خوانوں کا۔ یہ سلسلہ اب یہاں تک دراز ہو چکا ہے کہ مکتب اور مار پیٹ

---

[1] اردو زبان اور اس کا رسم خط از سیّد مسعود حسن رضوی ادیب ۱۹۴۸ء، ص ۵۰۔

کے الفاظ بطور مترادفات کے بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ نتیجہ اس صورت حال کا یہ ہے کہ استاد پڑھانے سے گھبراتا ہے اور طالب علم پڑھنے سے خوف کھاتا ہے ۔۔۔۔ ہمارے ملک میں تعلیم پانے والوں کی نسبت تعلیم سے بھاگ جانے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ چنانچہ ابتدائی درس گاہ مدرسہ کے بجائے مجبلہ کہلانے کی زیادہ مستحق ہے اور اس تمام ناگوار صورت حال کی ذمہ داری اردو زبان کے غیر سائنٹفک حروف تہجی پر عائد ہوتی ہے۔"

مضمون میں پنجابی واعظین کے "قال قال رسول اللہ" کو "کال کال رسول اللہ" پڑھنے کی مثال دے کر مزید لکھا گیا ہے :

"اردو جو اس خطۂ ارض سے پیدا ہوئی ہے اس سے اپنے مزاج کے خلاف آوازوں کو اپنانے کی توقع بہت زیادتی ہے ۔۔۔۔ چاہیے یہ تھا کہ جب اہل اردو میں عرب تالو کے لوگ اٹھ گئے تھے، حروف تہجی میں مناسب ترمیم کر لی جاتی ۔۔۔۔۔ ان حروف میں ترمیم کر کے رنگا رنگ فتنوں کو دعوت دینے کے خوف سے ترکوں نے عربی رسم الخط ہی کو خیرباد کہہ دیا ۔۔۔۔ سوال یہ ہے کہ عربی حروف تہجی میں جن فارسی اور اردو اصوات کے لیے حروف نہ تھے ان کے لیے نئے حروف کے اضافے اگر جائز اور مستحسن ہیں تو جن عربی حروف کی اصوات فارسی یا اردو میں مستعمل نہیں ہیں ان کے اردو فارسی حروف تہجی سے اخراج میں آخر کیا قباحت ہے۔ عقل کا فیصلہ بیّن ہے۔ جذبات کی جنگ کے لیے البتہ حوصلہ درکار ہے۔" [۱]

ان اقتباسات میں اُردو حروف تہجی پر جو فرد جرم لگائی گئی ہے اس کی بے سروپائی ظاہر ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ۱۹۵۵ء میں درس گاہوں میں مار پیٹ پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی تھی اور مار پیٹ دوسری زبانوں اور مضامین کی پڑھائی میں بھی ہوتی تھی، درس و تدریس میں مار پیٹ کے اسباب جداگانہ ہیں۔ اسی طرح تعلیم سے بھاگ جانے کے بھی گوناگوں وجوہ تھے اور ہیں۔ لیکن مضمون نگار نے ان تمام باتوں کی ذمہ داری اردو حروف تہجی کے سر منڈھ دی ہے۔ ان کو ان حروف پر بھی اعتراض ہے جو علاقائی مزاج کے خلاف ہیں۔ حروف کے اضافے اور ان کی تخفیف میں جو فرق ہے اس سے انھیں کوئی غرض نہیں۔ ایک طرف وہ اردو حروف تہجی میں تنسیخ کو بہت آسان سمجھتے ہیں دوسری طرف کہتے ہیں کہ "ان حروف میں ترمیم کر کے رنگا رنگ فتنوں کو دعوت دینے کے خوف سے ترکوں نے عربی رسم الخط ہی کو خیرآباد کہہ دیا۔" ترمیم کا کام اگر اتنا ہی پُرخطر ہے تو اہل اردو ہی اس کا بیڑا کیوں اٹھائیں؟ اس منطق سے تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اردو کے لیے کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔

"قال قال رسول اللہ" کو "کال کال رسول اللہ" پڑھنے کا مسئلہ اردو کے بجائے عربی کا ہے۔ اگر اردو حروف سے قاف کو حذف کر دیا جائے تو یہ مسئلہ کیونکر حل ہو جائے گا؟ اس کے لیے تو عربی میں ترمیم کی ضرورت ہوگی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا پنجابی مسلمان قرآن کو چھوڑ دیں گے اور "عرب تالو" نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے کوئی عربی تعلیم حاصل نہ کرنا چاہے گا؟ لیکن اردو حروف تہجی پر ہر اعتراض اور ان میں ترمیم و تنسیخ کی ہر خواہش بجا ہے۔ ان کے غیر سائنٹفک ہونے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے جیسے دوسری تمام زبانوں کے حروف تہجی بالکل سائنٹفک ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو حروف تہجی کو نہ پہلے کسی نے سیکھا تھا اور نہ اب سیکھ سکتا ہے۔ اگر اہل پنجاب قاف کا تلفظ نہیں کر سکتے تو اردو کا کوئی ذمہ دار شخص کب ان کی گرفت کرتا ہے؟ تحریری علامت کے طور پر قاف کو برقرار رکھنے میں کیا قباحت ہے، خاص طور سے اس صورت میں کہ اہل زبان، اور ہندوستان اور پاکستان کے کئی دوسرے صوبوں کے لوگ اس کے تلفظ پر قدرت رکھتے ہیں۔ عقل کا فیصلہ بیّن ہو یا نہ ہو لیکن مضمون نگار کی

---

[۱] ادب لطیف، لاہور، اردو نمبر، دسمبر ۱۹۵۵ء، مضمون "اردو املا کی اصلاح" از نصیر احمد ناصر، ص ۸۷، ۸۹، ۹۰۔

پریشاں خیالی اور جذباتیت حد سے زیادہ نمایاں ہے۔

اردو حروف تہجی کے معترضین کی طرح ان کو موجودہ صورت میں محفوظ رکھنے کے بعض موافقین جو دلیل دیتے ہیں وہ بھی کچھ کم گمراہ کن اور تشویش ناک نہیں ہے ان کے نزدیک اردو رسم الخط عربی رسم الخط سے مستعار ہے جو قرآن کریم کا رسم الخط ہے اور اس لحاظ سے مسلمانوں کا رسم الخط ہے۔ موافقت میں یہ دلیل اسی طرح کی دلیل ہے جس طرح مخالفت کی یہ دلیل کہ چونکہ اردو رسم الخط مسلمانوں کا رسم الخط ہے اس لیے دوسرے فرقوں کے لوگ اسے قبول نہیں کر سکتے۔ موافقت اور مخالفت میں اس طرح کی دلیل ہر رسم الخط کے لیے دی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہندی رسم الخط کی موافقت میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندوؤں کا رسم الخط ہے، اس لیے ہندو اس کو فروغ دیں، اور مخالفت میں کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے فرقوں کے لوگ اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ طرز فکر نہ صرف اس لیے غلط ہے کہ نہ تو اردو رسم الخط سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا رسم الخط ہے اور نہ ہندی رسم الخط سارے ہندوستان کے ہندوؤں کا، بلکہ معمولی منطق کے بھی خلاف ہے کیونکہ ایک دلیل جو کسی چیز کے حق میں پیش کی جا سکتی ہے وہی اس کے خلاف کس طرح استعمال کی جا سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ زبان کا مذہب، نسل، ملک اور علاقے سے ایک تعلق ہوتا ہے۔ اکثر زبانیں کسی مذہب، نسل، ملک اور علاقے کے لوگوں کی اکثریت سے وابستہ ہیں لیکن ہر زبان ہمیشہ ان حدود میں نہیں رہتی۔ بعض زبانیں جن میں اردو شامل ہے اس قسم کے حدود کو توڑ دیتی ہیں۔ اردو زبان اور رسم الخط کی ترویج و ترقی میں مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے لیکن دوسرے فرقوں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن اردو زبان اور رسم الخط کو ان کے بعض حامیوں اور مخالفوں نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں اور اسلام سے منسوب کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے فالفوں کو اور پاکستان میں اس کے حامیوں کو یہ نسخہ خاص طور سے کارگر نظر آیا ہے ہندوستان میں مختلف اسباب سے اردو رفتہ رفتہ عملاً مسلمانوں کی زبان بنا دی گئی ہے یا بنائی جا رہی ہے لیکن اس سے اس نقطۂ نظر کی تائید نہیں ہو سکتی کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ سابق پاکستان میں اس نقطۂ نظر کا جو انجام ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے لیکن وہاں اس پر برابر زور دیا جاتا رہا ہے۔

محمد حسن عسکری نے معمولی دلیلوں سے آگے بڑھ کر عربی رسم الخط کے پردے میں اردو رسم الخط کی مابعد الطبیعیاتی بنیادیں فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رائے میں اردو رسم الخط اسلامی عقائد، تہذیب اور فکر و فلسفہ کا ترجمان اور امانت دار ہے۔ حروف تہجی، ان کی شکلیں، نقطے یہاں تک کہ ان کا داہنی طرف سے لکھا جانا سب اسلامی خصوصیات کے حامل ہیں۔ رسم الخط کے داہنی طرف سے لکھے جانے کا تعلق قطبی تعین سے ہے اور بائیں طرف سے لکھے جانے کا تعلق شمسی تعین سے اور دونوں قسم کے تعین میں ایک ایسا تہذیبی اختلاف ہے کہ ان میں کسی نقطۂ اتصال کی تلاش بے سود ہے[1]۔ عربی رسم الخط کو اس اعتبار سے بلاشبہ فضیلت حاصل ہے کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب عربی زبان میں نازل ہوئی۔ عرب علماء اور مفکرین نے اسلامی نقطۂ نظر سے عربی رسم الخط کی بعض خصوصیات کی جو توجیہات کی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ان کے پیش نظر دنیا کے مسلمانوں کو، اگر وہ ایسا کر سکیں، عربی رسم الخط اختیار کرنے کی ترغیب دلائی جا سکتی ہے۔ اردو رسم الخط اگرچہ عربی رسم الخط سے مستعار ہے لیکن اس کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ دوسرے عناصر قبول کر چکا ہے اور اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں محمد حسن عسکری کی مذہبی توجیہات من گھڑت سے زیادہ نہیں۔ اردو زبان کی طرح اردو رسم الخط تہذیبوں کے حریفانہ اختلاف کے بجائے دوستانہ اشتراک کی علامت ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یوں رسم الخط ایک وسیلہ ہے، اسے جس گروہ کے لوگ چاہیں اپنا سکتے ہیں لیکن اسے کوئی ایسی معنویت پہنانا جو حقائق کے خلاف ہو اور جس سے اس کے حلقۂ اثر کو نقصان پہنچے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

حروف تہجی رسم الخط کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر بنیاد کی مضبوطی پر یقین نہ ہو تو عمارت کے استحکام پر بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ بے یقینی اور پریشاں خیالی کے ساتھ کسی رسم الخط کی مناسب تدریس نہیں ہو سکتی، ترویج و ترقی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اردو حروف تہجی میں اگر کچھ قباحتیں ہیں یا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے اردو کا رسم خط ایک مابعد الطبیعیاتی مطالعہ از محمد حسن عسکری۔
شب خون، الٰہ آباد، ع ۵۴، اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۸ تا ۲۴۔

محسوس ہوتی ہیں تو مسئلے کے عملی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے انھیں اہمیت نہ دینا چاہیے۔ کسی مروّجہ رسم الخط کے حروف تہجی کی تشکیل و ترتیب کو صدیوں میں استحکام حاصل ہوتا ہے اور معمولی سی ترمیم کے مقبول ہونے میں بھی ایک زمانہ لگ جاتا ہے۔ املا میں ترمیم و اصلاح قدرے آسان ہے لیکن حروف تہجی میں ترمیم و تنسیخ بہت مشکل ہے۔ ابجد کی ایجاد یا از سر نو تشکیل بچوں کا کھیل نہیں کہ ابھی ایک گھروندا بنایا اور ابھی اسے توڑ کر دوسرا گھروندا بنا دیا۔ اس لیے حروف تہجی میں روز ایک ترمیم تجویز کرنے کے بجائے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کے تحریری نظام کو سمجھنے سمجھانے اور سیکھنے سکھانے کی کوشش کی جائے۔ امتداد زمانہ اور قبول عام کے ساتھ ترمیم خارج از امکان نہیں کہی جا سکتی لیکن گذشتہ کئی سو برس میں ضروری ترمیم ہو چکی ہے۔ اردو حروف تہجی اس وقت تشکیل یا غیر معینہ حالت میں نہیں ہیں۔ جہاں تک قیاس کیا جا سکتا ہے یا تو یہ یوں ہی رہیں گے یا ختم ہو جائیں گے۔ ان کو جو خطرہ درپیش ہے وہ ان کی مبینہ کوتاہیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب سے ہے۔

افسوس ہے کہ اردو رسم الخط میں اصلاح کے مبلغین اصلاح کا نعرہ حروف تہجی سے بلند کرتے ہیں اور اس طرح اردو کے دشمنوں سے زیادہ اردو دشمنی کا حق ادا کرتے ہیں۔

زرِ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری مارچ۔ اپریل ۸۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہوچکا ہے۔ ازراہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۲۴ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

ندا فاضلی

تین گیت ـــــ تین چہرے

(۱)

تیرے پیروں چلا نہیں جو
دھوپ چھاؤں میں ڈھلا نہیں جو
وہ تیرا سچ کیسے، جس پر تیرا نام نہیں

تجھ سے پہلے بیت گیا جو
وہ اتہاس ہے تیرا
تجھ کو ہی پورا کرنا ہے
جو بن باس ہے تیرا

تیری سانسیں جیا نہیں جو
دھول پسینہ بنا نہیں جو
وہ تلسی کی رامائن ہے، تیرا رام نہیں
وہ تیرا سچ کیسے ...

تیرا من ہی پوجا گھر ہے
من کی مورت گڑھ لے
کوئی پستک ساتھ نہ دے گی
چاہے جتنا پڑھ لے

تیرے سُر میں سجا نہیں جو
اک تارے پہ بجا نہیں جو
وہ میرا کی سمپتی ہے، تیرا شیام نہیں
وہ تیرا سچ کیسے جس پہ تیرا نام نہیں

(۲)

پھولوں کے رنگ لال لال
چلتے میں روکیں
ہزاروں میں ٹوکیں
موسم جوابوں کا پوچھے سوال
پھولوں کے رنگ لال لال

پر کھلکے ہاتھوں سے دھوتی ہوائیں
پیڑوں میں چھپ چھپ کے اودھم مچائیں

مہندی کا بوٹا
دکھائے انگوٹھا
بھیگے دوپٹے میں لاکھوں کا مال
پھولوں کے رنگ لال لال

آنچل سے منہ ڈھک کے سوئے دوپہری
کمرہ میں بجلی سی چمکے سنہری

دریا کا پانی
سنائے کہانی
لہروں میں لہرائیں بھولے خیال
پھولوں کے رنگ لال لال
چلتے میں روکیں
ہزاروں میں ٹوکیں
موسم جوابوں کا پوچھے سوال۔

(۳)

چاند اگا کے دیکھ او مانجھی
رات جگا کے دیکھ
سرگم سرگم گیت چھپے ہیں
ساز اٹھا کے دیکھ

یہ جیون ہے بھیّا
بھنور بیچ نیّا
چلا چل جیسے
چلے پُروَیّا

تنکا تنکا جوڑ کے اپنا گھر باندھے گوریّا
لہر لہر لہرائے کنارا
ناؤ بڑھا کے دیکھ

نشہ کوئی گہرا
سنہرا سنہرا
کہیں کوئی مورت
کہیں کوئی چہرہ

کہاں رکھے گا دنیا ساری چھوٹا کر لے گھیرا
چھوٹے چھوٹے گھیروں میں
سنسار سجا کے دیکھ

۱۰۴۳ - امرا پارٹمنٹ، ڈنڈ پارہ - ۱ - کھار (ویسٹ) بمبئی - ۵۲

دُودھ پُتّر

جوگندر پال ● ۴-۳۰ سندر کنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

اٹھے آگے منّو بنگلے کے باہری گیٹ کی طرف چلا آرہا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے اندھیروں کی آڑیں ہیں جس کے پھٹتے ہی وہ ہر روز نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ دن بھر گھر کا سارا کام وہی انجام دیتا ہے مگر کیا مجال، وہ کبھی کسی کو دکھ جائے۔ گھر کے افراد کو خبر ہی نہ ہوتی کہ وہ کہاں ہے اکیسے ہے۔ مر گیا ہے یا زندہ ہے۔ بس ان کا کام انجام پاتا رہا۔ کل ہی کی بات ہے کہ بڑی اپنی چھوٹی بہن کو ایک کہانی سنا رہی تھی ــــ سن رہی ہو چھوٹی؟ ننھی شہزادی کبھی کام اس کا ایک منّا ساجن پورے کر دیتا تھا، مگر وہ منّا ساجن کسی کو دکھائی نہ دیتا تھا، ننھی شہزادی کو بھی نہیں ــــ

اتنے میں منّو چھوٹی کے لئے دودھ کا گلاس لئے ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ "اری بڑی، کہیں وہ منّا ساجن ہمارا یہ منّو ہی تو نہ تھا؟"

منّو کو اپنے جن بن جانے کے خیال نے گدگدایا ہے اور اس نے من ہی من میں اپنے سوئے ہوئے مالک کی مونچھ جھٹک دی ہے اور جب وہ وہاں اپنے بستر پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ہوگا، تب یہ منّا ساجن یہاں بجلی کی پھیکی روشنی میں خوشی سے ناچنے لگا ہے اور اس کے مانند اس کی پرچھائیں بھی، اور اپنی پرچھائیں کا ناچ اسے اتنا بھلا لگا ہے کہ اس پر کھیں جانے کے لئے یہ ٹھہر گیا ہے اور اس کے مانند اس کی پرچھائیں بھی، اور پھر یہ کھیل منّو کو اس قدر بھلانے لگا ہے کہ کبھی وہ اپنے ننھے منّے قدموں سے بے اختیار ناچنے لگتا ہے اور کبھی ایک دم ٹھہر جاتا ہے۔ مگر اتنے میں لان کے کنارے ہی پر اگے ہوئے امرود کے پیڑ نے اس کے سر پر ایک پکا ہوا امرود گرا کر کہا ہے، جاؤ منّو، دیر ہو گئی تو دودھ نہیں ملے گا۔

منّو نے ایک ہاتھ میں امرود لے کر اس پر اپنے دانت گاڑ لیے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے دودھ کا خالی ڈول گھماتے ہوئے گیٹ پر آ پہنچا ہے۔ لوہے کا دروازہ بند کا بند سویا پڑا ہے ــــ اتنی کچی نیند سوتا ہے کہ ذرا سا بھی کھول دو تو چیں چیں کرتے ہوئے جاگ پڑتا ہے ــــ منّو ہنسنے لگا ہے ــــ ہر دم ایک ہی جگہ گڑے رہنے سے گہری نیند آئے بھی کیسے ہمجے کا سونا تو ہاتھ پیر ہلانے اور چلنے پھرنے سے ہی ہوتا ہو ــــ دروازوں کے چلنے پھرنے کے خیال سے وہ پھر ہنس دیا ہے ــــ ٹھہرو۔ کدھر بھاگے جا رہے ہو، سڑک کے بیچ چل رہے ہو۔ گاڑی کے نیچے آجاؤ گے اور ٹوٹ پھوٹ جاؤ گے ــــ ٹھہرو ــــ ٹوٹ پھوٹ گئے تو لوگ اپنے گھروں میں کیسے داخل ہوں گے؟ ــــ مالک کے لوہے کے گیٹ پر اپنی گوشت پوست کی انگلیاں پھیرتے ہوئے منّو کو اپنے باپو کا گھر یاد آ گیا ہے اور وہ اداس ہو گیا ہے ــــ باپو کے گھر کا تو کوئی دروازہ ہی نہ تھا۔ جھونپڑے کے اندر بھی جیسے ہی معلوم ہوتا باہر بیٹھے ہیں ــــ اس کی آنکھوں میں سبح سویرے ساون کی گھٹا اتر آئی ہے اور یہ سہانا موسم اسے بہت اچھا لگ رہا ہے ــــ ارے او منّو کے بچے! ــــ اس کا باپو اسے ہمیشہ "منّو کے بچے" کہہ کر ہی بلاتا تھا، گویا منّو کو آپ ہی اپنا باپ بن کر جینا گذارنا ہو ــــ چلو، اندر چلو، دیکھتے نہیں، باہر پانی برس رہا ہے؟ ــــ اندر چیا دا برس رہا باپو۔ ــــ اس کا باپو لاجواب ہو کر آپ بھی بھیگتا رہتا اور اسے بھی مزے سے بھیگنے دیتا ــــ مگر کوئی کب تک بھیگتا ہی چلا جائے؟ کبھی تو ثابت چھت ملے۔ اس چھت کے نیچے روٹیاں پکاتی ماں کے پسینے گالوں میں انگار بھر آئے، باپو چین سے کھاٹ پر پسر کر حقہ پی رہا ہو اور میں ایک کونے میں کچے فرش کی گیلی مٹی سے اپنا گھروندا بنا رہا ہوں اور میری چھوٹی بہن رو رہی ہو کہ پہلے میرا گھروندا بناؤ ــــ اس کا گھروندا کیا بناتا؟ گاؤں میں ہیضہ پھوٹا تو سب سے پہلے وہی مری ــــ مورکھ کو بالی عمریا میں ہی شادی بنانے کا بڑا شوق تھا۔ ہر روز گھاس پھوس کا ایک نیا دولہا بنا کر لے آتی ــــ میرا گھروندا بنا دو گے نا منّو؟ اس میں میں اور میرا دولہا رہیں گے۔ تم بھی ہمارے پاس آ جایا کرو منّو ــــ کیا پتہ، مرنے کے بعد کسی دولہے کے سنگ کہاں جا بسی؟ ــــ

منّو روتے روتے لوہے کے گیٹ کے پیروں میں گھسٹ آیا ہے۔ لان کے دوسرے سرے سے رات کی رانی نے اسے اپنی خوشبو بھری بشاش آواز

سے پکارا ہے اُمنّو ۔۔۔ وا ۔۔۔ منّو چونک کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ میری پھتاں بہناں کی آواج کاں سے آئی ہے؟ ۔۔۔ منّو ! ۔۔۔ وا ! ۔۔۔ رات کی رانی نے پھر اُسے پکارا ہے ۔۔۔ پھتاں ! ۔۔۔ منّو ! ۔ پھتاں ۔۔۔ منّو نے ایک لمبی سانس لے کر پھتاں کی یادوں بھری خوشبو اپنے اندر اتار لی ہے اور اسے چین آ گیا ہے اور سوئے ہوئے دروازے کو ذرا سا کھول کر سڑک پر قدم رکھتے ہوئے گویا لوہے کے بتوں کے ہیبت ناک خواب میں گھس آیا ہے ۔

لوہے اور سیمنٹ کے جنگل نے اسے ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے اور بجلی کی بھوت ناک پیلی روشنیاں اس پر گولہ باری کرنے لگی ہیں جس سے سنسان سڑک پر جا بجا گڑھے پڑنے لگے ہیں مگر بارہ سالہ چھوکرا کسی طلسمی ننھے کردار کے مانند کھنڈرانہ آگے بڑھتے جا رہا ہے ۔ اُس کے ساتھ اُس کے اپنے سوا اور کوئی نہیں ہے ۔ اُس کے پہلو سے اُس کا سایہ برآمد ہوتا ہے اور اُس کے وجود کا چکر کاٹتے ہوئے لمبا ہی لمبا ہوتا جاتا ہے ۔ اپنے اتنے لمبے سائے کو دیکھ کر منّو کی ہنسی چھوٹ پڑتی ہے میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں ۔۔۔ وہ اکڑ اکڑ کر چلنے لگتا ہے ۔۔۔ اس وکھت ہمارے ساتھ والے بنگلے کا مالی جرا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے تو سالے کی وہ درگت بناؤں کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے ۔۔۔ پڑوس کی مالی کی منّو سے نہیں بنتی ہے اور وہ اکثر منّو کو انہی الفاظ میں دھمکایا کرتا ہے ۔

منّو نے اپنے آپ کو بتایا ہے کہ اس تراں گدھے کی چال چلتے رہے تو اُدھر پہنچنے پر دودھ کھتم ہو چکا ہو گا ۔۔۔ اس نے دودھ کے ڈول کو اپنے ہاتھ سے پیٹھ پر لٹکا لیا ہے اور زمین کی طرف منہ لٹکا کر محسوس کرنے لگا ہے کہ اس کی پیٹھ دو ٹانگوں پر سیدھی کھڑی ہونے کی بجائے چار پر چپٹی بچھ گئی ہے اور اس پر وہ خود آپ ہی بیٹھا ہے ۔۔۔ نہیں ، اُس کے آگے اس کی چھوٹی بہن پھتاں بھی ہے اور ان کے پہلو میں آگے آگے اس کا باپو ہے اور پیچھے پیچھے اس کی کھانستی ہوئی ماں اور وہ سب پڑوس کے گاؤں میں دیوی کا میلہ دیکھنے جا رہے ہیں ۔

منّو تادیر اسی طرح گدھا بنے جھول جھول کر چلتا رہا ہے اور پھر راستے میں ایک بھوری بلی کو اپنی طرف گھورتے ہوئے پا کر ایک دم رک گیا ہے ۔۔۔ لے پھتاں ۔۔۔ وہ گویا میلے میں اپنی بہن سے مخاطب ہو ۔۔۔ دیکھ تیرا یہ دولہا ! ۔۔۔ اُس نے اپنے ہاتھ کا دولہا سا بنا کے بلی کی طرف بڑھا دیا ہے ۔

جواب میں بلی غرائی ہے تو اس کی آنکھوں میں اپنے مالک کا غصیلا چہرہ گھوم گیا ہے ۔" دیکھو منّو ، آج بھی دیر سے دودھ لائے تو پورا ایک گھنٹہ تمہیں مرغا بناؤں گا ۔"

منّو مرغے کی طرح پھڑ پھڑا کر سرعت سے آگے ہو لیا ہے اور اس کے جی میں آئی ہے ، منہ سے ایک نہایت کھلی اور رچی آواز بانگ لگا دے تا کہ سبھی لوگ جاگ پڑیں اور جاگ کر بھی یہی سمجھیں کہ سوتے میں مرغے کی صدا سن رہے ہیں کیوں کہ ان کا جاگنا تو صرف موٹروں اور اسکوٹروں کے شور سے ہی ہوتا ہے ۔

"ایک بات بتاؤ منّو ۔" چھوٹی نے ایک بار اُس سے پوچھا تھا ۔" زندہ مرغا کیسے ہوتا ہے؟"

"جیسے تمہاری کتابوں میں کھنچا ہوتا ہے چھوٹی ۔"

"نہیں منّو ۔" چھوٹی ضد کرنے لگی ۔" مجھے سچ مچ کا مرغا دکھاؤ ۔"

" کھانے پینے کی چیزیں ویسے ہی ہوتی ہیں چھوٹی ، جیسے کھانے کی میز پہ دکھیں ۔" بڑی اپنی چھوٹی بہن کو سمجھانے لگی ۔" آؤ ، کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے ۔ مرغے کی ٹانگ کھاؤ گی تو بڑا مزہ آئے گا ۔"

" ارے کھاؤ ، کھاتے کیوں نہیں ؟" ایکا ایکی منّو کے دل میں اپنے باپو کی آواز بجی ہے ۔" تمہارے باپ نے بھی کبھو اتنی لجیج بھیڑ نہ چکھی ہو گی ۔"

ایک دفعہ اس کا باپو کہیں سے ایک بوڑھی بھیڑ چرا لایا تھا اور اس خوف سے کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے ، اس نے بھیڑ کو راتوں رات کاٹ کر چولہے پر چڑھا دیا تھا ۔

" نیں ، پھتاں کے باپو ۔۔۔ کھاؤں ۔۔۔ کھوں ۔۔۔" کھانسی کے بغیر منّو اپنی ماں کی آواز کو پہچان ہی نہ پائے ۔" میں اپنے بچوں کو چوری کا مال نیں کھانے دونگی ہمارے لئے دال بھات ہی ٹھیک ہے ۔"

" تمہیں کا مالوم ، میں دال بھات بھی چرا کے لاتا ہوں ؟"

" نیں ، مجھے مالوم ہے میرے بچوں کو تمہاری یہ بھیڑ ہجم نیں ہو گی ۔۔۔ کھاؤں ۔۔۔ کھوں ! ۔۔۔"

" حرام کی بھیڑ ہووے یا حلال کے پتھر ، گریب کے بچوں کو سب کچھ ہجم ہو جاوے ہے ، چلو ہٹو "

" نیں ! ۔۔۔ نیں ! ۔۔۔ کھا ۔۔۔ کھاؤں ۔۔۔ کھوں ! ۔۔۔"

اُس کے باپو نے لال پیلا ہو کر اس کی ماں کو جو زور سے دھکا دیا تو وہ اوندھے منہ زمین پر آ لی اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔
باپو نے گھبرا کر اُسے تھام لیا اور اسے چارپائی پر بٹھا کر اس کی ناک سے خون پونچھنے لگا اور اس کا سینہ سہلانے لگا اور پھر تھوڑی دیر میں اُسے دم آ گیا
تو بولا "تم گلت تو نہیں کہتیں پر ——"
اس کی ماں نے اپنا پلڑا بھاری پایا تو اپنی ساری تکلیف بھول کر چمکتی ہوئی بولی "میری مانو اور یہ بنی بنائی ہانڈی مندر میں کنہیا کے چرنوں پر رکھ آؤ۔"

"اور تمہارے اُس باپ پنڈت نے دیکھ لیا تو؟"

وہ کاہے کو دیکھے گا؟ چوروں کے باپ ہو، جیسے لائے ہو ویسے ہی چوری چوری رکھ آؤ کھاؤں!"

"پر بھگوان تو سر پہ لڈو پیڑے کھاتا ہے۔ گوست کو تو وہ چھونا بھی ناہیں۔"

"تو کا ہوا؟ چھوئے بگیر کسی کھانے والے کو دے دے گا۔ جاؤ ابھی جاؤ۔"

"رات تو پڑ لینے دو بھلی لوک۔ کسی نے دیکھ لیا تو جندا نہیں چھوڑے گا۔"

مُنو کا باپو چلا تو گیا مگر بے چارے کی شامت کہیے کہ اسی روز رات گئے مندر کا پنڈت بھگوان کی پشت میں بیٹھے چڑھاوے کے پیسوں کی گنتی کر رہا تھا۔ کھٹکا پا کر اس نے جو مورتی کے سر سے اپنا سر اونچا کیا تو باپو سراسیمہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پنڈت کے چلانے پر کئی لوگوں نے اُسے دروازے پر ہی آن لیا اور پیٹ پیٹ کر اُس کا بھرکس بنا دیا۔

"چمار کی جات کی ہمت دیکھو۔ بھگوان کو بھرشٹ کرنے کے لئے گوشت کی ہانڈی پکا لایا۔"

جب مُنو کی ماں اس کے باپو کی چوٹوں کو سینک رہی تھی تو اُس نے شکایت کی "میں نے تم کو بولا تھا نا۔"

"ہاں، بھتاں کے باپو کھاؤں کھوں! اس سے تو اچھا تھا کہ ہم ہی چوری چوری کھانے پینے کا پاپ کما لیتے۔"

پہلے موڑ پر مڑتے ہوئے مُنو کو اچنبھا ہونے لگا ہے کہ ابھی ابھی تو وہ بنگلے سے دودھ لانے نکلا تھا، اتنے میں ہی پورے چار سال گُل ہو گئے ہیں۔ نادان چھوکرا کیا جانے کہ ٹائم کسی کی راہ نہیں تکتا۔ ہم ہی ٹائم کی راہ تکتے تکتے چھوٹے سے بڑے اور پھر بڑے سے بوڑھے ہو کر مر کھپ جاتے ہیں، مگر بھتاں تو بڑی اور بوڑھی ہونے سے پہلے ہی مر کھپ گئی تھی۔ اپنی بالی عمر میں ہی اُسے ہر روز ایک نئے دولہے کا انتظار رہتا اور وہ نہ آتا تو وہ آپ ہی اُسے کپڑا، گھاس پھوس اور چیتھڑوں سے بنا لیتی۔ بھتاں کی ارتھی اٹھنے سے پہلے مُنو نے اُس کے کوئی تیس چالیس دولہے بھی اس کے پہلو میں لٹا دئے تھے۔

مُنو نے سوچا ہے اب تک اس کی ماں بھی شاید مر کھپ چکی ہو۔ بھتاں کی موت پر تو اُس پر کھانسی کا ایسا دورہ پڑا تھا کہ سب ڈرنے لگے، آج ایک کی بجائے دو ارتھیاں اٹھیں گی۔ اپنی ماں کے بارے میں سوچتے ہوتے ہوئے اس کے طفلانہ ذہن میں اس کا عجیب سا خاکہ ابھرتا تھا، یا تو وہ اپنے آگے آگے گھسٹتی ہوئی گھر کا کام کاج کئے جا رہی ہو اور اپنے پیچھے پیچھے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہو۔ اس کا دل چاہتا وہ اسے آرام سے کھاٹ پر بٹھا کر خود آپ سارا کام کر دے۔

"نہیں، مُنو، تمارا کام سر پہ کھیلنا ہے۔ جاؤ تم کھیلو۔"
مگر وہ کس کے ساتھ کھیلتا؟ بھتاں کو مرے تو کئی مہینے ہو چکے تھے۔

جس دن بازو کے چوہدری نے اسے نوکری کے لئے دلی لے جانے کو آنا تھا، اس دن مُنو کی ماں کا دم ویسے ہی الٹا ہوا تھا، جیسے بھتاں کی موت پر۔

"پہلا بھی اسی تراں ہاتھ سے نکل گیا تھا بھتاں کے باپو۔ اسے تو رہنے دو۔" مُنو کے بڑے بھائی کو بھی انہوں نے اسی طرح نوکری پر دلی بھیجا تھا۔ وہ انہیں ہر ماہ پچیس تیس روپئے بھیج دیا کرتا تھا مگر ادھر آٹھ دس ماہ پہلے اُن کے پاس اُس کے مالک کی چٹھی آئی تھی کہ وہ کسی چھوکری کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔ اسکے بعد اُسے نہ تو اپنے ماں باپ کو اپنی کوئی خبر بھیجی نہ پیسے۔

"اُس کا جکر مت چھیڑو بھتاں کی ماں۔" مُنو کے بڑے بھائی کے ذکر سے باپو کا پارہ چڑھ گیا۔ "میں تمہاری بیماری کی وجہ سے چپ ہوں، نہیں تو تم جانتی ہو وہ ہرام کی اولاد ہے" باپو اپنے بجھے ہوئے حقے کو زور زور سے گڑگڑانے لگا۔ "ہلال کا ہوتا تو پال پوس کا کرج چکانے سے ہاتھ نہ کھینچ لیتا ——

پھر اسے چھوڑ دو۔ چوہدری دلی سہر میں میری ترپھ سے کسی ساب لوگ کو جبان دے آیا ہے۔ وہ ساب لوگ ہم کو پچیس روپیہ نکد بھیج دیا کرے گا اور تمہارے مُنّو کو روٹی کپڑا مو بہت ملے گا۔ بولو، اور کیا چاہیئے؟ ۔۔۔۔ دمے کی بوت؟" ٹھنڈے حقے سے اس کے منہ میں دھواں نہ بھرا تو اسے غصہ آنے لگا" میری کسمت پُری تھی جو تم بیمار بھینس کو بیاہ لایا۔ اگر تم کھانس کھانس کر سوکھ نہ جاتیں تو پانچ دس تو جنتیں۔ جرا حساب لگاؤ، دس بار پچیس کتنے ہوتے ہیں؟ تمارے بے دکھت سوکھ جانے سے میرا کتنا بڑا انسکان ہوا ہے۔ ٹھنڈی چلم میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ ذرا رک گیا" اب اوپر سے جے ایک پچیس بھی گوانا چاہتی ہو تو تماری مرجی"

سولہ سالہ مُنّو ایک ہاتھ سے بیڑی پیتے اور دوسرے سے دودھ کا خالی ڈول ہلاتے سڑک پر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلا جا رہا ہے کہ اچانک ایک خوش پوش ادھیڑ عمر آدمی سے ٹکرا گیا جو ہر روز اپنی صبح کی سیر پر اُسے اِس وقت یہیں ملتا ہے۔ مُنّو کو معلوم ہے کہ وہ ورزش کے لئے آنکھیں موند کر گہری سانسیں لے رہا ہوتا ہے! اُس کے بٹوے کا بالائی نصف آج جیب سے باہر جھول رہا ہے۔ مُنّو نے بڑی صفائی سے بٹوے پر ہاتھ صاف کیا ہے اور ہونٹ گول کر کے سیٹی بجاتے ہوئے آگے بڑھ گیا ہے۔ اگلے موڑ پر پہنچ کر اُس نے بٹوا کھول کر پچاس پچپن کے نوٹ اور کچھ ریز گاری اپنی جیب میں ڈال لی ہے اور خالی بٹوا نالی میں پھینک دیا ہے اور کوئی فلمی دُھن گنگناتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ آج وہ میٹنی شو دیکھے گا، میم ساب نے چھٹی نہ دی تو بھی جائے گا، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ سالوں کا نوکر ہوں، گلام تو نیں۔۔۔ پھر وہ کسی فلم کے ہیرو کا کوئی ڈائیلاگ بولنے لگا ہے ۔۔۔۔ ماتا جی، میں گریب ہوں تو کیا ہوا؟ مو جھے جینے کا ادھیکار ہے۔ مَیں آپ کی بیٹی سے سچی موحبت کرتا ہوں ماتا جی ۔۔۔۔ مُنّو کی جیب میں پچپن روپئے ہیں، منہ پر سچی محبت اور پہلو میں ماتا جی کی خیالی بیٹی اور اپنی اس کیفیت میں وہ اِس خواہش سے بے قابو ہو رہا ہے کہ بیس پچیس آدمی کہیں سے ایکدم برآمد ہو کر اُس پر ٹوٹ پڑیں اور وہ ایک ایک کو چت کر دے ہے ! اُس نے آخری حملہ آور کو گرا کر بے اختیار اپنی فتح کا اعلان کیا ہے، جسے سن کر ایک خارش زدہ کتیا چوکنی ہو کر کھڑی ہو گئی ہے اور اُس کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگی ہے۔

مُنّو جب نوکری پر شہر پہنچا تھا تو اُس کی بغل میں ایک پھوڑا ابھل آیا تھا۔ اِس سے اُسے بہت تکلیف رہی۔ باہر کا یہ پھوڑا تو چند روز میں بھر گیا مگر اس پھوڑے سے جو اپنے ماں باپ سے جدا ہو کر بچے کی وجود میں اندر کی جانب پھول آیا تھا جس سے ایک مدت تک اس کی جان پر بنی رہی۔ اُس کے مالکوں کو خدا اخدا کر کے مطلب کا چھوکرا ملا تھا، وہ اسے واپس کیوں بھیجتے؟ شاید وہ اُسے چند دن چھٹی پر بھیجنے کا طے بھی کر لیتے مگر بچے کو اتنی دور پہنچاتا کون؟ اُدھر مُنّو کے باپو کو باقاعدگی سے ہر مہینے پچیس روپئے ملنا شروع ہو گئے تو اُسے یقین ہونے لگا کہ میرا بیٹا راضی خوشی ہے۔

مُنّو بدستور ملک بوتھ کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور راستے میں شیوجی پارک تک پہنچتے ہوئے اُس کے دو سال اور بیت گئے ہیں۔ اِس پارک میں ہر صبح کو بہت سے بوڑھے لمبی سانسیں لینے، غور و فکر کے آسن جمانے یا مصنوعی قہقہے لگا لگا کر ورزش کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ایک بوڑھے نے آنکھیں نکال کر مُنّو کی طرف دیکھا ہے اور اس پر یکلخت گولیوں کے مانند قہقہوں کی بوچھار کر دی ہے اور وہ گھبرا کر نہایت تیز قدمی سے آگے بڑھ گیا ہے۔

مُنّو! ۔۔۔ ارے او مُنّو!

مُنّو نے سانس درست کی ہے اور مُڑ کر دیکھا ہے۔ مرہٹن آیا اپنے گریاں بچے کو بگھی میں چھوڑ کر اُس کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی ہے۔

"لو!" مرہٹن نے مُنّو کی طرف ایک سیب بڑھایا ہے جو شاید وہ اپنے گھر سے چرا کر لائی ہے۔ مُنّو نے سیب بلا جھجک لے لیا اور معجوبانہ انداز میں مسکرانے لگا ہے۔

مرہٹن آیا مُنّو سے دس پندرہ برس بڑی ہے مگر اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو چکی ہے اور اُسے اپنے ساتھ بھگا کر دلی سے بمبئی لے جانا چاہتی ہے۔

"بولو، کیا پھیسلا کئے ہو؟"

"میں بول چکا ہوں آپٹی، ابھی نیں جا سکتا۔"

"کوئی بات ناہیں۔ ابھی اور سوچ لو" "آپٹی اسے جی ہی جی میں گلے لگائے ہوئے ہے"۔ ادھر کیا پگار ملتا ہے؟"

"کل بھی بولا تھا، اس مہینے سے پورا سو ہو گیا ہے۔"

"ہمارا ممبئی میں پورا دو سو لیں گا۔ دو سو تمارا، اور تین سو میرا، اور رکھا اپنا مو پھٹ۔ بولو، اور کیا مانگتے ہو؟" گھی میں بچہ اور تیزی سے رو رو کر فریاد کرنے لگا ہے تو وہ اُس کی طرف مڑ گئی ہے مگر جانے سے پہلے اُس نے جلدی جلدی کہا ہے "کل پھر ادھر ہی ملنا، ملیں گا نا؟"

مُنو نے سر ہلاتے ہوئے ہاں کہا ہے اور دودھ کا ڈول گھماتے پھر اپنے راستے پر چل دیا ہے۔

مُنو بڑا جوان نکلا ہے۔ اپنے مالک کے دیے ہوئے پرانے کپڑے وہ دھو پنج کر تیار رکھتا اور خوب بن سنور کر باہر نکلتا۔ جب وہ آتی جاتی لڑکیوں کی طرف دیکھتا تو انہیں بھی اپنی طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پاتا اور بدن میں ایک کرنٹ سا محسوس کر کے چاہنے لگتا کہ بجلی کے کسی کھمبے سے لپٹ جائے۔ گھر میں ٹی، وی، پر اُسے آئے دن ایسی فلمیں دیکھنے کو مل جاتیں، جن میں مالک بالآخر اپنی خوشی اور مرضی سے اپنی بیٹی کا ہاتھ اپنے نوکر تھما دیتا ——— تم غریب ہو بیٹا تو کیا ہوا؟ میں جو ہوں۔ تمہیں اب کیا فکر ہے؟ ——— مگر یہیں سے تو فکر لاحق ہوتی ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ اس نے کئی بار اپنے آپ کو تصور میں چھوٹی کے ساتھ بیاہ کے پھیرے لیتے ہوئے پکڑا۔ بڑی کا بیاہ ہو چکا تھا اور چھوٹی اب بڑی ہو چکی تھی اور اسے معلوم تھا کہ دور سے دیکھتے چلے جانے سے ہی اب چھوٹی کی تسلی نہیں ہوتی ——— مُنو، اِدھر آؤ! ——— آیا، ابھی آیا ——— یہ ہیر ڈرائر لے کر میرے پیچھے کھڑے ہو جاؤ ——— ارے اتنی دور نہیں، اور قریب آؤ ——— اور! ——— اور پھر اُسے وہ 'اور' سنائی دیتا جو شاید چھوٹی کے منہ میں رہ جاتا اور وہ اُس کے ہیر ڈرائر کی ہوا میں اڑتے ہوئے بالوں سے ایک قدم اور پیچھے ہٹ جاتا ——— ارے بے وقوف، آگے آؤ! ——— مگر بے وقوف کیا کرتا؟ پیچھے نہ ہٹتا تو حوالات میں ماں کو یاد کر رہا ہوتا۔

مُنو کی ماں کوئی سال بھر سے بھی پہلے مر چکی تھی لیکن اُسے ماں کی موت کی خبر دو ڈھائی ماہ ہی پہلے ملی۔ اُس نے وہ ساری رات سپنے میں اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے کاٹی تھی ——— نہیں، جاگتے میں تو وہ کبھی اُس کے ذہن کے آگے آئی نہ پیچھے۔ اس کا مالک خود آپ ہی اُس کے ماں باپ کو پچاس روپے کا منی آرڈر بھیج کر باقی پیسے اس کو سونپ دیتا اور وہ حلال کی اس کمائی کو چوری، یاری اور ٹھگی کے پیسوں میں ملا کر ٹھاٹھ کی بے خبر زندگی بسر کرتا، مگر اُس رات کو خواب میں اسکی ماں اُس کی آنکھوں سے ہٹنے میں نہ آ رہی تھی ——— کھ ——— کھاؤں ——— منو ——— وا! ——— گاؤں میں لال آندھی آئی ہوئی ہے اور ان کا چھونپڑا اُڑ گیا ہے اور وہ گھر کے اسی مقام پر بے گھر ہو کر سہما بیٹھا ہے اور اس کی ماں چلا رہی ہے ——— کہاں ہو مُنو؟ ——— مُنو ——— وا! ——— کھاؤں ——— کھوں! ——— وہ پیر جمال کے عرس کے میلے میں کھو گیا ہے اور ہجوم میں رو رو کر بھٹکتا پھر رہا ہے کہ اچانک اس کی ماں کہیں سے وارد ہو کر اُسے اپنے بازوؤں میں کس لیتی ہے ——— مُنو ——— وا! ——— کھ ——— ! ——— ماں ——— ماں ——— میں بھی بڑا ہو کر دلی جاؤں گا ——— نیں! ——— نیں! ——— ایک تو جا کے سدا کے لئے گیا۔ تم بھی چلے گئے تو میں کدھر جاؤں گی ——— نیں! ——— ماں! ——— ابھی پو پھٹنے میں بہت دیر تھی کہ منو کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے سے پہلے وہ اپنی ماں سے گلے مل رہا تھا شاید وہ کہیں جا رہی تھی مگر وہ تو کبھی کہیں نہ گئی تھی۔ آنکھ کھل جانے پر بھی مُنو خواب دیکھے جا رہا تھا اور بڑا فکر مند تھا کہ وہ ابھی ابھی تو یہیں تھی، کہاں چلی گئی ہے؟

اس روز جب مُنو کے مالک نے دفتر جانے سے پہلے مُنو سے پوچھا کہ اتنے اُداس کیوں دکھ رہے ہو منو، تو منو رو دیا، اسی طرح، جیسے پہلے پہل بغل کے پھوڑے کے درد سے رویا تھا۔

"میں اپنی ماں سے ملنے گاؤں جاؤنگا ساب"۔

"ارے ہاں"۔ اُس کے مالک کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اسے کیسے بتائے۔ آخر اس نے سر جھٹک کر کہہ ہی دیا "تمہاری ماں کو مرے کئی مہینے ہو چکے ہیں"۔

کچن کے نل سے پانی بند ہونے سے پہلے تھوڑی دیر بہت سوں۔ سوں کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"میں نے تمہیں اس لئے نہ بتایا مُنو، کہ جانے والی بے چاری تو گئی تمہیں بتا کر دکھ کیوں پہونچاؤں؟"

مُنو کو خیال آیا کہ وہ اُس سے ملنے نہیں جا سکا تو مہینوں ڈھونڈ ڈھونڈ کر آج اُسی نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ اس سے ملے بغیر وہ مر کر بھی ٹھنڈی کیسے ہوتی؟ مُنو نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کے بڑا اطمینان محسوس کیا ——— چلو، جانے سے پہلے مل تو گئی ——— اور باپو؟ ——— اس مہینے میرے باپو کو سو روپئے بھیج دیں ساب۔ اُس کا ہاتھ کھلا ہو جائے گا ——— مُنو ——— مُنو ——— میرا ہیر ڈرائیر کہاں ہے ———

مُنو! ــــ آیا! ــــ اور قریب آؤ ــــ اور ــــ اور

ملک بُوتھ اب مُنو کو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے صاف دکھائی دے رہا ہے لیکن یہاں پہنچتے پہنچتے اسے ڈھائی تین سال لگ گئے ہیں۔

مارکیٹ کے اِس علاقے میں ہر دم بھیڑ لگی رہتی ہے۔ شروع کے ہی نکڑ میں پان کی ایک دکان ہے جہاں رکے بغیر وہ کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ کستوری لعل پنواڑی اس کا بڑا خاص دوست ہے۔ اس کی آمد پر کستوری اُسے ہر بار دیسی پتے کا تین تمباکوں کا سپیشل پان مفت پیش کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اُس کے پان میں وہ خاص گولی بھی ڈال دیتا ہے جسے کوئی عام آدمی کھاتے ہی الٹ جائے مگر مُنو اُسے کھا کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ سوائے اُس کے ہر شخص کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اپنی اوپر کی کمائی کا بیشتر حصہ وہ کستوری کے پاس ہی جمع رکھتا ہے۔ وہ یہ پیسہ مل جل کر کھاتے اڑاتے ہیں۔

"مُنو بادشاہو" کستوری اُس سے کہا کرتا ہے "میں نے بڑے بڑے ناڈو خاں دیکھے ایہہ تمارے جیسا دلدار آدمی میرے دیکھن وچ کبھی نیں آیا"

"خوش رہ جان کی جان" مُنو اُسے جواب دیتا ہے "جس تراں مُنو بادشاہ سر پھِ اِک ہے، اسی تراں میرا یار کستوری بھی کُسر پھِ اِک ہے۔"

"پھر لیو بادشاہو" وہ اُسے خاص گولی والا سپیشل پان تھما دیتا ہے "چکھو کستوری دا ڈبل ڈوجرا تے چڑھ جاؤ اپنے کھٹے سفراں اُتے"

سال سوا سال پہلے مُنو کا گاؤں کا ایک واقف کار کستوری کو بتا گیا تھا کہ تین ماہ پیشتر مُنو کا باپو پرلوک سدھار گیا۔ کستوری سے یہ خبر سن کر پہلے تو مُنو نے سوچا تھا، پھر یہ پچھلے تین مہینے اُس کے پچاس روپے کون سالا وصول کرتا رہا، اور پھر وہ ہنس کر گویا ہوا تھا "سچی بات پوچھو کستوری تو باپو کو پہلے ہی ماں کے پیچھے نکل جانا چاہئے تھا۔ اکیلا اب اس دنیا میں کر بھی کیا رہا تھا۔ پھر اُس نے اپنا سر جھٹک کر خالی کر لیا تھا۔ "چلو کھانکھا کی جسے داری سر پر چڑھی ہوئی تھی، سو ختم ہوئی۔"

"پھر لیو بادشاہو"

پنواڑی سے چند قدم آگے الٹے ہاتھ پر ایک کیمسٹ کی دکان تھی جہاں سے وہ اپنے مالک اور مالکن کے لئے طاقت کی خفیہ دوائیں لے جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے طاقت کی دو گولیاں گرم گرم دودھ کے ساتھ حلق سے اتار لیں اور اتنا بے چین ہوا کہ چھوٹی سے مڈبھیڑ ہوتے ہی بے اختیار اس کی کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی اور جواباً جب وہ خفا ہونے کی بجائے صرف مسکرا دی تو اُسے گویا دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے کھلتے ہی چلے گئے۔ اکثر اوقات چھوٹی اب مُنو سے وہی پان لانے کو کہتی جسے کھا کے وہ ڈولنے لگے۔ ایسے موقعوں پر مُنو اس کے ماں باپ کی خفیہ گولیاں گرم گرم دودھ کے ساتھ نگل لیتا اور چھوٹی کے ڈولتے ہی اسے تھام لیتا، اُس کے تنہا کمرے میں اُسے ساری رات تھامے رکھتا۔

مُنو شروع سے ہی لال پگڑی والوں سے خوفزدہ رہتا تھا۔ ایک سہ پہر کو جب اُس نے مارکیٹ میں ہی حلوائی کی دکان کے پاس ایک چور کو کسی لال پگڑی والے کی پیٹی سے بندھی ہوئی ہتھکڑی میں جکڑا دیکھا تو ان کے قریب سرکتے ہوئے اُس کے دونوں ہاتھ بھی ناف پر از خود بندھ سے گئے۔ پولیس کا سپاہی اُس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا "کیوں، تم بھی چلو گے؟"

وہ حواس باختہ ہو گیا "میں نے کیا کیا ہے سنتری جی؟"

"مجھے سب معلوم ہے تم لوگ کیا دھندے کرتے ہو۔ چلو، آؤ، پہلے مجھے لسی کا ایک گلاس پلاؤ۔"

جب کبھی مارکیٹ کے علاقے میں پولیس کا کوئی سپاہی اپنے بیٹ پر گھوم رہا ہوتا اور ان کی آنکھیں چار ہو جاتیں تو مُنو جھٹ ہی وہاں سے کھسک جاتا، یا پھر اس سے رام رام، کہہ کے بڑی نرمی سے پوچھتا، لسی پیں گے جماں دار ساب؟

ایک سپاہی نے اُس کی لسی پی کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور پھر اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "مجھے تو تم کوئی گورو گھنٹال معلوم ہوتے ہو۔ بتاؤ تمہارا کیا نام ہے؟"

"منو، ہجور۔"

"باپ کا نام؟"

"رادھے رام"

"رام کے ساتھ رادھے کہاں سے آگئی؟ ضرور کوئی پہنچے ہوئے آدمی ہو ــــ خیر کس گاؤں کے ہو، کیا کام کرتے ہو؟ کتنی پگار لیتے ہو؟"

پوری اطلاع مل جانے کے بعد سپاہی اس سے کہنے لگا: "اب تمہارا سارا ریکارڈ میرے دماغ میں جمع ہوگیا ہے۔ چلو، ایک اور لسی پلاؤ ـــــ تمہیں ایسا گُر بتاؤں گا کہ یاد کروگے۔"

"نہیں سنتری جی! میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔"

"اوئے، جا، چپ چاپ لسی کا ایک گلاس اور لے آ۔"

مُنّو ملک بوتھ پر آن کھڑا ہوا ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت یہاں اور کوئی گاہک موجود نہیں ہے، اس لئے یہاں پہنچتے ہی اس کی باری آگئی ہے۔ اس نے پیسے ادا کرکے مشین کی نلی کے آگے خالی ڈول کو رکھا ہے اور ملک بوائے کے ہینڈل ہلانے پر مشین سے دودھ کی موٹی دھار اسی طرح گرنے لگی ہے جیسے بیسیوں ماؤں کے تھنوں کی دھاریں اکٹھی ہو ہو کر نلی سے بہہ نکلی ہوں۔ مُنّو کی ماں اُسے بتایا کرتی تھی، مجھ جیسا بھولا چھوکرا میرے دکھن میں نہیں آیا۔ میں تو اپنا تھن تیرے منہ میں ٹھونستی، پر تو اپنا منہ ہٹا کے میرے دودھ سے کھیلنا شروع کر دیتا   شیر خواری کے دنوں کی یہ عادت ابھی تک مُنّو کے دلوں و دماغ میں جوں کی توں بسی ہوئی ہے۔ اپنے ڈول میں انڈلتا ہوا دودھ دیکھ دیکھ کر وہ انجانے میں ویسے ہی خالی الذہن ہوکر اپنی ماں کے تھنوں سے کھیل رہا ہے اور غوں غاں کئے جا رہا ہے اور خالی ڈول دیکھتے ہی دیکھتے بھر گیا ہے۔

ڈول کو بند کرتے ہوئے اُس نے گویا آپ ہی دودھ سے لبالب بھر کے اپنے سر پر ڈھکن کسا ہے اور گھر لوٹنے کے لئے مڑ گیا ہے۔

کستوری اُسے اپنی دکان کے آگے برتن دھوتے ہوئے نظر آیا ہے لیکن وہ جھکے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے تاکہ دودھ پہنچانے میں دیری نہ ہو جائے۔ ماں کا یار دل کا تو برا نہیں مگر گپّے میں آ جائے تو آگا پیچھا نہیں دیکھتا۔ مالک کی گالیاں سنتے ہوئے اس نے اپنی رفتار بڑھالی ہے۔

"رک جاؤ پادشاہو!" کستوری نے اسے دیکھ لیا ہے۔

"نہیں، کستوری۔" اس نے اپنے آپ کو بریک لگا کر کہا ہے۔ "مجھے دیر ہوگئی ہے۔"

"دیر تو سبھوں کو ہو چکی ہے پادشاہو، اِک بڑی اچھی کھبر سن جاؤ۔"

منو مڑ کر اُس کے پاس چلا آیا ہے۔ "جلدی بتاؤ، کیا ہے؟ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

رات تمارے گاؤں سے اِک آدمی آیا سی پادشاہو۔ بتا ریا تھا تمارے ماں باپ کی موتاں کی کھبریں جھوٹی ایں۔

"اچھا؟" مُنّو خوشی سے اچھل پڑا ہے مگر فوراً ہی یہ سوچ کر اس کا چہرہ گر گیا ہے کہ اب پھر ہر مہینے پیسے بھیجنا پڑیں گے۔ "پر ایک بار اوپر جا کے کوئی نیچے کیسے آسکتا ہے؟"

نیچے سے اُپّر جا سکدا پادشاہو، تے اُپّرسے نیچے کیوں نیں آسکدا؟"

مُنّو وہاں بیٹھتے بیٹھتے پھر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ "مجھے دیر ہو رہی ہے کستوری۔ کام دام پورا کرکے پھر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے اتنے میں مَیں بھی تمارے ڈبل ڈوجرد اسامان سجالوں گا۔"

مُنّو نے اپنے گھر کا رخ کیا ہے اور بڑی تیز رفتاری سے چلنے لگا ہے اور پیچھے سے اس کے باپو اور ماں نے اُسے اپنی بے تاب آوازوں سے پکار پکار کر روک لینا چاہا ہے مگر وہ اپنے اکھڑے ہوئے قدموں سے پیہم تیز تیز چلتے رہا ہے اور جہاں گھر سے نکل کر پورے دس سال میں مارکیٹ تک پہونچ پایا تھا وہاں دس منٹ سے بھی پہلے مارکیٹ سے گھر آ پہونچا ہے اور یہاں پہونچتے ہی دودھ کا ڈول باورچی کو سونپنے کے لئے سیدھا رسوئی خانے کی طرف ہو لیا ہے۔

دودھ کو باورچی کے سپرد کرکے وہ سونے کے کمروں کی جھاڑ پھونک کیطرف متوجہ ہوگیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے گرد آلود جھاڑن کو اکثر اپنے منہ پر بھی مار لیتا ہے۔ اسی دوران تھوڑی دیر میں اُسے رسوئی خانے سے بی بی جی کی آواز سنائی دی ہے۔

"ارے! یہ تو پھٹ گیا ہے۔ باسی ہوگا۔"

"نہیں بی بی جی۔" باورچی نے اپنی مالکن کو جواب دیا ہے۔ "دودھ تو تازہ جاتا ہے۔ برتن کو بھی کھو۔ سا پہونہ رکھا جائے تو دودھ تُرکھٹا ہو جاتا ہے۔"

◆◆

رفعت سروش

دوسرا آدمی

میں یہ کیسے کہوں،
تم مرے دوست ہو،
میرے ہم جسم ہو،
میرے ہمزاد ہو،
تم کہ ہر لمحہ مجھ سے گریزاں رہے
پھر بھی رکھی ہمیشہ مجھی پر نظر
تم کہ لکھتے رہے جھوٹ، سچ
میرے سب راز
میرے گناہوں کا شب نامچہ
اور پھر مجھ کو رسوا کیا کو بہ کو
تم کہ نیلام کرتے رہے
میرا نام و نسب
میری شہرت
میری عزت و آبرو
تم کہ پیتے رہے روز میرا لہو
اور پھر بھی مجھے
مسکرانے پہ مجبور کرتے رہے
راز اپنا چھپانے پہ مجبور کرتے رہے
جھوٹ کا بوجھ اٹھانے پہ مجبور کرتے رہے
دفعتاً مجھ کو محسوس ہونے لگا
ایک مجبور قیدی ہوں میں
اور میعادِ قید کی خضر کی عمر سے بھی زیادہ طویل
مجھ کو ڈھونا ہے یہ جھوٹ کا بوجھ صدیوں تلک

● ۲/۸ ـ ڈی، ڈی ڈی اے فلیٹس، منیرکا، نئی دہلی ۶۷

نشتر خانقاہی

(۱)

اس ہفت روزہ ہاٹ میں جا کر دکاں نہ لے
ہر دم کا کاروبار ہے، شغلِ زیاں نہ لے

پھر سے مراجعت کی توقع، ملن کی آس
لمبا سفر ہے، موم کی بیساکھیاں نہ لے

پسنے سے پہلے راہ نکلنے کی ڈھونڈ لے
پتھر کی اس فصیل کے اندر مکاں نہ لے

محفوظ ہو خود اپنی رفاقت کے لطف سے
واقف نہیں ہے جن سے، وہ تنہائیاں نہ لے

محسوس کر وہ بات جو میں نے کہی نہیں!
پچھلا پہر ہے رات کا انگڑائیاں نہ لے

مانا کہ بے کنار ہے خیمہ نجوم کا
لیکن اس ایک چھت کے عوض آسماں نہ لے

اب وضعِ جاں نثاریٔ یاراں بدل گئی
اچھا یہی ہے دوست مرا امتحاں نہ لے

(۲)

رکن پربتوں پہ تیشہ اٹھائے ہوئے ہیں ہم
اپنے لہو میں آپ نہائے ہوئے ہیں ہم

ہر جسم اک مکان کی مانند ہے، جہاں
کتنی کرایہ دار بنائے ہوئے ہیں ہم

چالاک ہو گئے ہیں پرندے منڈیر کے
جیبوں میں پتھروں کو چھپائے ہوئے ہیں ہم

آسیب بن گیا ہے اندھیرے کا خوف کیوں؟
کیوں دوپہر میں شمع جلائے ہوئے ہیں ہم

کرنا پڑا جو سامنا اپنا کبھی تو پھر!؟
اب تک تو خود کو خود سے چھپائے ہوئے ہیں ہم

ہیں یوں کہ دستخط ہیں تمسک پہ قرض کے
ہر چند سب حساب چکائے ہوئے ہیں ہم

● محلہ پٹھانان، بجنور، یوپی

جدید افسانے کی داستانی فضا

سلیم شہزاد ● ۲۹۶ - ایم - ایچ - بی کالونی مالیگاؤں

عموماً جدید ادب سے اور خصوصاً جدید نظم اور جدید افسانے سے ادب کے قاری کو انکے غیر واضح اور مبہم ہونے کی شکایات عام ہیں کیونکہ دونوں اصناف میں بیانِ واقعہ کے لئے اظہار و اسلوب کی جو نئی تکنیکیں اختیار کی گئی ہیں انہوں نے من و عن بیان کی شرط ختم کر دی ہے بالراست بیانیہ ترک کر دیا ہے حقیقت کو ماورائے حقیقی زاویوں سے دیکھا اور دکھایا جانے لگا ہے، افشائے معنی کے لئے معنی کی ایک ہی سطح پر اکتفانہ کر کے بیان اور بیانِ واقعہ کی متعدد ابعاد دریافت کی جانے لگی ہیں اور خیال کی راست ترسیل اور سریع ابلاغ کے نظریات بے حقیقت ہو گئے ہیں چنانچہ فن افشائے فن کی بجائے فن کی پوشیدگی کے رجحان کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ فن کی اس پوشیدگی نے افسانے سے پلاٹ کردار اور زمان و مکاں کے روایتی تصورات ختم کر دیے ہیں، یہاں تک کہ افسانے سے کہانی بھی غائب ہو گئی ہے ہر افسانہ دھند اور دھوئیں میں لپٹا ہوا سامنے آتا ہے اور دھند اور دھوئیں کے پردے نہ صرف افسانے کے کرداروں کو چھپائے رکھتے ہیں بلکہ ان پردوں کے پیچھے کیا وقوع پزیر ہو رہا ہے، قاری کو اکثر اس کی بھی خبر نہیں ہونے پاتی۔ اس صورت حال کے واقع ہونے میں عصری افکار و خیالات کی کارفرمائی تو ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں فنکار کے ردِ عمل کی کوششیں بھی نمایاں نظر آتی ہیں اور یہ ردِ عمل افسانے میں حقیقت نگاری کے عمل دخل کے خلاف ہے جس سے دامن چھڑا کر دو دہائیوں کے طویل تشکیلی مراحل سے گذرنے کے بعد آج جدید افسانہ اس مقام پر ہے جہاں ادب میں صنفی اکائی کی حیثیت سے ایک صنف اپنا وجود منواتی اور تنقید کو اپنے ظاہر و باطن کی سمت متوجہ کراتی ہے۔

حقیقت نگاری کے خلاف ردِ عمل کا یہ افسانہ فنی اور فکری افراط و تفریط کا شکار، اس کا ظاہر انتہا پسندانہ اور باطن منتشر ہے اور یقیناً اس صنف کا مجموعی منظر نامہ ان علائم کا حامل ہے لیکن خلفشار میں فن کی موجودگی سے بھی انکار ممکن نہیں۔ جیسا کہ شر کی فراوانی میں خیر بھی کسی گوشے میں ضرور سانس لیتا ہوا پایا جاتا ہے اسی طرح دھند اور دھوئیں میں گم جدید افسانوں کے انبار میں متعدد ایسی تخلیقات بھی ہاتھ آئی ہیں جنہیں بلا شبہہ خزف ریزوں میں جواہر کہہ سکتے ہیں۔ اور دھند اور دھوئیں سے معمور یہی فضا جدید افسانے کے ایک اہم تر رجحان کی خالق بھی بن جاتی ہے یعنی افسانے میں داستانی ماحول تخلیق کرنے کا رجحان جو قدم قدم پر نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ قاری کو سرسری گذرنے نہیں دیتا مگر اس کے کوائف کے جائزے سے پہلے ماضی کی افسانوی حقیقت نگاری پر چند باتیں :

ادب میں حقیقت نگاری کی کارفرمائی سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کسان ساہوکار کے قرضوں تلے دبا ہُوا ہے، مزدور کو اس کی محنت کا صلہ نہیں ملتا اور جنسی طور پر ناآسودہ شخص طوائف کے جسم کا استحصال کرتا ہے لیکن یہ معلومات اگر ہم ادب کے توسط سے حاصل کر رہے ہیں تو گویا ہم نے زندگی اور دنیا کا براہِ راست مشاہدہ نہیں کیا ہے ان سماجی طبقاتی مسائل کا حل ہم کسی سیاسی نظامِ فکر میں تلاش کر لیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ہمارا حل یکطرفہ نہ ہو۔ ہم بذاتِ خود کسان، مزدور اور ساہوکار وغیرہ بھی تو نہیں کہ ان کے مسائل کو اپنی ذات پر جھیل رہے ہوں۔ ہم نے تو ان سے پریم چند، منٹو اور کرشن چندر کے افسانوں کی دنیا کے ذریعے تعارف حاصل کیا ہے۔ پس کیا ضروری ہے کہ جن تجربات و مشاہدات سے ہم بالراست گذر سکتے ہوں انہیں بالواسطہ اور وہ بھی ادب کے واسطے سے حاصل کریں جس کے خالق خود ان تجربات کے دور کے شاہد ہوتے ہیں۔ اسی سبب ادبی حقیقت نگاری حقیقت کے بالواسطہ بیانیہ میں بدل کر تجدید کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی معنویت یک سطحی اور اس کا اسلوب صحافیانہ ہوتا ہے۔ موجودہ عصر نے کسان، مزدور اور ساہوکار کے مسائل کو مزید پیچیدہ کر دیا ہے۔ اب ان کے مسائل عام فرد اور بے سمت ہجوم کے

مسائل ہیں چنانچہ ادب کے توسط سے صحافیانہ اسلوب کو بروئے کار لاکر پیش آمدہ حقائق کا بیان، زندگی سے ماخوذ کسی حقیقت کا محض ایک سطحی اظہار نہیں بلکہ ہمہ گیر و ہمہ جہت، تہ در تہ طبعی، نفسی، معاشی، سیاسی اور مذہبی مسائل کی فرد اور مجموعہ پر یکساں اثر اندازیوں کا نئے لسانی اسالیب، تمثیل، استعارہ، علامت اور آفاقی حوالوں کے پیرایوں اور فوٹوگرافی کی طرح یک رخی حقیقت نگاری کی بجائے ماورائے حقیقی زاویوں میں مذکورہ مسائل کی فنکارانہ پیش کش کے روپ میں سامنے آیا ہے۔ اس لحاظ سے جدید افسانے کا رجحان ابتدا ہی سے قدامت کی طرف کشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدید افسانے کی یہ قدامت، اس کے موضوعات سے قطع نظر، جو وہ موجودہ عصر اور زندگی کے جدید تر حقائق سے اخذ کرتا ہے، افسانے کے لسانی برتاؤ اور فنی طریق کار سے متلازم اس کے داستانی، حکایتی، تمثیلی اور اسطوری فضا تخلیق کرنے سے مماثلت و مطابقت رکھنے کا دوسرا نام ہے۔

افسانے میں تخلیق کردہ ماحول کے پُراسرار اور اجنبی ہونے سے داستانی فضا عود کرتی ہے جس میں متحرک کرداروں کے چہروں پر بھی اسرار کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات، ان کے مکالمے اور ان کے توسط سے افسانے کے موضوع کی حرکی کیفیات سب مل کر قاری کے سامنے قدیم داستانوں کی سی ناقابلِ شناخت اور ناقابلِ اعتبار دنیا لا کھڑی کرتے ہیں جو اس کے حواس پر کسی طلسم و افسوں کی طرح نازل ہوکر اسے افسانے کی گرفت میں پوری طرح جکڑے رہتی ہے۔ اس غیر یقینی اور غیر حقیقی ماحول میں جب فرد افسانے کے کرداروں کے اعمال و افعال میں خود اپنے اعمال و افعال کی جھلکیاں پاتا ہے تو یقین و گماں اور حقیقت و افسوں کے ایک دوسرے سے تشابہ سے افسانے سے حاصل ہونے والے اس حظ و طمانیت سے ہمکنار ہوتا ہے جو فن کی تخلیق اور فن کے مطالعے کا مقصد ہے۔

حکایت اپنے ایجاز و اختصار سے فوری تاثر پیدا کرتی ہے۔ افسانے کے حکایتی اسلوب کو بروئے کار لاکر فنکار اس صنف کی مختصر ہیئت میں جدید زندگی کے مسائل کی گہرائیوں اور وسعتوں کو اس طور پر سمو دیتا ہے کہ حکایتی افسانے کے خاتمے پر اچانک قاری کو خود اپنے کسی پیش آمدہ مسئلے کی سی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے سارے کوائف اس کے سامنے عیاں ہو جاتے ہیں۔ حکایت سے ملنے والا "اخلاقی سبق" اس طرز کے افسانے کا بھی خاصا ہوتا ہے جو کبھی تحیر اور کبھی تنوع کی صورت میں ابھرتا ہے۔ اس کے کردار بھی عموماً کسی تصور کی تجسیم ہوتے ہیں جو صورتِ واقعہ کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ بیانیہ اپنی لسانی تشکیل میں مسئلے کی پیچیدگیوں کو نمایاں کرتا چلا جاتا ہے اور روایتی حکایت کی طرح جس کا اخلاقی پہلو عموماً قاری کے ذہن میں یا تو پیشتر ہی موجود ہوتا ہے یا حکایت کے مطالعے کے دوران اس پر منکشف ہوتا جاتا ہے۔ جدید حکایتی افسانہ کسی اخلاقی سبق ہی کی طرح صورتِ واقعہ کے نفس کا قاری پر انکشاف کرتا ہے اگرچہ اخلاقی تدریس و تہذیب اس کا مقصد نہیں ہوتی۔ یہ طرز تو صرف افسانے کی تکنیک کے طور پر برتا جا رہا ہے جو حقیقت بیانی کو محض حقیقت بیانی نہ رکھتے ہوئے حکایت گو اور حکایت طلب دونوں ہی کو عصری مشینیت میں ایک طرح کی ذہنی آزادگی کا تجربہ بخشتا ہے۔

اسی نہج پر تمثیل بھی کام کرتی ہے۔ یہاں بھی تمثیل کے تکنیکی پہلو کو بروئے کار لانا فنکار کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کی ترسیل کے لئے چند تصورات کی تجسیم کر کے انہیں عمل کے لئے نہیں چھوڑ دیتا بلکہ تمثیل کے پیرائے میں جو تخلیق وہ پیش کرتا ہے اس کے ذریعے واضح ہونے والی عصری آگہی افسانے کے متصور تجسیمی کرداروں کے عمل سے اظہار کا روپ پاتی ہے۔ یہ کردار تجسیمی ہوتے ہوئے بھی تجریدی یعنی الف ب، وغیرہ یا جانور، پرندے، درخت یا صرف فرضی داستانی نام ہوتے ہیں اور بظاہر اپنے فطری باہمی برتاؤ کا فطری اظہار کرتے ہیں لیکن ان کے تمثیلی اور علامتی معنوں کی جنہیں کچھ اور مناظر بھی ذہن کے پردوں پر منعکس کرتی ہیں۔ فنکار تمثیلی افسانے میں کاغذی طوطا مینا نہیں اڑاتا اور نہ روایتی طوطا مینا کی کہانی کی طرح تمثیلی افسانے کے طوطا مینا اور کسی شہزادے یا درویش کی بپتا روایت کرتے ہیں بلکہ یہ "طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ" کے مصداق آپ بیتی میں جگ بیتی اور جگ بیتی میں آپ بیتی سناتے ہیں۔ اس طرح روایتی تمثیل کی طرح جدید تمثیلی افسانہ یک سطحی نہ ہوکر مختلف الابعاد معنوں کا حامل ہو جاتا ہے۔

جدید افسانے کی داستانی فضا کے ضمن میں اساطیر اور فرد اور سماج سے جڑی ہوئی مافوق الفطرت روایات کا ذکر ناگزیر ہے۔ افسانے میں دیومالائی کہانیوں کی کارفرمائی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور صرف داستانی فضا تخلیق کرنے سے الگ بھی جدید افسانے میں اسطور بیانی کا رجحان پسندیدہ رجحان ہے۔ یہ کبھی حقیقت نگاری کی طرح اسطور بیانی برائے اسطور بیانی ہوتی ہے، کبھی ایک

مکمل اسطوری واقعہ عصری حقیقت کے بیان کا ذریعہ بن جاتا ہے اور کبھی کسی اسطور کے علامتی معنوں کے ذریعے لمحۂ موجود میں وقوع پزیر ہونے والے کسی سانحے کو حال اور ماضی کے ایک دوسرے پر انطباق سے ہم عصر صورتِ واقعہ کے بیان اور اظہار کا روپ دیا جاتا ہے۔ اس طرح جدید افسانے کی یہ داستانی فضا معروف داستانوں سے ماخوذ واقعات، دیومالاؤں کے مافوق الفطرت کرداروں سے منسوب کہانیوں، مذہبی صحائف میں مرقوم تمثیلوں اور حکایتوں اور عوام میں مقبول توہم پرستانہ روایتوں کے خطوط کی بازآفرینی اور ان کی ازسرِ نو تخلیق سے پیدا ہوتی ہے۔ داستانوں سے منتخب جن کی چند مثالیں یہاں پیش ہیں:

> اتنے میں دس جوان حسین اس قلعے سے نکلے میں انہیں دیکھ کر نہایت متعجب ہوا، اس واسطے کہ دسوں جوان داہنی آنکھ سے کانے تھے اور ایک بڈھا دراز قامت جس کی صورت نہایت متبرک تھی، ہمراہ ان جوانوں کے تھا۔
>
> (قصہ تیسرے قلندر کا: الف لیلیٰ: جلد اول)

تحیر و استعجاب جدید افسانے کی اہم خصوصیت ہے جو افسانے کی ابتداء سے انتہا تک پائی جاتی ہے۔ پرانے افسانے میں یہ خصوصیت وحدتِ تاثر کے نام سے ضرور موجود تھی لیکن عموماً افسانہ نگار افسانے کے اختتام پر اس سے کام لے کر قاری کو چونکاتا تھا۔ آج کے افسانے میں تحیر کی یہ فضا پوری تخلیق پر حاوی ہوتی ہے، قاری مطالعے کے دوران جس کی گرفت میں ہوتا ہے اور مطالعے کے بعد بھی یہ تاثر تادیر قائم رہتا ہے اوپر کی مثال میں "داہنی آنکھ سے کانے دس جوان" اور "ایک دراز قامت متبرک صورت بوڑھا" کسی بھی جدید افسانے کو یہ متحیر کن فضا دے سکتے ہیں۔

> شہزادہ مایوس ہو کر چاہتا تھا کہ کوئی شخص ایسا ملے جو مدد ایسے وقت میں کرے۔ اسی خیال میں شہزادہ کے اندر کہ لب دریا آباد تھا۔ گیا اور دیر تک شہر کے کوچوں اور گلیوں میں پھرا لیکن کسی شخص سے ملاقات نہ ہوئی۔
>
> (قصہ شہزادہ قمر الزماں کا: الف لیلیٰ: جلد دوم)

ہم نوا یا ہم جنس کی تلاش کا موضوع متعدد افسانوں میں برتا گیا ہے۔

> ابوالحسن ساز و سامان اور خواصوں کو با این تکلف اور زرق برق دیکھ نہایت متعجب ہوا اور خیال کیا کہ یہ سب خواب میں دیکھتا ہوں یا بیداری میں۔ اگر بیداری ہے تو میں مقرر خلیفہ ہوں۔ رات کو اس مہمان سے ہنسی میں ذکر خلیفہ ہونے کا آیا تھا، شاید وہی خیال میرے دماغ میں اب تک سمایا ہوا ہے اور واقع میں کچھ نہیں۔ اسی حیص بیص میں آنکھیں بند کر کے قصد سونے کا کیا۔ ایک خواجہ سرا نے نزدیک اس کے آ کے دست بستہ عرض کیا، امیرالمومنین، یہ وقت آرام کرنے کا نہیں ابوالحسن نے یہ سن کر دل میں کہا تم دھوکے میں ہو، سوتے نہیں، یہ عالم بیداری ہے سوتا آدمی بات نہیں سنتا۔
>
> (قصہ سوتے جاگتے کا: الف لیلیٰ: جلد سوم)

"ابوالحسن کی خواب اور بیداری کی کیفیت"، کو جدید افسانے میں فرد کی اپنے ماحول میں اجنبیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جو کچھ عمل اس سے سرزد ہو رہا ہے وہ کسی "ہارون رشید" کے تسلط اور حکم سے ہے۔ اپنی دانست میں چاہے ابوالحسن خود کو "خلیفہ" تصور کر لے لیکن اس پر کوئی بیرونی طاقت ہی مسلط ہوتی ہے جو اسے کبھی خلیفہ اور کبھی ایک عام فرد "ابوالحسن" کی اداکاری کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

> درویش نے بڑی دیر کے بعد جواب دیا: میں اُس مکان سے جسے تم ڈھونڈتے ہو، خوب واقف ہوں مگر تمہاری اس خدمت سے مجھ کو تمہارے ساتھ ایک محبت ہو گئی ہے، اس واسطے میں نہیں چاہتا کہ اُس راہ اور مکان کو تمہیں بتاؤں شہزادے نے کہا: کیا سبب ہے؟ درویش نے کہا کہ اس کی راہ میں بہت خطرات ہیں۔ سوا تمہارے اور بہت لوگ اس جگہ آئے اور مجھ سے راہ اس مکان کی پوچھی۔ میں نے اس راہ کے بتانے میں بہت تامل کیا مگر انہوں نے میری بات نہ مانی اور پوچھنے میں بہت اصرار کیا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر اس راہ کو بتایا۔ اب تم یقین کر کے جانو کہ وہ سب کے سب اس راہ میں ہلاک ہو گئے۔ کوئی شخص ان میں سے صحیح و سالم پھر

ادھر نہ آیا۔

(قصہ شہزادہ بہمن کا: الف لیلیٰ؛ جلد چہارم)

"نامعلوم نصب العین" کی جستجو میں "نامعلوم سمتوں میں سفر" کا موضوع بھی جدید افسانے کا عام سا موضوع ہے۔

یہ کمترین تجارت کی خاطر چلا اور شہر نیم روز میں پہونچا۔ وہاں کے باشندوں کو دیکھا تو سب کا لباس سیاہ ہے اور ہر دم نالہ و آہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کچھ بڑی مصیبت پڑی ہے۔ اس کا سبب جس سے میں پوچھتا، کوئی میرا جواب نہ دیتا۔

(سیر دوسرے درویش کی: باغ و بہار)

ماحول کی اجنبیت اور فرد اور مجموع کی ایک دوسرے سے بے زاری کے اظہار کے لئے مذکورہ مثال میں بیان کی گئی "غیر متعلقانہ" صورت حال کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

— کھانے کو سرپوش طلائی ڈھانپ کر کتے کے واسطے لے گئے اور ایک دسترخوان زربفت کا بچھا کر اس کے آگے دھر دیا۔ کتا صندلی سے نیچے اترا، جتنا چاہا اتنا کھایا اور سونے کی لگن میں پانی پیا، پھر چوکی پر جا بیٹھا غلاموں نے رومال سے ہاتھ منہ اس کا پاک کیا پھر اس طباق اور لگن کو غلام کے پنجرے کے نزدیک لے گئے اور خواجہ سے کنجی مانگ کر قفل قفس کا کھولا ان دونوں انسانوں کو باہر نکال کر کئی سونٹے مارے، کتے کا جوٹھا انہیں کھلایا اور وہی پانی پلایا۔

(سرگذشت آزاد بخت بادشاہ کی: باغ و بہار)

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اس کے سفلی پن پر تیکھے طنز کے لئے باغ و بہار میں مذکور "خواجہ سگ پرست" کا احوال بذات خود ایک عمدہ افسانہ ہو سکتا ہے۔

قضا کار ایک درخت کے نیچے ایک شخص تسمہ کمر میں باندھے، بیٹھا ہوا تھا عمرو کو دیکھ کر باچھیں اس کی کھل گئیں عمرو سے کہنے لگا کہ آؤ بھانجے، میری تیری ملاقات کا ہونا بھی معنمات سے ہے، اس مقام میں ترا پہنچنا تعجبات سے ہے۔ میں نے تو جانا تھا کہ میں خود اور مال بھی تلف ہوا لیکن خدا نے حق دار بھیج دیا، بڑا میرے حال پر کرم۔ عمرو نے مال کا جو نام سنا، دم کو لے رہا، نہیں تو کہا چاہتا تھا کہ میں تیرا بھانجا کاہے کو ہوں، کیوں اجنبی آدمی سے میل مسافرت پیدا کروں۔ عمرو نے اس کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ تو نے مجھے پہچانا نہ ہوگا ——— مکان پر جانے کا قصد ہے جا نہیں سکتا ——— چلنا کیسا، کھڑے ہونے سے بھی جی چراتا ہوں۔ اگر تو مجھ کو اپنی پیٹھ پر لاد کے لے چلے تو مجھ پر دوہرا احسان کرے کہ میں مکان پر بھی پہنچ جاؤں اور تجھ کو تیری امانت بھی سونپ دوں یعنی جواہرات کا صندوقچہ ——— عمرو نے جو جواہرات کے صندوقچے کا نام سنا منہ میں پانی بھر آیا اس تسمہ پا کو اپنی پیٹھ پر سوار کر لیا۔ اس نے پیٹھ پر جاتے ہی اپنے پاؤں کو تسمے کی طرح سے عمرو کی کمر میں خوب لپیٹا اور گھٹنوں سے ایڑیں لگا کر کہنے لگا کہ ہاں میرے رہوار، قدم اپنے بڑھا عمرو ہمہ تن جکڑ گیا۔ ہر چند چاہا کہ ہاتھ سے، اس کے پاؤں کو اپنی کمر سے جدا کرے، اس بلا اور قید سے چھوٹے، اس نے ہاتھوں کو بھی جکڑا ——— عمرو ساری چالاکی اور عیاری بھول گیا، ناچار امیر کی طرف دوڑ ماری کہ امیر مجھے اس بلا سے چھڑا دیں گے وہاں جا کر جو دیکھا تو امیر بھی تمام رفیقوں سمیت اسی مصیبت میں گرفتار ہیں، جو لوگ شہ سواری کا دعویٰ کرتے تھے، ان پر اور لوگ سوار ہیں امیر نے عمرو کو دیکھ کر زبان عیاری میں کہا کہ ہم سمجھے تھے تم اس بلا میں مبتلا نہ ہو گے اور ہم لوگوں کو آ کر نجات دو گے، سو تم بھی گرفتار ہوئے۔

(امیر کا قصد ہندوستان: داستان امیر حمزہ، دفتر اول)

"پیر تسمہ پا" کی یہ حکایت اپنی اصل داستان کے تناظر سے جدا کر کے بھی ایک مکمل افسانے کی حیثیت رکھتی ہے "عمرو" جیسا کہ اس کی معروف

صفت "عیّار" سے واضح ہے یہاں "عیّاری" کی تمثیل ہے۔ "پیرتسمہ پا" "اپنی عیّاری کا آپ شکار" ہونے کا استعارہ اور "ناگہانی ابتلا" اور "بیرون سے لادے گئے جبر" کی علامت بھی ہے۔ "امیر کی مدد پانے کے لئے دوڑنا" عمرو یا کسی فرد کا اپنی ابتلا سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنی دانست میں کسی بااختیار شخصیت کی طرف رجوع کرنا ہے اور خود "امیر کا" "پیرتسمہ پا کا گرفتار ہونا" کسی کے بااختیار نہ ہونے کا اعلامیہ۔ "سواری کا دعویٰ کرنے والوں پر اور لوگوں کے سوار ہونے" کا طنز بالکل واضح ہے۔

جدید افسانہ ان داستانی واقعات کی شکلیں بدل بدل کر جدید زندگی کی تہ داریوں اور ان میں گھرے ہوئے فرد کے مسائل کے اظہار کے لئے انہیں برت رہا ہے۔ فنکار اپنی تخلیق کے لئے ایک موضوع منتخب کرتا ہے جو ظاہر ہے کہ زندگی کے پیش منظر کا ایک جزو ہے، جس کے تمام انفرادی، اجتماعی اور عصری کوائف کو وہ قدیم انسانی تاریخ، مذہب اور عقیدے، فلسفے، عقلی و غیر عقلی روایات اور فنی تلازمات سے متلازم کر کے تخلیقی طریق کار سے گزارتا ہے۔ اس عمل میں اس کی ذاتی فنی اور فکری بصیرت اور معاشرے میں اس کے اپنے تجربات و مشاہدات کی کارفرمائی بھی یقیناً شامل ہوتی ہے۔ موضوع کی جدت کو قدامت کے کسی دورافتادہ پہلو پر محمول کرنے سے اکثر ہوتا یہ ہے کہ موضوع کی پیش آمدہ حقیقت پر اسرار کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ ایک خوابناک فضا تخلیق ہوتی ہے، وہم اور ابہام اس پر مستزاد۔ اس مبہم فضا میں عموماً خوف و خطر، عجوبگی اور آسیبیت کے تاثرات کی فراوانی ہوتی ہے اور جو کردار اس غیر یقینی ماحول میں روبہ عمل نظر آتے ہیں وہ بھی پرچھائیوں سے مشابہ ہوتے ہیں اگرچہ داستان گو اپنی چرب زبانی سے انہیں خوب زرق برق بنا کر پیش کرتا ہے مرد ہو یا عورت، جن ہو یا پری، حسن و خوبی میں لاثانی اور قبح و بدی میں بھی انتہائی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں اور یہ خصوصیت کسی ایک داستان سے مختص نہیں، تمام ہی داستانوں کے جداجدا تمام قصوں کے کرداروں پر اسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ ان کے شہرہ آفاق کردار شہر زاد، امیر حمزہ، عمرو عیار، شہزادہ اسد، افراسیاب اور سندباد وغیرہ محض ہیولے ہیں یا اپنی شخصیت کے خصائص کی تمثیلیں۔ ان کے برعکس حقیقت نگاری کے افسانوی کردار بابو گوپی ناتھ، کالو بھنگی، کیرتی، شمن، چمپا اور خوجی اور آزاد تک احساس و ادراک کی حدود میں آنے والے کردار ہیں، ہمارے اپنے درمیان سے لئے گئے ہیں اور اپنی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ جدید افسانے کے کردار داستانی کردار ہیں بلکہ فنکار اپنی تخلیق میں جن کرداروں کو سامنے لاتا ہے وہ بھی بے نام، بے ہیئت، بے شناخت یا الف، ب، ج، سرخ چہرے والا، سیاہ پوش، نووارد اور اجنبی وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس صورت حال میں ہم انہیں صرف اسی بنیاد پر پہچان سکتے ہیں کہ وہ ہماری زبان میں ہمارے ہی کسی مسئلے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طریق کار سے فنکار چونکہ فن پیش کرتا ہے، کسی واقعے کی اخباری رپورٹ پیش کرنا اس کا مقصد نہیں ہوتا، اس لئے فن کی پوشیدگی جو بالذات فن ہے، اس کا مقصد بن جاتی ہے فن کی اس پوشیدگی میں تخیل کے علاوہ فنطاسیہ کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے جو تخیل کے مربوط لسانی پیکروں کے ساتھ غیر مربوط لسانی پیکر قاری کے سامنے لاتا ہے۔ اس طرح فنکار کے موضوع کی جدت اور قدیم میں موجود کسی مماثل صورت واقعہ سے اس کی ہم آہنگی قاری کو نئے اہتزاز سے ہمکنار کراتی ہے جس کے لیے وہ افسانے یا نظم کا مطالعہ کرتا ہے۔

داستانوں سے ماخوذ مثالوں سے مشابہ جدید افسانوں سے ماخوذ چند مثالیں:

> تتھاگت نے جگ کو نتارنے کے کارن کتنے جنم لیے اور کیسے کیسے دکھ بھوگے۔ ہر ہر جنم میں دیودت ایسے دشٹ پیدا ہوتے رہے اور تتھاگت کے لئے کٹھنائیاں پیدا کرتے رہے۔ سندر سمدر نے پوچھا، "ہے ودیا ساگر، کیا دیودت بدھ دیوجی کا بھائی نہیں تھا؟"
>
> "بھائی ہی تھا" یہ کہہ کر ودیا ساگر پہلے ہنسا پھر رویا۔
>
> "ہے گیانی، تو ہنسا کیوں اور رویا کیوں؟" گوپال نے پوچھا
>
> (کچھوے: انتظار حسین)

مہاتما بدھ کی جاتک تمثیلیں جو کلاسیکیت کی بنا پر ہر عہد میں بامعنی رہی ہیں، ان کے پردے میں آج کے عہد کے دکھ بھوگ کا اظہار بھی نئے معنوی کم انشا کرتا ہے۔ فرد کے اخلاقی، سماجی اور سیاسی افکار کی فنی ترسیل کے لئے جاتک کہانیاں بہترین حامل معنی لوازمات کا کام کرتی ہیں۔ نہ صرف ان کی تمثیلی حیثیت بلکہ ان کے استعاراتی اور علامتی پہلو بھی افسانوی اظہار میں ممد و معاون ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے تخلیق ہونے والی قدیم فضا کا نئے عہد پر محمول کیا جانا ماضی و حال کے ادغام کا پتہ دیتا ہے۔ انتظار حسین خصوصاً اس داستانی تکنیک کو استعمال کرنے میں ماہر ہے۔ وہ نہ صرف قدیم ہندی

ویدک اور بدھ کال کی روایات کی سمت مراجعت کرنا بلکہ عربی ایرانی اور ہندی اسلامی روایات، اعتقادات اور توہمات تک کو افسانوی اظہار کے لئے بالاستحسان استعمال کرتا ہے۔ اس تعلق سے انتظار حسین کا اپنا فنی نظریہ بھی معروف ہے جس سے تقسیم ہند کے واقعے کے المناک پہلو سے ہجرت کا مزید المناک پہلو برآمد ہوتا ہے اور اسلام کے نظریہ ہجرت سے کسی قدر مشابہت رکھنے کے بعد جو ظاہر ہے کہ داستانی رنگوں کو افسانے میں متاثر کن جہات سے آشنا کرتا ہے۔

خوابگاہ میں جاتے ہوئے اس کی مسحور نظریں سیاہ بلی کو نہیں دیکھتیں جس نے اب تمکنت کا چولا اتار پھینکا ہے اور میز پر چڑھی خونخوار درندے کی طرح میز پر پڑے دل کو اپنے پنجوں میں لئے بہت بے دردی کے ساتھ اپنے تیز دانتوں سے نوچ رہی ہے۔ اور نہ ہی اس کی مسحور آنکھیں اس عورت کے بت کو دیکھتی ہیں جس کے جسم کے ساتوں پردے اس کے پیروں میں پڑے ہیں اور جس کا ایک ہاتھ رقص کے انداز میں فضا میں لہراتا جامد ہو گیا ہے اور جس کے دوسرے ہاتھ نے مرد کے کٹے ہوئے سر کو الجھے ہوئے لمبے لمبے بالوں سے تھام رکھا ہے۔

(دواسٹوری: انور سجاد)

"خوابگاہ میں سیاہ بلی کا دل کو نوچنا" اور "مرد کا کٹا ہوا سر اٹھائے عریاں عورت کا بت" جنس زدگی کا استعارتی بیان ہے جس میں الف لیلی کے کسی بھی شبستان کی مشابہ تصویر اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے "مرد کا کٹا ہوا سر تھامے عورت" ہند دیومالا کے توسط سے مرد اور عورت کی نفسی اور عمرانی بنیادوں میں بہت گہرائی تک اپنا اثر رکھتی ہے۔

"ہاں بہت لوگ تھے اور سب اوپر ہی جا رہے تھے، میں نے چلتے چلتے ایک آدمی سے پوچھا: یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے سوچا، یہ سب بھی میری طرح اس درخت کے سائے ہی کے لئے اوپر جا رہے ہوں گے مگر ان کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں اور رفتار سست تھی، جیسے وہ نہ جانے کب سے سیڑھیاں چڑھ رہے ہوں اور اب تھک چکے ہیں۔"

(بچھڑے کا گیت: مسعود اشعر)

"درخت" مختلف سیاق و سباق میں مختلف جدلیاتی لفظ کا کام کرتا ہے۔ یہ فرد کے نصب العین کی تمثیل بھی ہے اور خود فرد کا استعارہ اور تہذیب کی علامت بھی۔

ایک عجیب و غریب گاڑی، سیاہ پردوں میں غالباً کوڑا کرکٹ بھرے شہر کی مختلف سڑکوں سے گذرتی ہے جسکی گاڑی بان خوابیدہ ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی مضافات سے ہوتی شہر سے گذرتی ہے ــــــ میں نے تصور میں دیکھا کہ میں اندھا دھند اس گاڑی کی جانب بھاگا جاتا ہوں اور اس کا پردہ ہٹاتا ہوں، اندر دیکھتا ہوں ــــــ اندر کیا ہے؟

(سواری: خالدہ حسین)

اقتباس کے سیاسی پس منظر سے قطع نظر نا آگہی کے زیر اثر نامعلوم کو جاننے کی دھن اس سطور سے واضح ہے۔

وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا

وہ سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے کہ ان سب کو نہ مسکرائے اتنا عرصہ بیت گیا تھا کہ اب انہیں یہ یاد ہی نہ رہا تھا کہ انسان کی مسکراہٹ اور جانور کے دانت نکوسنے میں کیا فرق ہے یقیناً یہ کوئی پاگل ہے جو ان حالات میں بھی مسکرانے کی ہمت رکھتا ہے بعض نے سوچا، کہیں یہ کوئی چھلاوا نہ ہو یا اگیا بیتال نے انہیں ڈرانے کے لئے یہ روپ اختیار کی ہے۔

(عذاب میں گرفتار بستی۔ سلیم اختر)

کسی فطری یا غیر فطری ابتلا کے اثر میں جینے والے افراد اس کے عادی ہو جائیں تو ایسی فضا میں تھوڑی سی تبدیلی بھی وسوسوں کو جنم دیتی ہے جن لوگوں کے لب ہنسنا مسکرانا بھول گئے ہوں، وہ اچانک کسی کے لب متبسم دیکھ لیں تو انہیں مسکرانے والے کا وجود مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے۔

صبح ہوتی، دن چڑھتا اور جب ٹھیک سمت النہار پر پہنچتا، شہر میں ایک ایسی گاڑی آتی جو شہر کے پرندوں کو

پکڑ کر لے جاتی ـــــ یہ گاڑی جو چاروں طرف سے رنگین شیشوں سے بند بے حد خوبصورت ہوتی، اس کے چاروں طرف ننھی ننھی گھنٹیاں بندھی ہوتیں جو چلتے وقت دھیرے دھیرے بج رہی ہوتیں۔ گھنٹیوں کی آواز عجیب ہوتی۔ کچھ ایسی جیسے کوئی سحر پھونک رہا ہو۔ ایک لمبا، خمیدہ کمر زرد رو آدمی گاڑی کو کھینچ رہا ہوتا۔ بالکل اسی طرح دوسرا آدمی گاڑی کے پیچھے چل رہا ہوتا۔

(پرندہ پکڑنے والی گاڑی : غیاث احمد گدی)

"پرندہ"، اپنی خوش رنگیوں اور خوش الحانیوں کے سبب فطرت کی خوش رنگیوں اور خوش الحانیوں کا استعارہ، فطرت کے اسرار کی علامت اور فرد کے جذبات و خواہشات کی تمثیل ہے جسکا دو دبیز شکلوں کے ذریعے پکڑ کر قید کر دیا جانا فطرت کی پاکیزگی اور معصومیت کے آلودہ ہونے اور فرد کے جذبات و خواہشات کے کچل دیے جانے کے مترادف ہے۔

لیکن جب بادشاہ ایک بچے کے قریب سے گزرا جو اپنے دادا کے کندھے پر سوار، بادشاہ کو دیکھنے کے لئے ضد کر کے گھر آیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، تو وہ بادشاہ کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا: ارے یہ تو ننگا ہے۔

(پوشاک : اقبال مجید)

حکایت اپنے اختصار اور اخلاقی سبق سے قاری کو متاثر کرتی ہے مقتبس سطور اگرچہ روایتی حکایت ہی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں لیکن عصری تناظر میں افسانہ نگار نے اسے سیاسی طنزیہ کے لئے افسانے کے کینوس میں جگہ دی ہے اور ـــــ "بادشاہ سب کچھ جانتا ہے، بادشاہ سب کچھ سن لیتا ہے اور بادشاہ بہت دور تک دیکھتا ہے" کہہ کر حکایت کے بظاہر مختصر کینوس کو ذہن و بصیرت کی وسعتوں پر حاوی کر دیا ہے۔

اس اطلاع پر اس کا بدن گھٹنے لگا، گھٹتا رہا اور پھر میرے بستر سے سیاہ ناگن کٹ بیگ کی طرف رینگ رہی تھی۔

(ڈوبتا ابھرتا ساحل : شفق)

ایک وجود کی دوسرے وجود میں تبدیلی یا قلب ماہیت قدیم کہانیوں ہی سے مستعار وہ تمثیلی عمل ہے جو ایک وجود کا عمل دوسرے میں ظاہر کرتا ہے۔

تبھی ایک کونے سے ایک پستہ قد زرد فام مینڈک ٹرا کر کہا "میں دیکھ سکتا ہوں، بلندی سے میں ندی کا نظارہ کر سکتا ہوں" تمام مینڈک اس زرد فام مینڈک کی طرف مڑے۔ وہ پندرہ بیس مینڈکوں کے کاندھوں پر چڑھا، سینہ پھلائے نہایت حقارت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، "اے دانائے راز، کیا میں ان تمام سفالی ہستیوں سے سربلند نہیں ہوں کہ یہ ندی کراں تا کراں میری نگاہ کی زد میں ہے۔

(ندی : سلام بن رزاق)

پنچ تنتر کی تکنیک کا یہ فنی استعمال ہے تمثیل، حکایت اور قصہ وغیرہ بیک وقت جس کی ترسیل کے ذرائع ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کی زبانی جو دراصل انسانی حقائق کی رمز بیانی کرتے ہیں، سیاسی طنزیہ کے اظہار کے لئے پنچ تنتر کی تکنیک قدیم ہی سے موثر ذریعہ خیال کی جاتی ہے۔

سامنے کی دیوار سے ملے ہوئے تین، مبہم سفید سے ہیولے نظر آئے۔ تینوں کے لباس سفید، جسم اور سارے بال اتنے سفید کہ وہ دیوار کی سفیدی کا جزو بن گئے تھے اور اتنے نزدیک آجانے کے بعد بھی وہ صرف وہم معلوم ہوتے تھے۔ ان کی سفید پتلیاں بے جان انداز میں سامنے کے کھلے ہوئے دروازے کے باہر ٹنگی ہوئی تھیں۔

(طلسمات : قمر احسن)

آپ اپنی جستجو کی رائیگانی اور نسل در نسل افراد کی کوششوں کی لا حاصلی سفیدی کے تصور سے اجاگر کی گئی ہے الف لیلیٰ کے شہزادہ بہمن کے قصے سے لی گئی مثال سے ان سطور کا موازنہ کریں تو دونوں کی یکسانیت واضح ہو جاتی ہے۔

وہ پریشان ہو گیا تھا، اٹھنا، بیٹھنا، راستہ چلنا، یہاں تک کہ سانس لینا دشوار ہو گیا تھا، ہر طرف جالے ہی جالے تھے۔ نظر نہ آنے والے جو ہاتھوں اور چہرے سے چپک کر کراہیت کا احساس پیدا کرتے تھے۔ چلتے چلتے ایکدم

وہ رک جاتا اور ہوا میں ہاتھ مارنے لگتا، پھر ہاتھ صاف کرتا اور چلنے لگتا، پھر رک جاتا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
جیسے کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا ـــــ ایک صبح اس کے ساتھ ایک عورت دیکھ کر لوگ اپنے کھیل تماشے بھول گئے۔ عورت
بھی مرد کی طرح ہوا میں سے جالے نوچ رہی تھی ـــــ تب بستی والوں نے سوچ بچار کر ایک شخص جو دانا دچالاک تھا
ان دونوں کا اتا پتا معلوم کرنے کے لئے، ان کے پیچھے لگا دیا ـــــ وہ تینوں ہوا میں سے جالے نوچ رہے تھے۔ مرد، عورت
اور دانا شخص۔

(دیدۂ بینا نہ ہوا: شرون کمار ورما)

"نظر نہ آنے والے جالے"، نظر نہ آنے والے خوف، فرسودگی اور زوال کی علامت ہیں۔ ان میں گھرے ہوئے بستی کے لوگوں کو جو ان کی موجودگی سے بے خبر جیسے جا رہے ہیں، ان جالوں کی خبر دینے اور جالے تخلیق کرنے والی مکڑی کی تلاش پر اکسانے کے لئے کچھ اہل بینش بھی موجود ہیں لیکن بستی کی بستی تو وہ شعور نہیں رکھتی کہ ماورائیت میں دیکھ سکے۔

لیکن اس شہر کا سب ہی کچھ نرالا تھا۔ نہ تو شہری تھے نہ جانور، نہ پرندے نہ پھول، نہ ہوا تھی، نہ پانی تھا بس تھا تو
وہ سیاہ پوش جو گھنٹہ بھر سے مجھے چھڑی کے اشارے پر نچائے جا رہا تھا ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گدھا اپنے سائز میں
بڑھنے لگا۔ پہلے تو وہ مرغ کی جسامت کو پہونچا پھر شتر مرغ کے برابر ہوگیا۔ سیاہ پوش نے اپنی جیب سے ایک چھلا نکالا
اور اسے گدھے کے بائیں پیر میں پہنا دیا ـــــ سیاہ پوش نے اپنے کوٹ کی جیب سے مٹھی بھر کالے مونگ نکالے، ان پر دم کیا اور
وہ مونگ گدھے کی سمت ہوا میں اچھال دیے۔ پھر کیا تھا، تمام آسمان گدھوں سے ڈھک گیا ـــــ آن واحد میں اس گدھے کا
سائز قد آدم کے برابر ہوگیا ـــــ مرد، عورتیں، بچے غرضیکہ اس تابوت میں سے پورے کا پورا شہر برآمد ہوگیا۔

(طلسم آباد: انور قمر)

"طلسم آباد"، جبر، تسلط، غلامی، پسماندگی، کسمپرسی اور بے چارگی کی تمثیلی کہانی ہے "سیاہ پوش"، اس بستی کی حرکات وسکنات، اعمال وافعال اور زندگی کا ذمہ دار ہے اور یہ ذمہ داری بھی وہ خود کسی کے تسلط کے تحت نبھا رہا ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ ایک لق و دق صحرا ہے۔ چار سو ریت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور پھونکتا سورج، وہ آنکھیں جھپکاتا ہے ـــــ اب
کیا دیکھتا ہے کہ بھرا بازار ہے، کھوے سے کھوا چھل رہا ہے، خریداروں کا ہجوم، دکانیں رنگارنگ اشیاء سے لدی پڑی ہیں۔
ـــــ کیا دیکھتا ہے کہ باغ یا باغیچے ہیں پھل دار پودے ہیں، رنگا رنگ پھول ہیں، بھوک سی محسوس ہوتی ہے۔ آگے بڑھ کر پھل توڑتا ہے منہ
میں ڈالنے لگتا ہے تو پھل پتھر کا نکلتا ہے۔ بازار میں آتا ہے تو دکانیں چیزوں سے بھری نظر آتی ہیں، ہاتھ لگاتا ہے تو مٹی ہو جاتی ہیں۔

(بے دروازہ سراب: رشید امجد)

کردار وعمل کا فقدان، ہجوم میں رہ کر فرد کی تنہائی، مصنوعات کی فراوانی لیکن سب میں اصلیت اور فطری پن کی عدم موجودگی کا یہ اظہار براہِ راست کسی داستان سے برآمد شدہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زبان اور اسلوب بھی داستانی ہے۔ نئے فنکاروں میں رشید امجد، قمر احسن، شرون کمار ورما اور انور قمر وغیرہ اس حقیقت سے آگاہی رکھتے ہیں کہ افسانے میں جو فضا خلق کرنی ہو اس کے لئے اسلوب بھی مناسبت رکھتا ہوا ہونا ضروری ہے چاہے اس عمل میں زبان قدیم ترکیبوں نہ برتنی پڑے۔

اوپر سے دو بے حد خوبصورت کاسنی رنگ کے کبوتر اتارے گئے اور انھوں نے ایک کوڑھ زدہ شہر کو دیکھا ـــــ "ان دونوں
کبوتروں کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم ان کے ساتھ پستیوں میں اترنا چاہتے ہیں۔"

(شہر ملامت: مظہر الزماں خاں)

قوم لوط کا واقعہ بذاتہ ہم عصر تمثیل کا بدل ہو سکتا ہے۔ افسانہ نگار نے اسے استعارۃً قبول کیا ہے۔ یہاں سدوم میں نازل ہونے والے فرشتے کبوتر بن گئے ہیں۔ کہ عموماً مصوری میں فرشتوں کو کبوتروں ہی کی شکل میں مصور کیا جاتا ہے۔

ہوا یوں تھا کہ ایک دن بستی کے لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ جو کام اپنے داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں وہ ان کا بایاں ہاتھ انجام

دھیرے دھیرے مفلوج ہو رہا ہے۔ شروع شروع میں لوگوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ کی اور اسے اپنا وہم سمجھا مگر آہستہ آہستہ انھیں محسوس ہوا کہ کوئی ان دیکھی قوت ان مخصوص کاموں کو بھی بائیں ہاتھ سے انجام دینے پر مجبور کر رہی ہے جنھیں وہ ہمیشہ سے دائیں ہاتھ سے کرتے آئے ہیں اور ان کا دایاں ہاتھ دھیرے دھیرے مفلوج اور پھر معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

(ایک ہاتھ کا آدمی: انجم عثمانی)

"وہ اپنی آنکھ سے کانے دس جوانوں" کا حوالہ پیش نظر رہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جدید افسانہ داستان سے کس قدر متاثر ہے یہ نہ صرف اپنے اظہار، موضوع اور زبان و اسلوب کے لحاظ سے بلکہ اپنی خارجی اور داخلی ہیئت کے اعتبار سے بھی متعدد داستانی خصوصیات کا حامل ہے۔

نووارد ــــــ درخت سے بندھے ریچھ کو نوجوان کے سامنے آیا اور کہنے لگا، تمھیں اس ریچھ پر سوار ہو کر پہاڑی راستوں سے گذرنا ہوگا۔ راستے میں ایک فلک بوس پہاڑ پر پرچم نظر آئے گا اور اس پہ انسانی کھوپڑیاں اور گردنیں نظر آئیں گی۔ تم گھبراؤ نہیں، تم وہاں سے دائیں طرف بڑھو، وہاں ایک اور بڑا پہاڑ نظر آئے گا۔ اس پر چڑھو اور دیکھو کہ پہاڑ کے نیچے روشنی ہے یا نہیں۔

(کہانی در کہانی: حمید سہروردی)

"ریچھ پر سوار ہو کر پہاڑی راستوں سے گذرنا" منہ زور قوتوں کو قابو میں لا کر اپنی مشکلات سے ان کے ذریعے آسان گذرنے کا استعارہ ہے۔ "روشنی کی تلاش" میں یوں تو کوئی ابہام نہیں لیکن انسانی کھوپڑیوں کے پہاڑ کے بعد ایک اور بڑا پہاڑ پار کر کے روشنی کا حصول "سنہری چڑیا" کے حصول کی طرح ایک دشوار امر ضرور ہے۔ ان مثالوں سے جدید افسانے کی داستانی فضا پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے جس کی تخلیق میں فنکار اپنے تخیل اور فنطاسیہ دونوں کو استعمال کرتا ہے جس کی تخلیق کا مقصد قدیم و جدید کو ایک دوسرے پر محمول کرنا اور قدامت کے توسط سے جدت کے نئے معنی تلاش کرنا ہے جس کی تخلیق کے لئے جدید افسانے میں داستانی روایات کی بازیافت اور بازنمود کا عمل کبھی براہ راست داستانی اسلوب میں اور کبھی الہامی کتابوں کی زبان میں اپنی تدریج سے گذرتا ہے اور کبھی فنکار اپنی بصارت اور بصیرت کے امتزاج سے ذاتی اسطور سازی کی طرح کسی داستان گو کا کردار نبھاتے ہوئے خود اپنی فنطاشیائی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اظہار اور ہیئت دونوں ہی پہلوؤں سے جدید افسانے کا رجحان داستان کی بازتخلیق کا رجحان ہے۔ اظہار کی سطحوں پر جس کے عوامل ہیں زبان و اسلوب کا داستانی استعمال اور افسانہ نگار کا قصہ گو یا داستان گو بن جانا یعنی افسانے میں بیانیہ پہلو کی موجودگی یہ بیانیہ بلاواسطہ اور بالواسطہ، سرگذشت اور سوانحی یا دوسرے لفظوں میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہی کا امتزاج ہو سکتا ہے کہ اسی تکنیک سے بیانیہ میں افسانہ در افسانہ کی خصوصیت پیدا ہوتی ہے جو داستان کی ایک معروف خصوصیت ہے اور جس سے داستان کی ہیئت تشکیل پاتی ہے۔ مختصر صورت میں افسانہ اسی تہ در تہ واقعاتی پہلو کے سبب اپنی داستانی ہیئت پاتا ہے۔

مشہور ہے کہ افسانہ زندگی سے ماخوذ کسی ایک واقعے کا فنکارانہ بیان ہے لیکن جدید افسانے میں واقعے کی تہ در تہ کیفیت اسے محض ایک واقعے کا بیان نہ ہو کر ایک ہی واقعے کے تمام انسلاکات کا فنکارانہ بیان بنا دیتی ہے۔ اور اس عمل کے لئے فنکار واقعے کی گرہیں اس طرح کھولتا ہے (ضروری نہیں کہ واقعے کی گرہیں کھولی ہی جائیں، عمل اس کے برعکس بھی ممکن ہے) کہ کہانی میں کہانی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ مجرد واقعہ جدید افسانے کا موضوع نہیں بنتا بلکہ واقعے کی وقوع پزیری میں متحرک طبعی اور نفسی عوامل بھی اظہار سے گذرتے ہیں اس طرح ایک کہانی اپنے اسرار کے انکشاف کے لئے دوسری کہانی کو اور دوسری کہانی تیسری کہانی کو خیال کی کمک پہنچاتی ہے اور کثرتِ خیال میں وحدتِ خیال کا تاثر پیدا ہو کر مختلف تاثرات کسی واحد تاثر کا ارتکاز کرتے ہیں۔ مرکزی واقعہ قائم رہتا ہے اور تخیل اور تصور صورتِ واقعہ کو صرف یقینی یا صرف غیر یقینی نہیں بناتے جیسا کہ بعض فنکاروں کے یہاں ایک اور بعض کے یہاں دوسری صورت واضح طور پر مشاہدے میں آتی ہے۔ اول الذکر فنکار لفظوں کا طلسم سجا کر واقعے کو یقینی بنانے کی کوشش میں روایتی داستان سرائی کرنے لگ جاتے ہیں، اور مؤخر الذکر واقعاتی حقیقت کو الف ب ج کرداروں اور دھند اور سناٹے کے ڈرامائی عناصر کی مدد سے غیر یقینی بنانے کی دھن میں ذہنی خلفشار کا پیرایۂ ربطِ بیان کا غدر یہ آثار دیتے ہیں۔ افسانے میں بھی یقینی یقینی اور غیر یقینی غیر یقینی ہی ہوتا ہے لیکن ان کا فنی اظہار یہ ہے کہ ایک میں دوسرا مدغم ہو جائے روایت حقیقت اور حقیقت روایت کا روپ دھار لے اور سارے داستانی رنگوں کے باوجود افسانہ افسانہ ہی رہے۔

کمار پاشی

اردھانگنی کے نام : کچھ نئی نظمیں

■

کاش تو میری ماں ہوتی
اور تو نے مجھ کو
اپنے گربھ سے
پہلا جنم دیا ہوتا

پہلا جنم
نہ جانے کب ، اور
کہاں لیا تھا میں نے
مجھ کو یاد نہیں ہے
تجھ کو بھی کچھ یاد نہیں ہے
پہلا جنم تھا میرا
یا پھر تیرا
آنے والے وقتوں میں رہنے والوں کو بھی
شاید معلوم نہ ہوگا
لیکن میں تو کہہ سکتا ہوں
آنے والے کسی بھی لمحے میں
جب تو مجھ سے بچھڑے گی
یہ جگ مگ سی ، سندر کائنات
اسی لمحے اجڑے گی ۔

■

یہ جیون دھوپ بھرا دن ہے
اور تو اک شام سہانی ہے

یہ یگ تو پت جھڑ کا یگ ہے
تو بسنت رت کی نشانی ہے

گمبھیر ، وشال ، مقدس تو
تجھ میں گنگا کی روانی ہے

آکاش سے بھی پہلے کی تو
تو دھرتی سے بھی پرانی ہے

ترے اندر مرا فسانہ ہے
مرے اندر تری کہانی ہے

جس بات سے تجھ کو دکھ پہنچے
ہر بات وہ تجھ سے چھپانی ہے

تو ساتھ تو جگ مگ سب رستے
تو نہیں تو خاک اڑانی ہے

■

موسم
پہلے بھی آتے تھے
موسم تو
پھر بھی آئیں گے
موسم تو
آتے رہتے ہیں
گھر گھر ، آنگن آنگن میں
کھلتے رہتے ہیں

لیکن وہ دن کیسا ہوگا ؟
جس دن
سارے موسم
ملنے ہم سے
ہمارے گھر آئیں گے
اور بن ملے
چلے جائیں گے ۔

■

ہولے ہولے پھول گرے
کچھ پلکوں پر
کچھ ہونٹوں
کچھ رخساروں پر

جہاں پھول گرا
وہاں پھول بنا
پھر پھولوں کی اک سیج بنی
اور سیج پہ سندر پھول کھلے

اک پھول تھا میرا
اک تیرا
پھر دونوں میں کچھ بات ہوئی
پھر رات ہوئی
ہولے ہولے
ہم دونوں پر
پھر کرنوں کی برسات ہوئی
ہر رات ہوئی ۔

(ماہیا)

■

اک پھول جو اپنا ہے
یہ جیون رات کڑی
تو سندر سپنا ہے

اک باغ کا رستا ہے
تری انگلیاں چھونے کو
ہر پھول ترستا ہے

آکاش میں تارے ہیں
رادھا ہو کہ میرا ہو
سب روپ تمہارے ہیں

بر تم میں سماتا ہوں
تنہائی میں جب تم کو
سینے سے لگاتا ہوں

۳۵۷۱- دہلی گیٹ ، دہلی - ۲

دبشیم

کنور سین ● ۴۳-ای ویسٹ پٹیل نگر - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

سڑک پر لاش پڑی تھی۔ لاش سڑک کے عین بیچ پڑی تھی۔

بستی بڑی تھی اور سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کا تانتا لگا ہوا تھا پیدل چلنے والے بے شمار۔ ہر کسی کے سینے میں دل تھا اور چہرے پر آنکھیں۔ دل دھڑکتا تھا اور آنکھیں دیکھتی تھیں۔

سڑک پر آنے جانے والے جلدی میں تھے۔ شاید سڑک پر چت ہو جانے سے پہلے لاش بھی جلدی میں تھی۔ اب اس کی کھوپڑی چٹک گئی تھی۔ کھوپڑی میں سے نکلا سیاہی مائل گلابی گودا سڑک کی کالکھ میں جذب ہونے لگا تھا۔ پیٹ پر سے پہلے اکہرا پھر دوہرا پہیہ گذر گیا تھا۔ اس میں اور پیٹھ میں فرق باقی نہ رہا تھا۔ آنتیں جھلی میں تبدیل ہو کر سڑک سے چپک گئی تھیں۔ ایک بازو آدھا رہ گیا تھا دوسرا بالکل پس چکا تھا۔ چہرہ، ناک، دانت اور آنکھوں سے عاری ہو گیا تھا۔ لاش کیا تھی گوشت پوست کا ملبہ تھا۔

لاش صبح سے سڑک پر پڑی تھی۔ اب دوپہر ہو گئی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر ملگجی رنگ کی سنگین عمارت تھی۔ عمارت میں وہ براجمان تھا۔ لاش کو اسی کا انتظار تھا۔ بستی میں ہونے والے ہر حادثے کو اسی کا انتظار رہتا۔ وہ جو توانا تھا اور چاق و چوبند بھی۔

کیا سماں تھا۔

سمندر پر چھائی بے پایاں سیاہی۔
فضا میں گونجتا کیتکی کا قہقہہ۔
دبیشم کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ

بات دراصل دبیشم اور فلسفی کی رہی کیتکی تو بس آخر میں بے دامن چٹان پر یا بے پیندے کی کشتی میں بھونڈا قہقہہ لگاتی نظر آئی۔ ناٹک کا سین ختم ہوتے ہی غیب سے آ ظاہر ہونے والی کیتکی۔

جنگل میں دبیشم سیدھا کھڑا نہ ہو سکتا تھا وہ جھک کر چلتا — جانور سے ڈرتا۔ حیوان اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اور دبیشم کوشش کرنے پر بھی حیوان سے بچ نہ پاتا۔

جانور کے خوف نے ہی دبیشم کو گنتی کی اہمیت جتائی۔ جنگل جانوروں سے بھرا پڑا تھا۔ بھیڑیوں کے غول، شیروں کے جھنڈ، اژدہوں کے جھرمٹ۔ پتہ نہیں کون کون سے جانور تھے اور کتنی تعداد میں تھے۔ دبیشم کے ساتھ بس الکا تھی۔

بھیڑیا تھا کہ دبیشم کے تعاقب میں رہتا۔ ایک پل کو بھی پیچھا نہ چھوڑتا۔ دبیشم کو محسوس ہوتا کہ رات کو الکا کے ساتھ سوتے وقت بھی اُن دونوں کے بیچ بھیڑیا لیٹا ہوا ہے۔ زندہ بھیڑیا۔ خونخوار آنکھوں، نوکیلے ناخنوں، سُرخ زبان اور بھیانک جبڑوں والا بھیڑیا جس کی آنتیں دبیشم کو دیکھتے ہوئے کُلبلاتی رہتیں۔

جانور کے علاوہ موسم کی چیرہ دستیاں تھیں۔ جما کر رکھ دینے والی سردی، جُھلس ڈالنے والی لُو، بے حال کر دینے والی بے پناہ بارش۔

دبیشم کے جسم پر بالوں کی جیکٹ تک نہ تھی۔ لے دے کر اندھا غار تھا یا درختوں کا بے مہربان سایا۔

دبیشم نے فولاد اور کنکریٹ کی بنی لمبی چوڑی بستی کو دیکھا اور وہ وشوکرماں کا کندھا تھپتھپانے لگا۔ ساتھ ہی اسے وقت کا خیال آنے لگا۔

مقام کے سینے پر چت لیٹا ہوا وقت!

دبیشم آگ کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا لیکن اسے اس کی اہمیت کا علم نہ تھا۔ وہ تو اُس کے بچے سے کچے گوشت کا ٹکڑا اچانک آگ میں گر گیا اور اُس کا ذائقہ بدل گیا۔ دبیشم کو بھنے ہوئے گوشت کی لذت نے پاگل کر دیا۔ اُس نے بچے کو اُٹھایا اور ہُو ہُو کرتے ہوئے اُسے آگ میں ڈال دیا۔

دلبشیم کے اپنی اولاد کے ساتھ کیے سلوک کو دیکھ کر فلسفی کانپ اٹھا تبھی فضا میں کیتکی کا قہقہہ گونجنے لگا اُسے سُن کر فلسفی کی گنجی کھوپڑی پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں حالانکہ سخت جاڑا پڑ رہا تھا اور آس پاس جما ہوا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف قصابوں کی دُکانیں تھیں۔ ان کے دروازوں پر تھے کھال اُترے بنا سر کے لٹکتے ثابت بکرے سیخوں میں پروئے ہوئے مسالے چڑھے مُرغوں اور چُوزوں کی لمبی قطاریں۔ اپنی گدیوں پر بیٹھے گوشت کا قیمہ بنانے میں مصروف قصائی جن کی آنکھیں خالی تھیں اور جن کے ہاتھ مشین کے اَن تھک پرزے تھے۔ ان کے کارندے بکرے کے گوشت اور مُرغے کا رس نکالنے میں جُٹے ہوئے تھے۔ کئی ایک دُکانوں کے باہر تندوروں میں مُرغ مسلّم بھُون رہے تھے دکانوں کے کونوں میں بھٹیوں پر چڑھی کڑاہیوں میں ابلتا تیل تھا اور اُس میں تلی جا رہی بے تاب مچھلیاں تھیں اور تھی دہکے کوئلوں پر بھنے جا رہے کباب کی پھیلی ہوئی بُو۔

یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ دلبشیم، فلسفی اور کیتکی کی تکون کیسے بنی۔

لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ فلسفی کے رونے پر کیتکی کیوں ہنستی ہے

ایک کہانی یہ بھی ہے کہ جب سورج پہلی بار طلوع ہوا اور جنگل نے پہلی بار آنکھ کھولی تو کیتکی نے دیکھا وہ ایک جزیرے میں پوکھر کے کنارے کھڑی ہے۔ پوکھر میں گنجا فلسفی تیر رہا ہے۔ وہ اُسے بار بار پار کر رہا ہے اور عجیب احساس سے بھرتا جا رہا ہے۔ کیتکی کو دیکھ کر تو اُس کا وجود اور بھی پھل اُٹھا جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

سورج دوسری بار طلوع ہوا تو کیتکی نے دیکھا پوکھر کی جگہ ندی بہہ رہی ہے فلسفی لہروں سے کھیلتا ہُوا اپنے سے بھی دور نکل گیا تھا۔ ندی اور جنگل کے بیچ کھڑی کیتکی چلّا اُٹھی تھی۔

کیتکی کی آواز نے فلسفی کو چونکا دیا۔ وہ سب کچھ بھُول کر کیتکی کو دیکھنے لگا لیکن اگلے ہی پل وہ کیتکی کو بھُول کر پھر لہروں کو پُچکارنے لگا

فلسفی کو مسکراتے دیکھ کر کیتکی نے قہقہہ لگایا اور آس پاس سہم کر رہ گیا۔

قہقہے کو سنتے ہی فلسفی ندی کو بھول کر اپنے میں اُتر گیا۔ اُس کے سامنے تھا طُلوع اور غرُوب کا سلسلہ اور عروج و زوال کی داستان ماضی کا افسانہ اور مستقبل کی کہانی کے ساتھ ساتھ حال کی حکایت

قصّہ اس روح کا جو ہمیشہ قالب کی تلاش میں رہی۔ اس کے علاوہ تھی محدود اور لامحدود کی تمیز، ازل اور ابد کا فرق، موت کی چاپ اور زندگی کا سنّاٹا۔

فلسفی حیران ہو اُٹھا:

اتنا کچھ جانتے ہوئے بھی ایک بھی جاندار اپنے وجود سے مُنکر ہونے کو تیار نہیں۔

وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا اور وقت اور مقام اِتہاس کے قالب میں ڈھلنے لگے۔ ایک کے بعد دوسرا چولا بدلنے لگے۔

دن ڈھلنے لگا۔ مسافت کی مار سے گھبرایا ہوا سورج مغرب کے اندھیروں کی طرف ہو لیا۔ اُس کی سُرخ دمک دیکھتے ہی دیکھتے پیلی ہو گئی۔ آخر وہ رات کی سیاہی میں کھو گئی۔

بستی پر پھیلتی رات کے ساتھ لڑتی مصنوعی روشنی اُسے اور بھی بھیانک بنا رہی۔ ادھر لاش تھی کہ ابھی تک سڑک پر پڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا سڑا ہوا وجود بھی کھو رہی تھی۔

فلسفی نے اگر جاندار کے انکار کی بات نہ جان لی ہوتی تو وہ اِتہاس کو عقیدہ مان بیٹھتا یا اُسے خود رو اور خود ساختہ عمل سمجھ کر مطمئن ہو جاتا

شاید اِتہاس اسے انسان کا مقدر نظر آنے لگتا یا اس کی اپنی یادداشت۔ کتاب کے ورق اُلٹنے پر مامُور جاندار۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اِتہاس کو خدا کا ظہُور مان بیٹھتا اور چلّا اُٹھتا:

"مُنزل مسافر کی مرہونِ منّت نہیں ہوتی"

لیکن اُس نے دیکھا کہ اتنا کچھ جانتے اور سہتے ہوئے بھی ہر کوئی جاندار اپنے وجُود کی صداقت پر اصرار کرتا ہے۔

فلسفی چونک اُٹھا:

اگر ایسا ہی ہے تو اِتہاس کو ایک چکّردار سلسلہ ماننے میں کیا تُک ہے"؟

کائنات کی وسعت کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ پھر بھی چھوٹی تھی۔ دلبشیم کا وجود محدود تھا وہ پھر بھی بڑا تھا۔ یہ بات معمولی نہ تھی۔ کائنات پھیل چُکی تھی۔ دلبشیم کو پھیلنا تھا۔

فلسفی اس سلوک کو نہ بھول سکتا تھا جو دلبشیم نے اپنے بچّے کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر کراہ اٹھتا:

"کائنات کا ظہُور ہو چکا ہے۔ دلبشیم کا ظہُور باقی ہے"

باقی والی بات غمناک تھی۔ فلسفی اکتاہٹ سے گریز کرتا تھا۔ باقی

والی بات اکتاہٹ پیدا کرتی تھی۔ اُس کی بُنیاد کا انتظار تھا۔

کیتکی تھی کہ پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ اُس کے وجود کی بُو اور اُس کے لباس کی سرسراہٹ یکایک ماحول کو بے چین کر دیتی تھی عجیب حالت تھی۔ فلسفی اتہاس کے رشتے کو سمجھنے میں مست تھا کہ کیتکی کے قدموں کی تھاپ اس کے کانوں پر تھاپ دینے لگی اور وہ بڑبڑانے لگا!

"کیتکی ابھی تک مجھے پریشان کیے جاتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ دبشیم کی بُدھی کا وکاس ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہی وکاس اتہاس کے چلن کی بنیاد بننے والا ہے۔"

رات اپنا تسلّط جما چکی تھی۔ قصابوں کی دُکانوں کے آگے گہما گہمی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ وہ کون تھا جس نے ویٹروں اور بیروں کا کام خود سنبھال لیا تھا۔ وہ بڑی چستی سے بھُنے ہوئے کباب اور تلے ہوئے گوشت کے قتلوں سے بھری پلیٹیں گاڑیوں میں بیٹھے مردوں اور عورتوں کو پیش کر رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے گلاسوں میں شراب انڈیل رہا تھا۔ شراب میں سوڈا ملاتے ہوئے انہیں اپنی خدمت کا احساس دلا رہا تھا اور مزید خدمت کرتا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے پھیلی روشنی میں ضرورت مندوں کو لڑکیاں اور عورتیں دکھا رہا تھا جو دن ڈھلتے ہی سج سنور کر سڑک کے کنارے بنی دکانوں کے پچھواڑے آ بیٹھتی تھیں وہ کباب ہوتے ہوئے گوشت کی بو سونگھتی ہوئیں اپنے گوشت کی قیمت آنکتی تھیں اور اس دلّال کا انتظار کرتی تھیں جسے کسی کا خوف نہ تھا کیونکہ اس سے ہر کوئی خوف زدہ تھا۔

سڑک کے ٹھیک بیچ پڑی لاش ایک دھبّہ بن کر رہ گئی تھی۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ لاش پر سے اسکوٹر گذر گیا یا کار یا ٹرک یا بس یہ بتانا بھی ممکن نہ رہا تھا کہ کون سی کمپنی کا ٹائر اس گاڑی کے پہیوں پر چڑھے ہوئے تھے جس نے لاش کو پہلی بار کچلا یا جو آخر میں اس پر سے گذر گئی۔

لاش کسی کام کی نہ رہی تھی۔ وہ اُن چھیچھڑوں سے بھی زیادہ گئی گذری ہو گئی تھی جو قصابوں کی دُکانوں کے آگے بکھرے پڑے تھے اور جنہیں آوارہ کُتّے بڑے چاؤ سے کھا رہے تھے۔ کُتّے جو ایک دوسرے پر غرّا رہے تھے۔ مسافر آ رہے تھے۔ مسافر جا رہے تھے۔ لاش سڑک کے بیچ پڑی تھی۔ چُوسی ہوئی ہڈیوں کے انبار میں دبی لاش بھی اس کے انتظار میں تھی جو سڑک کے دونوں طرف بنی دُکانوں کے کاروبار میں اپنے طریقے سے حصّہ دار تھا۔

جنگل گھنا تھا اور گہرا بھی۔ اُس میں نہ صرف کانٹے دار جھاڑیاں تھیں بلکہ آدم خور درخت بھی تھے۔ غار بہت کم تھے۔ اور آبادی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

جنگل میں دبشیم صرف اپنے جسم تک محدود تھا۔ جسم بھی پُوری طرح اُس کے قابو میں نہ تھا۔ سیدھا کھڑا ہوئے بغیر وہ آسمان کو نہ دیکھ سکتا تھا اپنے کو دیکھ کر ہی وہ اُس سُلوک پر پچھتا سکتا تھا جو اُس نے اپنے بچّے کے ساتھ کیا تھا۔

جنگل کی آگ کا تعلّق بھی دبشیم کے جسم سے ہی تھا۔ وہ اُسے گرم رکھ سکتی تھی حیوان کو اُس سے دُور رہنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن وہ جنگل کی آگ بھی جنگل ہی کی طرح اندھی تھی۔ زیادہ سے زیادہ گوشت بھُون سکتی تھی۔

دبشیم نے ٹھنڈے فولاد اور سرد کنکریٹ کی بنی بستی پر نظر گھمائی وہ اپنے دائیں پہلو میں کھڑے چانکیہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

بستی کے مشرقی علاقے میں آگ بھڑک اُٹھی۔ وہاں ایشور، اللہ، گاڈ اور واہگورو میں ٹھن گئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل گئے۔ بازاروں اور گلیوں میں نکل آئے۔ دھرم کرم، پوجا پاٹھ، نماز اور اذان، ماس اور کیرتن کو بھول کر اندر تک سُلگنے چلے گئے۔ اُن کے سر پر خُون سوار ہو گیا۔ آنکھوں میں جلّاد آ بیٹھا ہاتھوں میں ہتھیار سنبھالے وہ ایک دوسرے پر پل پڑے۔

لوگ نہیں جانتے تھے کہ انھیں کیا ہو گیا۔ صدیوں سے ایک ہی دھرتی پر اور ایک ہی آسمان کے نیچے اکھٹے رہنے والے، ہر حالت میں ایک دوسرے کے کام آنے والے، میلوں ٹھیلوں میں ساتھ ساتھ خوشیاں منانے والے، مصیبت میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے والے، شادی بیاہ اور سوگ میں ساتھ نبھانے والے آنکھ جھپکتے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے وہ محبّت اور مروّت بھُول کر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے۔ اپنے ہاتھوں پالے بچّوں کو نیزوں میں پرونے لگے۔ اپنے ساتھ پروان چڑھے گروؤں کو تلوار کے گھاٹ اتارنے لگے۔ اپنے لیے شفقت سے بھرے بزرگوں پر گنڈاسا گھمانے لگے۔ وہ اپنی ہی ماں، بیٹی اور بہن کی عزّت لوٹنے پر آمادہ ہو گئے۔

ایک جنون تھا جو سب پر مُسلّط ہو گیا۔

کوئی کچھ نہ جانتا تھا پھر بھی سب کچھ کر رہا تھا۔ دوسروں کو مار رہا تھا اور خود مر رہا تھا۔

جانے کون سی حِس جاگ اُٹھی۔

آنکھوں میں سوائے بیگانگی اور بے حیائی کے کچھ باقی نہ بچا تھا لوگ پریشان تھے۔

کوئی تھا جو اُن پر سائے کی طرح چھا گیا۔ اُن کی نیکی کو چٹ کر گیا اور شرافت کو کھا گیا۔ انھیں سب کچھ بھلا کر آپس میں بھڑا گیا۔

ہر طرف آگ تھی۔ آگ میں گھری عمارتیں تھیں۔ عمارتوں میں بند لوگ تھے۔ لوگوں کی چیخ و پکار تھی۔ آسمان بے حال تھا۔ زمین بدحواس تھی۔ نہ کوئی امید تھی نہ کوئی آس تھی حالانکہ دُور دُور تک پھیلی آبادی تھی اور دو قدم کے فاصلے پر وہ براجمان تھا جسے کسی کا ڈر نہیں تھا لیکن جس سے ہر کوئی خوف زدہ تھا۔

گلیوں میں لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ گھروں میں لاشیں پڑی تھیں اُن پر رونے والوں میں دم نہیں تھا۔ بات یہ نہیں کہ انھیں غم نہیں تھا۔ سوال باقی تھا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ لوگوں کی آنکھوں کا پانی ایک دم کیسے مر گیا؟ کون تھا جو اُن پر جادو کر گیا؟ اُن کی رگوں میں زہر بھر گیا؟ بھاری بھرکم جسم اور لمبے چوڑے ہاتھوں والے سلیٹی رنگ کی عمارت میں تیار پر تیار بیٹھے اُس کے ہوتے ہوئے بھی یہ سب کون کر گیا؟

فلسفی کو یاد نہیں کہ جنگل کو آگ دبشیم نے لگائی یا وہ خود ہی جل گیا۔ اُسے اتنا یاد ہے کہ جنگل کی راکھ اُڑ کر دُور چلی گئی۔ اس کے نیچے سے نکلی کنواری دھرتی۔ دھرتی پر پڑا تھا دھات کا ٹکڑا۔ جنگل کی آگ سے پگھلی دھات کا نکھار۔ جس نے دبشیم کو اپنی طرف کھینچا۔ دبشیم کو دھات کا ٹکڑا اُٹھاتے دیکھ کر لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے پتھر پھینک دیے وہ سب بھی دھات کے ٹکڑے کی تلاش میں لگ گئے۔ لیکن اُن میں سے کسی کو بھی دبشیم کے ٹکڑے سے بڑا ٹکڑا نہ مل سکا۔ وہ مطمئن تھے لیکن اس اطمینان میں وہ طمانیت نہ تھی۔ اس میں ایک بے چینی تھی۔ پھر بھی ہر کوئی اپنا ٹکڑا پتھر پر گھِس رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دھات کو دھار میں ڈھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دھار کی چمک کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے سامنے پھیلی کنواری دھرتی کو من ہی من میں پرکھ اور ناپ رہا تھا۔

جنگل میں فشار تھا۔ جنگل سے آزاد ہوئی دھرتی پر انتشار۔ لوگوں میں بٹی دھرتی خود اُنھیں آپس میں بانٹنے لگی۔ ہر کوئی ماضی اور حال کو بھول کر مستقبل کی طرف جانے لگا۔ آنے والا دن عذاب کی خبر لانے لگا۔ بیت رہے وقت کو آنے والے پل کو محفوظ کرنے کے لیے قربان کیا جانے لگا۔ ایک آواز لگاتار گونج رہی تھی۔ تھوڑی اور، تھوڑی اور۔ اسی وقت فلسفی کو کیتکی کے لباس کی سرسراہٹ نے چونکایا۔

اس نے دیکھا وہ بے دامن چٹان پر بیٹھی کنواری دھرتی کو دیکھ رہی تھی اور دیکھ رہی تھی اس کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں پھیلی حرص۔ فلسفی ایک بار پھر اپنے میں اُتر گیا۔ وہ مسافر، سفر اور منزل کا سوچنے لگا اور بڑبڑایا!

"دبشیم تو کب کا سفر پر نکل چکا۔ پھر یہ کیتکی۔۔۔؟"

وہ جملہ بھی پورا نہ کر پایا تھا کہ دبشیم لہو میں بھیگے پھل والا کلہاڑا اُٹھائے اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں پھیل رہ گئیں!

"یہ دبشیم ہے یا۔۔۔؟ جنگل تو کب کا راکھ ہو چکا اور بھیڑیا۔۔۔"

فلسفی نے اپنی گنجی کھوپڑی کو کھجاتے ہوئے نگاہیں ایک بار پھر دبشیم کی طرف اُٹھائیں تو کیتکی ہنس پڑی اور اُس کا قہقہہ فضا پر محیط ہو گیا۔

فلسفی نے کان بند کر لیے۔ وہ دبشیم کے ساتھ ننگی دھرتی کی طرف چل پڑا۔ لوگ ابھی تک مار کاٹ میں مصروف تھے۔ دھرتی لہو سے لال ہو گئی تھی۔ ہر جسم زخمی تھا۔ فضا میں چیخ گونج رہی تھی۔ "میں اور میرا"، "تو اور تیرا" "تیرا نہیں میرا" کا بے سُرا راگ تھا اور تھا دھرتی کے کرب کا دھواں۔

دبشیم نے چنگھاڑ ماری، وہ اپنا کلہاڑا لہراتے ہوئے خونخوار ہجوم میں جا گھسا۔ دوسرے ہی لمحے کلہاڑا اپنا جادو دکھانے لگا۔ کلہاڑی والا گھبرانے لگا۔ ہاہاکار مدّھم پڑنے لگی۔ ماحول سہمنے لگا۔ آخر خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے اپنی کلہاڑیاں زمین کی طرف جھکا دیں وہ دبشیم کی طرف دیکھنے لگے۔ دبشیم نے کلہاڑا اُونچا اُٹھا دیا۔ اُسے دھرتی کے وجود پر لہرا دیا۔

دبشیم میدان میں کھڑے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ لوگ اس کے پاس باری باری جانے لگے۔ زمین کا چھوٹا بڑا ٹکڑا پانے لگے۔ دبشیم کے کلہاڑے کے پھل اور پھل کی دھار کو دیکھتے ہوئے اپنے کو سمجھانے لگے۔

فلسفی خوش نہ تھا۔ فلسفی خوش ہو گیا!

"سفر اور ٹھوکر میں ہمیشہ میل رہا۔ بات منزل کی ہے۔"

اُس نے دیکھا آریہ بھٹ آگے بڑھا۔ اس نے ننگی دھرتی پر آگ جلائی اور دھات کو ہَل کے پھل اور درانتی میں ڈھال دیا۔

فلسفی خوش تھا کہ دھرتی کی مانگ نکال دی گئی۔ مانگ ہو گی تو سیندور بھی آ جائے گا۔

فلسفی اُداس تھا کہ قانون دبشیم کے کلہاڑے کے پھل کی دھار

سے نکلا تھا۔

سنڈریلا نے ڈبل بیڈ پر اپنے پہلو میں لیٹے پرومیتھیس کی طرف کروٹ بدلی اور بیڈ کے ساتھ لگے میز پر پڑے ارغوانی انگوروں کا گچھا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

سنڈریلا کے سینے کے گداز کو اپنی چھاتی پر محسوس کرتے ہوئے پرومیتھیس نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

سنڈریلا انگوروں کو بھول کر مسکرائی:

"میرے محبوب! تم نے دیوتاؤں کی آگ کیوں چرائی؟ آدم کو آگ دینے سے پہلے اُس کی اہمیت کیوں نہ جتائی؟ ورنہ آج وہ اس آگ سے اپنے کو جلا کر خاک کر دینے پر آمادہ نہ ہو جاتا۔"

پرومیتھیس نے سنڈریلا کی بات کا جواب دینے کی بجائے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور اُس کے جسم کے زاویوں کو سہلانے لگا۔

دبشیم نے فولاد اور کنکریٹ کی بستی کے گھر گھر میں پھیلے منظر کو دیکھا۔ وہ سنڈریلا اور پرومیتھیس کے بارے میں سوچ کر جھوم اُٹھا

بغاوت اور ہوس۔!

کہتے ہیں اُن دنوں عقیدہ جنم لے رہا تھا۔ لوگ دبشیم کو اپنا سب کچھ مان بیٹھے تھے۔

یہ بھی سُنا ہے کہ فصل لہلہا رہی تھی۔ آکاش ہنس رہا تھا۔ دھرتی مسکرا رہی تھی۔ بستی میں گھروں کے آگے بندھی تھیں بھیڑیں، بکریاں اور گائیں۔ کھلیانوں میں اناج تھا اور جگالی کرتے بیلوں کی ناند میں بچا ہوا چارا۔ گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ شاخوں سے لٹکتے پھل اپنے پر اترا رہے تھے۔ بستی کے بیچ ایک باغ تھا لیکن فلسفی کی تمنا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ تھا۔ بستی پر دبشیم کا نام تھا اور اس کے کلہاڑے کا آلام تھا۔

لوگ ایسا ہی بتاتے ہیں۔ لوگ جو سُنی سُنائی سُناتے ہیں۔ اسی کے سہارے وقت کاٹ جاتے ہیں۔

اپنے سے لپٹے پرومیتھیس کے منہ میں انگور کا دانہ ڈالتے ہوئے سنڈریلا کھلکھلا اُٹھی:

"جزیرے میں پہاڑی پر بیٹھا فلسفی چراغ کی روشنی کا منتظر رہا۔ وہ سمندر پر تنے اندھیرے کو چیر کر آنے والی کرن کا منتظر رہا۔"

سنڈریلا نے انگور چوستے پرومیتھیس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا:

"کیا سچ مچ دیوتاؤں سے چرائی ہوئی آگ میں روشنی نہ تھی؟"

پرومیتھیس کو اپنے جوبن پر اُمڈتے دیکھ کر وہ کہتی چلی گئی:

"فلسفی جلدی میں نہ تھا۔ وہ جانتا تھا روشنی کا اپنا سفر ہے اور سفر کا رشتہ وقت سے ہے۔

وقت کی کوئی حد نہیں۔ انتظار کی حد ہے۔

وہ عورت گھوم رہی تھی۔ وہ گلیوں، محلوں اور بازاروں اور سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔

ہر جگہ رونق تھی۔ لوگ لین دین میں مصروف تھے۔ آپس میں باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ وہ ملنے بچھڑنے اور بچھڑ کر پھر ملنے کا وقت طے کرنے میں مشغول تھے۔ اُن کے جسموں پر چہرے تھے۔ چہروں پر آنکھیں تھیں۔

عورت الف ننگی گھوم رہی تھی۔ اس کی جوان چھاتیوں کا تناؤ زخمی تھا۔ گداز بازوؤں اور بھرے بھرے کولہوں کی کشش بھی زخم خوردہ تھی۔ بال تھے جو اُلجھے ہوئے تھے اور اُن میں دُھول چمک رہی تھی۔ بھرے پُرے شکست زدہ جسم پر میل کی تہہ جم گئی تھی۔ پھر بھی جوانی تھی کہ سب کچھ جھٹلانے کے لیے کسی آنکھ کی نمی اور کسی آواز کی للکار کے انتظار میں بے قرار تھی۔

لوگ تھے کہ اپنے میں مست تھے۔ سالم دھڑ کے اوپر ٹکے چہروں والے لوگ۔ چہروں پر کبھی کُھلتی اور بند ہوتی ہوئی آنکھوں والے لوگ منہ میں حرکت کرتی زبان والے اور سینے میں دھڑکتے کتھئی رنگ کے دل والے لوگ۔ عورت کی رانوں پر جما خون ابھی تک چمک رہا تھا۔ اُن کے درمیان ٹکٹکی کوکھ کے نچلے سرے پر بھی خون کی گاڑھی ہوتی ہوئی بوند چمک رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ عورت دُنیا سے بے پرواہ ہو گئی تھی کہ دُنیا اس سے بے نیاز۔ سڑک خالی تھی نہ بازار نہ گلیاں۔ ہر جگہ لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ عورت مادر زاد ننگی گھوم رہی تھی۔ اپنے ننگے پن اور رانوں کے درمیان لٹکتی کوکھ کے ساتھ وہ عورت اکثر چوک کے بیچ کھڑی ہو جاتی اور وہاں سے گذرتے سواروں اور پیادوں کو گھورتی رہتی۔

جب وہ غنڈوں سے بچنے کے لیے سلیٹی رنگ کی عمارت میں داخل ہوئی تو اس کے جسم پر پورا لباس تھا۔ سوائے اُس کے چہرے کے تھوڑے حصے اور ہاتھوں کی آدھی ہتھیلی کے کچھ بھی بے لباس نہ تھا۔ اُس کی آنکھوں نے حیا کا پردہ اوڑھ رکھا تھا اور آواز میں شرم لہرا رہی تھی۔

شام کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا۔ غنڈے اُس کا پیچھا کر رہے تھے

وہ شریف عورت تھی۔ اپنے ہونہار بچوں کی ماں۔ اپنے شوہر کی بیوی۔ اپنے ساس سسر کی بہو۔ غنڈوں سے بچنے کے لیے سلیٹی رنگ کی آہنی عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ وہ شریف عورت تھی اور سلیٹی رنگ کی عمارت شرافت کی پناہ گاہ۔

غنڈے تعداد میں تین تھے۔ عمارت میں بیٹھے لوگ ان گنت ورنہ سرِ شام اندر جانے والی جوان عورت صبح دم اس حالت میں باہر نہ نکلتی۔ لباس سے بے نیاز۔ کندن سا بدن داغ داغ۔ ہر انگ نُچا ہوا۔ ہر رنگ لُٹا ہوا۔ انچ انچ پر وحشت کے نشان۔ پناہ گاہ والوں نے جب اُسے سڑک پر ڈھکیلا اُس وقت اُس کی کوکھ اُس کی رانوں کے درمیان لٹک رہی تھی۔ وہ اپنے گھر کی راہ بھول چکی تھی۔ اُسے بستی کی گذرگاہوں کی دھول راس آگئی تھی۔ وہی دھول اب اُس کا لباس تھی جس کی تہہ میں دھیرے دھیرے سب کچھ چھپ چلا تھا۔ صرف کوکھ تھی جو رانوں کے درمیان لٹک رہی تھی اور جس کے نچلے سرے پر خون کی گاڑھی ہوتی ہوئی بوند لرز رہی تھی۔

ایک مدت کے بعد پتہ چلا کہ دبیشم کے کلہاڑے سے عقیدے نے نہیں توقع نے جنم لیا تھا۔ بے چین شانتی اور بے قرار امن بھی توقع کی کوکھ سے نکلا۔ لوگ دبیشم کے آگے نہیں جھکے وہ توقع کے آگے سرنگوں ہوئے کہ اسی میں اُن کی نجات تھی۔ معاملہ سنگین تھا۔ فلسفی کو کیتکی کے وجود کی لو آنے لگی تھی جیسے وہ جزیرے کی طرف چل پڑی ہو۔

بات خطرناک تھی۔ محض عقیدہ پائیداری کا ضامن تھا۔ توقع اِتنا کا پتہ دیتی تھی۔ وہ بستی اور دبیشم کے بیچ ایسی کڑی تھی جس کا خیال کرتے ہی فلسفی کانپ اُٹھتا تھا اور دبیشم بے چین ہو جاتا تھا۔ توقع کلہاڑے کی دھار کو پہچانتی تھی لیکن وہ اپنے بارے میں لگاتار دعا بھی مانگتی تھی۔

اُدھر دبیشم کا تشکیل دیا ہوا جہان تھا ادھر بستی کے دل میں جاگتے بنتے نیا ارمان تھا۔ دبیشم کو اپنا ارمان پیارا تھا اور وہ ارمان سب سے نیارا تھا۔

کیتکی کے قدموں کی چاپ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

دبیشم کے دربار میں کھڑا اشٹادکر اپنے اوپر ہنستے درباریوں کو دیکھ رہا تھا من ہی من میں مسکراتے دبیشم کو۔

اشٹادکر نے سنا تھا بستی میں قانون ہے۔ بستی میں عدالت ہے۔ کوڑے اور ہتھکڑی کا انتظام ہے۔ ہر کوئی قانون کا غلام ہے۔ قانون دبیشم کے راج محل سے نکلتا ہے اور بستی پر پھیل جاتا ہے۔ وہ دھات کی چادر کی طرح پھیل جاتا ہے۔ اپرادھی کو ڈراتا ہے۔ پاپی کے وجود میں سرایت کر جاتا ہے۔ راجہ ہو کہ پرجا قانون کسی کو نہیں بخشتا۔

بستی میں پہنچتے ہی اشٹادکر حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ راج محل اور بستی کے بیچ کھنچی ریکھا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

راج محل میں بیٹھا دبیشم مسکراتا ہے۔ قانون کو عجیب نظروں سے دیکھتا ہوا اپنے برابر آتا ہے۔ اچانک اس کا خیال اپنے رنواس کی طرف جاتا ہے اور وہ عجیب احساس سے بھر جاتا ہے۔

دبیشم کی آنکھوں میں اندھی چمک کے پیدا ہوتے ہی قانون بستی کو کچوکنے لگتا ہے۔

رتنا دلی، کاویری، رجنی گندھا، سوم سریتا جوان ہو چکی ہیں۔ بستی کی ایک کنیائیں جوان ہو چکی ہیں۔ ان کے شریر سے پھوٹتی مہک گھر کی چار دیواری کو پھلانگ جاتی ہے۔ ایک نشیلی گندھ بستی میں پھیل جاتی ہے۔ بستی اُسے سونگھتے ہوئے جھومتی ہے۔ بستی اُسے پھیلتے دیکھ کر گھبراتی ہے۔ کنواریوں کے ماں باپ تلاش میں ہیں۔ وہ گبروؤں کی تلاش میں ہیں۔ وہ اس وقت کے آنے سے پہلے گبروؤں کی تلاش میں ہیں۔

گدرائے جسموں سے پھوٹتی مہک پر کسی کا قابو نہیں۔ وہ گلی محلے ہوتی ہوئی راج محل تک پھیل جاتی ہے۔ دبیشم مچل اٹھتا ہے۔ الکلانہ جاتی ہے۔

قانون ان گھروں کو گھیر لیتا ہے جن میں رتنا دلی، کاویری، رجنی گندھا اور سوم سریتا تحفظِ احساس کے لیے بیٹھی ہیں۔ وہ ان گھروں کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔ آواز لگاتا ہے۔ للکارتا ہے۔ دھمکاتا ہے۔ دروازے توڑ کر اندر گھس جاتا ہے۔ وہاں بیٹھی کنواریوں کو کھینچ لے جاتا ہے۔

اشٹادکر حیران کھڑا تھا۔ وہ درباریوں کو دیکھ رہا تھا۔ دبیشم کو دیکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا راج سنگھاسن کی پیٹھ سے عین اوپر ٹنگے کلہاڑے کو۔ وہ چونک اُٹھا:

"ہل اور درانتی؟"

اُس نے اپنے کو سنبھالا اور جی کڑا کیا۔

"اَجن! بستی کی سرکشا، بستی کی مریادا کی سرکشا۔۔۔؟"

دبیشم نے اشٹادکر کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے سامنے کھڑی کنواریوں کو اپنے جسم چراتے ہوئے دیکھنے میں مگن تھا۔ اُن کے شریر میں سرسراتے جوبن رس کو آنکھوں سے پینے میں مست تھا۔ اُس کی انگلیاں

ریشمی جوبن کو سہلانے کے لیے بے چین تھیں اور اُس کے پاؤں......

راجن بستی اپنی سرکشا کے لیے تم....''

اشٹادکر کی آواز درباریوں کے قہقہے میں کھو گئی اور دبشیم کی مُسکان اور بھی کٹیلی ہو گئی۔

''لگتا ہے میں چاروں کی منڈلی میں آگیا ہوں'' اشٹادکر چیخ اٹھا۔

بستی تحفظ چاہتی تھی۔ اُسے اپنا جان ومال عزیز تھا اور عزیز تھی اپنی عزت اور ناموس۔ اُس نے دبشیم کے سامنے اپنی کلہاڑی نیچی کر دی تھی۔ آریہ بھٹ نے کلہاڑی کو ہل کے پھل اور درانتی کی قوس میں بدل دیا تھا۔ جنگل میں بھیڑیا تھا بستی میں دبشیم۔ بھیڑیا بھیانک تھا ــ بھیڑیا بہت بھیانک تھا۔ گہرے کالے جنگل کا بھیڑیا۔

اشٹادکر آٹھوں گرہوں کا گیاتا۔ اُسے گرہوں کی ایک ایک چال اور اس چال کے پربھاؤ کا گیان تھا۔ ہر ایک گرہ کا گیان اس کے شریر میں اپنے نام کا بل ڈالتا گیا۔ آخر اُس کے جسم میں آٹھ خم پڑ گئے لیکن اس کے من کے آٹھ بل نکل گئے۔ اس میں آ بسیں گیان کے اجالے کی آٹھ کرنیں۔

اشٹادکر کی بات سُن کر دبشیم نہ گھبرایا نہ تلملایا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے اپنے پردھان منتری کو کچھ سمجھایا۔ تھوڑی دیر میں آٹھ سندریاں راج دربار میں آئیں۔ وہ اشٹادکر کو اپنے نازک ہاتھوں پر اُٹھا کر راج محل کے ولاس کُنش میں لے گئیں۔

باہر بستی کی ہاہا کار تھی۔ اندر اشٹادکر کے جسم کی سوئی ہوئی پیاس بیدار تھی۔

اشٹادکر نے آنکھوں کو ملا اور کانوں کو تھپتھپایا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُس نے اپنے پورے شریر کو سہلایا اور وہ سکپکا اُٹھا۔ اس کے شریر میں آٹھ کی بجائے سات بل رہ گئے تھے۔ اُس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے نرتکی نے مدرا سے بھرا پیالہ اُس کے منہ سے لگا دیا اور اپنی انگیا کی گانٹھ کھول دی..

بستی! پوری کی پوری بستی راج پتھ کے دونوں طرف کھڑی تھی۔ راج پتھ پر نکل رہی تھی دبشیم کی سواری۔ دبشیم آٹھ پہیوں والے رتھ پر بیٹھا تھا۔ اُس کے سنگھاسن کی پیٹھ کے عین اوپر کھڑا تھا لمبے دستے والا کلہاڑا جس کا چوڑا پھل لہو میں بھیگا ہوا تھا اور جس کی تیز دھار سے بوند بوند خون ٹپک رہا تھا۔ کلہاڑے کے نیچے کھڑا تھا اشٹادکر جس کے منہ سے مدرا کی مہک آ رہی تھی اور جو کلہاڑے کے پھل سے ٹپکتی ہر بوند کو اپنے سر پر جھیل رہا تھا۔

بستی نے دیکھا اشٹادکر کے آٹھوں بل نکل چکے تھے وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے کا قدرتی رنگ غائب ہو چکا تھا۔ اب اُس کی آنکھوں میں الگ چمک تھی۔ یہی چمک بستی نے پہلے بھی کہیں دیکھی تھی۔ بستی کانپ اُٹھی اُسے رتھ پر بیٹھا دبشیم اور اس کے پیچھے کھڑا اشٹادکر ایک دوسرے میں گم ہوتے دکھائی دئے۔

راج پتھ کے دونوں طرف کھڑی بستی کے خاموش اضطراب کو دیکھتا ہوا دبشیم سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک جگہ رتھ کو رکوا کر اُس نے گردن گھمائی اور اشٹادکر کی طرف دیکھا۔

دبشیم کے اشارے پر اشٹادکر نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑی پستک اوپر اٹھائی۔ اس نے پستک بستی کے سامنے لہرائی اور اُسے کھول لیا بستی سُن کھڑی تھی۔

پستک تھی کہ بستی کا اعمال نامہ۔ اس کا ایک ایک لفظ بستی کے گناہوں کا اعتراف تھا۔ دبشیم جنّت کا حقدار تھا کہ اُس نے بستی کو قانون دیا تھا۔ بستی کے کسی بھی دوسرے آدمی کے ہاتھ دبشیم کے دھات کے ٹکڑے سے بڑا ٹکرانہ لگا تھا۔ جنگل میں گنتی کی اہمیت اور آگ کی حقیقت کا علم بھی دبشیم ہی کو ہوا تھا۔ یہ بات معمولی نہ تھی۔ اس بات میں گہرا راز تھا۔ کوئی ہستی تھی جو سب کچھ دبشیم کی جھولی میں ڈال گئی۔ وہ ہستی زمان ومکان پر محیط تھی۔ جنّت اور جہنم دونوں جگہ اُس کی حکمرانی تھی۔ دبشیم اسی طاقت کی تخلیق تھا۔ دبشیم کی مخالفت کرنا اس طاقت کی مخالفت کرنا اس طاقت کی مخالفت کرنا تھا۔ اس لیے مخالفت گناہ تھی۔ گناہ جہنم کا دروازہ کھولتا تھا۔ دبشیم کی مکمل اطاعت جنّت کا در وا کرتی تھی دبشیم اپنے خالق کا عکس تھا۔ دھرتی خالق کی دین۔ دھرتی دبشیم کی ذات کا جزو تھی...

بستی سر جھکائے کھڑی تھی۔ دبشیم سر اونچا کیے بیٹھا تھا۔ اشٹادکر تھا کہ پستک سے آنکھیں نہ ہٹا سکتا تھا۔

بستی کے وجود پر چھایا قانون تھا جو پہلے دبشیم کے کلہاڑے کی دھار سے نکلا اور پھر لہو میں بھیگے سر والے اشٹادکر کی پستک سے۔

فلسفی کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیتکی کے قدموں کی چاپ دھمک میں تبدیل ہونے لگی تھی۔

سنڈریلا نے باتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھولا اور پرومیتھیس کو آواز دی۔ وہ اپنا تولیہ باہر بھول گئی تھی۔ باتھ ٹب کے پانی میں پیر ملاتے

ہوئے پرومیتھیس نے سنڈریلا کی طرف دیکھا تو وہ اُس پر گھر آئی۔ اس نے پرومیتھیس کے بالوں کو اپنے ہونٹوں سے سہلاتے ہوئے کہنا شروع کیا:

فلسفی دریا کے کنارے کھڑا بہتے پانی کی سالمیت کو دیکھ رہا تھا۔

وہ دریا کے کنارے ذرّوں میں بٹی پڑی ریت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا من پانی اور ریت کے بیچ ڈول رہا تھا۔ یقین کا دامن چھوٹا جا رہا تھا لیکن امید تھی کہ دامن نہ چھوڑتی تھی۔ وقت تھا کہ انتظار کی شکل میں محدود ہوا نظر آنے لگتا اور لازمانیت کی گود سے نکل کر ایک خاص زمانے میں ڈھلتا دکھائی دیتا۔ وقت تھا کہ زمان و مکاں کو جھٹلاتا نظر آتا۔ وقت ہی نعمت تھا۔ وقت ہی عذاب تھا۔

فلسفی نے ایک بار پھر سوچ کے ساغر میں غوطہ لگایا:

"کائنات لامحدود ہے پھر بھی چھوٹی ہے۔ دبشیم بڑا ہے پھر بھی بڑا ہے۔"

وہ اندر تک ہل گیا لیکن کیتکی کے قہقہے کے تصور سے ڈر کر اپنے میں لوٹ آیا۔ اُس نے من ہی من میں دہرایا۔

"وقت کی کوئی حد نہیں۔ انتظار کی حد ہے۔"

"سفر اور لغزش کا رشتہ اٹوٹ ہے۔"

"لیکن منزل اپنا وجود رکھتی ہے۔"

سنڈریلا نے باتھ ٹب میں مہکتے پانی سے کھیلتے ہوئے پرومیتھیس سے پوچھا:

"اے! تو دیوتاؤں کے قہر کو جھٹلانے کے بعد میرے ساتھ کیوں آ لیٹا؟"

دبشیم پریشان تھا۔ ابھی تک رجنی گندھا کو اس کے باپ کے گھر سے اُٹھا کر لانا پڑتا تھا۔ وہ ابھی تک اپنی حیا کے جال میں جکڑی دربار میں کھڑی اپنا جسم چراتی رہتی تھی۔ اشٹاد کر کا گیان بکھر جانے کے بعد بھی کوئی ایک بھی درباری رجنی گندھا کی ساڑھی کھینچ اتارنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بات ادھوری تھی۔ دبشیم اُسے پوری کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اُس نے درباریوں کو جواری بنا دیا۔ انہیں سوم سریتا کو بھرے دربار میں ننگا کرنے پر لگا دیا۔

بستی کو دبشیم سے ہی پناہ نہ تھی۔ اب درباری بھی جواری بن گئے تھے۔ جواریوں کے آگے پیچھے چلنے لگے تھے جواری جو اپنا داؤ سیدھا پڑنے کے انتظار میں بے حال تھے۔

دبشیم نے بستی کو کلہاڑا دکھایا تھا اور اشٹاد کر نے سنائی تھی پستک۔

بستی نہ کلہاڑے کو مانتی تھی نہ پستک کو پہچانتی تھی۔ اُس کے لیے اس کا سب کچھ اس کی توقع تھی۔ توقع جو عقیدے سے بھی تحفظ مانگتی تھی اور کلہاڑے سے بھی تحفظ کی طلبگار تھی۔ توقع جو اشٹاد کر سے اپنے تحفظ کا مطالبہ کرتی ہے۔

اشٹاد کر نے دبشیم کو خدا کا نائب بتایا تھا۔

اشٹاد کر نے ہی کہا تھا:

"خدا میں اعتقاد ہوتا ہے۔ راجہ میں اعتماد ہوتا ہے۔"

"عقیدت کبھی کم نہیں ہوتی۔ اعتماد میں کمی ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

سنڈریلا نے باتھ ٹب سے باہر نکل کر اپنے جسم پر تولیہ لپیٹتے ہوئے بتایا:

دبشیم کو جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی۔ بستی کی کراہ ولاس کلش میں گونجنے لگی۔ وہاں پھیلی دھند میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ بستی کا چھوٹا بڑا رونے لگا اور اشٹاد کر کے شریر میں ایک خم پڑ گیا۔ دبشیم اشٹاد کر کے جسم کی ٹیڑھ کا سُن کر گھبرایا۔ اُس نے پردھان منتری کو بلایا۔ بہت ترکیب کی لیکن ٹیڑھ چلاتی رہی:

"عقیدت کم نہیں ہوتی۔ اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔"

دبشیم نے کلہاڑا اُٹھایا۔ یہ داؤ بھی کام نہ آیا۔ بستی نے ہل کا پھل دبشیم کے پیٹ میں گھونپ دیا اور درانتی سے اُس کی منڈی کاٹ ڈالی۔

بستی حیران تھی۔ منڈی کٹتی گئی۔ دبشیم مسکراتا گیا۔

گلے پر درانتی چلتے وقت بھی دبشیم کا مسکراتے رہنا اشٹاد کر کے لیے عجیب بات تھی۔

کیتکی کے قدموں کی دھمک بھاری ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن فلسفی تھا کہ امید کا دامن چھوڑنے کو راضی نہ تھا۔ وہ مانتا تھا کہ سفر اور لڑکھڑاہٹ کا گہرا سمبندھ ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ منزل ان دونوں سے بے نیاز ہے۔ اسی لیے وہ سب کچھ بھول کر جزیرے کے پار روشنی کی تلاش کرنے لگتا اور تڑپ اُٹھتا:

"کیا اُجالے کی پہلی کرن اپنا سفر طے کرنے میں اتنا وقت لگاتی ہے؟"

اُس کی نظر جزیرے کے گرد پھیلی تاریک سمندر پر پھیل جاتی۔

اشٹاد کر نے دبشیم کو قتل کیا تھا۔ اُس نے بستی کے زندہ رہنے کی ضمانت نہیں دی تھی۔

اس نے دیکھا وہ کانپ اُٹھا۔ پہلے اکیلا دبشیم تھا اب سب کی باری تھی۔ بستی میں لگاتار بڑھتا "تھوڑا اور" "تھوڑی اور" "ایک نہیں انیک" کا شور تھا۔ نہ کسی کی پوچھ تھی نہ کسی کا زور تھا۔ معاملہ پھر "مَیں اور میرا" اور "تو اور تیرا" اور "تیرا بھی میرا" پر جا پہنچا تھا۔

عجیب بات تھی۔

جس کو ختم کیا تھا اسی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ دبشیم ہی منظور نہ تھا دبشیم کے بغیر گذارہ نہ تھا۔ امانت اور خیانت، دیانت اور ضمانت سب کچھ لٹک کر رہ گیا تھا۔ پورے کا پورا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا ڈھے گیا تھا سب کچھ انتشار کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔

اشٹادکر اپنے کو کوسنے لگا: قصور میرا ہے میں ہی قائم نہ رہ سکا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی سب کچھ کھو بیٹھا۔ میں تو اپنے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اُسے نرتکی کی پنڈلیوں کی یاد آئی جن پر سے لہنگا بار بار اُٹھ جاتا تھا۔ اُسے نرتکی کا من کو موہ لینے والا چہرہ یاد آیا اور یاد آئے اُس کے واسنا رس سے بھرے ہونٹ۔ اُس کے من کے پردے پر اُبھریں نرتکی کی نشیلی آنکھیں جن میں دعوت چھلکتی رہتی۔ اُس کے آگے آ حاضر ہوئی پوری کی پوری نرتکی ایک ہاتھ میں مدرا کا پیالہ لیے اور دوسرے ہاتھ سے انگیا کی گانٹھ کھولتی ہوئی۔

اشٹادکر نے آہ بھری:

میرے پاس گیان تھا۔ دبشیم کے پاس بُدھی۔ میرے سامنے نرتکی کی کایا کا ایک نرک تھا۔ دبشیم کے سامنے زمین، زر اور جورو کے تین نرک۔

اشٹادکر سٹپٹا اُٹھا:

سوال دبشیم کو ختم کرنے کا نہ تھا۔ سوال اور تھا۔

وہ بستی کے چوک سے سیدھا راج دربار میں آیا۔ اُس نے تابوت میں بند دبشیم کے دھڑ کو نکالا اور اُس کے سر کو اُٹھایا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ دبشیم مرا پڑا تھا لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ زندہ تھی۔

اشٹادکر نے دبشیم کا سر اُس کے دھڑ سے جوڑ دیا۔

سنڈریلا نے آگے جھک کر میز پر پڑے کیک کے ٹکڑوں سے بھری پلیٹ اٹھائی اور سامنے بیٹھے پرومیتھیس کے آگے کر دی۔ اس کے کھلے گلے سے جھانکتا جوبن پرومیتھیس پر چھانے لگا۔ وہ کیک اٹھانے کے لیے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روک کر بے وقت ہی سنڈریلا کی اور جانے لگا۔

سنڈریلا ہنسی اور پرومیتھیس کے چہرے پر اس بغاوت کے آثار ڈھونڈنے لگی جس کی وجہ سے دیوتاؤں نے اُسے اَن گنت اذیتیں دی تھیں۔

فلسفی خوش تھا:

"کائنات کا ظہور ہو چکا ہے۔ دبشیم کا ظہور باقی ہے۔"

وہ اُداس ہو گیا:

"کیا کائنات کا ظہور بھی مر مر کر ہوا؟ اگر نہیں تو دبشیم کا ظہور بھی ایک دم کیوں نہیں ہو جاتا؟"

وہ پریشان ہو اُٹھا:

"کائنات لامحدود ہے پھر بھی چھوٹی ہے۔ دبشیم محدود ہے پھر بھی بڑا ہے۔ کیا اسی لیے وقت لہو پیتا رہتا ہے اور مقام مردے کھاتا رہتا ہے۔"

اُس نے پہلو بدلا:

"شکر ہے دبشیم لوٹ آیا۔ سفر اور لڑکھڑاہٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن منزل ان دونوں سے بے نیاز ہے"۔ وہ سٹپٹا اُٹھا۔

"اور جو کچھ بیچ میں ہو رہا ہے وہ؟"

فلسفی نے اپنے کو پھر سنبھالا:

"سچ ہے تو آر پار بھی ہے۔ آر کے بعد پار ہی ہے۔"

دبشیم بدستور مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ زیادہ سے زیادہ معنی خیز ہوتی جا رہی تھی۔

اشٹادکر بڑبڑایا:

"یہ مر کر بھی بس بُدھی بٹورنے میں لگا رہا۔"

وہ ندامت کے احساس سے بھر گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے دبشیم کو راج سنگھاسن پر بیٹھنے کو کہا۔ لیکن دبشیم نہ ٹوٹے ہوئے سنگھاسن پر بیٹھا نہ لُٹے پُٹے راج محل میں رُکا۔ وہ اشٹادکر کو اپنے پیچھے آنے کو کہہ کر بستی کے چوک کی طرف چل پڑا۔

اشٹادکر حیرت میں ڈوب گیا:

"اِس کو میرے من کی بات کیسے معلوم ہو گئی"؟

اپنے ہی لہو میں نہائی بستی نے دبشیم کو دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئی اگلے ہی پل وہ اس کے چہرے پر رقصاں مسکان میں کھو گئی۔ پھر اس نے دبشیم کے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ خالی تھے۔ تبھی اُسے اشٹادکر دکھائی دیا

وہ ڈولتا چلا آرہا تھا۔ اس کے شریر کے تین بل لوٹ آئے تھے۔ تین بل والا اشٹادکر سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

بستی کی بوکھلاہٹ کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اشٹادکر نے اُسے دبشیم کو ایشور کا دوت ماننے کا اپدیش دیا تھا۔ اشٹادکر نے ہی اُسے دبشیم کی منڈی کاٹ ڈالنے کو کہا تھا۔ وہی اشٹادکر دبشیم کو دوبارہ زندہ کر کے چوک میں لے آیا تھا۔ دبشیم جس کے چہرے پر مُسکان تھی اور جس کے ہاتھ خالی تھے۔

بستی پر عجیب وقت آن پڑا تھا۔ ادھر وہ اپنا قتل کرنے پر تلی ہوئی اُدھر دبشیم تھا جس کے ہاتھوں قتل ہوتے رہنے سے بچنے کے لیے اس نے اشٹادکر کا کہا مانا تھا۔ اب اشٹادکر خود دبشیم کے ساتھ کھڑا تھا اور سوچ میں غرق تھا۔

سنڈریلا نے اپنے پیچھے کھڑے اپنی ننگی گردن کو چومتے پردیسی کو بتایا:

جزیرے میں سالم پانی اور ذرّوں میں بٹی ریت کے بیچ کھڑے فلسفی نے دیکھا ندی کی ایک لہر مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور اس کے پاؤں چوم کر لوٹ گئی۔

بات "میں اور تو" کی رہی۔ بات "میرے اور تیرے" کے آگے نہیں بڑھی۔ معاملہ کم اور زیادہ کا ہی رہا۔

لیکن مسئلہ آزادی اور برابری کا ہے۔

اشٹادکر نے بوکھلائی ہوئی بستی کو دیکھنا چھوڑ کر نظریں دبشیم کے چہرے پر گاڑ دیں:

مسئلہ اس کا بھی ہے اور بستی کا بھی۔

دونوں کے پاس ہاتھ ہیں۔ ہاتھوں میں انگلیاں ہیں۔ انگلیوں والے سالم ہاتھ۔

لیکن دونوں کے سامنے کوئی چٹان نہیں ہے۔ ندی میں بہتی بستی اور دبشیم کے راستے میں چٹان آئے گی تو وہ اُسے پکڑ کر اندھی ندی سے باہر آسکیں گے۔

بستی دبشیم کو دیکھ چکی ہے۔ دبشیم بستی کو جان چکا ہے۔

غلطی میری رہی۔ میں نہ بستی کو جان سکا نہ دبشیم کو پہچان سکا۔

شاید وقت کو یہی منظور تھا اور مقام اسی میں خوش تھا۔

اشٹادکر رُکا۔ اُس نے ایک بار پھر بستی پر نظر ڈالی اور اپنے پہلو میں کھڑے دبشیم کو بستی کے بیچ ڈھکیل دیا:

اس بار قانون بستی سے نکلے گا۔

اس بار قانون بستی کا ہوگا۔

اس بار قانون بستی کے لیے ہوگا۔

لہر کو اپنے پاؤں چھو کر ہنستے اور لوٹتے دیکھتا ہوا فلسفی چونک پڑا:

قانون! بستی!! بستی اور قانون!!

"وقت لامحدود ہے لیکن انتظار کی حد ہے"۔ اس کے کانوں میں اس کے اپنے ہی شبد گونج اُٹھے۔ وہ چونکا اور ندی میں اُس لہر کو ڈھونڈنے لگا جو ابھی ابھی اُس کے قدم چوم کر ہنستی ہوئی لوٹ گئی تھی۔

بدحواس، بیزار، بے دم بستی اور اس کے سامنے پھیلی جگمگاہٹ۔

اشٹادکر بولتا رہا:

سوال قانون کا نہیں۔ سوال بستی کا ہے۔ قانون عارضی امر ہے۔ بستی امر ہے۔

بستی نے دیکھا اشٹادکر شریر میں چوتھا خم اُبھر آیا۔ اُسے لگا اشٹادکر کے باقی خم بھی لوٹ آئیں گے اور پھر۔۔۔ وہ اشٹادکر کو دھیان سے سننے لگی:

جنگل میں منگل والی بات غلط نکلی۔ جنگل کے باہر منگل والی بات ہی ٹھیک ہے۔

جنگل فرد کا پجاری ہے۔ بستی پر سماج کی اجارہ داری ہے۔ سمسیا دبشیم کی نجات کی نہیں سماج کی نجات کی ہے۔

فاصلہ۔

قانون اور آزادی۔ قانون اور مساوات۔ مساوات قانون اور آزادی۔ عجیب گورکھ دھندا۔ بستی کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ وہ وچار کرتی جارہی تھی۔ الجھن میں پڑتی جارہی تھی:

قانون ہے تو قانون ساز بھی ہے۔

بستی سہم گئی:

قانون ساز ہے تو قانون نواز بھی ہے۔

سالم ہاتھوں والی بستی۔ انگلیوں والے سالم ہاتھوں والی بستی کے سامنے "چٹان" بھی اور تھا مسکراتا ہوا اشٹادکر جس کے پہلو میں کھڑا دبشیم اپنا وجود سہلا رہا تھا۔

بڑی الجھن تھی۔

جو آسان دکھائی دیتا تھا وہی مشکل تھا۔

بستی نہ خود میں ٹکی رہ سکتی تھی نہ دبشیم کو سہہ سکتی تھی۔

ندی میں تیرتا فلسفی تڑپ اُٹھا:

معاملہ نہ عقیدے کا رہا نہ توقع کا۔ معاملہ ترجیح کا نکلا۔ چننے اور ردّ کرنے کا نکلا۔ ترجیح اور اتیہاس! اتیہاس اور عقیدہ! توقع اور اتیہاس! اتیہاس اور انتظار! لہر لہر بے چین! موج موج بے قرار!

فلسفی نے اپنے کو سنبھالا:

اشٹاد کر نے ہی کہا ہے۔ قانون عارضی امر ہے۔

دبشیم نے سوکھی، ننہی، مرجھائی ہوئی بستی کی طرف دیکھا اور دیکھے اپنے گلے میں پڑے پھولوں کے ڈھیر سارے ہار۔ وہ مسکرایا اور بھیڑ میں کھڑے آریہ بھٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے اپنے گلے سے ایک ہار اتار کر اسے پہنا دیا۔ پھر وہ آریہ بھٹ کو ساتھ لے کر اشٹاد کر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر تک خم دار جسم کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اشٹاد کر کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

اشٹاد کر بولا:

یہ پہلے والا دبشیم نہیں ہے۔ یہ بستی کا دبشیم ہے۔ یہ دبشیم بستی کا ہے۔

لوگ گھروں کو لوٹ گئے۔ اپنی کلہاڑیاں چوک میں چھوڑ گئے۔ دبشیم نے کلہاڑیاں اکٹھی کیں۔ وہ اشٹاد کر اور آریہ بھٹ کو ساتھ لے کر راج محل کی طرف چل پڑا۔

راج محل کے دروازے پر پہنچ کر دبشیم رُک گیا۔ اُس کے ماتھے پر گہری لکیریں اُبھر آئیں:

"بستی سے الگ ہونے اور بستی سے الگ نظر آنے میں بڑا بھید ہے۔"

وہ راج محل کے پچھواڑے بنی پیلی کوٹھی کی طرف مُڑ گیا۔

فاصلہ۔

اپنی ننگی اور چکنی کمر پر ہونٹ پھیرتے پرومیتھیس کو سنڈریلا نے بتایا:

دوسری صبح اشٹاد کر جاگا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"مہاتمن! کیا آگیا ہے"؟

اپنے سامنے کھڑے باڈی گارڈ کو دیکھ کر اشٹاد کر بوکھلا گیا:

"مَیں کہاں ہوں؟"

اپنے سوال پر اشٹاد کر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ وہ راج محل کے چپے چپے سے واقف تھا اور پھر بھی پوچھ رہا تھا کہ وہ کہاں تھا۔

لان میں پھیلے جھٹپٹے میں سنڈریلا نے اپنے قدموں میں بیٹھے پرومیتھیس کی طرف غور سے دیکھا اور بولی:

بستی دُور دُور تک پھیل گئی۔ طرح طرح کے ناموں والی آبادیوں میں بٹ گئی۔ وشوکرماں کا کمال عروج پر تھا۔ اُس نے اُسے سرد فولاد اور ٹھنڈے کنکریٹ کی بلند و بالا بستی بنا دیا۔ دفتروں، کارخانوں، دکانوں اور مکانوں والی بستی کے سینے پر کالی سیاہ سڑکوں کا جال بچھا دیا۔

پرومیتھیس نے سنڈریلا کے پاؤں کو سہلایا اور وہ عجیب آواز میں منمنایا:

میری جان! یہ کیا کہانی چھیڑ رکھی ہے؟ تم بس رات کا خیال کرو جو اپنی تمام تر سیاہ سُندرتا کے ساتھ ہماری آتما میں اُترتی جا رہی ہے۔

فاصلہ۔

گول عمارت وشوکرماں کی کاریگری کا نمونہ تھی۔ لال رنگ کے پتھر کی گول عمارت راج محل کے دائیں طرف تھی۔ عمارت کے گول چبوترے پر کھُلتے ساگوان کے محراب دار دروازے تھے۔ گول دیوار میں کھڑکیاں تھیں جن کا اوپر کا حصّہ گولائی میں تھا۔ وسط میں وسیع گول ہال تھا ہال کے فرش پر بچھے خوبصورت ڈیزائن والے بیش قیمت قالین قالینوں پر لگی تھیں گدّے دار کرسیاں۔ چھت کی گولائی کے عین درمیان میں بہت بڑا گنبد تھا اور گنبد کے درمیان لٹکتا ہزار بتّی فانوس جس سے چھوٹتی روشنی ہزار عکس ہو کر ہال میں پھیل جاتی۔ ہال کی دیوار پر سجی ہوئی تھیں دبشیم کی تصویریں جو اُس کی عہد در عہد بدلتی یکساں شکل و صورت اور خد و خال کو عیاں کرتی تھیں۔ یہی تصویریں اُس کے کارناموں کا دم بھرتی تھیں۔

بوڑھے سے چلا نہیں جا رہا تھا سوکھی ٹانگوں والے مریل بوڑھے سے چلا نہیں جا رہا تھا کھرونچوں بھرے شیشوں والی عینک والے بوڑھے سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں چھوٹی سی کٹوری اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی پکڑے قدم قدم پر اُکھڑتے سانس والے بوڑھے کے لیے چلنا ناممکن ہو رہا تھا۔

بوڑھے کے پھٹے پُرانے میل خوردہ کُرتے کی اُدھی ادھوری دو جیبوں میں سے ایک میں کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ یہ ٹکڑا اُس نے اپنی دوسری جیب میں پڑی پرچی بیچ کر خریدا تھا بوڑھے کو بتایا گیا تھا کہ پرچی بہت قیمتی چیز ہے وہ اُس کی زندگی کی ضمانت ہے۔ وہ پرچی اُس کی آنے والی نسلوں کی زندگی کی ضمانت ہے۔

بوڑھا حیران رہ گیا۔ بھوکا، پیاسا، ننگا بوڑھا حیران رہ گیا تھا

اسے پتہ نہیں چلا کہ اُس نے اپنی پرچی کیسے دے دی اور کیوں دے دی۔ کوئی تھا جو اس کے پاس آیا۔ اُس نے اُسے کچھ سمجھایا، کچھ دکھایا اور اُس کے آگے ایک نقشہ بچھایا۔ مریل بوڑھے نے بستی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا پچکا ہُوا پیٹ تھپتھپایا۔ پیٹ کی مری ہوئی آواز سُن کر آنے والا مسکرا دیا۔ بوڑھے کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ اُس مُسکراہٹ کو دیکھتا چلا گیا اور اُس کا دماغ دُھندلانے لگا۔ اس نے اپنی پرچی نقشہ دکھانے اور بات بات پر مسکرانے والے ہاتھ میں تھمادی اور اپنی نگاہ گول عمارت پر جمادی۔

سنڈریلا نے پرمیتھیس کی آنکھوں میں ہوس کی تیز تر ہوتی ہوئی آنچ کو عجیب نظروں سے دیکھا اور اس کے گرم ہاتھوں کو اپنی کمر سے نیچے سرکنے سے روک دیا۔ پھر بے اختیار ہنسی ہنستے ہوئے وہ سپاٹ سُر میں بولی:

بوڑھے کی نگاہیں بدستور گول عمارت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ کسی اور طرف دیکھنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس نے صدیوں لمبا سفر طے کیا تھا۔ اپنے انجر پنجر اور دل اور دماغ کی قیمت پر یاترا کی تھی۔ وہ ان گنت مرحلے اور منزلیں طے کر کے عمارت تک پہنچا تھا۔ اتنا فاصلہ ناپ کر وہ کچھ لینے آیا تھا اُسے وہی چاہیئے تھا۔ اُس کے بغیر اس کا گذارہ نہیں تھا ——
اُس کے علاوہ اسے کچھ دوسرا راس بھی نہیں آسکتا تھا۔ گول عمارت اُس کی تپسیا کی دین تھی۔ وہ اُس کی امیدوں کا مرکز تھی ویسے بھی بوڑھے میں نہ آگے جانے کی طاقت تھی نہ لوٹنے کی سکت گول عمارت اُس کی عبادت کا صِلہ تھی اور پرچی اُس کے دُکھ کے مداوا کی ضمانت۔

باہر کنکریٹ اور فولاد کی بنی بستی تھی۔ بستی کے سینے پر بچھا کالی سیاہ سڑکوں کا جال بچھا تھا۔ بستی کے بلند و بالا اور سنہرے وجود پر بیٹھا تھا بوڑھا جس کی کھال اور ہڈیوں کے بیچ کے پٹھے اور ریشے کبھی کے تحلیل ہو چکے تھے۔ اب وہ سمٹتے پھیلتے کوڑھ کا داغ تھا۔

عجیب حالت تھی۔

سفر دبشیم نے بھی کیا تھا۔ اُس نے سر پر تاج پہنا تھا۔ اُس نے سر کٹوایا تھا۔ بات یہ نہیں کہ وہ بات سے ناواقف تھا۔ وہ بستی کو پہچانتا تھا۔ وہ بوڑھے کو بھی جانتا تھا۔ ریشم اور ٹاٹ کے فرق کو بھی مانتا تھا۔ اسی لیے گول عمارت میں بیٹھا وہ اپنا ماضی بھول کر سامنے لگے ترازو کے دونوں پلڑوں کو مساوی رکھنے میں جُٹا ہوا تھا۔

دبشیم کے ساتھ بیٹھے تھے آریہ بھٹ، وِشو کرماں، وِشنو گپت اِن کے علاوہ تھا کبیر۔ اس کے کانوں میں اشٹادکر کے اپدیش کی گونج تھی اور تھی اتہاس کے ان گنت پنوں کی پھڑپھڑاہٹ۔ لیکن اس سب کے ساتھ تھی سڑک پر پڑی ریزہ ریزہ سڑک کی کالکھ میں جذب ہوتی ہوئی لاش، سڑک پر بدحواس گھومتی ٹلکتی کوکھ والی الف ننگی عورت، آپس میں بٹی ہوئی اپنے آپ کو مارتی کاٹتی بستی، کالی سڑک پر دوڑتی ہوئی چمک دمک پر سمٹتا پھیلتا کوڑھ کا داغ جس کی سڑاند زندگی کی خوشبو کو نگلتی جارہی تھی۔

دبشیم نے اپنے گرد بیٹھے مہان پرشوں کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور دیکھا ترازو کے پلڑوں کو۔ وہ لرز اُٹھا۔

ترازو کے پلڑے بدستور اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ اُن میں پڑے باٹ اپنے اپنے وجود کی اہمیت جتا رہے تھے۔ وہ دبشیم اور اُس کے گرد بیٹھے مہان پرشوں کا منہ چڑا رہے تھے۔

دبشیم چیخ اُٹھا۔ اپنی چیخ کو عمارت کے گنبد سے ٹکرا کر لوٹتے سُن اس نے سراسیمہ ہو کر پھر اپنے اِردگِرد دیکھا۔ وہ سکتے میں آگیا۔ وہاں بیٹھے مہان پُرش خلا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ اس کے سامنے بس لگاتار ڈولتے ہوئے پلڑوں والا ترازو تھا اور تھیں گول عمارت کی گولائیاں۔

سنڈریلا نے بوکھلائے ہوئے پرمیتھیس کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور اُسے کھینچ کر عیش کدے کی سویں منزل کی کھڑکی پر لا کھڑا کیا ——
پرومیتھیس نے کھڑکی کے باہر گردن نکال کر نیچے دیکھا۔

کالی سڑک کے دونوں طرف تعصّب، عقیدہ، تحفّظ، قانون، ترجیح، توقّع، اعتقاد، سفر، راستہ، منزل، زمان و مکان، اتہاس، لازمانیت اور لامکانیت جیسے لفظوں کا قیمہ بنانے میں مست تھے۔ اُس قیمے کو شوق سے کھانے والے ہاتھوں میں جام تھامے للچائی نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رانوں کے بیچ ٹلکتی کوکھ والی عورت بدحواسی کے عالم میں پتہ نہیں کیسے گھوم رہی تھی۔ دُور نزدیک سے ہتھیاروں کے ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان آوازوں میں سے اُبھر رہی تھی مردوں، عورتوں، بچّوں، بوڑھوں اور جوانوں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا۔ پوری بستی آگ کی لپیٹ میں تھی۔ حالانکہ بستی کے شروع میں سلیٹی رنگ کی عمارت تھی اور اُس میں بیٹھا تھا اونگھتا ہوا وہ۔ اُس سے ذرا ہٹ کر تھی لال پتھر کی بنی گول عمارت جس کے اندر بیٹھا تھا دبشیم اور جس کے باہر بیٹھا تھا اَدھ مرا بوڑھا۔ دبشیم کے سامنے تھا بے قابو پلڑوں والا متضاد باٹوں کی جکڑ میں پھنسا ترازو۔ بوڑھے کی کمزور

وقار واثقی

وہ جو ملا، گویائی گم
الفاظ ہیں، لیکن معنی گم

انسان قدم رکھے تو کہاں
آکاش ہے لیکن دھرتی گم

اپنی اپنی سوچ میں آج
وہ بھی گم ہے، میں بھی گم

شعلہ اٹھا تھا، اک گھر سے
ہو گئی ساری بستی گم

ڈھونڈ رہا ہے ایک جہاں
اک چیز ہوئی تھی میری گم

اس کی بدلتی ایک نظر
عقل و خرد کی شوخی گم

اس کے گھر میں میرا حال
شہر میں جوں دیہاتی گم

● رسول آباد۔ احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

اویس احمد دوراں

لمحہ بہ لمحہ بڑھ ہی رہی ہے قلب و نظر کی بے چینی
جانے کہاں دم لے گی جاکر نوعِ بشر کی بے چینی

رات ڈھلی جاتی ہے پل پل اور میں اب تک جاگا ہوں
تو مجھے سونے دے گی بول اے دیدۂ تر کی بے چینی

کوئی قریہ کوئی وادی جائے سکوں اب نہیں رہی
چاہے جہاں بھی جاؤ ملے گی راہ سفر کی بے چینی

بالادستی شیوہ ہے جن کا پہنچ گئے سیاروں میں
دید کے قابل ہوگی اک دن شمس و قمر کی بے چینی

اہلِ زمیں کے پاؤں کے نیچے ذرّہ ذرّہ بے چین
اس سے بڑھ کر ہوگی بھلا کیا برق و شرر کی بے چینی

غم کی شدت سہتے سہتے ہو گئے بے حس ہم ورنہ
تاج گرا دیتی ہے سر سے اہلِ نظر کی بے چینی

دوراں ان کا حال نہ پوچھو جن کو دکھوں نے توڑ دیا
کون مسیحا دور کرے گا ان کے گھر کی بے چینی

● محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ (بہار)

ایم۔ اے شاد

دشتِ احساس میں آوازِ درا ملتی ہے
مجھ کو ہر سانس میں تمہید نوا ملتی ہے

رات سو جائے تو بیدار ہوا ملتی ہے
گھر کی دہلیز پہ قدموں کی صدا ملتی ہے

تجھ کو شاید نہیں معلوم حریفِ جادہ
یہ سڑک دشتِ بلاخیز سے جا ملتی ہے

ہم جسے بیچنا چاہیں، وہ خریدیں کیوں کر
زندگی! ہم سے تو بازار میں کیا ملتی ہے

چاند پانے کو مُصر ہو کوئی روتا بچہ
آئینہ ہاتھ میں دیدو تو جزا ملتی ہے

تجھ کو سوچیں بھی نہیں اور کہانی کی طرح
بات کیوں کوچہ و بازار سے جا ملتی ہے

گھر کے شیشوں پہ ترا نام لکھا ہے جب سے
دھوپ گل دان کے پھولوں سے خفا ملتی ہے

● شعبہ اردو، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج۔ بھوپال

بچوں کا ادب
آج کی مغربی دنیا میں اور ہم

سردار احمد (علیگ) ● سیڑھی والا گھر، کٹرہ شہاب خاں، اٹاوہ (یوپی)

انگریزی میں بچوں کے ادب کی روایت ۱۶۷۱ء سے مانی جا سکتی ہے جب بچوں کے لیے ایک کتاب A TOKEN FOR CHILDREN منظر عام پر لائی گئی۔ یہ ادب ترقی اور تبدیلی کے مختلف مدارج طے کرتا رہا لیکن TIME کے مشہور تبصرہ نگار اسٹیفن کینفر STEFAN KANFER کے مطابق مغرب میں ایک عرصہ تک بچوں کا ادب پبلشروں اور خریداروں کی نظروں میں ممتاز حیثیت نہ پا سکا۔ اس ادب سے متعلق کتابوں کو زندگی میں جگہ تو دی گئی لیکن تبصرہ نگاروں نے اپنے تمام تبصروں کے آخر میں جگہ دی، تو ناشرین نے فہرست کتب کے کتابچوں میں سب سے آخری صفحات وقف کیے اور پبلک لائبریریوں میں شیلف کے سب سے نیچے بچوں کے ادب کو رکھا گیا۔ آج عالم ہی دوسرا ہے۔ حالات بالکل برعکس ہیں۔ اب مغرب میں بچوں کا ادب دو سو ملین ڈالر کی کمائی کا ذریعہ ہے اور بہت سے پبلشرس بڑوں کی کتابوں کا خسارہ بچوں کی کتابوں سے پورا کر لیتے ہیں۔[1] مؤخر الذکر حقیقت کی تصدیق HARPER AND ROW کتابوں کے سیلس منیجر فرینک شیوشیا FRANK SCIOSCIA نے بھی اپنے ایک بیان میں کی ہے۔ ویسٹرن پبلشنگ کے صدر ٹیرنس ڈینیلس TERRENCE DANIELS نے بچوں کی کتابوں کی فروخت کے صرف اپنے ادارہ کے اعداد و شمار بتاتے ہوئے کہا ہے کہ بچوں کے ادب سے متعلق کتابیں پینتیس ۳۵ ملین اندرون ملک اور دس ملین بیرون ملک سال بھر میں فروخت کی گئیں۔ مغرب میں بچوں کے ادب کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا احساس اس قدر عام ہے کہ بچوں کے سرپرست، اساتذہ اور ذی علم حضرات اور صاحبانِ قلم اس لٹریچر کو اپنی زندگی کا ایک لازمی جزو بنا چکے ہیں۔ بچوں کا ادب KID LITERATURE کے نام سے بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہو رہا ہے۔

ہمارے یہاں اردو میں پریوں کے قصے اور اس طرز کی کتابوں کے خلاف بعض حضرات رائے دینے لگے ہیں اور سائنسی دور کے منافی سمجھتے ہیں لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سائنس کی آسائشوں اور آلائشوں میں ڈوبے ہوئے مغربی ممالک میں ایسے قصوں کو بچوں کے لیے مفید اور ان کی شخصیت کی نشو و نما میں معاون سمجھا جا رہا ہے۔ ابھی حال میں شائع ہونے والی ایک نئی کتاب "THE USES OF ENCHANTMENT" میں مشہور ماہر نفسیات برونو بٹیلہیم BRUNO BETTELHEIM رقمطراز ہیں :-

The fairy tale enlightens him about himself and fosters his personality development. Fairy tales are unique not only as a form of literature, but as works of art which are fully comprehensible to the child, as no other form of art is."

اس سلسلے میں اپنی اردو دنیا کے ایک ردِ عمل کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ میری ایک کتاب "خواب ایک بچے کا" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ہندوستان کی WILD LIFE کے بارے میں مستند معلومات دلچسپ کہانی کی شکل میں بچوں کی پسند، ان کے معصوم تجسس اور ان کی دلچسپی کو کہانی کے

---

[1] "TIME" (29 DEC 1980)

ہر موڑ پر برقرار رکھتے ہوئے پیش کیے۔ کہانی کا ہیرو ایک چھوٹا بچہ ریحان ہے جو خواب میں ایک خوبصورت پری کی ہمراہی میں ہندستانی جنگلات کی پراسرار فضا، وہاں کے جانوروں کے رہن سہن، عادات و اطوار، کھانے پینے اور ان کی شب و روز کی زندگی کے بارے میں جو کچھ دیکھتا سنتا ہے وہ دلنشیں انداز میں تصاویر کے ساتھ کتاب میں درج کیا گیا۔ خواب میں پری اور ہندستانی جنگلات کی زندگی ہی کیوں نظر آئی، اس کا معقول جواز بھی کہانی کی ابتدا کا اہم جزو ہے۔ اس پر بچوں کے ادب کے ایک نام نہاد ماہر نے اعتراض کیا کہ صاحب، پریوں کی کہانیوں کا زمانہ ختم ہو گیا ہے لیکن افسوس کہ موصوف کی نظر بچوں کی نفسیات اور کہانی کی اس تکنک کی افادیت پر نہ گئی۔ مغرب میں بچوں کے ادب میں موضوعات اور تکنک کی دنیا محدود نہیں ہے اور وہاں کے دانشور اس کی بڑی واضح اور صاف تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ آئزک بیشیوس سنگر ISAAC BASHEVIS SINGER کے نوبل پرائز ایڈریس میں درج ذیل دس نکات قابل غور ہیں، جو انھوں نے اس سوال کے جواب میں بتائے ہیں کہ وہ بچوں کے لیے کیوں لکھتے ہیں؟

1. Children read books, not reviews. They don't give a hoot about critics.
2. Children don't read to find their identity.
3. They don't read to free themselves of guilt, to quench their thirst for rebellion, or to get rid of alienation. 4. They have no use for psychology.
5. They detest Sociology. 6. They don't try to understand Kafka or Finnegans wake.
7. They still believe in God, the family, angels, devils, witches, goblins, logic, clarity, punctuation, and other such obsolete stuff.
8. They love interesting stories, not commentary, guides or footnotes.
9. When a book is boring, they yawn openly, without any shame or fear of authority.
10. They don't expect their beloved writer to redeem humanity. Young as they are they know that it is not in his power. Only adults have such childish illusions.

اسٹیفن کینفر STEFANKANFER نے انگریزی میں پچھلی تین چار نسلوں میں بچوں کے ادب کے لکھنے والوں کا ایک مختصر لیکن جامع جائزہ ابھی حال میں پیش کیا ہے جس کے مطابق آج کے معاصر ادیبوں میں صرف سنگر SINGER ہی نہیں بلکہ بہت سے ناول نگار اور شعرا جیسے جان اپڈایک JOHN UPDIKE، رینڈل جیرل RANDALL JARRELL، ایلسن لیوری ALISON LURIE جان گارڈنر JOHN GARDNER الزبتھ جینوے ELIZABETH JANEWAY اور ارسلا لی گین URSULA LE GUIN نے اعلیٰ قسم کی کتابیں بچوں کے لیے تصنیف کی ہیں۔ اس نسل سے قبل مشہور مضمون نگار ای۔ بی۔ وہائٹ WHITE نے دو اہم کتابیں STUART LITTLE اور CHARLOTTES WEB پیش کیں جو کلاسک کا درجہ اختیار کر گئیں۔ مزاح نگار جیمس تھربر JAMES THURBER اپنی مقبول تصنیف THE THIRTEEN CLOCK سامنے لائے، اور اس سے پہلے ٹالکین TOLKEIN نے THE HABBIT نامی کتاب لکھ کر نام کمایا۔ کیرل CARROL کی ALICE BOOKS اور بھی پہلے مقبول ہو چکی تھیں۔ لیکن اب تو مغربی دنیا میں بچوں کے ادب کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا ہے۔

مغرب میں بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے کچھ مخصوص انعامات کا بھی ذکر ضروری ہے۔ امریکن لٹریچر میں بچوں کے لیے سب سے نمایاں تخلیق پیش کرنے کے صلے میں JOHN NEWBERY MEDAL عطا کیا جاتا ہے جو اٹھارویں صدی کی ایک ایسی شخصیت کے نام کی یادگار ہے جس نے بچوں کے لیے کتابوں کے شائع کرنے اور فروخت کرنے کا بہت اہم کام بڑے پیمانے پر انجام دیا تھا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے مشہور مصور کے نام پر RANDOLPH J. CALDECOTT MEDAL بھی ہر سال ایسی ممتاز کتاب پر ملتا ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہو اور باتصویر ہو۔ ان انعامات کو پانے والی کتاب کے لیے ایک لاکھ کاپیاں زیادہ فروخت ہونے کی ضمانت ایک طے شدہ حقیقت ہے۔

بچوں کے لیے تصاویر یا ماڈل بنانے والوں کی اہمیت مغرب میں پکاسو اور میٹس MATISSE سے کم نہیں ہے، اس کا ثبوت آج کل پچیس برس سے مشہور و معروف ماریس سنڈک MAURICE - SENDAIC کی ان ۷۸ عدد کتابوں کی کئی کروڑ جلدوں کی فروخت اور

مقبولیت سے ملتا ہے جو خود سنڈک کی لکھی ہوئی یا اس کی مصوری سے مزین ہیں ۔ ایسے ادیب کی کتابیں جو بچوں کے لیے خود ہی تصاویر
اور اسکیچ بھی بنا سکے، اب مغرب میں زیادہ مقبول ہو رہی ہیں ARNOLD LOBEL کا نام بھی اس خوبی کے لیے آج کل انگریزی
ادب میں لیا جا سکتا ہے ۔ اردو میں بچوں کے آرٹسٹ یا مصور کا انفرادی طور پر ایسا کوئی وجود نہیں ہے کہ اس کے فن کے لیے انعام و اکرام
سے نوازا جائے اور نہ کسی ادیب و شاعر کے لیے اتنی بڑی مارکیٹ ہے جہاں بچوں کے لیے اس کی کوئی تخلیق ہزاروں ہی کی تعداد میں فروخت
ہو سکے ۔ آج اردو کی اچھی سے اچھی کتاب صرف پانچ سو یا ایک ہزار کے ایڈیشن سے آگے نہیں نکل پاتی اور اس کے نکاس کا عمل برسوں
تک چلتا ہے ۔ اس میں ہماری تعلیمی پس ماندگی کے ساتھ ساتھ مطالعہ کی عادت کا معدوم ہونا بھی شامل ہے ۔ اردو سماج میں عام طور سے
یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ مطالعہ کے لیے اپنے بجٹ میں کوئی رقم مخصوص نہیں کرتے ہیں۔

بچوں کی کتابوں کے ایک بڑے ناشر HARPER & ROW کی رپورٹ میں اس کے نائب صدر CHARLOTTE ZOLOTOW
نے انکشاف کیا ہے کہ ہر سال بچوں کے ادب سے متعلق آٹھ ہزار کتابوں کے مسودے اس کے دفتر میں ڈاک سے موصول ہوتے ہیں جن میں
کچھ بچوں کے بھی ہوتے ہیں ۔ بچوں میں اپنی کتابیں خود لکھنے کا نیا رجحان بھی مغرب میں پیدا ہو رہا ہے جس کی خبریں یونسکو UNESCO کے BOOKS
FOR ALL کی انیسویں اشاعت میں موجود ہیں ۔ ٹائم TIME کی جلد ۱۱۶ شمارہ نمبر ۲۶ کی اطلاع کے مطابق مذکورہ آٹھ ہزار مسودوں
میں ایک سو سے کم ہی مسودے طباعت کے لیے پائے جاتے ہیں لیکن بچوں کے ادب کا ایک سیلاب عظیم ہر پبلشر اور ناشر کے دفتر میں امنڈا ہوا ہے
جس کے پڑھنے، جانچنے اور انتخاب کرنے کے لیے بچوں کے ادب کے مستند پارکھ اور نقادوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں ۔

ہماری اردو دنیا کا حال اور مسائل :

بچوں کے ادب پر کئی برس قبل "سال اطفال" کے موقع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ ریڈیو اور ٹی وی
پر مذاکرات کا اہتمام ہوا اور کئی رسائل کے اچھے اور معیاری "اطفال نمبر" بھی شائع ہوئے ۔ کچھ
ایسا یقین ہونے لگا کہ اب اردو میں بچوں کے ادب کے سلسلے میں خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہوگی اور اس کے فروغ میں تبصرہ نگاروں اور نقادوں
کا قلم اور اردو اکیڈمیوں کی انعامی رقم اپنا رول ادا کریں گی لیکن نتائج اطمینان بخش نہیں نکلے ۔ ایسا کیوں ہے، اس کے لیے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا
ضروری ہے۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کا ادیب اور شاعر بننا کسر شان سمجھا جاتا ہے ۔ کبھی کبھار بڑے ادیب و شاعر بچوں کے لیے
بھی کچھ لکھ دیتے ہیں لیکن اس سے اپنا تشخص کرانا کم پسند کرتے ہیں ۔

۲۔ بڑے بڑے پبلشرس مالی اور تجارتی نقطۂ نظر سے چونکہ بچوں کے ادب کی اشاعت اپنے لیے مفید نہیں سمجھتے اس لیے اس پر اپنی توجہ
پوری طرح مرکوز نہیں کرتے ۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ کسی نئے ادیب کی اچھی کتاب کو ٹال دیا گیا لیکن کسی بڑے نام والے کی اوسط درجہ یا معمولی
درجہ کی کتاب کو محض اس کے منصب اور رسائی کا خیال کر کے شائع کر دیا گیا ۔ پبلشرس اس قسم کی ذہنیت میں تبدیلی لائیں تو بچوں کے حق میں
بہتر ہوگا ۔ رچرڈ اسکاری RICHARD SCARRY جن کی کتابوں کی اسّی لاکھ کاپیاں ستائیس زبان میں فروخت ہو چکی ہیں نے بڑی معقول
بات کہی ہے کہ ہر کتاب بچوں کے ادب سے متعلق نہیں ہوتی ہے ۔ بعض کتابیں جو بچوں کے ادب میں شمار ہونے لگتی ہیں وہ بڑوں کے کام کی چیزیں
ہیں ایسی کتابوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے رچرڈ اسکاری نے فیصلہ کن انداز میں کہا ہے کہ :۔

" They really are not children's books. The text is either too demanding for youngsters or not on their wave length. Children want stories to statisfy their natural curiousity. " (TIME Dec. 1980 Page 53).

۳۔ اکاڈمیوں نے بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں پر انعامات دینے کے لیے ابھی تک کوئی رہبر اصول اور ضابطے الگ سے نہیں مرتب
کیے جس کی وجہ سے ہر سال کئی اہم اور مفید کتابیں انعامات سے محروم رہ جاتی ہیں اور ان کے مصنفین کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے ۔

۴۔ ہمارے تعلیمی اداروں کے سربراہان اور ہمارے اردو اساتذہ جن کے سپرد چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نازک اور مقدس

کام ہے۔ بچوّں میں نصابی کتابوں کے علاوہ کتابوں کے مطالعہ کی عادت پروان نہیں دیتے بلکہ میں نے اتر پردیش کے بیشتر اسکولوں کے اردو اساتذہ کو بچوّں کے ادب سے قطعی ناواقف اور اس کی اہمیت سے یکسر خالی پایا۔ انھیں نہ بچوّں کے مصنّفین کا پورا علم ہے اور نہ کتابوں کے نئے اور پرانے ذخیروں کی پوری جانکاری۔ اس سے بدتر حالت بچوّں کے والدین اور سرپرستوں کی ہے جنھیں بچوّں کے لیے اچھی کتابوں اور مفید رسائل کی خریداری انتہائی بار معلوم ہوتی ہے اور ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جنھیں اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کا احساس بھی نہیں ہے۔

۵۔ بچوّں کے لیے لکھی گئی پرانی اور نئی کہانیوں کو جس طرح روس، امریکہ اور یوروپین ممالک میں فلم کے ذریعہ وسیع تر پیمانہ پر عام کیا جارہا ہے، اس تناسب سے ہماری فلمی دنیا میں بچوّں کی فلموں پر توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بچوّں کے ادب کے لیے اس موثر ذریعہ ابلاغ کا سہارا لینا بھی ضروری ہے۔ مغربی ممالک کی طرح بچوّں کے لیے کہانیوں کے کیسٹ کا چلن ہندوستان اور پڑوسی ممالک میں عام ہو رہا ہے لیکن غریب اور کم آمدنی والے طبقے ان کے فوائد سے محروم ہیں۔ اسکولوں میں آڈیو وژول AUDIO VISUAL فیس کی مدد سے اس کا انتظام ابھی صرف ایک فی صدی ہی نظر آتا ہے۔ اگر اسکولوں اور لائبریریوں کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو بچوں کے ادب کو کیسٹ CASSETTE کے ذریعہ بڑا فروغ مل سکتا ہے اور بچوّں کی خوبصورت، پیاری، دلنشیں اور معیاری نظمیں اچھی اور شیریں آوازوں میں پیش کی جا سکتی ہیں جنھیں بچے رٹنے سے زیادہ سُن کر اور محظوظ ہو کر خود بخود یاد کر سکتے ہیں۔ آج کے مشہور شاعر اور نقّاد کارلا کسکن KARLA KUSKIN کے تجربہ کے مطابق نظمیں فلم بندی اور صدا بندی کے بعد بچوّں کو زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ موصوف نے اپنا تجربہ بھی پیش کیا ہے کہ اس کی آواز میں سننے کے لیے بچوّں نے کم دلچسپی کا مظاہرہ کیا لیکن فلمی ذرائع ابلاغ کا استعمال زیادہ مفید ثابت ہوا۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کہیں فلم بچوّں کے ادب کی اشاعت میں کمی کا باعث نہ بن جائے۔ اس سلسلے میں مغربی ممالک میں جو عملی تجربات اور ان کے نتائج سامنے آئے ہیں وہ اس مفروضہ کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ تھیوڈر گیسل THEODOR GIESEL کے مطابق:-

" The time taken to watch the screen certainly detracts from time to read books. But the paradox is that good kid books are selling more than ever. "

(TIME Volume 116 No. 26 December 29, 1980).

۶۔ ہم تعلیمی اعتبار سے دنیا کے دوسرے ممالک سے ابھی بہت پیچھے ہیں۔ پورے ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کا فیصد اطمینان بخش نہیں ہے اور اردو دنیا اسی سماج کا ایک جزو ہوتے ہوئے اور بھی قابل ذکر سطح سے نیچے چل رہی ہے۔ بعض دیگر ہندوستانی زبانوں سے زیادہ اس میں منصب داری کے لیے کھینچا تانی کا بازار گرم ہے۔ ہر شخص جس کے ہاتھ میں ہلدی کی ایک چھوٹی سی گانٹھ ہے وہ اپنے کو شاعر اعظم اور عظیم ترین ادیب سمجھ رہا ہے۔ ان حالات میں بچوّں کے ادب کا بھی جو حال ہونا چاہیے وہ سامنے ہے۔

۷۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر بچّہ میں فطری طور سے اچھائی، برائی، محبّت، نفرت، بُغض، عداوت، جُدائی، ملاپ اور حسد و مقابلہ، نرمی و سختی جیسے جذبات کسی نہ کسی سطح پر اُبھرے یا چھپے، ظاہر یا پوشیدہ حالت میں رہتے ہیں، ان کی تطہیر اور تہذیب اور ان کو صحت مند سمت میں موڑنا اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی طرف مائل کرنا۔ بچوّں کے ادیب کا قلم جس مہارت، عمدگی اور غیر محسوس ڈھنگ سے انجام دے سکتا ہے وہ وعظ، لکچر اور براہِ راست نصیحت سے ممکن نہیں ہے۔ اردو میں بچوّں کے ادیب اپنی ذمّہ داری اور اپنے مقدّس کام کی عظمت سے غافل نہ ہوں۔

"شاعر کے لئے نایاب تصویریں، تحریریں اور خطوط ارسال کیجیے۔ ہم آپ کے شکریے کے ساتھ انھیں شائع کریں گے اور بہ حفاظت آپ تک پہنچا دیں گے۔"

سلطان اختر

①

چاروں طرف جل تھل کر دے
موسم کو پاگل کر دے
تجھ پر نازاں آبلہ پا
کانٹوں کو مخمل کر دے
تنگی کو پھر وسعت دے
صدیوں کو اک پل کر دے
ورق ورق معنی چمکیں
لفظوں کو صیقل کر دے
اس بے منظر موسم کو
آنکھوں سے اوجھل کر دے
جنگل جنگل شہر بسا
شہروں کو جنگل کر دے
آنکھوں کو متبرک کر
اشک کو گنگا جل کر دے
مظلوموں پر رحم خدا
ظالم بازو شل کر دے
گمراہی کے خیموں میں
ہلکی سی ہلچل کر دے

②

سورج میں دھوپ پیڑ میں سایہ نہیں رہا
اب موسموں کا ذائقہ اپنا نہیں رہا

بیتے دنوں کی یاد تہی دست کر گئی
آنکھیں کھلیں تو کوئی شناسا نہیں رہا

اب طاقِ انتظار پہ جلتے نہیں چراغ
دل میں کسی کے داغِ تمنا نہیں رہا

یاد آئیں گی گزشتہ دنوں کی سخاوتیں
جب سوچیئے گا کیا رہا کیا نہیں رہا

ہر شخص اپنے آپ میں یوں مطمئن ہے اب
جیسے کسی کو خوفِ خدا کا نہیں رہا

پھر موسمِ طلب میں کچھ ایسی ہوا چلی
سرسبز کوئی برگِ تمنا نہیں رہا

خود سے ملے تو اپنی نگاہیں لرز گئیں
اب آئینے میں عکس بھی اپنا نہیں رہا

● ہوم (دہلی)، ڈپارٹمنٹ، اولڈ سکریٹریٹ، پٹنہ ۱۵ (بہار)

جمال قریشی

اپنے دل کو میری یادوں کا نگر اُس نے کیا
اس طرح کچھ فاصلوں کو مختصر اُس نے کیا

کس طرح محسوس کرتا میں مسافت کی تھکن
عزم و ہمت میرے اپنے تھے سفر اُس نے کیا

مجھ کو اس کا غم کہ سارے شہر میں رسوا ہوا
اس کا یہ دعویٰ کہ مجھ کو معتبر اُس نے کیا

رفتہ رفتہ ہو گیا وہ اس قدر میرے قریب
مجھ کو اپنے آپ سے بھی بے خبر اُس نے کیا

چاہتوں کے پھول تو ہر وقت برساتا رہا
میرے زخموں سے مگر صرفِ نظر اُس نے کیا

لوگ اپنے سر ہتھیلی پر لئے پھرنے لگے
ظلم جب حد سے بڑھا تو یہ اثر اُس نے کیا

توڑ ڈالے عبد اور معبود کے رشتے تمام
آدمی کو آدمی سے باخبر اُس نے کیا

● جمال منزل، جمال پورہ، پگیتا، احمد آباد (گجرات)

دائرہ اور خط

ارتضیٰ کریم ● اے ای ڈبلیو - ۵/ اے ۹، کرول باغ، نئی دہلی - ۵

جب بادل برس چکا تو

تو دھرتی کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرتی نظر آئی ـــــ اور کچھ دنوں بعد اس میں زندگی کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔ لیکن جیسے جیسے زندگی کے نقوش واضح ہو رہے تھے ـــــ میں ...

... میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ کہ میرے خواب چکنا چور ہوتے نظر آئے، اور تب لگا میں خط بننے کی کوشش میں بالآخر دائرہ ہی بنتا جا رہا ہوں۔ شاید یہ دائرے ہی میرا مقدر ہیں۔ میں اس حصار سے باہر آنا چاہتا ہوں چاہتا تھا ـــــ لیکن ـــــ؟

میں اس دائرے کو توڑنے میں مصروف رہا اور میرا جسم، جسم کے اعضاء، ان لذتوں سے محروم رہے کہ یہ محرومی دائرے سے باہر آنے کی پہلی اور بنیادی شرط تھی۔

مگر یہ سب کچھ نہ ہوا ـــــ ہوتا بھی کیوں؟ میں شاید غیر فطری طور پر سوچ رہا تھا ـــــ نہ صرف سوچ رہا تھا بلکہ عمل بھی کر رہا تھا

ـــــ لیکن، تشنگی، پانی کی نوعیت نہیں دیکھتی! مفر اور بے مفر میں تفریق نہیں کرتی۔ تشنگی کو گرفت میں لینا، اس پر اختیار پا لینا ہی انسان کی فتح ہے ـــــ میں فتح کے قریب تھا مگر ...

ـــــ حالانکہ میں نے بات سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ کئی بار ہم میں گرما گرم گفتگو ہوئی ـــــ "

"میں نہیں چاہتا کہ ـــــ"

"مگر میں چاہتی ہوں کہ "

... اس روز چار برسوں میں پہلی بار مجھے اس کے لہجے میں سختی اور کرختگی کا احساس ہوا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انسان کے مزاج کو سمجھنے کے لئے چار سال کا عرصہ کم ہے یا زیادہ ـــــ کہ انسان اور یہ کائنات دونوں کی تفہیم و تفہیم جانے ممکن ہے بھی یا نہیں؟

میں ذرا کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوں، اس لئے میں نے اس کے لہجے کی سختی کو محسوس بھی کر لیا، ورنہ ـــــ شاید ـــــ بات ہی کچھ ایسی تھی یا ہے، پتہ نہیں ـــــ بات تھی یا ہے، شاید ہے، کیونکہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی! ختم بھی کیوں کر ہو سکتی ہے کہ میں اپنے مفاد کی سوچتا ہوں اور وہ اپنے ـــــ!

"ایک انسان دوسرے کے لئے کب مفر اور خراب ہو جاتا ہے، کب جذبۂ محبت نفرت میں تبدیلی ہو جاتی ہے ـــــ؟"

شاید محبت کی جگہ نفرت اور دوستی کی جگہ دشمنی اس وقت جنم لیتی ہے جب انسان اپنے اپنے دائرے میں بیٹھ کر صرف اپنی ذات سے متعلق سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ ورنہ ـــــ میں اور وہ ـــــ

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم دونوں میں کوئی غیر معمولی جنگ ہے یا ہم لوگ نفرت کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، مگر پھر بھی ایک احساس ہے، جس کا کیا نام دیا جائے ـــــ شاید محسوسات کو نام دینا مشکل ہے ...

"مگر میں چاہتی ہوں کہ ـــــ"

وہ جانے کیا کیا کہہ کر اور کہنے سے زیادہ اداس ہو کر خاموش بیٹھ گئی، شاید وہ بھی میری طرح سوچ کی دنیا میں مگن ہے۔ ایسا اکثر ہوا کیا ہے کہ جب وہ بولنے لگتی تو میں خاموشی کو راہ دیتا ـــــ اور جانے کیا کیا سوچنے لگتا ہوں ...

"اگر میں اس کی بات مان لوں تو ـــــ؟ نہ مانوں تو ـــــ؟"

حالانکہ اس کی بات ماننے میں میرا، بلکہ ہم دونوں کا فائدہ ہی ہے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ گھر میں سکون بحال ہو جائے گا۔ مگر کہیں یہ سکون ـــــ؟

... نہیں ... نہیں ...

"... میں ہمیشہ اپنی ماں سے کہتا تھا کہ میری شادی پڑھی لکھی لڑکی سے کرنا۔ پڑھی لکھی لڑکیاں حالات کی نزاکت کو سمجھتی ہیں۔ وقت کے مزاج

سے آشنا ہوتی ہیں۔ پھر شوہر کی مجبوریوں پر بھی ان کی نگاہ ہوتی ہے۔ ان کو کوئی بات سمجھانا قدرے آسان ہوتا ہے۔ مگر جانے کیوں اور خواہشوں کی طرح میری یہ خواہش بھی تکمیل کے دروازے پر دستک ہی دیتی رہی ۔ ورنہ مجھے یقین ہے وہ مسئلہ جو اتنا پیچیدہ ہوگیا یا ہوتا جا رہا ہے، نہ ہوتا ... اور میں ___"

میں نے محسوس کیا کوئی میرے بالوں سے کھیل رہا ہے۔ کرسی جس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا، اس کے پیچھے میری بیوی کھڑی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بڑے غور سے دیکھا ___ ایسے جیسے پہلی بار ملے ہوں، جیسے ایک دوسرے میں کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ ہی بول اٹھی ___ لیکن اس بار اس کی آواز میں کرختگی نہ تھی، بلکہ شیرینی اور مٹھاس تھی۔ میں نے ذرا غور سے سُنا تو لگا، وہ پچھلے چار برسوں کا کھاتہ کھولے بیٹھی ہو...

"... تم ___ تم نے مجھے پہلی رات سے آج تک سُکھوں کی چادر میں چھپائے رکھا، میری معمولی سی تکلیف پر تم دل برداشتہ ہوتے رہے۔ تم مجھے اتنا پیار، اتنا پیار کرتے ہو کہ میں ایسی دعا کرتی کہ، ایسا ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ہر عورت کو ملے ___ تم میری ہر بات کا کتنا خیال رکھتے ہو۔ تمہارا پیار، تمہاری چاہت بے مثال ہے۔ تم نے اپنی معمولی سی آمدنی میں ہی میرے سارے اخراجات اٹھائے ہیں۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ تم اتنی محدود آمدنی میں اس خوبصورتی سے گھر کیوں کر چلاتے ہو؟ مجھے تمہاری محبت پر ناز اور فخر ہے، مگر پھر بھی تم ___؟ آخر تم مجھے ایسی سزا کیوں دے رہے ہو، جو میں برداشت نہیں کرسکتی، جو تمہارے سارے اچھے کرموں پر پانی پھیر دینے کیلئے کافی ہے۔ کیا میں؟ کیا تم؟ کیا ہم؟ ..."

... بس ___ بس! میں نے اس کے لبوں پر انگلیاں رکھ دیں۔

"تم یہ سزا، تنہا تو نہیں جھیل رہی ہو؟" ۔ یہ مشترکہ ہے۔ پھر اسے سزا تو نہ کہو ___ کل آنے والا سورج بتائے گا کہ یہ انعام ہے انعام!

یہ سچ ہے کہ تمہارے مشورے میں ہمارا بھلا ہی ہے ___ مگر میری رائے بھی نفع سے خالی نہیں ___ تیاگ، تپسیا، قربانی مقصد سے ہمکنار کرنے والی چیزیں ہیں۔

اور یہ تو معمولی خوشیاں ہیں جانم
خوابوں کو ساکار کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو تیاگنی ہی پڑتی ہیں
میں نہیں چاہتا کہ ___"

... تم میری زندگی میں اس وقت آئیں، جب میری حیات پر پچیس تیس خزائیں گذر چکی تھیں۔ تم نے نہیں دیکھا کہ گرم ہواؤں میں میرے کتنے جذبات زرد ہوئے اور بادِ مخالف نے میری کتنی تمناؤں کی کشتیاں ساحل تک پہنچنے سے قبل غرق آب کر دیں ___ اور میں نے خود کو پھر بھی سمیٹ سمیٹ کر، بچا بچا کر، اس لئے رکھا ہے کہ میں اپنے خواب ان آنکھوں میں بسا سکوں، جو میری ہیں ___ اور ابھی وقت نہیں آیا کہ میں اپنی آنکھوں کو دریافت کروں۔ اگر مناسب وقت میں ان آنکھوں کی دریافت نہ ہوئی تو یہ آنکھیں بھی بے نور ہونگی، ان میں خواب تو ہوں گے، مگر اس کی تکمیل کے بجائے، انتظار انکا مقدر ہوگا۔ اور پھر میری آنکھوں میں اور ان آنکھوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ تم مجھے ابھی آنکھوں کی دریافت پر مجبور نہ کرو ___ میری مدد کرو کہ ___...

میں دائرہ نہیں بننا چاہتا، میں صدیوں سے دائرہ بنتا چلا آیا ہوں۔ مجھے خط بننا ہے اور میں خط بننے کی کوشش میں ہی جی رہا ہوں۔ جس روز مجھے یقین ہوگا کہ اب میں خط کی شکل میں آگیا ہوں، اس روز، تم دیکھو گی' میں آنکھوں کی دریافت کرتا ہوں یا نہیں ___ میرا خیال ہے تم دائرہ اور خط کا فرق ___

نہیں ___ مجھے ان کی تفریق نہیں سمجھنی... تم دائرہ بنو یا خط، مجھے اس سے کیا حاصل؟ کہ میں تم اپنی ___ ..." "حاصل ہے ___" خط بننا تمہاری تکمیل کی علامت بھی ہے اور استحکام بھی، اور اگر تمہاری ضدوں نے مجھے خط بننے سے روک دیا تو تمہاری تکمیل بھی ادھوری ہوگی، آدھی ہوگی ___ کہ

دائرہ اپنی وسعت کے باوجود، آخرکار اپنی جگہ واپس آجاتا ہے۔ مگر خط ___؟ خط میں ارتقا ہی ارتقا ہے، سفر ہی سفر ہے ___ خط واپس نہیں لوٹتا...

مجھے تمہاری ان پیچیدہ باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم مجھے لفظوں اور جملوں کے بوجھ تلے داب دینا چاہتے ہو، تم سمجھتے ہو، میں صرف بے وقوف اور نادان ہوں کہ میں ___ آخر میں چار برسوں میں میں نے تمہیں تھوڑا تھوڑا ہی سہی، مگر کچھ تو جانا ہے!"

"... تم ایک شکست خوردہ انسان ہو۔ زندگی جس پر قہقہے لگاتی ہے۔ تم نہایت کھوکھلی زندگی گذار رہے ہو۔ نادیدہ خوشیوں اور دُھندلی مسرتوں کے انتظار اور امید میں سامنے کی آسودگیوں کو گنوا رہے ہو، تم سمجھتے ہو، میں تمہاری کمزوریوں سے بے خبر یا ناواقف ہوں ___ سنو!

حقیقت یہ ہے کہ تم میری دھرتی پر اس بادل کی مانند چھائے رہے، جو ٹھنڈا سایہ تو دے سکتا ہے، ٹوٹ کر برس نہیں سکتا۔۔"

تشنگی، دھرتی کی مسلسل برہمی اور گرمی سے ماحول روز بہ روز گرم ہوتا گیا اور ـــــ

جب فضا میں حد درجہ اُمس، گھٹن اور تپش بڑھتی گئی، تو ہم نے خیال کیا، اب اس گرمی میں ہمارے بدن جھلس جائیں گے، ہمارے رشتہ کی زنجیر اس آنچ میں پگھل جائے گی۔۔۔ پھر راکھ اور دھواں

یہ تپش، یہ حرارت میں ایک زمانے سے محسوس کر رہا ہوں، مگر اب یہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

میری خواہش تھی ـــــ یہ اُمس، یہ گھٹن، بالکل نہیں تو کچھ دیر کی خاطر کم ہو جائے کہ ٹھنڈی فضا میں سانس لے سکوں اور فرحت محسوس کروں مگر۔۔۔

میں نے دھرتی کی جانب دیکھا اس تپش سے وہ بھی جگہ جگہ چٹخ گئی تھی وہ بارش کی منتظر تھی اور مجھے لگتا، میں اس کا مجرم ہوں۔ کبھی کبھی لگتا وہ نگاہوں سے کچھ کہہ رہی ہے۔ شاید بادل سے شکایت کرتی ہے کہ

۔۔ تم دن دن بھر مجھ پر چھائے رہتے ہو، ٹھنڈے سائے میسر کرتے ہو، مگر مجھ پر برستے نہیں، میں شروع سے تمہاری عنایت کی منتظر ہوں کہ تم مجھ پر برسوگے، میری تشنگی بجھاؤ گے اور پھر سیپ پر برستے بارش کا کوئی ایک قطرہ چرا کر اُسے قیمتی گہر میں تبدیل کر دے گی۔

لیکن تم برسو جب نا، کوئی قطرہ موتی بنے! آخر تم کیوں نہیں برستے؟ نہیں برسنے کی وجہ بتاؤ۔ کیا یہ دھرتی اس قابل نہیں؟ یا پانی اس کا مقدر نہیں۔ یا تم تم بے آب ابر ہو ـــ یا

تم نہیں جانتے ـــــ نہیں! شاید تم خوب سمجھتے ہو کہ بادل پانی نہ لائے اور دھرتی پھول نہ کھلائے ـــــ تو بادل، بادل نہیں رہتے اور دھرتی بنجر کہلاتی ہے۔ ایک زمانے سے خلقت میری جانب دیکھ رہی ہے کہ میں نے دھرتی کا فرض ادا نہیں کیا۔ میرے بطن سے کوئی کلی نہ چٹکی، کوئی پھول نہ کھلا، کسی پودے نے مجھ سے سر نہیں اٹھایا

ان کی نظروں میں، ان کے مشاہدے کے مطابق، میں بنجر ہوں۔

کیا معلوم کہ میں بنجر ہوں یا زرخیز ـــ اکیلی دھرتی کر بھی کیا سکتی ہے۔ جب بادل آئیں اور بغیر برسے چلے جائیں تو دھرتی ـــــ دھرتی کا کام تو بادل برسنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

دھرتی بغیر بادل کے ادھوری ہے۔ آسمان تو صرف اسے پناہ دیتا ہے۔

اس کی مانگ میں سیندور تو بادل ہی بھرتے ہیں۔۔۔ تم کیسے بادل ہو؟

بادل ایک زمانے سے دھرتی کی شکایتیں سن رہا تھا۔ مگر وہ نہیں برسنے پر مجبور تھا، یہاں بھی مصلحت تھی۔ ورنہ بادل کا مقصد ہی دھرتی پر برسنا ہوتا ہے

ادھر کچھ دنوں سے دھرتی کی شکایتیں شباب پر تھیں۔ جو ماحول میں اُمس، گھٹن اور تپش کو بڑھا رہی تھیں۔

بادل نے دھرتی کو چھو کر دیکھا، جہاں جہاں سے وہ چٹخی تھی، وہاں وہاں سے اُسے آنچ نکلتی محسوس ہوئی ـــــ کچھ وقفے کے لئے بادل کا وجود بھی جھلس گیا۔ ایک لمحے کے لئے بادل نے بھی چاہا کہ وہ برس جائے اور اتنا برسے کہ دھرتی کی تشنگی بجھ جائے۔ لیکن بادل نے خود کو سنبھالا۔ اسے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔ وہ جانتا تھا، ایک بار برسنے سے اس کی دھرتی ہری بھری تو ہو جائے گی، اس پر پھول بھی کھل اٹھیں گے ـــــ مگر پھر وہ ان ہریالی اور اُن پھولوں کی نشو و نما کو برقرار رکھنے کے لئے، حسب ضرورت پانی اور سایہ کہاں سے دے سکے گا، کہ اس کی وسعت کم ہے۔ پھر دھرتی کے پھول مرجھائیں گے اور میں دیکھوں گا، صرف دیکھتا رہ جاؤں گا کہ میں پھر برس نہیں سکتا اور

"میں نہیں چاہتا کہ ـــ"

"مگر میں چاہتی ہوں کہ، ـــ"

پھر ایک روز جب دھرتی کو بادل سے قریب ہونے کا موقع ملا تو دھرتی نے اس سے جی بھر کر شکایتیں کیں

محبت کی آنچ شاید زیادہ شدید ہوتی ہے کہ اس کی تپش سے فضا میں اتنی گرمی ہوئی، دھرتی اتنی تپی، پھر ہواؤں نے آندھیوں کی شکل اختیار کر لی، اور آندھیوں کے ساتھ بادل دھرتی پر اس طرح لڑھکا، اس قدر لڑھکا کہ بادل اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا ـــ اور

کون کیا بنا؟ خط ـــــ جس کا وجود ہوتا ہے، مگر چوڑائی نہیں ہوتی ـــــ!

دائرہ ـــ جس کا صرف مرکزی نقطہ ہوتا ہے ـــ!

قاضی فراز احمد

کل

میرے کل کا چہرہ بھی کل
سورج کل کا دیکھے گا
میں دیکھوں نہ دیکھوں لیکن
میرا بیٹا دیکھے گا

لہروں کی بے چین تڑپ کو
ساحل کی آغوش نہ تھی
پربت پربت ندیا اتری
دھرتی ساری لے ڈوبی

آندھی نے دیوار گرائی
پتوں کا گھر بکھر گیا
جو لمحے صدیاں بنتے تھے
وہ لمحہ لمحہ بکھر گیا

اک خواب نئی آشاؤں کا
اک دیپ نئی آوازوں کا
اب پھر سے چمن آباد کرو
رنگوں کا گگن آباد کرو

میں دیکھوں نہ دیکھوں لیکن
میرا بیٹا دیکھے گا

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲۱، دوحا (اسٹیٹ آف قطر)

شبیر آصف

یکے از نوادر

جزیرے میں نہ جانے کیوں کسی نے
گھوڑے کی نعل ایسا
حصارِ خشت کھینچا تھا
مگر میری تجسس زا نگاہیں
رخنۂ دیوار سے اندر کا منظر دیکھ لیتی ہیں
مجھے کچھ ایسے سنگی بُت نظر آئے
کہ جن کے آگے فنِ آزری بھی مات کھاجاتا
اگر وہ بُت زمانے کی نظر میں لائے جاتے تو
اک تہلکہ مچ گیا ہوتا
مجھے بھی شہرتِ بے مثل حاصل ہوگئی ہوتی

میں چکمہ کاٹ کر اندر پہنچتا ہوں
مجھے بس یہ خبر تھی
زیوس کے آشیرواد سے
پرسیوز نے تلوار سے
مڈوسا کی کتھا تو ختم کر دی تھی
مگر دو غیر فانی گارگن بہنوں کے بارے میں
مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی
اچانک میں نے آہٹ سُن کے
پیچھے مُڑ کے دیکھا تو .....
مسلسل دیکھتا ہی رہ گیا

کشتی سمندر میں کھڑی تھی
اور میری واپسی کی منتظر تھی

۴۱۸، نیا پورہ، مالیگاؤں (ناسک)

محسن رضا رضوی

دف طرز

میں نے جب بھی پیچھے مڑ کر اپنا ماضی دیکھا ہے
پہروں دل گھبرایا ہے
کہنے والے تو ہی کہہ دے کون بڑا شاعر ٹھہرا
اُس نے پوری غزل کہی ہے میرا ایک ہی مصرعہ ہے
جب بھی تصور میں وہ آیا کھِل اٹھے خوشیوں کے گلاب
اس سے کیسا رشتہ ہے
گاؤں کی بل کھاتی پگڈنڈی پر اک لڑکی چلتی ہوئی
احساسات کا ریلا آتا جاتا ہے
ریت پہ پہروں بیٹھ کے ٹیڑھا میڑھا کچھ لکھتے رہنا
معنی خیز سا لگتا ہے
چندا ماما چاندی کے پیالے میں دودھ لئے آنگن میں اتر
میرے اندر والا بچہ کہتا ہے
کل تک اس کے سارے درد کا درماں تھا بس ایک وہی
اب رضوی بیچارہ ہے

محلہ رحم خاں - ضلع دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴

آئینے بانٹنے والا

شبیر ہاشمی ● ۳۵۲، نیو وارڈ، مالیگاؤں

میرے لئے اس بات کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ پہلے پہل میں اس کی جانب متوجہ ہوا تھا یا اُسی نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

ویسے یہ فیصلہ کرنا کچھ اتنا ضروری بھی نہیں، ہو سکتا ہے اس کی دلچسپ حرکتوں کے سبب میں ـــــ لیکن یہ بات بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ اُس سے زیادہ دلچسپ حرکتیں تو ان لوگوں سے سرزد ہو رہی تھیں جنہیں وہ پمفلٹ دے رہا تھا۔

پمفلٹ تو میں اپنی آسانی کے لئے کہہ رہا ہوں
ورنہ اس کا فیصلہ ذرا مشکل ہی ہے کہ
وہ پمفلٹ تھا؟
یا پرچی!؟
یا پھر کوئی اشتہار!؟

وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اب صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ وہ مجھ سے تیس چالیس گز آگے تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے کسی معمول کی طرح چل رہا تھا

یہ فاصلہ ہم دونوں کے درمیان برقرار تھا

وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا ہو سکتا ہے کہ وہ بوڑھا ہو۔ یہ بات میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ بوڑھا تھا یا ادھیڑ!

پھیلا ہوا جسم ـــــ جس پر ڈھول کھایا ہوا کوٹ ـــــ ایک میلی سی پینٹ

پیروں میں ضرورت سے زیادہ استعمال شدہ بوٹ ــــ سر پر کھچڑی بالوں کا جنگل ـــــ چہرے پر چپکی ہوئی داڑھی! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چہرے پر داڑھی نہ ہو۔

لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس ہیئت میں تو داڑھی ضرور ہونی چاہیئے۔

میں اب تک اس کی صورت دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے خود ہی اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہ کی ہو۔

بغل میں ایک کپڑے کا جھولا ـــ پمفلٹ، پرچی، یا اشتہارات سے پھولا ہوا۔

بوڑھے سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک دس بارہ برس کا لڑکا جو غالباً میری ہی طرح جھولے کے راز کو معلوم کرنے کے لئے بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

لڑکا کافی دیر سے بوڑھے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ جب بھی بوڑھا کسی شخص کو پمفلٹ، پرچی یا اشتہار دینے کے لئے جھولے میں ہاتھ ڈالتا لڑکا تیزی سے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے اس کی طرف لپکتا۔

لیکن ہر بار بوڑھا اُسے جھڑک کر وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا شاید لڑکے کو بھی ضد ہو گئی تھی۔ اسی لئے وہ اس کا پیچھا چھوڑتا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

اب ہم شہر کی ایک بارونق شاہراہ سے گذر رہے تھے۔
ہمارے درمیان کا فاصلہ اسی طرح برقرار تھا۔
اور لڑکا بھی ٹھیک اسی طرح درمیان میں حائل تھا
"آخر مجھے کیا لینا ہے اُس سے؟"
"میں کیوں اُس کے پیچھے لگا ہوا ہوں؟"
ان سوالوں کا جواب شاید میرے پاس نہ تھا
یا پھر ممکن ہے کہ ہو ـــــ

ٹھیک اسی وقت پھر لڑکا تیزی سے بوڑھے کی طرف لپکتا ہوا دکھائی دیا۔

بوڑھے نے پمفلٹ، پرچی یا اشتہار نکالنے کے لئے جھولے میں ہاتھ ڈالا۔ اور پھر غرّا کر لڑکے کی طرف پلٹا۔ جو اُس کے جھولے کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

لڑکا سہم کر تیزی سے پیچھے ہٹا۔

بوڑھا آگے بڑھ گیا

اور اس نے اپنے جھولے سے ایک پمفلٹ، پرچی یا اشتہار نکال کر
سامنے سے آتے ہوئے ایک نوجوان کو تھما دیا۔

نوجوان پمفلٹ، پرچی یا اشتہار کو غور سے دیکھنے لگا۔

پھر ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔

نوجوان نے پمفلٹ کو چومنا شروع کر دیا۔

پھر اسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا، اور بوڑھے کی طرف بڑے
عقیدتمندانہ انداز میں پلٹا تو ___ بوڑھا بے نیازی کے ساتھ کافی آگے
بڑھ چکا تھا۔

"کیا ہے اس پرچے میں؟"

"وہ بوڑھا آدمی کون ہے؟"

میں نے نوجوان کے قریب پہنچتے ہوئے کہا

لیکن مجھے ایسا لگا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

وہ دور جاتے ہوئے بوڑھے کو دیکھتا رہا۔

نوجوان کے ساتھ سر کھپانے کو فضول سمجھ کر میں تیزی سے بوڑھے
کی طرف لپکا کہ کہیں وہ گم نہ ہو جائے ___

اور میں ناکام ہو جاؤں!

"لیکن کیسی ناکامی!؟"

بوڑھا اُسی بے نیازی کے ساتھ چل رہا تھا۔

منظر سے الگ ___ اپنی دھن میں مست!

لڑکا اب بھی اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔لیکن اب وہ کسی قدر مایوس
دکھائی دے رہا تھا۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صرف میرا وہم ہو۔اور لڑکے کی
دلچسپی اب بھی اُسی طرح برقرار ہو۔

اور شاید یہی بات ہو سکتی ہے۔ورنہ وہ کب کا ساتھ چھوڑ چکا ہوتا
اس عہد کے لڑکوں کے چالاک ہونے کی اطلاع تو اب کافی پرانی
ہو چکی ہے۔

"تو کیا وہ کوئی بات جان گیا ہے؟"

"کوئی دلچسپ بات!

"لیکن مجھے اس سے کیا لینا ہے؟"

میں کیوں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں؟

....

لڑکا پھر تیزی سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بوڑھے کی طرف لپکا۔

میں نے بھی اپنی چال تیز کر دی۔

بوڑھا پھر غرّا کر پلٹا۔

اور اس مرتبہ اس نے مارنے کے سے انداز میں اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔

لڑکا تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگا

بوڑھے نے ایک پمفلٹ، پرچی یا اشتہار نکال کر ایک شخص کو تھما دیا
اور آگے بڑھ گیا۔

اس شخص نے پمفلٹ، پرچی یا اشتہار کو غور سے دیکھا

اُس کی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرنے لگی۔

اور پھر وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔

"کیا ہے اس پرچے میں؟"

"وہ بوڑھا آدمی کون ہے؟"

میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں وہ ہنستا
ہی رہا

میں نے اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

بوڑھا اسی طرح اپنی روایتی بے نیازی کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

منظر سے الگ اپنی دھن میں مست!

لڑکا بھی اُسی طرح ساتھ لگا ہوا تھا۔

پھر ذرا سی دیر میں مجھے محسوس ہوا کہ اس بار لڑکا تنہا نہیں ہے۔بلکہ
اس کی عمر کا ایک لڑکا اور اس کے ساتھ ہو چکا ہے۔

دونوں لڑکے غور سے جھولے کو دیکھ رہے تھے اور بوڑھا بظاہر ان
دونوں کے وجود سے بے خبر دکھائی دے رہا تھا۔

"آخر یہ دوسرا لڑکا کہاں سے چلا آیا؟"

"کیا دونوں دوست ہیں؟"

"اور اگر دونوں ساتھی ہیں تو آپس میں بات چیت کیوں نہیں کر رہے ہیں"

"دونوں اتنے خاموش کیوں ہیں؟"

"وہ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"جھولے کا راز؟"

"یا پھر "

"آخر کیا ہے اس پرچے میں؟"

"مجھے اس سے کیا لینا ہے؟"

"میں کیوں اس بوڑھے کے پیچھے حیران ہوں"

آخر یہ بھی تو مسائل

دونوں لڑکے پھر تیزی سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بوڑھے کی طرف لپکے
میں نے بھی اپنی رفتار بڑھا دی۔
بوڑھا پھر غرا کر پلٹا۔ اور دونوں لڑکوں کو مارنے کیلئے دوڑا
لڑکے تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگے۔
بوڑھے نے اپنے جھولے سے ایک پمفلٹ، پرچی یا اشتہار نکال ایک شخص کو
تھما دیا۔
اُس شخص نے ایک نظر غور سے بوڑھے کو دیکھا اور پھر پرچے کو دیکھنے لگا
آہستہ آہستہ اُس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا
اُس نے غضبناک ہو کر پرچے کو مسلنا شروع کیا۔ اور پھر اس طرح اس
کے پرزے کرنے لگا جیسے وہ اس بوڑھے کی تکا بوٹی کر رہا ہو۔
"کیا تھا اس پرچے میں؟
"وہ بوڑھا آدمی کون ہے؟"
"میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔
اُس نے سرخ انگارہ آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔
اور پھر بے نیازی سے آگے بڑھتے ہوئے بوڑھے کو گھورنے لگا جیسے اُسے
کچا ہی چبا جانے کے سلسلے میں غور کر رہا ہو۔
بوڑھا اس کی کیفیت سے بے خبر اُسی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔
منظر سے الگ! اپنی دھن میں مست!!
اب ہم شہر کے چوراہے میں داخل ہو رہے تھے
دونوں لڑکے پھر اُس کے پیچھے چل رہے تھے لیکن اب اُن کے تیور
بڑے خراب معلوم ہو رہے تھے۔
اُن کا انداز بھی جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔
"کیا کرنے والے ہیں یہ دونوں؟
"کوئی منصوبہ؟"
"آخر یہ چاہتے کیا ہیں؟
"میں کیا چاہتا ہوں؟
"کیوں نہ اُسی بوڑھے ہی سے پوچھ لیا جائے۔"
"ہاں! یہی ٹھیک ہے۔"
اب تک میں فضول وقت برباد
اچانک دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا
اور پھر وہ باز کی طرح جھولے پر جھپٹے۔

بوڑھا اچانک ایک زبردست جھٹکے کے سبب زمین پر آ رہا!
جھولے کی ڈور ٹوٹ گئی۔
اور اس میں کی بیشمار پرچیاں فضا میں بکھر گئیں۔ دونوں لڑکے تیزی سے
پرچے بٹورنے لگے میں بھی تیزی سے لپکتا ہوا اُن کے پاس پہونچا۔ بہت
سارے پرچے ادھر اُدھر دُور تک پھیل گئے تھے۔ اور کچھ ابھی تک فضا
میں اڑ رہے تھے۔
میں نے فضا میں اڑتے ہوئے ایک پرچے کو پکڑا اور اُسے دیکھنے لگا
۔۔ اور پھر زمین پر پڑے پرچوں کو اکٹھا کر کے انہیں جلدی جلدی
الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔
مگر وہ سب ایک جیسے تھے
سادہ!
بالکل سادہ!!

بقیہ صفحہ ۵۵ دیشیم

پڑتی بینائی والی آنکھوں کے سامنے تھا نقشہ۔۔۔
سڑک کے منظر سے اُوب کر پرومیتھیس نے گردن گھمائی تو وہ
حیران رہ گیا۔ سنڈریلا اپنی کنچن کایا کو بے لباس کیے کھڑی مسکرا رہی تھی
لیکن اس سے پہلے کہ پرومیتھیس اُس کی طرف لپکے سنڈریلا کی مسکراہٹ
زہریلی ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ اُس نے تیوری چڑھائی اور دائیں بازو
کو پھیلا کر انگلی سے اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے پرومیتھیس پھر کھڑکی میں
سے نیچے سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ کانپ اٹھا۔
سڑک کی ساری رونق غائب تھی۔ ویران سڑک کے عین بیچ
پڑا تھا ایک جنازہ۔ جنازے کے چاروں طرف کھڑے تھے ہیجڑے۔
وہ اپنی بھدّی اور بے سُری موٹی آوازیں بین کر رہے تھے اور ہاتھوں
میں پکڑے جوتوں سے نیچے پڑی لاش کو دھڑا دھڑ پیٹتے جا رہے تھے
بیچ بیچ میں وہ گالیوں کی بوچھار کرتے ہوئے مرنے والے کو وارننگ
دے رہے تھے۔ او بدذات! پھر کبھی ہیجڑے کی شکل میں اِس دھرتی
پر نہ آنا۔ او بے سود خواہش کے کم ذات پتلے! پھر کبھی۔۔۔
پرومیتھیس کاٹھ کے پُتلے کی طرح کھڑا رہ گیا اور اُس کے پیچھے
سنہرے جسم والی سنڈریلا کا اُمڈتا ہوا جوبن بے تحاشہ ہنستا چلا گیا۔

رام پنڈت

ریوڑ سے الگ

(۱)

رقص کرتی ہوئی لاشیں
ہاتھوں میں شمعیں لئے ہوئے
اندھیروں کو
چیرتی ہوئی
گذر رہی ہیں، قبرستان سے جھیل کی اور

میں نے چِتا سے اُٹھ کر یہ منظر دیکھا
اور آنکھیں موند لیں
لکڑیاں پھر اوڑھ لیں
اور
شعلوں کو لپیٹ لیا
میں نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

تاج پوشی

(۲)

زندگی کے معیار کئی طرز کے ہیں
ورق، ورق ایک نئی سطح ہے
اس سطح کے پس منظر میں
ادب کو تقسیم کرنا
ستاروں کو دو دائروں بانٹنا ہے
زندگی برائے ادب گذارنے والے
لاکھ چلائیں
دربدر چیخیں
پر وقت کا کہرا چھٹتے ہی
گماں کا چلمن پھٹ جائے گا
اصلی شہنشاہ کے سر پہ ہی
وہ اصلی تاج رکھا جائے گا۔

بلڈنگ ۱۲ا ۔ بلاک ۱۵۹ ۔ نہرو نگر کرلا (ایسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۲۴

سیّد بشارت علی

بے مایہ

سِسکتی گذرتی ہوئی ساعتوں کا لہو پی رہے ہیں
ہم آباد دنیا میں ویرانیاں بو رہے ہیں
یہ کانٹوں بھری جھاڑیاں جو کھڑی ہیں
ہماری ہی کِشتِ عمل ہیں
شب و روز خود کو گنواتے چلے جا رہے ہیں
خود اپنے بدن کی رگیں کاٹتے ہیں
بکھرتے نظاروں کی رنگینیوں میں
ہم اپنی جھلک کھوجتے ہیں
مگر ان میں ہم کب بسے ہیں
ہمارا اور ان کا تعلق بہت سرسری ہے
ہم اپنے نگہبان، اپنے محافظ
ہم اپنے ہی قاتل
ہمارے لہو سے لکھی جائیں گی پھر
ہماری ہی بدبختیوں کی سیہ داستانیں
جنھیں لوگ پڑھ پڑھ کے ہم پر ہنسیں گے
کہ ہم تو بہکتی ہواؤں کے اک تند جھونکے سے کم تر
اندھیری گپھاؤں سے باہر ڈھکیلے گئے ہیں۔
اندھیری گپھاؤں میں لڑھکا دیئے جائیں گے

۵۲۳-۲-۲۲ بالسی کھیت - حیدرآباد - ۲۴

منصور اعجاز

معمول

سیاست، محبّت
وفا، دوستی
زندگی کے لئے جھوٹی بیساکھیاں
حاصلِ عمر ہے
بس یہی کرب لاحاصلی
اور تنہائیاں

نِت نئے خواب پلکوں کی دیوار پہ
اک چھبیلی
ہر اک شب سجاتی رہی
دن نکلتے ہی
چبھتی ہوئی روشنی
خواب زاروں کے پرزے اُڑاتی رہی
روز بننا، بگڑنا، بکھرنا ہمیں
روز جینا ہمیں
روز مرنا ہمیں

رشید اسٹوڈیو، الیرت مال ۴۴۵۰۰۱

جیوتشی

آنند لہر ● ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، جموں

ہوا یہ کہ قتل کسی نے کیا اور سزا کسی کو ملی اور دروازے کھٹکنے کی آواز کھڑکیوں سے آئی اور بے گناہ قاتل انصاف کے محافظ بنا دئے گئے خوبصورت لڑکیوں کے جسموں کی خوشبو ہواؤں نے قید کر لی۔ وہ لوگ سوچنے لگے کہ اب انصاف کرنے کا کون سا نیا طریقہ ایجاد کیا جائے۔ کیونکہ سورج نے جب سے ہوا کو پر دئے ہیں یہ آوارہ بادلوں کی طرح گھومتی رہتی ہے اسی وجہ سے انصاف کرنے والا ترازو ڈولتا رہتا ہے اور لوگوں کو انصاف نہیں ملتا۔

پر انصاف کو ایک جگہ جمع کر کے سب میں برابر تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی مگر ایسا اس لئے نہ ہو سکا کیونکہ جمع و تفریق میں غلطی تھی۔ جس بچے نے یہ پوچھا کہ دو ضرب دو اور دو جمع دو چار ہوتے ہیں مگر تین ضرب تین نو اور تین جمع تین چھ کیوں ہوتے ہیں اس کے دانت نکال کر اسے بوڑھا کر دیا گیا۔

ایسا ہونے کے باوجود خواہشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور بچپن نام ہے سپنوں کا اور جوانی نام ہے خواہشوں کا۔ سپنے جہاں ختم ہوتے ہیں وہیں سے خواہشیں جنم لیتی ہیں۔

اور ہوا یہ کہ انصاف جب تقسیم نہ ہو سکا تو بکنا شروع ہو گیا اور لوگوں نے دروازوں کے باہر ریٹ لسٹیں لگا دیں ایک دروازے کے باہر لکھا تھا "سستے انصاف کیلئے یہاں پر تشریف لائیں۔

اور انصاف بیچارہ ترازو میں تلنا شروع ہو گیا کہیں پر خوشبو کے عوض بکتا تو کہیں پر خوبصورتی کے بدلے دیا جاتا۔ اس کی زبان بند کر دی گئی۔ جسم کے ٹکڑے کر دئے گئے۔ پھر برف کے ترازو میں دھوپ بکنے لگی اور روشنی اندھے شخص کی آنکھوں میں قید کر دی گئی۔

تمام لوگوں نے انصاف خریدنا شروع کر دیا۔ ایک دکان پر اگر بھاؤ ٹھیک نہ بیٹھتا تو دوسری دکان پر چلے جاتے۔ انصاف بیچنے والے اپنے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے ننگی لڑکیوں کو کپڑے پہنا کر اپنی دکان کے باہر بٹھا دیتے اور انصاف سے جو کمائی ہوتی اُسے بانٹ کر کھاتے۔

مگر ایک دن انھیں محسوس ہوا کہ ان کے اپنے ہی ہاتھ ان کی گردنوں کو دبانے لگے ہیں اور ان کی خوبصورت بیویوں کا حُسن ان کی اپنی ہی آنکھوں نے چرا لیا ہے۔ اب وہ پریشان ہو گئے کہ کہاں سے سزا خریدیں اور کہاں سے معافی اور پھر ملزم کے کٹہرے میں کس کو کھڑا کریں؟

پھر ایک دن بستی کے لوگ مل بیٹھے اور پریشانی کے عالم میں انصاف کے طریقوں کے بارے میں غور کرنے لگے۔ پھر فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ جیوتشی انتریامی ہوتے ہیں اور ہر بات کو پہلے سے جان لیتے ہیں اس لئے اب انصاف کے معاملات جیوتیشوں سے حل کئے جائیں گے۔

پھر وہ لوگ شہر کے سب سے بڑے جیوتشی کے پاس پہونچے، معاملات بتائے اور کہنے لگے بتایئے کہ پیپل کے نیچے مرنے والے شخص کا قاتل کون ہے؟

جیوتشی نے بستی کے تمام لوگوں کے ہاتھ کی ریکھائیں دیکھیں اور پھر اُس نے ایک شخص کے بارے میں بتایا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں ظاہر کرتی ہیں کہ سفیدے کے درخت کے نیچے جو قتل ہوا ہے، اسی نے کیا ہے۔

لوگ خوش ہوئے اور کہنے لگے "کتنا سستا طریقہ ہے انصاف کا۔ کتنا آسان طریقہ ہے یہ"

مگر دوسرے ہی لمحے میں جیوتشی نے یہ فیصلہ بھی سُنا دیا کہ اسے بری کیا جاتا ہے کیوں کہ اس کے ہاتھ میں جیل جانے والی لکیر نہیں ہے۔

◆◆

پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکر دوار، بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا

مینا کشی

ہائیکو

زندگی ہے کیا ؟
شعلہ رکھ کے ہاتھ پر
قہقہے لگا

یادوں کا ساون
گھیرا پھر سیلابوں نے
تنہا گاؤں — من

ایک پہیلی
لوٹنا کا رخ بہنا کیوں ؟
بوجھ اے سہیلی

آشیاں کہاں ؟
دل پہ رکھ کے ہاتھ تو
بول آسماں

سرہانے جب دن
سر رکھ کر سو جاتے ہے
تب جاگے باطن

رات ڈھل گئی
چہرۂ تھکان پر
خواب مل گئی

● ایف۔کے ۶، نیو کوی نگر، غازی آباد ۳۰۱۰۰۲

پروین راجہ

بے سمت راستوں پر
جب
تیری تلاش شروع ہوئی
نکلا
وحشتوں کے جنگل سے
اژدہوں کا ہجوم
لہو میں ڈوبے
گوشت پوست کے ڈھانچے
پگھل گئے صحراؤں میں
تب اک آواز گونجی
کُن فیَکون
آ گیا
فرش پر اَبابیلوں کا لشکر
ہوئی سنگ باری
اور
شفق کے نمودار ہوتے ہی
مٹ گئی
خود نما ہجوم کی
بے نشاں داستاں !!

● راجہ منزل، بٹہ مالہ، باراں پتھر، سری نگر (کشمیر)

جمیلہ نشاط

نظم

ہم
رات کی کالی کشتی میں
بہہ رہے ہیں

موت کے سمندر کا
ساحل نہیں ملتا

سفید چادر اوڑھے
زندہ لاشیں آخر کب تک

کالی کشتی ہم
چپ کے ناخدا کے ساتھ
چلتی رہیں گی

آخر کب ساحل
ہمارا سواگت کرے گا

سفید چادر پہ
کب دھنک بکھرے گی ؟

● مکان نمبر 19/3 RT، وجے نگر کالونی، حیدرآباد

مکتوبات

شمارہ ۱۱-۱۲ سنہ ۱۹۸۵ء

ہیرانند سوز ——— ۲۷۱/۷-۱-اے فرید آباد

آپ کے دونوں شماروں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ شمارہ ۱۱ میں ڈاکٹر خورشید سمیع کا مضمون "نئی افسانوی روایت" بہت ہی اچھا اور سیر حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے قلم بند کرنے میں کافی محنت کی ہے اور قارئین اس سے اچھا استفادہ کر سکتے ہیں ——— آپ نے اس شمارے میں پانچ افسانہ نگار خواتین کو یکجا کر کے پرچے کو نیا رنگ عطا کیا ہے۔ محترمہ زاہدہ حنا کی کہانی "تتلیاں ڈھونڈنے والی" نہایت جذباتی اور اثر انگیز کہانی ہے اور فنی اعتبار سے بھی اپنے اندر پورا تاثر لیے ہوئے ہے۔ محترمہ جیلانی بانو کی کہانی "روز کا قصہ" جدید حسیت کی بہت خوبصورت مثال ہے مگر یہ جون ۱۹۸۵ء کے نقوش کے سالنامے میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔ شاید آپ کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ محترمہ آمنہ ابوالحسن کا افسانہ ان کی فنی صلاحیتوں اور ذہنی پختگی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شمارہ نمبر ۱۲ میں "سکوت" اچھی علامتی کہانی ہے مگر ورندا چتواری کی کہانی "روبوٹ" ایک مشہور انگریزی کہانی کا چربہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انگلش کہانی میں روبوٹ اپنے بنانے والے سائنس داں کا گلا گھونٹتا ہے۔ جب وہ سائنس داں اس کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے اس کا ٹیسٹ لینے کے لیے چالاکی سے کچھ گوٹیاں ادھر ادھر کر دیتا ہے اور یہاں روبوٹ مالک کے رویے سے نالاں ہو کر ایسا کرتا ہے۔

اس شمارے میں "نئی شاعری نئے نام" کے زیر تحت آپ نے اسکاف میں بڑے خوبصورت تعارف کے ساتھ جن شعراء کا کلام پیش کیا ہے اس سے ہمیں امید ہوئی تھی کہ ہم پر صنف سخن کی نئی جہتیں اور نیا طرز فکر روشن ہوگا۔ مگر صورتِ حال اس سے مختلف نظر آئی۔ ان شعراء کے کلام اور فن میں کتنی گہرائی اور گیرائی ہے اس سے بحث نہیں کیونکہ ہر ایک کا فکری رویہ اور زاویۂ نگاہ الگ الگ ہو سکتا ہے مگر ان کی بہت سی غزلوں میں شعری حس اور فنی مہارت کا بھی فقدان ہے۔ دیگر معائب کے ساتھ ساتھ کچھ اشعار تو وزن سے ہی خارج ہیں۔ "شاعر" جیسے بلند پایہ اور معیاری جریدے سے قاری ہمیشہ صحت مند اور اچھے ادب کے ذریعہ استفادے اور رہنمائی کی توقعات رکھتا ہے اور سلجھے ہوئے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کا قاری رہنا چاہتا ہے مگر اس شمارے کا شعری حصہ دیکھ کر دکھ ہوا۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو میں چند اشعار کی خامیوں کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا۔

(۱) ش۔ک۔ نظام:

میرے چہرے سے لو بولے
ہوا سے جب تیری خوشبو لے

"ہوا" کو بے وزن "ہا" باندھا گیا ہے۔

دشت میرا ہے اب نہ دوسرا
رات کی راکھ مقدر میرا

مقدر فعولن ہے اور فاعلن کے وزن میں باندھا گیا ہے
حرف کا بستر میرا: غیر فصیح ہے۔

(۲) رشید افروز: ان کی دوسری ساری غزل ایک شعر کے سوا باقی آئیں اور جائیں کے قافیہ تک محدود ہے اور قافیہ میں ایطا بھی ہے

(۳) اسعد بدایونی:

وہ ملک کو ناک تڑھائے جاتا ہے (تعقید لفظی ہے)

(۴) رؤف خیر:

یہ کس کا روشنی دیتا ہوا سا پیکر ہے (سا پیکر صحیح نہیں ہے)

(۵) پرنیپال سنگھ بیتاب:

کرتے رہے نجات کی ہر ہر سبیل ہم۔

ہر ہر غیر فصیح ہے۔ "ہر ہر" بھادلو کی طرح لگتا ہے۔ ہر اک یا کو بآسانی سے ہو سکتا تھا۔ بے سود ڈھونڈنا اسے دشت و جبل میں سے بہت ناگوار قسم کی تعقید لفظی ہے۔

دن بھر اپنی رات کا کر تے ہیں خون قتل (خوب مارتو پڑتی ہے خون قتل ہوتے ہیں سُنا تھا)

(۶) منظر ایرج:

ہاں پھر بن ڈھلتے ڈھلتے بس اتنا ہی یاد رہا
لمہ بر سے پھونکتے پھونکتے ہی جادوگر لوٹ گئے

پھونکتے پھونکتے وزن میں نہیں ہے فعلن کی جگہ فاعلن باندھا ہے

وہ پس پردہ مرے قتل کے درپے ہے ابھی
اور کھلے عام مرے حق میں سفارش کرتی

دوسرا مصرعہ مکمل نہ ہونے کی وجہ سے بے جان ہے۔
شعر یوں ہوتا تو شاید بات بن جاتی۔

وہ بے در پردہ مرے قتل کے درپے پھر بھی
سب سے کرتا ہے مرے حق میں سفارش کتنی

(۷) رونق شہری:

نہ جانے کس سمت کی ہوا تھی کہ جس کی شہ پر
پتنگ کی ڈور کو سے بہتر سمٹنا تھا

کون۔؟۔ فاعل کی کمی کھٹک رہی ہے ——

(۸) اسعد رضوی:

کبھی حیرت سے نہ یہ دیکھ مجھ کو
ترا سوچا ترا سمجھا ہوا ہوں

یہ کی بجائے شاید یوں ہوگا۔ کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے مگر "نے" کو بھی نا باندھا ہوا ہے جو غلط ہے۔ مت سے گذارا ہو سکتا تھا۔

کہ تم بھی مبتلا ہو کشمکش میں
ہمارا ذہن بھی الجھا ہوا ہے

"کہ" پہلے مصرعہ میں بس وزن پورا کرنے کے لیے جڑا لگتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں تو پھر بھی چل سکتا تھا۔

(۹) پرکاش تیواری۔ شاید ضرورت شعری کے مطابق اپنے تخلص کا وزن بدل لیتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی کتنے اشعار بحث طلب ہیں۔ مگر میں اس سلسلے کو مزید طول۔ دیتا ہوا اتنی عرض ضرور کروں گا کہ ارباب ذوق کے لیے شاعر کے نصف صدی سے چلے آ رہے بلند معیار کو برقرار رکھا جانا چاہیئے۔

عبید صدیقی ——— ریڈیو کشمیر سری نگر

آپ نے جس خوبصورتی کے ساتھ یہ شمارہ ترتیب دیا ہے وہ قابل داد ہے خاص طور پر آپ کے مختصر مگر جامع تاثراتی تجزیے جن کی مدد سے اس شمارہ میں شامل شعراء کو پہچاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا واقعہ یہ ہے کہ آپ کے یہاں ایک نقاد بھی پوشیدہ ہے۔ آپ نے جس طرح الگ الگ شعراء کی انفرادی خصوصیات کی نشان دہی کی ہے وہ ایک منجھا ہوا نقاد ہی کر سکتا ہے۔ یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کی زبان ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تجریدی ہے نثر اور بالخصوص اس نثر کو جو تنقید میں استعمال ہو تجریدی نہیں ہونا چاہیئے۔

خالد سعید ——— مسلم چوک، گلبرگہ (کرناٹک)

نئی شاعری نئے نام والا شمارہ اپنے ڈھنگ کی ایک نئی کوشش ہے اس شمارے اور ان کے سوانحی اشاروں سے ایک عجیب حقیقت کھل کر بہت سے نام تو ایسے ہیں جنھیں میں بہت دنوں سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ اور ان کے متعلق میرا یہ خیال تھا کہ شاید ہم سے پہلے کی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ عمر کے مطابق کم از کم نوجوانوں کی فہرست میں تو شمار نہیں کیا جا سکتا بشمول میرے "نئی نسل" کا انطباق عمر کے لحاظ سے تو نہیں البتہ ادب میں اُن کے ورود پر ہو سکتا ہے۔ جیسے مجھے ہی لیجیئے۔ میں نے بڑی تاخیر سے شاعری شروع کی ابتداً میں افسانے لکھے اور اس پر بھی بہت کم چھپتا ہوں جبکہ اس شمارے میں شامل بہت سارے فنکار تو دھڑا دھڑ چھپتے ہیں اس لیے میں نے سوچ رکھا تھا کہ شاید یہ حضرات اگلی نسل سے تعلق رکھتے ہوں بعض ایسے نو عمر حضرات بھی ہیں جو اپنی شعریت اور معنویت کے لحاظ سے اس فہرست میں شامل کئی شعراء پر بھاری ہیں۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے ان سے امیدیں وابستہ رکھی جا سکتی ہیں۔ غرض اس شمارے سے ادبی دھند پر چھائی ہوئی کچھ تو دھند چھٹی۔ کچھ حقیقتیں تو سامنے آئیں۔

آپ نے اٹھارہ شاعروں پر جو نوٹ لگائے وہ آپ ہی کا حصہ ہے مجھ میں تو اتنی صلاحیت نہیں کہ کسی کی صرف چند غزلیں پڑھ کر رائے قائم کر سکوں۔ اور وہ بھی غزل کے معاملے میں۔ اب تک ہماری نثر محض شعری پرچھائیوں سے برباد ہوتی آئی ہے۔ اس لیے نثر اور خصوصاً تنقید کو تو اس شعری اسلوب والی نثر سے بچنا چاہیئے۔ دو اور دو چار کی طرح دو ٹوک نہیں ہوتی۔ شعری اسلوب کی وجہ سے الٹا تنقید میں ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ یا تنقید بجائے وضاحت کے محض تاثراتی اشارے بن کر رہ جاتی ہے جیسے کچھ جملے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) غزل کی مخصوص ہیئت میں نرم نرم الفاظ کی
? موسیقی آمیز تخلیقی ترتیب میں شعریت اور اثر پذیری ہے"۔
(۲) "شعری اوقات میں مربوط اور نامیاتی
? آہنگ کی موجودگی کے باوجود پابندیوں اور حد بندیوں کی افراط کا احساس بھی ہوتا ہے"۔
(۳) "وہ اپنے مزاج میں سرپھری ہواؤں کی طرح ہیں"۔
(۴) "... موہوم جذبوں کو شعری پیکر عطا کرنے کی کاوش اُن کے یہاں دعاؤں کی صورت ہے"۔
(۵) ... دعاؤں کی نرم مٹی میں زرخیزی ہوگی تو ریاضت اور اکتساب اور استغراق کی آب و ہوا میں یہ کونپل اپنا بھرپور قد بنا لے گی

آخر الذکر تین جملوں میں شاعرانہ اسلوب تنقید کا عیب تو ہے لیکن فنکار کے تعلق سے کوئی امیج بنانے میں مدد نہیں دیتا کیونکہ شعری اسلوب جو ٹھہرا۔

اسی طرح پہلے دو جملوں میں جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں کم از کم مجھ پر اس کی معنویت کھل نہیں سکی۔

"موسیقی آمیز تخلیق ترتیب ؟" کیا ہوتی ہے۔ "نامیاتی آہنگ" سے کیا مراد ہے۔ کسی بھی نقاد کی ذاتی اصطلاحوں کو سمجھنے کے لیے اس کے تنقیدی کارناموں کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ اب ہمارے سامنے صرف اصطلاح پیش ہو۔ ممکن ہے اس نے اپنی اصطلاح کے تعلق سے ماضی کے کسی مضمون میں وضاحت کر دی ہو۔ چونکہ آپ کے تنقیدی کارنامے ابھی تک تو سامنے آئے نہیں تو اس لیے اس قسم کی اصطلاحوں کی جب تک نہ وضاحت ہو جائے مجھ جیسے غبی کے لیے معمہ ہی بنے رہیں گے۔

کچھ اور جملے ملاحظہ فرمائیں:-

'الف': ۱۔ "شفقت آمیز موجوں کی ترسیل ہی ان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ وہ لغوی الفاظ و معنی سے گریز نہیں کرتے اور نہ ہی لفظوں کو اپنے اوپر حاوی کرتے ہیں"۔

۲۔ "وہ نہ تو لفظوں کے تکلف، روییے کے اسیر ہیں اور نہ ہی لفظ ان کے غلام بلکہ وہ لفظوں کو دوستانہ ماحول میں تخلیقی پیکر دیتے ہیں"۔

'ب' ۱۔ "علامتوں اور استعاروں کا اہتمام چونکہ شعوری نہیں ہے لہٰذا غزل و نظم میں الجھاوے تشکیک یا ابہام کی بوجھل فضا نہیں ملتی"۔

۲۔ "موضوع، مواد اور الفاظ کا انتخاب اور ان کی پیش کش میں نہ تو تجریدیت ہے نہ تو الجھاوے"۔

۳۔ "اس طرح کسی غیر معمولی شاعری کا تصور، تجریدیت، ابہام اپنی کسی تجسیمی شکل کی بجائے شدت واقعے کے سبب یہ شاعری براہ راست اور پوری اثر پذیری سے ملفوظ آتی ہے"۔

'ج' ۱۔ "غزل اور نظم میں مختلف النوع مختلف جہتوں کی کشیدہ کاری کرنا، علامتوں اور استعاروں سے اپنے تجربوں اور محسوسات کو لفظ لفظ پیکر بنانا، کسی نئے اسلوب کی تخلیقی تلاش میں لسانی سطح پر شکست و ریخت کرنا۔۔۔"

۲۔ "ان کی شاعری کہ الفاظ کو برتنے کا عمل بھی ہے اور پرانی لفظیات کو نئے معانی دینے کی خواہش بھی"۔

۳۔ "تخلیقی سطح پر زندگی کو فنکارانہ روپ دینے کی خواہش، لفظ کو نئے نئے معنی دینے کی کوشش، موہوم جذبوں کو شعری پیکر عطا کرنے کی کاوش۔۔۔"

'ا' 'ب' 'ج' کے زمروں میں وہی جملے ہیں جو آپ نے مختلف فن کاروں کا تعارف کرواتے ہوئے ان کے کلام کی خوبیوں کی نشاں دہی کی ہے۔ یہ تو صرف چند جملے جو میں نے نکالے ہیں۔ میری بات کی دلیل کے لیے کافی ہیں، ورنہ سارے نوٹس کو بغور پڑھ لیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ پھرا پھرا کر لفظ بدل بدل کر وہی باتیں کی ہیں۔ ہر فن کار کے تعارف میں ایک آدھ جملہ غیر مشترک نکل آتا ہے۔ یا تو آپ نے سب کے تعلق سے مروت سے کام لیا ہے یا پھر آپ ہر فن کار کی انفرادی خوبیاں تلاش نہیں کر سکے۔ یا کسی ایک تعریف کے الفاظ بدل بدل کر سب چسپاں کر دیا؟ چونکہ چند ملاقاتوں اور چند ادبی لفظوں میں میں نے آپ کو سنا، لوگوں کی سخت سخت باتوں کو آپ نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ لہٰذا میں آپ کی کشادہ دلی، اعلیٰ ظرفی کا معترف ہونے کے بعد پھر پچھلے دنوں میرے اور آپ کے بے تکلف تعلقات کی بنا پر محض اس لیے کھل کے کہہ رہا ہوں کہ ہم جب تنقید کے لیے قلم اٹھائیں تو احتیاطاً سے تاکہ کوئی ہم پر گرفت نہ کر سکے اور آپ نے تو بڑی بھاری ذمہ داری بھی اٹھا رکھی ہے وہ ہے مدیر کی۔ صرف مدیر ہی نہیں بلکہ نئی صلاحیتوں کو متعارف کروانے، انھیں آگے بڑھانے کا بیڑہ بھی اٹھا رکھا ہے تب تو خود احتسابی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہاں ایک اور بات بھائی انفرادیت اور لسانی شکست و ریخت اتنا آسان عمل نہیں جتنا کہ آپ نے بتلایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ استعارے اور علامتوں کا استعمال بھی اتنا آسان عمل نہیں اور دل کی بات تو میں نہیں کرتا۔ اپنی حد ضرور رکھوں گا۔ ابھی تک میں نے شعریت کی ادنیٰ منزل پیکر کو بھی صحیح طور پر برتتے نہیں پایا تو استعارے اور علامت تک کہاں پہنچوں گا علامت کو تو بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر گذر جاتا ہوں۔

اب رہی میرے کتاب کے تبصرے پر تو جناب مجھے تبصرہ کچھ پسند نہیں آیا۔ اس لیے نہیں کہ آپ نے کچھ سخت سست کہا ہے۔ میں جب سخت کہتا ہوں تو سخت سننے کے لیے بھی تیار ہوں۔ دراصل آپ کے تبصرے میں ہر دوسرا جملہ پہلے جملے کی تکذیب ہے اس لیے کوئی واضح رائے قائم نہیں ہوتی۔ جملے پر یاد آیا۔ یار چھوٹے چھوٹے جملے لکھنے کی کوشش کرو۔ یہ طول جملے اکثر مطلب کو ہی کھا جاتے ہیں۔

فاروق شفق — جی۔۱۸۵، دھان کھیتی گارڈن ریچ، کلکتہ

'شاعر' کے نومبر، دسمبر ۱۹۸۵ء کے شمارے ایک ساتھ ملے۔ دونوں شمارے خوب ہیں۔ دسمبر کے شمارے کا تو کیا کہنا۔ کہنے کو تو یہ شمارہ عام شمارہ ہے لیکن مندرجات کے اعتبار سے بلاشبہ خاص نمبر کا حکم رکھتا ہے۔ یوں تو اس میں چند افسانے بھی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پورا شمارہ نئی شاعری 'نئے نام' کے لیے مخصوص ہے۔ آپ کے مزاج میں جو سلیقہ، نفاست اور نت نئے تجربات کرتے رہنے سے جو ایک نظری جدت آگئی ہے اس کے نقوش ہر صفحے پر مرتسم ہیں۔ یقین جانئے یہ دیکھ کر اور پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

دسمبر کا یہ خصوصی شمارہ جب سے آیا ہے میرے پاس بہت کم رہا۔ دوستوں ہی میں گردش کر رہا ہے۔ یہ 'شاعر' اور علی الخصوص اس خصوصی شمارے کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ ہر طرف سے آپ کے اس تجربے کی تعریف ہو رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انسان خواہ کوئی کتنا ہی اچھوتا اور قابل قدر کارنامہ انجام کیوں نہ دے دے لیکن ہر شخص اس کا قائل نہیں ہو سکتا ہے۔ اسے کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور محسوس ہوگی۔ اس شمارے کے تعلق سے بھی کچھ دوستوں نے مخلصانہ شکایت کی ہے۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ (اور جیسا کہ آپ نے بھی اس شمارے میں کسی جگہ اعلان کیا ہے کہ "نئی شاعری 'نئے نام'" کی یہ آخری کڑی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے کو ابھی مزید آگے لے جایا جائے گا۔) جس نسل اور جس قبیل کے شاعروں کو اس خصوصی شمارے کی زینت بنایا گیا ہے اس فہرست میں مزید کچھ شاعروں مثلاً عرفان صدیقی، پریم کمار نظر، کرشن کمار طور، عشرت ظفر، صدیق مجیبی، ساحل احمد، عبدالحمید، سید ارشاد حیدر، مدحت الاختر، عبدالرحیم نشتر کو ضرور شامل کرنا چاہیے تھا۔ صفحات یقیناً کچھ بڑھانے پڑتے لیکن ایسی صورت میں یہ شمارہ مزید معیاری، متنوع اور دستاویزی ہو جاتا۔ آپ نے ۵۲ شاعروں میں بعض ایسے شاعروں کو باتصویر چھاپ دیا ہے جن کا کچھ لوگ ابھی تک اچھی طرح نام بھی نہیں جانتے، جدید غزل کی نمائندگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض ایسے شاعر بھی اس شمارے میں بار پا گئے ہیں جن کی دنیا صرف مشاعرہ ہے۔ مشاعرے میں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا معاملہ ہوتا ہے۔ وہاں جن غزلوں پر شام مشاعرہ زیر و زبر کر دیتا ہے رسائل میں وہ غزلیں شائع ہوں تو بالکل صفر ٹھہرتی ہیں۔

بہرحال چھوٹی موٹی فروگذاشتوں کے باوجود آپ نے یہ بہت ہی کامیاب تجربہ کیا ہے جس کی داد آپ کے دشمن بھی دیں گے۔ تصویر، سوانحی خاکہ، غزلیں اور پھر ہر شاعر کا اس کی شاعری کے سیاق و سباق میں مختصر مگر جامع تجزیہ یہ سب چیزیں آپ نے اتنے سلیقے اور محنت سے سمیٹ کی ہیں کہ بے اختیار آپ کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

میرا خیال ہے اگلا قدم اور بھی یادگار ہوگا۔ اس خصوصی شمارے میں مجھے ذاتی طور پر اسعد بدایونی، رشید افروز، عبداللہ کمال (صرف غزل)، شبیر رسول، عبدالاحد ساز اور حامد اقبال صدیقی کی غزلیں بطور خاص پسند آئیں۔ باقی غزلیں شاید میری فہم سے بالاتر تھیں۔

شہنشاہ مرزا — ۸۲۔ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

شاعر کا ۲۵ شعراء کا انتخاب والا شمارہ خوب ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں بھی سبقت لی اور پہلی مرتبہ ایسا انتخاب پیش کیا۔ اگرچہ اہم نئے شعرا کی بھی اس میں شمولیت ہو جاتی تو یہ نمبر ایک دستاویزی حیثیت اختیار کر لیتا، اس کے باوجود یہ اپنے آپ میں ایک قابل ذکر نمبر ہے۔

احمد عثمانی — مالیگاؤں

شمارہ نمبر ۱۲ ۱۹۸۵ء دیکھا، اچھا لگا۔ خاتون افسانہ نگاروں پر توجہ قابل ذکر ہے۔ خاتون افسانہ نگاروں کو ہمارے ادب میں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے لیکن شاعر نے فال نیک انجام دیا ہے۔

خورشید سمیع صاحب کا مضمون پڑھا، مضمون میں یکسوئی نہیں ہے حال ماضی، ماضی حال اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ مضمون کی تفہیم مشکل ہو جاتی ہے۔ خاتون افسانہ نگاروں پر کوئی مبسوط مضمون ان افسانوں کے ساتھ شائع ہوتا تو یہ باب ہی مکمل ہو جاتا۔ تنقید میں بھی نقادان ادب خاتون افسانہ نگاروں کا نام لیتے ہوئے جیسے ڈرتے ہیں، خورشید سمیع صاحب کا مضمون بھی خاتون افسانہ نگاروں سے یکسر خالی ہے۔

آپ ہر بار شاعر کو ایک نئے گوشے سے مرتب کرتے ہیں جو کہ قابل ذکر اور متوجہ کرنے والا ہوتا ہے۔

فرید پربتی — سنگین دروازہ رعناواری سری نگر

شاعر کے شمارہ ۳ جلد ۵۷ میں بہت سے شاعروں نے عروض کے معاملے میں حد درجہ بے احتیاطی برتی ہے جس کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) دھیان کی "ی" مکتوبی و غیر ملفوظی ہے اس لیے تقطیع میں شمار ہوگی۔ لفظ دھیان فاع کے وزن پر آتا ہے مثلاً

اُسی کا دھیان ہے اور پیاس بڑھتی جاتی ہے
وہ اک سراب کو صحرا بنا رہا ہے مجھے
(پرکاش فکری)

وزن۔ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن۔

پیشِ نظر شمارہ میں مندرجہ ذیل اشعار میں دھیان کو مکان، دکان، نشان وغیرہم کے وزن پر موزوں کیا گیا ہے جو غلط ہے۔

(ا) یہ کون نیند سے آواز دے رہا ہے مجھے
یہ کس کے خوابوں کو اب تک دھیان میرا ہے
(رشید افروز)

(ب) شہنشاہ مرزا نے اپنی نظم "ہنگامِ قتل" میں لفظ "دھیان" کو دو طرح سے باندھا ہے۔

بس یہی اک دھیان کرنا ہے۔ بروزن فعول جو غلط ہے
دھیان کی سیڑھیوں پہ آہٹ تھی۔ بروزن فاع جو ٹھیک ہے

(ج) پرکاش تیواری کی غزل کا ایک شعر
عجب سے کل میں زندگی کٹی   مفاعلن مفاعلن مفاعلن
مرا دھیان ایک شخص میں رہا   فعولن " "

(۲) اسعد بدایونی نے دُچار کو دوچار کے تلفظ کے ساتھ موزوں کیا ہے
چراغوں کی لوؤں سے آنکھ کو دوچار کرنا کیا
جو یوں ہوتا تو سب اہلِ بصیرت ہو گئے ہوتے
وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غالب کا شعر حوالے کے طور پر دیا جاتا ہے ؎
اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دُوچار ہوتا

شاہد لطیف نے بھی یہی غلطی کی ہے
دل کا دوچار ہے اک درد سے کیا کیجئے مگر

(۳) پریتپال سنگھ بے تاب نے گم شدہ کی "ہ" گرا دی ہے جو جائز نہیں ہے کیونکہ گم شدہ فارسی لفظ ہے جس کی "ہ" گرائی نہیں جا سکتی ؎
کیوں ڈھونڈتے ہیں گم شدہ اپنی قبیل ہم
غالب کے کلام سے بیسیوں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔

(۴) حیدر صفت نے حرفِ ندا "اے" کی "ے" گرا دی ہے۔ اے حرفِ ندا ہے اور یائے حرو ایک لفظ ہے فارسی ہونے کی وجہ سے اس کی "ے" کسی بھی طرح گرائی نہیں جا سکتی۔
اے دھنک بدو اش نلک بنا ہے مری طرح | وہ اُداس کیا
فع مفاعلن   متفاعلن   متفاعلن   متفاعلن

منیر سیفی ——— ۶۔ سرکلر روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

ایک ساتھ شاعر کے دو شمارے (۱۱ و ۱۲) پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ "دوسرا سرا کوئی نہیں" اور "مسلسل اپنی" کی طرف اردو دوستوں کو توجہ دینی چاہیئے۔ "نئی افسانوی روایت" میں کچھ ضروری ناموں کی جگہ غیر ضروری ناموں نے لے لی ہے۔ کیا یہ احباب نوازی نہیں ہے؟

تمام کہانیاں اپنے اپنے طور پر متاثر کرتی ہیں۔ "شکوت" آواز میں بہت پہلے ہی خود خورشید کے نام سے چھپ چکی تھی۔ آپ نے اسے دوبارہ چھاپ کر قارئین پر احسان کیا ہے۔

"نئی شاعری نئے نام" کے تحت آپ نے سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد کے شعراء کو بھی منتخب کر لیا ہے۔ جبکہ اس انتخاب میں سنہ ۱۹۷۵ء کے بعد کے شعراء کو شامل کیا جانا تھا۔

مندرجہ ذیل اشعار نے مجھے کافی متاثر کیا،
کچھ دیر زیرِ پا جو ٹھہرتی کوئی زمین
ہم بھی قیام کرتے کسی جان گاہ میں
ہم بس گئے وہاں مگر آباد ہو نہ پائے
کچھ شہر وہ جدید تھا کچھ ہم قدیم تھے

بیتاب

مفلسی پاس شرافت نہیں رہنے دے گی
یہ ہوا پیڑ سلامت نہیں رہنے دے گی
تجھ سے بچھڑا تو پسند آگئی بے ترتیبی
اس سے پہلے مرا کمرہ بھی غزل جیسا تھا

منور رانا۔

میں خاک پر بھی اپنے قدم نہیں رکھتا
جہاں میں میرے سفر کا گواہ کوئی نہیں

شمیم رسول۔

خشک پتوں کی یہ مجبوری طرفداری نہ تھی
آندھیوں کے ساتھ ہو لینے میں دشواری نہ تھی

لمراج کسار

شاید تیری سوچ سے جیاس ایسے ہی لگن تھا
خود کو کتنے غیر ضروری کاموں میں الجھایا تھا

شاہد لطیف

مندرجہ ذیل شعراء نے مایوس کیا ؎
تم ہی بولو میں نے کسی کی شکایت کی
لوگوں نے بے پر کی اڑائی میں چپ تھا

عبید صدیقی

اس میں کاتب کا کتنا ہاتھ ہے؟
جینت پرمار نے برج کو سنرتج لکھا ہے۔
رونق شہری کا "بے لباسی میں شب و روز سسکتے ہیں --- پیڑ"۔
ہیں کے بعد "یہ" ہونا چاہیئے تھا۔
کا "لہو کا پیپل نام گوتم پکارتا تھا"۔
پیپل کی جگہ برگد زیادہ مناسب تھا۔
پرکاش تیواری کا "غم دل نے سکھا دیا پرکاش"۔
غم کی جگہ سہ حرفی لفظ ہونا چاہیئے۔
حامد اقبال صدیقی کا "مجھے بھی خود سے تکلّم کا گیان دے اللہ"۔
گیان پورے تلفظ کے ساتھ نہیں آتا ہے۔
اسد رضوی کا "کبھی حیرت سے دیدے دیکھ مجھ کو
کہ ہوئیں چاندنی گھولی ہوئی ہے"
گھلی لکھنا تھا لیکن مصرعہ موزوں کرنے کے لیے شاید رضوی کو گھولی لکھنا پڑا۔ جب کہ یہ عیب "گھلی لکھ کر بھی دور کیا جا سکتا تھا"
شائستہ یوسف نے بانہوں کو باہوں لکھا ہے۔
حیدر صفت کا ". . . سوچتا ہے کہ اب کوئی التماس لکھے۔"
التماس کی "ت" کو مشدّد پڑھنے سے مصرعہ موزوں ہوتا ہے۔
لیکن یہ صحیح نہیں ہے

کا "اس طرح سے تو نہ ہوتا کوئی برباد کہیں۔"
"تو" غیر ضروری ہے۔

عالم خورشید۔ معرفت ڈائرکٹوریٹ آف اکاؤنٹس (بہار) ایگزیبیشن روڈ پٹنہ (بہار)

"نئی شاعری نئے نام" کا انتخابی سلسلہ ایک اچھی کوشش ہے۔ آپ کے انتخاب کا جواز دعوتِ فکری نہیں دیتا بلکہ نئی شاعری کی شناخت کے لیے راہیں بھی ہموار کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج کی شاعری کو روایت، ترقی پسندی یا جدیدیت کے الگ الگ تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ آج کی نئی شاعری میں ایک ساتھ ان تینوں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ آج کی شاعری میں روایت کی صحت مند قدریں بھی ہیں، سیاسی شعور کی جھلک بھی، انفرادیت اور وجودیت کے توسط سے کائنات کو گرفت میں لینے کی سعی بھی، بدلتے ہوئے نظام میں اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا حوصلہ بھی اور ظلم و جبر کے خلاف احتجاج و سرکشی کی بلند بانگ بھی۔ اور یہ عمل شاید پیشِ نظر حالات کا ردِّعمل ہے مگر اس کسوٹی پر ۱۹۷۵ء کے بعد بلکہ ۱۹۸۰ء کے بعد اُبھرنے والے شعراء ہی پورے اترتے ہیں۔ اس انتخاب میں کچھ پرانے نام ایسے بھی آگئے ہیں جن پر خالص جدیدیت کا رنگ غالب ہے۔ بہر حال آپ نے ایک اچھی شروعات کی ہے جو یقیناً رنگ لائے گی۔

شمارہ نمبر ۱ ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ——— بیرو باڑی گوہاٹی ۷۸۱۰۱۴

جنوری لغایت مارچ سنہ ۱۹۸۶ء دہلی میں منعقدہ ساہتیہ اکادمی سیمینار ایوانِ غالب میں عبدالودود سیمینار میں شرکت اور راجستھان میں متعدد مقاموں پر دوستوں سے عالمِ زندگی میں آخری بار ملنے نیز دوسری مصروفیات سے دوچار ہونے کے بعد واپس آنے پر شاعر کے تین شمارے ۱۱/۸۵ء، ۱۲/۸۵ء اور ۱/۸۶ء بالترتیب حسبِ عادت بین السطور پڑھے اور استفادہ کیا۔ شاعر وہ رسالہ ہے جس کا شمارہ موصول ہوتے ہی میں ہزاروں یادوں میں گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر کھو جاتا ہوں۔ شاعر جریدہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک اکادمی، ایک روایت بن گیا ہے جو ماضی، حال اور مستقبل پر پھیلا ہے خوب سے خوب تر کی جانب رواں دواں شاعر تحریکِ اردو ادبیات ہے۔

شمارہ ۱۱/۸۵ء کے مشمولات لغایت دقیع ہیں۔ ڈاکٹر خورشید سمیع صاحب کا مضمون "نئی افسانوی روایت" ایسا مقالہ ہے جس کو افسانوی ادب کے محقق کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ موصوف کی صلاحیت و استعداد قابلِ صد ستائش ہے۔ سیماب مرحوم کی نظم "جشن" اردو ادب کی قسمت سے بازیاب ہو گئی۔ بڑی پیاری نظم ہے اور سیماب نے نظم ہذا کو ہندی رسم الخط میں بھی چھپوایا جو مرحوم کی وسعتِ قلب کی آئینہ دار بھی ہے۔ جوش ملیح آبادی کے خط کا عکس بھی خاصا توجہ طلب ہے۔ مزید براں رسالے کے دیگر مشمولات بھی معیاری ہیں۔

شمارہ ۱۲/۸۵ء "نئی شاعری نئے نام" کے تحت ۵۲ شعراء کے کلام بلاغت نظام کو بطور "مشتے از خروارے" پیش کیا گیا ہے، بہت خوب ہے اس کے اداریہ سے مجھے قدرے اختلاف ہے، یعنی صرف ایک پہلو سے متعلق سیمینار کو میرے خیال میں مشاعرے کے برابر نہیں رکھا جا سکتا مگر اس

[باقی صفحہ ۹۷ پر دیکھیے]

رفتار — کتب و رسائل ۔ نقد و نظر

تنقیدی مطالعے

مشہور ادیب و نقاد ڈاکٹر شارب ردولوی کے تنقیدی مضامین کا اولین مجموعہ جس میں ان کے طالب علمی کے زمانے کے چند مضامین اور گذشتہ بیس برسوں میں لکھے گئے بعض اہم مضامین کو یکجا کیا گیا ہے تنقید و محاسبہ کے تحت ، مضامین انیسیات کے تحت ۳ مضامین اور تطالعے میں ۹ مضامین شامل کیے گئے ہیں ۔ اس طرح یہ اہم کتاب زبان و ادب کے مختلف النوع موضوعات کا بھرپور مطالعہ و تجزیہ پیش کرتی ہے ۔ صفحات ۲۳۲ ۔ قیمت ۳۰ روپے ۔

پتہ : نصرت پبلی شرز ، حیدری چوک ، امین آباد ، لکھنؤ ۔

مسندِ صدارت سے

علم و ادب کی تاریخ کا تیس سالہ منظر نامہ خطبات کے ذریعہ ۔ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی ایک عمدہ کاوش ۔ بزرگ شاعر و ادیب جناب ضیا فتح آبادی نے اپنے استاد محترم علامہ سیماب اکبر آبادی کا تتبع کرتے ہوئے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۳ء تک مختلف جلسوں اور مشاعروں میں پڑھے گئے خطبات میں سے ۲۵ اہم خطبات کو کتابی شکل دی ہے ۔ ایک اہم اور قابل مطالعہ کتاب ۔ صفحات ۱۳۶ ۔ قیمت ۱۵ روپے ۔

پتہ : جے ۱۴۳ ، راجوری گارڈن ۔ نئی دہلی ۲۷ ۔

نشاطِ خاطر

اچھی نثر ہر نثر نگار کے بس کی بات نہیں ۔ ڈاکٹر حسنین کے انشائیے اچھی نثر کے نمونے ہیں ۔ ان تحریروں میں ان کی فکر بھی شامل ہے جس میں تازگی بھی ہے اور دل آویزی بھی اور وہ بے تکلفانہ انداز میں کچھ سناتے بھی ہیں ۔ یہ بڑی بات ہے [کلیم الدین احمد]

مشہور انشائیہ نگار حسنین عظیم آبادی نے تین نئے انشائیوں کے اضافے کے ساتھ "نشاطِ خاطر" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے جس میں ۱۱ انشائیے شامل ہیں ۔ صفحات ۱۲۸ ، قیمت ۹ روپے ۔

پتہ : کتاب منزل ، سبزی باغ ، پٹنہ (بہار)

ہندو فلسفہ ۔ ایک مطالعہ

ابراہیم اختر نے زیر نظر کتاب میں ہندستانی فلسفہ کی روح کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے ۔ ہندستانی فلسفہ نے جس کے ایک سرے پر شنکر اچاریہ ہیں اور دوسرے سرے پر چارواک ، مجموعی حیثیت سے جس ہندستان کی روح کی تشکیل کی ہے ، جس تانے بانے سے ہندستان کی شخصیت نے تشکیل پائی ہے اور جس کا اظہار یہاں کی زندگی ، رسومات ، ثقافت ، اعتقادات اور حد یہ ہے کہ توہمات تک میں جس طرح ہو رہا ہے ان سب کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے ۔ [عابد سہیل]

صفحات ۴۸۰ ۔ قیمت ۱۵۰ روپے ۔

پتہ : فسانہ ، فرینڈز کالونی ، وانگی روڈ ، پربھنی (مہاراشٹر)

سمتِ سفر

موجودہ دور میں جب افسانوں کی ایک بڑی تعداد صرف لایعنی ، تحریروں سے چٹ پٹی ہے ، ناوک حمزہ پوری کے افسانے نہ صرف یہ کہ تجسّے جاگتے کرداروں پر مشتمل اور قصہ در ماجرا سے بھرپور ہیں بلکہ قاری کو ان کے روزمرہ کے حقیقی مسائل کے رو برو لا کھڑا کرنے کی خوبی سے معمور ہیں [محمد اشرف علی]

نثر و نظم پر یکساں قدرت رکھنے والے ادیب ، شاعر اور افسانہ نگار ناوک حمزہ پوری کے ۱۲ افسانوں کا مجموعہ ۔ صفحات ۱۴۰ ۔ قیمت ۱۲ روپے ۔

پتہ : قوس اردو لائبریری ، حمزہ پور ، ڈاکخانہ شیر گھاٹی ۔ (گیا)

حفیظ جالندھری کا تنقیدی مطالعہ

حفیظ جالندھری کی شخصیت اور ان کی شاعری کے مختلف اصناف کا یہ تنقیدی جائزہ سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی کا ایم ۔ اے فائنل کے امتحان کے لیے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہے اور اپنے موضوع کی تمام بنیادی ضروریات کا احاطہ کرتا ہے ۔ حفیظ صاحب کے بارے میں معلومات ہی نہیں ان کی شعری کاوشوں کا تنقیدی تعارف بھی فراہم کرتا ہے [ڈاکٹر محمد حسن]

منظر شہیری نے اپنے اس تحقیقی کام کو قدرے مختلف ڈھنگ سے پیش کرنے کی سعی کی ہے ۔ صفحات ۲۲۴ ۔ قیمت ۹۰ روپے ۔

پتہ : منظر شہیری ، ریسرچ اسکالر ، ایس وی یونیورسٹی تروپتی (اے پی)

وادین کے بعد

معروف شاعر شجاع خاور کے شعری مجموعے "وادین" پر اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے تبصروں کو محمد عظیم نے کتابی شکل دی ہے ۔ اس میں ۱۳ تبصرے ، ایک دیباچہ اور وادین کی رسم اجرا میں پڑھا گیا ایک مضمون شامل ہے ۔ مرتب نے تبصروں پر محاکمہ کرتے ہوئے نہایت ہی دلچسپ تبصرہ تحریر کیا ہے ۔ اس طرح یہ کتاب اور زیادہ اہم ہو گئی ہے ۔ صفحات ۱۱۲ ۔ قیمت ۲۵ روپے ۔

پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۔

آواز

مشہور ناول و افسانہ نگار خاتون آمنہ ابوالحسن کا چوتھا ناول شائع ہو گیا ہے ۔ زندگی سے بھرپور ایک رومانی ناول جہاں محبت کی لطافت اس کی خوشبو اور رنگ نہایت دل پذیر ہیں اس پر مستزاد تخلیقی جملے متاثر کرتے ہیں ۔ صفحات ۱۷۶ ، قیمت ۲۵ روپے ۔

پتہ : ۳۷ پٹودی ہاؤس ، کرزن روڈ ، نئی دہلی ۔

ادب کی تلاش

شاعر ، افسانہ نگار اور ناقد بلراج کومل کی اولین تنقیدی کتاب جس میں شعر و ادب افسانہ اور شخصیات پر ۱۳ فکر انگیز مضامین ، اور ۱۱ اہم کتابوں پر تبصرے شامل کیے گئے ہیں ۔ یہ مضامین اور تبصرے ہند و پاک کے ادبی رسائل میں بہت پہلے شائع ہو کر بحث کا موضوع بن چکے ہیں ۔ صفحات ۲۴۰ ۔ قیمت ۳۰ روپے ۔

پتہ : نصرت پبلشرز ، حیدری مارکیٹ ، امین آباد ، لکھنؤ ۔

نگارِ حکمت

محمد فضل الرحمان نے نگار حکمت ۔ چند منظومات میں شعری اسلوب کے ذریعہ حیات و کائنات کے مختلف النوع متضاد رنگوں کی خوب صورتی کے ساتھ سجایا ہے ۔ صفحات ۸۰ ۔ قیمت ۱۲ روپے ادارہ سیاست حیدرآباد

تحریرِ ہمہ رنگ

ایک ادیب اور صحافی کی یادوں کے نگار خانے کا صرف ایک گوشہ ہے ، اس گوشے میں جتنی تصویریں ہیں سب خوبصورت ہیں لیکن ہر ایک کا حسن الگ الگ ہے ۔ اسد اللہ نے ان کے چہروں سے ذرا ذرا سی نقابیں اور میر تقی میر کے شعر کا حوالہ دیے بغیر یہ کہا ہے کہ

منہ کھلے اس کے چاندنی چھٹکے

دوستو ! سیرِ مہتاب کرو

اس نگار خانے سے جھانکنے والے کچھ مہتاب ایسے بھی ہیں جن کی یادوں کی چاندنی میرے دل میں بھی ہے ، وہ میری بھی یادوں کے نگار خانے کا حصہ ہیں ، میں انھیں یاد کرتا ہوں تو ان پر بے حد پیار آتا ہے ۔ آپ بھی اس کتاب میں ان سے مل کر انھیں پیار کرنے لگیں گے [ظ انصاری]

محمد اسد اللہ نے برلن میں رہ کر عالمی حیثیت کے لوگوں پر گاہے بگاہے جو مضامین تحریر کیے تھے جو ماہنامہ "صبا" حیدرآباد میں شائع ہوتے تھے اب ایک کتاب میں سجا دیے گئے ہیں صفحات ۱۰۹ ، قیمت ۲۰ روپے

پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، جامعہ نگر ، نئی دہلی ۔

ایک حلفیہ بیان

اقبال مجید اپنے افسانوں کے لہجے میں پختگی اور طمانیت کی نمایاں پہچان قائم کرتے ہیں ۔ پرانی قدروں اور عصری حسّیت کے تال میل میں قدیم اسلوب استعمال ہوتا ہے اور اس میں بڑی خود اعتمادی جھلکتی ہے ۔ جہاں تک نئی حسّیت کا تعلق ہے اس کے اظہار میں پرانے اسلوب کا استعمال بڑی محنت کا طلب گار ہوتا ہے ۔ امنڈتے ہوئے عصری دھاروں کو ایسے اسلوب میں ڈھالنے کے لیے جس کوشش اور جانفشانی کی ضرورت ہے اسے اقبال مجید جیسا پختہ فن کار ہی محسوس کر سکتا ہے ۔ [مہدی جعفر]

اقبال مجید کے ۱۶ شاہکار افسانوں کا مجموعہ صفحات ۲۱۴ قیمت ۳۰ روپے

پتہ : نصرت پبلی شرز ، امین آباد ، لکھنؤ ۔

جدیدیت ۔ تجزیہ و تفہیم

ڈاکٹر مظفر حنفی نے نہایت ہی دیدہ ریزی اور تلاش و تحقیق کے بعد ایک ایسی کتاب ترتیب دی ہے جس میں جدیدیت اور اس سے متعلق ادب کو مختلف زاویوں سے پرکھا اور سمجھا جا سکتا ہے ۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے ۔ حصہ اول میں تفہیم کے تحت ۱۰ مضامین اور ایک سمپوزیم دیا گیا ہے جس میں شعر و ادب اور افسانہ پر مشاہیر اہل قلم کے گراں قدر مقالے شامل ہیں ۔ حصہ دوم میں تجزیے کے تحت افسانہ ، غزل اور نظم پر ۱۹ مضامین اور جدید شاعری پر ایک اہم سمپوزیم دیا گیا ہے ۔

صفحات ۴۸۰ - قیمت ۵۰ روپے۔

پتہ: نسیم بک ڈپو، ۲۵ لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

محبِ وطن - اقبال

مظفر حسین برنی صاحب نے اپنے خطبے میں تاریخی و تحقیقی دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کی ہے کہ اسلام سے گہری وابستگی کے ساتھ اقبال مختلف قوموں اور مذاہب میں اتفاق اور یگانگت، رواداری اور محبت کے پیوستہ ہمنوا تھے، وہ جانتے تھے کہ بغیر مذہبی رواداری اور اتفاق کے ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے انھوں نے جنوری ۱۹۳۸ء میں سالِ نو کے پیغام میں کہا تھا "انسان اس زمین پر صرف انسان کا احترام کرکے رہ سکتا ہے"۔ مظفر برنی صاحب نے اقبال کی فکر میں یک جہتی، دردمندی، اور مذہبی رواداری کے پہلوؤں کو جس طرح اپنے خطبے میں اجاگر کیا ہے اور جس مدلل انداز میں اسے پیش کیا ہے اس کے لیے وہ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ برنی صاحب کا یہ خطبہ بلاشبہ اقبال شناسی کی ایک نئی جہت پیش کرتا ہے۔ [ڈاکٹر شارب ردولوی]

برنی صاحب نے "اقبال اور قومی یک جہتی" کے عنوان سے ۱۴ جنوری ۱۹۸۸ء کو بھوپال یونیورسٹی میں ایک عالمانہ خطبہ پڑھا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ کتاب علمی و ادبی حلقوں میں بے حد پسند کی گئی۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے گئے اس خطبہ پر نظرثانی اور اردو میں نئے اضافوں کے ساتھ "محبِ وطن - اقبال" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

صفحات ۱۶۸ - قیمت ۱۵ روپے۔

پتہ: ہریانہ ساہتیہ اکاڈمی، چنڈی گڑھ۔

شاعری کے کرشمے

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں "آپ کا کالم" میں جناب مستند کمال الدین عثمانی کامل کے جو مکاتیب و مراسلے اردو شاعری پر شائع ہوتے رہے انھیں انتخاب کرکے شائع کر دیا گیا ہے جس میں شاعری کے بہت سے کرشمے بیان کیے گئے ہیں جن میں حکمتیں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ انمول ذخیرہ اردو ادب میں اضافے کا سبب ہوگا کیوں کہ اپنی نوعیت کی یہ اولین کتاب ہے جو دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔

صفحات ۶۲ - قیمت ۹ روپے۔

پتہ: جمیل کاؤنٹر، دفتر روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد۔

خاکے

مشہور افسانہ نگار عوض سعید نے اپنے مشاہیر ہم عصروں پر جو خاکے قلم بند کیے تھے انھیں ایک کتاب میں یکجا کرکے شائع کر دیا ہے۔ ۱۰ شخصیات کو اپنے دل پذیر اسلوب میں جس طرح سجایا ہے وہ خاکہ نگاری کا بہترین نمونہ قرار دیے جا سکتے ہیں کہ ہر شخصیت کا مکمل پیکر تحریر میں سمٹ آئے۔

صفحات ۱۵۰ - قیمت ۳۰ روپے۔

پتہ: مکتبہ شعر و حکمت ۸۶۵-۶-۱۱، لکڑی کا پل، حیدرآباد۔

تجلیاتِ ولی

شاد عظیم آبادی کے مشہور شاگرد ولی کاکوی مرحوم [۱۹۰۲ - ۱۹۴۳ء] کی شاعری کا انتخاب مرحوم کے فرزند ریاض الرحمان نے کیا ہے۔ اس کتاب کا تعارف پروفیسر کلیم الدین احمد نے تحریر کیا ہے۔ پروفیسر ذکی الحق اور پروفیسر کلیم عاجز نے ولی کاکوی پر مضامین تحریر کیے ہیں۔

صفحات ۲۵۶ - قیمت ۲۵ روپے۔

پتہ: ریاض الرحمان ہاؤس، فریزر روڈ، پٹنہ۔

مستقبل کے رو بہ رو

بیسویں صدی کے خاتمے پر مستقبل سے انسان کا ایسا سامنا ہونے جا رہا ہے جس کے خدشے سے اس کے ذہنی توازن کے بگڑ جانے کا خدشہ ہے۔ کمپیوٹر، الیکٹرانکس، ماس میڈیا وغیرہ کے عہد میں انسان کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اس کی ذات اور خودی فکر اور عمل کی آزادی اور پہچان محفوظ رہ سکے گی؟ کیا اس کا ذہن و قلب تبدیلی کے اس عمل کو برداشت کرسکنے کا اہل ہوگا۔ خواندگی حروف اور الفاظ تک محدود رہے گی یا کمپیوٹر ریڈنگ میں بدل جائے گی؟ ادب میں رائج جدیدیت اور وجودی فلسفے پر کیا بیتے گی؟ کیا فرد اور سماج کی جدوجہد میں ابھرے احتجاج کا روپ اور لہجہ نہیں بدلے گا؟ دیویندر اسر ایک ایسا سوچنے والا ذہن ہے جس نے ادب کے حوالے سے اپنے عصر اور مستقبل کو تبدیلیوں اور ارتقا کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ مستقبل کے روبرو میں شامل ۱۵ مضامین لفظ لفظ فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ افسانہ نگار، مفکر اور نقاد دیویندر اسر کی یہ کتاب اردو کی اہم ترین کتاب ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔

صفحات ۱۲۸ - قیمت تیس روپے۔

پتہ: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، جے-۶ کرشن نگر، نئی دہلی ۵۱

اندر سبھا کی روایت

اندر سبھا کی روایت، ہندستانی ڈرامائی روایت میں اس قدر اہم ہے کہ اس کے جائزے کے بغیر ہندستانی ڈرامے کی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ اندر سبھائی روایت پر ابھی تک کوئی باقاعدہ تحقیقی کام اس نوعیت سے نہیں ہوا کہ اسٹیج اور پیش کش کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کیا ہے۔ یہ کتاب تین ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ اندر سبھا سے پہلے ہندستانی ڈرامے کی روایت، اندر سبھا کا تجزیہ، اندر سبھا کا اثر بعد کے ڈراموں پر۔ اپنے موضوع پر ایک گراں قدر تحقیقی کتاب — محمد شاہد حسین کا ادبی کارنامہ۔

صفحات ۲۸۶ - قیمت ۸۰ روپے۔

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

دھوپ، لہو، سفر

نئی نسل کے معروف شاعر حفیظ آتش کا اولین شعری مجموعہ جس میں ۶۵ نظمیں اور ۴۴ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ شاعری حفیظ آتش کی اور اس کے اطراف کے لوگوں کی کہانیوں کا منظرنامہ ہے۔ زندگی کے کچے اور گہرے رنگ ہیں، سرگوشیاں اور آوازیں ہیں۔ شہری تمدن کے نشیب و فراز ہیں اور اس کے حوالے سے شاعر کا اپنا عصر، اس کے اپنے مشاہدات اور تجربے ہیں۔

صفحات ۱۲۰ - قیمت ۲۵ روپے۔

پتہ: قلم پبلی کیشنز، ۷ بابو گھوگھلے اسٹریٹ بمبئی ۳۔

افکار و اظہار

۱۵ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ معروف نقاد تابش انصاری کے تنقیدی نظریات کا مظہر ہے۔ شعر و ادب کے مختلف موضوعات پر اپنے پیش رو اور ہم عصر ادب کی افہام و تفہیم کے لیے انہوں نے اپنی معروضات پیش کی ہیں جہاں الجھاوے نہیں بلکہ توازن سے اپنی بات کہنے کی کوشش ہے جہاں اختلافات بھی ابھرتے ہیں تو علمی مباحث کے لیے۔ صفحات ۱۸۰ - قیمت ۳۰ روپے۔

پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ۔

نقدِ قاطع برہان - مع ضمائم

"قاطع برہان" مرزا غالب کی ایک اہم تصنیف ہے اس میں برہان قاطع کی تنقید اور اس کی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ "برہان قاطع" فارسی کی نہایت ہی مشہور اور متداول فرہنگ ہے۔ اس کا مؤلف محمد حسین بن خلف تبریزی برہان ہے۔ یہ فرہنگ ۱۶۵۲ء میں مرتب ہوئی۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے نقد قاطع برہان میں غالب کی قاطع برہان کے بعض مندرجات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی سعی کی ہے۔

زیر نظر کتاب میں انھیں بیانات کے سلسلے میں ایک تحقیقی معروضہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ۲۰۷ صفحات پر محیط ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں پہلے لغت برہان قاطع درج ہے، پھر برہان قاطع میں جو تشریح ہے اس کا خلاصہ درج کیا گیا ہے، پھر غالب کے اعتراضات اور آخر میں اس پر محاکمہ ہوا ہے۔ یہاں محض منتخب الفاظ کا انتقاد پیش کیا گیا ہے۔ نقد قاطع برہان میں پروفیسر نذیر احمد نے غالب کے اعتراضات کو قدیم فرہنگوں کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں وہ تمام امور معارض بحث میں آئے ہیں جس سے

بہ خوبی آشنائی کے بغیر فارسی فرہنگ نگاری کے اصول کی شناخت ممکن نہیں۔ اس حصے میں ۵ ضمائم دیے گئے ہیں دساتیر پر ایک نظر، برہان قاطع، غالب اور صاحب برہان قاطع میں اتحادِ نظر، غالب اور زوال فارسی، تصحیفات اور لغاتِ فارسی۔ اس طرح یہ کتاب اپنے آپ میں ایک قابلِ قدر تحقیقی و علمی کارنامہ ہے۔

صفحات ۴۲۲ - قیمت ۸۰ روپے۔

پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔

لسانیات کے بنیادی اصول

اردو میں لسانیات پر تصانیف کا فقدان ہے، بالخصوص جدید لسانیات پر چند مضامین، دو ایک تصانیف اور بعض ترجموں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر اقتدار حسین خاں کی موجودہ تصنیف "لسانیات کے بنیادی اصول" ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ انھوں نے اس میں علم کی تمام سطحات، صوتیات، تجز صوتیات، صرف و نحو، تمام کا خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے۔ آخری ابواب میں انھوں نے لسانیات کے جدید ترین نظریہ تبادلی قواعد سے بھی قارئین کو روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں ان اصطلاحات کی ایک فہرست بھی دے دی ہے جن کا استعمال انھوں نے زیرِ نظر تصنیف میں کیا ہے اور جس میں انھوں نے ترقی اردو بیورو کی لسانیات کمیٹی کی وضع کردہ اصطلاحات سے [جو زیر طبع ہیں] جزوی طور پر استفادہ کیا ہے [مسعود حسین خاں]

یہ کتاب ۸ ابواب پر مشتمل ہے، آخر میں ضمیمہ، حواشی اور اصطلاحات دی گئی ہیں۔ صفحات ۱۶۸ - قیمت چالیس روپے۔

پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

موم کا شہر

غزل کا فن جس قدر آسان ہے، اتنا ہی دشوار بھی ہے۔ آسان اس لیے ر غزل کی مکمل روایت موجود ہے۔ ایک عظیم سرمایہ ہے جو شاعری کی کئی شکلوں . آسان کر دیتا ہے، لہٰذا محض لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی اکثر شعر کہ نہ کا رواج اردو میں عام ہے، لیکن صنف غزل کے مزاج کا شعور . تے ہوئے اس صنف کے برتنے میں درپیش دشواریوں سے واقف ر تے ہوئے غزل کہنے کی جسارت کرنا ایک خطرناک چیلنج قبول کرنے ، مترادف ہے۔ اس لیے شاید دکن کے ہی نہیں بلکہ ملک کے اکثر راء کے پاس نظم کا رجحان حاوی نظر آتا ہے۔ اسی نسل کے شعراء میں اقبال واحد شاعر ہیں جنہوں نے اس چیلنج کو مردانہ وار قبول کیا ماب تک اس کی پاسداری کر رہے ہیں۔ مگر اقبال کے پاس نہ تو غزل ، لیے درکار شعری لفظیات کی کمی ہے اور نہ ہی سوز و گداز کی جس ل کا مزاج بنتا ہے۔ [از نکاز افضل]

غزل اور ثلاثی دونوں ہی اصناف میں منفرد لب و لہجہ اپنا سعی کرتے ہیں۔ یہ ان کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ثلاثی شتمل مجموعہ "تتلیاں" شائع ہو چکا ہے۔

صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۲۵ روپے۔

پتہ: نوائے دکن پبلی کیشنز، ۶۸/۴ آصفیہ کالونی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

سنہری آنچ

واحد سحری دلی کی ادبی محفلوں کی جان ہیں، خالص غزل کے شاعر ، اور غزل کہ جس کی روایت ۱۰ ویں صدی کی دلی میں شروع ہوئی تھی شاعری کو فلسفیانہ گفتگو اور پیچیدہ مسائل سے بوجھل نہیں بناتے عصری زندگی سے جو بصیرت اور آگہی حاصل ہوتی ہے اور جو مشاہدے ، کے ذاتی تجربے بن گئے ہیں انھیں کو سیدھے سادے اور عام فہم زبان ، اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ ان کا یہ سخن دل کو چھوتا ہے۔ واحد سحری سچے اور کھرے فن کار کی طرح دولت اور اس کے حصول کے ذرائع سے بیاز اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ [ڈاکٹر خلیق انجم]

واحد سحری کا اولین شعری مجموعہ جس میں ہند و پاک کے مشاہیر کاروں کی آرا بھی شامل ہیں۔

صفحات ۱۲۷۔ قیمت ۲۰ روپے۔

پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸ گلی عزیز الدین وکیل ، پنڈت، دہلی۔

شب نیم

...غزل کے جدید اسلوب کو وہ [خلش بڑودوی] محض ن پرستی کے طور پر لباسِ شعر کی طرح استعمال کرنا نہیں چاہتے ، سے شعر کے بدنِ نازک کی حساس جلد بنانا چاہتے ہیں کہ شعر ایک ہویاتی چیز ہونے کے سبب اسی چیز کو قبول کرتا ہے جو تخلیقی ذہن کی سرن سے سازگار ہو۔ [وارث علوی]

مشہور شاعر خلش بڑودوی کا دوسرا شعری مجموعہ [قطعات پیشہ شائع ہو چکا ہے] جو کلاسیکی شاعری کا عصری روپ ہے، اچھی شاعری کا منظر نامہ ہے، نئی شاعری کا آئینہ ہے۔

صفحات ۱۷۶۔ قیمت ۲۵ روپے۔

پتہ: خلش بڑودوی، یاقوت پورہ، بڑودہ (گجرات)

تیسرے رخ کی تصویر

رحمٰن حمیدی اردو کا وہ بدقسمت افسانہ نگار ہے جو کہانی کے فن کو جاننے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو عصری اسلوب دینے کے باوجود بے توجہی کا شکار ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی جماعت یا گروہ سے وابستہ نہیں کیا ہے، ورنہ ان کی کہانیاں اپنے آپ میں نئی کہانی کا وہ معیار ہیں جو اس دور کے کم افسانہ نگاروں کو میسر ہے۔

رحمٰن حمیدی کا اولین افسانوی مجموعہ جس میں ۲۰ کہانیاں شامل ہیں جو ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

صفحات ۹۶۔ قیمت دس روپے۔

پتہ: دبستان چترہ گودام، گومو، دھنباد (بہار)

حکم نامہ

سلطان سبحانی کے کلام میں عصر کا متشدد روپ بھی موجود ہے اور ذات [جو عصر سے ماورا ہے] کا شانت روپ بھی، مگر یہ دونوں روپ الگ الگ حالتوں میں موجود نہیں ہیں بلکہ ان کی آویزش سے ایک تیسری حالت ابھری ہے جو ایک ایسے زاویۂ نگاہ کو ابھارنے میں کامیاب ہوئی ہے جو طوفان کی آنکھ میں داخل ہونے پر ہی وجود میں آتا ہے۔ [ڈاکٹر وزیر آغا]

افسانہ نگار، شاعر، صحافی اور آرٹسٹ سلطان سبحانی کا اولین شعری مجموعہ جس میں شامل نظمیں غزلیں ایک نئی مگر تازہ کار آواز کی دھمک ہیں جہاں لفظ لفظ نت نئے تخلیقی جہان نظر آتے ہیں۔

صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۲۰ روپے۔

پتہ: ہم زبان پبلی کیشنز، ۱۹۳۰۔ ایم۔ ایچ۔ بی کالونی مالیگاؤں (ناسک)

شہر جنوں

دوارکا پرشاد شریواستو شوق باندوی مرحوم [۱۹۴۵-۱۸۷۹] کے کلام کا انتخاب مرحوم کے فرزند نے شیو پرشاد برگ باندوی اور احسان آوارہ صاحبان کے تعاون سے شائع کیا ہے۔ اس انتخاب کی اشاعت سے باندہ کی ادبی تاریخ کی بہت سی کڑیاں جڑتی ہیں۔

صفحات: ۱۹۰۔ قیمت: ۱۵ روپے۔

پتہ: شنکر سرن شری واستو، ڈپٹی پوسٹ ماسٹر (ریٹائرڈ) محلہ کرہ، باندہ (یوپی)

مراٹھی رنگ

معروف شاعر بدیع الزماں خاور نے اپنے تخلیق کے کئی شعری مجموعے شائع کیے اور مقبول ہوئے اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے صوبے کی زبان مراٹھی کی عصری شاعری کو اردو روپ دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا اور اب تک مراٹھی شاعری کے تراجم پر مشتمل تین کتابیں "سبیل" "خوشبو" اور "دینار" شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی رنگ اس سلسلے کی چوتھی کتاب ہے۔ یہ کتابیں اردو میں منظوم تراجم کی تاریخ کی توسیع کرتی ہیں۔

مراٹھی رنگ میں مراٹھی کے دس معتبر شعراء کی کئی، چھوٹی بڑی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔ صفحات ۸۰۔ قیمت ۲۰ روپے۔

پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔

شمارِ نفس

۱۹۷۰ء کے بعد ابھرنے والے نئے شعراء میں ایک نام نجم عثمانی کا بھی ہے جن کا کلام اردو کے تمام ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ نجم نے اپنی غزل کو جدید غزل کا روپ سروپ دینے کی بھرپور کاوش کی ہے اور تخلیقی مینا کاری سے متوجہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے عصر کی پیچیدگیوں کو شعری پیکر عطا کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔

صفحات ۹۶۔ قیمت دس روپے۔

پتہ: سی ایم پی، ایف آفس، پوسٹ بکس نمبر ۵۰، دھنباد (بہار)

لباسِ زخم

انجم عرفانی نے اپنی شعری کائنات کو نئی شاعری کے لب و لہجہ سے اس طرح سجایا ہے کہ عصری حیثیت کی عکاسی میں اعتدال بھی ہے اور شعریت بھی۔ وہ نظم و غزل دونوں ہی اصناف میں تخلیقی اظہار کرتے ہیں اور کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ "لباسِ زخم" انجم عرفانی کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ایک کم معروف شاعر کو مقبول بنانے کے لیے کافی ہے۔

صفحات ۱۷۶۔ قیمت ۲۴ روپے۔

پتہ: شعبۂ اردو مہاراں لال کنور پوسٹ گریجویٹ کالج بلرام پور (یوپی)

صبحِ آوارگی

ساغر کرناٹکی نئی شاعری بالخصوص جدید غزل کے لب و لہجہ، اس کی لفظیات اور دیگر لوازمات کا ادراک رکھتے ہیں اور اپنے عہد کو اپنی شاعری میں کشید کرنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں اس طرح وہ آج کی شاعری کو اپنے طور پر برتتے ہوئے نئی شاعری کے کارواں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی ہے۔

صفحات ۱۱۲۔ قیمت دس روپے۔

پتہ: ساغر کرناٹکی، درگاہ، رانی بنّور ضلع دھارواڑ (کرناٹک)

ٹوٹا ہوا آئینہ

عارف خورشید نو وارد شاعر ہیں لیکن ان کا اولین شعری مجموعہ جس میں ۴۳ غزلیں اور ۳۴ نثری و آزاد نظمیں شامل ہیں، ان امکانات کا پتہ دیتا ہے جہاں انحراف بھی ہے اور رد کرنے کی قوت بھی۔ اپنے آپ کو اپنے طور پر پیش کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔

صفحات ۸۰۔ قیمت دس روپے۔

پتہ: عارف خورشید، مکان نمبر ۱۰۰-۱۹-۱، جونا بازار اورنگ آباد (مہاراشٹر)

شمیم کرہانی۔ حیات، شخصیت اور شاعری

اردو کے مشہور و معتبر شاعر شمیم کرہانی مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر کوئی خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہو سکا تھا، ڈاکٹر سید خواجہ علی انجم نے اس سلسلے میں ابتدا کی اور ایک اہم کتاب اردو دنیا کو پیش کر دی۔ ۳۱۲ صفحات کی اس کتاب میں شمیم کرہانی مرحوم کی حیات اور شعری شخصیت کے خد و خال ابھر کر آئے ہیں اور بہت حد تک شخصیت کی تدوین ہو جاتی ہے۔

کتاب میں شمیم کرہانی کی حیات، شخصیت، شمیم کی غزل گوئی، نظم نگاری، فنی تجربے، نعتیہ کلام، قصائد، سلام اور مرثیے، رباعیات و

تضمینات شمیم کی نثری خدمات، شاعری میں مقام اور دیگر کئی عنوانات ایک بڑے شاعر کا مکمل تجزیہ و تعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ قیمت ۳۰ روپے
پتہ: سید سکندر علی، سابق نائب صدر بلدیہ، آکوٹ ضلع آکولہ [مہاراشٹر]

پلک پلک تیشہ

اس کتاب میں جل گاؤں کے تمام اہم شعراء کا منتخب کلام، سوانح اور تصویر کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲ رنئے پرانے شعراء کی یکجائی سے کئی اہم سلسلے بنتے ہیں۔ نوجوان شاعر صابر زاہد نے اس انتخاب کو مرتب کیا ہے اور اسے ایک اہم تذکرے کی حیثیت دے دی ہے۔
صفحات ۸۰۔ یہ کتاب برائے فروخت نہیں ہے۔
رابطہ: صابر زاہد، ۳۰۲ سشنی پیٹھ، جل گاؤں ۴۲۵۰۰۱ [مہاراشٹر]

تفہیم العروض

فنِ عروض پر کتابوں کی کمی نہیں اس کے باوجود یہ فن مشکل ترین ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ عروض پر کتابیں لکھنے والوں نے اپنے اپنے طور پر اس فن کو بہ طور علم عام فہم بنانے کی معتدبہ کوششیں کی ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ عروض پر لکھی گئی کتابوں کے سلسلے کی تازہ ترین کتاب جناب شارق جمال کی تفہیم العروض ہے۔ شارق جمال خود بھی کہنہ مشق شاعر ہیں اور شاعری کی بدلتی ہوئی قدروں کو جذب کرنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ عروض پر ان کی نگاہ ہے جس کا ثبوت ان کی تازہ تالیف ہے۔ عام فہم اسلوب میں فنِ عروض کے ایک ایک نکتہ کو مثالوں کے ذریعہ واضح کرنے میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ یہ کتاب طالبانِ شعر و ادب کے لیے مفید ٹھہرے گی۔
صفحات ۱۰۰۔ قیمت ۱۵ روپے۔
پتہ: ادارہ غالب، تکیہ معصوم شاہ، مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸

فصیل

تسکین زیدی اردو افسانے کا نیا نام ہے جس نے اپنے چند ایک خوب صورت افسانوں کے ذریعہ افسانے کے قارئین اور ناقدان افسانہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ ۱۵ افسانوں پر مشتمل ان کا اولیں افسانوی مجموعہ ان امکانات کا مظہر ہے جہاں سے توقعات کا سفر شروع ہوتا ہے۔ افسانہ محض ڈرائنگ یا کرافٹنگ کا نام نہیں ہے، افسانہ محض ماجرا بندی کا نام بھی نہیں ہے یا الجھے ہوئے فلسفیانہ جملوں اور فقروں کی ترتیب کا نام بھی افسانہ نہیں ہے۔ افسانہ تو اس تخلیقی ہنرمندی کا نام ہے جو ان تمام تعریفوں کو اپنی سطح سے بلند نہ ہونے دے۔ تسکین زیدی کے یہاں تخلیقی ہنرمندی کے غیر واضح نقوش ان کے افسانوں میں یہاں وہاں ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اردو فکشن کے افق پر ایک اور ستارہ ابھر آیا ہے جسے ابھی اپنے تخلیقی سحر کو پھیلاؤ دینا ہے۔ صفحات ۱۵۱۔ قیمت ۲۵ روپے۔
پتہ: بزم خضر راہ، گوالٹولی، کانپور۔

خواب کا در بند ہے

شہریار اس دور کے ان معتبر شعراء میں شمار ہوتے ہیں جن سے اب اچھی اور سچی شاعری کے نت نئے تازہ کار شعری منظر نامے ابھرتے ہیں اور ایک بھیڑ کو راہ دیتے ہیں۔ تعلیق، اظہار میں انفرادیت، اپنا پن اور متاثر کرنے والا لہجہ اثر پذیری کے خوش رنگ دائرے اور سلسلے بناتا ہے۔ ایک جہان اور اس کے عصر کو جذب کرنے کا عمل ہر زندہ شاعر کے یہاں ممکن ہوتا ہے لیکن ہر شاعر اپنی پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ اپنے عصر کو پیش کرے اور نئے نئے جہانوں کا کولمبس بنے یہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ شہریار آج کے ان چند ایک شعراء میں شمار ہوتے ہیں جن کا اپنا شعری اسلوب ہے۔ ان کا اپنا شعری وژن ہے۔ نظم و غزل میں معنوی تہہ داری بھی ہے۔ وہ ایک ایسی خواب ناک فضا بندی کے شاعر ہیں جہاں ان کی آواز قاری اور سامع کو اپنی آواز معلوم ہوتی ہے۔
صفحات ۱۴۰۔ قیمت ۵۰ روپے۔
پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۔

گوکھرو کے پھول

ظفر گورکھپوری کا یہ تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل "تیشہ" [۱۹۶۲ء] اور "وادیِ سنگ" [۱۹۷۵ء] دو شعری مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ظفر گورکھپوری نے بتدریج شعری سفر طے کیا ہے اور اچھی شاعری کرتے ہوئے اپنے قاری اور سامع کو متاثر کرتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری میں زندگی کو بیانیہ اسلوب کے ذریعہ پیش کرنے کا رویہ حاوی رہا ہے یعنی موضوع و مواد کی اہمیت، فن، ہیئت یا تخلیقیت سے زیادہ رہی ہے۔ زندگی کے تضادات یا وہ عالمی سچائیاں جن سے تناسب و توازن بنتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ حرکت و ارتقا ہوتا رہتا ہے ان کو نظم کر کے شاعری کرنا اور اس پر اصرار کرنے کا رجحان عام رہا ہے۔ اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس قبیل کے شعراء روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو غزل کا موضوع بنانے لگے ہیں جس سے شعر میں تہہ داری کے بجائے ایک اکہرا پن ابھر آیا ہے یعنی وہی بیانیہ اسلوب جو شعر اور نثر کا فرق ہی مٹا دے، آپ کچھ لمحوں کے لیے تڑپ جائیں اس کے بعد پھر کچھ نہیں۔ ظفر گورکھپوری کی شاعری کے موضوعات و مواد اور اس کے تانے بانے ترقی پسند شاعری کے سانچوں ہی سے ابھرے ہیں تاہم اگر ان کی شاعری پر لیبل نہ لگایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں شعریت بھی ہے اور نغمگی بھی، فنی التزام بھی ہے اور معنی کی تہہ داری بھی۔ غزلوں میں اکہرا پن بہت زیادہ نمایاں نہیں۔ یہ شعری مجموعہ عصری شاعری کا رفتار پیما اور سچی شاعری کا نمائندہ ٹھہرے گا۔
صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۳۰ روپے۔
پتہ: رچنا پبلی کیشنز، اے ۱۲ نیو میونسپل کالونی، دیونار بمبئی ۸۸

مالکِ یوم الدین

ف س اعجاز نئی نسل کے ایک تازہ کار شاعر ہیں جو نظم و غزل دونوں ہی اصناف پر بھرپور تخلیقی قوت رکھتے ہیں۔ مالکِ یوم الدین ان کی نظموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں شامل نظمیں، زیادہ تر پابند شاعری کا نمونہ ہیں۔ ان نظموں میں موضوع و مواد اور ہیئت کا بے پناہ تنوع ہے یعنی موضوعات اپنے ساتھ ہیئت لے کر آئے ہیں چنانچہ پابند و آزاد نظموں میں سانیٹ بھی ہے، گیت بھی ہیں، ستزاد بھی ـــ ان نظموں کے موضوعات، واقعات و اخبار یا پھر وہ تاثرات ہیں جو شاعر کے قلبِ حزیں پر رقم ہوتے رہے ہیں۔ نوجوان شاعر کا کمال یہ ہے کہ نظموں میں بیانیہ اسلوب اختیار کرنے کے باوجود شعری رچاؤ کو قائم رکھتا ہے اس طرح نظموں کا یہ مجموعہ اپنے آپ میں قاری کو گرفت میں لینے کا ہنر سموئے ہوئے ہے۔ ان نظموں میں نغمگی ہے، روانی ہے۔ ایجاز و ارتکاز ہے۔ آزاد اور نثری نظموں کی بھیڑ میں پابند نظموں کا مجموعہ متوجہ کرتا ہے۔
صفحات ۱۱۲۔ قیمت بیس روپے۔
پتہ: انشا پبلی کیشنز نمبر ۶ رائے کنال ایسٹ اسٹریٹ کلکتہ۔

جلتے توے کی مسکراہٹ

سفرنامے۔ شاعروں کے۔ صدابندیاں لطیفوں کی۔ خاکے۔ اخلاقی ردیوں کی جھلکیاں۔ اسٹیج کی۔ جائزہ۔ سفر و حکمت کی کہانیاں۔ مختلف اردو سماجوں کی ماحول۔ پس منظر۔ باتیں۔ قصبوں، شہروں، مہانگروں کی۔ جائزے۔ فکر و نظر۔ ایک دلچسپ کتاب انور ندیم کے قلم سے۔
صفحات ۲۸۸۔ قیمت ۳۰ روپے۔
پتہ: ہم لوگ پبلشرز، ۲۷۱، ۵ لین نٹ دا گنج لکھنؤ۔

نہیں

نئی اردو کہانی کا معتبر نام علی امام جن کی ۱۰ کہانیوں پر مشتمل کتاب شائع ہو گئی ہے۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۲۱ روپے۔
پتہ: سعیدہ فردوسی معرفت، سید شاہ نورالدین احمد بنگلہ خان مرزا، پٹنہ ۶

مور کے پاؤں

کمال احمد کے ڈرامے باور کراتے ہیں کہ انھیں اسٹیج کرافٹ کی خاص جان کاری ہے، کم از کم یک بابی ڈرامہ لکھنے میں زبردست انفرادیت حاصل ہونے کی توقع ہے۔ [انیس رفیع] کمال احمد کے دس نئے ڈراموں پر مشتمل نئی کتاب۔ صفحات ۱۰۴، قیمت ۱۵ روپے۔
پتہ: شاداب کتاب گھر، ڈی ۱/ ۴۳، سرسید احمد روڈ۔ کلکتہ ۱۴۔

خطرناک سفر

بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے مشہور ادیب ریاض احمد خاں کی ایک اور دلچسپ کتاب جو کہانی بھی ہے اور بچوں کے لیے پیغام بھی۔ صفحات ۳۹۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔
پتہ: مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

رہنما در رہرو

جناب برہان حسین نے اپنی کالم نویسی کے ذریعہ اپنے عصر کے مسائل کا بڑی خوش اسلوبی سے احاطہ کیا ہے۔ ان کے کالموں کو پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے اطراف کی دنیا سے کس قدر باخبر اور متاثر ہیں۔ وہ سماج کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کا مقصد دل آزاری کبھی نہیں ہوتا۔ [محمد منظور احمد]

روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد میں محمد برہان حسین نے جو روزانہ کالم تحریر کیے تھے انھیں محمد منظور احمد نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔
صفحات ۲۹۰۔ قیمت ۵ روپے۔
پتہ: روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد۔

حرفِ آرزو

اردو کے بزرگ شاعر سادھو رام آرزو سہارنپوری کی سوانح حیات اور تذکرہ کلام کو معروف ادیب و شاعر ڈی اسے ہیر لیس قرباں نے نہایت ہی دیدہ ریزی کے ساتھ مختلف عنوانات کے ذریعہ ترتیب دیا ہے۔ ایک قابلِ مطالعہ کتاب۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت ۱۸ روپے۔
پتہ: ای ۷۷، آزاد کلاس کالونی، دہلی روڈ سہارنپور۔

مبشر علی صدیقی شخصیت و فن

اردو کے بزرگ ادیب و نقاد جناب مبشر علی صدیقی کی شخصیت و فن پر پروفیسر ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی نے یہ گراں قدر کتاب ترتیب دی ہے جس میں ہم عصر مشاہیر قلم کاروں کے تاثرات آزاد او مضامین کے علاوہ مبشر صاحب کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چند اہم مضامین اور مبشر صاحب کے خطوط و مراسلے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

صفحات ۲۰۸ ۔ قیمت ۱۵ روپے۔

پتہ ۔ گلی وحید بخش، محلہ سوتھ بدایوں (یوپی)

مجاز

اسرارالحق مجاز کی مکمل سوانح حیات اردو ڈرامے کی جدید ترین تکنیک کے ساتھ۔ معروف ڈراما نگار یوسف مرزا کا ایک منفرد تحقیقی کارنامہ جو فلمی منظر نامے اور مکالموں کے ذریعہ ترتیب دیا گیا ہے۔ مجاز کی پیدائش سے انتقال تک اہم ترین واقعات و سانحات کو موزوں مکالموں کی مدد سے مجاز کی چند نظموں اور غزلوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

صفحات ۲۵۰ ۔ قیمت ۳۰ روپے۔

پتہ ۔ محمڈن انٹرپرائزز ۳/۱۲ موتی لال نگر گورے گاؤں (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۱۰۴ ۔

اعتراف

شاعر، محقق، نقاد اور مدیر شمیس بدایونی کی شخصیت اور فن پر زیر نظر کتاب میں وہ مقالات اور مضامین شامل کیے گئے ہیں جو شمس بدایونی کی شخصیت اور تصانیف پر ہندوستان کے معیاری رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ جناب مبشر علی صدیقی نے اس کتاب کو سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ صفحات ۸۰ ۔ قیمت ۱۰ روپے۔

پتہ ۔ اسلیم مبشر اردو سوسائٹی، گلی وحید بخش سوتھا بدایوں۔

گزشتہ دو تین برسوں سے تاحال شاعر میں گاہے بہ گاہے نقد و نظر کا کالم دیا جاتا رہا ہے۔ نئی مطبوعات پر تبصروں کا یہ سلسلہ بعض ناگزیر وجوہ کے سبب باقاعدگی کے ساتھ جاری نہیں رہ سکا تھا تاہم ایک مقبول کالم "کتب و رسائل" معلومات کی حد تک اس کمی کو پورا کرتا رہا ہے۔ بڑی تعداد میں نئی مطبوعات کی وصولیابی اور ان پر تبصرے نہ ہونے کی شکایات نے مجبور کیا کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ "نقد و نظر" اور "کتب و رسائل" یہ دونوں ہی کالم اپنی علاحدہ شناخت و معیار کے ساتھ ہر شمارے میں شائع ہونے لگیں لہٰذا اس شمارے سے اگلی دو تین اشاعتوں تک، نئی پرانی مطبوعات کو "کتب و رسائل" اور "نقد و نظر" کے امتزاج کے ساتھ یعنی معلومات، تعارف اور مختصر تبصروں کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ہم "نقد و نظر" کو کچھ اور نئے تجربوں کے ساتھ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ایسے تجربے جو اردو کے ادبی رسائل کی تاریخ میں پہلی بار کیے جائیں گے۔ [ادارہ]

بقیہ صفحہ ــــ ۴۷

سے مدیر نے ایک نئی سمت، ایک نئے موضوع کی نشان دہی کی ہے جو بغایت اہم ہے۔ اس پر ایک مضمون وقت و فرصت ملتے ہی لکھوں گا۔

غالباً یہ بات شمارہ ۱۰/۸۶ء سے متعلق ہے۔ یہ شمارہ بھی شاعر کی لغت کا آئینہ دار ہے۔

غرض کہ تینوں شمارے جوانب والعاد و آفاق ادبیات سے بھرپور ہیں۔ ادبیاتی صحافت میں شاعر کا خاص رول رہا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ــــــ وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کراچی

شاعر کے ۴ شمارے ۸، ۹ تا ۱۲ موصول ہوئے جن کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ جس سلیقے، محنت، خلوص اور لگن کے ساتھ یہ رسالہ شائع کر رہے ہیں یقیناً ہم سب کی داد کے مستحق ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور علم و ادب کی خدمت کرنے کی مزید توفیق عطا فرمائے۔

عمیق حنفی ــــــ اے۔ ۲۳۲، پنڈارا روڈ، نئی دہلی

بڑی مدت کے بعد اپنا مضمون متعلقہ غزل گائیکی شاعر کے شمارہ ۱۰ جلد ۵ میں دیکھ کر مطمئن ہوا مگر غلطی ہائے کتابت نے اُداس کر دیا

ص۳۱ سطر ۲ MARSHAL MCLUHAN. کا MARSHALL MCLOHAN ہو گیا ہے۔

چھٹے پیراگراف کی دوسری سطر میں "تو غزل" PORTRAIT FACE بنا دیا گیا ہے۔ اصل سے مقابلہ کیجئے۔ نقل ہاتھ نہیں لگ رہی ہے۔

ص۳۵ سطر ۴ "معارف النغمات" کا "مکارف النغمات" مجھے جاہل مطلق ثابت کر دیا ہے۔

ص۲۳ کے فٹ نوٹ میں جلد ثالث "جلد تالہ" بنا ہوا ہے۔ صحیح اصطلاح بجانے والوں میں [illegible] مروج ہے۔

ص۳۳ تیسرے پیرے گراف کی آخری سطروں میں کاتب تقدیر نے حذف و اضافے سے کام لیا ہے: "اور خواتین کے ہاتھوں میں ٹننگ کی سلائیاں اور اون" کی بجائے ۔۔۔۔ کیا عرض کیا تھما دیا ہے۔

مصرعے "پاسباں مل گئے۔۔" کے بعد "اقبال" کے بجائے "اقبال" لکھ کر غضب کر دیا۔

یہ تو وہ غلطیاں تھیں جو ایک سرسری نظر میں ہی گرفت میں آگئیں "درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا"!

نظر گوپال پوری ــــــ یادگیر (کرناٹک)

شاعر کا شمارہ نمبر ۱۱ سنہ ۱۹۸۶ء ملا۔ ہر شمارہ کی طرح یہ بھی خوب ہے۔ جناب عمیق حنفی کا مضمون "غزل اس نے چھیڑی" ایک دلچسپ مضمون ہے لیکن مضمون نگار نے غزل گائیکی کے سلسلے میں مرحوم سہگل جیسی مایہ ناز ہستی کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ افسوس اور حیرت کی بات ہے کندن لال سہگل کے بغیر غزل گائیکی کی تاریخ یقیناً نامکمل ہے۔

جتنی بھی غزلیں سہگل نے گائی ہیں صرف ہارمونیم، طبلہ اور تان پورے کے ساتھ لیکن ان کی گائیکی کا اثر بہت ہے اور آج بھی وہ اپنا جواب آپ ہیں۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ وہ الفاظ پر موسیقی کو کبھی حاوی ہونے نہیں دیتے تھے۔ ان کی گائیکی کا اثر راست ہوتا تھا اور بات سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔ یوں تو اُن کے بعد مرحوم سی ایچ آتما اور مکیش نے ان کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن بات پیدا نہ کر سکے۔ سہگل نے بہت سی غزلوں کو جان بخشی ہے اپنی بے جوڑ آواز سے۔ مثال کے طور پر کچھ غزلوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

(۱) لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے (ذوق)
(۲) اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا (سیماب اکبرآبادی)
(۳) دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں (اکبر الٰہ آبادی)
(۴) اِدھر بھی نظر کر اُدھر جانے والے (؟)

آجکل کے غزل گائیک کئی ہندوستانی اور مغربی سازوں کے ساتھ گاتے ہیں لیکن عام طور پر بات نہیں بن پاتی۔ ایک بات خاص طور پر کہنا چاہوں گا کہ غزل کی سنگت میں طبلہ کا استعمال ہی نہایت مناسب ہے۔ اس کے برخلاف ڈھولک بجنے لگتا ہے تو غزل قوالی کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔

عمیق صاحب نے جن فلمی موسیقاروں کا نام گنوایا ہے ان میں ایک بہت اہم نام بھول گئے اور وہ ہے مرحوم مدن موہن جنہیں بیگم اختر غزل کا بادشاہ کہتی تھیں۔

مدن موہن اپنی غزل کمپوزیشن میں آرکسٹرا کا استعمال کرتے ضرور تھے لیکن اشعار کے شروع ہونے سے عین پہلے جیسے آرکسٹرا تھم سا جاتا تھا اور یہ صرف مدن موہن ہی کا کمال تھا۔

حیدرآباد میں بین الاقوامی اقبال سیمنار

حیدرآباد۔ بین الاقوامی اقبال سیمنار کی یادگاری افتتاحی تقریب میں مرکزی وزیر مشہور شیوشنکر، ریاستی چیف منسٹر این۔ ٹی راماراؤ اور گورنر ہریانہ جناب سید مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کو ہندستان کے عظیم شاعر اور مفکر کی حیثیت سے انہیں زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔

اس تقریب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں آندھرا پردیش کے چیف منسٹر این ٹی راماراؤ نے انگریزی اور تلگو میں ابتدائی کلمات ادا کرنے کے بعد اردو میں تقریر کی اور اقبال کے کئی اشعار ہی نہیں بلکہ پوری نظمیں سنائیں جن میں ترانۂ ہندی، بچوں کا قومی ترانہ اور نیا شوالہ شامل ہیں۔ مسٹر شیوشنکر نے اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقبال اردو کے عظیم شاعر تھے جنہیں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی اور جن سے بے شمار لوگ متاثر ہوئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اقبال نے اسلامی ادب کا ہی نہیں اپنشد اور گیتا کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

جناب مظفر حسین برنی نے اپنے کلیدی خطبے میں اقبال کے حیدرآباد سے تعلق، ان کی فکر پر اسلامی فلسفے کے علاوہ ہندستانی فلسفے کے اثرات اقبال کی وطن دوستی اور بین الاقوامی تصورات ان سب کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے اس دور میں جبکہ سارے مشرق پر سامراجیت کا تسلط تھا مشرق کی روحانی اور تہذیبی عظمت کو سربلند کیا۔ اقبال سارے برصغیر کے عظیم شاعر ہیں ان کے تعلق سے غلط فہمیوں کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ نمائش کلب کا سارا احاطہ اقبال کے شیدائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس تقریب کا آغاز فائن آرٹس اکیڈمی کے فن کاروں نے ترانۂ ہندی پیش کر کے کیا۔

ہندستان میں اردو کے مسائل

نئی دہلی۔ ۲۵ اپریل کو یہاں مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ اور مجلس عام کے اجلاس ہوئے اور ۲۶ اور ۲۷ اپریل کو ہندستان میں اردو کے مسائل پر دو روزہ سیمنار انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ اجلاس میں مجلس عاملہ اور مجلس عام کے ۱۸ ممبروں نے شرکت کی اور سیمنار میں ملک کے ۱۱ صوبوں میں اردو کی موجودہ صورت حال پر مضامین پڑھے گئے۔ سیمنار میں پاکستان سے جناب آغا سہیل اور انگلستان سے جناب باقر رضوی بھی شریک ہوئے۔ انھوں نے بالترتیب پاکستان اور انگلستان میں اردو کی حیثیت پر معلومات افزا مضامین پڑھے۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے ڈراموں کے انعامی مقابلے

بمبئی۔ (ڈاک سے) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے بمبئی میں اردو یک بابی ڈراموں کا علاقائی مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں حسب ذیل ڈراموں نے انعامات حاصل کیے۔

پہلا انعام: کہاں ہے (یونہ کالج)
دوسرا انعام: سارے جہاں سے اچھا (مومن کالج، اندھیری بمبئی)
تیسرا انعام: اسپارکنش (نیو ایرا ایجوکیشن سوسائٹی اندھیری بمبئی)

اداکاری کے لیے پہلا انعام جاوید واحد (کہاں ہے) دوسرا انعام پریش تیلپال (سارے جہاں سے اچھا) اور تیسرا انعام مجیب خاں (اسپارکنش) نے حاصل کیا۔ بہترین ہدایت کاری کا انعام سعید احمد (کہاں ہے) کو دیا گیا۔ چیرمین ڈاکٹر اے ملک منشی نے انعامات تقسیم کیے موصوف نے اپنی تقریر میں اردو ڈراموں کی ترویج و ترقی اور اردو علاقے میں ایک اپنے ہال کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی (جائنٹ سکریٹری اکادمی) نے اردو اکادمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور ڈراموں کا جائزہ پیش کیا۔

پٹنہ کی سڑکوں کے نام اردو میں

پٹنہ۔ وزیر مملکت جناب بندیشور شنکر سنگھ نے ریاستی کونسل میں کہا کہ پٹنہ میونسپل کارپوریشن علاقے کی سڑکوں کا نام ہندی کے ساتھ اردو میں لکھنے کی بابت پٹنہ میونسپل کارپوریشن کو ضروری ہدایت جاری کر دی گئی ہے۔ وزیر موصوف کانگریس (آئی) ممبر جناب ہردیو نرائن سنگھ کے

سوال کا جواب دے رہے تھے

خدابخش ایوارڈ کے لیے ٹاٹا اور حکومتِ بہار کا ایک ایک لاکھ کا عطیہ

پٹنہ۔ (ڈاک سے) ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے خدا بخش ایوارڈ فنڈ کے لیے ایک لاکھ روپے عطیہ دینا منظور کیا ہے اس سے قبل حکومت بہار نے اس فنڈ میں ایک لاکھ روپے کا عطیہ دینے کا اعلان کیا تھا جو موصول ہو گیا ہے۔ ہندستان کے تمام اہم صنعت کاروں اور خیر خواہ صاحبان سے عطیات کے لیے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ عطیات کی یہ رقم جلد ہی اپنا دس لاکھ کا نشانہ پورا کر لے گی اور لائبریری اس سال کے آخر میں اپنے پہلے ایوارڈ کا اعلان کر سکے گی۔

خدا بخش ایوارڈ ہر سال ایک زر خطیر کے ساتھ جنوبی ایشیائی، مغربی ایشیائی اور وسط ایشیائی مطالعات، فارسی، عربی، اردو ادبیات، علوم اسلامیہ، طب، تصوف، تقابل مذہب اور ہندستان کی مشترکہ تہذیب و تاریخ کے ممتاز فاضلوں کو دیے جائیں گے جنھوں نے اس میدان میں کوئی اہم کام کیا ہے۔

ناسخ اور منشی نول کشور کی یاد

"ہم صدائے لکھنؤ" نام کی ایک مقامی ادبی اور ثقافتی انجمن نے جس کے اغراض و مقاصد میں لکھنؤ کے مرحوم اردو ہندی شاعروں کی یادگاریں محفوظ رکھنا، ان کی قبروں پر یا جن مکانوں میں وہ رہتے تھے ان کے باہر دیوار پر سنگ مرمر کی تختی نصب کر کے اس پر ان کے مختصر حالات زندگی کندہ کرا دینا، ان کی یاد میں جلسوں کا اہتمام کرنا، ان کے حالات ان کی شخصیت اور شاعری پر کتابچے شائع کرنا، لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کو زندہ رکھنا شامل ہیں۔ اردو کے نامور شاعر اور استاد شیخ امام بخش ناسخ اور عربی، فارسی، اردو، ہندی کے سب سے بڑے پبلشر منشی نول کشور کی یاد میں دو جلسے کیے۔ پہلا جلسہ سرائے ہرن پارک چوک لکھنؤ میں میجر جنرل عنایت حبیب اللہ کی زیر صدارت دن کو گیارہ بجے منعقد ہوا۔ ناسخ اسی پارک کے قریب محلہ ٹکسال میں اپنے خرید کردہ ایک مکان میں رہتے تھے اور اسی مکان کی ایک کوٹھری میں دفن ہیں اب اس مکان کے مالک حاجی ستار بخش صاحب ہیں۔ جلسہ شروع ہونے پر سب سے پہلے اس مکان کے باہری دروازے سے متصل دیوار پر جناب ظفر نقوی وزیر جنگلات حکومت اترپردیش نے ہندی اور اردو میں سنگ مرمر کے دو کتبے نصب کیے جن پر ناسخ کے مختصر حالات کندہ تھے۔ اس کے بعد پروفیسر ولی الحق انصاری، ڈاکٹر انیس اشفاق، جناب امرت لال ناگر اور جناب سریندر موہن آئی اے ایس سکریٹری حکومت یو۔ پی اور میجر جنرل حبیب اللہ نے تقریریں کیں جناب ظفر علی نقوی نے اپنی تقریر کے دوران اعلان کیا کہ آج سے سرائے ہرن پارک کا نام ناسخ پارک رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رمیش چندر شرما ڈائرکٹر ریاستی میوزیم لکھنؤ نے شکریہ ادا کیا۔ جلسے میں ناسخ پر ایک ہندی اردو فولڈر بھی تقسیم کیا گیا۔

ہم صدائے لکھنؤ کے زیر اہتمام دوسرا جلسہ منشی نول کشور کی کوٹھی پر جناب نیاز حسن خاں اسپیکر یو۔ پی اسمبلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے جناب نیاز حسن خاں نے کوٹھی کے پھاٹک پر ہندی اور اردو میں سنگ مرمر کا ایک کتبہ نصب کیا جس پر منشی نول کشور کے مختصر حالات درج تھے۔ اس کے بعد جلسہ گاہ میں جناب نیاز حسن خاں نے منشی نول کشور کی تصویر کی گل پوشی کی اور لوک آیکت یو۔ پی جناب مرزا مرتضیٰ حسین نے ہندی اور اردو میں چھپے ہوئے اس فولڈر کی رسم اجرا ادا کی جس میں منشی نول کشور کی حیات اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی تھی اس موقع پر مرزا مرتضیٰ حسین صاحب کے علاوہ سریندر موہن صاحب راجا محمود آباد امیر محمد خاں صاحب، جناب نیاز حسن خاں، رانی لیلا رام کمار بھارگو اور ڈاکٹر رمیش چندر شرما نے تقریریں کیں اور صباح الدین عمر صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

اترپردیش اردو اکادمی کی طرف سے ۱۰۹ کتابوں کو ایک لاکھ ستائیس ہزار کے انعامات

لکھنؤ۔ (ڈاک سے) اترپردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے ۱۹۸۵ء میں پہلی بار شائع شدہ اردو کتابوں پر تقریباً ایک لاکھ ستائیس ہزار پانچ سو روپے کے مختلف انعامات دیے جانے کا فیصلہ کیا ہے جن میں کاتبوں / ناشروں اور لیتھو پریس کے انعامات بھی شامل ہیں۔

اترپردیش اردو اکادمی نے مجموعی ادبی خدمات پر دس دس ہزار روپے کے مقررہ دو انعامات کے ساتھ اس سال ایک اور خصوصی انعام دس ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا ہے جو پروفیسر محمد حسن سرسا منصب لکھنوی مرحوم (پس از مرگ) اور جناب عمر انصاری کو دیے گئے۔ کتابوں پر تین تین ہزار روپے کے تین انعامات، دو دو ہزار روپے کے سات انعامات، اٹھارہ ڈیڑھ ہزار روپے کے اٹھارہ انعامات، ایک ایک ہزار روپے کے سینتالیس انعامات اور سات سو پچاس روپے کے اڑتیس انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ انعامات کی مجموعی رقم ایک لاکھ ستائیس ہزار پانچ سو روپے ہے۔

علامہ برقؔ کا انتقال

بمبئی ۲۳ اپریل۔ مشہور مزاح گو علامہ برق (ریاض جردلی) بمبئی کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔ وہ ایک عرصے سے بمبئی کے روزنامہ انقلاب اور دیگر روزناموں میں مزاحیہ نظم لکھتے رہے ہیں۔ پسماندگان میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔

دہلی اردو اکادمی کی تشکیلِ نو

نئی دہلی۔ لیفٹیننٹ گورنر ایچ۔ ایل۔ کپور نے دو سال کی مدت کے لیے دہلی اردو اکادمی کی تشکیل نو کی ہے۔ اکادمی مندرجہ ذیل ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر صلاح الدین، انور دہلوی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر کامل قریشی، کنور مہندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، ایس دہلوی، مشکور صدیقی، خواجہ حسن ثانی نظامی، حکیم عبدالحمید، عبیرہ قدوائی، ریحانہ فاروقی، بیگم ذکیہ سافر نظامی اور سید حسین علی جعفری۔

'فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ' معیاری طباعت کا ایوارڈ

نئی دہلی۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے اعلیٰ کتابت و طباعت اور معیاری گیٹ اپ کے لیے سال ۱۹۸۵ء کا ایوارڈ 'فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ' پر دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے شائع کی ہے اور اس کے مرتب انجمن کے جنرل سکریٹری خلیق انجم ہیں۔ ایوارڈ کی رقم ایک ہزار روپے ہے۔

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

اوشا چکرورتی

صغرا عالم

صفیہ منظر

پرویز رحمانی

کہانیاں

نظمیں

غزلیں

جرعات

بساطِ سخن

بازیافت

آثار لفظ لفظ

چہرہ چہرہ یادیں

بہ صورتِ گر

مکتوبات

رفتار

ہارون فراز

بسمل نقشبندی

عقیل گیاوی

ظہیر ناشاد

ساجد حمید

اقبال ہاشمی

رفیق عادل

حبیب سوز

عطاء الرحمٰن طارق

رئیس الدین رئیسی

ع۔ زماں انصاری

شاداب رضی

سبطین اخگر

نگہت منظر

مسعود عابد

اُردو کی ابتدائی تعلیم پر توجّہ دیجیے

اردو زبان کے بارے میں اب کچھ لکھنا اپنے آپ کو مسلسل دہرانا ہی ہے کیوں کہ اس زبان کے بنیادی مسائل پر اتنا کچھ لکھا اور بولا جا چکا ہے کہ سب کچھ اپنی انتہاؤں سے تجاوز کر گیا ہے۔ مسائل تو اپنی جگہ بنے ہوئے ہیں جن میں خود اردو والے الجھ کر رہ گئے ہیں اور مخالف طاقتیں بھی اپنا کام پوری طرح انجام دے رہی ہیں۔ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال ایک ایسا بھیانک آتش فشاں بن گئی ہے کہ اب کیا ہو جائے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اردو زبان کل بھی انتشار و مخالفت کی زد پر تھی، آج کا معاملہ تو کل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود مخالفین اردو نے جو سوچ لیا ہے اُسے درست مانتے ہوئے عمل کر رہے ہیں۔ اردو کے وہ ادارے جنہیں حکومت وقت سے مالی تعاون ملتا ہے ان کے طریقۂ کار میں اردو کا فروغ جن خطوط پر کیا جا رہا ہے اسے ایک صدی میں بھی اردو زبان کی بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا، فیصلے پابند، لوگ پابند، کام پابند سب کچھ اس طرح کہ اردو والے خوش رہیں، آپس میں الجھتے رہیں اور ہر شخص یہ سمجھتا رہے کہ وہ اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس میکانیکی عمل نے اردو کو اس کے دشمنوں سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اس میکانیکی عمل نے اردو والوں کو خوش فہمیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا۔

ہم اردو والے کوشاں ہیں کہ ملک کے بعض صوبوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ پورے ملک میں اردو کو وہ حقوق دیے جائیں جن کی اردو زبان مستحق ہے مگر یہاں تو رسم الخط کے تحفظ کا بھی مسئلہ درپیش ہے یہ مسئلہ زیادہ اہم اور زیادہ سنگین ہے اور یہ کوششیں تیز تر ہیں کہ کسی طرح اردو کا رسم الخط بھی بدل دیا جائے۔ اردو املا میں تبدیلی، اردو کی درسی کتابوں میں شامل کیے جانے والے ہندی الفاظ۔ خود اردو والوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو بہت خاموشی سے اردو کے خلاف کام کر رہا ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم اردو والے بغیر کسی اتحاد و اتفاق کے اردو کے لیے کام کر رہے ہیں اس طرح ہم جس انتشار کی زد پر ہیں اسے ہمارے لیے ناگزیر بنا دیا گیا ہے۔ کوئی سنجیدہ نہیں ہے، حکومت بھی نہیں۔ بہت کچھ کھل کر سامنے آ چکا ہے۔ کیا ہم از سرِ نو اپنے بنیادی مسائل کو سمجھتے ہوئے مجموعی کوششوں کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے؟ کیا اردو اکادمیاں ہمارے بنیادی مسائل حل کر رہی ہیں؟ کیا اب ہمیں عوامی تحریک کی ضرورت پر غور نہیں کرنا ہے؟ کیا پورے ملک کے اردو والے کسی تنظیمی طریقۂ کار کے تحت کام کرنے کی طرف توجہ نہیں دیں گے؟

ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنے رسم الخط کے تحفظ کے لیے کیا ٹھوس اقدامات کیے ہیں۔ ہمارے جو بھی مسائل اور سوالات ہیں، ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس سے قطع نظر ہم تمام اردو والوں کو چاہیے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم پر توجہ دیتے ہوئے اپنے گھروں میں بچوں کو رسم الخط سے روشناس کروائیں۔ آپ کے بچے کسی بھی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں انھیں اردو زبان سے متعارف کروائیے، اپنی روزی روٹی کا تھوڑا سا حصہ اپنی زبان کے لیے بھی دیجیے۔ اپنے حلقۂ احباب کو اردو کی ابتدائی تعلیم کی طرف متوجہ کیجیے۔ وہ لوگ جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں انھیں کچھ وقت ضرور دیجیے۔ یاد رکھیے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں — ابھی اُردو زبان سے محبت کرنے والے لاکھوں کروڑوں لوگ موجود ہیں — اس ملک کی سیاسی جماعتوں اور خود حکومتِ وقت نے یہ محسوس ہی نہیں کیا ہے کہ ہندستان کا سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی توازن و تناسب صرف ہندی زبان سے نہیں بلکہ اردو اور ہندی کو یکساں درجہ دینے سے ہے۔ انھیں دونوں بڑی زبانوں ہی سے ملک کی علاقائی زبانوں کے درمیان رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے، یہ جو فاصلے اُبھر آئے ہیں، خلائیں پیدا ہو گئی ہیں انھیں دور کیا جا سکتا ہے۔ آپ ان حقائق کو محسوس کیجیے — آپ کے اختیار میں یہ تو ہے کہ اپنی زبان اور اس کے رسم الخط کو فروغ دے سکیں، اپنے اطراف میں بیٹھے غیر اردو داں حضرات کو اُردو پڑھائیں۔ یہ بہت آسان کام ہے۔ اپنے گھر کے افراد پر توجہ دیجیے، اپنے عزیز و اقارب پر نظر ڈالیے اور خصوصیت کے ساتھ بچوں کو اردو پڑھائیے۔ مایوسی، بے دلی اور ناامیدی کے احساس کو ختم کیجیے۔ اگر آپ زندہ ہیں تو اپنے ہونے کا ثبوت دیجیے۔

بازیافت
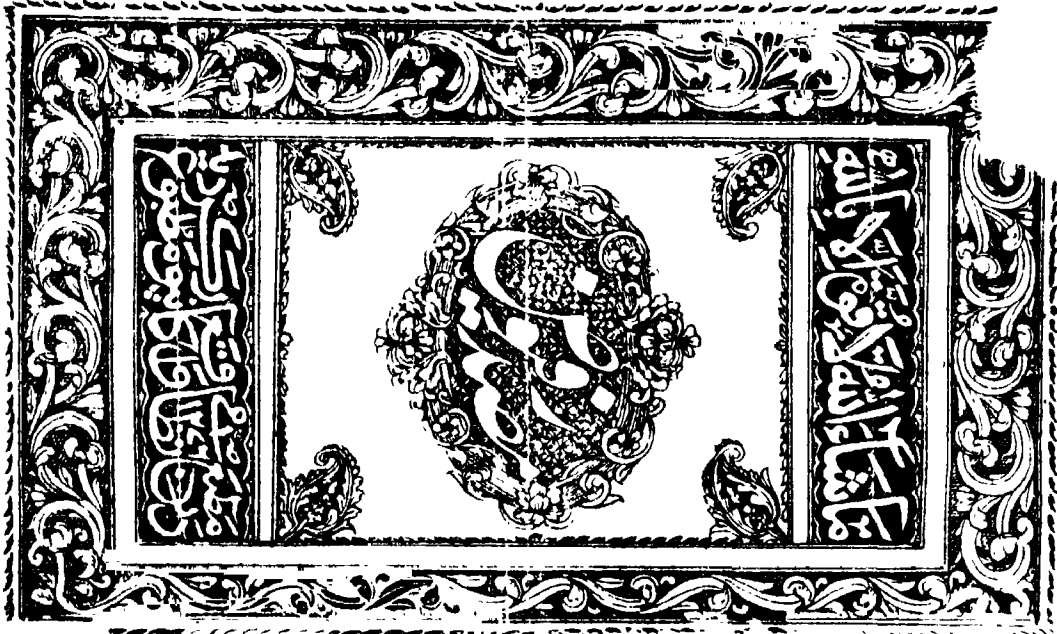
نام گردان	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	متکلم مع الغیر
اثبات فعل حال معروف	می پرورد همی پرورد	می پرورند همی پرورند	می پروری همی پروری	می پرورید همی پرورید	می پرورم همی پرورم	می پروریم همی پروریم
ترجمہ	پالتا ہے وہ	پالتے ہیں وہ	پالتا ہے تو	پالتے ہو تم	پالتا ہوں میں	پالتے ہیں ہم
نفی فعل حال معروف	نمی پرورد	نمی پرورند	نمی پروری	نمی پرورید	نمی پرورم	نمی پروریم
ترجمہ	نہیں پالتا ہے وہ	نہیں پالتے ہیں وہ	نہیں پالتا ہے تو	نہیں پالتے ہو تم	نہیں پالتا ہوں میں	نہیں پالتے ہیں ہم
اثبات فعل حال مجہول	پرورده میشود	پرورده میشوند	پرورده میشوی	پرورده میشوید	پرورده میشوم	پرورده میشویم
ترجمہ	پالا جاتا ہے وہ	پالے جاتے ہیں وہ	پالا جاتا ہے تو	پالے جاتے ہو تم	پالا جاتا ہوں میں	پالے جاتے ہیں ہم
نفی فعل حال مجہول	پرورده نمیشود	پرورده نمیشوند	پرورده نمیشوی	پرورده نمیشوید	پرورده نمیشوم	پرورده نمیشویم
ترجمہ	نہیں پالا جاتا ہے وہ	نہیں پالے جاتے ہیں وہ	نہیں پالا جاتا ہے تو	نہیں پالے جاتے ہو تم	نہیں پالا جاتا ہوں میں	نہیں پالے جاتے ہیں ہم

مصدر فیوض تالیف نذیر الدین حسن شائق قرشی ہاشمی ابن شاہ غلام محی الدین ادیب۔ مقام تصنیف دہلی۔ مطبوعہ ۲ رجب المرجب ۱۲۷۶ھ مطبع نظامی کانپور، سائز ۱۰" × ۶"، کل صفحات ۸۰۔ جداول کی تعداد ۷۱۔ کتاب کے نام "مصدر فیوض" کے اعداد ۱۲۳۰ ہوتے ہیں جسے مصنف نے کتاب کے آخر میں نظم کیا ہے۔

ہزار شکر ہوا مصدر فیوض تمام خدا کرے کہ یہ ہو مصدر فیوض انام
۱۲۳۰

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا زمانۂ تصنیف ۱۲۳۰ھ ہوگا اور اس کی طباعت کی نوبت ۱۲۷۶ھ میں آئی ہوگی۔ ممکن ہے کہ اس سے قبل بھی اس کتاب کے ایڈیشن شائع ہو چکے ہوں۔ زیرِ نظر نسخے میں ایڈیشن کا کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا کہنا مشکل ہے کہ یہ طبع اول ہے یا طبع ثانی۔

یہ صورت گر

بلراج ورما | محمد مشتاق شارق | کرشن ادیب

حمید سہروردی | راہی قریشی | اوم کرشن راحت

م ناگ | قاسم خورشید | سیف الرحمٰن عباد

چہرہ چہرہ یاد ہیں
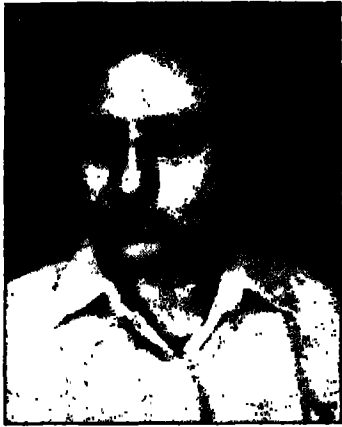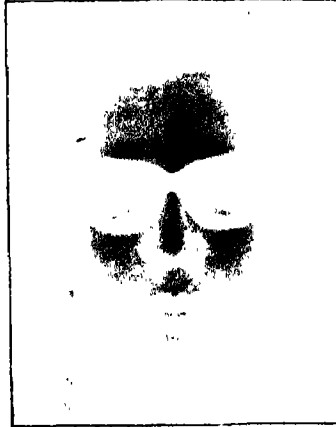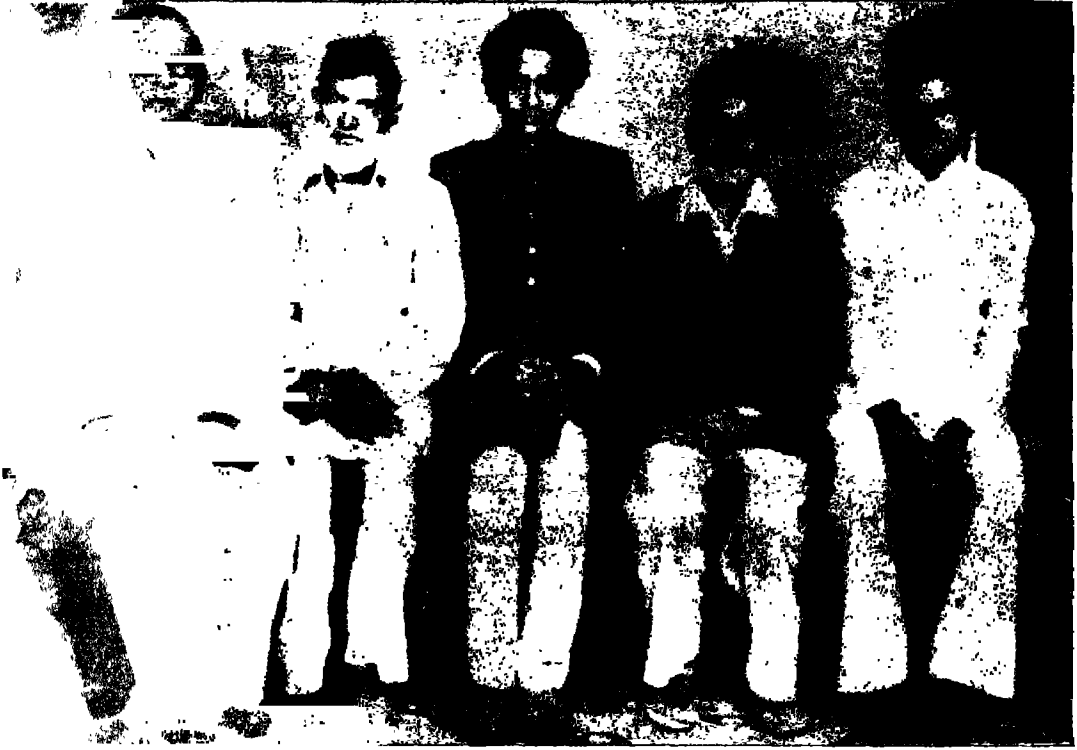
● دائیں سے بائیں ——————

(۱) عبدالقادر قیصر اندوری [پ : ۱۹۰۵ اندور ـ م : ۹ ارمارچ ۱۹۸۵ء اندور] تلمیذ ماہر کانپوری اور عتیق اللہ خاں واثق ٹونکی "قصرِ سخن" [شعری مجموعہ]

(۲) عبدالرؤف نشتر اندوری [پ : ۱۹۰۱ اندور ـ م : ۶ راکتوبر ۱۹۸۳ء اندور]
تلمیذ : مسکین اکبرآبادی، ماسٹر محمود اندوری ، عدیل بجنوری کئی گلدستے شائع ہوئے اور بعد از مرگ ایک سوونیر شائع ہوا

(۳) محمد خالد عابدی ـ

(۴) حافظ عبدالستار ساغر چشتی اجینی [پ : ۲ راکتوبر ۱۹۰۴ء اجین ـ م : یکم مئی ۱۹۸۳ء اندور] دردِ ساغر [شعری مجموعہ] متاعِ ساغر [زیرِ طبع]

(۵) غلام معین الدین صادق اندوری [پ : ۵ ۲ راکتوبر ۱۹۱۷ء اندور ـ م : ۳۱ رجنوری ۱۹۸۶ء اندور] تلمیذ محمد علی خاں شائق گلشن آبادی ، پنڈت پربھو دیال مشر عاشق لکھنوی نرشید [غزلیات] نقوشِ خاموش [نظمیں]

[بہ شکریہ محمد خالد عابدی
آل انڈیا ریڈیو ـ اندور ـ]

احسان دانش [پ : ۱۹۱۴ء کاندھلہ ضلع مظفر نگر۔ م : ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء لاہور] بنام مولانا خیر بہوروی۔

سید مسعود حسن رضوی بنام مولانا خیر بہوروی [بہ شکریہ جناب اسعار اللہ، علی گڑھ]

مخمور سعیدی

منتظر میری آہٹ کا گھر ہے مرا
کب سے خیمہ سرِ رہ گذر ہے مرا

ہر قدم اک نئی راہ پر ہے مرا
کن دیاروں کی جانب سفر ہے مرا

بار بار اپنی آہٹ پہ خود چونک اٹھوں
میرے رستے کی دیوار، ڈر ہے مرا

رات کی رہ گذر پر اُجالا کہاں؟
اک ستارہ مگر ہم سفر ہے مرا

دشمنی سے کسی کی وہ خائف نہیں
پاسِ اُلفت اسے کس قدر ہے مرا

تم سنوگے تو کہتا چلا جاؤں گا
یوں تو قصہ بہت مختصر ہے مرا

کوئی چاہے نہ چاہے مجھے کیا گلہ؟
یہ تقاضا بس اک شخص پر ہے مرا

چھاؤں میں اپنی پل بھر سلا لوں اُسے
کب سے جاگا ہوا ہم سفر ہے مرا

جا بسوں گا میں مخمورؔ اک دن وہیں
بستیوں سے پرے جو کھنڈر ہے مرا

پت جھڑ کی رُت آئے جائے

جب پت جھڑ کی رت آتی ہے
شاخوں سے پتے گرتے ہیں
کالی پیلی سرد ہوائیں
ان کو اُڑا کر لے جاتی ہیں
سوکھے پتے کھو جاتے ہیں
دشتِ فنا کی پہنائی میں

پیڑ مگر زندہ رہتا ہے
رس، پندارِ نمو کا پھر بھی
ویسی ہی نرمی گرمی سے
پیڑ کی شاخوں میں بہتا ہے
رس کی بوندیں کومل کومل
پھوٹ نکلتی ہیں شاخوں سے
پھر تر و تازہ پتے بن کر
کونپل کونپل

رس پندارِ نمو کا جب تک
پیڑ کی شاخوں میں لہرائے
پیڑ یونہی سر سبز رہے گا
پت جھڑ کی رُت آئے جائے

بیٹی سیما کی قبر پر

اس خرابے میں زباں کون سمجھتا اس کی
خاک پہ گر کے مری آنکھ کا آنسو چپ ہے

نکہتِ گل کسی زنداں میں مقیّد جیسے
یوں تہِ قبر ترے پیار کی خوشبو چپ ہے

میرے کانوں میں جو رس گھول دیا کرتے تھے
تیری چاندی کی وہ پازیب وہ گھنگرو چپ ہے

ڈس رہا ہے مری نس نس کو طلسماتِ سکوت
کیا ہوا؟ کیوں تری آواز کا جادو چپ ہے؟

کہیں یہ رسمِ ملاقات تو دیکھی نہ سُنی
تجھ سے ملنے کو میں آیا ہوں مگر تو چپ ہے

ھائکو

ادا جعفری

سہارے

بس اک جھلک سی چاند کی
اور اک سہانے گیت کی مدھر سی لَے
طویل رات کٹ گئی

بازگشت

ہواؤں کی سرگوشیاں
اور بنفشے کے پھولوں پہ تحریر نقشِ قدم
اتنی آباد تنہائیاں

یقین

میں فصلِ گل میں تمہیں ملوں گی
جو پھول کھلنے میں دیر ہوگی تو اپنی آنکھیں
قبائے فردا پہ ٹانک دوں گی

دامانِ بہار

تتلیاں تو آج بھی آنگن میں ہیں
اور مرے آنگن کی ہر خوشبو پرائے دیس میں
پھول سی یادیں مرے دامن میں ہیں

دردِ مشترک

دن خزاں کی ہواؤں کے ہیں
اپنے ساجھے دنوں میں بھی تنہا رہی
شاخِ گل اور میں

ناپذیرائی

گھر کے دھندوں میں رہی
شاخِ گل تکتی رہی مجھ کو دریچے سے لگی
اور مجھے فرصت نہ تھی

احترام

بصد شوق پذیرائی
بہت بے اختیار آئی ہے لیکن خیمۂ گل تک
صبا آہستہ گام آئی

رازداں

گمبھیر خامشی میں
میں اور یہ رات دونوں ہیں کس قدر اکیلے
کاتک کی چاندنی میں

ہم راز

بھیگی بھیگی رین
برکھا رت کو یا آکاش کے تارے جانیں
یا میرے دو نین

دُعا

یہ سانحہ کبھو نہ ہو
کہ میں نمازِ ہجر پڑھ سکوں
اور آنکھ باوضو نہ ہو

مشورہ

دل کو سہج سہج سمجھاؤ

گیلی شاخ دھواں دیتی ہے
غم کو دھیرے دھیرے برتو

بے نام موسم

بارش کا پہلا چھینٹا تھا
اب تو اس موسم کو صدیاں بیتیں
پلکیں اب تک گیلی ہیں

اُس دن

اس دن آنچل دھانی تھا
اب ریت کے تلنے ہالنے سے اک چادر بن کا اوڑھی ہے
وہ پہلا روپ کہانی تھا

اُجالے

ابھی تو چمکا ہے پہلا تارا
ابھی تو روشن ہیں حرف تتے کہ لکھ رہی ہوں
میں صبحِ فردا کا گوشوارہ

گھٹا

سرمئی آسماں
منتظر منتظر سی زمیں
خوش گماں بد گماں

التماس

نہیں، رُکو نہیں
یہ سارے خواب تتلیوں سے ہیں
انھیں چھوؤ نہیں

آئینے

یا صبحِ ازل ہی اب تک ہے
یا پھول کے اجلے آنچل میں اک حرفِ دعا سا موتی ہے
یا ماں کی گود میں بالک ہے

۹/۸/۲۳۴، بلاک ۶، پی ای سی ایچ سوسائٹی۔ کراچی۔ ۱۲۹، پاکستان

حمید الماس

(۱)
یوں رسیلے پھل دکھائی دے رہے ہیں
آئینے میں
منجمد ہوں عکس جیسے سامنے

(۲) قتل ہوتے ہیں
پہاڑوں میں

(۳) ہمارے روز و شب
میرے گھر آتا ہے سورج
شام کو
سر چھپانے کے لئے

(۴) کس نے دیکھی ہے مقدر کی کتاب
سب کے سب ہیں

(۵) زلف فردا کے اسیر
کھو چکی ہے معنی و مفہوم
میری روشنی
زیر سایہ ہیں حواس

(۶) بادلوں میں قید ہے
سورج

(۷) خلا میں پھنس گئی ہیں تتلیاں
میری آنکھیں
تک رہی ہیں چاند کو
ریزہ ریزہ ہو رہی ہے سب زمیں

(۸) کس کو سمجھوں معتبر
کس طرح آگے بڑھوں

(۹) راستے کیا کیا سناتے ہیں مجھے
یوں نظر آتی نہ تھی
دنیا حسیں
کیا یہی ہیں لمحہ ہائے آخر بر

(۱۰)
اس کے مستقبل کی بنیادوں میں
کتنے اَن گنت معصوم لوگوں کی
مقدس خاک ہے

(۱۱) وہ اکیلی جا رہی تھی
رات میں

(۱۲)
اس کے سائے سے ٹپکتا تھا لہو
اشرفی کی دھن میں
کوئی
زرد کرنوں کو چرا کر لے گیا

(۱۳) شہد سے لبریز ہے بوتل مگر
پھنس گئی ہے اس میں
بچاری مکس

(۱۴)
خشک پتے ہیں رہ گذاروں پہ
لوگ روتے ہوئے گذرتے ہیں
کر رہے ہیں درخت سرگوشی

(۱۵) سب جلالیں اپنی اپنی کشتیاں
گریہ زن ہے

(۱۶) آب دریا ہر طرف
کاٹتی ہیں
نارسیدہ خواہشیں
خشک پتوں کی طرح

(۱۷) دامنِ کوہسار میں
چہچہاتا ہے پرندہ

(۱۸) گونجتی ہے سب کے سینوں میں صدا
گھٹ رہا ہے
حلقۂ سیارگاں
چاند ہی ناداں ہے

(۱۹) مرتے مرتے بھی ہوئے ہیں
زندگانی سے

(۲۰) نئے قول و قرار
صف بہ صف
آئیں جو کرنیں
ہو گئے آنکھوں سے اوجھل راستے

(۲۱) اس کے سارے حوصلے
برف کی تہ سے
چیک کر رہ گئے

(۲۲)
آرہا ہے مختلف سمتوں سے آوازوں کا شور
بولتا جنگل ہے
گویا زندگی

(۲۳) ہے نگارِ شب پہ
سورج مہرباں

(۲۴) سو گئے ہیں سب چراغ
وہ یقیں سے کہہ رہا ہے
ساری دنیا
اس کی چادر میں سمٹ کر آئے گی

(۲۵) گھر پہ پہنچاتے ہیں آخر
رات میں
تنہا مسافر کو درخت

ٹی/ ۱۳۵۵ ۹۰ واں بلاک، جیانگر (ایسٹ) بنگلور ۵۶۰۰۶۷

ابھیشاپ

بلراج ورما ● ۲۴ ڈی - میور وہار پاکٹ ۳ - دلی ۹۱

یہ عجیب بات ہے کہ تمہارے اپنے دل کی بات یا تمہارے ذہن میں پنپتی ہوئی کوئی ایسی الجھن جس کے اعتراف یا کھلم کھلا اظہار سے تمہیں گریز ہو کوئی دوسرا بلا جھجک یا اشارتاً ہی کہدے تو تم ایک دم بوکھلا اٹھتے ہو اور اقرار کی بجائے بلا وجہ انکار کرنے لگتے ہو اور وہ بھی کچھ ایسی گرم جوشی سے کہ دوسرا تو حیران ہوتا ہی ہے۔ تم خود بھی بے اطمینانی کا شکار ہونے لگتے ہو۔

شنکر سنگھ مسکرا رہا تھا۔ دیکھتا ہوں پال صاحب آپ کو یہ جگہ کچھ زیادہ ہی بھا گئی ہے۔

جوگندر کو واقعی وہ جگہ پسند تھی مگر اقرار کے بجائے اس نے سر ہلا دیا۔ نہیں برادر ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے پھر قدرے جھجک کر بولا ویسے یہ جگہ خاصی معقول ہے اور سستی بھی۔ چھت سے سمندر کا نظارہ تو ظاہر ہے کہ بھلا لگتا ہی ہے، یہاں کے پنیر اور بینگن آلو کے پکوڑے بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کافی تو ہر مدراسی لک اچھی بنا جانتا ہے مگر اس قسم کے پکوڑے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہونگے ہو سکتا ہے یہ اشیا کسی اور جگہ بھی اسی طرح بنتی ہوں اور شاید نسبتاً بڑھیا بھی بنتی ہوں مگر مجھے اس کا علم نہیں میں اس شہر میں اجنبی ہوں تم لوگ مجھے چار پانچ بجے سے پہلے نہیں چھوڑتے۔ صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک مسلسل بولتے رہنے کے بعد ذہن تو تھکتا ہے۔ زبان بیچاری بھی خشک ہونے لگتی ہے۔ گرم پانی سے غسل کر کے ذرا سستا کر ادھر آنکلتا ہوں۔ بندرگاہ میں کھڑے جہازوں کا منظر مجھے بہت اچھا لگتا ہے ـــــ براڈ وے بطور عارضی رہائش خاصی آرام دہ جگہ ہے مگر وہاں سے نہ سمندر دکھائی دیتا ہے اور نہ وہاں اس قسم کی چیزیں ہی کھانے کو ملتی ہیں۔ کیٹینز کیبن مجھے پسند ہے۔ یہ آٹھ دس منٹ مزے سے گذر جائیں گے۔

شنکر سنگھ مسکرایا۔ لیجئے آپ کی کافی آگئی اور کیبن کی مالکہ بھی جو کافی سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔

یوں پکڑا جانا جوگیندر پال کو اچھا نہ لگا مگر اسے اعتراف کرنا ہی پڑا کہ اس نامانوس ساحلی علاقے کی سب سے دلچسپ شئے میرے لئے یہ محترمہ ہی ہیں۔

شنکر سنگھ نے بتایا کہ سی سی کی مالکہ ایک جہازی کی بیوہ ہیں اور پورے پانچ سال اپنے شوہر کے ہمراہ دنیا کی مختلف بندرگاہوں میں گھومی پھری ہیں ظاہر ہے کہ کیپٹن البرٹ کوئی بڑا دلچسپ آدمی تھا براڈ وے کے سامنے اندر دھنش کی ساتویں منزل پر ان کا تین بیڈ روم کا فلیٹ ہے۔ جہاں وہ اپنے بیٹے اور تاسس کے ساتھ رہتی ہیں۔ بہت کم گو ہیں مگر جب کبھی کوئی پرانا شناسا جہازی اس بندرگاہ پر رکتا ہے تو اس کی صحبت میں چند روز خاصی زندہ دلی سے گذارتی ہیں۔ جہازیوں کے علاوہ وہ دوسرے کسی مرد سے بات نہیں کرتیں۔ سی سی کا مینجر جیمز کسی زمانے میں ان کے شوہر کے ساتھ بطور چیف سٹوارٹ سیل کیا کرتا تھا۔ بڑا اچھا آدمی ہے۔ مالکہ کا بڑا احترام کرتا ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا گاہک ہو مجال ہے جو اسے کبھی بھولے سے بھی مڑ کونے والی وہ سیٹ (جو مستقل طور پر مسز البرٹ کے لئے ریزرو رہتی ہے) آفر کرے۔

پال صاحب بولے میں نے انہیں ایک دو بار کافی پیتے تو دیکھا ہے مگر کچھ کھاتے کبھی نہیں، بس بیٹھی بیٹھی دس بیس سگریٹ پھونک کر چلی جاتی ہیں جیسے ہی اوپر آتی ہیں جیمز بڑے تپاک سے گڈ ایوننگ کہتا ہے اور گولڈ فلیک کی ایک نئی ڈبیا اور جہاز مارکہ ماچس ان کے میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی محترمہ کے لبوں سے کبھی کوئی کلمہ نہیں سنا۔ ماسوائے ایک خفیف سی زیر لب مسکراہٹ کے انہوں

نے بیچارے جیمز کی گڈ ایوننگ کا بھی کبھی کوئی جواب نہیں دیا. مگر جیمز مطمئن ہے. گویا یہی اس کے لئے بہت ہو۔ وہ ان کی کافی رکھنے بھی خود ہی آتا ہے کسی بیرے کے ہاتھ کبھی نہیں بھجواتا۔ وہ کافی کے ایک دو سپ کبھی لے لیتی ہیں. کبھی پیالہ کو ویسے ہی پڑا رہنے دیتی ہیں

کیا عورت ہے شنکر سنگھ مسکرایا۔ لفظ کے اصلی معنوں میں حسین۔ جوانی کے اولین دور میں تو ظاہر ہے کہ ایکدم قاتلہ رہی ہوں گی.

پال صاحب نے مسز ایلبرٹ کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا. آپ نے کبھی غور کیا ہے. یہ ہمیشہ کالے لباس میں ملبوس رہتی ہیں. کبھی کالے سکرٹ بلاؤز میں تو کبھی کالی ساڑی میں. میں انہیں دس دن سے بدستور اسی رنگ کے لباس میں دیکھ رہا ہوں.

شنکر سنگھ مسکرایا. اس ماتمی ملبوس میں بھی وہ کرسچین ڈرا ہر کے کسی بڑے ماڈل ایسی من موہک لگتی ہیں. جوگیندر پال جیسے خود اپنے آپ سے ہمکلام ہوں. دھیرے سے بولے۔ وہ ہر روز اپنی منتخب کرسی پر بیٹھی بندرگاہ میں کھڑے جہازوں کو ایک ٹک دیکھتی رہتی ہیں. اور یہ شغل تب تک جاری رہتا ہے جب تک شام کے سائے ان جہازوں کو انسانی نگاہوں سے اوجھل نہیں کر دیتے. شام کا گزارنا میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ وہ دن بھر کیا کرتی ہیں یہ جاننے کا اشتیاق دن بدن بڑھتا جا رہا ہے مگر جانکاری کسی طرح ممکن دکھائی نہیں دیتی۔

وہ اتوار کا دن تھا. یعنی روزمرہ سے چھٹی کا دن. ہر چھٹی کے دن کی طرح آج بھی فرم کے منتظمین نے اس کی سیر و تفریح کیلئے سٹاف کار بھجوا دی تھی. آج کا دن اس نے میرینا بیچ پر گذارنے کا طے کیا. درجن بھر سینڈ وچز، کرافٹ پنیر کا ایک بڑا پیکٹ کئی موسمی پھل اور لبالب بھری تھرموس میں عمدہ کافی ڈلوا کر وہ چل دیا. یہ سب اہتمام بھی کمپنی کے طرف سے تھا. اپنی کنسلٹنسی کے دس سالوں میں اس قسم کا اہتمام اس کے تجربہ میں نہ آیا تھا. یہ مدراسی خود بھی کام کرتے ہیں اور کام لینا بھی جانتے ہیں۔

بیچ خوبصورت تھی۔ صاف شفاف تھی، مگر رونق کہیں نہ تھی. چند یورپی مرد عورتوں سے اور ناریل کا پانی فروخت کرنے والوں کے علاوہ کوئی مقامی چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ حیرت تھی کہ اس شہر کے لوگوں میں خوبصورتی کی حس اس قدر کم تھی۔ اس قسم کی بیچ شمال میں ہوتی تو لوگوں کے میلے لگ جاتے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک پانچ چھ سالہ بچے کو ہاتھ پھیلائے اپنی طرف آتے دیکھا. بچہ اکیلا تھا اور بڑی تیزی سے بھاگا آ رہا تھا۔ پال کے پاس آتے ہی اس کی ٹانگوں سے چمٹ کر انکل انکل پکارنے لگا۔ بڑا ہی پیارا گول مٹول بچہ تھا۔ پال نے اسے اٹھا کر چھاتی سے چمٹا لیا.

تمہارا نام کیا ہے بے بی .

ہم بے بی نہیں اونا ہیں۔ بے بی گندی ہے. ہم اچھے ہیں، ہم اچھے ہیں نہ انکل ۔!

تم بہت اچھے ہو۔ مگر بے بی کہاں ہے ؟

بے بی سو رہی ہے. ہم دن کو کبھی نہیں سوتے. ہم اچھے ہیں. ہم اچھے ہیں نہ انکل .

تم بہت اچھے ہو. تمہارے پاپا کہاں ہیں ؟

پاپا سی کیپٹن ہیں. پانی میں رہتے ہیں. ہمارے پاس کبھی نہیں آتے بڑے گندے ہیں، پاپا گندے ہیں نہ انکل. ہم اچھے ہیں. بہت اچھے ہم پانی میں کبھی نہیں جاتے ۔!

ارے بھئی آپ تو بہت ہی اچھے ہو اوناجی ۔!

اوناجی نہیں اوناسس. ہمارا نام ممی نے رکھا ہے. ممی بڑی اچھی ہے وہ دیکھو. وہ ننگی عورت جو گیلی ریت پر لیٹی ہوئی ہے. وہی ہماری ممی ہے. آپ اچھے ہیں جمی انکل بھی بہت اچھے ہیں مگر آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے.

ہم ضرور آئیں گے. تم بلاؤ گے تو ہم ضرور آئیں گے.

جمی انکل ممی سے ڈرتے ہیں. ممی ہر روز ہمیں جمی انکل کیساتھ گھومنے بھیج دیتی ہے. مگر جمی انکل کو گھر کبھی نہیں بلاتی. ممی سے سب ڈرتے ہیں. ممی کے پاس پستول ہے. پستول سے مر جاتے ہیں نہ انکل مجھے بھی ممی سے بہت ڈر لگتا ہے۔

اونا ۔ کسی نے پیچھے سے پکارا.

یہ جمی انکل جمی انکل چلاتا پال کی گود سے پھسل کر بھاگ گیا. اس نے دیکھا کہ بچہ جیمز سے نہ صرف مانوس ہے بلکہ بے حد پیار کرتا ہے.

تم انکل کے کپڑے خراب کر دو گے. گندے بچے. یہ مسز ایلبرٹ تھیں بکینی میں ملبوس مگر جسم کو ہاؤس کوٹ سے ڈھانپے. سینڈل ہاتھ میں لئے نہ جانے کب وہ پال کے اتنے قریب آکھڑی ہوئی تھیں۔

اوناٹرا پیارا بچہ ہے۔"

"اوناسس اس کا نام اوناسس ہے۔" محترمہ نے بتایا۔ یہ پہلا موقع تھا جب پال نے ان کی آواز سنی۔ آواز میں نرمی تھی نغمگی تھی اور ایک عجیب قسم کا عامیانہ وقار تھا۔ جیمز کی طرف مخاطب ہو کر محترمہ نے پوچھا "کار کو کیا ہوا برادر؟"

"شام کا وعدہ ہے میم صاحبہ۔ آپ کو جلدی ہو تو ٹیکسی لے آؤں۔"

پال کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "ہمارے پاس گاڑی ہے ہم آپ کو گھر چھوڑ دیں گے۔"

"کیا آپ یہیں تک آئے تھے؟"

"جی نہیں گھومنے نکلا تھا۔ کسی خاص جگہ جانے کا پروگرام نہیں تھا۔ بس آوارگی۔ سوچا تھا اس بڑے شہر کے گردونواح کو دیکھا جائے۔ میں یہاں قطعی اجنبی ہوں۔"

"آپ کو زحمت نہ ہو تو ہمیں بازار تک چھوڑ دیں۔"

جیمز اور اوناسس آگے اور وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔

"آپ جی آر کے میں ملازم ہیں۔؟"

"جی میں ان کا کنسلٹنٹ ہوں۔ ان کی فیکٹری میں ہماری مشین انسٹال کی جا رہی ہے۔ ہفتہ میں چھ دن صبح آٹھ بجے سے شام پانچ بجے تک نئی مشینری کی انسٹالیشن میں مصروف رہتا ہوں اور اتوار کو وہ لوگ میری تفریح کیلئے سٹاف کار بھجوا دیتے ہیں۔"

"آپ ہوٹل براڈوے میں ٹھہرے ہیں نہ۔"

"جی ہاں ساتویں منزل کے کمرہ نمبر ۸ میں آپ کے فلیٹ کے بالکل سامنے۔"

"تو گویا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"جی ہاں کچھ کچھ"

"اوہو!" محترمہ مسکرائیں۔ بڑی کھلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

"آپ کھانا کہاں کھاتے ہیں؟ جہاں تک میری نالج ہے اوبرائے صاحب کے ہوٹل میں لنچ اور ڈنر کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ کچھ عجیب سا انتظام ہے ان کا۔"

"مجھے یہ انتظام پسند ہے۔ میں رات کو کھانا نہیں لیتا۔ آپ کے سو سی میں ضرورت کے مطابق شام کو کچھ لے لیتا ہوں۔ دوپہر کا کھانا فیکٹری میں کھاتا ہوں۔ خاصا اچھا کھانا ہوتا ہے وہاں۔"

"جانتی ہوں جی آر کے۔ بہت اچھی پارٹی ہے۔" پھر کچھ رک کر بولیں

"آپ کھانے کے معاملے میں خاصے محتاط ہیں۔ جبھی اپنے جسم کو اس قدر سنبھالے ہوئے ہیں۔"

پال مسکرایا۔ "ہم کوئی ایسے ادھیڑ بھی نہیں ہیں"

"چالیس سال کا آدمی بھرپور جوان ہوتا ہے۔ نظر بد دور۔ دیکھنے میں تو آپ مجھ سے بھی کم عمر لگتے ہیں۔"

"آپ نے میری عمر کا اندازہ بالکل ٹھیک لگایا ہے۔ مگر آپ تو ماشاء اللہ بمشکل پچیس چھبیس کی ہوں گی۔"

"عورت کی عمر کا تخمینہ نہیں لگایا کرتے۔ ویسے میں آج کے دن پورے ستائیس کی ہو گئی ہوں۔"

جیمز نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "آج ڈیڈی کا جنم دن ہے آج کے دن ڈیڈی دن بھر گھوما کرتی ہیں مگر کم بخت کار کو آج ہی خراب ہونا تھا۔"

"میں گاڑی کے پیچھے بیٹھ کر گھومنے کو گھومنا نہیں کہتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی دوسرا اپنی مرضی سے پہلے ہی سے طے شدہ راستوں پر آپ کو گھما رہا ہے"

ڈرائیور نے انڈین کافی بورڈ کے مقامی کافی ہاؤس کے سامنے گاڑی روک دی۔

گاڑی رک گئی تو جیمز بولا "بابا سو گیا ہے۔ آج بہت ادھم مچایا ہے اس نے بہت تھک گیا لگتا ہے۔ آپ کہیں تو اسے گھر لے جاؤں"

"لے جانا برادر۔ مگر ایک پیالہ کافی تو پلوا دو۔ میں اس لباس میں اندر تو جا نہیں سکتی۔" جیمز اور ڈرائیور جا کر کافی لے آئے۔ ڈرائیور بڑی ہی عاجزی اور انکساری سے بولا۔ "میم صاحب خود گاڑی چلا لیں تو میں اپنے ایک نجی کام سے نپٹ لوں۔ شام کو ہوٹل پہنچ جاؤں گا"

ظاہر تھا کہ ڈرائیور کی اس درخواست کا سمجھاؤ جیمز ہی نے اسے دیا تھا۔ محترمہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جیمز نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکا اور بابا اور ڈرائیور کو لیکر بغیر کسی مزید تمہید کے چلدیا۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے اور گاڑی چل رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کوئی خاص جگہ آ جاتی تو محترمہ پال کو بتا دیتیں۔ مگر بغیر کسی قسم کی گرمجوشی کے جیسے کوئی کہنہ مشق ریڈیو اناؤنسر خبریں سناتا ہے اور بڑے سے بڑے حادثہ کا ذکر بھی ایسے کر جاتا ہے جیسے دوسری عام خبروں کی طرح وہ بھی محض ایک خبر ہے ——

اچانک پال کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کچھ یاد آیا؟"

"جی ہاں کلارک"

"کلارک؟ آپ کلارک کو جانتے ہیں؟"

"دیکھا نہیں بس سنا ہے۔"

"کلارک گاتا بھی ہے؟ میں تو اسے ایک کیبرے ڈانسر کے طور ہی جانتی ہوں۔ آج کل لوکل فلمی سٹوڈیوز میں بھی اس کی بہت مانگ ہے۔ فلموں میں کیبرے ڈانس کمپوز کرتا کلب میں چند لوگوں کے سامنے ٹھمکنے سے کہیں بہتر ہے۔ کبھی وہ ایلبرٹ یعنی میرے شوہر کا ماتحت ہوا کرتا تھا۔ ڈانس کے شوق نے اسے پروفیشنل بنا دیا ہے۔ آجکل بہت کماتا ہے۔"

"میں بی بی سی والے کلارک کی بات کر رہا تھا۔ جو دنیا کے بڑے سے بڑے حادثہ کا ذکر بھی ایسے کرتا ہے جیسے روزمرہ ایسی بات ہو آپ بھی ہر عظیم عمارت کا نام ایسے لیتی ہیں جیسے وہ بھی براڈوے یا اندر دھنش جیسی کوئی معمولی عمارت ہو۔"

"آپ براڈوے اور اندر دھنش کو معمولی عمارتیں سمجھتے ہیں؟"

"ایسی ہزاروں عمارتیں اس شہر کے گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔"

ہوں گی مگر جو خاص بات ان دو عمارتوں میں ہے وہ ہر کسی عمارت کو کہاں نصیب ہے۔ مجھے تو کوئی خاص بات دکھائی نہیں دی۔

وہ مسکرائی۔ "آپ اور ہم کیا خاص چیزیں نہیں۔ ایک میں میرا فلیٹ ہے اور دوسری میں آپ کا قیام۔ عارضی سہی مگر ہے تو سنگ و آہن کے یہ مجسمے بے جان ہیں جبکہ براڈوے کا اپنا ایک کردار ہے۔ میرا ایمان ہے کہ براڈوے اندر دھنش اپنے پن کے علاوہ اس شہر کے کسی مندر، مسجد یا کلیسا کا اپنا کوئی کردار نہیں خدا کے یہ گھر ہمارے احترام کی چیزیں ہیں ممکن ہے خدا کو اپنے نام پر بنی ان عمارتوں سے خاص انس ہو۔ مگر خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔"

پال چپ رہا۔ وہ اور سننا چاہتا تھا۔ وہ کھل رہی ہیں یہ اسے بڑا اچھا لگا۔ تھوڑی دیر دونوں چپ رہے۔ پھر محترمہ نے کہا "میرے مرحوم شوہر کا نام بھی کلارک تھا۔ ایلبرٹ کلارک۔ میں اپنے آپ کو مسز کلارک نہیں لکھتی۔ مسز ایلبرٹ لکھتی ہوں۔"

"کلارک تو آپکے شوہر کا ماتحت تھا۔"

"یہی تو۔ آپ بڑے ذہین ہیں۔ خاصی تیزی سے سوچتے ہیں۔"

"آپ کو دیکھ کر کوئی بھی ذی جان اپنے سوچنے کی قوت کھو سکتا ہے۔"

"میں بہت خوبصورت ہوں نہ۔؟"

"میں یہ نہیں کہوں گا۔ خوبصورتی بھی ایک چیز ہے مگر سب سے بڑی چیز کردار ہے۔ آپ ایک کردار ہیں۔ ویسے مجھے اعتراف ہے کہ میرے ملاقاتیوں کے دائرہ میں بہ اعتبار حسن آپ سر فہرست ہیں۔"

"آپ مجھے بگاڑ رہے ہیں۔"

"میں بلا وجہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔"

ہر مرد خوبصورت جھوٹ بولنا اپنا حق سمجھتا ہے، مگر یہ کیا۔ اتنی باتیں ہو گئیں ہمارے درمیان اور میں نے آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔"

"یہ انفرمیشن غیر ضروری ہے۔ بہرحال خاکسار کو مہوگیندر پال کہتے ہیں۔"

"آپ کب تک یہاں رہیں گے۔"

"جب تک ضروری ہوگا۔ ویسے فی الحال دس ہی ہفتے کا پروگرام ہے۔ میرا خیال ہے اتنے دنوں میں جی آر کے والوں کی نئی فیکٹری انسٹال ہو جائے گی کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔"

"جے آر کے کے مستقبل کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے۔"

"وہ اپنی فیلڈ میں یہاں سب سے آگے ہیں۔ نئی مشین لگ جانے کے بعد تو نیشنل سین پر آجائیں گے۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔ میں نے پورا ایک لاکھ ان کی فیکٹری میں انویسٹ کر رکھا ہے۔"

"تب تو مجھے اپنے کام کو اور بھی تیزی سے کرنا چاہئے۔"

"آپ اتنے عرصہ کیلئے ادھر آئے ہیں۔ اپنی فیملی کو ساتھ نہیں لائے؟"

"ماں بوڑھی ہے اور چھوٹے بھائی بہن ابھی طالب علم ہیں۔"

"بیوی بچے؟"

"میں نے شادی نہیں کی۔"

"حیرت ہے۔؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"آپ جیسی صحت شخصیت اور رتبہ۔"

"آپ نے عمر شامل نہیں کی۔ چالیس سال جوانی کا بڑھاپا اور بڑھاپے

کی جوانی ہوتی ہے، آدمی کو وقت پر شادی کر لینی چاہئے جو میں نے نہیں کی۔ اب ظاہر ہے کہ۔ "

" کیا ظاہر ہے ؟ "

" کون دے گا اپنی لڑکی میری عمر کے آدمی کو۔ جب وقت تھا تو میں نے ہمیشہ غلط عورت کو پسند کیا۔ وہ نہیں ملی تو سمجھوتہ نہیں کیا جو اکثر لوگ کر لیتے ہیں۔ "

" آپ کی پسند غلط نہیں ہو سکتی۔ مگر حیرت ہے کہ زندگی کی اتنی طویل راہ میں آپ کو کوئی نہیں ملی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ کوئی عورت آپ کو ناپسند نہیں کر سکتی۔ "

" اگر میں آپ سے شادی کی درخواست کروں ؟ "

" میری بات اور ہے میں بیوہ ہوں اور اپنی بیوگی کی ذمہ دار بھی کلارک نے ہمارے، یعنی میرے اور راوتاسس کے لئے جو کیا اس کے بعد کسی دوسرے سے بیاہ رچانا میرے لئے کفر ہوگا۔ "

" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ "

" یہ ایک لمبی کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گی۔ "

" آپ اپنے کالے لباس میں کسی کیتھولک کانونٹ کی جوگن سی لگتی ہیں "

" میں جوگن نہیں ہوں۔ میں نے بیوگی کا لبادہ ضرور پہنا ہے مگر کلارک میری زندگی میں نہ پہلا آدمی تھا نہ آخری۔ "

" آپ بڑی بے باک اور نڈر ہیں۔ "

" میں بہادر نہیں تو بزدل بھی نہیں ہوں میں نے اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جی ہے اور اسی طرح چلتے چلنے کا ارادہ ہے۔ جب تک کہ اوناسس کسی بڑے جہاز کا کپتان نہیں بن جاتا میں نے کلارک سے وعدہ کیا تھا اور ضرور نبھاؤں گی۔ "

ہم دونوں نے سمندر کے کنارے ایک جگہ رک کر پیٹ بھر کھایا کھانے پینے کے بعد مسز منے بھرپور انگڑائی لی اور وہیں ایک چٹان پر لیٹ گئیں۔ پال نے بھی جمائی لی۔ "نیند آ رہی ہے۔"

" آپ سو جائیں۔ "

" میرے پاس سگریٹ ہیں۔ اور آپ کا کردار۔ آج کا بریف اینکاؤنٹر آپ کی یہ باتیں۔ رنگا رنگ کے اس تانے بانے سے یادوں کی ایک خوبصورت شال بنوں گا۔ اور جب وہ تیار ہو جائے گی تو حفاظت اور قرینے سے تہہ کر کے اسے اپنی روح پر اوڑھ لوں گا تاکہ اس کی گرمی سے آنے والی کتنی ہی خنک اور تنگ و تاریک راتیں کاٹ سکوں۔ "

" آپ کلارک کی طرح کمزور نہیں ہیں۔ کلارک نے ہماری پہلی تفصیلی ملاقات ہی میں مجھے .... " وہ مسکرائیں۔

" میں بھی خاصا کمزور آدمی ہوں۔ میرے جسم کا رواں رواں آپ کے بدن کیلئے تڑپ رہا ہے۔ مگر نہ چور ہوں اور نہ ڈاکو۔ میں نے کبھی کسی عورت کیساتھ زبردستی نہیں کی۔ "

" تو آپ بھی۔ "

" میں ایک صحت مند بیدار مغز اور اپنے اندازے سے کافی معقول قسم کا آدمی ہوں بلا وجہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ "

" میں نے درجنوں عورتوں کے جسمانی تقاضے پورے کیے ہیں مگر اپنی روح کو کبھی داغدار نہیں کیا۔ نہ ہی میں نے کبھی کسی عورت کو اپنے ذہن پر ہی سوار ہونے دیا ہے۔ رہی دل کی بات وہ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں میں نے جس کو چاہا اس نے مجھے نہیں چاہا۔ یہ محض اتفاق ہے۔ محبت کے معاملے میں ہمیشہ ہی سے شہید ناز رہا ہوں۔ میں البتہ یہ بھی نہیں کہوں گا کہ کوئی تیر اتنا چبھا کہ یاد حیات ہو گیا۔ روایتی مجنوؤں کی طرح میں نے یکطرفہ محبت کبھی نہیں کی یک طرفہ چاہت البتہ اکثر کی ہے۔ ایسے جذبات سطحی ہوتے ہیں ان میں دم نہیں ہوتا اور محبت دم اور ثابت قدمی کی طالب ہے۔ جو کہانی تکمیل تک پہنچنے کے اہل نہ ہو اسے یاد بنا کر سجاتے سنوارتے رہنا حماقت ہے۔ مگر میں آپ کو یہ سب کیوں بتا رہا ہوں۔ آپ سو جائیے میری گود میں سو جائیے۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں میں پچھلے دس دنوں سے جیمز کے بکوڑے محض آپ کے دیدار کے لالچ میں کھا رہا ہوں جبکہ تلی ہوئی چیزوں سے مجھے دور کی بھی رغبت نہیں۔ میں کلارک نہیں ہوں گا چاہے آپ کے جسم کی چاہت میرا ذہنی توازن بگاڑ دے۔ "

" آپ نے میرا نام نہیں پوچھا۔ "

" میں نے آپ کی کہانی جاننے پر بھی اصرار نہیں کیا۔ آپ کا نام جان لینا مشکل نہیں نہ ہی آپ کی کہانی۔ مگر میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا مجھے اعتراف ہے کہ آپ جیسی حسین اور ذہین عورت میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ مجھے خوف ہے تو بس اس بات کا کہ میں دوسری عورتوں کی طرح آپ کی یاد کو آسانی سے فراموش نہ کر سکوں گا۔ ابھی ابھی میں نے جس تانے بانے کا ذکر کیا تھا وہ میں نے پہلے کبھی نہیں بنا۔ "

" میرا نام للین ہے۔ للین کلارک۔ آپ مجھے للی کہہ کر پکار سکتے ہیں کلارک مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتے تھے۔ "

" میرے لئے مسز البرٹ ہی کافی ہے۔ اب آپ سو جائیے

"آپ بہت تھک گئی ہیں۔"

لی واقعی سو گئی۔ پال نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ کتنی ہلکی تھی جیسے روئی کی بنی ہوئی۔ وہ نیند سے بیدار ہوئی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ گھڑی پر نظر جماتے ہوئے اس نے شکایت کی۔ "تم نے مجھے جگایا نہیں میں پورے دو گھنٹے مدہوش پڑی رہی۔" لی نے دیکھا کہ سوتے میں اس کا بریزر اپنے آپ کھل گیا تھا۔ اس کی برہنہ چھاتیاں آزاد ہو کر دو ننھے بچوں کی طرح اس کے جسم سے چپٹی سو رہی تھیں۔ اس نے ہاؤس کوٹ سے جسم ڈھک دیا۔

"تم مجھے کب سے دیکھ رہے ہو؟"

"جب سے تم سو رہی تھیں۔"

"تم نے مجھے چھوا تک نہیں!"

"مجھے پھول ڈالی میں سب سے زیادہ اچھے لگتے ہیں، پھولوں کے گلدستے بنا کر گلدان سجانے کی حماقت میں نے کبھی نہیں کی۔ میں نیک نیت آدمی ہوں۔ تم میری حفاظت میں سوئی تھیں۔ میرا فرض تھا کہ تمہاری رکھشا کروں، اپنے آپ سے بھی۔"

"تم جیسے انسان کی کنیز بن کر رہنا بھی فخر کی بات ہے۔ ابھی ابھی تم نے مجھ سے شادی کیلئے کہا تھا۔"

"ضرور کہا تھا اور خدا گواہ ہے کہ دل و جان سے کہا تھا۔ مگر تب مجھے معلوم نہ تھا کہ تم کسی کو اب بھی دل میں رکھے ہوئے ہو اور کسی کو دیئے وعدہ سے بندھی ہو ـــــ میں تمہارا جسم ضرور چاہوں گا۔ مگر تمہاری روح کا بٹوارہ مجھے منظور نہیں۔"

وہ کب آپ سے تم اور تو پر اتر آئے۔ انہیں خود بھی پتہ نہ چلا۔

اوناسس اب بھی باپ کے لوٹنے کا منتظر ہے۔

"بہت پیارا بچہ ہے۔ میں ممتا کے مفہوم کو سمجھتا ہوں۔"

"اسے ماں کے علاوہ باپ کی بھی ضرورت ہے۔"

"اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میں اونا کا باپ بننے کا اہل ہوں تو اپنی درخواست پھر دہراؤں گا۔ میں نہیں چاہوں گا کہ میں اونا کا باپ بنوں اور میرے بیٹے کا مستقبل تمہارا مرحوم شوہر طے کرے۔"

"خیر چھوڑئیے قصہ آئیے کچھ کھا لیں۔ مجھے بھوک لگ آئی ہے۔"

باقی جو کچھ بچا تھا دونوں نے مل کر کھایا۔ تھرموس خالی ہو گیا تو لی نے کہا۔

"آج میرا جنم دن ہے۔"

"جیو ہزار برس اور سو برس کے ہوں دن دس ہزار۔"

اگلے تین دن تک ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر یہ سوچ کر کہ لی نے جان بوجھ کر اپنی شاموں کا معمول ترک کر دیا ہے پال نے کلب میں جانا چھوڑ دیا۔ اگلے تین روز تک وہ بھی اپنے کمرے سے نہ نکلا۔

اتوار کو ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول باہر جانے کیلئے تیار ہو رہا تھا کہ ڈرائیور ایک معمر خادمہ کو ساتھ لے کر آ گیا۔

"میم صاحب بہت بیمار ہیں صاحب۔ آپ کو بلایا ہے۔"

پال نے دروازہ مقفل کیا۔ تو ڈرائیور نے قدرے جھجک کر التجا کی۔ "اگر آپ اجازت دیں صاحب تو کار کی چابی آپ کو دے دوں ـــ میری بیوی بیمار ہے صاحب چھ روز سے ہسپتال میں پڑی ہے۔ میں چھٹی لے سکتا تھا مگر اوور ٹائم مارا جاتا۔ اسی لئے عرضی نہ دی۔ مگر آپ کی مہربانی ہو جائے تو آج کا دن اپنی بڑھیا کے ساتھ گزار آؤں۔"

پال نے بغیر کچھ کہے چابی لے لی اور ڈرائیور کو دس کا نوٹ دے کر کہا۔ "ان کے لئے فروٹ لے جانا۔"

تین بیڈ روم کا وہ فلیٹ ہر لحاظ سے قابل دید تھا۔ قیمتی ساز و سامان سے لدے اس فلیٹ میں لی اپنے بچے کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ یہ جان کر اسے اس عورت کی دلیری پر رشک ہونے لگا۔

"ممی کے پاس پستول ہے۔ پستول سے مر جاتے ہیں نا انکل۔ مجھے ممی سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

خادمہ نے اسے احترام سے سب سے بڑی صوفہ چیئر پر بٹھا دیا۔ "پورے چھ روز تک بیمار رہ کر وہ آج ہی کچھ ٹھیک ہوئی ہیں۔ بابا اپنے جمی انکل کے ساتھ گیا ہوا ہے ـــ چھ دن بعد یہ ان کا پہلا غسل ہوگا۔ ابھی آ جائیں گی۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ وہ سخت بیمار ہیں۔"

"انہوں نے ہی ایسا کہنے کو کہا تھا۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ وہ ان دنوں خاصی بیمار رہی ہیں۔ اتوار کو انہیں غالباً سردی لگ گئی تھی۔ سوموار اور منگل تو وہ تقریباً بے ہوش رہیں۔ کل سے اٹھنا بیٹھنا شروع کیا تھا آج ہی ڈاکٹر نے نہانے کی اجازت دی ہے۔ آپ بیٹھئے میں سبزی ترکاری لینے بازار جاؤں گی۔ وہ ابھی آ جائیں گی۔"

پال پانچ دس منٹ یسے ہی صوفے میں دھنسے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے۔ پھر ادھر ادھر گھومنے لگے۔ عمدہ فرنیچر۔ عمدہ پردے۔ عمدہ قالین سب سے عمدہ فرنیچر ترتیب۔ فلیٹ کی مالکہ بلند مذاقی کا اشتہار تھی۔ پال نے دوسرے کمروں کا طواف کیا۔ کوئی بھی چیز ہندوستانی نہ تھی۔ کچن کا سامان تقریباً سارے کا سارا بیرون ممالک سے اکٹھا کیا ہوا تھا —— جہازیوں کی خصوصیت —— وہ لِلی اور کلارک کی تصویر کے سامنے کھڑا اپنے رقیب کے خد و خال کا معائنہ کر رہا تھا کہ لِلی نے پیچھے سے آ کر اسے اپنی باہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

"تم نے تو مجھے ایک دم ڈرا دیا۔"

"تم ڈرتے بھی ہو۔"

"صرف تم سے۔ مگر یہ کیا صورت بنا رکھی ہے تم نے۔ اتنی بیمار تھیں تو مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔"

"حقدار ہوں کہ نہیں اسی چکر میں الجھی رہی۔ آج تمہاری چھٹی ہے سوچا تمہیں کہوں کہ مجھے بھی گھمانے لے چلو"

"تم آج ہی بیماری سے اٹھی ہو۔ بہت کمزور لگ رہی ہو۔ پال نے لِلی کو بازوؤں میں بھر کر اٹھا لیا۔ تم بڑی ظالم ہو۔ میں نے تین شامیں تمہیں دیکھے بغیر گزاریں اور پھر بے بس جانا ہی چھوڑ دیا۔ سوچا تم شاید اس ایک روز کی تیز رفتاری سے نادم ہو۔"

"مجھے اس روز کار میں بیٹھے بیٹھے ہی بخار محسوس ہونے لگا تھا۔ تم نے مجھے چھوا نہیں تھا۔ ورنہ جان جاتے کہ میرا جسم حرارت پکڑتا جا رہا ہے۔"

کار کی چابی کو میز پر رکھتے ہوئے پال نے کہا۔ آج ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"صرف باتیں؟"

"باتیں بھی اور پیار بھی۔ جتنا اور جس حد تک تم اجازت دو گی۔"

ویسے ہی اٹھائے اٹھائے وہ اسے بیڈ روم میں لے گیا۔

"یہ بیڈ روم کی ڈریسنگ ہے۔"

"میں سیر کے لئے تیار ہو کر نکلا تھا کہ۔"

تو چلو میں بھی سیر کے کپڑے پہن لیتی ہوں۔

اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے کوٹ اتار کر پاس رکھی کرسی پر پھینک دیا۔

"وہ کہاں گیا ہے۔؟"

"شام کو لوٹے گا۔"

"تمہاری خادمہ۔"

"آج چھٹی پر ہے۔ کل صبح ترکاری لے کر آئے گی"

"تو گویا ہم!"

"اکیلے بھی ہیں! اور ہر لحاظ سے آزاد بھی"

"آج میں تمہارے سامنے پورے طور پر برہنہ ہو جانا چاہتی ہوں۔ آج میں تمہیں اپنی آتما بھی ننگی کر کے دکھا دوں گی۔ آج تم میری ساری خوبصورتی اور بدصورتی کو ایک ساتھ دیکھو گے تاکہ فیصلہ کر سکو کہ میں تمہارے کام کی ہوں کہ نہیں۔"

"تم بے حد امیر عورت ہو۔"

"یہ درست ہے۔ مگر یہ سب میرا نہیں۔ کلارک کا تھا۔ اور اب اس کے بیٹے کا ہے۔ میں تو محض محافظ ہوں۔ سب کلارک کے نام تھا اور اب اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے کا ہے۔ جمی کا کیئر ٹیکر کیبن بھی اونا کے نام ہے جمی اسے چلاتا ہے۔ میں نے اس سے کبھی حساب نہیں مانگا۔ وہ کلارک کا وفادار دوست تھا۔ اور آج اس کے بیٹے کا وفادار سرپرست ہے اپنے بھی زیورات اور کپڑوں کے علاوہ یہاں ایسا کچھ بھی نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ جیمز اور کلارک مدتوں ایک ساتھ رہے۔ ایک ہی جہاز پر۔ جمی چیف اسٹوارٹ تھا۔ اور کلارک چیف آفیسر۔ بطور چیف آفیسر یہ کلارک کا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد اسے کیپٹن بننا تھا۔ سب طے تھا۔ اور باقاعدہ اعلان بھی ہو چکا تھا۔ مگر تقدیر کے آگے کب کس کا بس چلا ہے۔"

پال لِلی کی گود میں سر رکھے اس کی کہانی سن رہا تھا۔

"کلارک ہمیشہ دوسرے ممالک کی بڑی بڑی جہازی کمپنیوں میں جاتا تھا اور دس سال کے قلیل عرصہ میں اس نے دس لاکھ روپے جمع کر لئے تھے۔ یہ فلیٹ خرید لیا تھا۔ اور اسے سجا سنوار کر اپنی ضرورت کے مطابق تیار کر دیا تھا۔ وہ تنخواہ کی رقم کبھی خرچ نہ کرتا تھا۔ اپنا بھی گزارہ اور میس کا بل تاش سے نکالتا تھا۔ وہ ہر بار جیتتا تھا۔ اس کے ساتھی اسے گالیاں دیتے۔ مگر پھر اسی کے ساتھ کھیلتے۔ کہاوت ہے کہ "لکی ان کارڈز ان لکی ان لو"۔ یہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ میں نے اس سے شادی کی۔ اس کے بیٹے کی ماں بنی مگر میں اس سے پیار کبھی نہ کر سکی۔ وہ ایک خوبصورت درندہ تھا۔ جسمانی پیار کا ہنر نہ جانے اس نے کہاں سے سیکھا تھا شاید اس قماش کے لوگ۔ مجھے درجنوں بار ذلیل کرنے کے بعد اس نے میرے ساتھ بیاہ رچایا تھا۔ شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ دنیا کی ہر جہاز

پلر سٹیڈ وہ دو چار آوارہ عورتوں سے وابستہ تھا۔ بڑے فخر سے وہ مجھے ان سے متعارف کراتا تھا جیسے میں اس کی سب سے بڑی ٹرافی ہوں۔ "

" مجھے کلارک کی کہانی نہیں سننی" پال یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔

" تم چپ چاپ میرے ساتھ لیٹی رہو۔ میں تمہاری کہانی تم سے نہیں تمہارے سارے بدن سے سننا چاہتا ہوں۔ تمہاری سانسوں کا آواگون۔ تمہارے دل کی دھڑکنیں سننا چاہتا ہوں۔ تمہارے یہ ہونٹ جنہیں اس نے چوسا تو غالباً سیکڑوں بار ہوگا۔ مگر چوما شاید کبھی بھی نہیں۔ اور تمہارے گلابی چہرے کی یہ نیلی جھیلیں جس میں مجھے ساتوں سمندر ایک ساتھ ٹھاٹھیں مارتے دکھائی دیتے ہیں مگر جن کی اچھل کو دہ اس کمبخت نے غالباً کبھی نہ دیکھی تھی۔ تم ایک بھرپور کہانی ہو گی۔ مجھے چند لمحے اس سمندر میں جی لینے دو گی۔ تم نے ورڈز ورتھ کا نام سنا ہے نا؟ کہتے ہیں وہ ایک رات اپنی نظموں کے ایک مجموعے کے پورے معاوضہ سے گلاب کی پتیاں خرید کر ان کے بچھونے پر سو گیا تھا۔ تمہارا جسم گلاب کی پتیوں سے بنا ہے۔ مجھے اس میں کھو جانے دو۔ اس کی مہک میں سو جانے دو۔ "

جب للی نے اسے جھنجوڑ کر جگایا تو دوپہر ہو چلی تھی۔

" اٹھو اندر چائے پی لو۔" للی اب بھی لباس سے آزاد تھی۔

پال نے اسے پھر اٹھا کر ساتھ لٹا لیا۔

کار بیچ پہ پہنچ کر رکی تو پال نے کہا۔ آؤ ذرا گھومتے ہیں۔"

" میں تو صبح ہی سے گھوم رہی ہوں۔"

" ابھی تک تو ہم اونچی فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ آؤ ذرا دھرتی پر اتر کر دیکھیں۔ "

پانچ بجے تک وہ دونوں ننگے پاؤں گیلی ریت پر چلتے رہے

دوسری شام وہ سی سی میں ملے تو اونا بھی ساتھ تھا۔ وہ دیر تک اونا کے ساتھ کھیلتا رہا۔ سات بجے آیا اونا کو لے گئی۔

" بڑا کھلنڈرا بچہ ہے۔"

" جہازی کی اولاد ہے نا! "

" تمہارے شوہر کے ماں باپ بھائی بہن! "

" تم نے میرے اپنے گھر والوں کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں پوچھا۔ "

" تمہارا اپنا کہنے لائق کوئی ہوتا تو تم اس وسیع عریض خطۂ زمین پر اکیلی نہیں رہتیں۔ "

" تم نے ٹھیک کہا ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میری ماں ایک مسلمان تاجر کے ساتھ وسط مشرق بھاگ گئی تھی اور میرے باپ نے ندامت میں خودکشی کر لی۔ "

" مجھے نانی نے پالا۔ نانی کے تین بیٹے تھے۔ میرے ماموں۔ مگر تینوں کے تینوں بڑے درجے کے حرامی اور لوفر تھے۔ دنیا کا کوئی عیب نہ تھا جو انہوں نے چھوڑا ہو۔ نانی خاصی امیر تھی۔ اپنے والد اور نانا کی اکلوتی وارث ورنہ بیچاری بھوکوں مر جاتی۔ اپنی عمر میں نانا نے بیٹوں کو الگ الگ مکان دے کر جدا کر دیا تھا۔ وہ مرے تو نانی اکیلی تو رہ گئی۔ مگر بے سہارا نہیں مکانوں اور دوکانوں کے کرایہ پر بھلا گذر بسر ہوتا تھا۔ "

" تم نے کلارک کو کیسے پھانسا؟ "

" پھانسا؟ "

" میرا مطلب ہے ریپ کے لئے کیسے اکسایا۔؟ "

وہ مسکرائی: تمہارا اندازہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ کلارک کے والد نانی کے کرایہ دار تھے۔ بیچارے ایک مقامی فیکٹری میں معمولی کلرک تھے بیوی یعنی کلارک کی ماں بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ لہٰذا میاں بیوی میں کبھی نہ بنی وہ اکثر جھگڑا کر کے میکے چلی جاتی۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر کلارک چھٹی پر آیا ہوا تھا تم جانتے ہو بڑے ٹھاٹ ہوتے ہیں ان جہازیوں کے۔ سب سے چھوٹا افسر ہونے کے باوجود وہ کوئی پانچ چھ ہزار روپے مہینہ تنخواہ پاتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے گھر آ دھمکتا۔ ہر اتوار کو باقاعدہ چرچ میں بھی ملتا۔ نانی کو لڑکا پسند آ گیا۔ اسی کے اکسانے پر میں کلارک سے کھلم کھلا ملنے لگی۔ کوئی ہفتہ بھر پہلے ہی میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی۔ بھرپور جوان تھی۔ نانی مجھے آگے پڑھانے کی بجائے میرا بیاہ کر کے چھٹکارا پانا چاہتی تھی ایک دن کلارک مجھے اپنے گھر لے گیا۔ ماں میکے گئی ہوئی تھی اور باپ نوکری پر۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اس نے گھر کے سارے دروازے پہلے ہی سے بند کر رکھے تھے۔ میں چیخی چلائی مگر اس پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ اس روز ایک ہی دن میں اس نے مجھے تین بار ریپ کیا۔ "

" ریپ صرف پہلی بار ہوتا ہے۔ "

" پہلی بار کے بعد میں نے مزاحمت نہ کی۔ "

کسی نے کہا ہے کہ

WHEN RAPE IS INEVITABLE WHY NOT RELAX AND ENJOY

" تم بڑے وہ ہو۔ میں کلارک سے جدا ہوئی تو ہم دوست بن چکے تھے۔ گھر لوٹ کر البتہ میں نے اس کے ظلم اور اپنی بے بسی کی داستان کچھ ایسی معصومیت سے سنائی کہ نانی کا خون کھول گیا ـــــ انہوں نے

کلارک کی ماں کو بلا بھیجا۔ ہمارے گھر میں ایک فیملی کانفرنس ہوئی جس میں میرے اور کلارک کے علاوہ سبھی تھے۔ کلارک کے والدین نانی اور میرے تینوں ماموں نتیجتاً ہماری شادی ہو گئی۔ اونا اس سے پہلے کلارک میں ہی میرے شکم میں آ گیا تھا۔ ہم جہاز پر تھے۔ جب نانی کی وفات کی خبر ملی۔ میں ٹوکیو سے ہوائی جہاز کے ذریعے گھر آئی۔ مگر گھر پر بڑا ماموں جو تینوں بھائیوں میں سب سے طاقتور اور خونخوار تھا قبضہ جما چکا تھا کسی نے میری آمد کو خوش آمدید نہ کہا۔ مجبوراً مجھے سسرال رہنا پڑا۔ اونا میرے پیٹ میں اب کافی اچھل کود مچانے لگا تھا۔ لہٰذا واپس کلارک کے پاس جانے کے بجائے میں ادھر اس کے ماں باپ کے پاس رہ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اونا کلارک کے جنون اور میری کمزوری کی اولاد ہوتے ہوئے بھی بے حد خوبصورت بچہ تھا۔ دادا دادی کا چہیتا۔ دادا دادی کی باہمی کشمکش اب کافی ماند پڑ گئی تھی۔ جہازی قوانین کے مطابق مجھے اب سال بھر اکیلا رہنا تھا۔ اسی بیچ میری ساس کا دیہانت ہو گیا۔ کلارک آیا اور چلا گیا۔ ،،

،، اونا بمشکل دس مہینے کا تھا جب ایک رات میرا سسر جیسے میں بے حد شریف اور نیک آدمی سمجھتی تھی شراب میں دھت میرے کمرے میں چلا آیا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی اس نے کسی عجیب و غریب مشروب میں سنا ہوا رومال میرے منہ پر رکھ دیا۔ اور میں ایکدم بے ہوش ہو گئی

جب ہوش آیا تو میں لٹ چکی تھی۔

کلارک کے ڈیڈی اب مجھے ملی ڈارلنگ کہہ کر بلاتے تھے۔ اب ہم باپ بیٹی کی طرح نہیں ایک مرد اور عورت کی طرح رہتے تھے۔ ادھیڑ ہوتے ہوئے بھی وہ بھرپور مرد تھا۔ ہر چھ مہینے بعد کلارک گھر آتا مہینہ دو مہینہ رہتا اور لوٹ جاتا۔ میں نے اسے اپنے اور اس کے باپ کے نئے تعلق کا کبھی شک نہ ہونے دیا بڈھا بڑا محتاط تھا میں نے تو سمجھ ہی لیا تھا کہ راز افشا ہو جانے کی صورت میں کلارک مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا جائے گا۔

بڈھا کلارک سے جلتا تھا ——— میرا بس چلے تو اس حرامی پلے کو جان سے مار ڈالوں۔ ،،

" تم نے بیٹے کی بیوی کو ذلیل کیا۔ اب اسے مارنے کی فکر میں ہو۔ تم آدمی ہو کہ جانور۔ ،،

اور تب اس نے بتایا کہ کلارک اس کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ ماں کے پیٹ میں پورے چھ مہینہ رہ چکا تھا جب اس کے نانا نے میری غریبی اور لاچاری کا فائدہ اٹھا کر اس کی ماں سے میرا بیاہ کر دیا۔ اور مجھے دو سال کے لئے باہر بھیجوا دیا۔ اپنی کہانی کی تصدیق کے طور پر اس نے کلارک کی ماں کا خود اپنے ہاتھ سے لکھا اعترافِ گناہ دکھا دیا۔ ،،

——— ہر عورت جو شادی سے پہلے کسی مرد سے ہم بستر رہ چکی ہو اس کے احترام کی حقدار نہیں رہتی جو ایک نیک بیوی اپنے مرتبہ کے اعتبار سے بجا طور پر ——— ،،

" یہ بات اس نے درجنوں بار دہرائی اور میں ہر بار چپ رہی۔ ،،

" تمہارا شوہر ہی وہ آدمی تھا اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وجہ، وقت، اور مقام کچھ بھی رہے ہوں اس خوبصورت گناہ کے لئے کسے تم نے ہی ورغلایا تھا۔ ،،

" تم میں حق پر چلنے کا دم نہیں ورنہ تم کلارک سے تمہارے تعلقات کا ذکر ضرور کر دیتیں ——— تم ایک حقیر، بے حد معمولی ادنیٰ اور ذلیل عورت ہو۔ کوئی بھی مرد جو تمہیں ذرا سا بھی جاننے کا موقعہ پڑنے پر تم سے وہی سلوک کرے گا جو کلارک نے یا میں نے کیا۔

" یہ سب تم کیوں مجھے بتا رہی ہو۔ "

" کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے پیار کرنے لگے ہو اور میں سمجھتی ہوں کہ تم پہلے مرد ہو جسے اپنی دانست میں ——— میں بھی ———

" اب جب کہ ہم دونوں نے اپنے جسموں اور روحوں کو ہر قسم کے لباس سے آزاد کر لیا ہے تو باقی کہانی بھی کہہ چکو۔ "

" ہم لوگ یونان کی اس بندرگاہ میں تقریباً تین ہفتوں سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سامان اتارا جا چکا تھا۔ نیا سامان لادا جا رہا تھا کہ ہمیں خبر ملی کہ باہر اینکر سٹیج میں کمپنی کا وہ جہاز جس پر کلارک نے پہلی بار سیل کیا تھا خطرے میں ہے۔ انجن روم میں پانی برستور بھرتا جا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان اور کرو نے جہاز خالی کر دیا تھا۔ جہاز رانی کے انٹرنیشنل قوانین کے مطابق ایسی حالت میں جو بھی شخص ایسے جہاز کو بچا لیتا ہے وہی اس کا واحد مالک قرار دیا جاتا ہے کلارک اپنے ہی ایسے ایک سیکنڈ انجینئر اور چند منچلے سیلرز کو لیکر ایک چھوٹی سی کشتی سے جہاز پر پہنچ گیا۔ پورا دن وہ لوگ جہاز پر ہی کام کرتے رہے۔ ہم لوگ بندرگاہ سے دوربینوں کے ساتھ جہاز کو دن بھر دیکھتے رہے۔ شام یا رات کے پہلے جھٹپٹے میں ہم نے دیکھا کہ

کلارک اور اس کے ساتھی اوپر ڈیک پر آ گئے ہیں اور خوشی سے ناچ رہے ہیں اور بوتلیں ہاتھ میں لئے شراب اڑا رہے ہیں۔ ڈیک پر روشنی تھی اور دوربین سے سب دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ شور و غوغا تقریباً آدھی رات تک ایسے ہی چلتا رہا۔ لوگوں نے مجھے مبارکباد دینی شروع کر دیں۔ مسز کلارک۔

" اب آپ تین چار کروڑ کی مالک ہیں۔ آپ کا شوہر واقعی ایک بہادر سیلر ہے اتنی چھوٹی عمر میں ایک بڑے جہاز کی ملکیت پا جانا معمولی بات نہیں۔ اس رات ہم گولپ بندرگاہ میں کھڑے اپنے جہاز کے ڈائننگ روم میں گئی رات تک کلارک کی صحت اور خوش قسمتی کے جام اڑاتے رہے۔ بالآخر جب ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کیبنوں میں لوٹے تو نئے دن کے تقریباً دو بج چکے تھے۔

کپتان لارنس نے دوربین سے دیکھ کر کہا۔ "وہاں بھی سب سو گئے ہیں۔"

دوسری صبح ہم اٹھے تو دیکھا کہ کلارک کا فتح کیا ہوا قلعہ مسمار ہو چکا ہے۔ جہاز چپ چاپ رات کے سناٹے میں جب ہر کوئی فتح کی خوشی میں بدمست سو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سنک کر گیا۔

وہ یکایک اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ الف ننگی تھی مگر ایسے چل رہی تھی جیسے کمرے میں دوسرا کوئی نہ ہو یا پھر ایسے کہ وہ پورے لباس میں ملبوس ہو چند منٹوں کے بعد وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں دو کاغذ تھے جو اس نے پال کو تھما دیئے۔

پہلا خط کلارک کی ماں کا اپنے بیٹے کے نام تھا جس کا مفہوم تھا کہ وہ جس شخص کو اپنا باپ سمجھتا تھا وہ اس کا باپ نہیں تھا۔ اس کا باپ اوناسس نام کا ایک جہازی تھا جو اس کی پیدائش سے چند ماہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ دوسرا خط کلارک کا للی کے نام تھا۔

" پیاری للی۔ تمہارا نام تتلی ہونا چاہئے تھا، تتلی جو ایک اڑتا ہوا پھول ہوتی ہے۔ نام للی بھی برا نہیں۔ تم واقعی للی ہو، میرے فرضی باپ سے تمہارے تعلقات کا مجھے علم تھا وہ میرا باپ ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔ وہ میرا باپ نہیں تھا اور تم نے اس کی ناجائز (؟) حرکت کا اشارتاً بھی کبھی ذکر نہ کیا تھا لہٰذا میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا مناسب نہ سمجھا۔ جب تم نے اس انوکھے تعلق سے سمجھوتا کر لیا تھا تو مجھے ہی کیوں ——

میں جانتا تھا کہ ایک بار تم میرے ساتھ جہاز پر آ گئیں تو پھر کبھی گھر لوٹنے کے لئے نہ کہو گی، یہی ہوا ہم چار سال سے ایک ساتھ ہیں۔ میں نے تمہیں کبھی بھی برا بھلا نہ کہا۔ جو آدمی خود درجنوں عورتوں سے شادی کے بعد بھی تعلقات رکھ سکتا ہے اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ تمہاری جیسی خوبصورت عورت کو اپنی ذاتی ملکیت مان کر سزا و جزا کی سوچے، لارنس سے تمہارے تعلقات کا مجھے علم نہیں تھا بس ایک شک تھا، جو کافی نہ تھا۔

البتہ کل اس نے میری کونفی ڈینشیل رپورٹ دکھائی تو مجھے علم ہوا کہ مجھے آگے بڑھانے میں تمہارا ہاتھ زیادہ ہے۔ تم مجھے کپتان دیکھنا چاہتی ہو نہ کپتان کی بیوی جہاز کی ملکہ ہوتی ہے۔ میں تمہیں ایک بڑے جہاز کی ملکہ نہیں مالکہ بنانے جا رہا ہوں اپنی زندگی پہ کھیل کر۔ بات بن گئی تو —— نہ بنی تو بھی تمہارے پاس اب سب کچھ ہے۔ ایک شاندار فلیٹ اور دس لاکھ روپے کی نقدی زیورات اور دوسری چیزیں جو جینے کے لئے ضروری نہیں ہوتیں مگر تمہارے لئے ضروری ہیں۔

کل صبح تک فیصلہ ہو جائے گا۔ کل صبح تم ایک بیوہ ہو گی یا ایک جہاز کے مالک کی بیوی۔ خوبصورت عورتوں کے لئے لوگوں نے پہاڑ کاٹے ہیں دودھ کی ندیاں بہائی ہیں یا ریگستانوں کی خاک پھانکی ہے، مجھے بھی خوبصورتی سے نباہ کرنے کا سلیقہ آنا چاہئے۔ "

تمہارا

البرٹ

نوٹ :۔ اوناسس ایک جہازی کا پوتا اور ایک جہازی کا بیٹا ہے۔ اوناسس کو جہاز کا کپتان بنانا میرا سب کچھ اس کا ہے۔ تم بھی حقدار ہو مگر اوناسس کی ماں کے ناطے۔ میرا تمہارا ناتا تو تم جانتی ہو ایک بھرم ہے جو جب تک بنا رہے اچھا ہے۔

اچھا۔ خدا حافظ

ایک اور بات ——— اگر میں لوٹ آیا تو اس خط کو بھول جانا۔ میں بھی اس کا تذکرہ کبھی نہ کروں گا۔ خوبصورت عورت سے شادی کی ہے میں نے۔ خوبصورتی سے نباہ کا سلیقہ تو آنا ہی چاہئے۔

تم!—

میں نے کہا تھا نہ کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔

تم ہر اس آدمی کے لئے خدا کا وظیفہ ہو جو خوبصورتی کا شیدائی ہے کیونکہ تم بے حد خوبصورت ہو۔ میں البتہ اس خط میں تم سے مانگے ہوئے وعدہ کو پورا کرنے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے اوناسس کو اپنایا تو اسے اپنے ڈھنگ سے پالنا چاہوں گا ——— ایک زندہ آدمی سے سمجھوتا دعا کیا جاسکتا ہے۔ کلارک جیسے شہید سے نہیں۔"

"میں جانتی تھی میری کہانی سن کر تم ——— تم جیسا آدمی ——— وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

پال نے اسے چپ نہیں کیا۔ اسے چپ چاپ گود میں لئے بیٹھا رہا۔ آخر جب وہ تھک کر سو گئی تو اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کاغذ اس نے جیب میں ڈال لئے۔ کپڑے پہنے اور باہر نکل گیا۔

دوسرے دن جیمز نے مسز زائبرٹ کو پال کا خط تھماتے ہوئے کہا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ اس کا جواب ضروری نہیں۔"

پیاری للی تم بہت حسین ہو۔ یہ بے پناہ حسن جو خدائے پاک کا ایک قیمتی تحفہ تمہارے لئے ایک ابھیشاپ بن گیا ہے۔ تمہارے دونوں خط میں نے جلا دئے ہیں کیونکہ ان کا بوجھ لیکر جینا تمہارے لئے مشکل تھا۔ کل شام میں کیپٹنز کیبن میں جیمز کے پکوڑے کھانے آؤں گا، تم ضرور آنا مگر ماتمی لباس میں نہیں شدھ سفید ساڑی میں جو بے داغ ہو اور جو مجھے یقین دلا دے کہ تم نے بھی یہ گرانبار تم اتار پھینکا ہے۔ کل رات تم میرے پاس تھیں میرے قبضے میں اور میں ——— مگر مجھے تمہارے اس خبیث سسر کی بات یاد تھی۔

ہر عورت جو شادی سے پہلے کسی مرد کے بستر ——— تم بھی

سے کنواری مریم ہو ایک پاکیزہ روح۔

اسے شادی کا پیغام سمجھ کر چلی آؤ گی تو ہم ایک ہو جائیں گے ورنہ جو شخص ۴۰ سال تک شادی کو ملتوی رکھ سکتا ہے وہ عمر بھر کنوارہ بھی رہ سکتا ہے۔"

جوگیندر

دوسرے روز وہ کیپٹنز کیبن کا تب تک انتظار کرتا رہا جب تک کہ اسے رات کے لئے بند کرنے کا وقت نہیں ہو گیا۔

وہ نہیں آئی ———

راہی قریشی

اندھیری رات مسلط ہے، اب چراغ جلا
نظر کے، دل کے، تمنا کے سب چراغ جلا

یہ روشنی ہے، کہ ایثار کی امانت ہے
لہو چراغ کو بخشا ہے تب چراغ جلا

فروغِ زندہ ضمیری مرے لئے ہے بہت
یہ سب چراغ بجھا دے، کہ سب چراغ جلا

بصیرتیں نہیں، اب تو بصارتیں بھی گئیں
عجیب روشنی پھیلی، عجب چراغ جلا

ہر ایک نور، نزولِ بلا کو روکے ہے
بڑھے جو رات کا قہر و غضب، چراغ جلا

خلا سے خاک کا ہر فاصلہ ہے ظلمت میں
سسک سسک کے نہ مر جائے شب، چراغ جلا

یہ دیکھنے نہ دیا انتظار نے راہی
کہ کب چراغ بجھا اور کب چراغ جلا

شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی
گلبرگہ (کرناٹک)

قیصر شمیم

موسم تو بدلتے ہیں لیکن کیا گرم ہوا، کیا سرد ہوا
اے دوست ہمارے آنگن میں رہتی ہے ہمیشہ زرد ہوا

سب اپنے شناسا چھوڑ گئے رستے میں ہمیں غیروں کی طرح
چہرے پہ ہمارے ڈال گئی، لاکر یہ کہاں کی گرد ہوا

چھوٹے نہ کبھی پھولوں کا نگر، کوشش تو یہی ہے اپنی مگر
اک روز اڑا لے جائے گی پتوں کی طرح بے درد ہوا

کیا بات ہوئی، کیوں شہر جلا، اب اس کے سوا کچھ یاد نہیں
اک فرد سراپا آگ ہوا، پل بھر میں ہوا اک فرد ہوا

آئی ہے گھنے جنگل میں ابھی، جو کھیل بھی چاہے کھیلے، مگر
کل میرے ساتھ اڑائے گی پھر صحرا صحرا گرد ہوا

آنکھوں کی چمک موہوم ہوئی، لو دیتے بدن افسردہ ہوئے
در آئی ہے قیصر گھر میں مرے یہ کیسی رتوں کی سرد ہوا

۱۰ - ہیسم گوشش لین
ہوڑہ ۲ ۷۱۱

محسن بھوپالی

جو غم شناس ہو ایسی نظر تجھے بھی دے
یہ آسماں غمِ دیوار و در تجھے بھی دے

سخن گلاب کو کانٹوں میں تولنے والے
خدا سلیقۂ عرضِ ہنر تجھے بھی دے

خراشیں روز چنے اور دل گرفتہ نہ ہو
یہ ظرفِ آئینہ، آئینہ گر تجھے بھی دے

پرکھ چکی ہے بہت مجھ کو، یہ شبِ وعدہ
اب انتظار زدہ چشمِ تر تجھے بھی دے

ہے وقت سب سے بڑا منتقم یہ دھیان میں رکھ
نہ سہہ سکے گا یہی غم اگر تجھے بھی دے

سبھی شہادتیں تیرے خلاف ہیں محسن
یہ مشورہ دلِ خود سر مگر تجھے بھی دے

محسن منزل، ۴۸ الف - ۱۵/۳ بلاک
ناظم آباد - کراچی (پاکستان)

شاہ جو کی چاندنی اور زمین کی گم شدگی

حمید سہروردی
صدر شعبۂ اردو۔ مسز کے۔ ایس۔ کے کالج۔ بیڑ (مہاراشٹر)

مرد نے چاروں اور دیکھا ہر طرف خاموشی اور ویرانی کی حکومت تھی۔ مرد اپنی آنکھوں میں ہر طرف وقت کی تیز دھار کو دیکھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وقت آسمانوں اور میرے تمام شریر میں رچ بس گیا ہے۔ مرد محسوس کرتا ہے اُسے تیز گام چلنا ہی ہوگا۔ مگر اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے کیوں نظر آرہے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مرد آہستہ سے بڑبڑاتا ہے۔

مرد کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہے۔ بیوی اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرتی ہے۔ مگر کیا؟ خود عورت کو بھی معلوم نہیں اور مرد عورت کی آنکھوں میں صرف اور صرف چاندنی دیکھنے کے لئے بے قرار ہے۔

عورت، مرد سے کچھ قدم دور چلتی ہوئی آتی ہے اور دور آسمانوں میں گرد اور دھول کو دیکھتی ہے۔ اور مرد کی آنکھیں سوجھی ہوئی ہیں اور وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ وہ دور آسمانوں میں نجات کا راستہ تلاش کر رہا ہو مگر کیوں ـــ زندہ لوگوں کو نجات کی کیا ضرورت ہے۔

عورت مرد سے پوچھتی ہے۔ تم آسمانوں میں کیوں دیکھ رہے ہو زمین پر کیوں نہیں دیکھتے؟

مرد جواب دیتا ہے ـــ "دیوانی! آسمانوں سے ہی قہر نازل ہوتے ہیں"
عورت اپنی ساڑی کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی کہتی ہے۔ "پھر تم آسمانوں میں کیوں گھور رہے ہو۔؟"

مرد کہتا ہے: "تم خاموش رہو۔ تم کچھ نہیں جانتی۔ خاموش رہو۔"
مرد کی آنکھوں میں ویران سناٹا ـــ مرد کو اس کا شدید احساس ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی آنکھوں میں چاندنی دیکھنے کے باوجود خاموش ہے۔

چند لمحوں کے بعد فضا میں دھول، گرد، دھواں چاروں طرف دیکھ کر مرد کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔
عورت پوچھتی ہے "یہ دھول، گرد اور دھواں کہاں سے آرہا ہے؟" مرد بیزاری سے کہتا ہے "آسمانوں سے۔"
عورت کسی قدر ناراض ہوتی ہوئی کہتی ہے "کیا تمہیں آسمان کے علاوہ کوئی اور چیز نظر نہیں آرہی ہے؟"

مرد صرف "ہاں" کہتا ہے۔

"نہیں شاہ جو، تم غور کرو۔ دھول، گرد اور دھواں زمین سے اٹھ رہا ہے۔ تم غور کرو۔ آسمانوں سے نہیں۔" عورت، شاہ جو کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتی ہے۔ اور کان کے قریب جا کر کچھ کہتی ہے۔

شاہ جو ـــ "نہیں، میری چاندنی! ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔"

چاندنی۔ "ہاں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میری سماعت دیکھو۔ میں کس قدر تیز تیز قدموں کی آواز سُن رہی ہوں۔"

شاہ جو ـــ "نہیں چاندنی، تمہاری سماعت میں زمین گردش کر رہی ہے۔"

چاندنی ـــ "ہاں، شاہ جو، میری سماعت میں زمین گردش کر رہی ہے، کیا تم آوارہ بادلوں میں گھومتے رہوگے، اور کب تک؟

شاہ جو ـــ دیوانی، دیوانی! او دیوانی ـــ میں زمین پر ہی کھڑا ہوا ہوں۔ میری چاندنی، میری رانی، دیکھو تو سہی ـــ"

چاندنی ـــ "مگر شاہ جو، زمین پر کھڑے ہو کر تم آسمانوں میں کیوں دیکھ رہے ہو؟ زمین کو دھرتی کے روپ میں دیکھو کتنی رنگین ہوتی جا رہی ہے۔ چاروں طرف لال رنگ ہے۔ تم بتاؤ، یہ رنگ کونسا ہے اور کس کا ہے؟ شاہ جو، ہے نا، لال رنگ ـــ ہاں شاہ جو، لال رنگ، دیکھو اپنی آنکھیں کھول دو ـــ"

شاہ جو ـــ "تم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا تم سماعت میں دیکھ رہی ہو! تمہاری آنکھوں میں چاندنی ہے، چاندنی، میری چاندنی ـــ"
چاندنی ـــ "تم تو آنکھوں سے دیکھ رہے ہو نا ـــ دیکھو، غور سے دیکھو۔

آبادیاں ؟ کیا تم نے سچ مچ اپنی بینائی کھو دی ہے ؟ شاہ جو ۔۔ "

شاہ جو ۔۔ "سنو ! چاندنی میری بینائی تمہاری آنکھوں میں ہے۔ میں صرف اور صرف تمہیں دیکھ سکتا ہوں "

چاندنی ۔ "ایسا نہیں ہے، شاہ جو، دیکھو لوگ بھاگ رہے ہیں "

شاہ جو ۔۔ "کس دشا میں ؟ "

چاندنی ۔ "تیسے دشا ہی "

شاہ جو ۔۔ تیسے سمت ہی بھاگے جا رہے ہیں، لیکن کیوں ؟ "

چاندنی ۔۔ "تم خود کیوں نہیں دیکھتے ہو "

شاہ جو ۔۔ "ہاں میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا، چاندنی تمہیں وہم ہوا ہے "

چاندنی ۔۔ "مجھے وہم نہیں ہوا۔ تم ڈھول، دھواں اور گرد نہیں دیکھ سکتے "

شاہ جو ۔۔ "نہیں چاندنی۔ ایسا نہ کہو "

مارو ۔۔ بھاگو ۔۔ تیز بھاگو

چاندنی ۔۔ "دیکھو شاہ جو، وہ بڈھا بھاگ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ سے، اس کی چھڑی گر گئی ہے۔ ارے دیکھو وہ عورت پیٹ کو دبائے ہوئے بھاگ رہی ہے تم اسے پکڑ کر لاؤ ۔۔ شاہ جو، یہاں درخت کے نیچے آرام کرے گی۔ دیکھو تو سہی وہ بچہ روتا ہوا ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے اور وہ بھی تمہاری طرح آسمانوں میں دیکھ رہا ہے۔ وہاں کیا ہوتا ہے ؟ آسمانوں میں شاہ جو ۔۔ "

شاہ جو ۔۔ "مگر یہ سب کچھ تمہیں کہاں دکھائی دے رہا ہے ۔ ؟ چاندنی ۔۔ "

چاندنی ۔۔ "میں عورت ہوں اور تم مرد۔ عورت جسم کے ایک ایک حصہ سے دیکھ لیتی ہے، شاہ جو ۔ کیا سچ مچ تم کچھ نہیں دیکھ رہے ہو ؟ "

شاہ جو ۔۔ "اب بس کرو، تمہاری بکواس سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے چاندنی "

چاندنی ۔ "میں اور دھرتی، ماں ہیں ماں ۔۔ یہ رنگ نہیں خون ہے شاہ جو، خون "

شاہ جو ۔۔ "مگر کس کا ؟ چاندنی۔ یہاں تو تم اور میں ہی ہیں "

چاندنی ۔۔ "تم کیا کہہ رہے ہو۔ اتنے سارے لوگ بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا ہے "

شاہ جو ۔ "مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے ۔ تا حدِ نظر خاموشی سناٹا اور جنگل "

چاندنی ۔ "نہیں شاہ جو، نہیں یہاں لوگ بھاگ رہے ہیں، گھر و سامان کوئی کسی کا نہیں ہے۔ بڈھا گر گیا ہے اور عورت اپنے پیٹ کو پکڑے رو رہی ہے اور بچہ کبھی آسمانوں میں اور کبھی زمین کو دیکھ رہا ہے۔ تم دیکھو شاہ جو "

شاہ جو ۔ "سچ مانو چاندنی میری آنکھوں میں صرف چاندنی ہے اور سماعت میں تمہاری دلکش آواز "

چاندنی ۔۔ "وہ وقت گزر گیا۔ ہم بہت دور آ گئے ہیں۔ تم ابھی پہلی رات کے منظر میں کھوئے ہو "

شاہ جو ۔ "ہاں، چاندنی میں اُسی ایک منظر میں کھو رہنا چاہتا ہوں "

چاندنی ۔۔ "مگر یہ کیسے ممکن ہے شاہ جو، دن رات گزرتے رہتے ہیں "

شاہ جو ۔ "لیکن چاندنی، مجھے وہی منظر چاہیے "

چاندنی ۔۔ "یہ ممکن نہیں، شاہ جو، ممکن نہیں "

چاندنی زور سے چیختی ہے "سنو کتنی بھیانک آوازیں آ رہی ہیں۔ کیا سن رہے ہو۔ شاہ جو، نکلو پہلی رات کے منظر سے "

آوازیں ۔۔ آوازیں ۔۔ آوازیں

بھاگم بھاگ ... بھاگم بھاگ ..... بھاگم بھاگ .....

پھر تم آسمانوں میں گھور رہے ہو، شاہ جو ۔۔ "

شاہ جو ۔ "نہیں میں آسمانوں میں چاندنی کو تلاش کر رہا ہوں "

چاندنی ۔ "اب شاید یہ ممکن نہیں ۔۔ "

"..... بچہ بھاگ رہا ہے۔ آوازیں قریب آ رہی ہیں۔ دیکھو اُس بچہ کو دوڑ کر لے آؤ۔ کہیں گم نہ ہو جائے "

شاہ جو ۔۔ "مگر وہ بچہ تو تمہاری کوکھ میں ہے، چاندنی "

چاندنی غصہ سے بھری ہوئی ہے۔ تیز آواز سے شاہ جو کو کہتی ہے "کیا تمہیں صرف میرا بچہ ہی نظر آ رہا ہے۔ وہ بچہ ۔۔ وہ بچہ ۔۔ بھاگ رہا ہے۔ دیکھو اُس کے پیر لڑکھڑا رہے ہیں ... وہ دیکھو عورت کی سانس پھول رہی ہے۔ زار و قطار رو رہی ہے۔ اُس کا پیٹ آہستہ آہستہ کم ہوتا نظر آ رہا ہے "

شاہ جو ۔۔ "نہیں چاندنی۔ تم اپنے پیٹ کو دیکھو۔ اتنا ابھرا ابھرا لگ رہا ہے تم چاند جیسا لڑکا جنم دو گی "

چاندنی ۔ "شاہ جو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو "

شاہ جو ۔ "کیا کہا ۔۔ "

چاندنی ۔۔ "میری آنکھ ۔۔ ہاں میری بینائی تیز اور تیز ہے۔ زندہ

ہے۔ وہ بوڑھا ابھی زندہ ہے۔ زمین پر لیٹا ہوا ہے "
شاہ جو — "چاندنی تم ہوش میں تو ہو، نا — "
چاندنی — "نہیں شاہ جو میں پوری طرح ہوش میں ہوں —— وہ بوڑھا بے دم ہوگیا ہے۔ تم اس کے لیے پانی تلاش کر کے لے آؤ — اور اس کے حلق میں ڈال دو اور اس بچّہ کو ادھر لاؤ — اور عورت کو ادھر لاؤ، درخت کے نیچے
درخت ساکت، دھول، دھواں اور گرد چاروں طرف
چاندنی تم کہاں ہو — ؟ درخت کہاں ہے —— ؟؟ کہیں نہیں، دیکھو میں آیا ہوں — پانی لایا ہوں
مگر وہ بوڑھا — !
اور وہ عورت — !!
اور، اور وہ بچّہ — !!!
چاندنی میں یہاں ہوں۔ تم خاموش کیوں ہو، تم نے کہا تھا، نا میری آنکھیں بینائی کھو چکی ہیں ایسا ہرگز نہیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں "
چیخیں، آوازیں، آوازیں،
"شاہ جو، شاہ جو، شاہ جو۔ تم کہاں ہو، میری بینائی کو کیا ہوگیا — میری سماعت تیز تر ہوتی جا رہی ہے، تم سُن رہے ہو —— شاہ جو — "میں کہاں ہوں
چاندنی اور تم — !؟
.... ایسا کیوں ہو رہا ہے — !!
"تم، تم شاہ جو — کیا تمہاری بینائی کھوگئی ہے ؟"
نہیں چاندنی، میں تمہاری دلکش آواز سُن رہا ہوں "
"کیا تم اُس بوڑھے، عورت اور بچّے کی آواز سُن رہے ہو ؟ شاہ جو "
" ارے تم کون سی بات کر رہی ہو — تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے ؟ تمہاری بینائی ختم ہوگئی ہے — یہاں کوئی نہیں ہے صرف تم اور صرف میں اور چاروں طرف سنّاٹا — کہاں ہو، چاندنی — کہاں ہو — میرے قریب آؤ — یہاں کوئی نہیں ہے — تمہاری کوکھ میں بچّہ ہے نا — دیکھو ادھر آؤ —— میں تمہارے پیٹ میں جینے والے بچّہ کی آواز سُن رہا ہوں — کہاں ہو چاندنی، کیا میری آواز نہیں سُن رہی —— چاندنی میرے قریب آؤ کیا کہا — میری سماعت —— میں سُن رہا ہوں —— خاموشی — اور دیکھ رہا ہوں —— سنّاٹا — اب کیا ہوگا "
شاہ جو ایک سمت چلتا ہے۔ پھر رکتا ہے — میں کدھر جاؤں ——
چاندنی کس طرف ہے —— میں کہاں جا رہا ہوں — چاندنی دیکھو، میرے پاس آؤ — ہر طرف لوگ سوئے ہوئے ہیں، آرام سے — مگر میری ناک کو کیا ہوگیا ہے — میری ناک —— میں مر جاؤں گا — میری ناک کو کیا ہوگیا چاندنی، — چاندنی کیا تم بھی سوگئی ہو — ؟ مگر میرا بچّہ تمہاری کوکھ میں جی رہا ہے — کیا کہا — وہ سوگیا — نہیں چاندنی، ایسا نہ کہو — ہاں چاندنی لال رنگ، چاروں طرف لال رنگ — ارے یہ کیسی آوازیں — اور کون کس دشا میں بھاگ رہا ہے۔ کیا چاندنی تم نے میرے بچّہ کو جنم دے دیا ؟
چاندنی کیوں خاموش ہو — چاندنی — چاندنی — "
شاہ جو ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ وہ آسمانوں کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے مگر اُس کی آنکھوں کے سامنے صرف خاموش ماحول ہے مگر یہ کیسی آواز
ٹھا — ٹھا — ٹھا — ٹھا — ٹھا
کون — ؟
کون ہو —— !؟
کون ہو، کہتے کیوں نہیں —— ؟؟؟
ارے یہاں کوئی نہیں
کیا میری چاندنی — ماضی بن گئی —— !؟
اور آنے والا بچّہ — کھوگیا — !!؟!
اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں —— ؟
شاہ جو کو زمین گھومتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔
نہیں چاندنی، نہیں۔ تم نے دھوکہ کیا — نہیں... نہیں.... نہیں.. ..
شاہ جو لڑکھڑا کر گرتا ہے۔
پورا منظر دھول، دھواں اور گرد سے بھرا ہوا ہے اور چاروں طرف زمین لال رنگ سے رنگی ہوئی ہے۔
مرد خاموش ہے
اور عورت درخت کے نیچے بے خبر پڑی ہوئی ہے !

محمد مشتاق شارق

نہیں یہ فکر مجھے گردشِ حیات ہے کیا ؟
یہ سوچتا ہوں کہ مقصودِ کائنات ہے کیا ؟

مری نگاہ پہ ظاہر ہے رازِ کون و مکاں
میں جانتا ہوں کہ تقدیرِ کائنات ہے کیا !

حیات موجِ صبا کی طرح گذر ہی گئی ،
میں سوچتا ہی رہا حاصلِ حیات ہے کیا ؟

میں لُٹ کے شہرِ جفا میں خیال کرتا ہوں
مری تباہی مرے خون کی زکات ہے کیا ؟

نگاہ نور سے خالی دلوں میں تاریکی ؟
یہی بصیرتِ حاضر کی کائنات ہے کیا ؟

ہمارے غم پہ کیا تبصرہ زمانے نے
سمجھ سکا نہ کوئی دل کی واردات ہے کیا ؟

نگاہِ ناز کے اُٹھنے کی دیر تھی شارق
سمجھ میں آگیا سرمایۂ حیات ہے کیا

● ۵۶ - کوٹلہ ، میرٹھ (یو۔پی)

کوشنے ادیب

دل کے صحرا میں کبھی ایسے بھی موسم آئے
غم کی زنجیر سے کرتے ہوئے ماتم آئے
ہر طرف پھیلا ہوا زیست میں سناٹا ہے
اس بیاباں میں کوئی یاد بھی کم کم آئے
میرے الفاظ میں ہو تیرے نفس کی خوشبو
تیرے لہجے کی میرے شعر میں شبنم آئے
زندگی ، یوں بھی کبھی یاد کیا ہے تجھکو
جس طرح نقش کوئی ذہن میں مدھم آئے
اب کسے یاد کروں اور میں روؤں کس کو
اب تو ہر چہرہ میرے ذہن میں مبہم آئے
کبھی جگنو کبھی آنسو ، کبھی تارا بن کر
آج اے یار تیری یاد بھی پیہم آئے

●

دل کی وحشت نہ گئی ، یاس کے سائے نہ گئے
ہم جنوں پیشہ کبھی ہوش میں پائے نہ گئے
درد کچھ اور بڑھا تازہ ملاقاتوں سے
یاد کے زخم پُرانے تھے ، بھلائے نہ گئے
ہم سے دیوانوں نے آباد کیا دشتِ جنوں
مصلحت کوش ، نہ اس راہ میں آئے نہ گئے
ایسا عالم بھی ترے عشق میں گذرا ہم پر !
دل میں تھا درد مگر اشک بہائے نہ گئے
صلح کرنے میں بھی کچھ اپنی انا تھی حائل ،
وہ تو روٹھے تھے مگر ہم سے منائے نہ گئے
جی یہ گذرے ہیں کبھی ہجر کے موسم ایسے
غزلیں لکھی نہ گئیں ، شعر سنائے نہ گئے

● ۱۴/۱۲ ، پی - اے - یو ، کیمپس ، لدھیانہ (پنجاب)

آخری داؤ

اوم کرشن راحت
[illegible] فرید آباد ٹاؤن شپ ۔ ۱۲۱۰۰۱

رکمنی کلب جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اسی طرح کھلے بالوں دروازہ کھولنے چلی گئی اور عبدو دادا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عبدو دادا نے کمرے میں گھستے ہوئے کہا "رکمنی بائی فلیٹ تو اچھا ہے۔"

"ہاں دادا ٹھیک ہے۔ کہو میرے غریب خانہ کا راستہ کیسے یاد آگیا" رکمنی نے اپنے لمبے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

دادا نے اچٹتی ہوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رکمنی نے مونڈھا کھینچ کر دادا کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "کہو دادا کیسے ہو؟"

"کیا بتاؤں؟ آنکھوں سے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ موتیا اتر رہا ہے۔ اپنے علاقے میں اب اور کئی اڈے بن گئے ہیں۔ بوڑھے شیر پر تو بلی بھی غراتی ہے۔ دھندا سب چوپٹ ہو گیا ہے، روٹی تک کے لالے پڑے ہیں۔ کوئی پرانا شاگرد ترس کھا کر کچھ دے دلا جاتا ہے تو اسی سے بسر اوقات ہو رہی ہے، تم کہو رکمنی بائی تم کیسی ہو؟" دادا ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

"دو چھوکریاں ہیں میرے پاس انہیں کے ذریعہ چار پیسے ہاتھ لگ جاتے ہیں لیکن اب تو وہ بھی بیمار رہنے لگی ہیں۔ سارا سارا دن کھانستی ہیں شام کو عموماً بخار بھی ہو جاتا ہے۔ میرے کہنے پر روتی بسورتی چلی تو جاتی ہیں مگر اب پہلے والی بات نہیں۔ فلیٹ کا کرایہ، پولیس والوں کے کبھی نہ بھرنے والے پیٹ، بھڑوؤں کی دلالی، مہنگائی کا زمانہ ہے بچتا بچاتا تو کچھ ہے نہیں کہ ان کا علاج کرواؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مجھ میں اب وہ بات نہیں رہی جسم کھوکھلا ہو چکا ہے" رکمنی نے آہ بھر کر کہا۔

"پھر وہی تاش والا دھندا شروع کر لو" عبدو نے اپنی تجربہ کار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ساری بستی میں تو بدنام ہوں دادا اب کون کھیلتا ہے تاش میرے ساتھ۔ رہی ہوٹلوں کی بات، تو تمہیں معلوم ہی ہے سو میں سے ستر روپے تو ہوٹل والے ہی رکھ لیتے ہیں، پھر اس کے بعد تم، تمہارے آدمی رات بھر تاش کھیلو تو کچھ پیسے کوڑی تو چاہیے۔ معاملہ تو وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ تمہارے طفیل دو وقت کی روٹی ہے وہ تاش کھیل کے کمالوں، کہ ان چھوکریوں کے دھندے سے یا اپنا جسم بیچ کر" رکمنی نے دادا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد رکمنی پھر بولی "تم اپنی کہو دادا ان دھندوں میں تم نے کون سی بلڈنگ کھڑی کر لی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو رکمنی بائی، مگر بڑھاپا تو کاٹنا ہی ہے۔ اب دادا پان سگریٹ کی دوکان کھول کر تو بیٹھنے سے رہا۔ اب یہ دھندا تو اپنی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ لیکن اب سوچا ہے کہ کسی طرح پچاس ساٹھ ہزار روپے ہاتھ آجائیں تو گھر بیٹھ کے آرام سے زندگی کے باقی دن گزار دوں"

"اتنے پیسے تو کئی بار آئے ہوں گے تمہارے ہاتھ میں" رکمنی نے عبدو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"قسم خدا کی رکمنی بائی اتنی رقم یک مشت ہاتھ آئی ہوتی تو اپنی زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ ہاں تم ایک بار مدد کر دو تو ہو سکتا ہے کہ زندگی کے باقی دن آرام سے کٹ جائیں" عبدو دادا نے شرارت بھری نظروں سے رکمنی بائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میں تو ایک اسکیم تمہارے پاس لے کر آیا تھا مگر تم کوئی اور جھمیلے لے بیٹھیں"

رکمنی ایک دم چپ ہو گئی اسے فوراً ہی وہ دن یاد آگئے جب وہ امرتسر سے بھاگ کر بمبئی آئی تھی، اسے اپنی سوتیلی ماں سے تنگ آکر گھر چھوڑنا پڑا تھا اور یہ قدم اٹھانے کے بعد ہی اسے پتہ چل گیا تھا کہ گھر سے

میں بدنامی ہو جائے گی۔ ہزار روپوں سے اپنا علاج کروانا، فلیٹ کا کرایہ میں ادھر سے بھیجتی رہوں گی۔ زیادہ لالچ نہیں کرنا، اپنے دیو اور گلزار کے علاوہ کسی کی معرفت جانے کی کوشش نہیں کرنا ٹھیک ہے؟"

دہلی پہنچ کر ہوائی اڈے پر سیٹھ کی بڑی امپورٹڈ کار کو دیکھ کر جہاں رکمنی بائی حیران رہ گئی تھی وہاں سیٹھ بھی اس کے گداز جسم، اس کی مدھ بھری آنکھوں اور اس کے لمبے بالوں کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا اور جب رکمنی بائی نے فلیٹ اور اس کی سجاوٹ کو دیکھا تو اس کے ذہن میں وہ سپنوں کا محل تعمیر ہو گیا جو بہت پہلے ڈھہ چکا تھا۔ رات کو جب سیٹھ کے ہاں سے پکا ہوا کھانا آیا تو وہ بھی اسے بہت اچھا لگا، اپنے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانے سے بھی اچھا ویسے اسے کھانے میں اتنی رغبت ہی نہ رہی تھی۔ شراب پینے کے بعد کھانے کے ذائقہ کا خیال ہی کہاں رہتا تھا۔ اس رات اسے نیند بھی بہت مزے اور بے فکری کی آئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی اس میں پھر عود کر آئی ہے۔ رات بھر اس نے سہانے خواب دیکھے تھے اور وہ صبح بہت دیر تک سوتی رہی۔ دن چڑھے گھنٹی کی آواز سن کر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو کھڑے پایا جس نے ضرورت سے زیادہ میک اپ کر رکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بہت لطیف آواز میں بولی آپ رکمنی بائی ہے نا"؟

"جی" رکمنی بائی نے کہا۔

"میں سیٹھ جی کی واقف ہوں۔ چلیے بازار سے کچھ شاپنگ کرا آئیں"

رکمنی شک اور یقین کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی اور اس کے ساتھ چل بھی پڑی۔ راستے بھر وہ عورت رکمنی سے انگریزی میں گفتگو کرتی رہی اور دل ہی دل میں اس کی انگریزی زبان پر دسترس پر خوش ہوتی رہی۔ اس عورت نے بتایا کہ اسے روزانہ اس کے ساتھ جانا ہوگا۔ اسے آنٹی کہہ کر پکارنا ہوگا اور وہ تاش کے کھیل سے ناواقفیت کا اظہار کرے گی کھیل سیکھنے کے لیے اس کی سہیلیوں اور اس کے سامنے گڑگڑائے گی بھی۔ پھر دھیرے دھیرے دس پندرہ دن کے بعد کھیلنا شروع کرے گی۔ وہ اس کی سب سہیلیوں کے خاوندوں، بیٹوں اور مرد رشتے داروں کو بھی لبھائے گی مگر بغیر اس کے اشارے کے کسی کے ساتھ بیڈ روم میں نہیں جائے گی یہاں تک کہ سیٹھ جی کے ساتھ بھی نہیں۔ پیسوں کی ضرورت کے لیے اس کی کسی سہیلی یا سہیلی کے خاوند کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے گی۔ پارٹی میں یا تاش کھیلتے وقت دو پیگوں یا بیئر کی ایک بوتل سے زیادہ نہیں پیئے گی۔ سب پر ظاہر کرے گی کہ اس کا خاوند مڈل ایسٹ میں بیوپاری ہے اور وہ کچھ مہینوں کے لیے ہندوستان میں اپنا علاج کروانے آئی ہوئی ہے۔ دادا اس کا باپ نہیں بلکہ نگہبان کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہے گا۔ دادا کے کھانے کا انتظام ہوٹل پر ہے گا جس کا خرچہ سیٹھ جی دیں گے۔ اور وہ کھانا اُس کے ہاں کھایا کرےگی۔ فلیٹ کی ایک چابی سیٹھانی اور دوسری رکمی کے پاس رہے گی — اور ہاں رکمنی دورانِ گفتگو گالیوں کا استعمال نہیں کرے گی کیونکہ اتنے گفتگو میں رکمنی کئی بار حرامی، سوّر کا بچہ، بہن کا یار جیسی لطیف گالیوں کا استعمال کر رہی تھی۔ سگریٹ پینے پر کوئی پابندی نہیں لیکن بڑھیا قسم کے۔

ڈھیر ساری پوشاکیں ان سے ملتے جلتے شیڈس کی لپ اسٹکیں، امپورٹڈ پرفیومز۔ پلکوں کے لوشن، پپوٹوں پر لگانے کی سیاہیاں، گالوں کو گلنار کرنے کے رُوز۔ مختلف شیڈ پنسلیں غرضیکہ بناؤ سنگھار کا کوئی ایسا سامان نہیں تھا جو نہ خریدا گیا ہو۔

بمبئی کی مرطوب آب و ہوا کا اثر ختم ہوتے ہی رکمنی کے سوئے ہوئے رنگ روپ نے پھر سے انگڑائی لی اور سیٹھ کے ملنے جلنے والوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ چند ہی دنوں میں رکمنی جہاں بڑے بڑے افسروں، کارخانے داروں اور شہر کے بیوپاریوں کے لیے کشش کا باعث بن گئی، نوخیز لڑکیوں، نو بیاہتا بیویوں اور قدرے ادھیڑ عمر کی عورتوں کے لیے بھی وہ حسد کا سبب بن گئی تھی۔

ایک شام جب اُس کو دہلی میں آئے تقریباً پندرہ دن ہو گئے تھے اس نے جھجکتے ہوئے تاش ہاتھ میں لیے تو صبح ہونے تک اس کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کی خوش قسمتی کے بھی چرچے ہونے لگے۔ ڈھیر سارے نوٹ اس کی جینز کی جیبوں اور پرس میں ٹھسے ہوئے تھے۔ وہ اتنی دولت دیکھ کر حیران تھی اور اس سے بھی زیادہ حیرانی اسے اس بات پر تھی کہ جوا کھیلنے والی افسروں کی بیویوں اور بیٹوں کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ سیٹھوں اور بیوپاریوں کی تو بات الگ ہے لیکن یہ افسر زادیاں ہزاروں روپے ہار کے بھی ہنستی رہتی ہیں۔ لیکن یہ سب جاننے میں اُسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہ باتیں کھلی کتاب کی طرح روز بروز اس کے سامنے آنے لگیں۔ کھیل کے دوران نشے میں ان عورتوں کی زبان کھلتی تو چپ ہونے میں نہ آتی جب مس پدما کمری جبہ پندرہ ہزار روپے ہار کر اور روپے لانے کے لیے گئی تو مسز آہوجہ نے رکمنی کی طرف

دیکھ کر کہا شالی روز جیت جاتی تھی آج پتہ چلا ہوگا۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ باپ بہت بڑا افسر ہے سُنا ہے کل ہی اس نے قتل کا کیس ٹھپ کروانے کے دو لاکھ روپے لیے ہیں اور پھر سب قہقہہ لگا کر یوں ہنس دی تھیں جیسے یہ کوئی مذاق کی بات ہو۔

ایک روز مسز آہوجہ بیس ہزار روپے ہاری گئیں تو واپسی کے وقت سیٹھانی نے کہا "رکمنی جی مسز آہوجہ کی کھال اور کھینچو، حرام زادی بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بناتی ہے، اس کا بھی گھر والا ہر ایک ریٹرن پہ لاکھ لاکھ روپیہ مانگتا ہے۔"

رکمنی کبھی آپ جیتتی تو کبھی سیٹھانی کو جتواتی۔ جوئے میں جیتے روپوں کا حساب ہوتا تو رکمنی کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ چند ہی مہینوں میں لاکھوں کی مالک ہو جائے گی۔ دادا اپنی جگہ خوش تھا وہ اسی علاقے کے پیسے والوں کے بگڑے لڑکے لڑکیوں کو بیس روپے گھنٹہ کے حساب سے اپنا گراج دے کر شراب کے نشے میں دھت گراج سے باہر لیٹ رہتا۔ اس نے تو کئی بار رکمنی سے اس کے فلیٹ کی چابی مانگی تھی لیکن رکمنی نہیں مانی تھی رکمنی صبح اٹھتی تو سیٹھ اپنی کار میں رات کی کمائی کا حساب کرنے آ پہنچتا۔ رکمنی کو اس کا حصّہ تھماتے ہوئے وہ اس کے ابھاروں، اس کے لمبے بالوں اور اس کی مدھ بھری آنکھوں کو دیکھ کر اپنا جی مسوس کر رہ جاتا کیونکہ سیٹھانی نے شاید اسے صبر سے کام لینے کو کہہ رکھا تھا۔

شراب، جوانی اور جیتی ہوئی دولت کے سہ آتشہ نشے میں چُور جب رات گئے رکمنی کسی کوٹھی یا کلب سے باہر نکلتی تو کئی کاروں کے دروازے اس کے لیے کھل جاتے، لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ اپنی اپنی بیویوں کی معرفت کی گئیں کوششیں بھی کارگر نہ ہوئیں تو تحفے تحائف اور روپوں کی گڈیاں، زیورات کے ڈبے اس کی طرف بڑھنے لگے تو کئی بار اُس کا من ڈول جاتا لیکن سیٹھانی کا وجود اس کی خواہشوں کے بیچ آ کھڑا ہوتا اور اس کی اپنی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ کسی طرح دو تین لاکھ روپے کما لے۔ پچاس ساٹھ ہزار روپے دادا کو دے دلا کر وہ بمبئی میں ٹھاٹھ سے رہ سکے۔ روز کے آنے جانے والوں میں اُسے ستندر بہت پسند تھا، وہ بہت بڑا افسر تھا لیکن اس میں افسری کی ذرا بھی بو نہیں تھی، وہ کتنا وضع دار تھا، بولتا تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں، پینے کے بعد تو وہ اور بھی حلیمی سے گفتگو کرنے لگتا اسے دیکھ کر رکمنی کو نہ جانے کون یاد آنے لگتا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ اس سے رسم و راہ بڑھائے مگر پھر وہی لاکھوں کا سپنا۔

ایک رات کلب سے نکلتے وقت سیٹھانی کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی اور رکمنی باہر نکل آئی ستندر اپنی کار میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ رکمنی سُرور میں تھی اور مرد کی قربت حاصل کیے اسے کئی دن ہو گئے تھے۔ ستندر نے کچھ ایسے پیار سے اُسے کار میں بیٹھنے کی دعوت دی کہ وہ انکار نہ کر سکی اور جب تک سیٹھ کی بیوی باہر نکلتی وہ ستندر کے ساتھ کار میں بیٹھ چکی تھی۔

ستندر نے کار اسٹارٹ کی تو ایک ہاتھ رکمنی کے کندھے پر رکھ دیا لیکن رکمنی بل کھا کر بولی "دیکھئے مسٹر ستندر آنٹی ناراض ہو جائیں گی۔ آپ گاڑی روک لیجئے پھر کسی دن سہی"۔

"ابھی چھوڑیئے آنٹی کو" ستندر نے رکمنی کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا

"نہیں مسٹر ستندر۔ ادھر مجھے صرف آنٹی کا سہارا ہے۔ میں ان کے ہاں علاج کے لیے ٹھہری ہوئی ہوں۔ پلیز مجھے اتار دیجئے۔ آنٹی خفا ہو جائیں گی۔ میری مانیے ستندر جی پھر کسی دن" رکمنی نے اپنی بغل سے اس کا ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آنٹی کیا سمجھیں گی۔ کیا خیال کریں گی میرے بارے میں"۔

ستندر نے رکمنی کی بغل سے ہاتھ نکال کر اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور رکمنی کی طرف پھینک دیا۔

"نہیں ستندر جی مجھے روپے نہیں چاہئیں۔ مجھے تو آنٹی سے ڈر لگتا ہے"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں۔ ڈھیروں جیتے ہیں آپ نے۔ میں پیسے نہیں دے رہا ہوں۔ آپ یہ پرس کھولیے"۔

رکمنی نے کنکھیوں سے ستندر کی طرف دیکھتے ہوئے پرس کھولا، اس میں دو عریاں لڑکیوں کی تصویریں تھیں جنہیں دیکھتے ہی رکمنی نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ یہ تصویریں سیٹھ کی دونوں لڑکیوں کی تھیں اور مختلف زاویوں سے ان کے جسم کے ایک ایک انگ کو نمایاں طور پر دکھایا گیا تھا۔

"ہوں۔ اب بھی آپ کی آنٹی جی ناراض ہوں گی؟ تمہاری آنٹی کو سب پتہ ہے کہ وہ دونوں میرے ساتھ مہینوں عشق کرتی رہی ہیں۔ آپ کی آنٹی ہی انہیں میرے پاس بھیجتی تھیں اور اُن میں سے کسی ایک کو دس لاکھ روپے سمیت مجھے مستقل طور پر دینے کو تیار تھیں۔ وہ بلا جھجک ہر موقعے بے موقعے باری باری میرے پاس بھیجتی رہتی تھیں۔ وہ ناراض نہیں ہوں گی" ستندر نے رکمنی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا۔ ذرا صبر سے کام لیں۔ گاڑی چلا رہے ہیں۔ کوئی حادثہ

نہ کر بیٹھنا۔"

"یہ تو زندگی ہی ایک حادثہ ہے۔ ہاں یہ میں نہیں چاہتا کہ حادثے میں کہیں چاند کو داغ لگ جائے" ستندر نے رکمنی کے گالوں سے بالوں کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

گھر پہنچ کر ستندر نے وی ڈی او آن کر دیا۔ بہت ہی پیاری دُھن میں کوئی لڑکی گانا گا رہی تھی۔ بیڈ روم کی سج دھج دیکھ کر رکمنی ہکا بکا رہ گئی۔ وہ کمرہ کسی ڈریم لینڈ سے کم نہیں تھا۔ تیز تیز روشنی میں حریری پردے کسی اڑن کھٹولے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اسکاچ وہسکی نے حلق سے اترتے ہی اس کمرے کو اور رومانٹک بنا دیا تھا۔ پھر۔ پھر۔ ناگاہ اس گانے والی لڑکی کی تصویر ٹی وی سے غائب ہو گئی۔

رکمنی بائی بلو فلم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "کیا کر رہے ہیں آپ مسٹر ستندر۔ میں کوئی مٹی تھوڑا ہی ہوں کہ جیسے چاہو میرے جسم کو مروڑ لو" اس نے ستندر کو پرے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لمحہ مرد کا کمزور ترین لمحہ ہوتا ہے وہ بولی "آپ کی انگوٹھی تو بہت شاندار ہے۔ ہیرے کی ہے کیا؟" پھر ہیرے کی وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں یوں سما گئی جیسے وہ اسی کے لیے بنائی گئی ہو۔

صبح جب رکمنی اپنے فلیٹ میں پہنچی تو سیٹھانی اس کے انتظار میں بیٹھی تھی اور رکمنی کو دیکھتے ہی جھلا کر بولی "رکمنی جی آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ کو پتہ ہے وہ کیسا آدمی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس نے اپنے بیڈ روم میں کیمرے فٹ کر رکھے ہیں۔ آپ کے انگ انگ کا فوٹو اس کے پاس رہے گا اور وہ جب چاہے گا آپ کو، آپ کی تصویروں کو استعمال کرے گا۔ مانا بہت بڑا افسر ہے لیکن ہے حرامی" سیٹھانی بولتی رہی اور رکمنی کے دماغ میں عیدو دادا اپنے روپ بدل بدل کر سامنے آ رہا۔

رات کی جیت کا حصہ رکمنی کو تھماتے ہوئے سیٹھانی بولی "اب وہ اکثر تمہیں اپنے ہاں بلوایا کرے گا اور اس کے بھی یار دوست تمہیں استعمال کریں گے اگر نہیں مانو گی تو تمہیں ڈرائے گا دھمکائے گا۔ سیٹھ جی بھی اس معاملے میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکیں گے۔ اگر تم کوئی قدم اٹھانے کا سوچو گی تو بھی اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں بڑے بڑے آدمی اس کے یار ہیں۔ آگر۔ خیر یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ رکمنی بائی تم نے رات شاید کچھ زیادہ پی لی تھی۔ میں نے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور کئی دن ہوئے جب تم پتے بانٹ رہی تھیں تو مسز اروڑا سنگھ تمہارے ہاتھوں کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ پولیس افسروں کی بیویاں بھی اپنے گھر والوں کی طرح بہت شکی مزاج ہوتی ہیں اور مسز اروڑا سنگھ ستندر کی بہت گہری دوست ہیں۔"

سیٹھانی کے جانے کے بعد رکمنی سیٹھانی کی کہی باتوں پر غور کرتی رہی۔ اس کے خیالوں میں کبھی دادا ستندر بن کر سامنے آ کھڑا ہوتا تو کبھی ستندر دادا بن کر۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور وہ نوٹوں کو پلنگ کے گدے کے نیچے چھپاتے ہوئے دروازہ کھولنے لپکی اور دروازہ کھولتے ہی پولیس کے سپاہیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عیدو دادا کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور پولیس والوں نے لپک کر جھٹ سے اس کے ہاتھ کے ہیرے کی انگوٹھی اتار لی تھی۔ کمرے کی تلاشی لی جانے لگی اور رکمنی ہکا بکا سی کھڑی اس پولیس افسر کی باتیں سن رہی تھی جو وہ ستندر سے کر رہا تھا "سر اتنک تو ہمیں پہلے ہی سے ہو گیا تھا۔ ہم نے ان کی تصاویر تو بہت پہلے ہی بمبئی پولیس کو بھیج دی تھیں۔ رات ہی وائرلیس پر ہمیں بمبئی پولیس نے ان کے بارے میں سب کچھ بتلا دیا تھا۔ ہم رات کو ادھر آئے بھی تھے لیکن یہ حرامزادہ گھر پر تھی ہی نہیں۔ ویسے سر وہ سیٹھ بھی بہت حرامی ہے"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ وہ ہم سب نپٹ لیں گے۔"

"ستر ہزار روپے ہیں جناب" تھانے دار نے کمرے کے اندر سے کہا۔ "آہستہ بولو تھانے دار۔ آہستہ بولو۔ سر اس حرامزادے سے پوچھو کہ اس کو سات ہزار تک گنتی بھی آتی ہے"۔ ◆◆

عتیق اللہ

۱

برت برت لیا ہر لمحہ، رائگاں کیا تھا
جب اس کی زد میں ہی آئے تو بھر گماں کیا تھا

نسوں میں قینچیاں چلتی تھیں ایک ساتھ کئی
کھلی نگاہ کے صدمے تھے درمیاں کیا تھا

زمیں کی ایک کرچ بھی نہیں تھی پانو تلے
تو پھر وہ قہر سا چاروں طرف رواں کیا تھا

کہاں کہاں سے گذر آیا نامرادانہ
پلٹ کے یہ بھی نہ دیکھا یہاں وہاں کیا تھا

زباں میں کئی سوراخ ہوگئے پیدا
ادا جو کر چکے اس چیخ میں نہاں کیا تھا

۲

پہاڑ رات تھی اور لمحہ لمحہ سنگ بہ پا
میں اس کی سمت کوئی جست بھی لگا نہ سکا

تمام خلق برہنہ کھڑی تھی پشت بہ پشت
اٹھا جو دست طلب بھی دراز دست ہوا

سبھی کے پانو کٹے ہیں، بریدہ سر ہیں سبھی
یہ کس طرف سے نکلنے کا اتفاق ہوا

کھڑے ہوئے تھے سبھی ایک ٹانگ کے بل پر
اور اس حصار سے باہر طلسم پھیلا تھا

میں کس زباں سے دہراؤں سرگذشت اپنی
مرے علاوہ کوئی بھی مرا شریک نہ تھا

کبھی تو توڑ مری ایک سی انا کا بھرم
کبھی تو ریڑھ کی ہڈی میں قہر بن کر آ

اے جی-۲۵۲ شالیمار باغ - نئی دہلی ۳۳

پرویز رحمانی

گیت

کھلے پڑے ہیں میرے آگے بڑھ کے اشٹ ادھیائے
مت کر اب اتیائے

اب تو سونا پن بھی اکیلا پا کر کاٹنے دوڑے
رات الگ دہلائے

آہ سہاگن ڈاہ
سکھیوں کا گدرایا جوبن بھی تو اب نہ سہائے

تیرا کیا ہے تجھ پر سئے دیالو
تو کیوں سوچے گا کہ مجھ پر کب کیا آئے جائے

میں بھی چنتا وشئے ہوں پیتم
کون تجھے سمجھائے

سب کی ہولی سب کی دوالی
میری ہی نہیں ہائے

ہو کر بھی میں نہیں ہوں تیری
من کو لگتی ہے سچ مچ میں رحمانی جی کی رائے

ڈورنڈہ، رانچی، (بہار)

گھوڑسوار

م۔ ناگ

۲- باندرہ پیراڈائز، ۳۳واں راستہ - آف لنکنگ روڈ - کھار - بمبئی ۵۲

لڑکی غضب کی حسین ہے مگر شادی کے لئے بیٹھی ہے۔

باپ ہفتہ پندرہ دن میں ایک چینڈو رخ کو پکڑ لاتا ہے اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر لڑکی کو سجنے کے لئے کہتا ہے۔ وہ سجتی ہے چائے اور فرسان سرو کرتی ہے۔۔۔۔ تب اس کی ناک اسکیل سے ناپی جاتی ہے اس کا بدن ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اس کی آواز کا شہد چکھا جاتا ہے۔۔۔۔ کبھی وہ پسند نہیں آتی کبھی باپ کی تجوری کمزور پڑ جاتی ہے۔

لڑکی کی شادی شدہ سہیلی جب اپنے بچے کے ساتھ گھر آتی ہے اور بچے کو گود میں اٹھائے لڑکی کلک رہی ہوتی ہے تو ماں کا بوجھ اور بڑھ جاتا ہے۔ بڈھا باپ چڑچڑانے لگتا ہے۔ جب وہ رانو کے اُپنیاس پڑھ رہی ہوتی ہے یا بنا کا گیت مالا سن رہی ہوتی ہے تب ماں ہر کس و ناکس سے کہتی ہے "تمہاری نظر میں کوئی ہو تو بولو۔ اچھے شادی ہو جائے لڑکی کی تو میں گنگا نہا لوں"

لڑکی شادی کے لئے بیٹھی ہے۔

ماں اور باپ پچھتا رہے ہیں "کاش ہماری لڑکی روز دو سونے کے انڈے دے۔ ایک کی جگہ دو۔ جیسے دنیش پانڈے کی کملا دیتی ہے۔

شادی کے لئے بیٹھی ہوئی لڑکی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ سب دھندلا دھندلا سا ہے۔ دھول ہی دھول ۔ کہاں ہے وہ لڑکا جو گھوڑے پر ٹھمکی چال سے آتا ہے۔ کہاں ہے وہ کہکشاں جس پر چل کر وہ اپنا سفر طے کریں گے۔ کہاں ہے وہ لڑکا جو مانگ ستاروں سے بھر دے گا۔

"ہم کب تک لڑکی کو بنا شادی کے بٹھائیں گے" ماں

"جب تک وہ گھوڑے سوار نہیں آجاتا" باپ

"کب تک وہ گھوڑے سوار نہیں آجاتا" ماں

"جب تک وہ انڈے دینا بند نہیں کر دیتی" باپ

"کیسے باپ ہو جی تم ۔ خود غرض ۔ وہ تمہارا خون ہے"

"تمہارا بھی تو ہے"

دیکھو جی ۔ وہ انڈے دینا بند کرے یا نہ کرے۔ یہ اُس کی مرضی مگر گھوڑے سوار آئے گا تو اسے ہم خالی ہاتھ نہیں لوٹائیں گے پچھلی دفعہ لوٹا دیا تھا اب نہیں لوٹائیں گے آخر کب تک ہم لڑکی کو بنا شادی بٹھائیں گے۔ دیکھو جی .....

"مگر دستک دینے سے پہلے ایسا لگا تھا کہ وہ آیا ہے۔ میں نے صاف سنی تھیں گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں"

میں نے نہیں سنی اور پھر گھوڑا کب ہنہنایا تھا"

دروازے پر دستک کی آواز لڑکی سن رہی ہے۔ لڑکی سپنوں سے بھرے بستر پر اٹھ بیٹھی ہے اور مسلسل گھوڑے کی ہنہناہٹ سن رہی ہے۔ مگر یہ طے نہیں کر پاتی کہ گھوڑا دروازے کے باہر ہنہنا رہا ہے یا اس کے اندر۔

وہ مندر میں بھگوان کے سامنے کھڑی ہے۔ بھگوان اُسے گھور رہا ہے۔ ایسے گھور رہا ہے جیسے گھور کر نظر انداز کر رہا ہو۔ وہ زور زور سے گھنٹے بجاتی ہے تاکہ بھگوان کی نیند ٹوٹے ۔ وہ جاگے ۔ وہ گھورے نہیں وہ دیکھے وہ کچھ کرنے کے لئے دیکھے۔ وہ زور زور سے گھنٹے بجانے لگتی ہے۔ گھنٹے بجاتے بجاتے اس کے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ گھنٹوں کی آواز پر سارا محلہ اکٹھا ہو جاتا ہے اور بھگوان ۔ بھگوان آواز سے پریشان اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے۔

روشنی آنے دو ۔ ہوا آنے دو ۔ دروازہ کھلا رہنے دو پتا جی"

باپ: بھیڑیا آجائے گا بیٹی

ماں: اور شیر ببر بھی آسکتا ہے"

باپ: ریچھ بھی آسکتا ہے

ماں: اور لکڑ بگھا

لڑکی: گھوڑے سوار بھی تو آسکتا ہے۔

ماں اور باپ: ہاں گھوڑے سوار بھی آسکتا ہے

باپ: مگر شیر ببر۔ ریچھ۔ بھیڑیا اور......

لڑکی: بندوق تو ہے نا آپ کے پاس

"ہاں ہے تو بندوق میرے پاس ــــ مگر وقت پر چلے گی بھی یا نہیں بارود کم ہے اور کارتوس بھی تو ختم ہو گئے" باپ سر کھجاتا ہے۔

"اوہ ــ ایسا کیجئے۔ پرانے صندوق میں ڈھونڈیے۔ ایک ادھ کارتوس مل ہی جائے گا۔ بندوق پہلے مجھ پر آزمائیے۔ چلتی ہے یا نہیں پتہ چل جائے گا" لڑکی سمجھاؤ دیتی ہے۔

"تم مر جاؤ گی بھولی بیٹی"

"مر جانے دیجئے ــــ ابھی کون سی جی رہی ہوں"

"انڈے دے رہی ہو اس کا مطلب جی رہی ہو" ماں اور باپ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہتے ہیں"۔ انتظار کرو بیٹی وہ آئے گا۔ گھوڑے سوار

لڑکی تڑپ جاتی ہے "کبھی نہیں آئے گا وہ اس سڑک سے گذر جائے گا آپ بھیڑیا سمجھ کے دروازہ نہیں کھولیں گے"

"مگر ہمیں گھوڑ سوار کو اپنی بیٹیا دینی ہے اس کے آنے تک رکنا ہوگا۔

"انتظار کی بھی حد ہوتی ہے" لڑکی روہانسی ہو جاتی ہے۔

لڑکی اب سینچر کا ورت ــــ بھی رکھ رہی ہے۔ ساون کے سات سوموار تو اس نے کئے تھے۔ جوتشی نے کہا ہے ستمبر میں گرد کی دشا ہے کہیں گہرے کنوئیں میں ننھے ننھے ہاتھ جیسے بلاتے ہیں بدن کا کسا ڈھلوسات کی کی سیون ادھیڑ رہا ہے اور ستمبر میں گرد کی دشا ہے کب آئے گا ستمبر ــ پچھلے کئی سالوں سے تو ستمبر آ ہی نہیں رہا ہے۔ اگست کے بعد سیدھے اکتوبر آجاتا ہے۔ کہاں ہے ستمبر"

"ستمبر یہاں ہے۔ یہاں ہے میرے پاس" گھوڑ سوار جیسے کانوں میں بولتا ہے "میں آرہا ہوں۔ بس چل چکا ہوں" آئی ایم آن دی وے" ــــ

ماں باپ پھسپھسا رہے ہیں۔

"کچھ بھی ہو ــــ مگر میں اپنی لڑکی اُسے نہیں دوں گی۔ سُنا ہے اس کے گھر بکن سے بھی بڑا اسٹو ہے"

"بکن سے بھی بڑا اسٹو؟!"

"ہاں بکن سے بھی بڑا اسٹو ــــ ہمیشہ بھر بھراتا رہتا ہے پتہ نہیں کب پھٹ جائے اور ہماری بھول جیسی لڑکی ....."

"آپ شگن مت بولو"

گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں سارے کمرے میں بھر گئی ہیں اور مسلسل تھاپ دروازے پر ــ ساتھ ہی دستک در دل پر ــ لڑکی چوکنی ہو جاتی ہے۔

ماں اور باپ گہری نیند میں خراٹے بھر رہے ہیں۔

سڑک سے سرپٹ بھاگتا گھوڑ سوار چاروں طرف دھول ہی دھول

ٹپاک ــــ ٹپاک ــ ٹپاک ــ ٹپاک

رک جاؤ، گھو ــ ڑ ــ ے ــــ سوار" لڑکی چیختی ہے۔ اور چیخ سن کر جاگ جاتی ہے چاوری باوری اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔ ماں اور باپ اس کے سرہانے کھڑے ہیں۔

"کیا ہوا"

"رکا نہیں ــ گذر گیا"

کوئی ہے ــ جو دروازے پر مسلسل دستک دے رہا ہے۔

"بھیڑیا ہے"

"نہیں گھوڑ سوار"

"نہیں بھیڑیا ــــ دیکھو اس کی دم"

"نہیں ریچھ ہے جھری میں سے دیکھ رہا ہے"

"آہٹ تو ۔ شیر ببر کی ہے"

"نہیں بھر بھراتا اسٹو ــــ بکن سے بھی بڑا"

"نہیں"

"ہاں"

باپ آگے بڑھتا ہے دروازہ کھولنے کے لئے ــــ ماں باپ کے پیچھے کھڑی ہے۔ لڑکی نے دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا ہے۔ اب تو اسے اوڑھنا بھی نہیں پڑتا ہے بلکہ خود ڈوپٹہ اس کے سر پر اپنے آپ چلا جاتا ہے۔ چھاتیوں کو ڈھک لیتا ہے چھاتیاں کہ جو اس کے دل پر پیپر ویٹ کی طرح دھری ہیں۔ کہ دل پر کٹا کبوتر ہے ــــ کھٹاک سے دروازہ کھلتا ہے۔ مگر کچھ صاف نہیں ہے۔ گہرے دھند لکے ہیں۔ دھول ہی دھول بھری ہے تبھی اچانک دقت کی دھول کمرے میں در آتی ہے اور بالوں کو چاندی بنا جاتی ہے۔

کہاں ہے کوئی ــ کوئی نہیں ہے

کیا ہوا شرارت کر رہی ہے

لڑکی مسلسل گھوڑے کا ہنہنانا سن رہی ہے مگر کچھ طے نہیں کر پاتی کہ گھوڑا دروازے کے باہر ہنہنا رہا ہے یا اس کے اندر ماں باپ بڑبڑا رہے ہیں۔

ہم لیٹ ہوئے دروازہ کھولتے میں۔ واقعی لیٹ ہوئے"

"پتہ نہیں کیا ہوئے"

"لیٹ تو ہم ویسے بھی ہو گئے"

"لیکن وہ آیا ضرور تھا کیوں کہ پاؤں کی آواز سنی تھی میں نے" "آیا تھا تو کہاں گیا — تمہارے کان بجنے لگے ہیں"

"پتہ نہیں تمہارا کیا کیا بج رہا ہے۔ میرے تو صرف کان بج رہے تھے"

"ہم لیٹ ہوئے"

"ہم مشورہ کرتے رہ گئے"

"ارے تمہارے بال"

"کیا ہوا میرے بالوں کو"

"ارے تمہارے بال سفید ہو گئے"

"کہاں ہے آئینہ — ارے اور تمہارے چہرے پر جھریاں باپ رے کتنا وقت بیت گیا ہم نے کتنی مدت تک دروازہ نہیں کھولا۔ ہم تبدیل ہوتے گئے اور خبر بھی نہیں"

"کہاں ہے گھڑی — کہاں ہے کیلنڈر — کہاں ہے سورج۔ کتنا وقت بیت گیا" "اور آپ مشورہ کرتے رہ گئے" لڑکی کہتی ہے۔ وہ نیلی پڑ گئی ہے۔ صرف آنکھیں انگارہ سی دہک رہی ہیں۔ یہ گھڑی چلتے چلتے بند ہو گئی ہے۔ اس کیلنڈر نے دھوکا دیا ہے۔ سورج نکلتا ہے مگر اندھیرا کم نہیں ہوتا۔ اور وہ دروازہ — وہ بڑا شریر ہے خواہ مخواہ بجتا ہے۔ آپ کے کان نہیں بجتے ہیں وہ دروازہ بجتا ہے۔ پھینک دو یہ گھڑی۔ پھاڑ دو کیلنڈر۔ کھول دو دروازہ — ہوا آنے دو اگر روشنی کہیں ہے تو اُسے بھی آنے دو۔ یہ سیلن یہ برسوں کی سیلن روشنی کا انتظار کرتی ہے" سارے کمرے میں سیلن کی وجہ سے کُکرمُتّا کی جھریاں اُگ آئی ہیں۔

"دیکھو یہ MASHROOM — یہ کُکرمُتّے کی جھریاں — وقت کتنے اس کمرے کی زندگی پر پیشاب کیا ہے۔ دیکھو دیکھو لڑکی چیختی ہے لگتا ہے اس کی شہ رگ پھٹ جائے گی اور شُر شُر خون بہنے لگے گا۔

لڑکی گھڑی دیوار سے اتار کر پھینک دیتی ہے کیلنڈر کے پرزے پرزے کر دیتی ہے۔ پرزے کمرے میں بکھر جاتے ہیں اور کیلنڈر کی تاریخیں ہوا میں اڑنے لگتی ہیں۔

"کھول دو دروازہ اگر روشنی کہیں ہے تو آنے دو — اس سے پہلے کہ نہیترہ پھٹ جائے اور ریزہ ریزہ دانے ہوا میں بکھر جائیں۔ اس سے پہلے کہ ملبوس کا آخری ٹانکا ٹوٹ جائے۔ کاٹ ڈالو مجھے۔ نکال لو سارے انڈے" لڑکی سسکنے لگتی ہے کھلا ہے بیٹی دروازہ — مگر بھیڑ بھیڑیا باپ اندیشہ ظاہر کرتا ہے — تب لڑکی فیصلہ کن لہجے میں کہتی ہے —

"آ جانے دو"

◆◆

پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکر دوار، بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا

بسمل نقشبندی

جب شب نے جاتے جاتے سویرا اُگل دیا
ہر شے نے اپنے جسم سے سایا اُگل دیا

ہر سمت لُو کے جھونکے ہیں اور اُڑ رہی ہے گرد
مجنوں نے آکے شہر میں صحرا اُگل دیا

اک دوسرے سے ہو گیا ہر شخص بدگماں
محفل میں کس نے رازِ یہ گہرا اُگل دیا

شیشے میں اپنا عکس جو دیکھا تو یوں لگا
خود ہم نے جیسے اپنا سراپا اُگل دیا

کیا جانے کیوں نگاہِ مصوّر نہ ہٹ سکی
کاغذ پہ جب قلم نے وہ چہرا اُگل دیا

صدیاں لگی تھیں جس کو نگلنے میں وقت کو
پھر آج وقت نے وہی لمحہ اُگل دیا

بسملؔ بکھر کے رہ گیا شیرازۂ شعور
آنکھوں نے جب وہ خواب سنہرا اُگل دیا

● کسٹم روڈ۔ بانسواڑہ (راجستھان)

جمیل قریشی

لہولہان تھا سارا بدن دریدہ تھا
وہ شخص معرکۂ ظلم آفریدہ تھا

وہ کیا صدا تھی جسے سُن کے مضطرب تھے لوگ
ہر ایک چہرے سے رنگِ سکوں پریدہ تھا

نہ رزقِ خوف ہوئی آنکھ کی چمک اس کی
اگرچہ خاک پہ وہ دست و پا بُریدہ تھا

کئے حروفِ تمنّا کے سر قلم اُس نے
ہر ایک صفحۂ قرطاس خوں شریدہ تھا

وہ احتیاط کہ ہر آنکھ سے ہوا رُوپوش
وہ وحشتیں کہ ہر آہٹ پہ پا تُریدہ تھا

جمیلؔ دشتِ بلا میں کیا قیام اُس نے
کہ جان و دل کا یہ دُکھ اس کا خود خریدہ تھا

● معرفت: پی۔ ڈبلیو۔ آئی آفس ویسٹرن ریلوے
رانا پرتاپ نگر۔ اودے پور (راجستھان)

فرید پربتی

رہ شکستہ، فاصلے دشت و سراب
سلسلے ہیں زیست کے دشت و سراب

کچھ نہیں میرے لئے جُز تشنگی
میری قسمت میں لکھے دشت و سراب

اس جگہ مجھ کو اڑا لائے ہوا
ہیں جہاں کے آسرے دشت و سراب

کیوں نہ قسمت خود شناسی کی بڑھے
آئینے بننے لگے دشت و سراب

جانے کس کے گھر مجھے لے جائیں اب
بے نوائی رت جگے دشت و سراب

● شئین دروازہ، رعنا واری۔ سرینگر ۱۰ (کشمیر)

ظہیر ناشاد

کو بہ کو صحرا بہ صحرا، در بدر کی بات ہے
زندگی کیا ہے یہ روداد سفر کی بات ہے

وہ تو دیوانہ تھا اے دانشورو! پھر کس لئے
سب کے ہونٹوں پر اسی آشفتہ سر کی بات ہے

حادثوں کو ہم سفر اپنا جو سمجھے راہ رو
یہ جہاں اس کے لئے گردِ سفر کی بات ہے

ہم نے جھیلیں ہیں مہذب زندگی کی سختیاں
ہم سے پوچھو اس میں کتنے دردِ سر کی بات ہے

اپنے گھر میں بھی سکوں سے آج رہنا ہے محال
چُپ رہو سن لے گا کوئی اپنے گھر کی بات ہے

دوستوں سے مل کے اب ناشاد ہوتا ہے گماں
میرے اندر بھی کوئی شاید ہنر کی بات ہے

● ۱۱ واٹ گنج اسٹریٹ، روم ۳۲۔ خضر پور
کلکتہ ۲۳

حالات

قاسم خورشید ● ایجوکیشنل ٹیلی ویژن۔ ایس سی۔ ای آر ٹی۔ بہار مہندرو۔ پٹنہ ۔۶

اس پُرشکوہ عمارت میں بسے ہوئے لوگ ملک کی سرحدوں سے باہر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ جو بھی اس شہر میں جاتا زیارت کے لیے اس مقام پر ضرور پہنچتا۔ عمارت میں داخل ہونے کے لیے کئی دروازے تھے لیکن عام آدمیوں کو ہر دروازے سے داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اگر کوئی جانا بھی چاہتا تو گارڈ اُسے دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔

شام ہوتے ہی کچھ مخصوص دروازے کھلتے آسمانوں سے زمین پر اترنے والی پریاں دکھائی دیتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پائل کی جھنکار فضا کو موسیقیت بخشتی۔ گارڈ انہیں بہت احترام سے اپنے اپنے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کرتا۔ پریاں کھلکھلا اٹھتیں۔ گارڈ مسکرا دیتا۔ پھر کچھ اور دروازے مات کے پچھلے پہر کھلتے۔ اس میں دوسری دنیا کے اہم لوگ داخل ہوا کرتے تاریک راتوں میں بھی ان کی آنکھوں پر کالا چشمہ ضرور ہوا کرتا۔ لباس سے پھوٹتی ہوئی خوشبو بہت دیر تک فضا میں تحلیل ہوتی رہتی۔ کئی گارڈ انہیں سلامی دیتے۔ اکثر لوگوں کے پاس چھوٹا سا بریف کیس ضرور ہوا کرتا اور جب وہ دروازے سے باہر نکلتے تو صبح ہو چکی ہوتی اب ان کی آنکھوں پر نہ کالا چشمہ ہوتا اور نہ ہی بریف کیس۔ معاملہ کچھ عجیب تھا۔

ایک روز اس عمارت میں ہنگامہ ہوا۔ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی گئی پر تھوڑی دیر بعد ہیلی کوپٹر سے کوئی نیا ڈاکٹر اترتا اور اس عمارت کے مالک رائے جنگ بہادر کے کمرے کی طرف لپکتا۔ کار سے آنے والے ڈاکٹر انھیں دیکھ کر احترام سے کھڑے ہو جاتے۔ جنگ بہادر بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور آج اُن کا دل دورے پر تھا، یہ ان کے لیے سخت پریشانی کا باعث ہوا۔ ڈاکٹروں کی لگاتار کوششوں سے انہیں بچا لیا گیا۔ پھر بھیڑ دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی اور ان کی دنیا حسب معمول آباد ہوئی۔ دوسرے روز انہوں نے اپنے چاروں بیٹوں کو کمرے میں بلایا

اس لکڑہارے کی طرح جو مرنے سے پہلے اپنے لڑکوں کو نصیحت دے گیا تھا سبھی بوڑھے باپ کے پاس احترام سے کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے نے ان سے الگ الگ مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”رائے لنگ بہادر یاد رہے کہ تم کو دیش کا سب سے بڑا تاجر بننا ہے اپنے کاروبار کو دور دور تک پھیلانے کے لیے تمہیں ہر ممکن راستہ اختیار کرنا ہے، بلکہ ناممکن بھی۔ تالاب کی بڑی مچھلی کی شناخت اسی وقت قائم ہوتی ہے جب وہ تمام چھوٹی مچھلیوں کو نگل جائے غیر ملکی تاجر بھی ہمیں اپنا بھرپور تعاون دے رہے ہیں۔ ہماری یہ ساکھ دن بہ دن مضبوط ہونی چاہیئے“۔

پھر بوڑھا دوسرے بیٹے سے مخاطب ہوا۔ ”رائے ذنگ بہادر تم ہماری ریاست کے ذمہ دار سیاسی لیڈر ہو۔ ہم نے تم کو بہت بڑا اہم ذمہ داری سونپی ہے۔ تم عوام کی امیدوں کا سہارا ہو۔ انہیں کبھی یہ پتہ نہیں چلنا چاہیئے کہ ان کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں۔ جس روز ان میں یہ احساس جاگا، سمجھ لو کہ ہم محفوظ نہیں رہ پائیں گے۔ ہمارے پرکھوں کی شان پل بھر بھی کہیں کھونے نہ پائے۔ میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں تمہیں اپنے ذہن سے کام لینا ہے“۔

اب بوڑھا تیسرے بیٹے کے سامنے کھڑا تھا۔ ”رائے رنگ بہادر تمہیں میں نے جو کام سونپا ہے، جانتا ہوں کہ بہت مشکل ہے، لیکن پرچار اور پرسار سے سب کچھ ممکن ہے۔ آج دنیا کے ہر دیش میں لوگ تمہارا پروچن سنتے ہیں اور بھکتی کی بھاونا ویکت کرتے ہیں۔ ہم معمولی تبدیلیوں کے بعد ساری دنیا میں ایک نیا دھرم پھیلانا چاہتے ہیں تاکہ ہر گھر میں بھگوان کی جگہ ہماری تصویریں ہوں۔ چاہے اور جو بھی راستہ چننا پڑے ہمیں لیکن ان کے دل میں شردھا کی بھاؤنائیں پیدا کرنی ہیں۔ اپنے بنائے ہوئے مذہب کے اصولوں پر سبھوں کو چلنے

کے لیے مجبور کرنا ہوگا لیکن اس کے لیے تمہیں ادھیک بولنے کی ضرورت
نہیں ہے۔ ہاں فلسفہ کی کچھ کتابیں ضرور پڑھ لو۔ جو بات آسانی سے
سمجھی جا سکتی ہے اسے اور الجھا دیتا کہ اس میں نیا پن معلوم ہو۔
کہ ساری دنیا آدھونکتا کی طرف بھاگتی ہے۔"

بوڑھا اپنے چھبیس سالہ چھوٹے بیٹے وجے سے مخاطب ہونے
سے پہلے خاموش ہو کر اسے گھورتا رہا۔ بوڑھے کو دکھ تھا کہ وجے
نے اچانک اپنا خاندانی نام بدلنا کیوں مناسب سمجھا۔ بغیر کسی مقصد
کے یہ اس قدر تعلیم کیوں حاصل کر رہا ہے؟ وہ کتابیں جو ہماری دشمن
ہیں اکثر اس کے ہاتھ میں دیکھی گئی ہیں۔ وہ لوگ جو ہمارے دشمن
ہیں، اکثر ان کے ساتھ بھی اسے دیکھا گیا ہے۔ یہ اس عمارت کا ایک
حصہ ہو کر بھی ہم سے الگ کیوں ہے؟ پھر بوڑھے نے سچ مچ بولنا
شروع کیا۔

"وجے تعلیم اچھی چیز ہے لیکن دنیا بھر کی بکواس کتابیں پڑھنے
کی تمہیں ضرورت ہی کیا ہے۔ تم ان کتابوں اور فٹ پاتھ کے لوگوں
کی وجہ سے میری دنیا سے بالکل الگ ہوتے جا رہے ہو۔ ابھی تم
جوان ہو۔ اس لیے خون گرم ہے۔۔۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں یہی سب
اچھا لگتا ہے تو میرا پیغام انٹیلکچوئل کلاس تک پہنچانے کا کام کرو
تاکہ یہ طبقہ بھی ہمارا بھگت ہو جائے اور پھر یہ ڈگر جب بھی تمہیں
کٹھن لگے اپنا اصل نام دنیا کے سامنے پیش کر کے بھائیوں کے
کاموں میں ہاتھ بٹانا۔ ویسے مجھے تمہارا یہ نام بالکل پسند نہیں۔"

وجے کی زبان کبھی اپنے پتا جی کے سامنے نہیں کھلی تھی لیکن اس
نے تب یہ ضرور کہہ دیا تھا کہ "میں اب اپنا نام بدلنے والا نہیں ہوں"

اس بات پر گھر کے دوسرے افراد چونک پڑے۔ باپ کا
دل ایک بار پھر تیز رفتاری سے دوڑنے لگا تھا۔ وجے کو بہت سمجھانے
کی کوششیں کی گئیں لیکن معاملہ اور بھی گمبھیر ہوتا گیا۔

دوسرے روز شام ہوتے ہی اچانک عمارت کو چاروں طرف
سے لوگوں نے گھیر لیا۔ بھیڑ دھیرے دھیرے بڑھتی جا رہی تھی۔ کئی دنوں
تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ریاست کے ہر خطے سے لوگ پہنچ چکے تھے۔
اس بھیڑ کو دیکھ کر عمارت کا ہر شخص خوف زدہ تھا، لیکن
بوڑھا بہت پریشان نہیں ہوا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے چاروں
بیٹوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ تین بیٹے تو آ گئے لیکن وجے ان میں نہیں
تھا۔ عمارت کے دوسرے افراد اسے تلاش کرنے لگے۔ بوڑھا
تینوں کے ساتھ سرگوشیوں میں مشغول تھا۔ دیر تک تبادلۂ خیال
کے بعد بوڑھے نے انہیں عمارت کے اس حصے میں بھیج دیا جہاں سے
عوام کو دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن بہت قریب ہونے کے باوجود عوام انہیں
چھو نہیں سکتے تھے۔ تینوں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ
سے مختلف آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ہر شخص بیزاری کے عالم میں تھا
ان کے پاس ڈھیر سارے مسائل تھے کسی نے کہا۔

"کل ہماری جوان بیٹی کو تمہارے آدمی یہاں اٹھا لے آئے تھے۔
اسے تم لوگوں نے نوچ نوچ کر ختم کر دیا۔ میں اس کی نعش کے ساتھ
یہاں آیا ہوں۔ مجھے بتاؤ یہ کس جرم کی سزا ہے۔"

دوسری آواز۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہمارے گاؤں کی فصلوں
کو ہریالی بخشو گے۔ ہمیں پورے طور پر بھوک سے نجات حاصل ہو
سکے گی لیکن بچی کھچی فصلوں کو بھی تمہارے آدمی لوٹ کر لے آئے۔
یہ اندھیر نہیں تو اور کیا ہے؟

تیسری آواز۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے شہروں کے دنگوں میں
تم ہی شامل ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ ہم چھوٹے کاروباری اپنی محنت
و مشقت سے آگے بڑھیں۔ تم نے اپنے مفاد کی خاطر ہمارے رشتوں
میں زہر بھر دیا ہے تمہیں آج ہی اس کا انصاف کرنا ہوگا ورنہ
اس عمارت کو ہم سب مل کر تباہ کر دیں گے۔

آوازیں اسی طرح گونجتی رہیں۔ قانون۔۔۔ روٹی۔۔۔
ریپ۔۔۔ مذہب۔۔۔ زبان۔۔۔ فساد۔۔۔ ایسے اور بھی
دوسرے مسائل ابھرتے رہے۔ تینوں کے پاس ان مسئلوں کا حل
تھا۔ ہاتھ جوڑ کر عوام کے سامنے کھڑے رہنا اور [illegible]۔

پھر ان کے مطابق انتہا پسندوں نے توڑ پھوڑ کا کام شروع
کر دیا اور روایت دہرائی گئی۔۔۔ آنسو گیس۔۔۔ گولیاں۔
کرفیو۔۔۔ قتل۔۔۔ بم۔۔۔ اور کچھ اخباروں پر پابندیاں۔
تب معاملہ بظاہر کسی حد تک نارمل ہو گیا۔

بوڑھا سمجھ چکا تھا کہ اس بغاوت کے پیچھے وجے کا ان لوگوں
کو بھرپور تعاون حاصل ہے۔ ورنہ اتنی ساری باتیں عوام تک
نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ بوڑھا ایک بار پھر فکر مند نظر آنے لگا اور اس
نے تنہائی میں وجے کو بلا کر اپنی سطح پر بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ تب
بھی اس نے بوڑھے کے اقوال سے احتراماً بھی احتجاج نہیں کیا۔ بوڑھے
کی تجربہ کار آنکھیں وجے کے اندر سلگتی ہوئی چنگاریوں کو شدت سے

اپنے اندر جذب کرنے لگیں۔ آئے دن عمارت پر کوئی نہ کوئی پتھر پھینکا جاتا۔ کسی نہ کسی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہوتا۔ کبھی کبھی کرچیاں بوڑھے کے وجود کو بھی چبھو جاتیں اور وہ تلملا اٹھتا۔ تینوں بیٹے بہت تجربہ کار نہ ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پریشان تھے انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔۔۔ تینوں خوف زدہ تھے کہ کہیں ان کا قتل نہ کر دیا جائے ۔۔۔ بوڑھا بھی ان خطرات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

جب وجے کے کمرے میں عام آدمیوں نے آنا جانا شروع کر دیا تو بوڑھا اور زیادہ فکر مند ہو گیا۔ حالانکہ اس کے تینوں بیٹے بہت حد تک خوش تھے کہ عام آدمیوں سے دھیرے دھیرے ان کا رشتہ ٹھیک ہوتا نظر آرہا تھا۔ بوڑھا ان کی اس نادانی کو دیکھ کر بالکل نراش ہو گیا تب اسے یہ بھی احساس ہونے لگا تھا کہ ممکن ہے ہماری نسل یہیں ختم ہو جائے۔ بوڑھے کا ذہن پھر بھی کام کر رہا تھا اور ایک رات اس عمارت میں پھر کئی بڑے بڑے ڈاکٹروں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا عمارت کے باہر دنیا نے سمجھا کہ بوڑھے پر پھر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ملک کے کچھ بڑے اخبارات بھی یہی بول رہے تھے۔ لیکن اس بار بوڑھا بالکل ٹھیک تھا۔ وہ گھنٹوں ڈاکٹروں سے گفتگو کرتا رہا اور انجام کار وجے کو باضابطہ طور پر پاگل قرار دیا گیا۔

جب اسے یہ خبر ملی تو وہ زور زور سے چلانے لگا اسے بیہوشی کا انجکشن دیا گیا اور رات کے ہی کسی حصے میں پاگل خانے پہنچا دیا گیا۔

ہوش آنے پر اس نے پاگل خانے کی دیواروں سے سر ٹکراتے ہوئے کہا۔ "میں پاگل نہیں ہوں"۔ دیواریں بول سکتی تھیں لیکن انھیں بولنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کی دیوانگی کو دیکھ کر رونا بھی چاہتیں لیکن ان سے تمام آنسو چھین لیے گئے تھے۔ جب وہ ان پاگلوں کی دنیا میں یہ کہتا کہ میں ایک بھیانک سازش کا شکار ہو گیا ہوں تو دوسرے پاگل اس کا مذاق نہیں اڑاتے بلکہ اپنی سطح پر اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ یہ عجیب سی دنیا تھی۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا تو دیواریں اسے بغور دیکھنے لگتی وہ اسے تھپکیاں دینا چاہتی تھیں لیکن ایسا بھی ممکن نہیں تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھنا تھا۔

پرشکوہ عمارت میں بسے ہوئے لوگ ملک کی سرحدوں سے باہر اور بھی دور تک پھیلتے گئے۔ عمارت پھر سے زیارت گاہ بنی۔ کالے چشمے والا دوبارہ رات کے درمیانی پہر میں آنے لگا۔ آسمانوں سے اترنے والی پریاں عمارت کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کھکھلانے لگیں اور گارڈ پہلے کی طرح مسکرانے لگا۔

کئی ماہ گزر جانے کے بعد پاگل خانے کے نظام میں خاص تبدیلی آئی۔ اب اس جگہ شور بہت کم ہو گیا تھا سبھی اداس اداس سے رہنے لگے تھے۔ وجے بھی بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کو پہچاننا نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھا اکثر پاگل خانے آتا اور دیر تک اپنے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا پھر تینوں بھائی آتے اور اپنی بے پناہ محبتوں کا اظہار کرتے۔۔۔ لیکن وجے پر اس دوران کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔ خاموشی اور صرف خاموشی۔۔۔ بوڑھا باپ اور تینوں بھائی اس کی نظروں سے دور جانے لگتے تو وہ انہیں دیر تک جاتے ہوئے ضرور دیکھتا پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آتیں۔۔۔ اب دیواریں بھی خود کو توڑ دینا چاہتی تھیں۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ ماحول کی ہر شے اس کی ایک آواز پر عقیدت کے ساتھ وجد کرنے کو تیار ہو چکی تھی لیکن اب وہ کچھ نہیں بول سکتا تھا مگر دھڑکنیں تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھیں ہر پل نئی دنیا کی تعمیر کے ساتھ دھڑکنیں اس کے ذہن میں منتقل ہو رہی تھیں اور اسی بیچ وہ سچ مچ پاگل ہو گیا۔

تب اس کی روتی ہوئی آنکھوں اور گہری خاموشی نے دیواروں سے سرگوشیاں کیں۔ دیواریں اس پار کے انسانوں کو یہ داستان سنانا چاہتی تھیں لیکن کسے فرصت تھی۔ تاحد نظر انسانوں کا سیلاب پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ خاموشی انہیں رک جانے کا اشارہ کرتی رہی۔ فریاد بھی نہ سنی گئی۔ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ پھر دیواریں توڑ دی گئیں لیکن وجے اسی مقام پر کھڑا رہا کہ شاید کچھ لوگ اسے پہچان لیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ چہار سمت سے اس پر پتھر ہی برسے۔ تب اسے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی اور سہارا بنا اسی کا بوڑھا باپ جو اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ رات کی تاریکیوں سے ابھرا اور اسے اپنی دنیا میں لے گیا۔

ان کا خیال تھا کہ ایسا مجسمہ جس میں زبان نہ ہو لیکن حرکت کر سکے، ہمارے نظام کے لیے انمول تحفہ ہے۔ ◆◆

حسیب سوز

ہم سے اس رات کا منظر مت پوچھ
ہاتھ میں کس کے تھا پتھر مت پوچھ
خشک رستوں کا سفر ہے تیرا
کتنا گہرا ہے سمندر مت پوچھ
عشق اک دشتِ زیاں ہے اب تک
اس مسافت کا مقدّر مت پوچھ
اک نہ اک دن وہ ضرور آئے گا
راز کی بات ہے گھر گھر مت پوچھ
میری بھیگی ہوئی آنکھوں کا سبب
یہ گذارش ہے کہ ہنس کر مت پوچھ
یہ میرے شہر کی جگ مگ گلیاں
ختم ہوتی ہیں کہاں پر مت پوچھ
پھول شاخوں سے جدا کیسے ہوئے
اس کہانی کو ستم گر مت پوچھ
اس نے اک لفظ لکھا تھا خط میں
بن گیا کیسے یہ دفتر مت پوچھ

مدیر: "لمحے لمحے" امام باڑہ
الہ پور، ضلع بدایوں

اقبال ہاشمی

اداس ہے مرا سورج اداس میں بھی ہوں — اکیلے تم ہی نہیں بدحواس میں بھی ہوں
نکال لیتا ہوں اپنی جگہ جہاں چاہوں — ہواؤں کی طرح موسم شناس میں بھی ہوں
سبھی کو سنتی ہے خلقت مجھے بھی سن لے گی — ترے کلام کا صوتی لباس میں بھی ہوں
تمام کوچہ و بازار ہیں مری مانند — رہینِ منّتِ خوف و ہراس میں بھی ہوں
زمین و آسماں تجھ پہ نثار ہیں لیکن
ترے حضور سراپا سپاس میں بھی ہوں

مکان نمبر ۱۸-۲-۸۸۸-۱۰/ ۲۲۳ حیاوَنی غلام مرتضیٰ اعلک نما، حیدرآباد۔

انور ادیب

کس کا حساب، کس کی سزا باقی رہ گئی — کیا باقی رہ گیا کہ قضا باقی رہ گئی
تاریک شہرِ دل میں ہے اک چاند یاد کا — بس اک یہی امیدِ ضیا باقی رہ گئی
شامل ہواؤں میں ہے تری خوشبوئے بدن — اور بارشوں میں تیری نوا باقی رہ گئی
سب رنگ اڑ گئے گل و ساغر کے تیرے بعد — لیکن وہ خوشبوؤں کی فضا باقی رہ گئی
کچھ دن ابھی یہ کارِ تنفّس چلے گا اور — اس شہرِ دل میں اتنی ہوا باقی رہ گئی
ملتا ہے کون ترکِ تعلق کے بعد پھر — کیوں دل میں حسرتوں کی فضا باقی رہ گئی
کیا بات تھی کہ رنجشیں اتنی بڑھیں ادیب
تکمیل آرزوئے وفا باقی رہ گئی

مظہر مینشن، گوری شنکر روڈ، جگسلائی، جمشید پور ۸۳۱۰۰۶

بلقیس ظہیر الحسن

خواب، خوشبو، رنگ و منظر ہر طرف روشن دیئے — اور ان کے بیچ ہم، تنہا بجھا اک دل لیئے
بے سبب، بے کار، یوں ہی روز و شب کے سلسلے — کچھ تو کہہ اے زندگی! کچھ تو بتا، ہم کیوں جیئے؟
پیار، اخلاص و وفا، سب موہ مایا، سب فریب — جانتے تھے ہم، مگر جینا تھا، سچ مانا کیئے
وسعتِ صحرا نصیبِ شورشِ وحشت کہاں! — گھر کی دیواروں ہی سے دن رات ہم الجھا کیئے
ہو گیا اک بار میں ہی کنٹھ نیلا آپ کا! — ہم رہے جیسے کے ویسے اور کتنے وِش پیئے
جانے کیسی آگ میں جلتے رہے تا عمر ہم! — ایک شعلہ بھی نہ لپکا، بس دھواں دیکھا کیئے
اپنے اندر کے بھنور سے، جان کر انجان تھیں؟
آپ اب بلقیس بی! یوں ہی ابھریئے ڈوبیئے

۳۰۴۔ ٹیگور روڈ ہوسٹل، نئی دہلی۔۲

راکھشس اور انسان

ہندی۔ وشنو پربھاکر
ترجمہ۔ ایس۔ ایم۔ حیات ● تملناڈو پبلک سروس کمیشن، مدراس۔

کال بیل بجنے لگی۔ دو لمحوں کے بعد شریمتی کھنا کے پیچھے معصوم آنکھوں والی ایک حسین لڑکی ہال میں داخل ہوئی۔ ایک تین سالہ بچی اس لڑکی کی انگلی تھامے ہوئی تھی۔ لڑکی کا رنگ جتنا گورا تھا آواز اتنی ہی مدھر اور دلکش تھی۔ لڑکی نے کھنا صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انکل! پاپا کو چند میگزین چاہئیں۔"

سندیپ کھنا نے سائڈ ٹیبل پر رکھے رسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ادھر رکھے ہیں جتنے چاہو لے جاؤ۔"

پھر چھوٹی بچی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "اور تمہیں کیا چاہیئے ہاتھی والی کتاب؟"

"نہیں نانا جی! ہمیں تو چاکلیٹ چاہیئے!" بچی نے فوراً جواب دیا۔ بچی کی معصومیت پر سبھی ہنس پڑے۔

شریمتی کھنا تب تک کافی کا انتظام کر چکی تھی۔ بولیں۔ "معاف کیجیئے ونئے جی! مجھے ابھی کالج جانا ہے۔ بہو بھی اپنے دفتر چلی گئی ہے!"

معصوم آنکھوں والی لڑکی نے فوراً کہا۔ "تو کیا ہوا آنٹی! میں جو ہوں۔ میں آجاؤں گی!

کھنا نے کہا۔ "ہاں ہاں ضرورت پڑے تو تمہیں ضرور بلا لیں گے بیٹی!"

سب کے چلے جانے کے بعد ٹائمس کے نامہ نگار ونئے بترا نے پوچھا۔ "یہ سرجیت سنگھ کی بیٹی ہے نا؟ ابھی ابھی میں نے انہیں بالکونی میں بیٹھے دیکھا ہے۔"

"جی ہاں! یہ سرجیت کی بیٹی ہی ہے۔" سندیپ کھنا نے کہا اور چپ چاپ بیٹھے رہے۔ قدرے توقف کے بعد انہوں نے آہستہ سے الفاظ کو جیسے تولتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہوا تم نے دونوں کو دیکھ لیا۔ تم نے پوچھا تھا کہ سرجیت سنگھ اور اس کے خاندان کے افراد کو اپنے گھر میں پناہ دے کر میں نے اپنے آپ کو مشکل میں کیوں ڈال دیا۔ اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے لیکن ونئے! میں تمہیں وہ بات بتانا چاہتا ہوں جسے میں نے آج تک کسی اور کو نہیں بتائی ہے!"———

سندیپ کھنا پھر گم صُم بیٹھ گئے۔ ونئے بترا نے محسوس کیا کہ کہیں دور لاتعداد گھنٹیاں بجنے لگی ہیں اور اس گرانبار سکوت کا طلسم پاش پاش ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سندیپ کھنا کسی راز پر پڑے پردے کو چاک کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔

سندیپ کھنا کہہ رہے تھے۔

"جس وقت بلوائیوں نے میرے مکان پر حملہ کیا اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں لمحہ بھر میں سینتیس[۳۷] سال کی لمبی مدت الانگ کر ۱۹۴۷ء میں جا پہنچا ہوں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ فساد مچاتے پاگل وحشی لوگ، کڑوے دھوئیں سے اٹا ماحول، سڑکوں پر پڑی لاتعداد لاشوں سے اٹھتا ہوا تعفن، اسٹین گن کی دندناتی گولیوں کی آواز، مختلف نعروں سے فلک شگاف دل ہلا دینے والی گونج۔ ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن جنم اشٹمی کا تیوہار تھا۔ مگر اس دھرتی پر کسی کرشن نے جنم نہیں لیا تھا۔ اگر جنم لیا ہوتا تو آج۔"

سندیپ کھنا پھر چند لمحوں کے لیے گم صم رہ گئے۔ ونئے بترا ان کے بار بار کٹھور ہوتے خون سے عاری چہرے کو حیرت سے دیکھے جا رہے تھے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے انھوں نے جنبش کی اور جیسے سچ مچ وہ ماضی کے اندھیروں میں جھانک رہے ہوں، کہا۔

"اس وقت بھی ہم پڑوسی تھے۔ میں اور سرجیت اور ان دنوں ہم جوان بھی تھے۔ مسلمانوں کے خلاف پاگل پن کی حد تک دشمنی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مہاناش کے سوالی رودر نے اپنا تانڈو ارقص

شروع کردیا ہوا اور ایک تال پر بہم بجتے گھنگھروؤں کی کان چھیدتی آواز اور قہقہوں کی دہشتناک گرج نے انسانوں کے ہوش و حواس چھین لیے ہوں۔ انسان درندہ بن کے رہ گیا تھا۔ اس کی بے خودی کے زیر اثر جس وقت دہلی شہر کے محلّے اور مضافات جل کر راکھ ہو رہے تھے اس وقت سرجیت سنگھ اور میں اسی دہشت انگیز سیلاب میں بہتے ہوئے وہاں جا پہنچے تھے جہاں ایک کھنڈر میں تبدیل ہوتے مکان میں ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی کے سوا کوئی نہیں بچا تھا۔ اس لڑکی نے اپنے آپ کو اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی لاشوں تلے چھپا کر بچا لیا تھا۔ یہ جینے کی ہوس بھی کس قدر ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے۔ لاشوں کے ڈھیر کو لانگھنے کی ہماری کوشش کے درمیان اس کی نظر ہم پر پڑی۔ اس کے منہ سے بے بس ایک چیخ نکل پڑی۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں!!"

پھٹے کپڑوں اور الجھے ہوئے بے ترتیب بالوں کے ساتھ وہ لڑکی دہشت زدہ اور سہمی ہوئی فاختہ کی طرح دلکش اور حسین نظر آرہی تھی ہمارے چہروں پر سے انسانیت کا نقاب کبھی کا اتر چکا تھا۔ سرجیت سنگھ چیل کی طرح اس لڑکی پر جھپٹا اور اسے دبوچ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت ہمارے ہاتھوں میں شیر کے خونخوار پنجے جڑ گئے تھے اور ہمارے دانت سور کے نکیلے دانتوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ مگر میں سچ کہہ رہا ہوں اس وقت بھی ایک ثانیہ کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے چیخ کر سرجیت سے یہ کہنا چاہیئے۔ حرام زادے! اس لڑکی کو اگر چھوا تو تیرا خون پی جاؤں گا۔ لیکن! ــ لیکن میں کہہ نہ پایا۔ مجھ میں سویا ہوا درندہ غرّانے لگا تھا۔ تبھی میں لپک کر اس بدحواس لڑکی کے کپڑے اتارنے لگا۔ ایک بار۔ صرف ایک بار اپنی تمام عاجزی اور بے بسی کے ساتھ خوف زدہ اور ہراساں لڑکی نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگی۔ "اس کے بعد کیا تم مجھے جان سے مار ڈالو گے؟"

میں نے دیکھا لڑکی جوہی کی کلی کی طرح معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ خوبصورتی کو معصومیت اور بھی نشہ آور اور مدماتی بنا دیتی ہے۔ اس ہوش ربا حسن کو ہم درندے اس وقت تک جھنجھوڑتے نوچتے رہے جب تک کہ اس کا جسم چھلنی نہیں ہو گیا۔ درمیان میں ایک بار اس لڑکی کے ہوش و حواس لوٹتے سے دکھائی دیے۔ بے جان پلکوں میں جنبش سی ہوئی اور خون سے عاری ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ شاید اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ الفاظ آواز کھو بیٹھے تھے۔ ہم سن نہ سکے۔ نہ جانے کہاں سے آکر مکھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ بہتے خون اور رِستے زخموں پر منڈلانے لگے۔ چیونٹیاں اور مکوڑے بھی لاشوں پر قابض ہونے لگے۔ قلیل وقفوں کے ساتھ سنائی دیتی نعروں کی گونج وحشت زدہ ماحول میں گھر چکی تھی۔ اللہ اکبر۔ ہر ہر مہادیو! ــ اور پھر دیر تک آنسو گیس کے گولوں کے پھوٹنے اور اسٹین گن سے نکلی گولیوں کی دندناتی آواز سارے ماحول میں گونج اٹھتی۔ تبھی میں نے دیکھا۔ منزل پر پہنچے کسی تنہا مسافر کی طرح سرجیت نہایت ہی سکون اور صبر کے ساتھ بیٹھا پان بنا رہا ہے۔ ملبے تلے نہ جانے پان دان کیسے سلامت رہ گیا تھا۔ اس نے دو بیڑے بنائے۔ ایک مجھے دیا اور دوسرا خود کھایا۔ پھر بڑے اطمینان کے ساتھ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ آؤ! اب جلدی سے قیمتی سامان بٹورلیں۔ دیر ہو گئی تو اور بھی حصّے دار شامل ہو جائیں گے۔"

چند لمحوں بعد وہ دونوں اس ملبے سے قیمتی لباس کا صندوق اور گہنوں کا بکس نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک ثانیہ کے لیے میرے دل میں یہ خیال کوند گیا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں موجودہ صورت حال کے پیشِ نظر مناسب ہو لیکن انسانیت کے ناطے کسی بھی صورت سے یہ سراسر ظلم ہے۔ ایک حیوانی حرکت ہے۔ تبھی سرجیت سنگھ نے آواز دی ــ "دیکھ! شاید وہ ہوش میں آرہی ہے!" ــ میری رگوں میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہ لہو لہان لڑکی ہوش میں کیسے آسکتی ہے؟ شاید میری طرح سرجیت کے دل میں بھی ایک مجرمانہ احساس بیدار ہو اٹھا تھا اور اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسے اس لڑکی کے ہوش میں آنے کا گمان ہوا تھا۔ دوسرے لمحہ فضا میں ایک زخمی اور دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ سرجیت نے کرپان سے اس لڑکی کا سینہ چاک کر دیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے سرجیت کے چہرے پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ شاید یہ بھی میری مجرمانہ ذہنیت کا ایک پرتو تھا۔ لاش تڑپ تڑپ کر بے جان ہو گئی لیکن ہماری درندگی ابھی برقرار رہی۔

سرجیت سنگھ نے مجھ سے کہا۔ "اس لاش کو اٹھا کر باہر چلو!۔" آج مجھے یقین نہیں آرہا ہے لیکن اس دن میں نے سرجیت کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کی تھی۔ باہر گلی میں ایک سفید گھوڑے کی لاش پڑی ملی۔ ہم نے اس لڑکی کی لاش کو اس گھوڑے کی لاش کے ساتھ جوڑ کر ایسا لٹا دیا کہ اُن کی ٹانگیں ایک دوسرے میں الجھ گئی ہوں ــ سرجیت نے انتہائی اطمینان کے ساتھ ان دونوں لاشوں کو دیکھا اور کہا۔ "خوبصورت لڑکیاں جانوروں کو ہی پسند کرتی ہیں"۔ ہم نے ایک

فلک شگاف قہقہہ لگایا اور ساماں سے لدے ظفریاب سپاہیوں کی طرح گلی سے باہر آئے اور فتح و کامرانی کے جوش میں چیختی چلاتی نعرے لگاتی بھیڑ میں جا ملے۔ شہریوں کی حفاظت کے لیے تعینات کی گئی فوج کے سپاہی ہاتھوں میں اسٹین گن لیے، چہروں کو ہیلمنٹ سے ڈھانکے اس طرح کھڑے تھے جیسے زبانِ حال سے یہ اعلان کر رہے ہوں کہ ہم ظلم کر سکتے ہیں لیکن ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔

وہ نئے بترا گم صم بیٹھے یہ خونیں رُوداد سُن رہے تھے۔ اس دوران اُن کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اختتام پر ایک خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوا۔ جبھی مغموم آنکھوں والی سُرجیت سنگھ کی بیٹی دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ یہ دونوں بُری طرح چونک پڑے اور اجنبیوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ یہ سُرجیت کی بیٹی تھی یا اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی، لاشوں کے بیچ اپنے آپ کو چھپا لینے والی وہ بدقسمت مسلم لڑکی جسے سردار اجیت سنگھ اور شری سندیپ کھنّا نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا!!

سُرجیت کی بیٹی سہم گئی اور بولی۔

"شاید میں آپ کی نجی گفتگو میں مُخل ہوئی ہوں میں نے سوچا تھا شاید آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو!"

سندیپ کھنّا نے بڑی مشکل سے اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں! ایسی کوئی بات نہیں بیٹی! تم اچانک ہی آ گئی تھیں!"

جواب سے مطمئن ہو کر وہ لڑکی ہنس پڑی۔ اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں جیسے خوشگوار دُھوپ کھِل اُٹھی تھی۔ اُس نے کہا۔ "اُنکل! پاپا نے کہلا... ہے... آپ ... جاتے وقت اُن کے ساتھ جانے پر ضرور شریک ہوں"۔ اور کسی جواب کی توقع کے بغیر ہی وہ لڑکی واپس چلی گئی۔ لیکن اس بار وہ اپنے پیچھے ایسی مہک چھوڑ گئی کہ دیر تک وہ دونوں اپنے آپ میں کھوئے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر سکوت کو توڑتے ہوئے سندیپ کھنّا نے کہا "جس وقت وہ وحشت انگیز بلوائی مجھے گھیر رہے تھے اس وقت سُرجیت کی یہ لڑکی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کے چہرے میں اُس مسلم لڑکی کا چہرہ گڈمڈ ہونے لگا تھا جیسے ۔۔ نہ جانے یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا ہے؟ کیسے"؟۔ اس کے بعد میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ کیا میں ایک بار پھر اپنی بیٹی کے جسم کو جھنجھوڑنے لگتا یا جھنجھوڑے جاتے دیکھ سکتا؟ ۔۔۔ دونوں ایک ہی بات ہوئی نا!۔ قصور وار تو میں بھی تھا۔ مانا سُرجیت سنگھ کو سزا مل جاتی لیکن مجھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے پراسچت کرنی چاہیئے۔ میں نے اپنے ہی کو تو بچایا ہے!۔

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بول سکے۔

وہ نئے بترا چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کے اندر بھی جیسے سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ وہ بدنصیب مسلم لڑکی اور سردار سرجیت سنگھ کی بیٹی۔ سینتیس ۳۷ سال پہلے کے اور آج کے سردار سرجیت سنگھ اور شری سندیپ کھنّا۔ اور وہ درندہ صفت بھی اور پاگل بھیڑ جنس کا صرف کل مسلمان تھے۔ آج سکھ ہیں اور شاید کل۔

"اور شاید کل۔؟؟ اور اس کے بعد آنے والا کل۔ انسانوں کے شناخت کی کسوٹی بدلتی رہے گی۔ مسئلوں کی نوعیت بدلتی رہے گی۔ حدف بدلتے رہیں گے۔ لیکن انسان کے اندر سویا راکھشس اسی طرح ہمیشہ جاگتا رہے گا۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے اپنے چہرے پر نئے نئے نقاب پہن کر برسرِپیکار رہے گا"

سندیپ کھنّا بولے جا رہے تھے جیسے وہ اپنے آپ ہی سے کچھ کہہ رہے ہوں۔ ان کی آواز جیسے کسی عمیق ترین کھائی سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"بترا! ہمیں اس راکھشس سے لڑنا ہے لیکن ہم ہیں کہ ان بے جان نقابوں کو نوچ رہے ہیں!"

بترا نے اطمینان کا سانس لیا جیسے کسی بحری طوفان میں پھنسا مسافر کنارے پر جا پہنچا ہو اور اتنی ہی دھیمی اور مستقل آواز میں کہا۔ "ہم کتنی ترقی کر ... ہیں۔ کتنی حیرت انگیز ایجادات بھی کی ہیں۔ مگر اس سچ کو زندہ رکھنے کا راستہ آج تک نہیں کھوج پائے۔

شاید۔

کھوجنا چاہا ہی نہیں!۔

◆◆

بقیہ صفحہ ۵۹ آخرِ شب

اس کی ٹوپی سر سے اتر کر اس کے قدموں میں آ گری۔ وہ گم صم سا دہیں کھڑا رہ گیا۔

"آج بھور کی گاڑی سے امجد کہیں باہر کام کھوجنے جائے گا"

امجد کی ماں کے الفاظ ہتھوڑوں کی طرح اس کے ذہن پر برس رہے تھے!!

◆◆

رئیس منظر

کس موڑ سے میں گذر رہا تھا
تاحدِ نظر غبار سا تھا
جب ذوقِ نظر نیا نیا تھا
جو نقش تھا، بولتا ہوا تھا
صورت تو دکھا رہا تھا، لیکن
آئینے میں بال پڑ گیا تھا
اک بھیڑ تھی قربتوں کی، جس میں
میں آپ ہی اپنا فاصلہ تھا
میرے لئے، میری دسترس میں
جو کچھ تھا، بڑا عجیب سا تھا
ڈستا تھا کیسے مرا تبسم
اندر سے یہ کون چیختا تھا
پانی سے فرات کے، نہ بہلا
میں آبِ حیات چاہتا تھا
اک لمحۂ معتبر کی خاطر
صدیوں کو کھنگالنا پڑا تھا
تنہا تھا مگر، رئیس منظر
رشتوں کا عذاب سہ رہا تھا

گلی لوہاران، پرانا گنج ۔ رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

رئیس الدین رئیس

اثاثہ گھر کا جب رختِ سفر میں منتقل ہوگا
تو کشتی، بادباں سب کچھ بھنور میں منتقل ہوگا
مری آنکھوں نہ اترا نا کبھی اس پھول موسم پہ
خزاں کا رنگ بھی دیوار و در میں منتقل ہوگا
یہ شوق اخبار بینی کا جو کچھ دے گا تو بس اتنا
کہ ہر اہلِ خبر اک دن خبر میں منتقل ہوگا
کبھی سپنے خوش آئیں گے کبھی سپنوں کی تعبیریں
کبھی تورات کا جادو سحر میں منتقل ہوگا
رئیس آغوش میں جائے گا جب سورج سمندر کی
سمٹ کر پھر ہر اک سایا شجر میں منتقل ہوگا

۱۰/۱۴۲۵ دہلی گیٹ علی گڈھ (یوپی)

شاداب رضی

سرِ ناخن پہ حنا ہی ٹھہرے
قتل کی کچھ تو گواہی ٹھہرے

میری دستار گئی تیری کلاہ
حادثے دونوں بلا ہی ٹھہرے

میں کہ بیگانہ ہر اک رشتے سے
تم بھی مقتولِ انا ہی ٹھہرے

اِذن ہر لب کو ملے ہنسنے کا
سب کو رونے کی مناہی ٹھہرے

یہ بھی ممکن ہے کہ تسخیر کے بعد
ہر طرف ایک خلا ہی ٹھہرے

لکچرر۔ شعبہ اردو، بھاگل پور یونیورسٹی بھاگل پور

مسعود عابد

ہوا میں لے کے اڑے ایک گھونٹ پانی بھی کچھ ایسا نشہ ہے چڑھتی ہوئی جوانی بھی
چٹان ٹوٹے تو پھوٹیں گے دودھ کے جھرنے عجیب شے ہے کسی کی مزاج دانی بھی
ہے سنگِ میل مری زندگی کا ہر لمحہ سبک لگے مجھے منزل کی سرگرانی بھی
حسد کی دھوپ نے جھلسا دیے دلوں کے کنول
ہزار ہم نے ردائے خلوص تانی بھی

بمقابل مسجد مہدویان ۔ ظہیر آباد

کارروائی

اسلم خان ● ۳ - اے سمرکورٹ - دوسرا منزل، جسلی بالین، سانتا کروز بمبئی - ۵۴

رات دھیمے دھیمے راکھ ہوئی تو . . . .

دن نے بوڑھے ہوئے کمان تھام لی۔ ہوا رک رک کر بہنے لگی گھنی جھاڑیوں کے سینے میں دبکے ہوئے پنچھی نکلے اور نیلے آسمان پر شور مچنے لگا۔

وال کلاک نے نو بجے کا اعلان کیا اور وہ ہاتھ میں آفس فائل، کاندھوں پر چھوٹے بھائیوں کی پڑھائی کا بوجھ، ماتھے پر جوان بہن کی گرم چبھتی ہوئی نگاہیں ذہن میں ماں کی دوائی کی بوتل، دل میں بیوی کی ساڑی، آنکھوں میں بچوں کے کھلونے، اور چہرے پر تمام عالم کا عزم لئے بس اسٹاپ کی جانب چل پڑا۔

زمین مسکرانے لگی۔

آسمان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

زمانہ سہم گیا۔

لیکن ـــــ اس سے پہلے کہ وہ آفس بلڈنگ میں پہونچنے کے لئے فٹ پاتھ چھوڑتا ایک نیلی مرسڈیز کار بدکے ہوئے سانڈ کی طرح اس پر جھپٹی ایک دلدوز چیخ اس کے حلق سے آزاد ہوئی اور آسمان پر چلی گئی ـــ دوسرے ہی لمحے بھائیوں کی کتابیں بہن کی گرم نگاہیں ماں کی دوائیاں، بیوی کی ساڑی بچوں کے معصوم کھلونے خون میں لت پت تارکول کی سڑکوں پر بکھر گئے

زمین سمٹ گئی

آسمان مسکرانے لگا

اور زمانہ ـ ـ ـ ـ

. . . . ـ چاروں طرف لوگوں کا مجمع لگ گیا مختلف قسم کی اور مختلف سمتوں سے ابل ابل کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگیں

مارڈالو . . . مارڈالو . . . ـ ڈرائیور کی اولاد کو . . . کسی نے کہا

ڈاکٹر . . . . ـ اسپتال لے چلو ایک آواز

پولس . . . پولس . . . . ۔ کئی صدائیں

اس سے پہلے کہ جھنجھلاتے ہوئے ذہن کسی نتیجے پر پہونچتے۔ ڈیوٹی کانسٹبل مجمع کو چیرتا ہوا اندر آیا فٹ پاتھ پر نیلی مرسڈیز کار کے دو پہیے چڑھے ہوئے تھے پہیوں کے نیچے ایک شخص بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں پتلیاں ساکت تھیں اس کا بھیجہ پھٹ گیا تھا اور زمین پر خون پھیلا ہوا تھا مجمع بے قابو ہونے لگا۔ ڈیوٹی کانسٹبل نے ڈپٹ کر سب کو چپ کرایا اور کار میں بیٹھے ہوئے شخص کو باہر آنے کا اشارہ کیا کار کے شیشے دھیمے دھیمے نیچے اترے اور ایک عیش پوش انگلیوں میں قیمتی پتھر ہاتھ میں ڈنہل۔ کا پاکٹ اور سپاٹ چہرہ لئے جوں ہی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اسکاچ کی بھبھک کانسٹبل کے نتھنوں سے ٹکرائی . . . . ـ ـ ٹکراتی رہی۔

مجمع میں پھر اتھل پتھل مچ گئی۔ کانسٹبل نے اپنی کرخت آواز سے مجمع کو ایک زوردار ڈانٹ پلائی . . . . مجمع پھر شانت ہو گیا۔

کانسٹبل نے اپنے سامنے کی جیب سے پاکٹ سائز ڈائری نکالی اور ڈائری میں پھنسی پنسل سے لکھا ـــ ؟

۱۴ جنوری ۱۹۸۵ء

آج صبح دس بجے نیو مرین روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے رمیش چندر نامی راہ گیر پر اوور اسپیڈ (OVER SPEED) نیلی مرسڈیز ایم آئی آر ۴۲۶۷ ماڈل ۸۰ چڑھ دوڑی۔ رمیش چندر جگہ پر ہلاک ہو گیا۔

پولس اسٹیشن میں ڈیوٹی آفیسر نے رپورٹ بک میں لکھا:

۱۵ جنوری ۱۹۸۵ء

کل ۱۴ جنوری ۱۹۸۵ء صبح دس بجے نیو مرین روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے رمیش چندر نامی راہ گیر پر نیلی مرسڈیز ایم آئی آر ۴۲۶۷ ماڈل ۸۰ چڑھ دوڑی رمیش چندر جگہ پر ہلاک ہو گیا۔

پولس اسٹیشن نے عدالت میں رپورٹ پیش کی۔!

۱۴ جنوری کو صبح دس بجے نیو مرین روڈ کے پاس تیزی سے روڈ کراس کرتے ہوئے رمیش چندر نامی راہ گیر پر نیلی مرسڈیز ایم آئی آر ۴۲۶۷

[باقی صفحہ ۱۵۰ پر دیکھئے]

ایم۔ آر قاسمی

آج ہم ہر بات پہلے سے جُدا کہنے کو ہیں
دشمنوں کے حق میں بھی حرفِ دُعا کہنے کو ہیں
ایک خواہش ہے کسی اظہار کی سینے میں بند
کیوں سمجھ میں کچھ نہیں، آتا کہ کیا کہنے کو ہیں
دل لیے پھرتا ہے کشتی وسوسوں کے درمیاں
ہم کہ اس طوفان کو ساحل نما کہنے کو ہیں
رنگ اک سب منظروں سے چاہتے ہیں ہم جُدا
بات اک حرف و صدا سے ماورا کہنے کو ہیں
ہم کو رونے کا ہنر آتا ہے ہنسنے کا نہیں
ہم فقط آشوبِ جاں کا مرثیہ کہنے کو ہیں
اُن پرندوں کو نویدِ شاخساراں دے خُدا
جو زبانوں سے تری حمد و ثنا کہنے کو ہیں

"شب کدہ" ۳/۱۸۲ - آٹھ کوارٹرس
عقب کھجور والی مسجد، جعفر آباد، دہلی ۱۱۰۰۵۳

سبطین اخگر

اک شگافِ ناگہاں اس بار بھی کھانا پڑا
راستہ مسدود تھا، دیوار کو ڈھانا پڑا
پھر ہوائے دل بریدہ سے سرو کاری ہوئی
پھر فریبی خواہشاروں میں مجھے آنا پڑا
وہ مرا مرہونِ منت تھا کبھی، تو کیا ہوا
اب مجھے بھی اُس کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا
میں کہاں جنگ آزما ہوتا صفِ اغیار سے
مصلحت درپیش تھی بچ کر نکل جانا پڑا
مشغلے تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہے رنگ و بو
پھر پُرانی عادتوں سے دل کو بہلانا پڑا

آفتاب ہوسٹل، آفتاب ہال۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

رؤف جاوید

خود اپنے آپ میں محصور زندگی کیا ہے
جو حادثات سے گھبرائے آدمی کیا ہے
جو دل کی راہ سے گزرا نہیں وہ کیا جانے!
خوشی کی راحتیں اور غم میں بے کلی کیا ہے
میں تجھ میں دفن رہوں اور تو مرے اندر
برائے نام اگر ہے تو دوستی کیا ہے
ہمیشہ دل کی ہر اک ضد کو پورا کرتا رہا
کبھی یہ سوچا نہیں دنیا سوچتی کیا ہے
وہ کیا ملا ہے کہ مجھ میں وہ "میں" نہیں باقی
کسی کے پیار میں شامل یہ دشمنی کیا ہے
نہ دوستی نہ کسی سے ہے دشمنی اپنی
خود اپنے آپ سے جاوید برہمی کیا ہے

پی۔ ایچ۔ ای۔ آفس، سرونج ۴۶۴۲۲۸

خ۔ زماں انصاری

جان دیتی گئی سیاہ مری
وقت کی ہر قدر ہے گواہ مری
کُھل گیا رات کے اندھیروں میں
دن کے خوابوں پہ تھی نگاہ مری
ہوں سوالوں سے آج تک محفوظ
کوئی سُنتا نہیں کراہ مری
زرد پتّے بھی ہو چکے رخصت
خشک ڈالی ہے اب پناہ مری
کج روی اور بڑھتی جاتی ہے
ہو گی کب سہل مجھ پہ راہ مری

نیشنل ڈیفینس اکاڈمی کھڑک واسلہ، پونہ ۲۳

لمحوں کا تعاقب

کہکشاں پروین
معرفت: کے۔ ایم۔ سروس۔ ڈاکٹر ڈھیکا۔ پرولیا۔ ۷۲۳۱۰۱

زندگی میں کچھ ساعتیں اس طرح سامنے آجاتی ہیں کہ وقت کے ٹھہر جانے کا احساس شدت سے ہونے لگتا ہے اور جب وقت کی رفتار میں حرکت کے بجائے ٹھہراؤ آجائے تو ہر شئے کتنی اُجڑی اُجڑی اور پھیکی پھیکی سی نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی تو مسلسل حرکت سے عبارت ہے لیکن میں کیسی زندگی جی رہی ہوں کہ ایک موڑ پر رُک گئی ہوں نہ آگے بڑھنے کی خواہش ہے اور نہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ۔ شاید اسے جینا نہیں کہا جاتا اس طرح تو زندگی کو بھگتا جاتا ہے۔ دل اور دماغ پر چھائے ہوئے کرب کے بادل آنسو بن کر ٹپکتے بھی نہیں شاید اس طرح دل کچھ ہلکا ہو جاتا۔۔۔۔۔۔

آج تم بہت یاد آرہے ہو۔ بہت زیادہ۔ چاروں طرف عفریت کا بھیانک ناچ ہو رہا ہے۔ ان کی وحشی آوازیں دل میں نشتر بن کر ابھر رہی ہیں اور میں تمہاری یادوں کے محفوظ حصار میں گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ شاید اس طرح بے قرار دل کو قرار آجائے یا زندگی کی سختی کا احساس تمہاری یادوں کی تھپک سے کم ہو سکے۔۔۔۔۔ لیکن ایسا کہاں ہوا ہے!!

ماضی کا ایک لمحہ بھی ہاتھ آجاتا تو شاید میں اتنی بددل نہ ہوتی۔ خلاؤں میں پرواز کرنے والی بلند و برتر مخلوق ابھی اس قابل نہیں ہو سکی ہے کہ گذرتے ہوئے وقت کا ایک لمحہ بھی اپنی مٹھی میں بند کر سکے۔ گذرے ہوئے لمحات کب واپس آتے ہیں۔۔۔ کچھ لمحے ماضی بن کر چلے جاتے ہیں تو حال میں واپس آجاتے ہیں۔ ماضی اور حال کا وقفہ خواہ کتنا ہی طویل یا مختصر کیوں نہ ہو۔ ان پرندوں کی طرح جو دانے دنکے کی تلاش میں۔ بنے آشیانے کو چھوڑ کر جنگل جنگل بھٹکتے ہیں لیکن بالآخر وہ اپنے گھر لوٹ آتے ہیں ہر روز ان کا ماضی حال میں بدلتا ہے اور حال ماضی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ برقرار رہتا ہے۔۔۔۔۔

لیکن میرا ماضی میرے حال میں کبھی نہ لوٹا اور ہر پل اس آس میں جیتی رہی کہ ماضی، حال میں نہیں لوٹا شاید مستقبل میں لوٹ آئے۔۔۔۔ لیکن یہ آس بھی ٹوٹ گئی۔ جو آنکھیں خوابوں کے سہارے کھلتی اور بند ہوتی تھیں آج وہی حقیقت کے سنگریزوں کو چنتے چنتے زخمی ہو رہی ہیں۔ ان سے لہو ٹپک رہا ہے یہ لہولہان لمحوں، ان ساعتوں اور ان گھڑیوں کا حنا مانگ رہا ہے جو بلانے سے نہیں آتیں اور بھلانے سے نہیں جاتیں۔۔۔۔۔۔

زندگی!۔۔۔۔۔ اسے کیا عنوان دوں۔ ماضی۔ حال۔ یا مستقبل۔۔ ماضی اور حال ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہتے ہیں۔ اور مستقبل کا پتہ کبھی نہیں ملتا۔ میں پاگل ہی تھی نا جو مستقبل کے بھروسے میں رہ گئی۔ بیتے ہوئے لمحوں اور آنے والی گھڑیوں کے بیچ مستقبل کی پٹی باندھ کر آنکھ مچولی کھیلتی رہی۔ شاید زندگی اسی کا نام ہے۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں کیا کہوں۔ تم نے زندگی کو کیا نام دیا۔ سمجھوتہ۔ سکون۔ خوشیاں۔۔۔۔ یا بے حسی۔ کاش ایک بار۔۔۔۔۔ میں جان جاتی۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تمہارے روبرو ہو کر تم سے کچھ یہ پوچھوں۔

شاید خوش فہمی کی ریشمی دیوار میرے قدم روکتی ہے۔ پھر اب کیا حاصل۔ مسائل جوں کے توں رہیں گے ان کا سدباب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے سوچتی ہوں کہ اتنے سال زندگی سے آنکھ مچولی کرتے گذار دیے اب کیوں نہ اس سے آنکھیں بند کر لوں اور سکون کی گہری نیند سو جاؤں جو میرے مقدر سے چھن گئی ہے۔۔۔۔۔

مجھے یاد ہے جب تم ایم۔ اے پاس کر کے ایک دفتر میں معمولی نوکری کرنے لگے تھے تو کتنے ناتکمیل خواب تمہاری آنکھوں میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔ میں چاہتی تھی جلد سے جلد ہم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔ لیکن تم ہمیشہ ٹالتے رہے۔ "اس معمولی سی نوکری میں کس طرح گذر بسر ہو گی، تھوڑا انتظار اور کرو"۔ میں صبر اور گمبھیرتا سے ہر گذرتے ہوئے لمحے کو محسوس کرتی۔ میری اداسی کا احساس کر کے تم نے ایک بار

کہا تھا۔

زندگی کی گاڑی کھینچنا بہت مشکل ہے، اشیاء کا زیادہ سے زیادہ ہونا تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کی علامت ہے اور اشیاء کا کم ہونا غیر مہذب ہونے کی نشانی ہے فرد کا ذہن اسی تناسب سے بدلتا رہتا ہے۔ زمین کے حقیر ذرّے جب آسمان کے روشن ستاروں سے ٹکرانے کی کوشش کرتے ہیں تو ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھر جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کو بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے۔ اور زندگی کی اس درندگی و سفاکی سے دوچار ہونا پڑے جو چیزوں کی کمی سے بڑھتی ہے اور اشیاء کے ہجوم سے کم ہوتی جاتی ہے۔"

میں چپ رہ گئی اور تم سے یہ نہ کہہ سکی کہ تمہارا ساتھ میری زندگی کی نوید ہے تمہاری محبت میری سب سے بڑی طاقت ہے لیکن تم میرے اس جذبے کو سمجھ نہ سکتے۔ کیوں کہ تم حسّاس نازک مزاج مگر ایک بزدل شخص تھے۔ میں تمہارے انتظار میں درختوں کی طرح خوشی اور پتھروں کی طرح مطمئن زندگی گذارتی رہی۔ اچانک مجھے خبر ملی کہ تم نے بھرپور زندگی کے حصول کا مؤثر راستہ چن لیا۔ ایک دولت مند گھرانے میں رشتہ جوڑ لیا۔۔ اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگے۔ طاقت ایک ایسا نشہ ہے کہ لوگ اس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں۔ اور ان کے انداز بدل جاتے ہیں اس لیے تم بھی مجھ سے کترانے لگے۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اشیاء کا کم ہونا درندگی و سفاکی کا پیش خیمہ ہے۔ میں تم سے کیا کہتی۔ میں ایک حقیر ذرّہ اور تم آسمان کا روشن ستارہ، میں واقعی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تہذیب اور تمدن تو خوشحالی کے گہوارہ میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ آرام و آسائش کا سہارا لے کر چلتے ہیں جہاں بھوک کا دور دورہ ہوگا وہاں زندگی کی اعلیٰ قدریں دم توڑ دیتی ہیں. اور تہذیب منہ موڑ لیتی ہے۔ تمہاری بھی کیا خطا ہے۔ تم بھی تو ایک انسان تھے میں سوچتی ہوں اور الجھتی جاتی ہوں۔ ایسے لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں جو سانس لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جی رہے ہیں۔ میں بھی ان لوگوں کی طرح بن جانے کی خواہش شدّت سے کرتی ہوں۔۔ جو سوچنا اور سمجھنا نہیں جانتے جو سماعت اور بصارت دونوں ہی سے محروم رہتے ہیں جن کی سرشت میں حس ناپید ہوتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا سوچیں نہ جانے کس دروازے سے ذہن میں گھس کر شور مچانے لگتی ہیں۔ جس طرح سرکش موجیں اپنے دام میں ہر شئے کو دور تک گھسیٹتی ہیں اور تند و تیز ہو کر ہر رکاوٹ کا سینہ چیر کر آگے بڑھتی جا رہی ہے۔

طرح ماضی بھی حال کے مسائل اور مستقبل کی فکروں کو دبا کر خود ابھر آتا ہے

"میں ہوں ماضی میں زندگی کی ٹھوس حقیقت ہوں۔ مجھے نہ بھولو آج کیا ہے کچھ نہیں کل کیا ہوگا کیا پتہ۔ آج اور کل کے بیچ میرا موجود معتبر ہے میں ہی اعتماد کے قابل ہوں" یادیں باز نہیں آتیں لاکھ انہیں بھلاؤ کیڑے کی طرح ذہن کی نالیوں میں کلبلاتی رہتی ہیں نشتر کی طرح صبح و شام کے پردوں کو چھیدتی ہیں۔ اور زخموں کی طرح ٹیس پیدا کرتی ہیں۔ خواہشوں کے بگولوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تم دور بہت دور نکل گئے۔ تمہاری ضرورت۔ نے میری محبت اور اس سے وابستہ ہر احساس کو کھا لیا۔ بھوک کا جذبہ بہت شدید ہوتا ہے۔ اس کا پورا ہونا لازمی ہے۔ اس لیے اب تم کتنے شکم سیر اور آسودہ نظر آتے ہو۔ لیکن کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوچتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ مجھے سست رفتاری کی تلقین کرتے کرتے تم اتنے تیز رفتار کیوں ہو گئے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ اس کا جواب نہیں ملتا مجھے۔ شاید نہیں ملے گا۔۔ کیوں کہ اس لامحدود کائنات میں "کیوں" کا جواب انسانی ذہن کے لیے موزوں نہیں ہے۔

◆◆

بقیہ صفحہ ۴۴ کارروائی

ماڈل ۸۰ چرٹھ ڈی ڈی رتیش چندر جگہ پر ہلاک ہو گیا۔

عدالت میں وکیل صفائی نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کی!

۴ار جنوری ۱۹۸۵ء کو صبح دس بجے نیو مرین روڈ کے پاس سے تیزی سے روڈ کراس کرتے ہوئے رتیش چندر نامی راہگیر پیپل مرسڈیز ایم آئی آر۔ ۷ ۴۲۶۔ ماڈل ۸۰ چرٹھ دوڑی۔ رتیش چند جگہ پر ہلاک ہو گیا پوسٹ مارٹم سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ مرنے والے کے پیٹ میں شراب کافی مقدار میں موجود تھی

جج نے اپنا فیصلہ سنایا۔!

عدالت چندر پرکاش سکینہ مرسڈیز ایم آئی آر۔ ۴۲۶۷ ماڈل ۸۰ کے مالک کو ۴ار جنوری ۱۹۸۵ء کو نیو مرین روڈ پر ہونے والے رتیش چندر کے ایکسیڈنٹ کے کیس سے باعزت بری کرتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ شراب پی کر روڈ کراس کرنے اور شہری زندگی میں خلل ڈالنے کے جرم میں رتیش چندر کے پسماندگان پر پانچ سو روپے جرمانہ عائد کرتی ہے۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں لاش متعلقین کے سپرد نہیں کی جائے گی۔

◆◆

نور محمد یاس

اپنے آگے کھلی کتاب رکھو
بند خوش فہمیوں کے باب رکھو

ضبط کوشی تہہ سکوت رہے
چشم پوشی پسِ نقاب رکھو

رنگ اڑنے نہ دو خیالوں کا
خوشبوؤں میں بسا کے خواب رکھو

گھاؤ بھرنے نہ دو تجسّس کے
شاخِ احساس پر گلاب رکھو

کون کس کی فضا بناتا ہے
اپنی سانسوں کا خود حساب رکھو

گل نہ ہو جائیں یہ نمو کے چراغ
سبز شعلے ذرا پُر آب رکھو

جانے کیا تم سے پوچھ لے کوئی
سوچ کر ذہن میں جواب رکھو

نہ بیے حرف کی سیاہی آنکھ
روشنی شاملِ نصاب رکھو

کھل گیا اب تو آتشی جوہر
نام ذرّے کا آفتاب رکھو

● ۴۴ شیامل لین، بھوپال (ایم پی)

ساجد حمید

چاندنی بانٹ کر زمینوں میں
کھو گیا چاند پھر اندھیروں میں
اک مہکتی غروبِ شب ساعت
آ بسی شہر کے مکینوں میں
اجلی اجلی کپاس جیسے لوگ
کیا ہوئے ڈھونڈنا صحیفوں میں
آگہی محوِ رقص تھی شب بھر
آیتیں کھل رہی تھیں سینوں میں
اک ضیا ساز خامشی ساجد
قید ہونے کو ہے مشینوں میں

● رینج فارسٹ آفیسر
۱۷ نہرو نگر، ساگر ۵۷۷۴۰۱

عطاء الرحمٰن طارق

زندگی ہے، تو بے سبب زندہ
شاعری، فلسفہ، ادب زندہ
قطرہ، قطرہ، رمق، رمق لذّت
جسم زندہ ہے، تو طلب زندہ
موت جب ٹل نہیں سکی تو کہا
کس کو رہنا ہے یار اب زندہ؟
بات کھٹکی شریف لوگوں میں
ہو گیا پھر حسب نسب، زندہ
ایک دن میں نے یہ کہا خود سے
اے کہ ہو جا باذنِ رب زندہ
رات بھر موت کے شکنجے میں
صبح، دیکھو تو سب کے سب زندہ!
مستحقِ داد کا ہوا طارق!
ہے بلا خوف، روز و شب زندہ

● ۹/۹۴ فاطمہ بنگلہ، رے رے روڈ، جیکب سرکل، ممبئی ۱۱

رفیق عادل

چھت تو جنگل ہوئی، اب فرش کو دلدل کر دے
اس طرح گھر کی تباہی کو مکمل کر دے

ہے یہی راہِ مفر اور یہی راہِ نجات
دن جو زنداں ہے تو پھر رات کو مقتل کر دے

قید اشجار کو کر دے جو ٹھہر جائے ہوا
ہاں، رواں ہو تو خس و خاک کو بادل کر دے

اس قدر دور نہیں دل کی تباہی کا سبب!
تو اگر یاد کے ہر نقش کو صندل کر دے

جانے کس لے سے سماعت کا شگوفہ چٹخے
شب کے سناٹے کو آواز کا جنگل کر دے

موسمی نہر کہیں گے اسے اربابِ نظر!
اشک کی دھار کو اک سوزِ مسلسل کر دے

تیرے اشعار میں وہ تاب کہاں ہے عادل
روزن و در کی سیاہی کو جو صیقل کر دے

● کوتوال باڑہ ۱- راویر ۴۲۵۵۰۸

آخرِ شب

سیف الرحمٰن عبّاد

معرفت : ڈاکٹر عبید الرحمان - محلہ سید واڑہ - غازی پور (یو پی)

دین الٰہی پٹیا پر عبداللہ کی گومتی میں حسبِ معمول صبح دس بجے چائے پینے پہنچا اور اردو کا تازہ اخبار سامنے کھینچ کر سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ عبداللہ چائے والے کے لئے دین الٰہی کی آمد کا مقصد واضح تھا۔ اس نے فوراً چولھے پر چڑھائے پانی میں چائے کی پیالی سے ناپ کر پانی بڑھا دیا۔

ادھر چولھے پر چڑھا پانی سن سنایا اور ادھر دین الٰہی کی نظریں ایک خبر کی آخری لائن تک جا پہنچی۔ پانی کی سن سناہٹ وہ اپنے تمام جسم میں محسوس کرنے لگا۔ اس کا ذہن آس پاس بیٹھے چائے کے منتظرین کی آپ بیتی اور جگ بیتی کے قصوں سے بے نیاز اپنے گھر کے آنگن میں بھٹک رہا تھا۔ عبداللہ بھی حیران تھا۔ آج دین الٰہی نے حسبِ عادت چائے اچھی بنانے پر زور دیا اور نہ ہی دوسرے شناساؤں کے ساتھ شہر میں بڑھتی ہوئی چوری ڈکیتی کی وارداتوں پر اظہارِ حیرت اور تشویش کی گفتگو میں شامل ہوا۔ وہ عالمِ بے خودی میں اخبار الٹ پلٹ کرتا اور اس خبر پر ہاتھ رکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔

عبداللہ نے چائے گلاسوں میں انڈیلی اور پھر اس کے لڑکے ظفر نے باری باری گلاسوں کو بنچ پر بیٹھے منتظرین کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ دین الٰہی کے ہاتھوں میں جیسے رعشہ تھا۔ گلاس پکڑتے وقت گرم چائے چھلکی اور دین الٰہی کی انگلیوں کو چھو گئی۔ دین الٰہی نے جلدی سے گلاس دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔

"کا بات ہے دین الٰہی بھائی؟ کون سوچ میں پڑے ہو؟" عبداللہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ سب ہی کی طرح عبداللہ بھی دین الٰہی کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ سچ بھی یہی تھا کہ افلاس، تفکرات اور پریشانیوں میں گھرے دین الٰہی کے پاس اگر کوئی ایسی شے تھی جس پر وہ فخر کر سکے تو وہ تھی اس کی عزت۔ سفید داڑھی اور بالوں کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ نمازی پرہیزگار ہونے کے ساتھ ساتھ محلّے کے ہر فرد کے دُکھ سکھ میں اپنا تعاون، گو وہ تسلّی یا مشورہ دن تک ہی محدود کیوں نہ ہو، دینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ رات کے دو بجے بھی اگر کوئی کسی کام کے لئے اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل پڑتا۔

"کوئی بات نا ہے عبداللہ میاں۔ بس تھوڑا جی بھاری ہے۔" دین الٰہی نے چائے کا گلاس اپنے خشک ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ عبداللہ پھر چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ عبدالرشید پیش کار مرحوم کا چھوٹا لڑکا اکرم ادھر سے گزر رہا تھا۔ دین الٰہی نے آواز دی۔

"اکرم میاں ادھر تو آنا!"

اکرم نے رک کر دین الٰہی کو سلام کیا اور پھر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ دین الٰہی نے اخبار اکرم کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اس خبر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اکرم میاں اس خبر کو پڑھ کر سنانا تو!"

دین الٰہی ان پڑھ تھا۔ تعلیم کے نام پر ٹوٹی پھوٹی زبان میں اردو پڑھنا جانتا تھا۔ خبر تو اس نے پڑھ لی تھی لیکن وہ چاہتا تھا کہ اکرم سے پڑھوا کر جو کچھ اس کی سمجھ میں آیا ہے، اس کی تصدیق کر لے۔ اکرم خبر پڑھ کر خلاصہ دین الٰہی کو بتانے لگا۔

"دہلی میں کسی لڑکی نے ایک عمارت سے کود کر خودکشی کر لی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی شادی میں طرح طرح کی پریشانیاں اور رکاوٹیں آ رہی تھیں۔ لڑکی کے والدین انتہائی پریشان اور متفکر تھے اس لئے لڑکی یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔"

دین الٰہی پھر مضطرب ہو اٹھا۔ جیسے معدے میں گئی چائے کھولنے لگی ہو۔ اکرم اٹھ کر چلا گیا تھا۔

عبداللہ کی گومتی سے اٹھ کر دین الٰہی سڑک پر آ گیا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار کالے دھبے ابھرنے لگتے۔ تفکرات اور الجھنوں میں گھرے دین الٰہی کے دل میں آج ایک نیا کانٹا سوزش دے رہا تھا۔ موڑ سے مڑ کر وہ اہل حدیث فرقے کی مسجد کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدم آہستہ اور تھکے ہوتے انداز میں اٹھ رہے تھے۔ جیسے وہ ریت پر چل رہا ہو۔ وہ ابھی گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی تو وہ گھر سے نکلا تھا۔ اور پھر گھر پہنچ کر اسے ملتا بھی کیا۔ شکستہ در و دیواروں سے جھانکتی ہوئی الجھنوں اور پریشانیوں کی مہیب پرچھائیاں۔ اور بس۔ حالانکہ گھر سے دور رہ کر بھی وہ گھر کے مسائل ہی میں الجھا رہتا تھا۔ لیکن باہر آ کر اتنا فرق ضرور پڑتا کہ ان مہیب پرچھائیوں کا تسلط اس کے ذہن سے ذرا پرے ہٹ جاتا۔

دین الٰہی امام باڑے کے قریب پہنچا تو اخبار کی اس خبر نے پھر اس کے ذہن کا احاطہ کر لیا۔ اس خبر کو وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ خودکشی کرنے والی لڑکی کو اپنے والدین کی پریشانیوں کا احساس ضرور رہا ہو گا لیکن ساتھ ہی اس کے اس اقدام میں کیا یہ جذبہ کارفرما نہ رہا ہو گا کہ پکا ہوا آم زیادہ دنوں تک اپنا بوجھ برداشت کر کے شاخ سے لگا نہیں رہ سکتا۔ اس کے جسم میں پھر ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ جامع مسجد کے قریب پہنچا تو سامنے سے رفیق مرحوم کا لڑکا امجد ایک ترنگ میں سیٹی بجاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ امجد کو دیکھ کر دین الٰہی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ لفنگا کہیں کا۔ آوارہ گردی کے سوا جیسے اسے کوئی کام ہی نہیں۔ امجد کو اس نے اکثر اپنے گھر کے پاس سے بھی اسی انداز میں سیٹی بجاتے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دین الٰہی بس کسی طرح ضبط کر کے رہ جاتا۔ شاید یہ سوچ کر کہ سڑک سرکار کی ہے اس کی اپنی نہیں۔

دین الٰہی بے مقصد سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ جب گھر پہنچا تو ایک بج چکا تھا۔ دروازے پر جھولتا ٹاٹ کا پیوند شدہ پردہ ہٹا کر وہ گھر میں داخل ہی ہونا چاہتا تھا کہ اندر اس کی بیوی نذیرن کی تیز آواز گونجی۔

"اے جمیلہ دیکھ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا کر۔"

دین الٰہی کا دل اچانک ڈوب کر رہ گیا۔ ابھی بڑی لڑکی شکیلہ کنواری بیٹھی ہے اور یہ کمبخت سب سے چھوٹی بھی جوان ہو گئی۔ اس نے اپنا تھکا ہوا قدم آنگن میں اتارا۔ نذیرن روز کی طرح برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھی گود میں سوپ رکھے بیڑیاں بنانے میں مصروف تھی۔ جمیلہ اس وقت وہاں موجود نہ تھی۔ وہ زینے کے اوپر اپنی تینوں بہنوں کے ساتھ بیڑی بنانے بیٹھ گئی تھی۔ دین الٰہی پر نظر پڑی تو نذیرن کے پچکے گال پھڑپھڑاتے اور پھر جیسے وہ دیواروں سے لڑنے لگی۔

"آج شکیلہ پینتیس کی ہوئی۔ ان کو تو جیسے کوئی فکر ہی نا۔ صبح ہوئی اور نکلے چلے جاتے پیٹے۔"

دین الٰہی کا دل یکبارگی تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ جیسے شکیلہ کی عمر بھی اس کی عمر میں شامل ہو گئی ہو اور پوری ایک صدی کا بوجھ اس کے جسم ناتواں سے نہ اٹھایا جا رہا ہو۔

"ایسے ہی باہر چلے گئے رہے۔" دین الٰہی نذیرن کے قریب سے گزر کر کمرے کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے نذیرن کی باتوں کا کچھ نہ کچھ جواب نہ دیا تو وہ گھنٹوں اسی طرح بڑبڑاتی رہے گی۔ کمرے میں پہنچ کر دین الٰہی نے چارپائی کی ادوائن کسی پھر چارپائی کے ایک پائے کے اوپر اپنی ٹوپی اتار کر لٹکائی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔

دین الٰہی کبھی تحصیل میں چپراسی تھا۔ جب تک نوکری تھی، روزی روٹی کا مسئلہ کچھ اتنا سنگین نہ تھا۔ اچھے برے سے پیٹ بھر جاتا اور خدا کا شکر بجا لاتا۔ لیکن پانچ سال پہلے جب وہ ریٹائر ہوا تھا اس وقت سے اب تک روز تفکرات کی تیز دھوپ اس کے آنگن میں اترتی اور سارے گھر کو جھلسا دیتی۔ پنشن اسے ملتی تھی۔ لیکن اس مہنگائی گرانی کے دور میں جبکہ کرسی پر بیٹھا افسر بھی گھریلو اخراجات

ستم سے پسینہ پونچھتا نظر آتا ہے، دین الٰہی کی پنشن کی کیا اہمیت تھی۔ چاروں بیٹیاں بیڑی بناتی تھیں۔ نذیرن گھریلو کاموں سے فرصت پاتی تو وہ بھی بیٹیوں کے ساتھ بیڑی بنانے بیٹھ جاتی۔ مشرقی یو پی کے اس شہر میں کوئی صنعت نہیں۔ دوسرے کام دھندے نہیں۔ کام دھندے کے نام پر یا تو بیڑی بناؤ یا پھر رکشا کھینچو۔ اس شہر کی فریاد کرتی ہوئی پسماندگی پر کسی وزیر کے چہرے پر افسوس کی لکیریں نہیں ابھرتیں۔ کسی کی آنکھیں نمناک نہیں ہوتیں۔

نوکری کے دنوں میں جب کہ دین الٰہی جوان تھا، کئی خواب اس کی آنکھوں میں بھی ٹھہرے رہتے تھے۔ گھر میں اور آفس میں بھی فرصت کے اوقات وہ یہی سوچا کرتا تھا کہ اپنے باپ دادا کی طرح وہ بھی نرا جاہل ہے لیکن اپنے لڑکوں کو وہ پڑھا کر ضرور بڑا آدمی بنائے گا۔ وہ جی توڑ محنت کرے گا۔ ہر چھوٹا بڑا کام کرے گا اور اپنے لڑکوں کی تعلیم کے اخراجات پورے کرے گا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ لڑکے کی آمد کا خواب دیکھتے دیکھتے چار لڑکیاں اس کے آنگن میں اتر آئیں۔ دین الٰہی کبھی کبھی فریاد کرتی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو "یا خدا! کیا میری دعاؤں کی قبولیت کا وقت ابھی نہیں آیا"۔ اور پھر یوں ہوا کہ اس کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آنے سے پہلے اس کے بوڑھے اور ریٹائر ہونے کا وقت آگیا۔ اس کی آرزوئیں دل میں گھٹ کر رہ گئیں۔ ایک احساس جرم نے نذیرن کو بھی گم صم سا کر دیا۔ یہ احساس پہلی لڑکی کی پیدائش ہی سے اس کی اداؤں کی وہ دلفریبیاں چھینتا گیا تھا، جس پر دین الٰہی نثار رہا کرتا تھا۔ دونوں کی زندگی میں پھر کوئی تنوع نہ آیا۔ گردش ایام نے بالآخر انھیں تہی دست و داماں وہیں لا کھڑا کیا جہاں سے انھوں نے امیدوں اور خوابوں کی زندگی شروع کی تھی۔

اب دین الٰہی تھا اور اس کی بے بسی۔ چاروں لڑکیاں بیڑیاں بناتی تھیں جس سے کنبے کی کفالت ہوتی تھی۔ اس شہر میں بیڑی بنانے کا کام غریب اور جاہل طبقے کا ایک بہت بڑا سہارا ہے۔ سات روپے ہزار کے حساب سے زنانہ اور دس روپے ہزار کے حساب سے مردانہ بیڑیاں بنتی ہیں۔ گھر گھر یہ کام ہوتا ہے۔ دین الٰہی کی چاروں لڑکیاں مل کر دن بھر میں ہزار ڈیڑھ ہزار بیڑیاں بنا لیتی تھیں۔ نذیرن کو فرصت ہوتی تو سو دو سو بیڑیاں وہ بھی بنا لیتی۔ البتہ دین الٰہی کسی کام کا نہ رہا تھا۔ آنکھوں سے کم سوجھتا تھا۔ بیڑی میں صفائی نہ آپاتی تھی جس کی وجہ سے اکثر اسے مالک کی جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔ دین الٰہی نے خود یہ کام نہ کرنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ ورنہ مالک شاید اس کے گھر سے یہ کام واپس لے لیتا۔ ہاں خود کو تسلی دینے اور کسی کام کا اہل نہ ہونے کے احساس کو کچلنے کے لئے وہ کبھی کبھی لوہے کا فرما لے کر بیٹھ جاتا اور ناپ ناپ کر بیڑی کی پتّی کاٹنے لگتا۔ یہ کام وہ بیڑی بنانے سے بہتر طور پر انجام دے لیتا کیوں کہ اس میں ہاتھ کی صفائی کو زیادہ دخل نہ تھا۔

اس رات دین الٰہی بے حد مضطرب تھا۔ برآمدے کے دوسرے کونے میں نذیرن سوتی جاگتی کیفیت میں کروٹیں لے رہی تھی۔ چاروں لڑکیاں اندر کمرے میں سو رہی تھیں۔ آج کے اخبار والی خبر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر اس کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شکیلہ کے بالوں کو چاندی کے تار برسات کی سیاہ رات میں چمکتی بجلی کی لکیروں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے کوندر ہے تھے۔ کتنی مماثلت تھی اس مرنے والی لڑکی اور شکیلہ میں۔ شکیلہ کا نصیب بھی ہاتھوں کی مہندی کے لئے ترس رہا تھا۔ کتنے ہی گھروں سے عورتیں آکر شکیلہ کو دیکھ گئی تھیں۔ لیکن شکیلہ کی لکنت کھاتی زبان نے اسی دم اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ شکیلہ کا قد نکلتا ہوا تھا۔ رنگ صاف تھا۔ ناک نقشہ بھی قابل قبول تھا لیکن شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکی کا ذرا سا نقص بھی کوڑھ کی طرح سمجھا جاتا ہے۔
دین الٰہی نیک اور شریف ہونے کے ساتھ ساتھ خوددار اور غیرت مند بھی تھا۔ آج تک اس نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا اور نہ ہی اپنے نصیب کا رونا رویا تھا۔ لیکن شکیلہ کے لئے اس نے بہت سے لوگوں کے آگے دست سوال پھیلا دیا تھا کہ وہ بیچ میں پڑ کر کہیں اس کا رشتہ طے کر دیں۔ شاہ جنید پیر کی مزار پر بھی اس نے پابندی سے حاضریاں دی تھیں۔ مزار کے کمرے میں دیواروں کے طاقچوں پر اس نے لوگوں کی بے شمار عرضیاں رکھی دیکھی تھیں۔ وہ بھی اپنی عرضی لکھوا کر وہاں رکھ آیا تھا۔ ایک بات سے دین الٰہی کو تقویت ضرور ملتی کہ جس وقت اس نے اپنی عرضی مزار کے کمرے کے طاقچے پر رکھی تھی، اس وقت وہاں پہلے ہی سے بہت ساری عرضیاں موجود تھیں۔ اس لحاظ سے اس کا نمبر بہت بعد میں آنا بھی چاہئے تھا۔ ایک لمبا سانس کھینچ کر دین الٰہی نے کروٹ بدلی۔

"ابھی جاگ رہے ہو کا شکیلہ کے ابا! ؟" نذیرن غنودگی میں بڑبڑائی۔ دین الٰہی خاموش رہا۔ نذیرن کے اس جملے نے اسے بے پایاں راحت سے ہمکنار کر دیا تھا۔ کتنا پیار تھا نذیرن کے اس ایک چھوٹے سے جملے میں۔ اور ہوتا بھی کیوں نہ۔ نذیرن اس کی بیوی ہی تو تھی۔ وہ نذیرن جس نے ہر سکھ دکھ میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اسے پریشان دیکھتی تو اس سے کھانا تک نہ کھایا جاتا۔ اس کی محبوب مسکراہٹ، اس کے کھنکتے قہقہے دین الٰہی کو سب کچھ یاد تھا۔ لیکن وقت کے ٹھوکر نے اسے اب کتنا چڑچڑا بنا دیا تھا۔ بات بات پر جھلاتی۔ اس پر نظر پڑتے ہی بڑبڑانے لگتی۔ آخر وہ دل کی بھڑاس نکالتی بھی کس پر۔ وہ قسمت کا ر دنا ضرور روتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اپنی بیٹیوں کو اس نے کبھی منحوس یا لعنت نہ سمجھا تھا۔ دل و جان سے انہیں چاہتی تھی۔ دین الٰہی جانتا تھا کہ نذیرن کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ وہ شکیلہ کے رشتہ کے لئے کیسے کیسے پاپڑ بیل رہا ہے۔ کتنے لوگوں کی منت سماجت کرتا ہے۔ باہر وہ صرف چائے پینے ہی نہیں جاتا بلکہ گھر کے مسئلوں کو سلجھانے اور شکیلہ کے رشتے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

کافی رات بیت چکی تھی۔ اور اب جو خیال دین الٰہی کے ذہن پر تازیانے برسا رہا تھا اس کی نوعیت سب سے مختلف تھی۔ صبح کے اخبار والی خبر ایک زہریلے سانپ کی طرح پھن اٹھائے کھڑی تھی۔ اگر شکیلہ نے بھی ایسا کر ڈالا؟ نا نا ایسا نا ہو گا۔" دین الٰہی نے بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹک کر خود ہی اپنے سوال کا جواب نفی میں دے ڈالا۔ لیکن ایک خیال جونک کی طرح اس کے ذہن پر چپکے جاتے جا رہا تھا۔ ایک نیا اندیشہ۔ ایک نیا وسوسہ۔ اس کے دل میں تھرتھری سی لگی ہوئی تھی۔ نذیرن تو نیچے برآمدے میں بیٹھ کر بیڑی بناتی تھی لیکن چاروں لڑکیاں اوپر چھت پر بیڑی بناتی تھیں۔ چھت سے متصل ایک کچا اور شکستہ حال کوٹھا تھا۔ چھت پر تو خیر اونچی منڈیریں تھیں لیکن کوٹھے کی کھڑکی میں صرف آدھی دور تک سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اوپر کا آدھا حصہ کھلا ہوا تھا۔ کھڑکی کے نیچے پختہ سڑک تھی۔ کوٹھا اتنا اونچا بھی تھا کہ شکیلہ اس لڑکی کی طرح کھڑکی سے نیچے کود کر اپنی دانست میں اپنی اور اپنے والدین کی پریشانی دور کر سکتی تھی۔ دین الٰہی گھبرا کر چارپائی پر اٹھ بیٹھا اس کا سانس بہت تیز چل رہا تھا۔ "نا نا ہم شکیلہ کو ایسا نا کرنے دیں گے۔" وہ پھر بڑبڑایا اور پھر پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ سوچتا رہا۔ کل سے وہ زینے کے دروازے پر تالہ لگا دے گا اور لڑکیوں سے کہے گا کہ نیچے کمرے ہی میں بیٹھ کر بیڑیاں بنائیں۔ وہ شکیلہ کو ایسی موت مرنے نہیں دے گا۔

دوسری صبح دین الٰہی بیدار ہوا تو سوچوں میں گم تھا۔ مسجد سے لوٹا تو آنگن میں جا بجا اُگی گھاس صاف کرنے لگا۔ نذیرن چارپائی پر پڑی جوڑوں کے درد سے کراہ رہی تھی۔ جمیلہ آنگن کے کونے میں بنا مٹی کا چولھا لیپنے بیٹھ گئی۔ دین الٰہی نے دزدیدہ نظروں سے آج پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کی پہلی ہی نظر نذیرن کی اس تنبیہہ کی سچائی کی تصدیق کر گئی۔ جمیلہ نے بھی اس کی طرف دیکھا اور پھر گھٹنوں میں سمٹتے ہوئے دوپٹہ برابر کرنے لگی۔

دین الٰہی اٹھ کر نذیرن کی چارپائی کے قریب آیا۔ شکیلہ ماں کے ہاتھ پیروں میں مالش کر رہی تھی۔ دین الٰہی نے باری باری سے دونوں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"دیکھو کوٹھا بہت کمزور ہو گیا ہے۔ سب بہنیں نیچے کمرے میں بیٹھ کر بیڑی بنایا کرو۔ ہم زینے کے دروازے میں تالہ لگا دیتے ہیں۔" نذیرن کراہتے ہوئے کچھ بدبدائی لیکن دین الٰہی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ ایک پرانا تالہ ڈھونڈ کر اس نے زینے کے دروازے میں لگایا اور قدرے مطمئن ہو کر جیسے ہی دروازے کے باہر آیا رفیق مرحوم کا لڑکا امجد سیٹی بجاتا ہوا ادھر سے گزر رہا تھا۔ دین الٰہی کا خون کھول اٹھا۔ سوچنے لگا رفیق مرحوم خود کتنے نیک اور شریف انسان تھے اور ایک یہ ہے۔ لفنگا آوارہ۔ گلی کوچوں میں جھوم جھوم کر سیٹیاں بجانے کے سوا مردود کو دوسرا کوئی کام ہی نہیں۔ امجد نے آگے بڑھ کر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ دین الٰہی کا خون پھر کھول اٹھا۔ اس کے جی میں تو آیا کہ وہ امجد کو ایسی کھری کھری سنائے کہ وہ آئندہ ادھر کا رخ ہی نہ کرے۔ لیکن پھر وہی خیال اس کے ذہن میں آیا کہ سڑک سرکار کی ہے اس کی اپنی نہیں۔

ایک رات دین الٰہی عشاء کی نماز پڑھ کر گھر لوٹا تو آنگن میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ شکیلہ زینے کے اوپر کھڑی بند دروازے

کو گھور رہی تھی۔ دین الٰہی کو اچانک سارا گھر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شکیلہ آہستہ آہستہ زینہ طے کر کے نیچے آئی اور کمرے میں چلی گئی۔
دین الٰہی کا احساس اور وہ اندیشہ جب ایک دوسرے سے ٹکرائے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کے دو مخالف کرنٹ کے تار آپس میں مل گئے ہوں اور اس کی آنکھوں کے سامنے چنگاریاں بکھر گئی ہوں۔ یقین نے اندیشے کو نگل لیا اور اسے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ شکیلہ اس آتش فشاں کے دہانے تک آگئی ہے جہاں پہنچ کر اس لڑکی نے خودکشی کر لی تھی۔ شکیلہ کوٹھے سے کود کر مرنا چاہتی ہے۔
...شکیلہ کوٹھے سے کود کر مرنا چاہتی ہے..... شکیلہ کوٹھے سے..... دین الٰہی کے اردگرد شور سا اٹھ رہا تھا" نا نا ایسا نا ہوگا"
دین الٰہی نے سر جھٹک کر اس آواز کو دبانا چاہا۔ لیکن آج یہ آوازیں اس کے کان پھاڑے دے رہی تھیں۔ وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ یہ آوازیں اس کے یقین کی آوازیں ہیں۔ اب اسے بہت محتاط ہو جانا چاہئے ورنہ شکیلہ جو ارادہ کر چکی ہے اس سے اسے باز رکھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ دین الٰہی نے زینے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ تالہ بدستور بند تھا۔ وہ چپ چاپ سا ڈھیلے کر بیڑی کی پتی کاٹنے بیٹھ گیا۔

دوسری صبح جب دین الٰہی عبداللہ کی دکان سے اٹھ کر گھر کی طرف بڑھ رہا تھا تو جیسے اس کے قدم ہی نہ اٹھ رہے تھے۔ آج اچانک اس کا بڑھاپا سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ شکیلہ کا سراپا اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ سلگتی بکھرتی شکیلہ۔ وہ شکیلہ جس کے لئے کبھی اس نے درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی تھیں آج اس کے لئے عذاب جان بنی ہوئی تھی۔ عبداللہ کی دکان پر آج وہ جو خبر سن کر آیا تھا اس سے اس کے شعور میں متواتر دھماکے ہو رہے تھے۔
دین الٰہی گھر میں داخل ہوا۔ چاروں لڑکیاں حسب معمول اندر کمرے میں بیڑیاں بنانے میں مصروف تھیں۔ نذیرن چولہے کے قریب بیٹھی اپنے جوڑوں کو سینک رہی تھی۔ دین الٰہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور پھر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا کھوئے کھوئے انداز میں اس نے چولہے کی آگ سے ایک بیڑی سلگائی اور ٹوپی اتار کر دھیرے دھیرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
"کا بات ہے شکیلہ کے ابا۔ چپ کاہے ہو؟!" نذیرن چولہے کی آگ کو کریدتے ہوئے بولی۔
"نذیرن.....!"
"ہاں کہو۔ چپ کاہے ہو گئے۔ یہی بات ہے نا کہ آج بھی شکیلہ کے رشتے کے لئے کہیں بات نا بنی؟"
"یہ بات تو ہے ہی نذیرن۔ اس سے بڑی ایک بات اور ہے؟" دین الٰہی بیڑی اپنے کان میں پھنساتے ہوئے بولا۔
"وہ بات کا ہے؟" نذیرن بدستور اپنے جوڑوں کو سینکتے ہوئے بولی۔
"نذیرن! پچھلے مہینے جہاں شکیلہ کی بات چلی رہی، اس کے برابر جو گھر ہے، ان کی لڑکی کو حمل ٹھہر گیا ہے؟"
"مگر وہ تو کنواری رہی" نذیرن کے ہاتھ پہلی بار اچانک رک گئے۔
"ہاں نذیرن۔ اسی لئے تو پورے شہر میں آج اس بات کا چرچا ہے۔
"کا کہہ رہے ہو؟؟!!" نذیرن کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ منہ کھول کر اس نے اپنا ہاتھ رکھ لیا۔
دونوں خاموش تھے لیکن ایک دوسرے کی دھڑکنیں صاف سن سکتے تھے۔ دونوں کے چہروں پر ایک ہی رنگ تھا۔
"دیکھو شکیلہ کے ابا، جیسے بھی ہو شکیلہ کا رشتہ جلدی کہیں طے کر دو؟" نذیرن کے ہاتھ سے کپڑا چھوٹ کر چولہے کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ وہ انتہائی مضطرب تھی۔ نذیرن کے جملے میں چھپے مفہوم کو دین الٰہی کیوں نہ سمجھتا جبکہ وہ خود بھی احساس کی صلیب پر لٹک رہا تھا۔ نذیرن کی بات کا وہ کیا جواب دیتا۔ شکیلہ کے رشتے کی بات اس کے بس میں ہوتی تو وہ یوں کنواری اپنے بال سفید نہ کر رہی ہوتی۔ "آہ!!" دین الٰہی نے ایک سرد آہ بھری اور سوچنے لگا کاش وہ امیر ہوتا تو شکیلہ کا نقص روپیوں کے ڈھیر سے ڈھک دیتا۔ آج کل تو لوگ جہیز سے شادی کرتے ہیں۔ لڑکی سے شادی کون کرتا ہے۔
اس رات نذیرن دیر تک دین الٰہی کے قریب بیٹھی رہی۔ وہ گم صم سی تھی۔ جب وہ اٹھ کر اپنی چارپائی پر گئی تو

دین الٰہی کی سوچوں کا دائرہ خود بخود وسیع ہوتا گیا۔ اگر شکیلہ کے قدم بھی بہک گئے تو ... وہ کنواری ماں بن گئی تو! دین الٰہی نے گھبرا کر چارپائی کی پٹی تھام لی اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں تکنے لگا۔ شکیلہ کی طرف سے اسے کبھی ایسی بے حیائی کی امید نہ تھی۔ وہ تو گھر سے باہر قدم بھی نہ رکھتی تھی۔ بس دروازے پر کبھی کبھار سبزی والے سے سبزی خریدنے آجایا کرتی تھی۔ لیکن وہ لڑکی بھی تو گھر ہی میں رہا کرتی تھی جس کی بے حیائی کا قصہ آج سارے شہر میں گونج رہا ہے۔ دین الٰہی کی سوچوں کا دائرہ کچھ اور وسیع ہوا۔ اس جذبے کی کارفرمائی میں کچھ اتنی شدت ہوتی ہے کہ سات پردوں میں بھی کرتب ہو جاتے ہیں۔ شکیلہ کی ہستی ہی کیا۔ رات کی تاریکی اچانک سائیں سائیں کرنے لگی نہیں نہیں اس کی تو ناک کٹ جائے گی۔ اپنی پیشانی پر یہ داغ لئے وہ کہاں منھ چھپائے گا۔ جہاں آج اس کی شرافت سے لوگ اسے سلام کرتے ہیں، کل اس کے منہ پر تھوکیں گے۔ سارے شہر میں چرچا ہوگا۔ ساری رات دین الٰہی انگاروں پر لوٹتا رہا۔

صبح وہ اٹھا تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ مشکل سے ایک گھنٹہ کے لئے اسے نیند آئی ہوگی۔ فجر کی نماز سے لوٹ کر وہ دیر تک آنگن میں یونہی بے ارادہ ٹہلتا رہا۔ چاروں لڑکیاں منہ ہاتھ دھو رہی تھیں نذیرن چولھا سنبھالنے جا رہی تھی۔ باہر سیٹی کی آواز گونجی۔ دین الٰہی نے دروازے کے پھٹے پردے سے باہر دیکھا۔ امجد سیٹی بجاتا ہوا سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ آج امجد کو دیکھ کر دین الٰہی کو غصے سے زیادہ رفیق مرحوم کو یاد کر کے افسوس ہوا۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے انھوں نے امجد کے لئے۔ ان کے مرنے کے بعد تو امجد جیسے کھلا سانڈ ہو گیا۔ سارے شہر میں بدنام ہے۔ باپ کے نام کو بھی داغ لگا رہا ہے اور بیوہ ماں کی آہیں بھی لے رہا ہے۔ چالیس کی عمر ہو گئی یونہی سڑکوں پر گھومتے گھومتے۔ کچھ سوچ کر دین الٰہی نے ٹوپی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل آیا۔

وہ رفیق مرحوم کے گھر جا رہا تھا۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو اندر سے امجد کی ماں کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ آواز دے کر اندر چلا آیا۔

"آؤ آؤ دین الٰہی آج راستہ بھول گئے کیا؟" امجد کی ماں کھانسی کے حملے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ارے نا بھابھی۔ تم لوگوں کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ گھر میں بہت پریشانی ہے بھابھی۔ وقت نہ ملتا"

"ٹھیک کہہ رہے ہو دین الٰہی۔ امجد کے ابا کے مرنے کے بعد تو ہم لوگ بھی کہیں کے نہ رہے۔ اچھا وہ شکیلہ کے رشتے کا کیا ہوا؟"

"شکیلہ کا رشتہ ابھی طے نا ہوا بھابھی۔ آج ہم تورے پاس کچھ کہنے آئے ہیں۔ دیکھو امجد کو سمجھاؤ۔ بڑا دکھ ہوتا ہے اسے دیکھ کر کب تک سڑک پر سیٹی بجاتا پھرے گا۔ رفیق بھائی کی روح پر کیا گزرتی ہوگی۔ تو بھی بیمار رہتی ہو۔ امجد سے کہو کوئی کام دھندا کرے"

"تو ٹھیک کہتے ہو دین الٰہی۔ ہم روز امجد کو سمجھاتے ہیں" امجد کی ماں نے پان کی گلوری دین الٰہی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "اب لگتا ہے سنبھل جائے گا۔ آج بھور کی گاڑی سے وہ کہیں باہر کام کھوجے جائے گا۔ سامان ٹھیک کر لیا ہے اس نے"

امجد کی ماں سے رخصت ہو کر دین الٰہی باہر نکلا تو قدرے مطمئن تھا۔ دراصل رفیق مرحوم کے گھر کو بھی وہ اپنا ہی گھر سمجھتا تھا۔ جب تک وہ زندہ تھے، دونوں گھروں میں آنا جانا تھا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد جیسے ہی دونوں گھروں میں پریشانیاں شروع ہوئیں آنا جانا خود بخود کم ہوتا گیا تھا۔

دین الٰہی گھر لوٹا تو آٹھ بج رہے تھے۔ نذیرن نے روٹی سبزی لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ناشتہ کر چکا تو نذیرن چائے لے آئی۔ چائے پی کر وہ دیر تک چارپائی پر بیٹھا رہا۔ آج معمول کے خلاف اس کا دل باہر جانے کو بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس کے ذہن میں پھر انتشار کی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ انتشار بڑھتا رہا بڑھتا رہا۔ اگر شکیلہ کے قدم بھی بہک گئے تو ...... اگر شکیلہ نے بھی منہ کالا کر لیا تو ... وہ کنواری ماں بن گئی تو۔ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ شکیلہ نے اگر ایسا کر لیا تو وہ دیسے بھی اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ کمبخت خود ہی مر جائے ہاں یہی ٹھیک ہے۔ مر جائے کمبخت۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔ دین الٰہی کی غیرت میں ایک تیز ابال اٹھ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ ٹھیک ہے۔ یہی ٹھیک ہے۔ وہ زینے کے دروازے کا تالہ کھول دے گا۔ شکیلہ کھڑکی سے کود کر مر جائے، یہی اچھا ہے۔ ہاں یہی اچھا ہے۔ دین الٰہی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے تکئے کے غلاف میں چھپائی چابی نکال کر وہ آنگن میں آ گیا۔ شکیلہ آنگن کے ایک کونے میں نہا کر بال جھٹک رہی تھی۔ یہی موقع اچھا ہے۔ دین الٰہی نے سوچا۔ شکیلہ آنگن ہی میں ہے تو وہ اسے تالہ کھولتے ہوئے دیکھ بھی لے گی۔ تیز تیز قدموں سے وہ زینے پر چڑھا اور دروازے کا تالہ کھولنے لگا۔ اس نے شکیلہ کی طرف بالکل نہیں دیکھا لیکن اسے پورا یقین تھا کہ شکیلہ اسے تالہ کھولتے ہوئے ضرور دیکھ رہی ہوگی۔ تالہ چابی ہاتھوں میں لئے وہ آہستہ آہستہ زینے سے نیچے اتر آیا۔

تمام دن دین الٰہی گھر پر ہی رہا۔ جب جب وہ زینے کے دروازے کی طرف دیکھتا اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ بڑی مشکلوں سے وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پاتا۔

رات ہوئی۔ دین الٰہی عشاء کی نماز سے لوٹ کر دیر تک بیڑی کی پتی کاٹتا رہا۔ نذیرن چارپائی پر لیٹ چکی تھی۔ چاروں لڑکیاں بھی اندر کمرے میں سونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ وہ بھی آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

نیند آج اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ آج رات ہی میں کسی وقت شکیلہ کوٹھے پر جا کر کھڑکی سے نیچے کود دے گی۔ دین الٰہی آنکھیں پھاڑے برآمدے کی چھت میں لہراتے مکڑے کے جالوں کو تکتا رہا۔ رات آدھی گزر گئی۔ پھر رات ڈھلنے لگی۔ صبح کاذب نمودار ہوئی۔ دین الٰہی اب تک جاگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ملگجا سا اجالا آنگن میں پھیل گیا۔ تبھی کمرے میں آہٹ ہوئی۔ دین الٰہی سانس روکے لیٹا رہا۔ چند لمحوں بعد شکیلہ کمرے سے باہر نکلی۔ پھر وہ زینے کی طرف بڑھنے لگی۔ دین الٰہی یکبارگی لرز کر رہ گیا۔ اس کے سینے میں کہیں ایک تیز درد اٹھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ دوڑ کر شکیلہ کو روک لے اور کہے ”نا شکیلہ نا۔ ایسا مت کر۔ اگر تو اب تک کنواری ہے تو اس میں تیرا کیا قصور۔ تو اپنے آپ کو کیوں سزا دے رہی ہے۔ رک جا شکیلہ رک جا۔ تو ہماری اولاد ہے۔ تو اس طرح مر گئی تو ہم ساری عمر اپنے آنسو نہ روک پائیں گے“، لیکن اچانک ہی دین الٰہی کی غیرت میں پھر ایک تیز ابال اٹھا اور وہ چارپائی سے ہل تک نہ سکا۔

شکیلہ زینے کا دروازہ کھول کر چھت پر پہنچ چکی تھی۔ دین الٰہی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل پھر لرزنے لگا۔ وہ شکیلہ کی موت کی خبر کیسے سن سکے گا۔ ایک جھٹکے سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فجر کی نماز میں ابھی کافی دیر تھی لیکن وہ ٹوپی پہنتا ہوا گھر سے نکل پڑا۔

مسجد سے لوٹتے وقت اس کا دل رو رہا تھا۔ جب وہ گھر پہنچے گا تو اس کی کھڑکی کے نیچے بھیڑ لگی ہوگی۔ سڑک پر خون ہی خون بکھرا ہوگا۔ خون خون۔ اس کا اپنا خون۔ شکیلہ مر چکی ہوگی۔

نکڑ پر جیسے ہی وہ مڑا اسے اپنی کھڑکی کے نیچے بھیڑ اکٹھا نظر آئی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں بہہ نکلیں۔ وہ کیسے اس خبر کو سن پائے گا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ گھر کے قریب پہنچا۔ وہ کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک احساس جرم اس کی آنکھوں سے نمایاں تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک جھٹکے سے گھر میں داخل ہو گیا۔ آنگن میں نذیرن پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ تینوں لڑکیاں سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھیں۔ نذیرن اس کی چھاتی سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔

”یہ کا ہو گیا۔ ارے ہمیں کا معلوم تھا کہ ایسا ہوگا۔ ارے شکیلہ تمہیں ہم لوگوں کا بھی خیال نہ آیا۔ کاہے کو کر لیا ایسا!“
آنگن میں پڑوس کی عورتیں بھری تھیں۔ سب نے نذیرن کو سنبھالا۔

دین الٰہی آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے دردیدہ نظروں سے کھڑکی کے نیچے دیکھا۔ لیکن وہاں تو ایک قطرہ بھی خون نہ تھا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے ایک لمبا سا رسّہ سڑک تک لٹک رہا تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیوں سے دین الٰہی کے کان پھٹے جا رہے تھے۔ بے اختیار ہو کر وہ رسّے کی طرف لپکا۔ رسّے تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے زور کی ٹھوکر لگی، سنبھلنے کی کوشش میں

بقیہ صفحہ ۴۶

عقیل گیاوی

پرامن ساعتوں کی دعا بھی مرے لئے!
گندی مخالفت کی فضا بھی مرے لئے
لب پہ دہکتی ریت سی صدیوں کی تشنگی
زرخیز موسموں کی گھٹا بھی مرے لئے
رقصِ شرار و سنگ بھی مجھ سے قریب تر
محفوظ حرفِ خیر و بقا بھی مرے لئے
سر پہ گھنے درخت کا سرسبز سائباں
تپتی ہوئی زمیں کی سزا بھی مرے لئے
ہر اک قدم پہ خوفِ شبِ انتشار بھی
روشن نئی سحر کی فضا بھی مرے لئے

معرفت: اوکے ٹیلرس، پرانا بازار، ادھنا باد (بہار)

ھارون فراز

جشن برپا ہو سر کے بچنے کا
یا کہ ماتم زبان کٹنے کا
بیٹھ کر اب دھوئیں کے سائے میں
دیکھیں منظر درخت جلنے کا
خواب بنتی ہے آنکھ صحرا کی
بھیگے موسم کا پھول کھلنے کا
اجنبی سب مجھے سمجھتے ہیں
میں بھی عادی ہوں گھر بدلنے کا
زندگی خواہشوں کے نرغے میں
مرحلہ خود سے جنگ لڑنے کا

۸۶۷، بیل باغ، مالیگاؤں

صغیر منظر

جُدا دیوار سے در ہو گئے ہیں
ہم آدھے گھر سے باہر ہو گئے ہیں
ہمیں سے کیوں ہواؤ سرگراں ہو
بگولے تک سُبک سر ہو گئے ہیں
ہمیں ڈھونڈو شناور بھائیو ہم
سرابوں کے سمندر ہو گئے ہیں
چلو کہ گاؤں میں اپنائیت ہے
شہر والے تو پتھر ہو گئے ہیں
غزل کے غم نے وہ وہ زخم بخشے
سراپا درد منظر ہو گئے ہیں

نز دکھار واڑی مسجد، کھنڈوا

صابر حسن رئیس

آنچل کے اوٹ میں ترا پیکر دکھائی دے
منظر غزل ہو تو پسِ منظر دکھائی دے
بچپن سہانا خواب، مگر کتنا مختصر
سورج تو آنکھ کھلتے ہی سر پر دکھائی دے
اک لغزشِ قدم مجھے لائی تھی گھر سے دور
اب لڑکھڑاتے قدموں کو پھر گھر دکھائی دے
اپنوں سے ہو خلوص کی چاہت تو دور رہ
کوہِ بلند دور سے خوش تر دکھائی دے
شانِ عطا کی خیر، یہ حدِ نگاہ کیوں
یوں ہو کہ آسماں سے بھی اوپر دکھائی دے
بھر سکوں جو آنکھ کروں بند اے رئیس
ساحل پہ سر پٹکتا سمندر دکھائی دے

نزد مسجد گول، ٹونک (راجستھان)

کسم پراشر

کبھی دھرتی گگن نہیں پاتی
آستھا دیہہ بن نہیں پاتی
مَن کا وشواس سرد راتوں سا
چاہ من کی تپن نہیں پاتی
آس شبدوں کی بھیڑ میں کھو کر
دھڑکنوں کا وچن نہیں پاتی
کیسی مائی ہے اندھی ابھیلاشا
بہتے پانی میں سَن نہیں پاتی
آسماں چھو رہی ہے مجبوری
آنکھ کوئی کرن نہیں پاتی
ہاتھ پھیلا کے زندگی جگ میں
کبھی چاہت کا دھن نہیں پاتی
شبد گونگے ہیں ارتھ بہرے ہیں
کوئی تصویر بن نہیں پاتے
ہر طرف شور یاتناؤں کا
پتھ کہیں سے پَوَن نہیں پاتی
راکھ بن کر کبھی وچار کرو
بھوک کیوں آگ جَن نہیں پاتی
پُورنْ ہوتی نہیں کبھی دنیا
جب تلک من کا دھن نہیں پاتی

● ۱۵۲، اشوکا گارڈن، رائسن روڈ، بھوپال

اوشا چکرورتی

ایسی پریت جگا دے مجھ میں دنیا کو جھٹلاؤں میں
اندھے، بہرے، گونگے رشتے توڑ کے تجھ تک آؤں میں
شَبدوں کو سمّانت کرنا کرن کرن دینا آشیش
ایسے چھو نا گیان جیوتی کے کاندھوں پر چڑھ جاؤں میں
نہ ساگر نہ گہری ندیا نہ آنسو نہ بہتا نیہہ
اُدھروں پہ وہ پیاس سجا دے ہر ترشنا ٹھکراؤں میں
پل پل کو ٹھہرا دے مجھ میں سانس سانس گہرائی دے
مجھ کو ڈھونڈے پاگل پیڑا خود میں ہی کھو جاؤں میں
ترسکار کا وِش پی پی ابھیمانی چھایا تپ گول
تپ کر سانسوں کی اگنی میں کندن سی ہو جاؤں میں
شکتی دے دے بھگتی دے دے انگ انگ بھر دے اپرش
ایسا رنگ اُڑھا دے مجھ کو بس تیری کہلاؤں میں
سانس سانس سولی پر لٹکی پل پل شنکا کے آدھین
ارتھ ہین شبدوں کے یگ میں کیسے وچن نبھاؤں میں
تو ہی میرے مَن کا دَرپَن تو ہی میرا روپ سروپ
جب تو اپنے نین اٹھائے گھونگھٹ میں شرماؤں میں
کونا کونا جھاڑوں پھونکوں دیواروں پہ سپن ملوں
جس دن تو میرے گھر آئے آشا دیپ سجاؤں میں

● ایل آئی جی بی/۱۹۲، سوناگری، بھوپال

ماہ جبین نجم

آدمی کو جان کر
حالِ دل بیان کر
زندگی نئی لگے
اس کو اپنا جان کر
گوہرِ مراد لا
پانیوں کو چھان کر
روح گنگنائے گی
گھر کو گلستان کر
اس کے دُکھ کو جان لے
اپنے سُکھ کو دان کر
ہے دعا کہ نجم سے
غم کو بدگمان کر

● لکچرر صدر شعبۂ اردو، یوراجاس کالج
میسور، (کرناٹک)

صغریٰ عالم

مرے حجابِ دل میں رقم ہے وہ کسی ورق پہ میں نے لکھا نہیں
مرا عشق اس کے حضور ہے کسی اور نے تو پڑھا نہیں
ہے یہ زندگی بھی تمام تر وہی چاک داماں دریدہ دِل
سبھی کر رہے ہیں رفو مگر کوئی زخم اب بھی سِلا نہیں
کسی صبح شام میں جی تو لوں کہ یہ زندگی ہے عزیز تر
ہوں اسی کے خوف سے جاں بلب ابھی حادثہ جو ہوا نہیں
وہ جو دے رہا ہے فریب سے کسی روشنی کی ضمانتیں
مری چشمِ تر کی فصیل پر وہ چراغ اب بھی بجھا نہیں
کوئی آرزو سی رہوں گی میں تری چشمِ تر کی پناہ میں
یہاں جسم و جاں کا قرب ہی کوئی انتہائے وفا نہیں

● دالم بلڈنگ، شاہ بازار، گلبرگہ۔

مکتوب

پروفیسر حامدی کاشمیری ۔ ۹۹۰ جواہر نگر، سری نگر (کشمیر)

آپ نے ۲۵ نئے شعراء کے کلام پر مشتمل جو خصوصی شمارہ شائع کیا تھا وہ بے حد اہم ہے ۔ نئے ذہن کو دریافت کرنا اور اُسے پروجیکٹ کرنا بھی ایک ذمہ دار مُدیر کے فرائض منصبی میں شامل ہے ۔ یہ کام آپ بہ طریق احسن انجام دے رہے ہیں ۔ آپ نے ان شعراء کے شعری رجحانات اور ساتھ ہی ان کے شعری مجموعوں کے بارے میں اظہارِ خیال کرکے اپنی قوتِ نقد کا بھرپور اظہار کیا ہے ۔ حالانکہ کہیں کہیں آپ کا لہجہ زیادہ توصیفی ہو گیا ہے ۔

ایم ۔ ایم وفا ۔ اسٹیٹ بینک آف انڈیا، بیتا برانچ بیتا (بہار)

نئی شاعری نئے نام کا انتخابی سلسلہ بہت خوب ہے ۔ ادبی اجارہ داریوں اور دھاندلی کی مصیبت سے بالاتر ہوکر نئی شاعری اور نئے شاعروں کو تخلیقی تناظر میں دیکھنے کی جو سعی آپ نے کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے ۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے ۔

ایم ۔ کے ۔ اثر ــــــــ بی ۔ ۱۷، ہگار ڈن ریچ روڈ، کلکتہ

نئی شاعری نئے نام کے عنوان سے جو نئی نسل کے تازہ کار شعراء کا انتخابی سلسلہ شروع کیا گیا ہے وہ یقین کی حد تک وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ۔ یوں تو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی رسالے میں کسی ایک شاعر کو جگہ دی جاتی رہی ہے یا پھر ایک سے زائد دو یا تین شعراء کو مسلسل پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ لیکن شاعر میں بہ یک وقت ۲۵ شعراء کو شامل کرکے ایک منفرد قدم اٹھایا گیا ہے ۔ اس اعلان سے بھی بے حد مسرت ہوئی کہ نئی شاعری نئے نام کی ابھی دو تین کڑیاں اور آنی ہیں ۔ آپ کی فہرست میں کئی اہم نام نظر نہیں آئے تھے اور ابھی کتنے ہی ایسے نام باقی ہیں جو اچھی شاعری کر رہے ہیں لیکن مدیران سے تعلقات نہ ہونے کی بنا پر شائع ہونے سے محروم رہتے ہیں یا محروم کر دیے جاتے ہیں ۔ اس طرف توجہ دے کر آپ نے قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم کی ادبی تحریک کو جلا بخشی ہے ۔

نئی شاعری نئے نام میں شامل تمام ہی شعراء مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے معیاری تخلیقات دے کر بالکل نئے شعراء کو اچھی شاعری کی ترغیب دی بالخصوص سے

آنے والی نسل کے حصے میں روشنی ہے فدا
خوف نفرت تیرگی اس عہد میں ہم پر تمام

ـــ عبداللہ کمال

بچے سوال کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے
یخ بستہ لاجواب کھڑے سب علیم تھے

ـــ بھوپال سنگھ بیتاب

آج لگتا ہے کہ کر لے گی قبول
ریگزاروں کی دعا بارش نے

ـــ عبید صدیقی

آنکھ خود بینی میں ہے اندر اداس
اور آنسو آنکھ کے باہر اداس

ـــ شبیر رسول

بدن پہ دھوپ کی چادر ہے پھیلی
لہو میں چاندنی گھولی ہوئی ہے

ـــ اسعد رضوی

ہاں! فاروق شفق اور حیدر صفت تو گھر کے لوگ ہیں، ہمارے بنگال کی آبرو ہیں ۔

پروفیسر محمد حسن ــــــــ ڈی ۔ ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی

شاعر کے پرچے باقاعدگی سے ملتے رہے ہیں، ہر شمارہ پچھلے سے بہتر دل ہی دل میں داد دی ۔ جی چاہا کہ آپ کو داد و تحسین پیش کروں کہ آپ نے اعجاز صدیقی صاحب کی روایت کو اور زیادہ تابندہ کیا ۔ سوچا تھا کہ کوئی نیا مضمون لکھ کر آپ کو بھیجوں تو اس طویل غیر حاضری کی تلافی ہو اور اسی غیر مطبوعہ مقالے کے ساتھ طویل خط بھی لکھوں گا اور آپ کی شاعر آرائی پر تبصرہ بھی ۔ مستقل مضامین کا جو سلسلہ اعجاز صاحب کے زمانے میں شروع کیا تھا اسے بھی پھر سے شروع کروں گا، مگر یہ سب کچھ نہ ہو سکا اور ابھی کچھ دن اور نہیں ہو سکے گا ۔ پرانے مضامین بکثرت پڑے ہیں، بعض اچھے بھی ہیں مگر آپ کو نیا مضمون ہی بھیجنا چاہتا ہوں ۔ شاعر کے بارے میں صرف ایک بات ۔ اس کی فنی اور فکری سمت واضح رہنی چاہیے ۔

اقبال متین کچھاتی ۷۰۰ گاؤں کالونی، پاچم پاڑ ۵۰۳۲۱۹ (اے ۔ پی)

شاعر برابر مل رہا ہے، خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے، تم نے یہ کام اعجاز بھائی کی زندگی ہی میں سنبھال لیا ہوتا، وہ کتنے خوش ہوتے تمہارے علم سے، تمہارے سلیقے سے، تمہارا متنوع ذہن شاعر کو کیا سے کیا بنا رہا ہے ۔ عبداللہ کمال کا خط [شمارہ نمبر ۲ ۔ ۸۹] کتنا سچا، کتنا پیارا ہے ۔ یہ اکھڑا اکھڑا نوجوان دل کو بھلا لگتا ہے ۔

محمد عظیم فیروزآبادی ۔ خدا بخش اینڈ کو فیروزآباد (یو پی)

نثری نظم اور آزاد غزل نمبر پر میں نے سو روپے نذر کیے تھے، ہر خصوصی نمبر پر اس نذرانے کا دو سال پیش نظر تھا ۔ بعد کے نمبروں نے توقعات پوری نہیں کیں ۔ موجودہ عام شمارہ [۲ ۔ ۱۹۸۹ء] عرشی زادہ کی تھامۂ غالب کی گوہر افشانی کال داس گپتا رضا کی توقیتِ غالب اور رام لعل کا آخری صفحہ کی بنا پر خصوصی نمبروں پر بھاری ہے ۔ اس کا باطن اس کے ظاہر کی طرح دل فریب ہے ۔

رؤف خیر ۔ بیت الخیر ۱۹/۲۔۲۔۱۔۹ دیوان شاہ گزنسالہ بازار گولکنڈہ حیدرآباد

بھائی! ان دنوں شاعر کو تو نظر لگ رہی ہے ۔ بڑا خوبصورت اور خوب سیرت ہو گیا ہے، ویسے ناقابلِ اعتنا کبھی نہیں رہا مگر غضِ بصر کی آزمائش اب پیدا ہوئی ہے ۔

تازہ شمارے میں ڈاکٹر سید حامد حسین کا مقالہ بہت ہی اہم ہے اس پر گپتا رضا صاحب کی توقیتِ غالب مزہ دے رہی ہے ۔

ڈاکٹر حامد حسین صاحب جیسی علمی بلند قامت شخصیت سے مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی والوں کا فائدہ نہ اٹھانا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر حامد صاحب نے کچھ شرائط اور مطالبات نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و تدوین کے لیے رکھے ہوں اور معاملہ پٹ نہ سکا ہو یعنی وہی صورتِ حال جو نسخۂ حمیدیہ کی اشاعتِ اول کے وقت ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری مرحوم کو پیش آئی تھی اور بعد میں مفتی انوار الحق نے ۱۹۲۱ء میں دیوان عبدالرحمان بجنوری مرحوم کے بغیر شائع کر دیا جبکہ اب تک محاسنِ کلامِ غالب جو مولوی عبدالحق نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے پہلے چھپوا دیے تھے ۔ بہرحال! اتنا کے مسائل چھڑ جائیں تو غالب کیں کھیت کی مولی؟ عراق و ایران جیسے ممالک غرق ہو جاتے ہیں ۔

مضطر مجاز ـــ مکان نمبر ۱۹ ۔ ۵ ۔ ۲۱، حیدرآباد (اے پی)

تازہ شاعر [شمارہ ۲] میں صفحہ نمبر ۳۴ پر جلیل نجیب آبادی نے اپنی غزل کے ایک شعر میں لفظ "متاثر" کو جس میں "ت" مشدد ہے، حرفِ بالکسرہ "متا ثر" باندھ دیا ہے ۔ اگر وہ لفظ "ہیں" نکال دیتے تو شعر ٹھیک ہو جاتا، اس فصل میں ہوئے متاثر اصول تک ۔ جبکہ انہوں نے ہوئے ہیں متاثر اصول تک لکھا ہے ۔ پھر چوتھے شعر کا دوسرا مصرع "محراب زلف و لفظ سے بابِ قبول تک" کتابت کی بھیانک غلطی کا شکار ہوا ہے ـــ صفحہ ۲۸ پر ارشد نظر کی غزل کے چھٹے شعر کا پہلا مصرع ساقط البحر ہے ۔ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا!

شبنم کے، موتیوں کے، ستاروں کے رنگ کے
خالی تھے ہاتھ، مانگنے جاتے کہاں کہاں

لفظ "اور" کی وجہ سے مصرع ساقط البحر ہو رہا ہے اور لفظ "سلسلے" ہی حشو و زوائد میں ہے ۔ دراصل شعر کہنے کے لیے سب سے پہلے لفظ پر فتح پانی پڑتی ہے ۔ دلت نظمیں بھی آپ نے بڑی اچھی پیش کی ہیں، جینت پرمار ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ عبداللہ کمال کا مراسلہ ہزارہا قارئین شاعر کے دل کی آواز ہے ۔ گپتا رضا صاحب نے توقیتِ غالب "حیاتِ غالب" پر ایک نظر پیش کر دی ہے ۔ اتنی محنت اور لگن کا کام وہی کر سکتے تھے ۔

رضا احمد ادیب ۔ ۹۔۱۔این اسٹاپ، آوٹار سرکل روڈ، جمشید پور ۵

زیرِ نظر شمارہ نمبر ۲ کے اداریے میں آپ نے آزاد کتاب گھر ساکچی بازار جمشید پور کے خط کا اقتباس بغیر کوئی تعلیق کے شائع کر دیا جس کے ردّعمل میں یہاں کے ادباء و شعراء بہت برہم نظر آتے ہیں کیونکہ آزاد کتاب گھر والوں کا خط ایک جھوٹ کا پلندہ ہے جس میں بے جا جھوٹ اور مبالغہ سے کام لیا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ۔ جمشید پور کے ادیب و شاعر جس قدر معیاری اور ادبی رسائل اور کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں صرف بہار ہی کے لیے نہیں غالباً ہندوستان کے لیے قابلِ رشک ہے ۔ اس خط کے سلسلے میں آپ کے پاس خطوں کا انبار لگ جائے گا ۔ اخلاق اور شرافت کا تقاضہ ہے کہ آپ تمام خطوط شائع کریں ـــ

سید یحییٰ نشیط ـــ کالی (ڈی کے) ضلع یوت مال (مہاراشٹر)

شمارہ نمبر ۲ ۔ ۸۹ میں سید حامد حسین صاحب کے مضمون "غالب کے دو تاریخی نسخے" بہت پسند آیا ۔ "توقیتِ غالب" کے بعد شاعر کے صفحات میں اسے جگہ دینے میں کیا مصلحت تھی، سمجھ میں نہ آیا ۔ رام لعل کی کہانی "اخبار کا آخری صفحہ" ایک اچھی کہانی ہے ۔ گجراتی کی دلت نظمیں بھی بڑی مؤثر ہیں ۔ آپ کا انتخاب لائقِ تحسین ہے ۔

> مکتوبات کے لیے مختصر، جامع اور مسائلی خطوط ارسال کیجئے جن میں تعریف و توصیف سے زیادہ شاعر کے مندرجات پر بحث کی گئی ہو ۔ ذاتی نوعیت کے خطوط شائع نہیں کیے جائیں گے ۔ مکتوبات کا کالم آپ کے لیے شاعر کے حوالے سے عصری ادبی مسائل اور زبان و ادب پر تاثرات ارسال کیجئے

رفتار — کتب و رسائل ۔ نقد و نظر

چاک

وقت کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی کی قدریں بھی بدلتی ہیں۔ شاعری
ال بھی فن چونکہ زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں اس لیے اس میں تبدیلی بھی
ری ہے۔ زندگی اور تمام اصنافِ فن کی اس ہم آہنگی کے لیے کوئی شرط
ں سوائے یہ کہ شاعر یا فن کار ظاہر و باطن میں زندہ ہو اور اس کی آنکھ
ی کائنات پر محیط ہو۔۔"
ب غوری ـــــ "زرد زرخیز" سے "چاک" تک آتے آتے زیب غوری ظاہر
طن میں پوری طرح جاگ اٹھے تھے اور ان کی آنکھ منظر بہ منظر پوری کائنات
محیط کیے ہوئے تھی۔ "چاک" وہ شعری مجموعہ ہے جسے ترتیب دیتے دیتے
شب و روز کے تواتر میں گم ہو گئے لیکن اپنی شاعری میں اس طرح
مرائے ہیں کہ اب انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو غزل کا ایک
م نام جو وقت کے چاک پر ان گنت خوب صورت چہروں میں ڈھلتا
ئے گا۔ ممکن ہے کہ زیب غوری کی شعری آواز کے سائے میں نئی غزل اپنا
فر طے کرے۔ ۳۲۰ صفحات کے اس مجموعے میں دو حمد، دو نعتوں
ء علاوہ ۹ غزلیں، متفرق اشعار اور "میں اپنی داد خود دے لوں" کے
وان سے زیب غوری مرحوم نے نہایت ہی معنی خیز پیش لفظ تحریر کیا ہے
اب کے آخر میں "چاک" اور "زرد زرخیز" سے پہلے کے کلام کا انتخاب دیا گیا
ہ۔ زیب غوری مرحوم کے بعض احباب کلیاتِ زیب غوری کے خواہاں
ء اور مرحوم نے جس کی ترتیب و تدوین کا کام بڑی حد تک مکمل کر لیا تھا۔
اک کا زیرِ نظر ایڈیشن پاکستان میں شائع ہوا ہے۔
فحات ۳۲۰۔ قیمت ۵۰ روپیے۔
تہ:۔ ۳۸/۹ بیت الرشیدہ، ناظر باغ، کانپور۔

تیسری دنیا کے لوگ

تازہ کار افسانہ نگار ابن کنول کے ۱۵ افسانوں پر مشتمل مجموعہ
سری دنیا کے لوگ" نئی اردو کہانی کی ان تخلیقی جہتوں کی معیار بندی کرتا
ہ جہاں کہانی اپنے پورے تجرباتی سفر کے بعد لوٹ کر آئی ہے یعنی آج
بیانیہ کہانی اپنے کل کے بیانیہ سے قدرے مختلف ہے۔ ابن کنول اپنے
لیقی سفر میں موضوع، تکنیک اور تنوع کو برتتے ہوئے فیشن زدگی
شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہانی کو بیانیہ کے اس روپ سروپ کے
ے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اچھی معیاری کہانی کی آج کی
ضرورت ہے۔ کتاب میں شامل کئی افسانے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے
یں۔ ابن کنول نے زندگی کو موضوع بناتے ہوئے محض نثری اظہار کو
ہمیت نہیں دی ہے بلکہ کہانی کے تانے بانے شعوری کوشش کے بجائے
لیقی کاوش معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب میں شامل کئی افسانے ان کے
ہاں سبزا مکانات کا پتہ دیتے ہیں۔ اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔
فحات :ـــ ۱۲۰۔ قیمت بیس روپیے۔ سنہ اشاعت جون ۸۴ء
تہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، نئی دہلی ۶۔

رنگ منچ

ایک بابی ڈراموں سے مزین اس کتاب میں ہندستان کی چھ بڑی
زبانوں کے معیاری ڈراموں کو شامل کیا گیا ہے جزوی اردو کے
علاوہ اڑیا، بنگلہ، کنڑ، مراٹھی اور ہندی زبان کے ڈراموں کے تراجم
دیے گئے ہیں۔ اردو میں ایک بابی ڈرامے لکھے تو گئے ہیں مگر یہ روایت
اب کمزور ہو چلی ہے ڈرامے لکھے جا رہے ہیں تاہم فنی اعتبار سے مکمل ہونے
کے باوجود وہ تحریری زیادہ معلوم ہوتے ہیں جبکہ آج اسٹیج ایک بار پھر
پوری قوت کے ساتھ ابھر آیا ہے فلم اور ٹیلی ویژن کی برتری کے باوجود
اسٹیج کی اہمیت اور مقبولیت کم نہیں ہو سکی ہے۔ گجراتی، مراٹھی، بنگالی
اور ہندی اسٹیج ڈرامے موضوع اور تکنیک ہر اعتبار سے اپنا تاثر قائم
کرتے ہوئے عوام سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو میں ڈراموں سے
بے اعتنائی کے سبب نہ تو اچھے ڈراموں کی کوئی فضا بن پا رہی ہے اور نہ
ہی اس موضوع پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں ایسی صورت حال میں ڈراموں
سے متعلق کوئی بھی نئی کتاب اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔
"رنگ منچ" ایک کامیاب کوشش ہے جس کے لیے انور امام اور
سلطان احمد ساحل مبارکباد کے مستحق ہیں کیوں کہ ہندستان کی بڑی زبانوں
سے معیاری ڈراموں کا انتخاب کرنا انھیں پڑھنا اور پھر ترجمہ کرنا آسان
کام نہیں۔ کتاب میں شامل ڈراموں کا مطالعہ مختلف زبانوں کے ڈراموں
کا تقابلی تجزیہ بھی پیش کرتا ہے۔
صفحات:۔ ۱۲۶۔ قیمت ۲۵ روپے۔ سنہ اشاعت اگست ۱۹۸۵ء۔
پتہ:۔ فیمس بُک ایجنسی، ۴۴، ساکچی بازار، جمشید پور۔

جو کہا نہیں جاتا

معروف کہانی کار عظیم اقبال کی ۱۰ طبع زاد کہانیوں کے اس مجموعے
میں بیانیہ اسلوب کے ذریعہ زندگی کے کئی مانوس کردار موضوع بن کر ابھر
ہیں۔ بے حد سیدھی سادھی کہانیوں میں تخلیقی چمک کی کمی کے باوجود چھوٹے
چھوٹے جملوں میں کہی ہوئی کہانیوں میں غیر ضروری تام جھام نہیں ہے۔
جتنا کچھ کہنا ہے وہی کہا گیا ہے ورنہ عام طور پر بیانیہ پر قدرت نہ ہونے
کے سبب چھوٹی چھوٹی جزئیات کہانی کار کو بے قابو کر دیتی ہیں۔ اس
مجموعے میں دو، تین کہانیاں متوجہ کرتی ہیں۔ اس سے قبل عظیم اقبال کا ایک
اور افسانوی مجموعہ "اپنی آہٹیں" شائع ہو چکا ہے۔
صفحات ۱۱۲۔ قیمت ۲۵ روپے۔ سنہ اشاعت جون ۱۹۸۵ء
پتہ:۔ گنج۔ ۱، بتیا (بہار)

انتخابِ کلامِ نازش

محمد مبین نازش بدایونی [۱۸۷۵ء ـ ۱۹۳۶ء] کے کلام کا
انتخاب طیب بخش بدایونی نے اپنے طور پر کیا ہے۔ نازش مرحوم کا بیشتر کلام
تو تلف ہو گیا تھا لیکن مولانا حسرت موہانی نے کانپور سے نازش مرحوم
کی شاعری کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ اسی طرح مرحوم نے اپنی
حیات میں کانپور سے ۱۹۳۵ء میں رباعیات کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔
حسرت موہانی کا انتخاب اور رباعیوں کو اس کتاب میں شامل کر لیا
گیا ہے۔ نازش مرحوم ذکی دہلوی کے شاگرد تھے اس طرح ان کا سلسلۂ
تلمذ مرزا غالب سے جا ملتا ہے۔ نازش بدایونی نے مزاحیہ شاعری بھی
کی اس لیے وہ "زاغ" تخلص استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے کئی
ناول بھی لکھے اُن میں "لال بی بی" اور "مرزا چوں چوں بیگ" قابل ذکر
ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، کئی
مشہور اخبار و رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ طیب
بخش بدایونی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک قابل قدر
کتاب اردو والوں کو دی اور تاریخ ادب اردو کے لیے اہم مواد
فراہم کیا۔
صفحات ۱۶۰۔ قیمت ۲۵ روپے۔ سال طباعت ۱۹۸۶ء۔
پتہ:۔ طیب بخش، پیلی کوٹھی، محلہ سوتھہ، بدایوں (یوپی)

کتب و رسائل

○ شاہین [افسانہ نمبر] فنی آداب و تہذیبی اقدار سے مزیّن
مجلہ شاہین کا چھٹا شمارہ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے
جو افسانوی انتخاب کی تاریخ میں نیا سنگ میل ثابت ہو گیا۔
ہر فن کار کے تعارف کے علاوہ ملک کے نامور حضرات
کے تبصرے۔ افسانوی ادب پر نئے زاویے سے تحریر کیے گئے مضامین
دیدہ زیب سرورق، عمدہ کتابت و طباعت۔ مرتبین!
معین الدین عثمانی اور صغیر احمد۔ رابطہ: ادارہ شاہین
لائبریری، نورانی شاپنگ سینٹر شاہو نگر، جلگاؤں [مہاراشٹر]

○ الاخبار ۔ بنگلہ دیش سے شائع ہونے والا اردو کا
سب سے پہلا سیاسی، ثقافتی، علمی و ادبی جریدہ جو نامساعد حالات
میں شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں شعر و ادب کے علاوہ سیاست
مذہب، کھیل کود، فلم اور سیاحت وغیرہ پر مضامین شامل کیے
گئے ہیں۔ ایڈیٹر: زین العابدین۔
پتہ: ۱۴۸ ۔ نواب پور روڈ، ڈھاکہ [بنگلہ دیش]

○ تشنہ ۔ [سہ ماہی] ادب، تہذیب اور ثقافت کے اعلیٰ
معیار کی ضمانت سہ ماہی "تشنہ" کے شمارۂ اولیں میں گوشۂ تشنہ شیر
گھاٹوی اور گوشۂ غیاث احمد گدی کے علاوہ مضامین نظمیں غزلیں
اور ایک افسانہ شامل ہے۔ سرپرست اعلیٰ اکمل بلخی، سرپرست فیضا بلخی، مدیر اعلیٰ ...
قیمت فی شمارہ ۳ روپیہ۔ زر سالانہ ۱۲ روپے تا عمر خریداری ۱۰۰ روپے۔ پتہ: دفتر تشنہ
معرفت شاہین اردو لائبریری، لودگی شہید، شیر گھاٹی (گیا) بہار۔

○ نشان ۔ سیتاپور (یوپی) سے شائع ہونے والا نیا علمی،
ادبی اور تہذیبی ماہنامہ۔
مدیر: سہیل وحید۔ قیمت فی شمارہ ۳ روپیہ۔
پتہ: ماہنامہ نشان، گریگ گنج، سیتاپور (یوپی)

○ عصری کاوش [سہ ماہی] بھیونڈی [ضلع تھانہ]
مہاراشٹرا سے شائع ہونے والا نئے ادبی رجحانات کا منظر نامہ جو نظیر
سلیم کی ادارت میں قلم کار احباب کے تعاون سے منظر عام پر آیا ہے۔
قیمت: فی شمارہ ۲ روپیہ۔ رابطہ: سہ ماہی عصری کاوش، گلزار
نگر، نیتی روڈ، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ (ضلع تھانے) مہاراشٹرا۔

اردو سے متعلق حکومت کرناٹک کا موقف مبہم

بنگلور۔ کرناٹک میں اردو تعلیم کی نگرانی کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ کے قیام کا مسئلہ صرف اردو اساتذہ ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ہر اردو داں اور ہر ہندوستانی کا ہے کیونکہ اس میں اردو داں بچوں کا مستقبل مضمر ہے۔ سترہ سال پہلے جب اردو تعلیم کی نگرانی با اختیار اردو داں افسران کے ذمہ تھی تو ان مدرسوں کو درسی وسائل اردو میں مہیا ہوتے تھے اور اردو تعلیم اور اردو اساتذہ کی نگرانی و رہبری خوب ہوتی تھی پھر جب مذکورہ اردو افسروں کے علیحدہ عہدوں کو ختم کرکے اردو مدارس کی نگرانی غیر اردو داں افسروں کے سپرد کر دی گئی تو درسی وسائل اردو میں مہیا ہونا بند ہو گئے اور اساتذہ کی اردو میں کی جانے والی رہبری ختم ہو گئی جس کی بنا پر اردو مدارس، اساتذہ اور درسی کتابیں رہتے ہوئے بھی اردو تعلیم کا معیار تیزی سے گرتا گیا۔ اور اردو مدارس تقریباً تباہ ہو گئے۔ ۱۹۷۹ء میں اردو اساتذہ نے اپنی ریاستی تنظیم کرناٹک اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن (کماٹا) بنائی اور مذکورہ مسائل پر غور کیا تو پتہ چلا کہ اردو میں تعلیمی وسائل کا فقدان اور اردو مدارس کی نگرانی غیر اردو داں افسران کے سپرد رہنے کے باعث اردو مدارس اور تعلیم کا معیار گرتا جا رہا ہے لہٰذا اردو اساتذہ نے حکومت کرناٹک سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ اردو تعلیم کی نگرانی کے لیے علیحدہ اردو ڈائرکٹوریٹ قائم کیا جائے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کی ضرورت و اہمیت سے کنڑی اور دیگر زبانوں کے اساتذہ کو تفصیلی طور پر آگاہ کیا گیا جس پر دیگر تمام زبانوں کے اساتذہ بھی اردو ڈائرکٹوریٹ کے مطالبے کی بھرپور تائید و حمایت کرنے لگے۔ بالآخر ریاستی حکمراں جنتا پارٹی نے بھی مذکورہ ضرورت کو سمجھا اور ۱۹۸۳ء کے انتخابات کے موقعے پر وعدہ کیا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ قائم کیا جائے گا۔ پھر ریاستی وزیر تعلیم نے ۱۵ اکتوبر ۸۴ء کو ایک تعلیمی کانفرنس میں اور ۲۱ اپریل ۱۹۸۵ء کو کماٹا کی اردو تعلیمی کانفرنس میں وزیر اعلیٰ مسٹر رام کرشن ہیگڑے کی موجودگی میں اعلان کیا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ جلد ہی قائم ہوگا نیز ۱۹-۳-۸۶ کو ریاستی لیجسلیٹو اسمبلی میں معزز رکن مسز ممتاز النساء سے وزیر تعلیم نے کہا تھا کہ اردو مدارس کے لیے علیحدہ ڈائرکٹوریٹ قائم کر دیا گیا ہے مگر اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اب تک نہ اردو ڈائرکٹوریٹ قائم کیا گیا اور نہ اردو ڈائرکٹر۔ آخر تنگ آکر اس کے فوری قیام کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنے کو کماٹا نے گاندھیائی طریقہ پر پرامن احتجاج شروع کیا ہے جس کا پہلا مرحلہ ۱۷ اپریل کو ودھان سودھا کے روبرو ایک دن کی علامتی بھوک ہڑتال کی شکل میں گزر گیا۔ لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مگر اب یہ بات یقینی ہے کہ اردو ڈائرکٹوریٹ فوری قائم نہیں کیا گیا تو اردو عوام خاموش نہیں رہیں گے اور عنقریب ہی پرامن ریاست کرناٹک میں ایک شدید لسانی بحران پیدا ہوگا جس کی پوری ذمہ داری کرناٹک کی موجودہ حکومت پر ہوگی ان باتوں کا تذکرہ جناب عبدالعلیم الامین نے اپنے ایک بیان میں کیا۔

صدر ضیاء الحق کو ۳۰۰۰ ہندوستانی کتابیں پیش کی گئیں

اسلام آباد۔ پاکستان کے لیے ہندوستانی سفیر مسٹر ایس کے سنگھ نے یہاں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کو تین ہزار ہندوستانی مطبوعات پیش کیں۔ یہ کتابیں پاکستان کی قومی لائبریری کے لیے بطور تحفہ دی گئی ہیں جو اردو اور انگریزی میں ہیں۔

اردو کو اتر پردیش میں اس کا مناسب حق دیا جائے

اردو اور ہندی کے ممتاز ترقی پسند قلمکاروں کا مشترکہ بیان

انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں ہوئی تقریب کے موقعہ پر ہندی اور اردو کے ادیبوں نے ایک بیان لسانی تنازعے پر جاری کیا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر جمع ہونے والے ہم ہندی اور اردو کے قلم کار مانتے ہیں کہ ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کو اپنے رسم الخط اور مزاج کے مطابق پھلنے پھولنے اور ترقی پانے کا یکساں حق حاصل ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جس علاقے اور صوبے میں جو زبان بولی جاتی ہے اس کو اس علاقے کے تعلیمی نظام، انتظامیہ اور عدالتی نظام میں، ہندوستان کے دستور کے مطابق مناسب مقام ملنا چاہیے۔

ہمیں یقین ہے کہ اتر پردیش میں اردو بولنے والوں کی خاصی تعداد رہتی ہے۔ ہم اس بات کی مذمت کرتے ہیں کہ اردو کو اتر پردیش میں اب تک وہ مقام اور حق نہیں مل پایا ہے جو اسے ملنا چاہیے تھا۔ ہم سرکار سے مانگ کرتے ہیں کہ وہ اس ریاست میں اردو کے حقوق بحال کرے اور اردو بولنے والوں کو اس کی ضمانت دے۔

ہم اردو اور ہندی کے اپنے ساتھی قلمکاروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ زبان کے مسئلے پر چھوٹے موٹے اختلافات سے اوپر اٹھیں۔ وقت آ چکا ہے کہ زبان کے سوال پر ایک ترقی پسند اور سائنسی نقطہ نظر اپنایا جائے اور ترقی پسند قلمکار متحد ہو کر ان قدروں کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں جنہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں سید محمد عقیل رضوی، وامق جونپوری، کیفی اعظمی، کھگیندر ٹھاکر، امرکانت، کملا پرشاد، موج فرازی، ضیاء الحق، تسکین زیدی، شاشوک، عبدل بسم اللہ، شکیل صدیقی، شیلندر چوہان، ولوڈ احمد جمال پاشا، سید محمود الحسن، اجمل اجملی، عابد سہیل، زاہدہ زیدی، شکیب رضوی، اجیت پشکل، اسرار گاندھی، عبدالقیوم امدانی، فخر کریم صدیقی، پردیپ سوربھ، ارتضیٰ کریم، علی جاوید، علی احمد فاطمی، حسین الحق، قمر رئیس، میراراٹی (وسچے)، رویندر کمار پانڈے، اروند کمار، آر ایس، ستر ایتس مالویہ، مرلیش کمار شیش، لوشا، اسلام، خورشید مسعود، رتن سنگھ، سید عاشور کاظمی، اتم چند، عتیق الہ آبادی، سریندر کمار، تیجو کمار سہائے اور عطیہ نشاط شامل ہیں۔

گجرات اردو اکادمی کی تشکیل

گاندھی نگر — حکومت گجرات نے وزیر تعلیم جناب نسیم محمد بھائی پٹیل کی صدارت میں گجرات اردو اکادمی کی تشکیل کی ہے جس کے نائب صدر رحیمان وردیا ہوں گے۔ اس کے دیگر اراکین میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، پروفیسر وامث علوی، پروفیسر محی الدین بمبئی والا، محمد علوی، مرحمت امروہوی، ڈاکٹر احمد حسین قریشی، مظفر ہاشمی (ایڈیٹر گلبن) احسان جعفری (سابق ایم پی)، پروفیسر مشتاد بیگم مرتضیٰ، اللہ بخش شیخ، مہر النساء شیخ، محمد میاں شیخ، ظہیر الدین بخاری، محمد کاظم حکیم (ایڈوکیٹ)، ڈاکٹر ریاض حسین قریشی، ڈاکٹر منصور الدین قریشی، شکور میاں قریشی اور رستم منظوری کا انتخاب کیا گیا ہے۔

سرکاری اراکین کے طور پر سکریٹری آف ایجوکیشن، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن، نائب صدر گجرات ماجیہ شالا پاٹھیہ پستک منڈل، نائب صدر یونیورسٹی گرنتھ نرمان بورڈ کا انتخاب کیا گیا ہے۔

رجسٹرار گجرات ساہتیہ اکادمی، گجرات اردو اکادمی کے سکریٹری کے فرائض انجام دیں گے۔

اردو اکادمی کی مدت دو سال ہوگی اور اس کا دفتر گاندھی نگر میں گجرات ساہتیہ اکادمی کے دفتر میں ہوگا۔

مغربی بنگال اردو تحریک تیسرے مہینے میں داخل

کلکتہ۔ علیم الدین اسٹریٹ میں مظفر احمد بھون کے قریب اردو تحریک کے جلسۂ عام میں مقررین نے محاذی حکومت کی اردو دشمن پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے عوام کو آگاہ کیا کہ کس طرح یہ حکومت اردو والوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ آل انڈیا اردو کو آرڈینیشن کمیٹی کے جنرل سکریٹری نوشاد مظہر نے بتایا کہ دو مہینے سے اردو تحریک چل رہی ہے مگر حکومت کی طرف سے کسی بھی مثبت اقدام کا کوئی اعلان نہیں ہوا ہے۔ اردو عوام کے اندر کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ اسلام پور، مرشد آباد، آسنسول، کلٹی، رانی گنج، مہیش پور، رحمت نگر، گردیا، حاجی نگر، جوڑہ، شب ... ایم۔ ایل، کانکی نارہ، نارکل ٹانگہ کے علاوہ شہر و مضافات میں جلسے جلوسوں اور احتجاجات کے زور و شور اور جوش کے باوجود حکومت اپنے زعم میں عوامی تحریک کو جو قومی اور لسانی مفادات کے پیش نظر اردو عوام کی قیادت میں چل رہی ہے، پامال کرنے کی سازش کر رہی ہے۔

باشندگان نارکل ڈانگہ کا ایک نمائندہ جلوس زیر اہتمام ہائر سرکل ویلفیر سوسائٹی نارکل ڈانگہ اردو تحریک کی بھوک ہڑتال کی حمایت میں ایسپلینڈ ایسٹ پہنچا۔ جلوس والوں نے آٹھ مقامات پر اسٹریٹ کارنر میٹنگ کا اہتمام کیا۔

اہل جلوس کو چونکہ اردو کی حمایت میں وزیر اعلیٰ کو میمورنڈم بھی دینا تھا اس لیے پولس والوں نے تقریباً تین گھنٹے طرح طرح کے حیلے اور بہانے کرکے تقریباً ۶ بجے شام کو جواب دیا کہ رائٹرس بلڈنگ بند ہے۔

انڈمان میں بھی اردو تحریک چلائی جائے گی

کلکتہ۔ آل انڈیا اردو کو آرڈینیشن کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ جزائر انڈمان اور نکوبار میں لسانی اور تعلیمی مسائل کے پیش نظر باشندگان انڈمان اور نکوبار جزائر کے تعاون سے ستمبر کے مہینے میں ایک کانفرنس کا انعقاد کرے گی۔ ایک ماہ قبل کمیٹی کی جانب سے جناب محمد ابراہیم نے انڈمان کا دورہ کرکے وہاں کے مسائل معلوم کیے ہیں۔ تقریباً پچاس ہزار اردو بولنے والوں کی تعداد ان جزائر میں موجود ہے جبکہ جزائر کی مجموعی آبادی ساڑھے تین لاکھ سے کچھ زیادہ۔ اس طرح سے دس فیصد سے بھی زیادہ لوگ اردو بولنے والے وہاں موجود ہیں۔

پورٹ بلیئر کے سماجی کارکنان اور اردو دوست حمزہ بھائی، واحد بھائی، عبدالرحیم، مجیب صاحبان اردو کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور تعاون دینے کی امید دلا رہے ہیں۔

ایک قرارداد منظور کرکے کہا گیا ہے کہ مغربی بنگال کے ان تمام انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو شعبے کا احیا کیا جائے جہاں پہلے اردو کی تعلیم ہوتی تھی اور کسی مصلحت کے سبب بند ہو گئی۔

ڈاکٹر ایم۔ اے نصر (جنرل سکریٹری آل بنگال اردو پروفیسرس ایسوسی ایشن) نے کہا مختلف اداروں، تنظیموں اور انجمنوں کو اپنے اختلافات بھول کر اردو تحریک میں شامل ہو جانا چاہیے۔

● اردو کے مشہور ادیب اظہر علی فاروقی صاحب کا ۱۱ مئی کو شام پونے پانچ بجے الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۰ سال کے تھے۔ چند روز قبل ان کا داہنا ہاتھ اور پیر دونوں مفلوج ہو گئے تھے۔ علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ ان کی طبیعت بگڑتی ہی گئی۔ تدفین محلہ دریا آباد الہ آباد کے قبرستان میں ہوئی وہ ایک نیک دیندار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند انسان تھے ان کے دو بیٹے ہیں جو اس وقت ایران اور پاکستان میں مقیم ہیں۔ مرحوم تا عمر اردو ادب کی خدمت انجام دیتے رہے اور نام و نمود اور انعام و اکرام کی کبھی خواہش نہیں کی۔ ان کی ادبی حیثیت کا اعتراف عالمین اردو نے ان کی زندگی ہی میں کر لیا تھا وہ ایک محقق و نقاد کے علاوہ افسانہ نگار، انشا پرداز، ڈرامہ نگار اور اسٹیج آرٹسٹ بھی تھے۔ وہ بے شمار مضامین اور کتابیں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ اتر پردیش کے لوک گیت ان کی ایک مشہور تصنیف ہے۔

فون ۰۱-۳۵۹۹۰۳

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۲۵۰ روپے (سالانہ)

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹیڈ

چیرمین جناب غلام غوث

مینجنگ ڈائرکٹر پدم شری زین جی رنگون والا

بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اراکین

اور

بیرونی بمبئی کی شاخوں کے مشاورتی بورڈ کے اراکین

اپنے کھاتے داروں، ایکزیکٹیو اور اسٹاف کا

شکریہ

ادا کرتے ہیں جن کے دلی اور مکمل تعاون کے باعث

بینک اِس قابل بنا کہ اُس کا ڈپازٹ

۳۰ جون ۱۹۸۶ء کو

۲۱۰ کروڑ روپے

سے بھی زیادہ ہوگیا

کیا صحیح ہے کیا غلط

کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کس معاشرے میں سانسیں لے رہے ہیں؟ کیا آپ محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ آپ کی آنکھیں لمحہ بہ لمحہ جن مناظر کو جذب کر رہی ہیں اور آپ کے کان جن آوازوں کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں ان سے آپ کی شخصیت بوجھل اور غیر متوازن ہوتی جا رہی ہے؟

آپ فن کار ہیں، تخلیق کار ہیں، زیادہ حساس ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں قلم کی طاقت ہے۔ آپ میں اظہار کی قوت ہے، آپ خوابوں کو پیکر دے سکتے ہیں، زندگی کی بدصورتیوں کو خوبصورت کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ ناکام ہیں، بے بس ہیں، مواقعوں کے اسیر ہیں آپ نہیں جانتے کہ نفاق کی زمینوں میں بدگمانیاں بونے والوں کو آپ ادب کے نام پر جو کھاد فراہم کر رہے ہیں وہ زرخیزی کی دشمن ہے۔

بہ ظاہر تو تخلیق کاروں نے طرح طرح کی تختیاں اپنی شخصیت پر سجا رکھی ہیں اور تختیوں کی حفاظت کے لیے ہر ممکنہ کوششوں میں مصروف بھی ہیں لیکن قدم قدم سوچوں کی تعبیرات کے بکھر جانے کا خوف بھی ہے۔ جو غلط ہے اسے صحیح کر دینے کی کشمکش اور ہر لمحہ کو صرف اپنے لیے استعمال کرنے کی خواہش نے اعتبار و اعتماد کا تصور ہی مٹا دیا ہے۔

آپ آزاد ہیں مگر غیر محفوظ۔

چھوٹی چھوٹی باتیں تخلیقی لمحوں کی گرفت میں تو آ رہی ہیں لیکن بکھراؤ سب کچھ اپنی زد پر لیے ہوئے ہے۔

زمین، زبان، مذہب، روایت، تحفظ، شناخت، انتہا پسندی، ایک طوفان ہے جو سب کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ علاقائیت، علاحدگی پسندی اور محدودیت "اجنبی" ہو جانے والے رویوں کو جنم دے رہی ہے۔ جڑیں کاٹی نہیں جا سکتیں کہ زمین کی کوکھ بانجھ کرنے کا حق کسی کو بھی نہیں۔"

پھر پتوں، شاخوں اور ٹہنیوں کو توڑنے سے کیا حاصل؟

مختصر ترین بے اختیار سانسیں کب بجھ جائیں گی کسی کو بھی نہیں معلوم۔ تاریخ کے صفحات پر شاندار قومیں، سجے سجائے شہر اور بکھری ہوئی تہذیبوں کی داستانیں رقم ہیں۔ جو اب خواب ہو گئی ہیں۔ معلوم نہیں کون کب خواب ہو جائے؟ ادب، معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ ادب اپنے عصر کو سنوارتا سجاتا ہے۔ دنیا کو خوبصورت خواب دیتا ہے تعبیروں کے لیے ماحول بناتا ہے۔ آپ اور آپ کا ادب بہت اہم ہے۔ اردو ایک روایت ہے، ایک تہذیب کا نام ہے۔ ہندستان کا مزاج ہے۔ اردو ہندستان کا نام ہے، قومی یک جہتی کی علامت ہے۔ کیا صحیح ہے کیا غلط اس بحث میں پڑے بغیر اپنی زبان اور اس کے ادب کو فروغ دیجیے، اپنے رسم الخط کا تحفظ کیجیے۔ ہندستان ہی نہیں پوری دنیا کو امن کی ضرورت ہے۔ امن عالم کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں۔؟

مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی کی پیدائش: ۱۴۱۴ء خراسان قصبہ جام۔ م: ۱۴۹۲ء کی مشہور زمانہ مثنوی یوسف زلیخا کا یہ ایک قدیم نسخہ ہے مگر اس سے قبل اور بعد میں کئی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مولانا جامی اگر صرف یہی ایک مثنوی تخلیق کرتے تب بھی فارسی ادب میں زندہ جاوید رہتے۔ اگرچہ یہ قصہ تاریخی حیثیت سے ناقابلِ اعتبار ہے مگر جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے جو بزمِ عشق سجائی ہے اس کی مثال فارسی ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بعض اشعار تو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں جیسے
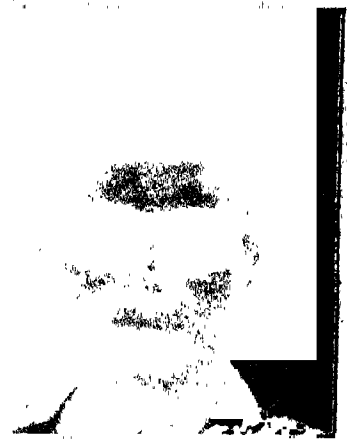
؎ نہ تنہا عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

یہ صورت گر

ضیا فتح آبادی

عمیق حنفی

محسن احسان

حامدی کاشمیری

نصرت قریشی

سلطان سبحانی

شاہد ماہلی

جتیندر بلو

عبدالصمد
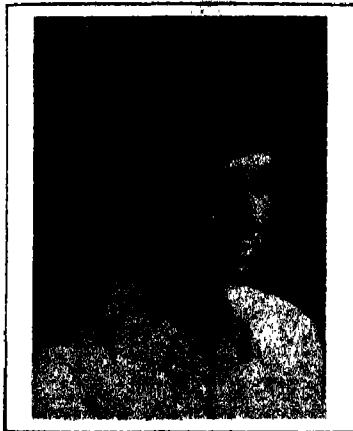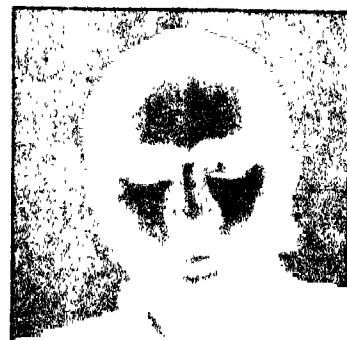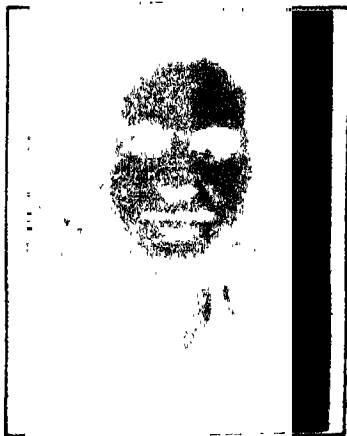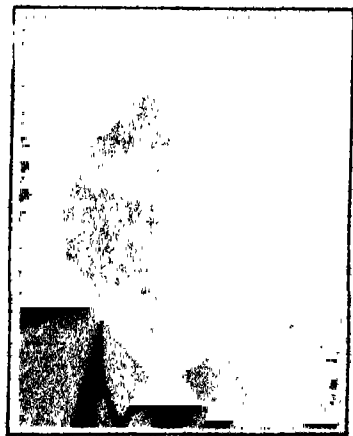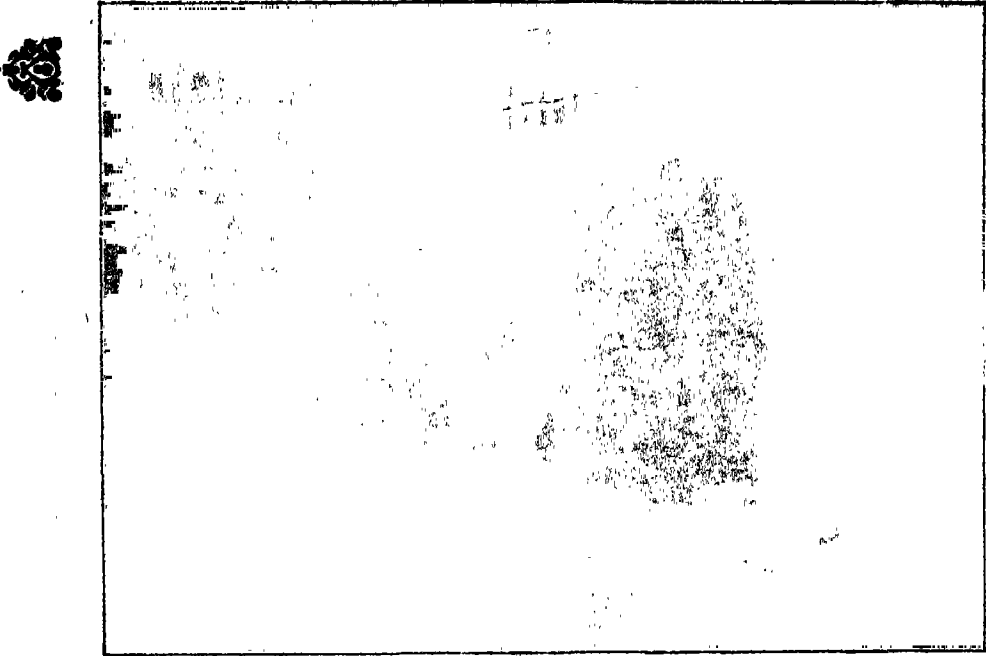
۳۰ر مارچ تا ۲ر اپریل کو شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے زیراہتمام منعقد ہونے والے سہ روزہ غالب صدی سیمینار بہ مقام یونیورسٹی لائبریری ہال۔ پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم [کھڑے ہوئے] پہلی مرتبہ کسی ادبی تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے۔ عموماً مرحوم کسی بھی طرح کی تقاریب وغیرہ سے گریز کیا کرتے تھے۔ تصویر میں بائیں طرف ڈاکٹر دیویندر ناتھ شرما اور پروفیسر اختر اورینوی مرحوم۔

پروفیسر احتشام حسین مرحوم "اقبال کا فن" کے موضوع پر اپنی آخری یادگار تقریر کرتے ہوئے۔ ان کے بائیں طرف حافظ شمس منیری کو بیٹھے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ جلسہ ڈاکٹر شکیب ایاز نے اورینٹل کالج (پٹنہ) میں منعقد کیا تھا۔

[بہ شکریہ ڈاکٹر شکیب ایاز (پٹنہ)]

فراق گورکھپوری بنام ابومحمد سحر

فراق گورکھپوری: پ: ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء۔ م: ۳ مارچ ۱۹۸۲ء

راغب مراد آبادی

رباعیات

(۱)

بابِ ذات و صفات کُھلتا ہی نہیں
رازِ موت و حیات کُھلتا ہی نہیں
کس کام کی ہے کلیدِ علم و دانش
قفلِ درِ کائنات کھلتا ہی نہیں

(۲)

لمحے، لمحوں میں جذب ہو جائیں گے
بیدار جو روز و شب ہیں سو جائیں گے
چلتے چلتے، بعینہٖ اے راغبؔ!
ہم بھی راہِ عدم میں کھو جائیں گے

(۳)

آگے یہ کارواں نہیں جائے گا
اے روحِ شررفشاں نہیں جائے گا
میں زندہ ہوں اس گرے پہ جب تک راغبؔ
دل سے، غمِ رفتگاں نہیں جائے گا

(۴)

رَہرو ایک ایک تھک کے سو جاتا ہے
راہِ ملکِ عدم میں کھو جاتا ہے
ہستی کا سفر ہو خواہ کتنا ہی طویل
آتے ہی اجل کے ختم ہو جاتا ہے

(۵)

ہر قصرِ مسرّت کی ہے غم پر بنیاد
ہر نغمہ ہے فطرتاً بنائے فریاد
اس دل پہ ہے اب گورِ غریباں کا گماں
جس دل میں کبھی، شہرِ طرب تھا آباد

(۶)

ہر لمحۂ راحت کے تعاقب میں ہے غم
دریائے تحیّر میں ہیں ڈوبے ہوئے ہم
کس جرم کی آخر یہ سزا ہے اللہ!
دوزخ ہے تصرّف میں، نہ قبضے میں اِرَم

(۷)

بستے ہیں تمام شہر اجڑنے کے لئے
بنتے ہیں تمام گھر بگڑنے کے لئے
خوش کون یہ ہوتا ہے کہ جس کی خاطر
ملتے ہیں بہم لوگ، بچھڑنے کے لئے

(۸)

اجڑے ہوئے قصر ناز سجتے کیوں ہیں
ویرانی و خامشی کو تجتے کیوں ہیں
ماضی کے جھروکوں سے جب آتی ہے نسیم
یادوں کے یہ جلترنگ بجتے کیوں ہیں

(۹)

اے جوئے طرب میں ناؤ کھینے والو!
اے خود کو فریبِ عیش دینے والو!
انجام نشاط، غم ہے، کچھ اور نہیں
اے غم کا کبھی نام نہ لینے والو!

نمبر ۱۰-۱۱/۷ آر فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۳۸

ضیا فتح آبادی

زندگی کرنے کا جس کو حوصلہ مل جائے گا
باغِ جنّت کا اسے آخر پتہ مل جائے گا

میں بھی کھو جاؤں گا تیری پستیوں میں اے زمیں
آسماں کے ساتھ چلنے کا مزا مل جائے گا

مل کے دونوں کر ہی لیں گے طے تمنّا کا سفر
مجھ کو تیرا، تجھ کو میرا آسرا مل جائے گا

میرے سجدوں میں محبّت لے گی انگڑائی نئی
جب صنم خانے کے ہر بُت میں خدا مل جائے گا

منزلِ مقصود، مٹ جائے جو یہ احساسِ وقت
فاصلہ کھو جائے گا اور قافلہ مل جائے گا

بجلیوں کو دے گا تو پیغام ابرِ نوبہار
پتّہ جو نخلِ تمنّا پر ہرا مل جائے گا

لُوٹ بازارِ سخن میں کل مچی تھی اے ضیاؔ
میں نے سمجھا تھا مجھے بھی کچھ صلہ مل جائے گا

پتہ: ۱۳۵ ماجوری گارڈن، نئی دہلی ۶۴

کہیں کچھ کم ہے

اقبال مجید ● آل انڈیا ریڈیو، شملہ ہل، بھوپال

"۔۔۔ میرا جسم یعنی زندہ 'میں' جانتا ہے اور شدت کے ساتھ جانتا ہے۔ اور جہاں تک علم کے ذخیرے کا تعلق ہے یہ ان چیزوں کے مجموعے سے بڑھ کر نہیں جنھیں میں اپنے جسم کے اندر جانتا ہوں اور آپ بھی جو کچھ جانتے ہیں اپنے جسم کے اندر جانتے ہیں۔۔۔"

ڈی ایچ لارنس، ترجمہ مظفر علی سید۔

جب میرے بدن پر کپڑے نہ تھے تب سے وہ میری دوست تھی۔ بعد میں وہ ایک لیڈی ڈاکٹر بنی اور میں فلسفے کے ایک ذہین پروفیسر کی گھریلو بیوی۔ ہم دونوں دوست جب ایک دوسرے سے ملتے تو ایک دوسرے کے جسم کو کپڑوں کے آر پار دیکھ کر یہ اچھی طرح محسوس کر لیتے کہ ہمارے سینہ، پیٹ اور رانوں کی کھال کی رنگت اس وقت کیا ہوگی اور ہماری بغلوں میں کتنا پسینہ موجود ہوگا۔

اس خوبصورت تندرست اور بھرے بدن والی لیڈی ڈاکٹر کا نام آپ کو بتاتی چلوں تو اچھا ہے۔ آج وہ لیڈی ڈاکٹر زندہ نہیں ہے۔ آج میں بھی زندہ نہیں ہوں۔

میں ــ لاجونتی شرما۔ دوسروں کو چٹکیوں میں مسل کر پھینک دینے والی، گرمیوں کی راتوں میں چارپائی پر ڈھیر سارا پانی ڈال کر گیلے باندھوں پر کروٹ بدل بدل کر سونے والی لاجونتی شرما اب زندہ نہیں ہے۔ اس کی جگہ ایک مری ہوئی چوہیا جیسی گول کمانی والا چشمہ لگا کر دھیرے دھیرے چھڑی کے سہارے چلنے والی یہ ایک عورت آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ ایک بے مصرف ناکارہ سنکی اور بد دماغ رانڈ عورت جو اپنی بہو سے صبح آدھی پیالی دلیا کا ناشتہ، دوپہر کو دو پھلکے اور رات ایک گلاس دودھ لے کر اُسے بھی ٹھیک سے ہضم نہیں کر پاتی۔

آج جو اہم بات میں آپ سے کرنے والی ہوں اس کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ ہم سب ایک طرح سے دیکھا جائے تو زندگی برتتے میں CONDITIONED ہیں اور اس CONDITIONING کو نظر انداز کیا جانا تو کیمیاگر سے ممکن ہے اور نہ کیمیاداں سے اور انسان ایک ہی وقت میں کیمیاگر بھی ہے اور کیمیاداں بھی۔ کبھی بھی سیدھی سادھی سی کہانیاں بھی بڑی گرٹھی ہوئی لگتی ہیں یہ شاید انھیں میں سے ایک ہے۔

مجھے گذرے ہوئے زندگی کے پل اس طرح یاد ہیں جیسے بچوں کو پہاڑے یاد ہوتے ہیں۔ میری آنکھوں پر یوں تو آج موٹی سی عینک ہے لیکن اپنی یادداشت کے جھروکے میں جب بھی جھانکتی ہوں تو سب ویسے ہی صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔

میری لیڈی ڈاکٹر دوست نے کہا تھا کہ میں اسے سب کچھ صاف صاف بتا دوں اس طرح شاید وہ میری مدد کر سکے۔ اس کا خیال تھا کہ آدمی کا جسم ایک بہت بڑا کباڑخانہ ہے اور دماغ تو کباڑ گودام اس گودام کی صفائی ہوتی رہنا چاہیئے۔ پھر اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے اپنے مرد کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ لیکن جہاں سمجھنے کو کچھ ہو ہی نہیں وہاں اچھی طرح کیا سمجھا جائے۔ آج بھی میرا خیال ہے۔ آج جبکہ میرے بال پک چکے ہیں کہ مرد کو اُبلا ہوا آلو نہیں ہونا چاہیئے عورت کو بھی نہیں ہونا چاہیئے۔

اب جبکہ سب ختم ہو چکا ہے، جوانی کا سونا راکھ بن کر بہہ چکا ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ جوان ہونے کے دن سے بڑھاپے کے دن

تک میں زندگی کی جس گرمی اور حرارت کو پکڑنا چاہتی تھی وہ مجھ سے اوجھل رہی۔ یہ بوڑھی لاجونتی شرما کیسے بھول سکتی ہے اپنے ان دنوں کو جب وہ اپنے بدن سے چپکے ہوئے کسی کپڑے کو اتارتی تھی تو وہ کپڑا جاڑے کے دنوں میں بھی بدن سے اترنے کے بعد خاصی دیر تک میرے بدن کی گرمی کو اپنے اندر بسائے رکھتا تھا اور ہاتھ سے چھونے پر لگتا تھا کہ اب بھی میرا گرم گرم جوان جسم اس کے اندر کسمسا رہا ہے۔ اتنا تو آپ بھی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں صرف جسم کی حرارتوں کی بات نہیں کر رہی بلکہ ان اوجھل گرماہٹوں کی بات کر رہی ہوں جنھیں زندگی ہزار ڈھنگوں میں منکشف کرتی ہے۔

پتہ نہیں کیوں بس ایک بے نام سی الجھن میں ایک روز میرے منہ سے نکل گیا۔

"مجھے مرد چاہیے۔"

اور میری لیڈی ڈاکٹر دوست یہ سن کر سنجیدہ ہو گئی۔ پتہ نہیں کیوں اس نے میری اس بات کو دماغ کے کسی محفوظ خانے میں رکھ لیا۔ پھر وہ ایک دن میری اس بات پر خوب ہنسی۔ تو میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس مٹی کے مادھو جیسے پتی سے گھن آتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ جب وہ مجھے پیار کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے ہونٹوں پر جمی ہوئی پھپھوندی چھڑا رہا ہو بلکہ اس لیے کہ اس کے ہونٹ گرم تو ہوتے ہیں مگر ان میں گرماہٹ نہیں ہوتی۔ ایسی گرماہٹ جو لمس کی گرمی نہیں کچھ اور ہے۔

میری دوست مجھ سے ایسی باتیں سن کر مجھ سے بہت سے سوالات کرتی۔ ان سوالوں کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی جیسے وہ میرے پتی کی نامردی کا پتہ لگانا چاہ رہی ہو اور جب میں اسے بتاتی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اس میں ایسا کوئی نقص نہیں ہے کہ اس کو نامرد سمجھا جائے یا اس طرح کی بیماری بھی اس کو نہیں ہے جس کا علاج ضروری ہو تو میری دوست کو پہلے یقین نہیں آتا پھر وہ مجھے اس طرح دیکھتی جیسے کوئی پُراسرار چیز دیکھ رہی ہو۔

ایک دن میری دوست کاغذ پر لکھے ہوئے چند سوالات میرے پاس لے کر آئی اس روز میں صرف بلاؤز اور پٹی کوٹ پہنے اور چھت کا پنکھا پوری رفتار سے کھولے پلنگ پر چت لیٹی تھی۔ اس نے سارے سوالات مجھ پر داغ دیے۔

"کیا شرما جی تم پر کبھی غصہ نہیں کرتے۔"

"غصہ مردوں کو آتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا شرما جی خالی وقت میں اپنا انگوٹھا چباتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیا چلنے میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی رانوں سے لگ بھگ ملا کر چلتے ہیں"؟

"نہیں۔"

"کیا وہ باتھ روم میں نہاتے وقت شور مچاتے ہیں۔"

"نہیں۔"

"کیا تمہارے ساتھ لیٹنے سے پہلے خود بتی بجھاتے ہیں یا یہ کام تمہیں کرنا پڑتا ہے؟"

مجھے اپنی دوست پر غصہ آ گیا۔

"یہ سب تم کیا اوٹ پٹانگ بک رہی ہو۔" میں نے اس کو روک دیا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اپنی دوست کو تھوڑا تھوڑا کر کے یہ سمجھا دیا کہ وہ جس نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہے وہ سب بکواس ہے۔ کسی نفسیاتی گتھی کی تلاش بیکار ہے اور نہ یہ جنسی آسودگیوں سے جڑا ہوا کوئی مسئلہ ہے۔

"تو پھر تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" لیڈی ڈاکٹر جھنجھلا گئی۔

کیا مجھے واقعی یہ بات معلوم بھی کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔ جب میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا تو اور بھی الجھ گئی۔ لیکن میں نے اپنی دوست کو اتنا ضرور بتا دیا کہ میرا شوہر بہت کم بولتا ہے، بہت کم کھاتا ہے۔ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے۔ آج تک اس کے ہاتھوں سے کبھی ایک پیالی بھی نہ ٹوٹی۔ اس کا ایک شیونگ بلیڈ پندرہ دن چلتا ہے اس کا ایک جوڑا جوتا پانچ سال میں بھی نہیں ٹوٹتا، اس کے بدن سے چھوٹے دن اترنے کے بعد بھی کپڑا ذرا میلا نہیں ہوتا اور اس کے گھر میں کوئی ایسا پرزہ فٹ ہے جو اس کی آواز کو کسی حالت میں بھی ذرا اونچا نہیں ہونے دیتا۔ اور سو بات کی ایک بات

یہ بھی کہ ہمیشہ ہر صورت میں ہر موقع پہ چاہے وہ خوشی ہو یا غم امید ہو یا نا امیدی محبت ہو یا نفرت، صبر ہو یا بے صبری میرا شوہر بس ایک سُر میں اور ایک لے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے جس میں کوئی آتار چڑھاؤ نہیں ہوتا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔

آج جب میرے کان اونچا سننے لگے ہیں اور کائنات میں بکھرنے والی تمام میٹھی اور سُریلی آوازیں، کرخت اور کھردری آوازیں، اونچی اور نیچی آوازیں اپنی رنگا رنگی اپنی موسیقیت اور اپنے بولتے اور پکارتے اور سرگوشیاں کرتے ہیجان کو میرے لیے بے معنی کر چکی ہیں تو ایک حقیقت کا مجھ پر شدت سے انکشاف ہوا ہے اور وہ یہ کہ عورت کے اعصاب پر سب سے پہلے مرد کی آواز کا جادو بڑا کام کرتا ہے۔ عورت مرد کی نگاہ سے بھی زیادہ اس کی آواز سے اپنے میں ایک سرمستی کی کیفیت کو محسوس کرتی ہے۔

پھر میں نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ مرد کا لہجہ اور اس کی آواز اور اس آواز کا زیر و بم اور اس زیر و بم کا گرم ارتعاش اور اس گرم ارتعاش کی برقی لہریں اور ان برقی لہروں کی ایک بے نام سی زندہ لذت کا ایک الگ ہی نشہ ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرا شوہر میری جانب شاید کبھی ہی دیکھتا ہو، میرے پاس بیٹھ کر جب وہ مجھ سے باتیں کرتا، یہاں تک کہ براہِ راست کوئی سوال بھی کرتا تو اس کی آنکھیں میرے چہرے یا میرے جسم کے کسی دوسرے حصے پر نہ ہوتیں بلکہ یا تو وہ میز پر رکھے خالی گلاس کو دیکھتا ہوتا یا آسمان کو یا اپنے ہی ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو تکتا ہوتا اور تب ہی میں نے اپنی سہیلی سے کہا تھا۔

"اگر مرد آنکھوں اور آواز سے عورت کو چھو نہیں پاتا تو پھر وہ اس کو چھو کر بھی ان چھوا رکھتا ہے۔"

ایک دن بڑا غضب ہو گیا۔ اس دن ڈاکٹر جاویری آئی یعنی میری دوست جس کا نام بتانا میں بھول گئی تھی۔ ہم لوگ زندگی میں کب اور کس کو دوست بنا لیتے ہیں اس کا کوئی فارمولا نہیں ہے مگر یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر جاویری کی عقل مجھے ہمیشہ سے بڑی لگتی تھی اور میں اس کی ہر بات کو سنجیدگی سے لیتی تھی۔ اس دن مجھ سے ڈاکٹر جاویری نے ذرا ڈٹ کر پوچھا تھا۔

"یہ بتا تو اپنے پتی سے چاہتی کیا ہے؟"

"ہنگامہ" میں نے بس کچھ کہنے کے لیے کہہ دیا۔ لیکن کیا میں نے یہ بات بس کہنے کے لیے کہی تھی یا واقعی میں اپنے شوہر سے ہر دم اور ہر گھڑی کسی ہنگامہ کی امید کیا کرتی تھی۔

"کیسا ہنگامہ چاہتی ہے تو"

"میں چاہتی ہوں وہ چیخے چلائے، گھر کا چھوٹا موٹا سامان اِدھر اُدھر پھینکے اور کبھی کبھی ایسی آوازیں ڈانٹ ڈپٹ کا کرے جو برابر کے گھر تک سنائی دے، کم سے کم باہر تک سنائی دے کچھ لگے تو کہ کوئی ہلچل ہے۔"

"کیا تو یہ چاہتی ہے کہ وہ تجھے گالیاں دے"

"پتہ نہیں" میں نے جواب دیا۔ "اگر گالیاں دے سکتا ہے تو کبھی کبھی یہ بھی چل سکتا ہے۔"

"کیا تو یہ چاہتی ہے کہ وہ تیرے کپڑوں کو گھسیٹے اتنی زور سے کہ وہ تیرے بدن پر پھٹ جائیں۔"

میں کچھ دیر جواب دینے کے لیے سوچتی رہی اور پھر ایک دم مجھے یاد آ گیا۔ وہ اپنے کپڑوں پر میرے کسی کپڑے کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ ایک دن وہ میرے قریب بیٹھا تھا کہ میری ساڑی کا پلّو اس کی گود میں اس کے کُرتے کے دامن پر جا گرا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں کمر بند ڈالنے والی نلکی تھی۔ میں نے دیکھا ساڑی کو ہاتھ لگائے بغیر اسی نلکی کے سہارے اس نے ساڑی کے پلّو کو اپنی گود سے نیچے گرا دیا۔

میں نے جاویری سے کہا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کبھی میری ساری کے پلّو کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنی طرف کھینچ سکے۔ زیادہ زور سے نہ سہی بس ہلکا سا۔"

"کیوں ۔۔۔؟"

"کپڑا کھینچنے سے بھی لمحہ بھر کو ایک گرماہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایک سکھ دینے والی گرماہٹ۔"

پھر جاویری نے مجھے سوال کرنے کو منع کر دیا اور خود سوال کرنے لگی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میرا جی یہ تو نہیں چاہتا کہ میرا شوہر مجھے چٹکیاں لے،

بال نوچے اور میرے سینے پر اس طرح سوار ہو جائے کہ مجھے اس کے بوجھ کے نیچے کچل جانے کا احساس ہونے لگے۔ تب میری سمجھ میں آگیا کہ جاویری مجھے برابر ایک نفسیاتی مریض سمجھ کر میرا پوسٹ مارٹم کر رہی ہے اور میرے جوابوں کی جنسی تاویلیں تلاش کر رہی ہے۔ وہ شاید یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ میں اعصابی طور پر کوئی غیر معمولی عورت ہوں۔ ہماری شادی کو چند سال ہوئے تھے اور بچے ہم دونوں نے نہیں چاہا تھا اس لیے نہیں ہوا تھا۔ پیسے کی اگر ریل پیل نہیں تھی تو کوئی کمی بھی نہ تھی۔ میں عام شادی شدہ عورتوں کی طرح مسکراتی ہنستی، گہری نیند سوتی، صبح بشاش اٹھتی، موسموں اور رتوں کی مناسبت سے کپڑوں کے رنگ پہنتی اور ایک اسمارٹ عورت کے سارے آدرشوں میں دن کاٹ کر رات میں جب کبھی من کرتا اپنے پتی کے پہلو میں چلی جاتی۔ میں نے یونیورسٹی تک جب تعلیم حاصل کی تو کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ نوکری کروں گی ہی اس لیے گھر مجھے اچھا لگتا تھا۔ میں نے جاویری کو پھر پیار سے سمجھایا۔

"جاویری کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی جگہ کچھ کم ہے۔ ایک چپ سی ہے۔ شاید میرا شوہر بے حد فارمل ہے یا پھر ہمارے درمیان کوئی ایک بے وجہ کی نقلی احتیاط ہے جو بار بار مجھے ایک سناٹے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔"

میں بولتی رہی اور جاویری سنتی رہی، ہنستی رہی اور ایک بڑی واضح قسم کی ہیجانی کیفیت کے ساتھ اپنی آخری انگلی کی سرخ پالش جلدی جلدی دوسرے ناخن سے کھرچتی رہی۔

"سناٹا" وہ بڑبڑائی "میں سمجھ گئی۔ یہ سناٹا ٹوٹے گا، دیکھ لینا میں توڑوں گی اس سناٹے کو۔"

پھر جو کچھ ہوا اس کی ایک ایک تفصیل مجھے یاد ہے۔ اگر اس کو ٹی وی پر دکھایا جائے تو کچھ اس طرح کا سین بنے گا۔

میرے ڈرائنگ روم کی دیوار کی گھڑی ساڑھے چار بجا رہی ہے [ابھی میرے شوہر کو دفتر سے گھر آنے میں ایک گھنٹہ باقی ہے] کہ جاویری ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے میں ہوں وہ اپنے بیگ سے ایک سگریٹ نکالتی ہے اس کو ہونٹوں میں دبا کر ماچس کی تیلی جلاتی ہے۔ اناڑیوں کی طرح سگریٹ سلگاتی ہے۔ سگریٹ سلگانے میں اس کو کھانسی آجاتی ہے جس پر قابو پانے کے بعد وہ میز پر رکھی صاف ستھری ایش ٹرے کو دیکھتی ہے پھر جلتی ہوئی سگریٹ کو ایش ٹرے پر رکھ دیتی ہے۔ اور پلٹ کر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے۔

"یہ کیا کر رہی ہو" ؟ میں پوچھتی ہوں۔

وہ جواب دیتی ہے۔

"شرما جی سگریٹ نہیں پیتے۔ آدھا جلا یہ سگریٹ جب ان کو ایش ٹرے پر رکھا ہوا ملے گا تو وہ تم سے سوال کریں گے۔"

"کون آیا تھا۔؟"

تم جواب دو گی

"کوئی نہیں آیا"

"پھر وہ سگریٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھیں گے کہ یہ سگریٹ کون پی رہا تھا" تب تم اپنی حیرت کا اظہار کرو گی اور گھبرا جاؤ گی جیسے چوری پکڑا گیا ہو۔ لیکن تم اپنی لاعلمی ظاہر کرو گی اور وہ نہیں مانے گا۔ بات کو کریدے گا۔ تب اس کے زیادہ پوچھنے پر تم کہو گی مجھے نہیں پتہ یہ سگریٹ کس کا ہے، شاید جاویری نے پیا ہو۔ پھر وہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں سگریٹ کب سے پینے لگی ہوں۔ تو میں صاف انکار کر دوں گی کہ میں سگریٹ نہیں پیتی۔

"لیکن اس سے ہوگا کیا۔؟" میں جاویری سے سوال کرتی ہوں۔

"ہنگامہ" وہ جواب دیتی ہے۔ "یہ ناٹک کا پہلا سین ہوگا۔"

پھر یہ ہوا کہ سگریٹ جلتے جلتے بجھ گئی۔ ساڑھے پانچ بجے میرا پتی آیا۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں اس کو جان کر ڈرائنگ روم میں لائی۔ اس کی نظر ایش ٹرے پر پڑی وہ بولا۔

"لاج (وہ مجھے لاج ہی پکارتا تھا) یہ سگریٹ کہاں سے آئی ؟"

جواب میں میں نے سگریٹ کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔

"کیا کوئی آیا تھا۔؟"

"نہیں تو۔"

"اچھا" وہ بولا۔ مگر اس طرح کہ نہ تو اس میں حیرت تھی اور نہ تشویش

"جاویری آئی تھی کچھ دیر پہلے۔" آخر کو مجھے کہنا پڑا

"کیا جاویری نے سگریٹ شروع کر دی؟"

میں نے اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں ظاہر کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ لیکن اس نے بھی پھر دوبارہ اس سوال کو نہیں دھرایا۔ بلکہ کوئی کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ کتابیں اس کی پناہ گاہیں تھیں اس لیے نہیں کہ وہ ایک پروفیسر تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی پہونچ کی چیزوں میں کتابیں سب سے قریب تھیں۔

کئی دن گذر گئے۔ جاویری دوسرے تیسرے دن آتی، مجھ سے رپورٹ لیتی لیکن میرے پاس اسے بتانے کے لیے اپنے شوہر کی چپ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس نے تو جیسے سگریٹ والی بات بھلا ہی دی تھی۔

ایک دن جاویری نے اپنے پرس سے کنجی کا ایک چھلا نکالا۔ چھلے میں پلاسٹک کا ایک مونوگرام لٹک رہا تھا جس پر انگریزی کے دو حروف ٹی اور پی بنے ہوئے تھے۔ چھلے میں ایک کنجی بھی پڑی ہوئی تھی۔

"یہ ایک بیکار کنجی ہے۔" یہ کہہ کر جاویری نے وہ چھلا میرے پتی کے پلنگ کے سرہانے رکھ دیا۔ اور پھر اپنے پرس سے ایک گنجلا گنجلایا مردانہ رومال نکالا جس کو شاید اسپرٹ میں بھگو کر وہ لائی تھی کیونکہ اس کے نکلتے ہی کمرے میں شراب جیسی ایک تیز بو پھیل گئی تھی۔ وہ رومال بھی اس نے میرے پتی کے سرہانے اسی چھلے کے پاس [illegible] کچھ تکیے کے نیچے اور کچھ باہر نکلا رہ گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"سین تیار کر رہی ہوں۔"

"کیا مطلب" میں گھبرا گئی۔

"تمہارا پتی رات کو بستر پر آئے گا۔ اس کی نظر چھلے پر پڑے گی۔ وہ چھلا اٹھا ہی رہا ہوگا کہ تکیے سے جھانکتا ایک مردانہ رومال اسے نظر آئے گا۔ جو اس کا نہیں ہے۔ وہ رومال کو بھی اٹھائے گا کہ اس کی ناک میں ایک بو کا احساس ہوگا۔ وہ رومال سونگھے گا۔ وہ پھر تم کو پکارے گا۔ تم آؤ گی وہ سوال کرے گا "یہ چھلا اور رومال کس کا ہے"۔ تم دونوں چیزوں کو دیکھتی رہو گی دیکھتی رہو گی اور تمہارے حلق سے آواز نہیں نکلے گی۔ وہ پھر تم سے پوچھے گا تو یکایک تم کو یاد آئے گا۔

"اوہ ہاں ڈاکٹر جاویری آئی تھی۔"

"جاویری۔ وہ میرے بستر پر کیا کر رہی تھی۔" تم جواب دو گی "میں کچن میں تھی تو جاویری تمہارے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔"

یہ کہہ کر جاویری میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ مجھے کسی سہمے ہوئے پرندے کی طرح دیکھ کر اسے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ میں نے جاویری کو یہ سب کرنے کو منع کیا اور سوال کیا۔

"یہ سب کرنے سے کیا ہوگا۔"

جواب ملا۔ "اس کے دل میں ایک شک بیٹھ جائے گا۔"

"کیسا شک" میں نے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ چھلے میں لٹکتا ہوا مونوگرام جس کے حروف اجنبی مردانہ رومال جس میں شراب کی بو، جاویری کا نہیں ہو سکتا تو پھر وہ کون ہے جو اس کے دفتر چلے جانے کے بعد اس کے بیڈروم تک آ جاتا ہے۔ اتنا سوچتے ہی اس کے اندر کا مرد ضرور جاگے گا وہ چیخے گا چلائے گا اور وہ سب کرے گا جو وہ نہیں کرتا اس کے حلق میں لگے ہوئے سائلنسر کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔ میرے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ دیکھ کر جاویری نے

میری بہت سی بدنصالی اور بتایا کہ عورت کی بے وفائی کی چوٹ ایسی ہوتی ہے کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈا مرد تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ اگرچہ مجھے ڈاکٹر جاویری کی باتوں سے ڈر لگ رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اپنے پتی کے بپھرے ہوئے تیوروں کو دیکھنے کا ایک شوق بھی جاگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب میں نے جاویری کو اس خطرے سے آگاہ کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ناٹک کوئی خطرناک موڑ لے لے تو اس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہونے پر وہ خود ہی ساری حقیقت میرے شوہر کو بتا دے گی۔

آخر کو رات ہوئی۔ میرا پتی اپنے بستر پر پہونچا۔ اس نے چھلّے اور رومال کو دیکھا پھر ہمارے درمیان لگ بھگ وہی مکالمے ہوئے۔ اس دن بھی وہ اپنے معمول سے زیادہ نہیں بولا۔ اس کی آواز میں بھی کسی طرح کا زیر و بم نہیں پیدا ہوا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یقیناً میں نے اس کو رومال سونگھتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ جب میں نے اس کو بتایا کہ وہ دونوں چیزیں جاویری کی ہی ہو سکتی ہیں جنھیں شاید وہ وہاں بھول گئی تھی تو اس وقت میرے شوہر کی گود میں ایک کتاب کھلی ہوئی رکھی تھی۔ وہ صفحات پر نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

"اچھا ہوگا یہ کتاب تم بھی پڑھ لو۔ سُنو ڈی ایچ لارنس نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ پھر وہ کتاب سے پڑھ کر سُنانے لگا جس کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا

> "ہمارے تمدن نے ابھی تک روح میں ہل جوتنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد وحشی بیج بوئے جاسکتے ہیں۔ مگر اب تک ہم نے قدیم وحشی جھاڑیوں کو جڑ سے اکھاڑنے اور جلانے کا کام کیا ہے۔ اب ہمیں دوبارہ وحشی بیج بونے ہوں گے۔ اپنے محسوسات کی پرورش کرنی ہوگی۔ ہر دل عزیزی کی کوشش بیکار ہے"

جاویری دوسرے ہی دن آئی۔

اور جب اس نے مجھ سے سارا ماجرا سُنا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی حیرت اور تشویش کا اظہار کرتی اس نے پورے اعتماد کے ساتھ مجھے یقین دلایا کہ میرا شوہر زخمی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تب ہی ایک دن میں نے جاویری کو بتایا کہ میرا پتی ایک دو بار خلاف معمول دفتر سے اچانک گھر آجایا کرتا ہے جس پر جاویری نے فوراً یہ کہا کہ وہ گھر آکر مجھ سے یہ بہانہ کرتا ہوگا کہ وہ کوئی چیز بھول گیا تھا جسے لینے آیا ہے۔ اور مجھے حیرت تھی کہ جاویری نے یہ اندازہ کیسے لگالیا جبکہ حقیقت بھی یہی تھی۔ پھر جاویری نے مجھے بتایا کہ تیر اب نشانے پر بیٹھ رہا ہے۔ فلیتہ جل چکا ہے۔ اور بارود آگ پکڑنے والی ہے۔

اس دن جاویری دیر تک مجھے یہ سمجھاتی رہی کہ آدمی کی زندگی میں یقین اور شک کے درمیان فاصلہ زیادہ لمبا نہیں ہوتا۔ یقین کی دیواریں کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہوں۔ شک ایک لمحہ میں ان دیواروں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ڈاکٹر جاویری نے اپنے شوہر کے مقابلے میں میرے شوہر [illegible] اس نے بتایا کہ اس کا شوہر جو ایک ہونہار ڈاکٹر ہے اور جاویری سے طالب علمی کے زمانے سے ہی محبت کرتا ہے۔ بنیادی طور پر بڑا ٹھنڈا مرد ہے۔ اگر اتنا مجھ اس کے ساتھ ہوگیا ہوتا تو اب تک ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔

اگرچہ مجھے جاویری کی اس ناٹک بازی میں ایک طرح کا ایڈونچر محسوس ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ وہ حرکتیں بچکانہ پن کی بھی لگ رہی تھیں۔ جب یہی بات میں نے ڈاکٹر جاویری کو سمجھائی تو وہ سنجیدہ ہوگئی اور بولی۔

"دراصل مجھے تم سے ہمدردی ہوگئی ہے۔ اس لیے نہیں کہ تم میری دوست ہو بلکہ مجھے زندہ عورتیں پسند ہیں۔ تم زندہ اس لیے ہو کہ جو کچھ جس طرح ہے اس کو تم اسی طرح قبول نہیں کرلینا چاہتی ہو۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرا شوہر ایک زندہ مرد ہے اور میرا خیال ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان رفاقت کی گرمجوشی تب ہی قائم رہ سکتی ہے جب دونوں ایک دوسرے کو اپنے زندہ ہونے کا احساس دلاتے رہیں۔ اور یہ احساس تب ہی دلایا جاسکتا ہے جب ہر صورت حال کو جوں کا توں قبول کرلینے کے بجائے اُسے چیلنج کیا جاسکے۔ میری ساری دلچسپیاں اس بات میں ہیں کہ تم اپنے شوہر کی ابلے ہوئے آلو جیسی شخصیت کو جوں کا توں قبول کرلینا نہیں چاہتیں اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی ہو بلکہ سچ پوچھو تو تمہارا منشا یہ ہے کہ تمہارا شوہر بھی لحاظ کے اس حق کو پوری طاقت کے ساتھ تمہارے خلاف بھی استعمال کرتا رہے۔"

۱؎ ترجمہ مظفر علی سید۔

یہ سُن کر مجھے ڈاکٹر جادیری کی عقل مندی کا دل ہی دل میں ایک بار پھر اعتراف کرنا پڑا اور پھر میں نے طے کر لیا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے ویسا اس کو کر لینے دیا جائے۔

میں نے ابھی یہ نہیں بتایا کہ ان دنوں میرا رنگ چمپئی تھا اور مجھے اپنے جوڑے میں پھولوں کا گجرا باندھنے کا بہت شوق تھا۔ اس دن جب ڈاکٹر جادیری نے ایک نیا سین بنایا تو میں حیران رہ گئی۔ پہلے تو ڈاکٹر جادیری نے اسٹڈی روم میں میری میز کے سامنے رکھی کرسی کا منہ اس طرح موڑ دیا کہ اندر آنے والے کو سب سے پہلے وہی کرسی دکھائی دے۔ کرسی پر سفید کُشن تھا۔ جادیری نے میرے جوڑے سے چند پھول نوچے اور کرسی کے گدّے پر ڈال دیئے پھر اس نے کالے رنگ کا صرف ایک کف لنگ نکالا اور اس کو پھولوں کے پاس ہی اسی گدّے پر ڈال دیا۔ اس کے بعد تو میری دوست نے کمال ہی کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ جوتوں کے سَول جیسے دفتی کے بنے دو پتابے بھی لائی تھی۔ ان پر اس نے گیلی مٹی کا لیپ لگایا اور کمرے میں داخل ہونے والے راستے پر آگے پیچھے رکھ کر فرش پر ایسے نشانات بنا دیے جو جوتوں کے نشانات جیسے تھے۔

میں سناٹے میں کھڑی اس سین کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

میرا شوہر اندر آئے گا اور دیکھے گا دو اجنبی جوتوں کے نشان۔ میز سے گھومی ہوئی کرسی، کرسی پر میرے جوڑے کے چند پھول اور کسی مرد کی ایک آستین کا کف لنگ۔ یعنی اس کی غیر موجودگی میں کوئی اجنبی آیا تھا اور وہ اس کرسی تک گیا تھا جس پر اس کی بیوی بیٹھی تھی، پھر وہ کرسی موڑی گئی تھی پھر وہ مرد اس کی بیوی کے اتنے پاس آگیا تھا کہ بیوی کے جوڑے کے پھول اس ملاپ میں ٹوٹ کر کرسی پر گر گئے تھے اور اس مرد کے ہاتھ اس کی بیوی سے اتنے الجھ گئے تھے کہ مرد کی آستین کا کوئی ڈھیلا ڈھالا کف لنگ آستین کے سوراخ سے پھسل کر کرسی پر آ رہا تھا۔

"مائی گاڈ" میں چیخ پڑی۔

ڈاکٹر جادیری بڑے پُراسرار انداز میں اس پلان کا اثر میرے اوپر دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"بتاؤ اس پلان کا تمہارے شوہر پر کیا اثر ہوگا؟"

"مجھے نہیں معلوم" میں اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔

"لیکن مجھے معلوم ہے۔"

"کیا۔؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس کی راتوں کی نیند غائب ہو جائے گی وہ تم سے بار بار دیوانوں کی طرح سوال کرے گا کہ بتاؤ وہ کون ہے جو اس کے پیچھے تم سے ملنے آتا ہے کون ہے وہ عیاش۔ شرابی؟"

پھر ڈاکٹر جادیری کے سازشی دماغ نے یہ طے کیا کہ مجھے کافی ٹال مٹول کے بعد اپنے شوہر کو یہ بتانا ہوگا کہ میں باتھ روم میں نہا رہی تھی اور ڈاکٹر جادیری اندر کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی تب ہی میں نے کسی کے اندر آنے کی آواز سُنی تھی۔ اور جب میرا شوہر اس بات کی تصدیق جادیری سے کرنا چاہے گا تو وہ اس کو یہ کہہ کر دن میں تارے دکھا دے گی کہ وہ تو کئی دنوں سے اس کے گھر گئی ہی نہیں۔

ممکن ہے کہ میرا شوہر آستین کے بٹن کو نہ دیکھ پاتا لیکن فرش پر جوتوں کے نشانات اس قدر غیر معمولی طور پر واضح تھے کہ انھوں نے میرے شوہر کو متوجہ کر لیا اور پھر سب چیزیں اس کی نگاہوں سے جڑتی چلی گئیں۔ وہ اس بٹن کو کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے اس کی الجھن نمایاں تھی۔ میں آس پاس ہی اپنے کام میں مشغول رہ کر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ پلٹا تو میں انجان بن گئی۔ پھر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ سوال جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اس نے پوچھا۔

"کیا آج تمہاری ڈاکٹر جادیری آئی تھی؟"

"جادیری؟" میری آواز لڑکھڑا گئی۔ "ہاں آئی تو تھی۔"

"ساتھ میں کون تھا؟" یہ اس کا دوسرا سوال تھا۔

پھر میں نے اس کو ویسا ہی بتا دیا جیسا جادیری سے طے ہوا تھا۔ میرا بیان سُن کر میرا شوہر پھر کچھ نہ بولا۔ میں مسلسل اُسے دیکھتی رہی۔

لیکن نہ تو اس کی آنکھیں ہی کچھ بتا سکیں اور نہ اس کی بے جان اور سپاٹ آواز ہی اس کے دل کا راز کھول سکی۔ لیکن اس شام وہ خلافِ معمول کپڑے تبدیل کر کے اپنے کسی دوست سے ملاقات کرنے چلا گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ ضرور ڈاکٹر جادیری سے ملنے گیا ہے۔

کئی دن ہو گئے جادیری مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ پھر ایک دن، ایک منحوس دن میں نے جو کچھ سُنا وہ میرے لیے ناقابلِ بیان تھا۔ ڈاکٹر جادیری نے اپنے گھر میں چھت کے پنکھے میں لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے تو مجھے کچل کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر جادیری کی خودکشی کے تیسرے دن میرا آچی شام کی چائے پیتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

"پولس کا شک کچھ زیادہ غلط بھی نہیں لگتا۔"

"کیسا شک" میں چونک پڑی۔

"یہی کہ ڈاکٹر جادیری کا قتل ہوا ہے۔"

"کیا۔؟" میں اچھل پڑی۔

"ہاں۔ فیملی وائلنس۔"

"کیا مطلب۔" میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جواب میں منمنایا۔

"مجھے اس کے شوہر پر ترس آ رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی گود میں رکھی کتاب کا صفحہ پلٹنے لگا۔ مجھے لگا کہ اگر وہ کچھ دیر اور چپ رہا تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ آخر وہ بولا۔

"وہ ہمیشہ سے اپنی بیوی کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا تھا اور الجھن میں مبتلا تھا لیکن میری اطلاعات نے شاید اس کو پاگل ہی کر دیا۔"

"تمہاری اطلاعات۔" میں نے ٹوکا۔

"میں ہرگز اس کے شوہر سے اُن باتوں کا ذکر نہ کرتا جس کے شبہے میں وہ اکثر پریشان رہا کرتا تھا۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑی۔ "کیا تم ڈاکٹر جادیری کے شوہر سے ملے تھے؟ کن باتوں کا ذکر کیا ہے تم نے اُن سے۔"

"انھیں باتوں کا۔" اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "جن نامناسب باتوں کے لیے ڈاکٹر جادیری میرے گھر کو استعمال کرتی تھی۔ اب مجھے دکھ ہو رہا ہے بیچارہ شوہر۔"

پھر وہ اپنی کتاب میں کھو گیا۔ میں پورے بدن سے کانپ رہی تھی۔ میرے ہاتھ چائے کے برتنوں کو سنبھال نہیں پا رہے تھے اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں کہ اسی درمیان مجھ سے آنکھیں مِلائے بغیر وہ دھیرے سے بولا۔

"ڈی ایچ لارنس کا یہ مضمون ضرور پڑھنا وہ کہتا ہے۔"

"آپ جتنی کامیابیاں چاہیں حاصل کر سکتے ہیں مگر آپ کے اندر ایک تاریک افریقہ موجود رہے گا جہاں سے چیخیں اور دھاڑیں بلند ہوتی رہیں گی۔"

آج جب میں بوڑھی ہو چکی ہوں تو شاید ایک بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ لوگ جو روح پر یقین کر کے مادّے پر شک کرتے تھے اتنے ہی بیچارے تھے جتنے آج مادّے پر یقین کر کے روح پر شک کرتے ہیں ہمیشہ کہیں کچھ کم کیوں رہتا ہے؟" ◆◆

عمیق حنفی

نظمیں

(۱)

پرندے تم
ہر برس میرے علاقے میں
ایک خاص موسم کے ساتھ
آتے اور لوٹ جاتے تھے

جب تم چلے جاتے تھے
تب میں مرجھائے ہوئے پھولوں کا
نوحہ لکھا کرتا تھا
اور یاد کے چھتنار درخت کی پھنگی سے
تمہیں اپنے کندھے، کلائی یا نظر کی شاخ پر
اتارنے کی کوشش کیا کرتا تھا

تمہارے بول اک نشان بن کر
پیڑ کی گھنی شاخوں میں اٹک جاتے تھے
ڈالیوں پر لٹک جاتے تھے

مگر اس بار
میرے علاقے میں
موسم نے پڑاؤ ڈال دیا ہے
نہ وہ جانے کا نام لیتا ہے
اور نہ تم
میری دنیا ہجر کی لذت سے
نامانوس ہوتی جا رہی ہے
یکساں موسم
یکساں پرندے
یکساں رنگ
یکساں بول
یکساں تال
چال
حال
جاؤ
اور اپنے پسندیدہ موسم کو بھی ساتھ لے جاؤ
انتظار کے وقفے کے بغیر
ملنا بھی کوئی ملنا ہے
ہجر و وصال کے درمیان تبدیلی کا پل ضروری
ہجر کے بغیر
داستانِ وصال
ادھوری ہے ■

(۲)

ہم نے اپنے گیان سے
دھیان سے
اک گھنا چھتنار پیڑ
اک نیا بودھی ورکش
اس صدی کی ناف سے
اوپر اٹھایا
ریگزارِ عقل و حکمت میں اگایا
قرمزی پیلے لہو رنگ آسماں کو چھیدکر
انتہاؤں تک
اس کو پھیلایا بڑھایا
چاند سورج
گھپ اندھیرے میں
خوف کے انجان گھیرے میں
چھپ گئے
روشنی اک لفظ بن کر رہ گئی
پانچ حرفوں میں بنٹی اور بہہ گئی

ہے کوئی سدھارتھ ؟
ہے کوئی گوتم ؟
جو کہ اس کی چھاؤں میں
بیٹھ کر
گیان پائے ؟
بدھ کہلائے ؟ ■

(۳)

گھاس کی
لانبی پتلی سبز پتی
دلربا من بھاونی
جس کے فنکارانہ خم پر
اوس کی ننھی سی بوند
ایک دو چھن ٹھہر جانے کے لئے
تھرتھراتی کانپتی پیہم لڑھکتی
پھر رہی ہے

اس کی اس معصوم خواہش پر
نادان کوشش پر
مسکراتی
لطف لیتی
اور پتی سے اٹھانے میں
کچھ توقف کرتی
سورج کی کرن ■

ے-۲۲۳، پنڈارہ روڈ، نئی دہلی-۳

دھنستی ہوئی زمین

سلطان سبحانی ● ۱۹۳ - ایم ایچ بی کالونی، مالیگاؤں (ناسک)

.... " ہاں ــــ میں برق سوار ہوں "
مستقبل میرا طواف کرتا ہے۔
لمحے مجھے سجدہ کرتے ہیں۔
اور میں وقت کی ساری فصیلوں کو توڑ کر صدیوں بھٹکنے والے زمانوں کے درمیان سے گزرنے کی ادا رکھتا ہوں " وہ اپنے سفر کے درمیان سوچ رہا ہے۔

" سندباد ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں کوئی مہم جو تو نہیں لیکن مجھ میں مدوشی اور سندباد دونوں کی بہت سی خصوصیات موجود ہیں۔ یہ سمندر، صحرا اور ہوا کیا، زمین کی گردش بھی میری تیز رفتاری پر حیران ہے۔ یہ عہد وہ ہے کہ اب زمین و آسمان کے سارے فاصلے مٹ چکے ہیں۔ تمام ستارے اور سیارے محصور ہو چکے ہیں اور لگتا ہے کائنات گھر کے آنگن سے زیادہ وسیع نہیں ہے، مشینوں نے پوری دنیا کو جیسے ایک طلسم خانہ بنا دیا ہے اور میں اس طلسم خانہ کا تیز رفتار مسافر اکو وقت سے پیش پیش اپنے سفر میں ہوں اور میرا سفر مستقبل کی دھند میں روشنی کی ایک تیز لہر کی طرح دراز ہوتا جا رہا ہے.... آگے طوفان ہے "

" یہ کون سی جگہ ہے؟ " وہ اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے۔

ہر سمت آگ، دھماکے اور شور ــــ تاحد نظر گولے پھٹ رہے ہیں اور اوپر بمبار طیارے۔ جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ زمین کے چیتھڑے اڑ رہے ہیں ریلوے لائن بجلی کے کھمبے، عمارتیں، پل سب کچھ روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ نیچے دندناتے ہوئے ٹینک اور سر پر مہیب عفریت .... شہر کے شہر تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ فوجی وردیاں اڑ رہی ہیں۔ گولیوں کے طوفان میں لاشوں کے انبار لگ رہے ہیں۔ کوئی بھی کیمپ سلامت نہیں۔ ساری فضا زہریلی ہو چکی ہے۔ شاید جدید گیسوں کا استعمال جاری ہے۔ اوپر طیارے بھی یکے بعد دیگرے پھٹتے جا رہے ہیں۔ ہر سمت بھاگ دوڑ اور شور ہے۔ جان بچا کر بھاگنے والوں کے گوشت کے لوتھڑے آہنی تاروں میں لٹک رہے ہیں۔ بچے کچلے ہوئے پڑے ہیں۔ پھولوں کی کوئی بھی کیاری سلامت نہیں۔ اسلحوں کے ذخیرے، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں دھماکوں کی زد میں ہیں۔

" لگتا ہے میں تیسری جنگ عظیم کی سرحد پر ہوں " وہ سوچتا ہے " مجھے یہاں سے فوراً بھاگنا چاہئے ورنہ کوئی بم مجھے بھی آگ کے چیتھڑوں کی طرح اڑا دے گا۔ کتنی ہولناک جنگ ہے یہ۔ اوپر بھی جنگ جاری ہے۔ خلائی اسٹیشن تباہ ہو رہے ہیں۔ سمندروں میں بھی آگ لگ گئی ہے۔ جہاز جل رہے ہیں۔ کہیں بھی کوئی محفوظ نہیں۔ اے جنگ عظیم! تجھے سلام کہ ستاروں سے آگے پرواز کرنے والا انسان ایک بار پھر زمین کے اندر دھنس گیا "

چند فوجی اسٹین گن لئے ہوئے حملہ آور کے انداز میں آتے ہیں اور اسے اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں۔

" کون ہو تم۔ ہماری سرحد میں کیسے داخل ہوئے اور تم کس نسل سے تعلق رکھتے ہو؟ " وہ کچھ سوچ کر کہتا ہے " ان گولیوں اور بموں نے تو تمام سرحدوں اور نسلوں کا امتیاز ہی ختم کر دیا۔ اب باقی کیا رہا "

" خاموش! یہاں جنگ ہو رہی ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی، کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے ہو " فوجی زور سے چیختا ہے " شوٹ "

لیکن شوٹ کرنے سے پہلے ہی ایک طیارہ بم برساتا ہوا گزرتا ہے اور فوجیوں کے جسم پٹاخوں کی طرح پھٹ کر بہت دور تک بکھر جاتے ہیں۔

وہ بھاگتا ہے۔ بہت تیز بھاگتا ہے اتنا تیز کہ "شرم" کا منظر بہت پیچھے چلا جاتا ہے۔

سفر جاری رہتا ہے۔

اندھیروں اور اجالوں کے لاتعداد سلسلے بدن کو چھو کر گذرتے ہیں اور اچانک سامنے ایک اُجلا سا مرمریں شہر ابھرتے دیکھ کر وہ چونک اٹھتا ہے ایک داستانی شہر جیسے بغداد یا استنبول، قدیم طرز کی عمارتیں، اونچے اونچے نوکیلے مینار، شاہراہوں پر بھیڑ۔ خوشنما دوکانیں۔ لیکن بسوں اور کاروں کا نام و نشان تک نہیں۔ ہر طرف گھوڑے گاڑیاں اور اونٹ۔ سب کے لباس ڈھیلے ڈھالے۔ اور عجیب سے ہیں۔ سپاہیوں کی وردیوں میں سنہری جھالریں ہیں اور ان کی کمر سے تلواریں لٹک رہی ہیں۔ وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔

وہ اونچی اونچی بلڈنگیں کہاں چلی گئیں۔ وہ عالیشان دوکانیں، وہ ٹرین، وہ جیٹ، وہ ایئرپورٹ، وہ سوئمنگ پول، وہ کالج، وہ تجربہ گاہیں اور وہ شیشے کی طرح چمچماتی ہوئی سڑکیں، وہ رنگین روشنیاں...... شاید اس جنگ عظیم نے دنیا کو بہت پیچھے ڈھکیل دیا ہے یا ممکن ہے لوگ جدید شہروں کی تیز اور ہنگامی زندگی سے اکتا گئے ہوں اور انھوں نے نئی تہذیب اور مشینی زندگی اتار پھینکی ہو...... ان لوگوں کے چہرے کتنے پرسکون اور خوبصورت ہیں"

وہ آگے بڑھ کر شہر میں داخل ہوتا ہے۔

دوکانوں کی قطاروں سے گذرتے ہوئے وہ محسوس کرتا ہے کہ سب اس کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ مٹی کے برتنوں کی ایک دوکان کے پاس رک کر غور سے ان برتنوں کو دیکھتا ہے" ایسے برتن میں شاید کہیں دیکھ چکا ہوں،

قریب کھڑی ہوئی ایک لڑکی اسے گھور گھور کر دیکھتی ہے پھر بے ساختہ پوچھتی ہے

"تم کس دنیا سے آئے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"تمہارا چہرہ اور لباس وغیرہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا ہے"

"ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے"

"کیا مطلب" وہ چونک جاتی ہے" چہرے اور لباس کا شادی سے کیا تعلق۔ سچ سچ بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو۔؟"

"میں اپنے عصر کو بہت پیچھے چھوڑ کر آیا ہوں۔ میری رفتار بہت تیز ہے میں مستقبل کے سفر میں ہوں ابھی میں بہت..... بہت آگے جاؤں گا دراصل عہد خوش خرام تک پہونچوں گا، جب زرد کپڑوں میں ملبوس ایک ایسا شخص نمودار ہوگا جس کے بال گیلے نہ ہوں گے لیکن محسوس ہوگا جیسے ان سے پانی کے قطرے ٹپکنے والے ہیں اور وہ صلیب کو توڑ ڈالے گا، خنزیر کو ہلاک کر دے گا اور تمام جنگوں کا خاتمہ کر کے سب کو مالا مال کر دے گا"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں" وہ کہتی ہے" کیا تم صحیفوں کی زبان میں بات کر رہے ہو؟"

اچانک کئی طرف سے نقاروں کی تیز آوازیں اٹھتی ہیں اور بازار میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ دوکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگتی ہیں۔ سب بھاگتے ہیں۔ شاہراہوں پر ہاتھی اور گھوڑے دوڑنے لگتے ہیں اور دھول میں سپاہیوں کی تلواریں نمودار ہوتی ہیں۔

لڑکی کے ساتھ وہ بھی بھاگتا ہے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ پوچھتا ہے۔

"تم نے نقارے کی آوازیں سنی نہیں، دشمن کا لشکر حملہ کرنے والا ہے۔ شہنشاہ نے آج صبح ہی منادی کرا دی تھی کہ سب جنگ کے لئے تیار رہیں"

"شہنشاہ" وہ حیرت سے کہتا ہے" شہنشاہیت کا خاتمہ تو کب سے ہو چکا ہے"

"بکواس مت کرو، بھاگو کہیں پناہ لو"

دونوں بھاگتے ہیں۔ بھاگنے والوں کے ہجوم میں وہ لڑکی سے بچھڑ جاتا ہے اور ہجوم اسے فصیلِ شہر کے صدر دروازے کی طرف بہا کر لے جاتا ہے۔

"اندھیرا پھیل رہا ہے" ایک آواز ابھرتی ہے" رات بھر جاگنا پڑے گا ورنہ دشمن شب خون مارے گا"

وہ سوچتا ہے" یہاں رکنا نہیں چاہئے۔ سپاہی مشعلیں جلائے پہرہ دے رہے ہیں۔ ممکن ہے جنگ رات ہی میں چھڑ جائے یا ممکن ہے صبح ہوتے ہی دونوں طرف سے طبلِ جنگ کی آوازیں ابھریں اور خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اس زمانے کو جلد سے جلد عبور کرنا چاہئے۔ لیکن وہ لڑکی کتنی خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ کتنا چمپئی و گلابی تھا۔ گھوڑی کی طرح رفتاری کا انداز اس میں بھی ہوتا تو اسے بھی شریک سفر کر لیتا۔ اس وقت وہ جانے کہاں ہوگی۔ کاش میں اس کا نام ہی پوچھ لیتا"

وہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے شہر کو الوداعی نظروں سے دیکھتا ہے ۔

اور سفر جاری ہو جاتا ہے۔

ایک تیز گردش ...... سارے منظروں کے میلے پیچھے بھاگ کر معدوم ہوتے جاتے ہیں۔

"میری رفتار کتنی تیز ہے" وہ مسکراتا ہے "چشم زدن میں وہ زمانہ کتنے پیچھے چلا گیا۔ ارے یہ کون سا عہد ہے۔ پتھروں کی عمارتیں اونچے اونچے ستون ۔صاف ظاہر ہے کہ مشینی عہد کے بعد دنیا دوبارہ ماضی کی طرف جائیگی اور از سر نو سفر کرے گی اور اپنی تاریخ کو دہرائے گی۔ سامنے وہ جو عمارتیں ہیں وہ نئی ہیں لیکن ان کا اسٹائل قدیم یونانی و مصری لگتا ہے۔ وہ محل کتنا خوبصورت ہے۔ اس پر جو جھنڈا لگا ہوا ہے غالباً اس پر بچھو بنا ہوا ہے" وہ سامنے دیکھتا ہے ۔

محل سے قریب میدان میں ہتھیار دلائے ہیں سپاہیوں کے دستے اور میدان کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ اور سب کے چہروں پر خوف و ہراس ۔ . . . سپاہیوں کے دستوں کے درمیان قیدیوں یا غلاموں کی قطاریں، جن کے پیروں میں زنجیریں ہیں، بہت سے غلاموں کے پیروں سے خون رس رہا ہے ۔

وہ سوچتا ہے "ممکن ہے انھیں سزا دی جائے ۔ یہاں سے جلد رخصت ہونا چاہئے۔ اذیت ناک منظر دیکھنے کی اب ذرا بھی تاب نہیں "

وہ اور آگے چلتا ہے۔ اندھیروں اور اجالوں کے درمیان ایک طویل سفر کرنے کے بعد ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا ہے ۔ وہ سرشار ہو کر سامنے دیکھتا ہے۔ دور بہت دور ایک وسیع سمندر جس کا پانی سرخی مائل ہے۔ ایک طرف پہاڑوں کے سلسلے، بیابان اور سامنے ایک وسیع عریض دریا جس کی موجیں چمک چمک کر شور کر رہی ہیں۔ ایک سمت بکھا راستہ ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس راستے پر بہت دور گرد و غبار اٹھ رہا ہے اور کچھ ہیولے متحرک ہیں اور ان ہیولوں کے پیچھے اسی راستے پر گرد و غبار کا ایک اور زبردست طوفان اٹھ رہا ہے ۔

تھوڑی دیر بعد ہیولے قریب آجاتے ہیں ۔

"کوئی قافلہ ہے ۔ لیکن یہ قافلہ دریا کی سمت کیوں آرہا ہے۔ کیا یہ گھوڑے اتنا وسیع عریض اور عمیق دریا پار کر لیں گے ۔ نہیں ناممکن ہے۔ اس قافلے کی رفتار کتنی تیز ہے اور پیچھے جو طوفان ہے ۔ . . . " وہ چونک اٹھتا ہے ۔

گرد و غبار کے اٹھتے ہوئے طوفان میں سمندر کی طرح پھیلا ہوا ایک عظیم لشکر ہے جو یقیناً اس قافلے کا تعاقب کر رہا ہے ۔

"اس قافلے کے تعاقب میں اتنا بڑا لشکر ؟ " وہ حیرت سے دیکھتا ہے ۔

پیچھے سے آتے ہوئے لشکر میں بے پناہ جوش و خروش پیدا ہوتا ہے اور برہنہ تلواریں بلند ہو جاتی ہیں لشکر اور گھبرائے ہوئے قافلے کے درمیان فاصلہ کچھ کم ہو جاتا ہے ۔ یہ قافلہ یقیناً ایک ہولناک مصیبت میں گھرا ہوا ہے ۔ ایک طرف پر جوش دریا اور دوسری طرف خونخوار دشمنوں کا لشکر جس میں زرہ بکتر پہنے ہوئے سپاہیوں کے جلوس ایک شخص شاہانہ مصری لباس میں ہے اس کے سر پر تاج ہے ۔

وہ سوچتا ہے "بس ابھی کچھ دیر بعد یہاں پورا قافلہ کٹ جائے گا "

گھبرایا ہوا قافلہ دریا کے کنارے رک جاتا ہے ۔

قافلے کا ایک دراز قد شخص جس کے ہاتھ میں تلوار کے بجائے ایک سونٹا ہے۔ وہ سونٹے کو پانی پر مارتا ہے۔ پانی بہت اوپر تک اٹھتا ہے ۔ . . . اٹھتا ہے۔ دریا میں ایک بھونچال سا آجاتا ہے۔ اور قافلے کے سامنے پانی کے دو دو پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک طویل راستہ نمودار ہوتا ہے ۔

وہ حیرت سے دیکھتا ہے۔ پانی کے ایستادہ پہاڑوں کے درمیان سے قافلہ نہایت تیزی کے ساتھ گزرنے لگتا ہے اور بہت آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔

پیچھے سے آئے ہوئے لشکر میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شاہانہ لباس پہنا ہوا شخص سب کو آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور اپنے گھوڑے کو پانی کے درمیان بچھے ہوئے راستے پر تیزی سے دوڑاتا ہے۔ پورا لشکر اس کے پیچھے دوڑتا ہے ..... !

وہ سوچتا ہے "قافلہ یقیناً اس پار پہونچ گیا ہوگا "

اچانک پانی کے کھڑے ہوئے پہاڑوں میں حرکت ہوتی ہے اور وہ ڈھسل کر ایک پر شور آواز کے ساتھ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں ۔

پر شکوہ زبردریا —— اور وہ شانت ۔

اسے یاد آتا ہے کہ ماضی میں کیسا ایک معرکہ ہو چکا ہے۔ وہ حیرت سے اپنی آنکھیں ملتا ہے کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن فضا میں گرد و غبار کا طوفان ابھی تک

ہے جو اس بات کا گواہ ہے کہ اس نے خواب نہیں دیکھا۔

"لگتا ہے میں ایک بہت ہی پراسرار دور میں آگیا ہوں۔ ایسا دور جہاں مظلوموں کو بچانے کیلئے پانی راستہ چھوڑ کر باادب کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے ادوار میں ظلم کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اب مجھے اور آگے چلنا چاہئے۔ یقین ہے آگے بہت خوشگوار اور زرّیں دور ہوگا"۔

وہ بجلی کی طرح آگے لپکتا ہے۔ آگے منظر کچھ اس طرح ہے۔

ایک بڑا سا میدان ہے جہاں دو عظیم الشان لشکر ایک دوسرے کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔ سپاہیوں کے جنگی لباس اور حُلیے عجیب سے ہیں۔ سر پر لمبے لمبے بال۔ پشت پر ترکش میں تیر، کاندھے پر کمان، ہاتھ میں ڈھال تلواریں اور گُرز۔ گھوڑے جُتے ہوئے رتھوں کی لمبی قطاریں اور رتھوں پر بھالے اور کلہاڑی نما ہتھیار۔۔۔۔

وہ سوچتا ہے: "تو کیا جنگ آخر تک جاری رہے گی۔ میں تو سمجھتا تھا کے آنے والے ادوار جنگ اور خون خرابے سے پاک رہیں گے۔ یہاں تو میں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتا۔ کتنے بھیانک ہتھیار ہیں یہ۔ لیکن یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے؟"

وہ آگے بڑھ کر کاندھے پر ایک بھاری گُرز اٹھائے ہوئے سپاہی سے پوچھتا ہے۔

"تم سپاہی ہو یا پہلوان؟"

سپاہی اسے اور اس کے لباس کو حیرت سے دیکھتا ہے۔

"یہ جنگ کس وجہ سے ہے؟"

اس کی بات سپاہی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بھی کسی زبان میں کچھ کہتا ہے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ سپاہی اپنی کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار اس کے سپرد کر کے اشارہ کرتا ہے کہ اس جنگ میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جائے۔

"اتنی وزن دار تلوار۔۔۔۔" تلوار اٹھا کر اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ وہ تلوار پھینک کر بھاگتا ہے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔

آگے سفر میں ایک ایسا علاقہ آتا ہے جہاں کے لوگوں کا قد کافی دراز ہے مگر سب کے سب اندھے ہیں۔ ہر طرف ایک انتشار اور بدحواسی ہے۔ وہ سوچتا ہے "یہ لوگ اندھے کیوں ہیں۔ ان کی آنکھوں کا نور کہاں چلا گیا۔ بڑا عجیب دور ہے یہ۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک طلسمی دنیا کا سفر کر رہا ہوں۔ دنیا بہت تیزی سے بربادی کی طرف جا رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جوں جوں عہد بدلتے جائیں گے دنیا بدصورت ہوتی جائے گی۔ میں ہر دور میں جنگ اور تباہی دیکھتا آ رہا ہوں۔ یہاں تک پہونچنے کے بعد دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کی آبادی کتنی کم ہو گئی ہے اور لوگ وحشیوں کی طرح رہنے لگے ہیں لیکن یہ لوگ اندھے کیوں ہیں۔ مجھے ان سے پوچھنا چاہئے کہ ان کے ساتھ یہ المیہ کیوں؟"

اچانک زمین میں ایک گھڑگھڑاہٹ پیدا ہوتی ہے، پھر فلک شگاف دھماکے ہوتے ہیں۔ زمین جگہ جگہ سے پھٹ جاتی ہے۔ اور پورے علاقہ پہ آگ اور پتھروں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ جیسے لاتعداد کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے ہوں۔ پورا علاقہ آگ اور پتھروں کی بارش میں دب جاتا ہے۔ سارے اندھے دھنستی ہوئی زمین میں دفن ہو جاتے ہیں اور زمین کی تہیں الٹ پلٹ ہونے لگتی ہیں۔ وہ گھبرا کر بھاگتا ہے "اف۔ کتنی بھیانک بارش ——— پانی کی بجائے آگ اور پتھروں کی بارش۔۔۔!"

بہت آگے پہونچ کر سوچتا ہے "اگر میں اتنا تیز رفتار نہ ہوتا تو یقیناً اسی دور میں دفن ہو جاتا۔ ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے میں مستقبل کے تمام زینے پھلانگتا ہوا اس عہد تک ضرور پہونچوں گا جس کے بارے میں سنا ہے کہ ایک ایسے شخص کا ظہور ہوگا جو تمام جنگوں اور ظالموں کا خاتمہ کر دے گا اور ساری دنیا پھولوں سے مہک جائے گی۔ اس عہد تک میرا سفر جاری رہے گا"۔

اس کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہے۔ کافی دور تک چلنے کے بعد جب وہ رکتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک سرزمین کے گرد گئی سمندر ہیں اور اس کے سینے پر کئی بڑے دریا اور کوہستانی سلسلے ہیں۔ وہ اور آگے چلتا ہے۔ اس سرزمین کے دشت و جبل سے گذرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہوا کی کیفیت اچانک بدل گئی ہے اور ہر طرف ایک سناٹا طاری ہو گیا ہے۔ اوپر کالے کالے مہیب بادل زمین کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا پھیل رہا ہے۔ ہوا تیز چلنے لگی ہے۔ ہوا اور تیز چلنے لگی ہے۔ یکایک بادل زور زور سے چنگھاڑ کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ بھاگ کر قریب کے ایک پہاڑ پر پناہ لیتا ہے اور وہاں سے دیکھتا ہے کہ قیامت خیز بارش نے جگہ جگہ سے زمین پھاڑ دی ہے اور پھٹی ہوئی زمین میں سے پانی کے چشمے ابل پڑے ہیں۔ ایک سمت ایک بڑا سا دہانہ ہے جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں سے کوئی بپھرا ہوا سمندر ابل رہا ہے جو تمام درختوں اور گھروں کو اکھاڑ کر گھاس پھوس کی طرح بہاتا ہوا چاروں طرف پھیل رہا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پورا علاقہ زیر آب ہو جاتا ہے۔

وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ تمام قصبے، شہر اور کوہستانی سلسلے ڈوب چکے ہیں۔ پانی میں زبردست ہیجان ہے۔ طوفان مسلسل گردش کر رہا ہے اور اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اتنا گہرا کہ اب کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے "نہیں معلوم کتنے دن گذر گئے"

ایک بار بجلی بہت زور سے چمکتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ کوئی سیال شے طوفان کے تھپیڑے کھاتی ہوئی پہاڑ کی طرف بڑھ رہی ہے "ممکن ہے کوئی کشتی ہو" چاروں طرف پانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے اس دور سے آگے جانا چاہئے۔ یہاں تو سب کچھ زیر آب اور نذر طوفان ہو چکا ہے۔ اے سرزمین آب . . . تجھے سلام۔ میں اپنے آپ کو اس طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے آگے جا رہا ہوں"

وہ آگے بڑھ کر بہت سارے اندھیروں اور اجالوں کو عبور کرتا ہے۔ سفر میں بہت سارے خوبصورت مناظر اس کا دامن کھینچتے ہیں، اسے بلاتے ہیں۔

"آؤ کچھ لمحے ہمارے ساتھ گذارو۔ دیکھو ہمارے پاس کتنا حسن اور تازگی ہے" لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ طوفان اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ بغیر کہیں قیام کئے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ کئی ادوار سے گذرنے کے بعد ایک نہایت خوبصورت منظر دیکھ کر وہ رک جاتا ہے۔ ہر طرف سرسبز و شاداب، جنگل، پہاڑ، آبشار اور ندیاں، پرندوں کی چہچہاہٹ اور دور دور تک کسی بھی قصبے کا نام و نشان تک نہیں۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ شہد کے چھتے لٹک رہے ہیں۔ جنگلی پھولوں کے پودے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ندیوں کے کنارے ہری ہری گھاس اگی ہوئی ہے۔

"سب لوگ کہاں گئے" وہ سوچتا ہے "ممکن ہے درختوں کے اس پار پہاڑوں کے دامن میں کوئی قصبہ ہو"

وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گذرتا ہوا پہاڑوں کے دامن تک پہونچتا ہے۔ دامن میں ایک نیلی جھیل ہے۔ وہ ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ جھیل کے ایک گوشے میں ایک اونچی چٹان کے قریب کچھ جوان لڑکیاں نہا رہی ہیں۔ ان کے بدن سونے کی طرح چمک رہے ہیں۔ وہ ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے

وہ لڑکی اس وقت کہاں ہوگی جس نے مجھ سے پوچھا تھا تم کس دنیا سے آئے ہو۔ اس کا رنگ کتنا چمپئی گلابی تھا۔

کچھ دیر بعد لڑکیاں نہا کر باہر نکلتی ہیں تو جانوروں کی کھال سے اپنے جسم ڈھانکنے لگتی ہیں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر ان کے قریب جاتا ہے۔ لڑکیاں اسے اور اس کے لباس کو دیکھ کر سہم جاتی ہیں اور شور کرتی ہیں۔

اچانک پہاڑوں کی گپھاؤں سے بہت سارے مرد نکل کر بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے عورتیں بھی ہیں اور سب کے ہاتھوں میں پتھر اور ہڈیوں کے ہتھیار ہیں۔

"شاید یہ قبائلی ہیں" وہ سوچتا ہے "کتنے وحشی لگ رہے ہیں"

وہ سب قریب آ کر اسے اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں اور گلے سے عجیب عجیب طرح کی آوازیں نکالتے ہیں۔ وہ سہم جاتا ہے۔ پھر حواس جمع کر کے کہتا ہے۔

"تم لوگ انسان ہو یا جانور۔ ایسی آوازیں تو ہمارے یہاں گھوڑے، گدھے، اور ہاتھی نکالتے ہیں"

اس کی بات کوئی نہیں سنتا۔ سب چیخنے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ تمام قوت لگا کر زور سے کہتا ہے۔

"سنو! میں پچھلے زمانوں کی طرف سے اور بہت دور سے آیا ہوں۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں انسان دوبارہ جانور اور وحشی بن جائے گا۔ میں ایک مہذب انسان ہوں۔ میرے ساتھ تہذیب سے پیش آؤ۔ میرے کپڑے مت نوچو۔ ان لڑکیوں سے کہو اپنے سینے ڈھانک لیں اور تم لوگ بھی ٹھیک طرح سے اپنے بدن ڈھانکنے کی کوشش کرو۔ میں اس عہد تک پہونچنے کا فیصلہ کر چکا ہوں جب زرد کپڑوں میں ملبوس ایک ایسے شخص کا ظہور ہوگا . . . " وہ بہت کچھ کہتا ہے مگر احساس ہوتا ہے کہ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

وہ اسے کھینچ کر ایک گپھا میں لے جاتے ہیں اور اسے اندر دھکیل کر ایک لمبے سے پتھر سے گپھا کا دہانہ بند کر دیتے ہیں۔

"اف۔ میں کس دور میں آ پھنسا" وہ گھبرا کر چاروں طرف گھومتا ہے مگر باہر نکلنے کا راستہ کہیں نہیں ملتا۔ کافی وقت گذر جاتا ہے۔ شاید رات آ جاتی ہے۔ دہانے کا پتھر سرکتا ہے۔ دو چار مرد اندر آتے ہیں اور اسے پکڑ کر باہر نکالتے ہیں۔ باہر رات ہے اور پورا چاند روشن ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جھیل کے کنارے پھیلی ہوئی زمین پر سیکڑوں مرد اور عورتیں ٹیڑھی میڑھی قطار میں دوزانو بیٹھے ہیں اور منہ سے عجیب عجیب طرح کی آوازیں نکال کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہیں اور چاند کو سجدہ کرتے ہیں۔

ایک بوڑھا مرد اسے اشارہ کرتا ہے کہ وہ بھی چاند کی عبادت کرے۔

"چاند کی پرستش؟" وہ چونک اٹھتا ہے۔ پوری وادی اسے گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چاند کی پرستش تو انسان پتھروں کے عہد میں کرتا تھا اور ان لوگوں کے پاس پتھروں اور

[باقی صفحہ ۵۳ پر دیکھئے]

نصر قریشی

میں ابرِ ہستی کا ایک قطرہ، سُلگتی ریگِ رواں پہ گر کر، وجود کو یوں بچا رہا ہوں
شجر، حجر، برگ، باد، صحرا، چٹان، کہسار، باغ، دریا کا ایک حصہ بنا ہوا ہوں

ہزار صدیوں سے پربتوں پر، خموشیوں کے دبیز کہرے، کثیف بادل ہی حکمراں تھے
بشارتوں کا علَم اٹھائے، طلسمِ خاموشی توڑنے کو، صدا بصحرا میں گھومتا ہوں

دہکتی تنہائی کی سلاخیں، اسیر آنکھوں سے نُور لے کر، چراغ سارے بجھا چکی ہیں
اندھیرے زندانِ آرزو میں، لہو بھرے پیرہن کی ضَو سے، یقیں کی شمعیں جلا رہا ہوں

نفس نفس اک عذاب کی سِل، قدم قدم پُل صراط حائل، جہنموں کی ہے آگ روشن
میں نیکیوں کی ردا سنبھالے، حقیقتوں کا لباس پہنے، عمل کے میداں میں آگیا ہوں

خزاں رسیدہ بہار میں بھی، کچھ ایسی شاخیں کہ جن پہ کھلتے ہیں حسرتوں کے فسردہ غنچے
سُلگتی صبحوں، اداس شاموں، حزیں دنوں اور اُجاڑ راتوں کے نوحے سن کر تڑپ رہا ہوں

سروں پہ شمشیر سی لٹکتی، دلوں میں اندیشے، یاس و حرماں، لبوں پہ بیچارگی کا پہرہ
یہ شہرِ امید ہے کہ مرگھٹ، بلند ہیں شعلے بے کسی کے، چتائیں چہروں پہ دیکھتا ہوں

یہ اعلیٰ قدروں کے ادنیٰ پیکر، حصاروں اور دائروں میں بٹ کر عجب ماحول بُن رہے ہیں
ہر ایک اپنا ہی پوسٹر ہے، قلم کی عظمت بھی زخم خوردہ، میں نصر برسوں سے دیکھتا ہوں

● ۴۴۷، ہتیا، بہادر گنج، الٰہ آباد - ۳

شاہد ماہلی

(۱)

کوئی صدا، کوئی سایہ نہ سلسلہ کوئی
تمام راہ دھندلکوں میں ڈوب ڈوب گئی

بہت قریب سے دیکھا تو میرا سایہ تھا
جسے گلے سے لگائے ہوئے تھی تنہائی

عجب صدا تھی کہ دیکھی گئی نگاہوں سے
عجیب برق تھی کانوں سے آکے ٹکرائی

رگوں میں پھیل گیا زہر خود پسندی کا
نمو کی دھوپ سے دیوارِ جسم ٹوٹ گئی

خیال ریت کا صحرا، اُمید راکھ ہی راکھ
کوئی شرر بھی نہیں دل کی آگ ایسی بجھی

(۲)

باتیں وہی، مزاج وہی، عادتیں وہی
گذرے جو چند سال تو صورت بدل گئی

مل جائے گی کہیں نہ کہیں آگہی کی بھیک
پھرتی ہے در بدر لئے کشکول زندگی

افسردگی سی چھا گئی سارے وجود پر
کانوں میں کوئی بات صبا آکے کہہ گئی

اک خواہشِ فضول کہ امید بھی نہیں
اک سعیِ رائگاں ہے کہ اب بھی کبھی کبھی

رگ رگ میں میری دوڑ گئی ہیں اداسیاں
سینے میں آکے ساری خموشی سما گئی

● کے - ۳۰ سی، شیخ سرائے، فیس II، نئی دہلی - ۱۱

اُردو افسانے میں علامتی تحریک*

اعجاز راہی ● ۴۵-اے- جہانگیر روڈ، راولپنڈی (پاکستان)

علامت پر گفتگو کے دوران ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا علامت نگاری از خود کوئی بہت بڑا مقصد ہے؟۔ کیا استعجاب، تجسس، جستجو اور انکشاف کا سارا کائناتی عمل علامت ہی کے لیے ہے؟ کیا علامتی تشکیل، علامتی اظہار، علامتی ادراک سب علامت کی مدح میں ہے؟ یا علامت خود کسی دوسرے بڑے مقصد کے حصول، کسی بڑی حقیقت کے ادراک، کسی بڑی بات کے اظہار، اور کسی گہرے غیب و اسرار کے انکشاف کا ذریعہ یا ذریعے کا اظہار ہے؟

کائنات کا سارا عمل ایک علامت پر استوار ہے اور یہ علامت شجر ممنوعہ کے اس خوشے سے پھوٹی تھی جس نے ہبوطِ آدم کی روایت کو جنم دیا لیکن علامت علت ہبوط نہ تھی بلکہ سبز پوش تھی۔ ان اسباب و علل کی جو شجر ممنوعہ کی توصیف تھے۔ شجر ممنوعہ اور اس کے پس منظر میں ثیث معرض ہے، اور علامت اس کا اظہار۔ اگر اس علامت سے علت اور معلول چھین لیے جائیں، تو علامت کی بلند و بانگ عمارت از خود ڈھل جائے گی گویا علامت کا وجود ماضی اور حال کے معروضی در و بست سے ابھرتے موضوع سے بحث کرنا اور اسی سے عبارت ہے۔ اور یہ اظہار نہیں اظہار کی معاون و مددگار ہے۔ چنانچہ آغاز میں ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامتی افسانہ بڑے مقصد کے حصول، بڑی حقیقت کے ادراک، بڑی بات کے اظہار اور گہرے اسرار و رموز کے انکشاف پر استدلال کرتا ہے، محض علامت نوازی کے لیے نہیں ہے۔

علامتی افسانے نے سن ۶۰ء کے بعد جن معروضی علائق میں طلوع لیا۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن اس جواب کے لیے کہ کیا علامتی افسانہ کسی خود رو اور اچانک تحریک کا نتیجہ ہے؟ اس کی جڑیں خلا میں پیوست ہیں؟ علامت نگاری محض فرسٹریشن اور ردعمل کا اظہار ہے؟ کیا یہ داخل کے آفاق میں گم پیچیدہ تر ذہنوں کی نمو ہے؟ اور کیا یہ زندگی کی زندہ روایتوں میں منفی رجحان رکھتی ہے؟ مزید بحث کا تقاضا کرتا ہے۔

علامتی افسانے کا فکری اور اسلوبیاتی دھارا بحر کی اس وسعت کی طرح ہے جہاں افسانے کی تمام فکری اور اسلوبیاتی ندیاں، نالے اور دریا آ کر یک جان ہو کر سمندر کی سمت ایک نیا سفر شروع کرتے ہیں۔ یلدرم کی رومانیت، پریم چند کی حقیقت نگاری ترقی پسند افسانے کی سماجی حقیقت نگاری، محمد حسن عسکری، احمد علی، ممتاز مفتی، کی جنسی نفسیات، شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال کرشن چندر کی وسیع المشربی بیدی کی نرم روی، منٹو کا بلند آہنگ جدید نفسیات کا رویہ اور سماجی کجرویوں پر شدید احتجاج، سب کچھ نئے افسانے کا روایتی ورثہ اور جدید عصر کی اپنی مبادیات، نفسیات، جبریات، ویژن اور فکر نئے افسانے کی تجربہ گاہ کے آلاتِ تخلیق ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد افسانوی روایت بھی تقسیم ہو گئی۔ ہندستانی افسانہ نصف صدی کے مشترکہ تجربہ کے باوجود نئے معروض کا اظہار کرنے لگا۔ پاکستانی افسانہ، پاکستان کی طرح یک لخت ایک بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوا۔ لاکھوں جانوں کی قربانی اور کروڑوں بے گھروں کی المیاتی صورتِ حال میں تا دیر مبہوت کھڑا رہا۔ پھر ایک رد عمل جس میں فسادات کا المیہ سرِ فہرست تھا۔ بہت خوبصورت افسانے لکھے گئے، فسادات میں جانوں کا زیاں، عصمتوں کی پامالی، بے گھری کا کرب، ہجرت کا دکھ سبھی کچھ تھا۔ مگر

کی دہائی تک زمین کی خوشبو، نئی ثقافت کا رنگ، نئی تہذیب کا آہنگ، نئے ابھرتے کرب کی صدائیں، نیا جنم لیتا احساس، نئے سیاسی حالات، نئی پابندیاں نئے اجڑتے گھر، نئی بستیاں نظر نہیں آرہی تھیں۔ اگر کہیں کہیں نیا طرزِ احساس اور روشنی کی رمق تھی تو اتنی کمزور کہ نئے دور کا اعلان نامہ نہیں بن سکتی تھی۔ اظہار میں فرسودگی اور بیوست میں جھلکتی تھی۔ دور پھر کروٹ لینے لگا تھا۔ مضبوط جاگیرداری کے سماج میں پہیہ اور چمنی داخل ہو گئے۔ محدود ہی سہی، چمنیوں سے نکلتا دھواں صنعتی دور کو آوازیں دینے لگا۔ چمنیوں کی بلندی اور پہیے کی رفتار جب شعور کو صیقل کرتی ہے تو شعور جاگتا ہے اور نئے عصر میں نئے تقاضوں کے لیے نئے ڈھنگ کا تقاضا کرتا ہے۔ پرانے اسلوب شہر مدفون بنتے ہیں اور اردو افسانے کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ رواں اسلوب حقیقی زندگی سے دور محسوس کیا جانے لگا کہ حقائق "عصری تقاضوں" کے بھنور میں اسلوب اور فنی تناظر سے خارج ہونے لگے۔ اور نئے آنے والوں نے محسوس کیا کہ جیسے کہانی کو موم کی گڑیا بنا دیا گیا ہے۔ جسے وقت کی ضرورتوں کے مطابق شکل دی جا سکتی ہے۔ افسانہ زندگی کے حقیقی مسائل اور تجربے سے تہی ہونے کے باعث خالی کنستر کی طرح بجنے لگا۔ حقائق تلخ تھے اور کہانی کی بنیادیں تلخیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیتوں سے محروم سمجھی جانے لگیں۔ کہانی کار کے لیے (دانستہ یا نادانستہ) یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ زندگی کی توجیہات اور تجربات کی شدت کو تجزیہ اور تحلیل کی رفتار سے ہم آمیز کر سکے۔ زندگی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی مشین یقیناً نہیں تھی۔ جسے کسی ڈرائیور کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گیر لیور GEAR LEVER سے تیز یا سست کیا جا سکے۔ افسانہ نگار سرعت سے بدلتے حالات میں خود کو شناخت نہیں کر پائے اور کہانی کے پرانے ڈھانچے، رویے، بنت، اسلوب اور فکر ایک جست میں تبدیلی کا تقاضا کرنے لگے۔ نئی بدلتی، بلکہ تیزی سے بدلتی معاشرتی قدروں کے نئے علائق سانچوں کی تبدیلی کے لیے ناگزیر ٹھہرے۔ چنانچہ ساٹھ کی نسل نے نہ صرف کہانی کے اسلوب اور سانچوں کو توڑ دیا بلکہ سوچنے کا نیا انداز، بات کہنے کا نیا ڈھنگ کہانی کی نئی بنت، لفظوں کا نیا چناؤ، علامت استعارے، پیکر تراشی کا نیا اسلوب اور فکر کا نیا علمی رویہ وقت کے ساتھ منطبق کر کے اپنا لیا۔ نئے ادیب کا سفر یہاں نہیں رکا، بلکہ اس نے نئی لسانیات کی تشکیل کا دعویٰ بھی کیا۔

لیکن اس سب کے باوجود کہانی کا نیا آہنگ روایت سے انحراف نہیں تھا۔ نہ یہ ترقی پسند افسانے کا ردِعمل یا مذمت تھا۔ یہ معروضی صورتِ حال میں ایک فطری ارتقاء کا عمل تھا۔ پھر یوں بھی ارتقاء کا عمل مستقیم میں سفر کرتا ہے۔ نہ تخلیق کی نیابت ایک رفتار کی پابند ہوتی ہے تخلیق کا عمل کہیں جست لگا کر اور کہیں سست روی سے ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ اسی لیے یہ دعویٰ خالی از علت نہیں کہ ہر عہد کا ادب اپنے عصر کے احساس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سیاسی و معاشی تبدیلیاں احساس اور فکر کے انداز بھی بدلتی ہیں۔ ہر نیا عہد نئے طرزِ احساس کی تشکیل کرتا ہے۔ اور یہی اس دور کے شعور، اور ایک اور جذبات کی اولین سطح بھی ابھارتا ہے۔

> "ہم اپنے فکری و شعوری تنظیم کی مدد سے جذبات کی تربیت کرتے ہیں۔ انھیں ترتیب دیتے ہیں۔ یہی مرتب جذبات ایک سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، تو ان کی مدد سے چیزوں کو قبول اور رد کرتے ہیں۔" [۵]

رد و قبول کا یہ رویہ ۱۹۶۰ء کے افسانے میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ طرزِ احساس کسی تبدیلی اظہار کے سانچوں کو تبدیل کرتی ہے۔ آزاد فضا میں چیزوں کی شناخت و ادراک کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ مگر ۱۹۵۸ء سے بدلنے والے حالات کی روشنی میں آنے والی فکری تبدیلیوں کو اگر ہم ماضی میں ادب کی مختلف اشکال کے حوالے سے دیکھیں، تو اخفا کا جو انداز اساطیری دور اور پھر داستانوں میں نظر آتا ہے۔ وہ غالب کے دور میں ایک نئے طرزِ احساس کے ساتھ اجاگر ہو کر مختلف شناخت کراتا ہے۔ حالی اور آزاد کا پرانی شاعری کے خلاف ایک نیا طرزِ احساس نئے شعور و ادراک کے دور کی خبر دیتا ہے۔ اور اسی طرح سرسید کی عقلیت پسندی کے خلاف جو نیا طرزِ احساس ابھرا وہ روحانی اور رومانی عہد کی نیابت کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فکری دھاروں کی تبدیلی ایک نئے عہد کا پتہ دیتی ہے جس کو آگے چل کر جدید ادب کے دوسرے اچک لیا۔ اور ترقی پسند تحریک نئے تشخص اور طرزِ احساس کے ساتھ نمو پذیر ہوئی۔ پاکستان کی تقسیم کے بعد فسادات کے ادب سے قطع نظر کوئی فکری شناخت نظر نہیں آتی مگر ۶۰ء کے بعد پاکستانیت اور زمین کے حوالے سے ابھرتا ہوا طرزِ احساس اپنی واضح شناخت

---

[۵] سجاد باقر رضوی تہذیب و اخلاق مکتبہ جدید لاہور ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۲۱۔

قائم کرتا ہے۔ جس کے جلو میں ماضی کے عظیم تجربات کی بازگشت بھی ہے اور جدید حسیات کی جولانی بھی۔

(۲)

علامتی افسانہ "جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں" روایت سے اپنے فکری اور اسلوباتی ندی نالوں اور دریاؤں کو ایک سمندر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ چنانچہ روایت کی سماجی حقیقت نگاری داخلیت پسندی، نفسیاتی اشاریت، جنس نفسیات، شعور کی رو، تہذیب و اقدار کے نوحیات اور اساطیری دداستانی طرز احساس کہیں یکجا اور کہیں الگ الگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ تمام رجحانات اپنی معروف تعریف کا ساتھ نہیں دیتے۔ بلکہ ایسے کئی رجحانات اپنی الگ اصطلاح میں جو مفہوم رکھتے ہیں۔ یہاں اپنے مخصوص معنی کے تعطل کو توڑ کر نئے معنی کا تعین کرتے ہیں۔ یہ رجحان کس حد تک افسانے کے فطری ارتقا میں معاونت کر سکا؟ یا اس نے افسانے کے مجموعی تشخص کی تشکیل میں کتنا کردار ادا کیا؟ اس کا فیصلہ قبل از وقت ہے۔ مگر اس سے نئی کہانی نے بطریق احسن کسب فیض کیا ہے جو نئی کہانی کے متنوع پہلوؤں کو ابھارنے میں مددگار رہا۔ شاید اس کا سبب یہ ہے، کہ کسی مخصوص تکنیک یا اسلوب سے وابستہ رہنے سے جو ٹھہراؤ یا جمود ابھرتا ہے۔ وہ علامتی افسانے نے قبول نہیں کیا۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے، کہ نفسیات ہو یا داخلیت پسندی اکثر نئے اور جنین افسانہ نگاروں نے اسے زندگی سے مشروط رکھا، اور حکایات زندگی کو سمجھنے اور بیان کرنے میں مدد لی ــ یہ بات واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ کہ جب علامتی افسانے کا ذکر کیا جاتا ہے، تو بیشتر ایسے افسانے بھی سامنے آجاتے ہیں۔ جو فکری استغراق سے تہی اور علامتوں کے استعمال میں شعور و ادراک سے محروم ہوتے ہیں۔ ان میں تجربیت پسند EXPERIENTALIST اور عصری شعور سے بے بہرہ خود مرکزیت پسند SELF-CENTERED حیلہ باز EVASCONST اور داخلیت پسندی کے ایک مخصوص طبقے INTROVERT اور وہ سب شامل ہیں جن کے سامنے کوئی، مقصدِ حیات یا مطمع نظر نہیں ہوتا چنانچہ جب زندگی سے متعلق نئے افسانے کی بات کی جاتی ہے۔ تو ایسے افسانے از خود منہا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ افسانہ ہنر کاری یا لفظوں کی بازیگری یقیناً نہیں ہے۔ اور نہ ہی افسانہ نگار کو رسی پر چلنا ہوتا ہے۔ وہ تو زندگی کے پل صراط سے گزرتا ہے۔ جہاں ایک طرف خارجی سطح پر زندگی کی حقیقتیں ہوتی ہیں۔ اور دوسری طرف ان حقیقتوں کے مرتب ہوتے منفی یا مثبت اثرات اور خوف' اور جب یہ سب کچھ مزاحمت کا خوف بن کر اندر اتر جاتے ہیں تو ردعمل اندر پلنے لگتا ہے۔ یہ خوف کئی اشکال اور افعال کا خوف ہوتا ہے جیسے سیاسی رویوں سے جنم لینے والا خوف ــ جنسی ناآسودگی کا خوف، معاشی بدحالی کا خوف، معاشرتی ابتری کا خوف ــ حتیٰ کہ یہ خوف خوشیوں سے بھی جنم لے سکتا ہے ــ خواب کے لٹ جانے کا خوف ــ زندگی کے روٹھ جانے کا خوف، دولت کے لٹ جانے کا خوف ــ یہ خوف انسان کو اندر اترنے پر مجبور کرتا ہے ــ جتنا بڑا مقصد ہوگا، خوف کی ارفعیت اس سے قائم ہوتی چلی جائے گی۔ صوفی کا خوف، (کہ وہ خارج کو باطن سے دیکھتا ہے) خود مرکزیت کے شکار کے خوف سے الگ شناخت کرتا ہے۔ چنانچہ نئے افسانے میں داخلیت پسندی کئی سطحیں قائم کرتی ہے۔ لیکن نئے افسانے پر من حیث المجموع الزام عائد کیا جاتا ہے۔ کہ نیا افسانہ دروں بیں بلکہ گنبد بے در میں بیٹھے ہوئے شخص کا مونولاگ MONOLOGUE ہے ــ جس نے زندگی کی سبھی حقیقتوں سے قطع تعلق کر رکھا ہے ــ اور یہ شخص ترقی پسند افسانے کی بے رحمانہ حقیقت نگاری کے ردعمل کا شکار ہے۔

نئے افسانے کے داخلی رجحانات پر گفتگو میں محمد حسن عسکری کے درج ذیل اقتباس سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔

"پچھلے دس پندرہ برس سے اردو کے اکثر تنقیدی مضامین میں داخلیت کا ذکر اس طرح ہو رہا ہے جیسے یہ کسی بیماری کا نام ہے ــ جیسے بخار کا نام سن کے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مریض کا بدن جلتا ہوگا۔ آنکھیں لال ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح ہمارے بہت سے نقاد اس لفظ داخلیت کے ساتھ چند باتیں یوں منسوب کر دیتے ہیں۔ گویا یہ سب داخلیت کے انڈے بچے ہیں مثلاً (۱) آدمی اپنی ذات میں کھو گیا ہے۔ (۲) حقیقت سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اور یہ اپنے تصورات میں الجھ کے رہ گیا ہے (۳) دوسرے آدمیوں سے اس کا کوئی علاقہ نہیں رہا اور اس نے اپنی ایک خیالی دنیا بسا لی ہے (۴) وہ ایسا انفرادیت پسند بلکہ خود پرست بنا کہ سماجی شعور اسے حاصل نہ ہو سکا (۵) لہٰذا وہ انسانیت کا دشمن قرار پایا۔" [۲]

۲ ـ محمد حسن عسکری داخلیت پسندی مطبوعہ ستارہ اور بادبان مکتبہ سات رنگ کراچی ۲۶۲

اُردو کے علامتی افسانے پر بعض نقادوں نے اسی قسم کے الزامات عائد کیے تھے، جس کی طرف آج سے بائیس سال قبل محمد حسن عسکری نے اشارہ کیا تھا۔ میں نے ابھی یہ بات کہی تھی کہ نیا افسانہ کسی ردعمل کا ردعمل نہیں۔ یہ زندگی کی حقیقتوں سے تحریک حاصل کر کے وجود میں آیا ہے۔ اور مستثنیات کو چھوڑ کر من حیث المجموع علامتی افسانے نے زندگی کی حقیقتوں کے اظہار میں اپنے فرض منصبی کو پہچانا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے ایک مضمون میں مندرجہ ذیل تین باتیں کی ہیں۔

۱۔ "اسی اثنا میں ہمارے ہاں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا یعنی ملک کی سول حکومت ختم ہو گئی، اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اظہار کی آزادی جو حقیقی جمہوریت کی اولین شرط ہے، ہمارے معاشرے سے مفقود ہو گئی۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس سے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے خلاف ردّعمل کے اظہار کا موقع ہاتھ آیا۔" [۳]

۲۔ "ردعمل نے دو صورتیں پیدا کی ہیں۔ کہ حقیقت پسندی کے بجائے علامت نگاری کو پیرائیہ اظہار بنایا، اور دوسرے معاشرے کے مسائل کے اظہار کے بجائے عرفان ذات اور اس کے اظہار کو موضوع بنایا" [۴]

۳۔ "یہی ذات کا عرفان آج جدید افسانے کا بھوت بن گیا ہے جس نے اردو افسانے کو ایک دل دل میں پھنسا دیا ہے" [۵]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ باتیں ایک بحث میں کہیں، جس میں چند دوسرے لوگوں نے بھی حصہ لیا۔ انتظار حسین نے ڈاکٹر جالبی کی اس رائے کے بارے میں کہا:

"مجھے اب نہیں پہلے بھی کئی مرتبہ خیال آیا تھا۔ کہ اپنے دوست جمیل جالبی کی تنقیدی بصیرت سے فائدہ اٹھاؤں اور یہ پوچھوں کہ یہ منفی رجحان کیا ہوتا ہے؟ یہ منفی عجب لفظ ہے سیاسی اور قومی معاملات میں برسر اقتدار لوگ بھی اسے بہت استعمال کرتے ہیں۔ اور ترقی پسند حضرات بھی جب کسی کو سُولی پر چڑھاتے ہیں، تو یہی کہہ کر چڑھاتے ہیں کہ اس کا زندگی کے بارے میں منفی رویہ ہے۔" [۶]

ڈاکٹر انور سدید جو اس بحث میں شریک تھے، انھوں نے کہا کہ

"اردو افسانے میں علامت کا استعمال اچانک شروع نہیں ہوا بلکہ علامتی افسانے کا شانہ روایتی افسانے کے ساتھ ملا ہوا ہے چنانچہ ساتویں دہائی سے قبل احمد علی (میرا کمرہ) منٹو (پھندنے، ٹوبہ ٹیک سنگھ)، عزیز احمد (مدن سینا اور صدیاں) اختر اورینوی (کینچلیاں اور بال جبریل) کرشن چندر (غالچہ، سرائیکی تصویر)، ممتاز شریں (میگھ ملہار) نے متعدد اور زندہ علامتی افسانے لکھ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ

حقیقت کی تہہ در تہہ کیفیتوں کو پیش کرنے کے لیے ایک مؤثر وسیلہ ہے" [۷]

اے خیام کا کہنا ہے:

"نئی نسل اپنی ذمہ داریوں سے واقف ہے، اپنا کام خوب انجام دے رہی ہے، اس سے متعلق کسی اندیشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ----" [۸]

اس بحث کے آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحریک پر ڈاکٹر وزیر آغا کا استدلال بھی دیکھ لیجیے:

"اردو کے علامتی افسانے کو محض نقالی قرار دینے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے ان چند وجوہ کی نشان دہی کی ہے ---- مثلاً ایک یہ کہ اردو کا علامتی افسانہ ترقی پسند حقیقت نگاری کے انحراف کے عمل میں ظاہر ہوا۔ دوسری یہ کہ جب مارشل لا نافذ ہوا اور آزادی اظہار سلب ہو گئی، تو ہمارے افسانہ نگاروں نے علامتی افسانوں کے ذریعہ اظہار کا ایک بالواسطہ انداز اپنا لیا حیرت ہے کہ اتنی بڑی بڑی وجوہات کا اقرار کرنے کے باوجود وہ اسے مغرب کی نقالی بھی قرار دیتے ہیں؟" [۹]

۳۔۴۔۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "سوال یہ ہے" علامتی افسانہ ایک منفی رجحان مطبوعہ اوراق خاص نمبر مارچ ۸۴ صفحہ ۱۱۔
۶۔ انتظار حسین ایضاً۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ایضاً۔

"دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جدید علامتی افسانے میں ترسیل اور ابلاغ کا عمل ناقص ہے۔ مجھے اس بات سے بھی اتفاق نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جدید علامتی افسانے نے نہایت نازک اور لطیف نفسی کیفیات اور معانی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے ۔۔۔۔ دوسری طرف علامتی افسانے نے خود کو حقیقت سے منقطع نہیں کیا تاہم وہ خود کو حقیقت کی محض بالائی سطح تک محدود نہیں رکھتا" ۱۰

ڈاکٹر جمیل جالبی کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب اسی بحث میں مل گیا۔ مگر اب بھی داخلیت پسندی اور عرفان ذات کی بحث سے گریز کرتے ہوئے ان حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جو علامتی افسانے میں موجود ہے، یا جس کے سبب جدید افسانے پر الزامات عاید کیے جاتے ہیں۔ یہ بات اولین سطح پر بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ ۶۰ء کی علامتی افسانے کی تحریک یا رجحان منشوری تحریک نہ تھی اور نہ اس کے پس منظر میں کوئی فکری اکائی تھی بلکہ مختلف الخیال افسانہ نگاروں کی فکری رو ایک نقطے پر ارتکاز کر گئی تھی اور وہ نقطہ وہی ہے، جس کی طرف ڈاکٹر جمیل جالبی نے اشارہ کیا ہے۔ "آزادی اظہار کی سلبی" زندگی کے بڑھتے ہوئے مسائل، سیاسی معاشی اور معاشرتی عدم استحکام عدم تحفظ اور روح کی بے چینی۔ یہی سارے مسائل، ۶۰ء کے افسانے میں بھی نظر آتے ہیں۔ ۷۰ء میں بھی اور ۸۰ء میں بھی جب کہ حکومتیں بدلیں، سول حکومت بھی آئی، مگر قومی حالات میں تبدیلی نہ ہونے کے سبب فکری رو میں تواتر اور تسلسل برقرار ہے۔ ۶۰ء کی دہائی میں اور بعد میں بھی ایسے افسانہ نگار بھی موجود تھے جنھیں عصری مسائل سے کم تر دلچسپی تھی وہ گوتم کے نروان کی تلاش اور عرفان ذات کا سفر طے کرتے رہے۔ رطب و یابس بھی سامنے آیا۔۔۔ داخلیت اور خود بینی رومانیت پسندوں کی ایک اہم خصوصیت ہے لیکن اردو کے رومانیت پسندوں میں سے بہت کم لوگ اس سطح کو چھو پاتے ہیں جو ورڈز ورتھ کی THE PRELUDE کو حاصل تھی روح اور فطرت کے مابین ہم آہنگی کی تلاش کا تجسس ہی مفقود ہے، جو رومانیت یا داخلیت کے مغربی تصوّر کا طرّہ امتیاز ہے۔

مشرقی داخلیت پسندی مغرب کی داخلیت پسندی کی شعوری تحریک سے بالکل جداگانہ منطق رکھتی ہے۔ صوفی ذات میں عکس کائنات اور خالق کائنات کو ڈھونڈتا ہے اس کا عرفان ذات ذات کی نفی سے شروع ہوتا ہے۔ اور مغرب کا عرفان ذات خفقان سے آغاز پاتا ہے بلیک، کولنز، کوپر، ایذرا پونڈ، جیرالڈ ی نروال اس کی بہترین مثالیں ہیں اور مادھو شاہ حسین، سلطان باہو، سچل سرمست، شاہ لطیف، رحمان بابا، بلّے شاہ اور خواجہ فرید عرفان ذات کے سفر کی ایسی مثالیں ہیں جن کا سفر ذات سے کائنات اور کائنات سے خالق کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔ داخلیت کا دوسرا پہلو حسن کا ادراک بھی ہے لیکن خود داخلیت کا یہ پہلو داخلیت محض کی نفی پر استوار ہوتا ہے داخلیت کا عنصر معلوم سے نامعلوم کی جستجو سے بھی عبادت ہوتا ہے چنانچہ داخلیت کا صوفیانہ تجربہ لامحدود وحدت میں تجسس جز کے لیے مضطرب کرتا ہے اور اردو کے افسانے میں جہاں گنبد بے در میں قید ذات کی باتیں موجود ہیں وہیں درون بینی کا یہ عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔ روسو یورپ میں رومانیت کے آغاز کرنے والوں میں اول تھا کہتا ہے۔

"وہ چیز جو مجھ سے باہر ہے مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ۔۔۔۔۔ مجھے اپنی انا کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں" ۱۱

جنکو لیورن JANCO LAURONE روسو کے اقتباس سے اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہے۔

"اقتصادی افراتفری اور سماجی تخریب کے ادوار میں ایسے افراد پیش پیش ہوتے ہیں جو اپنے ماحول کو قبول نہیں کرتے۔ ماحول کو قبول نہ کرنے کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں جدوجہد اور ناموافق حالات سے مقابلے کی سکت نہیں ہوتی۔ دوسری وہ اپنے ماحول سے مطابقت کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔۔۔ خیالی یا جذباتی نعم البدل بنا لیتے ہیں۔ ان کا اثر ایسا ہوتا ہے جیسے منشیات کا" ۱۲

۱۰۔ ایضاً۔ ۱۱۔ رومانیت کیا ہے از جینکو لیورن ترجمہ یوسف زاہد طبع کلاسیکیت اور رومانیت صفحہ ۸۔

۱۲۔ ایضاً صفحہ ۸۲۔

درج بالا انفعالی داخلیت کے علاوہ جینگ ایک تیسری قسم بھی بیان کرتے ہیں۔ اور یہ طبقہ ان داخلیت پسندوں کا ہے جن کا رشتہ زندگی سے نہیں ٹوٹتا وہ زندگی سے بغاوت کی جرأت رکھتے ہیں اور ان کے بس میں آنے والی ہر شے کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ مگر ان کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ داخلیت پسند کی انا کے سبب ہوتا ہے۔ وہ اپنی انا کو کھینچ کر اتنا بلند کر لیتے ہیں کہ باقی چیزیں انھیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ انفعالی داخلیت پسندوں کی نسبت کہ جو زندگی کی متحرک قدروں سے دور چلے جاتے ہیں۔ فعالی داخلیت پسند سماج سے رشتہ نہیں توڑتا اس کی انا پرستی کے باوجود وہ معاشرے کے لیے ایک نہایت مفید رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامتی افسانے نے داخلیت کے اسی فعالی کردار کو اپنایا ہے۔ جو جینگ و لیورن کے نزدیک تعمیری جذبے سے استاخیز ہے۔ پروفیسر نذیر احمد کہتے ہیں۔

"علامت نگاری ذات کے خول میں بند ہونے کا ذریعہ ہے نہ اس کا مطلب معاشرے اور اجتماعی مسائل سے منقطع ہوتا ہے۔ افسانے میں علامت نگاری کی جدید روایت داخلیت اور خارجیت کے متضاد عناصر کو مجتمع کر کے انسانی، ملکی، معاشرتی اور تہذیبی نوعیت کے علامتی مفہوم کے ابلاغ کی خوشگوار روایت اور اس لحاظ سے قابل تحسین ہے"۔[۱۳]

جدید نفسیات نے علامتوں کو دیکھنے کا ایک نہایت وسیع تناظر دیا ہے اور اس وسعت کے پیچھے جدید علوم کی مشارکت لاشعوری سطح پر علامت کاری میں مددگار بن رہی ہے۔ آج کے ادیب کے سامنے پوری انسانی تاریخ اپنے پورے نشیب و فراز کے ساتھ موجود ہے۔ حجری دور کی پتھر کی چٹانوں سے جھٹی گائے سے لے کر حمورابی کے پہلے منشورِ انسانیت اور یونان کی حکمت و علم سے لے کر مذاہب کے بامِ ثریا تک، بھوکے شیروں کے آگے ڈالے جانے والے مظلوم انسانوں کی چیخوں سے ناگاساکی اور ہیروشیما میں چپ چاپ مر جانے والے لاکھوں انسانوں تک۔ چنانچہ جہاں افسانہ نگار کو جدید علوم نے چاند گاڑی سے پرشنگ میزائل تک اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، وہیں علامت کی تشکیل کرتے ہوئے قدیم صوفیا کے کردار، اساطیر، حکایت، تاریخی تمثیلیں اور داستانیں بھی اس کے ذہن کے نہاں خانوں سے پس منظر کا کام دیتی ہیں۔ خارجی عناصر سے ابھرنے والی علامتوں سے لے کر تاریخی ورثہ سے بولنے والی علامتوں تک اظہار کا سارا عمل اس کے اندر پکتا ہے۔ اب افسانہ نگار خارج کے عمل کو تجربہ بنائے بغیر خارج میں انڈیل نہیں دیتا۔ ذات میں اتارتا ہے۔ ذات بناتا ہے۔ خارج کی واردات کو روح کی واردات میں ڈھال کر تجربہ بناتا ہے۔ اب خارج کو دیکھنے کے لیے خارج کی آنکھیں کافی نہیں۔

"باہر سے اندر جھانکنے والوں کو اتنا ہی دکھائی دیتا ہے جتنا کہ آنکھ احاطہ کر سکتی ہے۔ مگر ہر آنکھ کے پیچھے ایک اور آنکھ ہوتی ہے۔ جو اس سے زیادہ دیکھتی ہے جتنا کہ نظر آتا ہے"۔[۱۴]

علامتی افسانہ نگار کہانی بنانے میں ان دونوں آنکھوں سے کام لیتا ہے نئے افسانہ نگار کی دوسری آنکھ انکشاف ذات تک محدود نہیں (اگرچہ انکشافِ ذات بھی انکشافِ کائنات سے عبارت ہے۔) بلکہ اس کے مخرج نے پورے عصر کو فوکس کر رکھا ہے۔ یہ دروں بینی اور داخل کا انکشاف اصلاً عصری انتشار، گھٹن اور خوف سے پیدا ہونے والی بیزاری کا اظہار ہے لاتعلق اور فراریت کا نہیں، کہ لاتعلقی اور فراریت جن عوامل کو جنم دیتی ہے وہاں پہنچ کر "ایک اور آنکھ" کا وہ تصور ختم ہو جاتا ہے۔ جو علامتی افسانے میں بھرپور شخص کے ساتھ موجود ہے۔ افسانے میں ذہنی انتشار، بکھری غیر مربوط زندگی کی پورٹریٹ، لفظیات کا ابہام (جیسے ذات میں بند شخص کا مونولاگ کہا گیا ہے) اصل میں معاشرے کی ابتری کے سوا کچھ نہیں۔ اگر معاشرتی زندگی غیر مربوط ہے اور عدم تحفظ اور انتشار کا شکار ہے تو زندگی کا ربط افسانے سے کیسے واضح ہو سکتا ہے۔ جوگندر پال نے مناظر عاشق ہرگانوی کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک جملہ اس صورت حال کی وضاحت کے لیے بھی کہا ہے۔

"اچھا ادب زندگی میں بھرپور شرکت کے اسباب پر اصرار کرتا ہے"۔[۱۵]

۱۴- احمد جاوید باہر والی آنکھ (افسانہ) طبع غیر علامتی کہانی خالدین لاہور صفحہ ۴۳ - ۱۳- نذیر احمد جدید اردو افسانے میں علامت نگاری کا تنوع طبع سیپ کراچی نمبر ۳۶ صفحہ ۲۳۶ - ۱۵- طبع جدید ادب رحیم یار خاں مارچ ۸۳ صفحہ ۸۸ -

زندگی کے جس روپ رنگ میں ہوگی ادب اسے اسی طرح پیش کرے گا۔ چنانچہ داخل کا اپنا انتشار کوئی شے نہیں اس کا انتشار اور سکون اور سکوت خارج سے مربوط ہے۔ خارج اور داخل دو آنکھیں اور دو جہان ہیں، جو تجربوں کو چھلکے اور مغز ہر دو سطحوں پر دیکھ کر، دونوں کو ایک تجزیاتی سطح پر پرکھ کر ابھارتے ہیں۔ یونگ کے آرکی ٹائپ اجتماعی لاشعور اور تاریخی وراثت کی باطنی اشکال اس کا ثبوت ہے۔ لہٰذا داخلیت کی ترتیب خارج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی اثباتیت ہوتی ہے۔ اور مختلف اشکال اور زاویوں میں انھیں پنپنے کا موقع ملتا ہے اور جب عصری حیثیت اور پہلے سے موجود واردہ کسی واقعے کو اظہار کی سطح پر لاتے ہیں، تو داخلیت کی مرتب علامتیں موجود واردہ کا روپ اختیار کرلیتی ہیں۔ اس طرح علامتی افسانے میں داخل اور خارج یکساں تخلیقی عمل کو مہمیز لگاتے ہیں۔ علامت میں بڑی کہانی خارجیت کو منہا کر کے نہیں بنائی جاسکتی کہ داخلیت کا حصار انسانی انسلاک اور سماجی انساب سے قطع نہیں ہوتا۔ یہ رشتے داخلیت میں اتنی مضبوط جڑیں پھیلائے ہوئے ہیں کہ انہیں نکال باہر پھینکنا کسی طور ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ آج کے انسان کا تنہائی کا کرب، تنہائی کے ان معنوں کی نیابت نہیں کرتا۔ جو لغت میں برسوں قبل درج ہوئے تھے، یہ مشین کی تیزی اور پہیے کی رفتار سے ابھرتے اس دھویں اور دھند کی عطا ہے۔ جس نے ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ کیا ہے۔ یہ تنہائی کی مابعد الطبیعاتی صورت نہیں، ٹھوس معروضی حالات سے ابھرتی تشکیک ہے۔ جب ایک آگے اور ایک پیچھے رہ جائے تو COMMUNICATION GAP فطری عمل کے طور پر ابھرتا ہے لیکن COMMUNICATION GAP رشتوں اور تعلقوں کو نیست نہیں کر سکتا ہے۔؟

○ میں ہوں کہ زمین اور آسمان کے درمیان ستون ہوں میں ہوں کہ چلتا ہوا گھروں کی دہلیز پہ دم توڑتا ہوں کہ پھر جنم لیتا ہوں اور آسمان کو اٹھتا ہوں، کتنا خوبصورت چکر ہے۔ سب بکواس ہے۔ میری آنکھوں میں تو کیکر کے درخت کی سبزی ہے۔ اور میں اس لیے ہوں کہ زمین کو چاٹتے سفید پھولوں کو دیکھتا ہوں۔ اور ان سے جنگ کرتا ہوں۔ میرے جسم پر زبانوں کے زخم ہیں [۱۶]

○ اس پر میں نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دریا پر پھیلے آسمان کو دیکھا۔ اندھیرا خوب سا گہرا ہو چکا تھا، اور سڑکوں کی زرد سی بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ سوائے ان کے سفید سفید کپڑوں یا پھر ان کے دھندلے چہروں کے" [۱۷]

○ تاریکی کے غبار میں جب خواب، بے خوابی کے پہلے دور سے لوٹے تو میں نے ہڑبڑا کر کروٹ لی، میرے صوفوں، پلنگوں اور قالینوں پر بیٹھے، پنجوں میں سر دیئے کتنے یک دم اٹھ کھڑے ہوئے، بلا تکان بھونکتے، غراتے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ غیر واضح مبہم گھر کے افراد کے ہیولے اسی قبر کی مٹی سے اُگ رہے تھے کہ جسکی گواہی ہم سب دیتے آئے تھے" [۱۸]

○ صاحب ایک بات پوچھوں!

پوچھو!

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہتا ہے پھر کہتا ہے آپ کا گھر کہاں ہے؟

میں نفی میں سر ہلاتا ہوں

کسی دوسرے شہر میں؟

میں پھر نفی میں سر ہلاتا ہوں

کہیں بھی نہیں؟ وہ بے یقینی سے کہتا ہے آپ کے رشتہ دار تو ہوں گے کہیں نہ کہیں؟

کوئی بھی نہیں۔ وہ حیرت کی بھٹی میں پھر ٹھہراتا ہے"؟ [۱۹]

۱۶۔ انور سجاد کیکر مطبوعہ مجموعہ استعارے صفحہ ۱۴۷

۱۷۔ خالدہ حسین سواری مطبوعہ مجموعہ پہچان صفحہ ۶۹

۱۸۔ سمیع آہوجہ جہنم میں سفر ۱۰۵۔ ۱۹۔ رشید امجد جلاوطن طبع بے زار آدم کے بیٹے صفحہ ۱۴۷۔

○ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہر چیز کہ میلی سی بہار سی روشن تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ (کہ دیکھنے والی آنکھ جو نہ تھی) کمرے میں غراہٹیں بھی تھیں مگر آواز نہ تھی۔" [20]

○ "...... وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا میں کون ہوں
میں کون ہوں اس سوال نے اسے بہت گڑبڑایا۔ اس نے یہ طے کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ کون ہے۔ لیکن وہ یہ طے نہ کر سکا کہ وہ کون ہے ...... میں
جو کوئی بھی میں ہوں۔ میں ہوں" [21]

پیکروں کے ذریعہ تخیل کی بجائے تعلقی سطح پر خود ہر سوال سماجی حوالے کے ساتھ تعبیرات و انسلاکات کا وسیع تناظر نئے افسانے کی قدر مشترک ہے۔ میں کون ہوں؟ اس وقت سوال بنتا ہے جب وہ کون ہے؟ سامنے آتا ہے۔ نئے افسانے میں تنہائی کا آفاق پوری سماجی تصورات CONCEPTION میں فرد کی تنہائی کا نہیں معاشرے کے شیرازے اور شکست و ریخت کا المیاتی وظیفہ ہے۔ اگرچہ مختصر اقتباسات افسانے کی کلیت کی توضیح نہیں کرتے۔ مگر رویے کا استعاراتی ادراک اور پیکری اظہاریت کی اکائی نئے افسانے میں باہم مربوط اور مشترک فکری رو کا پتہ دیتی ہے۔ علامتی افسانے پر جدید نفسیات کے اثرات نمایاں ہیں۔ نقطہ اثبات میں نے دانستہ استعمال کیا ہے۔ تاکہ نفسیاتی دروبست میں کھلنے والے افسانوں کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

فرائڈ کہتا ہے کہ انسان کی دبی ہوئی خواہشات کبھی کبھی ایسا راستہ اختیار کر لیتی ہیں جو سماج کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ خواہشات کا یہ بہاؤ چونکہ اخلاقی عنصر کے منافی نہیں ہوتا، اس لیے سماجی اور اجتماعی زندگی کے لیے قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ خواہشات کے بہاؤ کے ارتفع میلان میں ادب بھی ارتفاع کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ دبی ہوئی یہ خواہشات سماج سے مطابقت رکھتے زاویوں میں بھیس بدل کر مختلف علامتوں، پیکروں میں وارد ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس سے ایک طرف لکھنے والا تسکین حاصل کرتا ہے، کہ وہ ان جذبوں کا اظہار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جسے برہنہ شکل میں معاشرہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، تو دوسری طرف معاشرتی مقصد کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے۔ جدید علامتی افسانے میں علامتوں کی تشریح میں نفسیات کے اس رخ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور نفسیات کی مختلف شاخوں کے حوالے سے اردو افسانے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے قبل کہ میں نفسیات کے مختلف نظریات کا ذکر کروں، میں اپنی اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ جدید نفسیات نے بیسویں صدی میں ادب پر یلغار کی ہے، جب کہ اساطیر، داستانوں اور حکایتوں اور صوفیا کے ملفوظات کے آثار صدیوں سے موجود ہیں۔

بیسویں صدی کی تنقید میں جن نظریات کو تجزیہ و تفسیر کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس میں چند نفسیاتی دبستان سے تعلق رکھنے والے نظریات بھی تھے۔ اور علامتی افسانے کی تاریخی توصیف میں ان کا ذکر آیا ہے۔ بیسویں صدی کے ادب کا جائزہ لیں، تو کہیں شعوری اور کہیں لاشعوری طور پر ایسے نظریے نظر آتے ہیں۔ جن کی بازگشت اردو افسانے میں سنائی دیتی ہے۔ نفسیات کے جن پہلوؤں نے اردو افسانے کو متاثر کیا ان میں علامتیت SYMBOLISM اظہاریت EXPRESSIONISM وجودیت EXISTENTIALISM اور سرریلزم SURREALISM خاصے نمایاں ہیں اور وسیع تناظر میں اظہاریت، وجودیت اور سرریلزم مختلف منطقوں میں ہونے کے باوصف ایک دوسرے سے علامتیت کے ذریعہ مربوط دکھائی دیتی ہیں۔ اظہاریت اصلاً ایسی ذہنی کیفیات اور تصورات کی نیابت کرتی ہے، جو اظہاریت پسند کو حقیقت اور حقیقی زندگی سے دور لے جاتے ہیں۔ وہ ایسے تصورات میں زندہ رہتا ہے جو خوابِ بیداری سے اوپر نہیں اٹھنے دیتے۔ جبکہ سرریلزم میں ادیب خارج کی دنیا سے رشتہ توڑ کر لاشعور کے آفاق میں گم ہو جاتا ہے۔

۲۰۔ احمد جاوید باہر والی آنکھ از طبع غیر علامتی کہانی صفحہ ۵۰۔
۲۱۔ انتظار حسین شانگیں طبع آخری آدمی صفحہ ۱۲۷۔

جس کے سبب وہ سماجی زندگی سے کٹ کر تنہا رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے لاشعور سے اپنے موضوعات تلاش کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے کسی سماجی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اور دوسری طرف تہذیبی، ثقافتی اور سماجی روحانی ورثہ کو رد کر دیتا ہے، اسے بورژوا قرار دیتا ہے۔ وہ فطرت کی مکمل تصویر کے اجزا کو یوں الگ کر کے دیکھتا ہے کہ اصل شکل تک مسخ ہو کر جمالیاتی تاثر کھو دیتی ہے۔

وجودی نظریے کے مطابق تاریخ انسانی پہلے سے موجود نہیں۔ بلکہ انسان خود اپنے ارادوں اور فیصلوں سے اس کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان بالکل آزاد پیدا ہوا اور اسے اپنی زندگی پر مکمل اختیار ہے وہ خارجی دباؤ یا اقدار کے تحت نہیں بلکہ اسے اپنے فیصلے خود کرنے ہیں۔ نفسیات نے دروں بینی کے سفر کو آسان کیا ہے۔ شعور کی رو STREAM OF CONSCIOUSNESS کی تکنیک اردو افسانے میں ۳۰ء کے بعد آ گئی تھی۔ اور اسے احمد علی نے اول اول برتا اور اس کے بعد محمد حسن عسکری اور عزیز احمد نے اپنے افسانوں میں اظہار کیا۔ نئے افسانے نے نفسیات کی اس تکنیک کو استعمال کر کے اختصار و ایجاز کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔

داخلیت کو حقیقت پسندی سے انکار نہیں ہے۔ مگر وہ حقیقت کے اس رویہ کی منکر ہے۔ جو چیزوں کو بے نقاب اور برہنہ کر دیتا ہے۔ حقیقت پسندوں کے لیے داخلیت کا یہی پہلو ناپسندیدہ ہے کہ یہ حقیقت کو بھی آنالیبٹ کر شوگر کوٹڈ کر کے پیش کرتی ہے۔ کہ حقیقت کی حقیقت گم ہو کر رہ جاتی ہے چنانچہ روایتی افسانہ نگار کا علامتی افسانے کو رد کرنے کا میلان عمومی طور پر ان ہی اعتراضات پر قائم ہے۔ کہ داخلیت چیزوں کو DESHAPE کر دیتی ہے۔ اصل کو چھپا دیتی ہے۔

علامتی افسانے کی تردید میں ایک دلیل یہ بھی آتی رہی ہے کہ اس نے حقیقت حال سے گریزپائی اور ذات کے اندھیروں میں اترنے کو ترجیح دی۔ علامتی افسانہ ان اعتراضات کی نفی کرتا ہے۔ اردو افسانہ شاید اردو کی تمام اصناف میں واحد صیغہ ہے۔ جس نے آغاز میں ہی زندگی سے گہرا رشتہ استوار کر لیا تھا۔ اسے غزل کی طرح نہ تو "دربار کی لونڈی" بننے کا شرف حاصل ہوا اور نہ ہی اس نے نظم کی طرح "فطرت پرستی" سے آغاز پایا اور نہ اسے تنقید کی طرح بیرونی نظریات، تحریک اور اصطلاحات کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھ کھولی تو اس کے سامنے زندگی تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں اردو افسانے میں کئی رجحانات ابھرے، کئی نظریات اور تحاریک پیدا ہوئیں، مگر زندگی اور افسانے کا رشتہ ہر دور میں مضبوط تر ہوا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری ہو یا راشد الخیری کی اصلاحی سماجیات یلدرم کی رومانیت ہو یا نگارے کی جدید نفسیات، ترقی پسند تحریک سے منسلک افسانہ ہو یا اس کے ردعمل میں لکھا جانے والا افسانہ، یہ صنف ایسی تھی، جسے زندگی سے کبھی کاٹا نہیں جا سکا۔

اردو افسانے نے فکری و اسلوبیاتی کئی موڑ کاٹے، اور ہر نیا سفر آگے کی سمت تھا اور اس کا آخری روپ علامتی کہانی کا روپ ہے۔ جو کئی اعتبار سے حقیقت پسند افسانے کی فکری توسیع ہے۔ توسیع اس لحاظ سے کہ اردو افسانہ حقیقت کی راہ گزاروں پر ہمیشہ گامزن رہا ہے۔ حقیقت پسندی کا ایک تصور پریم چند کے ذریعہ ابھرتا ہے۔ جو بقول پروفیسر عتیق اللہ

"احتساب تھا لیکن محدود۔ احتجاج تھا مگر مشروط (اور) بغاوت تھی مگر محفوظ۔۔۔ وہ کردار جو یلدرم، نیاز فتحپوری کے ہاں فلسفے کی نقاب میں اوڑھ کر خود اپنے ہی مذاق طرب آگیں کے شکار تھے، پریم چند کے یہاں ارضی صلاحیت اور ارضی لمس کے متحمل ہو جاتے ہیں۔" ۲۲

حیات اللہ انصاری، اپندر ناتھ اشک وغیرہ نے حقیقت پسندی کے تصور کو وسیع کرنے کی کوشش کی اور انقلاب کی روش کو نفسیاتی حقیقت نگاری کی آمیزش بخشی۔ موضوع کی محدودیت کو زندگی کے بعض نازک مسائل تک پھیلایا۔ کرشن چندر کی حقیقت نگاری میں رومانیت کی بوباس کرداروں کی تحلیل نفسی اور دروں بینی کی صلاحیت سے خیز تھی۔ منٹو کی حقیقت نگاری بے رحمانہ صداقت اظہار کی نیابت کرتی تھی۔ اس نے کرداروں کو ان کے پیشوں بدکرداریوں کمزوریوں سمیت پیش کیا، لیکن انھیں بنیادی انسانی مقام سے

۲۲۔ اردو افسانے میں حقیقت کا عمل از پروفیسر عتیق اللہ مطبوعہ عصری آگہی افسانہ نمبر دلی۔

سرفراز کیا، جو ان سے قبل کے افسانہ نگار نہ دے سکے تھے۔ منٹو کے ہاں حقیقت پسندی اور نیا اسلوبیاتی تنوع زیادہ فعال اور نمایاں ہوا۔ بیدی کی حقیقت نگاری ناگفتہ نافصوص انداز میں رگ و ریشہ میں اتر تی نئے حقیقت [illegible] دیتی ہے۔

حقیقت پسندی کا نیا انداز پاکستان کی تشکیل کے بعد ابھرا۔ احمد ندیم قاسمی کے حقیقت پسندانہ رویے دیہاتی زندگی کے در و بست میں نئی روا کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ جاگیردارانہ سماج کی جبریت سماج کے ایک اہم [illegible] حصہ پر گرفت کا اظہار سماجی حقیقت پسندی کے نئے روپ کا تعین کرتا ہے۔ اس رو کو نئے لکھنے والوں نے خوب اپنایا۔ جاگیردارانہ اجارہ داریت کے خلاف ردعمل کو ڈرامے، تھیٹر اور بعدازاں فلم نے اپنا لیا۔[23]

پاکستان کی تخلیق کے بعد ایک نیا رویہ ابھرا ہے۔ جسے پروفیسر عتیق اللہ حقیقت کے باطنی اور روحانی تجربہ سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس رویہ کی ابتدا انتظار حسین سے ہوتی ہے جو اخلاقی زوال ان کا موضوع اور داہام سے بھری دنیا ان کا نئی انکشافات تھی۔ جدید علامتی کہانی اور روایتی کہانی کے درمیان کھڑے جوگندر پال، رام لعل، انور عظیم، اقبال متین، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، بلراج کومل، احمد شریف، اور پھر دما آگے مین را، سریندر پرکاش، احمد یوسف، کلام حیدری، خالدہ حسین، حمید سہروردی کی حقیقت کی تفہیم داخلیت کی رواں میں منکشف ہوتی ہے۔ انور سجاد، رشید امجد، منشا یاد، مسعود اشعر، سمیع آہوجہ، قمر عباس ندیم، احمد داؤد، احمد جاوید اور منصور قیصر کی حقیقت نگاری ذات و کائنات کے نئے شعور کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔ شہری زندگی کی کشاکش، صنعتی تضادات سے ابھرتے بحران شکست و ریخت میں مبتلا معاشرے میں بکھرتے رشتوں کی نئی کشمکش، سیاسی استبدادیت اور جبریہ عناصر مرتب ہوتے مسائل کی بازگشت حقیقت پسندی کی مضبوط روایت علامتی افسانے کا پس منظر بنتے ہیں۔

چھٹی دہائی میں حقیقت نگاری کا کردار ان گھمبیر حالات سے جنم لیتا ہے۔

- انچارج کی تیز زبان اسے کاٹتی ہے۔ ماں بہن کی گالیاں۔ ماں بیوی کے سر زمین پر [illegible] نہیں پاتے۔ انچارج کے اشارے پر ایک سیاہ پوش کونے میں پڑے کڑوے تیل میں ڈوبا ہوا کوڑا نکالتا ہے، وہ بڑھ کر اسے گھسیٹ کے تاریک کوٹھری کے جنگلے کے ساتھ اس کی کلائیاں اور پیر باندھ دیتے ہیں۔ جیسے مسیح کو سولی پر باندھا گیا۔“[24]
- خوف اور اذیت کا یہ کھیل اب دن کی روشنی میں اپنی پہچان کرانے لگا ہے سو اس کا جسم اب دن کو بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وہ جب اسے پکڑنا چاہتا ہے۔ تو جسم ہاتھ پکڑ کر اسے پرے کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔ مجھے زندہ رہنا ہے اور زندہ رہنے کے لیے مجھے وہی کچھ کرنا پڑے گا جو دوسرے کرتے ہیں ورنہ تم ہی کوئی راستہ بتاؤ۔“[25]
- کام کرتے کرتے اس نے اردگرد نگاہ ڈالی اور حیران ہوا۔ مسلسل دھوپ اور شدید گرمی کی وجہ سے درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے اور بے سایہ ہو گئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ دیواریں پھاند کر سائٹ آفس، سٹور اور زیر تعمیر عمارت کے اندر گھسنے لگی۔ اسے باپ کی میت کا خیال آیا۔ وہ آتی بار اس کی چارپائی گھسیٹ کر آیا تھا۔ لیکن کیا پتہ۔ اس نے سوچا دھوپ برآمدے کی راہ کمرے میں گھس گئی ہو۔ مگر اسے کم از کم نصف دیہاڑی ضرور مکمل کر لینی چاہیے۔“[26]
- یہاں گھروں میں چولہے بھی روشن نہ ہوتے تھے۔ اس شہر کی چکاچوند کا عادی ہونے کے بعد حسین نے غور کیا، تو تمام اہل شہر کے چہرے زرد بالکل زرد تھے۔ قدیم چوغے لباس ان میں ان کے جسم ڈھانچوں کی طرح کھڑکھڑاتے۔ مگر

۲۳۔ ایضاً صفحہ ۴۷۔

۲۴۔ انور سجاد کونپل طبع استعارے (مجموعہ) صفحہ ۱۹۷۔

۲۵۔ رشید امجد۔ ۸ + ۹، لمحے بیت پرگرفت، صفحہ ۱۲

۲۶۔ دھوپ دھوپ محمد نثار احمد۔

میں خود بھی تو ایسا ہی تھا۔" ۲۷ء

○ "ہم سب" وہ زہر آمیز ہنسی میں ہنسا ہم سب کیا ہیں ہم سب کون ہیں پتلیاں محض پتلیاں۔ لیکن رسی کون چلا رہا ہے۔ اس کی آواز کمزور ہو گئی"

"کون جانے اس ٹھٹھرا دینے والی سردی سے بچنے کے لیے آگ چرانے کے جرم میں ہم کب تک اندھے کنوئیں میں لٹکے رہیں گے۔ کہ رسی ہلانے والا یہی چاہتا ہے۔ لیکن کب تک۔ آخر کب تک ـــــ" ۲۸ء

○ "کوئی کیا سنے۔ روشن دان کھلے ہیں، جس سے جھانکا جا سکتا ہے۔ نکلا نہیں جا سکتا۔ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں تو بند ہیں۔ کوئی کیا نکلے۔ آسمان کے بیچوں بیچ درختوں کی شاخوں کے پتے نہیں۔ ہوا چلتی ہے۔ مگر لو کا عالم ہے۔ لو کا عالم ہے۔ اندر رہنا ممکن نہیں۔ باہر نکلنا بھی دشوار۔ کوئی کیا نکلے۔ کوئی کیا دیکھے کوئی کیا سنے"! ۲۹ء

○ وہ ایک چیخ تھی۔ دل دوز، کربناک۔ مگر کربناکی تو صفت ہے، صورت نہیں۔ وہ ایک روح تھی۔۔۔۔۔ مگر وہ متحرک تھی مردہ نہیں تھی۔ یا شاید وہ ایک قہقہہ تھا، جو طاقت کے بربریت بننے کا مظہر تھا۔" ۳۰ء

○ "دہلیز کے سوراخ میں سانپ چھپا بیٹھا ہے"
باہر نکلنے کے راستے بند ہیں،
کھڑکی کی سلاخوں سے صرف ہاتھ باہر نکل سکتا ہے آدمی نہیں"
"جون بدلنی پڑے گی"
"اگر جون بدلی جائے، تو کون سی جنس مناسب رہے گی"
"بلی"
"نن ۔۔۔ نہیں ـــ گلی میں بو سونگھتا گلیڑیا چھپٹ پڑے گا" ۳۱ء

○ "یہ وہی دن تھا جب کھانوں کے لیے زنجیر لائی گئی"
"کھانوں کیا یہ زنجیر تمہارے پاؤں میں ڈال دیں"؟
"میں کوئی جنور تے نئیں"؟
۔۔۔۔ "مسلسل فاقوں سے کھانوں کا وزن کم ہونے لگا۔ اس کے بدن کی سیاہ زمین میں دراڑیں پڑ گئیں۔ آنکھوں کی پھرکیوں کی حرکت مدھم ہونے لگی۔۔۔۔۔ ایک روز کھانوں نے اپنی اصل ٹانگ ہلائی، زنجیر جو ہمیشہ پنڈلیوں سے اوپر پھنسی رہتی تھی، ایک جھٹکے سے ٹخنوں پر آ گری" ۳۲ء

تیزی سے بدلتی صورت حال میں حقیقت کی یہ بے رحمانہ تصویریں نئے حقیقت پسند رویے کی واضح روایت قائم کرتی ہیں۔ لیکن جدید اور روایتی افسانے کے مابین حقیقت نگاری کا تصوّر CONCEPTION داخلی اور خارجی دونوں سطح کو متحرک رکھتا ہے۔ ان دونوں میں ایک اور فرق بھی ہے۔ کہ پہلا افسانہ واقعیت کو ذات کا تجربہ بنانے سے گریز کرتا تھا۔ جب کہ نئے افسانے کا سارا کھیل ادیب کے احساس

۲۷۔ دروازہ از خالدہ حسین طبع دروازہ صفحہ ۱۴۴۔ ۲۸۔ سہیم اعجاز راہی مطبوعہ گواہی عوامی دارالاشاعت کراچی ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۹
۲۹۔ سن توصیم از احمد جاوید طبع گواہی صفحہ ۹۔
۳۰۔ چیخ کا چہرہ از قمر عباس ندیم طبع بہترین نئی کہانیاں صفحہ ۱۴۶۔
۳۱۔ احمد داؤد افسانہ گل گامش طبع دشمن دار آدمی ۱۹۸۳ء صفحہ ۹۱۔
۳۲۔ مستنصر حسین تارڑ کوٹ مراد طبع منتخب افسانے ۸۴-۱۹۸۳ء مطبوعاتِ حرمت صفحہ ۱۷۲۔

کی تاروں پر کھیلا جاتا ہے۔

(۳)

نئے افسانے میں ایک احساس نمایاں ہے جو تہذیبی سالمیت کے ٹوٹنے سے پیدا ہوا ہے۔ شہری زندگی میں گھٹتے ہوئے سماج کو بکھرنے ریزہ ریزہ کرنے اور اجتماعی طرزِ احساس کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ المیاتی آشفتگی افسانے میں بھی در آئی، کہ افسانہ تخلیق کار کے ذہن سے مربوط معاشرے کے خاتمے کے تمام اثرات کے ساتھ جنم لینے لگا۔

پاکستان کا افسانہ نگار ماضی سے رشتہ توڑے بغیر نئے طرزِ احساس کی تخلیق کر رہا ہے۔ اس کے سامنے جہاں ساڑھے آٹھ سو سال کا مسلمانوں کا ہندوستان میں شاندار ماضی اور شاندار تجربہ ہے اور تہذیبی روایت اور چودہ سو سالہ تاریخی شعور بھی حاصل ہے چنانچہ وہ حال میں ماضی کی روایت سے لے کر بہتر مستقبل کی تعمیر کا جذبہ رکھتا ہے۔ ماضی تو ایک تجربہ گاہ ہے جس سے افسانہ نگار حال اور مستقبل کے نئے خوابوں کی تعبیریں بناتا ہے۔ لیکن جب یہ تجربہ گاہ حال اور مستقبل پر دھند کی طرح چھانے لگتی ہے تو حال اور مستقبل دونوں نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ انتظار حسین یہاں تک تو ٹھیک کہتے ہیں کہ وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ لیکن جب ماضی کی یاد اعصاب پر چھا جائے تو حال اور مستقبل بھی ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین اظہر کہتے ہیں۔

"جب بھی کسی دور میں نئے تقاضوں کا ظہور ہوتا ہے اور پرانی روایتوں اور اعتقادات پر زد پڑتی ہے تو ایسے دور میں نئی اقدار کی تلاش اور اپنے آپ کو خارجی حقائق سے ہم آہنگ کرنے کے لیے انسان اپنی سائیکی میں کھو کر کوئی حال تلاش کرتا ہے۔" [۳۳]

آج کے صنعتی دور نے تمام پرانے رابطوں، رشتوں، تہذیبی منطقوں اور مربوط اقدار کو شکست و ریخت میں ڈھکیل کر زمانے کو نئے ادوار میں ڈال دیا ہے اور وقت کے بدلنے سے طرزِ احساس کی تبدیلی احساس محرومی کی کوکھ سے جنم لینے لگی۔

"جدید طرزِ احساس فرد کی علاحدگی، تنہائی، محرومی، بے بسی اور اقدار کی مکمل ناکامی سے عبارت ہے"۔ [۳۴]

جس صورت حال کی طرف پروفیسر نذیر احمد نے توجہ دلائی ہے۔ اس نے ڈاکٹر غلام حسین اظہر کے سائیکی کی راہ نے ماضی میں پناہ چاہی۔ تاریخی شعور اور ماضی پرستانہ رویے دو متغائر رویے قائم کرتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے کہ!

"تاریخی شعور کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں محض ماضی کے ماضی پن کا احساس ہو۔ تاریخی شعور کے معنی یہ ہیں کہ ماضی کو حال میں زندہ دیکھا جائے۔ یہ شعراء کو مجبور کرتا ہے کہ وہ لکھتے وقت محض اپنے عہد کو پیش نظر نہ رکھیں بلکہ انھیں چاہیئے کہ وہ ہومر کے زمانے سے آج تک کے یورپ کے ادب کو اس بڑے احاطِ شعور میں اپنے ملک کے سارے ادب کو اپنا ہم عصر بنا سکیں" [۳۵]

"آج تہذیبی و معاشرتی سطح پر اقدار و اخلاق کا کوئی ایسا نظام ہمارے پاس نہیں ہے۔ جس پر ہم مثبت طریقے سے زندگی کا کوئی نیا قلعہ تعمیر کر سکیں۔ اس وجہ سے پورا معاشرہ منتشر ہے۔ چیزوں کے رشتے بکھر گئے ہیں۔" [۳۶]

جب تہذیبی اکائی باقی نہ ہو، تو اجتماعی احساس کو اجاگر کرنے کے لیے فنکار کو کسی بڑے آدرش اور کسی بڑے مقصد کو ادب کا پس منظر بنانا پڑتا ہے۔ کہ کوئی بڑا آدرش اور مقصد ہی اس خلاء کو پاٹنے کا ایک وظیفہ قرار پا سکتا ہے۔ جس کی چھتنار چھاؤں میں لوگ اجتماعی طرزِ احساس کو روح کے قریب پا سکیں۔ ان مقاصد کی مشترکہ میراث ایک تو ماضی کی بازیافت ہوتی ہے۔ اور دوسرا عصر کے عصبی مسائل جن کی قدر کا اشتراک معاشرے کی اکائی کی اور نظر رکھتا ہے۔ انتظار حسین ماضی کی بازیافت پر زور دیتے ہیں۔

۳۳۔ اوراق افسانہ نمبر ۶۹ صفحہ ۴۶۔

۳۴۔ ہم عصر اردو افسانے کا جائزہ از نذیر احمد۔ سیف ستارہ ۱۵ صفحہ ۸۰۳۔

۳۵۔ مغرب کے تنقیدی اصول از سجاد باقر رضوی صفحہ ۳۰۳۔

۳۶۔ نیا ادب اور تہذیبی اکائی از ڈاکٹر جمیل جالبی نیا دور ۴۳، ۴۴، ۴۳ صفحہ ۲۴۸۔

"۔۔۔ ماضی پر اصرار کرنے سے افسانہ نگار کا یہ مطلب نہیں ہوتا یا کم از کم نہیں ہونا چاہیے کہ گئے ہوئے دنوں کو واپس لایا جائے گئے دن کہاں واپس آتے ہیں۔ لمحہ جو گم ہو چکا ہے اسے پایا نہیں جا سکتا۔ مگر اسے یاد تو رکھا جا سکتا ہے" ۳۷

ماضی کو یاد رکھنے کی یہ خواہش کہیں تو تہذیبوں کے ٹوٹنے کا المیہ بن کر ابھرتی ہے کہیں نسٹلجیا بن جاتی ہے اور کہیں محض علامت رہ جاتی ہے۔ اس کی وجہ محض اتنی ہے کہ لکھنے والے کو اظہار کے فن پر کس قدر گرفت حاصل ہے اور وہ بات کہنے کی کس قدر صلاحیت سے نیاض ہے۔

انتظار حسین نے بات کہنے کے لیے عقیدہ اوہام اور پھر اساطیر کو علامت بنایا گو یہ روایت نئی نہیں تھی۔ بیدی اور کرشن کے ہاں مذہبی اساطیر اور دیو مالائی کو دار کا استعمال بکثرت ہوا ہے سریندر پرکاش کے ہاں بھی کہانی کہنے میں اسطور کو مہارت اور ہنرکاری سے استعمال کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جوگندر پال نے بھی بیدی کی طرح اپنی کہانیوں شرادھ اور "کتھا ایک پیپل کی" وغیرہ میں جنگ مہابھارت، رامائن اور مذہبی کرداروں سے مدد لی۔ اسی طرح پاکستان میں انور سجاد نے یونانی دیو مالا سے، رشید امجد نے ہندوستان کی قدیم تہذیبی ورثے سے، مرزا یاض نے اساطیر سے، سمیع آہوجہ، منشا یاد اور دوسرے کئی نئے افسانہ نگاروں نے مذہب دیو مالا اور تاریخ سے کسب فیض کیا۔

انتظار حسین تہذیبوں کے کھو جانے کی المیاتی صورت کو بیان کرتے ہوئے تاسف کرتے ہیں کہ اب اس دھرتی پر جنگل کم اور آدمی زیادہ ہو گئے ہیں۔

"تو اب ہم ستم زدوں کی دنیا اتنی تنگ ہو گئی ہے کہ چیونٹی کا انڈا ہمارا آسمان ہے۔ یہ کیسی دنیا ہے کہ انسان جو ہے بس ہر طرف دکھائی دیتے ہیں، باقی کائنات اپنے درختوں، درندوں اور سایوں کے ساتھ کہاں گم ہو گئی" ۳۸

ماضی کی تہذیبی قدروں کی بازیافت جہاں انتظار حسین اور دوسروں کے ہاں سلسلہ بنتی ہے وہیں بعض کے ہاں اس کی تردید بھی نظر آتی ہے "ہماری تہذیب کی ساری قدریں جنھیں شرفیت کا دلکش نام دیا جاتا ہے دراصل ایک فارغ البال طبقے کے سامان تعیش کو برقرار رکھنے کے لیے تھیں" ۳۹

ممتاز شیریں مغرب میں قدیم اساطیر اور دیو مالائی کرداروں کو جدید ادب میں استعمال کرنے کی مثال دیتے ہوئے کہتی ہیں!

"فرانس میں اندرے ژید نے ایک نئے تھیسس THESEUS کی تخلیق کی ۔۔۔ کاکتو COTOAU نے الفرنل مشین میں اوڈیپس کی داستان نئے طرز سے رقم کی ۔۔۔ امریکہ میں یوجین اونیل نے MOURNING BECOMES ELECTRA اس المیاتی یونانی ناٹک کو سارے کا سارا موجودہ زمانے میں منتقل کیا اور اس کے ہر کردار کا موجودہ بدل پیش کیا" ۴۰

حال کے اظہار کا تعین ماضی کی داستانوں اور اساطیر میں مدد لینے کا تصور پورے عالمی ادب میں دکھائی دیتا ہے۔ امریکہ کا ادبی نشاۃ ثانیہ اسطور سازی کا دور ہی تھا جہاں فرضی اساطیر سے عصری بیان کو زیب کیا جاتا رہا۔ واشنگٹن اروِنگ کا نام اس سلسلے کی بہترین مثال ہے۔ امریکہ میں ماورائیت کے پس منظر میں بہت سے دوسرے نظریات کے علاوہ ہنری ڈیوڈ تھورو اور والٹ وٹ مین کے اس نظریے نے بھی بڑا کام کیا کہ خارجی اشیاء حقیقت میں وجود نہیں رکھتیں، بلکہ جو کچھ ہے آنکھ کی پتلی میں بند ہے اور ماورائیت خارجی حقیقت سے بلند تر ہے۔ صرف باطن کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مغرب میں اساطیر کی طرف رجوع یونان اور مشرقی ادب کے بعد ظاہر ہوا۔ اردو افسانے میں جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے یہ رجحان اولین ہندی مائتھالوجی سے آیا۔ مگر پوری انسانی دیو مالا اور اساطیر سے بھی استفادہ کیا گیا۔ جہاں اردو شاعری میں یونان سے زہر کا پیالہ آیا وہیں کربلا کی پیاس اور نیزے پر سر نے بھی تاریخی شعور کو اجاگر کیا۔ علامتی افسانے میں انتظار حسین کا اسلوب تاریخی شعور اور تہذیبی علامتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ اس نے قدیم مذہبی اسلوب میں اساطیری کرداروں کی نیابت سے عصر کی کتھا بیان کی ہے۔ ان کا اس سلسلہ کا اولین افسانہ "آخری آدمی" ہے۔ لیکن اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا فکری اور اسلوبیاتی رویہ کافکا سے متاثر ہے اور ان کی کہانی "آخری آدمی"

۳۷۔ اجتماعی تہذیب اور افسانہ از انتظار حسین مطبوعہ علامتوں کا زوال ۳۸۔ بکرم بیتال اور افسانہ از انتظار حسین مطبوعہ علامتوں کا زوال
۳۹۔ نگار سرسید نمبر آل احمد سرور صفحہ ۲۱۸۔ ۴۰۔ معیار ممتاز شیریں نیا ادارہ لاہور صفحہ ۹۰۔

یورپی ڈرامہ افسانہ نگار آئنسکو [illegible] کے ایک ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ آئنسکو کے اس ڈرامے میں تمام لوگ گینڈے کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف ایک آدمی آدمی کے روپ میں رہ جاتا ہے۔ آخری آدمی میں بھی آخری آدمی کا المیہ سب لوگوں کے جون بدلنے کے بعد کچھ دیر تک اکیلا آدمی رہ جاتا ہے۔

انتظار حسین اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ "انھوں نے جب آخری آدمی لکھا تو کافکا کو پڑھ چکے تھے۔ مگر آئنسکو کو بعد میں پڑھا۔"[۴۱] بہر طور موضوعی مشابہت کے باوجود آخری آدمی ماحول اور فضا کے اعتبار سے جدا منطقہ رکھتا ہے۔

داستانوں اور دیومالا کی یہ صفت ہے کہ اس کے کردار قلب ماہیت کی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ یہ اساطیر اور داستانوں کی فطرت کا حصہ ہے۔ مگر جدید افسانے میں قلب ماہیت کو انسانی معاشرت کے زوال کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں وہ کہانی اب تک موجود ہے جو سردیوں کی راتوں میں رضائیوں میں دبکے ہوئے نانی سے سنا کرتے تھے کہ جو مخلوق خدا کی نافرمانی کرتی ہے خدا انھیں بندر بنا دیتا ہے۔ اور دیر تک ہم جب بھی مداری کے سامنے بندر کو ناچتا ہوا دیکھتے تو تاسف کرتے کہ انسان کو نافرمانی کی سزا کس کس طور مل رہی ہے۔ جدید افسانے نے بھی اس روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ دورِ حاضر کے زوال آمادہ رویے پر تاسف کا اظہار اس طور کیا۔ کہ داستانوں سے کرداروں کو علامتوں میں زندہ کر کے کہانی بیان کی۔ انتظار حسین کا افسانہ "آخری آدمی" اور "کایا کلپ" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

انور سجاد علامتی افسانے کی جدید روش کے بانیوں میں سے ہیں۔ جہاں انھوں نے عصری زندگی کو مختلف النوع علامتوں سے اظہار کیا۔ وہیں دیومالا اور اساطیر کے ذریعہ بھی بات کہی ہے۔ ان کی اکثر علامتیں صنعتی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن علامتوں کے لیے انھوں نے مشرق اور مغرب ہر دو تہذیبوں اور دیومالا کے کرداروں کو چنا ہے۔ ان کے افسانے پرومیتھس اور سنڈریلا میں یونانی میتھالوجی کے معروف کردار آئے ہیں۔

نئے افسانہ نگاروں میں رشید امجد نے مذہبی اور اساطیری دونوں کرداروں کو استعمال کیا ہے۔ سمندر قطرہ سمندر میں کھوئی ہوئی تہذیب کی بازیافت کی کوشش نظر آتی ہے۔ "منجمد موسم میں ایک بحران" میں جنگ مہا بھارت کے اسطوری کردار کو برتا گیا ہے۔ اسی طرح "بے ثمر عذاب" میں برصغیر کے ثقافتی پس منظر کو برتا گیا ہے۔

منشا یاد نے مذہبی اسطور اور پس منظر کو اپنے بعض افسانوں میں استعمال کیا اس حوالے سے انھوں نے کئی کامیاب افسانے لکھے۔

سمیع آہوجہ نے اپنے موضوع کے لیے عرب سرزمین کی معروف علامتوں کو استعمال کیا۔ خالدہ حسین کا عمومی رویہ تصوف کے پس منظر کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اس طرح دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں بھی مذہب، تہذیب، داستان، اسطور اور دیومالا کے کردار عصری دروبینی میں استعمال ہوئے ہیں۔

اردو افسانہ ۶۰ء سے ۷۰ء۔ ۷۰ء سے ۸۰ء سے آگے ہر دہائی میں مسلسل آگے بڑھا ہے میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ ۶۰ء کے ابتدا میں اسلوب اور علامیت کا ایک کھردرا پن نظر آتا ہے۔ مگر ۷۰ء کے بعد اس میں ملائمت نظر آنے لگی، کہ چیزیں جب بن رہی ہوتی ہیں ان میں اکھڑا پن موجود ہوتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اس میں نرماہٹ آنے لگتی ہے۔

۶۰ء کی دہائی کا افسانہ اسلوب اور فن کے اعتبار سے تشکیلی دور کا افسانہ تھا۔ حقیقتیں بڑی تھیں اور اظہار چاہتی تھیں۔ انداز بیان اور اسلوب انوکھا تھا۔ مگر دس سال کا سمندر عبور کرنے کے بعد ۷۰ء کی دہائی میں نرماہٹ اور قبول عام کی روش پڑی اور آج علامتی افسانہ اپنے بھرپور تشخص کے ساتھ موجود ہے۔ اور اگلی منزل کی طرف رواں دواں۔ کہ علامت تنگ دائرے کو توڑ کر قبولیت کی نیابت میں داخل ہو چکی ہے۔

◆◆

۴۱۔ لفظ یونیورسٹی میگزین اورینٹل کالج لاہور مکالمہ انتظار حسین، سہیل احمد خان صفحہ ۹۳۔

حامدی کاشمیری

نقش ہیں دل میں حسرتیں کیا کیا
اَن کہی ہیں حکایتیں کیا کیا

قربِ باہم کا کیسا عالم ہے!
بڑھ رہی ہیں مسافتیں کیا کیا

ہے زمینوں کو حسرتِ باراں
بے طلب برسیں رحمتیں کیا کیا

اب بھی زنجیرِ دست و پا ہے وہی
لے کے آئے بشارتیں کیا کیا

کالے حرفوں میں کیسے ڈھل جائیں
خوں میں افشاں ہیں صورتیں کیا کیا

سامنا ظلمتِ سحر کا ہے
دیکھی ہیں شب کی ظلمتیں کیا کیا

● مسعود منزل، بانی گام، میراکدم
شالیار، سرینگر (کشمیر)

محسن احسان

خاک داں کو ماورائے آسماں لے جائے گا
جو پرندہ سر پہ رکھ کر آشیاں لے جائے گا

میں فقط پیتا رہوں گا ساحلوں کی تشنگی
وہ سمندر کی سبھی طغیانیاں لے جائے گا

جب اُتر جائیں گی تہہ میں خواہشوں کی کشتیاں
ناخدا اس وقت اپنے بادباں لے جائے گا

کارواں کے سب مسافر سوچتے ہیں شام سے
صبحدم کس سمت، میر کارواں لے جائے گا

کیا خبر ہے کس کی پہلے پتلیاں پھر جائیں گی
کون اپنے ساتھ کیا سود و زیاں لے جائے گا

ہم کنارے پر کھڑے گنتے رہیں گے موج موج
اور سفینے کو کہیں آبِ رواں لے جائے گا

اب تو خطرے میں ہے محسن خرقۂ درویش بھی
تو بچا کر شملۂ عزت کہاں لے جائے گا

● شعبہ انگریزی، اسلامیہ کالج، پشاور (پاکستان)

مہدی پرتاپ گڑھی

وہ میرے اندر جو اک بشر ہے
وہ میری دنیا سے باخبر ہے

میں اندھی سوچوں میں گھر گیا ہوں
سرورِ موسم بھی بے اثر ہے

اُتر گئی میرے جسم و جاں میں
جو ایک زردی شجر شجر ہے

قیام کب ہے مرا مقدّر
سدا مرے پاؤں میں سفر ہے

نظر نہ رکھے جو مصلحت پر
وہی زمانے میں بے ہنر ہے

ہے ظرف میرا بھی آسماں بھر
جو ظلم تیرے بساط بھر ہے

● معرفت: ایکزیکٹیو انجینئر۔ اریگیشن
ڈویژن، پرتاب گڑھ (یوپی)

کے ہاتھوں کی جھریوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ستاون اٹھاون سے کم نہیں ہے، اس نے ایک ہفتے کا کرایہ پیشگی لے کر مکان اور کمرے کی چابیاں میری طرف بڑھا دیں، پھر ذرا سخت لہجے میں کہا۔

مجھے صفائی سے گہری محبت ہے۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا کر اسے یقین دلانا چاہا کہ اس معاملے میں اسے مجھ سے کبھی شکایت نہ ہو گی۔ کچھ نہا تیں اور۔ رات دیر سے آنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن اتنا یاد رکھنا کسی کی نیند خراب نہ ہو، اس گھر میں کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں، کرایہ ہر ہفتے وقت پر دینا ہو گا۔

یہ کہہ کر اس نے بہت تلی نظروں سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ یکبارگی اس کی بلوری آنکھوں میں ایسی چمک ابھری، جیسے وہ مجھے قریب سے جانتی ہو اور وہ بھی مدت سے، لیکن اس نے اپنے لہجے کی سختی کو برقرار رکھا، جو نکہ تم جوان ہو اور خوش شکل بھی۔ اگر میں نے کسی لڑکی کو تمہارے ساتھ اس مکان میں دیکھ لیا، تو اگلے روز تمہیں یہ کمرہ خالی کرنا ہو گا۔

میں بر وقت اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ میری گرل فرینڈ، جس سے میں جلد ہی شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، وہ جب کبھی لندن آئے گی تو عین ممکن ہے کہ میں اسے یہاں بھی لے کر آؤں لیکن مسز جیکسن کی شخصیت کا رعب، لہجے کی سختی اور عائد کردہ پابندیوں نے مجھے اتنا سحر زدہ کر دیا تھا کہ مجھ میں لب کھولنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔

مسز جیکسن نے اپنے مکان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ مکمل گراؤنڈ فلور اس نے اپنی رہائش اور ذاتی استعمال کے لئے رکھا ہوا تھا، کسی کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور نہ ہی کوئی اس کی نجی زندگی میں دخل دیا کرتا تھا اوپر کی منزل پر تین کمرے تھے، سب سے بڑا کمرہ میرے پاس تھا، جس کی کھڑکی سڑک اور باغیچے کی طرف کھلتی تھی، برآمدے کے وسط میں ایک طرف باتھ روم تھا تو دوسری طرف ٹائلٹ، برآمدے کے آخر میں صاف ستھرا کچن تھا، جس کے اندر ہی مختصر سا زینہ ATTIC کو جاتا تھا، میرے ساتھ والے کمرے میں جو لڑکا رہتا تھا اس کا نام گلد یپ گل تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوا تھا یہیں پڑھ لکھ کر اس نے تین A. LEVEL حاصل کئے تھے اور اب اعلیٰ تعلیم کی خاطر مختلف یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کے لئے کوشاں تھا، ان دنوں بے کار تھا اور بے کار ہونے کے کارن خاصا افسردہ، فکر مند اور خود کو تنہا محسوس کیا کرتا تھا، حالانکہ اس کے ماں باپ اسی شہر میں مقیم تھے۔ لیکن وہ ان سے شاذ و نادر ہی ملا کرتا تھا۔ دو نسلوں کے درمیان تہذیبی فاصلہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اسے اپنے والدین کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے گھٹن ہوتی تھی وہ چہرے مہرے سے انڈین ضرور لگتا تھا، لیکن اس کے خول کے اندر مغربی تہذیب کا منجھا ہوا شخص سانس لے رہا تھا۔ کچن کے ساتھ باکس روم کا لاجر راجہ نندن تھا گہرا کالا رنگ، وہ سری لنکا کے اس علاقے سے تعلق رکھتا تھا، جہاں زور کی سے جنگ چل رہی تھی۔ صدیوں پرانے بسے ہوئے تامل ہندو اس علاقے کو سری لنکا سے کاٹ کر آزاد دیش بنانے کی فکر میں لڑ مر رہے تھے۔ راجہ نندن اپنے گھر والوں کے بارے میں ہر وقت پریشان۔ متفکر اور کھویا کھویا رہتا تھا، لیکن ایک صبح گھر والوں کا خط ملنے پر کہ وہ لوگ بخیریت انڈیا ہجرت کر گئے ہیں، تو اس نے سکھ کا سانس یوں لیا تھا جیسے ابھی موت سے بال بال بچ گیا ہو۔ اس روز پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ کمپیوٹر کا ایڈوانس کورس کر رہا تھا اور شام کو کسی تھیٹر میں گیٹ کیپر کا کام کرتا تھا۔ اٹک میں رشید نام کا ایک بانکا نوجوان رہتا تھا۔ صاف رنگ گہرے کالے بال۔ بلا کا اسمارٹ، اس کے بارے میں مجھے اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی ریسٹورنٹ میں ویٹر کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور رات گئے دیر سے لوٹتا ہے۔

ایک انگریز ریٹائرڈ لیڈی کے مکان میں تمام ایشیائی لاجروں کو دیکھ کر نہ صرف میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں بلکہ دماغ کی کھڑکیاں بھی کھل گئی تھیں اور میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مسز جیکسن نے تمام رنگ دار لاجروں کو اپنے ہاں کیوں رکھا ہوا ہے۔ جن میں میں بھی شامل تھا۔ بہت کم انگریز عورتیں تھیں جو کسی ایشیائی کو اپنے یہاں لاجر رکھا کرتی تھیں۔ مجھے اس سلسلے میں قسم قسم کے تجربے ہو چکے تھے۔ کچھ تو یہاں اور زیادہ تر مانچسٹر۔ بولٹن اور باتھ میں۔ میں نے جب بھی کسی انگریز عورت کے در پر دستک دی تھی۔ تو میری شکل دیکھ کر اسکے چہرے کا رنگ بدل جایا کرتا تھا جیسے میں کم تر درجے کا آدمی ہوں۔ اور غلط مقام پر چلا آیا ہوں۔ پھر وہ خود پر قابو پا کر بڑی ملائمت سے کہا کرتی تھی۔ SORRY, THE ROOM HAS GONE کئی مرتبہ یوں بھی ہوا تھا کہ میں نے دستک دی، کسی کھڑکی سے پردہ سرکا۔ چور آنکھ نے مجھے دیکھا اور پھر دروازہ نہیں کھلا ٹیلی فون پر تو انہیں فوراً ہی میرے لب ولہجے، جملوں کی ساخت اور الفاظ کی بندش سے احساس ہو جاتا تھا کہ میں ایشیائی ہوں۔ پھر وہ اتنی صفائی سے نفی میں جواب دیا کرتے تھے کہ مجھے برا بھی نہ لگے۔ اور نہ ہی میرا دل زخمی ہو۔ لیکن جہاں تک مسز جیکسن کا سوال تھا، تو مجھے دیکھ کر اس کے ماتھے پر کوئی بل نہیں پڑا تھا اور نہ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا، بلکہ وہ قدرتی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئی تھی۔ ان تمام باتوں کی نوعیت میرے نزدیک عجیب و غریب تھی۔ اور ان کی گہرائی میں اتر کر میری حیرانگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میرے ذہن

میں گنجل سا پڑگیا تھا جسے کھولنے کے لئے میرا اشتیاق روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔

اور ایک سرد شام میں اور کلدیپ کچن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے میرے اصرار کرنے پر ہی وہ رک گیا تھا۔ ورنہ اس کا معمول یہ تھا کہ وہ چائے بنا کر چپکے سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جایا کرتا تھا۔ وہ کھڑکی سے نیچے اترتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا، جو درجہ بدرجہ گہرا ہوتا جارہا تھا۔ میں بے ساختہ اس سے پوچھ بیٹھا۔

تمہیں یہاں رہتے ہوئے سات آٹھ ماہ بیت چکے ہیں یہ تو بتاؤ میرے کمرے میں مجھ سے پہلے کون رہتا تھا ؟

کوئی بھی نہیں تمہارے آنے تک وہ کمرہ بند تھا۔

اچھا ———— ؟ میں واقعی چونک اٹھا تھا۔

کیوں، کیا بات ہے ؟

کچھ نہیں، ایک دو چسکیاں بھر کر میں نے سگریٹ سلگایا۔ دو تین کش لے کر پھر پوچھا۔ تمہیں یہ خیال تو ضرور آیا ہوگا کہ مسز جیکسن نے اپنے ہاں رنگ دار لاجر کیوں رکھے ہوئے ہیں اور وہ بھی سب کے سب ایشیائی۔

میں نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔ اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ پھر موڈ بدل کر فوراً ہی بول اٹھا۔ لیکن اگر ایسا ہے بھی، تو اس میں حرج کیا ہے۔ ؟

حرج تو کچھ بھی نہیں ———— لیکن ایک سفید عورت کے ہاں سبھی رنگدار لوگوں کو دیکھ کر عجیب لگتا ہے۔

لگنا تو نہیں چاہیئے ———— یہاں کے لوگ اب ہر کسی کو قبول کرنے لگے ہیں۔

کس سطح پر ؟

میں سمجھتا ہوں ہر سطح پر ———— نسلی بھید بھاؤ آہستہ آہستہ مٹتا جارہا ہے ———— سوسائٹی کے ہر شعبے میں ہر رنگ کے لوگ کام کر رہے ہیں اور وہ تیزی سے اپنا مقام بناتے جارہے ہیں۔

جس اعتماد کے ساتھ وہ بولے جارہا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مقامی طبقے نے باہر سے آئے لوگوں کو ہر سطح پر قبول کر لیا ہے۔ جبکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ پھر فخر سے بول اٹھا،

میری طرف دیکھو ———— میری نسل تو کب کی یہاں کا حصہ بن چکی ہے، میں خود کو ان لوگوں سے الگ نہیں سمجھتا، بلکہ ان میں سے ایک ہوں۔

یکبارگی مجھے محسوس ہوا کہ جو شخص میرے روبرو بیٹھا ہے، وہ انڈین نہیں، ٹھیک برٹش ہے، اس کا خمیر اسی دھرتی کی بو باس سے اٹھا ہے اور اس کی آنکھ بھی مغربی ہے، جبکہ میری مشرقی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہو وہ اپنے اپنے ڈھنگ سے دیکھتی ہیں، محسوس کرتی ہیں اور سوچتی ہیں۔ لیکن کسی نتیجے پر پہونچ نہیں پاتیں۔ اگر کسی وجہ سے کوئی نتیجہ نکل بھی آئے تو اس کی تہہ میں کہیں نہ کہیں سمجھوتہ چھپا ہوتا ہے۔ کہیں ذاتی مفاد کی خاطر اور کہیں خوشنودی کی خاطر۔

انگریز آدمی کا گھر اس کے نزدیک ایک قلعے کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں داخل ہونے کے لئے کسی اجنبی کو سو سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مسز جیکسن کا گھر بھی قلعے سے کم نہ تھا۔ مکان کا وہ حصہ جو اس کا گھر تھا، وہاں تین کمرے تھے لیکن ان کے دروازے ہر دم بند رہا کرتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کمروں میں کیا ہے اور وہ تن تنہا دن بھر وہاں کیا کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنے کچن میں کھانا بناتے ہوئے دکھائی دے جاتی تھی۔ لیکن کسی لاجر کی آہٹ پاکر یا اسے دیکھ کر جھٹ سے دروازہ بند کر لیا کرتی تھی۔ دو تین مرتبہ میں نے اسے باغیچے کا گیٹ کھولتے وقت ضرور دیکھا تھا کہ وہ اپنے لاؤنج میں بیٹھی کتاب پڑھنے میں اس قدر کھوئی ہے کہ اسے آس پاس کا ذرا بھی ہوش نہیں۔ یقیناً کتابوں سے اس کی دوستی بڑی گہری تھی اور انہیں کے سہارے وہ زیادہ تر اپنا وقت کاٹا کرتی تھی۔ البتہ اس کے چند گنے چنے دوست ضرور تھے، جو اس کے ہم عمر بھی تھے، وہ لوگ گاہے گاہے اس کے پاس شام گذارنے چلے آتے تھے اور دیر تک اس کی صحبت کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔ لیکن ویک اینڈ پر مسٹر اسمتھ ہی اس کے ہاں دکھائی دیا کرتا تھا، وہ ساٹھ باسٹھ سے کم نہ تھا۔ ممکن ہے زیادہ بھی ہو۔ اچھی خوراک عمر پر کئی پردے ڈال دیتی ہے، معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا لیکن کپڑے اتنے شاندار پہنا کرتا تھا کہ بار بار اسے دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ مسز جیکسن بھی اس کی آمد پر جھوم اٹھا کرتی تھی۔ پھر بن سنور کر، خوشی خوشی اس کا بازو تھامے کسی پب کی رونق بڑھانے چلی جاتی تھی، بڑھاپے میں سہارا خواہ کوئی روپ دھار لیتا ہے، دونوں ایک دوسرے کے عذاب بنے ہوئے تھے۔ واپسی پر دونوں جھومتے ہوئے آیا کرتے تھے اور گھر کی دہلیز پر پہونچ کر مسٹر اسمتھ بھی اس کا گال چوم کر آگے بڑھ جاتا تھا اور کبھی اس کے ہاں رات بسر کیا کرتا تھا، میں یہ تماشا اپنی کھڑکی سے، جو باغیچے اور سڑک کی طرف کھلا کرتی تھی، اس کا پردہ سرکا کر دیکھا کرتا تھا۔ حالانکہ میرے دل نے کئی بار لعنت ملامت کی تھی کہ کسی کی بھی زندگی میں تاک جھانک کرنا بری بات ہے۔ غیر اخلاقی عمل ہے، لیکن میرے ذہن میں جو گنجل پڑ چکا تھا، میں اس کے ہاتھوں اتنا مجبور ہو چکا تھا کہ کوئی بھی شرمناک حرکت کرنے کو تیار رہتا۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں سے میں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ

مسز جیکسن طلاق شدہ عورت ہے اس کا ایک جوان بیٹا بھی ہے جو اسکاٹ لینڈ میں کہیں رہتا ہے۔ اور وہ اس سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ لیکن بیٹا ان کا زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ صرف کرسمس کے موقع پر اس سے ملنے کیلئے لندن آتا ہے، اور چند روز رہ کر سال بھر کیلئے غائب ہو جاتا ہے۔

ہدایت کی صبح وہ ہماری منزل پر آیا کرتی تھی۔ بڑی سنجیدگی سے کچن، باتھ، ٹائلیٹ اور برآمدے کا جائزہ لیا کرتی تھی۔ ہر حجرے کرایہ وصول کرتے وقت اس کے کمرے پر اچٹتی سی نگاہ ضرور ڈالا کرتی تھی، محض یہ جاننے کی خاطر کہ اس نے کمرے کو کس حالت میں رکھا ہوا ہے، پھر اس سے مختصر سی بات کر کے اگلے کمرے کی طرف بڑھ جاتی تھی۔ میں اس تاک میں تھا کہ کسی روز اس سے کھل کر بات کروں، میں اس سلسلے میں شعوری کوشش بھی کر چکا تھا لیکن وہ اتنی ہوشیار تھی کہ کبھی ایسا موقع ہی نہ آنے دیا کرتی تھی۔ کرایہ وصول کیا۔ موسم کے متعلق سرسری سی بات کی اور آگے بڑھ گئی، لیکن ہمت ہارنے کی بجائے میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی بہانہ کوئی موقع، میرے ہاتھ لگے اور میں قلعے کی کوئی کمزور دیوار توڑ کر اس کے قریب پہنچ جاؤں۔

کلریپ کو یونیورسٹی میں داخل مل گیا تھا، اور اسٹوڈنٹ گرانٹ بھی۔ وہ بے پناہ خوش تھا اس کا کمرہ خالی ہوتے ہی ایک ایسی تجویز میرے ذہن میں ابھری تھی کہ میں قلعے کی کمزور دیوار تو کیا، مضبوط دیوار بھی چٹکیوں میں توڑ سکتا تھا، لہٰذا میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا۔ جیلے حوالے تراشے اور جس روز میں نے مسز جیکسن کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا، تو وہ مجھے اپنی دہلیز پر کھڑا دیکھ کر اس قدر حیران ہوئی تھی کہ اس کی آنکھیں پھیل کر دوگنی ہو گئی تھیں اس سے پہلے کہ وہ اپنے ذہن پر زور ڈالتی، میں دھیرے سے بول اٹھا۔

"ایک ضروری کام تھا اس لئے آیا ہوں۔"

اس کے ماتھے پر سوال کرتی ہوئی تیوریاں ابھر آئی تھیں پھر اس نے میری آنکھوں میں کچھ تلاش کیا اور پورا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

"آؤ اندر آؤ۔"

لاؤنج حسب توقع صاف ستھرا تھا۔ آرائش بھی معیاری تھی قیمتی فرنیچر کا ہر ٹکڑا اپنی جگہ پہ یہ کہتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے سوچ سمجھ کے ہاتھ لگانا، ورنہ میں تمہارا ہاتھ جھٹک دوں گا۔ آرام دہ صوفے پر خود کو پھیلا کر میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ سنجیدہ، خاموش، لیکن متلاشی نظروں سے یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ میرے آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے فوراً ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

"میرا ایک قریبی دوست ہے۔ وہ ان دنوں بیڈ اینڈ بریکفاسٹ میں رہ رہا ہے۔ اسے کمرے کی سخت ضرورت ہے۔"

ردعمل گہرا ہوا تھا۔ لیکن خاطر خواہ۔ گو لہجہ خوشگوار مسکراہٹ سے بھر گیا تھا۔

"ظاہر ہے کہ تمہارا دوست تمہارے ہی ملک کا رہنے والا ہوگا؟"

"نہیں میڈم۔ وہ اس ملک کا شہری ہے۔"

"تو پھر وہ یقیناً یہیں پیدا ہوا ہوگا؟"

"پیدا تو وہ یہاں ضرور ہوا تھا ___ لیکن شاید آپ اس خیال میں ہیں کہ وہ ایشین ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ انگلش ہے۔"

ردعمل اس مرتبہ بھی گہرا ہوا تھا۔ لیکن برعکس۔ وہ سوچ کے اتھاہ ساگر میں اتر گئی تھی اور میرے ہاں جو کمبل پڑا ہوا تھا، اس کی گرہیں مزید سخت ہو گئی تھیں لیکن میں نے دل کی بات دل میں رکھی اور ہنستے ہوئے مذاقاً کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی غیر ایشیائی کو کمرہ دینا پسند نہیں کرتیں؟"

چونکتے ہی اس کا رنگ یوں زرد پڑ گیا تھا۔ جیسے میں نے اس کے سینے میں گھس کر اس کا اہم راز جان لیا ہو۔ لیکن مجھے ہنستا ہوا پا کر وہ بھی زبردستی ہنسنے لگی تھی ہم دونوں کی ہنسی ایک دوسرے میں شامل ہوتی جا رہی تھی اور ہم دونوں ہنستے چلے جا رہے تھے۔ لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس نے گھبراہٹ کے عالم میں میری ہنسی کا فائدہ اتنی خوبی سے اٹھایا ہے کہ اس کی آڑ میں وہ میرے وار سے صاف صاف بچ نکلی ہے۔

"تم آدمی دلچسپ لگتے ہو۔" پھر مجھ سے نظریں چرا کر اس نے دیوار پر لٹکی ہوئی مونالیزا کی تصویر کو دیکھا، اور بولی۔

"میرے ہاں ہر شہریت کے لوگ رہتے رہے ہیں، انگلش، آئرش، ویسٹ انڈین، چائنز ___ ان میں زیادہ تر انگلش ہی ہوا کرتے تھے۔ بڑے بھلے ہر قسم کے لوگ تھے وہ ___ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ تم لوگوں کو میں نے زیادہ امن پسند۔ قابل اعتماد اور نیک دل پایا ہے۔"

"شکریہ۔" میری گردن فخر سے اونچی ہو کر چھاتی پھٹنے کے قریب تھی، میں بے حد خوش تھا کہ مقامی لوگوں نے صرف فرق ہی محسوس نہیں کیا تھا بلکہ حقیقت کو بھی تسلیم کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کا اظہار برملا کر رہے تھے۔

"اس لئے آپ ایشینز کو اپنے ہاں رکھنا پسند کرتی ہیں۔"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ___ میری نظر میں سب برابر ہیں۔ گورے، کالے، رنگدار ___ پھر تم لوگ ہمارے لئے اب غیر تو نہیں ہو ___ یہاں کا حصہ بن چکے ہو ___ اب یہ ملک صرف ہمارا نہیں، تمہارا بھی ہے،

ہم سب کا ہے "

اس کی وسیع النظری نے مجھے اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ انسانی سطح پر مانوس اتی ہوئی محسوس ہوئی، یکبارگی مکدیپ کا چہرہ کہیں سے ابھر کر میری آنکھوں کے سامنے پھیل گیا اور اس کے بول میرے کانوں سے ٹکرانے لگے کہ مقامی لوگ اب ہمیں ہر سطح پر قبول کرنے لگے ہیں۔

" پھر تو آپ کو ہم سے اتنی ہی ہمدردی ہوگی، جتنی اپنے لوگوں سے ہے "

اس نے ایک بار پھر نظریں چرا کر مونا لیزا کی تصویر کو دیکھا، کچھ سوچا پھر گویا ہوئی۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اپنے لوگوں سے ہمدردی کچھ زیادہ ہے ___ ہونی بھی چاہئے ___ قدرتی بات ہے ___ اس لئے کہ میں بھی انگلش ہوں ___ لیکن مجھے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا ہے ___ رات رات بھر پارٹیاں، میوزک کا شور شرابہ اور ناچ گانا اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا "

"لیکن میڈم۔ پارٹیوں میں پینا پلانا، ناچ گانا، شور شرابہ تو ہوتا ہی ہے "

" میں جانتی ہوں۔ ہم لوگ ان کے بنا نہیں رہ سکتے۔ لیکن بوڑھی عمر میں یہ چیزیں اپنی کشش کھو بیٹھتی ہیں "

"مگر آپ تو اب بھی جوان ہیں "

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے ہی یوں بولی " تم واقعی دلچسپ آدمی ہو ___ شاید تمہیں پتہ نہیں تم سے بڑی عمر کا تو میرا بیٹا ہے "

" اچھا، " میں نے صریحاً انجان بن کر کہا۔ " میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا؟"

" وہ اسکاٹ لینڈ میں رہتا ہے "

یہ کہہ کر وہ کہیں دور نکل گئی تھی، آنکھیں روشن ہوتے ہی سوئی ہوئی ممتا جاگ اٹھی تھی۔ لیکن روشن آنکھوں میں کہیں نہ کہیں اداسی کی جھلک بھی تھی میں منہ پھیر کر مونا لیزا کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں کی پراسرار مسکراہٹ سے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ ذاتی طور پر خوش ہے یا اسے کسی بات کا دکھ ہے ، افسوس ہے۔ یہی حال مسز جیکسن کا تھا۔ جو اپنے بیٹے کے تصور میں کھوئی ہوئی ماضی کے جنگل میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ خاموشی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ان خاموش لمحوں میں عیاں تھا اور اس کی باتیں عمیق۔ ان کی تہہ داریوں میں اتر کر میں نے جاننا چاہا کہ ان میں کہاں تک سچ تھا، جھوٹ تھا، آمیزش تھی۔ لیکن ہر گزرتا ہوا لمحہ یہ احساس دلا گیا کہ مجھے رہا تھا کہ سچ جھوٹ پر حاوی تھا، آمیزش کا عکس ملتا اس لئے کہ سچ کے پیچھے اس کے ذاتی تجربات تھے۔ ڈھلتی عمر کے خوف سے

آرام دہ زندگی گذارنے کی تڑپ تھی، طاقتور خواہش تھی اور میرے سامنے بیٹھی ہوئی عورت مجھے ہر لحاظ سے صاف گو، ممتا والی اور دور اندیش لگ رہی تھی۔

اچانک میرے کانوں سے آواز ٹکرائی

" مسٹر خان۔ تمہارا دوست کرتا کیا ہے ؟ "

میں اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے والا تھا۔ لیکن میں تو ہر مشکل کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ بڑے سے بڑا جھوٹ بولنا بھی میرے لئے آسان تھا میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"ہم ایک ہی کمپنی کے ملازم ہیں۔ وہ حال ہی میں ڈربی سے ٹرانسفر ہو کر آیا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ میری طرح اکیلا ہے۔ اور ...... "

"میں سمجھ گئی۔ لیکن میرا اصول ہے کہ میں جب تک آدمی کو دیکھ نہ لوں، کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتی "

" کہو تو آج ہی اسے بلا لوں۔ ؟ "

میرے بے ساختہ پن سے وہ قدرے جھنجھلا اٹھی تھی۔ پیچ و تاب کھا کر بولی۔

" نہیں نہیں ایسی جلدی بھی کیا ہے ___ کمرہ تو خالی ہے ہی ___ کچھ دن رک جاؤ ___ میں سوچ کر تمہیں بتا دوں گی۔ پھر اسے بلا لینا۔ بعد میں دیکھیں گے۔

اس نے جس ڈھنگ سے گھما پھرا کر گول مول جواب دیا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ میں " ہاں اور نا " کی کیفیت کے درمیان لٹکتا پھروں، لیکن میرے ذہن کا مجمل کھل چکا تھا، دھند چھٹ چکی تھی، ہر شے شیشے کی طرح صاف تھی، میں نے اس پر مزید دباؤ ڈالنا مناسب نہ سمجھا، لیکن میں اتنا جان چکا تھا کہ وہ آئندہ اس سلسلے میں بھول کر بھی مجھ سے بات نہیں کرے گی اور نہ ہی کبھی میں اسے مجبور کروں گا۔

سنیچر کی شام تھی، راجہ نذر کے یار دوست ایک ایک کر کے میرے کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے چند خاص دوستوں کو اس خوشی میں مدعو کیا تھا کہ پہلے تو اسے کمپیوٹر کا ڈپلوما نصیب ہوا، پھر امریکہ کا امیگریشن۔ دونوں شرف حاصل کرنے پر اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، اس کا اپنا کمرہ چھوٹا ہونے کے کارن وہ الوداعی پارٹی میرے کمرہ میں دینا چاہتا تھا اور میں نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا کہ دوسروں کی خوشی میں دیوار بننا میرے کردار کے خلاف تھا مسز جیکسن بھی پارٹی میں شرکت کرنے والی تھی، حالانکہ شروع میں ہی اس نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا تھا کہ ہر سنیچر کی شام جارج اسمتھ اس سے ملنے کے لئے آتا ہے۔ اور وہ شام اسی کے ساتھ گزارا کرتی ہے۔ لہٰذا اس کا آنا مشکل ہوگا لیکن جب ہم خصوصاً میں نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے آکر TOAST PROPOSE کرے، ایک آدھ ڈرنک لے کر بے شک چلی جائے ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا

تو دیکھ سوچ کر رہ گئی تھی۔

راجہ نندن دوستوں میں گھرا ہوا چہک رہا تھا، ہر کوئی اس کی کامیابی پر نازاں تھا، رنگدار چہروں میں ایک سفید چہرہ بھی موجود تھا جس کی دیکھ بھال تقریباً سبھی کر رہے تھے اور وہ جلد ہی سب سے گھل مل گیا تھا۔ کھانے پینے کا سامان میز پر اتنی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کہ بھوک چمک اٹھی تھی۔ ہر شے تیار تھی۔ صرف مسز جیکسن کی آمد کا انتظار تھا لیکن سیڑھیاں خاموش تھیں، کوئی آہٹ، کوئی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی، وقت کچھ اور آگے سرکا، تو راجہ نندن اور اس کے دوستوں کے اصرار پر میں مسز جیکسن کو بلانے چل دیا، سیڑھیاں اتر کر ہال وے سے ہوتا ہوا میں اس کے در پر پہنچ گیا۔ دستک دینے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے مسز جیکسن کی آواز سنائی دی،

"جارج؛ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے ——— اب مجھے چلنا چاہئے ـ میں تو کہوں گی تم بھی ساتھ چلو۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"تم ساتھ رہو گے تو مجھے اچھا لگے گا۔ دس منٹ کی تو بات ہے۔ چھوٹی سی ڈرنک پی کر لوٹ آئیں گے۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"تمہارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے ——— تم مجھے ان لوگوں میں لے جانا چاہتی ہو، جنھیں میں دور سے بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا ——— لیکن ایک تم ہو کہ سارا گھر BLOODY WOGS سے بھر رکھا ہے۔۔"

"کیا کروں جارج ——— یہ میری مجبوری ہے ——— کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ان لوگوں کو پسند کرتی ہوں ——— مجھے تو ان کے رنگ سے گھن آتی ہے لیکن کیا کروں۔ مجھے گھر بھی تو چلانا ہے ——— بزنس بھی تو کرنا ہے۔"

"تم سفید لاجر رکھ کر بھی تو بزنس کر سکتی ہو؟"

"تمہارا کہنا صحیح ہے، ——— لیکن یہ لوگ پیسے دینے کے معاملے میں زیادہ کھرے ہیں، زیادہ ایماندار ہیں ——— پھر یہ لڑائی جھگڑے سے بھی دور رہتے ہیں، جو میرے لئے بہت اچھا ہے۔"

یکبارگی مجھے لگا کہ کسی نے میرے کانوں میں سیسہ انڈیل دیا ہے، سر سے پا تک سن ہو کر میں پتھر بن گیا تھا، اچانک دروازہ کھلا، مسز جیکسن لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ لئے میرے سامنے کھڑی تھی، لیکن مجھے پتھرایا ہوا دیکھ کر وہ بھی پتھر بننا شروع ہو گئی تھی اور ایک لمحہ ایسا آیا کہ ہم دونوں پتھرائے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ◆◆

ظفر صہبائی

(۱)

ٹوٹے سارے طلسم جا افسوس کی ہے
باطن باطن ایک صدا افسوس کی ہے

رہ کر تیرے شہر میں ہم نے کیا پایا
پیکر غم کا اور قبا افسوس کی ہے

دَم سادھے ہیں پنکھ پکھیرو، جنگل چپ
پیڑوں پیڑوں صرف ہوا افسوس کی ہے

ہنس لینا تو اپنی جرأت ہے ورنہ
جس بستی میں جاؤ فضا افسوس کی ہے

سورج شام کا ماں جایا سا لگتا ہے
یہ میلی سی دھوپ ضیا افسوس کی ہے

(۲)

زخم خوردہ جسم کو دہری اذیت کون دے
خواہشوں کو سرخیاں لکھنے کی دعوت کون دے

چاک پر مٹی پڑی ہے دستِ فن مفلوج ہے
اب ہمارے شہر میں خوابوں کو قامت کون دے

چل رہی ہیں آندھیاں چاروں طرف بکھراؤ ہے
منتشر اذہان کو ادراکِ وحدت کون دے

پاس ہوتے پھول تو ان کے لئے رکھتے بھی ہم
آنے والوں کو یہ خاکستر وراثت کون دے

نیند کی ٹہنی پہ کھل جائیں ابھی خوابوں کے پھول
جاگتی آنکھوں کو لیکن اتنی فرصت کون دے

● صوفیا ہاؤس، موتیا پارک، بھوپال - ۱

منظور ہاشمی

یہ اور بات کوئی شے بھی جاودانی نہیں
مگر وہ نام تو لگتا ہے جیسے فانی نہیں

پھر اس کے بعد ہر اک چیز دسترس میں تھی
بس ایک شرط تھی اس کی جو ہم نے مانی نہیں

کوئی سنائے تو اک داستاں سی لگتی ہے
ہماری بات جو اتنی ابھی پرانی نہیں

بہت دنوں سے پکارا نہیں اسے میں نے
بہت دنوں سے مرے خون میں روانی نہیں

وہ دن بھی تھے کہ اشارے زبان رکھتے تھے
اور آج لفظ بھی ایسے کہ کچھ معانی نہیں

اڑا دیئے ہیں سبھی رنگ دھوپ نے ایسے
کہ آسماں کا بھی اب رنگ آسمانی نہیں

● مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سیاہ کاغذ کی دھجیاں

عبدالصمد ● محل پیر، بہار شریف (نالندہ) بہار

وہ محکمۂ آب پاشی میں کام کرنے والے کل پانچ ہزار افراد تھے۔ ہندوستان جیسے کھیتی باڑی والے ملک میں محکمہ آب پاشی کی کیا اہمیت ہے، اسے کچھ وہی جان سکتا ہے جو کھیت اور پانی کے رشتے کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ دروغ بہ گردن راوی، کہتے ہیں کہ یہ جو صوبائی سرکاریں جلدی جلدی بنتی اور ٹوٹتی ہیں نا، اس میں محکمہ آب پاشی کے اعلیٰ حکام ہی کے ہاتھ ہوتے ہیں اور آپ جانیئے کہ ہندستان جیسے غریب ملک میں، اس وقت کہ چاروں طرف جمہوریت کا ڈنکا بج رہا ہو، پیسے کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

پانچ ہزار کی تعداد بڑی اہم ہوتی ہے اور وہ بھی اس وقت کہ یہ ساری کی ساری تعداد یکجا ہو۔ اس وقت پانچ ہزار سے بات کرنے کے لیے پانچ ہزار دروازوں پہ جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بس ایک ہی خطاب سے کام چل جاتا ہے۔ محکمہ آب پاشی میں کام کرنے والے یہ پانچ ہزار افراد، پانچ برس تک چاہے لیڈروں اور منسٹروں کی جوتیاں سیدھی کرنے میں لگے رہتے ہوں، لیکن وہ الیکشن میں اپنی اہمیت منوانا خوب جانتے تھے کیونکہ پانچ برسوں میں یہی ایک موقع آتا تھا جب محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے۔

بارے انھیں خطرہ محسوس ہوا کہ شہر کے پھیلاؤ اور علاقوں کی کانٹ چھانٹ کے نتیجے میں کہیں ان کی تعداد بکھر نہیں جائے، انہوں نے فوراً اس موضوع کو اپنا الیکشن ایشو بنا لیا اور جب اگلے انتخاب کا وقت آیا تو انہوں نے مانگ رکھ دی کہ ان کے لیے سرکار ایک الگ کالونی بسائے۔ یہ یک مشت پانچ ہزار ووٹوں کی یہ ایسی کوئی قیمت نہیں تھی جو وہ برسر اقتدار جماعت کی جیبوں میں نہیں ہوتی۔ اور پھر اسے کرنا بھی کیا تھا، صرف زمین ہی تو آلاٹ کرنی تھی، کون سا گھر سے کچھ جانا تھا، سو اس نے پانچ ہزار ملازمین کے لیے زمین آلاٹ کر دی۔ دوسری طرف برسر اقتدار جماعت کا رکن اس علاقے سے محض تین ہزار ووٹوں سے جیتا، یعنی ہر پانچ ہزار ووٹ اس کی مخالفت میں جاتے تو اس کی شکست یقینی تھی۔ زمین ملنے کے بعد کالونی بسانا کوئی کھیل نہیں ہے، لیکن محکمہ آب پاشی میں کام کرنے والے اس کھیل کے سارے رموز و نکات سے بھی واقف تھے، سو زمین پر مکانات بھی بنے، اسکول، اسپتال، مارکیٹ، پارک، سینما ہال بھی بنے، بجلی اور پانی کا بھی انتظام ہوا۔ کالونی کے افتتاح کے لیے صوبے کے چیف منسٹر کو زحمت دی گئی اور سچائی اور ایمان داری کے دیوتا مہاتما گاندھی کی یاد میں کالونی کا نام "گاندھی نگر" رکھا گیا۔ لوگ ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگے۔

تب پھر یہ ہوا کہ کالونی میں رہنے والے، محکمہ آب پاشی میں کام کرنے والے ایک فرد کا تبادلہ گنگا پہ بننے والے عظیم الشان پل کے پروجیکٹ پر ہو گیا جس میں کروڑوں روپیہ لگنے والا تھا۔ کالونی والوں کو اس کے جانے کا افسوس تو بہت ہوا لیکن جب وہ بے چارہ کمانے کے لیے جا رہا تھا تو اسے روکا بھی کیسے جا سکتا تھا، آخر آدمی دنیا میں کمانے ہی کے لیے تو آیا ہے۔ چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور اس کا مکان خالی ہو گیا۔ مکان بہت دنوں تک خالی رہا۔ وجہ یہ کہ وہاں محکمہ آب پاشی میں کام کرنے والے تو بہت آرام سے رہ سکتے تھے کہ وہ رہنے کا گر جانتے تھے، انہیں مہینے کے تیس دنوں تک ڈیوٹی نہیں کرنی پڑتی تھی، وہ تو اس روز جاتے تھے جب انہیں ہاتھ اور منہ کا ذائقہ بدلنے کی خواہش ہوتی اور کمال کی بات یہ تھی کہ ان کی غیر حاضری کو کوئی چیلنج بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ریکارڈ میں وہ کبھی غیر حاضر قرار نہیں پاتے تھے۔ پھر کالونی شہر سے دور بھی بہت تھی، ہر ایک کے پاس سواری تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے نئے مکانات تھے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ جنگل میں بھی ہوں تو آدمی منگل منا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عادتیں اور یہ سہولیات دوسروں کو کہاں نصیب ہو سکتی تھیں۔

جب لوگوں نے ایک روز مکان کا تالا کھلا دیکھا اور روشن دانوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنیاں دیکھیں تب انہیں پتہ چلا کہ اس مکان میں کوئی آگیا ہے۔ لیکن کون، اس کی انہیں کوئی خبر نہیں تھی۔ انہیں صدمہ ہوا کہ ان کے ساتھی نے کرایہ دار کے بارے میں ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ لیکن وہ شکایت کس سے کرتے۔

مکان دن بھر بند رہتا، اس میں دور دور تک زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے لیکن شام ہوتے ہی وہاں پر ہر چہار طرف روشنی دکھائی پڑتی اور خاص چہل پہل رہتی۔ رات بھیگتے بھیگتے وہاں ایسی زندگی نظر آتی کہ ساری کالونی کی زندگیاں پھیکی پڑ جاتیں۔ ہندوستانی اور مغربی موسیقی کی ایسی دھنیں سنائی دیتیں کہ سننے والوں کے دلوں میں رشک جگا دیتیں اور ایسی جھنکار، جو دلوں میں آگ لگا دیتی۔ اس رشک اور اس آگ نے طرح طرح کی باتیں پیدا کیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ مکان میں کون لوگ آئے ہیں، کیا کرتے ہیں، مکان باہر سے بالکل بند تھا لیکن موسیقی اور جھنکار اور جوانی سے بھرپور پُراسرار قہقہوں نے لوگوں کو اندر کے بارے میں بہت سی باتیں بتا دی تھیں۔

بڑے بزرگوں نے یہ بات محسوس کرنی شروع کر دی تھی کہ کالونی کے لوگ، خاص طور پر اس راستے کو اختیار کرتے ہیں اور یہ بالکل ناممکن تھا کہ کوئی اُدھر سے گذرے اور اپنی نگاہیں، نیچی رکھے۔ مکان کے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان ہمیشہ بند رہا کرتے لیکن اگر نگاہوں سے دیواروں میں چھید ہونا ممکن ہے تو اس مکان کی دیواروں میں ہزاروں، لاکھوں بلکہ لاتعداد چھید ہو چکے تھے اور نگاہ والوں نے اندر کا حال معلوم کر لیا تھا۔ راتوں میں جب مکان میں روشنی اور موسیقی ناچتی پھرتی تو اس کے آس پاس کی سڑکوں، جھاڑیوں، دیواروں اور مکانات کی چھتوں پر تاریکی چھائی رہتی اور اس تاریکی میں لاتعداد جگنو چمکتے رہتے۔ اس وقت، وقت ٹھہر جاتا اور ساری فضا ساکت ہو جاتی۔ ان جگنوؤں کو اگر اس مکان میں بکھیر دیا جاتا تو پھر اس مکان کی روشنی میں کیسے شبہ ہو سکتا تھا۔

لوگوں کو افسوس تھا کہ جب ان کا ساتھی رہا کرتا تھا اور وہ اس کے ہاں جاتے تو کبھی ان کی نگاہوں نے مکان کے وہ خفیہ اور نظر نہ آنے والے گوشے تلاش نہیں کیے جو اس وقت ان کے بڑے کام آتے۔ وہ مکان جس میں وہ بار بار آئے گئے تھے، اب ان کے لیے ایک ایسا معمہ بن گیا تھا جس کا راز کھلتا ہی نہ تھا۔ وہ لوگ تفریق کے ایسے گم شدہ خانوں میں بٹ گئے تھے جو ان کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل تھے۔ ان کے درمیان نوجوان، جوان، ادھیڑ اور بوڑھے تھے۔ ان میں کتنے ایسے تھے جو موقع ملتے ہی رسّی تڑا کر بھاگنے والے تھے، کتنے ایسے جو تازہ اور اجنبی ہواؤں میں سانس لینے کے لیے بے تاب رہا کرتے اور کتنے ایسے تھے جو ہمیشہ ایسی اوپری سطح پر رہتے جہاں سے کوئی بھی انھیں اپنی ہتھیلی پر چھان سکتا تھا۔ مکان میں دلچسپی لینے والوں اور رکھنے والوں کی اپنی سطحیں تھیں لیکن کالونی کے تقریباً سبھی لوگ کسی نہ کسی طرح مکان کے اجنبی رشتے سے آپس میں منسلک ہو گئے تھے۔ جو لوگ بوڑھے اور جہاں دیدہ ہو چکے تھے، ان کو سخت فکروں اور اندیشہ ہائے دور دراز نے آگھیرا تھا کہ جوانوں کا جو چلن تھا وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مکان کے بارے میں خوب تبصرے ہوتے ا خوب برائیاں بیان کی جاتیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ ہیں کون جو اس پُراسرار انداز میں ان کے درمیان رہ رہے ہیں۔ کالونی سے باہر جانے کے کئی راستے تھے لیکن اختیار وہی کیا جاتا جو مکان سے ہو کر جاتا، اور سبھوں کی یہ کوشش ہوتی کہ دوسرے اس بات کو جاننے نہ پائیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کے دل میں تھا۔

کالونی کے فکرمندوں نے نوشتۂ دیوار کو پڑھنے کی کوشش کی تو انہیں آڑے ترچھے بہت سے ایسے حروف دکھائی دیے جو نامعلوم دُنیاؤں کا پتہ بتاتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ہمیشہ بڑھ کر مینا ہاتھ میں اُٹھایا تھا۔ ان کی نگاہیں پہاڑوں کو چھید کر آر پار دیکھ لیتی تھیں بلکہ آپ پاشی میں کام کرنے والے لوگوں کا کریکٹر ہمیشہ بے داغ رہا تھا اور جب شہر میں کوڑے کرکٹ پر زندہ اور مُردہ ناجائز بچے کے پائے جانے کی اطلاع ملتی تو یہاں کے لوگ بڑھ چڑھ کر اس واقعہ پر تبصرہ کرتے اور گناہ کرنے والوں پر جی بھر کے لعنت بھیجتے اور اس پر فخر کرتے کہ ان کی کالونی ایسے گناہوں سے پاک و صاف ہے لیکن فکرمند صاف دیکھ رہے تھے کہ اُن کا یہ فخر زیادہ دنوں تک برقرار رہنے والا نہیں ہے کیونکہ ان کے بیچ ایک ایسا جنگل نمودار ہو گیا تھا جس میں آہستہ آہستہ لوگ کھو رہے تھے۔

کالونی کے لوگ اس مکان میں جانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس اُصول کے پابند تھے کہ نئے پڑوسی کو خود ہی پرانے پڑوسیوں سے اپنا تعارف کرانا چاہیے لیکن نئے لوگوں نے شاید اس کے بارے میں کچھ سُنا ہی نہ تھا۔ کتنے روز ہو گئے تھے انہیں آئے ہوئے، لیکن اب تک جانتے کی طرح

ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ دن کو مکان کے بند رہنے اور راتوں میں روشنی، موسیقی اور جھنکار، اندھیرے میں گاڑیوں کے آنے جانے اور نئے لوگوں کی پڑوسیوں کے ساتھ لاتعلقی نے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ وہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں اور یقیناً اُن کے ہاں برے لوگوں کا آنا جانا ہے۔ لیکن یقین ایمان کی طرح جلدی دلوں میں گھر نہیں کرتا۔ وہ تجسس کی فضا میں یوں مسحور ہوتے تھے کہ اگر ان سے پوچھا جاتا کہ آج کل وہ کن جہانوں کی سیر کر رہے ہیں تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سب سے زیادہ فکر مند عورتیں تھیں کہ اُن کے مرد آج کل یوں کھوئے کھوئے رہتے کہ کبھی پانی دال میں نمک کم لگتا، سبزی میں مرچ زیادہ۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت باہر گذار کر آتے، جب کہ بچوں کو بھی پتہ تھا کہ کالونی میں باہر وقت گذارنے کی کوئی مشین نہیں لگی تھی۔ ان کے پاس کام کی کمی تھی اور وقت کی زیادتی، اس لیے لوگ ایک دوسرے کے وقت میں ہاتھ بٹا کر اپنا وقت گذارتے۔ ان کی سوشل زندگی بڑی مکمل تھی۔ لیکن تحقیق و جستجو سے یہ بات معلوم ہوئی کہ لوگ اب بہت کم ایک دوسرے سے ملا کرتے ہیں۔ ان کے دل میں بیٹھا چور انہیں ایک دوسرے سے آنکھیں ملانے سے ڈرائے رکھتا۔ نئے لوگوں کے بارے میں سبھوں کے دلوں میں ان گنت سوالات تھے اور سب یہ سمجھتے تھے کہ دوسروں کے پاس جوابات موجود ہیں، لیکن زبان پر نہ سوال آتے نہ جواب۔ عورتوں میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پھیل رہی تھی۔ نئے لوگوں کے بارے میں جو کچھ مرد جانتے تھے، اتنا وہ بھی جانتی تھیں، فرق یہ تھا کہ وہ آپس میں کھل کر اور جی بھر کے باتیں کر چکی تھیں۔ لیکن انھیں مواد کے لیے بہت دور جانا پڑتا اور سنی سنائی پر زیادہ یقین کرنا پڑتا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ خود جا کر دیکھیں کہ وہ کون لوگ ہیں اور اندر کیا ہوتا ہے۔ لیکن پیش قدمی کرنے والا ان کے درمیان کوئی نہیں تھا۔ وہ ایسے ماحول کی پروردہ تھیں جس میں وہ وہی کرتی آئی تھیں جو ان سے کہا جاتا۔ وہ اپنے شوہروں اور باپ بھائیوں کی باتوں پر بے چون و چرا عمل کرتیں وہ آپس میں اور پڑوسیوں سے جب لڑنے پر آتیں تب ایسا لگتا جیسے کوئی محاذِ جنگ کھل گیا ہو جو ہار جیت کے فیصلے کے بغیر بند نہیں ہو سکتا۔ لیکن اتفاق سے کوئی منگڑی اُن پر آگرتی تو یوں بھاگتیں جیسے کوئی بم گرا ہو۔ راتوں کو جب کتے رونے اور بلیاں بلبلاتیں تو اُن کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی اور وہ اپنے بچوں اور شوہروں کی سلامتی کی دعائیں مانگنے میں رات گذار دیتیں۔ وہ آنے والی تمام آفتوں اور مصیبتوں سے نہ صرف واقف تھیں بلکہ ان کے پاس ان کے تدارک کی تدابیر بھی تھیں۔ لیکن یہ جو آفت انہیں اپنے گھروں پر منڈلاتی دکھائی دے رہی تھی، اس سے وہ ہرگز واقف نہیں تھیں اور نہ ان کے پاس کوئی نسخہ ہی تھا۔ ان کے شوہروں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ تو ان کے صبح اور شام کو دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھیں کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ پتہ نہیں کیوں انہیں یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر وہ ان سے براہِ راست کوئی سوال کریں گی تو وہ کبھی ان سے سچ نہیں بولیں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے جب بھی انہوں نے اپنے مردوں سے براہِ راست کوئی سوال کیا اور انہیں جو بھی جواب ملا، اسے سو فی صد سچ ماننے میں انہیں کبھی کوئی تامل نہیں رہا۔

کالونی کے لوگوں کے درمیان ایک کمیٹی تھی جو شادی، موت اور دوسرے سماجی تقریبات میں ہاتھ بٹاتی۔ اس کے قانون میں یہ بات درج تھی کہ اگر ان کے درمیان کوئی مصیبت آجائے یا کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو تو اسے دور کرنے کے لیے کمیٹی کی بیٹھک بلائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ کالونی میں رہنے والے کم سے کم دس افراد ایسا مطالبہ کریں۔ جب کمیٹی میں یہ نکتہ شامل کیا گیا تھا تو کچھ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا کہ بھلا سرکاری قانون اور اس کے لاؤ لشکر کے رہتے ہوئے کمیٹی کا قانون کیا کر سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت کمیٹی نے دفتر شادی و اموات ہی کی شکل اختیار کر لی تھی اور جھگڑے فساد کی نوبت اس لیے اب تک نہیں آئی تھی کہ یہاں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں آباد و شاد کام تھے۔ ان کے پاس جھگڑوں کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ وہ تو شروع ہی سے بڑے سمجھدار اور دُور اندیش تھے۔ مگر جب اس نئی صورتِ حال سے نپٹنے میں اندر کے سبھی ضابطے ناکام ہو گئے اور سرکاری قانون کے ابواب میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تو لوگوں کو یاد آیا کہ ابھی اُن کی کمیٹی باقی ہے اور ابھی امید کا دامن ہاتھوں سے چھوڑنا غیر دانشمندی ہے۔ دس افراد کے دستخط سے اس کی بیٹھک بلانے کی درخواست دے دی گئی جو ظاہر ہے، منظور ہو گئی اور بیٹھک کی تاریخ مقرر ہوئی۔ مقررہ تاریخ پر جب کمیٹی کی بیٹھک ہوئی تو اس میں بہت ہی مخصوص افراد شریک تھے اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ان کے سامنے کوئی ایجنڈا ہی نہیں تھا جس پر وہ گفتگو کرتے۔ لیکن بیٹھک بہر حال آئینی تھی اور انہیں اسے کوئی نہ کوئی رنگ دینا ہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے مجموعی صورتِ حال پر غور و خوض کیا، چند ایک باتوں پر مشورے کیے اور پھر اگلی نشست کا وعدہ کر کے اٹھ گئے۔

دوسری صبح جب کہ کالونی کے لوگ اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے، چند افراد نے لوگوں کے مکان کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ کافی دیر تک گھنٹی بجنے کے بعد ایک چھوٹی سی بچی نے دروازہ کھولا۔ یہ بتانے پر کہ وہ صاحب خانہ سے ملنا چاہتے ہیں، اس نے نشست گاہ کھول دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر کو جانے والے دروازے کا پردہ ہلا اور ایک نسوانی آواز نے انہیں مخاطب کیا۔

"فرمایئے"

"بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس کالونی کے رہنے والے ہیں اور صاحب خانہ سے ملنا چاہتے ہیں"

"کیوں۔؟"

"کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"

"تو پھر اس کے لیے آپ کو قبرستان جانا پڑے گا۔ پچھلے سال ایک حادثہ میں ان کی موت ہو چکی ہے"

اب ان لوگوں کے پاس نہ ضروری باتیں تھیں اور نہ زبان۔ لیکن وہ خاتون اپنے بارے میں بتاتی رہیں۔ ان کے شوہر ایک اچھے سرکاری عہدے پر تھے لیکن تھے بہت ایمان دار۔ رشوت کی کمائی کو حرام جانتے تھے، نتیجہ یہ کہ جب اچانک ان کی موت ہو گئی تو ان کے پاس بس اتنے ہی پیسے تھے جن سے ان کی تکفین و تجہیز ہو سکی۔ بعد میں سرکار کے پاس جمع ان کی پونجی ملی تو دال روٹی کے چلنے کے سامان پیدا ہوئے۔ چار لڑکیاں تھیں اور سب کی سب جوان۔ شادی کسی کی نہیں ہوئی اور ابھی کوئی آثار بھی نہیں۔ ان کے کچھ رشتہ دار اور شوہر کے کچھ دوست ہیں جو ان لوگوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ وہ اور ان کی لڑکیاں دن بھر کروشیا کا کام کرتی ہیں جن کی کچھ اجرت مل جاتی ہے۔ اس استفسار پر کہ یہ مکان انھیں کیسے ملا، انہوں نے بتایا کہ جس کا مکان ہے، وہ ان کا رشتہ دار ہے جس نے بہت کم کرایہ پر یہ مکان انہیں دے رکھا ہے۔ اندر سے ان کے لیے چائے بھی آئی اور کھانے کا کچھ نفیس سامان بھی ـــ بے حد معصوم اور مظلوم داستان تھی ان کی، جس میں کہیں بھی کوئی ایسا خانہ نہیں تھا جس میں کوئی رنگ بھرا جا سکے۔ وہ خاصے متاثر ہوئے تھے اور ان کے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھرے تھے۔ اب تک وہ کچھ سوچتے رہے تھے، اس پر انھیں شرمندگی تھی۔ وہ تو وہاں سے واپس آنے کے بعد انھیں پتہ چلا کہ یہ تو انہوں نے پوچھا ہی نہیں کہ راتوں میں وہاں روشنی کیوں ہوتی ہے، موسیقی کیوں بپا ہوتی ہے اور جھنکار کی آواز کیوں آتی ہے۔ دوسرے لوگوں کو جب یہی داستان سنائی تو وہ ان کے اندر ہمدردی کی دنیا نہیں جگا سکے بلکہ دوسروں کو تو داستان کا وہ حصہ سب سے خطرناک لگا جس میں چار جوان لڑکیاں تھیں۔ جب کمیٹی کی دوسری بیٹھک ہوئی تو اس میں زیادہ لوگ شریک ہوئے، سبھوں نے سر جوڑ کر اس بات کی بہت کوشش کی کہ داستان کے ذریعہ ان کی معلومات میں کہیں کچھ اضافہ ہو، لیکن انھیں پتہ چلا کہ جتنا کچھ انہیں معلوم ہوا ہے، اس سے کہیں زیادہ وہ پہلے سے ہی جانتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا تب وہ زیادہ جان کاری رکھتے تھے اور جب انھوں نے معلوم کیا تب ان کی معلومات میں کمی ہوئی۔ وہ ایک ایسی صورت حال میں پھنس گئے تھے کہ نہ وہ آگے جا سکتے تھے نہ پیچھے۔ انہوں نے حالات کو سب کچھ سونپ دیا اور مطمئن ہونے کی کوشش کی۔

خاتون اپنی لڑکیوں کو اس طرح چھپا کر رکھتیں کہ کالونی والے ان کی ایک جھلک تک سے محروم رہے۔ دلچسپی رکھنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ لوگوں نے اندر کی معلومات حاصل کرنے کے لیے بہت سے ہتھکنڈے اپنائے۔ گھر گھر کی خبر رکھنے والیوں نے خوب کمائی کی اور جھوٹی سچی خبروں کو اونچے داموں پر بیچا۔ راتوں کے پچھلے پہر مکان میں پتھر برسے، پتھروں کو پیغام رسانی کے کاغذات سے خوب لپیٹا جاتا۔ ان حرکتوں میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے بارے میں کوئی قطعی ثبوت نہیں مل سکا، لیکن لوگ قسم کھا کر ایک دوسرے سے کہا کرتے کہ وہ اندر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں، کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں جاننے کی جستجو ہے نہ خواہش۔ ان کی خبر کون رکھتا لیکن بیویاں اپنے شوہروں کی آنکھوں کو پڑھ رہی تھیں جس کی تحریر بہت گنجلک تھی، مائیں اپنے بیٹوں کے پاؤں کی لغزشوں کو پہچان رہی تھیں، بہنیں بھائیوں کے موڈ کو دیکھ کر خاموش تھیں اور نظر والے دیکھ رہے تھے کہ مکان کے آس پاس کے علاقے بہت پر رونق ہو گئے ہیں۔ مکان کے تین طرف بڑی اونچی اونچی بلڈنگیں تھیں جن میں درجنوں فلیٹ تھے۔ راتوں میں جب ان فلیٹوں میں روشنیاں ہوتیں تو دور سے دیکھنے پر

ایسا لگتا جیسے ان میں اچانک خوشیوں کے چراغ جل اٹھے ہوں، اب یہ تھا کہ ان فلیٹوں کو سیاہیاں نگل چکی تھیں۔ رات گئے تک کھڑکیوں اور روشن دانوں میں وہ آنکھیں چمکتی رہتیں جن میں تجسس اور بے اطمینان کی لہریں ڈیرہ جما چکی تھیں۔ اس وقت اگر اچانک کوئی تیز سرچ لائٹ آجاتی تو پتہ نہیں کتنے جگنو اس میں ڈوب جاتے اور کتنے راز افشا ہو جاتے۔ یہ بھی خبر تھی کہ اب لوگ وقت بے وقت غائب بھی رہنے لگے ہیں اور اُن کے چہروں پر اُن کے راز لکھے ہوتے ہیں۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ اب اس مسئلے پر ان کے درمیان بات ہی نہیں ہوتی تھی، ورنہ بہت سی باتیں بغیر معلومات حاصل کیے معلوم ہو جاتیں اور بے سمت دوڑنے والے قیاس آرائیوں کے گھوڑوں کو قرار آجاتا۔ جب کسی نے اس مسئلے کو چھیڑنے کی کوشش کی تو جواب ملا کہ شریفوں کو رذیلوں کے بارے میں باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔

آخر ایک بار پھر کمیٹی سے رجوع کیا گیا۔ میل بیٹھنے کی اس سے اچھی کوئی دوسری جگہ نہیں تھی اور لوگوں کو اس کا چسکہ پڑ چکا تھا۔ معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بیٹھک کی ایک تاریخ پھر مقرر ہوئی۔

بیٹھک ایک ہال میں بلائی گئی تھی۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو سو آدمی شریک ہوں گے لیکن ہوا یوں کہ جیسے اس دن ساری کالونی امنڈ آئی۔ ہال میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ رہی تو بیٹھک کو کھیل کے بڑے میدان میں منتقل کر دیا گیا۔ اتفاق یہ کہ پورا میدان بھر گیا لاؤڈ اسپیکر اور دوسرے لوازمات نے اس کی شان میں مزید یہ اضافہ کر دیا۔ جب نئے لوگوں کے بارے میں تمام باتیں رکھی گئیں اور انہیں کالونی کے اخلاق و تہذیب کے لیے ایک خطرہ عظیم بتایا گیا تو سارا جلسہ غصہ سے بھر گیا اور نئے لوگوں کو نکال باہر کرنے کا مطالبہ کرنے لگا۔ ایسا لگا جیسے کوئی خاموش لاوا تھا جو اچانک پھٹ پڑا ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ صورت حال غیر متوقع اور عجیب تھی۔ عام طور پر یہی خیال تھا کہ نئے لوگوں نے کالونی کے لوگوں کے درمیان گھر کر لیا ہے اور ان کے خلاف زبان سے کچھ نکالنا آسان نہیں ہوگا۔ لیکن وہاں تو دو چار ہی بار میں نعرے لگنے لگے اور منٹوں میں ایسی اشتعال انگیزی ہوئی کہ سارا جلسہ اسی وقت وہاں جا کر ان لوگوں کی پٹائی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ان لوگوں کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ شہر سے دور آجانے کی جو نعمت اخلاق و تہذیب کے تحفظ کی شکل میں انہیں حاصل ہوئی تھی، اسے ان نئے لوگوں نے یوں تباہ کر دیا کہ اب کالونی میں ان جرثوموں کا نام بھی نہیں لیا جاتا۔ غیض و غضب کی یہ صورت حال دیکھ کر وہ لوگ بھی ڈر گئے جو کمیٹی کی بیٹھک بلانے میں پیش پیش تھے۔ اگر یہ بھیڑ اس غصہ کے عالم میں وہاں چلی جاتی تو پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جاتا اور قانون کی نجانے کتنی دھجیاں اڑتیں، اور سارا الزام آتا اُن پر کہ جلسہ بلانے کے گنہگار وہی قرار پاتے۔ لوگوں کو سمجھایا گیا کہ طیش اور غصہ میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں جب کہ ہمارے ہاں جمہوری طریقہ کار موجود ہے تو ہمیں اسے استعمال کر کے مہذب ہونے کا ثبوت دینا چاہیئے۔ بات معقول تھی اور اتفاق یہ کہ لوگوں کی سمجھ میں بھی آگئی۔ طے پایا کہ پہلے نئے لوگوں کو ایک وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا جائے اور پھر بیٹھک کی تاریخ مقرر کر کے انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ پھر آگے کی کارروائی کی جائے۔ ظاہر ہے کہ جب الزام ثابت ہے تو پھر وہ لوگ صفائی کیا پیش کر سکیں گے، اس کے بعد وہ لوگ بھی کارروائی کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ چنانچہ نئے لوگوں پر الزامات کی ایک فہرست تیار کی گئی اور انہیں صفائی پیش کرنے کو بلایا گیا۔ اس وقت تک کے لیے کالونی کے اندر جو چہل پہل اور خاموشی رہی، اسے کوئی نام نہیں دیا گیا۔ کمیٹی کے دفتر میں جو رونق رہی، اسے تاریخی قرار دیا گیا۔ صفائی پیش کرنے کی تاریخ آئی اور نکل گئی۔ نئے لوگوں کا کوئی پتہ نہیں تھا، اُن کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ لوگوں نے ان کی خاموشی کو بہت معنی پہنائے اور اسے کالونی کے لوگوں اور کمیٹی کی بے عزتی پر محمول کیا گیا۔ تب پھر کمیٹی کی بیٹھک ہوئی۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ آخر ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس شخص کو بلایا گیا جو الزامات کی فہرست لے کر ان لوگوں کے پاس گیا تھا۔ پتہ چلا کہ فہرست کو ان لوگوں نے بہت خندہ پیشانی کے ساتھ وصول کیا، ان کے چہرہ پر پریشانی اور گھبراہٹ کا نام و نشان نہیں تھا۔ اب کرنا بھی کیا تھا، جمہوری طریقہ کار میں وہ لوگ اب کافی آگے جا چکے تھے، اس سے ہٹنا ممکن نہیں تھا، جمہوری قدروں کی لاج تو رکھنی ہی تھی، چنانچہ فیصلے کا دن مقرر کر لیا گیا۔

زیادہ سے زیادہ لوگ جمہوریت سے مستفیض ہو سکیں، اس کے لیے چھٹی کا دن طے کیا گیا۔ کالونی کے سارے لوگ کھیل کے میدان میں پھر جمع ہوئے۔ پچھلے جلسے سے لے کر اب تک کی ساری کارروائی سے مجمع کو باخبر کیا گیا۔ غصہ کی تیز لہر پھر دوڑ گئی۔ اب کے لوگ کر دیا مر دکے موڈ میں تھے۔ تجویز آئی کہ جمہوریت کی ساری شرائط پوری کی جا چکیں، اس کے لیے اب فیصلہ ہونا چاہیئے۔ لوگ تو اسی وقت چڑھائی کرنا چاہتے تھے —

فکر مندوں کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ تھا۔ کہاں تو اب تک وہ کالونی کے نوجوانوں کی بے راہ روی سے سخت فکر مند تھے کہ ان کی راتوں کی نیند اور دن کا چین تک حرام ہو گیا تھا اور وہ کڑھ کڑھ کے جی رہے تھے اور کہاں اب یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کے غیض و غضب سے ڈر رہے تھے کہ پتہ نہیں یہ کیا رنگ لائے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ لوگ کسی طرح ماننے والے نہیں تو پھر انہوں نے جمہوریت کا سہارا لیا۔ ان کا کہنا تھا جمہوریت ایک بہت ہی پیاشہ راہ عمل ہے جس کو اپنانا کبھی رائیگاں نہیں جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ اس کا اثر فوری طور پر نظر نہیں آئے لیکن دیر اور دور کی شرط کے ساتھ یہ بے اثر ہو جائے، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ دو ہی باتیں سامنے تھیں، ان لوگوں کو کالونی میں رہنے دیا جائے یا یہاں سے نکال دیا جائے۔ طے پایا کہ اس پر ووٹنگ کرالی جائے۔ اس کے لیے سیاہ اور سفید دو کاغذوں کا استعمال کیا جائے چنانچہ سیاہ کاغذی لاتعداد دھجیوں پر "ہاں" لکھا گیا اور سفید پر "نہیں"۔ پھر ان کاغذی دھجیوں کو لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔

ووٹ دینے کے لیے لوگوں میں بہت جوش و خروش تھا۔ یوں تو اس کے نتیجے کے بارے میں لوگوں کے اندر خاصا اطمینان تھا، لیکن محض جمہوری کارروائی کی تکمیل کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا۔

جب بیلٹ بکس کو گنتی کے لیے کھولا گیا تو سیاہ کاغذی دھجیاں اس میں بھری ہوئی تھیں اور جو کہیں کہیں سفید کاغذ بھی تھے تو ان کی سفیدی بھی سیاہی میں مدغم نظر آئی تھی۔ ——— یہ کالونی کے لوگوں کی اکثریت کی نہیں، جمہوریت کی کامیابی تھی۔ ◆◆

بقیہ صفحہ ۲۴ دھنستی ہوئی زمین

ہڈیوں کے ہتھیار ہیں۔ یہ گپھاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کی کوئی زبان نہیں۔ یہ جانوروں کی کھال سے جسم ڈھانکتے ہیں۔ . . . .

تو کیا میرا سفر مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف رہا ہے ؟ -

میں اپنے عہد سے کتنے پیچھے آگیا ہوں۔ مجھے فوراً واپس ہونا چاہئے۔ میں اپنے عہد سے کٹ کر جی نہیں سکتا۔ میں ضرور واپس جاؤں گا۔ ان تمام جنگلوں اور طوفانوں کو دوبارہ پار کروں گا،، ——— وہ بھاگتا ہے۔ ——— ——— بہت تیز بھاگتا ہے۔

مگر محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے ساتھ پورا جنگل، تمام پہاڑیاں، ندیاں اور گپھائیں بھاگ رہی ہیں۔ اور وہ خود ان سب کے درمیان گردش کر رہا ہے ◆◆

حفیظ آتش

نیا مدار

نہیں اب ضمیر شاہ سوزی کے منشی
تمہارے سرسے فریادوں کے گٹھر
جو اتاریں
اور تمہیں انصاف دلوائیں
کسے آواز دیتے ہو
یہاں کوئی نہیں ہے
کہ یہ پُرسوز آوازیں
یہ چیخیں
کسی بھی بادشاہِ وقت کو
چونکائیں
یہ سارے شاہ
اور منشی
دروں کو بند کرکے جا چکے ہیں
قلم کے تاجروں کی سبز وادی میں
عبادت کر رہے ہیں خود پرستی کی
انھیں تم کیا جگاؤ گے
کہ ان سے صورِ اسرافیل بھی
ٹکرا کے لوٹے گی

● بازار شفاعت پوتہ، امروہہ (یو، پی)

راشد جمال فاروقی

تبدیلی

ادھر کچھ دن سے میرا لاڈلا بیٹا
بلوغت کی حدیں چھونے لگا ہے
اسے نازک رنگا رنگ تتلیاں خوش آرہی ہیں
وہ اکثر گنگناتا ہے دھنک نغمے
اب اس کی پتلیوں میں سبز فصلیں لہلہاتی ہیں
وہ سوتا ہے تو خوابوں میں کہیں گل گشت کرتا ہے
اب اس کی مسکراہٹ میں چبھن ہے
اور اس کے ہاتھ گستاخی کے جویا ہو چلے ہیں
وہ کانوں پر یقیں کرنے کو راضی ہی نہیں ہے
اسے اسباق کی سچائیوں پر شک گذرتا ہے
وہ اب ہر چیز کو چھو کر پرکھنا چاہتا ہے

● اے-۱۵۲۸-آر، ڈی، پی، ایل ویر بھدر (دہرہ دون)
۲۴۹۲۰۲

محی الدین عادل

قادرِ مطلق

ایشور
مندروں کے مرتبان میں بند
خدا
مسجدوں میں مقید
لاچار
بے بس
اپنگ
اور ہم قادرِ مطلق آزاد کہ
جب چاہیں مندروں کے مرتبان توڑیں
مسجدوں میں آگ لگائیں
خون بہائیں اس کے نام پر
جسے ہم نے بند کر رکھا ہے
اور سمجھتے ہیں کہ سرشٹی کی رچنا اس نے نہیں
ہم نے کی ہے۔

● گلاب جانز لین، جی، ایس روڈ، پوسٹ آفس بھلواڑی، جمشید پور

مصحفی کے ایک ممتاز شاگرد ـــ محمد عیسیٰ تنہا

اکبر حیدری کاشمیری
۳۴۸ نرسنگ گڑھ۔ سرینگر۔ ۱۰ (کشمیر)

شیخ محمد عیسیٰ نام اور تنہا تخلص ہے[1]۔ ان کے آبا و اجداد دہلی کے تھے۔ لیکن تنہا کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی، وہیں نشوونما پاکر پروان چڑھے[2]۔ مؤلف خمخانۂ جاوید کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ تنہا دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے وقت کے باکمالوں کی طرح دلی کو خیرآباد کہہ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی[3]۔

تنہا کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ وہ ایک شریف النفس انسان تھے۔ خوش خلق، سلیم الطبع اور رنگین مزاج کے اوصاف کے علاوہ قدامت پرستی ان کا خاص شیوہ تھا چنانچہ تمام عمر لکھنؤ میں رہے پھر بھی دہلی کی زبان اور قدیم رنگ نہ چھوڑا[4]۔

تنہا سپاہی پیشہ تھے اور تلوار کے ساتھ ساتھ گردش قلم کا بھی مظاہرہ کرتے تھے۔ کم سنی میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور جو کچھ کہتے تھے وہ بغرض اصلاح مصحفی (متوفی سنہ ۱۲۴۰ ہجری) کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ وہ مصحفی کے مشہور اور ممتاز شاگردوں میں تھے۔ مصحفی کو ان کی شاگردی پر بڑا فخر تھا اور وہ انھیں "سرآمد تلامذہ" کہتے تھے[5]۔

تنہا کی تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ تذکرۂ ہندی کے وقت تالیف سنہ ۱۱۹۷ء تا سنہ ۱۲۰۹ ہجری (مطابق سنہ ۱۷۸۳ء تا سنہ ۱۷۹۴ ہجری) ان کی عمر ۲۷ سال کی تھی۔ اگر مصحفی نے ان کا ترجمہ سنہ ۱۲۰۹ ہجری میں لکھا ہوگا تو پھر اس حساب سے تنہا کی ولادت لگ بھگ سنہ ۱۱۸۲ ہجری مطابق سنہ ۱۷۶۹ء میں قرار دی جاسکتی ہے۔ مصحفی کے الفاظ یہ ہیں!۔

"عمرش قریب بست و ہفت رسیدہ، جوان صلاحیت شعار و خوش اطوار، از ابتدائے عمر بہ سبب موزونی طبع چیزے موزون می کرد۔ و حالا ریختہ گفتہ وی گوید و از نظر فقیر می گذارند، خیالش بسیار رساست"[6]

تنہا صاحب دیوان تھے[7]۔ ریختہ کے علاوہ سلام اور مرثیہ بھی کہتے تھے۔ اس فن کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی کا بھی شوق تھا[8]۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے۔ مؤلف خمخانۂ جاوید کہتا ہے کہ!۔

"تنہا کا کلیات سنہ ۱۲۳۲ ہجری (مطابق سنہ ۱۸۱۷ء) کا لکھا ہوا جس میں ۸۰ صفحوں پر غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی، چند مخمس اور ۲۵ رباعیاں درج ہیں راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ انہوں نے دیوان میں اکثر مقامات پر قدیم زبان کا تتبع کیا ہے اور فارسی ترکیبوں کے ترجمے بہت استعمال کیے ہیں۔ اگرچہ دلدادگان طرز ناسخ و آتش نے انہیں بالکل فراموش کر دیا مگر اس سے ان کی مشاقی و استادی میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ مصحفی کے شاگردوں میں آتش کے بعد ان کا نمبر سمجھنا چاہیئے"[9]

مصحفی تنہا کے بڑے قدردان تھے۔ مصحفی اور انشا کی معرکہ آرائیوں کے بعد جب مصحفی گوشہ نشین ہوگئے تھے تو یہ تنہا ہی تھے جن کی خواہش پر انھوں نے لکھنؤ میں بیرون شہر روشن آرائیں محفل مشاعرہ قائم کی جس میں وہ بھی جو پہلے سے بددل تھے شرکت کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ!۔

پیش ازیں چند سال زمانہ بود کہ من مسکین از بے ادائی دوستان زبانی زبان نطق بکام کشیدہ، بگوشۂ عزلت و قناعت گلیم سینہ تنگی بر دوش افگندہ، گمنام وار بسری بردم و بر شعر و شاعران و ملاقات امیران تبرائی کردم و وحشی وار ازیں قوم می رمیدم تا ایں کہ نظم طبیعت مرا اندک باز دام کردن گرفت و سبب سلسلۂ جنبانیٔ سخن گردیدہ، بایں طریق کہ روزے شیخ محمد عیسیٰ تنہا تخلص آمدہ

عرض کرد کہ اے قبلہ! اگر بجائے مشق ما مردم صحبت جلسہ انعقاد دادہ شود، اغلب کہ در رائے شریف ہم اولیٰ و انسب باشد ، التماس ایشان را پذیرکردہ در دیوانہ بیرون شہر کہ روشن آرائی گویند بایں روشن دلے خالی می کردیم و شریک جلسۂ غیر شاگرداں دیگرے کم شد ، چوں مراد در آں روز تعطیل محض بود، ایں شغل را بپاس خاطر دوستاں در پیش گرفتم"[۲۰]

مصحفی کے ہاتھوں تنہا کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ لالہ بنی پرشاد ظریف[۲۱] شاگرد مصحفی ایک دوسرے شاعر گور بخش تخلص ادیب[۲۲] کو مصحفی کی شاگردی کے لیے اپنے استاد کے پاس حاضر ہوئے۔ انہوں نے ادیب کے کلام پر اصلاح دی۔ ادیب نے اپنا کلام مشاعرے میں سنایا۔ سامعین نے اسے پسند کیا اور داد دی۔ ایک دو دن بعد تنہا مصحفی کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ وہ ادیب کے کلام پر اصلاح نہ دیں۔ مصحفی نے تنہا کی رائے سے اتفاق کیا اور بعد ازاں ادیب کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس بارے میں مصحفی کے الفاظ یہ ہیں!۔

"بعد یک دو روز محمد عیسیٰ تنہا کہ یکے از تلامذۂ فقیر بود، لفرمیدہ منع اصلاح نظم او بہ زبان آورد، گفت کہ اے قبلہ! اگر ہم چنیں ہر کس و ناکس را جناب در محفل قریب خوش جا خواہند داد مرتبۂ ما مردم کہ عمرے دریں فن بخدمت شریف استخواں شکستہ ایم کجا خواہد ماند؟ از استماع ایں سخن من ہم متامل شدہ نصیحتِ ناصح را کہ حق شاگردی او کثیر بود دلپذیر شدم و از در گزشتم"[۲۳]

تنہا نے مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں کئی لوگوں کو شامل کیا تھا۔ ان میں بھیروں داس تمنا[۲۴] لالہ کنور سین مضطر[۲۵] اور موجی رام موجی[۲۶] قابل ذکر ہیں۔

بعض تذکرہ نویسوں کی نگاہ میں تنہا کی شاعرانہ عظمت اس لیے بھی اہم ہے کہ انہوں نے ناسخ کے سے بلند پایہ اور مسلم الثبوت شاعر کو شاگرد تنہا قرار دیا ہے۔ ناصر لکھنوی مصحفی کے حوالے سے ناسخ کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ناسخ کو تنہا سے تلمذ حاصل تھا[۲۷] مؤلف بزم سخن کا قول ہے کہ!۔

"او ناسخ از محمد عیسیٰ تنہا اصلاح می گرفت۔ باز انحراف ورزید"[۲۸]

یہ خبر غالباً سب سے پہلے میر حسین علی تاسف[۲۹] شاگرد میر شیر علی افسوس نے اڑائی تھی کہ تنہا کلام ناسخ پر اصلاح دیتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں کہ!۔

"صاحبانِ دانش و مردمانِ بینش اس ماجرے سے واقف و مطلع ہیں کہ شیخ امام بخش ناسخ ابتدائے شوق میں تلمذ تنہا میاں سے وہ شاگرد میاں مصحفی مرحوم کا تھا ایک مدت تک رہا ہے"[۳۰]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصحفی نے اپنے تذکروں میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ ناسخ (م ۱۲۵۴ھ) شاگرد تنہا تھے۔ مصحفی نے دیوان ششم ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں ترتیب دیا تھا۔ اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ!۔

"شیخ امام بخش ناسخ کہ یکے از دوستانِ محمد تنہا ست و بہ فقیر ہم رسوخ از تہ دل دارد"

اگر تنہا کو واقعی ناسخ کی استادی کا شرف حاصل ہوتا تو مصحفی نے صاف صاف لکھ دیا ہوتا۔ اس لیے یہ کہنا بعید از حقیقت ہے کہ تنہا کلام ناسخ پر اصلاح دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ تنہا اور ناسخ کے تعلقات بڑے استوار تھے۔ ناسخ کی شاگردی کے علاوہ ناصر یہ بھی لکھتے ہیں کہ!۔

"مرزا خانی نوازش سلمہ فرماتے تھے کہ تنہا اور ناسخ میں الفت حد سے زیادہ تھی اور اکثر مصحفی کے شعروں پر اعتراض کرتے تھے اور یہ کچھ نہ کہتا تھا"[۳۱]

تنہا آخر عمر تک لکھنؤ میں ہی رہے۔ یہاں تک کہ فیض آباد بھی نہیں گئے، حالانکہ اس عروس البلاد کی یاد انہیں بے حد ستاتی تھی۔ اس کا ذکر ان کی غزلوں میں بھی بڑے مضطربانہ انداز میں ملتا ہے۔ جنہیں ہم نے نمونۂ کلام میں درج کیا ہے۔ یہاں صرف دو مطلعے پیش کیے جاتے ہیں ؎

جاؤں کس شکل سے میں بے سر و پا فیض آباد | سخت دشوار ہے جانا مجھے تا فیض آباد
دھیان رہتا ہے یہی جی سے چھٹا فیض آباد | دیکھیں کس روز دکھائیگا خدا فیض آباد

مجمع الانتخاب کے وقت تالیف (۱۲۱۹ھ) لکھنؤ میں تھے اور شاہ کمال سے صورت آشنا تھے[۳۲] مصحفی کے ریاض الفصحاء کے سال آغاز ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء تک لکھنؤ میں بقید حیات تھے۔ مؤلف خمخانۂ جاوید کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ۱۲۲۲ھ ہجری میں لکھنؤ جاتے تھے کہ راہ میں ڈاکوؤں نے قتل کر ڈالا[۳۳] ناصر لکھنوی لکھتے ہیں کہ!۔

جب محمد علی تنہا مرض موت میں مبتلا ہوا۔ زوجہ نے تنہا کی کہا کہ تم میں اور ناسخ میں نہایت محبت ہے۔ اگر اپنی تنگ دستی اس سے کہلا بھیجو کچھ ننگ و عار نہیں۔ تنہا نے اس حقیقت باوفا سے کہا کہ تمام عمر وہ اپنا ہاتھ دیکھا کیے ہیں۔ اب اس کا دستِ نگر ہونا غیرت سے بعید ہے۔ اس دُور اندیش نے شوہر سے خفیہ شیخ سے ان کی عسرت ظاہر کی۔ وہ پیغام یہ جب حاضر ہوا ناسخ نے فرطِ اندوہ سے زانو پر سر جھکا لیا۔ بعد یک لحظہ کے صندوقچہ طلب کیا اور دو سَو روپے اپنے آدمی کے ہاتھ اس پیغام بر کے ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیے کہ ایسے خادم سے اکراہ اور ننگ و عار نہ چاہیے۔ آخر اس مرض سے تنہا نے انتقال کیا۔"[25]

راجہ صاحب محمود آباد کے گنجینۂ نوادر میں دیوانِ ناسخ کا ایک بہت ہی معتبر اور پرانا نسخہ قبل از ۱۲۳۶ ہجری (مطابق ۱۸۲۰ء) کا مکتوبہ زیرِ نمبر ۹۶ محفوظ ہے۔ اس میں تنہا کی حسبِ ذیل تاریخ وفات درج ہے۔

مونسِ جانِ حزیں دشت بلاخیز میں آہ | اُٹھ گیا سوئے عدم چھوڑ کے ہم کو تنہا
کلکِ ناسخ نے لکھا مصرعِ تاریخِ وفات | آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا

۱۲۳۲ ہجری (۱۸۱۶ء)

مؤلف خمخانۂ جاوید اور ناصر نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے۔ حسرت موہانی نے اُردوئے معلیٰ میں تنہا پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا۔ اس میں تنہا کی ولادت ۱۱۷۰ ہجری اور تاریخ وفات ۱۲۳۲ھ بغیر کسی حوالے کے درج کی گئی ہے[26] یہ دونوں تاریخیں غلط معلوم ہوتی ہیں۔

تنہا نے اپنے اشعار میں مصحفی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

تنہا نہیں کسی کا زمانہ میں کوئی دوست | یہ نقش میرے دل پہ میاں مصحفی کی بات

تنہا اردو کے مسلّم الثبوت استاد شاعر تھے۔ ان کے اشعار دلکش اور پسندیدہ خاطر ہیں[27] وہ اپنے عہد میں یکتا اور بے مثل تھے[28] معلوم نہیں کہ ان کا دیوان کہیں محفوظ ہے کہ نہیں۔ آج سے ستر بہتر سال قبل حسرت موہانی نے ان کا انتخاب شائع کیا تھا یہ بھی اب کمیاب ہے۔ مختلف قلمی و مطبوعہ تذکروں سے ان کے اشعار یکجا کر کے پیش کیے جاتے ہیں!۔

اگر شعلہ بنا ہے یہ دل بے تاب آتش کا | جیا ہے ہمارے پاس ابھی اسباب آتش کا
وہ میر اشعلہ خواہش کا پکار بھبوکا ہے | کہ جس کو دیکھ کر ہوتا ہے دل بیتاب آتش کا
لباس سرخ میں یوں ہے صباحت اس کے پنڈے کی | پہن نکلا ہے گویا پیرہن مہتاب آتش کا
لگا دی آگ ساقی نے لنڈھا کر شیشہ مے کو | بہایا اس نے شب محفل میں کیا سیلاب آتش کا
سنا جس دن سے ہم نے طور کا قصہ اسی دن سے | ہمارے دل پہ ثابت ہو گیا آداب آتش کا
دماغ ان کے ہیں وہ داغ جو پہونچے ہیں راتوں کو | تیرے سودائی اکثر دیکھتے ہیں خواب آتش کا

پسینہ اس کے رونے آتشیں پر آن کر دیکھے
نہ دیکھا ہو کبھی جس نے کہ تنہا آب آتش کا

ہو کر خفا جو مجھ سے وہ یکبار اُٹھ گیا | مجلس سے میں بھی رات کو ناچار اُٹھ گیا
یہ اختلاط شیخ و برہمن ہوا کہ بس | آخر کو فرقِ سبحہ و زنار اُٹھ گیا
مرنے کی ہوسِ عشق کے وہ مجھ کو لگا کہ ہائے | دنیا سے آج اپنا خریدار اُٹھ گیا
بیٹھا تھا ذبح کرنے لگا جب نہ کٹ سکا | خنجر کو تب وہ دیکھ کے بیزار اُٹھ گیا
بالیں پہ جس کے جھک کے تو بیٹھا تھا کل میاں | دنیا سے آج وہ ترا بیمار اُٹھ گیا
بیچ و شرا کا لطف رہا کب اخیر عمر | تنہا مزہ یہ زیست کا سب بار اُٹھ گیا

سوئے کو تب آیا کہ جب شام ہو گئی
لوگ اپنے اپنے گھر گئے بازار اُٹھ گیا

وہ روٹھ کر جو مجھ سے یک بار گھر سے نکلا | میں بھی آسے منانے ناچار گھر سے نکلا
تیر کو اور اک ستم نے دل کر دیا ہے شاد | زہر لگائے جب وہ سو بار گھر سے نکلا
کیسا ہی کشش ہوتی ہے کیوں سر کے بال کھولے | تاریک شب میں جو تو اے یار گھر سے نکلا
سو بار سے میں نے اس وہم اپنا کیا گریباں | دامن جب اس کا تھامے اغیار گھر سے نکلا

حسن شور عاشقوں کا کیا پوچھے کس ادا سے
تنہا وہ ہاتھ میں لے تلوار گھر سے نکلا

کوئی گل لیے گلشن سے جو دامان میں آیا | دل ہو کے لہو دیدۂ گریان میں آیا
کب کیجیے اسے یاد کر اس دشت جنوں کا | یہ نقش بڑا اپنے گریبان میں آیا
زندانیوں میں آج ہے اک حشر سا برپا | شاید نیا قیدی کوئی زندان میں آیا

کیا تو نے کیا زہر کو کیوں کھا لیا تنہا
کیا بیٹھے بٹھائے یہ ترے دھیان میں آیا

تنہا ہوں کیا کیوں مرے اس دل کو لگی چپ | خاموش مری جان کہ ہے سب سے بھلی چپ
کرنے لگی بلبل کبھی کل گل کا جو شکوہ | ہو شرمندہ میں باعثِ بلبل اسی چپ
کس کا ہے سفر باغ سے گریاں ہے جو شبنم | حیران ہر اک نخل ہے ہر ایک کلی چپ

ان روزوں میں صدمہ ہے یہ کچھ دل کو کہ ہر دم
روتا ہوں میں پہروں جو ہوا ایک گھڑی چپ

جاؤں کس شکل سے میں بے سر و پا فیض آباد | سخت دشوار ہے جانا مجھے تا فیض آباد
کوسوں ہم آئے نکل منزلِ مقصود کو چھوڑ | دوستو ہم سے بہت دُور رہا فیض آباد
دیکھیں کس روز نکلتی ہے تمنا دل کی | اور کس روز دکھاتا ہے خدا فیض آباد
واے یوں خلق خدا نے نکالا ہم کو | ورنہ کہتا تھا عجب آب و ہوا فیض آباد
بھولتا دل سے نہیں شام اودھ کا عالم | یاد آتا ہے مجھے صبح و مسا فیض آباد
بسکہ مصروف ہیں ہم یاد میں تیری شب و روز | ہم کو بھاتا ہے وہ کب لکھنؤ یا فیض آباد
نہ کوئی گھر ہے اسے تفرقہ پرواز فلک | ہم جدا اس سے ہوں اور ہم سے جدا فیض آباد

دوستوں کو یہ غزل جا کے سنانا میری
اب کے گر جائے تو اے بادِ صبا فیض آباد

غزل فارسی

بہ چشم دیدہ ہالا ز حسن باقی است — نماز انجمن و لطف انجمن باقی است
شہید تیغ تو با خاک تیرہ یکساں شد — عجب نگر تو کہ رنگینیٔ کفن باقی است
بہ افگن از رخ خود پردہ کو تا بکشم — فدائے روئے تو جانے کہ در بدن باقی است
تسلی دل برگشتہ چوں تواں کردن — تو در کنار من و جستجوئے من باقی است

چو ہیزمے کہ شود از گلشن اسے تنہا
تمام سوختن و باز سوختن باقی است

حواشی

۱؎ ریاض الفصحا۔ ص ۲۰۳ مصحفی، عمدۂ منتخبہ ص ۱۴۳ نواب اعظم الدولہ، طبقات شعرائے ہند ص ۲۵۷ مولوی کریم الدین ۲؎ تذکرۃ الشعراء (تذکرۂ ہندی) ص ۸۲ مصحفی مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ۳؎ خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۱۴۳ لالہ سری رام ۴؎ ایضاً ص ۱۴۳، ۵؎ ریاض الفصحا ص ۱۱۱، ۶؎ تذکرۃ الشعراء ص ۵۳، ۷؎ سراپا سخن ص ۶۰ محسن لکھنوی ۸؎ تذکرۃ الشعراء ص ۸۲، ۹؎ خمخانۂ جاوید ص ۱۴۳، ۱۰؎ دیباچہ ریاض الفصحا ص ۲، ۱۱؎ ظریف تخلص۔ برادر خورد لالہ جیتی لال حریفؔ، از عمر دوازدہ سالگی موزون طبع افتاد، در ابتدا بزبانِ ریختہ چیزے کم کم موزون می کرد حالا کہ طبیعت او وسعتے و ترقی پیدا کردہ شعر بہ متانت و فصاحت می گوید۔ و مسدس و مخمس عاشقانہ و آبدار کہ بہ سلک نظم کشیدہ ناخن بدل می زنند و باوجود فرط میلان طبیعت بہ طرف ریختہ چند غزل فارسی ہم کہ از خامۂ فکرش ریختہ درست بستہ بہ نظر درآمد عمرش تا الی الیوم بست و یک سالہ خواہد بود۔ ہرچہ گفتہ و می گوید بہ فقیر نمودہ و می نماید" (ریاض الفصحا ص ۲۰۲) ۱۲؎ گوربخش ادیبؔ تخلص ولد امکی داس قوم کہار ساکن مفتی گنج، جوان مہذب الاخلاق، است، در ابتدائے حداثتِ سنِ بلوغ طبعش بہ طرف نوشت و خواند میلے تمام داشت۔ آخر بہ بمقتضائے شوق در مکتب لالہ بینی پرشاد ظریفؔ چندے زانوئے ادب پیش ادیبؔ تہ کردہ کور سوادی بہم رسانید، چوں موزون طبع بود خود بخود چیزے در زبان ہندی و فارسی بہ نوکِ قلم اصلاح آمد و در مشاعرہ بر دوش خواند ہمہ سامع پسندیدند و آفریں ہا گفتند" (ریاض الفصحا ص ۲۷ ۱۳؎ ریاض الفصحا، ص ۲۷ ۱۴؎ بھیروں داس تمناؔ تخلص قوم کالستھ ساکن پرہوتھ طرف ایوٹنجہ قانون گوئے مولدش لکھنؤ بعد از نوزدہ سالگی خیال موزوں کردن شعر ہندی در سرش افتاد اول شورۂ سخن بہ میاں محمد عیسی تنہاؔ کہ خدایش بیامرزد می کرد و بعد چندے مشارٌ الیہ ایشان را در حینِ حیات خود پیش فقیر حاضر ساختہ بحلقۂ تلامذہ دیگر درآوردہ باعثِ قدردانی اعتبار کردہ چوں سلیقۂ درست داشت شعر خود را در عرصۂ قلیل بہ پایۂ پختگی رسانید، عمرش تا امروز بست و شش سالہ خواہد بود" (ریاض الفصحا۔ ص ۶۲) ۱۵؎ مضطر تخلص، لالہ کنور سین نام سپر دیبی پرشاد قوم کالستھ، درگاہ پرشاد تخلص مضطربؔ ان کے چچازاد بھائی تھے۔ جوان خوش خلق اور سلیم الطبع تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ تنہا کے دوستوں میں تھے اور انہی کے توسّل سے مصحفی کے تلامذہ میں شامل ہوئے تھے (تذکرۃ الشعراء ص ۲۶۶) مضطر مرثیہ بھی کہتے تھے۔ جناب مسعود حسن رضوی صاحب ادیبؔ کے کتب خانے میں ان کے قلمی مرثیے موجود تھے۔ ۱۶؎ لالہ موتی رام تخلص موجی قوم کالستھ سری باستہ، جوانِ غریب و مہذب الاخلاق است معرفت شیخ محمد عیسی تنہاؔ بحلقۂ شاگردی ایں عاصی درآمدہ شعر زبان ہندی و فارسی بر دو می گوید۔۔۔ عمرش سی و چہار سالہ خواہد بود" (ریاض الفصحا ص ۲۰۳) ۱۷؎ خوش معرکۂ زیبا ص ۹۰ قلمی، ۱۸؎ بزم سخن ص ۱۱۰ سید علی حسن ۱۹؎ تاسف۔ میر شیر علی افسوس کے نواسے تھے۔ تفصیلات کے لیے تحقیقی نوادر مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری اور دیوان صد غزل مرتبہ ڈاکٹر شبیہ الحسن ملاحظہ فرمائیں۔ ۲۰؎ دیباچہ دیوان صد غزل ۲۱؎ دیوان ششم، مشمولہ تحقیقی نوادر، ۲۲؎ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) ۲۳؎ مجمع الانتخاب ورق ۴۴۶ ب از شاہ کمال بحوالہ تین تذکرے (ص ۸ مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی) ۲۴؎ خمخانۂ جاوید ص ۱۴۳ ۲۵؎ خوش معرکۂ زیبا قلمی ۲۶؎ اردوئے معلیٰ جلد ۱، نمبر ۲ صفحہ ۱ بابت فروری ۱۹۰۹ء ۲۷؎ عمدۂ منتخبہ ص ۱۴۲، ۲۸؎ خوش معرکۂ زیبا، ۲۹؎ انتخاب دیوان تنہا مطبع مفید عام علی گڑھ ۱۹۱۲ء ۳۰؎ دیوان جہاں (قلمی) ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ (مخمس ۹ بند کا ہے) ◆◆

ظہیر ناصری

وہ میری فکر کے اندر اتر گیا ہے کیا ؟
مرے وجود میں آکر سنور گیا ہے کیا ؟

طویل لمحوں کو زرد آفتاب، جلتے ہوئے
سیاہ رات کے سینہ پہ دھر گیا ہے کیا ؟

نمی رکیسی کفِ پا کو چومتی ہے مرے
ادھر سے ہو کے کوئی چشمِ تر گیا ہے کیا ؟

ہمارے ذہن کے ہیجان میں نہیں تو سیع
رگوں میں خون کا احساس مر گیا ہے کیا ؟

لکیر کھینچ کے پانی کی سطح پر کوئی
کسی خیال کی تشہیر کر گیا ہے کیا ؟

دفتر ڈپٹی چیف اکاؤنٹس آفیسر آر، ٹی، سی
کرنا ٹک ۱-۱۶۰۰۱۵

ایم آئی وفا

وہی شکستگہِ خواب کا اسیر ہوں میں !
نواز اپنے کرم سے ترا فقیر ہوں میں !

جہاں نہ فصلِ تمنا نہ کشت زارِ امید
انھیں اجاڑ دشاؤں کا راہگیر ہوں میں

خموشیوں میں بھی ہوتی ہے احتجاج کی لَے
نہ بے زباں کہو مجھ کو نہ بے ضمیر ہوں میں

یہی بہت ہے کہ اپنی نوا میں زندہ ہوں
نواحِ شہرِ سخن کا اسد نہ میر ہوں میں

مجھی پہ سارے جہاں کی نوازشیں ہیں وفا
تمام خانہ خرابوں کا جیسے پیر ہوں میں

اسٹیٹ بینک آف انڈیا، بتیا برانچ، بتیا ۸۴۵۴۳۸
(بہار)

اثر غوری

لہجے حصارِ نطق میں بے باک ہو گئے
جو فلسفے تھے شعر کی املاک ہو گئے

رونے کی دھن میں خوب لگائے ہیں قہقہے
آنسو ہماری آنکھ کے چالاک ہو گئے

تھے پاؤں میرے چیختی سڑکوں پہ جیسے بار
جذبے پگھل کے دھوپ کی خوراک ہو گئے

صحرائے بے ثبات سے ہجرت نہ کر سکا
جتنے سراب تھے مری املاک ہو گئے

اونچی اڑان بھر کے پرندے گئے کدھر
کیا وہ غبارِ گردشِ افلاک ہو گئے

مکان نمبر ۵۱-۳-۲ میر شکاری اسٹریٹ سداسیو پیٹھ
ضلع میدک حیدر آباد (اے۔ پی)

عجائب چترکار

مسکنِ غم سے، سہانے منظروں کے خواب دیکھ
تپتے صحرا پر برستے بادلوں کے خواب دیکھ
گو کہ اب تک بے ثمر ہے، آرزو کا ہر شجر
گلشنِ امید میں کھلتے گلوں کے خواب دیکھ
قوتِ پرواز گر باقی نہیں بہتر ہے پھر
اڑ رہے آبی پرندوں کے پروں کے خواب دیکھ
رفتہ رفتہ، چاندنی راتوں میں تا حدِ نظر
جھیل پر تو تیرتی کچھ کشتیوں کے خواب دیکھ
تیرے تخلیقی پروں پر کون گلکاری کرے
ہے یہی گر آرزو تو تتلیوں کے خواب دیکھ

معرفت کرشن ادیب ۱۲/۱۴، بی۔ اے۔ یو کیمپس، لدھیانہ (پنجاب)

مکتوب

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی . . . . دہلی یونیورسٹی دہلی ۱۱۰۰۰۷

شمارہ نمبر ۲/۱۹۸۶ء غالبیات کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے جناب باقر علی خاں عرشی زادہ صاحب نے خانۂ غالب کی گوہر افشانی کے ایسے نمونے فراہم کئے ہیں جو ہمیشہ قابل قدر و لحاظ تصور کئے جائیں گے۔ ماہر غالبیات جناب کالی داس گپتا رضا نے توقیت غالب قابل صد ستائش تحقیقی انداز سے ترتیب دی ہے، جو ان کی لائق موصوف کے تحقیقی کارناموں میں اضافہ شمار کی جائے گی۔ غالب کے شیدائیوں کو چاہئے کہ وہ اسی توقیت غالب کو کندۂ دیوار کرائیں۔ جمہوریۂ ہند کے سابق صدر جناب فخر الدین علی احمد مرحوم اور ان کے اہل خاندان کا یہ دعویٰ کہ وہ غالب کے خاندان سے واسطہ رکھتے ہیں مجھے ہمیشہ مشکوک معلوم ہوا اور اس پہلو پر مرحوم سے متعدد بار گوپال میں تبادلۂ خیالات کے مواقع مجھے ملے۔ یہ بات بھی اب بالکل صاف ہو گئی۔ فخر الدین علی احمد مرحوم بیگم زوجہ باقر علی خان (یعنی زین العابدین خاں عارف) کے نواسے تھے لہٰذا اس طرح سلسلۂ نسب صرف امراؤ بیگم زوجہ غالب ہی تک پہنچتا ہے۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب کا مضمون بعنوان "دیوان غالب کے دو تاریخی نسخے: نسخۂ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ" بہت عالمانہ و محققانہ ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی تاریخی اہمیت کے باوجود اصلاح کی ضرورت ہے۔ الغرض یہ شمارہ گوشۂ غالب بھی فراہم کرتا ہے۔ غالب سے متعلقہ تحقیق اس شمارے سے روگردانی نہیں کر سکتی۔

شمارہ ۳-۴/۱۹۸۶ء کا اداریہ جاذب توجہ ہے۔ اصناف شاعری کا زوال فی الواقع المیہ ہے۔ ہندی میں کھنڈ کاویہ खण्ड काव्य بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے ان کو مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مثنوی نگاری پر توجہ صرف کرنا چاہیے۔ اکثر ماہر جو اردو ترقی بیورو دہلی سے وابستہ ہیں بہت اچھے مثنوی نگار ہیں مگر اردو تحقیق ہنوز ان کی جانب متوجہ نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کا سپرد قلم کیا ہوا مضمون "اردو عروض جی" محققانہ و عالمانہ ہے۔ لسانیات میں نئے دن متعدد تنظیم شامل ہوتی رہی ہیں لہٰذا بے تنظیم دائرہ در دائرہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میری رائے میں ڈاکٹر سحر اور ڈاکٹر گیان چند صاحب نے اس تنظیم میں سب سے زیادہ بلفت عنوان طے کئے ہیں۔ لسانیات میں VOWEL RESULTS یعنی مصوتیات علیحدہ تنظیم بن چکا ہے۔ فرانسیسی زبان کے ایک کتابچے میں غنائی آواز سے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ دو مصوتوں کا اتصال طوالت صوت کے لحاظ سے ادغام میں تبدیل ہو جاتا ہے لہٰذا آئینی نو ابد میں لکھا جاتا ہے۔ اردو والوں کی اصطلاح بعض مبلغ گاؤں کو گانو، پاؤں کو پانو، کاؤں کو کانو وغیرہ لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں جو غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ رومن رسم الخط میں گاؤں GAON ہوگا نہ کہ GANO۔ مضمون سے یہ بات کوئی تعلق تو نہیں رکھتی مگر اس مضمون کو پڑھتے وقت یہ خیال ابھرنے لگا کہ اس پہلو پر ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر سحر صاحب کی توجہ مبذول کراؤں تاکہ میرے شکوک رفع ہو سکیں۔ اسی شمارے میں سردار احمد صاحب کا مضمون بچوں کا ادب۔ آغاز کی منزل پر رہنمائیں اور درس نہایت عالمانہ ہے اور جاذب توجہ بھی ہے۔ اردو میں ابھی موضوع پر کام نہیں کے برابر ہوا ہے۔

معشوق و مجبور کے خصوصی شمارے (جگن ناتھ آزاد نمبر) کو اصل موضوع پر میں نے بھی ایک مضمون دیا ہے۔ "جدید افسانے کی داستانی فضا" جس کو سلیم شہزاد نے سپرد قلم کیا ہے خاصا محققانہ تیز تجزیاتی ہے، دراں حالیکہ اشعار تو بے جان ہیں۔ جگر مراد آبادی کی فارسی غزل کا عکس مشمول ہونا شمارے کی اہمیت و افادیت کو ثابت کرتا ہے۔

ہندوستان میں متعدد اردو اکادمیاں قائم ہو گئی ہیں لیکن ہر ایک اکادمی اپنے بجٹ میں شاعر ایسے جریدے کی امداد کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکال سکتی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد —— ۱۷-۵ گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر جموں

شاعر کا نیا شمارہ ملا۔ اس میں بہت سی قابل ذکر چیزیں ہیں! جزاک اللہ۔ شاعر کے حسن ظاہر اور حسن باطن دونوں میں روز افزوں اضافہ دیکھ کے آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ آپ بڑی محنت سے ہر شمارہ مرتب کرتے ہیں۔ جس قدر ادبی نوعیت کی جدتیں آپ نے اس میں پیدا کی ہیں ان کے لئے آپ مستحق مبارکباد ہیں!

آپ نے نئے شمارے میں مسدس، مثنوی اور دوسری اصناف سخن کے احیاء کی بات کی ہے جن کی طرف سے آج کے شعراء کی توجہ ہٹ رہی ہے تو عزیزم! مسدس، مثنوی، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ کا مطلب تو ہے پابند شاعری اور آج کل کے اکثر شعراء، ناقدین اور مدیران جرائد نے پابند شاعری کے خلاف جو طوفان کھڑا کر رکھا ہے اس کے پیش نظر ان اصناف کے احیاء کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ پابند اور براہ راست شاعری کرنے والوں میں آخری اہم شاعر سکندر علی وجد تھے لیکن آج ان کا نام کوئی نہیں لیتا (فیض اور سردار جعفری کے ساتھ ان کی تصویر کا چھپ جانا بالکل دوسری بات ہے)۔ اس وقت تو ہوا کا رخ کچھ اور ہی ہے۔ ابھی اس تجرباتی شاعری کو چلنے دیجئے جب طبائع آزاد غزل اور نثری شاعری ایسی اصناف سے اکتا جائیں گی تو ہو سکتا ہے اس وقت پرانی اصناف سخن کا خیال آئے۔

ویسے اس وقت بھی ایسے شعراء موجود ہیں جو پرانی اصناف سخن کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں لیکن ان میں سے اکثر خود اتنے پرانے ہو چکے ہیں کہ پرانی اصناف سخن میں نیا پن پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ ترکیب بند کو لے لیجئے۔ یہ صنف اردو میں شروع سے کم یاب ہے لیکن اقبال نے "مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" لکھ کر اسے جس بلندی پر پہنچا دیا کہ اب اس پائے کے کسی نئے ترکیب بند کا تصور ہی دشوار ہے۔ مثنوی کو لیجئے سحر البیان اور گلزار نسیم اپنی اپنی جگہ پر لاجواب ہیں۔ گلزار نسیم تو ایک معجزے سے کم نہیں لیکن اقبال کے ساقی نامے کو دیکھئے اس پابند شاعری (مثنوی) میں اقبال نے وہ جادو جگایا ہے جس کا جواب ہماری اردو شاعری شاید ہی پیدا کر سکے گی —— اور سرور صاحب کی اس بات کی تردید شاید ممکن نہ ہو کہ ہماری جدید شاعری میں بلند شاعری کا فقدان ہے (سرور صاحب نے یہ بات مدت ہوئی سری نگر میں ایک تقریر کے دوران کہی تھی)

بہر طور آپ کا یہ اقدام بہت قابل تعریف ہے کہ آپ نئے زمانے میں بھی پرانی باتیں یاد دلا رہے ہیں۔ ادھر بیٹھے میں پروفیسر عبد الغنی نے تحریک بھی اسی مقصد کے پیش نظر نکالا ہے کہ پابند شاعری اور ادب اجرا افسانے کو فروغ دیا جائے۔ اس وقت مجھے ... خان علی خان (مرحوم)

دلشاد دکنی کا ایک شعر یاد آرہا ہے اور اسی پہ یہ خط ختم کرتا ہوں۔

پھر کہہ رہا ہے پلٹ کر نگاہ یار ابھی
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

نامی انصاری —— ۱۸۵/ا، پریڈ، کانپور

شاعر کا تازہ شمارہ نمبر ۳-۴ موصول ہوا۔ اس مرتبہ بھی مکتوبات کا حصہ بہت دلچسپ ہے۔ تنقید کی زبان کے بارے میں عبید صدیقی اور خالد سعید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ کسی معیاری تنقیدی زبان کا تعین ناممکن نہیں ہو سکتا ہے۔ ہر نقاد اپنے ذاتی میلانات کے مطابق لکھتا ہے سوال یہ ہے کہ تنقید کی معیاری زبان کسے مانا جائے؟ آل احمد سرور کی تخلیقی اور شگفتہ نثر کو؟ احتشام حسین کی پیچیدہ علمی زبان کو؟ وزیر آغا کی بے رنگ اور سپاٹ نثر کو؟ ممتاز حسین کی بوجھل علمی زبان کو؟ گوپی چند نارنگ کی سلیس اور شگفتہ نثر کو؟ شمس الرحمٰن فاروقی کے تدریسی انداز بیان کو؟ یا وارث علوی کی دشنام طرازی کو؟ اگر تنقید کی زبان خالص علمی فلسفیانہ، سپاٹ اور روکھی ہو گی تو وہ شاذ ہی ہمارے دل و دماغ کو متاثر کر سکے گی۔ دوسری طرف مرصع فقرے اور بے معنی خوبصورت جملے پڑھنے میں تو اچھے لگتے ہیں مگر وہ ایک متعین رخ پر چلنے نہیں دیتے۔ ادھر ادھر کے منظروں میں الجھا دیتے ہیں۔ تاثراتی تنقید کے لئے یہ نثر کارآمد ہے مگر اس سے تنقید کا پورا حق نہیں ادا ہوتا۔ رہی شگفتہ نگاری کے پردے میں دشنام طرازی، تو یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں کیونکہ یہ فن وہبی ہے اکتسابی نہیں۔ آپ نے پچیس نوجوان شعراء کی غزلیات پر جو اظہار خیال کیا ہے اس میں آپ کے اسٹائل کی انفرادیت بہت نمایاں ہے اور غالباً مکتوب نگاروں کے نزدیک یہی محل نظر ہے۔

فاروق شفق —— ۵-۱۸۵، ادھان کمیٹی کوارٹرز، پی ٹی گڈھ

"شاعر" کا تازہ مشترکہ شمارہ ملا۔ اس مرتبہ اس کا رنگ روپ کچھ اور نکھرا ہوا لگا۔ مندرجات کے اعتبار سے بھی یہ شمارہ خاصا بھاری بھرکم محسوس ہوا۔ پچاس کتابوں پر اکٹھے تبصرہ اور تعارف شائع کر کے ایک مرتبہ پھر دھماکہ کیا ہے۔ کم سے کم صفحات میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرنے کے لئے آپ نے REDUCE کرنے کا جو بے خطر طریقہ اپنایا ہے۔ خوبصورت طریقہ اور قرینے دیکھنے میں بھی بھلا لگتا ہے۔ بھائی صاحب، یہ تو تازہ شمارہ سب سے زیادہ دلچسپ اور معلوماتی معرکہ کتابوں پر تبصرہ اور تعارف کا ڈھیر ساری کتابوں سے ملاقات ہو گئی۔ یقیناً آپ کے اس اقدام کو سراہا جائے گا۔

مضامین میں ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کا مضمون شاید اس سے پہلے نیا دور لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔ مضمون خشک تو ہے لیکن معلوماتی اور کارآمد ہے یہ الگ بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک موضوع کو اپنے انداز و اسلوب سے مزید بوجھل اور گرانبار بنا دیا ہے کوئی ایسا لسانیات زدہ ہو گا جو پورا کا پورا پڑھ سکے۔ سلیم شہزاد بھی بوجھل اور خشک تحریر لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس مرتبہ تو غنیمت ہے کہ انہوں نے جدید افسانے پر قلم اٹھایا ہے ورنہ انہیں تو ایسے ایسے موضوعات سوجھتے ہیں کہ آپ کے فرشتے بھی

وہاں پڑھ پا رہیں۔ احساسات کی خوشبو مزید ہے کہ آج کل جدید افسانے لکھنے کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے جو جدید افسانے کے لئے یقیناً نیک شگون اور اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔

افسانے نہیں پڑھ سکا ہوں لیکن جوگیندر پال اور کرشن سینا کو پڑھوں گا۔ منظومات میں قتیل شفائی کی غزلیں خاصی ناقص ہیں۔ مظفر ایرج فیضی اور نشتر خانقاہی کی غزلیں بطور خاص پسند آئیں۔ ندا فاضلی کی گیت ہلکے پھلکے لیکن خوبصورت ہیں اور ان کے مخصوص انداز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کمار پاشی اپنی نظموں میں ادھر کچھ زیادہ ہی ہندو مائتھولوجی کو پیش کر رہے ہیں۔ بھائی بلبیر کی نظمیں پسند نہیں آئیں۔ ایم۔ اے شاد اور جمال قریشی کی غزلوں کے کچھ شعر پسند آئے۔ بحیثیت مجموعی تازہ شمارہ اپنے اندر ایک بڑی دلچسپ دنیا رکھتا ہے۔

[نیا دور میں جو مضمون شامل ہے وہ شاعر کے مضمون ہی کا ایک حصہ ہے]

احمد عثمانی ——— منشی شبان نگر، مالیگاؤں

جلد ۵۸ شمارہ ۳ بہم پہنچا۔ بچوں کے ادب کے متعلق سردار احمد بیگ نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ غالباً پہلی بار اس طرح کا جائزہ سامنے آیا ہے۔

آنند لہر کا مختصر افسانہ اچھا لگا۔ دل کو چھوتا ہے۔ باقی تمام مشمولات بہتر ہیں۔

سلیم شہزاد کا مضمون "جدید افسانے کی داستانی فضا" صفحات کا کور رکھ دھندہ بن کر رہ گیا ہے۔ سلیم نے اپنے موضوع سے انصاف نہیں کیا وہ بس مضمون کو طویل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے دو صفحے تو اپنی ہمہ دانی کو قاری پر ٹھونسنے کے لئے ضائع کئے تیسرے صفحے پر آتے ہیں تو ڈھائی صفحہ پھر یہاں پر پرانی داستانوں اور فاضل مضمون نگار کا فاضل مطالعہ یعنی داستانوں کے حوالے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر قدم قدم پر قدم رکھنے کی قیمت ہوتی تھی یعنی کسی نقاد نے ایک مضمون لکھا اور جو حوالے دیئے وہی سلیم نے لکھ لئے بس چند حوالے اس میں سے حذف کر دیئے۔ سلیم نے خود کوئی محنت نہیں کی مکھی پر مکھی مارنے والے اس مضمون میں لکھتا ہوں صرف پرانی داستانوں کے حوالوں کا اضافہ ہوا ہے جو کہ عنوان مضمون سے میل ہرگز نہیں کھاتا۔ ہر چند کہ یہ حوالے مضمون نگار کے پاس ناگزیر ہیں لیکن قاری کے لئے گراں بار ہیں۔

میں نے چند دن ہوئے ایک رسالے میں افسانوں پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس میں جو حوالے دیئے گئے تھے سلیم کے حوالے بھی وہی ہیں اور ترتیب بھی اسی انداز کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیم کو بس مضمون چھپوانے کی جلدی تھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مفت میں نقاد بننے کا جذبہ آج کل بہت سارے افراد کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ سستی شہرت چاہنے والے ہی مکھی پر مکھی مارنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔

رونق شہری ——— شعبۂ اردو، آرے ایس ہائی اسکول جھریا ۸۲۸۱۱۱ (بہار)

"شاعر" کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ نئی شاعری نئے نام میں شامل شعراء کی تخلیقات پر مختلف النوع خطوط کو آپ نے فراخدلی سے شائع کیا ہے۔ یوں تو شاعر میں لکھنے والوں کی بھیڑ ہمیشہ موجود رہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب سے یہ آفسیٹ پر شائع ہونے لگا ہے اس کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے اور مکتوبات کے کالم شروع ہوتے ہی غیر ضروری خطوط بھی شائع ہونے لگے ہیں "نئی شاعری نئے نام" میں شامل شعراء کی بیشتر تخلیقات پر حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ اس حاشیہ آرائی میں خاکسار کے اشعار بھی زد میں آئے ہیں۔ جیسے نند سوز صاحب نے میرے شعر ؎

نجانے کس سمت کی ہوا تھی کہ جس کی شہ پر

پتنگ کی ڈور مجھ سے بہتر سمیٹتا تھا

میں فاعل کی غیر موجودگی کا انکشاف کر کے وادطلب ہونا چاہا ہے۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے میں "مجھ سے" موجود ہے ظاہر ہے کہ فاعل کے لئے ہی ردیف "سمیٹتا تھا تو" یا "وہ" کی متقاضی ہے۔ آج شعریات میں اس طرح کا COMPLEX عیب نہیں بلکہ حسن مانا جاتا ہے۔ اگر پہلے مصرعے میں "وہ ہوگا تو دوسرے مصرعے کو مربوط کرنے کے لئے" جو۔ لکھتا آج سہل پسندی مانی جاتی ہے۔ زیر نظر شمارے میں ہی معتبر شاعر نشتر خانقاہی کے سات اشعار پر مشتمل غزل کے چھ اشعار میں بیرانند سوز صاحب فاعل تلاش کر دیں۔ مظفر ایرج صاحب کے "پھونکتے پھونکتے" پر بھی موصوف کی تنقیص غلط ہے شاید یہ ان سے "پھونکت پھونکت" لکھانے پر مصر ہیں۔ آج ایک مبتدی بھی اساتذہ کرام کے حوالے سے جانتا ہے کہ ضرورت اوزان کے تحت بڑی 'ے'، گرانا معیوب نہیں ہے۔ منیر سیفی صاحب نے "بے لباسی میں شب درد زمسکتے ہیں پیڑ، میں بھی" کے بعد 'یہ' لکھنے کا مشورہ دیا ہے ساتھ ہی تجویز کے ذریعہ عالمانہ انصاف بھی میرے خلاف پیش کیا ہے اس کے تعلق سے میں عرض کروں گا کہ اس مصرعے میں "بھی" کو پورے سکون اور تلفظ کے ساتھ میں نے پیش کیا ہے اور ایسا کرنا خلاف قاعدہ نہیں ہے ساتھ ہی میری سماعت "بھی یہ پیڑ" کی صوتی خراش قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ دوسرا نکتہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "یہ" پہلے مصرعے میں "حشو" ہو جائے گا۔ موصوف کے دوسرے اعتراض سے یہ بات صاف نہیں ہوئی کہ آخر "پیپل" سے زیادہ "برگد" کیوں مناسب ہے تاریخ کے طالب علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ گوتم بدھ کو پیپل کے درخت کے نیچے ہی نروان حاصل ہوا تھا نہ کہ برگد کے زیر سایہ۔ حامد اقبال صدیقی کے مصرعے میں لفظ "گیان"، "فاع" یعنی "ڈھیان" پر صحیح نظم ہوا ہے۔ اس لئے یہ جواز بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ پورے تلفظ کے ساتھ ادا نہیں ہوا۔ نئے شعراء کی تخلیقات پر آپ کے COMMENTS نے فکری مبادیات کی اہمیت کم کرنے کے لئے خالد سعید کا خط کم مائیگی کا مظہر ہے۔ مولا بخش میں وصف مشترک تلاش کرنے میں انہیں کامیابی نہیں ملی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ COMMENTS جو آپ نے دیئے ہیں وہ اس "مشکلات" پر اجماعی حیثیت میں بھی مشترک ASSETS ہے۔ خالد سعید صاحب کو آپ کے انفرادی ریمارک کی بھی تلاش کرنی چاہئے۔ ارشاد حیدر کے لئے فاروق شفق کی سفارش کی وجہ سمجھ میں آتی ہے لیکن عبدالرحیم نشتر کے لئے پتہ نہیں ہو گئی نے اچانک نرم گوشہ اختیار کیا ہے کہ مظفر صاحب کی شاعری کو ماہنامہ "روشنی" میرٹھ کے صفحات پر بہت پہلے ہی یہ رد کر چکے تھے۔

ابرار مجیب ——— ۱۱۰۳ایم۔۲۰۴/۱۵۔ آر کے سوپ ہاؤسٹ آفس کدما جمشید پور

"شاعر" کے تازہ شمارے (۲) میں "آزاد کتاب گھر" کے خط کا اقتباس دے کر آپ نے لاعلمی میں جمشید پور کے قلم کاروں پر ظلم کیا ہے۔ مکتوب نگار نے دور کے ڈھول پیٹ کر یہ سہانی اور دلخوش کن آواز سنانے کی کوشش کی ہے کہ شاعر کے خریدار عام لوگ ہیں جن کا ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔ خالص ادبی رسالے کا انتظار عام خریدار کیا کرتے ہیں۔ یہ بات یقیناً اردو داں حلقوں میں باعث حیرت و استعجاب ٹھہرے گی اور میرے لئے یہ بات باعث تعجب ہے کہ اس کے باوجود "آزاد کتاب گھر" نے شاعر کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا۔ آپ کو اطلاع دی گئی ہے کہ شاعر کی تمام کاپیاں فروخت ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری بینائی کمزور ہو گئی ہو اور گرد و غبار میں اٹے ہوئے جن رسائل کو برسوں سے دیکھتے آرہے ہیں وہ "شمع" اور "روبی" جیسے فلمی رسائل ہوں۔

آزاد کتاب گھر کا وجود اگر آج جمشید پور میں سانس لیتا ہوا نظر آرہا ہے تو صرف یہاں کے فن کاروں کی بدولت۔ لیکن ادھر چند برسوں سے آزاد کتاب گھر والوں کا یہاں کے فن کاروں کے ساتھ کچھ اس قسم کا رویہ رہا ہے کہ ادیب و شاعر اس ادارے سے بدظن ہوتے گئے۔ یہ رویہ ایک بزنس مین کے نفع نقصان اور جمع تفریق کا رویہ ہے۔ مختلف رسائل کے اہم شمارے خاص نوعیت کی ادبی کتابیں بیش قیمتوں میں اضافے کے ساتھ یہاں کے لکھنے والوں کو ملتی ہیں اب ایسی صورت حال میں کوئی ادیب یا شاعر آزاد کتاب گھر کا رخ کیوں کرے؟ اس کے باوجود لوگ وہاں جاتے ہیں۔ میری ہی مثال لیجئے میں شاعر کا یہ تازہ شمارہ وہیں سے لیکر آرہا ہوں۔ ذاتی پرخاش کو ادبی نوعیت عطا کرنا ادبی خلوص کے منافی ہے۔ اور آزاد کتاب گھر کے مالک نے یہی کیا ہے۔

یہ اور اس نوعیت کے دوسرے خطوط کی اشاعت شاعر کے خلوص نیت پر دال ہوگی۔

> ✻ شاعر [شمارہ نمبر ۲ ——— ۱۹۸۶ء] کے اداریہ "ادب کے قارئین کون ہیں؟" کے متعلق جو خطوط موصول ہوئے تھے ان میں اداریے کی پسندیدگی کے علاوہ کچھ خطوط سخت تنقیدی و تنقیصی لہجے ہوئے بھی تھے۔ ایسے خطوط میں سے ایک خط گذشتہ شمارے میں شائع کیا گیا تھا اور ایک خط اس شمارے میں دیا جا رہا ہے مگر وہ خطوط شامل نہیں کئے جا سکیں گے جو طوالت میں کسی مضمون سے کم نہیں تاہم ان خطوط کا مواد تقریباً وہی ہے جو شائع کئے گئے دو خطوں کا ہے۔
>
> محترمین نے اداریہ میں پیش کئے گئے معروضات کو کچھ غلط فہمی کی بنیاد پر غلط لکھ دیئے کہ آزاد کتاب گھر اور ان کے درمیان مقامی نوعیت کے کچھ مسائل درپیش ہیں۔ آزاد کتاب گھر کے خط کی شمولیت اداریہ کے حوالے سے ہمارا مطلب کسی کی دل آزاری نہیں ہے نہ ہی مقامی نوعیت کے مسائل سے ہماری کوئی دلچسپی ہے جن احباب کو غلط فہمی ہوئی ہے ہم معذرت خواہ ہیں۔

انشائیہ پر شاعر کی خصوصی اشاعت

۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کلکتہ ——— ۱۹۵۶ء ڈھاکہ

ادیب نکتہ رس، دبیر ماہر بنگال
ہوا نہ تجھ سا کوئی اور شاعر بنگال
ترے کلام کی لذت سے نیند آتی ہے
کہوں تجھے میں سخنور کہ ساحر بنگال

رضا علی ابن مولوی شمشاد علی۔ پیدائش کلکتہ (مغربی بنگال)۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ میں حاصل کی ۱۸۹۸ء میں انٹرنس پاس کیا۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں [illegible] تھا لہٰذا جلد ملازمت کرلی ہے۔ ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا امپریل ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی مکاتیب کا خلاصہ انگریزی [illegible] کا کام سونپا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں لکچرار مقرر ہوئے ۱۹۳۶ء میں پنشن ہوگئی۔ ۱۹۴۱ء میں لیڈی برابورن کالج کلکتہ میں پروفیسر مقرر [illegible] پہلے اردو اور پھر فارسی پڑھانے پر معمور کئے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انگریزی سرکار کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں خانصاحب [illegible] عطا ہوا اور ۱۹۳۱ء میں خان بہادر کا خطاب تفویض ہوا۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اردو فارسی دونوں ہی زبانوں میں شعر گوئی کی ابتدا کی۔ مولوی ابو القاسم محمد شمس [خلف حضرت نساخ شاگرد داغ] سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وحشت کلکتوی کو غالب سے بے پناہ عقیدت تھی اور مومن کی شاعری کے دلدادہ تھے۔ شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔

[illegible] وحشت

[illegible] ۱۹۱۰ء — ترانۂ وحشت [۱۹۵۰ء اس مجموعے میں چار ہزار اشعار شامل ہیں] مضامین وحشت مرتبہ جمال احمد صدیقی ۱۹۸۰ء [اس مجموعے میں [illegible] وحشت کلکتوی نے جو مضامین لکھے تھے اور جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے تھے انہیں جمع کرکے ترتیب دیا گیا ہے اور جسے مغربی بنگال اردو [illegible] نے شائع کیا ہے]
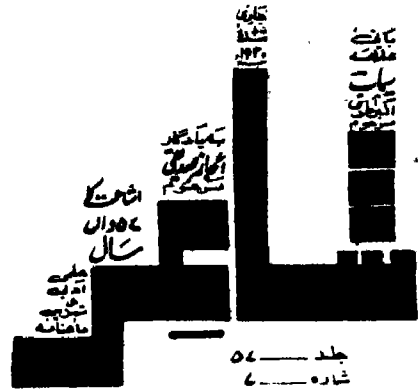
مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ ۳۰ روپے ◆ معاونین ۱۰۰ روپے ◆ تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

ماہنامہ شاعر ۔ مکتبہ قصر الادب ۔ بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ۔ بمبئی

اے آزادی! تجھے ہزاروں سلام

مہاراشٹر ہی نے حصولِ آزادی کا بنیادی خیال
بھارت کے کونے کونے میں پھیلایا۔

اب وہی مہاراشٹر

زراعت، صنعت و حرفت، سائنس، آب پاشی و دیگر
میدانوں میں رہنمائی و رہبری کا فرض بھی انجام دے رہا ہے۔
اس سرزمین میں تہذیب و تمدن اور سماجی مساوات
بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مہاراشٹر کی یہ تمام جلوہ گری

یہاں پائی جانے والی قومی یک جہتی، بھائی چارگی اور ہم آہنگی
کے حسین سنگم کا نتیجہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ

مہاراشٹر کا چمن سرسبز و شاداب ہے۔
اس ریاست کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی زمین میں ملک کی
قدیم تہذیب کا عکس ملتا ہے۔

ریاست مہاراشٹر ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

مقالات

غزلیات

انشائیے

نظمیں

انشائیہ — ایک موضوع

فنِ شاعری کی تدریس کا مسئلہ

فنِ شعر وہبی بھی ہے اور اکتسابی بھی۔ ماضی سے آج تک اردو شاعری بالخصوص غزل کی شاعری کے لئے اصول و ضوابط بنتے رہے ہیں۔ اساتذۂ فن نے اپنے اپنے طور پر محاورات کی تصحیح، الفاظ کی تذکیر و تانیث اور متروکات و مختارات کی تعین بندی کی ہے۔ آج کی بہ نسبت ماضی قریب میں جس نوع کی علمی و ادبی محفلیں، کتب و رسائل میں سجتی رہی ہیں آج ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری کا عمل اتنا سہل نہیں تھا، علوم و فنون کی تدریس اور مبتدی شعراء میں ذوق و شوق کے ساتھ ان کے حصول کا جذبہ غالب تھا۔ فارسی اور اردو ادب کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "اصلاح" کا تصور بہت قدیم نہیں لیکن شاعری کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی تدریس اور اس کے حصول کا سلسلہ صدیوں پرانا ہے۔ سیکھنے سکھانے کا عمل ارتقا پذیر دنیا کے لئے ناگزیر رہا ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ فنونِ لطیفہ کا کوئی بھی شعبہ ہو اس سے وابستگی کے لئے استادِ کامل کا ہونا ضروری ہے۔ ہم تک جو زبان پہونچی ہے وہ یوں ہی نہیں آ گئی، یا پھر فنِ شعر کا جو شعور ہمیں عطا ہوا ہے وہ ہمارے دور کی دین نہیں۔ ہم نے شاعری کو، فن کو اپنے اسلاف ہی سے حاصل کیا ہے۔ لیکن کیا آج فنِ شعر کا اکتساب ضروری نہیں؟ اردو شاعری زبان و بیان کی جن خصوصیات کی حامل رہی ہے اور اردو غزل اپنی جس انفرادیت کی وجہ سے کل عالم میں مشہور ہوئی ہے آج اس کا تصور کیا رہ گیا ہے؟ آج تنقیدِ شعر کے معیارات تبدیل ہو گئے ہیں، اب بحث شاعری سے کی جاتی ہے فن سے نہیں۔ غزل کی تنقید علیحدہ سے کچھ بھی نہیں۔

آج فنِ شعر میں کسی کی رہنمائی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اصلاح کے تصور کو ماضی کا حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ آج سیکھنے کا عمل کم سے کم ہوتا جا رہا ہے ہر نیا شاعر اپنے آپ میں استادِ فن ہے۔ ہمارے آج کے بزرگ شعراء کے یہاں بھی استناد و اجتہاد کا وہ عمل نہیں رہا ہے جس کی ضرورت و اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ نئی نسل کس سے استفادہ کر رہی ہے؟ ہمارے ادبی رسائل موجودہ حالات میں تخلیقات کی اشاعت کے علاوہ زبان و فن اور دیگر علوم کی پیش کش میں خاموش ہیں۔ تحصیلِ علوم کا شوق رکا ہو گیا ہے۔ شاعر بننے کا شوق تیز تر ہے اور حصولِ علم کا ذوق؟ آنے والی نسلوں کو ہم کیا سونپنے والے ہیں؟ زبان کا صحیح استعمال، املا، تلفظ وغیرہ کے معیارات کیا ہیں؟ کیا آج فنِ شاعری کا علم ضروری نہیں؟ نکاتِ فن بتانے والے، تفہیمِ شعر کا درس دینے والے، تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے والے کہاں ہیں؟ اب نہ وہ مکاتب ہیں نہ ادارے ہیں جن کی موجودگی نئے ذہنوں کو تقویت دیتی تھی، ان کا حوصلہ بنتی تھی۔ موزونیت کا نام شاعری نہیں ہے۔ شاعری ایک فن ہے اور اس فن کی افہام و تفہیم کے لئے آج کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے معتبر اساتذہ نے جو تخلیقی اور عملی کارنامے انجام دیے تھے، تنقید و تحقیق کی جو قوتیں دی تھیں، جو معیارات دئے تھے وہ سب کچھ آج کہیں بھی نہیں۔ آج استادی و شاگردی کا سلسلہ نہ سہی لیکن اس کی ضرورت کل سے زیادہ ہے کہ ہم اپنی زبان، اپنی شاعری اور اپنے فن کا نہ صرف تحفظ کریں بلکہ از سرِ نو اس کی معیار بندی کریں۔ ہمارے بزرگوں نے جو علمی و ادبی اور شعری سرمایہ ہمیں دیا ہے اس کی ترویج و اشاعت کریں، نئی نسل کی ذہنی تربیت کے لئے ان سلسلوں کا آغاز کریں جو ماضی کے نئے ذہنوں کو میسر تھا۔

تذکرۂ معرکۂ سخن

مطلب صرف اتنا ہے۔ اور کہنا یوں چاہیے تھا۔ کہ اگر رخ تحت دکھائے تو خوش ہے۔

غالب ؎ شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

اس میں دو جگہ "کو" زائد یا حشو موجود ہے۔ کہنا چاہیے تھا کہ جہاں تلوار دیکھی گردن جھکا دیتا تھا مگر دونوں جگہ "کو" لا یا گیا ہے اور اچھا لگتا ہے۔

غالب ؎ سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

اس میں بھی "کو" زائد ہے۔

عزیز ؎ دیوار سے کعبہ کی اس وقت دہن پایا
اور ابن لسان الحشر اک لمعۂ نور آیا
قدرت سے تجلی کی جب در کیا سا یا
آپ اپنے کو پوشیدہ اس پردے میں کھلایا
بے پردہ نکلنے میں یک راز تھا پنہانی

اعتراض۔ شاعر نے الٹی بات کہی۔ یعنی در پردہ کی جگہ بے پردہ کر دیا۔ واہ بے پردہ نکل آیا تو پھر راز کہاں۔

جواب اشہر۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ذات علی بمنزلۂ حجاب جنت ہے۔ اگر اس حجاب حقیقت کو اٹھا دیا جائے تو ذات علی اور ذات باری میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ذات علی عین ذات الٰہی ہو جاتی ہے۔ بے پردہ کے لفظ سے شاعر نے کس عقدہ ذکی مسئلہ حل کیا ہے۔ مگر یاس صاحب اس کی فہم سے عاجز ہیں۔

بے پردہ کے معنی یاس صاحب نے ظاہر ہونے کے لئے۔ حالانکہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ بغیر ذات کو پردہ کئے نکلنے میں ایک راز تھا اور وہ یہ راز تھا کہ علی عین خدا ہوئے جاتے تھے۔ علی کو مظہر نور احدیت کہا جاتا ہے نہ کہ عین ذات۔ اور یہی عقیدۂ اثنا عشری ہے۔

(مؤلف) میرے نزدیک معترض کا اعتراض صحیح ہے۔ بے پردہ ہرگز در پردہ کے معنی نہیں دے سکتا۔ اور یہاں مصنف کی غرض یہ ہے کہ در پردہ کا مفہوم ادا کیا جائے۔ "در پردہ" کہنے میں ایک خامی رہتی ہے۔ اسی لئے بے پردہ کہا گیا ہے۔

عزیز ؎ سجدے کی طرح جبینِ دیوار حرم دیکھو
اک نور کی صورت کے آگے ہیں بفرق بچھو
ہر سجدۂ طاعت میں کعبے کے صنم دیکھو
محراب کو کیوں دیکھو ابرو ہی کا خم دیکھو
کرتی ہے جبہ ہر سجدہ خود قدرت ربانی

اعتراض۔ جنوں کا سجدہ میں گرنا مسلم۔ مگر ایسے سجدہ کو سجدۂ طاعت کہنا غلط ہے۔ سجدۂ طاعت وہ ہے جو اپنی خوشی سے ہو۔ جنوں کا سجدہ کرنا اپنی خوشی سے نہیں ہے نہ ارادے سے۔

بھی سنبل سے ہے صنائیت ہی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

اگرچہ یہاں یہ کہنا بے ضرورت ہے کہ خلاف دستور اختیار ہی ایک قسم کا سونا ہوتا ہے۔ جو بہت نفیس ہوتا ہے۔ خسرو پرویز نے اسی سونے کا ایک ترنج بنایا تھا۔ جس کو وہ ہمیشہ ہاتھ میں رکھتا تھا۔

فاضل مجیب نے بڑی دور دور سے قرص آفتاب کے مجموعے پیش کئے ہیں مگر افسوس کہ انہوں نے سعدی کے اس مشہور مصرعہ کو نظر انداز کر دیا ع "قرص خورشید در سیاہی شد۔" اس کے علاوہ لغات میں دیکھئے تو قرص بدر منیر، قرص زر، قرص سیمیں، قرص گرم و سرد، قرص ماہ و قرص خورشید، قرص بدائیں، قرص زرد، قرص ہفت در وہ سب کی سب کنایتاً آفتاب و ماہتاب کے معنے میں مل جائے۔ بہرحال یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے اور یاس صاحب کو کہ اعتراض سے بچنا چاہیے تھا۔

عزیز ؎ نہ خانۂ کعبہ میں یہ محفل نورانی
اترا ہے محمدؐ پر اک مصحف ربانی
نکلا ہو کوئی لے کر اک تحفۂ یزدانی
اب چاہئے کو کھولیں گے سنگ عقیقانی
آئی جہاں ادا کی کعبے میں جو من مانی

اعتراض۔ لفظ "تو" حشو محض ہے۔ منہ مانگی مراد کی جگہ من مانی مراد جناب عزیز کا تصرف ہے۔

جواب اشہر۔ جناب یاس قائل ہیں کہ اساتذہ کے یہاں اس قسم کے حشو پائے جاتے ہیں تو اعتراض بیکار تھا خود یاس کا ایک مصرعہ ہے ؎ "کیسے کعبے کو سدھارے کہ صنم خانے کو" اگر جناب عزیز منہ مانگی مراد نظم کرتے تو محاورہ تھا۔ من مانی مراد محاورہ نہ ہونے کی حیثیت سے نظم نہیں کیا۔ بلکہ ان دو لفظوں سے مطلب ادا کیا ہے۔ من اپنی جگہ معنی دے رہا ہے۔ اور مانی اپنی جگہ۔ یہ کون کہتا ہے کہ اسے محاورہ کہئے۔ ہاں یاس صاحب کو تو ضرور ماننا پڑے گا۔ کیونکہ وہ تو عظیم آبادی ہیں۔ اور لکھنؤ کی زبان کی تقلید کرتے ہیں۔ لیک مشہور دعا کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

ہے جو بانی عزا کی محفل کا
اور اس کا بر آئے مدعا دل کا

کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ منہ مانگی مراد کی جگہ مدعائے دل کیوں نظم کیا۔ منہ مانگی مراد اور چیز ہے۔ اور من مانی مراد اور شے۔ کیا تمک ملایا ہے۔ سبحان اللہ۔

(مؤلف) "اب چاہئے کو کھولیں گے" میں مرزا یاس نے جو اعتراض کیا ہے۔ وہ اس لئے قابل وقعت نہیں ہے کہ روز مرہ پہلے بھی دونوں طرح تھا۔ اور اب بھی دونوں طرح ہے۔ خواہ یہ کہا جائے کہ اب چاہئے کھولیں گے۔ اور خواہ یہ کہا جائے کہ اب چاہئے کو کھولیں گے۔ ذیل میں دو ایک مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ مرزا غالب کہتے ہیں ؎

غالب مجھے اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

"تذکرۂ معرکۂ سخن" مؤلفہ مولانا عبدالباری آسی [پ: ۱۸۹۳ء] اردو زبان میں اپنی نوعیت کا اولین تذکرہ ہے۔ اردو فارسی کے سیکڑوں شاعر ایسے گذرے ہیں جن کے کلام پر اعتراضات کئے گئے اور ان کے جوابات دئے گئے۔ میر و سودا، ذوق و غالب، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، خاقانی و انوری، عرفی و ظہوری وغیرہ وغیرہ کے کلام پر کیا کیا اعتراضات ہوئے اور کیا کیا جوابات دئے گئے۔ یہ سب کچھ رسائل و کتب میں بکھرا پڑا ہے۔ اسی پھیلے ہوئے سرمائے کی چھان پھٹک کرکے مولانا آسی نے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ اس میں شعرا پر کئے گئے اعتراضات ان کا جواب اور پھر مولانا آسی کا محاکمہ۔ حواشی میں متذکرہ شاعر کا احوال دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب لغت و اصطلاح، عروض و قافیہ، بیان و معانی، شعراء کی نوک جھونک، علمی مباحث، ادبی لطائف، لغوی تحقیقات، مختلف اساتذۂ فن کا انداز بیان مناظرہ، ادبی اور محاکمہ، یہ کتاب معلومات کا سمندر ہے۔ صفحات ۷۸۲، مطبوعہ نگار بکجنسی لکھنؤ ۱۹۴۳ء — اب یہ کتاب نایاب ہے۔

یہ صورت گر

سلیم اختر

انور سدید

مجتبیٰ حسین

اندرجیت لال

دلیپ سنگھ

شفیقہ رحمت

شیخ سلیم احمد

مجید جمال

محمد اسد اللہ
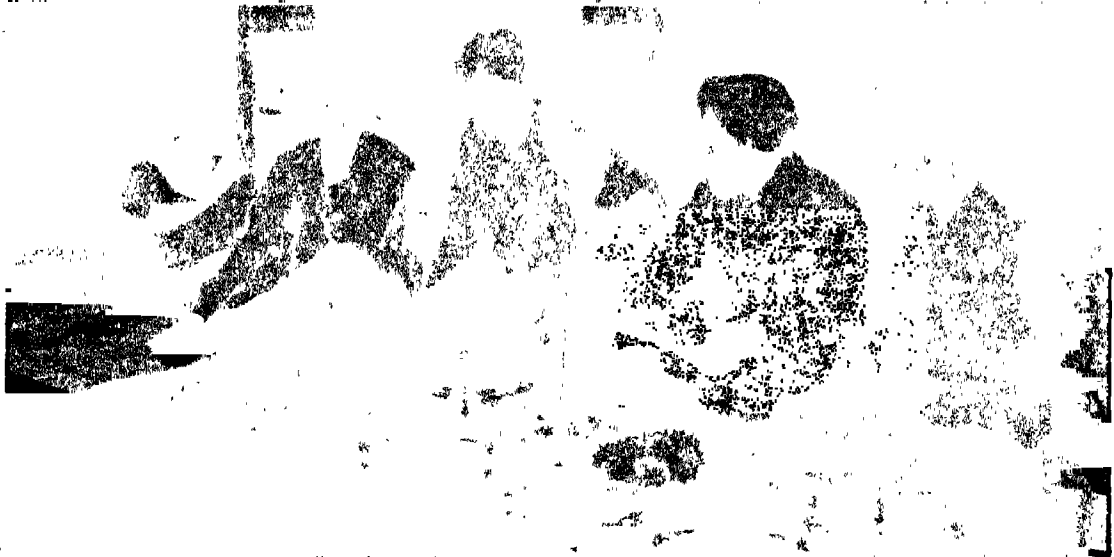
● جوش ملیح آبادی مرحوم ۱۹۶۴ء میں احمد آباد تشریف لائے تھے۔ یہ تصویر اسی موقع کی یادگار ہے۔ تصویر میں دائیں سے بائیں جمیل کلیمی، عیش ٹونکی اور مائک پر سید فخرالدین قادری [فخر گجرات] کو دیکھا جا سکتا ہے۔

[بہ شکریہ رحمت امروہوی احمد آباد]
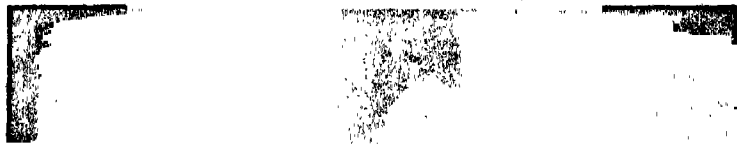
● ۱۹۷۴ء میں لکھنؤ میں شام افسانہ کے موقع پر لی گئی تصویر میں [دائیں سے] احمد جمال پاشا، اطہر نبی، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل، رتن سنگھ، مسیح الحسن رضوی اور عائشہ صدیقی۔

[بہ شکریہ رام لعل لکھنؤ]

محمد طفیل مرحوم کا آخری خط عبدالقوی دسنوی کے نام

محب گرامی   سلام مسنون!

تبصرہ "مضمون" مکاتیب نمبر اور خطوط نمبر پر مل گیا ہے۔

جب مجھے تبصرہ مضمون ملا۔ اس وقت مجھے 104 بخار تھا۔ میں نے اسی حالت میں مضمون کو دیکھا۔ یہ حالت یا کیفیت اکثر مجھ پر وارد ہوتی رہتی ہے۔ غرض میں اپنے کام سے کسی نہ کسی طرح نپٹتا ہی رہتا ہوں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کھانا کھاتے وقت کوئی مضمون مل گیا تو میں کھانے کو کم مضمون کو زیادہ کھاؤں گا۔ بس اپنی خوشی کے پہلو ہیں یہ!

ایک ہفتہ کے بعد آج پہلا دن ہے کہ دفتر آیا ہوں۔ املا کا عرض ہے – آج تو لفظ بھی غلط لکھے جا رہے ہیں۔ ورنہ املا کی جگہ احتیاطاً لکھا جا رہا تھا کہ — احتیاطاً آج اتنا ہی!

محمد طفیل
[illegible]/6/86

محمد طفیل —— محمد نقوش

ہند و پاک کے ادبی رسائل کو ضخیم موضوعاتی نمبروں کا تصور دینے والے مشہور صحافی اور خاکہ نگار جناب محمد طفیل مدیر نقوش (لاہور) کا ۵ ر جولائی ۱۹۸۶ کو اسلام آباد میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ طفیل صاحب کا آخری کارنامہ نقوش کا رسول نمبر ہے جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مرحوم، نقوش کے خصوصی نمبروں پر ہند و پاک کے مشاہیر قلم کاروں سے مضامین لکھواتے تھے۔ وہ رسالہ نقوش سے اس طرح وابستہ ہو گئے تھے کہ "محمد نقوش" کے لقب سے یاد کئے جانے لگے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے مہتمم اور محرک تھے۔ خصوصی نمبروں کے مواد کی فراہمی وغیرہ کے لئے وہ قابلِ قدر علمی و ادبی شخصیتوں کا تعاون حاصل کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ "نقوش" کے خصوصی نمبروں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا جائے۔ طفیل صاحب کے لئے یہی سب سے بہتر خراجِ عقیدت ہوگا۔

عکسِ تحریر

خان بہادر سید رضا علی صاحب وحشت کلکتوی

سوزِ غم میں نہیں پروانہ ہی قائل میرا
شمع بھی دیکھتی ہے منھ سرِ محفل میرا

متحیر ہے مرے ضبط پہ قاتل میرا
کیا سبب ہے کہ تڑپتا نہیں بسمل میرا

نہ اثر کو مرے پایا نہ غرض کو سمجھے
طرز اڑاتے رہے گلشن میں عنادل میرا

قعرِ دریا سے تو نکلا ہوں مگر ڈرتا ہوں
ڈوب جائے نہ سفینہ لبِ ساحل میرا!

زندگانی طمعِ خام میں گزری ساری
فکرِ حاصل کے سوا کچھ نہیں حاصل میرا

سختیٔ راہ سے ہوتی نہیں دل کو امید
کہ گزر ہوگا کبھی تا سرِ منزل میرا

رات اُس نے جو نظر مجھ سے چرائی وحشت
مل گیا خاک میں امید بھرا دل میرا

رضا علی وحشت

شہریار

خواہشیں جسم میں بو دیکھتا ہوں
آج میں رات کا جو دیکھتا ہوں

سیڑھیاں جاتی ہوئی سورج تک
دیکھنا چاہا تھا سو دیکھتا ہوں

تتلیاں، پھول، بھوز خوشبو کے
یاد وہ آتا ہے تو دیکھتا ہوں

اے خدا اور نہ دیکھے کوئی
میں کھلی آنکھ سے جو دیکھتا ہوں

شرط گر یہ ہے سمندر تیری
کشتیاں ساری ڈبو دیکھتا ہوں

آئینے دھندلے ہوئے ماضی کے
آنسوؤں سے انھیں دھو دیکھتا ہوں

باعثِ وحشت جنوں کہتے ہیں سب کچھ اور ہے
وجہ سکوں تو سہی، غم کا سبب کچھ اور ہے

ہم نے خود اپنی رات کو اتنا طویل کر لیا
ورنہ ہمارے عہد میں جینے کا ڈھب کچھ اور ہے

پلکوں پہ روکتے رہو، کاری ہیں وار رات کے
کافی تو ڈھل چکی ہے یہ تھوڑی سی شب کچھ اور ہے

پانی کی ایک بوند سے پیاس کی ابتدا کرو
چشمے پہ جب رسائی ہو کہنا طلب کچھ اور ہے

دید سے لمس تک ہمیں کیا کیا نہ تجربے ہوئے
دیکھنے میں اور کچھ تھا وہ چھونے پہ اب کچھ اور ہے

حرفِ ناگفتنی

شام کو ڈھلتے ہوئے دیکھ کے
ان آنکھوں نے
اک سمندر کے خد و خال گڑھے
رات کی کشتی اتاری اُس میں
اک کنارے پہ تجھے بٹھلایا
دوسرے پہ مجھے زنجیر کیا

باوجود اس کے مرے ہونٹوں نے
جسم پر تیرے بہت دیر تلک
حرفِ ناگفتنی تحریر کیا

● ۱۲ - سی، میڈیکل کالج کیمپس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ادب، عصری آگہی اور انشائیہ

انور سدید
کینال کالونی - فیصل آباد - (پاکستان)

عصری آگہی سے مراد کسی مخصوص عہد میں معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار، اذکار اور انکشافات سے آگہی ہے۔ اس اجمال کی روشنی میں سوال اگر یہ ہو کہ

کیا عصری آگہی کے بغیر ادب تخلیق ہو سکتا ہے ؟

تو میں بلا توقف نفی میں جواب دوں گا۔ وجہ یہ کہ ادیب اپنے عہد کا جزو لاینفک ہوتا ہے اور وہ اپنے عصر سے جدا نہیں ہو سکتا۔ ادیب جب اظہار ذات کے لئے ادب کو وسیلہ بناتا ہے تو اس کی تخلیق میں وہ لرزشیں بھی شامل ہوتی ہیں جو اس عہد کی معاشرتی، تہذیبی اور فکری سطح پر رونما ہو رہی ہوتی ہیں۔ اور جن سے ادیب کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتا ہے۔ حال وہ لمحۂ دیدہ ہے جس کی زد پر ادیب ہمیشہ رہتا۔ حوادثِ زمانہ کے دار سے تہہ تجربات سمیٹتا، اور مستقبل کی طرف بڑھتا ہے۔ ماضی وہ جھولی ہے جس میں یہ تجربات کسی محفوظ خزینے کی صورت جمع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ادیب ان دونوں زمانوں کے تجربات کو نہ صرف اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بناتا ہے بلکہ اس تجربے کو تخلیقات کی صورت دے کر آئندہ نسلوں کے لئے بصیرت اور آگہی کا سامان بھی فراہم کر دیتا ہے۔ چنانچہ تخلیق وہ بدن ہے جس میں عصری آگہی حرکت و حرارت پیدا کرنے کیلئے زندگی کی روح پھونکتی ہے۔ اور ریمی دی گارماں کے مطابق۔

"فن کار اپنی ذات کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی اپنے زمانے کے بارے میں لکھتا ہے۔" [1]

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اس مقولے میں مزید یہ اضافہ کیا ہے کہ

"ادیب بعض اوقات اپنے زمانے کے بارے میں لکھتے ہوئے اپنی ذات کے بارے میں بھی لکھ جاتا ہے۔" [2]

ان دونوں اقوال میں بظاہر فاصلہ نظر نہیں آتا تاہم غور کیجئے تو ریمی دی گارماں میں جو تیقن ہے وہ ایلیٹ کے قول میں دستیاب نہیں۔ ریمی گارماں کا قول جامع اور کشادہ ہے جبکہ ٹی ایس ایلیٹ نے زمانے کے مقابلے میں ادیب کی ذات کو قدرے محدود کر دیا ہے۔ ادیب چونکہ زمانے کا حصہ ہے اس لئے وہ اپنی ذات کے بارے لکھے یا زمانے کے بارے میں، وہ اس میں موجود ضرور ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ ادب میں، شخصیت کا اظہار ہو یا عصری آگہی کا، اس کا اساسی مقصد سچائی کی تلاش ہے۔ ادیب اپنے عصر سے روحِ عصر تلاش کرتا ہے جو حال کے لمحے اور "اب" کی قید سے آزاد ہے چنانچہ ادیب فنکار دوامی حیثیت اور عصر کے دوامی تجربے کا پیش کار ہے۔

ادب اور غیر ادب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ موخر الذکر میں عصری حقیقت کی تقلیب نہیں ہوتی اور واقعہ سطحی صورت میں قاری تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تحریروں میں ادیب کی ذات، اس کی چھاپ اور جذباتی سرگرمی اپنا مخصوص تخلیقی عمل بروئے کار نہیں لاتی۔ ادب کا اتنا عمل و کیا نوعیت کا ہے ادب اساسی طور پر اس خیال کا مرہون منت ہے جو واقعہ خارج کا زائیدہ ہے لیکن اس کا جنم ادیب کے باطن میں ہوتا ہے۔ یہ خیال یا ڈرن جب تخلیق کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے تو ادبی فن پارہ شمار ہوتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اس فن پارے میں زمانی واقعات، عصری تاثرات، سیاسی اور سماجی کروٹیں، علمی اور فکری جزر و مد اور ماحول کے شعور کے زاویے کسی سالار کی طرح موجود ہوتے ہیں اور فن پارے میں جو بکھرا بکھرا سا نظر آتا ہے وہ تمام تر اس عصری دیدے سے آہ پوشتا ہے میں عصری آگہی کہنا کہ ادب کا وجود قائم کرنا ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ

---

[1] بحوالہ ایلیٹ کے مضامین مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی [2] ایضاً

ادب میں عصری آگہی کا ظہور کس طرح ہوتا ہے اور اس کا موثر انداز کیا ہے؟

جو بات ظاہر ہے کہ ادیب کے لئے اساسی طور پر یہ ضروری ہے کہ ادیب محض لفظوں کی خشت بندی نہ کرے بلکہ وہ تخلیق کار بھی ہو۔ یعنی ادیب اپنے گرد و پیش سے جو بنیادی خام مواد حاصل کرے تو اس خام مواد کو اپنے تخلیقی جوہر سے منقلب کرنے اور اس میں روحِ عصر ڈالنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ یہ صلاحیت چونکہ فطرت کا عطیہ ہے اس لئے ہر شخص تخلیقی ادیب کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف جن ادبا کو یہ تخلیقی صلاحیت عطا ہوئی ہے ان میں سے ایک گروہ کا تقاضا یہ ہے کہ فنی تخلیق کو روحِ عصر کی براہ راست عکاسی کرنی چاہئے اور ادیب کے لئے لازم ہے کہ وہ ادب کے ذریعے پیغام رسانی کا فریضہ بھی سر انجام دے۔ بلاشبہ اس سے ادیب اور معاشرے میں ایک مضبوط رشتہ قائم ہو جاتا ہے لیکن شاید اس سے ادب کا فطری مزاج پوری طرح پنپ نہیں سکتا۔ ادب پر مقصد غالب آجائے تو ادیب ایک ایسے ناقوس کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو کسی مخصوص فری کوئنسی FREQUENCY پر ہی آواز نکال سکتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اس کی شدید مخالفت کی ہے اور لکھا ہے کہ:

"ایک سچا فنکار آرٹ پیدا کرنے کی غرض سے غالباً ان چیزوں کو تصرف میں لاتا ہے جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہی کام شعوری طور پر کرتا ہے تو وہ ایک چھوٹا فنکار ہے۔" [۳]

چنانچہ ادیبوں کا دوسرا گروہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ادیب سماجی سطح پر جن حالات و واقعات سے نبرد آزما ہوتا ہے ان کا بیانیہ ادب نہیں۔ بلکہ یہ سب ادیب کے مجموعی عادات بنتا ہے جب ادیب جب واقعہ یا تاثرات کو فن پارے کی صورت دیتا ہے تو وہ بالواسطہ طریق اختیار کرتا ہے اور زیر تصرف مواد کو لاشعوری طور پر تخلیق کی بنت میں شامل کر لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک سچا ادیب زمانے سے اپنا ناطہ نہیں توڑتا بلکہ معاشرے کے تصورات و نظریات کو اپنی ایمانیات کا جزو بنا کر انہیں اپنے فن کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔ اس کاوش میں ادیب کا جمالیاتی زاویہ، فنی اسلوب اور فکری جہت سب موجود ہوتے ہیں انہیں سے ادیب کی ذات کے نقوش مرتب ہوتے ہیں اور اب جو فن پارہ تخلیق ہوتا ہے وہ نہ صرف عصری آگہی کا مرقع ہوتا ہے بلکہ زمان و مکان کی قیود سے بھی آزاد ہو جاتا ہے اس فن پارے میں زمانہ حال کا جزر و مد گزرے وقتوں کی بازگشت اور آنے والے زمانوں کی چاپ یکساں سنائی دیتی ہے۔ اس لئے اس کی عصری صداقت ہر دور کی صداقت قرار پاتی ہے اور زمانہ اس پر مہر قبولیت دوام ثبت کر دیتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ادیب کی عصری آگہی ایک عام شہری کی عصری آگہی سے مختلف ہوتی ہے۔ عام شہری اپنی مادی ضرورتوں کا اسیر اور حالات کے لمحے کا قیدی ہے۔ چنانچہ اس کی آگہی کا دائرہ بہت محدود ہے اور گذرا ہوا کل اس کی جنت ہے۔ اس کے برعکس ادیب اس وژن VISION کی تجسیم کرتا ہے جو عصری آگہی کو تخلیقی شخصیت کا جزو بنانے سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک عام شخص کی جہت اس کی ذات کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ادیب کی جہت ذات کے علاوہ کائنات کی طرف گزرے ہوئے زمانے اور آنے والے مستقبل کی طرف بھی ہوتی ہے۔ اور ایک سچا ادیب نہ صرف فرد اور معاشرے کے رشتے کو مضبوط کرتا ہے بلکہ عصری آگہی کی فنی تجسیم سے فرد پر ایک نیا جہانِ معنی بھی آشکار کرتا ہے اور اسے تہذیبی لحاظ سے رفعت آشنا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

یہ طویل تمہید میں نے اس لئے باندھی ہے کہ اردو کی نسبتاً نوخیز صنفِ ادب "انشائیہ" میں عصری آگہی کے آثار اس صنف کی تخلیقات کی سطح کے ساتھ چپکے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ یہ ایک مخصوص تخلیقی عمل سے گزر کر ہی قاری کے سامنے آتے ہیں۔ انشائیہ میں آگہی کی سطح مرئی نہیں بلکہ انشائیہ عصری آگہی کو ایک نئی نوع کے تاثر میں تبدیل کر دیتا ہے جیسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن شاید بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس خوشبو کی مانند ہے جو مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے لیکن جسے چھونا ممکن نہیں۔ اس سب کے باوجود دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ بھی ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا تمام تر مواد زندگی کے نجی تجربے سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی پیشکش میں ذاتی تاثر کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ انشائیہ کے جنم میں اس حقیقت کا عمل دخل زیادہ ہے کہ جب مانتین نے اپنی عصری آگہی اور ذاتی تجربے کو زمانے کے سامنے آزادہ خیالی سے پیش کرنے کا ارادہ کیا تو اس کی غیر منضبط تحریروں سے انشائیہ وجود میں آگیا۔ مانتین فطری طور پر داخلیت پسند تھا۔ اسے زندگی کی بیشتر بنیادی آسائشیں حاصل تھیں۔ وہ دو دفعہ اپنے شہر کا میئر منتخب ہوا۔ اس عہدِ جلیلہ پر اسے تجربات کی ایک وسیع دنیا دیکھنے کا موقعہ ملا۔ مانتین کا عہد فکری تموج کا عہد تھا۔ زندگی اور مابعد الطبیعات کی جوئی جستجو نے ہر خاص و عام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سماجی سطح پر شدید نوعیت کی بداطمینانی موجود تھی۔ چنانچہ مانتین کے داخل میں جو مخلص اور سچا ادیب موجود تھا وہ خارجی ماحول کی ناہمواریوں کے ساتھ مطابقت پیدا نہ کر سکا اور ہمیشہ ذہنی اضطراب کی نذر رہا۔ اس کی زندگی کا وہ دور شاید سب سے زیادہ طمانیت کا حامل ہے جب مانتین نے ایک بڑے عہدے کو ٹھوکر مار دی اور شہر سے ناطہ توڑ کر اپنے آبائی گاؤں کی خلوت میں گم ہو گیا۔ یہاں مانتین نے اپنے سابقہ تجربوں

---

[۲] وزیر آغا . . . . حوالہ ایضاً [۳] حوالہ

کے جوہر کو پرکھنا شروع کیا اور داخلی کائنات سے گفتگو شروع کر دی۔ اس دور میں مانتین نے ایسی تحریریں تخلیق کیں جن میں نہ صرف مانتین خود موجود تھا بلکہ ان تحریروں میں اس دور کا فرانس بھی سانس لے رہا تھا۔ بلاشبہ مانتین نے زیادہ تر اپنی ذات کے بارے میں لکھا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے اس عمل میں اپنے زمانے کی عکاسی بھی کچھ کم نہیں کی۔ مانتین کے نثر پاروں سے مانتین کی سوانح عمری تو شاید مرتب نہیں ہو سکتی لیکن ان سے فرانس کی تہذیبی زندگی کے نقوش اور اس عہد کی معاشرتی سرگرمیوں کا احوال ضرور مرتب ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ مانتین نے متعدد تجربات کے اجزا سے ایک کلی حقیقت کا انتخاب کیا اور اظہار کے لیے بالعموم ایسے موضوعات منتخب کیے جو علمی حیثیت کے علاوہ سماجی اہمیت کے حامل بھی تھے چنانچہ وہ روح عصر جو فرانس کے فکری انتشار میں بیٹھا بہت مشکل تھا مانتین کے افکار پریشاں میں یوں سمٹ آئی کہ پورا فرانس اس آئینے میں اپنی فطرت کا مشاہدہ کرنے لگا۔ بلاشبہ مانتین کے انشائیے داخلی نوعیت کے ہیں لیکن یہ اپنے عہد کا اثبات بھی مانتین کی ذات سے کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود مانتین نے اپنے انشائیوں کے ساتھ کوئی بڑا مقصد منسلک نہیں کیا۔ مانتین کے انشائیے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقے کے حامیوں کے درمیان تنازع نہ تو روک سکتے تھے اور نہ ہی اس اختلاف کو تیز کرتے تھے۔ ان انشائیوں سے کسی عملی انقلاب کی راہ بھی ہموار نہیں ہوتی۔ یہ انشائیے انسان کو عرفان کی منزل تک پہنچانے میں بھی معاونت نہیں کرتے لیکن مانتین کی اس ادبی و سماجی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے فرد کو عصری حقیقت کا ایک نیا اور انوکھا روپ دکھانے کی کاوش کی۔ وہ زندگی کے اندھیرے میں اس جگنو کی طرح چمکا جو منزل کی امید تو دلاتا ہے لیکن خود منزل نہیں بنتا۔

بیکن قدیم انشائیہ کا دوسرا بڑا نام ہے۔ بیکن نے اپنے عہد کے متصادم میلانات اور برسرپیکار تصورات کو عصری آگہی کی نئی تعبیر سے ایک مثبت سمت دینے کی کاوش کی اور فرد کو ممنوعات کے اژدہام سے نکال کر فطری سطح پر زندگی بسر کرنے کی دعوت دی۔ انشائیہ کی یہ ابتدا بے حد معنی خیز تھی۔ تاہم اسے عصری آگہی سے براہ راست متعلق کرنے میں ایڈیسن اور سٹیل نے زیادہ گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ یہ انشائیہ نگار چونکہ اخبارات کے ساتھ وابستہ تھے اس لیے ان دونوں نے انشائیہ کو تہذیبی اصلاح کا وسیلہ بنانے کی کاوش کی۔ چنانچہ ایڈیسن نے انشائیہ کو ایک ایسا مفرامن قرار دیا ہے جس سے باغ کی روشوں کی شاخ تراشی کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے سٹیل کے بارے میں لکھا ہے کہ

"وہ غیر مطلین عوام کی توجہ بٹانے کے لیے ایسے ESSAY لکھتا ہے اور اس نے نثر میں غیر جارحانہ اور سرد رویے کی عکاسی کر کے سیاست کی پیدا کردہ گرمی کو معتدل بنانے کی کاوش کی ہے۔"

ایڈیسن اور سٹیل کے بیشتر انشائیوں میں لمحہ موجود کی سیاسی اور سماجی زندگی اور حال کے مسائل کو اہمیت دی گئی ہے۔ انہوں نے آواز اخلاق کو یوں اٹھایا کہ اسے شکر چڑھی گولی کی طرح حلق سے اتارنا آسان ہو گیا۔ چارلس لیمب، ڈبراؤن، جیمز تھربر، لیوکس وغیرہ انگریزی انشائیہ کے چند ایسے نام ہیں جو اخبار کی ضرورت کے مطابق انشائیہ لکھتے تھے۔ ان کا موضوع عام دلچسپی کا حامل ہوتا، اپنے عہد کے مسائل کو محیط کرتا اور سماجی اعتبار سے غیر مطمئن قاری کو لطافت اور مسرت کے ایک نئے جادے پر ڈال دیتا۔

مندرجہ بالا اجمال سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ کا فن زندگی کے گھسان میں پروان چڑھتا ہے افکار، حوادث اور محسوسات کے جزر و مد آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ انشائیہ نگار مظاہر اور عوامل کی ہر نئی پرت کو نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ اسے اپنے اندر پروار بھی کرتا ہے اور تلخ، ترش یا تیز ابی ردعمل پیدا کرنے کے بجائے فرد کو ایک نیا زاویہ دکھا کر اس کی سوچ کا رخ تبدیل کر دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ رخ بھی زندگی کی کوکھ سے ہی پھوٹتا ہے۔ اور اس کا خمیر بھی عصری آگہی سے ہی اٹھایا جاتا ہے لیکن ملحوظ نظر ہے کہ شاعر، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار فن پارے میں عصری تاثرات سمو کر قاری کے جذبات کو ایک خاص جہت میں لے جانے کی کاوش کرتے ہیں اس کے برعکس انشائیہ نگار اسے ایک ایسے بر اعظم میں چہل قدمی کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کا نظارہ اس نے کبھی نہیں کیا۔ چنانچہ حقیقت ایک نئے مناظر میں جلوہ کشا ہو جاتی ہے۔ اور آگہی کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ انشائیہ نگار کڑوی بات کو میٹھا نہیں بناتا بلکہ وہ اسے میٹھے انداز میں پیش کرتا ہے اور معاشرتی ردعمل کو باندازِ دگر دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ انشائیہ بقول ہیزلٹ ادیب کو کچھ کہنے کی جرأت عطا کر دیتا ہے جو وہ انسان کی حیثیت میں محسوس کرتا ہے۔

جس طرح ادب کی تخلیق میں ادیب کا فطری طور پر تخلیق کار ہونا ضروری ہے اسی طرح انشائیہ نگار میں انشائیہ کا فطری مزاج ہونا بھی ضروری ہے اور اس کی ضرورت اس لیے زیادہ ہے کہ انشائیہ میں مزاح، طنز، افسانہ اور مضمون وغیرہ کے اسالیب کا سمٹ آنا بہت ممکن ہے۔ اگر ادیب کا مزاج انشائیہ

کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تو وہ اس جہانِ معنی کو گرفت میں لینے سے قاصر رہتا ہے۔ جو چھوٹی چھوٹی چیزوں اور معمولی معمولی باتوں کے بطون میں چھپا ہوتا ہے اور صرف انشائیہ نگار کی تخلیقی گرفت میں آسکتا ہے۔ اس صورت میں خدشہ لاحق ہوجاتا ہے کہ ادیب کا قلم اپنا رخ مزاح کے قہقہہ زار کی طرف نہ موڑ دے یا ادیب خود ایک بڑے راسخ سنگھاسن پر متمکن ہوکر ماحول پر زہرناک طنزیہ نظر نہ ڈالنے لگے۔ انشائیہ نگار عصری آگہی میں خود شرکت کرتا ہے اور موضوع کو ایسے زاویوں سے دائرۂ نور میں لاتا ہے جس سے زندگی کا تناظر منور ہوجاتا ہے۔ اور مشینی تکرار ٹوٹ جاتی ہے۔ اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ انشائیہ چھوٹی چھوٹی چیز اور بڑے سے بڑے موضوع پر یکساں خیال انگیز انداز میں لکھا جاسکتا ہے۔ رابرٹ لینڈ نے لکھا ہے کہ

"یوم حساب سے لے کر قینچی تک دنیا کی ہر چیز انشائیہ کا شاداب موضوع بن سکتی ہے۔ قاری کا انشائیہ نگار سے صرف ایک ہی تقاضا ہے کہ وہ موضوع یا چیز کے ایسے زاویوں کو سامنے لائے کہ اس کی سابقہ آگہی نئی لو سے منور ہوجائے۔"

چنانچہ انشائیہ کا زندگی اور اس کے گرد و پیش سے ایک تعلق تو یہ ہے کہ انشائیہ موضوعات کی رسمی قید سے آزاد ہے۔ دوسری بات یہ کہ موضوعات کو رسمی اور بھاری بھرکم حوالوں سے نکھارنے کے بجائے انشائیہ موضوع کے باطن سے مخفی مفاہیم کی دریافت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اور فرد کی آگہی میں نیا اضافہ کرکے اس کی سوچ کو ایک نئی کروٹ دے دیتا ہے۔ انسان کی آگہی کو زنگ لگ جائے تو اس کے داخل سے روشنی کا مناسب انعکاس رک جاتا ہے اور فرد پر مایوسی، قنوطیت اور اداسی کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ انشائیہ فرد کی ذہنی ترنگ کو ہی سامنے نہیں لاتا بلکہ یہ ذہن کو بیدار اور متحرک بھی کرتا ہے اور یوں انسانی شعور کی توسیع میں ایک اہم فریضہ سر انجام دیتا ہے۔

انشائیہ کی متذکرہ بالا مختصر فنی بحث کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو انشائیہ میں عصری آگہی نے جس انداز میں جلوہ نمائی کی ہے اس کا جائزہ اجمال سے پیش کیا جائے۔ اردو میں رسمی مضمون نگاری کی ابتدا ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ شمار کی جاتی ہے۔ یہ مضامین بالعموم امتحانی پرچوں میں دریافت کئے گئے سوالوں کے جواب میں لکھے جاتے تھے اور ان کی نوعیت درسی تھی چنانچہ انہیں سے "جواب مضمون" کی اصطلاح وضع ہوئی جو ایک طویل عرصہ تک ESSAY کی مترادف اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے انگریزی ایسے ESSAY کی تقلید کی کاوش کی۔ تاہم ان کی نوعیت اسی جواب مضمون جیسی ہی ہے جن میں موضوع کو پہلے سوال میں ڈھالا جاتا ہے اور پھر منطقی اور استخراجی انداز میں اس کے جواب میں دلائل اور براہین جمع کئے جاتے ہیں۔ سر سید احمد خان لندن گئے تو انہیں ایڈیسن اور سٹیل کے انشائیے پڑھنے کا موقعہ بھی ملا۔ ان انشائیوں میں چونکہ عصری آگہی کا عمل دخل زیادہ تھا اور مقصد اصلاحی تھا اس لئے سر سید کو یہ بالواسطہ طریق پسند آیا اور انہوں نے وطن واپس آکر "تہذیب الاخلاق" میں اسی نوع کے مضامین لکھنے کی کاوش کی۔ سر سید کے مضامین میں انشائیہ کا جزوی مزاج موجود ہے۔ عصری آگہی کے حوالے سے دیکھا جائے تو انہوں نے زندگی کے خارج اور واقعات و مسائل کے اصلاحی زاویوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کا طریق بلا واسطہ اور خطیبانہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھٹکے ہوئے مسافروں کو فلاح کا راستہ دکھانے کی کاوش زیادہ کی ہے۔ یہ ایک بڑی قومی خدمت ہے لیکن ادب کے زاویے سے دیکھئے تو "بحث و تکرار"، "امید کی خوشی" اور "خوشامد" وغیرہ مضامین میں سر سید نے قاری کو کسی نئے فکری مدار میں داخل کرنے کے بجائے پرانے اور گھسے مدار کو ہی صاف کرنے کی تلقین کی ہے۔ سر سید کے رفقا میں سے الطاف حسین حالی، محسن الملک اور مولوی ذکاء اللہ کے ہاں سائنسی انداز اور اصلاحی زاویہ زیادہ نمایاں ہے۔ تاہم اس حقیقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ان سب نے اپنے عہد کی آواز کو گوش ہوش سے سنا اور اہل وطن کو جدید فکر کی صدا پر چلنے کی دعوت دی۔ انیسویں صدی کی مضمون نگاری اگرچہ انشائیہ کے جملہ فنی تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتی تاہم ان مضامین میں انشائیہ نگاری کا پرتو موجود ہے اور انہیں جدید انشائیے کا پیش رو قرار دینے میں کوئی حرج نہیں۔ انیسویں صدی کے ربع چہارم میں انگریزی تہذیب کی یورش نے فرد کو خود اپنے اندر جھانکنے اور تحفظِ ذات کے وسائل تلاش کرنے پر مائل کیا تھا چنانچہ ادب کو رشد و ہدایت اور اصلاح و تبلیغ کے ایک موثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اور انشائیہ کی خشتِ اول رکھی گئی تو اس صنف نے اپنے عہد کے مسائل کا نہ صرف استدراک کیا بلکہ انہیں اپنی بنت میں سمو کر اپنی عصری ذمہ داری کی تکمیل بھی کی۔

بیسویں صدی خالص انشائیہ کی طرف پیش قدمی کی صدی ہے۔ اس صدی کے نصف اول میں ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے مضمون کی روایتی پابہ گل حیثیت کو قبول کیا تو صنوبر کی طرح آزاد ہونے کی کوشش بھی کی۔ اس دور میں اصلاح اور تبلیغ کی ضرورت سے تو شاید ادبا نے انکار نہیں کیا لیکن ان اصلاحی عناصر کی پیشکش کے زاویوں میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ طنز اور مزاح اس دور کے موثر حربے تھے۔ تاہم خواجہ حسن نظامی، سجاد انصاری کا

پطرس اور رشید احمد صدیقی کا شمار ایسے ادبا میں ہوتا ہے جنھوں نے حالات و واقعات اور عناصر و مظاہر کو محبت کی نظر سے دیکھنے اور شگفتہ زاویوں سے منور کرنے کی کوشش کی۔ ان ادبا نے اپنے گرد و پیش اور اپنے عہد کی گرد و ملال کو خارج کی زیرک آنکھ سے دیکھا۔ لیکن ان کے مضامین میں انکشافِ ذات کے زاویے زیادہ نمایاں نہیں۔ عصری آگہی کے نقوش واضح اور روشن ہیں لیکن یہ سب ایک مخصوص ردِ عمل کے زائیدہ نظر آتے ہیں۔ ادیب بلا واسطہ طور پر مصلح اور ناصح بننے کی کوشش نہیں کرتا لیکن اس کے سامنے ایک منزل ضرور ہے۔ اور وہ ایک مخصوص تیزابی عمل سے معاشرے کی تطہیر کا آرزو مند بھی نظر آتا ہے۔

آزادی کے بعد جب سیاسی تموّج نے سماجی جہت اختیار کی تو فرد نے نہ صرف گرد و پیش پر ایک تہذیبی انسان کی نظر ڈالی بلکہ اپنی شخصیت کو معاشی سرگرمیوں اور سماجی مظاہر کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش بھی کی۔ اس دور میں وزیر آغا نے جو غیر رسمی مضامین "خیال پارے" کے عنوان سے لکھے اس میں اشیا اور مظاہر اور افکار و مسائل پر نظر ڈالنے اور انہیں خالصتاً اپنی ذات کے حوالے سے پیش کرنے کا زاویہ موجود تھا۔ وزیر آغا نے اسلوب کی تازہ کاری سے اشیا اور مظاہر کے نئے مخفی مفاہیم اجاگر کئے اور انسانی شعور کو نسبتاً وسیع تر مدار میں سرگرم سفر ہونے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس نوع کے مضامین کو پہلے حیرت کی نگاہ سے دیکھا گیا لیکن پھر انہیں مضامین سے اردو انشائیہ کے خد و خال اور ایک مخصوص مزاج کی نشاندہی بھی کی گئی۔ لفظ "انشائیہ" اگرچہ لغت میں موجود تھا اور یہ کچھ موقر ادبا کے ہاں خال خال مستعمل بھی ہو چکا تھا۔ لیکن اس نئی صنف ادب کے ساتھ اس لفظ کی باقاعدہ وابستگی بھی اسی دور میں شروع ہوئی۔ انشائیہ کے فن کی حدود اور اس صنف کے خد و خال پر بحث و نظر کا طویل اور لامتناہی سلسلہ بھی اسی دور کا واقعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انشائیہ کے مزاج اور اس کی متعین تاریخ کے بارے میں اختلاف آج بھی موجود ہے۔ تاہم اس حقیقت سے شاید انکار ممکن نہ ہو کہ متذکرہ بالا نوع کا انشائیہ نسبتاً زیادہ لکھا جا رہا ہے اور اس کے تخلیق کاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے چنانچہ انشائیہ کا ایک مخصوص مزاج سامنے آجانے کے بعد عصری آگہی کو انشائیے میں پیش کرنے کے زاویے بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ روایتی قسم کے مضمون میں ادیب رسمی انداز میں کسی حتمی نتیجے کی طرف سلسلہ وار پیش قدمی کرتا ہے۔ لیکن انشائیہ میں پیش قدمی کا انداز غیر مربوط ہے۔ انشائیہ نگار موضوع کی ڈور کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے اور اسے ایک آزاد پتنگ کی طرح کھلی فضا میں پرواز کی اجازت دے دیتا ہے چنانچہ انشائیہ میں عصری آگہی اپنے جامد تصور کو پیش نہیں کرتی بلکہ اس کا مدار بھی ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے۔ کبھی انشائیہ نگار اپنی ذات کے کسی ایک نکتے کے انکشاف میں زمانے کو گرفت میں لیتا ہے اور کبھی زمانہ ذات کے زینے سے کائنات کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انشائیہ نگار کسی تیز یا ترش ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس کا انداز غیر رسمی اور غیر معروضی ہوتا ہے اور وہ زمانے کی خلوت میں داخل ہونے کے لئے ہمارے سامنے اپنی شخصیت کا دریچہ کھول دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر آج کا انشائیہ معاشرے کے اعمال و افعال کی ہر حرکت کو دیکھتا ہے اور اس کی ہر لغزش کو ٹپکے ہوئے پھول کی طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ اور یوں انشائیہ نگار کی لوح دل پر جو نقش بھی ابھرتا ہے اس میں زمانے کی روح موجود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انشائیہ نگار نے چوری کے پیشے پر انشائی نظر ڈالی ہے اور نہ صرف تاریخ و تہذیب کی بعض معروف دھڑکنوں کو سمیٹ لیا ہے بلکہ مویشیوں کی چوری سے لے کر ثقافت کی نقالی تک سرقے کے تمام زاویوں کی طرف خوش طبعی سے اشارہ بھی کر دیا ہے۔

> "چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں، مشغلہ بھی ہے۔ اور ہم نے لیل و نہار کی ہزار کروٹوں کے باوجود نہ صرف اسے زندہ رکھا ہے بلکہ اس میں لاتعداد موشگافیاں اور فنی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں۔ دروغ بر گردنِ راوی لیکن یہی سنا ہے کہ ہمارے اس پیشے کا ذکر رگ وید میں بھی موجود ہے۔ آریہ جب ہم پر حملہ آور ہوتے اور ہمارے قلعوں کو برباد کرتے چلے گئے تو ہم نے ابا اور انتقاماً ہم نے بھی ان کے مویشی چرانے شروع کر دیئے۔ وہ سارا دن لوٹنے بھڑنے کے بعد جب رات کو آرام کرتے تو ہم شب خون مار کر ان کے مویشی اڑا لے جاتے۔ یقین جانو ہم نے انہیں اس قدر پریشان کیا کہ وہ اپنے اشلوکوں میں برکھا اور دودھ اور فرزند کے لئے دعائیں مانگنا چھوڑ کر یہ دعا مانگنا شروع ہو گئے۔ بے چارے اور کر بھی کیا سکتے تھے لیکن ان کا یہ مکروہ صورت ناگ کا پجاری اور مویشیوں کا چور ایسے خطاب عطا کرنا خود ان کے بنیادی کمزوری کی ایک دلیل تھا ہمیں اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا تھا؟ ذرا سوچو کوئی چاند پر تھوکے تو خود اس کا منہ کیا محفوظ رہے گا۔ بہر حال اپنے تاریخ جغرافیہ کے استاد سے پوچھ لو کہ یہ آریہ لوگ تھو تھو کر کے صفحۂ خاک سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے یا نہیں؟ لیکن دشمن سے انتقام لینے کا جو شاندار حربہ ہماری تحویل میں آگیا تھا ہم نے اس سے دستبردار ہونا پسند نہ کیا اور اسے ہر نئے حملہ آور کے خلاف آزماتے رہے۔ چنانچہ ہزاروں برس کے استعمال کے بعد یہ پیشہ ہمارے ساتھ گویا چپک کر رہ گیا۔ آج بھی ہم مویشیوں کی چوری میں خاصے مشاق ہیں۔ یقین نہ ہو تو کسی

گاؤں میں دو بیگھہ زمین اور ایک بیل لیکر بیٹھ جاؤ۔ اگلی صبح بیل ہمارے گھر پہنچ چکا ہوگا اور دو بیگھہ زمین بدستور تمہاری تحویل میں ہوگی لیکن یہ بھی غلط ہے کہ ہم نے اپنے پیشے کو صرف مویشیوں تک محدود رکھا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیشے کو پھیلا کر زندگی اور ثقافت کے سارے کینوس پر محیط کر دیا ہے۔"

[چوری سے یاری تک]

ہمارا آج کا معاشرہ بے راہ روی، بے ربطی اور بدنظمی کا شکار ہے۔ انشائیہ نگار اس معاشرتی روگ کو دیکھتا ہے لیکن اس پر کڑھنے اور آنسو بہانے کے بجائے وہ ضبط و توازن کو اپنی شخصیت اور تجربے کی کوکھ سے برآمد کرتا ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"مجھے یہ سب دیواریں پسند ہیں۔ یہ دیواریں میری آوارہ خرامی اور بے راہ روی کے راستے میں سینہ تان کر کھڑی ہو گئی ہیں۔ ان دیواروں نے میری ذات کی حدود کو متعین کر دیا ہے۔ میری آواز کی بے مقصد پرواز کو روکا اور میرے جذبے کے اندھے طوفان کے راستے میں بند باندھ دیئے۔ یہ انہیں دیواروں کا کرشمہ ہے کہ میری روح کو جسم اور میرے خیال کو لفظ کا لبادہ عطا ہوا ہے۔ اگر یہ دیواریں نہ ہوتیں تو کبھی کا ہوا میں تحلیل ہو گیا ہوتا۔ سورج کی تمازت میں موم کے ٹکڑے کی طرح پگھل کر یا برف کے تودے کی طرح گھل کر زمین میں جذب ہو گیا ہوتا اور آج صفحۂ خاک میں میرا نشان تک باقی نہ ہوتا۔ بھلا کناروں اور دیواروں کے بغیر بھی کوئی باقی رہ سکا ہے"؟ [دیوار]

طوطا پالنا بظاہر ایک بے کار سا مشغلہ ہے لیکن دیکھیے اس بے کار مشغلے سے انشائیہ نگار نے عصری حقیقت کے چند عرفانی زاویے کس خوبصورتی سے اجاگر کئے ہیں۔

"میں نے زندگی کو تین اہم ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا وہ دور جس میں آپ کبوتر پالتے (بلکہ اڑاتے) ہیں۔ دوسرا وہ دور جس میں آپ مرغ پالتے (بلکہ لڑاتے) ہیں۔ تیسرا وہ دور جس میں آپ طوطا پالتے اور گھنٹوں بڑبڑاتے ہیں۔ اڑانے، بڑبڑانے اور لڑانے کے انہیں تین مدارج سے زندگی عبارت ہے۔

ان میں کبوتر پالنے کا رجحان عہدِ طفلی سے خاص ہے۔ آپ مکان کی چھت پر ایک لمبا سا بانس ہاتھ میں لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گھنٹوں کبوتروں کو ہوا میں قلابازیاں لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں...... ہو سکتا ہے کہ عہدِ طفلی ختم ہوتے ہی آپ کبوتر کی دنیا سے باہر نکل آئیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ بانس ہاتھ میں لئے چھت پر گزار دیں......

زندگی کا اگلا دور مرغ پالنے اور لڑنے لڑانے کا دور ہے۔ مرغ کی زندگی انسان کے گر بست آخرم سے مماثلت رکھتی ہے۔ وہی گھر، بیگمات، ان گنت بچے اور ایک نقطے پر رک کر اپنی مملکتِ خداداد پر نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی روش۔ اس دور میں آپ مجسم انا کے روپ میں ساری دنیا سے متصادم ہوتے اور اپنی ذات کے تحفظ کے لئے جان کی بازی تک لگا دینے سے گریز نہیں کرتے......

لیکن آخر کب تک؟ ایک دن ایسا بھی طلوع ہوتا ہے کہ یہ سارا طلسمِ انا واحد میں پارہ پارہ ہو جاتا ہے...... مکڑی اپنے جالے کو نگل جاتی ہے...

یکایک ایک صبح آپ کی کھاٹ کے پاس سے طوطے کا کرخت اور خوفناک قہقہہ بلند ہوتا ہے اور آپ آنکھیں مل کر دیکھتے ہیں کہ اپنے پرائے، دوست دشمن، بیوی بچے سب آپ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور گویا بھری کائنات میں آپ اور آپ کا ہمزاد ـــــ میاں مٹھو باقی رہ گئے ہیں۔ اس وقت آپ کو محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی روح طوطے میں منتقل ہو کر آپ کے سامنے آگئی ہے۔ یہیں سے خود کلامی کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ قطعاً غیر شعوری طور پر کہیں سے کچے پھل اور روٹی کے چند ٹکڑے حاصل کرتے ہیں اور طوطے سے گفتگو کا وہ سلسلہ شروع کر دیتے ہیں جو آپ کے آخری دم تک قائم رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں طوطے سے انسان کو ہرگز مفر نہیں اور طوطا ہر شخص کی زندگی میں زود یا بدیر ضرور نمودار ہوتا ہے۔" [طوطا پالنا]

کامیابی حاصل کرنا ایک صحت مند عمل ہے لیکن موجودہ دور میں کامیابی کا ناجائز حصول ایک عصری حقیقت بن چکا ہے۔ انشائیہ نگار اس عصری بدعت کا تماشا کرتا ہے لیکن وہ جراحت پیدا کئے بغیر آپ کی نظامِ فکر ایک اور ڈگر پر ڈال دیتا ہے۔ اس کی مثال مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجیے۔

"کامیابی حاصل کرنے سے میں آپ کو منع نہیں کروں گا مگر یہ ضرور پوچھوں گا کہ کامیابی کس قیمت پر؟ بے شمار لوگ اس لئے ناکام ہو گئے ہیں کہ وہ ہر قیمت پر کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک ایک فرد نے پوری سوسائٹی کو اپنی کامیابی کے داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس طرح دولت کی طاقت نے، اکثریت کی طاقت نے، نظریے کی طاقت نے، سیاست کی طاقت نے، طاقت کی طاقت نے، کئی بار اپنی کامیابی کے جھنڈے معصوم انسانوں کی لاشوں پر گاڑ دیئے...... کامیابی ایک ذاتی سی چیز ہے۔ اس کے معیار بھی ذاتی ہیں۔ مگر کامیابی کسی فرد یا قوم کے مزاج اور کردار کا تعین بھی کرتی ہے۔ انگریزی نے سارش

کے ذریعے سلطان ٹیپو کو شکست دینا چاہی۔ سلطان نے جان دے دی مگر شکست قبول نہ کی۔ سلطان نے جان کی قربانی دے کر آزادی اور حریت کی شمع جلانے میں کامیابی حاصل کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اخبارات میں ہم روزانہ یہ خبریں پڑھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے چوروں کا مال لے کر فرار ہوگیا۔ مگر میر جعفر کی کامیابی کی حیثیت آج اس سے زیادہ نہیں۔"
[کامیابی]

انشائیہ "تمباکو نوشی" میں انشائیہ نگار کا مقصد بظاہر اس قبیح عادت کی ضرر رسانیوں کی طرف بالواسطہ طور پر توجہ کرانا نہیں تاہم مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں عصرِ حاضر میں پنپنے والی انا اور تکبر جیسے جذبات پر اس موضوع کے حوالے سے اظہارِ خیال کی راہ پیدا کی گئی ہے۔

"پائپ نوشی ہماری جدید ثقافت کی غمازی کرتی ہے۔ حقہ اس زمین کی پیداوار ہے۔ اس کو رنگ روپ یہاں کی مٹی اور ہوا سے ملا ہے۔ اس کا نے ہماری سانس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مگر ہمارے ملک میں پائپ نوشی کا آغاز بیرونی ممالک کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقہ پینے والے اور پائپ پینے والوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پائپ پینے والوں کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے کہ حقے کی طرح پائپ کا پیندہ نہیں ہوتا۔ پائپ اگرچہ حقے کے تتبع میں عالم وجود میں آیا مگر زمین پر پاؤں نہ رکھنے کی وجہ سے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ اس کے پینے والے کی گردن میں ایک خاص تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اب وہ ایک دم بڑا آدمی بن گیا ہے۔ میرے ایک دوست "ج" جب ایک ایک بڑے عہدے پر متمکن ہوگئے تو پہلا تبدیلی ان میں یہ ہوا کہ حقے کی جگہ پائپ پینے لگے۔ پائپ بلا شرکت غیرے پیا جاتا ہے۔ پائپ نوشی فرد کی انا کو ابھارتی ہے اور اجتماعی شعور کو فنا کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس حقہ سماج کے اجتماعی شعور کو جلا بخشتا ہے اور فرد کی انا کے اندھے گھوڑے کو سرپٹ دوڑنے سے باز رکھتا ہے۔" [حقہ نوشی]

اسی قسم کی ایک صورت انشائیہ "آئینہ" میں پیش کی گئی ہے جس میں برتری کا نشہ انشائیہ نگار کی توجہ گزشتہ دور کی ایک عظیم ترین عصری تباہی کے سب سے بڑے مجرم کی طرف مبذول کرا دیتا ہے۔

"آئینہ ایک طرف دوستی اور امن کی علامت ہے تو دوسری طرف دشمنی اور فساد کا علمبردار بھی ہے۔ میں بعض اوقات یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ ایک طرف تو ہم اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خوبصورت آئینے تحفے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف جب ہٹلر ایسا شخص آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہے تو برتری کے ایسے نشے میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا کو تہہ و بالا کر کے ہی دم لیتا ہے عجیب تماشہ ہے۔"
[آئینہ]

انشائیہ "جال" میں غیر ملکی امداد سے پیدا ہونے والی ذہنی غلامی کی طرف بالواسطہ اشارے موجود ہیں۔

"دانے اور جال کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ وہ یوں کہ جب کوئی مکار قوم کسی دوسری سیدھی سادی یا مجبور اور بے بس قوم کو اپنے ہتھکنڈوں میں پھانسنا چاہے تو پہلے دوستی کا جال پھیلاتی ہے۔ اور پھر قرض یا رشوت کا دانہ پھینک کر بالآخر ایک ایسا مہلک جال تیار کرتی ہو کہ دوسری قوم اس میں سسک سسک کر، تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتی ہے۔"
["جال"]

انشائیہ "کرسی" میں فنکار نے عصری آویزش اور سماجی کشمکش کا ایک زاویہ کرسیوں کی جنگ میں دیکھا ہے۔ لیکن وہ اس موضوع پر ایک حساس انسان اور حساس ادیب کی نظر ڈالتا ہے اور کرسیوں کی جنگ کے پست مقاصد میں ملوث ہوئے بغیر ارفع تر مقاصد کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔ اس انشائیے میں ادیب کی پرواز افقی نہیں بلکہ عمودی ہے اور یہ اس کے مذہبی رجحان کو اجاگر کرتی ہے۔

"جب سے میں نے ٹیڑھی کرسیوں سے منہ موڑ کر اپنی آبائی کرسی پر بیٹھنا شروع کیا ہے مجھے ہر چیز ایک نئی روشنی میں دکھائی دینے لگی ہے۔ چنانچہ مجھے کئی بار محسوس ہوا کہ میں ایک اونچی کرسی پر بیٹھا ہوں اور میرے سامنے پھیلی ہوئی ساری دنیا ایک بازیچۂ اطفال کی طرح ہے جہاں لوگ چھوٹی چھوٹی کرسیوں کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔ آبائی کرسی پر بیٹھنے کے بعد مجھے چھوٹی چھوٹی کرسیوں کی جنگ بے معنی نظر آئی۔ پھر کبھی کبھی اس آبائی کرسی پر بیٹھے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ساری کائنات ایک عظیم الشان کرسی ہے اور اس کرسی پر کوئی عظیم ہستی بڑے اطمینان سے بیٹھی اس بازیچۂ اطفال کو ایک لطیف مسکراہٹ سے دیکھتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے خود کبھی اس ہستی کو نہیں دیکھا لیکن اس کے وجود کا احساس مجھے بار بار ہوا ہے۔"
[کرسی]

مندرجہ بالا امثال سے اگرچہ انشائیہ کی روح کو پوری طرح پیش نہیں کیا جا سکا وجہ یہ کہ انشائیہ کا اقتباس پورا انشائیہ نہیں ہوتا ہے تاہم ان سے حقیقت

بشر نواز

کھوئے گیتوں کا نوحہ
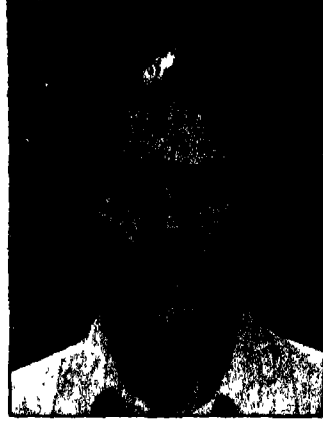
صحرا میں آوارہ ہواؤں جیسے ہمارے گیت
آپ ہی اپنی گونج بنے ہیں
گھومیں، بھٹکیں بن کے مہاجر آج کے سارے گیت

کہاں گئے وہ گیت جو دکھ میں سکھ میں ساتھ رہے
جیسے فلک پر رنگ دھنک کے یوں ہونٹوں پہ سجے
کونپل بن کر دل کی دھرتی سے جو پھوٹ پڑے
کہاں گئے وہ گیت؟
جن کے ان دیکھے بندھن میں
پیڑھی کا پیڑھی بندھتی آئیں ہنس مکھ دوشیزائیں
چوڑی چکلی چھاتی والے ویر جنھیں اپنائیں
کانپتی پلکوں پر تارا ہوں جو آنچل میں موتی
دھیرے دھیرے ڈوبنے والے ارمانوں کی سسکی
کہاں گئے وہ گیت؟
ندیا جیسے بہتے وقت پہ جو اک پل بن جائیں
یگ یگ کی تصویریں اپنے درپن میں دکھلائیں
کہاں گئے وہ گیت؟
بہتے جھرنوں، مست ہواؤ
اُن گیتوں کا پتہ بتاؤ
گندھا ہوا ہے جن میں صدیوں صدیوں کا سنگیت
کہاں گئے وہ گیت؟

کیا کیا لوگ خوشی سے دبنے بکنے پر تیار ہوئے
ایک ہمیں دیوانے نکلے ہم ہی یہاں پر خوار ہوئے

پیار کے بندھن، خون کے رشتے، ٹوٹ گئے خوابوں کی طرح
جاگتی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کیا کیا کاروبار ہوئے

آپ وہ سیانے رستے کے ہر پتھر کو بُت مان لیا
ہم وہ پاگل اپنی راہ میں آپ ہی خود دیوار بنے

اپنی اپنی جگہ پر دونوں بے بس بھی، مسرور بھی ہیں
تم تحریرِ سنگ ہوئے ہم بھولا ہوا اقرار ہوئے

آنے والی صبح گنے گی رات کے اندھے طوفاں میں
کتنے ساحل ہی پر ڈوبے، کتنے بھنور کے پار ہوئے

ساحلوں سے کہو، میں نہیں آؤں گا

مجتبیٰ حسین

وہ ۱۹۷۵ء کے نئے سال کی رات تھی۔ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے آگے ہم چار دوست جمع تھے۔ محمود سعیدی، امیر آغا قزلباش، کمار پاشی اور میں۔ نیا سال آیا تو امیر آغا نے کہا چلو آج ایک عہد کرتے ہیں۔ جب ۲۰۰۰ء ختم اور اکیسویں صدی شروع ہوگی تو ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ہم چاروں دوست پھر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جمع ہوں گے۔ ہم میں سے جو جہاں بھی ہوگا اسے اس رات یہاں آنا پڑے گا۔

میں نے کہا "امیر آغا! تمہارا اور محمود کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ پچیس برس بعد تم دونوں تو خود جامع مسجد کے اندر سے ہاتھوں میں تسبیح لیے باہر نکل کر سیڑھیوں پر آجاؤ گے۔ کمار پاشی برلا مندر سے چلا آئے گا۔ میں اپنے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہوسکتا ہے اس وقت تک میں حیدرآباد واپس چلا جاؤں یا پھر اس دنیا میں ہی نہ رہوں۔"

محمود نے کہا "یہ ہو نہیں سکتا۔ یہ دنیا اگر تمہیں جینے نہیں دے گی تو ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔ تم حیدرآباد واپس چلے بھی جاؤ تو ہم تمہیں اسٹریچر پر ڈال کر یہاں لے آئیں گے۔ اور تمہیں بتائیں گے کہ دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خراب میں۔"

میں نے کہا "یارو! مجھے اس طرح کے عہد سے دور رکھو۔ سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں۔ میں صرف اس خیال کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا کہ ہمیں پچیس برس بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ملنا ہے۔ کیوں ملنا ہے؟ آخر ایسا کیا ضروری کام ہے؟ جو بات تم پچیس برس بعد کرنا چاہتے ہو ابھی کر لو۔ آج کا کام کل پر ٹالنا چاہتے ہو تو پرسوں پر ٹالو۔ اس صدی کا کام دوسری صدی پر کیوں ٹالتے ہو؟"

کمار پاشی نے کہا "اس رات ہم تمہیں اپنا غیر مطبوعہ کلام سنائیں گے۔"

میں نے کہا "اس لیے کہ ۲۰۰۰ء میں اردو کا کوئی رسالہ ہی نہیں ہوگا جو تمہارے غیر مطبوعہ کلام کو زیور طبع سے آراستہ کر سکے۔ یہ تمہاری مجبوری ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ یوں بھی اب کون سا غیر مطبوعہ کلام سناتے ہو۔ تمہارا غیر مطبوعہ کلام بھی مطبوعہ سا لگتا ہے۔"

مگر میرے اس معقول استدلال کے باوجود ان تینوں نے مجھے زبردستی اس نامعقول عہد کا نہ صرف ایک فریق بنایا بلکہ جب میں وہاں سے جانے لگا اور کچھ دور چلا بھی گیا تو امیر آغا نے مجھے دوبارہ بلا کر یاد دلایا "یاد رکھنا! ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ٹھیک ۱۲ بجے ہمیں ملنا ہے۔ ہم سے دو چار منٹ کی دیر ہو بھی جائے تو انتظار کرنا اور ہاں یہ سامنے والی سیڑھیوں پر ملنا ہے۔ کہیں تم پچھلی سیڑھیوں پر نہ چلے جانا۔"

اس رات کو گزرے ہوئے گیارہ برس بیت گئے۔ امیر آغا اور محمود ابھی تک مسجد سے اور کمار پاشی مندر سے کوسوں دور ہیں اور میں ہنوز دہلی میں ہوں۔ تاہم ہم سب کو اپنا عہد یاد ہے بلکہ اس عہد کا ایک نقصان یہ ہوا کہ اس کے بعد ہم لوگوں نے آپس میں ملنا جلنا کم کر دیا ہے کیونکہ ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ہمیں ملنا جو ہے۔ ایک بار محمود نے مجھے فون کر کے کہا "یار! تم سے ایک ضروری کام ہے۔ بتاؤ کب ملو گے؟" اور میں نے کہا "۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ملنا جامع مسجد کے سامنے ٹھیک ۱۲ بجے۔ ۲ چار منٹ کی دیر ہو جائے تو انتظار کر لینا۔" اور محمود نے اپنا یہ ضروری کام اس رات تک کے لیے یوں محفوظ رکھ چھوڑا ہے جیسے لوگ بینک لاکرس میں

اپنے قیمتی زیورات کو محفوظ رکھتے ہیں۔

مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے زندگی کا واحد مقصد اب یہ رہ گیا ہے کہ سانسوں کے تسلسل کو خواہ مخواہ اکیسویں صدی تک لے جاؤں۔ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ لطیفہ یاد آتا ہے کہ ایک نوجوان ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے چائے میں چینی تو نہیں ڈالی تھی البتہ ہر گھونٹ کے بعد پیالی میں چمچہ چلاتا جاتا تھا۔ جب کئی بار چمچہ چلا چکا تو ایک بزرگ نے کہا "تم بھی عجیب آدمی ہو۔ چائے میں چینی تو نہیں ڈالی مگر چمچہ ہے کہ چلاتے جا رہے ہو" اس پر نوجوان نے کہا "حضور! میں ایک تجربہ کر رہا ہوں اور اپنے تجربے میں کامیاب بھی ہو چکا ہوں"۔ بزرگ نے پوچھا "اس بیہودہ تجربہ کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟"

نوجوان نے کہا "میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر چائے میں چینی نہ ہو اور آپ اس میں ہزار بار بھی چمچہ چلائیں تو چائے میٹھی نہیں ہو گی۔"

ہم لوگ بھی اب اس طرح زندگی گذار رہے ہیں جیسے بنا چینی کی چائے میں چمچہ چلا رہے ہوں۔ چمچہ ہے کہ چلتا چلا جا رہا ہے اور چائے ہے کہ میٹھی ہونے کا نام نہیں لیتی۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے ہم چار دن چمچے ہیں اور زندگی کے پھیکے محلول میں بلا وجہ چلے جا رہے ہیں۔ میں پرانی دہلی بہت کم جاتا ہوں۔ دو برس پہلے کی بات ہے ایک رات گیارہ بجے جامع مسجد کے سامنے اچانک امیر آغا کچھ اس عالم میں ملے جس میں زماں صدیوں سے پرے اور مکاں کائنات کی بندشوں سے ماورا ہو جاتا ہے۔ میں لمحہ لمحہ جوڑ کر زندگی گذارنے والا آدمی ہوں۔ میں امیر آغا سے بچنے کے لیے ایک گلی میں چھپنے لگا تو امیر نے پکار کر کہا "کیوں میاں! اتنی جلدی یہاں آ گئے۔ ہمیں تو سولہ (۱۶) برس بعد ملنا ہے۔ ابھی سے یہاں ڈٹے ہوئے ہو۔"

میں نے زوردار قہقہہ لگا کر امیر آغا کو ان کے حسب حال ایک لطیفہ سنایا کہ دو دوست تھے۔ ایک دوست کو اچانک کسی کام سے تین سال کے لیے ملک سے باہر جانا پڑ گیا۔ لہٰذا دوسرے دوست نے اسے وداع کرنے کے لیے ایک میخانہ میں پارٹی دی۔ رخصت ہونے کا وقت آیا تو ملک میں رہنے والے دوست نے باہر جانے والے دوست سے کہا "یار! ایک وعدہ کرو تین سال بعد فلاں تاریخ کو جب تم ہندستان واپس آؤ تو اسی دن شام کو پھر اسی میخانہ میں ملیں گے۔ ٹھیک تین سال بعد۔ یاد رکھنا۔ بھولنا مت"۔ دونوں رخصت ہو گئے اور تین سال بعد پہلا دوست باہر سے واپس آیا تو اسے وعدہ یاد تھا۔ وہ بھاگم بھاگ میخانہ گیا تو دوسرے دوست کو میخانہ میں موجود پایا۔ دفور جذبات سے دونوں بغل گیر ہو گئے۔ باہر سے آنے والے دوست نے کہا "یار! میں تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تمہیں تین سال بعد آج ہی کے دن اسی وقت اس میخانہ میں مجھ سے ملنے کا وعدہ یاد رہے گا۔ تم نے نہ صرف وعدہ کو یاد رکھا بلکہ میرے استقبال کے لیے یہاں موجود ہو۔"

اس پردیسی دوست نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا "یار کیسا وعدہ؟ میں تمہارے جانے کے بعد اس میخانہ سے کہیں گیا ہی نہیں۔ یہیں بیٹھا تمہاری واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

صاحبو! یہ تمہید جو ذرا لمبی ہو گئی ہے اس لیے باندھی گئی ہے کہ ہمیں تمہید کو کھولنا نہیں آتا۔ یوں بھی ان دنوں ہر کس و ناکس کو اچانک یہ احساس ہو گیا ہے کہ کروڑوں برس پرانی دنیا چند برسوں میں بیسویں صدی کی کینچلی کو اتار پھینکنے والی ہے۔

اردو کے چار بے فکرے اور لاپرواہ شاعروں اور ادیبوں نے اگرچہ پچیس برس پہلے اکیسویں صدی کے قدموں کی چاپ سن لی تھی حالانکہ ان کی زبان کی بساط تین چار صدیوں سے زیادہ کی نہیں ہے بلکہ انھیں تو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ اگر خدا نخواستہ اکیسویں صدی آ جائے تو یہ اپنی زبان کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے یا اپنی زبان کو بیسویں صدی میں ہی چھوڑ کر اکیسویں صدی میں یوں جائیں گے جیسے سکندر اس دنیا سے گیا تھا۔ اب جب کہ ہر شخص کو پتہ لگ گیا ہے کہ اکیسویں صدی آنے والی ہے تو ہر شخص بیسویں صدی سے چھٹکارا پانے کی سوچ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جب انیسویں صدی جا رہی تھی اور بیسویں صدی آ رہی تھی تو اس وقت لوگوں نے کیا کیا تھا۔ میں تو اس وقت نہیں تھا۔ میرے والد مرحوم ضرور زندہ تھے ان کا سن پیدائش اور علیگڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج کا سن پیدائش دونوں ایک ہی تھے وہ بتاتے تھے کہ انیسویں صدی کے اختتام پر ان کی جیب میں صرف پانچ روپے پڑے ہوئے تھے ان دنوں پانچ روپے بہت ہوتے تھے۔ یہ ایک اتفاق

ہے کہ اس تحریر کو لکھتے وقت جب کہ ایک صدی کے پورا ہونے میں صرف چودہ برس باقی رہ گئے ہیں، میں نے اپنی جیب ٹٹولی تو اس میں بھی پانچ روپے ہی پائے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ پچھلے چھیاسی برسوں میں روپے کی قدر و قیمت تو گری ہی ہے لیکن آدمی کی قدر و قیمت تو اور بھی گری ہے۔ اس لحاظ سے میرے والد مرحوم پچھلی صدی کے خاتمہ پر مال و دولت اور کردار کے اعتبار سے جتنے تونگر تھے آج میں اتنا ہی کنگال ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے خاندان کا جملہ اثاثہ جو پانچ ردیوں پر مشتمل ہے، اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ میرے والد مرحوم کی بڑائی تھی کہ انیسویں سے چل کر بیسویں صدی میں آنے لگے تو اپنے ساتھ میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، مصحفیؔ اور ڈپٹی نذیر احمد نہ جانے کن کن کو اپنے ساتھ لیتے آئے۔ اب میں وقت کی چھلنی میں بیسویں صدی کو چھاننے بیٹھا ہوں تو وقت کی چھلنی کے چھید اب کچھ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد، مصحفیؔ اور ذوقؔ تو کجا، میرؔ اور غالبؔ تک اس چھلنی کے چھیدوں سے پھسلنے لگے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ بیسویں صدی کے خاتمہ پر وقت کی چھلنی جب کچھ دیر کے لیے رکے گی تو میرؔ اور غالبؔ تو چھلنی کے چھیدوں سے نیچے پھسل آئیں گے اور چھلنی میں صرف اردو اکیڈمیاں باقی رہ جائیں گی۔

صدیوں کے حساب کتاب میں ہمیشہ جھمیلا ہوتا ہے۔ میرے ایک بزرگ رشتہ دار ہیں۔ خزاں رسیدہ پتے کے سمان۔ پھر بھی بیسویں صدی کے پیڑ سے چپٹے ہوئے ہیں انھیں بھی اکیسویں صدی میں جانے کی جلدی ہے۔ اسّی کے پیٹے میں ہیں اور پچھلے ۸۰ برسوں سے انھیں قیامت کا بے چینی سے انتظار ہے۔ پچیس برس پہلے تک فرماتے تھے کہ قیامت بیسویں صدی میں ہی آئیگی مگر اب انھوں نے قیامت کو مہلت دے دی ہے۔ کہتے ہیں کہ قیامت بیسویں صدی میں نہیں آئی تو کیا ہوا۔ اکیسویں صدی میں تو ضرور آئے گی۔ ان کے زندہ رہنے کا واحد مقصد کم از کم مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ قیامت کو بہ نفس نفیس اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دور اندیش اتنے ہیں کہ ابھی سے اپنے علاوہ ان اشیا کی فہرست تیار کر چکے ہیں جنھیں وہ اپنے ساتھ اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتے ہیں اور قناعت پسند اتنے ہیں کہ ان کی فہرست چار پانچ اشیاء سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہے۔ ایک توان کی لاٹھی ہے جس میں آواز بھی ہے اور جس کے سہارے کے بغیر وہ اکیسویں صدی تو بہت دور کی بات ہے اپنے روم سے باتھ روم تک نہیں جا سکتے۔ دوسری شے ان کا ٹونٹی کا لوٹا ہے جس پر ان کا نام معہ ولدیت اور مفصل پتہ کے درج ہے۔ ایک بے معنی سا شعر بھی اس پر کندہ کرا رکھا ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور لوٹے کی باثباتی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے دو جوڑے کپڑوں، ایک بوسیدہ چپل کے علاوہ میر امن کی باغ و بہار کا ایک نسخہ بھی اس فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔ میں نے ان کی فہرست کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کہا "حضور! آپ اکیسویں صدی میں وہ چیزیں لے جا رہے ہیں جنھیں بہت سے لوگ انیسویں صدی میں ہی چھوڑ آئے تھے"۔

بولے "میاں! میں تو طلسم ہوشربا اور داستانِ امیر حمزہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر اکیسویں صدی کے ناتواں کندھوں پر ترس کھا کر اس بھاری بوجھ کو اتار دیا ہے۔ اور ہاں اگر میں انیسویں صدی کی کچھ چیزیں، اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتا ہوں تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے ملک میں آدھے لوگ ایسے ہیں جنھیں ابھی تک حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کی بات تو بہت دور کی ہے، ان کے مصلوب ہونے تک کا علم نہیں ہے۔ مہاتما بدھ ان کے لیے اجنبی ہیں۔ ان کی زندگی دیکھو تو لگتا ہے بابل و نینوا کی تہذیب ابھی ان کے لیے آنے والی کئی صدیوں کی بات ہے۔ تمہیں اعتراض ہے کہ میں اپنا ٹونٹی کا لوٹا لے کر اکیسویں صدی میں کہاں جا رہا ہوں۔ بھیا! میرا لوٹا خالص مراد آبادی لوٹا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اور حضرت جگرؔ مراد آبادی کی تاریخ پیدائش دونوں کم و بیش ایک ہی ہیں۔ اس لیے جگرؔ کے شعروں میں جتنا مطلب ہوتا ہے اتنا ہی پانی اس لوٹے میں سماتا ہے — برخوردار! اکیسویں صدی میں جانے سے کسی کو روکنا ہی ہے تو ان افراد کو روکو جو بظاہر زندہ تو اس صدی میں نظر آتے ہیں لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر حضرت عیسیٰؑ سے کئی برس قبل کی صدیوں میں سانس لے رہے ہیں۔ پھر بھی انھیں اکیسویں صدی میں جانے کی جلدی ہے"۔

میں نے ان بزرگ سے مزید کوئی بازپرس نہیں کی۔ اب آپ سے کیا چھپانا میں نے چوری چھپے اپنی بیوی کی مرتب کردہ

وہ فہرست دیکھی ہے جس میں اس نے اپنی پسند کی ان اشیاء کو درج کیا ہے جنھیں وہ اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتی ہے۔ اس میں اس نے جہیز کے اس سامان کو بھی شامل رکھا ہے جو وہ تینتیس برس پہلے اپنے ساتھ میرے گھر لے آئی تھی۔ دیگر اشیاء میں چار عدد بچوں کے علاوہ دو عدد نواسے بھی شامل ہیں۔ اس فہرست میں کوڑا کرکٹ تو بہت ہے لیکن دور دور تک کہیں میرا نام شامل نہیں ہے۔ مجھے اس سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے کیونکہ اگر میں اکیسویں صدی کے اپنے سامان کی فہرست تیار کروں گا تو اس میں اسے شامل نہیں رکھوں گا۔

صاحبو! ان ساری باتوں کے پیشِ نظر میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جس سڑک پر میرا مکان واقع ہے اس پر برسات کے موسم میں تیس برس پہلے جن گڈھوں میں پانی ٹھہرتا تھا اب بھی ٹھہرتا ہے بلکہ برسات کے موسم کی تخصیص کے بغیر ٹھہرتا ہے۔ اس کے دو مین ہولس کے ڈھکن پتہ نہیں کب سے کھلے ہوئے ہیں۔ اس سڑک پہ آدمی چلتا کم ہے اور ٹھوکریں زیادہ کھاتا ہے۔ کیا یہ سڑک مجھے اکیسویں صدی تک لے جائے گی؟۔ پھر اس سڑک کو عبور کرنے کے بعد جس بس اسٹاپ پر میں بس کا انتظار کرتا ہوں وہاں ہاتھ دکھانے کے باوجود کئی بسیں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں اور اگر اتفاقاً کوئی بس میری خاطر نہیں بلکہ کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے رک بھی جاتی ہے تو میں اس کے ڈنڈے سے لٹک کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہوں۔ کیا میں اکیسویں صدی میں ڈنڈے سے لٹک کر ہی جاؤں گا؟ جس آدمی کی زندگی کا بڑا حصہ راشن کی دکان کے کیو سے نکل کر دودھ کے ڈپو کے کیو میں لگنے اور وہاں سے کسی اور کیو میں لگنے اور پھر وہاں سے نکل کر مٹی کے تیل کے کیو میں لگنے میں گذر جاتا ہو اُسے اکیسویں صدی میں جا کر کیا کرنا ہے؟

پھر جبکہ مجھے معلوم ہے کہ خود اکیسویں صدی میں جانے کے لیے لوگوں نے ابھی سے کیو لگانا شروع کر دیا ہے اسی لیے میں اپنا حساب کتاب اسی صدی میں چکتا کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنی اولاد کو وہ پانچ روپے سونپ دینا چاہتا ہوں جو پچھلی صدی کے خاتمہ کے وقت میرے والد مرحوم کے پاس تھے اور اب اس صدی کے خاتمہ پر میرے پاس موجود ہیں۔ مجھ سے اب ان پانچ روپوں کی حفاظت نہ ہو سکے گی۔ ان روپوں کی حفاظت کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے۔ کتنے بجٹوں سے ان کو بچا کر یہاں تک لے آیا ہوں۔ دنیا کی بڑی طاقتوں کی نظر ان پانچ روپوں پر ہے۔ دنیا بھر کے منافع خور تاجر، رشوت خور، بدعنوان افسر اور اسمگلر میرے ان پانچ روپوں پر گھات لگائے بیٹھے ہیں، اب مجھ میں ان پانچ روپوں کو بچانے کی سکت نہیں ہے۔ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں والا معاملہ ہے۔

پھر مسئلہ یہ بھی ہے کہ مجھے بیسویں صدی سے محبت ہو گئی ہے۔ اس صدی میں سانس لینے کے لیے میں نے کتنی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کو جھیلا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی تو میرے سانس لیتے لیتے بے سانس ہو گئے تھے۔ میرے ہوش سنبھالتے ہی دنیا نے ایٹم بم بنا لیا تھا اور میرے ہوش اڑتے ہی ملک تقسیم ہو گیا تھا۔ مجھے اس صدی میں جینے کی پریکٹس ہو گئی ہے۔ میں اکیسویں صدی میں جا کر کیا کروں گا۔ اسی لیے آج میں آپ سب حضرات کی موجودگی میں اپنے تینوں دوستوں مخمور سعیدی، امیر آغا اور کمار پاشی کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج سے میں ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ملنے کے معاہدہ کا فریق نہیں ہوں۔ دو چار منٹ کی دیر سویر ہو جائے تو انتظار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دو چار برس بھی انتظار کرو تو میں نہیں آؤں گا۔ تم تینوں ملنا چاہتے ہو تو ضرور ملو مگر مجھے تلاش نہ کرو۔ اپنی جھولیوں کو ٹٹولو اور دیکھو کہ بیسویں صدی نے تمہیں کیا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی وہیں کہیں تمہیں پڑا ہوا مل جاؤں۔ میں اس مضمون کو کمار پاشی کی ہی ایک نظم کے بند پر ختم کرتا ہوں۔

ساحلوں سے کہو میں نہیں آؤں گا
اب کسی شہر کی رات میرے لیے جگمگائے نہیں
دھوپ بوڑھے مکانوں کی اونچی چھتوں پر
میرا نام لے کر بلائے نہیں
میں نہیں آؤں گا، میں نہیں آؤں گا۔

زبیر رضوی

امن گیت

امن کا نغمہ جادوانہ
اے زمینِ وطن گنگنا نا

امن باغوں میں پھولوں کا کھلنا
امن ساجن سے ملنے کا سپنا
امن ہاتھوں میں مہندی کا رچنا
امن گھونگھٹ میں گوری کا ہنسنا

امن بچوں کا اسکول جانا
امن ماؤں کا لوری سُنانا
امن گڑیاں، کھلونے، تماشے
دولہا دلہن براتوں کے باجے

امن اماں کے ہاتھوں کی روٹی
امن بہنا کے ہاتھوں کی چوڑی
امن آنگن میں رشتوں کی خوشبو
امن ملنے بچھڑنے کے آنسو

امن مسجد سے آتی اذانیں
امن مندر میں بھجنوں کی تانیں
امن تہواروں میلوں کے موسم
امن گنگا کی لہروں کا سرگم

امن رندوں کی رنگین راتیں
امن زاہد کے روزے نمازیں
امن غالب کی غزلوں کا دیواں
امن فطرت کا دستِ مہرباں

امن شاخِ نہالِ تمنا
امن اظہارِ حرفِ تمنا
امن آوازِ پائے تمنا
امن تکمیلِ راہِ تمنا

امن کا نغمہ جادوانہ
اے زمینِ وطن گنگنا نا

سیانے چوہے

شفیقہ فرحت ● ۲۰۔۱۷۶ ای، مرزا دیار بھوپال ۲۰

مثل مشہور ہے کہ قاضی جی کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں" گو آج قاضی جی کا دائرۂ عمل و اختیار صرف نکاح تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اور نکاح چاہے وہ فلم نکاح ہو یا مصری چھوہارے والا اس میں عقل کا دخل ہے کہاں۔! لیکن چوہوں کے سہارے اُن کے سیانے پن کا بھرم آج بھی قائم ہے۔!

اور قاضی جی ہی کیوں اللہ اس کے دانتوں کو سلامت رکھے کہ اس کے دم اور خم سے بڑے بڑوں اور اچھے بروں سب کی لیاقت شرافت حماقت پر پردہ پڑا ہے۔!

کمال دانتوں کا ہے اور خود اس کے سیانے پن کا۔ ورنہ پردے کو فاش ہوتے دیر کتنی لگتی ہے۔

حاکموں کی گدی اور حکومتوں کی زندگی سب اس کے لب و دنداں کا صدقہ ہے۔!

تازہ ترین واردات۔ ویسے تو کولڈ اسٹوریج اور ڈیپ فریزر نے وقت اور زمانے کو اپنے اندر قید کر کے تازے باسی کے اختلاف ہی کو ختم کر دیا۔ لہٰذا برسوں پرانا حادثہ بھی "تازہ ترین" کے دائرہ میں لایا جا سکتا ہے۔ اور ابھی ابھی کی بات بھی پرانی رنگ اتری۔ زنگ بھری!۔

یہ تو جناب اپنی سہولت اور سمجھ کا کھیل اور پھیر ہے۔! تھی تو واردات تازہ مگر جناب مزید چند منٹ باسی ہو گئی، یہ کہ اتنے وسیع و عریض ملک کے ایک بہت بڑے صوبے کے عظیم اور فہیم تعلیم شعبے میں ایک موٹی تازی رقم یعنی بعض چند کروڑ کی کتابوں کی ہیرا پھیری ہو گئی۔ (مقام شکر کہ چوری نہیں۔!) اور اس ہیرا پھیری کا کے نتیجے میں پھیرا پھیری شروع ہو گئی۔ بحث مباحثہ، سوال جواب، الزام دشنام کی وہ بمباری ہوئی کہ حکومت کی کشتی ڈانواڈول اور افسر حکام گول مول ہوتے نظر آئے۔ (نظر بندی جنگل بندی کا ایک ادنیٰ نمونہ۔!)

پھر جیسا جس کا مقدر تھا کسی نے عقل دوڑائی کسی نے نظر۔ عقل تو خیر کیا دوڑتی نظر جا کر لمبی دم، چمکیلی آنکھوں اور نوکیلے دانتوں والے اس چھوٹے سے جاندار سے جا ٹکرائی جو شیر کو جال سے آزاد کر کے بھی اپنے چنگل سے نکلنے نہ دے۔! وزیر عالی سے لے کر افسر بالا تک خوش کہ جان بچی اور لاکھوں پائے۔ (مزید۔!) اور ہم بھی خوش کہ کسی نے تو کتابوں کو ہاتھ لگایا۔ ڈگری لینے دینے والے نہ سہی چوہے ہی سہی۔! ہمیں تو ایسے ہی سیانے عالم فاضل چوہوں کی تلاش ہے کہ ہاتھ لگ جائیں تو زورا زبردستی، شرافت خوشامد کسی طرح انہیں لائیں اور آنریری ڈگریاں اور بامعاوضہ پروفیسریاں ان کی خدمت میں پیش کریں۔

مگر جناب وہ تو سیانے چوہے ہیں۔ دروازے کے سیدھے راستے آ جا کر اپنی جان کا رسک کیوں لیں۔ وہ تو نظر نہ آنے والی زمین دوز سرنگیں کھود کے جہاں چاہیں پہنچ کے سُرخ رو ہو جائیں۔ یہی تو چار پیروں کی اہمیت اور فائدے ہیں۔!

خیر تو اس واقعہ کے بعد ہمیں اس ننھی سی جان سے ایک تعلق خاص پیدا ہو گیا۔ دوستانہ۔ رقیبانہ۔! (اس میں کچھ اپنے جثے جسامت کا بھی دخل ہے۔!)

بچپن میں سُنی گئی تمام کہانیاں یاد آ گئیں۔

میں گیا تھا آٹری باٹری۔

کہانی آپ نے بھی سُنی ہو گی کہ عقل نہ سہی بچپن ہر ایک کو ملا ہے۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ ایک دُم کے ٹکڑے کے

ہمارے چوہا کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔
اپنے بل سے راج دربار تک۔!
دُم کا یہ دَم بس جیسوں کا حصّہ ہے۔!
اور پھر چوہوں کے اس ہجوم بیکراں کو بھی آپ نہ بھولے ہوں گے جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے دور دیس سے PIPER MAN بلایا گیا تھا بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے آنگن میں لگے پودے کو سمجھنے کے لیے فارن ایکسپرٹس کی ٹیم بلائی جاتی ہے۔!
بچپن کی ان کہانیوں سے لوک اور لوگ کتھاؤں تک پنچ تنتر سے گل بکاؤلی تک، اور اردو ہندی عربی فارسی سے انگریزی تک۔ ہر داستان ہر قصّے میں چوہے کی بھاگ دوڑ عقل سمجھ سے راگ سنا رہی ہے۔ نئے گل کھلا رہی ہے۔!
دیوتا گنیش جن سے ہر کام کا شری گنیش ہوتا ہے۔ اور پہلے جن کا بھوگ لگتا ہے۔ انہوں نے اپنی سواری کے لیے منتخب کیا تو کسے۔؟ اسی چھوٹے سے جسم اور لمبی دُم والے چوہے کو۔ کہ اس کو ترک (کٹ حجت) کو ترک سکھانے اور قابو میں لانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ پھر اس کے بعد تو وہ ہر بھوگ کی ایسی خبر رکھتا اور خبر لیتا ہے اور ان کے بھوگ میں ایسا حصّہ بٹاتا ہے جیسا صاحب کا چپراسی صاحب کے دربار کا۔!

اور آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ کھودا پہاڑ نکلی چوہیا۔ یعنی ایک چوہیا تک اتنی اہم ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے پورا پہاڑ کا پہاڑ کھودنا پڑتا ہے۔ کس قدر قابل کریم ہے وہ ہستی جس کے لیے اتنا خرچ اور وقت صرف کیا جاتا ہے۔
غرض یہ کہ آپ کا کتب خانہ ہو یا دیوان خانہ۔ باورچی خانہ ہو یا معودی خانہ۔ خانہ آباد ہو یا خانہ برباد ان دیکھی ان جانی راہوں سے یہ موجود۔
ڈرانے سے یہ ڈرتے نہیں۔ بھگانے سے بھاگتے نہیں۔ پنجرے میں پھنستے نہیں۔ زہر سے مرتے نہیں۔ بس چھوٹی چھوٹی شرمیلی آنکھوں سے آپ کو دیکھتے رہیں گے۔ گویا آپ کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ اور جب سے ہماری سرپرستی ہمارے سروں سے اٹھی ہیں تب سے ان کی آنکھوں میں بغاوت اور انا کے شعلے اور تیزی سے لپک رہے ہیں۔
جتنے یہ ڈھیٹ ہوتے ہیں اتنے ہی ڈرپوک۔ ذرا سی آہٹ پہ اپنے بلوں میں دبک جائیں اور دوسرے لمحے پھر موجود۔
سیانی بلی کے خلاف بڑی بڑی تقریریں یہ کریں اور گھنٹی آپ کے ہاتھ میں تھما دیں گے۔!!
مگر یہ ہوتے ہر جگہ ہیں۔!

بقیہ صفحہ ۱۱۷ ادب عصری آگہی اور انشائیہ

واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انشائیہ نگار اپنے عہد کے اعمال و افعال، سیاسی اور سماجی کروٹوں، فکر و نظر کی لہروں اور تہذیبی و معاشرتی کراوتوں پر ایک حساس اور تجربہ کار ادیب کی نظر ڈالتا ہے لیکن وہ محتسب کا کردار ادا کرنے کے بجائے اس مخلص دوست کا کردار ادا کرتا ہے جو معاشرتی معائب اور عصری ناہمواریوں کو آپ کے سامنے خوش فکری اور اعتدال مزاجی سے پیش کر سکتا ہے۔ انشائیہ ہر چند ایک ڈھیلا ڈھالی صنفِ اظہار ہے اور اس میں ادیب کا اہوار خیال کسی ایک نکتے کو مکمل طور پر دائرہ نور میں لانے کے بجائے متعدد نکات کو مس کرتا اور متعدد عصری حقیقتوں کو نئے نئے زاویوں سے روشنی عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ تاہم اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ یہ سارا عمل کچھ اس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار زمانے کے مواج سمندر میں گہرا غوطہ لگانے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے۔ اور جب زمانہ اس پر اپنے اسرار چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی طرح کھولنے لگتا ہے تو انشائیہ نگار انہیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے انشائیہ کی تخلیقی صورت دے کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ لکھنا ایک کریمانہ عمل ہے —— اور معزز ادبائے کرام!
میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اس کریمانہ عمل میں آپ بھی آج ہی شرکت کیجئے۔

نصیر پرواز

احساس نارسا ہوں سخن آشنا کرو
دل ڈوبنے لگا ہے غزل ابتدا کرو
لکھنا صدائے شب پہ مرا کرب لامحیط
جب بھی طواف کوچۂ حرف و نوا کرو
موسم تو خیر لہجۂ گل میں کرے گا بات
کچھ اعتبار جنبشِ دست صبا کرو
ہر آنکھ اپنی روح کی گہرائیوں میں ہے
اس شہر اضطراب میں کس کو صدا کرو
راہیں قدم کے ساتھ مسافر سفر کے ساتھ
چلنے کا فیصلہ ہے تو چلتے رہا کرو
کچھ لوگ اشک نبھاتے ہیں زندگی
بے چارگی پہ یوں نہ کسی کی ہنسا کرو
خوشبو بھی سانس لیتی ہے بین السطور میں
تحریر آنسوؤں کی کبھی چھو لیا کرو
اب میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا
اب تم ہی مجھ سے کوئی کہانی کہا کرو
پرواز ناشنیدہ ستم آفریدہ ہوں
اک فاصلہ سا مجھ سے ہمیشہ رکھا کرو

ایچ ۲ / بی نمبر ۱۰۹۲ - گووند پورہ، بھوپال۔

کرشن موہن

خرد کا ہمنوا ہی رہ گیا ہوں
جنوں ناآشنا ہی رہ گیا ہوں
گریزاں ہی رہی مجھ سے حقیقت
اسیرِ ماسوا ہی رہ گیا ہوں
کہاں پہنچے ہیں یارانِ طریقت
مگر میں خستہ پا ہی رہ گیا ہوں
کسی نے مجھ کو پہچانا نہیں ہے
کتابوں میں لکھا ہی رہ گیا ہوں
میں اپنے تن کے اندر جھانکتا کیا
کہ درپن پر اٹا ہی رہ گیا ہوں
بڑا تھا شور میرا، اپنے گھر میں
سبھا میں ان سُنا ہی رہ گیا ہوں
مرے ساتھی سبھی کام آ گئے ہیں
مگر میں سوچتا ہی رہ گیا ہوں
خدا جانے مرا انجام کیا ہو
میں اک زخمی سپاہی رہ گیا ہوں
مرا ظاہر ہے سالم کرشن موہن
بباطن تو بٹا ہی رہ گیا ہوں

۱۵۸ - پشپانجلی، آئی پی ایکسٹینشن II دہلی ۹۲

حیات وارثی

فصیلِ شکر میں ہیں، صبر کے حصار میں ہیں
جہاں گذر نہیں غم کا ہم اس دیار میں ہیں

وجود ہی سے عدم کو وجود ملتا ہے
ہیں منتظر بھی ہمیں خود ہی انتظار میں ہیں

ہمیں اُجال دے پھر دیکھ اپنے جلوؤں کو
ہم آئینہ ہیں مگر پردۂ غبار میں ہیں

ہے اختیار ہمیں کائنات پر حاصل
سوال یہ ہے کہ ہم کس کے اختیار میں ہیں

بکھر گیا ہے کمال و ہنر کا شیرازہ
دل و دماغ معیشت کے انتشار میں ہیں

حیات کی کوئی تشریح کر نہیں سکتا
لطافتوں کے جہاں کُن کے اختصار میں ہیں

باغ انور، لکھنؤ — ۳

جن کی واپسی

دلیپ سنگھ
۵۹/۳، راجندر نگر، نئی دہلی - ۶۰

ایک کباڑی جو میرے ہاں ردّی خریدنے کے لیے آیا تھا، غلطی سے میرے آنگن میں ایک ٹوٹا ہوا چراغ بھول گیا۔ میں نے اسے باہر پھینکنے کی غرض سے جو ہاتھ لگایا تو اس میں سے دھوئیں کا ایک بادل امڈ آیا جس نے آہستہ آہستہ ایک جن کی صورت اختیار کرلی۔ اور مجھ سے یوں مخاطب ہوا

"بول کیا مانگتا ہے"

میں نے کہا حضور ایک تو آپ اردو غلط بول رہے ہیں۔ اگر کسی اہلِ زبان نے سن لیا خواہ مخواہ لفڑا ہو جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ میں کوئی بھکاری نہیں ہوں جو کسی سے کچھ مانگوں۔ میں محنت مزدوری کر کے گذارا کرنے والا آدمی ہوں۔ جن کہنے لگا یہ سب کچھ چراغ کو ہاتھ لگانے سے پہلے سوچنا تھا اب جب تو مجھے بلا ہی بیٹھا ہے تو کچھ نہ کچھ تو مانگنا ہی پڑے گا۔ میں نے کہا حضور پھر کبھی سہی۔ جن کہنے لگا کیا میں کوئی سرکاری کلرک ہوں جو فائیل کو پینڈنگ رکھ لوں۔ مجھے ابھی اسی وقت تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ بول کیا کروں۔ اگر چاہو تو میں تمہیں منسٹر بنا سکتا ہوں۔ میں نے کہا مجھ سے منسٹری کیسے ہوگی۔ حکومت کو چلانا کوئی معمولی کام تو ہے نہیں۔ جن ہنسا اور کہنے لگا ارے بھولے انسان، حکومتیں کیا منسٹر چلاتے ہیں۔ منسٹر تو فقط اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ اپنے چند رشتہ داروں اور دوست یاروں کی زندگی میں رنگ بھر سکیں۔ میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو پھر حکومت چل کیسے رہی ہے۔ کہنے لگا یہ کسی پیر فقیر کی دعا سے چل رہی ہے۔ جس کا اتا پتہ مجھے بھی معلوم نہیں۔"

میرے نہ نہ کرنے پر بھی جن نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک گردش میں پایا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں راشٹرپتی بھون میں بطور وزیر تعلیم حلف لے رہا ہوں۔

راشٹرپتی بھون سے اپنی کوٹھی کی طرف آتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ اگر قسمت نے مجھے کلرکی کی کرسی سے اٹھا کر وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا ہے تو میں پورے انصاف سے حکومت کروں گا۔ کسی نااہل رشتہ دار یا ناکارہ دوست کی ہرگز مدد نہیں کروں گا۔ میرا انصاف عدل جہانگیری ہوگا۔ اس چکر میں چاہے میری بیوی کو جیل کی چکی ہی کیوں نہ پیسنی پڑے۔ آخر گھر میں بھی تو پیس رہی ہے۔

گھر پہنچ کر میں نے کاغذ قلم ہاتھ میں لیا اور ایک لسٹ بنانا شروع کی کہ بطور منسٹر یہ کروں گا اور یہ نہیں کروں گا۔ بسم اللہ یہ لکھ کر کی کہ کسی نااہل کی مدد نہیں کروں گا۔ ابھی یہاں تک ہی لکھنے پایا تھا کہ دیکھتا ہوں نگینہ صاحب دروازے سے تشریف لا رہے ہیں۔ نگینہ صاحب میرے کافی ہاؤس کے دوستوں میں سے ہیں۔ ویسے تو ہم انھیں شاعر کہتے ہیں لیکن جو شعر وہ لکھتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں سن کر اکثر لوگوں کے کان کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ایسے شعر آپ عورتوں کو ہرگز نہیں سنا سکتے۔ اس لیے ہم سب مرد لوگ ان کے شعر سنتے اور پھر بعد میں الگ الگ اپنی بیویوں کو سناتے تھے۔

نگینہ صاحب مجھے دیکھتے ہی بغل گیر ہو گئے اور کہنے لگے "مبارک ہو" آج کے اخبار میں تمہارے وزیر بننے کی خبر پڑھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ مجھے نگینہ صاحب کی بات پر رتی بھر شک نہیں تھا کیونکہ ان کی باچھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اتنی کھلی ہوئی باچھیں میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

نگینہ صاحب کہنے لگے کہ اگر خدا نے تمہیں وزیر بنا ہی دیا ہے تو بھائی غیر جانب داری سے حکومت کرنا۔ نہ کا ہوں سے وزیر ناکام ہو ہے پھر اس سلسلے میں میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ کم از کم میں

تم سے کبھی کوئی فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ نگینہ صاحب وہی کہہ رہے ہیں جو میں چاہتا ہوں۔

کچھ دیر بعد نگینہ صاحب فرمانے لگے کہ آج ایک نظم ہوئی ہے جو میں تمہیں سنانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں نے کہا آپ کی نظم سنا میری موجودہ پوزیشن میں کچھ مشکل سا ہو گیا ہے۔ ہنس کر کہنے لگے ویسی نہیں ہے اور سچی بات یہ ہے کہ یہ نظم میں نے خود نہیں لکھی کسی غیبی طاقت نے مجھ سے لکھوالی ہے۔"

نگینہ صاحب کی نظم میں میری شخصیت کی بڑائی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں تھیں جن سے میں بالکل واقف نہیں تھا۔ نظم میں ایک شعر ایسا بھی تھا جسے سُن کر میں پانی پانی ہو گیا۔ نگینہ صاحب نے کہا تھا

میں تجھے اکبرِ اعظم کی طرح مانتا ہوں
تو سکندر ہے میرے عہد کا میں جانتا ہوں

میں نے شرما کر کہا نگینہ صاحب آپ کچھ مبالغہ آمیزی سے کام لے رہے ہیں اور ویسے بھی جمہوریت کے اس دور میں سکندرِ ثانی کا پیدا ہونا کچھ مشکل سا ہو گیا ہے کیونکہ کسی دوسرے ملک کو فتح کرنا تو کجا، دوسرے ملک میں گھسنے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر تلوار ہاتھ میں لے کر سفر کرنے پر آج کل سخت پابندی ہے۔ پر نگینہ صاحب میری کہاں سننے والے تھے۔ کہنے لگے نگینہ نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لوگ اگر تمہاری عظمت سے آگاہ نہیں ہیں تو محض اس لیے کہ ان کے پاس نگینہ پرکھنے کا ہنر نہیں ہے۔ خیر کچھ ہی دنوں میں یہ حقیقت پوری دنیا پر آشکار ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا "وہ کیسے" کہنے لگے میں اس نظم کو اپنی کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ جو اگلے ہفتے منظرِ عام پر آجائے گی۔ تمہارا اس سلسلے میں اتنا ہی فرض ہے کہ اس کتاب کی دو ہزار کاپیاں خرید وا کر لائبریری تک پہنچاؤ کیونکہ تمہیں اور مجھے کوئی حق نہیں کہ ہم تمہاری عظمت کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھیں۔

میں ابھی اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ نگینہ صاحب کے حملے سے کیسے نجات پاؤں کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اور صاحب دروازے سے داخل ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے تعارف میں کہا کہ وہ مشہور تاریخ دان پروفیسر سکسینہ ہیں۔ میں نے کہا حضور کو کبھی پہلے نہیں دیکھا۔ کہنے لگے کہ تاریخی ریسرچ میں ایسا گم ہوں کہ کبھی ابھروں تو کوئی دیکھے۔ آج بھی اسی سلسلے میں تاریخ کے پرانے اوراق دیکھ رہا تھا جب مجھے یہ ہاتھ لگا "یہ" سے مراد ایک خاندانی شجرہ تھا جس کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ میرے خاندان کا ہے۔ شجرے کے حساب سے ہمارے خاندان کا تعلق ایک اونچے راجپوت گھرانے سے تھا۔ جس کا سلسلہ بھگوان کرشن سے جا ملتا تھا۔

مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ بچپن میں میرے ہاتھوں ایک دو گوالنوں کی گگریاں پھوٹ گئیں تھیں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ میں نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کچھ لڑکیوں کو بنسی کی مدھر تانیں سنائی تھیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ حرکتیں مجھ سے میری رگوں میں بسنے والا خون کرا رہا تھا۔ میں نے پروفیسر سکسینہ سے گذارش کی کہ بغور دیکھنے کے باوجود مجھے اپنے یا اپنے والد کے چہرے کے گرد کبھی کوئی ہالہ نہیں نظر نہیں آیا۔ لیکن تاریخ دان ٹس سے مس نہیں ہوا ــــ کہنے لگا جناب اس لیے نظر نہیں آیا کہ آپ کے پاس ایک ریسرچر کی نگاہ نہیں ہے۔

پروفیسر سکسینہ کہنے لگے کہ یہ جو شجرۂ نسب مجھے اچانک مل گیا ہے اس کو میرے دیباچے کے ساتھ سرکاری خرچ پر شائع ہونا چاہیئے۔ سرکار جو ہزاروں روپے اس قسم کی ریسرچ پہ برباد کر رہی ہے، کہ علامہ اقبال قبل از دوپہر پیدا ہوئے تھے یا بعد از دوپہر، میری اس ریسرچ پر کیوں خرچ نہ کرے جس سے یہ راز کھلتا ہے کہ اس کے وزیروں میں سے ایک ایسا بھی ہے جس کے خون میں بھگوان کرشن کے خون کی ملاوٹ ہے۔

میں پروفیسر سکسینہ کی ریسرچ کا جواز ڈھونڈ رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں میرے پرائمری اسکول کے استاد منشی حکومت رائے چلے آرہے ہیں۔ منشی جی اچھی طرح کمرے میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ کہنے لگے میں نے ہمیشہ تمہیں یہی کہا بیٹا کہ چھپی ہوئی کتابوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہمیشہ میری نصیحت پر عمل کیا۔ میں نے سدا یہ کہا کہ علم کتابیں پڑھنے سے نہیں ملتا۔ استاد کی خدمت کرنے سے ملتا ہے۔ بڑا آدمی بننا ہے تو استاد کے گھر میں برتن دھوؤ۔ اس کا حقہ بھرو۔ اس کے گھر کے چولہے کے لیے جنگل سے ایندھن لاؤ۔ میری نصیحتوں کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے وہ لڑکا جو چھٹی جماعت میں تین بار فیل ہوا آج ہمارا وزیر تعلیم ہے اور اس لیے ہے کہ اس نے کتابوں پر نہیں ماسٹر حکومت رائے کی نصیحت پر عمل کیا"۔ ماسٹر حکومت رائے نے بتایا کہ انہوں نے اپنی تمام نصیحتوں کو یکجا کر کے ایک کتابی

شکل دی ہے۔ جس کا نام ہے "حکومت رائے کے اقوال زریں"۔ ماسٹر جی نے کہا کہ اب ضروری ہوگیا ہے کہ اس کتاب کو نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ ہندستان کے تمام بچے وہ رتبہ حاصل کرسکیں جو مجھے نصیب ہوا ہے، میں نے کوشش کی کہ ماسٹر جی کو آگاہ کردوں کہ میرے منسٹر بننے میں ان کے اقوال زریں کا نہیں اس چراغ کا دخل ہے۔ جو ایک کباڑی غلطی سے میرے آنگن میں چھوڑ گیا ہے۔ لیکن ماسٹر جی نے ڈانٹ کر کہا کہ

فضول کی بک بک بند کرو، ورنہ ناک سے پکڑ کر وہی تھپڑ ماروں گا جو تم نے کئی بار کھائے ہیں۔ اور یہ کہہ کر وہ اس زور سے ہنسے جیسے ابھی ابھی انہوں نے سال بھر کا بہترین لطیفہ سنایا ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے حلقۂ دام سے نکلوں تو کیسے نکلوں۔ اسی وقت میرے سکریٹری نے آکر کہا کہ سر آپ کو فوراً ایک جلسے کی صدارت کے لیے جانا ہے۔

یہ ایک دانشوروں کا جلسہ تھا جس میں ادیب، تاریخ داں اور استاد لوگ شامل تھے۔ جلسے میں جو تقریریں ہوئیں ان میں زبردست احتجاج کیا گیا کہ سرکار خواہ مخواہ ہمارے کاموں میں دخل دیتی رہتی ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ کررہے ہیں۔ کسی فائدے کی خاطر نہیں کررہے۔ ہمیں یہ ہرگز پسند نہیں ہے کہ سرکار ہمارے کام میں دخل دے۔ ہم جو چاہیں گے لکھیں گے جو چاہیں گے چھاپیں گے۔ ہمیں اس سلسلے میں پوری آزادی ہونی چاہیئے سرکار کو چاہیئے کہ وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔ تقاریر کے بعد جو تالیاں بجیں ان میں نگینہ صاحب۔ پروفیسر سکسینہ اور ماسٹر حکومت رائے نے پرزور حصہ لیا۔

جلسہ گاہ سے جب میں گھر پہنچا تو بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ صبح کے واقعات اور جلسہ گاہ کی تقاریر میرے دماغ کے اکھاڑے میں کشتیاں لڑ رہے تھے۔

جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اچانک کسی نے شفقت بھرے ہاتھ سے مجھے بیدار کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہی چراغ والا جن میرے سامنے کھڑا تھا۔ اور کہہ رہا تھا "کوئی خدمت میرے لائق"۔ میں نے تقریباً چیخ کر جواب دیا۔ "خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے حکومت کو چلانے میں مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ مجھے کسی کے مشورے۔ اقوالِ زریں یا تاریخی ریسرچ کی ضرورت نہیں ہے" جن حیران و پریشان کچھ دیر تک تو مجھے تاکتا رہا۔ اور پھر مایوس ہوکر میرے دیکھتے ہی دیکھتے چراغ میں گھس گیا۔

اختر لکھنوی

کوئی دیدہ ورِ طرف دیدۂ تر بھی ہو گا
تھا گماں کوئی یہاں اہلِ نظر بھی ہو گا

شعلے جب اٹھیں گے لکھنے کو گھروں کی تاریخ
ان کے اک باب کا عنواں مرا گھر بھی ہو گا

ہم تو ہیں شہرِ تضادات کے رہنے والے
ہم میں ہر خنداں بلب خاک بسر بھی ہو گا

مجھ پہ ہنستے ہوئے یہ بھول نہ جانا لوگو
رخ ہواؤں کا جدھر تم ہو ادھر بھی ہو گا

بند کمروں میں ابھی فیصلے ہوتے ہیں تو ہوں
فیصلہ ایک سرِ راہگذر بھی ہو گا

ریڈیو پاکستان کراچی (پاکستان)

کیفی وجدانی

نوائے جاں بھی ہوائے جہاں کے نام لکھوں
کہ یہ بھی سمتِ سفر بادباں کے نام لکھوں

وہ برگِ سبز تو اک ذہن تھا مصوّر کا
یہ انکشاف بھی بادِ خزاں کے نام لکھوں

کہ خاک ہو کے بھی میں اپنی عظمتوں میں ہوں
یہ گردِ راہ میں کس کارواں کے نام لکھوں

وہ میرے خون کا خود بھی تو ذائقہ چکھے
اسی کا زہر اسی کی زباں کے نام لکھوں

جو تیز دھوپ نے لکھا ہے میرے سینے پر
وہ حرفِ طنز میں کس سائباں کے نام لکھوں

بس ایک پھول مری شاخِ فن پہ آیا ہے
یہ پھول کس کے لبِ گلفشاں کے نام لکھوں

محلہ گڑھی (رفیع آباد) بریلی

شاہین بدر

ساعتوں کی دھوپ نے شاید مجھے سمجھا نہیں
میں کسی گرتی ہوئی دیوار کا سایہ نہیں

زندگانی جنگِ خندق کی طرح ہے محترم
ساعتوں کے لشکروں سے میں سراسیمہ نہیں

میں کہ پیاسی ریت کے ہونٹوں کی خوشبو بن گیا
وہ کہ بادل تھا، مگر بے فیض تھا، برسا نہیں

خشک شاخوں سے لپٹ کر رو پڑی فصلِ دعا
پیڑ پودوں کے بدن پر ایک بھی پتہ نہیں

اب تو آوازوں میں بھی ظلمت کی کائی جم گئی
روشنی روتا ہوا اک بلب بھی زندہ نہیں

اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے ہوا یہ انکشاف
جو مقدر میں لکھا ہے وہ عطا ہوتا نہیں

آنسوؤں کے دستخط موجود ہیں شاہین بدرؔ
کوئی بھی صفحہ کتابِ زیست کا سادہ نہیں

پلاٹ نمبر ۱، ۵/۸ ایریا کورنگی نمبر ۶، کراچی ۳۱

انشائیہ کیا نہیں

ڈاکٹر سلیم اختر ● "الجوث" ۵۶۹ - iii-C - جہان زیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن - لاہور ، پاکستان

اگرچہ انشائیہ کا جوانی یا خواب جوانی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن اس کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ انشائیہ کی اتنی زیادہ متنوع بلکہ پر تضاد تعریفیں کی گئی ہیں کہ:

ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

والی بات لفظاً نہیں ہے بلکہ اب تو کثرت تعبیر نے انشائیہ کی تعریف کو ادبی "تاثیریوں" میں تبدیل کر دیا ہے ــــــ اس حد تک کہ منیر نیازی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

"انشائیہ ایک ایسا حرف ہے جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

انشائیہ کی تعریف کو ہدف بنا کر چاند ماری کرنے والوں کو عمومی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ جو خود انشائیہ نگار ہیں اور وہ جو انشائیہ نگار نہیں مگر نقاد ہیں۔ اگرچہ علمی مباحث اور ادبی مسائل کی تفہیم کے ضمن میں شاید اس نوع کی عمومی گروہ بندی چنداں سود مند ثابت نہ ہو اور اگر کسی اور صنف کا معاملہ ہوتا تو شاید اس سے کچھ فرق بھی نہ پڑتا یعنی اس انداز پر فکشن کے بارے میں بحث نہیں جا سکتی کہ فکشن لکھنے والے اور فکشن نہ لکھنے والے ناقدین ــــــ لیکن انشائیہ کی بحث میں یہ اضافی امر ہی اساس ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ انشائیہ نگار شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی انداز کے انشائیہ کو درست تسلیم کرتا ہے جس انداز کا انشائیہ وہ خود قلمبند کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ اس لیے اس کے بموجب "اصلی تے وڈا" انشائیہ وہی ہوتا ہے جیسا وہ خود قلمبند کرتا ہے اور جس انداز کا انشائیہ قلمبند کرنے سے قاصر رہتا ہے دوسرے سے اسے انشائیہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس نوع کی پالتو تعریفوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انشائیہ کی تعریف، اس کی خصوصیات اور تکنیکی لوازم کے بارے میں غلط بحث سے جو تکرار کی بحثیں چھڑیں ان کی بنا پر انشائیہ کی تعریف علمی کی بجائے محض تکنیکی بن کر رہ گئی ہے۔ انشائیہ میں مزاح ہو یا نہ ہو، اس میں طنز ہو یا نہ ہو، اسے سنجیدہ ہونا چاہیئے یا غیر سنجیدہ۔ اس سے کسی نوع کی معلومات کا حصول ممکن ہے یا نا ممکن، اس میں روح عصر کی ترجمانی کی صلاحیت ہو یا وہ اس سے عاری ہو۔ اس کا زندگی سے تعلق ہو یا نہ ہو ــــــ یہ اور اسی نوع کے دیگر فنی تقاضے جو دیگر اصناف ادب بالعموم طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ انشائیہ میں آج تک اگر ان کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کیا جا سکا تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انشائیہ نگار اس معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ وہ دوسرے کے انداز کو درست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ جا رہا ہے اچھا انشائیہ کم لکھا جا رہا ہے، البتہ اس پر اچھی بحثیں زیادہ بہتر ہو رہی ہیں۔ چنانچہ احتشام حسین کے بقول:

گزشتہ چند سالوں سے اردو کے کچھ ادیب خاص طور سے انشائیہ کے حدود متعین کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ان میں سے بعض نے خود بھی انشائیے لکھے ہیں اور گویا اس بات کا بھی ثبوت فراہم کیا ہے کہ ان کے خیال میں انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنے ذوق اور اپنے تصور کے مطابق انشائیے لکھ رہے ہیں لیکن اس فکر میں نہیں ہیں کہ وہ انشائیے کی تعریف بھی کریں۔ یہ وہ ہوشیار لوگ ہیں جن کو آم کھانے سے کام ہے گٹھلیاں گننے کا کام دوسروں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں یا اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:

"شعر میں کہتا ہوں بجھے تم کرو۔"

[illegible]

جہاں تک انشائیے پر تنقیدی تحریروں کا تعلق ہے تو ان میں بیشتر کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ ان میں استخراجی کے ضمن میں INDUCTIVE METHOD سے کام نہیں لیا جاتا یعنی انشائیوں کے مطالعہ کے بعد ان کی مشترک خصوصیات یا مابہ الامتیاز خصائص کے استنباط کی بنیاد پر بات کرنے کے برعکس پہلے سے طے شدہ نتائج، مفروضوں یا پھر پالتو تعصبات کی روشنی میں اچھے یا برے انشائیہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے یعنی وہی فرموں پر ٹوپی فٹ کرنے والی بات۔ اب فرمہ تو انوٹ ہے اس لئے ٹوپی کی گردن مروڑتے رہو۔ اس لیے انشائیہ کی پہچان، شناخت، شجرۂ نسب یا امروہنی پر مبنی انشائیہ کیا ہے قسم کے مضامین پڑھ کر ذہن ایسا الجھتا ہے کہ جی چاہتا ہے اے کاش کوئی ایسا مضمون بھی لکھے جس کا عنوان یہ ہو، انشائیہ کیا نہیں!

آیئے ناقدین کی تعریفوں کے آئینہ میں انشائیہ کے سراپا کا جائزہ لیتے ہیں۔ سرفہرست ڈاکٹر وزیر آغا ہیں جو پاکستان میں انشائیہ کے قافلہ سالار ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک معروف مقالہ "انشائیہ کی پہچان" میں "انشائیہ کی جان" یہ بتائی ہے:

"......لیکن اگر آپ ان گھسی پٹی راہوں سے الگ ہو کر ایک نئے زاویہ سے سمندر کو دیکھنے کے متمنی ہیں تو آپ سمندر کی طرف پشت کرکے کھڑے ہو جائیں، اور پھر جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھیں تو آپ کو ایک ایسا منظر دکھائی دے گا جو آپ سے پہلے شاذ ہی کسی اور کو نظر آیا ہوگا۔ ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھنے کی یہ روش دراصل آپ کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کرے گی جو دیکھنے کے مروجہ انداز سے آپ کو آزاد کرے گا۔ اس نئے مقام کی تسخیر کے بعد آپ کے ہاں جو عجیب و غریب رد عمل مرتب ہوگا وہی انشائیہ کی جان ہے"[۱۵]

مشکور حسین یاد نے اپنی تالیف "ممکنات انشائیہ" میں انشائیہ کی تعریف کے ضمن میں اسی خیال کا اظہار کیا:

"چونکہ انشائیہ، ادب کا ایک فطری اظہار ہے اس لیے ہر ادب اس کا موجد ہوتا ہے دنیا کی ہر زبان میں جب اس کے ادب کا آغاز ہوا تو انشائیہ وجود میں آیا اس لیے کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ صرف وہی انشائیہ کا موجد ہے ایک کھلی حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ انشائیہ کی تعریف لفظوں میں نہیں ہوا کرتی۔ انشائیہ کی تعریف یا تو انشائیہ پڑھنا یا انشائیہ لکھنا"[۱۶]

نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں کے مجموعہ "شہرت کی خاطر" کے دیباچہ میں انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے قول محال کا سہارا لیتے ہوئے یوں لکھا:

"انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں میں مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے ...... یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان اور نفس مضمون میں وہی نسبت ہے جو کھونٹی اور لباس میں ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے"[۱۷]

ڈاکٹر سید محمد حسنین انشائیہ نگار بھی ہیں اور انشائیہ پر ایک مقبول کتاب "صنف انشائیہ اور انشائیے" کے مرتب بھی — ان کے خیال میں:

"انشائیہ ادب کی وہ کمین گاہ ہے جہاں قلمکار بیٹھ کر جس پر چاہے تیر چلا سکتا ہے اکرام اور دشنام سے بے پرواہ ہو کر وہ ہر نام اور ہر کام کی عظمت اور ذلت کا محاسبہ کر سکتا ہے۔ اپنی نابکاریوں کے اظہار و اشتہار پر بھی انشائیہ نگار پر کوئی قانونی دفعہ نہیں چلا سکتے کیونکہ ادب کا یہی وہ گوشہ ہے جہاں قلمکار کو ہر طرح کے بیان کی چھوٹ ہے۔ یہ گفتار کا وہ غازی ہے جسے سات نہیں سیکڑوں خون معاف ہیں"[۱۸]

یہ تو تھیں چار انشائیہ نگاروں کی تعریفیں ایسی تعریفیں جو کسی حد تک ان کے اپنے انشائیوں کے فنی مقاصد کی ترجمان بھی نظر آتی ہیں آیئے ناقدین کی تعریفیں بھی دیکھ لیں کہ وہ انشائیہ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر اختر اورینوی کے "ترنگ" کے دیباچہ سے رجوع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں سید محمد حسنین کی یہ رائے ہے کہ انشائیہ کے موضوع پر یہ پہلا تنقیدی مضمون ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے انشائیہ کی کئی خصوصیات گنوا

---

[۱۵] نئے مقالات ص ۲۳۰ [۱۶] "ممکنات انشائیہ" ص ۴۳ [۱۷] "شہرت کی خاطر" ص ۱۰

[۱۸] "صنف انشائیہ اور انشائیے" ص [illegible]۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین "نگار پاکستان" کے افسانہ نمبر (۱۹۶۹ء) میں جو مقالہ بعنوان "ادب کی خاص صنف ــ انشائیہ" شامل ہے وہی اس کتاب کے مقدمہ کے کچھ اجزا پر مشتمل ہے البتہ الفاظ میں کچھ معمولی سی تبدیلی کر دی گئی ہے مثلاً کتاب میں یوں لکھا ہے "انشائیہ نثری ادب کا ایک خاص اسلوب ہے" جبکہ نگار میں یوں ہے "انشائیہ نثری ادب کی ایک خاص صورت ہے"۔

ہیں۔ ہمارے بعض حضرات انشائیہ میں مزاح کو پسند نہیں کرتے جبکہ ڈاکٹر اختر اورینوی کے بقول:

"انشائیوں میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے ایک انشائیہ نگار مزاح کے ترکش کا ہر تیر استعمال کر سکتا ہے مگر سلیقہ شرط ہے شائستہ مزاح، طیف سے کر طنز نمک کی یہاں گنجائش ہے اور جنسی مذاق، بولی ٹھولی پھبتی، سوانگ، گدگدی، چٹکی اور ظرافت کی دوسری قسموں کا برمحل استعمال انشائیوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ جملہ بازی یا فقرے کسنا یا وقت کی سوجھ بوجھ کی کوئی بات کہہ دی یا کوئی چبھتا ہوا ریمارک یا ہلکی سی چوٹ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے ظرافت کا استعمال ہر جگہ خوش مذاقی چاہتا ہے"[1]

کلیم الدین احمد نے حسین عظیم آبادی کے انشائیوں کے مجموعہ "نشاط خاطر" کے پیش لفظ میں لکھا:

"خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے پوشیدہ سرچشموں کو پالیتا ہے جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں اور یہ دل بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا ہے اور اس طرح ان سے نجات پالیتا ہے۔ اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے کیونکہ دانشمند وہی ہے جو اپنی شخصیت کو پانے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے جانے نہ دے"[2]

ماہنامہ "ادیب" علی گڑھ کے انشائیہ نمبر (مئی ۱۹۵۹ء) میں انشائیہ کے موضوع پر مذاکرہ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مختصر ترین الفاظ میں انشائیہ کی تعریف یہ کی:

"انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسنِ انشا ہے۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مفردِ مضمون کے اصل توجہ حسنِ عبارت پر ہو"

اسی مذاکرہ میں علامہ اختر علی تلہری نے اس خیال کا اظہار کیا۔

"انشائیہ اپنے محدود معنی میں اس صنفِ ادب کو کہتے ہیں جو مکاتیب کی شکل میں ظہور پذیر ہو لیکن یہاں اس کا وسیع مفہوم مراد ہے جس میں ادب کی وہ تمام اصناف داخل ہیں جن میں تخیل کا تخلیقی حسن نمایاں ہو..... انشائیہ تخیل کی جلوہ فرمائیوں کا نتیجہ ہے اگر کوئی ذہن تخیل کا سرمایہ دار نہیں ہے تو اس سے کبھی کوئی "انشائیہ" جسے واقعی انشائیہ کہا جا سکے وجود میں نہیں آ سکتا"

ڈاکٹر محمد حسن بھی اسی مذاکرہ میں شامل تھے انھوں نے انشائیہ کے بارے میں یہ کہا:

"میرے نزدیک انشائیہ یا اچھے صرف تابناک اور خود آگاہ قسم کی شخصیت ہی کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ انشائیہ یا مضمون تو بنیادی طور پر شخصی یادداشت ہے اور ظاہر ہے کہ جس قدر شخصیت زیادہ ہمہ گیر خود آگاہ اور عظیم ہوگی اتنی ہی اس کی یادداشتیں دلچسپ ہوں گی"

سید صفی مرتضیٰ کی کتاب "اردو انشائیہ" کے "تعارف" میں سید احتشام حسین کے بقول:

(انشائیہ کو)..... "ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے والوں کے ذہن پر منطق اور استدلال کے ذریعہ نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب ملکانہ اندازِ بیان کے ذریعہ اپنا تاثر قائم کرے"[3]

ڈاکٹر آدم شیخ نے اپنی مرتبہ "انشائیے" میں "خط و خال" کے عنوان سے جو مقدمہ شامل کیا اس میں انھوں نے انشائیہ کے "خط و خال" ابھارتے ہوئے یہ کہا:

"انشائیہ ایک ذہین، رنگین مزاج، ترقی پسند اور روایت شکن فنکار کے جذبات اور احساسات کا پرتو ہوتے ہیں۔ ایک انشائیہ میں لکھنے والے کے ان دبے ہوئے جذبات کا اظہار ہوتا ہے جن کی راہ میں اس کے عہد کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں انشائیہ نگار مروجہ اور فرسودہ روایتوں سے مانوسیت اور مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے انفرادی نظریات اور ذہنی کشمکش اظہار کے ذرائع ڈھونڈتی ہے ادب اس اظہار کے لیے زبان اور تحریر کا سہارا لیتا ہے لیکن اصنافِ ادب میں بھی جو تحریریں انشائیہ نگار کے نے

---

[1] مرتبہ صفدر ۱۹۸۸ [2] نشاط خاطر ص ۱۰ [3] اردو انشائیہ ص ۵

اور مختلف خصوصیات کی حامل ہوتی ہے اپنے مواد، ہیئت اور انداز بیان کی وجہ سے دوسری تحریروں سے منفرد ہوتی ہیں یہی انشائیے ہیں۔[۱]

اردو دستیاب کے مرتب ڈاکٹر سید ضیاء الدین مدنی کے بموجب:

"انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدوں کی روشنی میں حیات و ممات اور حوادث کائنات سے متعلق شوخیٔ بیان کے ساتھ بعض اوقات صاف صاف اور بعض اوقات رمز و کنایہ میں کسی اخلاقی پہلو کو پیش کرتا ہے ..... انشائیہ نگار کی کامیابی کا گُر اس میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ پند و نصیحت طنز و مزاح اور لطافت زبان و بیان کو کام میں لاتا ہے یہی وجہ ہے کہ انشائیہ نگار کے لئے ازسمک تا سماء ہر شے موضوع کا کام دیتی ہے اور وہ حقیر سے حقیر شے کی اہمیت اور حسن کو اجاگر کر دیتا ہے[۲]"

جبکہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے مخصوص اسلوب میں انشائیہ پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

"انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے اس میں بعض ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا ہر مضمون میں پایا جانا ضروری نہیں۔ انشائیہ کا موضوع عام طور پر ہلکا اور تحقیقی نہیں ہوتا۔ معلومات کا فراہم اس کا مقصد نہیں۔ اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنائیت[۳] سے جا ملتی ہیں اس کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس زندگی کے عام معاملات اس میں پیش کئے جاتے ہیں اس معاشرے کے نشیب و فراز کی تصویر کشی کی جاتی ہے[۴]..."

ان اصحاب نے اپنے انشائی مذاق اور تنقیدی شعور کی روشنی میں انشائیہ کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے جہاں اس کے مزاج کی لچک واضح ہو جاتی ہے وہاں بلحاظ تدبیر کاری اس میں تنوع کی وسعت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے میں نے جان بوجھ کر انگریزی میں انشائیے کی تعریفوں کے حوالے نہیں دیئے اور اس لیے کہ اب اردو میں انشائیے کے بارے میں اچھی بری آراء کی کمی نہیں۔ اردو میں اس صنف نے ایک صدی کا تخلیقی سفر طے کیا ہے اور اس سفر کے مختلف مدارج دراصل مختلف انشائیہ نگاروں کی تخلیقی اپج کے مظہر ہیں اس لیے ہمیں اپنے مخصوص مزاج کے حامل انشائیہ کو انگریزی تعریفوں کی روشنی میں پرکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ سرسید نے شعوری طور پر اس صنف کو اردو میں متعارف کرایا اور ان انگریز اہل قلم کے نام بھی دیئے جن سے وہ متاثر ہوئے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اس صنف کو اپنے مخصوص قومی مقاصد کی خاطر استعمال کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کی بالفاظ دیگر صنف کا تصور تو مستعار تھا مگر انہوں نے اپنی تحریروں کو ایڈیسن یا سٹیل کا چربہ نہ بنایا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے انشائیہ کی انفرادیت بھی اس میں مضمر ہے کہ اس نے ماحول کے زیر اثر روح عصر کی ترجمانی کی اور یوں اپنا تشخص برقرار رکھا اسے بعض حضرات ادبی بدعت سمجھتے ہیں میں اسے ان کا اجتہاد سمجھتا ہوں انشائیہ ہی نہیں بلکہ کسی بھی صنف ادب کے کسی دوسرے ملک غیر زبان اور بیگانہ کلچر میں پہنچنے یا فروغ پانے یا مقبولیت حاصل کرنے کے لیے یہی بنیادی شرط لازمی ہے کہ وہ اس قوم کے مخصوص مزاج اور اجتماعی شعور کی عکاسی کر سکے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو ہمیشہ غریب الوطن رہے گی۔ ہمارے ہاں ناول، افسانہ انگریزی کے زیر اثر آئے تھے مگر انہوں نے ہمارے احوال کی یوں ترجمانی کی کہ وہ اب ہمیں اپنے معلوم ہوتے ہیں جبکہ اختر شیرانی اور ن۔م۔ راشد جیسے شعراء کی کوششوں کے باوجود بھی سانیٹ اردو میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اس لیے کہ سانیٹ میں ادا کئے جانے والے تمام تصورات، احساسات اور جذبات کو نظم اور غزل میں بھی بآسانی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی حال اردو میں انشائیہ کا بھی ہے کہ جن باتوں کی فسانہ، مضمون یا مقالہ میں کہنے کی گنجائش نہ تھی انشائیہ نے ان کی ادائیگی کے لیے ایک ذریعہ دے دیا اور اس میں انشائیہ کا جواز مضمر ہے۔ میں نے تو صرف یہ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے انشائیہ میں اظہار کی جو لچک ملتی ہے اسے اس کی امکانی حد تک لے جاتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

"انشائیے، افسانے، ڈرامے اور دیگر فنی صورتوں میں بھی لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جاتے رہے ہیں اور ان کا رشتہ کبھی ناول سے، کبھی ڈرامے سے کبھی افسانے سے جا ملتا ہے درحالیکہ اپنے اپنے بنیادی رویے کی وجہ سے نہ یہ ڈراما ہیں نہ افسانہ اور نہ ناول صرف ان خاصوں کو جدا قسم

---

[۱] انشائیہ، ص ۲۰۲
حوالہ ... انشائیہ نگاری ... (۱۹۷۷ء)
[۲] اردو دستیاب، ص ۱۱
[۳] بقول ڈاکٹر اختر اورینوی انشائیوں کے لیے تھوڑی سی غنائیت ...
[۴] اوراق، افسانہ و انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء

کے رویے کے پیش اختیار کرکے انشائیہ نگار نے اپنی تخلیق پیش کی ہے۔[1]

اس لحاظ سے اگر ڈاکٹر احسن فاروقی نے تنقیدی انشائیہ (نیا دور کراچی خاص نمبر ۶-۶۸) بعنوان "تنقید علم اور جہالت" قلمبند کیا تو وہ گویا انشائیہ میں لچک کے جو امکانات ہیں انھیں ان کے منطقی حد تک لے جا رہے تھے۔ ویسے انشائیہ کو اس انتہا تک لے جانا انشائیہ کی انفرادیت کو مجروح کرنے کا باعث بن سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تحریر کے جس وصف کو "انشائیت" سے موسوم کیا جاتا ہے تحریر اس سے عاری ہو کر اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے مگر وہ انشائیہ نہ رہے گی۔ ہر صنفِ ادب کے مخصوص فنی تقاضے ہوتے ہیں ایسے تقاضے جو تدبیر کاری اور اسلوب کو خاص رنگ میں رنگنے کا موجب بنتے ہیں یوں دیکھیں تو اصناف بھی آزاد اور خود مختار مملکتوں کی مانند اپنی اپنی حدود میں رہتی ہیں تاہم ایک صنف دوسری پر بالواسطہ طور پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے بلکہ بعض اوقات تو اس نوع کی اثر اندازی سے خاص قسم کی تخلیقی چمک بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس معاملہ میں فنی نزاکتوں کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے اس لیے انشائیہ کو اگر دیگر اصناف پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو اس وقت جب وہ اسلوب کے خمیر میں مل کر اپنا تشخص ختم کرکے شیر و شکر ہو جائے لیکن اس کے برعکس ہوا تو کباب میں ہڈی والی بات بن جائے گی۔

آغاز میں درج معروف انشائیہ نگاروں کی تعریفوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ذہن میں انشائیہ کا تصور حالتِ معکوس سے مشروط ہو چکا ہے یہ درست ہے کہ انشائیہ نگار چیزوں کو نئے تناظر میں دیکھتا ہے اور اس تجزیہ کے حظ میں اپنے قارئین کو بھی شریک کرتا ہے ورنہ وہ انشائیہ قلم بند نہ کرتا لیکن ڈاکٹر صاحب اس ضمن میں یہ بنیادی حقیقت فراموش کر گئے کہ چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھنے کے لیے واقعات، حوادث اور افراد کی طرف "پشت کرکے کھڑے ہو جائیں اور پھر جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے" دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ غلام جیلانی اصغر نے بھی اپنے ایک مضمون "انشائیہ کیا ہے" میں اسی انداز کی بات کی ہے:

> "آپ جب انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی سا زاویہ مل جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دنیا کو دیکھ رہے ہوں اور آپ پر زندگی کی ایسی ابعاد منکشف ہو رہی ہوں جو اس سے آپ کے اندر کی آنکھ یعنی تیسری آنکھ سے پوشیدہ تھیں۔ آپ چاہیں تو پہاڑ کی کسی چوٹی سے بھی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں بھی اشیا کا ایک نیا رخ آپ پر وا نشکاف ہو جائے گا"[2]

یہ نہیں معلوم تھا کہ انشائیہ نگاری کے لیے یوگا کی مشقیں بھی ضروری ہیں اسی طرح اگر وہ احتیاطاً یہ بھی ہدایات دے دیتے کہ پہاڑ کی چوٹی کی کتنی بلندی ہو تو خاصی سہولت رہتی کیونکہ بلند سے بلند تر ہوتے جانے میں نہ صرف یہ کہ نگاہ کے زاویے تبدیل ہوتے جاتے ہیں بلکہ بلندی کا ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں سے نیچے کا تمام منظر معدوم ہو جاتا ہے۔ انشائیہ جو ایک سیدھی سادی بلکہ خاصی بے ضرر صنفِ ادب ہے اسے احباب کی تعریفوں، توجیہات اور تشریحوں نے عجیب و غریب چیز بنا کر پیش کر دیا ہے جبکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ فن کار کے تخلیقی مشاہدہ کا جسمانی حرکات سے مناظر کی تبدیلی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں جبکہ خود غلام جیلانی اصغر "اندر کی آنکھ یعنی تیسری آنکھ" کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں تو پھر سر کے بل کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے ہر تخلیقی فن کار زندگی کو نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ تخلیقی فن کار کیسے کہلائے گا لیکن اس کے لیے شاعر و افسانہ نگار، مصور یا سنگ تراش کو چمگادڑ سے انسپیریشن لینے کی کیا ضرورت ہے! چیزوں و دنیا مناظر عطا کرنے والی تخلیقی آنکھ ہوتی ہے جس کا تعلق بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے ہوتا ہے۔ ہر تخلیقی فن کار اس معاملے میں دیوتا سمان ہوتا ہے کہ وہ تیسری آنکھ بھی رکھتا ہے اور یہ تیسری آنکھ ہی اسے یہ اہلیت عطا کرتی ہے کہ وہ افراد، اشیا اور واقعات کے بارے میں عمومی اور مروجہ ردعمل کا اظہار کرنے کے برعکس تخلیقی سطح پر انھیں نئے روپ اور نئی شکل پر انھیں نئے روپ، نئی زندگی اور نئی توانائی سے ہمکنار کرتا ہے۔ دراصل اور مختلف بننے کی تمنا میں ڈاکٹر وزیر آغا اسی انداز کی عجیب و غریب مثالیں دیتے رہتے ہیں جو اگرچہ خوشنما الفاظ کا مرکب ہوتی ہیں لیکن ان کی ابہمیت ہی بنا بر صفر ہوتی ہے کہ ان سے انشائیہ کا مسئلہ واضح ہونے کے برعکس مزید الجھ جاتا ہے کسی صنف (یا کسی بھی چیز) کی تعریف جن لفظوں میں کی جائے وہ ایسے منطقی ہوں کہ تعریف پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ تعریف

---

[1] اوراق، افسانہ، انشائیہ نمبر، ... اپریل ۱۹۸۰ء ... انشائیہ پر ایک مذاکرہ میں گفتگو کرتے ہوئے اسی خیال کا اظہار کیا تھا
"آپ کی ... انشائیہ کر سکتے ہیں ... کے انداز ... [illegible]
[2] اوراق، مارچ، اپریل ۱۹۸۲ء

کرنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ کس چیز کی تعریف کر رہا ہے۔ یہ اس لیے لازم ہے کہ تعریف بھی دراصل ایک نوع کی دلیل ہوتی ہے۔ چند خصوصیات کی موجودگی اور پھر چند خصوصیات کی عدم موجودگی کی بنا پر تعریف کر کے تعریف کی جانے والی صنف (یا شے)، یا فرد، یا تصور یا خیال یا عمل کو دوسری سے ممیز کرتے ہیں اور وہی تعریف کامیاب بھی جائے گی جو اوصاف اور خصائص کی موجودگی اور عدم موجودگی کے کلیہ کو مدنظر رکھے گی۔ ملا ہر ہے کہ کوئی بھی تعریف مکمل یا سالم یا ثابت نہیں ہو سکتی اور اس لیے مختلف النوع تعریفیں ہوتی رہتی ہیں لیکن ہر تعریف سے کم از کم اتنی توقع تو کی جانی ہوگی کہ وہ کم از کم یہ تو واضح کر دے کہ وہ کس چیز کی تعریف ہے۔ روزنامہ "جنگ" ۱۹۸۲ء میں انشائیہ کے بارے میں ایک مذاکرہ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی یہ تعریف کی:

"انشائیہ گویا جزیرہ کا پھول ہے اور یہ جزیرہ متلاطم سمندر کے اندر وہ نقطہ ہے جو اپنی جگہ پر سکون ہوتا ہے۔ یہاں سے آپ متلاطم سمندر کو دیکھ سکتے ہیں لیکن خود اس میں شامل نہیں ہوتے۔ بیسویں صدی ایک متلاطم صدی ہے۔ انشائیہ اس میں ایک ایسے جزیرہ کی طرح ہے جہاں سے اس صدی کے پورے تلاطم کو دیکھا جا سکتا ہے۔"

یہ تعریف بے حد شاعرانہ ہے خوبصورت الفاظ کا مرکب ہے لیکن یہ تعریف منطقی نہیں کہ یہ اتنی بے مہار تعریف ہے کہ انشائیہ کے "نقطہ" کی جگہ کوئی بھی لفظ رکھ دینے سے یہ تعریف نہ صرف اس پر فٹ آئے گی بلکہ انشائیہ کے مقابلہ میں اس کی بہتر اور اچھی تعریف بھی نظر آئے گی مثلاً انشائیہ کی جگہ جدید شاعری، علامتی افسانہ، نثری نظم حتیٰ کہ مصوری بلکہ کسی مصور کی کسی مشہور تصویر (مثال: لیونارڈو دا ونچی کی "مونالیزا" گویا کی "گیگرنیکا" یا پکاسو کی "گیرنیکا") پر بھی اسی تعریف کو کامیابی سے لاگو کیا جا سکتا ہے یہی نہیں بلکہ اسی تعریف میں تو اتنے امکانات پوشیدہ ہیں کہ اسے کسی بھی مشہور شخصیت پر لاگو کیا جا سکتا ہے مثلاً احمد ندیم قاسمی یا خود ڈاکٹر وزیر آغا ——— الغرض امکانات کے در وا ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ ہم اسے کسی مجموعے کا فلیپ بھی بنا سکتے ہیں۔

اسی مذاکرہ ڈاکٹر صاحب نے اسی انداز کی ایک اور گول مول بات یوں کی ہے:

"...انشائیہ یہی کہتا ہے کہ دریا عبور کر کے دوسرے کنارے کو دیکھا جائے اور پھر دوسرے کنارے سے پہلے کنارے پر ایک نظر ڈالی جائے انشائیہ چیزوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا رویہ ہے۔"

ہمیں اپنی جہالت کا اعتراف ——— کہ اپنا حال تو یہ ہے:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کو اسی انداز کی شاعرانہ مبہم اور غیر واضح (لہٰذا گمراہ کن) تعریفیں کرنے کا بے حد شوق ہے کہ وہ الفاظ اور انداز بدل بدل کر اس نوع کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں چنانچہ دریا والی اس مثال کو انھوں نے اپنے انشائیوں کے مجموعہ "دوسرا کنارا" کے پیش لفظ میں نہ صرف دہرایا بلکہ خصوصی انداز میں اس کی صراحت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا:

"انشائیہ نگار بالکل یہی کرتا ہے وہ شے یا منظر کو سامنے سے دیکھنے کے بجائے عقب سے اس پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ یوں اس کی معنویت کو گرفت میں لے لیتا ہے جو ہر وقت ایک ہی مانوس زاویے سے مسلسل دیکھنے کے باعث اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔"

دراصل ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں نئے زاویہ نگاہ کی تشکیل جسمانی حرکت اور پھر اس کے نتیجے میں پیش منظر یا تناظر میں تبدیلی سے مشروط ہو کر رہ گئی ہے لیکن یہ تصور غیر تخلیقی ہے اور اسی لیے محدود بھی۔

جب ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک مضحکہ خیز تعریف پیش کر دی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈاکٹر انور سدید اس معاملہ میں پیچھے رہ جاتے چنانچہ انھوں نے بھی اپنی فطرت کے عین مطابق انشائیہ نگار کی یہ تعریف فرمائی:

"انشائیہ نگار اس انبوہ میں شریک ہے جو پگڈنڈی پر چلتے چلتے کیچڑ میں لتھڑ گیا ہے لیکن زہر خند یا ہنسی کو جنم دینے کی بجائے انشائیہ نگار اسی کیچڑ سے انکشاف سرور کر رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو ایسی شگفتہ باتیں بتا رہا ہے جیسے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھنے زمین کے

اس سے آشنا ہونے اور کیچڑ کا ذائقہ چکھنے سے پہلے معلوم نہیں تھا۔[1]

جو لوگ ادب اور ادیب کے نفسیاتی مطالعے کے منکر ہیں انھیں ان منہ بولتی سطروں کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ کیسے انھوں نے شخصیت کی کجی کی طرف انگلی اٹھا دی جس شخص نے تمام عمر شرفا پر کیچڑ اچھالی ہو اور خود اس میں لوٹ لگائی ہو وہی کیچڑ کی مثال دے کر اس سے "اکتساب سرور" کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو ایسی شگفتہ باتیں بتا سکتا ہے شاید اسی لیے انشائیوں کی مانند ڈاکٹر انور سدید کی تمام تنقید بھی محض کیچڑ سے "اکتساب سرور" میں تبدیل ہو گئی اور یوں ان کی بلند پایہ تنقیدی آرا محض "ساتھیوں کو شگفتہ باتیں" سنانے کی چیزیں بن کر رہ گئیں ـــــ فاعتبرو یا اولی الابصار!

علمی مباحث میں اس انداز کی OVER SIMPLIFICATION بے حد نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور بالخصوص جب معاملہ اصناف ان کی تعریفوں اور ان کے طریق کار کا ہو تو اس انداز کی گفتگو مسئلہ کو روشن کرنے کے برعکس دھندلکے میں اضافہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جسم اور اس کی حرکت اور اس کے نتیجہ میں نگاہ کے تبدیل ہوتے زاویوں کو ان کی ظاہری حیثیت میں قبول کر لیتے ہیں اس لیے وہ سطح تک رہتے ہیں ہم اس ضمن میں ان سے لمبی چوڑی فلسفیانہ بحثوں کی توقع نہیں رکھتے لیکن علمی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر قلم اٹھانے کے باعث ان سے اتنی سی صراحت کی توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ جو بات پہلے وہ خود اس کے بارے میں اپنے ذہن میں واضح ہوں اور پھر اپنے قارئین تک بھی اپنی بات کو پہنچا سکیں انھوں انشائیہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا لیکن افسوس کہ ان کے تمام لکھے نے انشائیہ کی بحث کو مزید الجھا دیا جس کا ایک سبب ان کی عجیب و غریب تعریفیں بھی ہیں اگر معاملہ ہم جیسے فانی انسانوں کا ہوتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا جو جی میں آئے کہو اور جس طرح چاہو تعریف کرو لیکن ڈاکٹر وزیر آغا خود کو انشائیہ کی صنف کے بانی اور اسی اصطلاح کے موجد اور جیسے پاک و ہند میں انشائیہ نگاری کی تحریک کے سالار کارواں کہلاتے ہیں اس لیے ان کے قلم سے جب ایسی بلند پایہ تعریفوں کا اخراج ہو تو ان کا اسی بنا پر نوٹس لینا ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قافلہ کی گمراہی کا تو سبب بنتے ہی ہیں کہ وہ میر کارواں ہیں اور ان کے ارشادات انشائیہ کے سوئے قافلے کے لیے صدائے جرس کا کام کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ادب کے قارئین، طالب علموں اور ناقدین کے لیے بھی عمومی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کو "دوسرا کنارا" والی بات بہت پسند آئی ہے کیونکہ اپنے انشائیوں کے مجموعہ "دوسرا کنارا" میں بھی انھوں نے اسی انداز کی بات کی ہے:

> "انشائیہ "دوسرے کنارے" کو دیکھنے ہی کی ایک کاوش تو ہے مراد محض یہ نہیں کہ آپ دریا کا پل عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچیں اور پھر اس سے لطف اندوز ہوں اپنی جگہ یہ بات بھی غلط نہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ جب آپ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں تو آپ کا ہر روز کا دیکھا بھالا "پہلا کنارا" "دوسرا کنارہ" بن کر آپ کے سامنے ابھر آتا ہے۔"

اگر اس تعریف کی اتنی سی تحریف کر دی جائے کہ دریا کا پل عبور کر کے دوسرے کنارے پہنچنے کی بدلیت نظر انداز کر دی جائے اور انسان تیر کر دریا عبور کرے یا کشتی میں بیٹھ کر دریا عبور کرے یا ریل یا بس یا کار کے ذریعہ دریا عبور کرے تو پھر دوسرے کنارے کا منظر کیسا لگے گا، ڈاکٹر وزیر آغا تو خیر سے علامتی شاعری بھی فرماتے ہیں وہ اس حقیقت کو کیوں فراموش کر گئے کہ افراد، اشیا، واقعات، حادثات اور مظاہر کو نئے زاویے سے دیکھنے کے لیے کناروں پر کود پھاند کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہم اپنے وجود میں دونوں کنارے رکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کی ندی کے ایک کنارے پر کھڑے دنیا کو دکھائی دیتے ہیں جبکہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت ہم ذات کی ندی کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوں اس کیفیت سے دوئی، بُعد یا فاصلہ کا بڑا احساس جنم لیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں نفسی کشمکش جس آشوب ذات کا موجب بنتی ہے وہ ادب کا اہم ترین مطالعہ ہے کہ یہی انسان کا مطالعہ ہے۔ انسانی نفسیات سے آگہی رکھنے والا تخلیقی فن کار (اور اس کا انشائیہ نگار ہونا ضروری نہیں) اپنے تخلیقی وجدان سے اس کشمکش کے محرک بننے والے نفسی عوامل کی گرہ کشائی کرتا ہے لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے غالباً اتنی گہرائی میں جانا ممکن نہیں اس لیے وہ سطح تک رہتے ہوئے محض جغرافیائی انداز سے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کی بات کرتے ہیں اور اگر اسی انداز پر بات کرنی ٹھہری تو پھر سڑک کے بھی تو دو کنارے ہوتے ہیں اسے بھی چھوڑیئے آپ کمرے میں الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں تو فرنیچر کی ترتیب کے زاویوں میں تبدیلی کے باعث کمرہ کا منظر

[1] ڈاکٹر انور سدید "دستخط" ص ۳۰

تبدیل ہو جاتا ہے لہٰذا یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ انشائیہ نگار ایک دروازے سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے اور پھر ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں "سامنے سے دیکھنے کے بجائے عقب سے اس پر ایک نظر ڈالتا ہے"۔۔۔۔ اور کمٹ سے انشائیہ تیار کر لیتا ہے۔ الغرض اس انداز کی مثالیں وضع کرنی مشکل نہیں لہٰذا مثالیں وضع کرتے جاؤ اور انہیں انشائیہ پر چسپاں کرتے جاؤ اس امید کہ اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔۔۔۔ ویسے ڈاکٹر وزیر آغا کی ان تعریفوں کے بارے میں گفتگو کرنے والا میں پہلا گنہگار نہیں کیونکہ مجھ سے پہلے محمد ارشاد بھی اپنے مقالہ "موتیں، انشائیہ اور انشائیہ نگار" میں ڈاکٹر صاحب کی تعریف کا تجزیاتی مطالعہ کر چکے ہیں:

"وزیر آغا۔۔۔۔ جنہیں اردو انشائیہ کا موجد شناس خیال کیا جاتا ہے، کی پیش کردہ تعریف نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے وہ انشائیہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں "انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔" یہ متعدد بلحاظ شاعرانہ انداز بیان ہے اسے تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے الفاظ سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی مسمریزم کی تعریف (EULOGY) کر رہے ہیں یا پھر کسی شعبدہ بازی کی اور یا خواب نامہ یا تحلیل نفسی کے مطابق خوابوں کی تعبیر کرنے والے یا پھر خواب دیکھنے والے کی۔ یہ تعریف دیگر خامیوں سے قطع نظر مبہم الفاظ پر مبنی ہے۔ تعریف کے منطقی قواعد میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ تعریف مبہم، پیچیدہ اور مترادف الفاظ میں نہیں ہونی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں معرف زیر تعریف (انشائیہ) ہی واضح نہیں ہے جس کی تعریف کی جا رہی ہے تو انشائیہ نگار کا لفظ کیوں کر واضح خیال کیا جا سکتا ہے اسی طرح اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرنا، اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کچھ اس طرح (گرفت میں لینا) انسانی شعور (انشائیہ نگار کا یا قاری کا) اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانا، مبہم اور پیچیدہ الفاظ ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بیان جدید غزل، افسانے اور ناول اور فینٹسی ناول اور جدلیاتی تنقید اور تحلیل نفسی کے ماہرین کی معالجاتی بیٹھکوں کے بارے میں بھی بغیر کسی تردد اور تامل کے درست ثابت کیا جا سکتا ہے۔"[۱]

ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد نظیر صدیقی اور محمد حسنین کی آرا کا مطالعہ کریں تو وہاں بھی کچھ اسی قسم کا انداز کار فرما نظر آتا ہے۔ نظیر صدیقی کی شہرت کی خاطر کے دیباچہ میں سے جو اقتباس دیا گیا اس میں سے طوالت سے بچنے کے لیے جو جملے حذف کر دیئے گئے تھے وہ بھی یہاں درج کئے جاتے ہیں ان کے بموجب انشائیہ۔۔۔

"وہ ادبی صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ ہوتا ہے اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ یعنی بالفاظ غالب لکھنے والے کی بے خودی میں ہوشیاری اور ہوشیاری میں بے خودی پائی جاتی ہے۔ یہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں کہیں سچ میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے اور کہیں جھوٹ میں سچ کی، یہ وہ صنف ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسرے کی پگڑی اچھالی جاتی بلکہ اپنی پگڑی اور دوسرے کا نام بھی۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں لکھنے والا صرف دوسروں کی کمزوریوں پر نہیں ہنستا بلکہ اپنی کمزوریوں پر دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں تفریح اور تنقید ایک دوسرے سے بغل گیر نظر آتی ہیں اور بصیرت اور ظرافت ایک دوسرے کی سگی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔۔۔۔"

جیسا کہ گزشتہ سطروں میں لکھا گیا نظیر صدیقی نے PARADOX کے ذریعہ انشائیہ کی خصوصیات واضح کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ خود انشائیہ میں نہ تو اس نوع کے تضادات کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور نہ ہی انشائیہ کے اسلوب کا رنگ ان سے چوکھا ہوتا ہے۔ اس طرح انشائیہ اگر انشائیہ نگار کی شخصیت کا ترجمان اور اس کے منفرد زاویہ نگاہ کا عکاس ہے تو پھر اس نوع کی "نیم دروں نیم بروں" قسم کی تعریفوں سے اس کے خصوصی ذائقہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی پھر یہاں بھی وہی بات نظر آتی ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریفوں میں بنیادی خامی تھی یعنی اسے دوسری اصناف یا اشیا پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے مثلاً طنز و مزاح اور پیروڈی کے بارے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے بلکہ نظیر صدیقی کی یہ سطریں تو انشائیہ کے برعکس اردو جدید کی تنقید پر بلیغ تبصرہ معلوم ہوتی ہیں:

---

[۱] [illegible]

"...... نہ صرف اپنا نام اور دوسرے کی پگڑی اچھالی جاتی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسرے کا نام بھی۔"

اسی طرح جب ہم یہ پڑھتے ہیں تو پطرس کے مزاج کا بنیادی وصف ذہن میں آجاتا ہے:

"...... لکھنے والا صرف دوسروں کی کمزوریوں پر نہیں ہنستا بلکہ اپنی کمزوریوں پر ہنستا بلکہ اپنی کمزوریوں پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔"

ویسے میرا خیال ہے کہ یہ سطریں لکھتے وقت نظیر صدیقی کے تحت الشعور میں ان کا اپنا انشائیہ "شہرت کی تلاش" ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نوع کی تعداد میں اسلوب کی خوبصورتی کے باوجود بات قطعی اور دو ٹوک نہیں کی جاتی جس کے نتیجہ میں ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے چنانچہ محمد حسنین جب انشائیہ کو ادب کی ایسی "کمین گاہ" قرار دیتے ہیں جہاں قلمکار جس پر چاہے تیر چلا سکتا ہے" تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا انشائیہ نگار ایک حساس ادیب اور سنجیدہ مزاج قلمکار ہونے کے برعکس 007 جیمز بانڈ ہے جسے ہز مجسٹی کی سیکرٹ سروس نے "LICENSE TO KILL" دے رکھا ہے کیونکہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انشائیہ نگار کو سات نہیں سیکڑوں خون معاف ہیں"۔۔۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ استعارے کے ذریعہ سے بات سمجھائی جا رہی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ استعارہ میں مفہوم کی گریز پائی ہی اسے علمی تعریف کے لیے ناموزوں بنا دیتی ہے۔۔۔ میں ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی اور ڈاکٹر محمد حسنین یا دیگر حضرات نے انشائیہ کے علمی پہلوؤں کو اجاگر کرنے یا اس کی تنقیدی اساس استوار کرنے کے لیے جو مساعی کی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اسی طرح ان حضرات کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود یہ امر اپنی جگہ مسلم کہ اس انداز کی شاعرانہ استعاراتی اور ڈھیلی ڈھالی تعریفوں کے باعث ہی انشائیہ کی بحث ایسی الجھی کہ اب تو انشائیہ لنڈے کا کوٹ محسوس ہونے لگا ہے جو نااہل ادیبوں کی ادبی ستر پوشی کے کام آرہا ہے۔

مشکور حسین یاد نے انشائیہ کی تکنیک اور اس سے وابستہ تنقیدی مباحث کو ممکنات انشائیہ میں سمیٹا ہے جو اس بنا پر اور بھی قابل توجہ ہے کہ اردو کی حد تک یہ انشائیہ پر پہلی باضابطہ تالیف ہے اور اس لحاظ سے علمی حلقوں میں اس کی اچھی پذیرائی بھی ہوئی۔ مشکور حسین یاد نے ایک کام یہ کیا کہ کتاب کی تحریر میں انشائیہ کا اسلوب کار فرما رکھا اور یوں ہلکے پھلکے انداز میں نئی بات کہی ہے مشکور حسین یاد انشائیہ کو ام الاصناف سمجھتا ہے اگرچہ یہ تصور نزاعی ہے لیکن اس طرح سے مشکور حسین یاد نے انشائیہ کو تخصیص انشائیہ کو ذرا سی ڈبیا میں بند کرنے کی بجائے اسے محیط بے کراں بنا دیا کیونکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی قائل ہیں:

"میں صنف انشائیہ کو ادب کی امکانی صنف کا نام بھی دیا کرتا ہوں۔ میرے خیال میں آئندہ بھی اگر کوئی نئی صنف ادب وجود میں آئی تو وہ انشائیہ کے بطن ہی سے وجود میں آئے گی۔"

شاید بعض اصحاب کے لیے یہ بھی متنازعہ فیہ ہو لیکن یہ بات کہنے کے لیے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا کریڈٹ تو مشکور حسین یاد کو ملنا ہی چاہیے۔

بات ہو رہی تھی انشائیہ کی تعریف کی تو اس ضمن میں بھی مشکور صاحب نے اچھی بات کہی ہے:

"میں سمجھتا ہوں کہ انشائیہ جس قدر آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز ہے یہ اسی قدر طرح طرح کی تعریفوں کے باعث الجھ کر رہ گیا ہے۔"

"...... انشائیہ تو سرتاسر ایک تخلیقی سرگرمی ہے اور یہی اس کی بھی اور حقیقی تعریف بھی کہی جا سکتی ہے۔"

لیکن اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ برقرار کہ "تخلیقی سرگرمی" کے بغیر تو کسی طرح کی بھی تخلیق ممکن نہیں پھر وہ انشائیہ سے ہی کیوں مشروط ہے؟

غلام جیلانی اصغر اچھے انشائیہ نگار ہیں لیکن جب انشائیہ پر لکھنے بیٹھے تو انھوں نے بھی اسی استعاراتی انداز میں بات کی چنانچہ اپنے مضمون "انشائیہ کیا ہے؟" میں فرماتے ہیں۔

"انشائیہ ایسے ہی اتنا ہی مختلف ہے جتنی کہ حالی کی مسدس انیس کے مرثیہ سے۔ حالانکہ ہیئت کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ انشائیہ میرے نزدیک ایک ایسی ادبی تحریر ہے جو اپنے انداز سے پہچانی جاتی ہے جگر نے انشائیہ کے بارے میں ایک عمدہ شعر کہا ہے:

[illegible] ممکنات انشائیہ، ص ۱۳۰

[illegible] ممکنات انشائیہ، ص ۴۳

[illegible] ممکنات انشائیہ، ص ۳۹

حسن وہی ہے حسن وہ ظالم   ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

اگر سارا انشائیہ آپ کی گرفت میں آجائے تو یہ اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔ انشائیہ میں گریز کی کیفیت ہوتی ہے آپ جب ایک سرے سے اسے پکڑنا چاہتے ہیں تو دوسرا سرا آپ کی انگلیوں سے پھسل جاتا ہے۔"

انشائیہ اور رپتے میں جو امتیاز کیا گیا ہے وہ غالباً اس لیے کہ غلام جیلانی اصغر مزاج اور ذائقہ کے لحاظ سے انگریزی ایسے اور انشائیہ کو جداگانہ سمجھتے ہیں اس حد تک کہ ہیئت اور تدبیر کاری میں مماثلت کے باوجود بھی وہ ان دونوں کو جداگانہ تصور کرتے ہیں، یہ تصور جس منطقی مغالطہ پر استوار ہے، اگر اسے دیگر اصناف ادب پر بھی منطبق کیا جائے تو افسانہ اور شارٹ سٹوری، خاکہ اور سکیچ، سفرنامہ اور ٹریولوگ وغیرہ سب دوئی کے شکار نظر آئیں گے۔ ادبیات کا ایک سیدھا سادا اصول ہے ایسا اصول جس کی کارفرمائی عالمی سطح پر بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ اصناف کی تکنیک، اصول اور تدبیر کاری وغیرہ سب کچھ مستعار ہوتا ہے لیکن تخلیق کار اپنی دھرتی کی خوشبو سے اسے اپنا لیتے ہیں۔ شعورِ عصر سے اسے اپنی زندگی کا استعارہ بنایا جاتا ہے اور پھر یوں معرضِ وجود میں آنے والی تخلیق روحِ عصر کا آئینہ بنتی ہے اگر انشائیہ محض ایسے کا چربہ رہتا تو اس نے ایک صدی کا تخلیقی سفر طے نہ کیا ہوتا۔ اتنی طویل مدت گزار لینے کا یہی مطلب ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہماری ذہنی زندگی کی بعض ضروریات کی تکمیل ہوتی رہی ہے۔ اور پھر سو باتوں کی ایک یہ کہ مخمس مسدس ہی رہتی ہے اگر حالی اور انیس نے اسے مختلف موضوعات کے لیے استعمال کیا تو یہ امر اضافی ہے اساسی نہیں!

غلام جیلانی اصغر صاحب "اوراق" میں چھپنے کے باوجود اچھے انشائیہ نگار ہیں، میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ انشائیہ کی معنویت کو بند مٹھی کی ریت بنانے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں اگر تو ان کے ذہن میں تجریدی انشائیہ کا کوئی مخصوص تصور ہے تو اور بات ہے لیکن اگر وہ مروج انشائیہ ہی کی بات کر رہے ہیں تو نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں تو غلام جیلانی اصغر سمیت باقی حضرات کے انشائیہ بھی سمجھ میں آتے ہیں بلکہ اکثر انشائیے تو محدود بلکہ MYOPIC مشاہدہ اور روکھے پھیکے اسلوب کی بنا پر اتنے روکھے پھیکے ہوتے ہیں کہ انہیں رعایتی نمبر دے کر پاس کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر ڈاکٹر وزیر آغا کا سارا انشائیہ "گرفت میں آجاتا ہے تو غلام جیلانی اصغر کے استدلال کی رو سے یہ اس کی "ناکامی کی دلیل" ٹھہرے گی ــــ جبکہ میں ایسا سمجھنے کو تیار نہیں ــــ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے!

یہ جو انشائیہ کے بارے میں اتنا خلط مبحث ہے تو اس کی ایک وجہ اسی انداز کی تعریفیں بھی بنتی ہیں اور جیسا کہ ابتدا میں لکھا گیا انشائیہ کی اس نوع کی تعریفیں بالعموم انشائیہ نگاروں نے کر رکھی ہیں اور یہ بالعموم ایسی ایسی تعریفیں ہیں جو ان کے اپنے انشائیوں کا جواز بنتی ہیں اس لیے شاعرانہ اسلوب اور استعاراتی پیرایہ سے بچ کر سیدھی سادی نثر میں اگر انشائیہ کی تعریف مقصود ہو تو پھر میرے خیال میں ــــ "بیدار ذہن کے حامل تخلیقی شخصیت کی زندگی کے تنوع سے زندہ دلچسپی کے بامزہ نثر میں مختصر اور لطیف اظہار کو انشائیہ قرار دیا جاسکتا ہے"!

اس تعریف میں بیدار ذہن اور تخلیقی شخصیت انشائیہ نگار کی ہے، زندگی کا تنوع موضوعات کی کثرت کا ضامن ہے۔ زندہ دلچسپی نظر کی تازہ کاری کی مظہر ہے، بامزہ نثر انشائیہ کے اسلوب کا وصفِ خاص ہے اور لطیف اظہار نزاکتِ بیان سے وابستہ ہے اگر مزید گہرائی میں جائیے تو ذہن انشائیہ نگار کی تعلیم، مطالعہ اور استدلال سے عبارت ہے جبکہ اس کے تمام نفسیاتی کوائف کے مجموعہ کا نام شخصیت ہے اس لیے اگر ذہن بیدار ہو اور شخصیت تخلیقی ہو تو یقیناً انشائیہ کے لیے "یہ مٹی بڑی زرخیز ہے" ــــ دیگر تعریفوں کی مانند شاید یہ تعریف بھی جزوی صداقت کی حامل ثابت ہو لیکن یہ اس بنا پر قابلِ توجہ ہے کہ ایک تو بات سمجھ میں آجاتی ہے اور جو بات سمجھ میں آتی ہے وہی کہی گئی ہے اس لئے اس کی ایک سے زائد تشریحات یا توجیہات ہو نہیں ہوسکتیں لہٰذا کثرتِ تعبیر کی بھول بھلیاں میں معنی کی ڈور کا سرا گم نہیں ہو جاتا، اور پھر انشائیہ کے ضمن میں زاویۂ نگاہ، اختصار، اسلوب اور حسنِ بیان پر بالعموم زور دیا جاتا ہے تو وہ سب اس تعریف میں آجاتے ہیں اور پھر اس تعریف کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نہ تو ٹانگوں میں سے جھک کر دیکھنا پڑتا ہے، نہ عقب میں دیکھنا پڑتا ہے اور نہ ہی سر کے بل کھڑے ہونے کی ضرورت ہے، اور نہ ہی کیچڑ میں لوٹ لگانی پڑے گی۔

رشید اعجاز

یقین

جھماکا نور کا ہوگا
لہو کو اک نئی رنگت ملے گی
پسینے کی جگہ موتی ڈھلیں گے
جگہ فرماں رواؤں کی، غلاموں کو ملے گی
ابلتے چوک ہوں یا تنگ کوچے
ہوا کی جانچ ہوگی
کڑی دھوپوں کی شاخیں
قطاریں چھلنیوں کی چھانٹ دیں گی۔
مضر کرنوں کو ہوں گے قید خانے
کھلی آنکھوں کو زہر اور زہر پیکر!
نہ دے پائیں گے دھوکہ
جگہ فرماں رواؤں کی غلاموں کو ملے گی
جھماکا نور کا ہوگا ....!
مرے منکر مجھے پہچان لیں گے۔ ■

احتیاج

کتاب ہو کہ نظر،
حسن ہو کہ داغِ نہاں
نگاہ و نقد ضروری ہے ارتقاء کے لئے
سراپا -!
عکس کا محتاج ہے زمانے سے
ہر ایک یگ میں ضرورت رہی ہے شیشے کی
مشاہدہ ہے کہ اس امر سے مفر ہی نہیں
مگر یہ ٹوٹتے سالوں کی پیش گوئی ہے
کہ لوگ کانچ پہ پارہ نہیں چڑھائیں گے
اب آنے والے،
چٹانوں کو آزمائیں گے۔ ■

خود تسلّط کردہ فرض

جاننا،
کچھ بھی نہیں!
اہلِ خبر میں خود کو گنوانا ہے بس!!
بے خار آنکھیں کھلی رکھنے کا نام
"فکر کی بازی" ہے چونکانے کا کھیل،
یعنی ہوں مہرے کسی کے اور ہو اپنی بساط
"غور"، ہے وہ شورِ لقمہ، دیر ہضم
نشۂ فرسودہ سے نایاب تک جس کا اثر،
"واہمہ" کا خود تیقّن تک سفر!
ماحصل -؟
اک منزلِ تسکیں
فقط اپنی سمجھ!
اور سمجھنا کیا ہے؟
اک کارِ دگر
خود تسلّط کردہ سمجھانے کا فرض ■

چونک

آج جب
ایک چھوٹی سی رنگین چڑیا، مری نیند پر
وار کرکے اڑی
میں نے
بستر سے اٹھنے کی خاطر، نئی صبح کے
خیر مقدم میں..
جی دار کروٹ جو بدلی
— بڑے پھول کے تولیے میں تمہیں
غسل خانے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر
یاد آیا -!
بہت دن ہوئے
سوچ کی کوئی اترن ملکیروں کی باہوں میں
آئی نہیں!!
میں نے،
تصویر کوئی بنائی نہیں -!!! ■

ایرا غیرا

اندرجیت لال ● ڈی - ۱۴ - گل مہر پارک - نئی دہلی - ۴۹

ایرا غیرا کوئی عجیب و غریب یا نامعلوم اصطلاح نہیں، اسے ہم عام آدمی کے لیے روزانہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں، اس کی ہم معنیٰ اصطلاحیں اور بھی ہیں جیسا کہ للّو پنجو۔ نتھو خیرا۔ ہما شما۔ ایسا ویسا عام آدمی وغیرہ وغیرہ، یہ اس شعر سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

انسانی سماج میں اگر میں غلط اندازہ نہیں لگاتا تو اکثریت یہاں تک کہ نوّے پچانوے فی صد انسان عام آدمی یا للّو پنجو کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ گویا میں اور آپ بھی للّو پنجو ہو سکتے ہیں - در اصل عام آدمی اور وی آئی پی یا بڑے آدمی کی یہ تفریق انسان نے خود پیدا نہیں کی۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ انسانی سماج میں بیشتر نتھو خیرا یا ہما شما ہوتے ہی ہیں، اب جو ہیں سو ہیں اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یوں ایک ماہر نفسیات کے الفاظ میں دنیا دو ڈھیروں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایرا غیرا اور بڑا آدمی۔

اس ایرا غیرا کو آپ ایک غیر اہم۔ حقیر۔ ناچیز۔ مسکین۔ خاکسار۔ منکسر المزاج۔ ڈرپوک۔ سادہ لوح۔ نادان اور ایک طرح سے چھوٹا آدمی بھی کہہ سکتے ہیں۔ خاکساری اور سادہ لوحی کی خوبیاں خامیاں اس کی زندگی کے ساتھ بڑی مضبوطی سے جُڑی ہوتی ہیں۔ شرافت اس کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ یہ ہر ایک سے دستِ تعاون بڑھاتا ہے۔ دوستی استوار کرنے کی سعی بھی کرتا ہے اپنا نقصان کر کے دوستی بھی نبھاتا ہے۔ میلوں ٹھیلوں میں جوق در جوق شریک ہوتا ہے۔ مندروں مسجدوں میں زیادہ بھیڑ بھاڑ اسی کے دم سے رہتی ہے۔ پبلک جلسوں میں یہ دریاں بچھاتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر نصب کرتا ہے۔ زمین پر بیٹھتا ہے۔ چلچلاتی دھوپ یا بھاری برسات میں چلتا چلاتا ہر بھیڑ بھاڑ میں جا پہنچتا ہے۔ تقریب کی رونق دوبالا کر دیتا ہے۔ پھر بڑے شوق سے نعرے لگاتا ہے۔ جھنڈے اٹھاتا ہے۔ انہیں بلند کرتا ہے یا بڑے آدمی کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے یا پیر فقیر یا گورو مہاراج اگر تشریف لا رہے ہوں تو ان کے استقبال کے لیے ہاتھ باندھ کر قطار میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان کی آمد پر پرنام کرتا ہے۔ کئی بار ڈنڈوت پرنام بھی کرتا ہے۔ بیوی بچوں سے بھی پرنام کرواتا ہے اور صدقے میں ان کی نیک بختی کے لیے بڑے آدمی یا وی آئی پی سے شاباشی کا ملتجی ہوتا ہے۔ پرشاد یا آشیر واد یا شفقت کی تھپکی پر نازاں ہوتا ہے۔ ایرا غیرا کا کردار خالص سونے کی طرح ہے۔ اس میں کوئی کھوٹ نہیں۔ وہ بالعموم جلدی رام ہو جاتا ہے۔ اور دوسروں کی دل و جان سے عزت کرتا ہے، خواہ اس کی عزت نہ بھی ہو۔

ایرا غیرا اپنے حلقے میں خوش رہتا ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے قدرت کی کہ اس کے وسائل کم اور مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ مسائل اس کی محنت سے کچھ زیادہ حل بھی نہیں ہو پاتے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مسائل ساتھ ساتھ قدرت کے سہارے کچھ نہ کچھ حل ہوتے بھی رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ پھر بڑھتے بھی رہتے ہیں۔ اس کی داد دیجیے کہ ایرا غیرا مسائل سے دل گیر نہیں ہوتا۔ انہیں ان کے حال ہی پر چھوڑ دیتا ہے یا پھر خدا پر کہ وہی سب کے مسائل حل کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ انسان تو ایک دوسرے کے لیے مسائل زیادہ پیدا کرتا ہے اور حل کم کرتا ہے تو پھر کیوں نہ مسائل کا علاج خدا کے ہاتھوں میں سونپ کر یا اس کی ذات پر بھروسہ کر کے اطمینان کر لیا جائے۔ سو ایرا غیرا جیسے تیسے اطمینان کر لیتا ہے۔ اور ایسا نظر ساری عمر بنائے رکھتا ہے۔

ایرا غیرا کی خواہش بڑی محدود اور اس کی ضرورتیں قلیل ہوتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُس کا سوچ و ادراک بھی، وہ زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملاتا۔ شیخی نہیں بگھارتا اپنی کھال میں سمٹا سمٹا رہتا ہے۔ دل و دماغ کو پھیلاتا نہیں، اور اپنی سیدھی سادھی زندگی میں مست ملنگ وقت کاٹ دیتا ہے۔ ایرا غیرا بالعموم اپنے حقوق حکومت سے یا سماج سے یا اپنی برادری سے نہیں منواتا — دراصل وہ اتنے مطالبات رکھتا ہی نہیں جو پہلے تو اُسے خود پریشان کریں، اور پھر ان مطالبوں کے لیے وہ دوسروں کو پریشان کرتا پھرے۔ اس لیے وہ نہ تو پریشانی پیدا کرتا ہے اور نہ ہی پریشانی میں الجھنا چاہتا ہے بلکہ وہ ایک سیدھی سادھی پگڈنڈی پر ساری عمر چلتا رہتا ہے رواں دواں جس کی راہ میں کوئی نشیب و فراز نہیں۔ زندگی میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں۔ بس سیدھی سپاٹ زندگی۔ نہ زیادہ الجھن نہ زیادہ پریشانی۔ یہ ایرا غیرا بالعموم زندگی میں آتے ہی مفتوح ہو جاتا ہے۔ اپنا سرِ نیاز بڑے لوگوں کے سامنے خم کر دیتا ہے۔ وہ اتنا دبا دبا رہتا ہے کہ ہر لمحہ بڑے لوگوں کو برتری کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

ایرا غیرا کی زندگی میں رنگینی زیادہ تر نہیں ہوتی اور شاید ہو بھی نہیں سکتی جب دولت کی فراوانی نہ ہو، وقت کٹی کے لیے کوئی رنگین مشاغل نہ ہوں۔ فرصت فراغت نصیب میں ہوئی نہیں بس کولہو کے بیل کی طرح انسان چلتا ہی رہے تو وہ طیارے کی اڑان، کاک ٹیل پارٹی، پائن ایپل کی پیسٹری، گدے دار تکیہ پر آرام، اور عیش و عشرت کے معنی کیا جانے۔ بس یوں کہیے ایسے زندگی میں بہار کم اور خزاں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اچھا ہے کہ ایرا غیرا زیادہ تر ایسے تضاد پر سوچ سوچ کر دیوانہ نہیں ہو جاتا۔ وہ مست ملنگ آدمی ہے۔ اللہ جس حال میں اُسے رکھے اسی میں خوش رہتا ہے۔ اُدھر بڑے آدمی یا وی آئی پی بنگلوں میں رہتے ہیں۔ کم محنت سے یا بغیر محنت کیے بڑھیا سے بڑھیا غذا کھاتے ہیں، ان کی زبان و لہجہ میں عتاب اور رعب ہوتا ہے۔ وی آئی پی اپنی حیثیت کی تراش خراش میں ہمہ تن لگا رہتا ہے۔ دن بھر اپنی مصروفیت کے اوقات معینہ طور پر صرف کرتا ہے اس کے اقدار اس کی زندگی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر وہ آسائشوں میں گھرا رہتا ہے۔ جہاں جہاں جاتا ہے اپنے جاہ و جلال، علم و حکمت سے یا سماجی و سیاسی رعب سے دندناتا پھرتا ہے۔ دوسروں کو ہیچ و کمتر اور اپنے کو افضل سمجھتا ہے۔ اور اپنے قول و فعل سے اپنی برتری جتلاتا رہتا ہے۔ اس طرح زیادہ تر دوسروں کو ذہنی کوفت دے کر اپنا رقیب یا دشمن بنا لیتا ہے۔ آخر شیخی بگھارنے والے کو کون حقارت سے نہیں دیکھتا؟ وی آئی پی آخر ایرے غیرے کی ضد بھی تو ہے۔

وی آئی پی کو اعصابی امراض، ذہنی الجھن اور زندگی میں بڑھنے کی امنگ عمر بھر پریشان رکھتی ہے۔ اس کے جی حضوری اور خوش آمدی اس کے مال و دولت پر موج اڑاتے ہیں، ڈاکٹر اور وکیل بڑے بڑے بلوں کی رقم اس سے ہتیاتے ہیں، پنڈت ملّا بھی ایسے لوگوں کو سنکٹ سے نجات دلانے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں، اپائے بتاتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ روپیہ پیسہ کو خرچ کرا کے کئی ڈرامے کیے جاتے ہیں، غرضیکہ وی آئی پی کی زندگی اس کے وقار، مال و دولت کی فراوانی اور ساکھ پر قائم ہوتی ہے نہ کہ شخصی اوصاف اور اخلاقی کردار پر۔ ہمارے سماج میں ایک کمزوری بنیادی طور پر یہ ہے کہ وی آئی پی کی عزت کی جاتی ہے۔ اور بالعموم ایرے غیرے کی ہمت یا جسارت نہیں ہوتی کہ وی آئی پی کی امارت سے یا اس کے اقتدار سے ٹکرا سکے یا اسے چیلنج کر دے اور اگر چوک سے ٹکرا جائے تو اپنا سر پھوڑ لے گا۔ اسی لیے وہ پہاڑ سے سر نہیں پھوڑنا چاہتا ہے۔

ایرا غیرا بالعموم لالچی نہیں ہوتا۔ حسد بھی کم پالتا ہے بغض و کینہ کر کے بھی اسے خاطر خواہ فائدہ نہیں ملتا۔ کیونکہ اس کی اپنی اتنی اوقات نہیں ہوتی اسی لیے ایرا غیرا ماپ تول کر اور سنجیدگی سے زندگی نہیں بسر کرتا اور وی آئی پی برابر ماپ تول میں لگا رہتا ہے۔ ایرا غیرا خدا سے ڈرتا ہے اس پر ایمان لاتا ہے وہ پرارتھنا اور عبادت سے اپنے معبود کو یاد کرتا ہے تا کہ اس کے پاپ دُھلتے رہیں وہ بخشا جائے وہ بڑے آدمی کی طرح کسی جنت گم گشتہ کی تلاش میں نہیں رہتا بلکہ ہر لمحہ جنت الفردوس کے تصور میں منہمک رہتا ہے۔ ادھر وی آئی پی دھرم کرم کے نام پر بڑے بڑے پروگرام رچاتا ہے۔ کیرتن پر روپیہ پیسہ خرچ کرتا ہے دوسروں کو بھی اس میں شریک کر لیتا ہے آخرت و عاقبت کس کی نیک ہو گی یہ تو وقت بتائے گا۔ ابھی تو دوڑ جاری ہے۔ کہ روحانیت کا میدان کون مارے گا یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ باوجود زندگی کی محنت کش کٹھنائیوں کے

ایرا غیرا کے طبقے سے بھی بڑے بڑے فن کار۔ ادیب ۔ مغنی ۔ شاعر مصور۔ سائنس داں اور مفکر ہو گذرے ہیں۔ اور یہ واقعی بہت بڑی بات ہے کہ جہاں ایرے غیرے کو اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور انہیں بروئے کار لانے کے مواقع نہ بھی نصیب ہوں ۔ اس پر بھی وہ بازی مارے تو پھر آپ مرحبا نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے ؟ یا پھر اسے مقدر کا سکندر کہہ لیجئے ۔

کیا کمال ہے کہ ایرا غیرا کے طبقے کی ایک متعین کلاس ہے اور ایک طرح سے متعین نہیں بھی ۔ خود بڑے آدمی یا وی آئی پی میں بھی بڑی وسعت ہے ۔ ایک مخصوص طبقہ ہر وقت وی آئی پی نہ ہو لے نہ ہو سکتا ہے ۔ ایک بات صاف ہے کہ بڑا آدمی یا وی آئی پی جب نازل ہوتا ہے تو خود اً ایرا غیرا کو فتح کر لیتا ہے ۔ ان کے سر اپنے پائے پُر غرور میں جھکا دیتا ہے ۔

جاوید وششٹ ایک جگہ لکھتے ہیں "قلعہ معلیٰ والے دلی والوں کو للو پنجو سمجھتے ہیں امراء وزراء کے سامنے خدام للو ہو جاتے ہیں ، تو بادشاہ سرمست کے حضور میں امراء و وزراء ایرا غیرا ہو کر رہ جاتے ہیں ، اور اگر کوئی جابر اور طاقت ور بادشاہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دے تو بادشاہ سلامت بھی ہما شما ہو کر رہ جائیں ، اسی طرح خانقاہ میں پیر و مرشد اور اللہ میاں کے آگے انبیاء بھی للو پنجو ہو کر رہ جاتے ہیں "۔ یہ تو یہاں تک تجربے میں آیا ہے کہ ایک وی آئی پی دوسرے وی آئی پی کو ایرا غیرا اور اسی طرح ایک ایرا غیرا ایک وی آئی پی کو ایرا غیرا سمجھتا ہے ، یہ کیا عجیب منطق ہے ؟

جمہوریت کے اس دور میں ایرے غیرے کی مٹی خراب تو ہے ہی ہاں اس کی قدر و منزلت ووٹ سے ضرور قائم ہے ۔ امیدوار اس اس سے درد مندانہ اپیل کرتا ہے پھر ایک دن امیدوار ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایرے غیرے کی چوکھٹ پر سجدہ کرتا ہے ، اس کی منت سماجت کرتا ہے ، اسے روپے پیسے یا کام دھندے کا لالچ دیتا ہے ۔ لیکن یہ سب دنیاداری ہے ۔ عارضی خوشامد ہے ، اس لیے ایرا غیرا اس جھانسے میں نہیں آتا اور اپنی اوقات کو سمجھتا ہوا بڑے آدمی کے بلند بانگ دعووں یا وعدوں کا اعتبار نہیں کرتا ۔ اگر اعتبار کر لیتا ہے تو بعد میں پچھتاتا ضرور ہے ۔ بڑے آدمیوں میں لیڈر لوگ ، پونجی پتی ، بڑے بڑے صنعت کار ، بیورو کریٹس ، نئے و پرانے راجہ مہاراجہ اور رئیس آ جاتے ہیں ۔

وی آئی پی کی ساری سرگذشت اپنے ہی کو بڑا بنانے میں صرف ہوتی ہے ۔ اس بڑے پن کے حصول کے لیے وہ ہر قیمت پر عمر کے آخری دنوں تک تگ و دو کرتا ہے ۔ دوسروں کو گرانے ہٹانے اور مٹانے میں سرگرم رہتا ہے ۔ تاکہ آپ شخصیت میں کچھ اور بلندی پیدا کر سکے ۔ ناموری حاصل کر سکے ۔ اپنا وقار بڑھا سکے ۔ چنانچہ اسے ہر لمحہ احساس برتری کھائے جاتا ہے اور وہ اپنی عظمت کو منوانے میں مصروف رہتا ہے ۔ دراصل وہ ہر وقت سماج میں آگے بیٹھنے اور دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی فکر میں گھرا رہتا ہے یوں سمجھئے ، وی آئی پی یا بڑا آدمی تمام تر ساز و سامان کے ساتھ اپنے زمانے پر سواری کرتا ہے اور بڑا نازاں ہو کر ادھر ادھر دیکھتا مسکراتا چلا جاتا ہے اس احساس کے ساتھ کہ ہم سوار ہیں اور آپ ایرا غیرا لوگ پیدل یا پیادہ خاک دھول سے نکلے ابھرے اور اسی میں پل کر بڑے ہوئے اور ہم ٹھہرے آپ سے افضل و برتر آدمی ۔

ایرا غیرا بڑا حقیقت پسند ہوتا ہے ، وہ اپنی صلاحیتوں و خدمات کے عوض کچھ طلب نہیں کرتا ۔ اور اپنے قول و فعل سے کچھ ایسا نہیں کر گذرتا جو انصاف و سچائی کے تقاضوں پر پورا نہ اترتا ہو ، یا جس سے کسی فرد یا سماج کا نقصان لاحق ہوتا ہو ، ادھر وی آئی پی دوسروں کے سہارے یا ان کو کہنی مار کر آگے نکل جاتا ہے ، اپنی شخصیت میں استواری اور عظمت حاصل کرنے کے لیے کئی بار غلط لائحہ عمل بھی اختیار کر لیتا ہے اب لطف کی بات یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش جن ایرے غیرے کے بل بوتے پر وہ آگے بڑھتا ہے ۔ ایک دن انہی محسنوں کے دل و دماغ پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ایسے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے پھر دل و جان سے جٹ جاتا ہے ایک دن ان کے دل و دماغ پر آخر کار چھا ہی جاتا ہے ۔ دراصل بڑا آدمی شاعروں کی اس خودی کی پروردگار ہے ۔ جس پر اردو کے ہزاروں اشعار لکھے جا چکے ہیں ۔ اس کے برعکس ایرا غیرا اس انا کو کمال مستعدی سے مار گراتا ہے جس کی سب مذاہب میں پُر زور تلقین کی گئی ہے ۔ ایک نے اس اخلاقی درس کو اپنایا دوسرے نے بالکل پرواہ ہی نہ کی ۔

ایرا غیرا کبھی کبھی خوش نصیب بھی بن جاتا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎ میری گفتگو عوام سے ہے ۔
مصور کو دیکھئے ایرے غیرے کے مرقعے بنا کر نمائش لگاتا ہے ۔

[۱۶ ؛ صفحہ ۴۴ پر دیکھیے]

ضمیر درویش

سورج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا میں
اک دشتِ بے کنار کو سر کر رہا تھا میں

للکارتی تھی مجھ کو بلندی درخت کی
ٹوٹے ہوئے پروں پہ نظر کر رہا تھا میں

آیا تھا قید ہو کے سکندر کے سامنے
زنجیر کو بھی تیر و تبر کر رہا تھا میں

ہر موڑ پر تھا میرے لئے ایک پل صراط
یعنی صداقتوں کا سفر کر رہا تھا میں

وہ میرے سر کی خیر مناتے بھی کس طرح
اک آہنی فصیل کو در کر رہا تھا میں

کرنا تھا دوستی کا مجھے ہر طرح دفاع
وہ تیغ زن تھا سر کو سپر کر رہا تھا میں

● گنبد والی مسجد، کسرول، مراد آباد (یوپی)

جے۔ ڈی۔ احمر

یوں زمانے میں مری فکر کے پیکر پھیلے
جیسے سورج کی ضیا صبح کو گھر گھر پھیلے

ننھے کیڑے کی طرح رینگ رہا ہے قطرہ
عین ممکن ہے کبھی بن کے سمندر پھیلے

تیسری جنگ مرے جسم کے اندر ہو گی
یوں مری سوچ کے ہر سمت نہ لشکر پھیلے

کچھ تو میدانِ عمل چھوڑنے والو سوچو
بند کمرے میں اگر خوف کا بستر پھیلے؟

اڑ کے جائے گا کہیں دور یہاں سے احمر
کھلتی کلیوں کی طرح اس کے بھی شہپر پھیلے

● روڈ نمبر ۵، آزاد نگر، جمشید پور (بہار)

اظہار مسرت

شدّتِ احساس کا اتنا سا ہے ردِّ عمل
ایک کاغذ اک قلم، کچھ روشنائی، اک غزل

بھیڑ" اور پیش نظر تنہائیوں کا اشتہار
ایک دریا، ایک صحرا، ابر پارے اور جبل

نادر و نایاب ہے آوارگی کا کینوس!
ایک جھرنا، اک ندی میں، تیری چاہت، اک کنول

تیری خواہش، تیری خوشبو، تیری قربت، تیری یاد
ایک عادت، اک وظیفہ، اک تصور، اک عمل

سلسلہ مجبوریوں کا بادشاہت تک گیا!
مفلسی، محنت، پسینہ، سنگ مرمر کا محل

منزلیں چومیں گی بڑھ کر تیرے قدموں کو ضرور
پُر یقیں رہ، عزم خو بن، کر ارادہ، اٹھ کے چل

شعر کے پردہ میں دل کی دھڑکنیں ہیں معتکف
اذنِ اظہارِ مسرت، درد کا نعم البدل

● پوسٹ بکس نمبر ۲، بیکانیر ۔ ۳۳۴۰۰۱ (راجستھان)

انور شمیم

خموشی جیسے دعوت کی طرح ہے
علامت بھی وضاحت کی طرح ہے

قیامت سے بہت پہلے ہی شاید
یہاں سب کچھ قیامت کی طرح ہے

رہے گی کربلا کی چیخ کب تک؟
سوال آنکھوں میں حیرت کی طرح ہے

صدا کانوں تلک تو آ رہی ہے
مگر اندھی ہدایت کی طرح ہے

کبھی خوشبو، کبھی بارش کی بوندیں
وہی شئے جو اذیت کی طرح ہے

نظر میں اب بھی اک منظر پرانا
کسی خوشخط عبارت کی طرح ہے

وہی "تو" ہو بہو، اگر تجھ کو سوچوں
بہت واضح، حقیقت کی طرح ہے

تعلق سب ہیں کاروبار جیسے
نہ کچھ بھی ماں کی شفقت کی طرح ہے

اذیت ہی اذیت دے گئی ہے
انا بھی اک مصیبت کی طرح ہے

● صدر بازار، پوسٹ آفس اور ضلع سمستی پور ۸۴۸۱۰۱ (بہار)

الپن

محمد اسد اللہ
ایوت پورہ۔ ڈوبر۔ وارڈ۔ ضلع امراوتی (مہاراشٹر)

جانے کیوں محبت کے ذیل میں کیوپڈ کا تیر صدیوں سے تیر بہدف نسخہ کی طرح استعمال ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں آج تک کسی کو پن PIN سے استفادہ کی نہیں سوجھی۔ الپن جو نہ صرف دو دلوں کی طرح دو کاغذ کو جوڑتی ہے بلکہ کاغذ کے سینے میں اتر کر تیر نیم کش کی خلش بھی جگاتی ہے یوں تو کاغذ گوند سے بھی جوڑے جا سکتے ہیں مگر یہ کرسی اور لیڈر جیسا خالص سیاسی ATTACHMENT ہے یہاں خلش صفر ہوتی ہے کیونکہ آج کل سیاست صفر سے ہندسہ برآمد کرنے اور ہندسہ کے آگے صفر کی لمبی قطار لگانے کا دلچسپ کھیل ہو گئی ہے۔ بچوں کی قطار البتہ ممنوع ہے۔ یوں تو صفر کے معنی بھی خلش ہی ہوتے ہیں جبکہ وہ جیب میں ہو۔

الپن بھی صفر ہی کی طرح حقیر اور پر تحقیر ہے۔ کوڑے دان کی طرح صفر کے بھی دن بدلتے ہیں جب وہ کسی ہندسے سے ملتا ہے۔ اس تقریب خانہ آبادی میں صفر بھی وقتی طور پر دولہا کی طرح اچانک اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ صفر کسی ہندسے سے مصافحہ کرنے میں کامیاب ہو جائے (سیاسی اصطلاح میں گٹھ جوڑ کر لے) تو اس کے بعد وہ جتنے صفروں کو اپنا ہمدم بنائے گا خود اس کی ذات میں ہر قاب کے بر لگتے چلے جائیں گے۔ لیکن آدمی کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ صفر میں سے برآمد ہوتا ہے مگر خود صفر نہیں ہوتا۔ ماضی اور حال کے کاغذ کو جوڑتا ہے اور کسی دن ان اوراق پارینہ سے نکل کر راہی ملک عدم ہو جاتا ہے۔ تب وہ اپنے پیچھے ایک بہت بڑا صفر چھوڑ جاتا ہے۔ آدمی زندگی بھر کی تگ و تاز کا حاصل اور قابل دید چیز بنتا ہے کہ وہ اپنے پیچھے کتنا بڑا صفر چھوڑ گیا۔ آدمی الپن ہی کی طرح کبھی انگلیوں میں چبھ کر خلش جگاتا ہے اور کبھی قفل سے نکل کر۔

ہر شخص کے اندر پن ہی کی طرح ایک کٹیلی نوک ہوا کرتی ہے جو دشمنوں کی صحت ناساز ہو جائے تو مزاج پرسی کے کام آتی ہے اسی قسم کی ایک نوک دوستوں کے پاس بھی ہوتی ہے جو کچھ زیادہ کٹیلی اور مستعد ہوتی ہے جن صاحبان کے پاس اس قسم کی نوک نہیں ہوتی وہ الپن سے بھی زیادہ حقیر ہوتے ہیں۔ ان کا بھرتا لذیذ بنتا ہے جو ہمارے معاشرے کی مرغوب غذا ہے۔ اسی لئے ایسے لوگوں کو سماج کا ہر فرد چاروں طرف سے کچل کچل کر لذیذ بھرتا بناتا ہے اور چٹخارے لے لے کر کھاتا ہے۔

پن کا ننھا سا وجود عشق ہی کی طرح امن کی بھی علامت ہے امن کا مطلب PIN DROP SILENCE ہے اسی کے حصول کے لئے جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے تاحال ہر زمانہ میں امن کی شدید ضرورت رہی ہے جنگل اپنا قانون چلانے کے لئے امن کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ کیروسین کی طرح امن و سکون کبھی نایاب ہو جاتا ہے اور کبھی مہنگا بکنے لگتا ہے اسی طرح جنگوں کے زمانے میں مارکیٹ سے کیروسین کا رو پوشی اختیار کر لینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنگیں امن اور کیروسین کی باہمی سازش ہی کا نتیجہ ہے امن کی فراہمی کے لئے ہی جنگیں لڑی جاتی ہیں دراصل بغیر جنگ کے امن کیسے ہو سکتا ہے لاشوں کے انبار پر وحشت ناکی کے کہت گاتا ہوا PIN DROP SILENCE ہی امن کا مقصود ہے اس پر آشوب مشینی دور میں الپن کی فریاد اسی کے لئے تیسری جنگ عظیم کا سناٹا طاری کر رہی ہے۔

لیکن پن سے اتنا انتظار نہ کھینچا گیا۔ اس نے اپنے وجود کے ایک سرے پر نوک اگالی بالکل اسی طرح جیسے بکری کے سینگ نکل آتے یا جیسے میاں خوجی بار بار اپنی قرولی نکال لیا کرتے تھے۔ پن کی ننھی سی نوک ہو یا میاں خوجی کی قرولی جہاد زندگانی کا بڑا سہارا ہے جیسے چیونٹی مرتے مرتے کاٹ لے جیسے کسی بھیانک خواب کی ہولناکی سے گھبرا کر ہم ایک خطرناک چیخ کے دامن میں پناہ گزیں ہو جائیں اسی لئے چھریوں زدہ لنڈ نے ہاتھوں میں تھمی ہوئی چھڑیاں جسموں کے شکستہ ٹکڑوں سے زیادہ کرتے ہوئے حوصلوں اور جذبوں کے ڈاک ٹکٹوں کو سنوارنے کا کام دیتی ہیں۔

الپن بھی میرے لئے ایک ایسے ہی حوصلہ کا سرچشمہ ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب خبروں میں بم اور میزائلوں کے دم بدم دھماکے سن کر میں

خود کو خرگوش کے قالب میں محسوس کرتا ہوں اور بار بار چونک پڑتا ہوں۔ اسی طرح دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوں BOSS کوئی آسودہ کشش ہے جو میرے مانند سکون کی گھڑیاں بجھائے گیا ہے اور گھر میں منتظر بیوی بچے زلزلوں اور قحط سالی کے خوف سے عبارت ہیں۔

کاش! ٹیبل پر بکھری ہوئی الپنوں کی سی بے فکری ہمارا بھی مقدر ہوتی کہ کسی نے زور زبردستی کی تو "نوک مبارک" سلامت ہے مجھے فقط اپنی ہی خیریت نیک مطلوب ہے۔ انگلی میں پچھے سے چبھ کر خواب غفلت سے نہ جگایا تو کچھ نہ کیا میرے خیال میں پھول کے محافظ کانٹے اور الپن کی نوک سب ہیل کے سینگوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں میں بھی اسی حسب د

نسب سے ہوتا تو کل ہی جب ایک قرض دار نے میری غیرت کو للکار دیا تھا ایک آدھ بم سے ساری دنیا کو ترقی کی آخری منزل پر پہونچا دیتا۔ اوکی کچھ کر نہیں سکتا تو سوچوں کے گچھے نوچ نوچ کر ہی سکون پالیتا ہے۔

میں کسی کا یہ بیان سنتا ہوں کہ ہمارے پاس اس قدر موثر ہتھیار موجود ہیں کہ پلک جھپکتے ہی ساری دنیا کو ختم کر دیں تب خیال آتا ہے کہ میاں نوچی اب بھی بقیدِ حیات ہیں نوچی کی قردلی سے الپن کی نوک تک ایک ہی سلسلہ ہے۔ نوچی ہمارے اندر ہر دور میں زندہ رہے گا۔ نوچی زندہ باد الپن زندہ باد۔

بقیہ صفحہ ۴۴ ایرا غیرا

ورڈز ورتھ جیسا عظیم شاعر ایک دیہاتی لڑکی پر نظم لکھتا ہے۔ فلم میں راجہ کا ولی عہد ایک دھوبن سے عشق فرماتا ہے سماج میں ایک کمڈیپی گوالن سے شادی کرلیتا ہے۔ ایرا غیرا بڑے بڑے ادبی شاہ کاروں میں ناولوں میں ایک اہم کردار بنتا ہے۔ لیڈر مرتبے کی بات اس کو خطاب کرکے سمجھاتا ہے۔ جمہوریت اس کے بل بوتے پر چلتی ہے۔ اس کی اکثریت ہی میں اس کی قدر چھپی ہوئی ہے اگرچہ یہ اپنی اہمیت سے واقف نہیں۔ وہ خود واقف ہو نہ ہو۔ انسانی نظام میں انفرادی و مجلسی دونوں سطحوں پر اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ایرا غیرا عوام کا نمائندہ نہیں بلکہ خود عوام ہے۔ پبلک ہے۔ جنتا ہے بلکہ جنتا جناردھن ہے۔ اکثریت تو اس کی ہے ہی اور اکثریت بھی بھاری، اس رائے میں کوئی شک نہیں۔

بڑے آدمی یا وی آئی پی اور ایرے غیرے یا عام آدمی کے موازنے سے یہ نتیجہ قدرتی ہے کہ آج کی دنیا میں وی آئی پی کی جگہ ایرے غیرے کی زیادہ ضرورت ہے۔ ایسا عام آدمی جو دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اپنی ناک سے سونگھتا ہے۔ اپنے کانوں سے سنتا ہے اپنے دماغ سے سوچتا ہے اور پھر حتی الامکان سماج کی ہر طرح سے خدمت بجا لاتا ہے چونکہ ایسا انسان خود بڑا بننے کی خواہش سے پاک ہوتا ہے جو سماجی نقطۂ نظر سے یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور آپ یہ تسلیم کرلیں کہ ایرا غیرا ہمارے سماج کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس لیے اسے گمنام۔ غیر اہم حقیر و ناچیز نہ جانیئے، بلکہ اس کی قدر کرنا سیکھئے۔ یہ انسانی اور قومی فریضہ ہے۔ ایرا غیرا۔ زندہ باد۔ عام آدمی پائندہ باد۔

ذکی بیلگرامی

خبر ہے اپنی نہ کچھ ہوش راستوں کا ہے
خمار سر میں ابھی پچھلے موسموں کا ہے
رگوں میں گردِ مہ و سال جم رہی ہے اور
لہو کو شوق بدن کی سیاحتوں کا ہے
خزاں سے کب کوئی شکوہ رہا پرندوں کو
عذاب ان پہ تو شاداب موسموں کا ہے
نواحِ جاں میں مہکتے ہیں تیرے لمس کے پھول
بدن پہ قرض بہت تیری خوشبوؤں کا ہے
کوئی جواز تو ہوگا تیری اداسی کا؟
ہمارے سر پہ تو سایا کٹے دنوں کا ہے
یہاں پہ سرحدِ شہرِ سخن تمام ہوئی
اب اس کے آگے تو جنگل علامتوں کا ہے

بی/۲۲ ۲-۲-۴۹۲ کامت واڑی روڈ۔ بال سیٹھی کھیت۔ حیدرآباد-۴۴

معصوم نظر

نکلو گھٹن کے خول سے روکو یہ قتلِ عام
گھوڑے ہوس کے ہوگئے ہر سمت بے لگام
گھبرا کے شب کی کوکھ سے سورج نکل گیا
روحیں بھٹکتی بھیڑ میں گم ہوگئیں تمام
آکر ہر ایک صحن میں ٹھہری سکون سے
دن بھر کی دوڑ چھوڑ کے لوٹی گھروں میں شام
مشکل کی اک ڈھلان سے رشتے پلٹ گئے
احباب دیکھتے رہے آیا نہ کوئی کام
قاتل بدن کے شہر میں ٹھہرے گا ایک پل
اک اک لہو کی بوند سے لے گا وہ انتقام

شاہد منزل۔ لال پیدہ، ڈونگر پور ۳۱۴۰۰۱ (راجستھان)

نعمان شوق

کوئی پتّی شجر آشنا ہی نہ تھی
تیز اتنی کبھی تو ہوا ہی نہ تھی
بھیک میں جس نے سارا سمندر دیا
اس جزیرے پہ کوئی گھٹا ہی نہ تھی
بٹ گئے دل بھی پرکھوں کی دولت کے ساتھ
ورنہ قسمت میں گھر کی تبا ہی نہ تھی
خود کو مجرم سمجھنا پڑا تھا مجھے
میرے حق میں کسی کی گواہی نہ تھی
وہ مزاجاً بھی مجھ سے الگ تھا بہت
وجہِ ترکِ تعلق انا ہی نہ تھی
کورے کاغذ سے لوگوں کے چہرے رہے
حادثوں کے قلم میں سیاہی نہ تھی

دائرۂ ادبیہ۔ مہادیوا۔ آرہ-۸۰۲۳۰۱ (بہار)

عبّاس دانا

سر پہ بادل! کوئی ٹھہرا نہیں! سایہ بن کر
ہم تو ہر دور میں تپتے رہے صحرا بن کر
جس کو دیکھو! ہے اسے! تشنہ لبی کا شکوہ
ہم تو چھپ جائے ترے شہر میں دریا بن کر
ایک مجرم کی طرح! جینے کا فن سیکھ لیا
ورنہ اس دور میں مر جاتے فرشتہ بن کر
ہم بکھر جائیں گے کب؟ ٹوٹ کے، معلوم نہیں
وقت کے ہاتھ میں رہتے ہیں! کھلونا بن کر
اس کو خاموش ہوئے! ایک زمانہ گذرا
اب بھی رہتا ہے سماعت میں وہ نغمہ بن کر
کوئی آواز نہ دے! بیتے ہوئے لمحوں کو
"عہدِ ماضی کبھی لوٹا نہیں" فردا بن کر
زخم سب بھر گئے! جب آنکھ لگی تھی دانا
خواب میں آیا تھا اک شخص مسیحا بن کر

۵۔ فتح منزل ستیہ دیو کیمیکل کے پیچھے، پرتاپ نگر روڈ۔ بڑودہ

قوتِ صدا

مجید جمال

۲۰ - سیکٹر بی، دہلی گیٹ، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر)

ہم بی ایس سی سال اول کے طالب علم تھے۔ یہ بڑا ہی منحوس سال ہوتا ہے۔ جہاں کئی طلبا کے ڈاکٹر بننے کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم بہت ہی لگن سے پڑھ رہے تھے۔ فزکس کی کلاس چل رہی تھی۔ پروفیسر صاحب فزکس کا ایک سبق قوتِ صدا SOUND ENERGY اور توانائی کے بنیادی اصول پڑھا رہے تھے۔ کچھ طالبات افسانہ لکھ رہی تھیں دل بے قرار کا، ایک طالب علم سو رہے تھے تصور جاناں لئے ہوئے اور ہم غلطی سے بڑے دھیان سے سبق سن رہے تھے جو کچھ کچھ ہماری سمجھ میں بھی آ رہا تھا اس طرح کی غلطی ہم سے شاذ و نادر ہی سرزد ہوتی تھی۔ ہماری ایک خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی بات ذرا سی بھی ہماری سمجھ میں آ جائے تو پھر باقی باتیں ہم نہیں سنتے اور خود ہی اس کو کھینچ کر رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں۔ اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ فزکس جیسا خشک مضمون تو ہماری سمجھ میں کیا خاک آتا۔ عام طور پر یہ مضمون ہمارے دماغ میں سے یوں گزر جاتا ہے جیسے صاف شفاف کانچ میں سے روشنی گزر جاتی ہے لیکن اس دن ہمارا دماغ کچھ گدلا گدلا سا تھا اسی لئے توانائی والی بات ہماری ناقص عقل میں سما گئی۔

پروفیسر صاحب فرما رہے تھے: توانائی ایک ایسی شئے ہے جسے نہ پیدا کیا جا سکتا ہے نہ تباہ، البتہ اس کی قلب ماہیت کی جا سکتی ہے۔ جیسے کوئلے سے چلنے والے ریل کے انجن۔ ٹھیک اسی طرح آواز یا صدا بھی ایک توانائی ہے۔ اس کی ایک تبدیلی تو برسوں سے ہو رہی ہے۔ جیسے آواز کو برقی لہروں میں تبدیل کر کے ریڈیو کی مدد سے دوبارہ آواز میں تبدیل کرتا ہے۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی ہے ہم فوراً کھڑے ہو گئے اور پھر کلاس میں ایک سوال داغ دیا۔ سر! کیا آواز کو میکانکی، روشنی یا بجلی کی توانائی میں بدلا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے جو کچھ ہم بولتے ہیں اس کا مصرف چاہے کچھ ہو جو کیا ہم اس قوت کو کسی کام میں لا سکتے ہیں وہ ضائع تو نہیں ہوتی لیکن ہمارے ہاتھ بھی نہیں آتی۔ کسی اور توانائی میں تبدیل کر سکتے ہیں؟ پروفیسر صاحب نے برجستہ جواب دیا "کیوں نہیں، کیوں نہیں، آپ اس پر ریسرچ کیجئے گا۔ فی الوقت جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اسے پوری طرح سمجھ لیجئے۔" کلاس میں قہقہہ بلند ہونا ہی چاہا کہ ہنسنے والوں کا منہ نوچ لیں مگر اپنا سا منہ لیکر بیٹھ گئے۔ ہمارا زرخیز دماغ اب سبق سننے کی بجائے توانائی کی تبدیلی پر غور و خوض میں مصروف ہو گیا۔ ہم نے کلاس میں بیٹھے بیٹھے ریسرچ کے نتائج اور اس پر ملنے والے نوبل انعام تک تمام مراحل طے کر لئے۔ اگر قوت صدا کو میکانکی روشنی یا بجلی کی توانائی میں تبدیل کر لیا جائے تو ملک میں توانائی کے بحران کو بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے ہم نے بھی پہلی مرتبہ بہت ہی سنجیدگی سے غور کیا ہے کہ سبزی مارکیٹ میں ہونے والے تمام شور شرابے کو صدا بند بیٹری میں محفوظ کر لیا جائے۔ اور سبزی خرید کر آپ اپنی اسکوٹر یا سائیکل میں یہ آلہ لگا دیں جس کی تبدیلیت سے آپ کی سائیکل یا اسکوٹر خود بخود چلنے لگے تو آپ کو کتنی مسرت اور عجب ہوگی۔ اگر یہ تخمینہ آپ کو مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تو چلئے ہم اسے کچھ کم کئے دیتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ گھر آکر سبزی پکانے کے لئے جو ایندھن درکار ہوتا ہے وہ سبزی کے ساتھ آپ کو مفت مل گیا۔ ہم اپنی زرخیز سوچ کے دھارے پر بہہ نکلے۔ ہماری قوت سماعت ضرورت سے زیادہ حساس تھی ہم ذرا سی آواز پر چونک جاتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا۔ ہمارے چاروں طرف لوگ بولتے ہیں تو یوں جیسے بقیہ سب بہرے ہوں۔ کوئی رسم نہیں جو چیخنے چلانے کے بغیر مکمل ہو جائے۔ زندگی کا آغاز بچے کے رونے اور عزیز و اقارب کی خوشی سے بھری کلکاریاں ملنے سے ہوتا ہے۔ موت پر ماتم ہوتا ہے۔ پیشہ ور ماتم کرنے والوں کا ترنم اور سر تال میں رونا کانوں کو تکلیف دینے کے علاوہ توانائی کو ضائع کرنا ہے۔ SOUND POLUTION اس وقت ہمارا مضمون نہیں ہے بلکہ ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح ہم آواز کی توانائی کو ضائع کرتے ہیں۔ چند صبح کا آغاز منہ میں انگلیاں ڈال کر پانی کی ٹنکی کو کھنگالنے سے ہوتا ہے۔ رات کا اختتام چوکیدار کے ڈنڈے کی کھٹ کھٹ اور جاگتے رہو سن کر ہوتا ہے

صبح سے شام تک دوردرشن، ریڈیو، اخبار خاموشی سے ہم تک نہیں پہنچتے چونکہ ہم کو توانائی کی تبدیلی کا پورا اندازہ ہوگیا تھا ہم ہر شخص کو یہ سمجھانے لگے کہ قوت گویائی کو ضائع کرنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کے پس پردہ ہمارے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ ساری دنیا کو یہ معلوم ہوجائے کہ آواز کی توانائی کی قلب ماہیت کا خیال سب سے پہلے ہمارے دماغ میں آیا تھا لہٰذا ہم نے نیوٹن اور گلیلیو کی طرح بہکی بہکی باتیں شروع کر دیں۔ اور اب اس امید پر بقیہ زندگی گذر رہی ہے کہ جب بھی کوئی آواز کی تبدیلی توانائی کے تجربے میں کامیاب ہو گا آدھے نوبل انعام کے حق دار ہم ہونگے اس شوق میں کیا کیا رسوائی نہ ہوئی۔ ہم نے آواز کی تبدیلی توانائی پر ایک مضمون انگریزی رسالے میں چھپوادیا۔

مضمون کا چھپنا تھا کہ ہم سا تویں آسمان پر پہنچ گئے۔ ہمارے ایک معاصر دوست نے ہماری صلاحیت کا اقرار کیا تو ہمیں بہت اچھا لگا ورنہ عام طور پر ہم ان کی اور وہ ہماری صلاحیت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے پھر یہ شک بھی ہوا کہ دوست تعریف شاید اس لئے کر رہے ہیں کہ انعام ملنے پر وہ فخر کریں گے کہ ہم ان کے دوست رہے ہیں۔ ہماری حالت سائنس میں وہی ہوئی جو بشر نواز کی ادب میں ہوئی ہے

ہر قدم پر نارسائی کا تماشہ کیجئے
کب تک آخر ایک پرچھائیں کا پیچھا کیجئے

اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ صبح ہماری چڑ بن گئی ہے دوپہر میں جب ہم قیلولہ کرتے ہیں اور ردی والا چلاتا ہے۔ ردی۔ ردی۔ ردی ے۔ا۔ل۔ا تو ہمارے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ہمیں لگتا ہے کہ وہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے ہم نے ہمت کی اور ردی والے کو بلا کر کہا کہ تم بلا وجہ چیخ چیخ کر اپنا گلا خراب کرتے ہو۔ گھر گھر جا کر ردی کیوں نہیں خرید لیتے۔ اس طرح تمہارے گلے پھیپھڑوں اور ہماری قوت سماعت کو سکون ملے گا۔ ہمارے گھر نہ آنا کہ ہم اپنے رسالے اور اخبار نہیں بیچتے بات سن لی گئی۔ کئی دن کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ردی والا ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ہم نے پوچھا کیا ہے؟ "ردی ہے کیا صاحب"؟ ہم نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا بتا تو دیا تھا ہم ردی نہیں بیچتے ردی والے نے دست بستہ جواب دیا ممکن ہے ارادہ بدل دیا ہو"۔ چلا نہ بند کر دیا آہستہ سے پوچھنا میرا کام ہے" شادی بیاہ۔ غزل، بھجن، فلمی گانے، لاؤڈ اسپیکر ہمارے لئے عذاب جان بن گئے۔ ہمارے پیچھے اگر کوئی ہارن کو ایک سے دو مرتبہ بجادیتا تو اسے ہم اپنی ہتک تصور کرنے لگتے توانائی کا بیجا استعمال اب ہمارے اندر چھپے سائنسداں کو قطعی پسند نہ تھا۔ اگر کوئی شخص بغیر سائلنسر کی سواری پر ہمارے پاس سے گذر جاتا تو ہمیں لگتا ہم سے چھیڑ خانی کر رہا ہے۔ نجانے کیسے ہمارے پڑوسیوں کو ہماری اس کمزوری کی اطلاع ہو گئی۔ ان میں ایک صاحب ایک پرانی موٹر سائیکل جس کا سائلنسر بھی نہیں تھا خرید لائے۔ روز صبح دو تین سو کک مار کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے۔ امتحان کا زمانہ تھا دو تین دن کے بعد ان کی یہ حرکت ہمارے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بجائے کک مار کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کے ہم سے دھکا لگوا لیا کریں۔ دوسرے دن صبح بڑی مستعدی کے ساتھ پڑوسی نے ہم سے پوچھا آپ آتے ہیں یا دھکا مارنے یا میں کک ماروں۔ ہمارا جی چاہا کہ پڑوسی کو کک اور موٹر سائیکل کو دھکا لگا دیں پھر بطور حفظ ماتقدم موٹر سائیکل کو دھکا لگانے پر اکتفا کیا۔ ہم پھر نیک نیتی سے عرض کرتے ہیں جو ہم سے ہو گا ضرور کریں گے مگر ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے بھائی بند سائنسداں بھی کوشش کریں اور ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی صداؤں اور آہوں کی توانائی کو جمع کریں تاکہ کسی کارآمد مقصد کے لئے ان کو تبدیل کر کے ملک و قوم کی خدمت کی جائے۔ ہمیں بھرپور یقین ہے کہ اس طرح ہمارا توانائی کا بحران کسی حد تک دور ہو سکتا ہے اگر تبدیلی توانائی صدا کے آلات ایجاد ہو گئے تو الیکشن کی تقریروں سے لیکر پارلیمنٹ میں ہونے والے ہنگامے مفید ثابت ہوں گے۔ مچھلی و مینا بازار، سبزی منڈی، پارلیمنٹ اور اسمبلی توانائی کے بھنڈار بن جائیں گے۔ پٹرول پمپ پر بھیڑ کم ہو جائے گی ملازم، بیوی، ڈرائیور، پارٹنر اور منسٹر کا انتخاب اس بنیاد پر ہو گا کہ ان کی گفتار کی رفتار کیا ہے۔ گفتار کا غازی جسے ماضی میں علامہ اقبال مرحوم نے بہت ذلیل کیا تھا۔ ان حالات میں کردار کے غازی سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو گا۔

ذرا تصور تو کیجئے ادھر کسی نے بولنا شروع کیا ادھر آپ کا پنکھا چلنے لگا انگیٹھی سلگ گئی۔ بلب روشن ہو گیا۔ کون کیا بولتا ہے اس سے زیادہ آپ کی توجہ اس بات پر ہو گی کہ وہ کتنا بولتا ہے۔ لیڈر، مولوی، طالب علم، عورت اور قوال کو ان کے شوق کا مناسب معاوضہ ملا کرے گا۔ اور وہ جو اردو شاعری میں کسی محترم نے فرمایا تھا کہ ۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق ۔
سچ تو یہ ہے سود مند بھی ثابت ہو گا۔

مومن خان شوق

کتاب

ورق ورق پڑھے چلو
سسکتی، ادھ جلی ہوئی حیات کی علامتیں
سطر سطر میں منتشر، حرف حرف نقوشِ جاں
مہکتی پھول جیسی بھولی بسری زندگی
خمار، خواب، جام، عکس
عکس، جام، خواب، لب
کرن کرن کلی کلی، بدن کے ذائقہ کا لمس
خاک و باد و برق ـــــ
خوف، خواہشوں کے رنگ
ایک باب، ایک فصل، ایک واقعہ، غزل
فسانہ پھر روایتیں، نقد و تبصرہ کہ فن
پرانے لوگ چیتھڑے، لباس نو بہ نو سجے
خدا کا خوف، نیکیاں، عذاب اور پھر عذاب
بھوک، کھیت، بالیاں
چاند جیسی روٹیاں
لڑکیاں پہیلیاں
حکایتیں، صحیفے، تذکرے ورق ورق سبھی پڑھو
کتاب آئینہ دکھائے گی
تمہیں وہی بنائے گی
جو تم نہیں ہو۔

● اشرف ویلا ۲۳-۷-۳-۱۱ ملے پلی حیدرآباد-۱

محمد علی اثر

کتنی راتوں سے جل رہا ہوں میں
جاگتے زخم کا دیا ہوں میں

مجھ سے خود کو بچا کے یوں نہ نکل
زندگی تیرا آئینہ ہوں میں

میرے لہجے میں بولتا ہے تو
اپنی آواز سن رہا ہوں میں

ریزہ ریزہ بکھر رہی ہے حیات
لمحہ لمحہ پگھل رہا ہوں میں

تو نے کانٹا سمجھ لیا تھا مجھے
دیکھ پلکوں پہ کھل رہا ہوں میں

عمر رفتہ کے ریگزاروں پہ
نقش پا اپنے ڈھونڈتا ہوں میں

● کاشانۂ اثر ۲۲۶/۹-۴-۲۰ چوک، حیدرآباد-۲

مصطفیٰ مومن

مرے خیال کا موسم گذرنے والا تھا
دل و نگاہ میں خنجر اترنے والا تھا

جلا کے راکھ کیا اس نے سبز موسم کو
وہ سرخ پھول جو خود بھی بکھرنے والا تھا

چھپا لیا ہے مناظر کو اپنی آنکھوں میں
زمانہ حادثہ بن کر گذرنے والا تھا

یہ میرے اشک بہت کام آگئے ورنہ
مرے قریب ہی صحرا ابھرنے والا تھا

بچا لیا مجھے میرے سکوت پیہم نے
میں لفظ لفظ فضا میں بکھرنے والا تھا

لرز رہے تھے ستارے فضا میں، ہلچل تھی
نہ جانے کون فلک پر ابھرنے والا تھا

● رحمت گنج، پالی ٹیکنک - دھنباد-۱ - ۸۲۶

بڑا آدمی

شیخ سلیم احمد

۱۵۰، بستی حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

ہم بڑا آدمی نہیں بن سکے۔ بننا چاہتے تو بن جاتے لیکن ایک خوف ہمارا پیچھا کرتا رہا کہ ہر کمالِ را زوال کے مصداق اگر ہم بھی بڑے بن جاتے تو ایک دن پستی کا منہ بھی دیکھنا پڑتا۔ بلندی کے مزے نہیں اڑائے تو اپنی پستی کے دکھ، دکھ نہیں لگتے۔ بلکہ انہیں دکھوں میں ہم خوش ہیں، مست ہیں۔ محلوں سے پھر جھونپڑی میں لوٹنا پڑتا تو زندگی اجیرن ہو جاتی۔

بڑا آدمی بننے سے بہت سے کامیاب اور آزمودہ فارمولے یا نسخے مع ترکیب استعمال ہمیں آفر بھی ہوئے۔ مگر اپنی جبلّی کمزوریوں کی وجہ سے وہ ہمیں قابل قبول نہ ہوئے۔ مثال میں اپنے دوست کے ساتھ ہوئی اس سلسلے کی گفتگو یہاں نقل کرتے ہیں۔

نامعلوم شخص کی ایک قبر تھی۔ جس کے گرد ایک چھوٹی سی چہار دیواری بھی تھی۔ ہمارے ایک ہمدرد جو ہمارے حال زار میں اظہار افسوس کرتے رہتے تھے ایک روز ہمارے پاس آئے اور یہ برادرانہ مشورہ دیا کہ ہم اس مزار پر قبضہ کر لیں اور یہ بشارت دی کہ نہ صرف یہ کہ میری حالت بہتر ہو جائے گی بلکہ آنے والی میری سات پشتوں کی دنیا و عاقبت بھی سنور جائے گی۔ آج کل یہ ایک منافع بخش کاروبار ہے۔ شہر کی زیادہ تر قبروں پر قبضہ ہو چکا ہے، بس چند مواقع باقی ہیں، جن میں سے ایک سنہری موقع ٹکڑوں میں ہے۔ دولت مند بننے کا یہ آخری موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا تو ہاتھ ملتے بلکہ مسلتے رہ جاؤ گے۔ ہمارے خیر خواہ نے اس میدان کے اور بہت سے رموز پر سے پردہ اٹھایا جو ہمارے لیے باعث حیرانی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اب شہر کی قبروں کو کرایہ یا ٹھیکہ پر بھی دیا جا رہا ہے۔ بعض اہم و نامعلوم قبروں پر پگڑی بھی چل رہی ہے۔ قبر جتنی پرانی ہو اتنی ہی مہنگی پگڑی۔ شہر کے معزز لوگ اس تجارت میں پڑ گئے ہیں خوب پیسہ کما رہے ہیں۔ ہم نے یہ سب سن کر کہا کہ ہم مُردوں کا کاروبار نہیں کریں گے۔ ہمارے دوست بہت ہی ڈھیٹ تھے۔ انہوں نے فوراً ہی ایک اور تجویز پیش کی۔ "مسجد کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ہم کچھ سمجھے نہیں۔ انہوں نے مزید وضاحت کی۔ شہر میں بہت سی مسجدیں ویران و اجاڑ پڑی ہیں۔ ان میں سے ایک پر قبضہ کر لو۔ فائدوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ مرمت کے لیے چندہ وصول کرو۔ ارد گرد پڑی زمین پر قبضہ یونہی ہو جائے گا۔ کچھ غنڈوں کو دکانیں کھلوا دو۔ افیم اور چرس کا کاروبار مسجد کی آڑ میں بہت اچھا چلتا ہے۔ راتوں رات امیر ہو جاؤ گے۔ ہم نے احتجاج کیا۔ اللہ کے گھر سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے ہمارا ضمیر تیار نہیں۔ آپ کے مشورہ کے لیے شکریہ۔ ہمارے دوست گہری سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے اپنے ترکش سے ایک تیر اور چھوڑا۔ آپ کو خبر بھی ہے کہ آج کل تاریخی کتابوں کی فروخت بڑھ گئی ہے۔ یا اللہ بزنس کا یہ کون سا گوشہ ہے۔ لوگ اس بات کی تلاش میں ہیں کہ کس کے انتقال کو کتنا عرصہ ہوا ہے سو سال پہلے کے انتقال شدہ لوگوں کی کھوج ہو رہی ہے تاکہ انہیں پھر سے زندہ کیا جائے۔ سو سالہ۔ دو سو سالہ۔ چھ سو اور سات سو سالہ جشن منائے جا رہے ہیں۔ اس پیشہ میں شہرت کے ساتھ پیسہ بھی اچھا ہے۔ تاریخ کے صفحات سے میں تمہیں چند نام تجویز کرتا ہوں۔ تم ان میں سے ایک نام چن لو۔ میرے دوست میرے چہرے پر پسندیدگی کے کوئی آثار نہ پاتے ہوئے اگلے پلان پر کود پڑے۔ اچھا بھئی۔ ان مُردوں اور قبروں کو چھوڑو۔ تمہیں شاید مُردوں سے ڈر لگتا ہے۔ کہ بھوت بن کر تمہیں پریشان کریں گے۔ اگرچہ یہ کاروبار سب سے زیادہ سیف ہے کہ مُردے آپ کی آمدنی میں سے حصہ بٹانے پر اصرار

نہیں کرتے۔ شاید تم ایسی تجارت چاہتے ہو کہ جس میں کوئی حصہ دار بھی ہو۔ تو کسی زندہ کو پکڑ لو۔ کوئی بڑا مولوی۔ بڑا سیاستداں۔ شاعر یا ادیب جس کی دھاک ہو یہ دیکھو کر وہ ساٹھ سال سے اوپر ہو چکا ہے۔ اس کا ساٹھ سالہ جشن منا ڈالو۔ مگر اس کے لیے موصوف سے معاہدہ کرنا پڑے گا کہ منافع کا کتنا فیصد صاحب جشن کو دینا ہوگا۔ یہ فیصد کم سے کم ہو اس کا دار و مدار آپ کی تاجرانہ صلاحیت پر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حضرات یہ بھی واچ کرتے ہیں کہ کون بڑا آدمی کونسی ہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ دل کتنی بار فیل ہو چکا ہے۔ چراغ زندگی کب تک جلا رہ سکتا ہے اور یہ لوگ اس حساب سے تیاریاں کرتے ہیں۔ ان کے خود بڑا بننے کا یہ بھی ایک سنہری موقع ہے۔ اخباروں میں موت کے کالم پر نظر رکھتے ہیں، جیسے ہی کسی بڑے آدمی کی موت کی خبر چھپی یہ لوگ اپنی دکانیں چمکانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنے دوست کی باتیں غور سے سنتے رہے مگر ہمارا دوست جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی تجویز ہمیں قابل قبول نہ ہوگی۔

مہربان دوست پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر ڈوبا رہ کر پھر ابھرا اور یوں گویا ہوا۔ کوئی تنظیم بنا ڈالو۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے نام پر عربوں سے پیسہ مل جائے گا۔ ارے تمہیں کیا معلوم کتنے لوگ کروڑپتی دارب پتی بن گئے۔ انجمن، سوسائٹی، کمیٹی، ایسوسی ایشن وغیرہ کچھ بھی بنا لیجئے۔ رجسٹرڈ کرا لیجئے۔ سال میں ایک دو جلسے کیجئے۔ چند غریب بچوں کو وظیفے دیجئے۔ کوئی فرضی اسکول کھول لیجئے۔ غیر ملکوں کا دورہ کیجئے۔ ڈالر اور دیناروں سے لدے پھندے وطن لوٹیے۔ مزے ہی مزے۔ عیش ہی عیش۔ اب لوگ نہیں چاہتے کہ غریبی ختم ہو۔ جہالت دور ہو۔ یہ جہالت اور غریبی کو پروان چڑھاتے ہیں تاکہ ان کے نام پر اپنے محل کھڑے کر سکیں۔ ملک سے غریبی اور جہالت ختم ہو گئی تو ان کے کاروبار ٹھپ ہو جائیں گے۔ ان کی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ دوست کچھ تو کرو۔ ایسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو کچھ بھی نہ ہو گا۔ تمہارے چاروں طرف جو غریبی کی دلدل ہے۔ اسی میں سے کنول کے پھول کی طرح ابھرو۔ دیکھتے نہیں کہ پیر صاحب کا محل تو تعمیر ہو گیا مگر محل کے گرد جہالت و غربت کی تاریکی کے سائے زیادہ گہرے ہو گئے۔ تمہاری بنیادی خرابی یہی تو ہے کہ تم جڑ پر کلہاڑا بجانا چاہتے ہو۔ اصل مرض کو دور کرنا چاہتے ہو۔ اس وقت مسلمان اور اسلام مردِ بیمار کی طرح ہیں۔ ان کے علاج کے نام پر جتنا پیسہ چاہو جمع کر لو۔ بیمار کو مرنے دو اپنی فکر کرو۔

جب ہم نے اس تجویز پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تو دوست بہت جھنجھلایا۔ پھر کیا کرو گے؟ اسمگلنگ کرو گے؟ چور بازاری کرو گے؟ افیم، حشیش، چرس بیچو گے؟ آخر کیا ہے تمہارے دل میں؟ ہم نے اپنے دوست کی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے کہا۔ ہم کتابیں چھپوا کر بیچنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسی کتابیں جو اس ملک میں فکری انقلاب لائیں۔ لوگوں کی حالت بہتر ہو۔ ان کا معیار زندگی بلند ہو۔

تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے۔ تم دوسروں کا معیار زندگی بلند کرنے کی بات کرو گے تو غریبی کی دلدل سے کبھی نہ نکل سکو گے۔ ہم خاموش رہے۔ ہم اگر اسے بتاتے کہ ایسا میگزین شائع کرنا چاہتے ہیں جو اندھی تقلید، توہم پرستی۔ مذہب کے نام پر استحصال کے خلاف جنگ کرے گا تو محترم دوست اور بھی چراغ پا ہو جاتے۔ یہ ہم جانتے تھے لیکن ہمارا یہ دوست بھی ڈھیٹ ہی تھا، وہ ہر محاذ پر ڈٹا رہا۔ میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا!

کتابوں سے دلچسپی ہے تو سیکس پر کتابیں لکھوا اور چھاپو۔ عورتوں کی ننگی تصویروں والا میگزین نکالو۔ تعویذ گنڈوں اور کرامات والی کتابیں بھی آجکل بہت چل رہی ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

اس سے تو یہ بہتر ہو گا کہ ہم چائے کی دکان کھول لیں۔ ہم نے ذرا جوش میں آ کر کہا۔

تم کوئی بھی ڈھنگ کا کام کرنے کے اہل نہیں ہو۔ تمہارے مزاج میں ٹیڑھ ہے۔ اچھا ایک تجویز اور ہے۔ پالٹیکس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ آج کل یہ کاروبار بھی خوب چل رہا ہے۔ آسان بھی ہے۔ جب کوئی کچھ نہیں بن پاتا لیڈر بن جاتا ہے۔ اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرو۔

اس کے بعد ہمارے دوست نے کئی نام گنائے جو دوسرے شعبوں میں کچھ نہیں کر سکے تو سیاست میں آ گئے۔ خوب چمکے۔ معمولی لوگ تھے۔ کیا سے کیا بن گئے۔ نہ کسی قابلیت کی ضرورت۔ نہ کوئی سند درکار ہے۔ زیادہ پیسے کی بھی ضرورت نہیں۔ عقل بھی نہیں چاہیئے۔ بلکہ بالکل نہیں چاہیئے۔ تاریخ کا ایک سچا واقعہ بیان کیا کہ کسی ملک کی راجدھانی میں نائی کی ایک ایسی دکان تھی جو کھوپڑیوں کی صفائی کا کام کرتا تھا۔ ایک وزیر اپنی کھوپڑی کی صفائی کے لیے

دکان پر آیا۔ نائی نے کھوپڑی تو صاف کر دی مگر ایک گدھے کی کھوپڑی غلطی سے وزیر کی گردن پر لگ گئی۔ کچھ دنوں بعد نائی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وزیر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ حضور غلطی ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں کہ غلطی سے آپ کی کھوپڑی بدل گئی۔ آپ کی کھوپڑی یہ ہے جو آپ کی گردن پر لگی ہے وہ ایک گدھے کی کھوپڑی ہے۔ وزیر موصوف نائی کی یہ بات سن کر مسکرائے اور کہا۔ اب اسے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کھوپڑی کو پہن کر پہلے سے زیادہ کامیاب ہوں۔ بادشاہ اب مجھے زیادہ پسند کرنے لگا ہے۔ دوست نے بات کو منطقی موڑ تک پہونچاتے ہوئے کہا

تم تو پھر بھی عقلمند انسان ہو۔ پالیٹکس میں آؤ گے تو عقل کچھ کم ہی کرنی پڑے گی۔ بلکہ اب تو زندگی کے ہر شعبہ میں اس شے کا استعمال غیر ضروری ہو گیا ہے۔

دوست نے اپنے تمام حربے ناکام ہوتے دیکھے تو ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے بولا۔

تاریکی کے جانور ہو۔ تاریکی ہی میں خوش رہتے ہو۔ کبھی بھی بڑا آدمی نہیں بن سکو گے۔ بڑا بننے کے جراثیم تم میں نہیں ہیں۔

زرِ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری جولائی ۱۹۸۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ ازراہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۔ہم روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

شاعر کے لئے نایاب تصویریں، تحریریں اور خطوط ارسال کیجیے۔ ہم آپ کے شکریے کے ساتھ انہیں شائع کریں گے اور بہ حفاظت آپ تک پہنچا دیں گے۔

کیف احمد صدیقی

- نام: احتشام علی صدیقی ابن عبدالمنان صدیقی
- قلمی نام: کیف احمد صدیقی
- پیدائش: ۱۲ جنوری ۱۹۴۳ء سیتاپور
- تعلیمی لیاقت: ایم اے (اردو)، ایم اے (تاریخ)، بی ایڈ، ادیب کامل۔ میونسپل انٹر کالج میں اردو اور تاریخ کا درس دیتے رہے۔
- کتابیں شعری مجموعے: دینی نظمیں۔ مکتبہ الحسنات رامپور۔ سدا بہار نظمیں (بچوں کے لئے) ۱۹۸۰ء
  گرد کا درد۔ ۱۹۷۰ء نامی پریس لکھنؤ۔ سورج کی آنکھ ۱۹۷۵ء
  بارِ دیگر ۱۹۷۷ء۔ حساب لفظ لفظ کا ۱۹۸۵ء
- وفات: ۵ جون ۱۹۸۶ء کو صبح دس بج کر پندرہ منٹ پر لکھنؤ میڈیکل کالج میں انتقال ہوا۔
- پتہ: کیف منزل، ۳۵۔ بنگلہ، سیتاپور ۲۶۱۰۰۱ (یوپی)

KAIF AHMED SIDDIQI
M. A. (Urdu), M. A. (History), Adib Kamil, B.Ed.
Urdu Lecturer
Municipal Inter College Sitapur (U.P.)
President
Anjuman Ittehad-e-Qaum-o-Adab, Sitapur (U. P.)
President
Tameer-e-Aivan-e-Urdu Committee, Sitapur (U. P.)

Home Address
Kaif Manzil
35, Bangla
Sitapur 261001

Date- 16-5-86

کیف احمد صدیقی

یہ زمیں روشن ہوئی یہ آسماں روشن ہوا
میرے دل کی آگ سے سارا جہاں روشن ہوا

رفتہ رفتہ خاک ہو کر رہ گئے دونوں وجود
ایک شعلہ میرے تیرے درمیاں روشن ہوا

سارہ دنیا دیکھتی ہے میرے ماتھے کی طرف
دردِ دل چمکا کہاں تھا اور کہاں روشن ہوا

دل میں اک بجھتا ہوا حرفِ تمنا تھا مگر
داستاں در داستاں در داستاں روشن ہوا

زندگی سے موت تک میں اک سراپا راز تھا
کچھ یہاں روشن ہوا اور کچھ وہاں روشن ہوا

محفلِ دل میں ہمیشہ جلوہ ساماں رہی
بجھ گئی شمعِ تمنا تو دھواں روشن ہوا

آگ تو زیرِ زمیں خاموش ہو کر رہ گئی
صرف اپنی خاک سے یہ خاکداں روشن ہوا

بجھ گیا سارا زمانہ جب طبیعت بجھ گئی
سارہ دنیا جگمگائی دل جہاں روشن ہوا

آتشِ تخلیق سے جلنے لگے جب ذہن و دل
کیفؔ صاحب آپ کا طرزِ بیاں روشن ہوا

شعلہ بھڑکے گا سرد ہونے تک
قلب تڑپے گا درد ہونے تک

کون جانے شجر پہ کیا گزری
سبز پتوں کے زرد ہونے تک

کتنے رنگوں کے دشت سے گزرا
آسماں لاجورد ہونے تک

سارے عکسوں کو کر گیا صیقل
آئینہ فرد فرد ہونے تک

دھوپ کا قہر ہے زمانے میں
صرف سورج کے سرد ہونے تک

جانے کتنے حصار ٹوٹ گئے
میرے آوارہ گرد ہونے تک

شہر در شہر ٹھوکریں کھائیں
میرے صحرا نورد ہونے تک

کیفؔ سورج کی آنکھ بھر آئی
گرد کا درد گرد ہونے تک

انشائیہ — ایک بحث

انشائیہ کوئی نئی صنف نہیں۔ یہ وہی صنف ہے جسے انگریزی میں ESSAY کہتے ہیں۔ غنائی کی طرح انشائیہ بھی اپنی اصل شکل میں انفرادیت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے جس میں اس کی شخصیت کے تضادات ہیں اور یہ اصل، بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا ہے اور اس طرح ان کی عکاسی پاتا ہے۔ اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے، یعنی کہ انشائیہ نگار اپنی شخصیت کو پالے اور اپنی فطری آزادی کو پا لے۔

ESSAY کے متعلق ڈاکٹر جانسن کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے:—

THE ESSAY IS A LOOSE SALLY OF MIND

اور لوگ نقل کرنے والے زور لفظ "LOOSE" پر دیتے ہیں۔ حالانکہ انشائیہ بہ حیثیت انشائیہ LOOSE نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر جانسن کا مقصد صرف یہ تھا کہ ESSAY اور کتاب یا تصنیف میں تفریق کی جائے۔ اور بس۔

یہ ضرور ہے کہ کتاب کی طرح انشائیہ لمبا، پیچیدہ اور منطقی نہیں ہوتا۔ یہ نسبتاً مختصر ہوتا ہے اور اس میں منطقی دلائل اور براہین بھی نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں بھی لفظ LOOSE بے محل ہے۔ خود ڈاکٹر جانسن کے انشائیے جو اس نے THE RAMBLER کے لیے لکھے، وہ LOOSE نہیں کہے جا سکتے ہیں۔ انہیں کہیں سے ایک تارم ہوتا ہے۔ LOOSE کا کوئی نظم ہوتا ہے۔ ان میں ابتدا، وسط اور انجام میں ربط ہوتا ہے، یعنی ایک نظم ہوتا ہے۔ جو بات کہے گئے ہیں وہ خاص ایک تکمیل ہوتی ہے۔

اب لیجئے AFTER DINNER SPEECHES OF A WELL READ MAN. ڈنر کے بعد ایسی تقریریں دلچسپ ضرور معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی ادبی مقام نہیں اور انشائیہ کی طرح یہ ادب کی جانی پہچانی صنف نہیں۔

OO

— کلیم الدین احمد، پیش لفظ

نشاطِ خاطر از حسنین عظیم آبادی۔ بار دوم۔ ۱۹۸۰ء صفحہ نمبر ۱۰ تا ۱۵

پروفیسر کلیم الدین احمد "انشائیہ" کی خصوصی صنفی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ انشائیہ نام کی کسی تحریر کا ادب میں کوئی وجود نہیں۔ موصوف کا کہنا ہے کہ "انشائیہ کوئی نئی صنف نہیں ہے"۔ یہ دراصل ESSAY ہے۔ اس میں ESSAY کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو مغرب کے بڑے اہل قلم نے اپنے ESSAYS میں پیش کی ہیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں ——— اختلاف کی وجہ میں واضح کردوں، انداز فکر کا فرق ہے۔ یعنی انشائیہ کو میں خالصتاً مشرقی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور اسے مخصوص موضوع اور لوازم کا حامل تصور کرتا ہوں۔ "مضمون" کے لیے ESSAY، "مقالہ" کے لیے SERIOUS-ESSAY. اور "انشائیہ" کے لیے LIGHT ESSAY جیسے انگریزی مترادفات میری ناقص رائے میں زیادہ صحیح اور وقیع ہیں ——— مغرب کی زبانیں اور ان کے علمی و ادبی اور سائنسی سرمایے کو کامل تہذیب و تمدن قرار دینا بوالعجبی ہے، نیز اس عظیم ذخیرہ کو نظر انداز کر کے زبان اردو کے مستقبل کو حاصل کرنے کی سعی حماقت ہوگی یا خلافِ ذہانت ——— اس اعتراف کے باوجود، گرچہ اس اظہار میں اصرار ہے اور علت اصول ہے کہ مغرب کے مقابلے میں ہمارے یہاں کئی ایسے خوش وضع اور جاندار اسالیب شعر و نثر موجود ہیں جو مغرب کی ادبی یا تہذیبی روایات و نظریات سے میل نہیں کھاتے، اور اسی بنا پر مغربی ادب میں یہ کسی لغوی وجود کے حق دار نہیں۔ مثال کے طور پر شعری ادب میں غزل، واسوخت، شہر آشوب اور ہجو یا نثری ادب میں تذکرہ، وقائع اور تقریظ۔ یہ ہماری زبان کے ایسے منفرد اسالیب ہیں جن کی تاریخی حیثیت مسلم ہے، جن کی روایتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور جن کا رواج ان کی ادبی و تہذیبی قوت حرکی دلیل ہے۔ ان مختلف اور ممتاز اصناف کے وجود سے محض اس بنا پر انکار کہ مغربی ادب میں یہ کسی خاص نام سے موسوم نہیں، میرے نزدیک مشرقی مزاج و اقدار میں غیر معقول متضاد انداز فکر ہے۔

"انشائیہ" کو اسی وسیع تناظر میں دیکھنا اور پرکھنا احسن سمجھتا ہوں۔ اس صنف کو "مضمون" کا ایک بالیدہ، ترقی یافتہ اور دل کش اسلوب مانتا ہوں۔ اسے انگریزی ESSAY کی اس قسم میں شمار کرتا ہوں جس میں نہ صرف LIGHT ESSAY کی لطافت ملتی ہے ——— بلکہ جو PERSONAL-ESSAY کے مطالبات و مطائبات انجام دیتی ہے۔

نو وارد نثری اصناف میں افسانہ کے بعد مقبول ترین صنف انشائیہ ہے۔ مگر انشائیہ کے نام سے جو مطبوعات سامنے آتی ہیں، اکثر و بیشتر ان میں قلم کار کی قوت اظہار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ تحریریں انشائیہ نہیں۔ یہ "ذکاہیہ" ہیں، وہ مولود اسلوب جو اپنے گہوارائی دور سے گزر رہا ہے۔ نئے نثری اسالیب میں "ذکاہیہ" کوئی جگہ پا سکے گا یا نہیں! فی الوقت یہ بچہ اور بچے کی نگہداشت کی فکر ہے۔ "ذکاہیہ" ہمارے نقادین کی فوری توجہ کا مستحق ہے۔

انشائیہ پسندی کے اس رجحان سے فی زمانہ افسانہ اور انشائیہ دونوں کا قالب رقیب مجروح ہو رہا ہے۔ یعنی اچھے صاحبِ صلاحیت افسانہ نگار موضوعاً انشائیہ پرست ہو گئے ہیں اور افسانوں میں بات کا بتنگڑ بنانا کمال فن سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف، ابھرتے انشائیہ نگار رسماً کہانی کار بن گئے ہیں اور بے بات کی بات میں ماہرانہ نگاری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اول الذکر کے یہاں "کہانویت" غالب اور نیرنگی تاثرات غالب ہے۔ آخر الذکر کے یہاں ذہنی ترنگ اور فکری تجلیاں شوخی چٹکیوں کی مثال ہیں ——— انشائیہ پسندی کے اس غلط رجحان سے صاحبِ قلم کی صلاحیت اور ان اصناف کی سالمیت پر دو کو کیڑے لگ رہے ہیں۔

اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ایم۔ اسلم، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ملا رموزی، حیدرآبادی اور بہار کے چند اہم نام تھے، جو ساقی، نیرنگ خیال، ہمایوں، ادبی دنیا اور ندیم جیسے ماہناموں کے قلمی معاونین تھے۔ اس مقبولیت کے باوجود یہ کہانی کار افسانہ نگاری سے اسی طرح نا آشنا تھے جیسے آج کے شعرائے تغزل نظم کے تصور اور نظم نگاری کے فن سے ——— عجیب بات یہ تھی کہ پریم چند آسمانِ افسانہ پر ستارۂ صبح کی طرح روشن تھے، تاہم یہ عظیم تخلیق کار اردو افسانہ نگاروں کے لیے قطبی ستارہ نہ بن سکا ——— ان کے افسانے کا معیار کوئی پُر لطف لطیفہ یا پھڑکتا واقعہ تصور کیا جاتا، اس میں زور زبردستی کی ظرافت ہوتی اور حقیقت نگارانہ ترجمانی کی طرف توجہ نہ دی جاتی۔ بس ذکر معاشقہ یا رنگ مزاح کافی تھا ——— "افسانہ زندگی کی ایک قاش ہے۔" اس فکر و نظر سے ہاتھ لگانے والے دو چار ہی کہانی کار تھے۔

کچھ ایسا ہی حال آج اردو انشائیوں کا ہے۔ ہمارے انشائیہ نگار جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ انشائیہ نہیں۔ یہ انشائیہ اور افسانہ کا ناجائز اختلاط اور غیر صنفی تعلق ہے۔ جدید انشائیہ نگار اپنے روز و شب میں کسی دل کش بات پر انشا کی نگاہ سے افسانہ کا فریم لگا دیتے ہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ انشائیہ نگار کسی موضوع یا مسئلہ پر آزادانہ اور بے باکانہ قلم اٹھاتا ہے۔ بے بات کی بات میں وہ "کچھ" بات پیدا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ انھیں اس کا بھی شعور ہے کہ اپنی ماہرانہ قلم کاری سے وہ حکمت میں حماقت اور حماقت میں حکمت پیدا کر دینے پر قادر ہوتا ہے۔ مگر صد حیف! عہد حاضر کے بیشتر انشائیہ نگار افسانہ اور انشائیہ کی سرحدیں توڑ کر ادبی آوارہ گردی کرتے نظر آتے ہیں۔

انشائیہ کے نام پر جس قسم کی تحریریں منظر عام پر آرہی ہیں وہ کچھ اور ہیں۔ ان کی دل کشی کسی بات کا واقعاتی بیان ہے۔ ان کی پذیرائی کا سبب، اہم سبب ظرافت کی رنگ آمیزی ہے، وہ ظرافت جو "بہاری فکر" کی شان ہے ——— عام قاری ان "افسانہ نما انشائیوں" کو ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ تحریریں انشائیہ نہیں ہیں، یہ "ذکاہیہ" ہیں۔

OO

— محمد حسنین عظیم آبادی

نشاطِ خاطر ۱۹۸۰ء صفحہ نمبر ۱۰ تا ۱۵

اُردو انشائیے کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے محققوں اور نقادوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر انگلش ایسے کو ہی اُردو انشائیے کا سرچشمہ فرض کر کے اُردو انشائیے سے یکسر چشم پوشی کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انگریزی لفظ ESSAY (جو فرانسیسی لفظ ESSAI بمعنی کوشش سے مشتق ہے) اُردو انشائیے کے آغاز و ارتقا کی ایک گمراہ کن روایت بن کر رہ گیا ہے۔ اسی لئے اُردو انشائیوں کے جملہ مرتبین آج تک انگلش ایسے کی مختصر تاریخ کے پس منظر میں ہی اُردو انشائیوں کا ذکرِ خیر کرتے چلے آئے ہیں۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم ٭ یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

اُردو انشائیوں کے حسب ذیل مرتبین۔ سید صفی مرتضیٰ (مرتب اُردو انشائیہ)، ڈاکٹر وحید قریشی (اُردو کا بہترین انشائی ادب)، ڈاکٹر آدم شیخ (انشائیہ) اور ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (اُردو ایسیز) اُردو انشائیے کو انگریزی کی دین قرار دیتے ہیں۔ اُردو انشائیے کی تاریخ کے سنگِ بنیاد کی یہ کجی آج بھی انشائیہ کے قصرِ نامکمل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مذکورہ مرتبین کے نظریات نے اُردو انشائیے پر گمنامی کے دبیز پردے ڈال دیئے اور ایک اور غلط نظریہ کو جنم دیا کہ اُردو کے پہلے انشائیہ نگار، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد یا میر ناصر علی تھے۔ مثلاً سید صفی مرتضیٰ اور مولانا نیاز فتح پوری سرسید کو انشائیہ کا موجد قرار دیتے ہیں، تو ڈاکٹر آدم شیخ کبھی سرسید کو کبھی محمد حسین آزاد کو تو کبھی میر ناصر علی کو اُردو کا پہلا انشائیہ نگار سمجھتے ہیں چونکہ یہ نظریہ بھی غلط مفروضہ پر قائم ہے لہٰذا صحیح نہیں۔

اُردو لفظ انشائیہ پر دو بیان ملتے ہیں، ایک ڈاکٹر سید محمد حسنین کا دوسرا ڈاکٹر وحید قریشی کا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کچھ مذبذب ہیں۔

"انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے مخصوص معنوں میں غالباً مہدی حسن نے استعمال کیا۔ مضمون اور جوابِ مضمون کے الفاظ مرحوم دلی کالج کے زمانے میں رائج ہوئے"
(مقدمہ۔ اُردو کا بہترین انشائی ادب)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہدی افادی نے انشائیہ کا لفظ سرے سے استعمال ہی نہیں کیا البتہ لفظ مضمون اور آرٹیکل اُن کے یہاں موجود ہے۔ مہدی افادی نے ایسے کو "مقالاتِ ادب" کا نام دیا ہے

ڈاکٹر سید محمد حسنین رقمطراز ہیں:-

"اُردو میں انشائیہ کو صنفی لحاظ سے پہلے اختر اورینوی نے ادب میں روشناس کرایا یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے ... سید شاہ علی اکبر قاصد کے "بوئے رنگ" میں اختر صاحب کا مقدمہ بھی تھا۔ یہ مقدمہ صنفِ انشائیہ پر اُردو کا پہلا مقدمہ ہے۔ لفظ انشائیہ خاص مقدمہ نگار کی طباعی کا نتیجہ تھا۔" (مقدمہ۔ صنفِ انشائیہ اور چند انشائیے)۔

لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر اختر انگلش ایسے کی بھول بھلیاں سے باہر نکل نہیں سکے۔

مذکورہ بالا اُردو انشائیوں کے مرتبین کے بیشتر خیالات و بیانات ولیم ہنری ہڈسن (William Henry Hudson) کی مشہور تصنیف An introduction to the study of literature کے باب The study of the essay pp 361. سے ماخوذ ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین 'صنفِ انشائیہ اور چند انشائیے' کے مقدمہ میں انشائیہ کی تعریف ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:-

"انگریزی کے مشہور ادیب جانسن کا فقرہ مشہور اور رائج ہے اس صنفِ ادب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے "It is a loose sally of mind" یعنی انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے یہ ترنگ انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ روح جس میں جو لطف ہے وہ نہیں جس میں انتشار ہے پراگندگی نہیں وہ نشہ جو دل کے ساتھ دماغ کو بھی تیز دیتی ہے ... انشائیہ ذہن کا نیم پختہ ذہن کی ترنگ ہے آزاد و بے پروا جیسے رقص حسن مثل سماع میں کسی اہلِ کیف کا ایک محویت و اختیار۔ انشائیہ کے لطف و دلکشی کا راز حکمت و حماقت کا امتزاج ہے۔ سنجیدگی و ظرافت کا امتزاج ہے ... انشائیہ کسی موضوع پر مقالہ نگار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی۔ اس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے۔ جو کبھی کبھی چلتی ہیں اور دبے پاؤں آتی ہیں۔ اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جس کی ہر چنگاری آزاد اور منتشر ہوتی ہے ہم اسے ادب کی پھلجھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر وزیر آغا "خیال پارے" میں انشائیہ کی خصوصیات کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

۱۔ انشائیہ میں "غیر رسمی طریق کار" اور شخصی رد عمل لازمی ہے۔ غیر شخصی موضوعات پر تنقید و تبصرہ کرنے کی بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور شخصی رد عمل کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔
۲۔ بنیادی طور پر انشائیہ کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ ایک اچھے انشائیہ میں طنز بھی کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ محض ایک سنبھالے کا کام دیتی ہے۔
۳۔ ایک اچھا انشائیہ نہ صرف آپ کو مسرت بہم پہنچاتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت میں کشادگی اور رفعت پیدا کرتا ہے۔
۴۔ انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی عدم تکمیل ہے۔
۵۔ انشائیہ میں موضوع کی مرکزیت کے علاوہ ضمنی باتیں بھی ہوتی ہیں۔
۶۔ مقالہ کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ ڈھیلا Loose ہوتا ہے اور اس میں مقالہ کی سنگلاخ کیفیت موجود نہیں ہوتی اس کے علاوہ انشائیہ میں ایک مرکزی خیال کے بادصف دونوں کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا۔
۷۔ انشائیہ اور غزل میں بڑی مماثلت ہے
۸۔ انشائیہ دعوتِ فکر دیتا ہے
۹۔ انشائیہ اور سانٹ میں اپنے اختصار کے باعث بڑی یکسانیت ہے۔
۱۰۔ ایک آخری چیز جسے انشائیہ کا امتیازی وصف سمجھنا چاہئے اس کی تازگی ہے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطۂ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور جمود سے اوپر اٹھا کر ماحول کا ازسرِ نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے
۱۱۔ اور انشائیہ نگار اور ایک غیر ملکی سیاح میں قریبی مماثلت ہے۔
۱۲۔ انشائیہ کا خالق کوئی تیر اندازی نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے۔ اس کا کام محض ایک چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کی توجہ کرنا اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی کسوٹی پر سرسید احمد خاں پورے نہیں اُترتے اسی لئے وہ سرسید کو انشائیہ نگار نہیں تسلیم کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ فی الواقع اُردو میں باقاعدہ انشائیہ کی صنف بطور ایک تحریک کے معرضِ وجود میں نہیں آئی۔ سرسید کے بعض مضامین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہم انہیں انشائیہ کے تحت شمار کر سکتے ہیں لیکن میری دانست میں ایسا کرنا درست نہیں کیونکہ سرسید کے بیشتر مضامین میں ایک سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے جو انشائیے میں نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے انداز بیان میں شگفتگی نہیں جو انشائیہ کا بنیادی وصف ہے تیسرے ان مضامین میں سرسید نے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کے بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان مضامین کو

[illegible]

رام لعل نابھوی

آم کے آم ۱۹۸۳ء صفحہ نمبر ۱۵ تا ۲۷

اور اب جب کہ مقطع میں سخن گسترانہ بات آ ہی پڑی ہے تو عرض کردوں کہ عروض کی مہارت اور سخن فہمی کے ساتھ ساتھ کامن سینس بھی ضروری ہے۔

مثلاً (۱) آپ کے خط کے نیچے مدیر محترم نے اپنے اعلان میں لکھا ہے ... زبان و ادب پر تاثرات ارسال کیجیے" مجیب صاحب نے "ث" کی تشدید غائب کر دی۔

(۲) اسی شمارہ میں صفحہ ۲۵ پر نور محمد یاس کا مصرعہ ؎ اپنی سانسوں کا خود حساب رکھو ظاہر ہے شاعر انفاس کا حساب رکھنے کا مشورہ دے رہا ہے بیوی کی باتوں کا حساب رکھنے کا نہیں۔

(۳) صفحہ ۴۹ پر رخ زماں انصاری کا مصرعہ ؎ وقت کی ہر قدر ہے گواہ مری" ہر" کتابت کی غلطی ہے جس سے مصرعہ ساقط البحر ہو گیا۔ شاعر بے چارہ اتنی فحش غلطی نہیں کر سکتا۔

(۴) خود آپ کی غزل شمارہ ۲۰۵ میں پریس کی کمی کے باعث "لباس" کے بجائے "رباس" چھپ گیا ہے۔

شاہد کامران ——— چھت بل سری نگر ۳

"شاعر" (عکس ۲۰۹) میں محسن رضا رضوی کی "دف طرز" دیکھ کر تعجب ہوا۔ موصوف نے آزاد غزل کو ایک عنوان دے دیا ہے۔ غالباً یہ بھی اس سعیٔ نامشکور کا حصہ ہے جس کے تحت آزاد غزل کے لیے غزل نما، غزلیہ وغیرہ نام تجویز کیے جا رہے ہیں۔ غیر "غزل نما" یا "غزلیہ" میں کوئی معنویت تو ہے۔ "دف" دراصل ایک PERCUSSION INSTRUMENT ہے، مثلاً طبلہ، ڈھول وغیرہ "دف" کی طرز نہیں ہوتی، اس کی آواز ہوتی ہے۔ مثلاً "سارنگی طرز" یا "ستار طرز" کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ ماہرین موسیقی اس سلسلے میں مزید روشنی ڈال سکتے ہیں۔

سلیم شہزاد کے مقالے "جدید افسانے کی داستانی فضا" [illegible] معنی میں فکر انگیز ہے کہ اسے پڑھ کر اس شبہ کو تقویت ملتی [illegible] کہ کتنے افسانہ نگار ہمارے مقبول و معروف داستانوں [illegible] میں افسانے لکھ رہے ہیں۔ مثلاً "باغ و بہار" سے "سرگذشت آزاد [illegible] بادشاہ" کا اقتباس (صفحہ ۳۰، شاعر) دیکھیے اور پھر انور [illegible] کے افسانے "طلسم آباد" سے دیا ہوا سلیم شہزاد کا اقتباس (صفحہ ۴۰) ملاحظہ فرمایئے۔

مؤخر الذکر، اول الذکر کا چربہ ہی نظر آئے گا۔ انتظار حسین نے داستانوں اور اساطیر سے اثر ضرور قبول کیا، لیکن اسے ایک نئی تخلیقی جہت بخشی۔ اب یار لوگ انتظار حسین کی کامیابی سے متاثر ہو کر داستانوں کی نقل اتار رہے ہیں۔ اور ہمارے نظریہ ساز ناقدین انہیں "جدید افسانے" سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہر دیپ رحمانی کا نام آزاد غزل کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن اب شاید انہوں نے اپنی الگ شناخت بنانے کے لیے اپنی ایک آزاد غزل "گیتل" کے عنوان سے چھپوائی ہے۔ شمارہ نمبر ۲۰۷، غالباً اس لیے کہ اس میں بعض ہندی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ ان دنوں بہت سے شاعروں کو نئے نئے عنوانات وضع کرنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ غزل نما، یا غزلیہ، میں پھر بھی کوئی بات ہے، لیکن دف طرز، گیتل وغیرہ بے معنی اور مضحکہ خیز عنوانات ہیں۔ یہ محض عنوان سے کوئی صنف الگ وجود نہیں قائم کر سکتی۔ اگر آزاد غزل میں ہندی الفاظ شامل کر دیے جائیں تو کیا کوئی الگ ہیئت یا صنف معرض وجود میں آ جائے گی۔ ایسی بے شمار غزلیں ہیں جن کا ڈکشن ہندی آمیز ہے۔ کیا انھیں غزل کے زمرے سے خارج کر دیا جائے گا؟ ایک سوال یہ کہ "گیتل" کو "گیت" کہنے میں کیا قباحت ہے؟

رئیس منظر ——— محلہ لوہاران، رامپور (یوپی)

شمارہ ۴، ۳۰ میں ہیرانند سوز اور منیر سیفی صاحبان نے اپنے مکتوبات میں بعض بے محل اعتراضات وارد کیے ہیں۔

ہیرانند سوز۔

(۱) وہ ملکت کو انا کی بڑھائے جاتا ہے۔

(اسعد بدایونی)

اس مصرعہ پر اعتراض ہے کہ اس میں تعقید لفظی ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ تعقید لفظی، اردو کے لسانی نظام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ عملاً اس کی حیثیت ایک ——— کی ہے جس کی بدولت شاعر کو اظہار خیال میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس کا برتنا فنی مہارت و بلاغت کا تقاضا ضرور کرتا ہے ورنہ یہ شعر کا عیب بن جاتی۔

زیر بحث مصرعہ میں اصل نقص روانی اور سلاست کا فقدان ہے۔ اس کا تعقید لفظی سے کوئی واسطہ نہیں۔

رنگ سونے میں چمکتا ہے طرح داری کا
گرد عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

(حسرت موہانی۔)

یہاں دونوں مصرعوں میں تعقید لفظی ہے۔ لیکن دونوں مصرعے اتنے رواں دواں ہیں کہ اس تعقید کا احساس تک نہیں ہوتا۔

۲۔ یہ کس کا روشنی دیتا ہوا سا پیکر ہے

(اسعد بدایونی)

اعتراض کیا گیا ہے کہ "سا پیکر" صحیح نہیں ہے۔ معترض نے یہ نہیں بتایا کہ اس میں آخر غلطی کیا ہے۔ مجھے تو مصرعہ کی فصاحت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ کیا سوز صاحب وضاحت فرمائیں گے؟

منیر سیفی۔

۱۔ غم دل نے سکھا دیا پرکاش

(پرکاش تیواری)

معترض کے بقول "غم" کی جگہ سہ حرفی لفظ ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں دو حرفی لفظ میں کیا قباحت ہے؟ غالب کے ایک مشہور شعر (مطلع) کا پہلا مصرعہ ہے:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔

کیا یہاں بھی "دل" کی جگہ سہ حرفی لفظ ہونا چاہیے؟ معلوم ہونا چاہیے کہ اس بحر میں پہلا رکن "فاعلاتن" کی بجائے "فعلاتن" بھی ہو سکتا ہے۔ غالب کا محولہ بالا مصرعہ اس کی مثال ہے۔

۲۔ مجھے بھی خود سے تکلم کا گیان دے اللہ

(حامد اقبال صدیقی)

اعتراض ہے کہ "گیان" پورے تلفظ کے ساتھ نہیں آیا ہے۔ معترض نے یہ نکتہ ملحوظ نہیں رکھا کہ دھیان، گیان وغیرہ ہندی الفاظ کی "ی" تقطیع میں شمار نہیں ہوتی۔ یہ الفاظ "فاع" کے وزن پر آتے ہیں۔

ہندی کے بعض دوسرے الفاظ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً لفظ "کرشن" جس کی "ر" تقطیع میں گرا دی جاتی ہے۔

ادا میں کھینچتی تھی تصویر کرشن و رادھا کی
نگاہ میں کئی افسانے نل دمن کے ملے

(فراق گورکھپوری)

۳۔ اس طرح سے نہ ہوتا کوئی برباد کہیں

(حمیدہ رصفت)

معترض کا ارشاد ہے کہ "سے" غیر ضروری ہے۔ اس کی وجہ؟ ڈھنگ، طور، طریقہ، روش، انداز، طرز، شکل وغیرہ الفاظ کے ساتھ حرف علامت اگر غیر ضروری نہیں ہے تو "طرح" کے ساتھ کیونکر غیر ضروری ہو گیا؟ طرح کے بھی تو یہی معنی ہیں۔ اساتذہ کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں!

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ نین وہ ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

(سودا)

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے (درد)

کس طرح سے مانیے، یار، کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا (میر)

کسی نے مری طرح سے اے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں (انیس)

ڈاکٹر گیان چند ——— ۱۵/اے یونیورسٹی پوسٹ آفس حیدرآباد

میں نے شاعر کے شمارے دیکھے۔ ان کے اضافے دیکھے۔ ان سے پرچے کی قدر و قیمت اور آب و تاب میں اضافہ آ رہا ہے۔

بسا اسکی غالباً اعجاز صدیقی مرحوم کے منظوم ذکر شعرا پر مبنی ہے۔ مجھے اس کے شعری پہلو سے زیادہ نثری بیانات سے دلچسپی ہے۔ اگر شعرا کی صحیح تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات نیز ان کی تصانیف کی صحیح تاریخ معلوم ہو جائے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ یہ بہت بڑی فنی ذمہ داری بھی ہے۔ اسی لیے [illegible] کوئی منتقی محقق حرف گیری کرے گا۔ انابات بھی مفید ہے۔ آپ کسی اچھی پرانی لائبریری سے مدد لے سکتے ہیں۔ مخطوطات اور نادر مطبوعات بھری پڑی ہوتی ہیں۔ آپ ان کے بارے میں برسوں لکھ سکتے ہیں۔ بمبئی میں انجمن اسلام اور جامع مسجد کے کتب خانوں میں بہت مواد ملے گا۔

آثار لفظ لفظ قدما کی تحریروں کا عکس ہے یا غیر مطبوعہ تحریروں کا، مجھے واضح نہیں۔ بہرحال کتب خانوں میں اس کے لیے بھی کافی دولت مل سکتی ہے۔ ہماری زبان میں مشاہیر کے خط چھاپے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے نام کے خطوط انجمن ترقی اردو ہند کی لائبریری میں دے دیے ہیں۔ اب صرف معاصرین کے خطوط آتے ہیں۔

یاد آیا آپ کالی داس گپتا صاحب کے کتب خانہ سے بازیافت اور آثار لفظ لفظ کے لیے مواد لے سکتے ہیں۔ چہرہ چہرہ یا دیں بدلتا عکس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ فرق یہ ہے کہ آخر الذکر میں اعجاز صاحب مرحوم کا قطعہ بھی آتا ہے

بہر حال ضرورت ہے کہ ہمارے تمام بڑے اہلِ قلم کی مختصر ترین سوانح ۱۹۸۵ء ہو تب ؟ کی شکل میں درج کر دی جائے تو بہت مفید ہوگا لیکن یہ کام کرے گا کون۔ آپ محقق ہیں ایں۔ آپ رسالہ تیار کریں گے کہ چھان بین کرتے پھریں گے۔ مقالی محققوں سے مدد لیجیے لیکن چہرہ چہرہ کے لفظ سے ایسا لگتا ہے کہ قلمی تصویر کے ساتھ عکسی تصویر کا شمول بھی ضروری ہے۔

کیوں صاحب! چہرہ چہرہ یادوں کے بجائے آپ مختصر زندہ ادیبوں پر آجائیے۔ تصویر دیں یا نہ دیں۔ ان کا سن ولادت دے دیں۔ دو تین سطروں میں سوانح اور ان کی تمام شائع شدہ کتابوں کے سنہ اشاعت (اگر کئی ایڈیشن نکلے ہیں تو ہر ایڈیشن کا سنہ) دے دیں تو مستقبل کے مورخ کے لیے بیش بہا مواد ہوگا۔ ہر شخص اپنے بارے میں لکھے گا تو مستند ہوگا۔ آپ تدفین کر دیجیے کہ آدھے صفحے سے زیادہ کا مواد نہ ہو۔ آج کل میں "من آنم" ایک چارٹ کی شکل میں ہوتا ہے، آپ مختصر بیانیہ انداز میں لکھائیں گے۔ آپ پاکستان کے اہلِ قلم کو بھی لے سکتے ہیں۔ غور کیجیے۔ اگر زندہ آدمیوں کے بارے میں لکھنا ہے تو چہرہ چہرہ یادیں" عنوان نہ رہ سکے گا۔

شکر گذار ہوں کہ آپ نے شاعر میں کی جانے والی تبدیلیوں کو پسند کیا اور نئے کالموں کے متعلق اپنی گراں قدر رائے اور مفید تجاویز سے نوازا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کے مکتوب گرامی کا جواب پوری وضاحتوں کے ساتھ دوں لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ کے خط کے حوالے سے یہ ضروری وضاحتیں قارئینِ شاعر کے لیے بھی مفید رہیں گی۔

"تسا ہل سخن" قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم کا منظوم اجمالی تعارف و تذکرہ ہے جو ماہنامہ "عالمگیر" [لاہور] کے "تاریخ نمبر" میں شائع ہوا تھا۔ یہی طویل نظم شاعر (آگرہ) کے اپریل ۱۹۴۴ء کے شمارے میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں حضرت امیر خسرو سے اعجاز صدیقی تک ۸۲ مشاہیر شعراء پر ایک ایک قطعہ کہہ کر شامل کیا گیا ہے۔ شاعر شمارہ ۵؍۶ ۱۹۸۵ء میں اس نظم کے متعلق پوری تحقیقی تفصیل دی گئی ہے۔ یوں تو کسی بھی شمارے میں یہ پوری نظم شائع ہو سکتی تھی لیکن میرے ذہن میں ایک ایسے اہم کام کا خاکہ بن رہا تھا جس میں ۸۲ شعراء کی تصاویر اور ان کے مستند سوانح آجائیں۔ ماضی میں اردو شعراء کا ایک مصور تذکرہ سیّد زوّار حسین فریدی نے ۱۹۵۸ء میں غالب بک ڈپو، اردو بازار، دہلی سے شائع کیا تھا لیکن اس میں شعراء کے سوانحی کوائف بے حد سرسری اور تاثراتی نوعیت کے تھے۔ میں نے جب کام کا آغاز کیا تو معلوم ہوا کہ متقدمین اور بعض متوسطین شعراء کے سوانحی کوائف نہ صرف الجھے ہوئے ہیں بلکہ ہمارے محققین نے انہیں اور زیادہ الجھا دیا ہے۔ ہمارے کئی اہم تذکرے اور ادبی رسائل کے مرعوب کر دینے والے خاص نمبر کچھ زیادہ ہی گمراہ کن نظر آئے چنانچہ اردو شاعری کے تمام اہم ناموں کے مستند تحقیقی کوائف کی یکجائی کے لیے اس سلسلے کو مفید جانا۔ اس میں ابھی گنجائشیں بہت ہیں۔ یہ کام جاری ہے۔ جب کتابی شکل دی جائے گی تو ترمیم و اضافے بھی کیے جائیں گے۔

"بازیافت" کا سلسلہ اس لیے شروع کیا گیا ہے کہ ہندو پاک میں بے شمار نایاب و کمیاب کتابیں اور ہزاروں مخطوطات ذاتی کتب خانوں یا اہم عوامی لائبریریوں میں موجود اپنی ترتیب و تدوین کے منتظر ہیں ـــ بکھرے ہوئے اس تاریخی سرمایہ تک صرف خواص کی رسائی ہے۔ ہمارے بیشتر ادباء و شعراء اور طلباء اس بکھرے ہوئے سرمائے سے لاعلم ہیں۔ یہ تو خیر ممکن نہیں کہ یہ سارا سرمایہ شاعر کے اس ایک صفحے کے ذریعہ سے ہر خاص و عام تک پہنچ جائے گا۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ طلباء میں اپنے علمی و ادبی سرمایہ سے دلچسپی پیدا ہو نئے ریسرچ اسکالر فرسودہ موضوعات پر تحقیقی کام کرنے کے بجائے نایاب و کمیاب اہم کتابوں اور مخطوطات کی طرف متوجہ ہوں۔ اس طرح بے شمار پرانی کتابوں اور مخطوطات کی تدوین کے لیے فضا ہموار ہوگی ورنہ ہماری یونیورسٹیوں میں نئے ریسرچ اسکالرز کو عموماً معمولی موضوعات دے کر ان سے تحقیقی کام لیا جاتا ہے کہ یہ کام اگر نہ بھی ہوں تب بھی کوئی فرق نہ پڑے۔

"بازیافت" کو بھی کتابی سلسلوں میں سمو دیا جائے گا۔ اس طرح اپنی نوعیت کا یہ ایک قیمتی کیٹلاگ بن جائے گا۔

"آثار لفظ لفظ" میں اب تک کثیر تعداد کی غیر مطبوعہ تحریروں کے عکس ہی شائع کیے گئے ہیں۔ اس میں ہم عصر مشاہیر ادباء و شعراء کے خطوں کے عکس بھی شائع کیے جائیں گے۔ اس عنوان کو کچھ اور بھی وسعت دی جائے گی۔ آپ کی یہ تجویز بے حد اہم ہے کہ تمام اہلِ قلم کی مختصر ترین سوانح کیپسول کی شکل میں درج کر دی جائے۔ "تسا ہل سخن" ایک طرح کا کیپسول ہی ہے۔ اس طرح کے کیپسول کا خاکہ ہمارے پاس ہے۔ شاعر کے آئندہ شماروں میں کچھ اور نئی تبدیلیوں کے ساتھ آپ ہم عصر قلم کاروں کے سوانح ملاحظہ فرمائیں گے۔ شاعر میں ہم عصر قلم کاروں پر گوشوں کے سلسلے شروع کیے گئے [۱۹۷۵ء] تو (ایک نظر میں) کے تحت مختصر مگر جامع سوانحی کوائف بھی دیے جاتے رہے ہیں اور شاعر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۷۵ء تک اور پھر اس کے بعد، یہ سلسلہ کسی نہ کسی عنوان سے آ رہا ہے۔ "آثار لفظ لفظ" ایک الگ موضوع بنتا جا رہا ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ان سارے نئے عنوانات کے ذریعہ پیش کیا جانے والا مواد سرسری نہیں ہے بلکہ میری ہر ممکنہ کوشش یہی ہے کہ یہ مواد استناد کا درجہ حاصل کرے۔ صرف کتابوں اور خطوں کے عکس یا تصاویر کا لگا دینا سب کچھ نہیں۔

عنوان "چہرہ چہرہ یادیں" تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے پہلے ہی یہ عرض کیا کہ ابھی شاعر میں اور بہت کچھ تبدیلیاں ممکن ہیں۔ ہمارے وسائل بے حد محدود ہیں اور ہمارے خواب کائنات بھر۔ کوششیں جاری ہیں۔ میں تو ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔ اگر آپ ایسی بلند پایہ شخصیتیں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتی رہیں اور مجھے آپ لوگوں کی سرپرستی حاصل رہے تو شاعر دنیا کی بڑی زبانوں کے ادبی رسائل کی صف میں اپنی جگہ ضرور بنائے گا۔ اسے ایک تاریخی حیثیت تو مل گئی ہے، عالمگیر شہرت بھی مل جائے گی ورنہ اردو والوں کا تو یہ مزاج بن گیا ہے کہ کتنا ہی بلند معیاری اور منفرد کام کر جایئے سراہنے والا کوئی نہیں۔ [افتخار]

کہانیاں شائع ہو گئی؛ اردو کلاسک کی کہانیوں کی دوسری جلد جو ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں ۱۱۰ کہانی کار شامل ہیں منظر عام پر آگئی ہے۔ اس ضخیم جلد کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ روایتی کہانیوں پر مشتمل ہے اور دوسرا جدید، علامتی کہانیوں سے متعلق۔

برصغیر کے سب ہی اہم اور مشہور افسانہ نگار اس میں شریک ہیں۔ کتاب کی قیمت ۱۲۵ روپے ہے۔ اور اس پتے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اردو کلاسک ۵۵ نیو آنند نگر، سانتا کروز (ایسٹ) بمبئی ۵۵

مکتوبات کے لیے مختصر، جامع اور مسائلی خطوط ارسال کیجیے جن میں تعریف و توصیف سے زیادہ شاعر کے مندرجات پر بحث کی گئی ہو۔ ذاتی نوعیت کے خطوط شائع نہیں کیے جائیں گے۔ مکتوبات کا کالم آپ کے لیے شاعر کے حوالے سے عصری ادبی مسائل، زبان اور ادب پر تاثرات ارسال کیجیے۔

اور

راج کومل - اقبال متین - صدیق مجیبی - انور عنایت اللہ - یوسف ناظم - گ

مظفر حنفی - الیاس احمد گدی - منظور سبزواری اور کئی اہم نام

ش کے تمام مستقل عنوانات کے

اوندھا دی مئے حب وطن پیالے میں
رکھا نہ فرق کوئی مسجد اور شوالے میں
ترے سخن میں ہے آزادیوں کی وہ نکہت
جو پائی جائے کسی نوشگفتہ لالے میں

مُدیر
افتخار امام صدیقی

●

مُعاون
ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاحیات خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

نئی راہیں روشن کریں

جب ہم ادب، ادیب اور معاشرے کی بات کرتے ہیں تو ایک سوال یہی ابھرتا ہے کہ انسان کو فنونِ لطیفہ کی ضرورت کیوں ہے یا یہ کہ ادب کی ضرورت کیوں ہے؟ سوال یہی ابھرتا ہے کہ ارتقاء پذیر دنیا لمحہ بہ لمحہ اپنے اسرار منکشف کرتی جارہی ہے اور ذہانتیں تیزی کے ساتھ اپنا کام کررہی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر آج کا انسان ان ذہانتوں کو تعمیری صورت گری کے بجائے تخریب کاری کی طرف زیادہ مائل ہے۔ ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے مزاجاً وہ اپنی بنیادوں کے حصار سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ لگتا ہے یہ ارتقاء تحفظ اور عدم تحفظ کی کشمکش اور خوف ہی کا ردِعمل ہے۔ یہ کشمکش اور خوف روز افزوں ہے اور عالمی سطح پر ایک ایسا انتشار ابھر آیا ہے جس کی شدت کو عوام و خواص سبھی محسوس کررہے ہیں، لیکن ایک پُراسرار دنیا اور نامکمل انسان کے درمیان جو تناسب و توازن ابھی باقی ہے اس کا سبب وہ اذہان ہیں جو مختلف فنون سے وابستہ ہیں۔ پیچیدہ انسانی سائیکی کی تفہیم اور مسائل سے گھری ہوئی دنیا کو تعمیری روپ دینے والے خواب آشنا یہ لوگ اپنے تخلیقی عمل سے وہ بنیادی کام انجام دے رہے ہیں جس کی ضرورت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔

ایک موضوع ہمیشہ ہی سے بحث طلب رہا ہے کہ کس طرح کا ادب تخلیق کرنا چاہیئے؟ ترقی پسند ادب یا جدید ادب؟ ان دونوں اصطلاحوں سے قطع نظر دیکھا جائے تو دونوں کا مفہوم تو ایک ہی ہے لیکن اگر ان اصطلاحوں کو سیاسی تناظر میں دیکھا جائے تو دونوں کی سمتیں مختلف ٹھہریں گی۔ نظریاتی مقصدیت کے زیر اثر ادب تخلیق کرنے والا اصرار یا پھر اس مقصدیت کے خلاف انحرافی ادب تخلیق کرنے والا اصرار جس میں اجتماعیت کے بجائے فرد کی اہمیت اور اس اہمیت کو ابھارنے کے لئے بکھراؤ اور ژولیدگی کو راہ دینے والا رجحان دونوں ہی اپنی اپنی انتہاؤں میں گم گویا تخلیق کار، تخلیقی عمل اور فن پارہ یہ سب کچھ ثانوی درجے پر آتے ہیں۔

بے ترتیب اور منفی قوتوں پر مشتمل دنیا سے نبرد آزمائی کے لئے مثبت تعمیری رویّوں اور راہوں کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں تخلیق کار اپنے معاشرے سے الگ نہیں لیکن ایک عام آدمی اور تخلیق کار میں فرق ہے۔ اس فرق کے مفہوم کو البتہ خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ادیب، ادب اور معاشرے کا جو تعلق ہے اور آج کی دنیا کو جس طرح کے ادب کی ضرورت ہے اس کے لئے ہمیں کن راہوں کو اختیار کرنا ہے کہ اب تک جن رویّوں کے تحت ادب تخلیق ہوتا رہا ہے انہوں نے وسیع تر مفہوم کی حامل اصطلاحوں کو سیاسی رنگ دیتے ہوئے ان طاقتوں کی نمائندگی زیادہ کی ہے جن سے ایک عالم خوف زدہ ہے۔
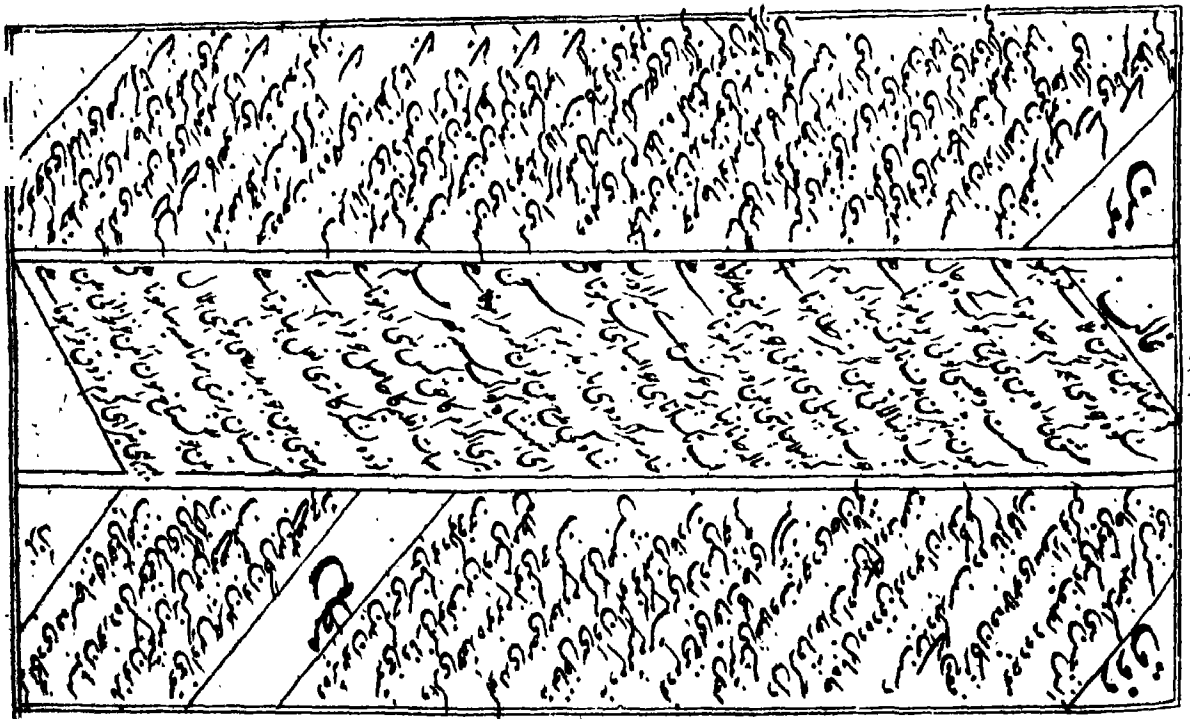
نگارستانِ سخن مرتبہ ظہیر دہلوی کے دو ورق اس کتاب پر تفصیلی مضمون شاعر کے اسی شمارے میں ملاحظہ کیجئے

بہ صورت گر

اقبال متین

انور عنایت اللہ

تاراچرن رستوگی

عزیز اندوری

صدیق مجیبی

مظفر حنفی

خورشید اکبر

حامد جعفری

مختار شمیم
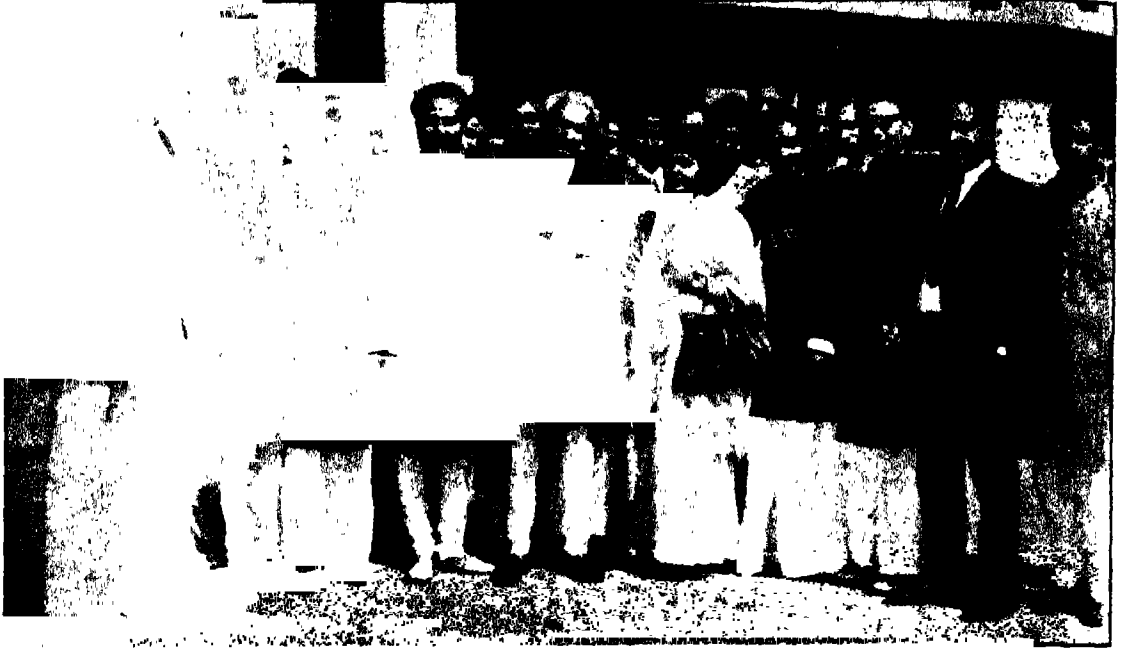
۱۹۶۸ء میں سیفیہ کالج بھوپال کے ایک جلسے کی یادگار تصویر میں نمایاں ہیں [دائیں سے بائیں] پروفیسر مرتضیٰ علی شاد، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، جاں نثار اختر مرحوم، شاہ جہاں بانو یاد دہلوی، ایم۔ عرفان مرحوم، ایڈوکیٹ اختر سعید خاں، مجروح سلطان پوری، اظہر سعید خاں اور سیفیہ کالج کے طلبہ
[بہ شکریہ ایم اے۔ شاد بھوپال]

ایک یادگار تصویر۔ [بائیں سے دائیں] پرویز شاہدی، ل احمد اکبرآبادی، راجندر سنگھ بیدی اور مظہر امام۔ کلکتہ فروری ۱۹۵۵ء
[بہ شکریہ: مظہر امام، سری نگر]

صبا اکبرآبادی

بجھتا ہوا چراغ سحر دیکھتے چلیں
کتنا جلا ہے خونِ جگر دیکھتے چلیں

اک اک قدم پہ اہلِ سفر دیکھتے چلیں
پست و فراز راہ گذر دیکھتے چلیں

اُن سے وداع ہو کے نظر کچھ نہ آئیگا
جو کچھ دکھائے دیدۂ تر دیکھتے چلیں

چہرہ جہانِ زشت کا نادیدنی سہی
دیکھا نہ جا سکے گا مگر دیکھتے چلیں

اہلِ نظر کو آئینہ خانہ ہے کائنات
خود اپنے عیب اپنے ہنر دیکھتے چلیں

جلوے ہر اک طرف ہیں بڑی کشمکش ہے یہ
آخر کدھر نہ دیکھیں کدھر دیکھتے چلیں

میں بھی ہوں نقش بہ دیوار اے صبا
میری طرف بھی ایک نظر دیکھتے چلیں

● ۴۹-اے۔ بلاک-۳ گلشنِ اقبال کراچی-۴۷ (پاکستان)

بلراج کومل

چور مینار

اک زمانہ ہوا
چور مینار کے روزنوں میں
بریدہ سروں کی
نمائش نہیں ہو سکی
مرگ انبوہ کا
واقعہ، سانحہ، حادثہ
کوئی ایسا نہ تھا
جس کو دستِ مصوّر سے
رنگ فضیلت کا اعزاز ملتا
ہوا شور کرتی ہوا
صرف ماتم نہ تھی
حرف گریہ نہ تھی
ایک معمول تھی، صرف معمول تھی

یہ فراموش، گمنام، خستہ کھنڈر
آج پھر بَین کرتی صداؤں سے آباد ہے
روزنوں میں
کشادہ، مگر اک زمانے سے اجڑے
تہی روزنوں میں
ہزاروں، جواں سال سر بھی ہیں
سینے بھی، بازو بھی
منظر سے مغلوب
جسموں کا ہنگام
سر بستہ رہ گیر، رہزن، تماشائی
قاتل بھی مقتول بھی
دور تک
آسماں بوس
دلدوز چیخوں کا کہرام
لاکھوں لہو رنگ قوسوں کی تحویل میں
چور مینار دائم۔

● ای-۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی

غلطیہائے مضامین، پر ایک نظر

ڈاکٹر گیان چند ● اے-۱۵، اسٹاف کوارٹرس، سینٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد-۳۲

پروفیسر عطا کاکوی صاحب مندرجہ بالا عنوان کے تحت رسالہ معاصر پٹنہ کے آٹھ شماروں میں بالاقساط مضامین لکھتے رہے۔ بعد میں انھیں اسی نام کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ وہ خود ناشر ہیں، جنوری ۱۹۸۴ء میں پٹنہ سے اشاعت ہوئی۔ ۱۶۰ صفحات کی کتاب میں کل ۵۷ شقیں ہیں جن میں کتابوں اور مضامین میں در آئی ہوئی تحقیقی غلطیوں کی تصحیح کی ہے۔ اس کتاب سے ایک طرف مصنفین میں حزم و احتیاط کی کمی کا پتہ چلتا ہے دوسری طرف عطا صاحب کی وسعت علم و کثرت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ اور قدیم ادب پر ان کی کتنی گہری نظر ہے اس کا اندازہ کتاب دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے

تاریخی معلومات:

۱ صلا۔ ڈاکٹر محمد عمر کے مضمون 'ہندو تہذیب اور مسلمان' کی تصحیح میں صراحت کرتے ہیں کہ غازی الدین کے دادا اور نانا دونوں ہم نام تھے۔ دادا قمرالدین آصف جاہ اول اور نانا اعتمادالدولہ قمرالدین خاں وزیر۔

۲ صلا اعجاز حسین کی تاریخ ادب اردو میں امیر خاں انجام کی شہادت کا سال ۱۱۵۶ھ دیا ہے صحیح تاریخ ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۵۹ھ۔

۳ صلا شیخ تصدق حسین کی کتاب بیگمات اودھ میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ نے اپنی ایک زوجہ عالیہ سلطانہ بیگم عرف گنا بیگم قمرالدین خاں کو بخش دی عطا صاحب تصحیح کرتے ہیں کہ تذکروں کے مطابق گنا بیگم قمرالدین خاں ہی کی زوجہ تھیں۔

۴ صلا کریم الدین نے اپنے تذکرے میں حیدری مرثیہ گو کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ شجاع الدولہ کی عملداری میں ان کے بیٹے سرفراز خاں کے ساتھ بنگال میں رہا۔ اس پر مسیح الزماں اپنی کتاب اردو مرثیے کا ارتقا (ص ۱۴۸) میں لکھتے ہیں کہ شجاع الدولہ کا کوئی بیٹا سرفراز خاں نام کا نہیں تھا اور نہ وہ حاکم بنگال تھا۔ عطا صاحب نے اس فاحش غلطی کی تصحیح کی کہ یہاں شجاع الدولہ سے مراد نواب اودھ نہیں بلکہ بنگال کا شجاع الدولہ ہے جو ۱۱۴۶ھ میں مرشد آباد میں مسند امارت پر بیٹھا اور جس کا بیٹا سرفراز خاں تھا۔

ادیبوں سے متعلق تاریخی معلومات:

۵ صلا مسعود حسن رضوی نگارشات ادیب ص ۱۶۸ پر لکھتے ہیں کہ صاحب تذکرۂ سراپا سخن نے تجلی (ابن محمد حسین کلیم) کو میر کا بھانجا لکھا ہے لیکن کلیم کے دوسرے بیٹے محمد محسن کو میر کا برادر زادہ لکھا ہے۔ میر اور شیفتہ نے بھی محسن کو میر کا برادر زادہ لکھا ہے لیکن کلیم کا بیٹا نہیں لکھا۔

عطا صاحب مسعود حسن رضوی جیسے محقق کی غلطی کی اصلاح کرتے ہیں کہ کلیم کے صرف ایک بیٹا تھا محمد محسن تجلی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے غلطی سے محمد حسن کو محمد حسین لکھ دیا ہے۔ میر تقی کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن کے بیٹے کا نام محمد محسن تھا اور وہ واقعی میر تقی کا بھتیجا تھا۔

راقم الحروف نے مختلف کتابوں کو دیکھا تو مندرجہ بالا بیان صحیح پایا۔ قاضی عبدالودود نے بھی اپنے ایک مضمون میں محسن پسر حافظ محمد حسن ہی لکھا ہے[۱]

۶ صلا عارف بٹالوی نے اپنی کتاب "غالب کا رومان" میں لکھا ہے کہ عارف نے اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں بستی بیگم سے شادی کر لی۔ عطا صاحب کی نظر اتنی وسیع ہے کہ وہ عارف کے خاندان کی تفصیل سے واقف ہیں۔ فوراً گرفت کر لی کہ عارف نے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد بستی بیگم سے شادی کی۔

۱؎ قاضی عبدالودود: میر کے مختصر حالات زندگی مشمولہ ایم حبیب خاں (مرتب): افکار میر ص ۴۳۔ دہلی دسمبر ۱۹۶۷ء

ص۵۵ ڈاکٹر خلیق انجم "میر تقی میر کے ادبی معرکے" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ محشر شاگرد میر درد کو ہجلت شاگرد جرأت نے قتل کر دیا اس کے بعد محشر کے اہل خاندان نے ہجلت کی جان لے لی۔

راقم الحروف نہ محشر سے واقف ہے نہ ہجلت سے۔ اس بیان کو پڑھ کر گذر جاتا لیکن عطا صاحب عارف ہیں۔ انھوں نے تصحیح کی کہ معاملہ اس کے برعکس ہے محشر نے ہجلت کو قتل کیا۔ کئی سال بعد ہجلت کے رشتہ داروں نے محشر کو قتل کیا۔

تحقیقی ادب

۸ ص۱۳۵۔ پہلے مسعود حسن رضوی صاحب کی غلطی کی اصلاح کا ذکر آچکا ہے۔ عطا صاحب نے شیرانی جیسے محقق کی ایک فاحش غلطی کی گرفت کی۔ عارف، مومن اور تسکین تینوں ۱۲۶۸ھ میں فوت ہوئے۔ بقول شیرانی سالک نے تاریخ لکھی ع ارم میں مومن و تسکین و عارف

شیرانی لکھتے ہیں کہ محمد حسین آزاد نے اس مصرع تاریخ کو اس لئے نہ مانا کہ اس سے ۱۳۸۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اگر تسکین کے بجائے توحید پڑھا جائے تو یعنی ع ارم میں مومن و توحید و عارف تو سال مطلوب صحیح برآمد ہوگا۔

عطا صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ آزاد اور شیرانی نے یہ کہاں لکھا ہے۔ آب حیات میں مومن اور غالب کے حالات میں یہ بیان نہیں ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ مندرجہ بالا مصرع سے ۱۳۸۰ھ نہیں ۱۳۰۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ آزاد کی غلطی ہے، شیرانی کی یا عطا صاحب کا سہو کتابت۔ بہرحال عطا صاحب کی تصحیح قابل توجہ ہے۔

وہ سخت معترض ہیں کہ شیرانی نے خواہ مخواہ تسکین کی جگہ اپنی طرف سے "توحید" قیاس کر لیا۔ سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ شیرانی نے سالک کے قطعۂ تاریخ کو توجہ سے نہیں پڑھا۔ اس کے قوافی ساکن، دن اور مومن ہیں۔ تاریخ کا شعر یوں ہے

کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب ارم میں عارف و تسکین و مومن

شیرانی دوسرے مصرع کو مصرع تاریخ سمجھ بیٹھے حالانکہ سالک نے اشارہ کیا ہے کہ "ارم" کے اعداد میں عارف، تسکین، مومن کے اعداد جوڑ لیجیے تو تاریخ ۱۲۶۸ھ ہاتھ آجائے گی۔

اشعار کا صحیح انتساب

عطا صاحب نے اشعار کے غلط انتساب کو دریافت کر کے ان کے واقعی خالق کا پتہ دیا اور کئی بار ایسی صورتوں میں جب کہ مصنف اصلی غیر معروف شاعر تھا مثلاً

۹ ص۳۹ ڈاکٹر وحید اختر نے اپنی کتاب "خواجہ میر درد" میں ص۲۲۵ پر ذیل کے دو شعر قائم سے منسوب کیے ہیں:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

عطا صاحب نے انکشاف کیا کہ پہلا شعر رشک پسر شیفتہ کا ہے اور دوسرا جمیل سہسوانی کا

۱۰ ص۵۶ دیوان جہاں مرتبۂ کلیم الدین احمد میں ولی مرشد آبادی کے نام سے ایک غزل ہے جس کا مقطع ہے

سارے جہاں میں دھوم مچاؤں تو شرط ہے شاگرد ہو گئے (کذا۔ ہو کے؟) گلشن نامی کا اے دل

عطا صاحب کے مطابق یہ غزل ولی دکنی یا گجراتی کی ہے

۱۱ ص۹۶ سید حسین عابدی (صحیح سید صفدر حسین عابدی) کی کتاب مانی جائسی، حیات اور شاعری، میں ذیل کا شعر مانی سے منسوب کیا ہے۔

دست یاران وطن سے نہیں مٹی درکار دب رہوں گا میں کسی ریگ بیاباں کے تلے

عطا صاحب نے تصحیح کی کہ یہ آتش کا ہے

۱۲ ص۱۵۹۔ مالک رام صاحب نے تذکرۂ معاصرین جلد چہارم میں سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کی روایت سے ایک لطیفے یا واقعے میں ذیل کا شعر اکبر الٰہ آبادی سے منسوب کیا ہے۔

دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے تالی اکبر   ہم اکیلے ہی محبت کو نبھائیں کیوں کر

جناب عطا انکشاف کرتے ہیں کہ یہ شعر اکبر داناپوری کا ہے۔

چونکہ عطا صاحب نے متعدد تذکروں کی تلخیص یا ترتیب کی ہے اس لئے ان کی نظر میں غیر مشہور شعرا تک کے حالات و اشعار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ادب سے متعلق غلط روایات پر ان کی نظر خود بخود ٹھٹھک جاتی ہے۔

اب اُن کے کام کے دوسرے پہلو پر غور کیا جاتا ہے۔

تصحیحِ اغلاط سے بہت فائدہ ہوتا ہے لیکن ایک خیال آتا ہے کہ کیا یہ کام اتنا اہم ہے کہ اس پر باقاعدہ جم کر تحقیق کی جائے۔ ادبی تاریخوں اور متفرق مضامین میں سنین وغیرہ کی غلطیاں کثرت سے ملتی ہیں۔ اگر ان سب کی اصلاح کی ذمے داری اپنے سر لے لی جائے تو پھر اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ فدائی فوجدار کی طرح ایک ایک کتاب اٹھا کر اس میں اسقام تلاش کرتے رہیے صفیر بلگرامی، نصیر حسین، خیال اور رشاد عظیم آبادی کی کتابیں، رام بابو سکسینہ کی تاریخِ ادبِ اردو، گلِ رعنا، شعر الہند، حامد حسن قادری کی داستانِ تاریخِ اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین کی تاریخِ ادبِ اردو غرضیکہ کوئی کتاب اٹھا لیجئے اور اس میں عمر بسر کر دیجئے اگر کسی کتاب کی محض اغلاط گنائی جائیں اور خوبیوں سے صرفِ نظر کیا جائے تو مہاتما گاندھی کے اس قول کی یاد آئے گی جو انھوں نے مس میو کی انگریزی کتاب "مدر انڈیا" کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ یہ گندی نالی کے انسپکٹر کی رپورٹ ہے میرے نزدیک موزوں تر یہ ہے کہ اپنی طرف سے کچھ لکھتے وقت اس موضوع پر دوسروں کی تحریروں میں کوئی تسامح دکھائی دے تو صورتِ حال پیش کر دی جائے کسی کتاب یا مقالے پر تبصرہ لکھنا ہو تو اس کے دونوں پہلو پیش کئے جائیں۔ محض خوبیوں پر اکتفا کرنا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا محض غلطیاں گنانا۔ اگر عیب جوئی کو پیشہ بنا لیا جائے تو اپنی طرف سے تعمیری کام کرنے کا وقت ہی نہیں بچے گا

زیرِ نظر کتاب میں عطا صاحب نے بار بار اشارہ کیا ہے کہ اردو میں ۲، ۳، ۴، ۷ جیسے اعداد میں خلط ملط اور سہوِ کتابت کا بہت زیادہ امکان رہتا ہے، اس کے باوجود انھوں نے بعض ایسی غلطیوں پر اعتراض کیا ہے جو صریحاً سہوِ کتابت ہی ہیں مثلاً

۱ ص۱۴ گلِ رعنا میں ص ۲۱۵ پر میر انیس کی تاریخِ وفات ۱۳۹۲ھ دی ہے اور اس طرح میر انیس کی عمر ایک سو ایک سال بڑھا دی ہے حالانکہ انیس کی وفات ۱۲۹۱ھ میں ہوئی۔

عرض ہے کہ ۱۳۹۲ھ برابر ہے ۷۳-۱۹۷۲ء کے جب کہ گلِ رعنا وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے ۱۲۹۲ھ لکھا ہوگا اور محض ایک سال کا گھپلا کیا ہوگا۔

۲ ص۱۶ کاظم علی خاں نے تنقیدی تجزیے ص ۲۶۷ پر آتش کی وفات ۱۲۶۳ھ/۱۸۶۷ء دی ہے۔ عیسوی سال ۱۸۴۷ء ہونا چاہیئے۔

عرض ہے کہ کاظم علی خاں اچھے محقق ہیں۔ وہ لکھنؤ کے اتنے بڑے شاعر کا سنہ وفات غلط نہیں لکھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کاتب نے ۱۸۴۷ء کے ۴ کو ۶ لکھ دیا ہوگا۔

۳ ص۵ امیر حسن نورانی نے گلزارِ نسیم کا سنہ طباعت ۱۲۶۰ھ مطابق ۴-۱۸۰۳ء دیا ہے۔ عطا صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۸۶۰ء کا تطابق ۱۸۴۴ء سے ہے نہ کہ ۱۸۰۳ء سے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ۱۸۶۰ء کا تطابق ۴۴-۱۸۴۳ء سے ہے کاتب نے ۴-۱۸۰۳ء لکھ دیا ہوگا۔ نورانی ہرگز نہیں سمجھ سکتے کہ گلزارِ نسیم ۱۸۰۳ء میں چھپ گئی تھی۔

یہاں عطا صاحب اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ ہجری سال کے مقابلے میں عیسوی سال اور عیسوی سال کے مقابلے میں ہجری سال دیتے وقت دو سال لکھنے چاہئیں لیکن سب سے بڑی حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ نورانی نے تو ۱۲۶۰ھ کے متوازی دو ہجری سال دیے ہیں لیکن خود اسی مقام پر عطا صاحب لکھتے ہیں ۱۲۶۰ھ کا تطابق ۱۸۴۴ء سے ہے نہ کہ ۱۸۰۳ء سے

حقیقت یہ ہے کہ ۱۲۶۰ھ کے پہلے ۱۲ دن ۱۸۴۳ء میں آتے ہیں۔ اس طرح اس کا تطابق محض ۱۸۴۴ء سے نہیں ۱۸۴۳ء سے بھی ہے۔ عطا صاحب نے ص ۱۱۱ پر بھی ۱۲۱۸ھ م ۱۸۰۴ء لکھا ہے حالانکہ ۱۲۱۸ھ مطابق ہے ۴-۱۸۰۳ء کے۔ حیرت ہے کہ عطا صاحب نے ص ۵۰ پر خود ہی اس اصول کی خلاف ورزی کی اور تین سطر بعد اصول کی تلقین کی۔

۴ ص ۹۵ ۔ ڈاکٹر صلاح الدین کی مرتبہ ، دہلی کے اردو مخطوطات ، کے ص ۴۴ پر ایک مخطوطہ "مجموعۂ شمسی" کا ذکر ہے اس کا سنہ کتابت مرتب نے ۱۰۸۰ھ دیا ہے لیکن ترقیمے میں سہواً ۸۰۶ اچھپ گیا۔ اس سے عطا کاکوی صاحب کو طنز و استہزا کا سامان میسر آگیا۔ لکھتے ہیں کہ اس ترقیمے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً تین سو سال پہلے اردو کی یہ کتاب ضبطِ تحریر میں آچکی تھی۔ عطا صاحب کو سوچنا چاہئے تھا کہ اس مطبوعہ ترقیمے سے یہ صاف پتا چلتا ہے کہ کاتبِ فہرستِ مخطوطات نے اعداد الٹ کر لکھ دیے ہیں۔

۵ ص ۱۳۵ ۔ حال میں مکاتیبِ شیرانی لاہور میں چھپی ۔ اس میں شیرانی صاحب نے مجموعۂ نغز کا سن تالیف ۱۲۲۱ھ دیا ہے عطا صاحب لکھتے ہیں شیرانی صاحب خود اس کے مرتب ہیں۔ اس کا سالِ تصنیف تالیف ۱۲۲۱ھ ہے ۔ اگر یہ سہو ہے تو تصحیح کر کے سجدہ سہو لازم آتا ہے۔" اگر" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عطا صاحب کے نزدیک یہ امکان بھی ہے کہ شیرانی مجموعۂ نغز کا سنہ تالیف واقعی ۱۲۲۱ھ سمجھتے ہوں۔ اور اگر سہوِ کتابت حال میں چھپنے والی کتاب "مکاتیبِ شیرانی" کے کاتب سے سرزد ہوا ہو تو کیا شیرانی قبر میں سجدہ سہو کریں گے ؟

میں عرض کرتا ہوں کہ اس قسم کے بدیہی تسامحاتِ کتابت کی تصحیح کرنا غیر ضروری اور تضیعِ اوقات ہے اور یہ بھی اس شکل میں کہ اس کتاب "غلطیہائے مضامین" میں اغلاطِ طباعت کی بھرمار ہے جن میں کئی اغلاط سنین کی ہیں ۔ اگر ناشر کوئی دوسرا ہو، کتاب کسی دوسرے شہر میں چھپی ہو تب تو مصنف بری الذمہ ہو جاتا ہے لیکن عطا صاحب اپنی کتاب کے خود ہی ناشر ہیں اور کتابت و طباعت دونوں انہیں کے شہر پٹنہ میں ہوئیں۔ کم از کم کوئی غلط نامہ تو دے دیا ہوتا۔ اغلاطِ طباعت کی چند مثالیں

ص ۷ ، سطر ۱۰ ایضاہرت کے لفظ کو کاٹ کر اس کے اوپر مضاہرت لکھنا چاہا ہے لیکن وہ پڑھا نہیں جاتا۔

ص ۸ ، سطر ۱۲ نیز ۱۵ ت کی ردیف ۔ ردیف ت بجائے ن کی ردیف ، ردیف ف

ص ۱۹ ، سطر ۱۵ بطوع رغبت بجائے بطوع و رغبت

ص ۵۲ ، سطر ۷ ، پیشِ طبیعت منجم تر بجائے پیشِ طبیب منجم

ص ۵۷ پر سطر ۱۴ اور ۲۰ یکساں ہیں ۔ سطر ۱۴ حشو ہے ، سطر ۲۰ صحیح مقام پر ہے۔

ص ۵۹ ، سطر ۱۲ کارِ میر ، بجائے افکارِ میر ،

ص ۷۵ ، سطر ۱۰ ایک مولانا ان ، بجائے ایک مولانا شہید ان ،

ص ۷۸ ، سطر ۷ اشارت علی تصدق ہے ، بجائے ، اشارت علی صدق ہیں ،

چونکہ مصرعِ تاریخ میں تخلص صدق ، دیا ہے اس لئے تصدق کے بجائے صدق ہونا چاہئے ،

ص ۸۰ سطر ۶ ص ۲۱۷ بجائے ۳۱۷

ص ۹۷ ، سطر ۲ ہوس اسمتھ بجائے لیوس اسمتھ

ص ۹۹ ، سطر ۵ ، ۶ ، ولادت کے متعلق ، بجائے ولادت کے مقام کے متعلق ،

ص ۱۰۶ ، سطر ۱۷ ۱۱۲۴ھ بجائے ۱۱۳۴ھ

ص ۱۱۱ ، آخری سطر تاریخِ آصفی مصنفۂ ابو طالب لندنی کا اردو ترجمہ ڈاکٹر ثروت علی نے کیا جو ادارۂ صبحِ ادب دہلی سے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ۱۹۱۸ء غلط ہے۔ کوئی حالیہ سال ہوگا۔

ص ۱۲۸ ، سطر ۹ ثگن بجائے فیلن

ص ۱۳۸ ، سطر ۷ مضامین معلوماتی اور مفید نہیں ، بجائے ۔۔۔۔۔ مفید ہیں

ص ۱۴۵ ، سطر ۳ سالِ تصنیف ۱۲۱۵ھ ہے ، بجائے ۔۔۔۔۔ ۱۲۲۵ھ ہے۔

وہ پچھلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ اعداد انگریزی میں لکھے جائیں تاکہ کتابت میں غلطی نہ ہو۔ اسیر نگر نے مثنوی کی تاریخ ۱۲۲۵ھ لکھی ہے۔ عطا صاحب نے

انگریزی اعداد کے باوجود لکھا جو سہوِ کتابت نہیں۔

ص ۱۴۶، سطر ۶ حکیم سید عبدالحسنی بجائے حکیم سید عبدالحیٔ

ص ۱۵۲، سطر ۱۴ "عشقی تخلص خود نشر عشق کے دگھسیاڈ کا ہے"

معلوم نہیں یہاں کیا کہنا چاہتے ہیں اور "گھسیٹاؤ" کا ہے کی تخریب ہے

ص ۱۵۵، آخری سطر نیز ص ۱۵۶ پہلی سطر۔ مؤلہ برہان۔ بجائے موید برہان

ص ۱۵۸، سطر ۱۴ اکیلے ہی بجائے اکیلے ہیں۔ ممکن ہے "ہی" صحیح متن ہو لیکن یہاں تذکرۂ معاصرین سے نقل کیا ہے اور اس میں "اکیلے ہیں" ہے اب ترتیب وار کچھ مشاہدات پیش کئے جاتے ہیں۔

۱ ص ۷۔ تجلی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کے سنہ تصنیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں "ڈاکٹر گیان چند ۱۲۰۷ھ پر مصر ہیں"

سچ یہ ہے کہ اس مثنوی کے مصرعِ تاریخ کے مختلف متون سے مختلف تاریخیں نکلتی ہیں جنہیں میں نے "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے زیرِ طبع دوسرے ایڈیشن میں دیا ہے۔ ان میں ۱۲۰۷ھ کو ترجیح ہے۔ اس کی قطعیت پر اصرار نہیں۔

۲ ص ۱۵، وہ صحیح لکھتے ہیں کہ منجر عشق ابوالحسن کاندھلوی کی تصنیف ہے۔ یہی میں نے اپنی کتاب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے ص ۲۶۴ پر لکھا ہے۔ اس مقالے پر ۱۹۶۰ء میں ڈگری ملی، ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

اس صفحے پر وہ مثنوی فریبِ عشق کی تاریخ ۱۲۶۲ھ لکھتے ہیں جب کہ ص ۵۱ پر ۱۲۶۴ھ لکھی ہے۔ معلوم نہیں ان کا کیا ماخذ ہے۔ میں اس مثنوی کی قطعی تاریخ دریافت نہ کر سکا۔ ص ۱۵ پر ہی بہارِ عشق کی تاریخ ۱۲۶۳ھ دی ہے۔ میں نے اردو مثنوی شمالی ہند میں طبع اول ص ۵۰۰ پر اس کی بحث کی ہے۔ یہ مثنوی ایک نواب کی فرمائش پر لکھی گئی اور پہلی بار شوال ۱۲۶۶ھ میں شائع ہوئی۔ قیاس ہے کہ تصنیف کے بعد طباعت میں دیر نہ ہوئی ہوگی اس لئے یہ ۱۲۶۶ھ کی تصنیف ہونی چاہئے۔

۳ ص ۹۴ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے کہ سودا نے مثنوی سحرالبیان دیکھ کر میر حسن کو داد دیتے ہوئے کہا کہ تم نے یہ مثنوی ایسی کہی ہے کہ میر غلام حسین کے بیٹے نہیں معلوم ہوتے۔

عطا صاحب نے واضح کیا کہ مثنوی ۱۱۹۹ھ کی تصنیف ہے جب کہ سودا ۱۱۹۵ھ میں انتقال کر چکے تھے۔ راقم الحروف نے بھی اپنی کتاب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے ص ۳۰۴ پر یہی گرفت کی ہے۔

۴ ص ۹۴ مثنوی گلزارِ نسیم کے سلسلے میں لکھتے ہیں

مخمور اکبرآبادی اس کا سالِ تصنیف ۱۸۳۳ء بتاتے ہیں،

چونکہ عطا صاحب محققوں کی غلطیوں کی گرفت کر رہے ہیں اس لئے متوقع تھا کہ وہ اصولِ تحقیق کی کماحقہٗ پابندی کریں گے۔ حوالہ دینا چاہیے کہ مخمور نے کس کتاب یا مضمون میں یہ سنہ درج کیا ہے میں واضح کر دوں کہ یہ ان کی کتاب "صحیفۂ تاریخِ اردو" ص ۱۷۷ پر ہے۔

حوالے اور ماخذ کو عطا صاحب نے بارہا نظرانداز کیا ہے مثلاً کتاب کا پہلا ہی جملہ ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں،

قاری جاننا چاہے گا کہ کس مقالے میں؟ لیکن چونکہ یہ اقتباس ایک اردو کتاب "بنگال میں اردو" مولفۂ وفا راشدی سے لیا ہے اس لئے عطا صاحب کی ذمہ داری کم ہو جاتی ہے۔ ص ۵۲ پر اندراج ہے۔

خلیق انجم صاحب "میر تقی کے ادبی معرکے" کے تعرّف میں لکھتے ہیں،

واضح کرنا چاہئے کہ یہ کس کی کتاب ہے۔ ہر شخص نہیں جانتا کہ یہ محمد یعقوب کی ہے۔

ص ۵۹ پر "افکارِ میر" سے قاضی عبدالودود کے اقتباسات دیے ہیں۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے "افکارِ میر" قاضی صاحب کی تصنیف ہو۔ یہ کوئی مشہور کتاب تو ہے نہیں۔ لکھنا چاہئے تھا افکارِ میر مولفۂ ایم حبیب خاں، علی گڑھ ۱۹۶۷ء

۵ . ص ۲۲ پر اس مشہور شعر کی بحث ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی   دِوانہ مر گیا آخر کو، ویرانے پہ کیا گزری ؟

لکھتے ہیں کہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں صرف یہ لکھا ہے کہ سراج الدولہ کی شہادت کی خبر سن کر موزوں نے یہ شعر پڑھا۔ چونکہ یہ شعر تذکرہ مسرت افزا میں بادنیٰ تغیر مرزا ابراہیم مشتاق بنارسی کے نام دیا ہے اس لئے یہ شعر مشتاق کا ہے جسے موزوں نے سن رکھا ہوگا اور اس موقع پر پڑھ دیا۔

میں اس شعر کے انتساب کو تفصیل سے پرکھنا چاہتا ہوں۔

تذکرہ میر حسن تذکرہ مسرت افزا پر مقدم ہے۔ موزوں کے حالات دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے نہیں لیے۔ عطا صاحب کا کہنا ہے کہ تذکرہ میر حسن میں صرف یہ ہے کہ یہ شعر موزوں نے پڑھا، اس عبارت سے اکثر لوگوں کو یہ شبہہ ہوا کہ موزوں ہی کا برجستہ موزوں کیا ہوا ہے۔[۶۳] تذکرے کے نسخہ انجمن کے الفاظ ہیں "فی البدیہہ این شعر می خواند"۔ فی البدیہہ کا لفظ عموماً شعر کے فوراً تخلیق کرنے کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قارئین اس فقرے کے صحیح معنی سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے قدیم ترین مخطوطے نسخہ سلطان المدارس، لکھنؤ کی بنیاد پر تذکرے کو از سر نو مرتب کیا ہے۔ اس نسخے میں متعدد و بیش بہا معلومات مزید ہیں۔ اس کے الفاظ ہیں۔

"فی البدیہہ یک شعر گفتہ می خواند و می گریست"

"گفتہ" کے لفظ کے بعد تو بات صاف ہو گئی۔

ب مسرت افزا ص ۲۲۴ پر مرزا ابراہیم مشتاق بنارسی کا احوال ہے۔ اس کا ذکر کسی اور تذکرے میں نہیں۔ اسے عنفوانِ شباب میں مالیخولیا ہو گیا تھا۔ علاج کے باوجود خللِ دماغ ٹھیک نہ ہوا۔ وہ کہیں نکل گیا اور اس کے بعد کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا کیا ہوا۔ اس کے چند اشعار مشتاقوں کی زبان پر مشہور تھے جن میں سے آخری شعر یہ ہے۔

غزالو تم تو حاضر ہو، کہو مجنوں کے ماتم میں   دِوانہ مر گیا جس وقت، میخانے پہ کیا گزرا

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ غزالوں اور مجنوں سے مے خانے کا کیا تعلق ؟۔

میر حسن نے تذکرہ فیض آبادی میں لکھا، صاحب مسرت افزا نے کلکتے میں۔ مشتاق کے اشعار سنی سنائی پر مبنی ہیں۔ دیوانے کا کیا ہوا، معلوم نہیں اس نے موزوں کا شعر تو نہیں پڑھ دیا تھا یا لوگوں نے اس کے اشعار دہرانے میں سہواً موزوں کا شعر اس سے منسوب کر دیا ہو۔ اس کے اشعار کی روایت میں کہاں تک احتیاط برتی گئی ہوگی۔ میخانے کا لفظ راوی کی غلط گوئی پر دال ہے۔

ج ظاہر ہوا یہ شعر ایسا نہیں جو غزل کے بیچ کہا گیا ہو۔ یہ کسی خاص موقع پر کہا ہوا فرد معلوم ہوتا ہے۔ میر حسن نے اس کی جو شانِ نزول بیان کی ہے وہ شعر کے مفہوم پر بالکل برجستہ اترتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے مجھے اپنے مکتوب مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۸۶ء میں لکھا

"مجھے نہ معلوم کہاں سے یہ یاد تھا کہ غزالاں تم تو واقف ہو . . . جس غزل میں ہے وہ پوری غزل میں نے دیکھی ہے، بلکہ ایک اور شعر (مطلع) بھی اس کا مجھے یاد ہے

نہ جانے جام و مینا اور پیمانے پہ کیا گزری   میں اٹھ کر جب چلا آیا تو مے خانے پہ کیا گزری

ممکن ہے "غزالاں ....." والے شعر کے علاوہ باقی سب الحاقی یا موضوعی ہوں، لیکن غزل میں نے دیکھی ضرور ہے۔"

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بھی مجھے ۱۵ مئی ۱۹۸۶ء کے خط میں لکھا کہ انھوں نے بہار کے کسی محقق کی کتاب میں یہ پوری غزل دیکھی ہے۔

چونکہ یہ مطلع اور دوسرے شعر کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرے اس لئے زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ الحاقی ہیں لیکن اس سے ایک بات معلوم ہوئی کہ ردیف میں "گزرا" کے بجائے "گزری" کی روایت زیادہ مضبوط ہے جس کی دوسروں نے بھی تقلید کی

چونکہ تذکرہ میر حسن میں شعر کا متن، اور شعر کا شانِ نزول زیادہ معقول ہے بہ نسبت مسرت افزا کے ناقص متن کے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے

شعر کو موزوں سے لے کر مشتاق کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔

ص ۸۔ راقم الحروف کی کتاب "تحریریں" نیز "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے اوراق پر لکھا ہے کہ میر حسن نے فضائل علی خاں کا ذکر ردیف ن میں کیا ہے۔ ساتھ ہی بے قید تخلص لکھا ہے جس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ بے قید تخلص تھا یعنی نام کے سوا اس کا اور کوئی تخلص نہ تھا۔

عطا صاحب نے تذکرۂ میر حسن میں فضائل علی خاں کے حالات کے آخری حصے کی طرف توجہ دلائی جس میں میر حسن نے صریحاً کہا ہے کہ میں نے ان کے نام کی رعایت سے ان کا ذکر حروفِ فا میں کر دیا ہے۔ مجھ سے سہو ہوا۔ دراصل از روئے تخلص حرف با میں ہونا چاہئے تھا۔

عطا صاحب لکھتے ہیں کہ میر حسن کی اس صراحت کے بعد بحث ہی ختم ہو جاتی ہے۔ راقم الحروف مانتا ہے کہ میر حسن نے "بے قید تخلص" کے معنی یہ نہیں لیے وہ شخص جو تخلص کی قید سے آزاد ہو، کیوں کہ میر حسن واقعی اس کا تخلص بے قید سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا ہم اسے حتمی فیصلہ مان لیں، جس صراحت سے میر حسن نے اس کا تخلص بے قید قرار دیا ہے اسی صراحت سے مسرت افزا میں لکھا ہے ——— فضائل علی خاں، فضائل تخلص

مسرت افزا کا مولف امر اللہ ابو الحسن الٰہ آباد کا رہنے والا ہے۔ فضائل علی خاں نے اپنی مثنوی قیامِ الٰہ آباد میں لکھی۔ امر اللہ ان دنوں بھی الٰہ آباد ہی میں تھا۔ اس عہد میں الٰہ آباد بڑا شہر نہ ہوگا۔ ایک لاکھ سے کم آبادی ہوگی۔ رقبہ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ اردو کے ادیب ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے امر اللہ فضائل علی خاں کے کلام کا رسیا تھا۔ لکھتا ہے وقتِ تحریرِ تذکرہ مثنوی اس کے سامنے نہیں لیکن خورد سالی سے جو اشعار یاد ہیں انہیں کو لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ اور یہ کتنے اشعار ہیں؟ پورے ۷۶ جو اس کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ میر حسن نے ۲۲ شعر اور صاحبِ گلزارِ ابراہیم نے محض ۱۳ لکھے ہیں۔ امر اللہ نے فضائل کے حالات بھی سب سے زیادہ تفصیل سے دیے ہیں۔ بالعموم میر حسن کو زیادہ ثقہ تذکرہ نگار مانا جائے گا لیکن فضائل علی خاں کے معاملے میں امر اللہ سب سے زیادہ باخبر تذکرہ نگار ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ہم شہر، معاصر، شائق فضائل علی خاں کے بیان کو ترجیح دیں کہ میر حسن کے بیان کو دونوں امکانات ہیں لیکن میں فضائل علی خاں کے سب سے بڑے عارف کے بیان کو ترجیح دوں گا۔

۷ ص ۹، لکھتے ہیں

"حالی حیاتی، حیات اور شاعری، سید حسین عابدی کی ایک تصنیف ہے" عرض کرتا ہوں کہ کتاب کے نام میں "حیات اور شاعری" نہیں "حیات و شاعری" ہے نیز مصنف کے نام کا اہم ترین جز چھوٹ گیا ہے۔ اس کا پورا نام سید صفدر حسین عابدی ہے۔

۸ ص ۸۰۔ اب میری ایک بڑی غلطی۔ میرا ایک مضمون "غالب کے نقاد" صحیفہ لاہور بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا جو بعد میں میرے مجموعے "رموزِ غالب" میں شامل ہوا۔ میں نے اس میں ص ۱۰۳[1] پر لکھا ہے۔

"نظامی بدایونی کے مرتبہ دیوانِ غالب کے دیباچے میں سرسید کے صاحبزادے ڈاکٹر سید محمود نے غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار قرار دیا"

عطا صاحب نے بہت دلچسپ انداز میں تصحیح کی کہ مقدمہ نگار سرسید کے بیٹے جسٹس محمود نہیں بلکہ بہار کے لیڈر ڈاکٹر سید محمود ہیں"

عطا صاحب درست فرماتے ہیں۔ میرے پاس صحیفے میں شائع شدہ مضمون نہیں کہ دیکھ سکتا کہ اس میں بھی "سرسید کے صاحبزادے" کا فقرہ ہے کہ نہیں۔ میں ۱۹۶۹ء میں ماخذ اور حوالوں کے اعتراف کا اتنی شدت سے پابند نہ تھا جیسا کہ اب ہوں۔ میں نے بدایونی ایڈیشن نہیں دیکھا۔ صحیح یاد نہیں کہ میں نے مندرجہ بالا مقولہ کہاں سے نقل کیا تھا۔ سوچنے پر یہی یاد آسکا کہ میں نے ڈاکٹر عبد اللطیف کی کتاب "غالب" سے لیا ہوگا۔ اب یہ کتاب میرے سامنے نہیں۔ میں نے کالی داس گپتا رضا صاحب کو لکھا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبد اللطیف کی کتاب غالب مطبوعہ ۱۹۲۲ء کے ص ۱۱ سے یہ جملہ لکھ کر بھیجا۔

"ایک اور نقاد ڈاکٹر سید محمود بیرسٹر ایٹ لا میں بھی یہی رجحان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے جو بدایونی نسخہ کے دیباچے میں غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنا دیتے ہیں۔"

اگر میرا ماخذ یہی ہے تو سرسید کے صاحبزادے، میرا اپنا اضافہ ہے حالانکہ میں اس بات سے واقف ہوں کہ سرسید کے بیٹے جسٹس محمود تھے اور اس سے بھی واقف ہوں کہ بہار کے کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود تھے۔ میں نے آخر الذکر کو دیکھا اور سنا ہے، غالباً انجمن ترقی اردو کی کانفرنس

[1] سہوِ کتابت سے عطا صاحب کی کتاب میں صفحے کا نمبر ۲۱۰ چھپ گیا ہے۔

ہیں۔ شاید مجھے موبیرسٹر ایٹ لا کے فقرے سے غلط فہمی ہوئی ہو کہ یہ جسٹس محمود ہوں گے کیونکہ ڈاکٹر سید محمود کے بارے میں مجھے علم نہ تھا کہ وہ بیرسٹر بھی تھے۔ کالی داس گپتا صاحب نے مجھے دیوانِ غالب مطبوعہ نظامی پریس بدایوں طبع پنجم ۱۹۲۳ء سے مقدمہ نگار کا نام یوں لکھا ہے۔

از ڈاکٹر سید محمود صاحب پی۔ایچ۔ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ

اس میں بات بالکل صاف ہو گئی۔ مقدمے پر تاریخ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء درج ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ جسٹس محمود اس وقت تک انتقال کر چکے تھے۔ بہر حال مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میرے ذاتی ذخیرے میں نظامی پریس کے دیوان کی طبع ششم ہے لیکن اس میں مقدمہ ندارد ہے، نکل گیا ہوگا۔

۹ ص ۹۲۔ غالب کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں پانچ سو روپیہ ماہانہ غالب کا مقرر کیا تھا۔ دو سال بعد سلطنت نہ رہی۔

راقم الحروف یہ دیکھ کر چونکا کہ غالب اتنے رئیس کب تھے کہ انہیں اسی زمانے میں پانچ سو روپے ماہانہ کی یافت ہوتی۔ شیخ اکرام کا غالب نامہ دیکھا تو اس میں لکھا پایا

غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ دربارِ اودھ سے ان کے نام پانچ سو سالیانہ بھی مقرر ہوا تھا۔ [۱]

جناب کالی داس گپتا رضا غالبیات کے معتبر محقق ہیں۔ میں نے انہیں لکھ کر پوچھا کہ یہ کس خط کا ذکر ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے مکتوب نومبر ۱۸۶۰ء میں یہ جملے ملتے ہیں۔

"واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے، وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ چلے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی" (خلیق انجم: غالب کے خطوط جلد دوم ص ۶۰۹)

عطا صاحب سہواً سالانہ کی جگہ ماہانہ لکھ گئے

۱۰ ص ۹۴ تا ۹۸ پر ڈاکٹر صلاح الدین کی مرتبہ فہرست، دہلی کے اردو مخطوطات، کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک پروجیکٹ کے تحت پہلے یہ فہرست انگریزی میں تیار کی گئی۔ بعد میں ڈاکٹر خلیق انجم نے انھیں سے اس کا اردو ترجمہ کرکے رسالہ اردو ادب، خاص نمبر ۱۹۸۴ء، شمارہ ۱، ۲ کے طور پر شائع کر دیا۔ عطا صاحب کے جائزے کے بعد ایمان لانا پڑتا ہے کہ جب تک مخطوطات پر اچھی نظر نہ ہو، ان کی فہرست نگاری کا کام ہاتھ میں نہ لینا چاہئے۔ چند اندراجات پر اعتراضات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

ص ۹۵۔ مخطوطہ مجموعۂ شمس کی اشاعتِ اول ۱۸۴۳ء میں اور کتابت ۱۸۶۰ء میں دکھائی ہے۔ عطا صاحب تجاہلِ عارفانہ کے طور پر لکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اشاعت سے کیا مراد ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ کتاب ۱۸۴۳ء میں شائع ہوئی اور اس مطبوعہ ایڈیشن کو نقل کر کے ۱۸۶۰ء میں مخطوطہ تیار کیا گیا۔

ص ۹۵ ہی پر ایک مخطوطے کا نام مونس الارواح بمعروف ہدیۂ ابراہیم دیا ہے۔ عطا صاحب نے مناسب تصحیح کی کہ بمعروف کی جگہ معروف بہ ہونا چاہئے۔ اگر پورا نام ترجمہ مونس الارواح معروف بہ ہدیۂ ابراہیم ہوتا تو بات اور زیادہ صاف ہو جاتی۔ اس کے سنین کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے۔

تاریخ تصنیف ۲۸ رمضان ۱۰۴۹ھ تاریخ کتابت ۱۲۹۵ھ

اس پر عطا صاحب کئی سوال اٹھاتے ہیں جن کا شافی جواب مرتب کے بیان میں موجود ہے لیکن وضاحت سے نہیں۔ فارسی کتاب مونس الارواح کی تاریخ تصنیف ۱۰۴۹ھ ہے۔ اردو ترجمے کی تاریخ تالیف اور تاریخ کتابت دونوں ۱۲۹۵ھ ہیں۔

ص ۹۷۔ زیر بحث فہرست میں چار درویش کے انگریزی ترجمہ از لیوس اسمتھ کا سنہ اشاعت ۱۹۷۰ء دیا ہے۔ انہوں نے اس سنہ پر شبہہ ظاہر کیا ہے۔ سہو کتابت سے عطا صاحب کی کتاب میں مصنف کا نام لیوس اسمتھ چھپ گیا ہے۔ بلوم ہارٹ کی سپلیمنٹ فہرست مطبوعات ہندوستانی

۱؎ غالب نامہ ص ۱۱۱ ناشر احسان بک ڈپو لکھنؤ سنہ طباعت ندارد

برٹش میوزیم میں اس ترجمے کی یہ تفصیلات ہیں

L.F SMITH : THE TALES OF FOUR DURWESH WITH NOTES; CALCUTTA, 1813

قرینِ قیاس نہیں کہ اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۹ء میں چھپا ہو

۱۱ ص ۱۰۶۔ کالی داس گپتا رضا نے سہو دوسرا نسخہ میں لکھا ہے کہ ناسخ نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر پائی ہوگی۔ چونکہ ناسخ ۱۲۵۴ھ میں مرے، عطا صاحب نے اس میں سے ۸۰ منہا کر کے رضا صاحب کے مطابق ناسخ کا سنہ ولادت دریافت کرنا چاہا۔ ۱۲۵۴ میں سے ۸۰ کم کرنے سے ۱۱۷۴ھ آتا ہے۔ حساب اور کتابت کے سہو سے یہ ۱۱۴۴ھ چھپا ہے۔ چونکہ عطا صاحب لکھتے ہیں کہ اس طرح ناسخ میر سے بھی ایک سال بڑے قرار پاتے ہیں اس سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ عطا صاحب نے ۱۱۲۴ھ لکھنا چاہا ہوگا۔ واضح ہو کہ میر کا سنہ ولادت ۱۱۲۵ھ مانا جاتا ہے۔ عطا صاحب کی حساب کی غلطی کو سہوِ کتابت نے المضاعف کر دیا۔

کتاب کے ص ۱۲۵ پر وہ حساب کی غلطی کی بہت معذرت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس کو ۱۱۸۴ھ ہونا چاہئے۔ چونکہ ۷ اور ۸ کے اعداد میں صوری مشابہت نہیں اس لئے یہ امکان کم ہے کہ کاتب نے ۱۱۷۴ھ کو ۱۱۸۴ھ لکھ دیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے عطا صاحب نے حساب میں پھر چوک کی ہے۔

۱۲ ص ۱۱۱۔ لکھتے ہیں کہ زرّیں نے بھی یہ قصہ اسی سال لکھا جس سال میر امّن نے باغ و بہار لکھی یعنی ۱۲۱۸ھ م ۱۸۰۴ء میں۔ دونوں نے اپنی کتاب کی تاریخ "باغ و بہار" بھی لکھی ہے۔

عرض ہے کہ باغ و بہار سے ۱۲۱۷ حاصل ہوتا ہے ۱۲۱۸ نہیں۔ چونکہ عطا صاحب نے ہجری سال میں ایک کا اضافہ کر دیا اس لئے عیسوی سال میں بھی ایک بڑھ گیا، لیکن وہ اپنے وضع کردہ اس اصول کو بھول گئے کہ ہجری سال کے متوازی دو عیسوی سال دینے چاہئیں۔ میر امّن نے باغ و بہار کے آخر میں قطعے میں کہا ہے۔

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار — تھی سنہ بارہ سو سترہ در شمار

اور اس سے پہلے نثر میں کھول کر لکھا ہے

"جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا۔ باعث عدمِ فرصت کے بارہ سو سترہ سنہ کی ابتدا میں انجام ہوئی"

۱۲۱۷ھ کی ابتدا مساوی ہے ۱۸۰۲ء کے۔ اس طرح باغ و بہار کا سنہ تصنیف ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۲ء ہے جب کہ غوث زرّیں کے چار درویش کی تاریخ ۱۲۱۷ھ م ۳-۱۸۰۲ء ہے۔ عطا صاحب کی درج کردہ تاریخیں دونوں کتابوں کے لئے غلط ہیں۔

۱۳ ص ۱۱۹۔ انگریزی کتاب "گلکرسٹ اینڈ دی لینگویج آف ہندوستان" کے مصنف کا نام انہوں نے صادق الرحمٰن قدوائی لکھا ہے۔ انگریزی میں صدیق اور صادق ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے۔ کتاب کے مصنف جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دلّی کے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی مشہور آدمی ہیں۔ عطا صاحب کو ان کے نام کے بارے میں مغالطہ ہوا۔

۱۴ ص ۱۴۵ اسپرنگر نے فہرست کتب خانہ، شاہانِ اودھ میں جرأت کی ایک مثنوی کی تاریخ ۱۲۲۵ھ لکھی ہے۔ عطا صاحب کی کتاب میں سطر ۳ میں اس کی تاریخ 1215ھ اور سطر ۵ میں 1225 چھپی ہے۔ اسپرنگر نے 1225 ہی لکھی ہے۔ عطا صاحب لکھتے ہیں:

1225 یوں بھی غلط ہے کیوں کہ جرأت کا انتقال 1224 میں ہو چکا تھا،

عرض ہے کہ جب مثنوی کی تاریخ کی (جو واقعی غلط ہے) تردید جرأت کے سنہ وفات سے کر رہے ہیں تو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جرأت کا سنہ وفات اختلافی ہے۔ ناسخ کے مصرعِ تاریخ ع "ہائے ہندوستان کا شاعر مرا" سے ۱۲۲۵ھ نکلتی ہے جب کہ مصحفی نے کہا ہے۔

گیری از نا معنی اگر تاریخِ او — از قلندر بخش، شصت و دو فگن

۱۲۸۶ − ۶۲ = ۱۲۲۴ھ

۱۵ ص ۱۴۷ حکیم عبدالحی نے لکھا کہ ناسخ کا دیوان دو جلدوں میں ہے۔ عطا صاحب اس کی اصلاح کرتے ہیں۔

ناسخ کے تین دواوین ہیں۔ دوسرا اور تیسرا دیوان مخلوطہ ہے،

میرا خیال ہے 'مخلوطہ' سہوِ کتابت ہے۔ عطا صاحب نے 'مخطوطہ' لکھا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناسخ کے دو ہی دیوان ہیں اور دونوں

مطبوعہ ہیں، مخطوطہ نہیں۔ بعض حضرات فرض کر لیتے ہیں کہ تیسرا دیوان دوسرے دیوان میں ضم ہے یعنی ہر ردیف میں دیوانِ دوم اور دیوانِ سوم کی غزلیں ملی ہوئی ہیں۔

اس مفروضے کے کیا معنی ہوئے؟ اس طرح تو کسی کے بھی ایک دیوان کو دو یا تین یا چار دیوانوں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ ناسخ کے دو مطبوعہ دیوانوں کے علاوہ کسی تیسرے دیوان کا وجود نہیں۔

۱۶ ص ۱۴۷ "آتش کا دو دیوان ہے اور دونوں ان کی زندگی میں چھپا تھا"

اس جملے میں فعل کی وحدت اردو روزمرہ کے خلاف ہے۔ اگر کوئی شے بہت بڑی تعداد میں ہو یعنی سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں تو جمع کے لئے واحد فعل لایا جا سکتا ہے۔ مثلاً

امیر اللہ تسلیم ——— سیکڑوں داغ، لاکھوں روزن تھا

آتش ——— ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ناسخ ——— لاکھ زنجیر ترے گیسوئے خم دار کی تھی

لیکن محض دو کے لئے واحد کا صیغہ نہیں لا سکتے۔ مندرجہ بالا جملہ یوں لکھا جانا چاہئے، آتش کے دو دیوان ہیں اور دونوں ان کی زندگی میں چھپے تھے۔

۱۷ ص ۱۵۹۔ سید مرتضٰی حسین بلگرامی کے ایک بیان کی تغلیط کے بعد کہتے ہیں

"بلگرامی حضرات کے بیانات کو بڑے احتیاط سے باور کرنے کی ضرورت ہے"

وہ صغیر بلگرامی سے بدظن ہیں لیکن جملہ بلگرامیوں کو اس طرح غیر ثقہ قرار دینا بہت نامناسب ہے۔ بلگرام سے شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی اور ان کے بھائی عماد الملک سید حسین بلگرامی کو بھی نسبت ہے کسی قصبے یا شہر کے تمام باشندوں کو کاذب نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ان معروضات کی غرض کتاب کی افادیت کو کم کرنا نہیں۔ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ غلطیاں ہر تحقیقی تحریر میں ہو سکتی ہیں۔ ان سب کی نشان دہی اپنے ذمے لے لینا اپنے وقت کا بہترین استعمال نہیں۔ ہاں کسی موضوع پر لکھتے وقت اس موضوع سے متعلق تحریروں میں جو تسامحات نظر آئیں ان کی اصلاح کر دینی چاہئے۔ ایک یہ بھی صورت ہے کہ کسی بہت بڑے اہلِ قلم نے کسی اہم مسئلے میں غلطی کی ہو تو اس کی نشان دہی کے لئے مراسلہ یا نوٹ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ خامیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ متعلقہ تحریر کی خوبیوں کی طرف بھی اشارہ کیا جائے تاکہ بات یک طرفی نہ بن جائے۔

باقی صفحہ ۱۳۰۔ اداریہ نگاری اور تبصرہ نگاری۔ ایک مطالعہ

اچھے شعر پر نظر جا پڑی اور اس کے بعد تاثر میں ڈوب کر ہر شعر اچھا معلوم ہونے لگا۔ تاثراتی مغالطہ AFFECTIVE FALLACY کے تحت سپرد قلم کیا گیا تبصرہ کس قماش کا ہوگا سو

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

غزلیات، قطعات، رباعیات نیز دیگر اصناف سخن ابھرتے شاعر کے مرکزی خیالات و تصورات پر روشنی ڈالنا برمحل ہی ہوگا۔ استعارات و تشبیہات کی نوعیت کی نشاندہی کر دینا بھی سودمند ہوگا۔ وہ روایت پر محیط ہیں یا ان کو نئی معنویت کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ غزلیہ (آزاد غزل) ہائیکو، دوہا وغیرہ مشمولات پر اسی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر مشمولات نثری نظموں کو محیط ہوں تو پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ ان پر کس طرح تبصرہ کیا جائے، کیا کہا جائے، کس بات سے روگردانی کی جائے، کس پر توجہ مرکوز کی جائے مشکل سوالات ہیں جن سے میں مخاطب تو ہوا ہوں مگر ہنوز کسی ایسے فیصلہ پر نہیں پہنچ سکا ہوں جو مجھے تشفی بخش معلوم ہو۔

اب ایک اور نکتہ پر توجہ مبذول فرمائیں۔ جریدوں یا رسالوں کے خصوصی نمبروں پر تبصرہ کس طرح کیا جائے۔ سب سے پہلی توجہ طلب بات یہ ہے کہ خصوصی نمبر کا موضوع کیا ہے؟ فرض کیجئے، ایک رسالے نے "غالب نمبر شائع" کیا۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ غالب بہ حیثیت موضوع مغلوب ہو گیا، ہاں اگر کوئی رسالہ اساتذہ غالب خصوصی نمبر نکالتا ہے تو غالبیات میں اضافہ ہوگا کیونکہ اس موضوع پر اب تک ایک دو کتابیں ہی نکلی ہیں مگر نام بڑے اور درشن چھوٹے کہاوت پر ہی پوری اترتی ہیں۔ یہ ہیں میرے معروضات، جن کو میں "حرف آخر" کے تحت نہیں رکھتا عم صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مظفر حنفی

(۱)

دروازے پر تھا پردہ
لیکن تم سے کیا پردہ

کرنیں پھوٹ پڑتی تھیں
جھلمل جھلمل سا پردہ

معنی لفظوں کو زنجیر
لفظ معانی کا پردہ

باغی تھے سارے کردار
پھر کیسے اٹھتا پردہ

رنگوں اور لکیروں نے
مل کر فاش کیا پردہ

یادیں پھر سرکاتی ہیں
راتوں کا کالا پردہ

در در آنکھ سوالی ہے
دد چہرہ پردا پردہ

(۲)

مہیب جنگل میں رات کا دم نکل رہا ہے
کہ دوج کا چاند بھی مرے ساتھ چل رہا ہے

کسی نے غرقاب ہو کے دریا کی لاج رکھ لی
کوئی کنارے کھڑا ہوا ہاتھ مل رہا ہے

وہ آبدیدہ ہے حالتِ زار پر ہماری
کسے یقین آئے گا کہ پتھر پگھل رہا ہے

گھلی ملی ہے ہوا میں بارود کی مہک بھی
ہرن پیاسا ہے اور چشمہ اُبل رہا ہے

کھڑے نہ ہو جائیں ہم کہیں پینترا بدل کر
زمانہ ہم سے بہت نگاہیں بدل رہا ہے

اڑو کہ اک زلزلہ سا ہے بال و پر میں رقصاں
رُکو کہ موسم خراب ہے دن بھی ڈھل رہا ہے

غزل کہو اور خوب جم کر کہو مظفر
بہت دنوں سے کوئی کلیجہ مسل رہا ہے

(۳)

سوکھے بنجر کھیتوں کو گرماتا رہتا ہے
ترنے کو بارش کا موسم آتا رہتا ہے

پودوں پر بارود جمی ہے کھلیانوں میں خون
روز ادھر سے لشکر آتا جاتا رہتا ہے

غم کی تاریکی میں بڑھ جاتی ہے دل کی لَو
تیز ہوا میں یہ پرچم لہراتا رہتا ہے

ہمسائے کی بالکنی میں کھل جاتے ہیں پھول
ایک دریچہ آئینہ چمکاتا رہتا ہے

نیل گگن کے نیچے میری آشا کا پنچھی
پنجرے ہی میں اپنے پر پھیلاتا رہتا ہے

تیرے کمرے میں کھلتی ہے زنداں کی دیوار
روزن تیرا ہی چہرہ دکھلاتا رہتا ہے

جس کو دیکھو آج مظفر اپنی غزلوں میں
میرے شعروں کے پیوند لگاتا رہتا ہے

(۴)

شہر کا چہرہ مصفا، آنکھ اتنی زرد کیوں ہے
آسماں نزدیک تو بیشک ہے لیکن گرد کیوں ہے

اس کا خط آیا نہ دیکھا ہے سنہرا خواب کوئی
بے سبب آنکھوں میں آنسو اور دل میں درد کیوں ہے

کیا مغنی کی الاپوں میں شرر سے پھوٹتے ہیں
اے مقرر لفظ تیرے گرم جذبہ سرد کیوں ہے

سوچ کا انجام اک بے نام سی دہشت پہ ہوگا
پوچھنا بھی جرم ہے سہما ہوا ہر فرد کیوں ہے

اے مظفر حق پرستی کا نتیجہ جانتا ہوں
تند موجوں کے سفر میں بلبلہ نامرد کیوں ہے

● ۵۸ سہ بٹالہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماں

اقبال متین ● کہانی۔ ڈی ۔ ۳ ۔ اے سی۔ روڈ گلاؤن کالونی ۔ پوچم پٹہ ۔ ۵۰۳۲۱۹ (آندھرا پردیش)

ڈاکٹر شہلا انجم سے میری ملاقات کو ایک سو نوے دن گذر گئے تھے یعنی چھ مہینے آٹھ دن۔ یکم ستمبر کو میں اس سے پہلی بار اس کے کلنک پر ملا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں کچھ یوں لگا تھا جیسے میں اس کی کسی امانت کو اپنے پاس چھپا رہا ہوں اور وہ ہاتھ بڑھا کر مجھ سے کچھ اس طرح کوئی چیز لے رہی ہے کہ جس سے خود اس کا دوسرا ہاتھ واقف نہیں ہے۔ اور آج اس حقیقت سے نہ وہ انکار کر سکتی ہے نہ میں منکر ہوں کہ وہ خوبصورت بوجھ سا جو وہ اٹھائے ہوئے ہے، وہ بلا شرکت غیرے میری اور اس کی نیتوں کا نتیجہ ہے۔

اس حمل کا اسقاط اس کے لئے بہت آسان تھا اس لئے بھی کہ وہ خود ڈاکٹر تھی ـــــ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ آسان کام اس کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس کے مزاج میں جو گھلاوٹ تھی وہ کچھ اتنی شفاف سی تھی کہ لگتا تھا وہ کسی غیر انسانی آمیزش کو گوارہ ہی نہیں کر سکتی ـــــ جو لڑکی چھونے ہی سے حمل و سمور کا احساس دلاتی ہو اس میں کم در اپن تلاش کرنا جذبے کی اہانت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے مزاج کی نرمی، اس کی ملائمت، اس کا گندھا گندھا سا وجود، اس کے اپنے پیشے سے خائف سے نظر آتے تھے۔ اس کو میں جب کبھی کسی سیریس بچے کا علاج کرتا ہوا دیکھتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کو اس عالت میں دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سی تسلی ہوتی۔ اس پر اتنا پیار آتا جی چاہتا کہ کلینک کی پابندیوں کو نظر انداز کر دوں اور ان آنکھوں کو ہزار بار چوم لوں جو بچے کی ماں کے ساتھ ساتھ سوکھے سوکھے نہ دکھائی دینے والے آنسو اس طرح بہاتی ہیں جنہیں میں صاف صاف دیکھ سکتا ہوں۔ ایسے مواقع پر کبھی اس کو تنہا پا کر میں اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور دھیرج بندھاتا تو وہ کچھ اس طرح جھینپ جاتی جیسے اپنے پیشے کی تکلیف کو سنبھال کر وہ اس مجروح عورت ہی کو مجھ سے چھپا رہی ہے جس کی جراحتیں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں صرف ممتا کی آنکھ دیکھ سکتی ہے ـــــ اور اس کی انہیں آنکھوں نے عمر کے تفاوت کے باوجود مجھے خرید رکھا تھا۔ میری مشاقی، میری تجربہ کاری اس کی معصومیت سے ٹکرا کر اس حد تک پرسکون ہو جاتی کہ زندگی کی خوبصورتی کے سوا سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ـــــ میری ہو کر بھی مجھ سے اجنبیت اپنا سب کچھ سونپ کر بھی اتنی گریز۔ اس کے مزاج کی انہیں رنگا رنگی خزا کنوں نے ایک ایسا سماں باندھ رکھا تھا جو گھر گھر کر چھائی بدلیوں میں ہلکی ہلکی بجلیوں کی بے آواز چمک سے پیدا ہوتا ہے۔

اس کا منگیتر ہر اتوار کو کلینک آنے لگا تھا۔ پہلے وہ مہینے میں ایک دو بار اتوار ہی کو آیا کرتا ـــــ وہ مسکرا کر اس کی پذیرائی کے لئے بڑھتی اگر مریض نہ ہوتے۔ اور اگر مریض ہوتے تو وہ باہر ہی بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا۔

باسط الطاف شہر کے سربرآوردہ کنٹراکٹر احمد الطاف کا اکلوتا بیٹا تھا کاروبار میں نہ صرف باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا بلکہ احمد صاحب کے اثر و رسوخ سے راست باسط کو بھی ٹھیکے ملنے لگے تھے۔

یہ نوجوان شہلا کا ہم عمر ہوگا۔ سال چھ ماہ ادھر ادھر ہو سکتا ہے۔ خوب رو تو نہیں تھا، قبول صورت ضرور تھا ـــــ فطانت میں شہلا سے کم تھا وفاؤں میں شہلا سے زیادہ ـــــ اس کے یہ معنی نہیں کہ شہلا کے جذبہ وفا پر مجھے شک و شبہ تھا۔ میں نے شہلا کے تعلق سے اس وقت جو بات کی ہے وہ باسط الطاف کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ شہلا کی سنجیدہ شخصیت دو خانوں میں بٹ گئی تھی۔ مجھ میں اور باسط میں لگتا تھا ہم دونوں ہی اس کے دل میں رہتے ہیں اور خاموش نہیں رہتے۔ ہمیشہ ہی ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ اس کے سینے میں جو کھلبلی ہے۔ جو واویلا ہے اس کا ہم تینوں میں آخر ذمہ دار کون ہے۔ مجھے تو نہ میں قصوروار لگتا تھا

باسط الطاف۔ لے دے کر ایسے میں نظر صرف شہلا پر ٹھہرتی تھی، اس
نے اپنے جسم کو میرے جسم سے باندھ رکھا تھا اور اپنی روح کو باسط الطاف
ار دی ہے۔۔۔ ایسے میں میں جانتا تھا کہ شکست یقینی طور پر میری ہے۔
ج نہیں تو کل میں ہار جاؤں گا اور شہلا اپنی روح کی ساری توانائی
کے ساتھ اس معصوم کی ہو رہے گی جس کا نام باسط الطاف ہے۔ لیکن
میرے اندازے تیزی سے غلط ثابت ہونے لگے۔ درمیان میں جو ایک
ننھا منا سا وجود آ پڑا تھا اس نے پانسہ ہی پلٹ کر رکھ دیا۔ آغاز
خاطر میں تو میرے وہم و گمان میں یہ بات آئی نہیں تھی کہ ڈاکٹر شہلا
نجم ممتا کا دوسرا نام ہے۔ جب وہ ایسا سب کچھ کر ہی نہیں سکتی جو اس کے
بائیں ہاتھ کا کھیل تھا تو اس نے مجھے اس قدر سپردگی کے ساتھ کس طرح اپنا
لیا تھا۔ آخر یہ افتاد تو پڑنی ہی تھی۔۔۔ پہلے سے ہم نے کوئی احتیاط سرے
سے برتی ہی نہیں تھی۔۔۔ میں اپنے تیئیں یہی سوچ کر دکھی تھا کہ ہر اس وجود
کا جو میرے اور شہلا کے درمیان ہمارے ہی خون اور جسم کا ایک حصہ بن کر
ابھرے گا۔ وہی حشر ہوگا جو وجود اور عدم وجود کا فرق مٹا دیتا ہے، میں
اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی کسی وجود کو جس کا خالق خدا کے بعد میں
ہی تھا، اس طرح ضائع کر دینے کو اپنے ہی ضمیر کے لئے ایک سوالیہ علامت
سمجھتا تھا لیکن ایسی سوالیہ علامتیں شہلا کے سپرد کر دینے کے سوا میرے بس میں
کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ کسی لحاظ سے میرے لئے اولین اہمیت رکھتی تھی۔

میں حیران ہو گیا جبکہ ایک رات شہلا نے میرے بالوں سے بھرے سینے
پر سر رکھ کر اور اپنی مخروطی انگلیوں سے بالوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

"میں یہ بچہ جنوں گی اور تم اسے چھپا کر پرورش کرو گے۔ اس کے
سوا کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہارا کوئی مشورہ نہیں سنوں گی۔

میری آنکھیں دھکی چھپی مسرت سے پھیل گئیں تو اس نے مجھے بغور دیکھا
آنکھیں بند کر کے اپنا سر پھر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے چادر برابر کر کے
اس کو کھینچ لیا تو اس نے سر اٹھا کر پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
بڑی دو گھڑی اتنی محبت بھری نظروں سے دیکھا جن کا میں نے آج تک
تصور نہیں کیا تھا۔۔۔ کہنے لگی۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تمہاری آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔۔۔ بولو
میں کچھ غلط تو نہیں سمجھ رہی ہوں نا؟"

میں ہنس پڑا تو اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے پر رکھ دیا۔ پھر بے تحاشہ
مجھے چوما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں سے میرا چہرہ بھیگتا
رہا۔ ہم اس وقت جانے اپنے جسم جانے کہاں گنوا آئے تھے۔ اس کے آنسوؤں
کی دھار میں اپنے لبوں پر محسوس کر رہا تھا۔۔۔ لگتا تھا اس کا میرا ایک رشتہ
ایسا بھی ہے جو آنسوؤں سے ملتا ہے۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ ذرا سا پرسکون ہوئی
تو میں نے اس کے جسم کو جو مجھ پر پڑا تھا اپنے سینے پر دبا کر اور اس کی پشت
کو سہلا سہلا کر کچھ اس طرح محسوس کیا جیسے کھوئے ہوئے خزانے پا رہا ہوں
پھر ہم ایک دوسرے میں بہت گہرائی تک اترتے گئے۔ اتنا گہرا کہ ہم نے اپنے
جسموں کی اتنی گہرائیاں کبھی نہیں پائی تھیں۔ اتنی گہرائیاں جہاں جسم روح میں
تحلیل ہو جاتے ہیں۔

صبح کو جب وہ نہا دھو کر غسل خانے سے باہر نکلی تو بے حد ہشاش بشاش لگ
لگ رہی تھی۔ اس کی یہ بشاشت کسی ایسے پرسکون جزیرے کی طرح تھی جس میں
تیرنے والی چھوٹی چھوٹی کشتیاں کنارے سے لگی بادبان کھلنے کی منتظر ہوں۔
لیکن جزیرے کا ساکت و ساکن پانی صبا کے گدگدانے سے موج موج ہلکورے
لینے لگا ہو۔۔۔ جیسے جزیرہ ابھی ابھی انگڑائی لے کر بیدار ہوا ہو اور نرم نرم
لہریں سانس لیتے جزیرے کے تنفس کو تیز کر رہی ہوں۔

میں نے آئینے میں اس کے عکس کو نظروں سے چومنے کے انداز سے دیکھا
تو اس نے آئینے میں میری چوری پکڑ لی۔۔۔ پلٹ کر کہا۔

"اس طرح پھر کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"پھر"۔۔۔ پر میں ہنس پڑا۔

میں نے کہا۔ "جانم تم وہی ہو۔۔۔ لیکن آج پہچانی نہیں جا رہی
ہو۔" وہ اٹھی کچھ کہے بغیر میرے قریب آ گئی۔ اپنی باہیں میری گردن میں حائل
کر کے کہا۔

"تم نے کہا تھا نا کہ آج ہماری ملاقات کو ایک سو نوے دن گزر گئے
ہیں۔ تم نے کہا ہے تو سچ ہی کہا ہوگا۔ میں نے کبھی اپنی رفاقتوں کو وقت کے پیمانے
سے نہیں ناپا۔ آج خوش ہوں کہ میں نے یہ سارے پیمانے تم سے بھی چھین لئے
ہیں۔"

میں دل ہی میں اس کی ذہانت پر خوش ہو کر خاموش رہ سکتا تھا
لیکن اس نے وقت کے پیمانے مجھ سے چھین کر جو اضطراب آمیز خوشی بلاشبہ
مجھے سونپ دی تھی اس کے آگے میں کچھ مجبور سا ہو گیا تھا۔۔۔ وہ سب
کچھ چھین لینا شاید میرے بس میں نہ تھا جو میں چھپانا چاہتا تھا۔ میں پلنگ پر
اٹھ بیٹھا۔ کمر میں بانہیں ڈال کر بڑی احتیاط سے اس کو قریب کیا۔۔۔ چادر
ہٹا کر اپنے ہونٹ اس کے پیٹ پر ثبت کر دیئے اور چوم چوم لیا۔

"شہلے، دل کہتا ہے کہ اس میں میرا بیٹا ہے"

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی نرم دبوں میں جیسے پھول بھر

رحل پر رکھے ہوئے قرآن کی طرح میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جانے کیا کیا دیکھتی رہی۔ پھر جھک کر اس طرح آنکھوں سے بوسے لئے جیسے میری آنکھیں زمزم کی بند کٹوریاں ہوں۔

میں اندازہ کرسکتا تھا کہ ہمارا رشتہ صرف جسم کا رشتہ نہیں ہے۔ اس رات کی صبح اتنی اجلی تھی کہ مستقبل کے سارے راستوں کا تعین ہوسکتا تھا۔ میرا پندار اجازت نہ دیتا کہ میں اس سے عقد کی بات کروں۔ ان مراحل سے گذرنے کی خواہش کرنے کا موقع میں کھو چکا تھا تعجب اس بات پر تھا کہ شہلا نے خود ایسی بات کیوں نہیں کی۔ شہلا میری کفیل نہیں تھی۔ لیکن جس ڈھنگ سے ہم جی رہے تھے اس میں نہ میں اس کا محسن تھا نہ وہ میری۔ اس کے مسلسل منت سماجت کرنے پر میں نے اس کا ہاتھ بٹانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور جب سارے اکاونٹس کی جانچ کرکے دواؤں کا اسٹاک، نقد رقومات اور بنک کے حسابات میں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تو میں نے یہ مناسب سمجھا کہ کمپونڈر کی حیثیت سے کسی اور آدمی کا تقرر ضروری ہے۔ جو صاحب اس خدمت پر مامور تھے ان کے منہ کو تو لہو لگ چکا تھا۔ اب کسی نئے نظم و نسق کے ساتھ ان کا تعاون ناممکن تھا چنانچہ شہلا نے میری بات مان لی اور اخبار میں اشتہار دے کر انٹرویو کی تاریخ مقرر کر دی۔

امیدوار آئے تو انٹرویو لیتے وقت اس نے کچھ ایسا طریقۂ کار اپنایا کہ انٹرویو دینے والے ہر امیدوار کو مکمل طور پر یہ احساس ہو گیا کہ شہلا ڈاکٹر ہونے کے باوجود صاحب اقتدار میں ہی ہوں۔ چنانچہ انتخاب کے بعد اس نے جس شخص کو دوسرے دن آنے کے لئے کہا اس میں میری منظوری شامل تھی۔

چنانچہ دوسرے دن جب وہ آیا تو شہلا نے کہا۔

"اندر جا کر صاحب سے مل لو۔"

میں نے ساری طے شدہ باتیں اس کو سمجھا دیں۔ اب وہ میرے بتلائے ہوئے طریقۂ کار پر اس طرح عمل کرتا کہ کلینک کے وقت شوکیس کی چابیاں جن میں دوائیں رہتیں مجھ سے حاصل کر لیتا۔ شہلا جو نسخے تجویز کرتی وہ لے کر مریض میرے پاس آتے۔ میری دستخط کے بعد نسخہ کمپونڈر کو دیتے ہوئے دوائیں لے کر نسخے کے ساتھ پھر میرے پاس آتے اور قیمت ادا کرتے کسی مخصوص نسخے پر انجکشن وغیرہ کی فیس لکھنی ہوتی تو وہ شہلا خود لکھ دیتی۔

اس طریقۂ کار سے ہم دونوں مطمئن تھے۔ شہلا کی پریکٹس خاصی اچھی تھی۔ اس کو مجھ جیسے آدمی کی شدید ضرورت تھی جو اس کی یومیہ آمدنی سے اپنے جیب کا رشتہ نہ جوڑ سکے۔ میرے آنے کے بعد وہ اس معاملہ میں اس حد تک مطمئن ہو گئی کہ اپنا منک بیلنس اپنے سیف لاکرس سب آہستہ آہستہ میرے

حوالے کر دئے۔

میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی حفاظت کرتے کرتے میں اس کو لے کر اتنی دور نکل جاؤنگا اور وہ قدم ملا کر اتنی دور میرے ساتھ چلی آئے گی کہ لوٹ جانا ہم دونوں ہی کے بس میں نہ ہوگا۔ میں اس کی پائی پائی کا حساب کرکے اس کے نام سے جوڑتا رہا اور وہ اپنے روئیں روئیں کا حساب کرکے میرے نام سے جوڑتی رہی۔ میری جیب خالی رہی۔ میرا دامن بھرتا رہا۔ میں اپنے کام کا کوئی طے شدہ مشاہرہ نہیں لیتا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ابھی ابھی پنشن ہوئی تھی اور میری ایک جان کے لئے دو ہزار روپئے کم نہ تھے۔ شہلا پہلے پہلے کہا کرتی تھی کہ وہ میرے احسانات کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے لیکن اب اس نے ایسا کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اب شاید دل ہی دل میں اس نے اپنے حقوق مجھ پر تسلیم کر لئے تھے۔

کلینک کرتے کرتے جب اس کی نظریں میری طرف اٹھتیں تو اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ مجھے یہ احساس ہوتا کہ وہ ایک ایسی گھائل ہرنی ہے جو چلچلاتی دھوپ میں کسی تناور درخت کی چھاؤں کو حسرت سے تک رہی ہے اس لئے کہ اس کے زخمی پاؤں میں اتنی سکت نہیں ہے جو اس کو اس درخت کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں لا سکے۔ اور وہ درخت بلاشبہ میں ہوں۔ اور وہ گھنی چھاؤں ہماری زندگی ہے۔ وہ زندگی جو کلینک کے اوقات کے بعد ہم شروع کرتے ہیں اور وہ زندگی جو کلینک کے اوقات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ تو کیا باسط الطاف شہلا کے پاؤں کا زخم بن گیا ہے۔

میرا کام تو صرف اتنا تھا کہ اس کی پائی پائی جوڑتا رہوں اور شیشہ کی اسکرین سے جتنے زاویوں سے اس کو اپنی آنکھوں میں بھر سکتا ہوں بھرتا رہوں وہ بھی بچوں کا معائنہ کرتے کرتے کنکھی کن آنکھیوں سے مجھے دیکھتی تو ہمیشہ ہی خود کو میری نظروں کے گھیرے میں پاتی اس گھیراؤ سے اس کے چہرے پر عجیب قسم کی کشش سی آ جاتی۔ جس کو نہ اس کی زیر لب مسکراہٹ چھپا سکتی نہ اٹھتی جھکتی نظریں اور جس کو میں بھی صرف محسوس کر سکتا تھا، اس کا اظہار کیسے کرتا۔ آپ نے کبھی "پولی سن" کے پکتے گلاس کے جار JAR میں پانی کو کھولتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اسی کھولتے ہوئے پانی کی تہہ میں ہیٹر کے سرخ تاروں کو اس طرح دہکتے دیکھا ہے جیسے سورج کسی شفاف جزیرے پر اپنی شعاعیں اوپر سے نہیں اس کی تل میں سے بکھیر رہا ہو اور ساری روشنیاں کرن کرن اندر سے پھوٹ رہی ہوں۔ آپ یقین کیجئے شہلا ایسے میں کرن کرن اندر سے پھوٹنے والا جار بن جاتی اور اس کے سینے میں جو اتھل پتھل رہتی وہ میری نظروں کے الکٹرانک عمل کا ردعمل ہوتی میں نظریں ہٹا لیتا تو وہ اس طرح شانت ہو جاتی جیسے پولی سن گلاس کے جار

کو ہیٹر سے نیچے رکھ دیا گیا ہو۔ اس شانتی کا حسن بھی دیدنی ہوتا جس کی زیریں رو محسوسات کو چھوتی رہتی۔

باسط الطاف ملنے کے لئے آتا تو بلا شبہ یہ اتوار کا دن ہوتا۔ دوسرے دنوں میں اُس کو اپنے بزنس سے فرصت ہی نہ ملتی۔ اتوار کو شہلا صرف صبح کا کلینک کرتی۔ اگر ہم کام میں بھولے ہوئے ہوں تو جیسے باسط الطاف یاد دلا جاتا۔ دوپہر ہمیں چھٹی ہے۔ میں شیشہ لگی اسکرین کے پردے ذرا سا ٹھیک کرکے اپنی الجھن کو چھپا لیتا اور باسط الطاف کو اپنے کیبن ہی میں بٹھا کر بیرونی دروازے سے شہلا کو اطلاع کرنے کے لئے چلا آتا۔ میری اپنی نشست سے شہلا کے معاینے کی میز تک نظروں کو کبھی بھی کوئی رکاوٹ نہ ہوتی۔ شیشہ لگی اسکرین کے اس حصّے پر کوئی عارضی پردہ بھی نہ ہوتا جس کو ضرورتاً حائل کرسکیں اس لئے میں اپنی نشست چھوڑ کر اس وقت کہیں اور بیٹھ رہتا جب مریضوں کے ختم ہونے پر باسط الطاف شہلا کے پاس معاینے کے کمرے میں ہوتا۔ دس پندرہ منٹ کی اس ملاقات کے دوران شہلا کے حکم کے مطابق بیرونی دروازہ کھلا رکھا جاتا جس کے چوکھٹے پر جھولتا ہوا اسپرنگ کا نصف دروازہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے شہلا اور باسط الطاف کے پورٹ ریٹس کو اس طرح چھپائے رکھتا کہ ان کی ٹانگیں اور سر باہر سے صاف دکھائی دیتے۔ چوکھٹے میں جڑی تصویروں کی طرح ڈاکٹر شہلا اور سیٹھ باسط الطاف کبھی ایک دوسرے کے مقابل ہوتے کبھی ذرا سا تڑپ کر ایک دوسرے کے برابر۔

کافی منگوانے کے لئے کال بل پر جب اسپرنگ لگا دروازہ کمپونڈر کی آمد و رفت سے جھول جاتا تو لگتا ڈاکٹر شہلا اور باسط سیٹھ کی محبت کو ٹیلی وائز کیا جا رہا ہے۔ اور سوئچ کے گھوم جانے سے کبھی آواز بلند ہو جاتی ہے تو دونوں کے مکالمے اتنا تو سمجھا دیتے ہیں کہ دونوں ہی اپنے کاروبار سے مطمئن ہیں۔ کافی پینے کے دوران شہلا یا باسط کبھی کبھی مجھے بلوا لیتے تو میں کسی نہ کسی طرح ٹال جاتا۔ کبھی سرے سے انکار ہی کر دیتا، کبھی کافی باہر منگوا لیتا۔ کافی پیالی میں ٹھنڈی ہوتی رہتی اور سینے میں سب کچھ جھلستا رہتا باسط سیٹھ چلا جاتا تو شہلا کار کی چابی والی چین میں اپنی انگلیاں پھنسائے میری نشست کو کھڑی کھڑی تکتی رہتی اور میں نشست پر پہنچنے سے پہلے ہی بہت آسانی سے اس کے اضطراب کو پردے کے دوسرے حصوں سے دیکھ لیتا جو ایسے میں میری اور صرف میری نظروں کے لئے مختص تھے۔ لگتا کہ کچھ دیر اسی طرح گزر جائے تو شہلا کی انگلیاں چابی کی چین میں لہو لہو ہو جائیں گی۔ میں ایسے میں اپنے دل سے رستے ہوئے قطرہ قطرہ خون کو سینے میں کہیں چھپا کر اپنی نشست پر آ جاتا اور شیشے میں سے ہماری نظریں چار ہوتیں تو لگتا ہم ایک دوسرے کو آمنے سامنے رکھ کر کہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ پر اس کھوج کا ہمیں بھی کہیں اور چھور نہیں تھا۔ میں اکثر ایسے میں خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا اور میز پر دھرے مکمل رجسٹروں کی اس طرح ورق گردانی کرتا جیسے خود اپنی تکمیل کر رہا ہوں۔ وہ کچھ دیر انتظار کرکے اسکرین کے قریب آ جاتی اور شیشے کو کار کی چابی سے اس طرح بجاتی جیسے اپنی دھڑکنوں کو اس آواز کے نیچے دبا رہی ہو۔

میرا جی چاہتا، اس کی گردن میں جھولتا ہوا استھسکوپ اسی کے سینے پر لگا کر پوچھوں کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ ہم اگر زندہ ہیں تو یہ کیسی زندگی ہے۔ تم باسط سے جو کچھ چھپا رہی ہو وہ تم ہی نہیں میں بھی جانتا ہوں لیکن وہ کیا راز ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ کیا ہم صرف استھسکوپ کے سہارے زندگی بھر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں گنتے رہیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ڈاکٹر ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سینے میں دھڑکتا ہوا دل، تمہارے پاس زندگی کی بس یہی ایک علامت ہے۔ لیکن تمہیں اس زندگی کے قدموں کی چاپ کیوں نہیں سنائی دیتی جب کہ ہمارے دل دھڑکتے رہیں گے اور ہم زندگی کو ترس ترس کر جیتے رہیں گے۔

میں شہلا سے اسی دن کہنا چاہتا تھا کہ شہلا ہم اپنی شناخت کھو رہے ہیں وہ دن دور نہیں ہے جب ہم ایک دوسرے کی اجنبیت کا احساس بھی نہیں مٹا سکیں گے۔ اور ــــ اور اس دوغلی زندگی کی سزا کاٹنے والا میرا لخت جگر ہوگا، تمہارے ہی دل کا ایک ایسا ٹکڑا ہوگا جس کو تم آج اپنی کوکھ میں سو سوجتن سے پرورش کر رہی ہو اور کل جس کو تمہارا استھسکوپ بھی نہیں پہچان سکے گا۔ لیکن میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ بس اسی میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

آج کرسی چھوڑ کر میں جب کھڑا ہو گیا تو میں نے طے کر لیا تھا کہ شہلا سے دو ٹوک بات کر دوں گا۔ اس سے پوچھوں گا کہ تم جو شہر بھر کے بچّوں کی ڈاکٹر سے زیادہ ماں دکھائی دیتی ہو اپنے ہی بچے کی نہ ہی ڈاکٹر ہو نہ ماں اور غضب تو یہ ہے کہ تمہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہے۔

کار کا دروازہ کھولتے ہوئے شہلا نے مجھ سے کہا۔

"آج کار تم چلاؤ۔ میں نہیں چلا سکوں گی"

میرا جی چاہا ایک طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دوں۔ لیکن ہم تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ہم نے یونیورسٹی سے ڈگریاں لی تھیں۔ مرد کس طرح عورت پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ اس سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ حمل ساقط کر دیا جائے۔ اتنی سی

تو بات تھی کہ میں باپ بننے والا تھا اور شہلا ماں بننے والی تھی۔ ایک معمولی سا انجکشن میرے اور شہلا کے اس مقدس رشتے کو ختم کر سکتا تھا۔ ہم یہ قتل آسانی سے کر سکتے تھے۔ لیکن اس معمولی بات کے لئے میں تہذیب کی بلندی سے اس حد تک گر گیا تھا کہ شہر کی سب سے زیادہ معروف لیڈی ڈاکٹر پر سر بازار ہاتھ اٹھانے کا خیال میرے ذہن میں آ سکتا تھا۔ لہذا میں نے کچھ نہیں کیا اسٹیرنگ سنبھال کر کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے شہلا کی طرف دیکھا جو میرے برابر کار میں موجود تھی۔ لیکن شہلا کی آنکھوں میں مجھے شہلا نہیں ملی۔

میں نے کسی پیش بندی کے بغیر اس سے کہا

"اگر تم سیٹھ باسط الطاف کے پاس سے لوٹ آئی ہو تو میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" اس نے بھی مجھ سے زیادہ تڑپ کر مجھے دیکھا۔ کہنے لگی۔

"تم جانتے ہو کہ میں باسط الطاف کے ساتھ کبھی کلینک کی سیڑھیاں بھی نہیں اترتی۔"

"پھر تم کار کیوں نہیں چلا سکتیں۔ جب تم اپنی دوغلی زندگی کی گاڑی کو اتنی آسانی سے چلا سکتی ہو۔"

اس نے چوٹتے ہوئے کہا۔

"اس کے معنی یہ ہیں کہ تم بے رحمی پر اتر آئے ہو۔"

"اس کے معنی یہ کیوں نہیں ہیں کہ میں تم سے رحم کا طالب ہوں۔"

"کس طرح بھلا۔"

"اس طرح کہ تم جانتی ہو کہ تم حاملہ ہو۔"

"ہاں وہ تو تم بھی جانتے ہو۔"

"تو پھر میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ بچہ کس کا ہے۔"

اس نے شیرنی کی طرح بپھر کر مجھے دیکھا

"تم نے سوچا بھی کہ تم مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔ ؟"

"بہت سوچا ہے، بہت سوچا ہے۔ اگر اس میں سوچنے کے لئے کچھ ہے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ ـــ میں تو نہیں جانتی کہ اس کا باپ کون ہے، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنا سب کچھ لٹا کر تمہیں یہ بھی جتاتی رہوں۔"

میں نے تیزی سے کار بڑھاتے ہوئے کہا۔ تو پھر سنو

جس طرح تم اور صرف تم اس کی ماں ہو اسی طرح میں اور صرف میں اس کا باپ ہوں، اور اسی لئے مجھے اپنے بچے کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے جس حق کا تم گلا گھونٹ رہی ہو ـــ بتا سکتی ہو کہ کون کس پر رحم نہیں کر رہا ہے میں بے رحم ہوں جو تم سے اپنے ہی بچے کی پہچان کی بھیک مانگ رہا ہوں"

وہ خاموش رہی

میں نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔

"تمہاری یہ خاموشی میرے دکھ درد کا علاج نہیں ہے شہلا"

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

اسٹیرنگ پر دائیں ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے میں نے جھک کر بائیں ہاتھ سے اس کو اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ اس کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں کچھ ایسے ویرانے دکھائی دئے جس میں بھٹکنے کے لئے میں خود کو تیار نہ کر سکتا تھا۔

کچھ دیر چپ رہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو ویرانے جل تھل میں بدل گئے تھے۔ لیکن آج میں ان میں بھیگنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔

آنسو ہر غم کا علاج نہیں ہیں شہلا۔ یہاں تک کہ ہر زخم کا مرہم بھی نہیں ہیں

میں نے پھر وار کیا

"میں کسی کا علاج نہیں کر رہی ہوں"

میں بپھر گیا

تم یہی تو غلط کر رہی ہو۔ اور میں یہی تو رو رہا ہوں کہ تمہیں ہمارا علاج کرنا چاہئے۔ میرا اور میرے بچے کا۔ شہر بھر کے بچے تمہاری کلینک پر آتے ہیں، تم سب کے اپنے قیمتی آنسوؤں کی سوغات بانٹ کر کیوں نہیں لوٹا دیتیں۔ تم تو ان کی بیماری سے لڑتی ہو۔ موت سے لڑتی ہو۔ پھر میرے بچے نے تمہارا کیا قصور کیا ہے"

میں نے بات زہر میں بجھا لی تھی۔

"تو پھر میں تمہارا بچہ نہیں جنوں گی۔"

میں سن ہو کر رہ گیا۔ کار بھاگ رہی تھی۔ سارا بازار بھاگ رہا تھا۔ گھر بنگلے، بستیاں سب بھاگ رہے تھے۔ اسٹیرنگ میرے ہاتھ میں تھا لیکن کار کوئی اور چلا رہا تھا ـــ تیز اور تیز، اور تیز ـــ اور تیز ـــ

ہر چیز پیچھے چھوٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ شہلا کا بنگلہ بھی پیچھے رہ گیا۔ شہلا جو میرے برابر بیٹھی ہوئی مبہوت سی ہے ـــ وہ بھی تو پیچھے نہیں چھوٹ گئی؟

میں کہاں جا رہا ہوں کیوں جا رہا ہوں؟۔

کیا میں بھی کہیں پیچھے چھوٹ گیا ہوں؟ ❁

بقیہ صفحہ ٥٠ تشدّد

چنتی پنڈت کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک خاص چمک۔ شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب تو گاؤں کے ان گنو ۔ ۔ ۔ ں کو یقین ہو گیا ہوگا کہ دیوی درگا کا شکتی یعنی طاقت کے روپ میں ظہور ہو چکا ہے۔ ❁

مصور سبزواری

رکے پتہ نہ ثمر ہی ٹھہرے
آج کی شام وہ گھر ہی ٹھہرے

خوش گمانی کی نہیں حد کوئی
ایک تنکا بھی شجر ہی ٹھہرے

تجھ سے مل کر بھی ہوا شک جیسے
یہ ملاقات خبر ہی ٹھہرے

دستکیں دور بہت دور کی ہیں
ہر نظر جانبِ در ہی ٹھہرے

لفظ ریشم ہیں وہ لہجہ رنگت
بات خوشبو کا سفر ہی ٹھہرے

دھند میں گم ہوا خورشید کا رتھ
اب تعاقب بھی مفر ہی ٹھہرے

اس کے رستوں کا تعین نہ کرو
تند ندی ہے کدھر ہی ٹھہرے

کچھ نہ کچھ ہیں تو مصور ہم لوگ
شہرت شہر بدر ہی ٹھہرے

پوسٹ آفس فتح - ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ)

صدیق مجیبی

سرکشیدہ، دشمنوں کے درمیاں مجھ کو کیا
وہ انا میری تھی جس نے بے اماں مجھ کو کیا

میں بھی اک دریا تھا اور صحرا بہ صحرا تھا رواں
ایک وحشت تھی کہ جس نے بے نشاں مجھ کو کیا

تیز آندھی چل رہی ہے جسم و جاں کے آر پار
کف دریدہ خواہشوں نے بادباں مجھ کو کیا

اے غبارِ جاں، تجھے لے جاؤں کس صحرا کی اور
میری مٹی نے تو اب تک رائگاں مجھ کو کیا

تشنگی سیال دوزخ پی گئی یہ بھی ہوا
چند قطروں نے کبھی آتش بجاں مجھ کو کیا

سر بھری نیندیں بھٹکتی ہیں، لیے کشکول خواب
چاند نے آنکھیں جلا ڈالیں دھواں مجھ کو کیا

زندگی، اک تو ہی کیا کم تھی مجیبیؔ کے لیے
کیوں عبث پھر دوستوں میں سرگراں مجھ کو کیا

شعبہ اردو، رانچی یونیورسٹی - رانچی

حامد جعفری

سماعتوں کا بصارت کا سلسلہ ٹوٹا
بچھڑ کے تجھ سے زمانے سے رابطہ ٹوٹا

شکستگی نے عطا کی ہمیں یہ ناقدری
جہاں میں پھرتے رہے لے کے آئینہ ٹوٹا

گلہ نہ تھا ہمیں دنیا کی کج ادائی سے
یقین ڈھہ گیا جب تجھ سا باوفا ٹوٹا

کوئی نہ جان سکا جاں پہ اس کی کیا گزری
اک آبگینہ کہ محفل میں بے صدا ٹوٹا

ملال یہ ہی نہیں شخص اک جہاں سے گیا
سوال یہ بھی ہے کتنوں کا آسرا ٹوٹا

۱۷ - سول لائنس - بالا ٹیک بھوپال

اداریہ نگاری اور تبصرہ نگاری - ایک مطالعہ

ہیرو باری - گوہاٹی - ۷۸۱۰۱۴ (آسام)

اداریہ نگاری ایسے پر افادیت و اہمیت موضوع پر اردو کے کسی رسالے میں ابھی تک غالباً کوئی مضمون ہنوز شائع نہیں ہوا ہے باایں ہمہ اردو کا ہر جریدہ مدیر کے ارشادات ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اداریہ نگاری تنظیم صحافت کے تحت آتا ہے لہٰذا صحافت کے نصابات سے باقاعدہ گذرنے والے اور اس سے دلچسپی رکھنے والے اصحاف، اداریوں سے متعلق متعدد نکات سے واقف ہوتے ہیں مگر ادبی صحافت پر بطور خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر، اداریوں کے ملفوظات کو زیر مطالعہ لانے کی ضرورت کا احساس ہونا ناگزیر ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے اردو ادبی جرائد سے صرف نظر کرتے ہوئے دوسری زبانوں بالخصوص یورپی زبانوں میں نکلنے والے رسائل و جرائد کو لیا جائے۔ انگلینڈ کا TIMES LITERARY SUPPLEMENT ادبیات میں خصوصی اہمیت کا جریدہ ہے اور اس پر کبھی اداریہ کا بوجھ نہیں لادا جاتا۔ یہی صورت EDINBURGH REVIEW کی ہے CALIFORNIA LITERARY SCENARIO, LITERATURE, CRITIQUE وغیرہ اداریے شامل ہوتے ہیں مگر ان اداریوں کی نوعیت مشمولات پر نظر خوش گذر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ گلبرگہ سے شائع ہونے والا مشہور انگریزی جریدہ THE JOURNAL OF ENGLISH WRITING IN INDIA میں کبھی اداریہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ اس کے خصوصی شماروں کی ادارت معروف و مشہور ادیبوں کو بھی سپرد کی جاتی ہے جب کہ اس کے مدیر ڈاکٹر جی۔ بلرام گپتا ہیں مگر وہ جب کبھی کوئی خصوصی نمبر نکالتے ہیں تو اس کی اعزازی ادارت کسی ایسے شخص کو جو خصوصی نمبر کے موضوع پر گرفت و قدرت کے سبب حامل شہرت ہوتا ہے پیش کرتے ہیں لہٰذا JIWE کے خصوصی نمبروں میں اداریے ہوتے ہیں جن کو GUEST EDITOR یعنی مہمان مدیر سپرد قلم فرماتا ہے۔ بطور مثال JIWF کا حالیہ خصوصی شمارہ کا موضوع ہے AMERICAN STUDENTS' PERSPECTIVE OF ENGLISH WRITING IN INDIA اور اس کے مہمان مدیر جناب J JUSSAWALA جو ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں اور امریکہ میں ایک یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ اس شمارے کا اداریہ صرف ڈیڑھ صفحہ کو محیط ہے اور اس کی نوعیت صرف نظر سے خوش گذرے ہے۔

ہندوستانی زبانوں میں اردو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی، بنگالی اور آسامیہ کے ادبیاتی رسالے بھی زیر مطالعہ لانے پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر اداریے ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو بغایت مختصر ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے عرض کیا گیا ہے کہ اداریوں کی شمولیت لازمی قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہاں یہ بتانا بھی غالباً برمحل ہی ہوگا کہ بہار اردو اکیڈمی کے سہ ماہی "زبان و ادب" جموں کشمیر ریاست کے "شیرازہ" ہماچل پردیش کے "فکر و فن" وغیرہ میں اداریے ہوتے تو ہیں مگر وہ قارئین کو آگے بڑھنے سے روکتے نہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہمارے بیشتر رسالے طول طویل اداریوں کے متحمل ہوتے ہیں یہ نکتہ بغایت اہم معلوم ہوتا ہے کہ رہنما اصول کی تلاش و جستجو پر توجہ صرف کی جائے، مخفی مبادا امر وہی دونوں پرشتمل نکات پر ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے۔

اولاً بات نیاز فتح پوری کے معروف ماہنامہ نگار لکھنؤ سے شروع کی جائے۔ نگار لکھنؤ اور نیاز فتح پوری دونوں مرحوم ہو چکے ہیں۔ نگار کے مشمولات سے تحقیق روگردانی نہیں کر سکتی لہٰذا درگور ہونے کے باوجود دونوں جہان علم و دانش میں زندہ ہیں۔ نیاز کے اداریے اور رسالہ وما علیہ فیچر کے تحت نگارشات نیاز دونوں پر محققانہ نظر ڈالنے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں کام کی باتیں کم، بیکار باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔" نیازیت" ہمیشہ الفاظ و تراکیب کے استعمال

کیا غلط ہے اور کیا صحیح ہے، صرف و نحو کے خار و خس وغیرہ کے گرد ہی محوِ طواف نظر آتی ہے۔ مثلاً حضرت فرماتے تھے کہ طالت کوئی لفظ نہیں ہے، عربی لغت اطالت ہے۔ لکھنؤ میں جب کبھی میں نگار کے آفس میں پہونچ جاتا ایسی ہی باتیں ہونے لگتی تھیں۔ ارے اطالت عربی ہے تو ہو گا اس کو اردو سے کیا لینا دینا۔ اگر عربی کے قاعدے سے "نقش کالحجر" غلط ترکیب ہے تو ہوا کرے، اردو میں تو مستعمل ہے۔ لفظِ رضا (بکسر اول) صحیح ہے یہ سن کر میں نے ان سے کہہ ہی دیا کہ اردو میں صحیح رَضا (بفتح اول) ہے مگر رِضوی (بکسر اول) ہے۔ اردو کا مزاج و احول جداگانہ ہے اور رہے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں سے مدیر کو احتراز کرنا اشد ضروری ہے۔ اسی نوعیت کی یہ بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت تک کا جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ اب کون بتائے کہ ترقی پسند ادب کے نظریاتی پس منظر سے ناواقفیت ہی یہ بات کہلوا سکتی ہے، یہ خیال بہت سے نقادوں کا بھی ہے گر ہے ایسے نقادوں کا جو صرف بزعم خود ہی ناقد ہیں۔ ترقی پسند ادب کا نظریاتی پس منظر جہاں صرف نظر ہوا کہ ٹھوکر لگی۔ اشتراکی جمالیات سے ناآشنائی ایسے ہی لغویات پر منتج ہو سکتی ہے۔ جدیدیت کی بات کرنے والے اکثر و بیشتر مرورِ ایام سے پیدا ہونے والے اثرات کی نشاندہی تو نشاندہی وہ جدید کی وضاحت کر سکتے ہیں نہ جدیدیت کی تشریح، اگر اداریہ میں ایسا کوئی مسئلہ اٹھانا ناگزیر ہی ہو تو اداریہ میں بھرپور تشریح و توضیح سے لکھنا کوئی بُری بات نہیں ہوتی۔ امریکہ کے معروف رسالے THE NEW YORKER کے ایڈیٹر ای۔ بی وہائٹ E B WHITE یہی کرتے تھے۔ وہائٹ کی یاد برمحل آئی۔ ان کا ایک اداریہ جو اسلوب STYLE پر تھا، کلاسیکی اہمیت کا حامل ہو چکا ہے۔ منجملہ دیگر امور وہائٹ نے اس امر پر کہ مدیر کو انانیت سے احتراز کرنا لازم ہے خاصا زور صرف کیا ہے، اور ہمارے اردو کے مدیر ہیں جو اکثر و بیشتر "محراب و منبر" کرنے پر تلے رہتے ہیں، جیسے کہ ہمارے بیشتر اردو شعرا اپنی تخلیقات (؟) کو سامع کے سر تھوپنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی باتیں سپرد قلم کر جاتے ہیں جو ان کو خدا ان ریش کے رول میں لا کھڑا کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر، دہلی سے شائع ہونے والے ایک ہفتہ وار میں اس مخالفت کا ذکر تھا جو یوپی میں اردو کو دوسری زبان بنانے سے متعلق تحریک پر کی جا رہی ہے۔ وہ حضرت جوش میں آکر یہاں تک لکھ گئے کہ "مہا دیوی ورما" ہندی میں دوسری درجے کی شاعرہ بھی نہیں ہیں"۔ یہ ریمارک بغایت افسوس ناک بھی ہے اور ان کی ہندی ادبیات سے لاعلمی کا آئینہ دار بھی ہے۔ مدیر کی رائے سپریم کورٹ کی بینچ کا فیصلہ نہیں ہوتی۔ اس کو کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کو فتویٰ اکال تخت سے جاری ہونے والا "حکمنامہ" اشکرا چاریہ کے پُر وچن وغیرہ کے ذیل رکھا جائے مزید براں، تحقیر آمیز طرز سے احتراز کرنا ضروری ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کہیں وہ عزت ہتک کا مورد الزام تو نہیں ہو رہا ہے۔ مثال کے لئے باسدیو سنگھ سابق وزیر یوپی پر گفتہ ناگفتہ باتیں لکھی گئیں جو غالباً ان کو معلوم نہ ہوئی ہونگی ورنہ مقدمہ دائر ہو ہی جاتا۔ باسدیو سنگھ، مہادیوی ورما، امرت لال وغیرہ کے موقف پر اعتراضات کیے گئے تو درست ہی کیے گئے جو بالکل علاحدہ بحث ہے۔ اردو پر روا رکھے گئے سلوک پر روشنی ڈالی جائے تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ اگر کوئی مدیر ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتا ہے اور "جدیدیت" کو ترقی پسند تحریک کی توسیع سمجھتا ہے تو اس کو کھل کر لکھنا چاہیئے یا اس مسئلہ پر قلم کاروں کی توجہ مبذول کرانا چاہیئے تاکہ اتفاق یا اختلاف کرنے والے لکھ سکیں، اور اس طرح ایک طرح کے سیمنار کا انعقاد ہو سکے گا۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ ایک ادبی رسالے کے اداریے میں سیمنار کو مشاعرہ کے صف میں کھڑا کر دیا گیا بات ٹھیک تھی یا نہیں توجہ طلب بات یہ ہے کہ ایسے ریمارک کو بغیر تشریح کے چھوڑ دیا گیا ہے [میں سیمنار کو بغایت حامل اہمیت (دانشانہ) سمجھتا ہوں، مگر یہاں اس پر مزید کچھ کہنا برمحل نہ ہو گا۔] اجمالاً درج ذیل ملفوظات توجہ طلب ہیں۔

(۱) مدیر کو صاف دلی، دیانت داری، اخلاقی جرأت، ذمہ داریوں کا احساس، رکھ رکھاؤ وغیرہ سے متصف ہونا ضروری ہے۔ جو کچھ اشاعت کے لئے موصول ہوتا ہے اس پر غائر نظر ڈالتے ہوئے ضروری قطع و برید کے مرحلے سے گذرتے ہوئے مگر قطع و برید ایسی بے دردانہ نہ ہو کہ قلم کار کا موقف ہی فوت ہو جائے یا یکسر بدل جائے۔

(۲) اگر کسی مسئلہ پر بحث و تمحیص شروع ہو جائے تو اس کی اشاعت کا سلسلہ بند کرنے کی نوبت غلط بحث، تلخی و غلط فہمی پیدا ہو جانے پر آجاتی ہے اور اس کو ختم کرنے کا اختیار مدیر کو ہے تو ضرور مگر سلسلہ پہلے معترض کو جوابی مضمون شائع کر کے ہی بند کرنا چاہیئے۔ سلسلہ بند کرنے پر مدیر کو اپنی رائے پیش کرنے سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ادیب جذبات کی رو میں بہہ کر گذا و گذا پر اتر آتے ہیں اور کبھی کبھی یہ بھی کہنے لگتے ہیں کہ فلاں ادیب کا اسلوب "سوقیانہ" ہے اور مدیران کے مراسلوں کو شمول کرتے ہوئے اعتذارانہ نوٹ دے دیتا ہے کہ ادارت کو فلاں کی سوقیانہ حرکت پر افسوس ہے۔ ایسا نوٹ بذاتہ سوقیانہ ہوتا ہے۔ معاملہ اگر طول پکڑ جائے تو عزت ہتک کا دعویٰ تک دائر ہو سکتا ہے۔ مدیر کوئی ایسی ہستی نہیں ہوتا جو ملک کے قانون

و دستور سے بالاتر ہو اور ساتھ ہی مضمون نگار بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

(۳) اخلاقی جرأت وہ لازمہ ہے جو مدیر کو اصلی معنوں میں مدیر بناتا ہے۔ ادبیات اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ جس سے ملک و قوم پر خراب منتجات مرتب ہونے کا خدشہ محسوس ہو تو اس پر بحث سے قلم اٹھانا چاہیے۔ مثال کے طور پر، آج ملک کی یک جہتی کو جو خطرہ لاحق ہے اور نتیجتاً ہمارے اقدار شکست و ریخت کی زد میں آگئے ہیں۔ اس مسئلہ پر لکھنا اور قارئین کی توجہ مبذول کرانا قومی فریضہ ہی تسلیم فرقہ واریت اور فنڈامینٹلزم سے مرتب ہونے والے اثرات پر ضرور لکھنا چاہیے۔ ادبیاتی میڈیا بھی ثقافتی فضا کو مسموم ہونے سے بچا سکتا ہے۔ پھیلے ہوئے زہر کا تدارک پیش کر سکتا ہے۔

(۴) ادبیاتی مدیر کا مبلغ علم جریدے کی مشمولات سے واشگاف ہو جاتا ہے۔ مزید برآں، مشمولات کو منصوبہ بند ترتیب سے جگہ دی جائے۔ مثال کے طور پر، تجزیاتی و تنقیدی مضامین، غزلیات، نظمیات، نثریاتی نظمیات نیز غزلیہ جات (آزاد غزل کو میں غزلیہ کہنا پسند کرتا ہوں مگر بغیر اصرار) تبصرات، مراسلہ جات، موخر الذکر کو شامل اشاعت سوچ سمجھ کے کیا جائے اور وہی مراسلے شائع کیے جائیں جو کسی موضوع سے متعلق ہوں۔ توصیفی خطوط کا شامل اشاعت کیا جانا بالواسط خود اشتہاری و خود نمائی کا مظہر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

(۵) سہیل بھائی (سہیل عظیم آبادی) کہا کرتے تھے کہ زبان اردو کو صرف ادبیات ہی تک محدود کر لیا گیا ہے اور دوسرے تناظیم کو بالکل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ کم از کم اکادمیوں کے جراید کو سرکاری جرائد کی طرح ثقافتی و تمدنی مضامین کو جگہ دینا چاہیے۔ ادب اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو متعدد تناظیم کو عطر QUINTESSENCE ہوتا ہے لہٰذا نفسیات، عمرانیات، بشریات وغیرہ جیسے تناظیم سے متعلق مضامین کو جگہ دینا چاہیے۔ مجھے بھائی جان کی بات توجہ طلب معلوم ہوئی۔ وگیان بھون نیو دہلی میں منعقدہ سیمینار کے ایک اجلاس کے بعد سہیل عظیم آبادی مرحوم، اعجاز صدیقی مرحوم، معیز الدین (پاکستان) اور راقم الحروف چائے پی رہے تھے کہ سہیل بھائی نے بر سبیل تذکرہ اس رائے کا اظہار کیا۔ اعجاز صدیقی مرحوم اور معیز الدین دونوں نے ان سے اتفاق کیا، اور یہ بھی کہا کہ اس سمت میں ابتکار INITIATIVE اکادمیوں کو لینا چاہیے۔

نہ جانے اور کتنے "چاہیے" پیش کیے جا سکتے ہیں مگر مصلحت اندیشی سے ہر "چاہیے" پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہمارے مدیران اکثر و بیشتر ملحوظات سے ناآشنائے محض ہوتے ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اچھے مدیر سرے سے ہیں ہی نہیں، ہیں مگر معدودے چند اور ان کے اسمائے گرامی بتانا نامناسب ہوگا۔ کسی کی تنقیص کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔

تبصرہ نگاری

چونکہ ہر رسالے اور اخباروں کے بالخصوص اتوار کے شمارے میں کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں تبصرہ نگاری فیچر کے لحاظ سے واضح طور پر ابھر کر سامنے آگئی ہے مگر اس سے متعلق رہنما اصول کیا ہونا چاہیں اس کو محسوس تو کیا گیا ہے مگر بھرپور توجہ ہنوز نہیں دی گئی ہے۔ ظ۔ انصاری کی تصنیف "کتاب شناسی" ان تبصروں کو محیط ہے جو انہوں نے کتاب کی تالیف تک لکھے۔ تبصرے خاصے ہیں مگر پہلا باب جس میں تبصرہ نگاری پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ژولیدگی زدہ ہو کر رہ گیا ہے، یہ میرا خیال ہے جو لازمی نہیں کہ درست خیال ہی ہو۔ بہر کیف، اقتباسات کے کوہ گراں کے تلے مسئلہ دب کر رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے جو فی الواقع ادبیاتی ژرف نگاہی کے حامل ہیں 'ہماری زبان' کا ایک خصوصی شمارہ اسی موضوع پر نکالا تھا جس میں جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دے رہا ہے صفحہ اول پر ظ۔ انصاری صاحب کا وہی مضمون جو کتاب شناسی کا پہلا باب ہے شامل کر دیا۔ لہٰذا میرا ذہن تو بالکل جواب دے گیا۔ موضوع کہر زدہ ہو کر رہ گیا، پیش رفت کا سوال ہی نہیں اٹھتا، آگے پیچھے کچھ دکھائی تو دے تبھی تو آگے بڑھنے کی کوشش بار آور ہو سکتی ہے۔

ایک اور تلخ تجربہ ہوا۔ ایک سیمینار میں ایک "ذات گرامی" نے اپنے مقالے میں تبصرے سے کبھی تنقید کو تولد کیا اور کبھی تنقید سے تبصرہ کو جنم دے ڈالا۔ موضوع بری طرح غتر بود ہو گیا۔ تبصرے اور تنقید کیا ایک ہی ہیں؟ میں اس سوال سے بھی اپنے دل و دماغ کو مخاطب کرنے لگا INDIAN
JOURNAL بھارت سرکار کا ہر ماہ دو بار نکلنے والا معتبر جریدہ جو بالخصوص بیرون ملک کے لئے ہے & FOREIGN REVIEW
OF ENGLISH WRITING IN INDIA SENTINEL وغیرہ میں مدتوں سے میرے تبصرے شائع ہوتے رہے

مزید براں انگریزی جرائد میں شائع ہونے والے ری ویوز REVIEWS کو پڑھتے وقت ذہنی پس منظر میں یہ خیال بھی کارفرما رہتا ہے کہ تبصرہ نگاری کے رہنما اصول تک رسائی ہو سکتی ہے یا نہیں EDINBURG REVIEW, TIMES LITERARY SUPPLEMENT, SUNDAY, INDIA TODAY, AMERICAN QUARTERLY, SPAN, POINT, COUNTERPOINT.

ہندوستانی انگریزی اخبارات کے یک شنبہ شمارے میں چھپنے والے تبصروں کو بین السطور زیرِ مطالعہ رکھنے سے میں نے خاصا کچھ استفادہ کیا ہے درج ذیل نکات پیش نظر رکھنا غالباً حامل اہمیت ہیں۔

(۱) زیرِ تبصرہ کتاب کا نام مع مصنف
(۲) ناشر کا پورا پتہ، قیمت
(۳) تبصرہ

ظاہر ہے کہ موخر الذکر نکتہ قابلِ غور ہے۔ اچھے تبصرے کو تعارف کے مترادف سمجھنا چاہئے۔ جن امور پر بالخصوص روشنی ڈالنا چاہئے وہ یہ ہیں۔ مصنف کا موقف کیا ہے، کلیدی بات کیا ہے جس کا ابلاغ مصنف کے پیش نظر ہے۔ کتاب میں کتنے ابواب ہیں؟ جہاں تک ممکن ہو تبصرہ نگار کو ہر باب کا مرکزی خیال پیش کرتے ہوئے، پوری کتاب کی تلخیص پیش کر دینا چاہئے۔ مزید براں، زیرِ تبصرہ موضوع سے متعلقہ دیگر معلومات جن کا تبصرہ نگار کو علم ہو اگر قارئین کو فراہم کر دی جائیں تو تبصرہ برتر سطح کا تصور کیا جائے گا۔ تبصرہ نگار کو اپنی رائے پیش کرنے سے گریز تو کرنا چاہئے مگر ناگزیر سے روگردانی کرنا بھی ارتکابِ جرم کے مترادف ہو گا۔ نیا موضوع ہے تو اس کو نیا کہنا ہی چاہئے، اگر کسی موضوع پر کسی نئے زاویہ سے روشنی ڈالی گئی ہے تو اس زاویہ نگاہ کی جانب قارئین کی توجہ ضرور مبذول کرانا چاہئے۔ مگر کسی صورتِ حالات میں تبصرہ نگار کو ایسی رائے نہیں دینا چاہئے جو اکال تخت کے حکم نامے، مولاناؤں کے فتوے، پنڈتوں کے دھرم گورشناؤں وغیرہ سے مشابہت رکھتی معلوم ہو۔ تبصرہ نگار سپریم کورٹ کی بنچ نہیں ہوتا اور نہ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس۔ تعارف پیش کر دینے کے بعد اس کی کارکردگی ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً کلیم الدین احمد مرحوم کی تصنیف پر ایک ذات گرامی نے تبصرہ کرتے ہوئے فیصلہ صادر فرما دیا کہ دو کوڑی کی تصنیف ہے۔ عالموں نے ان کی تبصرہ نگاری کو آنحضرت کی سادہ لوحی و احمقانہ طرزِ نگارش پر سرسری نظر ہی ڈالی ہو گی البتہ فاضل تبصرہ نگار نے یہ ضرور سمجھا ہو گا کہ بہت بڑا کام میں نے کر دکھایا۔ اردو میں اچھے تبصرہ نگاروں کی کمی نہیں ہے مگر تعداد زیادہ بھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر جناب سید مظفر حسین برنی کے خطبے "اقبال اور قومی یک جہتی" پر ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے قابلِ تعریف تبصرہ کیا تھا اور برسبیل تذکرہ بہار میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ کس طرح ملا برمحل تذکرہ تھا۔ یہ خلیق انجم اور برنی صاحب ہی کی کارگزاری تھی، جس کا ذکر تبصرے کی اہمیت میں چار چاند لگا گیا۔

ابھی تک پیش کئے گئے معروضات تنقید، سماجیات، فلسفہ، سیاسیات بشریات وغیرہ موضوعات سے متعلق ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے تبصرہ نگاری کا کوئی ایک مخصوص خاکہ تیار کرنا کارِ دشوار ہی کیا بلکہ کارِ محال ہو گا۔

افسانوی ادب پر تبصرہ لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ ناول، مثلاً قرۃ العین صاحبہ کا معروف زمانہ ناول، کارِ جہاں دراز ہے۔ یا آمنہ ابو الحسن صاحبہ کا وابسی پر تبصرہ میں پلاٹ کا خلاصہ دے دینا بغایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد تکنیک، محرکات و تاثرات، قلم کاروں کا سماجی پس منظر وغیرہ کا ذکر برمحل ہو گا۔

افسانوں پر مشتمل کسی افسانہ نگار کی تخلیق پر تبصرہ جداگانہ احاطہ طلب کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ہر افسانے کی تلخیص پیش نہیں کی جا سکتی۔ بہرکیف یہ تو معلوم ہو ہی سکتا ہے کہ زیرِ تبصرہ افسانہ نگار سماج کے کس طبقے کے کردار پیش کرتا ہے، تکنیک اگر توجہ طلب ہو تو اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ افسانوں کی دنیا کیسی ہے، مصنف کیا کہنا چاہتا ہے اور اس نے کس طرح کہا ہے۔؟

شعری مجموعوں پر تبصرہ کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اگر تبصرہ نگار ہالہ اثری HALO EFFECT کا شکار ہو گیا تو اس صورت میں لکھا گیا تبصرہ بھی عجیب و غریب ہو جائے گا۔ ہالہ اثری علم نفسیات کی اصطلاح ہے اور قارئین غالباً اس اصطلاح کے مفہوم سے واقف ہونا ناپسند نہیں کریں گے۔ موٹے طور پر اس اصلاح سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ہم کسی کی ایک بات کو سن کر یا پڑھ کر پسندیدہ یا ناپسندیدہ تاثر لے کر ساری باتوں کو اچھا یا برا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسا تاثر غلط روی کی جانب گام و خرام ہی پر منتج ہو گا۔ مثال کے طور پر کسی مجموعے کو کھولتے ہی ایک

بقیہ صفحہ ۲۰ پر دیکھیے

جمیل احمد نظر

جو موسموں کو گلشن آشنا بھی رکھتے ہیں
وہ سانس لینے کو گھر میں ہوا بھی رکھتے ہیں

پرند کرتے ہیں جب بھی فضا کی پیمائش
زمین والوں سے اک رابطہ بھی رکھتے ہیں

دماغ، دار و رسن کو پتہ نہیں شاید
جو عشق کرتے ہیں وہ دل کھلا بھی رکھتے ہیں

جو مصلحت کے شکنجوں میں بند رہتی ہے
وہ بات کہنے کا ہم حوصلہ بھی رکھتے ہیں

عجیب دشمن جاں ہیں جو میرے سائے سے
جدا بھی رہتے ہیں اور واسطہ بھی رکھتے ہیں

گریز کرتے ہیں جو باہمی تصادم سے
وہ درمیان میں کچھ فاصلہ بھی رکھتے ہیں

جو چل کے آتے ہیں خود دشمنوں کے نرغے میں
فرار ہونے کا وہ راستہ بھی رکھتے ہیں

کرخت لہجے میں جو دور ہیں حقیقت سے
وہ اپنے زعم میں اک التجا بھی رکھتے ہیں

وہ لوگ جن سے تعلق ہے اپنا مٹی کا
نظر ضمیر میں اک رابطہ بھی رکھتے ہیں

آر-۱۹/۴۰/۷، الیف، بی، ایریا، کراچی ۳۸

عزیز اندوری

(۱)

الٰہی پرتوِ حسنِ جلال دے مجھ کو
کبھی تو عزمِ جنابِ بلال دے مجھ کو

میں تیرے ظرف کو پہچان کر ہی دونگا جواب
تو میرے قد کے برابر سوال دے مجھ کو

بلندیوں کو زمیں کا نصیب پہلے بنا
پھر اس کے بعد خوشی سے زوال دے مجھ کو

میں کب سے زیست کے اندھے کنوئیں میں تنہا ہوں
عزیز مصر یہاں سے نکال دے مجھ کو

میں اپنے ظرف کی تلوار تجھ کو دیتا ہوں
تو اپنے جبر و تشدّد کی ڈھال دے مجھ کو

تو پہلے کوئی ثبوتِ چمن فروشی دے
پھر اس کے بعد یہاں سے نکال دے مجھ کو

(۲)

جو سکوں کے نام پر آیا تھا لینے گھر مجھے
دے گیا بے درد کتنے خوں فشاں منظر مجھے

پہلے شیشوں کے مکانوں میں مقید کر دیا
اور پھر ہاتھوں میں اس نے دیدیئے پتھر مجھے

رفتہ رفتہ میں بھی آخر بن گیا ہوں سنگ میل
رہروانِ شوق نے دیکھا ہے کیوں رک کر مجھے

شہروں شہروں ہے مسرّت، کوچہ کوچہ ہے سکوں
میرے قاتل نے سجھائی بات یہ اکثر مجھے

میں بھی وہ اک چاند جیسے بت تراشوں گا عزیزؔ
جانے کب آواز دے دے وقت کا آزر مجھے

۱۷۷، آشیانہ، جونا رسالہ اسٹریٹ ۱، اندور (ایم پی)

پھیلا ہوا ہاتھ

انور عنایت اللہ

یو/۱۱۸ (پہلا منزلہ) بلاک نمبر-۲- پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی کراچی (پاکستان)

مونا کے چہرے سے اب یوں لگنے لگا تھا جیسے اسے صبر آگیا ہو۔ اس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونا کم کر دیا تھا۔ کئی راتوں سے وہ چین سے سو رہی تھی۔ پھر یکایک خدا جانے کیا ہوا کہ ایک رات اس نے ایک بار پھر وہی بھیانک خواب دیکھا۔

صبح پرسکون ہے اور موسم بے حد خوشگوار۔ بچے باغ میں کھیل رہے ہیں۔ اس کا اکلوتا بیٹا طاہر اور اس کا ہم عمر دوست پانچ سالہ ساجد، جو اپنی بیمار نانی کے ساتھ ان کے پڑوس میں رہتا ہے۔ یکایک باغ کی طرف سے ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔ وہ تیزی سے جاکر باورچی خانے کی کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے۔ جامن کے درخت کی ایک ٹہنی سے اس کا طاہر چپکا ہوا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ سہارے کے لئے پھیلا ہوا ہے۔ اسی ٹہنی پر ساجد چڑھ رہا ہے۔ وہ گھبرا کر تیزی سے باہر نکلتی ہے اور درخت کی طرف دوڑتی ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے دل کے ٹکڑے کا ہاتھ تھام لے، خشک ٹہنی چٹخ کر ٹوٹتی ہے اور پلک جھپکتے ہی طاہر زمین پر دھم سے آن گرتا ہے!

ایک چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس بھیانک خواب نے اس کی نیند اڑا دی۔ جب بھی وہ یہ خواب دیکھتی یہی ہوتا۔ رت جگوں کا اثر اب اس کی صحت پر پڑ رہا تھا اور وہ چہرے سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ شاہد نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔

"خدا کے لئے جذبات کو قابو میں رکھو مونا —— صبر کرو —— اس دیوانگی سے کیا حاصل؟ اب طاہر ہمیں کبھی واپس نہیں مل سکتا۔"

"جانتی ہوں" اس نے جواب دیا۔ "سارا قصور اس ذلیل ساجد کا ہے جس کے بہلاوے میں آکر میرا بیٹا درخت پر چڑھا۔ اسی کمینے نے میرے بچے کو مار ڈالا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہولے ہولے رونے لگی اور رات کے سناٹے میں شاہد کو یوں لگا جیسے کسی ویران قبرستان میں کوئی بے چین روح بین کر رہی ہو۔

"تمہارا خیال غلط ہے مونا" شاہد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "بچے کی موت آگئی تھی اس لئے وہ مرگیا۔ ساجد نے کچھ نہیں کیا۔"

"بالکل نہیں —— سب اسی کا کیا دھرا ہے جب سے وہ پڑوس میں آیا ہمارے معصوم بچے نے اوٹ پٹانگ کھیل شروع کر دئے۔ اسی کے کہنے پر وہ درخت پر چڑھا ہوگا۔ پھر وہ بھی اس ٹہنی پر نہ چڑھتا تو نہ ٹہنی ٹوٹتی اور نہ میرا بچہ گرتا" اس نے روتے ہوئے شکایت کی۔

"ٹہنی خشک تھی مونا" شاہد بولا۔

"میرا بچہ کون سا وزنی تھا۔ ٹہنی دو بچوں کا بوجھ نہ سہار سکی۔ میرا بس چلے تو میں اس ظالم کا گلا گھونٹ دوں —— میرے بچے کا قاتل!"

اس پر شاہد نے ایک بار پھر بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں مونا —— ساجد قاتل کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ تو خود ظالم وقت کے ہاتھوں ستایا ہوا ہے۔ جو بچہ چار سال کی عمر ہی میں ماں اور باپ، دونوں کی شفقت سے ایک ہی رات میں محروم ہو جائے، وہ ظالم کیسے ہو سکتا ہے؟ نانی کے لاڈ پیار نے اسے کسی حد تک ضدی ضرور بنا دیا ہے لیکن وہ نہ بدتمیز ہے اور نہ اتنا برا کہ اپنے عزیز دوست کی موت کا باعث بن جائے، اسے تو طاہر سے، ہمارے گھر سے —— بلکہ، تم سے ہر ایک سے عشق تھا مونا۔ مجھے اب بھی وہ اتنا ہی اچھا لگتا ہے جتنا طاہر کو لگتا تھا۔ تمہیں یاد نہیں، ہم بھی اس سے اس لئے خوش تھے کہ طاہر کی تنہائی ختم ہوگئی تھی اور اسے کھیلنے کودنے کے لئے ایک ہم عمر ساتھی مل گیا تھا۔"

کچھ ایسی ہی باتیں صبح تک جاری رہیں۔ جب تھک کر مونا کو نیند آگئی تو شاہد نے ٹھنڈی سانس لی اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔

ساجد بھی طاہر کی طرح مونا کو امی پکارنے لگا تھا۔ ماں کی محبت سے محرومی کا یہ واضح اظہار تھا۔ شاہد کو یاد آیا، ایک دن طاہر نے اس سے پوچھا تھا۔

"ابو —— ساجد اگر آپ کو ابو پکارے تو آپ خفا تو نہیں ہوں گے؟"

"نہیں بیٹے" شاہد نے شان سے جواب دیا تھا۔

"وہ کل کہہ رہا تھا۔ تمہارے ابو کو ابو پکارنے کو جی چاہتا ہے۔"

ایسے ہی کئی چھوٹے چھوٹے سے واقعات اسے یاد آنے لگے تو اس کی نیند بھی غائب ہوگئی۔

حادثے کے بعد ساجد نے صرف ایک بار یہاں آنے کی جرأت کی تھی جس کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ یہاں مونا نے اسے اتنا ڈانٹا اور برا بھلا کہا تھا کہ ڈر کر اس نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ نانی کے پاس یہاں آنے کے بعد زندگی میں پہلی بار اس نے ایک ہی دوست بنایا تھا اور وہ تھا طاہر۔ اور اب وہ بھی اسے اپنی امی کی طرح ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ خدا جانے اب وہ کس حال میں تھا اور کہاں تھا کیوں کہ شاہد نے حادثے کے بعد اسے بالکل نہ دیکھا تھا۔

ایک شام دفتر سے آنے کے بعد شاہد کسی کام سے طاہر کے کمرے میں گیا تو میز پر اسے نئی کتابوں کا وہ بنڈل نظر آیا جو حال ہی میں خریدا گیا تھا۔ طاہر کو گرامر اسکول میں داخلے کی امید تھی اور یہ کتابیں اس سلسلے میں خریدی گئی تھیں۔ گرامر اسکول کے پرنسپل کو مونا اس زمانے سے جانتی تھی جب وہ لندن میں زیر تعلیم تھی۔ اس لئے اسے یقین تھا کہ طاہر اور ساجد دونوں کو ضرور داخلہ مل جائے گا لیکن موجودہ حالات میں یہ ناممکن تھا کہ ساجد کو وہاں بغیر کسی کی سفارش کے داخلہ ملتا۔ اس خیال سے شاہد کو دکھ ہوا اور وہ سوچنے لگا ——— کیا ہوگا اس بچے کا ؟ اس کی نانی صاحب فراش تھیں۔ گھر بوڑھے ملازم کے رحم و کرم پر چلتا تھا اور ملازم ساجد کو صرف قریب کے سرکاری اسکول ہی میں داخلہ دلوا سکتا تھا۔

ایک دن ناشتے کے بعد شاہد دفتر چلا گیا تو مونا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ وہ خاصی دیر تک اخبار پڑھتی رہی۔ پھر اٹھ کر ایک تازہ رسالہ نکالا اور ڈرائنگ روم میں کھڑکی کے قریب آ بیٹھی۔ یہ کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ اس نے دیکھا کئی ننھے منے بچے، صاف ستھرے کپڑے پہنے، ہاتھوں میں کھانے کے رنگین ڈبے لئے، کاندھوں سے پانی کی بوتلیں لٹکائے، خاندان کی کسی نہ کسی خاتون یا مرد کے ساتھ اسکولوں کی طرف جا رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی مونا کو یاد آ گیا کہ بچوں کے داخلے کی آج آخری تاریخ تھی۔ انہیں دیکھتے ہی ایک بار پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کو بے دردی سے کچل دیا ہو۔ بڑی عجیب تڑپ تھی یہ۔ کاش وہ منحوس دن نہ آتا۔ کاش وہ ذلیل ساجد اس دن ان کے یہاں نہ آتا۔ دوسرے سے ان کی زندگی ہی میں نہ آتا۔ کاش وہ طاہر کو درخت پر چڑھنے کے لئے نہ اکساتا ——— کاش وہ سوکھی ٹہنی کٹوا دیتی ——— اس نے اُف وہ سوکھی ٹہنی کیوں نہیں کٹوائی ؟ ساجد نے تو کئی دن پہلے اسے بتایا تھا کہ جامن کی ٹہنی سوکھ گئی ہے۔ اس طرح کیا طاہر کی موت کی وہ بھی ذمہ دار تھی ؟ ———

اس خیال سے وہ تڑپ گئی۔ ذہنی ہیجان ہو کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے سینے سے باہر نہ نکل آئے۔ منٹوں میں اس کی طبیعت اس قدر بگڑی کہ وہاں بیٹھنا اس کے لئے دوبھر ہو گیا۔ وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گئی اور سڑک کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں ایک بچے پر رک گئیں جو کھویا کھویا ما جانے کہاں جا رہا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تو پہچان لیا۔ وہ ساجد تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، یوں جیسے اسے ہوش نہ ہو کہ اسے جانا کہاں ہے۔

مونا نے غور سے اسے دیکھا تو نہ جانے کیوں اسے یوں لگا جیسے وہ بھی اتنا ہی تنہا ہو جس قدر وہ خود تھی۔ ان چند لمحوں میں خدا جانے کیا ہوا کہ وہ بے اختیار گھر سے باہر نکلی اور اس کے قدم آپ ہی آپ ساجد کی طرف بڑھنے لگے۔

ساجد نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ رک گیا اور سہمی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مونا کو اس پر بڑا رحم آیا۔ اس نے قریب جا کر آہستہ سے اس سے پوچھا۔

"اتنے دن کہاں تھے ساجد"

"جی ——— بس یہیں تھا۔" اس نے مرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ مونا نے نوٹ کیا اس نے امی کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔

"اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ ——— داخلے کے لئے اسکول کیوں نہیں گئے ؟" مونا نے آہستہ سے پوچھا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ ساجد نگاہیں جھکائے اپنے داہنے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا طاہر کی امی کے لہجے میں جو نرمی پیدا ہوئی ہے اسکے کیا معنی ہو سکتے ہیں ؟ -

"جواب کیوں نہیں دیتے ؟" مونا نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "پہلے تو مجھ سے بہت بولا کرتے تھے !"

"اسکول والے اکیلے بچوں کو داخل نہیں کرتے۔ نانی جان کی طبیعت کل رات سے بہت خراب ہے"

اس کا لہجہ بڑا اداس تھا جس کی وجہ سے مونا کو اپنی تنہائی کا احساس اور شدید ہو گیا۔ اس نے غور سے ساجد کو دیکھا اور پوچھا۔

"تم نے اپنا یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے ؟" اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولی "چلو میرے ساتھ"

یہ سن کر تو یوں لگا جیسے ساجد کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر مونا کے چہرے پر اسے نرمی نظر آئی تو وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ مونا اسے اندر لے آئی۔ منہ ہاتھ دھلایا۔ الماری میں سے طاہر کے اچھے کپڑے نکال کر پہنائے اور سنگار میز کے سامنے اسے اسٹول پر بٹھا کر یوں پیار سے کنگھی کرنے لگی جیسے وہ ساجد نہیں، طاہر ہو۔ چند منٹوں کے بعد اسے کچھ یکایک یاد آیا تو اس نے پوچھا۔

"تم نے ناشتہ کیا ؟"

"نہیں"۔ ساجد نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا ارادہ کیا ہے ؟ فاقے کرو گے تو فوج میں کیسے داخل ہو گے ؟ اس کے لئے خوب تگڑا ہونا ضروری ہے ——— چلو ——— میں ناشتہ کراتی ہوں" ——— یہ کہتے ہوئے وہ اسے پیار سے ڈرائنگ روم میں لے گئی اور اسے اس کرسی پر بٹھا

دیا جو طاہر کے لئے مخصوص تھی۔ اس کے بعد وہ خود باورچی خانے میں گئی اور ساجد کیلئے ناشتہ تیار کرنے لگی۔

"کتنا دبلا ہو گیا ہے یہ لڑکا؛" اس نے سوچا۔ "دو مہینوں میں برسوں کا بیمار لگتا ہے؛"

تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹرے میں ناشتہ لگا کر ساجد کے پاس لے گئی۔ اس کے گلے میں نیپکن اسی طرح باندھا جس طرح وہ طاہر کے باندھا کرتی تھی پھر توس پر مکھن اور جام لگا کر اسے دیا۔ ساجد کو غالباً بہت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے تیز تیز کھانے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر مونا کو یکایک ساجد کی قمیص کی جیب پر جامن کے نیلے نیلے دھبے نظر آئے۔

"جامن بھر لے تھے جیب میں؟" اس نے پوچھا۔ "یہ داغ مشکل سے جاتے ہیں ——— تمہیں بھی جامن پسند ہیں سجو؟" اسے معلوم تھا اس کے بیٹے کو تو جامن سے عشق تھا۔

"جی ہاں ——— بہت" ساجد نے جواب دیا۔ اتنے دنوں کے بعد طاہر کی امی کے منہ سے "سجو" سن کر اسے بہت اچھا لگا۔

"اسے بھی جامنیں بہت پسند تھیں ——— میرے طاہر کو" مونا نے یکایک انداز میں آہستہ سے کہا۔

"جانتا ہوں ——— وہ جامن توڑنے ہی تو چڑھا تھا درخت پر" ساجد بولا۔

"لیکن سوکھی ٹہنی پر کیوں چڑھ گیا تھا وہ؟" مونا نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ نہیں چڑھا تھا ——— سوکھی ٹہنی پر تو میں چڑھا تھا!" ساجد نے جلدی سے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" حیرت سے مونا نے فوراً پوچھا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں! ——— اس کا پیر تو سبز ٹہنی پر سے پھسلا تھا وہ زرد تھی۔ میں تو اسے روکنے کے لئے تیزی سے چڑھا تھا۔ لیکن میرے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی سوکھی ٹہنی بھی ٹوٹ گئی اور میں بھی دھم سے گرا ——— یہ ٹہنی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس لئے مجھے معمولی چوٹ لگی!"

یہ کہتے ہوئے ساجد نے اپنی قمیص کی آستین اوپر چڑھائی تو مونا نے دیکھا اس کی بائیں کہنی بری طرح سے چھل گئی تھی۔ زخم ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا اس روز طاہر کو زمین پر پڑے دیکھ کر اس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ ساجد کو بھی چوٹ لگی تھی۔

ساجد نے مونا کو خاموش دیکھا تو سمجھا اسے پھر غصہ آ گیا ہے۔ اور اب وہ جھنجھلا کر ضرور ایک بار پھر اس کی پٹائی کرے گی۔ اس خیال سے وہ بری طرح سہم گیا اور فوراً روہانسی آواز میں کہا۔

"میرا یقین کیجئے امی!" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "میں اس کی مدد کرنے کو چڑھا تھا درخت پر ——— سوکھی ٹہنی پر صرف میں تھا ——— میں بے قصور ہوں امی ——— خدا کی قسم وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔"

اس کی باتیں سن کر مونا پر تو گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ صحیح واقعات جان کر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اس نے اب تک خواہ مخواہ اس معصوم کو غلط سمجھا تھا۔ طاہر کی موت تو واقعی ایک حادثہ تھا یکایک دور سے اسے ساجد کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا امی ——— خدا کی قسم کچھ نہیں کیا ——— مجھے مت ڈانٹئے امی ——— مجھے آپ سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

ساجد کے منہ سے بار بار امی کا لفظ سن کر مونا نے دیوانہ وار اسے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے کہا۔

"مت ڈر بیٹے ——— مت رو ——— مجھے معلوم ہے تم سچ بول رہے ہو۔ مجھے یقین آ گیا ہے تم نے کچھ نہیں کیا جو کچھ ہوا وہ ہماری تقدیر میں لکھا تھا۔ اب آنسو پونچھ لو۔ اسکول لے جانے کے لئے پہلے میں تمہارا کھانا تیار کرتی ہوں۔ بوتل میں ٹھنڈا پانی بھرتی ہوں۔ پھر میں تمہیں گرامر اسکول لے چلوں گی ——— داخلہ دلوانے ——— مت رو میرے بچے ——— مت رو۔"

ساجد کی آنکھوں سے تو جھڑی لگ گئی تھی اور سسکیاں تھیں کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ بہت سی محبت اچانک پا کر بھی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ مونا سوچ رہی تھی ——— عجیب پاگل لڑکا ہے! اس کا پھیلا ہوا ہاتھ میں نے اتنی مضبوطی سے تھام لیا ہے ——— پھر بھی نہ جانے کیوں روئے جا رہا ہے ——— بالکل میرے طاہر کی طرح ——— وہ بھی تو یوں ہی بات بے بات رویا کرتا تھا!

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالانہ خریداری اگست ۱۹۸۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ ازراہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۴۰ روپے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

حیدر قریشی

خوشی حد سے زیادہ دے کے بھی برباد کرتا ہے
انوکھے ہی ستم وہ صاحبِ ایجاد کرتا ہے

تماشہ سا تماشہ ہی بنا ڈالا مجھے اس نے
کبھی وہ قید کرتا ہے کبھی آزاد کرتا ہے

عجب اب کے طلسمِ خامشی طاری کیا اس نے
وہ جادوگر نہ کچھ سنتا نہ کچھ ارشاد کرتا ہے

یہ دل ہے یا کوئی کردار اگلی داستانوں کا
ابھی ہنستا بھی جائے ہے، ابھی فریاد کرتا ہے

سزائیں مل رہی ہے مجھ کو میرے نیک عملوں کی
گنہ سب میرے حصے کے مرا ہمزاد کرتا ہے

یہی وہ خانماں ویراں ہے جس کو عشق کہتے ہیں
دلوں میں بستیاں غم کی یہی آباد کرتا ہے

نہ لذّت کا کوئی احساس نہ کوئی اذیت ہے
نہ کوئی یاد آتا ہے نہ کوئی یاد کرتا ہے

ستمگر حوصلے کی داد تو دینے لگا حیدرؔ
اگرچہ داد میں بھی وہ مجھے بے داد کرتا ہے

ایف ر ۱۰۳، محلہ کھوکھراں۔ خانپور، ضلع رحیم یار خان (پاکستان)

ذکاء الدین شایاں

(۱)

روشنی، لٹکی ہوئی تلوار سی
حسن افزا ہر نظر، خونخوار سی

خوشبوؤں کی زرم ہم آغوشیاں
درمیاں اک آہنی دیوار سی

سامنے صد رنگ نسخے، مشورے
زندگی صدیوں سے کچھ بیمار سی

کالی آنکھوں میں شہابی کروٹیں
کوئی خواہش رات کی، بیدار سی

محو سے ہوتے ہوئے خبروں کے شور
یاد کی آہٹ یکایک تار سی

دل وہی برباد، اور صدیوں کی گرد
وقت کی ہر فتح بھی بیکار سی

(۲)

آنکھوں آنکھوں میں سفر شفاف منظر تک رہا
گرد کا طوفاں اٹھا، پلکوں کے باہر تک رہا

موسموں کی دھوپ چھائی تو آئینوں کے وہ سراب
خود جو اک دریا تھا، پیاسا وہ گلِ تر تک رہا

صحرا صحرا تازگی تھی، آب آب افسردگی
کون جز دِ جاں مرے خوابوں کے منظر تک رہا

اہلِ غم کو وادیٔ پُرخار میں نیند آگئی
خوابِ نادیدہ کہیں پھولوں کا بستر تک رہا

خاک پرور تھیں شمعیں، وسعتوں کے سر گئیں
مسئلہ آبادیوں کا بام اور در تک رہا

نزد۔ اولڈ سٹی پوسٹ آفس۔ بکریا۔ بیلی بھیت، یوپی (۲۶۲۰۰۱)

نگارستانِ سخن مرتبہ: ظہیر دہلوی

مختار شمیم ● صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج - اندور - ۴

۱۸۵۷ء کے بعد دلّی سے شاعری کی تین اہم کتابیں تقریباً ایک ہی زمانے میں شائع ہوئیں۔ ۱۲۷۸ھ میں مرزا غالب کے کلام کا ایک نسخہ مطبع احمدی واقع شاہدرہ دلہائی امّو جان کے اہتمام سے شائع ہوا۔[۱] لیکن یہ نسخہ جب کتابی شکل میں غالب کے سامنے آیا تو وہ بہت جز بز ہوئے اور اپنی ناراضگی کو چھپا نہ سکے۔ میر مہدی کو ایک خط میں لکھا
"دلّی اور اس کے بانی اور اس کے چھاپے پر لعنت ...... نہ میں خوش ہوا ہوں، نہ تم خوش ہو گئے"[۲]

خاقانیٔ ہند ذوقؔ دہلوی کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہو چکا تھا۔ ذوق کے انتقال کے بعد ان کے دیوان کی ترتیب کا سلسلہ ان کے صاحبزادے محمد اسماعیل فوقؔ اور مولانا محمد حسین آزاد نے شروع کیا ہی تھا کہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا اور خلیفہ محمد اسماعیل کے انتقال کے ساتھ ساتھ ذوق کا زیرِ ترتیب مسودہ بھی گم ہو گیا۔ لیکن محمد حسین خاں تحسین مہتمم مطبع مصطفائی کی تحریک پر ذوق کے ایک شاگرد غلام رسول ویرانؔ نے اپنے حافظے کی مدد سے اور احباب کے تعاون سے تدوینِ کلامِ ذوق کی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ ویران کے ساتھ ساتھ ذوق کے نامور شاگرد نواب مرزا ظہیرؔ دہلوی اور ان کے بھائی امراؤ مرزا انورؔ دہلوی بھی شریکِ کار رہے۔ ذوق کا یہ دیوان بھی مرزا امّو جان کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ دلہائی میں طبع ہوا لیکن اس کی ترتیب میں حیدر بخش کے علاوہ خود ظہیر و انور شامل تھے۔ تصحیح کا کام ویران کے شاگرد محمد بخش اور شیخ حفیظ اللہ نے کیا۔[۳] لیکن اس کے باوجود نسخۂ ویران میں بھی کتابت کی غلطیاں راہ پا گئی تھیں۔ بعد کے جو نسخے اس سے نقل کئے گئے ان میں اس قسم کی غلطیاں بدستور قائم رہیں۔ ذوق کا یہ پہلا دیوان ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں یعنی غالب کے مذکورہ دیوان کے کچھ ہی عرصہ بعد شائع ہوا۔

لیکن اسی سال دہلی کے ایک تاجرِ کتب لالہ جے نرائن کی فرمائش پر ظہیر دہلوی نے "نگارستانِ سخن" کے نام سے ایک مجموعہ ترتیب دیا جس میں ذوق، غالب اور مومن کا کلام یکجا کیا گیا تھا۔ جناب مالک رام لکھتے ہیں۔

> "۱۸۶۳ء میں دہلی کے ایک تاجرِ کتب لالہ جے نرائن نے ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے دیوانوں کا انتخاب یکجا شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ترتیب کا کام غالباً راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی (تلمیذ ذوقؔ) کے سپرد ہوا۔"
>
> (گفتارِ غالب۔ ص ۱۷۷)

"غالباً" کا محل شاید اس لئے ہے کہ مرتب کی حیثیت سے ظہیر کا نام کتاب کی لوح پر مندرج نہیں ہے لیکن "نگارستانِ سخن" کے مرتب کی حیثیت سے راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی کے نام کے سلسلے میں محققین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے انتخابِ کلام کے علاوہ اس میں بہادر شاہ ظفر کے کہے ہوئے سہرے اور شاہ ظفر کی مدح میں ظہیر کا قصیدہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک غزل اور قطعہ بھی اس میں درج ہے۔" نگارستانِ سخن" کے صفحہ ۱۶۵ پر ظہیر کے قصیدہ کا عنوان ہے

> "قصیدہ فقیر سراپا تقصیر ظہیر الدین مؤلف تذکرہ ہذا الکترین از تلمذ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ در مدح حضور لامع النور بہادر شاہ بادشاہ"

مولانا امتیاز علی عرشی رقم طراز ہیں کہ

> "اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر کسی تذکرے کے مؤلف ہیں اور اس تذکرے میں انہوں نے یہ قصیدہ درج کیا ہے اور وہاں سے نگارستانِ سخن میں نقل کر لیا گیا ہے مگر میری دانست میں یہاں "تذکرہ" بجائے "مجموعہ" لکھا گیا ہے اور ظہیر اسی "نگارستانِ سخن" کے مؤلف و مرتب ہیں۔ واللہ اعلم۔"[۴]

ڈاکٹر تنویر علوی "نگارستانِ سخن" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اس انتخاب کی اس لئے بڑی اہمیت ہے کہ اس کے مرتب ظہیر دہلوی ہیں جو نسخۂ دیوان کی ترتیب دہی میں بھی شامل ہیں نیز اس میں ایسی متعدد غزلیں شامل ہیں جو اس سے بیشتر اور اس کے بعد ذوقؔ کے کسی مجموعہ یا انتخاب میں شامل نہیں کی گئیں۔"[۵۷]

مولانا امتیاز علی عرشی کے نزدیک اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ

"مرتب نگارستان نے ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے کلام کا انتخاب چھاپا ہے، مگر غالبؔ کا دیوان خود ہی منتخب اور مختصر تھا اس لئے اس کا بہت بڑا حصہ اس مجموعہ میں سما گیا ہے۔ اتنا بڑا کہ ہم اسے مطبع احمدی کا دوسرا ایڈیشن کہہ سکتے ہیں۔"[۵۸]

کالی داس گپتا رضا کا خیال ہے کہ

"یہ نسخہ نہایت کمیاب ہے۔ چونکہ اس میں غالبؔ کا تقریباً تمام متداول کلام آگیا ہے اس لئے اسے غالبؔ کے دیوان کا چھٹا حیاتی ایڈیشن کہنا چاہئے۔ اس میں ذوقؔ کے بھی کچھ ایسے اشعار ہیں جو دیوانِ ذوقؔ مرتبہ حافظ ویران اور محمد حسین آزادؔ سے زائد ہیں۔"[۵۹]

پروفیسر عطا کاکوی "نگارستانِ سخن" کی اشاعت کو "غالبیات میں ایک اہم اضافہ"[۶۰] قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

ذوقؔ اور مومنؔ کے کلام کا تو انتخاب ہے مگر غالبؔ کا کلام تمام و کمال "نقش فریادی" سے لیکر "یاران نکتہ داں کیلئے" تک جو متداول نسخوں میں پایا جاتا ہے، اس میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے اب تک جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ غالبؔ کے اردو دیوان کے کل پانچ ایڈیشن خود ان کی حیات میں چھپے، یہ غلط ہے، ان میں ایک اور اضافہ ہوا، اور اب ان کی ترتیب بھی بدل گئی، جو پانچواں ایڈیشن تھا وہ چھٹا ہو گیا اور پانچویں کی جگہ "نگارستانِ سخن" نے لی۔"[۶۱]

"نگارستانِ سخن" میں کل ۱۰۷ صفحات ہیں۔ سرورق قلمی گل بوٹوں سے مزین ہے اور لوح پر ذیل کی عبارت درج ہے

"بعون خالقِ ارض و سما قادر بیچون و چرا مجموعۂ انتخاب دواوین شعراء عظامٰ ذوقؔ و غالبؔ و مومنؔ مسمیٰ"[۶۲]

نگارستانِ سخن

حسب فرمائش لالہ جی نرائن صاحب در مطبع، مطبع العلوم سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی

"باہتمام بندہ قاسم علی طبع شدہ"

صفحہ ۲ سے ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے کلام کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، ہر صفحہ (۳) کالمی ہے اور اشعار کی کتابت ترچھے ترچھے انداز میں کی گئی ہے۔ اول کالم میں ذوقؔ، کالم دوم میں غالبؔ اور آخری تیسرے کالم میں مومنؔ کا کلام درج کیا گیا ہے لیکن یہ ترتیب ص ۹ پر بدل گئی ہے۔ اس صفحہ پر پہلے کالم میں مومنؔ، آخری کالم میں ذوقؔ اور درمیان میں غالبؔ کا کلام ہے۔ صفحہ ۱۰ سے ابتدائی ترتیب کے مطابق ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی ترتیب موجود ہے۔ اسی طرح صفحہ ۶۰ پر پہلے غالبؔ کی غزل ہے، درمیان ذوقؔ کا قطعہ اور تیسرے کالم میں مومنؔ کی غزل دی گئی ہے۔ صفحہ ۶۱ پر ترتیب درست ہو گئی ہے لیکن ترتیب کی ایک بڑی غلطی صفحہ ۸۷ - ۸۸ پر کاتب کے "کمالِ فن" کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے یعنی صفحہ ۸۷ کے آخری کالم میں مومنؔ کے عنوان کے تحت غالبؔ کی غزل درج ہے اور صفحہ ۸۸ پر درمیان کے کالم میں غالبؔ کے نام سے مومنؔ کی غزل کے اشعار درج ہیں۔ غالبؔ اور مومنؔ کی ان غزلوں کے مقطعے اس طرح ہیں

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروغ کو	خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہئے
ترک مذہب کیوں کرو مومنؔ کیا	اس صنم کو لاف یکتائی نہیں

پہلے کالم میں شاہزادہ جواں بخت کی شادی پر شاہ ظفر کا کہا ہوا سہرا بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"جہاں ذوقؔ کا انتخاب ختم ہوتا ہے وہاں نسبتاً جلی قلم سے ظفر لکھ کر ظفر کے کچھ اشعار ایک توصیفی عبارت کے ساتھ درج ہیں۔ انہیں کے ساتھ شہزادہ جواں بخت کی شادی کتخدائی کے موقعہ پر کہے ہوئے ظفرؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے سہرے بھی دئے گئے ہیں۔"[۶۳]

اس اقتباس سے یہ التباس ہوتا ہے کہ سہرے سے پہلے توصیفی عبارت کے ساتھ ظفرؔ کے چند اشعار بھی درج ہیں اور یہ کہ یہ "توصیفی عبارت" صرف ظفرؔ کے لئے ہی مندرج ہے۔ جب کہ صورت حال یہ ہے کہ صفحہ ۶۲ پر ذوقؔ کے قصیدے کے اختتام پر اول کالم میں جلی قلم سے ظفرؔ لکھا ہوا ہے اس کے بعد یہ عبارت درج ہے۔

"نتائجِ طبع زاد ریختۂ کلکِ گوہر سلک فرماں فرمائی شہرستانِ معانی حضرت ظلِ سبحانی بادشاہ کیواں جاہ سراج الدین محمد ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ"۔
اور اسی کے ساتھ "سہرہ ظفر" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اسی کے پہلو میں دوسرے کالم میں غالب کے قطعہ کے اختتام کے بعد درج ذیل تحریر موجود ہے اور اس کے بعد "سہرہ ذوق" کا عنوان درج ہے اور تحریر یہ ہے کہ

"لائی مدار معامین منسلک نمودہ خاطر نقاد عیار سخن جادو بیان سامری فن خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد حضور والا۔

تیسرے کالم میں پہلو بہ پہلو مومن کی رباعی کے خاتمہ پر جلی قلم سے غالب لکھا ہوا ہے اور یہ عبارت شامل ہے: ـــ

"عروسِ افکار حجلہ نشین دل خوش منزل طوطی شکرستان سخنوری مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر"۔

اس کے بعد "سہرہ غالب" کا عنوان ہے۔

صفحہ ۱۶۳ سے حسب ترتیب ظفر، ذوق اور غالب کے سہرے درج ہیں۔ ظفر کے کہے ہوئے دو سہرے نگارستان سخن میں شامل ہیں

(۱) کرتا اس رخ پہ ہے کیا جلوہ نمائی سہرا   آئے جو دیکھنے کو ساری خدائی سہرا

نو اشعار پر مشتمل یہ سہرا صفحہ ۱۶۳ پر ہی مکمل ہو جاتا ہے۔ دوسرا سہرا

یہ سہرا شاہ کے نورِ نظر کا ہے سہرا   یہ سہرا شاہ کے جان و جگر کا ہے سہرا

صفحہ ۱۶۴ پر درج ہے اور کل پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔

صفحہ ۱۶۳-۱۶۴ پر ذوق و غالب کے وہ تاریخی سہرے شامل ہیں جو ادبی معرکہ کی لاجواب مثال کہے جاتے ہیں۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ

"غالب کا یہ سہرا مارچ ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا تھا اور حالانکہ اس کے بعد ان کی زندگی میں دیوان کے تین ایڈیشن چھپے، اسے ان میں سے کسی میں بھی شامل نہیں کیا گیا، یہ کتابی شکل میں پہلی مرتبہ اسی "نگارستان سخن" میں چھپا تھا۔"[۱۱]

صفحہ ۱۶۵ پر مومن و غالب اور ظہیر کے قصیدے شامل ہیں۔ مومن کا قصیدہ نعتیہ ہے جس کا مطلع ہے:

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس   کہ جیسے صبحِ شبِ ہجر نالہائے خروس

مومن کا یہ نعتیہ قصیدہ صفحہ ۱۷۴ تک محیط ہے۔ اسی طرح غالب کے دو قصیدے ہیں۔ پہلا قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام   جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

یہ قصیدہ صفحہ ۱۶۵ سے ۱۷۰ تک درج ہے۔ اسی صفحہ سے غالب کا دوسرا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔

صبح دم دروازۂ خاور کھلا   مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

بادشاہ ظفر کی مدح میں یہ قصیدہ صفحہ ۱۷۰ پر مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد میں غالب کا ایک قطعہ اور شامل ہے "ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو"۔ کتاب کے آخر میں مومن کا مخمس صفحہ ۱۷۴ تا ۱۷۶ بھی شامل ہے۔

شاہ ظفر کی مدح میں ظہیر دہلوی کا قصیدہ (۱۶۵ تا ۱۷۳) ان کے کسی مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہے۔ صفحہ ۱۷۴۔۱۷۵ پر ۲۴ شعروں کی ظہیر کی کہی ہوئی ایک غزل بھی درج ہے۔ یہی غزل ان کے دیوانِ اوّل (گلستانِ سخن) کے صفحہ ۱۲۴ پر کسی قدر لفظی ترمیم کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مثلاً نگارستان سخن میں اس غزل کا مطلع یوں درج ہے

علائق سے وارستہ انساں نہیں   گلو گیر کس کا گریباں نہیں

"گلستان سخن" میں 'علایق' کو لفظ 'تعلق' سے بدل دیا گیا ہے

تعلق سے وارستہ انساں نہیں   گلو گیر کس کا گریباں نہیں

بعض دیگر اشعار میں بھی یہی صورت ہے، مثال میں صرف دو شعر درج کیے جاتے ہیں

نگارستان سخن: پسند اپنا ہے ہم کو اقلیم عشق   جہاں پرسشِ کفر و ایماں نہیں   (چوتھا شعر)

خدا کی خدائی میں کیا کیا نہیں   مگر دادِ خونِ شہیداں نہیں   (آٹھواں شعر)

گلستان سخن: جدا ہے زمانے سے اقلیم عشق   جہاں پرسشِ کفر و ایماں نہیں

خدا کی خدائی میں سب چیز ہے مگر دادِ خونِ شہیداں نہیں

لیکن ظہیر نے اس غزل کے چوبیس اشعار میں سے صرف چودہ اشعار اپنے دیوان میں رکھے ہیں اور باقی اشعار ترک کر دئے گئے ہیں۔

"نگارستان سخن" کے صفحہ ۲۶۴ پر سہروں کے بعد نصف صفحہ پر ذیل کی عبارت شامل ہے۔

الحمد للہ والمنہ کہ بمیمن تائید ایزدی دمان انتخاب دیوان ہر سہ شعرائے جادو بیان شہسواران عرصۂ سخندانی
شہریارانِ شہرستانِ نکتہ دانی، کہ گوئے سبقت از قدما و متاخرین ربودہ وعلم استادی در میدان فصاحت و بلاغت افراشتہ
اند یاد اولاً کلام معجز نظام خداوند سخن خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد حضور والا ثانیاً طوطی شکرستان معانی چراغ افروز
شبستان زبان دانی نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ بہادر ثالثاً فلاطونِ دوراں، مسیحائے زماں حکیم
محمد مومن خاں تخلص مومن درین چند اوراق حسب فرمائش لالہ جے نرائن صاحب سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ
دہلی بحسن اہتمام مرزا اموجان حلیہ انطباع پوشید بتاریخ بست ہفتم صفر ۱۲۷۹ ہجری تمام شد

صفحہ اول (سرورق) کی عبارت سے نگارستان سخن، کے مطبع العلوم سینٹ اسٹیفنز میں چھپنے کی بات پتہ چلتا ہے لیکن صفحہ ۲۶۴ پر درج بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے
"نگارستان سخن" میرزا اموجان کے مطبع احمدی میں چھپ کر تیار ہوا۔ صفحہ ۲۶۵ پر ایک تحریر مندرج ہے

"الحمد للہ والمنہ کہ نسخۂ عجایب در علم سخن موسوم بہ نگارستان سخن حسب فرمائش لالہ جی نرائن صاحب سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع
شاہدرہ با اہتمام محمو جان طبع شد"۔

اس کے بعد میرزا اموجان کا یہ نوٹ بھی ملاحظہ ہو

"درخدمت ہمہ صاحبان عرض است کہ سہ جزو کتابت لہٰذا از جانب شروع در مطبع دیگر اولاً طبع شدہ بود بعد از سہ جزو تا تمام در
مطبع بندہ طبع گردید۔ فقط الراقم بندہ اموجان مہتمم مطبع احمدی"

اس سے ظاہر ہے کہ "نگارستان سخن" کے صرف تین جزو سینٹ اسٹیفنز کے مطبع میں چھپے اور باقی حصہ مطبع احمدی میں چھاپا گیا۔ یہ وہی میرزا اموجان ہیں جن کے زیر اہتمام مطبع احمدی میں غالب کا دیوان (۱۸۶۱ء) میں چھپا تھا اور غالب اس کی کتابت پر سر پیٹ کر رہ گئے تھے۔

اس سے پہلے ہم یہ بات کہہ چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس انتخاب کی اشاعت کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ احمدی پریس میں طبع ہوا ہے۔ چونکہ اس میں غالب کا متداول کلام شامل ہے اس اعتبار سے "نگارستان سخن" کو غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں نے کلام غالب کا پانچواں نسخہ تسلیم کیا ہے جو غالب ہی کی زندگی میں شائع ہوا۔ اسی کے ساتھ ابتدا میں یہ بھی مذکور ہوا کہ "نگارستان سخن" کی اشاعت کے زمانۂ قریب ہی میں دیوانِ غالب کا ایک نسخہ مرزا اموجان کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اس دیوان کی اشاعت سے غالب کو کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے اس پر اپنی ناراضگی کا برملا اظہار کیا تھا[۱]۔ "نگارستان سخن" میں شامل کلام غالب کو مطبع احمدی کا دوسرا ایڈیشن کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ غالب نے اس مطبوعہ نسخہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی کہیں اس کا حوالہ دیا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہوگا کہ بقول امتیاز علی عرشی "دیوان غالب احمدی ایڈیشن اور نگارستان سخن کا مطبع ہی نہیں کاتب بھی ایک ہے۔ نیز اس میں وہ سب غلطیاں موجود ہیں جو احمدی ایڈیشن کے غلط نامے میں مذکور تھیں[۲]"۔ ظاہر ہے کہ مرزا غالب اپنے کلام کے ایک ایڈیشن کی غلطیوں پر جھلاتے ہوئے بیٹھے ہی تھے، یک نہ شد، دو شد "نگارستان سخن" کو انہوں نے پردۂ خفا میں رکھنے کی مصلحت دیکھی۔ اس لئے خود غالب نے "نگارستان سخن" کا نہ کہیں ذکر کیا اور نہ حوالہ دیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ یہ انتخاب ان کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ خود ظہیر دہلوی بھی اس کی کتابت اور طباعت سے مطمئن نہ ہوں گے یہی وجہ ہے کہ خود انہوں نے بھی "نگارستان سخن" کے بارے میں خموشی اختیار کی۔ یہ فرد ہے کہ ان کی اس خموشی سے کئی افسانے تراشے گئے اور تراشے جا رہے ہیں لیکن ہماری دانست میں ظہیر کی خموشی انتخاب کی اغلاط کے باعث حق بجانب ہے۔ شرمندگی اور تاسف کا اس سے بڑھ کر اظہار اور کیا ہوگا کہ جن اساتذۂ ثلاثہ سے بے پناہ خلوص اور ربط باہمی رہا ہو، ان کے کلام کی مسخ شدہ یہ صورت دیکھیں، خود انہیں تعجب اور حیرت نہ ہوئی ہوگی؟

"نگارستان سخن" میں کتابت کی غلطیاں اتنی عام ہیں کہ کسی شعر کا صحیح پڑھ لینا مشکل ہے۔ بعض جگہ الفاظ کی صحیح شکل ہی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ سہو کتابت نے بعض اشعار کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ کہیں ایک شعر دو دو بار بھی درج ہوا ہے۔ مومن کی غزل غالب کے عنوان سے اور غالب کی غزل مومن کے نام سے چھپ گئی ہے۔ ڈاکٹر

تنویر احمد علوی کے بقول "یہ نسخہ کتابت وطباعت کی فروگذاشتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے[۱۷]"۔ خود مہتمم مطبع مرزا اتو جان کے نام کا املا ایک ہی جگہ دو صورتوں میں ہے "عمو جان" اور "اتو جان"۔ مولانا امتیاز علی عرشی کی نشاندہی کے مطابق غالب کی ایک غزل کا مطلع صفحہ ۹۴ پر درج ہے اور بقیہ اشعار صفحہ ۹۶ پر درج ہیں۔ غالب کے کلام کے سلسلے میں اسی قسم کی فروگذاشتوں اور کتابت کی غلطیوں پر مولانا امتیاز علی عرشی نے تفصیل سے اپنے ایک مضمون میں روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کلیات ذوق کے مقدمہ میں اس جانب اشارہ کیا ہے البتہ کسی کو مومن کے کلام کی بابت کوئی فکر نہ ہوئی جبکہ مرتب مومن کا مقلد ہے:

طرز مومن سے نہ آگاہ تھا جب تک کہ ظہیر سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

بات یہ ہے کہ مومن کا دیوان شیفتہ کا فراہم کردہ کریم الدین مصنف "طبقات الشعرا" نے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء) میں شائع کرا دیا تھا۔ ۱۲۶۹ھ میں "نگارستان سخن" میں مومن کے کلام کا ایک انتخاب شائع ہوا۔ اس اعتبار سے مومن کے کلام کا یہ دوسرا منتخب مجموعہ کہا جا سکتا ہے مگر اغلاط سے پُر۔ اس کے بعد بھی مومن کے کلام کے جو ایڈیشن نکلے ہیں وہ بھی اغلاط سے خالی نہیں تھے۔ ان کے اردو کلام کا صحیح نسخہ بہت بعد کو ۱۹۳۴ء میں ضیا احمد بدایونی نے مرتب کیا[۱۸]

"نگارستان سخن" کو کلام مومن کا بہترین انتخاب کہیں[؟] غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا دوسرا احمدی ایڈیشن کا نام دیں یا ذوق کے کلام کا قدیم ماخذ قرار دیں۔ اس میں شک نہیں کہ بے شمار سہو و اغلاط کے باوجود ظہیر دہلوی کے انتخابی ذہن کی یہ ایک خوبصورت یادگار ہے اور محققین و شائقین ادب کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ بعض محققین نے نگارستان سخن کے سلسلے میں عجیب و غریب افسانے تراشے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ

"اس میں ذوق کی سولہ غزلیں ایسی ہیں جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ لہٰذا شبہہ سے بالا نہیں"[۱۹]

چنانچہ ڈاکٹر عابد پشاوری داخلی شہادتوں سے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ سولہ غزلیں ذوق کی نہیں ظہیر دہلوی کی کہی ہوئی ہیں۔ نہایت شد و مد سے اپنا ایک بیان جاری کر دیتے ہیں حالانکہ اس صورت میں داخلی شہادتیں ناکافی ہوتی ہیں لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ

"مولانا آزاد نے ان غزلوں کو قبول نہیں کیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے یہ غزلیں دیکھی ہی نہیں ہوں گی ان کے پیش نظر نسخۂ دیوان موجود تھا، جگہ جگہ 'ناتمام' دیکھ کر ان کے دل میں ان کو پورا کرنے یا پوری پوری غزلیں کہنے کی امنگ پیدا ہوئی جو تذکرے یا ماخذان کو دستیاب تھے انہوں نے ان کی طرف بھی توجہ نہیں کی۔ ظہیر کا معاملہ مختلف ہے جو دیوان کے ساتھ مل کر استاد کا دیوان مدون کر چکے تھے۔ استاد کے کلام کی کمی انہیں بھی کھٹکی ہوگی۔ کچھ ردیفوں سے استاد کا دیوان خالی تھا انہوں نے سوچا ل(؟) استاد کا دیوان مکمل کر دیں لیکن عجلت کے سبب وہ تین ایسی ردیفوں میں چھ غزلوں کا اضافہ کر سکے۔ ان پر فارسیت غالب ہے۔ مومن کے انداز کے دلدادہ تھے جس کا ثبوت ان کا یہ شعر فراہم کرتا ہے ؎

طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

چنانچہ ان سولہ غزلوں میں انہوں نے استاد مومن کی سی نازک خیالی اور پیچیدہ بیانی بخشنے کی کوشش کی ہے"۔[۲۰]

اس اجمال کی تفصیل میں ڈاکٹر عابد پشاوری نے تقریباً ۱۱ صفحات کے مضمون میں وہی معاملہ اپنایا ہے جو ذوق اور محمد حسین آزاد کی نسبت اب تک دہرایا جا رہا ہے۔ ذوق کی مذکورہ غزلوں کی بابت حیرت و استعجاب تو ڈاکٹر تنویر علوی، پروفیسر عطا کاکوی اور اسلم فرخی کو بھی ہوا تھا لیکن ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی رقم طراز ہیں

"اس انتخاب کی اس لیے بڑی اہمیت ہے کہ اس کے مرتب ظہیر دہلوی ہیں جو نسخۂ دیوان کی ترتیب دہی میں شامل ہیں نیز اس میں ایسی متعدد غزلیں شامل ہیں جو اس سے پیشتر اور اس کے بعد ذوق کے کسی [illegible] مجموعہ یا انتخاب میں شامل نہیں کی گئیں۔...... یہ نسخہ کتابت وطباعت کی فروگذاشتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کی تاریخ اشاعت جیسا کہ عبارتِ اختتام سے معلوم ہوتا ہے بست و ہفتم ماہ صفر ۱۲۶۹ھ ہے۔ نسخۂ دیوان کا سالِ اشاعت بھی یہی ہے۔ ماہ و تاریخ کی اس میں کوئی تشریح نہیں لیکن گمان غالب ہے کہ اس کی ترتیب و تسوید کا کام اس سے پہلے عمل میں آ چکا ہوگا بصورت دیگر اس میں شامل نایاب حصہ "کلام ضرور نسخۂ دیوان میں موجود ہوتا"۔[۲۱]

اس سلسلے میں پروفیسر عطا کاکوی لکھتے ہیں کہ

"قیاس چاہتا ہے کہ یہ نسخہ حافظ ویران والے نسخہ سے مقدم ہے ......اس کتاب میں مجھے ذوق کے ایسے کلام کا پتہ چلا جو نہ ویران والے نسخے میں ہے اور نہ آزاد والے نسخے میں۔ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ حافظ ویران والے نسخے کی ترتیب میں ظہیر بھی شامل تھے اور اس نگارستان سخن کی ترتیب سے بھی بظاہر ظہیر کا تعلق ہے۔اسی لئے کہ ظہیر کے کچھ قصائد اور غزلیں بھی اس کے آخر میں شامل ہیں پھر کیا وجہ ہوئی کہ ذوق کا یہ کلام حافظ ویران والے نسخے میں داخل نہ ہو سکا۔"[۲۳]

ڈاکٹر عابد پشاوری نے ڈاکٹر عطا کاکوی کے مضامین کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ وہ نگارستان والے کلام کو ذوق کا مانتے ہیں اور نگارستان سخن نسخۂ ویران سے پہلے چھپا اور اس امر کی کوئی وجہ نہیں بتائی[۲۳]۔یہی خیال ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا بھی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ظہیر نسخۂ ویران کی ترتیب میں شامل تھے تو اس وقت ذوق کی مذکورہ سولہ غزلیں اور چھ اشعار اس انتخاب میں شامل ہونے سے کیوں رہ گئے اور کیا اس کی خبر ان کے بھائی انور کو بھی نہ ہوئی۔عابد پشاوری کی مشکل یہی ہے اور جب تنویر علوی سے اس کا سبب دریافت کرتے ہیں تو وہ اسے باہمی رقابت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں[۲۴]۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کا اس بابت خیال ہے کہ

"اس سلسلے میں دو باتیں ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہیں پہلی تو یہ کہ یہ مجموعہ ذوق کے انتقال کے آٹھ برس بعد شائع ہوا تھا۔اس زمانے میں ذوق کے بیشتر اچھے تلامذہ زندہ تھے اگر یہ کلام الحاقی ہوتا تو وہ لوگ ضرور احتجاج کرتے۔دوسرے یہ کہ اس کلام کا اسلوب، انداز، طرز ادا اور بندش سو فیصد ذوق کی ہیں۔نگارستان کی ان غزلوں میں ذوق کا رنگ پوری طرح نمایاں ہے۔اس بنا پر انہیں ذوق کی ملکیت تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔"[۲۵]

ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے میں وزن بھی اور وجہ بھی کسی حد تک معقول ہے لیکن ڈاکٹر عابد پشاوری کو ان کی اس رائے سے اختلاف اس لئے ہے کہ

"ہم نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر صاحب نے ذوق کا دیوان دیکھا ہوگا ہمارا مطلب ہے پڑھا ہوگا ......وہ آزاد پر کام کر رہے تھے لہٰذا آزاد کی تصانیف کا انہوں نے مطالعہ کیا لیکن دیوان ذوق کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ سب پروفیسر شیرانی کے مضامین سے ماخوذ ہے۔ اپنی طرف سے اضافہ یہی صد فی صد انداز والا بیان ہے جو غالباً سنجیدگی سے نہیں دیا گیا۔یہ دعویٰ کرنے سے پہلے کہ اس کلام کا انداز، بندش، اسلوب، طرز ادا صد فی صد ذوق کا ہے، انہیں اس دور کے شعرا کا نہیں تو کم از کم ظہیر کے کلام کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے تھا اور یہ انہیں میسر نہیں تھا۔انہوں نے روا داری میں ایک بیان دے دیا جس سے ان کے خیال میں کوئی مضر نتیجہ نکلنے کا احتمال نہیں تھا لہٰذا ان کے دلائل کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"[۲۶]

اس جملے کے فوراً بعد کے پیراگراف میں ڈاکٹر عابد پشاوری لکھتے ہیں :

"ہمارے سامنے ظہیر کا کلام نہیں ہے۔انتہائی کوشش کے باوجود یہ یقین علم نہیں ہو سکا کہ ظہیر کا دیوان چھپا بھی ہے یا نہیں۔ان کی اور کتابوں کے نام ملتے ہیں لیکن دیوان کی اشاعت کا علم نہیں ہے۔"[۲۷]

ان سطور کو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر عابد پشاوری کے بیانات پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ جو اعتراض انہوں نے اپنی تحریر میں اسلم فرخی پر کیا ہے، وہی اعتراض ان پر لفظ بہ لفظ صادق آتا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ عابد پشاوری "ذوق اور محمد حسین آزاد" پر ایک کتاب تحریر کر رہے ہیں[۲۸] لہٰذا انہیں کم از کم ظہیر پر قلم اٹھانے سے پہلے ظہیر کے مطبوعہ دواوین کا مطالعہ تو کر ہی لینا چاہئے تھا لیکن وہ ان سے بے خبر ہیں۔اس کے باوجود وہ نہایت وثوق سے فرماتے ہیں کہ

"ان سولہ غزلوں کو دیکھ کر پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں ذوق کے بجائے مومن کے انداز کا پرتو ہے ان میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو ذوق کے مزاج یا کلام سے میل نہیں کھاتیں ...."[۲۹]

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"کلیات ذوق مرتبہ ڈاکٹر علوی کے اختلاف نسخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی جگہ ظہیر نے ذوق کو اصلاح دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس لئے ان غزلوں کو بے جھل وحجت ذوق کا کلام نہیں مانا جا سکتا۔ظہیر نے دیوان اور انور سے کچھ زیادہ سعادت بٹورنے کی کوشش کی ہے اور اسی لئے انہوں نے استاد کے کلام میں اضافہ فرمایا ہے۔"[۳۰]

راقم السطور نے ڈاکٹر عابد پشاوری کے اس انکشاف پر ان کے نام اپنے ایک خط میں تعجب کا اظہار کیا اور ظہیر کے مطبوعہ کلام سے آگاہ کیا تو موصوف نے جواب میں

مزید چونکا دینے والی باتیں کہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"......میں ذوق اور محمد حسین آزاد لکھنے میں معروف تھا۔ میں نے کتاب مکمل کر لی، اس کے باوجود مجھے دیوانِ ظہیر کا پتہ نہ چل سکا۔ بہر حال کچھ مدت بعد مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ ظہیر کے تین دیوان (ان کے نام فی الوقت یاد نہیں) ہیں جو ان کی زندگی ہی میں بمبئی سے شائع ہوئے تھے۔ انتخاب سخن بھی اس زمانے میں چھپ کر آیا تھا اور مجھے اس کا علم دلّی ہی میں رشید حسن خاں کے پاس بیٹھے ہوئے ہوا بلکہ اسے میں نے وہیں دیکھا اور اس سے میرے شبہے کو مزید تقویت ملی۔ اگرچہ دواوین ظہیر ان کی عمر کے (مؤخر) حصے میں شائع ہوئے اور ظاہر ہے ان میں خاصی ترمیم ہوئی ہوگی، میرے شبہے کی بنیاد تو ظہیر کے ابتدائی کلام کو دیکھ کر پڑی تھی ---- میرے پاس تو نگارستان بھی نہیں تھا۔ مضمون سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے اس کے اندراجات کہاں کہاں سے فراہم کیے۔"[۳۱]

ظہیر کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہے کہ ان کے کلام و کمال سے بے خبر رہ کر ان کے بارے میں جو چاہیں تحریر کر دیں۔ ڈاکٹر عابد پشاوری نے اپنے نتائج کا اخذ کرتے میں کسی قدر جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے! ظہیر کے سلسلے میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

پہلی بات یہ کہ ظہیر کی فکری و فنی اساس قلعۂ معلّٰی کی رہینِ منت ہے۔ وہ خود بادشاہ ظفر کے قلمدان کو اکثر ہاتھ میں لیے رہتے اور شاہ ظفر کے فرمودہ اشعار کو زیبِ قرطاس کیا کرتے۔ ظہیر کا پورا خاندان قلعۂ معلّٰی سے وابستہ رہا۔ خود ان کے والد فنِ خوشنویسی میں شاہ کے استاد تھے اور ظہیر کے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق بھی استادِ شاہ کے مرتبے پر فائز تھے۔

دوسری بات یہ کہ ظہیر جن حضرات کی مجلسوں سے فیض یاب ہوئے ہیں ان میں شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ، سالک اور صدرالدین آزردہ جیسے عالم کے نام آتے ہیں۔ ظہیر، ذوق کی زبان کے رسیا، غالب کے لب و لہجے کے دلدادہ، اور مومن کے طرزِ بیان کے عاشق تھے۔ قصائد میں خصوصاً انہوں نے ذوق کی لفظیات اور تراکیب سے خوب استفادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ والیٔ ٹونک نواب ابراہیم علی خاں کی مدح میں جب انہوں نے ذوق کی زمین میں قصیدہ پیش کیا تو بعض لوگوں نے اسے ذوق کا قصیدہ ہی جانا۔ ان کے عہد کے اربابِ نظر نے انہیں "ذوقِ زندہ" کہا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ استاد کی زبان کی، جو دراصل قلعۂ معلّٰی کی زبان تھی، عمر بھر حفاظت کرتے رہے۔ اس سلسلے میں داغ نے بھی انہیں فضیلت دی ہے لیکن وہ طرزِ مومن کے معتقد تھے۔ ان کے اندازِ بیان میں مومن کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ذوق اور مومن نے پہلے شاہ نصیر کے آگے ہی زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ اسی اثنا میں ناسخ کا کلام دلّی پہونچا تو شعرائے دہلی نے ان کے طرز پر غور کیا اور ترکیبِ لفظی اور بندش کی درستی میں وہ شعرائے لکھنؤ کی پیروی کرنے لگے۔ فارسی کی تراش خراش پر دھیان دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی عہد کے شعرا نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر بعض اثرات یکساں طور پر قبول کیے۔ جو ان کے رنگ و آہنگ کے اختلاف کے باوجود ان کے کلام میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ یہ یکساں اثرات خصوصاً زبان سازی کے عمل میں ناگزیر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض موقعوں پر مرزا غالب نے مومن کی طرز کو اڑانے کی کوشش کی ہے لیکن نازک خیالی کے میدان میں وہ مومن سے سبقت نہ لے جا سکے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہ لیا جائے گا کہ جہاں مومن کی طرزِ ادا غالب کے کلام میں جھلک رہی ہے وہ غالب کی تخلیق کو مشکوک بناتی ہے۔

کیا یہ تعجب خیز امر نہیں کہ دلّی میں ایک ہی زمانے میں ذوق، غالب اور مومن جیسی تین بڑی شاعرانہ شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ غزل اور قصیدہ کی صنف میں خصوصاً ان شعرا نے اپنے کمالِ فن کے علم بلند کیے۔ تاریخ ادب اردو کے طالب علموں نے ان میں سے کسی کو کسی پر فوقیت دی ہو، یہ الگ بات ہے لیکن ان شعرا کا مرتبہ اپنی اپنی جگہ بلند تھا اور ان کے زیرِ تربیت ایک ایسی نسل بھی پروان چڑھ رہی تھی جس نے بجائے خود اپنے مقام و مرتبے کو محفوظ کرا لیا تھا۔ اس تناظر میں معاصر شعرا کا ایک دوسرے پر سبقت کا جذبہ اور یہاں تک کہ ایک دوسرے کے لئے ردّ و قبول کا رویّہ بھی اپنا رنگ جمانے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بندشیں، ترکیبیں اور طرزِ بیان کے زاویے ایک دوسرے سے خلط ملط ہوتے ہیں اور غیر محتاط مطالعے کے سبب ہم ان کی تخلیقات کے بارے میں عجیب و غریب فیصلے کر ڈالتے ہیں۔

ذوق کے یہاں اگر اتفاق سے مومن کی کوئی ترکیب جگہ پا جاتی ہے تو ان کے کلام کے بارے میں اس امر کا اظہار تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لہٰذا کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ مومن کے معتقد ظہیر کا کہا ہوا ہوگا!۔

ظہیر تو ذوق و غالب و مومن کے پیروکار تھے۔ بعض اوقات ان کے اشعار ان شعرا کے استفادہ کی روشن مثال بھی بن جاتے ہیں۔[۳۲] لیکن ان کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ذوق کے نام سے اپنا کلام منسوب کرتے۔ جب کہ خود اپنے کہے ہوئے کلام میں بھی وہ بار بار ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رکھتے ہیں۔ پھر ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کے کیوں کر مرتکب ہو سکتے ہیں۔ حافظ ویران اگر نگارستان نہیں دیکھ سکتے تھے تو اوروں کو اس میں کیا لحاظ تھا جسے آزاد نے کیوں نظر انداز کیا؟ پھر داغ بھی تھے۔

وہ چیں بہ جیں کیوں نہ ہوئے؟ ہمارے خیال میں "نگارستان سخن" میں شامل ذوق کی سولہ غزلیں اور چھ اشعار ظہیر کے کہے ہوئے تو ہرگز نہیں ہیں۔ بلاشبہ انہیں ذوق کا کلام ہی تسلیم کیا جانا چاہیے۔

"نگارستان سخن" دراصل ظہیر کی ذوقیات کا ایک حصہ ہے۔ شیخ ابراہیم ذوق کے تمام کی ترتیب و تدوین میں وہ حافظ ویران اور برادر نورہ دا الورد دہلوی کے شریک کار رہے تھے لیکن عرصے سے ذوق، غالب اور مومن کے انتخاب کلام کی ضرورت کو وہ محسوس کرتے رہے ہوں گے۔ نسخۂ دیوان کی ترتیب کے دوران بھی انہیں یہ کھٹکا لگا رہا ہوگا۔ اتفاقات سے ایسے زمانے تاجر کتب کی فرمائش نے ان کے اس خیال پر مہر کا کام کیا۔ ظہیر ذوق کی استادی کے معترف، غالب کے انداز بیان سے متاثر اور مومن کی طرز ادا کی دلدادہ و عاشق تھے۔ شاہ نصیر سے بھی انہیں عقیدت تھی۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے نتیجہ میں خود ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ خورد برد ہو گیا تھا۔ جب ظہیر دوبارہ دلی لوٹ کر آئے ہیں اور نسخۂ دیوان کی ترتیب و تدوین میں شریک ہوئے ہیں تو برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ اساتذۂ ثلاثہ کا کلام جو انہوں نے از راہ تلوّن و عقیدت جمع کیا تھا اسے کسی طرح ڈھونڈ نکالنا چاہیے۔ چونکہ یہ زمانہ پریشان حالی اور بے سکونی کا تھا۔ گھر بار بھی لٹ چکا تھا لیکن چند پوٹلیاں "غدر کے ایام میں دلی سے بھاگتے ہوئے وہ ادھر ادھر پھیلا گئے تھے ممکن ہے جب ذرا ہوش و حواس ٹھکانے آئے تو انہوں نے انہیں پوٹلیوں میں سے ان مسودات کو ڈھونڈ نکالا ہو جو "نگارستان" کی شکل میں چھپ کر سامنے آئے۔ ان میں غالب کے کلام کا وافر حصہ، ذوق کی وہ غزلیں بھی جو نسخۂ دیوان میں شامل نہیں ہیں اور مومن کے کلام کے انتخاب کے ساتھ ہی ساتھ شاہ ظفر کے کہے ہوئے دو سہرے اور خود ظہیر کا وہ قصیدہ جو ان کے کسی مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہے نیز ۱۴ اشعار کی ایک غزل [جس کے ۴ شعر اور وہ بھی ترمیم شدہ شکل میں دیوان اول میں جگہ پا سکے ہیں] ظہیر کو ایسے وقت میں دستیاب ہوئے جب نسخۂ دیوان تیار ہو کر چھپنے کے لئے جا چکا تھا۔ ظہیر نے خاص طور سے ذوق کی ان سولہ غزلوں کی وجہ سے ہی "نگارستان سخن" کی اشاعت میں جلد بازی سے کام لیا ہوگا اور اس جلد بازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادھر کی کاپی ادھر جوڑ دی گئی، کتابت کی بے شمار غلطیاں راہ پا گئیں، تصحیح کا کوئی موقعہ ہی نہ تھا۔ ایک پریس میں چند جز چھپے ہیں اور دوسرے پریس میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ سب جلد بازی کا ہی کرشمہ تھا لیکن اس کے باوجود نسخۂ دیوان کی اشاعت "نگارستان سخن" سے پہلے ہوئی اور ظہیر نے اس باب میں خاموشی اختیار کر لی۔

درج بالا معروضات کی بنیاد ان واقعات پر رکھی گئی ہے جو ظہیر کی خود نوشت "داستان غدر" میں ملتے ہیں اور ان کے دواوین میں شامل ان کے کلام صورت حال سے بھی بعض دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قیاس اغلب ہے کہ ذوق کا وہ کلام جو نسخۂ دیوان میں شامل نہیں ہو سکا ظہیر کو اپنے کھوئے ہوئے مسودات کی بازیافت سے ہی حاصل ہوا ہوگا۔

حواشی

لے گفتار غالب، مالک رام ص ۳۰ ، ۱ ۔ سے اردوئے معلیٰ ص ۳۱۱ ۔ ۱۲ بحوالہ ایضاً ۔ ۳ ۔ ۴ ظہیر دہلوی کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار — اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

۵ انور دہلوی کا مقبول خاص و عام شعر ہے ؎ (نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے — پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

۶ ذوق کے مذکورہ دیوان کی یہ تمام تر تفصیلات "کلیات ذوق" اردو، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (ترقی اردو بورڈ نئی دہلی) سے ماخوذ ہیں۔ ۷ گنجینۂ غالب ص ۵ ۔ ۸ کلیات ذوق (اردو) مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۔ ۹ گنجینۂ غالب ص ۶ ۔ ۱۰ مکتوب بنام راقم۔ مورخہ ۸ اپریل ۱۹۸۴ء ۔ ۱۱ تحقیقی جائزے، عطا کاکوی ص ۲۵ ۔ ۱۲ ایضاً ص ۲۶ ۔ ۱۳ عطا کاکوی نے اس لفظ کو مسیٰ پڑھا ہے (تحقیقی جائزے ص ۲۵) ۔ ۱۴ کلیات ذوق (اردو) تنویر احمد علوی ص ۴۰ ۔ ۱۵ گفتار غالب، مالک رام ص ۸۰ ، ۱ ۔ ۱۶ تفصیل کے لئے دیکھئے اردوئے معلیٰ ص ۳۱۱ ۔ ۴ ، خطوط غالب ۱ ۔ ۳ ۔ ۲۷۳ ۔ ۴ اور گفتار غالب از مالک رام ۔ ۱۷ آئینۂ غالب ص ۷ ۔ ۱۸ کلیات ذوق اردو ص ۴۰ ۔ ۱۹ مومن شخصیت و فن، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ص ۱۲۵ ۔ ۱۲۶ ۔ ۲۰ ڈاکٹر عابد پشاوری "نگارستان سخن" مرتبہ ظہیر دہلوی غالب نامہ جولائی ۸۳ ص ۱۳۱ ۔ ۲۱ غالب نامہ، جولائی ۸۳ ص ۱۵۱ ۔ ۲۲ کلیات ذوق اردو ص ۹ ۳ ۔ ۴۰ ۔ ۴۱ ۔ ۲۳ تحقیقی مطالعے ص ۸ ۔ ۹ ۔ ۲۴ غالب نامہ ص ۱۳۴ ۔ ۲۵ محمد حسین آزاد از اسلم فرخی ص ۲ (یہ حوالہ ڈاکٹر عابد پشاوری کے مضمون سے لیا گیا ہے) ۔ ۲۶ غالب نامہ ص ۱۳۸ ۔ ۱۳۹ ۔ ۲۷ اپنے مضمون کے حاشیہ میں موصوف نے اس مضمون کو اپنی کتاب "ذوق اور محمد حسین آزاد" کا ضمیمہ قرار دیا ہے ۔ ۲۸ غالب نامہ ص ۱۴۰ ۔ ۱۵۰ ۔ ۲۹ مکتوب عابد پشاوری بنام راقم مورخہ ۶ فروری ۱۹۸۵ء ۔ ۳۰ میں نے اپنے ایک علیحدہ مضمون میں ظہیر کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اساتذۂ شعراء خصوصاً ذوق، غالب اور مومن کے اثرات کی نشاندہی کی ہے ۔ ۳۱ مرزا قادر بخش صابر "گلستان سخن" ذوق کے کلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اکثر احباب ہمراز کیش و تلامذۂ اخلاص اندیش ان کے اشعار گوہر نثار سے بڑی بڑی بیاضیں فراہم رکھتے ہیں۔" (ص ۲۲۴)

چیتن کمار چیتن

(۱)

ہاتھ
لرزنے لگے

ہونٹ
پھڑپھڑانے لگے

آنکھیں
جھلملانے لگیں
اور زبان
لڑکھڑانے لگی
محسوس ہوتا ہے
بڑھاپا
حد سے گذر رہا ہے۔

(۲)

انسان
بھاگتے بھاگتے
چاند سے آگے
نکل گیا
لیکن
موت
آج بھی
سامنے کھڑی ہے۔

چیتنا، ڈھالگرواڑ، پانکور ناکہ، احمد آباد

حقیر استانی

پوچھا ہے

گلِ تر سے، کلی سے، خار سے، سبزے سے، پوچھا ہے
سحر سے، شام سے، شب سے، فغاں، نغمے سے پوچھا ہے
بدلتے موسموں سے گھومتی پھرتی ہواؤں سے
اِدھر آوارہ بادل سے، اُدھر کالی گھٹاؤں سے
مزاجِ وقت کی گرمی سے، نرمی سے
زمیں کی کوکھ سے جو آج تک ٹھنڈی نہ ہو پائی
فلک کی گردشِ پیہم، خلا کے سونے پن سے بھی
ندی کے بہتے پانی سے، سمندر کے تذبذب سے
جمودِ کوہ سے بھی، اُبلے گل سے، ریگِ ساحل سے
یہاں کے قولِ محکم سے، وہاں کے نقشِ باطل سے
خود اپنا چہرہ دیکھا ہے، خود اپنے دل سے پوچھا ہے
اچانک کچھ نہیں ہوتا
اچانک کچھ نہیں ہوتا

۲۰۷، گولڈ کراؤن، جے پی روڈ، اندھیری (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۶۱

حامد مجاز

شکار

بھیڑیوں کی آوازیں
خار پشت جنگل سے
دھیرے دھیرے اٹھتی ہیں
ان کہے خیالوں کا
شور بڑھتا جاتا ہے
اجنبی دراڑوں سے
لگ کے کب سے بیٹھا ہوں
بے کراں سمندر پہ
تار تار سناٹا
دور کوئی ماہی گیر —
مچھلیاں پکڑتا ہے!

رات کی دھوپ

مگر یہ غار
اور اس کی یہ پراسرار تاریکی
نگلتی جا رہی ہے
کتنی صدیوں سے
شرارِ دل کی تابانی
مگر کچھ ایسا لگتا ہے
تماشے گم ہوئے ہیں
(کہ گم کہاں ہیں)
چھپ گئے ہیں ایک لمحے کو
کبھی کچھ ایسا لگتا ہے
شرارِ دل کی جولانی
دمادم بڑھ رہی ہے
اپنی مستی میں سوئے منزل
مگر یہ بھی بس ایک دھوکا سا لگتا ہے!

۹-۴-۲/۱/۲، کاچی گوڑا، حیدرآباد (اے پی)

تشدّد

گربچن سنگھ
اے ۹/ پنجابی لین، رام داس بھاٹا، جمشید پور ۱۰۰

"تب یاد آیا"۔ ماں نے اکھڑتی ہوئی سانسوں کے درمیان لمبا سا ہوکا لیکر کہا تھا۔ "میں نے تو ایک نہیں، کئی چٹھیاں لکھوا کر ڈالیں۔ سب میں یہی لکھا تھا دلگیرے واپس لوٹ آؤ۔ میں تگڑی نہیں! اور پھر یہاں کی ہوا بھی بگڑی ہوئی ہے۔ جانے کیا ہو جائے۔ گھر میں اور کوئی ہے نہیں۔ ایک طرف تیری چنتا تھی۔ دوسری طرف اپنی بیماری کی۔ بیماری تو جان کے ساتھ جائے گی۔ لیکن تیرے ہاتھوں سے ایک گھونٹ پانی پی کر میری سانس تو ٹھیک چلتی۔ پر تو نہیں آیا۔ آیا بھی تو تب جب کہ میں بالکل چارپائی سے لگ گئی۔"

وہ کیسے کہہ دیتا، ماں مجھے تمہاری کوئی چٹھی کوئی خط نہیں ملا۔ ملتا بھی کیسے۔ لمبے سفر میں جانے والی ٹرکوں کا کیا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے سویرے کہیں تو رات کو کہیں اور۔ کوئی پکا ایڈریس تھوڑے ہی ہوتا ہے جہاں چٹھی پہونچ جائے۔ پہلے تو رات کا بھی سفر ہوتا تھا تو کھانا بھی بے ٹھکانے ملتا تھا بے وقت۔ رات کا سفر اتر پردیش اور بہار کے چور ڈکیتوں کے چلتے کم ہو گیا ہے۔ اب رات بتانے کا بھی کوئی صحیح ٹھکانہ نہیں رہ گیا۔ چٹھی پہونچتی تو کہاں!

اسے خاموش دیکھ کر ماں نے نحیف آواز میں کہا تھا۔ "تو بولتا کیوں نہیں۔ تو نے میری چٹھی کا جواب کیوں نہیں دیا۔ تو آیا کیوں نہیں؟"

"ماں میں بہت دور چلا گیا تھا۔ اس لئے آنے میں دیر ہو گئی۔"

"کہاں چلا گیا تھا؟"

"ادھر آسام کی طرف۔"

"تو تو کہتا تھا میں امبرسر (امرت سر) جا رہا ہوں۔"

"ہاں ماں گیا تو وہیں تھا۔ پھر وہاں سے آگے کی طرف چلا گیا تھا۔"

"تو مجھے چھوڑ کر اتنی دور کیوں چلا جاتا ہے۔ کون ہے بھلا یہاں، جس کے آسرے چھوڑ کر مجھے جاتا ہے۔ میں اب تجھے کوئی نکر نہیں سنوں گی۔ اس بار تجھے کسی کے ساتھ باندھ کر رہوں گی۔ پچھلے گاؤں سے تیری موسی پھر آئی تھی۔ وہ اپنی نند کی لڑکی سے تیرا ساک پکا کر دیگی"

"پھر میں نے کہا کہ میں ابھی . . . ."

"تو کبھی ہاں نہیں کہے گا . . . . میں جانتی ہوں۔ پھر اس بار تو نے ہاں نہیں کی تو میری مری کا منہ دیکھے۔ اسے اکل سے کام لے۔ میرے بعد تجھے کون پوچھے گا۔ یہ تیرے تائے چاچے اور بھائی، ان کی گھر والی کوئی تجھے خاطر میں نہیں لائے گا۔ کون کھانا بنا کر تجھے کھلائے گا۔ کوئی مصیبت کے وقت پاس نہیں پھٹکے گا۔ میرے جیتے جی تیرا گھر بس جائے تو چین سے آنکھیں موند سکونگی۔"

دلگیرا گھر کے آنگن میں چارپائی پر بیٹھا سوچ رہا تھا، ماں ٹھیک ہی کہتی تھی۔ ماں کے خیالات و جذبات اپنی جگہ تھے۔ اس کی اپنی مجبوریاں اپنی جگہ تھیں۔ اگر کسی کو بیاہ کر وہ یہاں چھوڑ جاتا، تو وہ ماں کے پاس رہتی۔ لیکن وہ خود کئی کئی دن دیس بدیس سڑکوں کی دھول پھانکتا پھرتا۔ ماں تو اس کے لئے پریشان تھی ہی۔ جسے بیاہ کر لاتا اس سے بھی دور رہ کر وہ اس سے بے انصافی کرتا۔ سوچتا ایک دن جب ماں نہیں رہے گی، تب اس کی دیکھ بھال کون کرے گا! اس کے ذہن میں کئی سوال بگولوں کی طرح چکر کاٹ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے کہا تھا۔ ماں پہلے ٹھیک تو ہولے۔ شادی وادی بعد میں ہو جائے گی۔

"تو اپنے منہ سے ہاں تو بول . . . !"

"ہاں . . . . ہاں! کئی بار تو بول چکا ہوں"۔

تب ماں نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

آج دن ڈھلے وہ گاؤں پہونچا تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے رجّو پر اس کی نظر پڑی تھی، کچھ معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف

دیکھا تھا۔ اُسے وہ لوگ، بلکہ اپنے ملک کے سب لوگ کچھ بدلے بدلے سے نظر آ ئے تھے۔ سب کے چہرے غم ناک، آنکھوں میں اداسی، اور کہیں کہیں کسی کے چہرے پر نفرت انگیز غصہ کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔ جب وہ ملک سے باہر تھا تو اپنے ٹرانز سٹر پر اس نے سنا تھا کہ پنجاب میں بڑی گڑبڑ چل رہی ہے۔ آئے دن کہیں نہ کہیں خون خرابہ ہوتا رہتا ہے۔ کہیں بسوں میں آدمی قتل ہو رہے ہیں تو کہیں لوگ فوج یا سپاہیوں کی گولی سے مارے جا رہے ہیں۔ کہیں بندوقیں چلتی ہیں، بم پھوٹتے ہیں، تو کہیں تلواریں، بھالے اور ترشول اچھلتے ہیں۔ ایسا کیوں؟ پھر اس نے سنا، دربار صاحب پر فوج کا حملہ ہوا ہے۔ کافی جانی نقصان ہوا ہے۔ ملک کی ریل ڈاک تار سب کچھ بند ہے۔ ٹرک بھی نہیں چلتے، پنجاب میں داخلہ بند ہے۔ تو اس نے محسوس کیا تھا، اس کا دیس سلے ملک سے کٹ کر جدا ہو گیا ہے۔ گاؤں آتا تو کیسے! کیا ماں یہ سب نہیں جانتی تھی۔ اسے ضرورت بھی کیا تھی یہ سب جاننے کی!

بھائی سنگت سنگھ ٹرک ڈرائیور کو بھی بڑی فکر تھی۔ اس کا بھائی سادھو قسم کا آدمی ہے۔ ہمیشہ گردواروں کی زیارت کے لئے پیدل سفر کیا کرتا ہے۔ جو کھانے کو ملا کھا لیا۔ جہاں رات کاٹنے کو جگہ ملی سو گیا۔ جانے ایسے ڈھونگر آدمی کا کیا بنا ہوگا۔ کہیں وہ ...ج کی گولی کا شکار نہ ہو گیا ہو.....!

فی الحال دلگیر کو ماں کی فکر تھی۔ اُس کا خیال تھا وہ آسام سے ...س پندرہ دنوں کے بعد ٹرپ لگا کر لوٹ آئے گا۔ اور ہوا بھی ایسا ...تھا۔ لیکن دلی پہونچ کر رک جانا پڑا تھا۔ اناس کا بھرا ہوا ٹرک ...بھی خالی کر کے اونے پونے بیچنا پڑ گیا تھا کہ کہیں پھل سڑ نہ جائیں ...رجب ہریانہ میں داخل ہوئے وہاں ان کی تلاشی لی گئی تھی۔ تلاشی ...کچھ ناجائز سامان نہ ملنے پر بھی انہیں تین دن بھوکے پیاسے ...الات میں قید رہنا پڑا تھا۔ بار بار یہی پوچھا جاتا تھا، تم کون ہو؟ ٹرک میں جو مال لایا جا رہا تھا، وہ کہاں ہے۔؟

ان سوالوں کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے، تھانے والوں کو ...اسے تسلی نہ ہوتی اور وہ جوتے اور ٹھڈوں سے بات کرتے۔

وہ ماں سے یہ سب کچھ کیسے بتاتا۔ گھر لوٹنے میں دیر کیوں ہوئی! شام اُتر آئی تھی۔ دن کا اجالا رفتہ رفتہ سمٹ کر اندھیرے آنچل میں سما رہا تھا۔ ماحول میں ایک اداسی اور ویرانی سی ...ئی تھی۔ یہ کوئی شہر تھوڑا ہی ہے جہاں شام چھاتے ہی بجلی کی روشنی جگمگانے لگے گی۔ چہل پہل شروع ہو جائے گی۔ جس کا رنگ دن کی بھیڑ بھاڑ سے جدا ہوگا۔ یہ تو گاؤں ہے۔ اپنی محدودیت میں قید ایک مختصر سا گاؤں۔ جی چاہا گردوارے جائے۔ وہاں گردوارے میں کچھ لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی تو یہاں کی کوئی خبر بھی سننے کو ملے گی۔

آنگن کا دروازہ کھڑکھڑایا اور کوئی گھر میں داخل ہوتا ہوا بولا۔" دیکھو تو اس گھر میں کوئی دیا باتی جلانے والا ہی نہیں۔

" ابھی جلاتا ہوں چاچی" کہتا ہوا دلگیر چارپائی پر سے اٹھا اور تاکچہ کی طرف جا کر لالٹین تلاش کرنے لگا۔

مائی دانی نے آواز پہچان لی۔ دلگیرے تو کب آیا رے؟ اتنے دن کہاں تھا۔ بُوئی بیچاری نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔!

دلگیر نے لالٹین جلاتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔ میں بہت دور چلا گیا تھا چاچی۔

کہاں چلے گئے تھے...؟ مائی گلوگیر آواز میں بولی۔" اتنی دور نہیں جانا چاہئے تھا"۔

کیا کرتا ٹرک کی نوکری ہی ایسی ہے۔

کیا سچ میں بہت دور چلے گئے تھے...!

ہاں چاچی آسام کی طرف چلا گیا تھا۔

" بوئی تو تم سے بھی دور چلی گئی بیٹا۔ اسے تمہارے لوٹ آنے کا بہت انتظار تھا۔

دلگیر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ کیا کہے، بہت مجبور ہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کے دور چلے جانے کے بعد ایسا ہو جائے گا۔

چاچی دانی کچھ دیر اس کے پاس کھڑی سسکتی رہی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ بیچاری کو چار آدمیوں نے کندھا دے کر شمشان تک پہونچایا اور سنسکار کر دیا۔ تم ہوتے تو اس کے منہ میں آگ دیتے۔ وہ بیچاری تو تمہارے سر پر سہرا بندھا دیکھنا چاہتی تھی۔

دلگیرے نے گہرا ہوکا لیتے ہوئے کہا۔ چاچی قسمت میں جو ہو رہی ہو کر رہتا ہے۔ یہ کہو تم کیسی ہو۔ فرقد رام کا کیا حال ہے!

مائی دانی نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ بیٹا فرقو کی جالندھر سے کوئی خبر نہیں آئی۔ تو شہر سے ہو کر گاؤں آ رہا ہے نا۔ کیا حال ہے وہاں کا..؟

کچھ ٹھیک نہیں ہے چاچی ....!
"میں نے فرتو سے کہا تھا، وہ لالہ کی نوکری چھوڑ دے اور گاؤں لوٹ آئے"
موقع دیکھ کر ضرور آجائے گا۔ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے نا چاچی۔ کہیں آنے جانے میں بہت مشکل ہو رہی ہے۔
کرفیو تو یہاں بھی لگا ہوا تھا۔ پر سمجھ میں نہیں آتا یہ کرفیو ہوتا کیا ہے!؟
دلگیر سنگھ اس سلسلہ میں مائی دائی کو کیا بتاتا۔ وہ تو صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ کرفیو لگنے سے گھر سے باہر، گلی کوچوں، یا سڑکوں پر نہیں نکلا جاتا۔ کہیں ادھر ادھر آنا جانا بھی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو فوج والے پکڑ لیتے ہیں اور جیل میں بند کر دیتے ہیں جی میں آئے تو راہ چلتے کو گولی سے اڑا دیتے ہیں۔
وہ بولا۔ چاچی اب گاؤں سے کرفیو ہٹ گیا ہے تو اس کے بارے میں جاننے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ فکر مت کرو۔ فرتو مزے میں ہوگا۔"
"چنتا تو ہے نا۔ اچھا یہ بتا، تو نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ تجھے کوئی ایک گلاس پانی دینے والا بھی تو یہاں نہیں ہے۔ کیا بناؤں تیرے لئے بول ....؟"
"جو ملے گا کھا لوں گا"
"دال روٹی تو چل جائے گی نا"
"ہاں ...!"
"تو ٹھیک ہے۔ میں جا کر روٹی تیار کرتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجانا" کہتی ہوئی دائی واپس لوٹ گئی۔
دلگیر گھر سے باہر نکل آیا۔ گلی میں کافی اندھیرا تھا۔ وہ ہوا جو کھیتوں کی طرف سے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی اس میں نمی کے علاوہ ٹھنڈک تھی۔ یوں لگا کہیں آس پاس پہاڑوں میں ضرور بارش ہوئی ہوگی۔ ایک کتا اسے دیکھ کر غرایا۔ وہ اس کی پرواہ کئے بنا آگے نکل گیا۔ سوچ رہا تھا اگر مائی دائی اس کی ماں کا خیال نہ رکھتی تو شاید اس کے لئے ایک دن کے لئے بھی گاؤں سے باہر نکل جانا ممکن نہ ہوتا۔ مائی دائی کے پتی چاچا سوہن لال اور اس کا پتا گرمیج سنگھ کبھی اکٹھے ہی ایک ہی پلٹن میں فوج کے سپاہی ہوا کرتے تھے۔ دونوں میں دوستی ہی نہیں بھائیوں جیسا رشتہ بھی تھا، دونوں چین کے ساتھ ہونے والی لڑائی میں ایک ساتھ قربان ہوئے تھے۔ تب وہ بہت چھوٹی عمر کا تھا۔
دلگیر گلی پار کر کے پیپل والے چبوترے کے پاس سے ہو کر کچھ آگے بڑھا تو دیکھا، چمنی پنڈت کی دکان پر تین چار لوگ بیٹھے کچھ دبے دبے لہجے میں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ اچانک اس کے پاؤں رک سے گئے۔ وہ خاموش ہو گئے۔
ان میں ایک نے پوچھا "کون ہے؟"
دوسرے نے ڈھبری کی روشنی میں اسے پہچانتے ہوئے اس سے کہا۔ یہ تو دلگیر لگتا ہے۔ گرمیج پلٹنیے کا بیٹا۔
"آؤ بھئی آؤ ....! گاؤں کب لوٹے؟"
"آج ہی دن ڈھلے لوٹا ہوں۔ کہتا ہوا دلگیر دکان میں گھس گیا۔
سبھی نے سرک سمٹ کر اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔
جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔ اپنے گاؤں کا کیا حال ہے سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟
تم کہو اتنے دن کہاں رہے؟ کیسے رہے؟
"میں تو آسام گیا ہوا تھا"
لوٹتے ہوئے شہر ہو کر آئے ہوگے۔!
شہر اور شہر والوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے، بس میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں دیال چاچا۔
کچھ کھل کر کہو تو ان کی سمجھ میں آئے گا۔ چمنی پنڈت بیڑی کا لمبا سانس کھینچ کر دھواں اگلتا ہوا بولا "کھول کر بتا کہ فوجیوں نے سنہری مندر پر حملے کے دوران کیسی بہادری دکھائی ہے، تب ان کے کانوں کے جھیتے کھلیں گے اور ان کو یقین ہو جائے گا کہ درگا ماتا پرگٹ ہو گئی ہے۔
دلگیر سنگھ اس کی باتوں پر دھیان نہ دیتے ہوئے بولا پنڈت یہ بیڑی پینی کب سے شروع کر دی۔
بات دوسری طرف مت لے جاؤ۔ چمنی پنڈت چلم بجھا کر بیڑی کی راکھ جھاڑتا ہوا بولا۔ یہ کہو ماں درگا پرگٹ ہوئی یا نہیں!
میں نے نہیں دیکھا پنڈت۔ جھوٹ کیوں کہوں! دلگیر ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔ میرے جیسے پاپی کو نا سکھ کو بھلا ماں دیوی کے درشن کیسے ہو سکتے ہیں۔

پنڈت منی فخر ملا ہوا سے اس کی طرف دیکھتا ہوا اپنی کھوپڑی ہلا کر بولا۔ تو ناستک کب سے ہو گیا پہلے تو نیلی یا کالی پگڑی باندھتا تھا۔ اب یہ لال رنگ کی پگڑی باندھنے لگا۔ اس سے کیا تیرا بھید چھپ جائیگا۔

اس سے کیا ہوتا ہے پنڈت۔ پگڑیاں میلی ہو گئی ہیں۔ کل دھو کر پھر باندھ لوں گا۔" ٹھیک ہے باندھو۔ شوق سے باندھو۔"

چھوڑو پنڈت۔ کیوں لڑکے سے الجھنے لگے۔" گردھاری لال بیچ میں پڑ کر بولا۔ دلگیرا اچھا لڑکا ہے۔ بہت محنتی ہے۔ اس نے سارے بھارت کی سیر کی ہے۔ کلکتہ، بمبئی، دلی، کانپور، پٹنہ اور آسام، دور دور کا چکر کاٹا ہے اس نے۔ اس سے کوئی اور بات پوچھو۔

" تم لوگ پوچھو۔ مجھے کیا نہیں معلوم۔"

دلگیرے نے محسوس کیا، کوئی اس سے اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہے۔ ہمدردی اور خلوص کے دو الفاظ بھی کسی کے منہ سے نہیں پھوٹ رہے ہیں۔ چینی پنڈت تکبر میں چور ہے۔ وہ اُن کے درمیان سے اٹھتا ہوا بولا۔ اچھا بھئی میں چلا۔ اور دکان سے باہر نکل آیا۔

باہر وہی سناٹا تھا، وہی ویرانی۔ یوں لگتا تھا رات اترتے ہی سارا گاؤں چپ سادھ کر سو گیا ہے۔ نہ کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی ہے، نہ کسی بچے کے رونے کی۔ اس کا دل کہیں کسی دوسری طرف جانے کو بھی نہیں چاہا لہٰذا وہ اپنے گھر کی طرف ہو لیا۔

رات شاید آدھی سے بھی زیادہ بیت چکی تھی۔ اور دلگیر کی آنکھ نہیں لگ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، جیسے پاس ہی کوئی کراہ رہا ہے۔ اس کی ماں کو بہت تکلیف رہی ہو گی۔ افسوس وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔

وہ اٹھ کر ماں کی چارپائی کے پاس گیا اور اس کی پائنتی پر سر ٹیک دیا۔

ماں تمہارا سر دبا دوں؟

نہیں بیٹا....!

اتنا ہائے ہائے کیوں کر رہی ہو۔

بیٹا! میں نے دیکھا ہے، سارا گاؤں جل رہا ہے۔ دھو دھو کر جل رہا ہے۔ لوگ چیخ رہے ہیں چلا رہے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے گاؤں کے لوگوں کو۔ کیا دھرما اور سرجن سنگھ کے آدمی پھر سے جھگڑ بیٹھے ہیں....!

نہیں ایسی کوئی بات نہیں ماں! تم سو جاؤ۔"

میں تو سو ہی رہی تھی۔

ٹھیک ہے سو جاؤ۔

دلگیر سنگھ بھری بھری آنکھیں لئے اپنی چارپائی پر آ گیا۔ اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اس بار کا آسام کا سفر اسے مہنگا پڑا تھا اُس کا دھیان بیتے دنوں کی طرف چلا گیا۔ ادھر پچھلے سال سے وہ محسوس کر رہا تھا، دیس کی فضا میں ایک گھٹن سی آ گئی ہے۔ دوستی اور بھائی چارے میں ایک فرق سا پڑ گیا ہے۔ ہنسی اور قہقہے گم ہو گئے ہیں۔ گیت اور سنگیت کا دم گھٹ گیا ہے۔ ہر روز لڑائی جھگڑے اور نعرے بازی۔ ہڑتالیں اور بازار بندی۔ اس نے سوچا تھا کہ پنجاب سے باہر چلا جائیگا تو کچھ سکون ملے گا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ باہر کا رنگ ڈھنگ اور بھی بدلا ہوا تھا۔ لوگوں کے برتاؤ میں نفرت اور دوئی کا جذبہ تھا۔ اپنے پن کی جگہ پرایا پن جھلکتا تھا۔ بات بات پر طنز و طعنہ مار۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے تو ایسا ہی محسوس کیا تھا ان کے لئے محبت اور خلوص کے لفظ نہیں رہ گئے ہیں۔ تب اسے امید تھی کہ جب اپنے گاؤں، اپنی ماں کے پاس لوٹ جائیگا تو وہاں اُسے سب کچھ مل جائے گا۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ وہ دنیا کے شور شرابے سے تو ضرور دور چلا آیا ہے لیکن اس کا اپنا گھر بھی شمشان سے کم نہیں۔

ٹھنڈی ہوا کے کچھ جھونکے آئے تو شاید اس کی آنکھ لگ گئی۔ جانے کیا وقت رہا ہو گا کہ کچھ عجیب سے شور کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ لوگوں کے تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی اُن آوازوں میں مائی دانی کی آواز بھی شامل تھی۔ کچھ لوگ پریشانی میں اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے وہ سوچنے لگا کہیں ڈکیت تو گاؤں میں نہیں ٹوٹ پڑے۔ دلگیر سنگھ گھبرا کر چارپائی پر سے اٹھا۔ دروازے کے پاس رکھی لاٹھی ہاتھ میں تھام کر دروازے کی طرف لپکا۔ تبھی گرمیجا اسے گلی سے گذرتا دکھائی دیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ دلگیرے میں تیری طرف ہی آ رہا تھا۔ دیکھ ابھی پوری طرح دن نہیں چڑھا۔ اندھیرا ہے ابھی۔ ہو سکے تو گاؤں سے نکل جا۔ کہیں دور چلا جا۔ فوج نے گاؤں پر دھاوا بول دیا ہے۔

وہ کیوں....؟ دلگیر سنگھ نے تعجب سے پوچھا۔

"تشدد پسندوں کو پکڑنے کے لئے"

"یہ تشدد پسند کون ہیں؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

"تو میں کیوں گاؤں چھوڑ کر بھاگوں!"

"اس کا بھی کیا ثبوت ہے کہ تو تشدد پسند نہیں۔"

گر میچے بھائی تو کیوں سویرے سویرے میرے پیچھے پڑ گیا۔ لگتا ہے تیرا دماغ پھر گیا ہے۔

اچھا تیری مرضی میں چلا۔ میں تو تیرے بھلے کے لئے کہہ رہا تھا۔ کہتا ہوا وہ گلی میں بھاگتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔

سارے گاؤں میں ایک ابتری سی پھیل گئی تھی تمام لوگ، عورتیں مرد، لڑکے لڑکیاں، اگر رداڑے کے قریب جمع ہونے لگے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ فوج کا کردار ٹھیک نہیں ہے۔ سختی بھی بہت کرتی ہے۔

گاؤں کا سرپنچ بھی وہاں پہونچ گیا۔ اس نے سب کو پرسکون ہونے کو کہا۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیا تم نے کوئی پاپ کیا ہے؟ کسی بے گناہ آدمی کا قتل کیا ہے جو یوں گھبرا رہے ہو۔ سب یہیں رہو اور سرکار کے آدمیوں کو اپنا کام کرنے دو۔ کوئی گاؤں سے باہر نہ جائے۔ فوج نے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ان کے پاس ٹینک اور مشین گنیں ہیں۔ کوئی ان سے الجھنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ تشدد پسندوں کو پکڑنے آئے ہیں۔ کیا تم میں سے کوئی انتہا پسند یا تشدد پسند ہے اگر ہے تو وہ اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دے تاکہ گاؤں والوں کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

سب ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کون ہے ہم میں تشدد پسند۔ کس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ کس کی آنکھوں میں خون کی لالی جھلکتی ہے.....! لیکن کسی کو کسی کی آنکھوں میں ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔

صبح کا وقت تھا۔ عورتیں اپنا روزمرہ کا گھریلو کام بھول گئی تھیں مرد کھیتوں اور باغیچوں کی طرف جانا بھول گئے تھے۔ گائے بھینسوں کے تھن دودھ سے بوجھل ہو رہے تھے۔ ان کے بچے بھوک سے ڈکار رہے تھے۔ اچانک ہی گاؤں جیسے ویران ہو گیا تھا لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اب کیا ہوگا....!

لوگوں نے دیکھا، فوج کا ایک افسر جس کے ساتھ رائفلیں تھامے فوجی بھی تھے، ان کی طرف آتے دکھائی دئیے۔ ان کے پیچھے پیچھے گاؤں کے اور بھی کچھ لوگ تھے جن کی اگوائی چینی پنڈت کر رہا تھا۔

فوجی افسر نے قریب آکر پوچھا، یہ اتنے سارے لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟

سرپنچ نے کہا۔ یوں ہی۔ لوگ فوج کے آنے سے گھبرا گئے ہیں۔

فوجی افسر کی نظریں ان نوجوانوں کو بھانپنے لگیں جو جسم سے تندرست و توانا تھے۔ جن کے چہروں پر سادگی اور بھولا پن تھا اور ان پر گنوارپن کی چھاپ تھی۔ پھر اس نے منہ گھما کر چینی پنڈت کی طرف دیکھا اور بولا۔ کون ہے وہ، کیا اسے پہچانتے ہو...؟

جی سرکار...! کہتا ہوا چینی پنڈت آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس نے دلگیرے کی طرف اشارہ کیا۔ صاحب یہ چھوکرا بہت خطرناک ہے۔ یہ تشدد پسندوں سے ملا ہوا ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ اس نے ہمیں بہت تنگ کیا ہے۔

"پنڈت چاچا"... دلگیرے کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ایک فوجی کی بندوق کا کندہ اس کے منہ پر پڑا۔ ہونٹ پھٹ گئے اور اس کی قمیص پر خون ٹپکنے لگا۔ لوگ یہ دیکھ کر کانپ اٹھے۔

دو سپاہی آگے بڑھے اور اسے زمین پہ گرا کر رگیدنے لگے جب دلگیرے کی اچھی طرح پٹائی ہو گئی تب وہ اسے گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر لے چلے جہاں وہ گاڑی کھڑی تھی جس میں اس جیسے اور نوجوان جکڑے پڑے تھے۔ دلگیر گہری چوٹ سے کراہ رہا تھا

چینی پنڈت کی نظریں کچھ اور چہرے تلاش کر رہی تھیں جنہیں وہ فوجی افسر کو بتا کر گاؤں والوں پر اپنی دھاک جما سکے۔

تبھی مائی ورانی گرتی پڑتی وہاں پہونچی اور چینی پنڈت کو مخاطب کرتی ہوئی بولی۔ چینی تو کس جنم کا بدلا لے رہا ہے گاؤں والوں سے کیا گاؤں والوں سے تیری دشمنی ابھی گئی نہیں۔

پھر وہ افسر سے مخاطب ہوئی اور بولی۔ حضور دلگیرے کا کیا قصور ہے؟ اسے کیوں پکڑ کے لئے جا رہے ہو؟ ابھی ابھی تو اس کی ماں مری ہے۔ اس نے تو ابھی اس کی گیارہویں بھی نہیں کی۔ وہ بھی ایک فوجی کا بیٹا ہے۔ جس نے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اپنی جان دی تھی۔ اسے چھوڑ دیجئے۔

فوجی افسر اس کی ٹھیٹ دیہاتی زبان کو نہیں سمجھ سکا۔ اس کی عقابی نظریں نوجوانوں کو بھانپ رہی تھیں۔ [بقیہ صفحہ ۲۶ پر دیکھیے]

ہائیکو

ناوک حمزہ پوری

یادوں کی تتلی
بالک من کے واسطے
بہلاوا نکلی

عمر کوتاہ
خواہشات بے پایاں
کیا کروں، آہ!

دل ہے ملول
یہ مصلحتے تو ہیں
کاغذی پھول

مجھ میں رہ رہ کر
یہ کون چیختا ہے
"اُف! جانے دو گھر"

یہاں نہ وہاں
لذتوں کی تشنگی
مٹتی ہے کہاں؟

کفِ افسوس
ملتے رہ گئے سبزے
اُڑ گئی اوس

علی مختار مبارکپوری

تو ہی سب کا رب
سورج، چاند، ستارے
تیرے بندے سب

کیا ہے اس تن میں
پنجرے کے بے بس پنچھی
اُڑ جا گگن میں

ہے شب خون کا ڈر
تو نے جو غفلت برتی
لُٹ جائے گا گھر

یہ کیا جینا ہے
جب تک سانسیں آتی ہیں
آنسو پینا ہے

کتنی دوری ہے
سات سمندر پار
اس کی نگری ہے

کیا غضب کیا
اک ذرا خوشی ملی
غم بھلا دیا

کنول پانی پتی

تتلیاں ہیں تنگ
بن کے پھول پھول میں
ایک سرد جنگ

دل سے دل کی بات
چاندنی میں گھل گئی
کیوں سہاگ رات

کیسی ہے بہار؟
خوشبوؤں کی بھیڑ میں
روپ سوگوار

راہ بے شجر
دھوپ سے الجھ گیا ہے
پیاس کا سفر

درد کا لباس
ریشمی وجود میں
زندگی اداس

● پوسٹ آفس شیرگھاٹی ۸۲۴۲۱۱ ضلع گیا (بہار)
● محلہ پرانی بستی۔ مبارک پور۔ اعظم گڑھ (یو۔پی)
● ۳۱/۲۲ دیونگر۔ نزد پرم ہنس، کٹنیا، پانی پت

ایک بے موقع تقریر

یوسف ناظم ● ۱۹ انیو دیپ پلاٹ نمبر ۱۳۱، باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۵۰

"اردو کی علمی و ادبی تحریکات" سے متعلق اس سیمینار کے کنوینر جنھیں داعی بھی کہا جا سکتا ہے، جناب قاضی سلیم نے مجھے اس میں شرکت کیلئے طلب کیا تو انھوں نے اس بات کی احتیاط فرمائی کہ مجھے لکھنے یا بولنے کے لئے کوئی موضوع نہیں دیا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر میں لکھ سکتا ہوں تو موضوع سے ہٹ کر ہی لکھ سکتا ہوں موضوع پر نہیں لکھ سکتا۔ میرے متعلق انھوں نے یہ رائے غالباً اس لئے قائم کی کہ وہ مجھے ظ انصاری صاحب کا دوست سمجھتے ہیں۔ مفکرین نے اسی لئے کہا ہے آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ بہر حال میں قاضی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے کوئی موضوع نہیں دیا۔ اگر وہ مجھ سے اردو کی مہلک ادبی تحریکات پر کچھ لکھنے کی فرمائش کرتے تو میں مطالعہ کرتے کرتے پریشان ہو جاتا۔ نئے نمونے کی شعر گوئی، نثری نظم سازی اور آزاد غزل نویسی یہ سب اردو کی مہلک تحریکات ہیں اور اگر اردو داتی سخت جان نہ ہوتی تو وہ غیروں کے کرم کی بنا پر نہیں اپنوں ہی کی عنایت کے طفیل آج آرام کی نیند سوتی ہوتی۔ جس شاعری میں ساحلِ سمندر پر کوئی مچھلی کپڑے اتارے اور دریا کی موج کہے ہائے۔ اور جس شاعری میں اس قسم کے اشعار ہوں جنھیں پڑھتے وقت آدمی اعضا شکنی کی کیفیت سے دوچار ہو جیسے کہ

مزے کی مٹھی میں قید سی ہے یہ خوشہ چیں نرم گرم لڑکی — سڑک کی دونوں طرف کٹی فصل میں دو دو ھ پیاس کا ہے

تو میں اس شاعری کے لئے الفاظ کس لغت میں تلاش کرتا۔ اگر قاضی سلیم مجھے نثری نظم کے بارے میں لکھنے کا حکم دیتے تو میں ان سے یہی پوچھتا کہ نثری نظم کو ادب کے کس کمپارٹمنٹ میں جگہ دی جائے۔ زنانہ یا مردانہ۔ یہ بھی پوچھتا کہ کیا ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں روٹی کو چاول کے ساتھ ملا کر کھایا یا جائے میں آئسکریم کو گھول کر پیا جا رہا ہے۔ اگر غذا کے معاملہ میں ایسا کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا ہے تو پھر بیچاری صنف شاعری نے شاعروں کا کیا بگاڑا ہے جو وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔ آزاد غزل کے موضوع پر بھی میرا کچھ عرض کرنا ممکن نہ ہوتا کیونکہ اگر ہمارے شاعر ایسا پیجامہ پہن کر مشاعرے میں آیا جا نہیں سکتے جس کا ایک پائنچہ ٹخنوں تک اور دوسرا پائنچہ گھٹنوں تک ہو تو پھر وہ آزاد غزل سے ہمیں کیوں نوازتے ہیں جس کا پہلا مصرعہ بحر ہزج میں ہو اور دوسرا بحر الکاہل میں۔ مانا کہ اردو داں طبقہ کئی طرح کی معاشی مشکلات میں مبتلا ہے لیکن اس کا مطلب تو نہیں ہوتا کہ آزاد غزلیں کہی جائیں۔ یہ مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ ذہنی انتشار کے اظہار کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ ہمارے شاعروں میں کئی معزز شعرا صاحبان، مدرسوں اور کالجوں میں اردو پڑھاتے ہیں (سمجھا تو یہی جاتا ہے) کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کی نئی شاعری، نثری نظمیں اور آزاد غزلیں اینٹی اردو کا کام کریں۔ قاضی صاحب نے اچھا کیا جو مجھے یہ موضوع نہیں دیا۔ تاہم مجھے یہ عرض کرنا ہی پڑے گا کہ مضمون نگار، خواہ موضوع سے ہٹ کر ہی کیوں نہ لکھے اسے ایک موضوع تو دیا جانا ہی چاہئے تاکہ سامعین کو اندازہ ہو سکے کہ فاضل مضمون نگار نے موضوع سے کتنا ہٹ کر لکھا ہے۔ اس لئے سامعین کرام کی سہولت کی خاطر میں نے اپنے اس مضمون کے لئے ایک عنوان چاہے جو ذرا تفصیلی ہے۔ عنوان ہے "اردو شاعری کے محبوب کی (کاغذ پر) صنفی تبدیلی" یہ اور بات ہے کہ اسے کسی علمی یا ادبی تحریک کا رتبہ حاصل نہ ہو سکا۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے یہ دنیا قرنہا قرن سے قائم ہے اور ہر دور میں یہ ہوتا آیا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی لوگ بقید حیات ہوتے ہیں ان میں چند ضرور اپنے آپ کو روشن خیال سمجھتے ہیں حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ روشن خیال لوگ اپنے گھر کی چار دیواری کے باہر تو تھوڑا بہت اجالا پھیلا سکتے ہیں لیکن خود کے گھر کے اندر کی تاریکی دور نہیں کر سکتے۔ اندرون خانہ جو بحر ظلمات ہوتا ہے اس میں ان کے گھوڑے کبھی نہیں دوڑتے اس لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے یہاں بچوں کی ولادت کے موقعہ پر ایک ہی قسم کی ذہنیت کار فرما ہوتی ہے یعنی جب بھی کسی ولادت کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو متوقعہ بچے کے والدین، والدین کے والدین، خاندان کے دیگر اقسام کے بزرگ، عزیز و اقارب، دوست احباب حتیٰ کہ اہل محلہ بھی جن کا اس ولادت سے (بظاہر) کوئی تعلق نہیں ہوتا سب کے سب یہ چاہتے ہیں کہ خدا کرے لڑکا تولد

یہ ایک عام خواہش ہوتی ہے جس کے اظہار میں وہ لوگ بھی پیش پیش ہوتے ہیں جنھیں اپنے متعلق روشن خیال ہونے کی غلط فہمی ہوتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر اس خواہش کے مطابق دنیا میں لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوتے تو ہم اور آپ کہاں ہوتے اور آج کا یہ سیمی نار کیسے منعقد ہو سکتا تھا۔ دنیا تو کب کی اردو زبان کے تولّد ہونے سے بہت پہلے ختم ہو چکی ہوتی۔ حضرات! میں اپنے موضوع سے بالکل نہیں ہٹ رہا ہوں۔ اس بیان سے میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس ذہنیت نے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنا پولیوشن پھیلا دیا تھا کہ ہماری شاعری بھی اس آلودگی سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس آلودگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری میں جو محبوب تو تھا وہ مفروضے کے طور پر ہی سہی، مذکر پیدا ہوا۔ میں اس خیال کا حامی ہوں کہ یہ صرف ذہنیت کا قصور تھا کہ لڑکی کو لڑکا مان لیا گیا ورنہ آپ سب جانتے ہیں کہ وہ مذکر نہیں تھا وہ اصل میں محبوبہ تھی اور اس کا تعلق صریحاً طبقہ اناث سے تھا۔ کمال یہ ہے کہ ہمارے شاعروں نے جن میں سے اکثر کو سمجھ دار بھی کہا جا سکتا ہے اپنی محبوبہ کو محبوبہ کہتے میں سبکی محسوس کی اور دوسرا کمال یہ ہے کہ اسے تہذیب کا نام دیا گیا۔ کہا گیا کہ یہ پردہ نشیں لوگ ہیں اس لئے ان کا ذکر کچھ اس پیرائے میں کرو کہ حقیقت پر پردہ پڑا رہے۔ اردو شاعری میں یہ تحریک جسے میں تلبیس شخصی کی تحریک کہوں گا اتنی زبردست تھی کہ اکثر گھروں میں اچھی خاصی عمر کی لڑکیوں نے مردانہ لہجہ اختیار کر لیا یعنی لب زنانہ، لہجہ مردانہ۔ مانا کہ لڑکیاں اب جمپر بھی پہننے لگی ہیں لیکن آج کی بات اور ہے۔ آج کون سی جمپر لپٹے شیخ خدوخال میں ہے۔ میں تو اردو شاعری کی بات کر رہا ہوں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک معشوق جس کی لمبی لمبی زلفیں ہوں اور جن کے بارے میں شاعر کہتا ہو

جب چمن میں جا کے پیارے تم نے زلفیں کھولیاں ۔۔۔ لے گئی بادِ صبا خوشبوؤں کی بھر بھر جھولیاں ۔ یا یہ کہ

ہاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا ۔۔۔ دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

مزید یہ کہ وہ زلفیں جن کے آپ، ہم اور ہم سب اسیر ہوئے اور ایسی زلفیں جو کسی کے شانوں پر بکھر جائیں تو نیند دماغ اور راتیں اسی کی ہو جائیں کسی لڑکے کی کیسے ہو سکتی ہیں۔ آج تو خیر لڑکے اپنے سر کے بال بڑھا سکتے ہیں کیونکہ لڑکیاں اپنے بال ترشوا سکتی ہیں لیکن پچھلے زمانے میں لڑکوں کو یہ آزادی حاصل نہیں تھی اسے بے راہ روی کی طرف پہلا قدم سمجھا جاتا تھا اور جس گھر میں کوئی لڑکا اپنے سر کے بال بڑھاتا تھا اسے دوسرے ہی دن خلیفہ کے آگے سرنگوں ہونا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں والدین اپنے لڑکوں کے بال پابندی کے ساتھ ہر ہفتے اپنی نگرانی میں ترشواتے تھے بلکہ چندیا پر ایک مربع انچ کی ایک مستطیل نما جگہ سپاٹ چھوڑ دی جاتی تھی تاکہ اس جگہ روغن بادام اچھی طرح جذب ہو جائے اور لڑکا اپنا سبق ذہن نشیں کر سکے تو ان حالات میں کس لڑکے کی مجال تھی کہ وہ اپنے سر کے بالوں کو کسی مقرر کی تقریر کی طرح طول دے سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ زلفیں جن کا ذکر اردو شاعری میں ہر دوسرے شعر میں کیا گیا ہے زنانہ زلفیں تھیں اور جب بھی کہیں بارش ہوئی لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پوچھتے۔ کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی ؟

اور حضرات ایسا بھی نہیں ہے کہ راقم الحروف صرف ایک زلفوں کی بنا پر اردو شاعری کے محبوب کو محبوبہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اس شخص کے دیگر اعضائے جسمانی لباس و پوشش اور عادات و خصائل کی بنا پر بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ محبوب صرف برائے نام مذکر تھا مثلاً یہ کہ اس محبوب کے عارض گلگوں پر کسی نہ کسی جگہ ایک تل ضرور ہوا کرتا تھا جو پیمائش میں صفر کے برابر ہونے کے باوجود غضب ڈھاتا تھا۔ لب غیر معمولی طور پر نازک سی گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ہوتے تھے اور دہن اگر ہوتا تھا تو بہت مختصر ہوتا تھا۔ بس ایک کلمۂ خیر کی طرح۔ اور کمر کے ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اکثر اشعار میں محبوب کی ساقوں کا بھی ذکر آیا ہے جنھیں ساق سیمیں کہا گیا ہے۔ ممکن ہے ان ساقوں پر ہمارے شاعروں کی نظر کبھی پڑ گئی ہو اور شاعروں نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا ہو مطلب یہ کہ شاعری کی گرفت میں۔ ہم شخصی طور پر شاعری میں بھی ساقوں کے بیان کو معیوب سمجھتے ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ کوئی بھی محبوب ساق سیمیں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ شاعروں نے تو اور بھی بہت کچھ کہا ہے جن کا ذکر ہم ایک اچھے اور سفید سیمی نار میں مناسب نہیں سمجھتے اس لئے یہ مال ہم نے الگ باندھ کر رکھ دیا ہے ور جناب والا وہ شعر بھی آپ کو سنانا مناسب نہیں ہے جنھیں دیکھ کر شاعر کو کسی کے محرم آب رواں کی یاد آ گئی تھی اور اردو شاعری کا یہ محبوب دوپٹہ بہر حال اوڑھا ہی کرتا تھا۔ ملاحظہ ہو۔

گھٹا اور بجلی میں ہے آج چوٹ ۔۔۔ ہے آبی دوپٹے میں کچلے کی گوٹ

اور یہ محبوب چونکہ الھڑ ہوا کرتا تھا اس لئے ۔۔۔ آنچل ڈھلا رہا مرے مست شباب کا

اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کر

(یہ معاملہ کچھ اور ہو گا ورنہ دوپٹہ تو اس سلیقے سے بھی اوڑھا جاتا ہے کہ سوائے دوپٹے کے کچھ نظر ہی نہیں آتا) ظاہر ہے یہ شخص جو محرم آب رواں اور دوپٹہ

استعمال کرتا تھا لڑکی بھی ہو گا لڑکا ہو نہیں سکتا۔۔۔ راقم الحروف اس محبوب کو شخص اس لئے کہہ رہا ہے کہ استاذ مکرم غالب نے اسے شخص ہی کہا ہے۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے　　اب وہ رعنائی خیال کہاں

ڈوپٹہ اوڑھنے والے اشخاص پردہ نشیں تھے لیکن کبھی کبھی گھر سے باہر بھی نکلتے تھے اور یہی موقعہ تھا جب شعرا صاحبان انھیں دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایک شاعر نے اس لئے کہا ہے:

کچھ رات گئے اور کبھی کچھ رات رہے　　ہم نے ان پردہ نشینوں کو نکلتے دیکھا

اور انھیں میں سے ایک شخص تو کسی وجہ سے ایسا گھبرایا گھبرایا تھا کہ وہ "ڈوپٹہ اوڑھ کر الٹا" نکل پڑا۔ اب ڈوپٹے کا ذکر آ گیا ہے تو اپنی ایک رائے جو تقریباً صائب ہے پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ میری رائے میں ڈوپٹے کی صحیح کیفیت صرف حسرت موہانی نے بیان کی ہے۔ ان کے شعر سے مشرقی تہذیب ٹپکتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ کاش ایسا واقعہ ہمارے ساتھ بھی ہوا ہوتا۔ کہا ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً　　اور ڈوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

میں نئے شعرا کا مخالف نہیں ہوں لیکن جو لوگ پیکر تراشی پیکر تراشی اور امیجری امیجری کہہ کر ہم پر رعب ڈالا کرتے ہیں کبھی ایسی مہذب، باوقار اور سادہ پیکر کا امیجری کا نمونہ پیش فرمائیں۔ کم سے کم کوشش تو کریں۔ ان کے ہاں پیکر تراشی اور امیجری دیکھ کر تو لوگوں نے شاعری پڑھنا اور سننا ترک کر دیا ہے۔ ایک جدید شاعر نے کہا ہے

غرورِ عشق کی کھسیانی بلّی　　غمِ جاناں کا کھمبا نوچتی ہے

ایک اور شاعر نے فرمایا　　تیس کی ہو کر بھی کیا اندازہیں　　بج رہی ہیں اور بے آوازہیں

اسی قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو "پتھر کی بھوری اوٹ میں لالہ کھلا تھا کل　　اس کو تو نوچ لے گئیں دو بچیاں جناب"

لیکن اگر میں آپ کو اسی طرح کے نئے اشعار سناتا رہا تو بڑی مشکل ہو جائے گی اور میں اپنے موضوع کی طرف واپس نہ آ سکوں گا۔ اس لئے میں ایک مرتبہ اور عرض کروں گا کہ ہماری شاعری میں اس صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک جو محبوب برسرکار رہا وہ از قبیلۂ مستورات ہی تھا بس صرف اتنا ہوا تھا کہ کاغذ پر اس کی صنف فیمیل نہیں میل لکھی ہوئی تھی۔ میں چونکہ پرانے لطیفے سنانے کا بھی عادی ہوں اس لئے موقعہ کی مناسبت سے ایک لطیفہ پیش کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ چھوٹی جماعت کی ایک طالبہ جب اسکے امتحان کے بعد نتیجے کا کارڈ دیا گیا تو اس میں ہر مضمون کے آگے اے یا کم سے کم بی ضرور لکھا تھا لیکن لفظ "سیکس" کے آگے ایف لکھا تھا لڑکی نے پریشان ہو کر اپنی استانی سے کہا میڈم آپ نے سبجکٹ تو ہمیں پڑھایا ہی نہیں اور فیل بھی کر دیا۔ یہ لطیفہ شاید آپ کو زیادہ پسند نہیں آیا حالانکہ لطیفہ گوئی کے ایک مقابلے میں جس میں شرط یہ تھی کہ صرف پرانے لطیفے سنائے جائیں جب ہم نے یہ لطیفہ سنایا تھا تو دوسرے دن ہال کی چھت کی مرمت کرانی پڑی تھی۔ یہ اڑتے اڑتے بچ گئی تھی۔ اردو شاعری کے محبوب کے آئڈنٹٹی کارڈ پر گڑبڑ یہ تھی کہ ایف کی جگہ ام لکھ دیا گیا تھا اور یہ روایت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ فلمی گانوں پر بھی اس کی چھاپ نظر آنے لگی۔ ایک گانے کا مکھڑا ہمیں یاد ہے جس میں عاشق بہاروں سے فرمائش کرتا ہے کہ اے بہارو پھول برساؤ مرا محبوب آتا ہے اور سین بدلتے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک محترمہ چلی آ رہی ہیں۔ محبوب کے بائیو ڈاٹا میں سیکس کی تبدیلی یا یوں کہئے کہ سیکس کی تصحیح اگر کسی شاعر نے کی تو وہ اختر شیرانی تھے۔ اختر شیرانی سے پہلے کسی شاعر کی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی محبوبہ کو اس کی صحیح صنف میں پیش کرے۔ انھوں نے نہ صرف اس تلبیس شخصی کو آشکارا کیا بلکہ محبوب کا نام تک بتا دیا۔ میں ذاتی طور پر اختر شیرانی کو اردو کا سب سے دلیر شاعر مانتا ہوں۔ آپ بھی مانئے۔ اور میں اسے صرف اخلاقی بھی مانتا ہوں۔ اس میں آپ کا کیا جاتا ہے۔ اختر شیرانی کے یہاں ہمیں دو خواتین کا نام ملتا ہے۔ ایک عذرا اور ایک سلمیٰ۔ عذرا تو ان کے یہاں خال خال ہیں لیکن سلمیٰ کے نام کے اشعار تو اتنے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے اختر شیرانی انھیں سے باتیں کرنے کے لئے شاعری کرتے تھے۔ کچھ اشعار بطور تبرک پیش ہیں

سوئے کلکتہ جو ہم با دلِ دیوانہ چلے　　گنگناتے ہوئے ایک شوخ کا افسانہ چلے

شہرِ سلمیٰ ہے سرِ راہ گھٹائیں ہمراہ　　ساقیا آج تو دورِ مئے کا پیمانہ چلے

بادلو! خدمتِ سلمیٰ میں یہ کہہ دو جا کر　　کہ ترے شہر میں ہم آ کے غریبانہ چلے

کلکتہ کا ذکر تو ہماری شاعری میں اس سے پہلے بھی ہوا ہے لیکن سلمیٰ غیر موجود تھیں ایک جگہ تو وہ سلمیٰ کو حضرت سلمیٰ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

حریم حضرت سلمیٰ کی سمت جاتا ہوں ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کر لوں گا

ایک اور شعر ہے : پوچھتے منزل سلمیٰ کی خبر ہم جس سے وادی نجد میں ایسا کوئی انساں نہ ملا

ہمارے شاعر اپنے محبوب کو اس کے گھر کی چھت پر دیکھ کر خوش ہو لیا کرتے تھے۔ اختر شیرانی نے اس عمل کو بھی بزدلی قرار دیا ہے اور کہا ہے

نازشے گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھا ہاتھ اختر یوں گدایانہ تماشائے لب بام نہ کر

غالباً سلمیٰ جی نے اختر شیرانی کے اس بیباکانہ طرز عمل کے بارے میں شکایت بھی کی تھی۔ اختر شیرانی اس شکایت کے بارے میں کہتے ہیں

شعر میں ذکر کسی کا دل ناکام نہ کر اس نے لکھا ہے کہ یوں تو ہمیں بدنام نہ کر

لیکن اختر شیرانی ماننے والے آسامی نہیں تھے، اس شکایت کا انہوں نے یوں جواب دیا

تری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمیٰ ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اختر شیرانی کی اس پامردی کا نتیجہ ہوا کہ ادب میں ایک صحت مند روایہ سکۂ رائج الوقت کی طرح مقبول ہوا اور آگے چل کر خود شاعرات نے بھی تسلیم کر لیا کہ وہ نہ صرف محبوبہ ہیں بلکہ ان میں بھی عشق و محبت کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ اردو شاعری میں محترمہ سلمیٰ کیا آئیں۔ شاعری کا حسن نکھر آیا جادو سر پر چڑھ کر بولنے لگا وہ کس طرح اس شعر میں دیکھئے

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لئے

یہ ہے ایک شاعرہ کا شعر۔ پروین شاکر ان کا نام ہے اور وہ اسی قسم کے شعر کہتی ہیں ان کے یہاں بھی ایک شخص موجود ہے جس کا ذکر وہ ان لفظوں میں کرتی ہیں

ہر رنگ میں، وہ شخص نظر کو بھلا لگے حد یہ کہ روٹھ جانا بھی اس شخص پر کھلے

انگریزی میں میزوں کے رنگ کا بدل جانا شاید اسے ہی کہتے ہیں۔ ہمارے شاعروں نے اپنی محبوباؤں کے روٹھنے منے اور من کر پھر روٹھنے کا کافی رونا رویا ہے اس کا جواب بھی پروین شاکر کی زبانی سن لیجئے

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہئے جاناں دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

اور اصل بات یہ ہے کہ محبوبہ کو منانے کا سلیقہ آنا چاہئے۔ ذرا غور سے یہ شعر سنئے

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی

اردو شاعری میں سچ کہنے کی اس تحریک کے بانی اختر شیرانی تھے اور ان کے بعد کے آنے والے شاعروں نے اپنی اپنی محبوباؤں کو نہ تو صیغۂ راز میں رکھا نہ ان کے لئے صیغۂ مذکر استعمال کیا مثلاً مری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے"۔ یا یہ کہ: "اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو" اور پھر یہ کہ "میں تمہارے جوڑے میں پھول سجا رہا ہوں اور تمہاری آنکھیں شرم سے جھکی جا رہی ہیں"۔ وغیرہ وغیرہ۔ مانا کہ ہمارے اکثر شاعر آج بھی اپنی محبوبہ کے لئے آتا ہے جاتا ہے کہہ لیتے ہیں لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پرانی عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ ہماری شاعری میں ہجر کے واقعات اس لئے زیادہ ہیں کہ شاعروں نے غلط زبان استعمال کی تھی۔ ان کا طرز مخاطب صحیح ہوتا تو وہ اتنے ہجر زدہ نہ ہوتے۔

آخر میں پھر اس بات پر زور دوں گا کہ اختر شیرانی ایک لحاظ سے انقلابی شاعر تھے انہوں نے اردو شاعری میں صنفی انقلاب برپا کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں کچھ ہی دن بعد کالجوں میں مخلوط تعلیم رائج کر دی گئی جس میں تعلیم پر کم اور اختلاط پر زیادہ زور دیا گیا اور ایسے لوگ بھی جنہیں تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں تھی کالجوں میں داخلہ لینے لگے۔ جن کی پیاس یعنی تعلیم کی پیاس یہاں نہیں بجھی مزید مخلوط تعلیم حاصل کرنے کے لئے باہر چلے گئے اور جب واپس آئے تو وہ مکمل طور پر مخلوط تھے اور ایک چلتا پھرتا سرٹیفکٹ ان کے ساتھ تھا۔ ❁

شاعر کا آئندہ شمارہ ، گوشۂ حامدی کاشمیری ، نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ

خورشید اکبر

(۱)

مجھے سزا کی سفارش کہاں کہاں نہ ہوئی
مرے لہو کی نمائش کہاں کہاں نہ ہوئی

کسے خبر تھی کہ اندر سے ہے وہ جوالامکھی
خموش لب کی ستائش کہاں کہاں نہ ہوئی

تھیں آسمان پہ نفرت کی بدلیاں کالی
زمیں پہ خون کی بارش کہاں کہاں نہ ہوئی

ہر ایک موڑ پہ جسموں کے بلب روشن تھے
چراغِ روح کی خواہش کہاں کہاں نہ ہوئی

ہوا نہ سبز کبھی پیاس کا شجر خورشید!
ندی اُگانے کی کاوش کہاں کہاں نہ ہوئی

(۲)

یہ زندگی، یہ موت کی سازش عجیب ہے — جلتی چتا پہ اشکوں کی بارش عجیب ہے
اپنے لکھے ہوئے کو بھی پڑھتا ہے بار بار — سنتا ہوں اُس کی طرزِ نگارش عجیب ہے
مُرجھا گئے نظر میں کئی پھول جیسے خواب — خوش رنگ تتلیوں کی نوازش عجیب ہے
میں بوند بوند خون کو تیشہ بناؤں گا — پتھر میں گل کھلانے کی کاوش عجیب ہے
کیوں سوچتا ہوں اپنے خدا کا حساب لوں — خودسر کہو مجھے، مری خواہش عجیب ہے
کس کو سناؤں شہر کی آسیبی کیفیت
ہر سمت قہقہوں کی نمائش عجیب ہے

پبلک ہیلتھ انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ، ٹیکنیکل سکریٹری ایٹ
پٹنہ-۱۵

کہکشاں نوید

(۱)

نہ جانے کون سا غم آ پڑا ہے
سمندر پھر خموشی چاہتا ہے
نہیں ہے تو ہی چہرہ دار تنہا
ہمیں بھی آئینہ پہچانتا ہے
تھے جتنے بھی سہارے اٹھ چکے ہیں
بس اپنا ہی بھروسہ رہ گیا ہے
نہیں ڈھلتا مگر یادوں کا سایہ
کہاں تک ساتھ دے گا دیکھنا ہے
دکھائی دیتا ہے دریا تھما سا
مگر اندر ہی اندر بہہ رہا ہے
نوید آتی ہے بے حالی کبھی جب
تبھی بادل سمندر سوچتا ہے

(۲)

جب آکاش سمندر تھا
صحرا صحرا بنجر تھا
کیا دن تھے خوشحالی کے
اس کا گھر میرا گھر تھا
آج وہ میرا مرکز ہے
کل تک تیرا محور تھا
تلوے انگاروں پر تھے
پانی سر سے اوپر تھا
سوچ رہی تھی پیروں کو
سر چادر سے باہر تھا
خوشبو باہر پھیل گئی
وہ ہی ہوا جس کا ڈر تھا
کس نے کیا پھر موم نوید
میرا دل تو پتھر تھا

بوکارو روڈ ۹/۱۱۱ ساکچی جمشید پور-۸۳۱۰۰۱

بغیر انگلیوں کا ہاتھ

الیاس احمد گدی ● فتح پور لین - پوسٹ جھریا، ضلع دھنباد (بہار)

اس نے بے حد مکاری سے دیکھا۔ وہ دیکھنا آنکھوں کی وہ چمک میں نے گرگٹ کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ جو کسی کو اپنے دائرہ اختیار میں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ آنکھیں بڑے یقین سے کہہ رہی ہیں اب تم نہیں بچ سکو گے بس ایک جھپٹے میں ....

میں بچ نہیں سکوں گا یہ بات میں جانتا ہوں۔ یہ جو چاروں دیواریں چاروں طرف سے آہستہ آہستہ کھسکتی آ رہی ہیں، یہ مجھے دبوچ لیں گی ہیں۔ دینگی مدافعت کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے ایسے دیکھنے سے جسم میں ایک خوف کی لہر سی اٹھتی ہے۔ ایک دلچسپ بات آپ کو بتاؤں۔ آدمی خوف دوسرے کی طاقت سے نہیں اپنی کمزوری سے کھاتا ہے اسے بھی معلوم ہے کہ میں کمزور ہوں اور یہ بھی معلوم ہو کہ کہاں سے کمزور ہوں اس لئے وہ بڑے اطمینان سے کہتا ہے۔

تم ناحق پریشان ہو۔ میں جانتا ہوں تم بہت سی چیزیں کھو چکے ہو۔ بہت سی قیمتی چیزیں، جو اگر آدمی کے پاس ہوں تو وہ تونگر کہلاتا ہے اور نہ ہوں تو قلاش مگر اب بھی تمہارے پاس ایک ایسی چیز رہ گئی ہے جسے اگر تم بیچ دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارا یہ روز روز کا تھوڑا تھوڑا مرنا رک جائے گا۔

وہ کیا چیز ہے ——— ؟ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ابھی ایسی کونسی چیز ہے میرے پاس ——— ؟

وہ رک کر پھر اسی مکاری سے میری طرف دیکھتا ہے۔

وہ ...... تمہارا قلم ہے۔!

قلم ...... ؟

ہاں! اسکو بیچ دو تو تمہاری ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔

مجھے بڑا غصہ آیا ——— تمہیں پتہ ہے اس میں سیاہی کی جگہ میں اپنا لہو ...

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ......

تمہارے لئے نہ پڑتا ہو گا مگر میرے لئے پڑتا ہے۔ میں اپنے جسم کے تمام رگ و ریشے میں دوڑنے والے زہر کو اسی نشتر سے نکال باہر کرتا ہوں تب مجھے سکون مل جاتا ہے اور کوئی ٹھنڈی شیتل لہر میری آنکھوں کی جلن چوس لیتی ہے اور جسم اتنا ہلکا اور سبک ہو جاتا ہے کہ اگر میں پرواز کے لئے اپنے دونوں بازو پھیلا دوں ...

مگر تمہیں ملتا کیا ہے؟ ——— اس نے مجھے ہوا کے دوش سے نیچے اتار لیا روٹی ملتی ہے تمہیں ——— ؟ تمہارے بچوں کی پڑھائی کا خرچ، تمہاری بیوی کے ارمان ——— ؟ ایک لکڑی کا بے بضاعت بے قیمت گھوڑا جس کے لئے تمہارا منا دو مہینے سے ضد کر رہا ہے اور تم کسی سن رسیدہ آدمی کی طرح اس دو سال کے بچے کو کہانیاں ٹالتے اور دلاسہ دیتے آ رہے ہو۔

آنکھوں کے سامنے شاداب آکھڑا ہوتا ہے۔ وہی سوال لئے۔ گھوڑا ......

جیسا مختار خان کے لڑکے کا ہے۔

گھوڑا آجکل پچاس روپے میں آتا ہے۔ نصف سو۔ اگر اتنے پیسے ہوں تو کتنے کام ہو جائیں گے۔ حمید کے لئے بارلکس، اس کا سفید چہرہ دیکھ کر جی ہوتا ہے اپنے بدن کا سارا خون اسے دیدوں۔ مگر میرے پاس بھی خون ہے کیا؟ ڈرتا ہوں اسکو اگر کوئی بیماری لگ گئی تو کیا ہوگا۔ ویسے بھی اس کی آنکھوں کی ویرانی دیکھکر لگتا ہے جیسے ایک التجا ایک فریاد منجمد ہو گئی ہے وہاں۔ مستقل ....

کیا سوچنے لگے ——— ؟ اس آدمی نے تبسم کیا یوں جیسے یہ بے حد معمولی بات ہو اور میرا سوچنا مضحکہ خیز۔

مجھے پھر حیرت ہوئی کہ وہ اتنی معمولی اور بے قیمت چیز کے لئے اتنا اصرار کیوں کر رہا ہے میرے لئے وہ اہم ہے کہ میرے برے سے برے وقت کا اچھے سے اچھا ساتھی ہے جب میں گرنے لگتا ہوں تو موسیٰ کے عصا کی طرح میرا سہارا بن جاتا ہے۔ زندگی کو جینے کے لئے طاقت، اور جو جینے کیلئے حوصلہ عطا کرتا ہے مگر اس کے لئے تو یہ ایک سب سے معمولی ......

میں قلم کو ہاتھ سے ڈھک کر چھپاتا ہوں تو وہ میری بے وقوفی پر ہنس دیتا ہے۔

تمہاری قسمت ہی خراب ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ یہ آخر ......

یہ بات اس نے سچ کہی ہے۔ اگر میری قسمت خراب نہ ہوتی تو میں ایک دس بائی

دس کے مرے میں سمایا ہوں کہ جیسے ڈربے میں اپنی آدھی زندگی کیسے گذار دیتا۔ ایسے کمرے میں جہاں نہ دھوپ ملتی ہے نہ ہوا۔ دھوپ کے نام پر ملگجی اجالا اور ہوا کے نام پر دھواں یا پھر کبھی ابجاتی ہوئی نالیوں اور سامنے پڑے کوڑے کے ڈھیر کی بدبو۔ گھر کے افراد کے چہروں پر ٹنگی ہوئی بھوک اور نچلے جسموں پر چیتھڑوں کے ٹکڑے زندگی میرے لئے وہ لباس ہے کہ ایک جگہ سیتا ہوں تو کئی جگہ سے پھٹ جاتا ہے۔

پھر دوسری جگہ سیتا ہوں۔ پھر کئی جگہ سے پھٹ جاتا ہے۔

یار تم زندگی بھر سوچتے رہوگے۔ اور زندگی بھر کوئی فیصلہ نہ ہو پائے گا۔ میری ایک بات یاد رکھو! زندگی آدمی کو صرف ایک بار ملتی ہے، بس ایک بار! اسکو جی چاہے کسی متعفن نالہ میں ڈال دو یا اٹھا کر کسی عالی شان عمارت میں رکھ دو۔ یہ دونوں کام تمہارے اپنے اختیار میں ہیں۔

اس کی یہ بات بھی حق ہے۔ مگر عمارت تک پہنچنے کا جو راستہ ہے وہ انگنت انسانی جسموں سے پٹا پڑا ہے۔ مُردوں سے نہیں زندوں سے۔ پاؤں رکھنے کی بھی ذرا سی جگہ نہیں۔ اور یوں صورت حال یہ ہے کہ ہر قدم کسی کے سر پر پڑتا ہے۔ کسی کی چھاتی پر کسی کے پیٹ پر اور یہ میں نہیں کر سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ میں نے جب بھی پاؤں اٹھا کر آگے رکھنا چاہا ہے کسی کا سر، کسی کی چھاتی، کسی کا پیٹ، دیکھ کر رک گیا ہوں۔

وہ میرے چہرے سے، چہرے کے رنگ سے بھانپ گیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

بولا......

گھوڑا گھاس پر رحم کھائے گا تو کیسے چلے گا۔؟

سوال گھوڑے اور گھاس کا نہیں ہے۔ انسان اور انسان کا ہے۔ اور کوئی چیز ہنوز میرے اندر ایسی زندہ ہے، روشن ہے جو مجھے انسان کا احترام کرنا، انسان سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔

وہ بے رحمی سے بولا ـــــ دنیا فلسفے سے نہیں پیسے سے چلتی ہے۔

مجھے بڑی ہنسی آئی۔ دنیا پیسے سے چلتی نہیں، دوڑتی ہے۔ امبیسڈر۔ فیٹ کونٹیسا اور ماروتی پر سوار ہو کر سج سنور کر، خوشبو میں بس کر امراء کے بچے بچیوں کے ساتھ پیزا، ایوننگ ان پیرس، اور انٹی میٹ کے جھونکے فضا میں بکھر جاتے ہیں جیسے دنیا کے اس جہنم میں جنت کی کوئی کھڑکی کھل گئی ہو۔

وہ تلخی سے بولا ـــــ تم جب بھی سوچتے ہو اپنے خیالوں میں اتنا اونچا اڑ جاتے ہو کہ تمہیں اپنا گھر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ حمیدہ کا مرجھایا چہرہ، بچوں کی کھلونوں اور کپڑوں کی رنگین خواہشیں، خوراک کی کمی، صاف ہوا کی عدم موجودگی سے ٹوٹ کر قدم قدم موت کی طرف بڑھنے والی انکی تندرستی۔ میں کہتا ہوں کیا یہ ضروری تھا تمہارے لئے کہ شادی بھی کرو اور بچے بھی پیدا کرو۔

میں پھر لوٹ کر اپنے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ وہی گھر۔

بیوی کی آنکھوں میں ایک چھوٹا سا سادہ سا سوال ہے، وہ ڈرتے ڈرتے میری طرف دیکھتی ہے کہ کہیں اس نے جو امید لگا رکھی ہے وہ...... بھلا امید بھی کیا ہے۔ یہی نا کہ کچھ پیسے ملے ــــ؟ منّے کے لئے دودھ ـــ دو ایک دن میں دودھ ختم ہو گیا تھا بہت رونے لگا تو شیشی میں پانی ڈال کر اور اس میں چینی گھول کر دھوکے سے پلا دیا ہے۔

میری بیوی بھی عجیب ہے اتنے چھوٹے بچے سے بھی دھوکہ کرتی ہے۔

میں جب بھی گھر پہنچتا ہوں زیادہ بے چین ہو جاتا ہوں، نظر بیوی کے جسم کو نہارتی ہے۔ اس کے پیچ و خم کے لئے نہیں۔ اس کی دل آویزی یا خوبصورتی کے لئے بھی نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لئے کہ شاید کہیں کوئی زیور رہ گیا ہو، کوئی ایر رنگ کوئی چھلا۔

بھوک آدمی کو ذرا پامال کرتی ہے، ایکدم سے کمینہ بنا دیتی ہے۔ ایسا کمینہ کہ ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو دھوکہ دیتی ہے، شوہر اپنی بیوی کو صرف زیور کیلئے دیکھتا ہے اور اندر کی وہ ساری پاکیزگی اور طہارت اپنی مجبوریوں اور شرمندگی کے سفلی پن کی آلائش سے اٹ جاتی ہے ـــ

ہمیشہ مضبوطی سے میرے جمے قدم گھر پہنچنے کے بعد اکھڑنے لگتے ہیں۔ وہ جانتا ہے اسلئے بار بار مجھے گھیر کر گھر پہنچا دیتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میدانِ کارزار یہی وہ جگہ ہے جہاں.......

میں پھر قلم کو اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتا ہوں۔ اس کے ڈر سے نہیں۔ اپنے ڈر سے وہ بجھ جاتا ہے۔

اچھا خیر چھوڑو، بیچنا نہیں چاہتے۔ تو مت بیچو، اسے گروی رکھ دو۔

'گروی ـــــ؟ میں چونک کر اس کو دیکھتا ہوں۔

بھائی گروی کا مطلب نہیں سمجھتے ـــــ؟ رہن؟؟

میں پھر بھی چپ اس کو دیکھتا رہتا ہوں تو وہ ہمدردی سے سمجھانے لگتا ہے ـــــ گروی کا مطلب ہے کہ چیز تمہاری ہی رہے گی۔ یعنی ملکیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

کیا تمہیں یقین ہے کہ قلم میرا ہی رہ جائے گا۔؟

بالکل ـــ! اس نے یقین سے کہا۔

اب میں ہل گیا تھا۔ میرے قدم اکھڑ چکے تھے۔ حمیدہ کی ویران آنکھوں میں میں نے صاف لکھا دیکھا تھا کہ اگر میں گر جاؤں گی تو مجھے اٹھا نہ پاؤ گے ـــ آپ یوں نہ سمجھئے کہ حمیدہ میری مجبوری ہے۔ میری مجبوری تو اس کی آنکھوں کی وہ بے نام التجا ہے جسے میں سہار نہیں سکتا۔

چنانچہ دوسرے دن وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتا ہے ایک بہت بڑے

دفتر میں۔ ایک شاندار عمارت، جس کی پیشانی پر ایک خوبصورت بورڈ جھومر کی طرح لٹکا ہے۔ اندر ایک بڑا سا ہال، کئی چھوٹے چھوٹے کمرے، بے حد صاف ستھرا ماحول، خوبصورت ملائم چہرے والے خوش باش، خوش رو لوگ، قیمتی لباس، سوٹ ٹائیاں، بھائی مجھ پر تو رعب پڑ گیا۔ لوگ میرا لباس، میری وضع قطع دیکھ کر مسکرائے جیسے مجھے کوئی بے وقوف دیہاتی سمجھا ہو۔ مگر مجھے پرواہ نہ تھی۔ شاں شاں چلتے پنکھے کی ٹھنڈی ہوا نے فرحت بخش کر دیا۔

بہت دیر بعد بلاوا آیا۔ صاحب نے مجھے دیکھا تو کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ میرے پھٹے کپڑوں کا بھی خیال نہیں کیا۔ چائے پلوائی۔ کافی دیر تک ادھر ادھر کی بات کرتا رہا بیچ بیچ میں میرے قلم کو اشتیاق سے دیکھتا بھی رہا۔ پھر اچانک میرا قلم مانگ لیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اپنے قلم کو اپنے سے جدا کیا تھا۔ وہ واحد چیز جو میری اپنی تھی۔ ایک دم سے مجھی کا صرف میری۔

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آئی چہرہ یوں کھل اٹھا جیسے کوئی بے حد قیمتی چیز اس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ بولا۔

اس کی ہمیں بے حد ضرورت تھی۔ ہم اس کا منہ مانگا معاوضہ دیں گے۔

منہ مانگا معاوضہ ——— ؟ مجھے پھر تعجب ہوا۔ میں نے اسے صرف دو روپے میں خریدا تھا۔ آج اس کی اتنی قیمت کیسے ہو گئی۔ اس آدمی نے قلم مجھے لوٹا دیا اور کاغذ آگے بڑھا کر بولا۔ اس پر لکھو۔

میں نے لکھا تو وہ چونک گیا۔

اس کی سیاہی . . . . . ؟

میں نے بھی چونک کر دیکھا۔ تحریر کے حروف فاسفورس کی طرح جل رہے تھے اس سے ایک روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ اس نے انگلی سے چھو کر تحریر کو دیکھا پھر جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اس میں آگ ہے ——— !

آگ ——— ؟

وہ کسی قدر خوف سے مجھے دیکھنے لگا۔

مجھے پتہ نہیں صاحب کہ اس میں آگ ہے۔ ویسے اس کی روشنائی . . . . . . !

واقعی مجھے پتہ نہیں تھا اور زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب میرے قلم سے کسی کو اتنا خائف ہوتے دیکھا تھا۔

ایک کام کیجئے ——— اس نے گہرائی سے سوچتے ہوئے کہا۔ اس کو دھو کر ہمارے یہاں کی نیلی روشنائی بھر دیجئے۔

میں ہچکچایا تو وہ مجھے سمجھانے لگا۔ ہمارے یہاں کی نیلی روشنائی تمام میں مشہور ہے اس میں نہ آگ ہوتی ہے اور نہ جلن بلکہ اس سے لکھی جانے والی تحریر آدمی کو ایک عجیب طرح کا کیف بخشتی ہے۔ ایک نشہ طاری ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ نیند۔ پھر نیند میں خوبصورت چمکیلے خواب آج دنیا کے تھکے ہوئے دماغ کو انہی خوبصورت چمکیلے خوابوں کی ضرورت ہے۔

میں نے چاہا کہ کچھ کہوں مگر شاداب سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہی سوال لئے۔ گھوڑا گاڑی کا گھوڑا۔ بیوی کی ویران آنکھوں میں بھی وہی مخصوص سوال تھا۔ پہلا ——— کچھ کہنے کا یارا نہ رہا۔ قلم لیا۔ دھویا اور نیلی روشنائی بھر دی۔

مجھے ایک بڑا سا ٹیبل دے دیا گیا۔ سر پر پنکھا شاں شاں ٹھنڈی ہوا کی پھوار گرا رہا تھا۔ چھوٹا سا سفید سوئچ بٹن علاء الدین کا وہ چراغ تھا کہ جو کہو حاضر۔ بڑا مزہ آیا۔ میں دن بھر لکھتا رہا مگر شام کو تحریر صاحب کے پاس گئی تو وہ یکدم سے برہم ہو گئے۔ یہ کیا لکھا ہے ——— ؟

میں نے ڈرتے ڈرتے دیکھا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ نیلی روشنائی کے ساتھ کہیں کہیں وہی فاسفورس، وہی چمکیلا مادہ، وہی آگ . . . .

ایسا کیسے ہو گیا ؟

صاحب گرج برس کر تھما تو پھر دھیرے سے بولا۔ یا شاید حکم دیا۔

قلم کو پھر ٹھیک سے دھو لو۔ آئندہ اس طرح کی بات نہ ہونی چاہیے۔

دوسرے دن میں نے قلم کو پھر ٹھیک سے دھویا پھر نئی نیلی روشنائی ڈالی مگر پھر وہی بات . . . . .

کئی ہفتوں تک یہی ہوتا رہا۔ ہر بار میں قلم دھوتا، روشنائی بدلتا رفتہ رفتہ وہ چمک یا روشنی یا آگ، یا جو بھی وہ تھا ختم ہو گیا اور صاف نیلی چمکدار تحریر ابھر آئی۔ صاحب بہت خوش ہوئے۔

جس دن مجھے پیسے ملے اس دن پہلی چیز جو میں نے خریدی وہ دو تکیے تھے۔ سیل کی ریفائنڈ روئی کے تکیے۔ خس کا ایک دانہ نہیں۔ ریشم کی طرح ملائم . . . . . سر رکھو اور سر غائب، آنکھ بند کرو اور ہوش ختم، بس یوں لگے بادلوں کے ملائم گالوں پر سو رہے ہیں نیند باندی کی طرح منتظر . . . .

تین برس پہلے جو کپاس کی روئی کا تکیہ بنوایا تھا وہ سخت ہوتے ہوتے اب پتھر کی طرح ہو گیا تھا۔ اس سے تکیہ کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا تھا بس سر اونچا ہو جاتا تھا اس سے جان چھوٹی۔ حمیدہ بے یقینی سے اس عجیب و غریب تکیے کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

مگر دوسرے دن اس نے جو بات بتائی اسے سن کر میں چونک گیا اس نے بہت ہی رازداری سے بتایا کہ آپ کے اس تکیہ پر مجھے رات بھر نیند نہیں آئی ذرا جھپکی آئی تو خواب میں دیکھا کہ آپ کسی آدمی کی چھاتی پر پاؤں رکھے کھڑے ہیں اور آپ کے ہاتھ کی انگلیاں کو لہو سے بھر گئی ہیں۔

میں ایک دم سناٹے میں آ گیا کیونکہ بالکل یہی خواب میں نے بھی دیکھا تھا ———

آہ! ضیاء فتح آبادی

ضیا فتح آبادی کا انتقال ہوگیا۔ یہ خبر میرے لئے معمولی نہیں۔ یہ سانحہ ذاتی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ذاتی اس لئے کہ مرحوم کا تعلق خاندانِ سیماب سے تھا وہ اسی خاندان کے ایک فرد تھے اس طرح کہ تیسری نسل تک انہوں نے اس تعلق کو عملی طور پر نبھایا۔ ان کی موت سے تعلقات کے بے شمار یاد رنگ ابھر آئے ہیں لیکن تعلق کی یہ نصف صدی چند سطروں میں نہیں سموئی جاسکتی۔

ضیا صاحب ایک شخص یا شاعر ہی نہیں ایک انجمن بھی تھے۔ سیماب اسکول کی نمائندگی کرتے ہوئے آخری عمر تک انہوں نے نئے ذہنوں کی فکری وفنی تربیت بھی کی۔ ان کی تجربہ پسند شعری شخصیت نے ہر دور میں نئے شعری اسالیب کو قبول کیا اور فکر وجذبے کے امتزاج سے اچھی اور سچی شاعری کی۔ ادبی رسائل سے وابستگی، ادبی انجمنوں سے دلچسپی، مشاعرے، علمی وادبی جلسے محفلیں وغیرہ۔ ضیا صاحب صحیح معنوں میں ایک ایسے شاعر تھے جو روایت کا احترام بھی کرتے تھے اور پورے شعور کے ساتھ اس روایت سے انحراف بھی کرنا جانتے تھے۔ پابند نظم سے نثری نظم تک اور غزل سے آزاد غزل تک تخلیقی سطح پر انہوں نے زبان وبیان کی صحت اور بھرپور فنی التزام کے ساتھ ساتھ شعریت کو اپنی شاعری کا معیار ومزاج سمجھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ناقدینِ شاعری نے ضیا صاحب پر توجہ نہ دی ورنہ تو آزاد نظم کا تجربہ کرنے والے شعراء میں ہر لحاظ سے وہ کم معیار نہیں۔ اسی طرح گیت نگاری میں بھی انہوں نے گیت کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے گیت تخلیق کئے۔ غزل ان کا بنیادی وسیلۂ اظہار تھا اور جو شخص مختلف ہیئتوں میں تخلیقی اظہار کی بے پناہ قوت رکھتا ہو، زبان وبیان پر قدرت رکھتا ہو، لفظیات وتراکیب کا ہنر جانتا ہو، غزل کو محض روایتی اور کلاسیکی سطح تک نہیں رکھ سکتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ضیا صاحب کی یادگار قائم کی جائے اور ان پر تخلیقی کام ہوں۔ ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے۔ ان کے غیر مطبوعہ مضامین کی اشاعت ہو، غیر مطبوعہ کلام کو ترتیب دیا جائے۔

ضیا فتح آبادی ——— ایک نظر میں

پیدائشی نام ○ مہر لال سونی
تخلص ○ ضیا
پیدائش ○ ۹ر فروری ۱۹۱۳ء
مقام ○ کپورتھلہ، ضلع جالندھر [پنجاب]
وطنِ مالوف ○ فتح آباد [ضلع امرتسر]
ابتدائی تعلیم ○ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء خالصہ مڈل اسکول پشاور
۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۹ء مہاراجہ ہائی اسکول جے پور [راجستھان]
۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء ایف اے ہندو سبھا کالج امرتسر
۱۹۳۳ء بی اے آنرز فارسی۔ ۱۹۳۵ء ایم اے انگریزی۔ فورمن کرسچین کالج لاہور
ملازمت ○ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۷۱ء ریزرو بینک آف انڈیا میں کلرک ہوئے۔ ۱۹۵۲ء تک دہلی میں رہے۔ پھر بمبئی، کانپور اور مدراس کے دفاتر میں کام کرتے ہوئے چیف ڈپٹی آفیسر کی پوسٹ تک ترقی کی۔
شاعری ○ شاعری کی ابتدا ۱۹۲۵ء سے ہوئی، ابتدا میں عطا تخلص تھا جو ان کے استادِ اوّل مولوی اصغر علی حیا جے پوری کا دیا ہوا تھا۔ مولوی صاحب اردو کی تدریس کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں جے پور سے امرتسر منتقل ہونے پر غلام قادر فرخ امرتسری سے اصلاح لی ۱۹۳۰ء سے بذریعۂ خط وکتابت علامہ سیماب اکبرآبادی سے اصلاح لینی شروع کی اور یہ سلسلہ علامہ کی حیات تک جاری رہا حالانکہ استاد نے ۱۹۴۰ء میں انہیں فارغ اصلاح قرار دے دیا تھا۔
تصانیف ○ طلوع [قطعات] ۱۹۳۴ء — نورِ مشرق [نظمیں سانیٹ
شعری ○ اور گیت] ۱۹۳۶ء ضیا کے سو شعر ۱۹۳۸ء — نئی صبح [پابند اور آزاد نظمیں، غزلیں، رباعیات اور گیت] ۱۹۵۲ء
گردِ راہ [رباعیات، نظمیں، گیت، غزلیں] ۱۹۶۳ء
حسنِ غزل [غزلیں] ۱۹۶۶ء — شعر اور شاعر [تالیف] ۱۹۷۴ء
دھوپ اور چاندنی [غزلیں] یہ مجموعہ ۱۹۷۶ء میں خود ضیا صاحب کے قلم سے تحریر کیا ہوا لندن سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء
رنگ ونور [غزلیں] ۱۹۸۰ء
سورج کا سفر [پابند وآزاد اور نثری نظمیں، سانیٹ اور گیت]
نثری ○ سورج ڈوب گیا [افسانے] ۱۹۸۱ سیماب بنام ضیا [خطوط]
زاویہ ہائے نگاہ [تاثراتی مضامین] ۱۹۸۳ء
ذکرِ سیماب [سیماب کا سوانحی خاکہ] ۱۹۸۴ء
مسندِ صدارت سے [خطباتِ ضیا] ۱۹۸۵ء
ضیا فتح آبادی پر دو کتابیں ○ ضیا شاعر اور شخص [رسالہ تحریر خاص نمبر] مرتبہ مالک رام
بوڑھا درخت از ڈاکٹر زرینہ ثانی ۱۹۷۹ء
وفات ○ منگل ۱۹ر اگست ۱۹۸۶ء، سر گنگا رام ہسپتال دہلی

مکتوبات

علی جواد زیدی ——— ۳۰۲، ڈالی باغ کالونی لکھنؤ

آپ نے شاعر کو ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے بہت سنوار نکھار دیا ہے جدید رجحانات کی تشہیر میں بھی حصہ لیا ہے لیکن شعری روایت نہ ایک دن میں بنتی ہے نہ بگڑتی ہے۔ یہ عمل عموماً دہائیوں پر چھیلتا ہے اور تب کہیں ظہور ذا آتا ہے۔ اس حقیقت کا سرا ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے اور خوشی ہے کہ آپ کو ادبی روایات کے ناقابل شکست تسلسل اور ارتقا پزیر تکمیل کا پورا خیال رہتا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور شاعر کو مزید توانیاں دے۔

مظہر امام ——— ڈائرکٹر دوردرشن سرینگر

شاعر کے نئے رنگ، روپ اور اس کی روز افزوں ترقی کی بات میرا اظہار خیال شعر میں شعر ملانے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھے گا۔ نہ صرف عام قاری، بلکہ شاعروں اور ادیبوں کے تمام معتبر حلقے شاعر کے نئے رنگ و آہنگ کا مداح خواں ہیں۔ آپ نے تخلیق، تنقید و تحقیق کے مناسب امتزاج سے شاعر کو ہر ادب دوست کا محبوب بنا دیا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا انداز ہر شمارے سے ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ترتیب و تزئین کے نئے نئے تجربے بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ تجربے ضروری ہیں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے کہ ہر تجربہ ہر موقع پر زیب نہیں دیتا۔ مثلاً آپ نے حق کتابت کا تجربہ کیا۔ مکتوبات کے لئے شاید یہ ٹھیک ہے۔ ایک بار تبصروں کے لئے بھی اچھا لگا لیکن اب یہ حد اعتدال سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ تازہ شمارہ میں ترتیب کے صفحے پر یہ تجربہ گراں گزرا۔ مضمون اور مضمون نگار کے نام پڑھنے کے لئے عینک کے سرے اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ زیادہ مواد دینا اچھی بات ہے لیکن قاری کی آنکھوں کی صحت کا کا خاص مرد کیا ہے۔

گذشتہ ڈیڑھ پونے دو سال کے دوران شاعر نے کچھ بہت ہی اہم نگارشات شائع کی ہیں۔ مثلاً شمارہ ۹–۱۰؍ ۸۵ء میں یگانہ کی رباعیات کے مجموعے "ترانہ" کا عکس۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے تخلیقی ادب میں شائع شدہ یگانہ کی اسی غیر مطبوعہ رباعیاں بھی شامل کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مسعود کا ایک نہایت دلچسپ مضمون جو معلومات کا خزانہ بھی ہے۔ آپ نے وہ یگانہ اور ترانہ کے بارے میں جو نوٹ لکھا ہے، اس کی حیثیت تحقیقی اور اعتقادی دونوں سے یگانہ کے خطوط کا عکس، تحریریں ان پر مستزاد۔ ۸۰ صفحات کا یہ مواد یگانہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑا اہم ہے۔ آپ کی یہ کاوش قابل قدر ہے۔

شاعر نے احساس دلایا ہے کہ یگانہ کا از سر نو مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے انہوں نے بہت سے نامانوس الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کی معنوی تہوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ یگانہ کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ "تھی" تنہا کی رباعی پر ہے اور بے جا غیر فصیح ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب "ہے" "تھی" کی جگہ ہی لکھنا کوئی پسند نہیں کرتا۔

یہاں ایک چھوٹی سی بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ رسالے کی ترتیب اور تزئین پر بڑی محنت کرتے ہیں اور ایک پالیسی بھی اپنائی ہوئی رکھتے ہیں، اس لئے آپ کی وضع ہوئی ترتیب میں مشورہ کو دخل ہوگا ہی لیکن مجھے کچھ محسوس ہوا کہ اگر آپ یگانہ کا گوشہ صفحہ ۹ کی بجائے صفحہ ۱۱ سے شروع کرتے تو بہتر تھا۔ اسی طرح یہ حصہ صفحہ ۹۰ کی بجائے صفحہ ۸۸ پر ختم ہوتا۔ اسی طرح گوشۂ زیب غوری کو بھی صفحہ ۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۱۳ پر ختم ہونا چاہئے تھا۔ یہ میں بطور مثال اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ اگر کوئی یہ حصے علیحدہ طور پر الگ محفوظ کرنا چاہے تو اسے غیر ضروری صفحات شامل کرنے پڑیں۔ غالباً ڈاکٹر لقمان چنیسے بھی آپ کا توجہ اسی جانب مبذول کرائی تھی

"نئی شاعری نئے نام" کا شمارہ بھی بہت اہم تھا، آپ نے اس نوع کا شمارہ پہلے بھی ترتیب دیا ہے لیکن اس بار (شمارہ ۱۲ ؍ ۸۵ء) مولوی مدن کی سی بات پیدا ہوئی ہے۔ آپ کے تبصرہ بلاشبہ ہر شاعر کی خصوصیات اجاگر کر دی ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک شمارہ "نیا افسانہ، نئے نام" بھی ہو سکتا ہے۔

مختار شمیم ——— ۴۹/۲ ریلوے کالونی طویلہ ٹک اندور ۴۵۲۰۰۲ ایم پی

شاعر کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ جناب اکبر حیدری کا مضمون اور اقبال مجید کا افسانہ خاصے کی چیز ہے۔ چند منظومات بھی خوب ہے۔ خاص طور سے عتیق حنفی، نعمت نوتنی، حامدی کاشمیری، ظفر صہبائی، راغب مرادآبادی، منظور ہاشمی وغیرہ کی تخلیقات قابل داد ہیں۔ "مکتوبات" سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کے مضمون کو اہل نظر پسند کر رہے ہیں۔ پروفیسر ابو محمد سحر نے اردو کے حروف تہجی اور اردو املا کے سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا ہے، اس پر نہایت سنجیدگی سے توجہ دی جانی چاہیے اور اہل لسانیات کو اردو کی "آوازوں" اور اردو حروف تہجی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ عام طور پر اہل لسانیات الف، ہمزہ اور عین کو ایک ہی آواز مانتے ہیں لیکن تینوں حروف کی اہمیت اپنی جگہ ہے، ان میں سے کسی کو بھی کم نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آیئے، بعد، ل، اعتراف، آئینہ وغیرہ۔ ان لفظوں میں سے ایک ہی آواز کے تینوں حروف کا استعمال اپنی جگہ ضروری ہے۔ پھر کس طرح ہم آواز ہوتے پر کسی ایک حرف کو کم کیا جا سکتا ہے۔

سلطان سبحانی ——— ۳۱۹۴۱، ایم۔ ایچ۔ اے کالونی، مالیگاؤں

شاعر کا نیا شمارہ ملا۔ افسانہ کی اشاعت پر آپ کا بہت بہت ممنون ہوں۔ اس شمارے کے اداریہ کا ایک ایک لفظ آج کے فنکار کو وقت کی میزان پر رکھ کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر رہا ہے۔ پوری دنیا میں جو کھلبلی، انتشار، بے اطمینانی اور رہبر آلود دہانوں کی صف آرائی ہے آپ کا اداریہ ادیبوں کے لئے ایک نہایت اہم سوال چھوڑتا ہے۔ یہ تمام ادیبوں کے لئے چیلنج بھی ہے اور فرض کی آواز بھی۔

سلیم شہزاد کے مضمون پر احمد عثمانی کا عجیب و غریب جواب پڑھ کر حیرت ہوئی کہ باقی مشمولات بہتر ہیں لکھنے کے بعد احمد عثمانی نے بہتر کو بھی بدتر ثابت کرنے کی کوشش کر ڈالی۔

"جدید افسانے کی داستان دراصل ایک نہایت وسیع موضوع ہے اور اس میں وہ تمام باتیں شریک نہیں ہو سکتیں جو احمد عثمانی اپنے خوابوں میں طے کر چکے ہیں کیونکہ یہ مضمون ترکاری پکانے کے طریقے کے بارے میں نہیں لکھا گیا ہے کہ صاحب اس میں مرچ کم رہ گئی ہے نمک زیادہ ہو گیا ہے اور لہسن تو ڈالا ہی نہیں گیا ....

اسی مضمون پر فاروق شفق نے بھی تنقید کی ہے لیکن ان کا انداز تحقیر آمیز نہیں ہے۔

مضطر مجاز ——— ۲۱-۵-۱۰۲۰، فرحت نگر، حیدرآباد

شاعر کے شمارہ نمبر ۹ میں ابو محمد سحر صاحب کا جو معرکۃ الآرا مضمون تھا اس درجے کی کوئی تحریر شمارہ نمبر ۱۰ میں شریک نہ ہو پائی۔ اب کی بار تخلیقی ادب کا وزن ذرا زیادہ ہی ہو گیا۔

اردو کی ابتدائی تعلیم پر توجہ دینے کا سوال آپ نے بہت بر وقت اٹھایا ہے۔ ہمارے یہاں آندھرا پردیش میں اس تعلق سے بڑا عجیب تجربہ رہا۔ بڑی کدوکاوش کے بعد اقلیتوں کے لئے ایک میڈیکل اور انجینئرنگ کالج کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی بعد کی حکومت کی جانب سے تنسیخ اور عدالتی کارروائی ایک دردناک کہانی ہے، مگر افسوس کہ ابتدائی تعلیم سے غفلت کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے طالب علم ہی نہ ملے۔

مسجد یا مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

حاصل یہ کہ ایک اقلیتی ادارے میں غیر اقلیتی طلبا کو کثیر تعداد میں شریک کرنا پڑا اور جو قیام کی غرض و غایت تھی وہ پوری نہ ہو پائی۔

مختصر یہ کہ ہم لوگ اپنے اہرام بنانے میں مشغول ہیں۔ اس پس منظر میں آپ کا اداریہ سارے ملک کے اردو والوں کے لئے بالعموم اور دانشوران کے لئے بالخصوص بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی تحریریں پمفلٹ کی شکل میں چھاپ کر جلسوں اور جلوسوں میں تقسیم کی جائیں۔ جن کی ان دنوں کوئی کمی نہیں۔ اب تو سارے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا مادری زبان میں ہونا ضروری ہے۔ اعلیٰ تعلیم انگریزی یا کسی بھی زبان میں ہو سکتی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی والا تجربہ اب بالکل غیر ضروری اور بے وقت کی راگنی ہے اردو یونیورسٹی کے بجائے اردو کے اعلیٰ ثانوی اسکولوں کا جال پھیلنا چاہیے۔

احمد کمال پروازی ——— ۴/۹ ابجد بائی مارگ، اجین

شمارہ نمبر ۶ میں اعجاز راہی نے اپنے مضمون "اردو افسانے میں علامتی تحریک" کو متوازن بنانے میں بڑی محنت صرف کی ہے یوں تو آنے والے دور میں اردو افسانے میں علامتی تحریک پر بطور پراگندہ کچھ کچھ لکھا ہی جا رہا ہے لیکن یہ مضمون غیر جانب دارانہ رویہ کا مظہر ہے۔ اور یہ سلیقہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم کسی صنف کا مطالعہ براہ راست کرتے ہیں اور نتائج عکس کرتے ہیں۔ یعنی اسی طرح کے جدلیاتی عمل سے قاری (ناقد) کا مطمع نظر تشکیل پاتا ہے۔

اگرچہ مضمون اردو افسانے میں علامتی تحریک کو محیط ہے لیکن اس کی طوالت متعدد دعنوانات کی حامل ہے ایسا لگتا ہے مضمون نگار نے اپنی علمیت اس میں ٹھونس ٹھونس کر بھر دی ہے۔ حالانکہ اس میں مصنف کے نقطہ نظر تک تو رسائی ممکن ہے لیکن تشفی نہیں ہوتی۔ بہر حال کسی حد تک یہ ایک سنجیدہ و دیانت دارانہ سعی ہے۔ اس نوعیت کے متوازن مضامین وقتاً فوقتاً ہی سامنے سے گذرتے ہیں جہاں انتہا پسندی کی جگہ اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے اس سے قبل عتیق اللہ کا مضمون "افسانے کی داخلی گہری ساخت" نے بھی مجھے اپیل کیا تھا، انہوں نے بھی داخلیت کو حقیقت کی توسیع قرار دیا ہے۔

شمارہ نمبر ۶ نظم و نثر دونوں اعتبار سے جامع ہے۔

آپ اداریہ بڑی جانفشانی سے لکھتے ہیں۔ اس میں احساس اور فکر کی آمیزش متاثر کرتی ہے۔ شاعر کو بہتر بنانے کا جذبہ، اردو کو جائز حقوق دلانے کا عزم، شاعر کی ۵۰ سالہ روایت کی عکاسی ہے۔ اگر آپ سب کچھ نہ بھی لکھیں تو یہ الفاظ آپ کے سینے سے نکل کر شاعر کے خالی صفحے از خود ثبت ہو جائیں۔ شاعر کا اداریہ، اداریہ نہیں اس کی روح ہے۔

مبشر علی صدیقی ——— گلی وحید گنج، کلاسوتہ بہار

شاعر کے شمارہ ۱۱–۱۲ میں سردار احمد علیگ، کا مضمون "بچوں کا ادب" نظر سے گذرا۔ موصوف اردو میں بچوں کے ادب سے متعلق اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہمارے تعلیمی اداروں کے سربراہان اور ہمارے اردو اساتذہ جن کے سپرد چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نازک اور مقدس کام ہے نصابی کتابوں کے علاوہ کتابوں کے مطالعہ کی عادت پر زور نہیں دیتا بلکہ میں نے اتر پردیش کے بیشتر اسکولوں کے اردو اساتذہ کو بچوں کے ادب سے قطعی ناواقف اور اس کی اہمیت سے یکسر خالی پایا۔ انہیں نہ بچوں کے مصنفین کا پورا علم ہے اور نہ کتابوں کے نئے اور پرانے ذخیروں کی پوری جانکاری" اس سے بدتر حالت بچوں کے والدین اور سرپرستوں کی ہے جنہیں بچوں کے لئے اچھی کتابوں اور مفید رسائل کی خریداری انتہائی بار معلوم ہوتی ہے۔ میں گذشتہ دس سال سے اسی تلخ مرحلے سے گذر رہا ہوں۔

نقد ونظر

لوحِ ادب

اقبال ماہر [پ ۱۹۱۹] کا یہ اولین شعری مجموعہ ہے جس میں تقریباً ۱۲۵ غزلیں شامل کی گئی ہیں اور ہر غزل اوسطاً ۱۰ اشعار پر مشتمل ہے اس طرح ڈیڑھ ہزار کے قریب یہ اشعار کسی کہنہ مشق شاعر کے تخلیقی سفر کا منظر نامہ ہیں۔ اقبال ماہر مطالعے ومشاہدے کے شاعر ہیں۔ وہ ایسے محسوسات کے لئے جو لفظیات وتراکیب استعمال کرتے ہیں وہ روایت کے بطن سے جنم لیتی ہیں لیکن شعری قوتیں انہیں تازہ کار بنا دیتی ہیں۔ جو صوامت کی پیش کش اور جمال کی ندرت سے یہ لفظیات وتراکیب بوجھل نہیں معلوم ہوتیں۔ اقبال ماہر جو کہ فن پر قدرت رکھتے ہیں لہٰذا نئی نئی زمینوں میں اظہار کے دھنک رنگ سجاتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں ہر غزل میں چند ایک شعر ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن کے انتخاب سے لوحِ ادب کے شاعر کی شعری کائنات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اقبال ماہر ایک روایتی شاعر ہونے کے باوجود جو اُن کو کبھی فرسودہ سمجھتے رہے ہیں اور جو کسی جدیدی کے جذب واحد کے مراحل سے بھی گذرتے رہے ہیں لہٰذا ان کی غزلوں میں ایک طرح کا تنوع بھی موجود ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی تخلیق کی ہیں اور تراجم بھی کئے ہیں۔ کتاب میں ایک آزاد غزل بھی شامل ہے اور یہ سب کچھ ان کو اعتبار کا درجہ دینے کے لئے کافی ہے۔

کتاب میں علی جواد زیدی، پروفیسر احتشام حسین، ست گو عقیل اور ال احمد سرور کے تاثرات وخیالات بھی شامل ہیں۔ یہ شعری مجموعہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ صفحات ۲۲۳۔ قیمت ۲۰ روپے سن اشاعت ۱۹۸۰ء۔ پتہ ۲۲۶ سنگھاسن کنج، الٰہ آباد

انجمن اسلام کے سو سال [تاریخ و جائزہ]

انجمن اسلام بمبئی کا وہ تعلیمی ادارہ ہے جس کی ایک سو گیارہ سالہ شاندار تاریخ اور روایت ۱۸۷۵ء–۱۹۷۵ء رہی ہے اور اب ۱۹۸۶ء میں اس کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ انجمن اسلام کی پچھلی سو سالہ تاریخ کو مشہور ماہر علم جناب سید شہاب الدین دسنوی نے نہایت ہی عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ دسنوی صاحب خود بھی برسوں انجمن اسلام کے فعال سکریٹری رہے ہیں اور کچھ سے دور اہم منصوبوں کی تکمیل کی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے حصۂ اول میں تاریخ کے تحت پانچ ادوار دئے گئے ہیں پہلے دور میں انجمن کے قیام کا پس منظر پوری تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے تعلیمی پروگرام اور ثقافتی سرگرمیاں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے دور کے تحت انجمن کے پانچ دور، دستور میں تبدیلیاں، الزامات، دستور کی اسکیم، ایم سیلرز ہو چپ چلڈ تک اور گرلس اسکول ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ تیسرا دور کے تحت لڑکیوں کی تعلیم، ثانوی گرلس اسکول، صابو صدیق جماعتوں میں اضافہ، دو گرلس اسکول نا کافی عمارت اور صابو صدیق اسکول کا ذیلی عنوان کے ذریعہ تفصیلات دی گئی ہیں۔ چوتھے دور میں اسی تعلیمی ادارے کے ذریعہ قائم کئے گئے لڑکے اور لڑکیوں کے مختلف ہائی اسکولوں اور ٹیکنیکل اسکولوں کے ساتھ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ پانچویں دور کے تحت انجمن اسلام کی نئی تشکیل، نیا دستور، چند خصوصی رفقاء، انتظامیہ، ٹرسٹیوں کا اسکاٹ بورڈ کی رکنیت، ڈپلومہ، ڈگری اور سرٹیفیکٹ کورسز کے علاوہ دیگر نئے منصوبوں کا احوال ہے اور یہ تمام اہم کام اور منصوبے ہندوستان کی آزادی تک کے ہیں۔ داستان کے عنوان سے بعد میں جو تبدیلیاں آئیں اور کام ہوئے ان کی تفصیل ہے۔ اس طرح انجمن کی صد سالہ کارگزاریوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔

کتاب کا حصۂ دوم جائزہ وتجزیہ پر مشتمل ہے۔ اس میں انجمن کے خصوصی نوعیت کے موضوعات کا جائزہ جیسے تعلیم نسواں، تعلیمی پالیسی، انجمن اور اردو، دیگر خدمات، سیاست سے تعلق، فلاحی اسکیمیں اور بعض اہم تقریبات کا ذکر کیا گیا ہے انجمن کے معمار کے عنوان سے پوری ایک صدی کے ان خاص خاص لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے انجمن کے مقاصد کو آگے بڑھانے اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ ان میں شخصیات بھی ہیں، عہدے داران بھی، کارکن بھی ہیں، مدرسین بھی اور منتظمین بھی۔ چونکہ یہ ایک طویل ترین فہرست ہے اور ان سب کا ذکر بھی وقت طلب لہٰذا صرف چند ناموں ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات کے علاوہ دس ضمیمے بھی پیش کئے گئے ہیں جن میں انجمن سے متعلق بعض اہم اسناد اردو اور انگریزی کی درج ہیں اور اعداد وشمار دئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ اپنی نوعیت کی ایک ایسی تاریخی دستاویز بن گئی ہے کہ جسے تعلیمی اداروں اور تعلیمی کاموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی مفید ٹھہرے گی۔

انجمن اسلام کے موجودہ صدر ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا کی سرپرستی میں صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے اور یہ اہم کتاب اسی صد سالہ جشن کا ایک تعمیری کارنامہ ہے۔ صفحات ۲۳۶۔ قیمت ۲۵ روپے سن اشاعت اپریل ۱۹۸۶ء۔ پتہ: انجمن اسلام، بدرالدین طیب جی مارگ، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱۰۰۰۰۱

پریم چند اور مضامین پریم چند
کچھ نئے تحقیقی گوشے

مانک ٹالا اردو کے معروف افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں افسانوں کے کئی انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ ادھر چند برسوں میں ان کا رخ تحقیقی کاموں کی طرف بھی ہوا ہے۔ ان کا موضوع پریم چند ہیں اور پریم چند پر جس علمی نوعیت کا کام انہوں نے کیا ہے وہ پریم چند شناسی میں اضافہ ہی ہے۔

پریم چند اردو اور ہندی کے وہ قدآور افسانہ نگار تسلیم کئے گئے ہیں جنہوں نے افسانے کو ایک سیاموڑ ہی نہیں دیا بلکہ اپنے ہم عصروں اور بعد کی نسلوں کے لئے راہیں بھی روشن کیں۔ مختصر افسانے کی ابتدا کا مطلب پریم چند ہی ہیں۔ پریم چند ایک بڑے افسانہ نگار ہی نہیں ایک اہم ادیب بھی تھے۔ اردو میں لکھنے کے ساتھ ہی انہوں نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کیا تھا اور یہی بات بعد میں بحث کا موضوع بنی اور اردو ہندی کی طرح دو مخالف سمتیں ان کے لئے کام کرنے لگیں اور شعوری طور پر غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں۔ اس انتہا پسندانہ رویوں نے ایک بڑی شخصیت کو جو رنگ دینے شروع کئے اس کی پیش بندی کرنا بھی ناگزیر ہو گیا تھا ورنہ یہ سلسلے کچھ دور جا کر ایک ایسا پہاڑ بن جاتے کہ اسے اپنی جگہ سے ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ مانک ٹالا نے ایسے ہی غلط رویوں اور تحریروں کے خلاف علمی وتحقیقی جہاد کیا اور پریم چند کی شخصیت وفن کو صحیح تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی بھرپور سعی کی جو اس کتاب سے ظاہر ہے۔

کتاب میں جو ۱۶ مضامین شامل کئے گئے ہیں ان کے عنوانات ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مانک ٹالا نے کس ژرف بینی سے پریم چند کا مطالعہ کیا ہے۔ پریم چند پر بعض بالکل نئے گوشے بھی ابھر کر آئے ہیں۔ تمام مضامین تحقیقی دلائل، مواد اور معلومات کا آئینہ خانہ ہیں جو پریم چند پر کام کرنے والوں کے لئے بھی مفید ٹھہریں گے۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت ۴۵ روپے۔ سال اشاعت ۱۹۸۶ء پتہ: مانک ٹالا، اے۔۱۰ امین سیڈ اپارٹمنٹس، پالی ہل کھار، بمبئی ۵۶

○ **محمود سعیدی — ایک مطالعہ** — اطہر فاروقی نے اردو کے نامور معتبر شاعر محمود سعیدی پر ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں وہ گیارہ مضامین شامل کئے گئے ہیں جو مختلف رسائل میں محمود صاحب پر تحریر کئے گئے تھے۔ کتاب میں مضامین، ایک خاکہ اور دو انٹرویو دئے گئے ہیں۔ صفحات ۱۹۸، قیمت ۳۰ روپے۔ پتہ: علامہ اقبال کلچرل سوسائٹی ۲۷۱ رسالداران اسکندرآباد ۲۰۳۲۰۵ یو۔پی

○ **الف تماشہ** — ہند وپاک کے معروف مزاح نگار نریندر لوتھر کے ۱۷ مضامین کا نیا مجموعہ۔ اس سے قبل دو کتابیں ہند کو اور مزاحیہ برسی شائع ہو چکی ہیں۔ کتاب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا گراں قدر مقدمہ بھی شامل ہے صفحات ۱۷۴، قیمت ۶ روپے پتہ۔ زندہ دلانِ حیدرآباد، ۷ بیچلرز کوارٹرس معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد۔۱

○ **نقد ونظر** [خواجہ منظور حسین نمبر] پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی ادارت میں شائع ہونے والے ششماہی رسالے کا ایک اہم خصوصی شمارہ معروف استاد اور نقاد خواجہ منظور حسین پر ترتیب دیا گیا ہے شخصیات پر شائع ہونے والے ضخیم نمبروں اور کتابوں کے درمیان ایک علمی وادبی نوعیت کا کام جس میں ۶ طویل مضامین، خواجہ صاحب کی تحریروں سے اقتباسات۔ خواجہ صاحب کے تراجم میں سے ایک روسی کہانی کا ترجمہ۔ خواجہ صاحب کی تین کتابوں پر تفصیلی تبصرے اور مرتب نقد ونظر کے نام آئے ہوئے خطوط دئے گئے ہیں۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات قیمت ۲۰ روپے پتہ: پروفیسر اسلوب احمد انصاری، بزمِ اقبال، گلفشاں، سول لائنز، دودھ پور، علی گڑھ

○ **عکس ریز** — اسرار اکبرآبادی کا اولین شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ کلاسیکی روایت کے محور پر عصری حسیت کا خوب صورت اظہار۔ غزلوں اور آزاد وپابند نظموں کے تخلیقی جواہر پارے۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۲۰ روپئے۔ پتہ: سرکار بک ڈپو، کلکٹریٹ روڈ۔ آگرہ یو پی

نظام ٹرسٹ کی طرف سے خدا بخش ایوارڈ فنڈ کو پچاس ہزار روپے

پٹنہ۔ ——— نظام ٹرسٹ نے جو پرنس مکرم جاہ کی سربراہی میں قائم ہے خدا بخش لائبریری کے قائم کردہ خدا بخش ایوارڈ فنڈ میں پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم کا عطیہ دیا ہے۔ ایوارڈ کے فنڈ میں اس سے قبل ناشاکی طرف سے ایک لاکھ روپے کا عطیہ موصول ہو چکا ہے۔ گورنمنٹ آف بہار نے بھی ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا ہے امید ہے کہ سال کے آخر تک دس لاکھ کا منصوبہ پورا ہو جائے گا۔ جس کے بعد اگلے سال کے آغاز سے لائبریری ایوارڈ دینا شروع کردے گی۔ یہ ایوارڈ جیسا کہ اعلان ہو چکا ہے ہندوستان کی تاریخ، قرون وسطیٰ، مشرق وسطیٰ کی تاریخ وتہذیب، وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا کی تہذیب وتاریخ، عربی فارسی، روداد جات، طب یونانی، تقابلی مذاہب، علوم اسلامیہ کے احیا میں اعلیٰ پایے کے کاموں پر دیے جائیں گے۔

اردو اخبارات کا چوتھا مقام

ہندوستان میں شائع ہونے والے مختلف زبانوں کے اخبارات میں تعداد کے لحاظ سے اردو اخبارات اور جریدوں کا چوتھا مقام ہے۔ سب سے زیادہ اخبارات یعنی ۵۹۳۶ ہندی میں شائع ہوتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر ۳۸۴۰ اخبارات انگریزی میں ۱۵۵۵، اخبارات بنگالی میں اور ۱۴۳۵ اخبارات اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ اس امر کا اظہار رجسٹرار آف نیوز پیپرز کی ۲۸ویں سالانہ رپورٹ میں کیا گیا ہے جو پریس آف انڈیا ۱۹۸۴ء کے عنوان سے اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت شری وی این گیڈگل نے لوک سبھا میں پیش کی ہے۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کی تشکیل نو

بمبئی۔ ——— حکومت مہاراشٹر نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے اردو اکادمی کے نئے بورڈ کی تشکیل کی ہے جس کے ممبران وعہدیداران حسب ذیل ہیں:

صدر: وزیر اعلیٰ مہاراشٹر ایس بی چوان

نائب صدر: ڈاکٹر ظ۔ انصاری

اراکین: جناب سید احمد (وزیر مملکت ہاؤسنگ وماحولیات)، جناب علی سردار جعفری (بمبئی) جناب کیفی اعظمی (بمبئی) جناب مجروح سلطانپوری (بمبئی) جناب مقبول سلیم (مانڈلی) جناب ستیو مادھو راؤ پگڑی (بمبئی) ڈاکٹر آدم شیخ (بمبئی) ڈاکٹر منشاء الرحمن منشا (ناگپور) جناب ودیا دھر گوکھلے (بمبئی) پروفیسر غلام دستگیر شیخ (پونہ) جناب قاضی سلیم (اورنگ آباد) جناب فاروق اے ظفر علی (بھیونڈی) جناب عبدالخالق قاضی (امراؤتی عثمان آباد) جناب ونایک راؤ جادھو (اورنگ آباد) پروفیسر تسنیم پٹیل (امرا پور مالیگاؤں) محترمہ فاطمہ انیس (بمبئی) جناب انیس احمد خاں (امراوتی) اور جناب شفیع قریشی (مانڈلی)۔

چین میں اردو

اردو والوں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اب چین میں بھی ایک اردو رسالہ شائع ہو رہا ہے۔ چین شہر نانکنگ میں مقیم چند پاکستانی طلبہ نے "فکر نو" نامی ایک ماہنامے کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے یہ رسالہ ۱۹۸۲ء سے باقاعدہ طور پر شائع ہو رہا ہے اور اس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر ایوب مرزا، سجاد حیدر، ملک مظہر الاسلام اور قتیل شفائی شامل ہیں۔ فیض احمد فیض بھی اس رسالے کے لیے اپنی غزلیں اور نظمیں روانہ کرتے رہے تھے۔

آندھرا کے اردو اخبارات سر فہرست

ملک میں اردو کے سب سے زیادہ اخبار آندھرا پردیش سے شائع ہوتے ہیں اس امر کا انکشاف پریس رجسٹرار کی تازہ ترین ۲۸ویں سالانہ رپورٹ میں ہوا ہے جو حال ہی میں چھپی ہے۔ اور جس میں ۱۹۸۳ء کے اعداد دیے گئے ہیں۔ اس سال آندھرا پردیش کے اردو اخباروں کی کل تعداد ۲۶۹ تھی اس اولیت کی بدولت ریاست نے وہ امر از واپس حاصل کر لیا ہے جو ۱۹۸۰ء میں اتر پردیش نے اس سے چھین لیا تھا اور پھر تین سال تک اسے اپنے

اس مقابلہ کے حتمی نتائج سامنے آجائیں گے۔ ان نتائج کی بنا پر شمال اور جنوب کی اردو صحافت کی قوت کی برتری کا فیصلہ ہوگا۔ آج ملک کے چاروں خطوں کی اردو صحافت میں شمالی ہند کے بعد دوسرا مقام جنوبی ہند کو حاصل ہے۔ جنوبی ہند کی چار ریاستوں میں سے کیرل کو چھوڑ کر باقی تین ریاستوں سے اردو کے اخبار شائع ہوتے ہیں جن میں آندھرا پردیش کا حصہ اسی فیصد ہے۔ فی الحال یہ امر قابل توجہ ہے کہ بہت سے اخبار پریس رجسٹرار کو اپنے سرکولیشن کے بارے میں اطلاع مہیا نہیں کرتے۔ ۱۹۸۳ء میں آندھرا پردیش کی ۲۶۶ کی مجموعی تعداد میں سے ۱۳۳ یعنی نصف تعداد نے اپنے اعداد وشمار مہیا نہیں کیے۔ ماہناموں میں اکثریت ہفت ناموں کی تھی جن کے ۱۰۱ میں سے ۸۲ نے اپنے اعداد مہیا نہیں کیے۔ آندھرا پردیش میں ہفت روزوں کی اکثریت ہے لیکن کسی ایک کی بھی تعداد دس ہزار کو نہیں چھو سکی۔ پندرہ روزہ جریدوں میں سے کسی ایک کا سرکولیشن بھی دو ہزار سے نہیں بڑھ سکا۔ ماہناموں میں سے کوئی ایک بھی پانچ ہزار تک نہیں پہنچ سکا۔ البتہ اردو روزناموں میں کم از کم چار ایسے روزنامے تھے جن کا سرکولیشن دس دس ہزار سے زیادہ تھا۔

قبضے میں رکھا۔ ۱۹۸۳ء میں اتر پردیش کے اردو اخباروں کی مجموعی تعداد ۲۶۳ تھی۔ اردو صحافت کے میدان میں شمال اور جنوب کی ان دو نمائندہ ریاستوں کا مقابلہ ایک عرصے سے خاموشی سے چل رہا ہے۔ اپنے کوائف کے لحاظ سے یہ مقابلہ خاصا بے جوڑ ہے اتر پردیش کی آبادی تمام ریاستوں میں اول نمبر پر ہے اور یہ ریاست اردو صحافت کی نشو ونما میں بھی منظم ترکردار کی دعویدار ہے۔ دوسری طرف آندھرا پردیش ملک میں آبادی کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے اور یہ ۱۹۷۰ء تک اردو صحافت کا کوئی اہم مرکز نہیں تھا لیکن اب پچھلے دس سال سے اس اکھاڑے میں برابر زور دار کر رہا ہے اور اس مقابلے میں کئی بار اپنے حریف کے اوپر ہو گیا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک چار برس اس کے اردو اخباروں کی تعداد اتر پردیش سے زیادہ رہی۔ یہ مقابلہ سرکولیشن کے میدان میں بھی گرم رہتا ہے اس بات میں ۱۹۸۳ء میں اتر پردیش نے آندھرا پردیش کو مات دے دی ہے۔ اتر پردیش کے تین لاکھ ۲۰ ہزار کے مجموعی سرکولیشن کے مقابلے میں آندھرا پردیش کا مجموعی سرکولیشن اس کے اخباروں کی تعداد زیادہ ہونے

کے باوجود تین لاکھ ۴۳ ہزار یعنی اتر پردیش سے ۱۹ ہزار کم تھا۔ ۱۹۸۳ء میں یو۔ پی کو عددی برتری حاصل تھی لیکن سرکولیشن آندھرا کے تین لاکھ ۹۲ ہزار کے مقابلے میں تین لاکھ ساٹھ ہزار یعنی تین ہزار کم تھا۔ ۱۹۸۰ء میں اتر پردیش کو تعداد اور سرکولیشن دونوں کے لحاظ سے آندھرا پردیش پر سبقت حاصل تھی۔ اندازہ ہے کہ آئندہ دس سال تک ———

دہلی کے پولس ملازمین کے لیے اردو کورس

نئی دہلی ——— دہلی پولس نے ان کانسٹیبلوں کو اردو پڑھانا شروع کر دیا ہے جو اردو کورس پڑھنے کے لیے رضاکارانہ طور پر تیار تھے۔ دہلی پولس میں بہت سے ریکارڈ اردو میں ہیں اور چونکہ اردو داں عملے کی تعداد میں تیزی سے کمی آرہی ہے اس لیے ان ریکارڈوں کو پڑھنے میں دشواری کا سامنا ہے اس زیر تربیت کانسٹیبلوں کے پہلے جتھے سے خطاب کرتے ہوئے ایڈیشنل کمشنر آف پولس (سیکورٹی) مسٹر گوتم کول نے کہا کہ اردو کوئی مرتی ہوئی زبان نہیں ہے۔ دہلی میں آباد لوگوں کا ایک بڑا حصہ اردو جانتا ہے۔ دہلی پولس میں اس وقت موجود اردو داں عملے کی ریٹائرمنٹ ۱۹۹۲ء تک طے ہے۔

"حال ہند" کا اجرا

دہلی۔ ۲۳ اگست کو نئی دہلی میں وزیر اطلاعات جناب وی۔ این۔ گیڈگل نے ایک اردو ماہنامے "حال ہند" کی رسم اجرا ادا کی۔ اس رسالے میں سیاسی، ادبی اور علمی مضامین شامل ہیں۔ رسالے کے چیف ایڈیٹر ڈی۔ ڈی۔ ٹھاکر، ایڈیٹر جناب داس احمر اور منیجنگ ایڈیٹر مہراج ورما ہیں۔ آفسیٹ پر انتہائی خوبصورت اور پرکشش ماہنامہ پہلی بار شائع ہوا ہے۔ کروڑوں اردو داں عوام ملک کے حالات وواقعات کے مختلف پہلوؤں سے ناآشنا نظر آتے ہیں۔ ملک کی ترقی کے لیے اس وقت ایسے رسالے کی ضرورت ہے۔ توقع ہے یہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملک کی اقتصادی سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کی غمازی کرے گا۔

تین ماہانہ رسائل کی اشاعت کا فیصلہ

حیدرآباد۔ ——— آل انڈیا ینگ رائٹرس اکیڈمی کی جانب سے اس سال کے اختتام سے قبل تین ماہانہ رسائل کی اشاعت عمل میں آئے گی۔ یہ بات بانی صدر اکیڈمی جناب سید فاضل حسین پرویز نے بتائی۔ وہ اکیڈمی کے منتخب عہدیداروں کے اجلاس سے مخاطب تھے۔ جناب پرویز نے بتایا کہ آل انڈیا ینگ رائٹرس اکیڈمی کی جانب سے ملک کے پہلے اردو اسپورٹس میگزین ماہنامہ کھیل کے میدان سے کی ماہ ستمبر کے پہلے ہفتے سے اشاعت کا آغاز ہوا جبکہ ماہ نومبر سے "بچوں کا ڈائجسٹ" اور ایک ادبی ماہنامے کی اشاعت عمل میں آئے گی۔ یہ ادبی ماہنامہ مکمل طور پر نوجوانوں اور نئے قلم کاروں کا ترجمان ہوگا۔ ماہ دسمبر کے اواخر میں اکیڈمی ایک "جنرل نالج" بک شائع کرے گی جو اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہوگی۔ آل انڈیا ینگ رائٹرس اکیڈمی کی شاخیں آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور کرناٹک کے ۴۳ مقامات پر قائم کی جا چکی ہیں۔ جبکہ دہلی، بمبئی، کلکتہ، کانپور، الہ آباد، مدراس، رام پور، بھوپال، بجنور، روڑکیلا اور دوسرے شہروں میں اکیڈمی کی شاخوں کا عنقریب قیام عمل میں آئے گا۔ اس سلسلے میں مرکزی اکیڈمی کی جانب سے ممبر شپ فارم فراہم کیے جائیں گے جو دفتر اکیڈمی ۵/۲۸۲T، سعید آباد کالونی حیدرآباد کے پتے سے بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس نیشنل لکچرر

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر قمر رئیس کو سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے "نیشنل لکچرر" کے اعزاز سے سرفراز کیا ہے پروفیسر قمر رئیس اس سال کے دوران ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں لکچر دیں گے اور وہاں قیام کر کے طلبہ اور اساتذہ سے اردو زبان وادب کے مسائل پر تبادلہ خیالات کریں گے۔

صدارتی ایوارڈ

نئی دہلی۔ امسال صدر جمہوریہ کی جانب سے سرٹیفکٹ آف آنر پروفیسر نور الحسن انصاری (فارسی)، انسر العدول فیاض الدین حیدر (فارسی) پروفیسر عبدالستار خاں (عربی) پروفیسر عبدالحلیم ندوی (عربی) اور سنسکرت کے دس فاضلوں کو عطا کیے گئے ہیں۔ یہ سرٹیفکٹ عربی، فارسی اور سنسکرت کے دانشوروں کو دیا جاتا ہے جس کا اعلان یوم آزادی کے موقع پر ہوتا ہے۔

✿

رفت

جلد ــــ ۵۷
شمارہ ــــ ۹-۱۰

فون ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

۱

زرِ سالانہ ۴۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاحیات خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی

اُردو اکادمی دہلی

اردو مصنّفین اور شعرا کی

ڈائریکٹری

اُردو کے موجودہ ہندوستانی مصنفین اور شعرا کی کوئی ایسی ڈائریکٹری نہیں ہے جس سے ضروری سوانحی معلومات فراہم ہو سکیں اردو اکادمی دہلی نے اس کی اشاعت کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس سلسلے کا بیشتر کام ہو چکا ہے اور ڈائریکٹری عنقریب پریس کے حوالے کر دی جائے گی جن مصنفین اور شعرا نے (جن کی کم از کم ایک کتاب شائع ہو چکی ہو) ابھی تک ڈائریکٹری فارم پُر کر کے روانہ نہ کیا ہو وہ پندرہ دن کے اندر اندر ذیل کے پتے پر خط لکھ کر فارم منگوالیں۔ یا سادہ کاغذ پر ذیل کی معلومات لکھ کر سکریٹری اردو اکادمی دہلی کو بھجوا دیں۔

(۱) نام / قلمی نام (۲) والد کا نام (۳) تاریخ پیدائش مع جائے پیدائش (۴) مکمل پتہ (۵) تعلیم / ڈگری (۶) مشاغل، ملازمت وغیرہ (۷) تصانیف مع سنہ اشاعت (۸) اعزازات، انعامات وغیرہ۔

فارم یا معلومات بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ / جنوری ۱۹۸۷ء

سکریٹری، اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خلیلُ الرحمن اعظمی نمبر کی اشاعت کے بعد

شخصیات پر

"شاعر" کے فقیدُ المثال نمبروں میں ایک اضافہ اور

غیاث احمد گدّی نمبر

ممتاز افسانہ نگار کی شخصیت اور فکر و فن پر ایک اہم ادبی دستاویز

شاعر کی آئندہ اشاعتوں میں

تفصیلات ملاحظہ کیجیے۔

احتجاج و طلب کے اسلوب کو بدلیے

ایک روشن حقیقت یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہے۔ ہماری گفتگو مایوسیوں سے مملو ہوتی ہے اور ہم تمام تر خامیوں کی آگاہی کے باوجود اسی عمل کو بہتر جانتے ہیں جو ہم کر رہے ہیں۔ ہم اپنی زبان کے مسائل سے واقف ہیں، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نئی نسل اپنی زبان کے رسم الخط سے ناواقف ہوتی جا رہی ہے۔ اس تلخ حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ آج کوئی بھی زبان معاشی مسائل سے جڑے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ ہم اس امر سے بھی واقف ہیں کہ فروعی مسائل میں الجھنے کو ترجیح دینے کے پس پشت ہمارے مقاصد کچھ اور ہیں۔ ہم اپنی زبان اور اس کے ادب کو علاقائی زبانوں کے مسائل، سرکاری احکامات اور اعداد و شمار کے پس منظر میں دیکھتے ہوئے دوسرے، تیسرے درجے کا کام سمجھتے ہیں۔ نہ ہمارے ادب کی گونج ہے اور نہ ہی ہمارے کاموں کی۔ اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخی روایت ہو یا پھر ملک کے بنیادی مسائل کے حل میں ہماری زبان کا کوئی اہم کردار رہا ہو، اس کی کوئی اہمیت کبھی بن ہی نہیں سکتی۔ آپ کتنے ہی ذہین کیوں نہ ہوں اگر اردو بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں تو آپ کی ذہانت آپ ہی میں بجھ جائے گی آپ کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا یا پھر آپ ان گروہی لوگوں میں پھنس جائیں گے جو زبان و ادب کے ٹھیکیدار ہیں۔ ادب کے تمام معاملات جن کے زیر اثر ہیں کیوں کہ ان کے پاس وسائل ہیں یہ وسیع تر تعلقات رکھتے ہیں، انہیں مصنوعی مسائل پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انعامات و اعزازات کہاں کہاں سے مل سکتے ہیں اور انھیں کن اپنوں میں تقسیم ہونا ہے۔ ضمیر فروشی کا بازار گرم ہے لہٰذا غیر جانبداری کے ساتھ سانسیں لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ با اختیار لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کی زبان باقی رہے گی یا نہیں۔ ہر سمت تعصب کا الاؤ روشن ہے اور نمایاں ہے۔ سیاسی بازی گر کھلے ہوئے دھوکے اور نت نئی پرکشش کرتب بازیوں کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں اور ہم اردو والے "ادب برائے ادب" "تخلیق کار" اور انا کے تنگ دائروں سے باہر ہی نہیں نکل پا رہے ہیں۔ ہماری آج کی ضرورت نہ تو ادب ہے اور نہ ہی ادبی سرگرمیاں۔ ہمارا اہم ترین مسئلہ تو یہ ہے کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت ہو اور ہمارا رسم الخط باقی رہے۔

سوال یہ ہے کہ عمل کی صورتیں کیا کیا ہوں ایک بات تو بہت صاف ہے کہ آج کے تناظر میں عمل کی وہ تمام صورتیں فرسودہ ٹھہریں گی جو اب بے اثر ہوتی جا رہی ہیں۔ مثلاً جلسے جلوس، دستخطی مہم، کاغذی مطالبے، احتجاج، مانگیں، درخواستیں وغیرہ۔ سرکار کچھ نہیں کر سکتی سوائے اس کے کہ کسی صوبے میں کوئی اردو اکاڈمی بنا دے اور اس صوبے کے تمام اہم اردو والوں کو بہت سے غیر ضروری کاموں میں الجھا دے کہ چھوٹے چھوٹے محاذ بناؤ اور مصروف ہو جاؤ اور ہم سب پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ہماری اردو اکاڈمیوں نے اور زبان و ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا ہے۔ جب تمام اہم لوگ ایک ہی کام میں مصروف ہو جائیں جو طے شدہ طریقہ کار کے تحت ہو رہا ہو تو نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔

عمل کی نئی صورتیں بہت نئی بھی نہیں ہیں، بارہا ان کا ذکر ہوتا رہا ہے، امکانات پر بھی غور کیا گیا ہے، ضرورت اور اہمیت کو شدت کے ساتھ ناگزیر سمجھا گیا ہے مگر تحریر و تقریر کی حد تک، عملی روپ نہایت ہی غیر واضح اور کمزور سا ــ

- نئی نسل سے اردو رسم الخط کا تعارف، بہ طورِ خاص ان لوگوں میں جو بڑی عمر کے ہیں اور اردو سیکھنے کے خواہش مند ہیں۔
- اپنے بچوں کو رسم الخط سے آشنا کرنا چاہے وہ کسی بھی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں ــ
- احتجاجی سطح پر کسی تحریک کے ذریعہ اردو کا نفاذ سرکاری و غیر سرکاری دفتروں میں، بینکوں میں، ریلوے، پوسٹ آفس وغیرہ میں اردو میں دستخط کرنے سے درخواستوں تک، تمام شعبوں میں۔ قدم قدم پر اردو کا عملی استعمال ناگزیر کر دیا جائے۔ اس طرح ذریعۂ معاش کے امکانات روشن تر ہو جائیں گے۔
- اردو ذریعہ تعلیم ایک بنیادی ضرورت ہے، اس کا رشتہ اقتصادیات سے جڑنا چاہیے، اس طرح تعلیمی اور معاشی سطح پر زبان کا بہتر فروغ ہو سکے گا۔
- اردو زبان کے بنیادی مسائل کو سمجھتے ہوئے اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے جب کہ ہو یہ رہا ہے کہ اردو کے نام پر کام کرنے والے مختلف سمتوں اور گروہ میں تقسیم ہو کر بکھر گئے ہیں۔ پورے ملک کے لیے ایک بڑی تنظیم کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

بڑھتی ہوئی خوش فہمیوں پھیلتی ہوئی غلط فہمیوں اور تضادات کی مایوس کن فضا بندی کے باوجود یہ طے ہے کہ اردو کا دوسرا نام ہندستانی ہے اور ہندی کے فروغ میں اردو ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے اور رابطے کی زبان ہندستانی میں اردو کے الفاظ اور اسی زبان کا لہجہ غالب ہے ریڈیو اور ٹی وی کی زبان چاہے کچھ بھی ہو۔
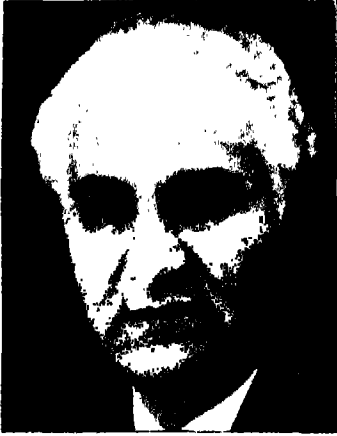
بہ صورت گر

علی جواد زیدی — فضا ابن فیضی — اختر سعید خاں

خلش بڑودوی — ظہیر غازی پوری — اختر امان
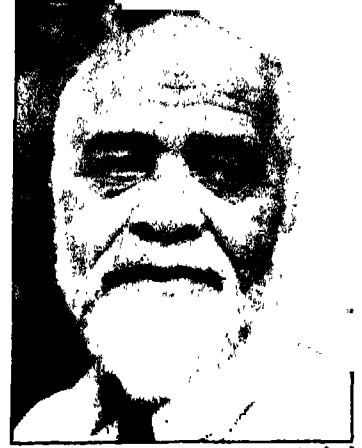
اکبر حمیدی — ہیرانند سوز — افتخار امام صدیقی
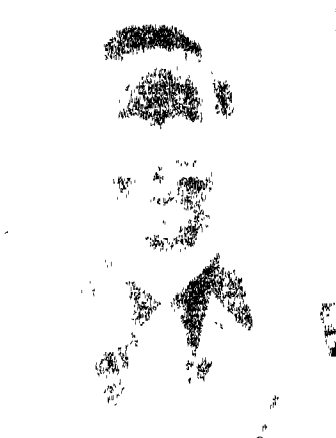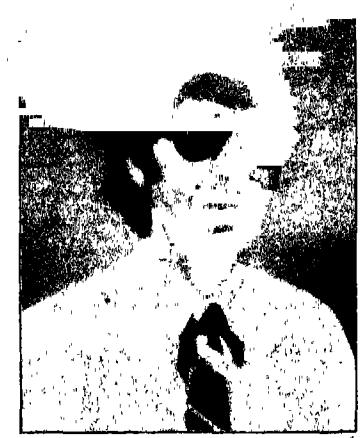
حامدی کاشمیری • ایک نظر میں

نام ○ حبیب اللہ

قلمی نام ○ حامدی کاشمیری

پیدائش ○ ۲۹ جنوری ۱۹۳۲ء

مقام ○ بہوری کدل، بازار مسجد، سری نگر، کشمیر

تعلیم ○ ایم۔اے [انگریزی] ایم۔اے [اردو] آنرز [فارسی] گولڈ میڈلسٹ ڈگری [انگریزی تدریس] پی۔ایچ۔ڈی [اردو]

ملازمت ○ لیکچرار انگریزی [۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء] سری پرتاپ کالج، سری نگر۔ اسسٹنٹ سکریٹری [۱۹۵۹ء ــــ ۶۰] اکاڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، جموں کشمیر، لکچرار اردو [۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۴ء] شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر ـــ ریڈر، اردو [۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۸ء] شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر ــ پروفیسر اردو [۱۹۷۹ء سے تا حال] شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، سری نگر ـــ صدر، شعبۂ اردو [۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۰ء] کشمیر یونیورسٹی، سری نگر ـــ صدر شعبۂ اردو [۱۹۸۴ء سے تا حال] کشمیر یونیورسٹی، سری نگر ـــ

تصانیف ○ افسانوں کے مجموعے ـــ وادی کے پھول [۱۹۵۷ء] سراب [۱۹۵۹ء] برف میں آگ [۱۹۶۱ء]

ناول ○ بہاروں میں شعلے [۱۹۵۶ء] پگھلتے خواب [۱۹۵۷ء] اجنبی راستے [۱۹۵۸ء] بلندیوں کے خواب [۱۹۶۱ء]

تنقید ○ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات [۱۹۶۸ء] معقول کردار داری [۱۹۶۰ء] غالب کے تخلیقی سرچشمے [۱۹۶۲ء]

نئی حسیت اور عصری اردو شاعری [۱۹۷۴ء] اقبال اور غالب [۱۹۷۸ء] ناصر کاظمی کی شاعری [۱۹۸۲ء]

حرفِ راز [اقبال کا مطالعہ ۱۹۸۳ء] کارگہہ شیشہ گری [میر کا مطالعہ ۱۹۸۲ء]

شاعری ○ عروسِ تمنا [۱۹۶۱ء] نایافت [۱۹۷۸ء] لاحرف [۱۹۸۴ء]

انعامات ○ عروسِ تمنا، بلندیوں کے خواب، غالب کے تخلیقی سرچشمے، اقبال اور غالب، نایافت، ناصر کاظمی کی شاعری، کارگہہ شیشہ گری، حرفِ راز [اقبال کا مطالعہ] پر جموں کشمیر کلچرل اکاڈمی، اتر پردیش، بنگال، اور بہار اردو اکاڈمیوں کے انعامات ـــ

اعزازات ○ کشمیر یونیورسٹی سنڈیکیٹ ـــ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ـــ کشمیر ڈکشنری بورڈ ـــ سینٹرل کمیٹی کلچرل اکاڈمی ـــ مشاورتی بورڈ دوردرشن سری نگر ـــ اردو کمیٹی ـــ این سی۔ای۔آر۔ٹی کی ممبرشپ ـــ

ادارت ○ مدیر 'بازیافت' [شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کا جریدہ] شیرازہ (سری نگر) کے مدیر اعزازی رہ چکے ہیں

افرادِ خانہ ○ معرہ مریم [شریکِ حیات] مسعود عالمگیر اور صبا [بچے]

حامدی کاشمیری تصویروں میں

میر سیمنار کے سلسلے میں منعقدہ مشاعرے میں حامدی کاشمیری اپنا کلام سناتے ہوئے

(دائیں سے) سردار جعفری عالم خوندمیری اور حامدی کاشمیری
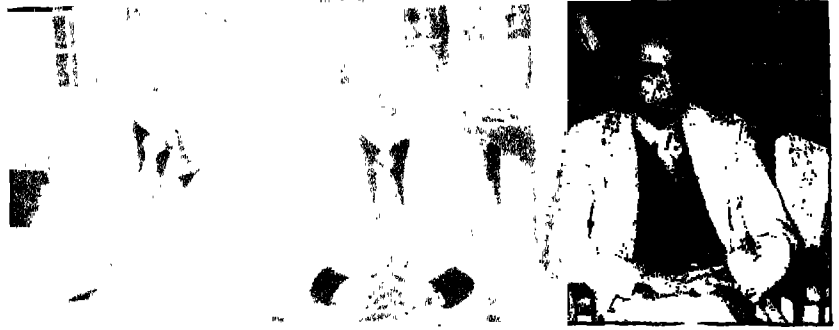
(دائیں سے) آل احمد سرور، سردار جعفری، حامدی کاشمیری، شمس الرحمٰن فاروقی، اسلوب احمد انصاری، بشیر اختر اور چمن لال چمن

حامدی کاشمیری۔ ایک ادبی سیمنار میں مقالہ پڑھتے ہوئے، سامنے کی صف میں تا۔ انصاری۔ آل احمد سرور، جمیل جالبی اور خورشید الاسلام بیٹھے ہوئے

جوگندر پال

۲۰۴ - مندا کنی انکلیو، الکاجی - نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

اُس طرف کا آدمی

حامدی کاشمیری کو دیکھ کر بے اختیار کشمیر کے پہاڑوں کا خیال آنے لگتا ہے۔ خاموش، ہمودی، وابستہ اور زرخیز، اس لئے جب کبھی وہ میدانوں میں آنکلتا ہے تو ہماری دلّی بھی اپنے چھٹپن کے باوجود دیرفضا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں آبادی کی کثرت سے پیدا شدہ مسائل کا ایک حل شاید یہ بھی ہے کہ یہاں کے لوگ حامدی کاشمیری کے مانند کھلے کھلے ہوں اور ان کے توسط سے انسانی روابط کے امکانات کی توسیع ہوتی رہے۔ دل بڑے ہوں تو چھوٹی جگہوں کے رقبوں میں بھی وسعت نظر آتی ہے۔

اہلِ محبت عام طور پر بے احتیاط ہوتے ہیں لیکن کاشمیری کو میں نے کبھی بے احتیاط بھی نہیں پایا۔ اس کی شخصیت پہلی ہی نظر میں اپنے ٹھہراؤ، احتیاط اور وقار کے باعث اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ دوڑ دوڑ کر عجلت میں محبت کرنے والے لوگ ابھی ابھی آپ سے محبت کر رہے ہوتے ہیں اور ذرا نامعلوم کہاں غائب ہو جاتے ہیں، مگر جس طرح پہاڑوں کا قیام آپ میں بھروسہ پیدا کرتا ہے بعینہٖ کاشمیری کی رفاقتوں کا ٹھہراؤ آپ کو اطمینان دلاتا ہے کہ جب آپ کا پاؤں کہیں پھسلے گا تو وہ نہایت محبت بھری احتیاط سے آپ کو تھام کر کسی محفوظ گھاٹی پر لا بٹھائے گا۔ اس کا تجربہ مجھے یوں ہوا کہ ایک دفعہ میں نے اپنی فیملی کے ساتھ گرما کے دو ایک ماہ سری نگر میں بتانے کی ٹھان لی۔ وہاں ہم جا تو پہونچے لیکن ہمارے بجٹ کی پھسلن میں خدا کا یہ نیک بندہ اگر ہمیں ہاتھ نہ دیتا تو ہم اس چڑھائی پر سے جو گرتے تو واپس نئی دہلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اپنی ہڈیاں ڈھونڈ رہے ہوتے۔ بھائی نے ہمارا گاڈ فادر بن کے بڑی خاموش مستعدی سے ایسے انتظامات کر دئے کہ ہمیں اپنا وہی بجٹ نصف سال کے قیام کیلئے کافی معلوم ہونے لگا۔ پہاڑ تو ہمیں سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے راستہ دیتے ہی رہتے ہیں، ہم ہی ذرا سے میں دم توڑ دیتے ہیں۔

حامدی کاشمیری کے چہرے پر بھی پہاڑی موسم کا سماں بندھا رہتا ہے۔ بادلوں میں کتنی ہی گھن گرج کیوں نہ ہو۔ ان میں جا بجا دھوپ کے تار اٹکے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ ناراضگی میں بھی مسکراتا رہتا ہے اور اس عالم میں اتنا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ناراضگی کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا، یا پھر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناراضگی کے اسباب کی شناخت کی صلاحیت سے عاری نہیں۔ ایک دن اردو کے بعض مشہور نقادوں کی گروہ بندی، خیانت، تساہل اور کند ذہنی کا ذکر کرتے ہوئے خلاف توقع وہ دھماکے کی طرح پھٹنے لگا۔ پہلے تو مجھے تعجب ہوا، اور پھر خوشی، اور میں ایک محفوظ کونے میں کھڑا انتظار کرنے لگا کہ اب بھولے شو کا تانڈو بھی دیکھنے میں آجائے گا مگر اپنی اس دھماکو حالت میں وہ اچانک سنبھل کر اپنے معمول کے خنداں دھیرج سے گویا ہوا، ہو سکتا ہے مجھے ان لوگوں کو سمجھنے میں دھوکا ہوا ہو ——— شوجی کے تانڈو ناچ کی خبر پا کر ایک عام آدمی نے شکایت کی تھی، شو کو اس لئے غصہ آجاتا ہے کہ وہ ہمیں کہیں اونچائیوں پر کھڑا ہو کر دیکھتا ہے۔ اگر اسے بھی اونچائیوں سے نیچے آکر ہمارے ساتھ جینا پڑ جائے تو شاید وہ ہم جیسا بھی نہ ہو پائے۔ کاشمیری بھی ایسے موقعوں پر اپنے آپ کو تانڈو ناچ شروع کرنے سے روکے ہوتا ہے اور اپنی ہمدردانہ فہم کی آڑ میں مسکرائے جاتا ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ حامدی کاشمیری ایک نقاد ہونے کے ناطے بے لاگ پرکھ سے احتراز کرتا ہو۔ اس کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس کی تنقید کا پیرایہ مہذب ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ سامنے والے کو اس کے مہذب تنقیدی پیرائے کے پیشِ نظر ڈسِ آرم ہوئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ سات آٹھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک ٹیلی ویژن انٹرویو کے دوران میرے فن کے بعض پہلوؤں کی تعریف کرتے ہوئے اس نے اپنے کسی اعتراض کو اتنے علائم التزام سے پیش کیا

کہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہی رہ گیا۔ اس کے بیان میں مجھے ٹھا۔ ٹھانا ئی دیتی تو میں دفاع کا کوئی اقدام کر پاتا۔ ہمارے ان جنٹلمین کریٹک کا نہایت مؤثر ہتھیار اس کا نیچرل کمپوزر ہے جسے کھو دینے کی وہ کسی صورت بھی اپنے آپ کو اجازت نہیں دیتا۔

انہی دنوں اس نے مجھے بتایا کہ وہ اردو ادب میں نئے تنقیدی لہجوں پر تنقید کا ایک پروجیکٹ ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ کاوش نہ صرف اس کے کھرے پن کے شواہد فراہم کرے گی بلکہ اس کے اس کام سے ہمارے ادب میں مہذب تر منصفانہ تنقیدی اظہار کے باب بھی کھلیں گے۔ کاشمیری کو بخوبی علم ہے کہ ججمنٹ بذاتِ خود کسی جج کے خود پارسائی کے عمل سے عبارت ہے۔ ججمنٹ میں حیات پرور آنچ اس وقت ہی بھر آتی ہے۔ جب لٹریری جج تخلیق کار کے کرب میں شریک ہونے پر آمادہ ہو۔

حامدی کاشمیری کی ناقدانہ اہلیت میں یقیناً اس کی پیشہ ورانہ استعداد کا بھی ہاتھ ہوگا (وہ اردو ادب کا استاد ہے) مگر اس سے بڑھ کر اس کے تنقیدی شعور میں فنی ضمیر کا وہ ادراک بھی کام کرتا ہے جو وہ پہلے افسانہ نگار اور پھر ایک شاعر کی حیثیت سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ تخلیقی شرکت، نیک نیتی کو روزمرہ کی خوشگوار عادتوں میں کلچر کرنے میں ملکہ، اور پھر شیئر ہارڈ ورک اور کمیٹمنٹ ـــــــ اپنی ذات کے انہی اجزا کی مدد سے وہ اپنی تکمیل کا جویا ہے۔ علم و ادب اس کے نزدیک مجرد اشیا نہیں: وہ علم و ادب کے حصول کو انسانی رشتوں سے عہدہ برآ ہو پانے کے انعام کے مترادف گردانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب لکھتا اور پڑھتا پڑھاتا بھی ہے اور ادب جیتا بھی ہے ـــــــ تخیلی اور عملی وارداتوں سے یکساں رویے روا رکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ محسوس کرنے اور جینے کی متضاد کیفیتوں سے زندگی کرنے کے آداب میں ایک مضحکہ خیز اور غیر فطری پن کی صورت کھڑی ہو جاتی ہے اور اس طرح آدمی بے چارہ دانستہ طور پر اوروں کو دھوکا دیتے ہوئے غیر دانستہ طور پر اپنے آپ کو ہی دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری جس طرح قدروں کو اپنی علمی بحثوں میں لاتا ہے، اسی طرح انہیں جیتا اور بھوگتا بھی ہے اور یوں اس کے ایمان کی سلامتی کی وجوہ میں انحطاط واقع نہیں ہوتا۔

اگر ہمیں بتایا جائے کہ جنت میں بعض پیارے دوستوں سے ملاقات ہوگی تو ہمارا جی چاہتا کہ مر کر بھی وہاں پہنچ جائیں۔ کشمیر کی ارضی جنت کے تصور سے جہاں میری آنکھوں میں اس کی برف میں ڈھنپی ہوئی چوٹیاں، سرسبز باغ اور گنگناتے جھرنے گھوم جاتے ہیں وہیں وادی کے کئی پیارے لوگ بھی سامنے آ جاتے ہیں اور جمگھٹے میں نظریں حامدی کاشمیری کو بھی ڈھونڈنے لگتی ہیں ـــــــ وہ ہے! ـــــــ وہ اپنے مقام پر تو عین بین مقامی ہوتا ہے مگر جب اس سے کشمیر سے باہر کہیں ملنا ہو جائے تو لگتا ہے کہ کوئی ندی ڈھلانوں پر سے میدانوں میں بہہ آئی ہے اور یہاں کے جغرافیائی ماحول میں یہیں کے مانند آباد ہو گئی ہے۔ میرے سننے میں آیا ہے کہ پہلے پہل انسان بھی ندیوں کی طرح پہاڑوں سے ہی وارد ہوئے تھے خدا کا شکر ہے کہ قدرت کا یہ فیاض عمل ابھی تک جاری ہے۔ ❁

بقیہ صفحہ ۱۵ حامدی کاشمیری دھندلکوں کا شاعر

کہ حامدی کاشمیری ان دھندلکوں کے شاعر ہیں، جو شعری تخلیق کو طلسمی رنگوں سے آباد کرتی ہے۔

حامدی کاشمیری کے اس بیان سے مجھے پوری طرح اتفاق ہے کہ "ہر عہد میں شعر شناسی صرف چند ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے"، لیکن اس عہد میں جو شعر شناس ہیں، مجھے ان سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ میں خود ہرگز اپنے آپ کو اس صف میں شامل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ پھر بھی حامدی کی شاعری کے بارے میں دو تین باتیں عرض کرنے کی جسارت کی ہے۔ حامدی کے کلام کی "شعر شناسی" میں مجھ سے غلطیاں ہونے کا امکان کچھ زیادہ ہی ہے۔

پھر حامدی نے "لاحرف" میں "عرضِ حال" کا اختتام غالب کے ایک مشہور فارسی شعر سے کیا ہے:

دور باش از ریزہ ہائے استخوانم اے ہما — کایں بساطِ دعوتِ مرغانِ آتش خوار است

وہ شعر شناس جو "مرغانِ آتش خوار" کے زمرے میں آتے ہوں، خال خال ہیں۔ حامدی نے شاعری کی جو بساط سجائی ہے، اسے "مرغانِ آتش خوار" مزید ملیں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے، کیوں کہ کسی شاعر کی شاعری کا فوری طور پر مقبول ہو جانا اس کی کامیابی کی دلیل نہیں ہے۔ ❁

بلراج کومل

ای - ۹۳۱، کالکاجی نئی دہلی

حامدی کاشمیری کی شاعری

"عروسِ تمنا" حامدی کاشمیری کا پہلا مجموعۂ کلام تھا "نایافت" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اور "لاحرف" ۱۹۸۴ء میں۔ اپنے تخلیقی سفر کے زیر و بم میں حامدی کاشمیری نے "شعلہ و سیماب" بننے کا خواب بارہا دیکھا ہوگا اور تعبیروں کے ہجوم میں شاید کبھی کبھی اداس بھی ہوگئے ہوں گے۔ ہر شاعر اور فنکار کی طرح حامدی کاشمیری کے ردِعمل کی کچھ بنیادی خصوصیات ہیں۔ سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عصری حقیقتوں کو جذب کرنے کے باوجود انسان کی بنیادی جبلتوں اور عناصر کی آمیزشوں کے تماشائی ہیں۔ فطرت کو اس کے ان گنت رنگوں میں دیکھتے ہیں۔ اور بصری، حسّی تجربوں میں سے گذرتے ہوئے لفظ و معنی کے ماورائی آفاق تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

حامدی کاشمیری کی نظمیں پڑھتے ہوئے میں عجیب و غریب پراسرار کیفیات سے دوچار ہوا ہوں۔ اکثر نظموں میں پیش کردہ منظریات کا نیم شبی کا منظر ہے۔ کھنڈر، کالے بلے، مٹی کی خجل دیواریں، گورکن، گھائل پرندے، لہو کے سرخ اچھلتے سمندر، وحشی عریاں آوازیں، کالی سنگین دیواریں، برف کے گالے، سر پر منڈلاتے گدھ، رات کے اس منظر سے ہیولوں اور شبیہوں کی صورت میں ابھرتے ہیں اور حواس و احساسات کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ حامدی کاشمیری کے ہاں فطرت کا روپ غالب انداز میں مخاصمانہ ہے۔ اور انسان خاک و خون کے پیرہن میں محبوسِ سفر ہر لمحہ ناگزیر طور پر فطرت سے متصادم ہے۔ حامدی کاشمیری کی نظمیں نام اور عنوان کی تشریحات سے اکثر گریز کرتی ہیں۔ جزئیات و کیفیات و تفصیلات کا انتہائی کفایت سے استعمال کرتی ہیں اور تیرہ پیکروں کو "شعلہ رنگ" کرنے کے لئے مصروفِ کار نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں کربِ اظہار خواہشِ تشدد سے مماثل ہے اور لوری کی طرح موت کی وساطت سے حصولِ ماورائیت کے لئے بے قرار ہے۔

فصیلِ سنگ میں محصور کف بلب حبشی
اب انتظار ہے کیا؟
بدن کے آر پار کر دو
دہکتی ہوئی سلاخوں کو
لہو کے سرخ اچھلتے سمندر میں
اچھال دو مجھ کو
بس ایک پل کے لئے
تیرہ پیکر کو
شعلہ رنگ کر دوں

[کربِ اظہار]

تمام رات
ہوا تیز چلتی رہی
سمندر رُت کی بپھرتی سیاہ لہروں نے

اسے اچھال دیا ریگ زارِ حل پر
وہ اس کی رحم طلب آنکھیں، ہانپتے شعلے
اجاڑ چہرے پہ کائی جمی
بدن دلدل
نہ جانے کون ہے
کھڑکی کو بند ہی کر لو۔۔
بکھر بکھر گئیں پرچھائیاں
بے ثمر اشجار
جگہ جگہ سے چلے مشتعل جلوسوں میں
مرے مکاں پہ وہ چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے
چھناکے، کرچیاں، کراہیں، سکوتِ بے پایاں
سحر کے گھاؤ بدن پر شمار کرتا ہوں۔

______________ [سحر کے گھاؤ]

تیرہ راتوں کو سرد بستر میں
نیند جب دیر تک نہیں آتی
کالی دیواروں سے نکلتا ہے
اک عجب اژدہام آنکھوں کا
سانس لینا محال ہوتا ہے

______________ [آنکھیں]

حامدی کاشمیری کے ہاں جزئیات وتفصیلات کا نوکیلا پن مجتمع ہونے کی منزل پر معنوی ایمائیت کے ابر میں تلاشِ آفتاب کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری اردو شاعری کے غالب رویہ یعنی عمومی طرزِ اظہار کے شاعر ہرگز نہیں ہیں وہ فی الواقعہ کہنے SAYING کی بجائے کرنے RENDERING اور آزادانہ تجسیم کاری کے شاعر ہیں۔ نظم وغزل۔ دونوں اصناف میں ان کا رویہ یکساں طور پر کارگر ہے۔ لیکن غزل میں تجسیم کاری کا عمل اکثر وبیشتر عمومی طرزِ اظہار سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری رفتہ رفتہ نظم کے مقابلے میں غزل کی جانب ملتفت شاید اس لئے ہوتے گئے ہیں کیونکہ وہ تجسیم کاری کی مختلف النوع جہات کو دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر میں نظم ہی کی طرح وہ ایک کلی تجربے کی بازیافت میں یقین رکھتے ہیں۔ حامدی کاشمیری کی شاعری مسلسل تازہ کاری کا عمل ہے۔ وہ انسانی صورتِ حال کو ہجوم عناصر میں تمام تضادات کے ساتھ قبول کرتے ہوئے بھی اکثر نقطۂ آغاز اور نقطۂ انجام کی مخاصمت کا جبر محسوس کرتے ہیں۔

تم بھلا مجھ سے خفا ہو کے کہاں جاؤ گے　　　شہر کی گلیوں میں اس وقت اندھیرا ہوگا

غزل کا روایتی مقبول طرزِ اظہار مطالبہ کرتا ہے کہ شعر کو تذکیر وتانیث کے جبر سے آزاد کر دیا جائے تاکہ ایمائیت اپنا پورا جلوہ دکھا سکے لیکن حامدی کاشمیری کا مسئلہ چونکہ تجسیم کاری کا ہے اس لئے وہ معنیاتی پیکروں کو انسانی صورتِ حال کے بنیادی تقاضوں کے ساتھ منسلک کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نقطۂ آغاز ہے یا نقطۂ انجام؟ اس سوال کا فیصلہ کن جواب پیش کرنا مشکل ہے لیکن حامدی کاشمیری کا پورا شعری منظر نامہ فسوں کارِ پرکار ہے۔

اتر آئے ستارے کھڑکیوں پر　　　اندھیرا اور گہرا ہو گیا ہے

ان کی غزلوں کے مطلعے بامعنی بولتے ہوئے مطلعے ہیں۔

جتنے طوفان بلا ہیں مرے گھر لے آنا — اے ہوا بحری پرندوں کی خبر لے آنا

ہر دم کو بھی شریک گمرہی کرتے رہے — روشنی میں جستجوئے روشنی کرتے رہے

مرمریں خواب ڈھونڈتے ہو کہاں — کالے ملبے سے اٹھ رہا ہے دھواں

وہ اکثر حسی تجربوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ردعمل کی تجسیم کاری کیلئے مناسب OBJECTIVE CORRELATIVES تلاش کرتے ہیں اور حسی اور ماورائی کیفیات کا انتہائی دلاویز امتزاج پیش کرتے ہیں۔

نیلے سمندروں کی طرح بے کراں کیا — ساحل کی عورتوں میں تو بیشک عظیم ہے

یہ زمیں دیکھنے میں سبز نظر آتی ہے — دو قدم اور چلو سوختہ پائی دے گی

حامدی کاشمیری کے ہاں عام طور پر تجربے کی پہلی سطح بصری یا پھر حواس کے ساتھ غالب طور پر منسلک سطح ہے اس سطح پر ان کے اشعار پہلی نظر میں بیانِ منظر ہیں پھر یکایک ناصر کاظمی کے انداز میں ایک معجزہ ہوتا ہے اور منظر یکایک منور ہو جاتا ہے۔

اسے اپنا نہیں بستی کا غم ہے — کناروں پر اکیلا جاگتا ہے

مقفل گھر کے دروازوں کو کر لو — سمندر خون تشنہ ہو گیا ہے

جسے طے کرنے میں ایک عمر گذری — اسی کوہ گراں کا سامنا ہے

میں سن کے آیا ہوں سرگوشیاں درختوں کی — تمہارے منہ پہ یہ چپ سی لگ گئی کس ڈر سے

توڑ دیں تا جمع زنجیریں تمام — ایک زنجیر طلائی رہ گئی

چپ کی دیوار میں ہوا شگاف — سر پٹکتی رہی کوئی آواز

شور دستک کا بند دروازے — لوگ کہتے ہیں گھر سے باہر ہوں

برف باری کی تیرگی دن کو — رات کو بارش شرر دیکھو

جانے کب سیل رواں بن جائے گی — چاندنی میں رات بھر جاگا کرو

ہو گئے ایک ایک کر کے سب تماشے بے اثر — اب تماشہ ہی تماشہ ہے تماشائی نہیں

حامدی کاشمیری کی نظمیں ان کی غزلوں میں ان کی شخصیت کی توسیع کرتی ہیں اور ان کی غزلیں بھی ٹھیک اسی طرح ان کی نظموں میں ان کی شخصیت کی توسیع کرتی ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں دونوں میں بحری پرندوں، سمندروں، زیر آتش جنگلوں اور دیوار و در کی متکلم تصویریں ہیں۔ ان کا انسان ان کی آویزشوں میں ہی وجود کا تجربہ کرتا ہے فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر۔ طوفان بلا کو لبیک کہتا ہوا۔

جتنے طوفان بلا ہیں مرے گھر لے آنا — اے ہوا بحری پرندوں کی خبر لے آنا

حامدی کاشمیری کی شاعری پورے آدمی کی داستان ہے یا ادھورے آدمی کی۔ یہ سوال بے معنی ہے۔ وہ خاک و خون اور تشدد کے موسم میں عصری حقیقتوں کے بھی اسی شدت سے قائل ہیں جس شدت سے وہ ماورائی تجربوں کے قائل ہیں۔ وہ حواس کی اور خارجی دنیا کی بھی اتنی ہی تنظیم کرتے ہیں جتنی وہ باطنی مدّوجزر کی۔ وہ لسانی اہتمام کے بھی قائل ہیں۔ اور لسانی آزادروی کے بھی۔ حق تو یہ ہے کہ حامدی کاشمیری مسلسل و متواتر نادیدہ نادرہ کار پیکروں کے سفر میں ہیں۔ میں خود بھی شاید اسی سفر میں ہوں۔ اس راہ گذر پر اکثر میری ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

میں اس ملاقات کے تسلسل اور تواتر کیلئے دعا گو ہوں۔

حامدی کاشمیری کی شاعری انتہائی شدید، دلاویز اور تازہ کار شعری ردعمل کی مثال ہے۔ ❁

مظہر امام

ڈائرکٹر دوردرشن، سری نگر (کشمیر)

حامدی کاشمیری : دھندلکوں کا شاعر

حامدی کاشمیری کی شاعری کا سفر پیکریت اور تجسیم کی جانب ہے۔ ان کے یہاں ایک ایسی طلسماتی فضا ملتی ہے جو بہ اک وقت استعجاب انگیز بھی ہے اور دہشت خیز بھی۔ حامدی کی شاعری میں الفاظ کے جدلیاتی استعمال کی ایک شعوری کوشش ملتی ہے۔ وہ لفظیات کے نئے ابعاد کی تلاش میں دور دور تک نکل جاتے ہیں۔ ان کی شعری شخصیت دوسری شعری شخصیتوں سے ٹکراتی نہیں، لیکن ان سے الگ ضرور ہونا چاہتی ہے، اسی لیے حامدی اپنے تجربات اور ان کے اظہار کے لیے الفاظ کے انتخاب میں دوسروں سے متمیز ہونے کی سعی کرتے ہیں، ممکن ہے اس کوشش میں کہیں کہیں الفاظ سے زیادہ غیر رسمی اور خیالات کبھی کبھی گنجلک ہو جاتے ہوں، ممکن ہے ان کا یہ تخلیقی رویہ شعری تاثر پر اثر انداز بھی ہوتا ہو، لیکن اس سے شاعر کی شعری صلابت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

حامدی کاشمیری نے اپنے تیسرے مجموعہ "کلام" "لاحرف" کی ابتدا میں ہی آرکی بالڈ میکلیشن کی دو لائنیں نقل کی ہیں، جن کا مفہوم ہی یہ ہے کہ نظم کو "بے الفاظ" WORDLESS ہونا چاہیئے۔ الفاظ کو "بے الفاظی" عطا کرنے کی کوشش حامدی کی شاعری میں جا بجا ملتی ہے۔ یا جیسا کہ انھوں نے لاحرف کے آغاز میں "عرض حال" کے عنوان سے اپنی شاعری کا موقف بیان کرتے ہوئے کہا ہے،

"الفاظ کا جو بے دردانہ اور مجہولانہ استعمال اردو شاعری میں ملتا ہے، شاید ہی کسی اور زبان کی شاعری میں ملتا ہو۔ اس افسوسناک صورت حال کی بنا پر میں نے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے، جو میرے تجربوں کی لسانی تشکیل کی ممکنہ صلاحیت کو بروئے کار لا سکیں"۔

لسانی تشکیل کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ لسانی تشکیل کے نام پر اکثر شاعروں کے یہاں زبان کی بڑی عجیب و غریب صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ ایسے شاعروں کا نام لینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اردو ادب کا سنجیدہ قاری ان سے واقف ہے۔ حامدی نے لسانی تشکیل کو اتنا بڑا مسئلہ نہیں بنایا، لیکن الفاظ کو ایک دوسری سطح پر برتنے کی کوشش ضرور کی ہے اور وہ اس پل صراط سے بیشتر بہ سلامت گذرے ہیں۔ جی یہ چاہتا ہے کہ وہ لسانی ڈھانچے کی شکست کر کے ... اظہاریت کے نئے امکانات[1]، کی تلاش میں اس طرح کے مصرعے خلق نہ کرتے:

آنکھ میں اپنے ہی ناخن گڑ لیے، اچھا کیا

اس صداقت کا اعادہ غیر ضروری ہے کہ آج کی نسل کے مسائل پچھلی نسل یا نسلوں کے مسائل سے مختلف ہیں۔ آج کی نسل کے مزاج کی تشکیل کئی متضاد اور مخالف عناصر سے ہوئی ہے۔ جرأت اور بزدلی، صداقت اور دروغ، ایمان داری اور فریب، جوش اور بے دلی — ہمارے معاشرے کے تضادات کا اظہار ہیں۔ صنعتی تہذیب کی حشر سامانیوں نے ہمارے جذباتی اور نفسیاتی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے اور امید و یقین کی جگہ تشکیک اور بے یقینی نے لے لی ہے۔ منافقت کا دور دورہ ہے۔ بڑی حقیقتیں اور اعلیٰ اخلاقی قدریں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہیں۔ ہماری نئی یا جدید شاعری میں اس صورت حال کا اظہار نت نئی جہتوں سے ملتا ہے۔ حامدی کاشمیری کی شاعرانہ شخصیت

---

[1] دیباچہ "نایافت": حامدی کاشمیری۔

حساس، سنجیدہ اور مفکرانہ ہے۔ ان کی شاعری میں موجودہ دور کی حشر سامانیوں کا اظہار ایک مختلف زاویے سے ہوا ہے۔ حامدی الفاظ کی معنوی جہتوں سے آشنا ہیں اور فنی اعتبار سے ان کے یہاں تازگی اور جمالیاتی سادگی کا احساس ہوتا ہے: ان کے دوسرے مجموعہ کلام "نایافت" کے یہ چند اشعار:

مرمریں خواب ڈھونڈتے ہو کہاں — کالے ملبے سے اُٹھ رہا ہے دھواں
کر گئے دفن کالے سایوں میں — تنگ گلیوں کے زرد بوڑھے مکاں
ساگر ساگر کالی چپ — ساحل ساحل ہے کہرام
میری جانب سیاہ ہاتھ بڑھے — سائے پتوں کے ہو رہے تھے دراز
وہ کالے ہاتھ ہوا میں دکھائی دیتے ہیں — جو راز سینے میں ہے، جا کے چوک میں کہہ دوں
وہ ہنستے گاتے گھرانے کہیں نہ پاؤ گے — قدم قدم وہی پیلا غبار ہے لوگو!
یک بیک چیخ اُٹھے چار دشاؤں کا سکوت — زرد دن میں بھی ایسا ہو تو پھر کیا ہوگا
آنکھ کے کالے گڈھوں میں وہ گرفتار تھے سب — کس نے گرتے ہوؤں کو ہاتھ سے تھاما ہوگا
شہر کی سڑکوں پہ یہ گھومتے کالے جنگل — گھیر لیں مجھکو ہر سمت تو پھر کیا ہوگا!

ان اشعار میں سیاہ (کالا) اور زرد (پیلا)، دو رنگوں کا استعمال باقاعدگی کے ساتھ ہوا ہے۔ 'سیاہ' دہشت انگیزی اور خوفناکی کی صفت ہے، اور 'زرد' مایوسی اور محرومی کی۔ اس دور کے مزاج کو رنگوں کی مناسبت سے پیش کرنے میں حامدی نے خاصی کاوش کی ہے۔

آج کا انسان جس غیر محفوظیت، ڈر اور خوف کا شکار ہے، اس کا ذکر آج کی شاعری میں عام ہے۔ حامدی کے یہاں بھی یہ موضوعات ہیں، لیکن وہ ان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ یہ موضوعات تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ ان کے تازہ مجموعے "لاحرف" کے یہ اشعار:

روکو نہ میرا راستہ سرسبز جنگلو! — میں دست و پا شکستہ ہوں، پیچھے غنیم ہے
مرے محافظو! خنجر بکف رہو شب بھر — سنا نہیں وہی آواز آئی باھر سے
سبھوں نے بند کیے ان پہ اپنے دروازے — خبر یہ سب کو تھی، لوٹ آئے تھے سمندر سے

دہشت اور خوف سارے احساس پر محیط ہے۔ زندگی غیر محفوظ ہے اور اسے بچائے رکھنے کے لیے انجانے راستوں کی طرف بھاگتے جانا ہے، لیکن کیا غنیم پیچھے ہی ہے، کیا وہ آگے سے وار نہیں کر سکتا؟ اور کیا ان اشعار میں سیاسی مضمرات کی تلاش نہیں کی جا سکتی؟ حامدی جانتے ہیں کہ عصری حسیت کا منظوم بیان شاعری نہیں ہے۔ ان کی شاعری تحیر و تجسس اور خوف و ہراس کے جو مناظر پیش کرتی ہے، اس کی نوعیت سراسر تخلیقی ہے اور باطن کے اضطراب کی پروردہ ہے۔

حامدی کی ایک غزل کے یہ اشعار دیکھیے:

یہ وقوعے تو آسماں کے ہیں — سانحے اور جسم و جاں کے ہیں
آج انھیں پہلی بار دیکھا ہے — کون ہیں یہ، بھلا کہاں کے ہیں
دونوں پاتال میں مقید ہیں — دو ہی کردار داستاں کے ہیں
سایہ سایہ ہے اژدہا صورت — کیا یہ آثار اسی جہاں کے ہیں

کیا یہ ماضی کے ویران کھنڈروں میں رہنے والی روحیں ہیں؟ یا وہ گوشت پوست کے ایسے پیکر ہیں، جو گزرے ہوئے زمانوں کے دھندلکوں میں محوِ خرام ہیں۔ حامدی اس طرح کے سوالات کو "بے جواب" چھوڑ دیتے ہیں، اب یہ قاری کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ ان سوالات کے جواب اپنی ذہنی مناسبت سے تلاش کرے یا شاعر کی بنائی ہوئی پراسرار راہوں پر بھٹکتا پھرے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں

[باقی صفحہ ۱۰ پر دیکھیے]

شمس الرحمٰن فاروقی

۸۵/II ڈی ۔ کالکا جی ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

سوال یہ ہے کہ میر کے نقادوں نے جو باتیں عام طور پر میر کی تعریف یا تفہیم میں کہی ہیں۔ کیا وہ میر کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں؟ یا اگر کافی نہ بھی ہوں تو کیا وہ باتیں میر کو سمجھنے میں ہماری معاونت کر سکتی ہیں؟ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

(۱) ...نازک مزاجی اور خودداری کے ہاتھوں وہ زندگی سے بیزار رہے اور ہمیشہ دکھ درد سہتے اور خونِ جگر کھاتے رہے اور اسی خونِ جگر سے انھوں نے زمینِ شعر کو سینچا جو اب تک تر و تازہ ہے۔

(بابائے اردو مولوی عبدالحق)

(۲) (میر کے) ان اشعار میں خارجی، دل فریب و نظر فریب لوازم کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے ...ان اشعار میں خیال آرائی یا مضمون آفرینی نہیں کی گئی ہے۔ میر کی شاعری کا دھیما پن جس سے حیات و کائنات کے رعب و جلال کا اندازہ ہمیں میسر کراتے ہیں...میر کے لہجے کی نرمی دنیا کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔

(فراق گورکھپوری)

(۳) میر کی شاعری کا پہلا اثر تو ہمارے اوپر یہ ہوتا ہے کہ اپنے دور کے مظالم اور تشددات کے آگے سر نہ جھکاؤ۔ لیکن اس سے زیادہ زبردست اثر جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جو مناسب اور زمانے کے اعتبار سے ممکن ہے کرو لیکن اپنے اندر چھچھورا پن سطحیت اور نروباہگی نہ آنے دو بلکہ بہرحال سنجیدگی، توازن، شائستگی اور سلیقہ قائم رکھو۔

(مجنوں گورکھپوری)

(۴) میر کے ذہن کو المیہ تصورات سے بڑی دل بستگی ہے۔ ان کے نزدیک عشق اور ٹریجڈی لازم و ملزوم ہیں۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

ان جواہر پاروں پر بہترین رائے زنی کے لئے میر کے بعض شعر پڑھتا ہوں ؎

(۱) عاقبت تجھ کو لباس راہ راہ[1] لے گیا ہے راہ سے اے تنگ پوش

(دیوان سوم)

(۲) کیا اس آتش باز کے لونڈے کا اتنا شوق میر بہہ چلی ہے دیکھ کر اس کو تمہاری رال[2] کچھ

(دیوان دوم)

(۳) اس کا بحرِ حسن سراسر اوج و موج و تلاطم ہے شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج (دیوان پنجم)

---

[1] لباس راہ راہ: ایسا لباس جو رنگ برنگ کی پٹیوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہو۔ آج کل اس کو "پٹا پٹی" اور "چٹاپٹی" کہتے ہیں۔

[2] رال: ایک طرح کی گوند جو آتش بازی میں استعمال ہوتی ہے۔

(۴) پرواز گلستاں کے تو شائستہ نہ نکلے — پروانہ نمط آگ ہم اب دیں گے پروں کو

(دیوان دوم)

(۵) کیا جانوں چشم تر کے ادھر دل پہ کیا ہوا — کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی

(دیوان دوم)

(۶) چشم کم سے دیکھ مت قمری تو اس خوش قد کو ٹک — آہ بھی سرو گلستانِ شکستِ رنگ ہے

(دیوان اول)

مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ جس طرح کے اشعار میں نے اوپر نقل کیے ہیں، اس طرح کے سیکڑوں ہی اشعار کلیات میں ملیں گے موجود ہیں اور جو اقتباسات میں نے اوپر درج کیے ہیں ان میں سے کوئی بھی اقتباس مندرج بالا اشعار میں سے کسی بھی شعر پر صادق نہیں آتا۔ جو شخص شعر کو اس طرح برتتا ہو اس کے بارے میں کوئی ایک حکم لگانا، یا دو چار حکم لگانا کہاں تک مناسب ہو سکتا ہے ؟ اور اس پر طرہ یہ کہ اوپر درج شدہ احکام میر کا پورا کلام نہیں بلکہ محض نمونۂ کلام پڑھ کر لگائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر فراق صاحب نے لکھا کہ میر کے اشعار کی تعداد تیس ہزار سے زائد ہے۔ اگر انھوں نے کلیات میر دیکھا ہوتا تو انھیں معلوم ہوتا کہ اشعار کتنے ہیں۔ مجنوں صاحب نے فرمایا کہ میں نے اپنے مضمون میں ہر طرح کے شعر نقل کیے ہیں۔ لیکن ان کے تمام مضمون میں امرد پرستی، پھکڑپن جنسی لطف اندوزی، غصہ اور تلخی، مابعد الطبیعیاتی گہرائی، اس طرح کے مطالب و معانی پر مبنی ایک شعر بھی نہیں ہے۔ میر کا ایک رسمی تصور، ایک مثالی لیکن فرضی پیکر، ہمارے ذہن میں ہے اور ہم اس کو قائم کرنے کی خاطر خود میر سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو ڈاکٹر عبداللہ کو محمد حسین آزاد کے مرقعۂ میر کو رد کرنے کی کوشش میں کئی صفحے نہ خرچ کرنے پڑتے۔ اس رد کی کوشش میں وہ تصوراتی اور تاثراتی باتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کو میر سے اس لیے پرخاش تھی کہ آزاد کا ذہن ان لوگوں سے بالکل مانوس نہیں ہوتا جو افسردہ دل اور گھٹے ہوئے ہوں، وہ ہشاش بشاش، شوخ طبع، ہنسوڑ اور ہنگامہ پرور شخصیتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔" ایسے موقع پر کہنے کا جی چاہتا ہے کہ ذوق کی طرح شوخ طبع، ہنسوڑ اور ہنگامہ پرور؟ سوال یہ ہے کہ آزاد نے میر کے بارے میں جو لکھا ہے وہ غلط ہی سہی، لیکن آپ بھی تو انھیں باتوں کو دہرا رہے ہیں جب آپ میر کو "افسردہ دل" کہتے ہیں اور انھیں شوخ طبع، ہنسوڑ اور ہنگامہ پرور نہیں تسلیم کرتے۔ آخر ان باتوں سے آپ کیا ثابت کر سکتے ہیں ؟

توجب میر کا کلام ایسی چٹان ہے کہ اس سے ٹکرا کر بڑے بڑوں کے سفینے پاش پاش ہوئے اور خود بقول میر؎

تختے پارے گئے کیا جانے کدھر پانی میں

تو ہمارے نئے نقاد، مثلاً گوپی چند نارنگ اور حامدی کاشمیری کس گھاٹ اتریں گے ؟ لیکن ان لوگوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ متواز یعنی میر کا کلام، ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ میر کے فرضی پیکر کے نہیں، بلکہ کلام میر کے طالب اور جویا ہیں۔ فی الحال حامدی کاشمیری کے حوالے سے ایک دو باتیں ہو جائیں۔

"کارگہ شیشہ گری" میر کی شاعری کو اندر سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ یہ میر کے کلام کے لغوی معنیٰ سے زیادہ اس کے داخلی منظر اور اس سے داخلی منظر کی علامتی اور مابعد الطبیعیاتی جہتوں کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ یہ طریق کار مجھے کچھ زیادہ راس نہیں آتا اور اسی لیے میں اس کی اتنی قدر بھی کرتا ہوں، کیوں کہ جو کام میں خود کر سکوں اس کے لیے دوسرے کی ضرورت کیا ہے؟ حامدی کاشمیری کہتے ہیں:

> تنقید اگر تخلیق کے لسانی یا ساختیاتی نظام اس فوری مقصد کے تحت کرنا چاہتی ہے کہ معانی کو سمجھا یا جائے تو یہ عجلت پسندی کی انتہا ہے... ناقد تخلیق کے اندر تشکیل پذیر تخیلی صورت حال میں کردار و واقعہ کے ڈرامائی عمل کو شناخت کرتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اسے لفظ و پیکر کے معانی کو کریدنے کے بجائے ان کے متنوع تلازمات (جو معانی نہیں ہیں) کو حسیاتی گرفت میں لاتا ہے۔

حامدی کاشمیری اس تنقید کو "اکتشافی تنقید" کا نام دیتے ہیں۔ یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ شعر کے معنی سمجھے بغیر، یا ان کو نظر انداز کر کے "طلسم کدوں کے جادوئی دروازوں" کو کس طرح وا کیا جا سکتا ہے اور لفظ پیکر کے "متنوع تلازمات" کیوں کر شعر کے معنی سے الگ وجود رکھ سکتے ہیں۔ حامدی کاشمیری میر کی شاعری میں پنہاں تخیلی کائنات میں حسیاتی اور علامتی پیکروں میں کسمساتے ہوئے نادر الوجود اور حیرت انگیز توقعات" کو دریافت کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بات واضح نہیں کرتے کہ ان کے اس طریق کار میں "تاثراتی" تنقید کے طریق کار میں کیا فرق ہے؟ فراق صاحب بھی تو یہی کہتے تھے کہ میں ان "جمالیاتی، وجدانی، اضطراری اور مجمل اثرات" کو جو میرے کان، دماغ، دل اور شعور کی تہوں پر پڑے ہیں" دوسروں تک اس طرح پہچانا چاہتا ہوں کہ ان اثرات میں حیات کی حرارت و تازگی قائم رہے۔" فراق صاحب اور حامدی کاشمیری میں فرق ہے تو صرف یہ کہ فراق صاحب کی زبان میں وہ کچاپن اور انداز میں وہ خود اعتمادی ہے جو ہمارے زمانے کے پی، ایچ، ڈی اور فراق صاحب کے زمانے میں بی، اے کے طالب علم کی صفت تھا، اور حامدی صاحب نے اتنے بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر بوعلی سینا کو بھی جھرجھری آجائے۔ ہاں "کسمساتے ہوئے" والا فقرہ خالص فراقی ہے۔

خیر یہ باتیں تو تنقیدی طریق کار سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو الگ کر کے دیکھتے ہیں کہ حامدی کاشمیری سے ہمیں میر کے بارے میں کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اکثر نقادوں کے علی الرغم حامدی کاشمیری نے میر کے کلام کو پورا پورا اور اندر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش ہی ایسی بنیادی تنقیدی کارگزاری ہے جس کے لئے ہم سب کو حامدی کاشمیری کا ممنون ہونا چاہیئے۔ دیوان اول میں ایک قطعہ ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

جاگے تھے ہمارے بخت خفتہ ۔۔۔ پہنچا تھا ہم وہ اپنے گھر رات
تھی صبح جو منہ کو کھول دیتا ۔۔۔ ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات
پر زلفوں سے منہ چھپا کے پوچھا ۔۔۔ اب ہووے گی میر کس قدر رات

سب سے پہلے تو حامدی کاشمیری لائق مبارک باد ہیں کہ ان کی نظر اس قطعے پر ٹھہری۔ (ڈاکٹر عبداللہ کا ارشاد ہے کہ میر کے یہاں عشق اور ٹریجڈی ہم معنی ہیں، لہٰذا ان کے خیال میں یہ قطعہ میر کا نہ ہوگا) اب حامدی کو سنیئے:

> روایتی محبوبہ انسانی جذبات سے عاری ہوتی ہے، لیکن اس (قطعے) میں ابھرنے والی ہستی غیر انسانی پیکر نہیں، وہ ایک خوبصورت عورت کی زندہ، شوخ اور طرح دار شخصیت کا احساس دلاتی ہے۔

یہ سب بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہاں اس بات پر بھی غور لازم تھا کہ اس طرح کی "زندہ، شوخ اور طرح دار" شخصیت والا معشوق اصلی عورت ہے یا شاعر کے ذہن کی محض تمنائی امیج ہے؟ اور یہ بھی غور کرنا تھا کہ کیا ایسی شخصیت صرف میر کے یہاں ملتی ہے؟ مرزا علی لطف کا شعر ہے ؎

یہ بھی ہے نئی چھیڑ کہ اٹھ وصل میں سو بار ۔۔۔ پوچھے ہے کہ کتنی رہی شب کچھ نہیں معلوم

ظاہر ہے کہ دونوں مضمون ایک ہیں۔ چونکہ لطف کے ایک شعر کے مقابل میر کا پورا قطعہ ہے، اس لئے امکان ہے کہ میر نے مرزا علی لطف سے مضمون مستعار لے لیا ہو۔ اگر ایسا نہیں بھی ہے تو میر کے قطعے کی معنویت اور خوبصورتی صرف اس بات پر نہیں قائم ہو سکتی کہ بقول حامدی کاشمیری اس قطعے میں معشوقہ کا کردار اردو شاعری کی روایتی محبوبہ کے کردار سے یکسر مختلف ہے۔ اور "یکسر مختلف" اس لئے بھی ذرا مشکل ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک شعر میں (جو میں نے نقل نہیں کیا ہے) "پشت چشم نازک کرنے" کا ذکر ہے۔ پشت چشم نازک کرنے کے معنی ہی ہیں غمزہ کرنا، اور جس طرح زلفوں میں منھ چھپا کر معشوق بات کر رہا ہے اس میں بھی غمزہ اور شوخی کا انداز نمایاں ہے۔ لہٰذا میر کے قطعے کا معنیاتی تجزیہ کیے بغیر اس کا بے نظیر حسن ثابت نہیں ہو سکتا۔

میر کی داخلی دنیا کے بارے میں حامدی کاشمیری کہتے ہیں کہ "یہ خواب کی ایسی دنیا ہے جو حقیقی دنیا کی ہولناک آگہی کو تیز کرتی ہے"۔ میرا خیال ہے میر کے بارے میں ایک جملے میں اس سے بہتر بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن جب وہ اس دنیا کو "آسیب زدہ ذہن کی دنیا" بھی بتاتے ہیں

تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر اس میں معنویت اور کشش کیوں نظر آتی ہے جس کا ذکر وہ اگلی ہی سانس میں کرتے ہیں۔ وہ میر کا ایک شعر نقل کرتے ہیں

ہم ہیں قلندر آ کر اگر دل سے دم بھریں عالم سا آئینہ ہے سیہ ایک ہو کے بیچ

اور کہتے ہیں کہ "یہ ایک قلندر یا ساحر کی انوکھی شخصیت ہے" تو بے اختیار دل چاہتا ہے کہ وہ "عالم سا آئینہ" کی معنویت پر بھی غور کرتے۔ وہ میر کے "مکاشفانہ" لہجے کی بات کرتے ہیں تو دل خوش ہوتا ہے، لیکن پھر وہ پھکڑ میر بھی یاد آتا ہے جو اسی غزل میں بکتا ہے

بحث آپڑے جو لب سے تمہارے تو جب ہو کچھ بولنا نہیں تمہیں اس گفتگو کے بیچ

حامدی کاشمیری کی زبان میں میر تخلیق کے برقی لمحوں میں تخیل کی سایہ گوں وسعتوں میں منور پیکروں کی تخلیق "کرتے ہیں۔ پھر وہ کون سا میر ہے جو آج بھی ہر محلے، ہر گلی میں نظر آتا ہے

چھپ لگ کے بام دور سے گلی کوچے میں سے میر میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

حامدی کاشمیری کو میر کے اشعار "لفظوں کے شعوری التزام، آرائش، صنعت کاری اور تصنع سے دور" معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جو اشعار ان کی کتاب میں بکھرے پڑے ہیں، ان میں سے اکثر کی بنیاد رعایت اور لفظوں کی مناسبت پر ہے۔ حامدی صاحب کہتے ہیں کہ "تکمیل یافتہ شعر اپنے ارتکاز، رخشندگی اور وحدت کی بنا پر گہر کی طرح دمکتا ہے" اور اسی لئے میر نے شعر کے لئے گہر کا استعارہ وضع کیا ہے"۔ میں یہ نہ پوچھوں گا کہ "تکمیل یافتہ شعر" گہر کے بجائے ہیرے یا شبنم کی طرح کیوں نہیں دمکتا، مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ اپنے قول کے ثبوت میں جتنے شعر انھوں نے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کئے ہیں ان سب کی بنیاد رعایت اور صنعت پر ہے اور اس نکتے کو پوری طرح حاصل کئے بغیر ان اشعار کی معنویت آدھی رہ جاتی ہے۔

حامدی کاشمیری نے بہت بنیادی بات کہی ہے کہ میر نے "جو شعری لسانیات تشکیل دی ہے وہ آنے والے شعراء کے لئے سرچشمۂ فیض بن گئی"۔ پھر وہ یہ نکتہ بھی واضح کرتے ہیں کہ "شاعری میں سہل پسندی اس کا کوئی وصف ذاتی نہیں ۔۔۔ ایک اچھا شعر زبان کی سادگی اور روانی کے باوجود ابہام اور معنوی تہ داری کا حامل ہوتا ہے"۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "میر کسی معین یا واضح خیال کا اظہار کرنے کے بجائے ایک مخصوص اور نادر شعری صورت حال کو خلق کرتے ہیں"۔ لہٰذا ان کی رائے میں شعر حقیقت کا وجدانی علم عطا کرتا ہے"۔ کارگہ شیشہ گری" اس طرح کی حکیمانہ بصیرتوں سے بھری پڑی ہے۔ ان بصیرتوں پر مغربی فن تنقید کا اثر ہے، لیکن حامدی اس کے غلام نہیں ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر میر سے بوریت نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اس طرح کا اہتزاز حاصل ہوتا ہے جو وکٹر ہیوگو کو بودلیئر کا مطالعہ کر کے حاصل ہوا تھا۔ ❁

مصرہ مریم

مسعود منزل، بالی گام، میراکاباد، شالیمار، سری نگر (کشمیر)

حامدی گھر میں
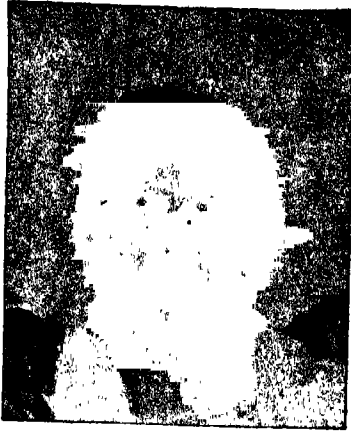
حامدی کی شخصیت کی میرے لئے کئی حیثیتیں ہیں، وہ میرے چہیتے شوہر ہیں، میرے محبوب فن کار، میرے عزیز دوست، میرے شفیق اور غمگسار۔ ایک فن کار کی حیثیت سے جب میں ان کو دیکھتی ہوں تو مجھے ان میں بظاہر شاعروں اور فن کاروں کی سی کوئی بات نظر نہیں آتی ہے۔ لمبے لمبے کھردرے بال، چہرے پر ہفتوں کی بڑھی ہوئی داڑھی، لباس کی طرف سے لاپرواہی، سگریٹ نوشی یا شراب نوشی کی عادت، چائے خانوں اور کافی ہاؤسوں میں وقت برباد کرنا، ذاتی پروپگنڈا کرنا، اپنے ہم عصروں سے رشک اور حسد کرنا، دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کرنا، ان میں سے ان میں کوئی بات نہیں، بلکہ ان کی جو عادتیں اور خصائص ہیں وہ سب کی سب ان کے الٹ ہیں۔ اس کے باوجود وہ میری نگاہوں میں ہمیشہ ایک منفرد اور بلند قامت فن کار رہتے ہیں۔

حامدی خوش وضع، نفاست پسند اور سیدھے سادھے انسان ہیں، ان کی طبیعت میں توازن اور عادتوں میں ستھرا پن ہے۔ وہ تمام تکلفات اور PRETENTIONS سے آزاد ہیں۔ وہ ایک سیدھی سادھی خاموش اور منکسرانہ زندگی گذارتے ہیں۔ روز صبح سویرے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر شیو بناتے ہیں۔ فوراً بعد ناشتہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے کپڑے پریس کرتے ہیں پھر سٹڈی میں جا کر کچھ دیر کے لئے پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں پھر نہا دھو کر یونیورسٹی جانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ روز کا معمول ہے۔ حامدی کو اپنے لباس کا بہت خیال رہتا ہے۔ خاص کر وہ قمیص کے معاملہ میں بہت اہتمام کرتے ہیں۔ سفید رنگ کی قمیص یا بش شرٹ ان کی کمزوری ہے اس زمانے میں بھی جب، جیسا کہ میں نے بارہا سنا ہے، وہ طالب علم تھے۔ روز اپنی قمیص کو دھلوا کر پریس کر کے بڑے چاؤ سے پہنتے تھے۔ وہ بہت صفائی پسند ہیں۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی دیکھنا چاہتے ہیں۔ گھر صاف ستھرا ہو، بیٹھنے کی جگہ، لکھنے پڑھنے کی جگہ صاف ہو۔ اگر کبھی کسی وجہ سے وقت پر گھر کی صفائی نہ کی جائے تو وہ خود جھاڑو ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اس دھمکی میں آکر ہم سب ایک دم مستعد ہو جاتے ہیں۔

بنیادی طور پر حامدی ایک شفیق انسان ہیں۔ وہ حسد یا نفرت کر ہی نہیں سکتے۔ میں ہمیشہ محسوس کرتی ہوں کہ وہ خلوص، محبت اور ایثار کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے دوستوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ لیکن جن کو دوست سمجھتے ہیں، ان سے بہت مخلصانہ اور مشفقانہ انداز سے ملتے ہیں، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ تو دشمنوں سے بھی نفرت یا دشمنی نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ اپنے دشمنوں یا دوست نما دشمنوں کو پہچانتے نہیں ہیں۔ ان کو خوب پہچانتے ہیں۔ ان کے دوغلے پن پر ان کی نظر رہتی ہے۔ لیکن ان سے ہمیشہ مروّت سے ملتے ہیں۔ اور ان کے خلاف دل میں کوئی رنجش یا پرخاش نہیں رکھتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان کے مخالفوں اور بدخواہوں نے انھیں زک پہنچایا، یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے باہر، جسے انھوں نے شدّت کے ساتھ محسوس بھی کیا، لیکن نفرت یا انتقام کا جذبہ ان کے دل میں کبھی پیدا نہ ہوا، کہتے ہیں دشمن سے بدلہ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے محبت سے ملو، انتقام یا نفرت زہر ہے جو ہمارے ہی اعصاب کو مسموم کرتا ہے، اور دشمن کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے مخالفانہ رویّوں سے ان کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے، بلکہ ہر چوٹ کھانے کے بعد ان کا حوصلہ، ان کا عزم اور جذبۂ عمل زیادہ مستحکم ہوتا گیا، ایک دن دوردرشن

لیندرسری نگر سے ایک مشاعرہ پیش ہوا، حامدی میر مشاعرہ تھے، مشاعرے میں ایک بزرگ شاعر بھی تھے، جو حامدی سے عمر میں بہت سینئر تھے، لیکن ترتیب میں حامدی نے ان کے بعد اپنا کلام پڑھا، میں نے حامدی کی توجہ اس طرف دلائی تو انہوں نے کہا جب میں کالج میں زیر تعلیم تھا تو ایک مشاعرے میں مجھ کو مدعو کیا گیا، جس کی نظامت یہ حضرت کر رہے تھے، مشاعرے میں انھوں نے سب کو ایک ایک کر کے پڑھنے کی دعوت دی لیکن میرا نام گول کر گئے۔ مشاعرہ ختم ہوا اور سب چلے گئے اور میں بھی شکستہ خاطر گھر لوٹا۔ لیکن میرے اندر ایک نیا عزم جاگ اٹھا کہ میں اپنے وجود کو منوا کر ہی دم لوں گا۔ اور آج وہ دن آ گیا ہے۔"

حامدی نے اپنی ادبی زندگی کے دوران پیش آنے والی مخالفتوں، حق تلفیوں اور دھاندلیوں کے خلاف کبھی شکایت نہیں کی۔ اس کے برعکس پیہم محنت اور لگن سے کام لے کر اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشتے رہے اور خاموشی سے خانہ نشیں ہو کر اپنی زندگی کے ہر پل کو، ہر سانس کو ادب کے لئے وقف کرتے رہے۔ ان کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آتا، میں جھنجھلا جاتی ہوں، یہ انسان ہیں یا پتھر، معمولی کیڑا بھی محض چھو جانے پر ردِ عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تو لوگوں کے سفاکانہ سلوک پر بھی برا نہیں مانتے، کتنی ہی بار میرے صبر کا پیمانہ چھلکا، میں نے ٹوکا اور جواباً حامدی اپنا فلسفہ بگھارتے رہے۔ "لوگوں سے خیر کی توقع بے جا ہے اس لئے کہ انھوں نے شر پر قابو پانا سیکھا ہی نہیں ہے، میں نے کسی سے کوئی توقع وابستہ ہی نہیں کی ہے تو گلہ کرنے کا کیا سوال ہے۔" سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے قریبی عزیزوں کی ناشائستہ حرکتوں کا بھی شکوہ نہیں کرتے، ہاں اگر میں کبھی کوئی ایسی بات کروں جو ان کی توقع کے خلاف ہو تو بپھر جاتے ہیں اور جھگڑا کرتے ہیں۔ یوں تو شاذ ہی ہوتا ہے مگر ان کا یہ "بگڑنا عتاب میں"، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یہ ان کی شخصیت کی کی نفی کرتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی شخص ان سے اچھائی یا نیکی کرے تو وہ رہ رہ کر حیرت کے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔ ملازمت کے دوران کئی سخت مرحلوں پر بعض صاحب اختیار لوگوں نے خلوصِ دل سے ان کی مدد کی تو وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ ایسے ہی ایک موقع پر گھر آ کر انھوں نے کہا "مجھے حیرت ہے کہ اس شخص نے میرے ساتھ ایسا نیک سلوک کیوں روا رکھا" اور میں ان کی حیرت پر حیران رہ گئی۔

یہ سچ ہے کہ حامدی کسی حد تک مردم بیزار ہو گئے ہیں۔ صرف اس لئے نہیں کہ ان کے لئے "طرز تپاک اہل دنیا" مایوس کن ہے بلکہ وہ انسان کو ایک وسیع فلسفیانہ تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ انسان حیوانی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور تہذیبی ترقی اور مذہبی تعلیمات کے باوجود اس کے خون میں حیوانی خصائص ہیں اور سیاسی اور اقتصادی حالات نے اسے زیادہ ہی سفاک بنایا ہے۔ وہ خود غرضی، لالچ، تنگ نظری اور بے ایمانی کے تحت دوسروں کا گلا تک کاٹنے سے گریز نہیں کرتا۔ قدریں بے معنی ہو گئی ہیں، انسان وحشی ہو گیا ہے" پھر بجھے ہوئے لہجے میں کہتے ہیں "خود حفاظتی کی بس ایک صورت ہے، لاتعلقی، لوگوں سے جس قدر ہو سکے دور رہو" وہ اپنی باتوں پر سختی سے عمل بھی کرتے ہیں۔ ان کا معمول ہے گھر سے یونیورسٹی اور وہاں سے سیدھے گھر لوٹنا، دائیں بائیں دیکھے بغیر گھر میں بھی کسی سے ملنے کے موڈ میں نہ ہوں تو نہیں ملتے ہیں، کئی بہانے تراش لیتے ہیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ صبح ہی سے حامدی شعری موڈ میں تھے اور کسی سے ملنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے گھر میں سب سے کہہ کے رکھا تھا کہ جو آئے کہہ دینا کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ ہوا یہ کہ اس دن ان کے ایک قریبی دوست آ گئے۔ ان سے کسی نے کہہ دیا کہ حامدی صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا میں انتظار کروں گا، ملنا بہت ضروری ہے۔ اور وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ حامدی نے سنا تو سٹپٹا گئے، کریں تو کیا کریں۔ ان کی بے چینی، ندامت اور پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ وہ پچھواڑے کے دروازے سے نکل کر سامنے کے دروازے سے یوں آئیں، جیسے ابھی ابھی آئے ہیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا، بعد میں اپنے موڈ پر ان کو بہت افسوس ہوا۔ اب جو بھی گھر آتا ہے اس سے مل لیتے ہیں۔ لیکن آگا پیچھا دیکھے بغیر اپنے گھر لوٹنا ان کی عادت ہے، جس میں کسی تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا۔ ان کے کئی دوستوں نے مجھ سے پوچھا "آپ کے گھر میں ایسا کیا ہے جو حامدی صاحب بھاگ کے سیدھے گھر جاتے ہیں"۔ میں انھیں کیا سمجھاتی کہ

حامدی کے لئے گھر پناہ گاہ ہے وہ کہتے ہیں "گھر میری جنت ہے"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انسانی رشتوں سے مایوس ہیں۔ البتہ اس وسیع اور لاتعلق کائنات میں انسان کی حیثیت، جسے موت کی غارت گری، فطرت کی سفاکی اور سماجی استحصال نے بے معنیٰ اور مضحکہ خیز بنایا ہے، انھیں تشویش میں مبتلا کرتی ہے۔ اور وہ انسان کے عظیم کارناموں یعنی تسخیر کائنات وغیرہ کو بھول کر زندگی کی بے معنویت کے قائل ہو جاتے ہیں اور ان کا کرب وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں جذباتی رشتوں، گھریلو نشاط، مناظر کی دلکشی اور شعور کی روشنی کا شدید احساس ان کے لایعنیت کے رویّے سے ٹکراتا ہے۔ یہ کرب ان کی زندگی میں بھی ہے اور ان کی شاعری کے متحرک پیکروں اور شبیہوں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

ان کی سیمابی طبیعت کبھی کبھی مجھے پریشان کرتی ہے۔ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر انھیں کہیں قرار نہیں۔ گھر میں کبھی ان سے زیادہ دیر تک ایک جگہ بیٹھا نہیں جاتا۔ سمینار میں اپنا مقالہ پڑھیں گے تو پھر وہاں ان سے ایک لمحہ بھی بیٹھنا ممکن نہیں۔ مشاعرہ پڑھیں گے تو فوراً رفوچکر ہو جائیں گے۔ ایسے لمحوں میں وہ تکلفات اور آداب محفل کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ان کی اس عادت سے اب ان کے دوست احباب بھی واقف ہو گئے ہیں اور انھیں پابہ زنجیر کرنے کے لئے آخر میں پڑھواتے ہیں۔ حامدی جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے، طبیعت ہی انہوں نے ایسی پائی ہے۔ کبھی کسی رشتہ دار کے یہاں جانا ہو تو گھر میں ہی مجھ سے کہتے ہیں "دیکھو پانچ دس منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھنا ورنہ میں تم کو وہیں چھوڑ کے چلا آؤں گا۔ تم عورتوں کی باتیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی ہیں"۔ چنانچہ وہ عزیز و اقارب کے یہاں دس پندرہ منٹ گزارنے پر فوراً کھڑے ہوتے ہیں اور بلا تامل روانہ ہو جاتے ہیں۔

کم گوئی حامدی کی عادت ہے چند ضروری باتیں کر لیتے ہیں اور بس، گھر میں بھی غیر ضروری باتیں نہیں کرتے ہیں۔ نہ کسی کی شکایت نہ مخالفت، نہ غیبت، نہ کسی پر تبصرہ نہ تنقیص۔ ہاں بات ہوتی ہے تو اپنے بارے میں، اپنے گھر، اپنے بچوں، اپنے لکھنے پڑھنے کے بارے میں سب سنجیدگی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں لیکن اس سنجیدہ فضا کو حامدی ہی اپنے زوردار قہقہوں سے توڑتے بھی ہیں۔ ان میں مزاح اور شرارت بھی بہت ہے۔ باتوں باتوں میں فقرے چست کرتے ہیں یا اچانک کوئی مزاحیہ بات کہہ جاتے ہیں یا فی البدیہہ مزاحیہ شعر کہتے ہیں یا کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں کہ گھر زعفران زار بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں "میں چاہتا ہوں تم لوگ ہر وقت ہنستے رہو" بچوں سے تو بالکل ایک دوست کی طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ سختی اور درشتی تو ان کو چھو کر بھی نہیں گئی ہے۔ ان کو غصّہ بہت کم آتا ہے۔ لیکن جب آتا ہے تو بہت شدید ہوتا ہے۔

گھر میں کسی مہمان کی آمد آمد ہو تو حامدی بہت خوش نظر آتے ہیں اور گھر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ گھر میں زیادہ تر ادیب شاعر ہی آتے ہیں۔ باہر سے آنے والے بیشتر ادیب اور شاعر حامدی سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ میں نے اکثر ادیبوں کو کہتے سنا ہے کہ کشمیر کی سیاحت حامدی کاشمیری سے ملے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسے موقعوں پر رات دیر گئے تک گھر ایک ادبی محفل میں بدل جاتا ہے۔ شاعری اور ادب پر گفتگو اور مباحثے ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر حامدی کی کم گوئی اور کم آمیزی عنقا ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی شدت سے محو گفتگو ہوتے ہیں اور اپنی بات کو استدلالیت سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حامدی کی شخصیت میں تضاد ہے۔ ایک طرف وہ بے حد مضبوط، قوی اور مکمل طور پر آزاد شخصیت کے مالک ہیں، ایک کوہ گراں، کسی بھی آفت یا مصیبت کا خاموشی سے ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کے تحمل اور قوت برداشت کو دیکھ کر میں حیران ہو جاتی ہوں اور کبھی کبھی چڑ بھی جاتی ہوں۔ اور دوسری طرف وہ کسی وقت باد مخالف کے معمولی جھونکے سے تھر تھر کانپ جاتے ہیں۔ بارہا ان کی آنکھوں میں میں نے آنسو دیکھے ہیں۔ ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور زار زار روتے ہیں۔ کبھی کبھی شعر پڑھتے ہوئے یا کسی المیے واقعہ کو یاد کرتے ہوئے یا کسی دلخراش منظر کو دیکھ کر اشکبار ہو جاتے ہیں۔

ان کی بے صبری سے مجھے اکثر وحشت ہوتی ہے۔ میں نے ان جیسا جلد باز اور بے صبرا انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔ جو منہ سے نکلے ایک دم ہونا چاہیئے۔ ان پر کوئی بھی دھن سوار ہو جائے تو اسی کے ہو کے رہ جاتے ہیں اور جب تک وہ کام نہ کریں نہ خود چین کا

سانس لیتے ہیں اور نہ دوسروں کو لینے دیتے ہیں۔ انتظار کھینچنا ان کے بس کی بات نہیں۔ وقت کی پابندی بھی غالباً ان کی جلد بازطبیعت ہی کی وجہ سے ہے۔ کہیں جانا ہو تو آدھ گھنٹہ پہلے تیار ہو جائیں گے میں حیران ہو جاتی ہوں کہ ایسے موقعوں پر ان کی معقولیت اور استدلالیت کہاں غائب ہو جاتی ہے۔

ادیبوں اور شاعروں کے لکھنے کے انداز جداگانہ ہوتے ہیں۔ حامدی کا لکھنے کا ڈھنگ بالکل منفرد ہے۔ وہ لکھتے وقت کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے اور نہ ہی مکمل خلوت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اکثر سب کی موجودگی میں لکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ سردیوں کی چھٹیوں کا انھیں خاص طور پر انتظار رہتا ہے۔ برف و باراں کے دنوں میں بخاری سے گرم کمرے میں وہ دنیاو مافیہا کو بھول کر لکھنے میں مستغرق ہو جاتے ہیں اور باقاعدگی سے کسی موضوع پر کام کرتے ہیں حامدی کا شعر ہے:

فصلِ مہتاب اُگنے لگی دل میں　　　　وہی تاریک سینے آئے

کسی ادبی شخصیت پر لکھنا ہو تو پہلے اس کی جملہ تخلیقات کا بھرپور مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر اپنے تاثرات اور خیالات کو قلم بند کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس ادبی شخصیت کے بارے میں دوسرے اہم نقادوں کی آرا کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کوئی نکتہ یا خیال جس کا پہلے ہی کسی نے اظہار کیا ہو، حامدی اسے اپنے مضمون یا کتاب میں پیش نہیں کریں گے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے موضوع کے بارے میں کسی نئے پہلو یا گوشے کو سامنے لائیں۔ مسودے کو دو تین بار دیکھتے ہیں اور اس کی مناسب ترمیم و تہذیب کرتے ہیں۔ خود اپنے لکھے کو ایک ناقد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور پھر چھاپنے کے لئے بھیجنے سے پہلے مجھ کو پڑھنے کے لئے ضرور دیتے ہیں۔ حامدی شروع میں مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔ انہوں نے کہانیاں، ناول، ڈرامے، تبصرے اور منظوم فیچر لکھے۔ لیکن اب وہ زیادہ تر تنقید لکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان کا میلان شاعری کی طرف ہے۔ اور شاعری ان کی روح ہے۔ اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی انہوں نے شاعری ہی سے کیا ہے۔ شعر لکھنے کا موڈ ہو تو حامدی استغراق اور خود رفتگی کی کیفیت میں ڈوب جاتے ہیں۔ بظاہر وہ سب معمول کا کام کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کا سارا وجود تخلیقی شعلگی کی زد میں رہتا ہے۔ ایسے لمحوں میں وہ گھر میں تکیے پر سر رکھتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور بیچ بیچ میں اُٹھ کر کاغذ کے کسی پرزے پر شعر لکھ لیتے ہیں۔ شعری کیفیت میں حامدی کا ذہن پیدل چلتے ہوئے زیادہ فعال ہوتا ہے وہ شام کو اکیلے گھومنے کے لئے نکلتے ہیں اور ہشاش بشاش گھر لوٹتے ہیں اور فوراً قلم کاغذ لے کر اشعار لکھتے ہیں۔ یہ شاعرانہ موڈ کبھی ہفتوں اور مہینوں تک رہتا ہے کبھی دن میں دو غزلیں بھی ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی ایک شعر بھی کئی دنوں تک اٹک جاتا ہے اور جب موڈ کافور ہو جاتا ہے تو دوسرے کاموں کی طرف لگ جاتے ہیں۔

لکھنا پڑھنا حامدی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ میں نے گھر کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لی ہوئی ہیں اور ان کو مکمل طور پر آزاد رکھا ہے۔ گھر، والدین، بہن بھائیوں، رشتہ داروں کی ذمہ داریاں، بچوں کی پڑھائی، دنیاداری، یہ سب کچھ میں خود سنبھالتی ہوں۔ پچھلے دس بارہ سال سے زیادہ ہی حامدی اپنے ادبی کاموں میں ڈوبے رہے یوں کہنا چاہیئے یہ زمانہ ان کی بے خبری اور خود فراموشی کا تھا۔ اس عرصہ میں انہوں نے "غالب کے تخلیقی سرچشمے"، "نئی حسیت اور عصری اردو شاعری"، "اقبال اور غالب"، "کارگہ شیشہ گری"، "ناصر کاظمی کی شاعری"، "جدید کاشمیری شاعری"، "حرف زار"، جیسی گراں قدر کتابوں کے علاوہ کئی اہم تنقیدی مضامین لکھے۔ مزید برآں "نایافت" اور "لاحرف" دو نئے شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔

حامدی نے ایک مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ شروع میں وہ نماز روزہ کے سخت پابند تھے اور مسجد میں اذان دیا کرتے تھے ان کے والد صاحب ان کو بچپن میں صبح سویرے اٹھا کر اپنے ساتھ مسجد اور خانقاہ میں لے جایا کرتے تھے اور یہ عادت جوانی تک قائم رہی۔ علی الصباح قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا کہ حامدی نے کئی برسوں تک نماز ادا نہیں کی۔ ایک بار ہم تولاب گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھے سہ پہر کو میں رات کا کھانا تیار کرنے میں لگی اور حامدی باہر گھومنے نکلے کام سے فراغت پا کر میں باہر نکلی میں نے دیکھا کہ وہ ایک سرسبز قطعۂ زمین پر نمازِ عصر ادا کر رہے ہیں۔ نماز ادا کرنے کے بعد انہوں

نے کہا "مجھے لگا کہ یہاں خدا کا وجود ہے، بے اختیار سر جھک گیا۔ دیکھو نا کیا منظر ہے، کیسا سکوت ہے، کیا تقدس ہے۔"

حامدی کے مزاج میں جو شرافت، قلندری، محبت، لاتعلقی، دردمندی، فقر، خود شناسی اور فن کارانہ جذبہ ہے وہ انھوں نے اپنے خاندان سے وراثت میں پایا ہے۔ ان کا ایک بہت بڑا مشترکہ گھر تھا جو چند برس قبل ہی تقسیم ہوا ہے۔ اس میں ان کے والدین، بہن بھائی، دو چچا اور ان کے بیوی بچے سبھی شامل تھے۔ میں جب اس گھر میں آئی تو مجھے سب کا پیار ملا۔ خاص طور سے ان کی والدہ کا۔ جو ایک ذہین، سمجھدار اور سیدھی سادھی خاتون ہیں۔ محبت اور خلوص کی دیوی، کشمیری شاعری کی رسیا، میں نے اکثر انھیں تنہائی میں یا کام کرتے ہوئے "حبہ خاتون"، "رسول میر"، اور دوسرے شعراء کے اشعار زیر لب گنگناتے ہوئے سنا ہے۔ حامدی کے کانوں میں والدہ کی شیریں گنگناہٹ نے بچپن سے ہی رس گھولا ہے۔ حامدی کے والد صاحب صوفی مزاج آدمی تھے۔ دنیوی علائق سے زیادہ عبادت الٰہی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ علالت کے باعث وہ کام کاج ترک کر چکے تھے اور زیادہ وقت مسجد کے متولی کے طور پر گذارتے تھے۔ حامدی کے دادا، والد اور چچا بھی مسجد میں بلا معاوضہ اذان دیا کرتے تھے۔ ان کے والد ان سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتے تھے کھڑکی میں بیٹھ کر دن کے دو بجے ہی سے ان کی راہ تکتے تھے اور اگر ان کو آنے میں دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتے تھے اور عالم بے قراری میں سڑک پر نکل جاتے تھے۔

حسن پرستی حامدی کی فطرتِ ثانیہ ہے، وہ ہر حسین چیز کو پسند کرتے ہیں، چاہے وہ کوئی منظر ہو، شئے ہو، رنگ ہو، ملبوس ہو، خوشبو ہو یا عورت ہو۔ حسینوں کی صحبت انھیں بہت مرغوب خاطر ہے میں اس معاملہ میں ان کی محتسب بننا نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی حسیاتی اور جمالیاتی سطح جو ایک حسّاس اور تخلیقی شاعر کا لازمہ ہے، بہت بلند ہے۔ ان سے ملنے بہت سی عورتیں اور لڑکیاں آتی رہتی ہیں، جن میں ان کے مداح، شاگرد شاعرات اور دوست شامل ہیں۔ اور حامدی مجھ سے کچھ چھپاتے بھی نہیں، وہ صرف مجھ کو اپنا سب سے قریبی دوست اور راز داں سمجھتے ہیں۔

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا   دیوانہ گر نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں

محمود ہاشمی

۷/سی - ۳۳۷، بٹالہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

حامدی کاشمیری سے ایک گفتگو

محمود ہاشمی: - بیسویں صدی کے آدمی پر غالباً دوسرے زمانوں سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس عہد میں جئے اور اس عہد کے مطالبات کو پورا کرے۔ ان مطالبات کو ہمارے زمانے میں جن لوگوں نے محسوس کیا ہے، ان کی قدر و قیمت اور غرض و غایت کو جانا ہے، ان میں پروفیسر حامدی کاشمیری بھی شامل ہیں۔ حامدی صاحب کو میں ایک ایسا ادیب، ایسا فنکار سمجھتا ہوں جن کی ذات میں کئی سرچشمے ہیں، جن کی ذات سے کئی سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ حامدی صاحب بیک وقت افسانہ نگار ہیں، صاحبِ کتاب شاعر ہیں اور اس کے علاوہ اردو تنقید میں بہت اہم نام ہیں۔ حامدی صاحب ویسے تو کشمیر میں رہتے ہیں، کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں، لیکن اردو والے ان کو جانتے ہیں، برصغیر میں ان کی بہت سی کتابوں کے ذریعہ، حامدی صاحب! مجھے یاد ہے کہ آپ کی جو کتاب میں نے سب سے پہلے پڑھی تھی وہ "اردو نظم پر یورپی اثرات" ہے جو غالباً آپ کا تھیسس تھا۔ اس کے بعد آپ کی کئی کتابیں میں نے پڑھی ہیں، خاص طور پر "غالب کے تخلیقی سرچشمے" جو کافی عرصہ پہلے پڑھی تھی لیکن اس کا عکس اب تک میرے ذہن میں موجود ہے، اس کے نقوش ثبت ہیں۔ میر پر آپ کی تصنیف، اس کے علاوہ آپ کے مضامین سیمیناروں میں سنے ہیں۔ آپ تشریف لائے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ برصغیر میں اس وقت ادب کی جو صورت حال ہے اور اس میں بھی خاص طور پر تنقید کا رویّہ ہے، اس کے بارے میں آپ سے باتیں کروں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے ذریعہ اردو میں جو تنقید وجود میں آئی، اس نے ہمیں بہت سے موضوعات دئے، اور ایک طرح کا اعتماد دیا، اس اجتماعی زندگی کا جس سے اس سے پہلے تنقید بے بہرہ تھی، لیکن یہ اعتراض کیا گیا کہ ترقی پسند تحریک نے چونکہ ایک خاص نقطۂ نظر کو اپنا کر ادب کی تفہیم کی کوشش کی ہے، لہٰذا ادب کو زیادہ آزاد، اور زیادہ جمہوری فضاؤں میں پروان چڑھنے دیا جائے، اور اس کی ضرورت ہے کہ ادب کو ادب کے وسائل سے، ادب کے ضابطوں سے پڑھا جائے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے جدید تنقید آئی اور بہت سے وہ موضوعات آئے جن کا تعلق ہماری صدی سے ہے اور ہماری اس صدی میں جینے والے آدمی سے ہے، اور یہ بدقسمتی ہے اس عہد کے انسان کی، کہ وہ دو دنیاؤں کے درمیان زندہ ہے۔ ایک طرف اس کے تصورات ہیں، اس کے عقائد ہیں اور دوسری طرف موت کا اجتماعی خوف ہے۔ اس عالم میں جمالیات اور فنونِ لطیفہ پر جو ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس سے روشناس کرانے کی بڑی ذمّہ داری اس عہد کی تنقید پر ہے۔ ابتدائی دور میں غالباً ہمارے جدید ناقدوں نے، جن میں آپ بہت ممتاز ہیں، اس فریضے کو بخوبی ادا کیا۔ لیکن اب ادھر ایسا محسوس ہوتا ہے مجھے، بعد میں، میں آپ سے درمیان میں ایک اور بھی سوال کروں گا، کہ ادھر ہماری تنقید، خاص طور پر جدید تنقید ایک طرح کے علمی کرائسس سے ڈائیلما کا شکار ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ناقدین اپنے علوم کو اور اپنی کتابوں کے انبار کو پڑھنے والوں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں، اور ادب کی صحیح تفہیم کے جو مطالبات ہیں وہ پورے نہیں ہو رہے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

حامدی کاشمیری: - محمود ہاشمی صاحب، آپ نے بیک وقت کئی سوالات اُبھارے ہیں قبل اس کے کہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں، میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے بہت اچھے الفاظ کے ساتھ مجھے یاد کیا۔ آپ نے ترقی پسند تنقید کا ذکر کیا اور یہ فرمایا کہ ترقی پسند تنقید نے اجتماعیت

کا ایک صحت مند تصور پیش کیا ہے، تنقید میں بھی اور تخلیقی ادب میں بھی، تو ظاہر ہے کہ اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ترقی پسند تنقید پر جب ہم گہری نظر ڈالتے ہیں، مجموعی طور پر، اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندانہ سرگرمیوں سے لے کر جب ہم پہنچتے ہیں نئے مارکسی نقادوں تک،

محمود : جی۔

حامدی : (جب ہم پہنچتے ہیں نئے مارکسی نقادوں تک) بیچ میں سید احتشام حسین ہیں، مجنوں گورکھپوری ہیں یا ممتاز حسین ہیں اور دوسرے لوگ ہیں، تو مجموعی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نظریے کو اہمیت دی، اور تجربے کی جو پہچان ہے ادب میں، اور اس کی جو تعینِ قدر کا مسئلہ ہے، اس کو نظر انداز کر گئے۔ اصل میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سے مشکل سے ایک آدھ نام ہے، مجنوں کا ہے یا ممتاز حسین کا ہے، چند مضامین احتشام حسین کے ہیں۔ تو ان ناموں کو چھوڑ کر، جو بھی ترقی پسند تنقید ہے وہ ایک تبصرے کی اہمیت رکھتی ہے جس میں یہ لوگ زیادہ تر فنکار کے معاشرتی، تمدنی اور سوانحی حالات کو پیش کرتے رہے ہیں، اور جیسا کہ آپ نے کہا، اپنی معلومات کے انبار پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن فن پارہ کیا ہے، اس کی حیثیت کیا ہے، اس کے محرکات کیا ہیں، وہ کن پیچیدہ عناصر کی ترکیب سے وجود میں آتا ہے، اس کو یہ لوگ چھو تک نہیں گئے ہیں۔ تو نتیجہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر ترقی پسند تنقید نے، میں سمجھتا ہوں کوئی CONTRIBUTION اردو تنقید میں پیش نہیں کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تبصرے ہیں، بعض توضیحیں ہیں، جن کی زیادہ سے زیادہ مکتبیانہ اہمیت ہے۔ اب اسی کے ساتھ ایسے لوگوں کی خاصی تعداد رہی ہے موجودہ صدی میں، ہمارے بزرگ نقادوں جن میں احتشام حسین اور سرور ہیں، کے زمانے سے آج تک بے شمار نام ایسے ہیں جنھوں نے بیسیوں مضامین لکھے ہیں جو مدرسانہ اور معلمانہ نوعیت کے ہیں، رسائل میں بھی چھپتے رہے ہیں، کئی کتابیں بھی چھپی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا، جیسا کہ آپ بھی غالباً سوچتے ہوں گے، کوئی CONTRIBUTION نہیں رہا ہے، اس لئے کہ طالب علموں کے لئے لکھے گئے نوٹس کو جمع کر کے ان کی صورت بدل کر، ان کو نئے سرے سے مرتب کر کے، کچھ حواشی کے ساتھ، کچھ توضیحات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور تنقید کا کیا منصب ہے، تنقید کا کیا فریضہ ہے، تنقید کے پیچھے کون سی CONSCIOUSNESS کام کرتی ہے، کون سا جمالیاتی شعور کام کرتا ہے، یہ چیزیں ان کے یہاں ملتی نہیں۔ ان کا بھی، سمجھ لیجئے، کچھ ایسا ہی رویّہ رہا ہے، کہ توضیحی کام کیا ہے انہوں نے، ان لوگوں میں جو سب سے بڑا نام ہے سید عبداللہ کا، انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ بھئی میں معلمانہ تنقیدیں لکھتا ہوں تو کافی علمیت کے باوجود، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تنقید کا اصلی کام اور اصلی تفاعل ان سے پورا نہیں ہوا ہے۔ پھر آپ نے ذکر کیا کہ موجودہ کرائسس کے زمانے میں جو کرائسس شعور میں پیدا ہوا ہے، اور ادب میں پیدا ہوا ہے، اس کے تعلق سے ہمارے جو باشعور نقاد سامنے آئے، نئی نسل سے تعلق رکھنے والے، انھوں نے ادبی تنقید کی طرف توجہ کی۔ چند نام ضرور ہیں ایسے، جن سے کچھ توقعات بندھتی ہیں، مثال کے طور پر وزیر آغا ہیں، لسانی تنقید میں نارنگ ہیں، یا شمس الرحمان فاروقی ہیں، خود آپ ہیں محمود ہاشمی صاحب، اور فضیل جعفری ہیں، اور مغنی تبسم ہیں، اور کچھ اور لوگ ہیں۔ انہوں نے جو پہلا کام انجام دیا وہ یہ ہے کہ تعمیمات GENERALIZATIONS سے ہٹ کر فن پارے کا سامنا کیا اور بہت حد تک فن پارے کے اندر جو اسراری فضا ہے، وہاں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی، انہوں نے بلاشبہ مختلف طریقے اختیار کئے، بعض لوگوں نے نفسیات کا سہارا لیا، عمرانیات کا سہارا لیا یا لسانیات کا سہارا لیا یا جو کلیدی پیکر ہیں یا علامتیں ہیں، ان کا تجزیہ کیا، جیسا کہ آپ کرتے رہے ہیں، میر پر آپ کا کام ہے اور میر کے یہاں اسم اعظم کے طور پر آپ نے دو یا تین ایسے پیکر چن لئے ہیں، جن کی علامتی اہمیت ہے، تو ان کے سہارے، میر کے باطن میں جو کسمساتے ہوئے تخلیقی تجربے ہیں، ان تک پہنچنے کی سعی کی ہے تو یہ مختلف طریقے رہے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان چند نقادوں سے کچھ امید وابستہ ہو سکتی ہے، نہیں تو، مجموعی طور پر، میرا یہ خیال ہے کہ اردو تنقید ابھی تک اپنی کم مائیگی کا احساس مٹا نہیں سکی ہے۔

محمود: دو باتیں اور اس میں شامل کرنا چاہتا ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ محسوس کرتے ہیں؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ برصغیر کے ان دونوں ملکوں میں اگر میں ہندوستان کو لیتا ہوں تو سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اس طرح کی روش عام ہوئی ہے کہ لسانی تنقید یا اسلوبیاتی تنقید پر بہت زیادہ توجہ ہے، اور ایک اور سلسلہ جو نیا شروع ہوا ہے، وہ تشریحات کا ہے، جس کو ابتدا میں آپ، میں، شمس الرحمان فاروقی یا دوسرے ہمارے ساتھی جو ہیں وہ، اس کو ناپسند کرتے رہے، کہ شاعری جو ہے اس کے لئے ضروری نہیں کہ آپ اس کو INTERPRET کیجئے، اس کی تشریح کیجئے، اور اس سے پہلے جو کام تشریحات کا ہوا ہے وہ بھی شاعری کو محدود کرنے کا عمل ہے، ایک تو یہ صورت ہے لسانی تنقید کی، اور شعری تجزیوں کی، اور اس کے علاوہ اسلوبیات کی، جس میں زیادہ تر بحث اس سے ہوتی ہے کہ کس شاعر نے کن الفاظ کو کتنی مقدار میں، کتنی شدت کے ساتھ استعمال کیا ہے اور ان کے کلیدی الفاظ کیا ہیں، اس سے قطع نظر، استعارہ کیا ہے، اس سے قطع نظر علامت کیا ہے اس پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے کہ ان کا آہنگ کیا ہے اور اس آہنگ کے ذریعہ کس نوعیت کی شاعری، ان کی، مجموعی طور پر ہماری سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں ادھر جو تنقید لکھی جا رہی ہے اس کا رجحان مجموعی طور پر تصوف یا ان مستشرقین کی علمی روایات کی جانب ہے جنہوں نے ایک طرح نئے انداز سے ایک مذہبی نقطۂ نظر کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، تو یہ دونوں ملکوں میں جو نئی سمتیں ہیں، ایک طرف ہندوستان میں لسانی سمت ہے تنقید کی، پاکستان میں ایک خاص نہج پر ایک مذہبی اور تاریخی تصور کے ساتھ ایک HISTORICITY کے ذریعہ کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، یہ اختلاف کس نوعیت کا ہے اور کیا اس کا سبب ہے؟

حامدی: پھر آپ نے دو تین سوالات اٹھائے ہیں، پہلا تو یہ ہے کہ لسانی تنقید کا کیا تفاعل ہے، اور ظاہر ہے اس کے ساتھ یہ تصور بھی وابستہ ہے کہ اس کی حد بندیاں کیا ہیں۔ تو لسانی تنقید ایک نئی چیز ہے، نہ صرف اردو تنقید میں، بلکہ یورپی تنقید میں بھی دیکھیں تو اس کی بہت پرانی TRADITION نہیں ہے۔ موجودہ صدی میں ہی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہاں چند مضامین جو لکھے گئے ہیں، مسعود حسین خان کے ہیں یا گوپی چند نارنگ کے ہیں یا مغنی تبسم کے ہیں، تو ان لوگوں نے اسلوبیات کے سہارے یا جیسا کہ آپ نے کہا، بعض کلیدی الفاظ ہیں، اُن کو لیا ہے، یا آوازوں کے ذریعہ، یا اسم اور فعل کی تکرار ہوتی ہے، اور کہاں کہاں ہوتی ہے، کس شاعر کے یہاں، اس سے مجموعی طور پر شعر کی تفہیم میں کیا مدد ملتی ہے، اس پہلو کو انہوں نے لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام بہت حد تک ایک سائنسی اساس رکھتا ہے، اور اس میں جس چیز کی کمی کا مجھے احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ لسانیاتی یا اسلوبیاتی تنقید ایک حد تک جا کر رک جاتی ہے، یہ بہت دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتی۔ اس کے بعد ان سرحدوں کو عبور کر کے وہ آفاقیت سامنے آتی ہے جو تجربے کی آفاقیت ہے اور جو لسانیاتی ناقد کے دائرۂ ادراک سے باہر ہے، تو ان سرحدوں کو عبور کرنے کے بعد لسانیاتی ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادبی نقاد کا فریضہ انجام دے۔ جہاں یہ کام ہوگا، ابھی بہت کم ہوا ہے محمود ہاشمی صاحب، تو جتنا اس کی طرف توجہ کی جائے گی کہ لسانیاتی ہتھیاروں سے کام لینے کے بعد، شاعر یا افسانہ نگار یا ناول نگار کے ادبی شعور کی اسراریت کو پہچانا جائے، اس حد تک تو یہ کام کارگر ہوگا۔ دوسرا سوال آپ نے یہ کیا ہے کہ ادھر کچھ ہندوستان میں بھی اور بہت زیادہ پاکستان میں بھی تنقید جو علمیت کا رخ اختیار کر رہی ہے، کچھ ماضیت کی تلاش ہے، کچھ تمدنی علوم کی بازیافت کا عمل ہے،

محمود: جی!

حامدی: عمرانیات کا تو پہلے ہی سے تھا، تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تنقید کے کام میں ایک حد تک، صرف ایک حد تک، یہ طریقے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ پھر لازماً وہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ تنقید کا اصل تفاعل کیا ہے، کیا ہم فن پارے سے ہٹ کر صرف فن کار کے علمی ذخائر کی تلاش کریں یا یہ قرار دیں کہ فن کار کتنا عالم ہے، فاضل ہے، اور کتنے علوم پر اس کی دسترس ہے، اس کی تحقیق

میں اپنا وقت صرف کریں اور پھر قارئین کے سامنے وہ چیزیں پیش کریں۔ یہ چیز کہاں تک دائرۂ تنقید میں آتی ہے، ایک سوال۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر فنکار کو ہم وقتی طور پر نظر انداز کریں اور فن پارے پر نظر رکھیں تو ایک دوسری صورت حال سامنے آتی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر یہ ساری علمیت، یہ ساری معلومات، یہ سارا تمدنی علم اور عمرانی علم، اور تصوف، ساری چیزیں میں سمجھتا ہوں، ثانوی اہمیت اختیار کر جاتی ہیں، اس لئے کہ اب ہماری نظریں مرکوز ہیں فن پر، فن پارے پر، اور فن پارے کی دنیا کیا ہے، اس کائنات کے کیا مطالبات ہیں، اس کے کیا اسرار و رموز ہیں، اس کی کیا تہہ داریاں ہیں، اس کی کیا پیچیدگیاں ہیں، وہاں تک ہمیں پہنچنا ہے اور یہ عمل ہے اتنا طویل، اتنا پیچیدہ، اتنا خود مکتفی اور اتنا دشوار گذار کہ، میں سمجھتا ہوں، ان معلومات کی اور علمیت کی اہمیت رہ ہی نہیں جاتی۔ اس کے مقابلے میں، کیونکہ علم کا، ادراک کا، نظر کا اور تمام اسرار کا مخزن خود فن پارہ ہے، اور فن پارہ ہمیں کہیں لے جاتا ہے تو لے جاتا ہے، نہیں تو فنکار یا اس کی معاصرت، یا اس کی ماضیت، یا اس کے تصورات و عقائد، یہ ہمیں دور تک نہیں لے جا سکتے۔

محمود: دو ENTITES آپ کی اس گفتگو سے ہمارے سامنے واضح ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ جو فن پارہ ہے ہمارے سامنے، وہ ایک پوری کائنات کو سمیٹے ہوئے ہے، اور دوسری ENTITY یہ ہے کہ ناقد جو ہے وہ، اُن تمام اسرار کی گرہ کھولتا ہے، اور اس میں جو تصورات اور جو کائناتیں موجود ہیں، ان کو تلاش کرتا ہے۔

حامدی: جی بالکل درست،

محمود: لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پورا عہد HUMANITIES کے شعبے میں ایک بہت بڑے CRISIS کا عہد ہے، یعنی وہ تمام علوم جو انسانی علوم کہلاتے ہیں، جو سائنس سے الگ ہیں، THEORITICAL SCIENCE سے الگ ہیں، اور PRACTICAL SCIENCE سے الگ ہیں، ان میں خاص طرح کا کرائسس ہے آجکل، اس کی مثال میں دے سکتا ہوں آپ کو کہ یونانی زبان کے ماہرین اب ہمارے زمانے میں موجود نہیں ہیں لیکن اس مہارت کے باوجود کسی بھی یونانی مفکر پر یعنی ارسطو ہو یا افلاطون ہو، یا دوسرے یونانی مفکرین ہوں یا ادیب ہوں، ان کی تخلیقات پر اور ان کے کارناموں پر بہت بڑا ذخیرہ کتابوں کا موجود ہے، اس کے باوجود ہمارے عہد کا آدمی جو ہے وہ بالکل بے خبر ہے کہ اوڈیسی کیا ہے، ہمارے عہد کا آدمی بالکل بے خبر ہے اس لئے کہ اوڈیسس کون تھا، اور وہ ضرورت محسوس نہیں کرتا ہے جاننے کی کہ یونان کے ہومر نے، ایک نابینا شخص نے، یونان اور ایتھنز کی گلیوں میں گھومتے ہوئے کس طرح زندگی بسر کی، اور کیا سرمایہ پوری دنیا کو اس نے دیا۔ ایک صورت، جو بین الاقوامی سطح پر نظر آتی ہے یہ ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی منائی گئی، اور غالب کے سلسلے میں اردو میں بے پناہ کتابیں شائع ہوئیں، خود آپ کی "غالب کے تخلیقی سرچشمے" اس سے شاید ایک سال بعد شائع ہوئی تھی، اسی زمانے کی تصنیف ہے وہ، اسی طرح میر کے سلسلے میں بہت سی کتابیں اور مضامین ہیں، یا جو لکھا جا رہا ہے، اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں غالب کی جو تفہیم، اور غالب سے جو وابستگی ہونی چاہیئے، یا میر سے جو وابستگی ہونی چاہیئے وہ نہیں ہے، تو پھر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ HUMANITIES جو کرائسس ہے، وہ پوری دنیا میں ہے، اسے ہم بھی SHARE کرتے ہیں۔

حامدی: وہ تو بہر حال واقعہ ہے، جس CRISIS کا ہمیں سامنا ہے، موجودہ صدی میں، اس میں HUMANITIES کا بحران بھی شامل ہے، تو اس سے ایک حد تک ہم بھی متاثر ہیں۔ تنقیدی سطح پر جب ہم دیکھتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ GREEK LITERATURE یا یونانی افکار ہی سے عدم واقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں، بلکہ خود اپنے ماضی سے بھی بیگانہ ہیں۔ جیسا کہ آپ نے کہا کہ غالب سے یا میر سے بس ایک نمائشی تعلق ہے ہمارا، تو اس نے بھی اس کرائسس کو شدید تر بنانے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فن، اس کی اصلیت، اس کی ماہیت، اس کی مقصدیت

اس کے سماجی روابط اور اس کا جمالیاتی عمل وغیرہ، ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں ابھی تک ہمارے ذہن صاف نہیں ہیں، آپ مجھے معاف کریں گے، اتنے بڑے نام ہیں اردو تنقید میں جو ترقی پسندی سے لے کر ہیئتی تنقید اور پھر ادبی تنقید، اور پھر، جدید تنقید سے بھی متعلق ہیں، ان سب لوگوں کی میں قدر کرتا ہوں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سطحیت، ایک DOGMATISM اور ایک وہ تنگ نظری ہے جسے عصبیت بھی کہا جاتا ہے، عام ہے۔ دیکھیے ایک مسئلہ آپ کے سامنے یہ بھی ہے کہ جس شاعر، جس افسانہ نگار، یا جس ناول نگار پر لکھا گیا ہے، مجھے یہ بتائیے کہ کتنے شخص اصلاً ناول، افسانہ یا نظم یا شعر کو دیکھتے ہیں، اس کو پرکھتے ہیں یا اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت آسان سا نسخہ ہاتھ آگیا ہے کہ بھئی میر پر لکھنا ہے تو میر کے جو سوانحی اور تمدنی اور معاشرتی حالات ہیں، ان کی چھان بین کر دو، معلومات کا انبار لگا دو، اور پھر بعض مفید، مطلب اشعار جہاں تہاں QUOTE کر لو۔ یہ عمل آج تک جاری ہے۔ تو، میں تکرار کے طور پر بھی کہہ رہا ہوں، یہ صورت حال بہت مایوس کن ہے۔ اور اس صورت حال میں چند نام جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، ان کی کوششیں واقعتاً قابلِ ستائش ہیں۔ اگرچہ نئے ناموں میں بھی آپ مجھے معاف کریں گے، کچھ لوگ ایسے ہیں، مثال کے طور پر وارث علوی ہیں، جن کے یہاں مختلف جو طریق نقد ہیں ان سے اکتساب کا عمل ملتا ہے جو بہت ہی اچھا ہے، برا نہیں ہے۔ ایک انتخابی عمل ہے۔ کہیں وہ عمرانی تنقید، کہیں نفسیاتی تنقید اور کہیں ادبی اصولوں کو سامنے رکھتے ہیں۔ گویا وہ سب ان چیزوں سے اکتساب کر رہے ہیں، لیکن مجموعی طور پر کیا وہ اس تجربے سے ہمارا تعارف کراتے ہیں۔ جو فن ہے، کیا وہ خود اس کی شناخت کا ثبوت دیتے ہیں؟ یہ سوال ان سے بھی متعلق ہے، اور تمام معاصر نقادوں سے بھی۔ اور جس کرائسس کا آپ نے ذکر کیا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ کرائسس اس سے بڑھ کر ہے، اس لیے کہ اگر ہم فن پارے سے اپنا سفر شروع نہ کریں تو ہم بھٹکیں گے، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ عمرانیات کو، تمدنی حالات کو، یا عہد ماضی کو، یا فن کار کے جو نفسیاتی PREDILECTIONS ہیں اور ذہنی عوامل ہیں، ان کو کلیتاً نظر انداز کریں، میں یہ نہیں کہتا لیکن بنیادی اہمیت جس چیز کو حاصل ہے اس کو وہ اہمیت حاصل رہے، یعنی تکمیل شدہ فن پر آپ توجہ مرکوز کریں، اور پھر اگر ضمنی طور پر کچھ مدد ملتی ہے فن کار کے ذہن سے، اس کی سوانح حیات سے، اس کے عہد سے، اس کے دیگر جو HUMANITIES کے رشتے ہیں، ان کی تفہیم سے اگر کچھ مدد ملتی ہے، تو میں اس کو بھی WELCOME کرتا ہوں لیکن اردو تنقید سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ہم فن کار کے بجائے فن کو مرکز توجہ بنائیں۔

نمود: کیا یہ جو صورت حال ہے، اس میں آج کل جو تعلیمی سلسلہ ہے، جامعات ہیں، اس وقت ہندوستان کی تقریباً باون[۵۲]، ترپن[۵۳] یونیورسٹیز میں شعبۂ اردو قائم ہے، اور اتفاق یہ ہے کہ یونیورسٹیز سے وابستہ تمام اساتذہ اپنے آپ کو بیک وقت نقاد بھی سمجھتے ہیں، اور چونکہ طلبا کے لیے سوانحی حوالہ بہت ضروری ہے، اور اس عہد کا حوالہ بہت ضروری ہے، لہٰذا اس پر توجہ زیادہ دیتے ہیں، تو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جو ابتری ہے کہیں کہیں اردو تنقید میں، خواہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں، اس کا تعلق ہماری یونیورسٹیز سے ہے؟

امدی: جی ہاں، ایسا ہی ہے، صورت حال یہی ہے کہ جیسا کہ آپ نے خود بھی کہا کہ ہمارے اکثر و بیشتر معلمین جن کا تعلق تدریس سے ہے، وہی اس بات کے بھی دعوے دار ہیں کہ وہ تنقید سے بھی رشتہ رکھتے ہیں، جو درست نہیں ہے۔ اپنے حق میں شاید وہ یہ بات کہیں کہ امریکن یونیورسٹیز میں بھی ایسا ہی معاملہ ہے، بیشک وہاں صورت حال یہی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں اگر ایک معلم ہے تو معلمانہ حیثیت کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں اس کی ادبی حیثیت بھی ہوگی، جو وہ خود منوا چکا ہوگا۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ جو شخص بھی صدر شعبہ ہو جاتا ہے یا اردو تدریس سے جس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے وہ اپنے کلاس نوٹس کو نئے سرے سے ترتیب دے کر کتاب چھپواتا ہے۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں، ہماری ایک اکاڈمی جو ہمارے ہی ملک میں ہے، اس میں ایک سال میں نے دیکھا، دو ڈھائی سو کتابیں انعام کے لیے بھیجی گئی تھیں، اس میں، میں نے دیکھا کہ نوے فی صد کتابیں وہ کتابیں تھیں جو اساتذہ کی لکھی ہوئی

تھیں، اور سب انعامات کے طلبگار، تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں ٪۹۰ لوگ صرف کتاب اس لیے لکھتے ہیں کہ انھوں نے مواد طالب علموں کے لیے لکھا ہے، اسے کتابی شکل دی اور پھر انعام کے طلب گار ہیں، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت اور ان کا، مقصد کتنا صاف ہے تنقید کے بارے میں، تو یہ مجھے کہنے دیجیے کہ اردو تنقید میں جو ابتری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اس میں اردو اساتذہ کا بھی ہاتھ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی جو منصبی ذمہ داریاں ہیں، ان کو وہ پورا نہ کریں۔ اگر وہ تنقید کرتے ہوئے سوانحی عنصر کو وضاحتاً پیش کرتے ہیں کلاس میں، تو اس کی اپنی افادیت ہے، اس کی ضرورت ہے، لیکن جب وہ اس میدان سے ہٹ کر تنقید کے میدان میں قدم رکھیں تو ان کی ذمہ داریوں کی نوعیت بدل جاتی ہے، لیکن وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے۔ میرا یہ خیال ہے کہ تنقید میں بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ ہم لسانیاتی نظام کے توسط سے اس بنیادی تجربے تک پہنچیں، جو تجربہ لفظوں، پیکروں اور علامتوں کے حجابات میں مستور ہوتا ہے اور یہ کام نقاد انجام دیتا ہے، اور وہی نقاد جو بصیرت رکھتا ہے، جو زبان شناس ہے، جس کی نظر عصری تقاضوں پر ہے، اور پوری ادبیت کی تاریخ پر ہے، روایت پر ہے۔ کافی چیزیں درکار ہیں ایک نقاد کے لیے، اور جب ان تمام چیزوں سے وہ متصف ہو کر AS CRITIC کام کرنا شروع کرتا ہے تو، میرا یہ خیال ہے کہ مدرسانہ اور مکتبیانہ اور دوسری طرح کی جو تنقیدیں ہیں، یعنی محض INTERPRETATION محض توضیح، وہ بے اثر ہو کے رہ جاتی ہیں۔ آپ نے محمود ہاشمی صاحب، تنقید کے حوالے سے یہ بات کہی تھی کہ اشعار کی تشریح کرنا اور شعر کا مفہوم چند لفظوں میں پیش کرنا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ تنقید والی بات نہیں ہے کہ شعر سے، یا راجندر سنگھ بیدی یا کرشن چندر کے افسانے سے ہم مطلب نچوڑیں، موضوع کو نچوڑیں اور کہیں کہ صاحب، اس میں یہ سماجی مسئلہ پیش ہوا ہے، تو یہ بھی ایک مکتبیانہ عمل ہے، تنقیدی عمل نہیں،

محمود: وقت چونکہ کم ہے، میں چاہتا ہوں کہ کچھ تخلیقی ادب کے بارے میں بھی آپ سے سوال کروں، ایسا کیوں ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک ہم لوگ کوئی ایک شعر سن کر ناصر کاظمی کا یا احمد مشتاق کا یا بانی کا، فراق صاحب کا، بہت دیر تک محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ ادھر دونوں جانب سرحد کے اُس پار اور سرحد کے اِس پار، ایک طرح کی یکسانیت تخلیقی تجربے میں زیادہ ہے، اور بہت دنوں سے کسی نام نے کسی تخلیق نے چونکایا نہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

حامدی: پہلے میں آپ سے اتفاق کروں کہ ادھر ناصر کاظمی اور خاص طور پر بانی کے بعد، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکسانیت کا عالم ہے تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر زمانے میں اگر ہم دیکھیں، اس کے لیے کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ایک زمانے تک تخلیقی ذہن فعال رہیں گے، پھر ان میں جمود آئے گا۔ محمود ہاشمی صاحب، جب بھی کسی عہد میں، خواہ وہ غیر معمولی عہد ہو یا ایک معمولی سا تاریخی عہد، تخلیقی ذہن پیدا ہوتا ہے تو پورے منظرنامے کو بدلتا ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت جو یکسانیت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا چکا چوند پیدا کرنے والا تخلیقی ذہن کام نہیں کر رہا ہے، شاعری میں چند نام ضرور ہیں، وزیر آغا ہیں، بلراج کومل ہیں جو نظمیں لکھتے ہیں، اور بھی شاعر ہیں جو لکھ رہے ہیں، لیکن کوئی ایسا معرکۃ الآرا نام یا اس کا کوئی کام ایسا سامنے نہیں آتا ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ذہن ایک سطح پر جیسے آکر رک گئے ہیں۔

محمود: بہر حال، آپ سے جو گفتگو ہوئی، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ، جس لمحے اور جس نوٹ پر گفتگو ختم ہوئی ہے، ہم اس عہد کے ایک بڑے تخلیقی سورج کے منتظر ہیں، جس کے ذریعے یہ ابتری اور جو کیفیت ہے دھند لکے کی، شاید ختم ہو سکے گی۔ اور اسی کا مجھے انتظار ہے۔
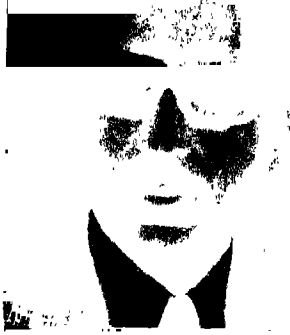
ڈاکٹر حامدی کاشمیری

مسعود منزل، بانی گام، میرا کا باد، شالیمار۔ سرینگر (کشمیر)

ہیئتی تنقید

تنقید، قدر شناسی کے ضمن میں اپنے طریقِ کار کے اعتبار سے بالعموم دو مفروضات کی پابند رہی ہے، اول یہ کہ تخلیق دو خاص عناصر یعنی موضوع اور ہیئت کے ربط باہم سے معرضِ وجود میں آتی ہے، اس لئے نقاد تخلیق کی تعینِ قدر کے لئے من مانے طریقے سے، اسے موضوع اور ہیئت کے حصوں میں تقسیم کرتے رہے ہیں، اور پھر الگ الگ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو گنا کر بزعمِ خود تنقیدی فریضے سے عہدہ برآ ہوتے رہے ہیں" دوم" ادب ادیب کی حقیقی زندگی، ماحول اور عہد کے حقائق سے منسوب و مربوط ہے۔ اس لئے تنقید کی ساری مساعی اس نقطے پر مرکوز رہی ہے کہ ادب میں ان ہی خارجی عناصر کی ان کی حقیقی صورت میں نشاندہی کی جائے، نتیجے میں شاعر کی اہمیت کا تعین اس کے اپنی زندگی یا اپنے عصر کے شعور یا علم کی وسعت کے مطابق کیا جاتا رہا ہے، تنقید کے اس مروجہ تصور کو مکتبی تاریخی، تمدنی اور مارکسی نقادوں نے گلے کا تعویز بنایا، وہ ادب کے منفرد جمالیاتی اقدار کو، جو دراصل اس کے تشخص کے ضامن ہیں، پس پشت ڈال کر اس کی تاریخی، عصری اور نظریاتی تاویلات پر اپنا زورِ قلم صرف کرتے رہے ہیں، میر غالب اور اقبال کی شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے ان کے نجی، تاریخی اور سماجی حالات و واقعات کے دفاتر کھولے گئے ہیں، لیکن ان شعرا کے تخلیقی ذہن کی انفرادیت اور وجودیت کی شناخت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔

متذکرہ بالا دو مفروضات پر انحصار کر کے اور ان کو اپنا منتہائے مقصد قرار دے کر تنقید نے نہ صرف اپنے اصلی تفاعل سے کنارہ کشی کی ہے، بلکہ شاعری کی زباں رسانی کا ساماں بھی کیا ہے، شاعری اپنے خالق کی داخلی شخصیت کے ازلی تخلیقی سرچشموں سے منحرف ہو کر خارجی اور عصری مسائل کی، جن کی فرومائیگی، ناپائیداری اور سطحیت مسلّم ہے، راست ترسیل کے صحافتی عمل کے مماثل ہو گئی، موجودہ صدی کی شاعری کا معتد بہ حصہ اس کا ثبوت ہے۔ اس طرح سے شاعری کی ماہیت اور اس کی اصلی کارگذاری نظروں سے اوجھل ہونے لگی تنقید کے تاریخی، نظریاتی اور مکتبی طریقوں کے علمبردار تخلیق کو موضوع و ہیئت میں تقسیم کرنے کے غیر فطری اور میکانکی عمل کا ارتکاب کر کے محض اس کی اوپری نوعیت کی خوبیوں اور خامیوں کا ورد کرتے تک محدود ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے تخلیق کے آزاد، نامیاتی اور وحدت پذیر وجود کو یکسر نظر انداز کیا، شاعری کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کرنا کہ اس کے شاعر کی نجی زندگی یا اس کے سماجی اور تمدنی حالات کا علم حاصل کیا جائے، شاعری کے ساتھ صریحاً زیادتی ہے، جو نقاد اپنے فرائض منصبی کو نظر انداز کر کے تاریخ داں کا کام کرے، وہ شاعری اور تاریخ دونوں کی صورت مسخ کرنے کے درپے ہے، اس طریق نقد سے شاعری کو جو نقصانات اٹھانا پڑا ہے وہ ظاہر ہے، انیسویں صدی میں غالب کے بعد حالی اور آزاد اور ان کے متعین کے ہاتھوں، اور پھر موجودہ صدی میں چکبست جوش اور احسان دانش کے علاوہ بیشتر ترقی پسندوں کے یہاں شاعری تخلیقیت اور داخلیت سے دور ہو کر خارجیت، مقصدیت اور نثریت کی پست سطح پر منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ تنقید، تخلیق کے بطن سے خلق ہونے کے باوجود، اپنے آزادانہ عمل سے اس کے مزاج و معیار کی تعین و تشکیل یا اس کی تنزمی میں اہم حصہ ادا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندی کے دور میں مخدوم محی الدین جیسے شعرا، جو تخلیقی ذہن سے بہرہ ور تھے، مارکسی تنقید کے غیر ادبی اصولوں کے زیر اثر اپنی تخلیقی حسیت کو شعوری یا غیر شعوری طور پر سماجی آگہی اور مقصدی خیالات کی بھینٹ چڑھاتے رہے، اور ذہین شعرا کی ایک پوری نسل تباہ ہو کر رہ گئی۔

تنقید کے جن طریقوں کا سطور بالا میں ذکر ہوا، وہ پوری تنقید میں بھی ایک عرصے تک مستقل رہے، تاہم موجودہ صدی تک آتے آتے ان کی معنویت

اور نتیجہ خیزی کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا جانے لگا، مجموعی طور پر اس نوع کی تنقید نظری زیادہ تھی اور علمی کم، بیشتر صورتوں میں یہ خیال آرائی، ہیئت شعر
اور تعمیم پسندی کی گرویدہ تھی، اس میں تاثریت کی کارفرمائی کی بنا پر استدلالیت اور توازن کا فقدان تھا، یہ نظریاتی جکڑبندیوں میں گرفتار ہوکر اپنے آزاد
اور خود مختارانہ رول سے منحرف ہوگئی تھی، اردو میں تو اس کی حالت زیادہ ہی مایوس کن تھی اس طریق نقد کے بڑے مؤیدین مثلاً سید احتشام حسین، سردار جعفری
اور فراق، فن کے بارے میں طویل مباحث کو پیش کرنے کے باوجود فن پارے کے قریب نہ آسکے، وہ فن کی ماہیئت کا ادراک کرنے کے بجائے اس کی تاویلات
میں کھو گئے موجودہ صدی میں بعض نقادوں نے تنقید کے نئے رجحانات کی جانب توجہ کی، چنانچہ نفسیاتی، لسانی، اسطوری اور ہیئتی تنقید کے رجحانات
جو مغربی ادب میں مقبولیت حاصل کر چکے تھے، اردو میں متعارف کئے گئے، ان میں ہیئتی تنقید کو خاص اہمیت ملی، ہیئتی تنقید کی رو سے یہ بات تسلیم کی
کی جانے لگی کہ فن پارہ ایک ناقابل تقسیم نامیاتی وجود ہے، اس لئے اسے موضوع اور ہیئت کے الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا زندگی کی حرارت
وحدت اور تحرک سے محروم کرنے کے مترادف ہے، ہیئت موضوع یا تجربے سے الگ کوئی شے نہیں، ہیئت ہی تجربہ ہے" یہ بقول کروچے" جمالیاتی
حقیقت ہے، اور ہیئت ہی حقیقت ہے، چنانچہ تخلیق کا بنیادی خیال، اس کی ساخت، آہنگ، وزن، لفظ، شبیہ اور علامت ایک فطری
اور مکمل ربط وادغام سے ایک نئی وحدت میں ڈھل جاتے ہیں، اور شعری ہیئت کی صورت اختیار کرتے ہیں، یہی ہیئتی تنقید کا موضوع ہے، اور
اس کے تجزیہ وتحلیل سے تنقید اپنے وجود کا جواز فراہم کرتی ہے، اس طریق نقد سے اس غیر متعلقہ عمل کا بھی سد باب ہونے لگا، جس کی رو سے تنقید مرکز جو
ہونے کے بجائے مرکز گریز روسے پرکاربند تھی۔

انگریزی میں ہیئتی تنقید کی شروعات انیسویں صدی میں کولرج نے کی تھی، بعد میں علامت پسندی مثلاً ویلری نے اسے مزید تقویت دی،
موجودہ صدی میں ہیئتی تنقید کی طرف جان کرورین سم نے سنجیدگی سے توجہ کی، اس نے THE WORLD'S BODY میں اس بات
کی نشاندہی کی کہ شعری تخلیق تجریدی خیالات کے بجائے شیئت، جو پیکروں کی مرہون ہے، کو خلق کرتی ہے، اور اسی سے اس کے وجود کی شناخت
ہوتی ہے، اس کے نزدیک "پیکر اس شخص کے لئے شان وشکوہ GLORY کا ابر ہے، جس نے یہ دریافت کیا ہو کہ خیال ایک قسم کی تاریکی ہے"
چنانچہ اس نوع کی تجسیمی شاعری کو رین سم "خالص شاعری" سے موسوم کرتا ہے، اس کا خیال ہے کہ شعر مکمل اور وحدت پذیر تجربے کی تجسیم
کاری کرتا ہے۔ اس کے نظریے کے مطابق شاعری دنیا کے نامیاتی جسم کو معرض وجود میں لاتی ہے، جبکہ سائنس خالی خولی استخوانوں یعنی
اصولوں اور تصورات ہی کو گلے لگاتی ہے، رین سم نے ہیئتی تنقید کے اصولوں کی وضاحت اپنے مقالے THE NEW CRITICISM
میں کی اور یہیں سے "نئی تنقید" کی اصطلاح مروج ہوگئی، اور پھر دیگر نقادوں مثلاً رچرڈ بلیک مور، آئی۔ اے رچرڈس، ولیم ایمپسن،
ونٹارس، ایلیٹ، کلینتھ بروکس اور ایلن ٹیٹ نے نئی تنقید کی تشکیل وتوسیع میں اہم رول ادا کیا، نئی تنقید کے ان مؤیدین نے تخلیق کار
کے بجائے تخلیق کو مرکز توجہ بنایا، ان کے نزدیک تخلیق ایک نمو پذیر ہیئتی وجود رکھتی ہے اور تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اس ہیئتی وجود کو مکمل صورت
میں اپنی گرفت میں لے لے، ان کے نزدیک شعر کا وجود الفاظ، پیکروں، علامتوں، موسیقیت اور فضا کی انسلاکاتی شدت کے ترکیبی عمل سے تشکیل
پاتا ہے، اور ان ہی عناصر کی تفہیم وتجزیے سے اس تجربے تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے، جو تخلیق ہے، اور جو مفاہیم کا سرچشمہ ہے، کلینتھ بروکس اس تنقید
کو "نئی تنقید" سے موسوم کرنے کے حق میں نہیں، وہ اسے ساختیاتی یا ہیئتی تنقید سے موسوم کرتا ہے، اس نے لکھا ہے "چنانچہ جس غیر مناسب طریقے
سے اسے نئی تنقید کا نام دیا گیا ہے اس کی یہیں پر نشاندہی ہونی چاہیے، یہ بہتر طریقے سے ساختیاتی یا ہیئتی تنقید کہلائی جا سکتی ہے یہ فرض کر کے ہی
کہ لکھنے والا ادبی ہیئت کے توسط سے ہی اپنے مفہوم سے ربط قائم کرتا ہے"

یہ صحیح ہے کہ ہیئتی تنقید کے علمبردار اپنے مطالعے کے ضمن میں بنیادی اہمیت فن پارے کو دیتے ہیں، اور اس لحاظ سے ان کے تنقیدی رویوں
میں کم وبیش ایک نقطہ اشتراک ملتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ مستنبط نہیں ہوتا کہ یہ سارے نقاد ایک مشترک نظریۂ نقد کے حامی ہیں، ان کے تصورات
نقد اور طریقہ ہائے نقد میں اختلافات نمایاں ہیں، کینتھ برک اور بلیک مور تخلیق کی ہیئت کو محض لسانیاتی نقطۂ نظر سے نہیں جانچتے، بلکہ وہ اس
کی نفسیاتی توجیہ میں بھی دلچسپی لیتے ہیں، یہ رچرڈس کی مانند ہیئت کو جذباتی تاثر پذیری کا وسیلہ بھی گردانتے ہیں، مزید برآں، وہ شاعری میں
مارکسیت، تحلیل نفسی اور بشریات کے اثرات کی کارفرمائی کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ رین سم اور ونٹرس شعر کے ہیئتی وجود کو بنیادی اہمیت

دینے کے ساتھ ہی اس کے جمالیاتی اور اخلاقی تصورات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، رچرڈس نے ہیئت کے تجزیاتی مطالعے سے معانی کی مضمر تہوں کو کھولنے میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے، چنانچہ PRACTICAL CRITICISM (1928) میں وہ تجزیاتی مطالعے شامل ہیں جو اس نے اپنے شاگردوں سے نظم نگاروں کا نام ظاہر کئے بغیر ان کی نظموں پر لکھوائے، یہ عملی تنقید کا ایک ٹھوس کارنامہ ہے، لیکن جب وہ اپنی تنقیدات میں لسانی تجزیے سے زیادہ اقداری فیصلوں کی جانب رجوع کرتا ہے، تو اس کا ذہنی الجھاؤ ظاہر ہوتا ہے، فن کی تعیین قدر کرتے ہوئے وہ جمالیاتی اثر انگیزی پر زور دینے کے بجائے نفسیاتی توازن کی بحالی کے معالجاتی عمل کو گھسیٹ لاتا ہے، اس طرح سے فنی عمل کے نتیجے کو اس کے بنیادی عمل سے خلط ملط کرتا ہے، ولیم ایمپسن نے SEVEN TYPES OF AMBIGUITY (1930) میں اس بات پر زور دیا کہ شعر کا لسانی نظام مختلف اور متضاد معانی کو جنم دے سکتا ہے، اس نے زبان شناسی سے کام لے کر لسانی اور لفظی تجربہ کی اہمیت واضح تو کی، تاہم اس نے اس کی باقاعدگی سے پاسداری نہیں کی، وہ لفظ کی معنیاتی تہیں اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی خیال آرائی، تحلیل نفسی اور سماجیات کو بھی دخیل کرتا ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ ایمپسن باریک بینی سے کام لے کر شعر کے لفظی نظام کے تجزیاتی عمل کے لئے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں ایلیٹ نے بھی کئی مضامین میں ہیئتی تنقید کے اصولوں کو برتا ہے، تاہم وہ اس پر اکتفا نہیں کرتا ہے اسکی اور بھی ذہنی ترجیحات ہیں، وہ تخلیقی ذہن، لاشخصیت، کلاسکیت، معروضی متلازمہ، روایت اور انفرادیت کے تصورات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہیئتی تنقید سے زیادہ جمالیاتی اور کلاسیکی انداز نقد کی جانب مائل ہوتا ہے ہربرٹ ایڈ نے بھی ہیئت بالخصوص عضوی ہیئت کی وکالت کی ہے، تاہم وہ بلا تامل فرائیڈ اور ینگ کے نفسیاتی نظریات کا بھی دامن تھام لیتا ہے ان سارے نقادوں میں البتہ کلینتھ بروکس بہت حد تک ہیئتی طریق نقد سے اپنی گہری وابستگی کو ظاہر کرتا ہے، اس کے نزدیک شاعری تناؤ، طنز، پیچیدگی تضاد اور تہہ داری کی ایک زندہ اور نامیاتی قوت ہے، جو لفظوں کے گہرے مطالعے سے قابل شناخت ہو جاتی ہے، وہ ادب کے تخیلی کردار کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، اور اس کی قدر سنجی کے ضمن میں شاعری اور فکشن میں کسی تفریق کو روا نہیں رکھتا، کلینتھ بروکس کی کتاب UNDERSTANDING POETRY 1938 جو اس نے رابرٹ پین وارین کی رفاقت میں لکھی ہے، تجزیاتی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اردو میں کوئی ایسا نقاد نہیں، جس نے باقاعدگی سے ہیئتی تنقید کو برتا ہو، میراجی "اس نظم میں" بعض معاصرین مثلاً راشد، فیض اور جوش کی بعض نظموں کے تجزیاتی مطالعے پیش کر کے ہیئتی تنقید کی شروعات کی ہے، کلیم الدین احمد نے "عملی تنقید" میں بعض اشعار کی CLOSE READING کی طرف توجہ کی ہے حالیہ برسوں میں وزیر آغا، فاروقی افتخار جالب، نارنگ، محمود ہاشمی وارث علوی فضیل جعفری مغنی تبسم اور اسلوب احمد انصاری نے ہیئتی تنقید کے بعض اچھے نمونے پیش کئے ہیں، فاروقی نے علیت استدلالیت اور معروضیت کے ساتھ ہیئتی تنقید کو برتنے کی کوشش کی ہے، ان کے تنقیدی مقالات "شعر اور غیر شعر اور نثر"، نئے معاصر ادبی ذہن پر گہرا اثر ثبت کیا ہے انہوں نے شعر کی ماہیت پر غور و خوض کرتے ہوئے اس کے ہیئتی اور لسانی رموز کو بے نقاب کیا ہے، نارنگ نے بعض اہم شعراء مثلاً میر، غالب اور اقبال کے کلام کی لسانی اور صوتی ساختیات کو مرکز توجہ بنایا ہے انہوں نے جدید افسانہ نگاروں کو تہذیبی اساطیری اور عصری میلانات کی دید و دریافت کے لئے لسانی طریقہ نقد سے کام لیا ہے محمود ہاشمی نے بعض شعراء کی کلیدی علامتوں کا تجزیہ کیا ہے، وزیر آغا کے بعض تجزیاتی مطالعے ان کی ژرف بینی اور جودت طبع کے مظہر ہیں۔ دیگر ہیئتی نقادوں کا انداز نقد انتخابی رہا ہے، وہ شاعری کی ہیئت کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ نفسیات، بشریات اور تمدنی حالات کی تلاش و تحقیق میں بھی دلچسپی لیتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض معاصر نقادوں مثلاً وزیر آغا، نارنگ، فاروقی اور محمود ہاشمی نے بعض فن پاروں کو دقت نظر اور لفظ شناسی سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اور تنقید تاریخیت اور تاثریت کے موہوم دھندلکوں سے نکل کر معروضیت، جامعیت اور خود مرکزیت کی طرف آئی ہے۔

ہیئتی تنقید کے امکانات اور حدود کیا ہیں، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ تنقید کا یہ طریقہ شاعری کی اصلیت کی دریافت اور اس کی کلی تعیین قدر کے لئے دیگر نظریات نقد کے مقابلے میں زیادہ کارآمد، معنی خیز اور معروضی ہے، یہ طریقہ فنی تخلیق کی انفرادیت، تخصیص اور خود مختاری کا احساس دلانے میں موثر رہا ہے، اور غیر ضروری علمی اور تمدنی مباحث میں الجھنے کے بجائے اس کی لسانی باریکیوں اور پیچیدگیوں کے دقت نظر سے مطالعہ کرنے کی ضرورت پر اصرار کرتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہیئتی تنقید نے فن کے تشخص کی بحالی میں نمایاں رول ادا کیا

ہے، سوال یہ ہے کہ یہ طرزِ نقد کس حد تک اقداری فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ نقد ہیئت کے گہرے مطالعے سے تخلیق کی اندرونی معنیاتی جہات تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے، معنیات کو بوقلمونی، وسعت اور گہرائی بنیادی طور پر فنی تجربے کا نتیجہ ہوتی ہے، چنانچہ میرؔ اور غالبؔ کے مقابلے میں فیضؔ اور فراقؔ کی کم رنگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ موخر الذکر شعرا تجربے کی اس بیکرانی کا احاطہ نہ کر سکے جس پر میرؔ و غالبؔ متصرف تھے، میرؔ و غالبؔ کا فن ہیئت کے اعتبار سے اپنی پیچیدگی اور مضمر معنوی جہات کے امکانات کو ظاہر کرتا ہے اور اس سے ان کی فوقیت مسلم ہو جاتی ہے، پس، ظاہر ہوا کہ ہیئتی تنقید اعلیٰ اور کمتر درجے کے ادب میں تفریق کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے، جو تاریخی تنقید کے بس کی بات نہیں، کسی فن پارے کی موضوعیت یا تاریخی معلومات کی بنا پر اس کی تعیئن قدر نہیں ہو سکتی، اگر ایسا ہوتا تو جوشؔ کی سماجی اور سیاسی شاعری یا پریم چند کے طبقاتی شعور کے حامل افسانے اعلیٰ درجے کے فن کے دائرے سے خارج نہ ہوتے، ہیئتی تنقید ادب کے مکمل وجود کا محاکمہ کر کے خالص فنی اور جمالیاتی معایر کے مطابق اقداری فیصلے کے لئے راہ ہموار کرتی ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس نوع کی تنقید نئے ادبی مزاج جس کا خاصہ پیچیدگی، علامتیت اور دروں بینی ہے اور جو خالص تخیلی ادب سے سروکار رکھتا ہے، سے مکمل ہم آہنگی رکھتی ہے، نیز، یہ ادب کی قدر سنجی کے لئے کسی مستعار یا عاید کردہ تنقیدی معیار کی دست نگر نہیں بلکہ ادب کے باطن سے ہم رشتہ ہے۔

کیا ہیئتی تنقید شاعر کی زندگی یا اس کے سماجی پس منظر سے صرف نظر کر کے اپنے تنقیدی مقصد کو پورا کر سکتی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ تاریخی، سماجی اور ادبی حقائق بالواسطہ یا بلاواسطہ فن پارے پر اثر انداز ہوتے ہیں، شاعری کا میڈیم یعنی زبان فی نفسہ ایک سماجی روایت کا درجہ رکھتی ہے، جو تاریخی حالات کی پابند ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ملٹن ڈن، ایلیٹ اور اقبالؔ کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ بعض لفظوں اور پیکروں کے تاریخی، مذہبی اور اساطیری پس منظر کا علم حاصل کیا جائے، لیکن ایسا کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ یہ علم شعری لسانیات میں منتقل ہو کر تجربے کا حصہ بن جاتا ہے اور اس کی تاریخی حیثیت متغیر ہو جاتی ہے۔

آخر میں ہیئتی تنقید کی ایک حد بندی کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، ہیئتی تنقید لسانی ہیئت کا تجزیہ کر کے فن پارے میں مضمر معانی کو دریافت کرتے یا زندگی سے اس کے معنوی روابط کی شناخت کرنے پر اپنا سارا زور صرف کرتی ہے، اس میں خطرہ یہ ہے کہ یہ طریقہ بالآخر معنی کو موضوعیت کا بدل قرار نہ دے، اور محض موضوعیت کی نشاندہی کرنے کے کتابانہ رویے پر منتج نہ ہو جائے، جو روایتی تنقید کا مطمع نظر رہا ہے، اس طرح سے فن پارے کا منفرد، انوکھا اور آزاد وجود، جو زمان و مکان کی پابندیوں کی نفی کر کے بیکرانی کا احساس دلاتا ہے، پس پشت ہو جائے گا، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہیئتی تنقید کے تحت فن پارے کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے فوری طور پر لفظ و پیکر سے معانی و مطلب کو برآمد کرنے پر ساری قوتیں صرف نہ کی جائیں، جیسا کہ فاروقی کر رہے ہیں، بلکہ تخلیق کے لسانی نظام کے مطالعے سے اس مستور اسراری تجربے کی شناخت کی جائے، جو فن پارے کی شناخت بھی ہے، اور منتہائے مقصد بھی، کسی فن پارے سے کسی معینہ یا مخصوص معانی کی کشید پر اصرار کرنا کیا اس کی کثیر المعنویت سے انکار کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ دراصل تنقیدی عمل فن پارے کی ہیئت کے توسط سے اس کی باطنی کائنات میں باریاب ہو کر اس کے تحیر خیز و قوعات سے متصادم ہونے کا عمل ہے، اس عمل میں نقاد باشعور قارئین کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا ہے، اور اسراری جلوؤں کے روبرو کھڑا کرتا ہے، اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، تو اس کا فریضہ مکمل ہو جاتا ہے، رہی معانی کی توضیع کی بات، تو اس کے لئے پیشہ ور مدرسوں کی کیا کمی ہے؟ تاہم اگر وہ تعبیرات یا توضیع معانی کا ضمنی کام بھی ہاتھ میں لے، تو اس کا کام معانی کی تعیئن نہیں، بلکہ معنوی امکانات (جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے) کی جانب اشارہ کرنا ہوگا، تاکہ اقداری فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ ❁

زیر پا ہے فلک، زمیں کیا ہے
دھند میں صورتِ یقیں کیا ہے

یوں ہی مسمار ہو رہا ہوں میں
گردشِ چرخِ ہفتمیں کیا ہے

زندگی عمر شناوری کی ہے
کس کو معلوم تہہ نشیں کیا ہے

رات کے منجمد سمندر میں
رہرو دشتِ موجِ آتشیں کیا ہے

لمسِ شیریں بھی، جنبشِ مضطرب بھی
یہ مری جان کے قریں کیا ہے

کتنے شہروں کو کر لیا نابود
تیرا منصوبہ اے زمیں کیا ہے؟

دل میں قصدِ دیارِ کوکب تھا
رات میں ہی سوارِ اشہب تھا

تھی حکایت بطورِ ناطق کی
کس کو شوقِ ارائے مطالب تھا

ہرف گرتی تھی وادیٔ جاں میں
نغمہ گر ایک آتشیں لب تھا

میرے ظلمت کدے میں در آیا
کس کا جویا ستارۂ شب تھا

آخرش وہ بھی سنگسار ہوا
بستی میں ایک صدق مشرب تھا

یوں تو تھا اک فقیر گوشہ نشیں
کس کو حرف و نوا کا منصب تھا

سفر یہ آخری کوہ گراں ہے
مقدر میں وہ گنجِ شائگاں ہے

ہے لرزاں خوف سے جنگل کا جنگل
ابھی تو خواب میں شیرِ ژیاں ہے

قریب آنے سے کر لو حذر، لوگو
مرے سینے میں اک آتش فشاں ہے

طرب خانوں میں جشنِ رامش و رنگ
گزرگاہوں پہ خونِ کشتگاں ہے

خلائے بے جہت میں کچھ نہیں ہے
فقط برفاب کا بحرِ رواں ہے

مجھے اب واقعی نیند آ رہی ہے
جبیں پر کس کا دستِ مہرباں ہے

موج و ساحل شب بے خوابی ہے
چاند کا منظر غرقابی ہے

بحرِ ظلمت میں اتر کے دیکھو
تہہ بہ تہہ جلوۂ مہتابی ہے

موسمِ خونِ شہیداں تو نہیں
دور تک دشت میں شادابی ہے

کٹ مرا لشکرِ اعدا بھی تمام
کس کی قسمت میں ظفریابی ہے

ہو گیا جاری ہوا کا فرمان
اب کسے طاقتِ سرتابی ہے

گھر لیتے ہیں کواکب مجھ کو
کیا یہ شعلۂ بے تابی ہے

حارث الہاشمی

علی جوّاد زیدی

اجنبی

آؤ اہلِ وطن، پاس آؤ ذرا
مرحبا اور لبیک کہہ کر بڑھو.
ایک بار اور پھر غور سے دیکھ لو
زخم کھائے، لہو میں نہلاتے ہوئے
سر پہ خوں میں عمامہ ہے، بر میں عبا
اس پہ میرے ہی خوں کی گلکاریاں
کیا یہ سب اجنبی ہیں تمہارے لئے؟
پانو سوجے ہوئے، ہونٹ سوکھے ہوئے
گردِ میداں کی چادر میں لپٹا بدن
رن سے زندہ پھرا ہوں کہ غازی ہوں میں
(پھر یہ کب کہہ رہا ہوں نمازی ہوں میں)
زخم خوردہ ہوں لیکن فراری نہیں
میں ہوں صیدِ زبوں موت سے بچ رہا
اور اب زندگی مجھ کو لائی وطن
اے وطن! اے وطن! اے مرے پیارے وطن
اب کہاں ہے وہ اجداد کا آستاں
وہ محل کی طرح اونچے اونچے مکاں
یہ شکستہ سی دیوار، ٹوٹے سے در
دشمنوں کے ہیں، میرے یہ ہرگز نہیں
یہ میں رَو میں خدا جانے کیا کہہ گیا؟

یادگارِ تمنائے ماضی ہیں یہ
یہ کھنڈر میری ہستی کی تاریخ ہے
اس میں کھیلا ہوں، ناچا ہوں، رویا ہوں میں
اس میں دوڑا ہوں، جاگا ہوں، سویا ہوں میں
بھیگے ساون کی مٹی میں لوٹا ہوں میں
یہ مری انگلیوں کا ستم گر قلم
اس کے آنگن میں میری امانت بنا
میری طینت بنا، میری فطرت بنا
اپنے ماں باپ کی شفقتوں کی قسم
یہ زمیں میرا ایمان ہے، دھرم ہے
بس یہی ایک خواہش ہے وقتِ سفر
میرے ماتھے کا یہ خاک ٹیکا بنے!
میں تمہارے لیے اجنبی تو نہیں!
پھر جو مدّت کے بعد آج آیا یہاں
ساری بستی میں کوئی شناسا نہیں
جیسے انساں نہیں میں کوئی بھوت ہوں
میں وہی ہوں جو کل بھائی تھا، یار تھا
غور سے دیکھ لو، مجھ کو پہچان لو۔
اُف یہ کیسی ہوائیں سنکنے لگیں
کیوں رفاقت کے رخ پر رعونت کی زلفیں بکھرنے لگیں؟

لہلہاتے ہوئے آنچلوں میں چھپیں
ان گلابی عذاروں کی محبوبیاں
بے کراں، بے اماں، سرگراں!
چند معصوم لمحوں کو آغوشِ انفاس میں
ساعدِ سیم گوں سے سمیٹے ہوئے
انگلیاں بکھری زلفیں ہٹاتی ہوئی
رُخ کی تابندگی، تازگی، سادگی
کو بتاتی ہوئی جاوداں!
خود مجھے بھی تو کچھ اجنبی سی لگیں —
سونے پن میں بھی کچھ مسکراتی ہوئی
دیکھتی ہیں مجھے شوخ محبوبیاں
اور میں وقت کے صحن میں چپ کھڑا
رات کے چاند کی پہلی تھالی لئے
نو شگفتہ گلاب اور چنبیلی سے تھالی سجائے ہوئے
کھلتے عارض میں اصنام کی نغمہ گر خامشی
میرے دل میں عقیدت بھرے پیار کی نغمگی
اب بھی راتوں کو اکثر بھٹکتی ہوئی
تلخ و شیریں و نمکیں یادیں لئے
زنگ خوردہ، فسردہ، مرادیں لئے
سوچتی ہے کسی ہم نشیں سے کہے
کیا یہ سب کچھ کوئی اجنبی ہیں، بھلا!

۱۸ ڈالی باغ کالونی، لکھنؤ — ۱ (یو پی)

رتن سنگھ

۴۵۔ ایم۔ یول ہیتھر کالونی، گواری گھاٹ روڈ۔ جبل پور۔ ۴۸۲۰۰۸

ڈری ڈری ہوا

تھا تو وہ ربر کا بنا ہوا شکاری کتے کا پلّا ہی، لیکن اسے دیکھ کر ہی دل سہم جاتا تھا۔ اس کی بناوٹ ہی بڑی بھیانک سی تھی۔ آنکھوں میں غصہ بھرا ہوا منہ کھول کر نوکیلے دانت یوں دکھا رہا تھا جیسے ابھی کاٹنے کے لئے تیار ہو۔ دُم اوپر کو اٹھی ہوئی اور چاروں پاؤں آگے کو بڑھے ہوئے جیسے ابھی جھپٹا کہ جھپٹا۔

اسے دیکھ کر گھر میں سبنے ناک بھوں چڑھائی۔

"چلو پھینک کر آؤ۔ اسے دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے۔"

"یہ کیسا کھلونا ہوا۔ لگتا ہے ابھی کاٹنے کو آ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے کسی نے اُسے اٹھایا اور نیچے فرش پر پھینک دیا۔ ربر کا پلّا گیند کی طرح ہوا میں اچھلا اور پھر اچک کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور چوں چوں کرنے لگا۔

"ارے یہ تو زندہ پلّوں سے بھی زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو دانت نکال کر کیسے بھونک رہا ہے؟"

"ارے بھئی۔ ربر کی گڑیا کو دبایا جائے تو اس سے سیٹی کی آواز نکلتی ہے یا نہیں؟ فرق صرف یہ ہے کہ میرا پلّا چیں چیں نہیں کرتا، بلکہ بھونکتا ہے۔"

بچے نے اپنے پلّے کو فرش سے اٹھا لیا تھا اور گود میں لے کر اس کی پیٹھ پر یوں ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسا کرتے ہوئے وہ شرارت سے اسے دبا بھی جاتا تھا۔ اس لئے پلّا پہلے کی نسبت زیادہ اونچی آواز میں بھونکے جا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ ابھی تک اپنے فرش پر پھینکے جانے کے لئے احتجاج کر رہا تھا۔

ایسا کرتے ہوئے بچہ خوش ہو رہا تھا۔

مگر گھر کے باقی لوگ سہمے جا رہے تھے۔ پلّے کی آواز ہی ایسی بھیانک تھی۔

اس کھلونے کے آنے کے بعد گھر دو حصوں میں بٹ گیا۔

بچہ اور اس کا پلّا ایک طرف۔

باقی گھر دوسری طرف

بچہ اس پلّے کو گھر کے ڈرائنگ روم میں کسی نمایاں جگہ پر سجا سنوار کر رکھتا، جہاں پر سب کی نظر پڑے کبھی سامنے شیلف پر بھگوان کی تصویر کے عین نیچے۔ یا پھر صوفوں کے درمیان رکھی ہوئی تپائیوں کے بیچ و بیچ، جہاں پر پھولوں کا گلدستہ رکھا رہتا ہے، وہاں۔ مگر گھر کے لوگوں کو موقعہ ملتا تو وہ اس پلّے کو اٹھا کر اوپر طاق پر رکھ دیتے جہاں پر کسی کی نظر نہیں جاتی تھی۔ بچہ پھر اسے اٹھا کر واپس بھگوان کی مورتی کے نیچے یا تپائی پر رکھ دیتا تھا۔ اس لئے تنگ آ کر گھر والوں نے ایک دن چھلا کر پلّے کو اٹھایا اور الماری میں بند کر کے تالا لگا دیا۔

بچے کو جب اپنا کھلونا کہیں دکھائی نہیں دیا تو اس نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ پہلے تو اس نے گھر کے کونے کونے میں اسے ڈھونڈا۔ نہیں ملا تو گھر کی جو چیز ہاتھ لگی وہ اِدھر اُدھر پھینک دی۔ کتابیں وہاں بکھری پڑی تھیں، جہاں جوتے رکھے جاتے تھے۔ اور اس پر بھی کھلونا نہیں ملا تو اس نے بھوک ہڑتال کر دی، اور منہ سجا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ کوئی اسے بلاتا تو وہ اسے مارنے کو دوڑتا۔

گھر کی بگڑی ہوئی حالت اور بچے کے غصّے کو دیکھ کر کسی نے کہا: "دے دو بھائی اس کا کھلونا۔ بچہ تو اس پلّے سے بھی زیادہ خطرناک ہو رہا ہے"۔

اس طرح ربر کا بنا ہوا پلّہ گھر کا فرد تسلیم کر لیا گیا۔ اب بچّے کا جیسے دل کرتا اسے رکھتا۔ جہاں دل کرتا لے جاتا۔ اب اس معاملے میں وہ بالکل نڈر ہو گیا تھا۔

گھر والوں نے پلّے کو تسلیم تو کر لیا تھا، لیکن اندر سے ان کا دل ڈرا ڈرا رہتا تھا۔ اب بچّے کا دل آتا تو وہ اپنے پلّے کو ڈرائنگ روم میں رکھ دیتا اور کبھی سونے والے کمرے میں کبھی پڑھنے والے کمرے میں اور کبھی کبھی تو وہ رسوئی گھر اور یہاں تک کہ وہ پلّے کو پوجا والے کمرے میں بھی رکھ دیتا تھا۔ ایسی صورت میں گھر والوں کو ایسا لگتا اس پلّے کے ایک کے بجائے پانچ سات ہو گئے ہوں۔ گھر میں جہاں بھی جاتے وہیں انہیں وہ سامنے ہی رکھا ہوا ملتا۔

پھر ایک دن گھر والوں کا ڈر سچا ثابت ہونے لگا۔

اس دن انہیں لگا جیسے پلّا پہلے سے تھوڑا بڑا ہو گیا ہو۔ وہ سب لوگ حیرانی سے ڈرائنگ روم کے غالیچے پر کھڑے اس پلّے کو دیکھ رہے تھے۔ اس کا منہ

کچھ اور کھل گیا تھا۔ دانت مقابلتاً بڑے ہوگئے تھے اور ٹانگیں بھی پہلے کی نسبت زیادہ بڑی اور مضبوط لگ رہی تھیں۔ پنجوں کے ناخون بھی بڑھے ہوئے تھے۔

ربر کا کھلونہ بڑا کیسے ہوگیا؟۔ سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

اتنے میں بچہ وہاں آگیا۔ چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ لیتے ہوئے۔

"یہ پلا بڑا کیسے ہوگیا؟" کسی نے غصے سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ تھوڑی سی ہوا زیادہ بھری گئی ہے۔"

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب بچے نے اس پلے کو گود میں لے کر گھر سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ اس ڈراؤنے پلے کو دیکھ کر گلی محلے کے بچے، اس بچے سے ڈرنے لگے تھے۔ سب پر اس کا رعب پڑ گیا تھا۔ جس حلوائی سے وہ اُدھار مٹھائی کھاتا تھا، اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی بچے سے پیسے مانگنے کی۔ گلی محلے کے بچے جان بوجھ کر اس کی زیادتیوں کو نظر انداز کیے رہتے تھے، اور ڈر کے مارے اس سے دوستی کا دم بھرتے تھے۔

ایک دن تو یہ ہوا کہ گلی محلے کے دو ایک لڑاکو قسم کے کتے اس پلے کے خونخوار انداز دیکھ کر دُم ہلاتے ہوتے بچے کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے گھر کے دروازے تک آگئے۔

پھر ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔

گھر والوں نے دیکھا کہ ان کا وہ ربر کا پلا پورا جوان کتا بن کر غالیچے پر کھڑا تھا۔ آنکھیں خونخوار ہو رہی تھیں۔ پنجوں کے ناخن اتنے بڑے کہ ایک ہی وار میں آنتیں نکال کر باہر رکھ دیں۔ دانت ایسے تیز کہ جہاں گڑ جائیں، وہاں کی بوٹی بوٹی نوچ لیں۔ اور چاروں ٹانگیں ایسی اکڑی ہوئی کہ جھپٹنے کے لئے تیار۔ پتلی کمر کے نیچے پیٹ اندر کو دھنسا ہوا جیسے اصلی شکاری کتوں کا ہوتا ہے۔ جسم کی ایک ایک نس پھولی ہوئی اور دُم اوپر کو اٹھی ہوئی۔ لگتا تھا ابھی جست بھرنے ہی والا ہے۔ ربر کے اس کتے کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر گھر والوں کی چیخیں نکل گئیں اور وہ سہم کر ایک کمرے میں چھپ گئے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ ان کا ربر کا کتا ڈرائنگ روم میں رکھی بیچ والی تپائی پر کھڑا ہے اور پاس ہی غالیچے پر گلی محلے کے پانچ سات کتے بیٹھے ہوئے گردنیں نیچے ڈالے زور زور سے دُمیں ہلا رہے تھے جیسے ربر کے کتے کی کہی ہوئی کسی بات کی پُرزور تائید کر رہے ہوں۔

اس منظر کو دیکھ کر گھر والے حواس باختہ ہوگئے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے اور گلی محلے کے اتنے سارے کتے ان کے ڈرائنگ روم میں آکر کیوں بیٹھے ہیں۔

جلد ہی ساری بات کھل کر سامنے آگئی۔

اگلے دن صبح ہی صبح گھر والوں نے سُنا کہ ان کے گھر کے سامنے بہت سے کتے بھونک رہے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ماجرا کیا ہے انہوں نے باہر جھانکا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔

ان کا اپنا ربر کا کتا، اچھا خاصا گوشت پوست کا کتا بن کر سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے آٹھ دس ہٹے کٹے کتے تھے اور وہ پنجے مار مار کر اور منہ اٹھا اٹھا کر غصے سے اس طرح بھونک رہے تھے، جیسے حملہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اُن کے اپنے کتے کی شکل ایسی بھیانک ہو رہی تھی کہ بالکل موت کا فرشتہ لگ رہا تھا۔

انہوں نے گھبرا کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

پھر انہوں نے سُنا کہ اُن کتوں نے علاقے میں دہشت پھیلا دی ہے۔ وہ جھنڈ کا جھنڈ آگے بڑھتے ہیں اور کبھی اس کو کاٹ لیتے ہیں، کبھی اس کو۔ کبھی اچک کر کسی کی گردن دبوچ لیتے ہیں کبھی کسی کی۔

ہر طرف ایسا سہم چھایا ہوا ہے کہ ہوا بھی ڈری ڈری سی لگتی ہے۔

اور سہمے ہوئے لوگ سر جوڑ کر یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ کتے ان کے سماج میں پنپ کیسے گئے۔ اور اب ان سے نجات پانے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔

بقیہ صفحہ ۹۴ جالے

میں شادی شدہ ادھیڑ عمر خواتین کے ساتھ غپ شپ میں گذرتا۔ کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن، پکوان کی نئی نئی ترکیبیں، بچوں کی بھولی بھالی شرارتیں ان کا محبوب موضوع تھیں۔ ایک شام وہ کلب میں جا کر بیٹھی ہی تھی کہ کسی نے بتایا افسر کا اچانک ہارٹ فیل ہوگیا۔ پتہ نہیں کیوں اُسے خیال آیا کہ افسر کی موت کی ذمہ دار وہی ہے۔ گیتا نے افسر کی موت کی خبر اُسے کیوں نہ دی۔ شاید اس کا خط راہ میں ہی ہو مگر پہونچ کر اس نے گیتا کو خط لکھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اسے اب بھی یقین تھا کہ اس نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ مگر اداسی بوند بوند اس کے دل، دماغ رگ رگ پر برسنے لگی۔ جس طرح کوئی مسافر کھلے میدان میں ہو اور بوچھار آجائے۔ وہ بھیگتی رہی۔

رات نیلو فر کو سلا کر وہ شب خوابی کے کپڑے تبدیل کرنے لگی تو اس کی نظر اپنی کلائیوں میں جگمگاتی چوڑیوں پر پڑی۔ اس نے چوڑیاں اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیں۔

بستر پر لیٹی تو خیال آیا کہ علیحدگی کے بعد بھی وہ ہمیشہ افسر کے متعلق ہی سوچتی رہی تھی اور اب ــــــ سوچنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں رہا تھا۔

فضا ابن فیضی

میدانِ جنگ ہوں، یہیں لشکر اتار دے
آ! اور میری پشت میں خنجر اتار دے
میں لے چکا ہوں بسط سے باہر کا جائزہ
اب مجھ کو میرے جسم کے اندر اتار دے
ہے یہ مرا وجود، اسی کینوس پہ تو
سارا درونِ ذات کا منظر اتار دے
آئینے سب کے، زنگ کی میراث ہیں یہاں
تو میرے ہی خزف میں یہ جوہر اتار دے
ایسے کئی چراغ مری دسترس میں ہیں
یہ آفتاب اسی کے افق پر اتار دے
ہے کتنا پاگداز سفر شش جہات کا
تلوؤں کو دیکھ! کاندھے سے بستر اتار دے
ہستی کا قرض میرے لئے ہے وبالِ دوش
گردن تو چھوٹے، تیغ اٹھا، سر اتار دے
تو بے جہت ہے، خود کو نہ کمرے میں بند رکھ
دیوارِ بے خودی میں کوئی در اتار دے
ہے ختم کے قریب سفر میرا، اب مجھے
دہلیزِ کائنات کے باہر اتار دے
سو جائے رفتہ رفتہ نہ معنی کا مد و جزر
الفاظ میں لہو کا سمندر اتار دے

● مئو ناتھ بھنجن۔ ضلع اعظم گڑھ (یو، پی)

اختر سعید خاں

لبِ سکوت پہ اک حرف بے نوا بھی نہیں
وہ رات ہے کہ کسی کو سرِ دعا بھی نہیں

خموش رہیئے تو کیا کیا صدائیں آتی ہیں
پکاریئے تو کوئی مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

اب اور نذر کو کیا لے کے زندگی آئے
کفیلِ صبح اگر خونِ کربلا بھی نہیں

جو دیکھیے تو جلو میں ہیں مہر و ماہ و نجوم
جو سوچیے تو سفر کی یہ ابتدا بھی نہیں

قدم ہزار جہت آشنا سہی لیکن
گزر رہا ہوں جدھر سے وہ راستا بھی نہیں

کسی کے تم ہو کسی کا خدا ہے دنیا میں
مرے نصیب میں تم بھی نہیں خدا بھی نہیں

اس ازدہام میں کیا نام کیا نشاں اختر
ملا وہ ہنس کے مگر مجھ سے آشنا بھی نہیں

● اندرونِ اتوارہ، بھوپال ..

آمنہ ابوالحسن

۲۷۔ پٹودی ہاؤس، کیننگ روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سرگوشی

اور اس دن وہ گھر سے نکل ہی گئی ——

کبھی تو اس کا ذہن خالی مکان کی طرح ٹھنڈا ہو جاتا کبھی اتنے خیالات آپس میں الجھ جاتے کہ سلجھاتے سلجھاتے نہ سلجھتے۔

دونوں حالتوں سے اسے بڑا ڈر لگتا۔

پھول پتے پیڑ سب منہ چڑاتے نظر آتے۔

سنہری دھوپ تاریکی بن جاتی۔

خود اس کا وجود ایک گنبد۔

وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

اتنا بڑا گھر —— روشن ہوادار —— زر زیور —— بچے ——

باغیچہ —— نوکر چاکر ——

ہمسائے —— مہمان —— رونق مگر ——

جب صبح ہوتی تو اسے تمنا ہوتی شام نہ ہو اور شام ہوتی تو دعا کرتی صبح نہ ہو۔ لیکن صبحوں اور شاموں کا سلسلہ اپنے پورے تسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری تھا۔ ان سے وابستہ ہر ہر مصروفیت اپنے وقت پر شروع ہو کر وقت پر ختم ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹروں نے کہا تھا۔ اسے کوئی بیماری نہیں۔ ملنے جلنے والے سبھی سوچتے کتنی قابلِ رشک زندگی ہے اس کی۔

جب بچے اس سے لپٹتے تو اسے بڑی راحت ہوتی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ ہواؤں میں اڑنے لگتی مگر جیسے ہی بچے کھیلنے چلے جاتے خوف پھر اس کے اندر اترنے لگتا۔

وہ اپنے بچاؤ کے لئے کتاب اٹھا لیتی لیکن الفاظ خلط ملط ہو جاتے۔

ٹرانسسٹر چلاتی تو گیت بھی چیخ بن جاتے۔

نرم ہری ہری دوب پر چلتی تو تلوے جلنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا ہجوم میں اپنے آپ کو گم کر دے۔ تھوڑی دیر یہ اچھا بھی لگتا پھر اس سے بھی اکتاہٹ ہونے لگتی۔

اپنے آپ میں ملتی تو پھر خیالات کی یورش ہوتی ——

خوشحال بچپن ——

خوبصورت جوانی ——

خوش آئند زندگی ——

کتنی اٹریکٹیو —— ایکٹف تھی وہ ——

بہترین طالبہ ——

بہترین گھر والی ——

بہترین ماں ——

بہترین مالکہ —— میزبان ——

بہترین دوست —— اور پڑوسی ——

سارا ماضی سانپوں کی طرح اس سے لپٹ جاتا۔ جتنی محبت اس نے کی —— جتنی اس سے کی گئی بہت کم کسی کے حصے میں آئی ہو گی مگر ایسے میں یکایک سب درہم برہم ہو گیا —— اس نے بے حد کوشش سے ہر ہر چیز کو واپس اپنی اپنی جگہ لے جانا چاہا لیکن قطعی کامیاب نہ ہو سکی۔ تب ناچار خاموشی اختیار کی —— شاید خاموشی ہی خلا کو بھر دے۔

پھول پھر رنگ برنگے ہو جائیں ——

پیڑ ہرے بھرے —— لدے لدے ——

دھوپ سندر سنہری ——

لیکن خاموشی کے قلعے میں وہ تنہا رہ گئی۔

کسی پھول نے اس کی طرف نہیں دیکھا ——

کسی پیڑ نے اپنا سایہ اس کے اطراف نہیں پھیلایا ——

دمکتی دھوپ اس تک نہ پہنچ سکی۔

وہ خالی خالی ہی رہی ــــ

جب جب وہ اپنے خاندانی البم دیکھتی جنہیں خود اس نے بڑے شوق اور دلچسپی سے ترتیب دیا تھا تو یقین نہ آتا وہ اتنی خوش اور مطمئن تھی ــــ ہر دم متبسم ــــ اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ۔ بچوں کے ساتھ۔ بہن بھائیوں کے ساتھ ــ رشتے داروں ــ دوستوں کے ساتھ ــ اپنی دلچسپیوں کے ساتھ ــ

کیمرے کی آنکھ میں سب کچھ محفوظ تھا مگر یہی سب کچھ اس کی زندگی سے نکل کر جانے کہاں گم ہو گیا تھا ــــ

مدت تک جھوٹی ہنسی ہنس کر اس نے خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دیا تھا پھر ہنسی بھی رفتہ رفتہ اس کے ہونٹوں سے غائب ہو ہو گئی جب وہ دوسروں کو ہنستا ہوا دیکھتی تو ایک ٹھیس سی دل میں اٹھتی وہ سوچتی ــ کچھ کھا پی کر خود کو ختم کر لے تب بچے سامنے آ کھڑے ہوتے ــ وہ خود کو لعنت ملامت کرتی ــ انہیں اپنے احساس سے سینے سے لگا لیتی ــ بغیر ماں کے بچے کس طرح پل سکتے ہیں پل بھی گئے تو مکمل کہاں ہو سکتے ہیں۔ تب وہ انتشار کی تمام ہولناکی کو جھٹک دیتی۔

خود کو پھر سے استوار کرنے لگتی ــــ

یہ سب کرتے ہوئے اس کا جی چاہتا چیخ چیخ کر رو دے یا زور زور سے ہنسے لیکن نہ وہ چیخ سکی نہ ہنس سکی ــ پھٹی پھٹی آنکھیں بے ساکت ہی رہی اور ساری زندگی ساری جگمگاہٹ اس کے وجود سے نکل نکل کر نہ معلوم کہاں کہاں بکھر گئی ــ اب اسے اپنا آپ بالکل اندھیرا نظر آنے لگا۔

کہیں بھی کوئی روشن دان نہ تھا ــــ

آہستہ آہستہ اس نے تمام کتابیں الماریوں میں مقفل کر دیں ــ

تمام تصویریں ٹرنکوں میں ڈال دیں ــــ

ہمسائیوں سے کترانے لگی ــــ

مہمانوں سے بچنے لگی ــــ

دعوتیں نظر انداز کرنے لگی ــــ

پرانے نوکروں کے سہارے گھر کا کام باقاعدگی سے چلتا رہا مگر جو بے قاعدگی اس کے اپنے اندر پیدا ہو گئی تھی وہ کسی جتن سے دور نہ ہو سکی ــ

صرف بچے تھے جو احساس طمانیت بخشتے مگر اپنی تعلیمی مصروفیتوں اور عمر کے تقاضوں میں وہ کبھی سوچ ہی نہ سکے۔ ان کی ماں ہراساں ہے ــ ہراسانی کی کیفیت ان کے ذہنوں سے کوسوں دور تھی ــ خالی پن سے وہ واقف ہی نہ تھے ــ انہیں سخت حیرت تھی کہ ڈھیروں عمدہ چیزوں کے بیچ ان کی ماں اتنی مرجھائی ہوئی کیوں ہے۔

وہ پاپا سے پوچھنا چاہتے

ماں اتنی مایوس کیوں ہے مگر اول تو پاپا ملتے نہیں ــ مل بھی جاتے تو تھوڑا ساتھ رہ کر فوراً جاتے۔

"اگر میں اسی طرح وقت گنواتا رہا تو کام کاج ٹھپ سمجھو۔ ساری محنت اکارت ــ پھر نہ کہنا ہمارے پاس اچھی اچھی چیزیں نہیں۔ یہ نہیں وہ نہیں ــ"

وہ خوشی خوشی پاپا کو اجازت دے دیتے ــ اپنا اصل سوال بھول ہی جاتے ــــ

تو جب وہ گھر سے نکلی احساس ہی نہیں ہوا کیا کر رہی ہے۔ بڑی دیر تک چلنے کے بعد تھک گئی ــ تھک گئی تو ایک جگہ بیٹھ گئی ــــ

آتے جاتوں میں کچھ نے سرسری انداز سے اسے دیکھا کچھ نے گہری گہری نظروں سے ــــ

خوفزدہ ہو کر وہ پھر چلنے لگی ــــ

بھوک کا کوسوں پتہ نہ تھا مگر پیاس سے اس کا گلا سوکھ رہا تھا اس نے چاہا پلٹ جائے مگر آنکھوں میں اندھیرا سا لہرایا اور وہ لڑکھڑائی لوگ سرعت سے اس کے اطراف جمع ہونے لگے۔

خدا جانے کون ہے ــ

چہرے سے شریف لگتی ہے ــــ

کپڑے لتوں سے خوشحال ــــ

تب اکیلی پیدل کیوں ــ کہاں جا رہی ہو گی ــ ساتھ کوئی بھی نہیں

کچھ بھی نہیں ــ کیسے ــ پتہ معلوم کریں ــ نڈھال بہت ہے

اسپتال لے چلیں ــــ یا ــــ پولیس اسٹیشن ــــ؟

شاید دماغی حالت ٹھیک نہیں ــــ

بڑھتی ہوئی شام کے ساتھ ساتھ بھیڑ بھی بڑھتی جا رہی تھی جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی تھیں مگر ایک آدمی بھی اس سرگوشی کو نہ سن سکا جو اس کے لبوں پر ٹھٹکی ہوئی تھی ــــ

تھوڑی محبت ــ!

تھوڑی محبت دے دو ــ!!

سب آسائشیں لے لو بس محبت دے دو ــــ

ظہیر غازیپوری

دیوھیکل

سکوتِ شب !
تجھ سے مانگتا ہوں
وہ درد ــــــ
جس پر نثار ہو جائیں زندگی کی تمام خوشیاں
وہ کرب ــــــ
جس پر شعورِ انساں کو رشک آئے
وہ زخم ــــــ
جس پر طمانیت کا غرور ٹوٹے
وہ ضبط ــــــ
جس پر نشاط حامد کو نیند آئے
میں جانتا ہوں
یہ سارے الفاظ
تیری مٹھی میں
زندہ کردار کی طرح ہیں
یہی سبب ہے
کہ نام تیرا ہے دیوھیکل !

ارتقاء

گذرگاہیں وہی ہیں
قلعے، چوپالیں، وہی ہیں
اکے، تانگے، بگھیاں
اب شاہراہوں پر نظر آتی نہیں
فراٹے بھرتی کاریں، جیپیں اور موٹر گاڑیاں
اب شہر کی پہچان ہیں !

انسان !
جیسے کیمرے کی آنکھ ہے
جس میں ہر ساعت بدلتے ہیں مناظر
جلتی بجھتی روشنی میں
مختلف رنگوں کے سائے تیرتے ہیں !

اجنبی احساس
چہرے ناشناس
ایقان کی سرحد سے دور آخر کہاں ہم آگئے
ہر سمت کالی ہے ردا
روشن نظر تاریک ہے !

سبز ادراک

دھوپ لذت بانٹتی ہے
یہ غلط ہے
شیریں لمحوں کی عذوبت چاٹ کر
مختلف رنگِ طبیعت بانٹتی ہے
سُرخ، نیلے، کاسنی رنگوں سے
مجھ کو کیا غرض
میں تو سبز ادراک کی تفہیم
دنیا بھر کو دینا چاہتا ہوں
میں پیمبر تو نہیں
اک سلسلہ ہوں آگہی کا !

● آفس سپرنٹنڈنٹ، بی۔ ایس۔ آر۔ ٹی کارپوریشن، ہزاری باغ ۸۲۵۳۰۱ (بہار)

خلش بڑودوی

اوروں کو خبردار بھی کرنے کے لئے تھے
وہ حادثے جو ہم پہ گذرنے کے لئے تھے

میں شاد بہت تھا جنھیں پلکوں پہ سجا کر
وہ سارے حسیں خواب بکھرنے کے لئے تھے

طوفان میں اک ڈوبنے والے تھے فقط ہم
باقی تو سبھی پار اترنے کے لئے تھے

وہ اس کے تراشے ہوئے الفاظ وہ جملے
تیروں کی طرح دل میں اترنے کے لئے تھے

دریا کی نوازش تھی نہ موجوں کی سیاست
جو ڈوب کے ابھرے وہ ابھرنے کے لئے تھے

تصویر بلاشبہ چمک اٹھی ہے لیکن
یہ رنگ تو کردار میں بھرنے کے لئے تھے

ہم موت کی آنکھوں میں پروئے رہے آنکھیں
جینے سے جنھیں پیار تھا ڈرنے کے لئے تھے

اُجڑا ہوا دیکھا انھیں اس بار سفر میں
وہ گھر جو مسافر کے ٹھہرنے کے لئے تھے

یاروں نے کئے یوں تو خلش کام ہزاروں
وہ کام نہ کر پائے جو کرنے کے لئے تھے

● یاقوت پورہ، بڑودہ (گجرات)

انور خان

۸۴/۲۲ سکھی والی چال، تیسرا منزلہ۔ شیخ برہان قمرالدین سٹریٹ۔ بمبئی ۔ ۱

جالے

کالونی کے دروازے پر ٹیکسی رکی اور ایک عورت بڑی تمکنت سے برآمد ہوئی۔ پیازی رنگ کی شلوار، قمیص میں ملبوس، سیاہ چشمہ لگائے۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے جو قلفی والے سے محو گفتگو تھا چونک کر اسے دیکھا۔ ارے، یہ تو رضیہ بیگم ہیں، افسر صاحب کی پتنی۔ بے اعتنائی سے اس نے بنڈی سے بیڑی نکالی اور پھر قلفی فروش کی طرف متوجہ ہوگیا۔

سہ پہر پورے عروج پر تھی۔ ہوا کے جھونکے رضیہ کے آویزوں سے اٹکھیلیاں کرتے گذر رہے تھے۔ کالونی کے بچے کھیل میں اس قدر محو تھے کہ کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ کون جا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جوں ہی وہ ایک فاتح کی طرح کالونی میں داخل ہوگی ہل چل مچ جائے گی۔ عورتیں کھڑکیوں سے جھانکنے لگیں گی۔ مگر دریچے خالی خالی رہے۔ شاید ابھی کسی کو پتہ نہیں چلا تھا۔ ایک سایہ سا اسکے چہرے پر آکر گذر گیا۔ چشمہ اتار کر اس نے پرس میں رکھ لیا۔ ہر چیز آج معمول سے کچھ زیادہ شفاف تھی۔ رنگ کچھ زیادہ گہرے نظر آ رہے تھے۔

زینے پر ایک گجراتی ملازمہ سے مڈبھیڑ ہوئی۔

"چھٹا چھیڑا مل گیا میم ساب؟"

اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ نوکرانیوں کو جیسے ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ اچھا ہوا اس نے بے نیاز، سپاٹ لہجے میں کہا۔ جیسے کہہ رہی ہو ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔

فلیٹ کا دروازہ کھول کر رضیہ داخل ہوئی تو بکھری چیزیں، دھول سے اٹا فرش فریادی نظر آئے۔ ان کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے رضیہ نے گیس کا چولہا جلا کر سالن کی پتیلی چڑھائی کیونکہ بھوک سے وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ گھر سے وہ سالن پکا کر چلی تھی۔ سامنے رکھے شلیف سے اس نے تام چینی کی پلیٹ، پیالہ، چمچ وغیرہ نکالے اور کپ بورڈ سے ڈبل روٹی کے سلائس۔ برتن کھنکھناتے کھنکاتے سالن گرم ہوگیا۔ پیالے میں اس نے سالن نکالا اور پلیٹوں، چمچوں سمیت ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کھانے کے لئے بیٹھی تو گھر کا سونا پن کھلنے لگا۔ اس نے آشا بھونسلے کے فلمی گانوں ایک کیسیٹ ٹیپ ریکارڈ پر چڑھا دیا۔ کھانا شروع کیا تو ریکارڈر کی آواز کچھ کم معلوم ہوئی، اس نے اٹھ کر آواز کا حجم پورا کھول دیا۔ آشا بھونسلے کی اسٹیریو فونک آواز دیواروں سے ٹکرا کر کالونی میں دور دور تک سنانے لگی۔ وہ ہنسی جیسے افسر سے انتقام لے رہی ہو۔ افسر کو اونچی آواز بالکل ہی پسند نہ تھی یہ کیا گنواروں کا طریقہ ہے؟ وہ چیخنے لگتا۔ فوراً بند کرو اسے۔ آزادی بھی کیا نعمت ہے۔ اس نے سوچا۔ میکے میں تھی تو وہ سارا دن ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ اونچی آواز میں بجاتی رہی جس دن خاموش رہتی پڑوسی سمجھ جاتے کہ رضیہ گھر پر نہیں۔ افسر نے تو موسیقی سننے کا سارا مزہ ہی غارت کر دیا تھا۔ بہرحال اب وہ آزاد خلع ہے۔ جب اس نے خلع کے لئے درخواست دی تھی سب ہی حیران ہوئے تھے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن سب سمجھانے آئے تھے۔ لیکن افسر گھر چھوڑنے پر کیسے راضی ہوگیا؟ فلیٹ تھا تو بہرحال رضیہ کے نام پر ہی، اس کے پپا نے جہیز میں دیا تھا۔ اس نے نیلو فر کو لینے کے لئے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ اس کی صورت سے ہی پشیمانی ٹپکتی تھی۔ ورنہ وہ اسے کیس واپس لینے کے لئے کیوں کہتا۔ رضیہ گھر کو تباہ کرکے کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے خلاف عادت بڑے نرم لہجے میں کہا تھا۔ اس نے کیس واپس لے لیا ہوتا مگر تب ہی اسے خیال آیا تھا کہ یہ آزادی کا آخری موقع ہے۔ مہینوں میں تو وہ اپنے حوصلوں کو ارادوں کو مجتمع کر پائی تھی اور افسر کی تو سرشت ہی ایسی تھی۔ اس نے جب بھی اس کی طرف دیکھا یوں دیکھا جیسے کسی حقیر کیڑے کو دیکھ رہا ہو۔ ایسے میں اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ زمین میں سما جائے یا فضا میں تحلیل ہو جائے کہ افسر کی نظر اس پر نہ پڑے۔ کوئی چیز کبھی اس کی مرضی

کے مطابق نہ ہوتی۔ یہ چیز یہاں کیوں پڑی ہے۔ وہ چیز وہاں کیوں رکھی ہے۔ انڈہ تلتے ہوئے زردی ٹوٹ جاتی تو وہ آبل پڑتا طشتری اٹھا کر پھینک دیتا۔ تمہارے ماں باپ نے تمہیں کچھ سکھایا نہیں۔ پتہ نہیں کس جانوروں کے خاندان سے آئی ہو۔ کسی نے تمہیں تہذیب نہیں سکھائی۔ اپنے میکے کو بُرا بھلا کہتے سن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ماں باپ نے تو اُسے کبھی گھورکا بھی نہ تھا ـــــ۔ پپا بھی گھر میں سب سے زیادہ اسی کو چاہتے تھے۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوتی تو بڑے پیار سے سمجھاتے۔ بھائیوں نے ہمیشہ ہتھیلی پر رکھا۔ ایک افسر تھا کہ چہرے پر ہمیشہ خشونت چھائی رہتی۔ نیلوفر اس کی دس سالہ بچی بھی اسے دیکھ کر سکڑ جاتی۔ نیلوفر ہی کیا کوئی بھی دیکھ کر آپ غیر ارادی طور پر سکڑ جاتا تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا تھا۔ وہ اپنے ارادہ پر اٹل رہی اور آج وہ آزاد تھی۔ رضیہ نے ایک لمبی سانس لی اور چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا۔

ٹیپ ریکارڈر کی بلند آواز سے اُس کے سر میں دھمک ہونے لگی تھی۔ عادت جو نہیں رہی تھی۔ ہاتھ دھو کر اُس نے بے خیالی کے عالم میں آواز کم کی اور گیلری میں جا کھڑی ہوئی۔ اس گیلری کے عین سامنے دوسری گیلری میں ایک پنجرہ لٹک رہا تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ یہاں رہتے ہوئے اتنے سال ہوگئے تھے مگر ـــ پنجرے کے وجود سے جیسے وہ آج آگاہ ہوئی تھی۔ اس نے نظریں دوڑائیں کتنی ہی گیلریوں سے پنجرے لٹک رہے تھے۔ اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ پنجروں کا چلن اس قدر عام ہوگا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سارے پنجرے کھول دیتی۔ وہ کچھ دیر گیلری میں کھڑی رہی پھر خیال آیا کہ سارا کام ابھی یوں ہی پڑا ہے۔

کپڑے تبدیل کر کے اس نے صفائی شروع کی۔ پلنگ کی چادر، پردے تبدیل کئے۔ الماریوں سے دھول جھٹکی۔ ڈریسنگ ٹیبل صاف کرتے ہوئے افسر کی تصویر سامنے آئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے خوف سا محسوس ہوا۔ اس کی چبھتی نگاہیں! اس نے جلدی سے فریم اٹھا کر دراز میں ڈال دی۔ نیلوفر کے کھلونے جابجا فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ انہیں سمیٹ کر اس کے بکس میں ڈالا۔ ملازمہ کے آنے میں ابھی وقت تھا۔ فرش پر دھول اتنی تھی کہ اُسے الجھن ہونے لگی۔ اس نے خود ہی جھاڑو لگائی اور پوتا مارا تب کہیں چین پڑا۔

اتنا کام وہ کسی اور روز کرتی تو تھک کر چور چور ہو جاتی۔ مگر آج وہ خود کو بہت ہلکی پھلکی اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی، عورتوں کا ایک میگزین لے کر پلنگ پر دراز ہو گئی۔

چار بجے ملازمہ آئی تو اس نے بھی وہی سوال کیا۔

بائی، سنا تم کو طلاق مل گیا۔

ہوں......اُس نے جواب دیا۔

تو تم اب اکیلا رہے گا ادھر۔

ہاں، پر تم آئے گا نا۔

"ام کیوں نہیں آئے گا بائی" وہ ہنسی ام کو ہمارے پیسے سے مطلب،

نیلوفر اسکول سے آئی تو اُس نے نیلوفر کے کپڑے بدلے۔ چائے بنا کر دی۔ ٹوسٹ پر مکھن لگایا۔ خود بھی چائے پی۔ ملازمہ کام ختم کر کے گئی تو وہ بھی حسبِ معمول نیلوفر کو لے کر چہل قدمی کے لئے نکلی۔

راستے میں خورشید دارا بجی اور مسز پریرا ملیں وہ اسے ایسی ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ گویا علیحدگی اس نے نہ لی ہو بلکہ افسر نے دی ہو۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ مختصر سے علیک سلیک کے بعد وہ آگے بڑھ گئی۔

پارک میں پہونچی تو کوئی بنچ خالی نہ تھی سوائے ایک بنچ کے۔ اُس پر بھی مسٹر بسواس براجمان تھے۔ ان سے بھی ناچار گفتگو کرنی پڑی۔

مسز...... میرا مطلب ہے مس رضیہ، انہوں نے کہا۔ آپ نے اچھا کیا اس BRUTE سے علیحدہ ہوگئیں۔

مسٹر بسواس کی بات رضیہ کو پسند نہیں آئی۔ شکایت اسے تھی۔ کوئی اور افسر کا ذکر اس طرح کیوں کرے۔

اگلے چند روز بہت اچھے گذرے۔ سب سے پہلے وہ اپنے والدین کے گھر گئی۔ وہ لوگ بہت اداس تھے۔ مگر اُسے خوش دیکھ کر ان کی افسردگی کچھ کم ہوئی۔ وہ بھی ہنسنے بولنے لگے۔ بھائی بہن بھی آکر ملے۔ دوپہر میں کھانا کھا کر لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ پانچ بجے ماں نے زبردستی اٹھایا۔ "سونے کے لئے آئی ہے کیا یہاں، ماں نے ہنستے ہوئے فہمائش کی۔"

"میں کبھی یہاں آتی ہوں تو اسی طرح سو جاتی ہوں"۔ اس کی بڑی بہن نے کہا 'پتہ نہیں کیا بات ہے۔ میکے میں جیسی گہری نیند آتی ہے ایسی تو اپنے گھر پر کبھی نہیں آتی۔

رات میں سب نے ساتھ میں کھانا کھایا۔ برسوں بعد وہ اس طرح یکجا ہوئے تھے دیر تک غپ شپ رہی۔ والدین کے اصرار کے باوجود میکے میں وہ نہیں رکی گھر کا سارا کام چوپٹ ہو جاتا۔ نیلوفر کا اگلے روز اسکول تھا۔ اور اس کی ساری چیزیں گھر پر ہی تھیں۔ چھوٹا بھائی گھر

تک ساتھ آیا۔

ایک ایک کرکے وہ اپنی داسہیلیوں سے ملی۔ کئی نئے لباس اُس نے بنوائے۔ کبھی شاپنگ کو نکل جاتی۔ کبھی نیلوفر کو لے کر کسی تفریح گاہ پر پہونچ جاتی۔ رانی باغ، پلینیٹیرم، سائنس سینٹر سب جگہیں اس نے نیلوفر کو دکھا ڈالیں۔ گیتوں اور غزلوں کے کئی نئے کیسیٹ خریدے۔ کئی فلمیں دیکھ ڈالیں دن بھر مصروف رہنے کے باوجود تھکان کا احساس خدا جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ خورشید داراب جی کے اصرار پر اس نے کلب بھی جانا شروع کر دیا۔ کلب کی ممبر تو وہ پہلے سے ہی تھی مگر افسر کے ساتھ کبھی کبھی کسی خاص تقریب میں ہی شرکت کرتی تھی۔ شام میں سیر کے لئے حسب معمول وہ نکلتی ہی تھی مگر اب کچھ اور ہی تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ چار بجے سے وہ بننے سنورنے لگتی۔ زرد، خشک چہرہ ایک بار پھر گلنار ہو گیا۔ صحت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ راستہ چلتی تو دوڑنے کو جی چاہتا۔ بات بات پر ہنسی آتی۔ عدالت کے آخری دن کا افسر کا پژمردہ چہرہ اور زخمی نگاہیں کبھی تصور میں آتے بھی تو آزادی کے احساس اور فرط انبساط میں فراموش ہو جاتا۔ نیلوفر نے دو ایک بار پوچھا ضرور کہ پپا کہاں ہیں؟ مگر وہ بھی افسر کی عدم موجودگی سے شاید خوش تھی کہ اُسے ہمہ وقت گھورتی تہہ دیدہ نگاہوں سے نجات ملی۔

دن گذرتے گئے۔ احساس مسرت کی جگہ اطمینان نے لے لی زندگی ایک بار پھر جیسے معمول پر آگئی۔ رضیہ کی زندگی ایک بار پھر گھر، بازار، کلب، نیلوفر کے اسکول اور شام کی سیر میں محدود ہو گئی۔ اُسے اب کوئی شکایت نہیں تھی مگر کبھی کبھی خالی پن کا کچھ احساس ہوتا۔ عجیب سی بے چینی کروٹ لینے لگتی۔ صبح آنکھ کھلتی تو ایک طویل دن سامنے نظر آتا۔ ملازمت کی اُسے نہ خواہش تھی نہ ضرورت۔ والدین کا دیا اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ کئی کمپنیوں کے شیئرز تھے جن سے باقاعدہ منافع ملتا رہتا۔ بینک میں طویل میعاد کے لئے رقم جمع تھی جہاں سے ہر مہینے اس کے جاری کھاتے میں رقم جمع ہوتی رہتی۔

ایک روز رضیہ کلب میں تاش کھیل رہی تھی۔ پاس کی میز پر افسر کا نام سن کر اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ پھر کان لگا کر ان کی گفتگو سننے لگی۔ مسٹر ورما لوگوں کو کہہ رہے تھے کہ افسر کا بزنس فیل ہو گیا۔ باوجود اس کے افسر کا اب اس سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا، یہ خبر سن کر اُسے دُکھ ہوا۔ ویسے بھی افسر کا خیال کسی نہ کسی حیلے سے اکثر اس کے من میں آتا ہی تھا۔ مگر اس سے زیادہ دُکھ اسے اس بات سے ہوا

کہ لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا تعلق رضیہ سے جوڑ دیا۔ کہا جاتا تھا کہ افسر رضیہ سے علیحدگی کے بعد بہت بدل گیا تھا، افسردہ رہتا تھا۔ کچھ لاپرواہ بھی ہو گیا تھا۔ نیلوفر کے اسکول کے باہر کئی لوگوں نے اسے گاڑی کھڑی کر کے نیلوفر کو تکتے بھی دیکھا تھا۔ افسر کے متعلق طرح طرح کی باتیں رضیہ کو معلوم ہوتی گئیں۔ اس نے سوچا کلب میں لوگ اسے ہی الزام دیتے ہوں گے پہلے بھی جب خلع کے بعد وہ کلب میں موضوع گفتگو بنی تھی تو اُسے بڑی جھینپ محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ لوگ اُس سے ہمدردی ظاہر کرتے تھے۔ اب لوگوں کی ہمدردیاں افسر کی طرف منتقل ہو رہی تھیں۔ اُس نے کلب جانا کم کر دیا۔ شاید وہ کلب جانا ترک کر دیتی مگر اتنے سارے لوگوں کے درمیان اُسے اچھا لگتا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں افسر کے بارے میں جاننے کی خواہش بھی بڑھ گئی تھی۔ چار پانچ مہینوں کے بعد افسر امریکہ چلا گیا۔ پھر ایک عرصے تک اُسے افسر کی کوئی خبر نہ ملی۔

شاید یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ جس شام اس نے افسر کے امریکہ جانے کی خبر سنی اس کے اگلے ہی روز سویرے جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے اپنا جسم پتھر کی طرح بھاری محسوس کیا۔ دیر تک وہ بستر سے اٹھ ہی نہ سکی۔ اچھا ہوا کہ اس روز اتوار تھا۔ اگر نیلوفر کا اسکول ہوتا تو بڑی مشکل ہوتی۔ یہ کیفیت کم زیادہ چار پانچ روز رہی پھر خود بخود ختم ہو گئی۔ اور وہ پہلے کی طرح خود کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگی۔ خورشید کے کہنے پر اُس نے اب جسم کو تندرست اور پھر تیلا رکھنے کے لئے ورزشیں شروع کیں۔ خود کو مصروف رکھنے، خوش رکھنے کے لئے اس نے دانستہ کوششیں کیں۔ اس کا اثر بھی ہوا چہرے سے زردی تو کب کی جا چکی تھی۔ ساڑی کے بجائے اس نے شلوار، قمیص کا استعمال شروع کیا جس کی وجہ سے وہ اور بھی کم عمر نظر آنے لگی، خوش لباس، چہرے پر ٹھہراؤ اور وقار اور بھرے بھرے جسم نے اس کی شخصیت کو ایک نیا پن اور پختگی عطا کی۔ جو بھی دیکھتا متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا۔ کئی مردوں نے قریب آنے کی کوشش کی۔ کلب میں ہنستے کھیلتے ہوئے بارہا ایسا ہوا کہ اُس کی نظر اٹھی تو اس نے کسی کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا۔ کئی بار اُسے لگا کہ کوئی شخص خواہ مخواہ اُسے ستا رہا ہے۔ کبھی زبانی کبھی نظروں میں کئی پیغام آئے کسی نے فلم، کسی نے چائے کی دعوت دی مگر رضیہ سے جب بھی کوئی مخاطب ہوا، اُس کی آنکھوں میں رضیہ کو پنجرے لہرانے

نظر آئے۔ انجانی فضاؤں میں پرواز کرنے کی اُسے نہ خواہش تھی نہ ہمت۔ انسانی رشتوں پر سے اس کا اعتقاد ہی اٹھ گیا تھا۔ اس کی سہیلیوں نے اُسے بہت اکسایا مگر بقول اُس کے انسانی رشتوں کا حال پتنگ جیسا تھا کہ ادھر فضا میں بلند ہوئی، کچھ دیر فضا میں لہرائی، ابھی جی خوش ہوا ہی تھا کہ ڈور کٹی یا ٹوٹی اور کاغذ اور تیلی کا ڈھیر ہوا اوروں کے رحم و کرم پر۔ دیر یا سویر تمام تعلقات ختم ہو جاتے ہیں یا بوجھ بن جاتے ہیں۔

ایک صبح وہ نوکرانی کو ٹھیک سے کپڑے دھونے کی ہدایت کر رہی تھی کہ ڈاکیہ خط ڈال گیا۔ کافی دنوں بعد کوئی خط اس کی دہلیز پر آیا تھا۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے خط اٹھا کر دیکھا۔ امریکہ سے آیا تھا۔ اس کی سہیلی گیتا جھویری کا خط تھا۔ اسے پتہ نہیں کیوں مایوسی ہوئی۔ لکھا تھا :

پیاری رضیہ !

تمہارے شوہر کو یہاں آج ایک دعوت میں دیکھا تو تمہاری یاد بڑی شدت سے ستانے لگی اور تمہیں خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اسی دعوت میں مجھے پتہ چلا کہ تم نے افسر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی۔ تفصیل سے لکھو، یہ سب کیسے ہوا۔ افسر خلاف توقع بڑی خوش دلی سے ملا۔ اس کے ساتھ ثریا وسیم بھی تھی۔ سنا ہے وہ اکثر اس کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔ تم شاید میرے بارے میں جاننے کی خواہشمند ہو گی۔ میں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ مسٹر جھویری بھی ٹھیک ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں جو اسکول جاتے ہیں۔ تم خط کا جواب فوراً بھیجو پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔

تمہاری

گیتا

اتنے دن بعد افسر کے متعلق جان کر اُسے خوشی ہوئی اگرچہ ثریا وسیم کا ذکر اُسے کھٹکا۔ لیکن اب اس کا افسر پر حق ہی کیا تھا۔ پھر بھی اس کا جی چاہا کہ افسر سے اس کی دوستی نہ بڑھے۔

اس روز وہ سارا دن گھر پر رہی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹی تو بدن پھر بھاری بھاری سا لگا۔ نیلوفر اسکول سے لوٹی بھی مگر وہ اٹھ نہیں پائی۔ نیلوفر سے دیر تک وہ بدن کو کبھی دبواتی کبھی کھجلاتی رہی۔ مگر بے سود۔ اس کی طبیعت پھر کئی دن تک یوں ہی ماندہ رہی۔ اس بار اس نے ایک خاتون ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ طبی معائنوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو ٹانکوں اور وٹامنوں کے مسلسل استعمال پر ختم ہوا۔ کبھی افاقہ ہو جاتا، مہینے دو مہینے اچھے گزرتے پھر وہی حال۔ طبیعت کئی کئی دن تک بوجھل رہتی۔ طبیعت پر ایک بے دلی سی چھائی رہتی۔ پھر ایک روز وہ اٹھی تو بالکل صحت مند۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ رفتہ رفتہ ان دوروں کو بھی اس نے معمول سمجھ کر قبول کر لیا۔

وقفے وقفے سے گیتا کے کئی خط آئے۔ ہر خط میں افسر کا ذکر ہوتا۔ افسر کس تقریب میں ملا۔ کس تفریح گاہ میں نظر آیا۔ افسر سے کہاں ملاقات ہوئی۔ اس کا بزنس کیسا چل رہا ہے۔ ایک خط سے اسے پتہ چلا کہ افسر نے ثریا وسیم سے شادی کر لی۔ اچھا ہی ہوا۔ اس نے سوچا۔ شاید اب وہ زیادہ خوش ہو۔

ایک روز مسز مرزا اُس کے گھر آئیں۔ وہ کئی سال لندن میں رہی تھیں۔ اور لو میرج کی تھی۔ ایک زمانے میں رضیہ نے ان کے بڑے چرچے سنے تھے۔ بڑی کامیاب ڈاکٹر تھیں۔ پھر پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ سب فیشن چھوڑ دیا، برقع پہننا شروع کیا۔ تبلیغی جماعت کی بڑی سرگرم ممبر بن گئیں۔ ہر جمعرات کو ان کے مکان پر اجتماع ہونے لگا۔ وہ زبردستی رضیہ اور نیلوفر کو اپنے گھر جلسے میں کھینچ لے گئیں۔ اپنے ساتھ تم بیٹی کو کیوں دین سے ناواقف رکھنا چاہتی ہو انہوں نے کہا۔ ویسے بھی تو تم تنہا وقت ضائع کرتی ہی ہو۔ ہفتے میں ایک روز ہمارے مکان پر آؤ گی تو کیا نقصان ہو گا۔ الٹے کچھ نہ کچھ حاصل ہی ہو گا۔

شروع شروع میں رضیہ کو ان کی باتیں عجیب سی لگیں۔ کچھ اچھا بھی لگا۔ کچھ خوف بھی محسوس ہوا۔ یہ عورتیں جہنم اور قبر کے عذابوں کا ذکر کچھ اس طرح بیان کرتی تھیں گویا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہی ہوں۔ رضیہ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ نماز تو اُس نے بچپن میں سیکھی ہی تھی۔ ایک بار پھر باقاعدگی سے پڑھنے لگی۔ مسز مرزا نے کچھ وظیفے بھی سکھا دیے۔ اُسے واقعی کچھ سکون ملا۔ اچھا بھی لگا۔ ایک انجانی طاقت پر سب کچھ چھوڑ کر وہ جیسے بے فکر ہو گئی۔ بے دلی کے دورے بھی اب کم ہو گئے۔ مگر چند مجلسوں کے بعد اُس نے مسز مرزا کے گھر جلسوں میں جانا بند کر دیا کیوں کہ عذاب قبر، پل صراط، میدان حشر کی باتیں سن سن کر اُسے خفقان ہونے لگا۔ نماز وہ پابندی سے پڑھتی رہی۔

کلب اب بھی وہ ہفتے میں دو ایک بار ضرور جاتی مگر بس سہیلیوں سے ملنے۔ تاش وہ کبھی کبھار ہی کھیلتی۔ زیادہ وقت دوسروں کے

[باقی صفحہ ۱۴۰ پر]

عبداللہ کمال

۱

میرا احساس کھرچ کر لے جائے
کوئی شعلوں کا سمندر لے جائے

کاش، اترے وہ فرشتہ بھی اک دن
نوچ کر فکر کا شہ پر لے جائے

جب مقدّر ہی حماقت جینا ہے
آسماں عقل کا پتھر لے جائے

سر، کہ پابندِ عناصر ہی کب ہے
کیا پتہ کب کوئی خنجر لے جائے

کوئی کابوس زدہ شب ہے مجھ میں
کب لہو پگھلے، مرا ڈر لے جائے

کنڈلی مار کے بیٹھا ہوں اندر
بین کی لے مجھے باہر لے جائے

کس کا موسم مری شاخوں پہ اترا
کوئی طائر مرا شہ پر لے جائے

کسی کی آنکھوں کا دھواں کھینچے دل کو
شام ڈھلتے ہی مجھے گھر لے جائے

۲

کریں سبیل ہوا کی، کہ بادبان کھلے
زمیں پہ حبس بہت ہے اب آسمان کھلے

میں پرشکستہ نہیں، پر سمیٹے بیٹھا ہوں
نئی دشا تو کھلے، پھر مری اڑان کھلے

نیا محاذ خود اپنے خلاف کھولا ہے
مری انا پہ مری فتح کا نشان کھلے

کبھی بہشتِ تصوّر نظر کا رزق بنے
کبھی یقین کا شہ پرِ گمان کھلے

وہ میری جنبشِ انگشت، اور وہ وحشیِ غزل
کھلے تو ایسے کہ جیسے کسی کمان کھلے

ورق ورق میں اسے کھولتا چلا جاؤں
وہ حرف حرف سا اک روز مجھ پہ آن کھلے

عجب جمود سا طاری ہے شاعروں پہ کمالؔ
عجب نہیں کہ نئی چائے کی دوکان کھلے

۳

اپنے ہونے کا اک اک پل تجربہ کرتے رہے
نوکِ نیزہ پر بھی ہم رقصِ انا کرتے رہے

اک مسلسل جنگ تھی خود سے کہ زندہ رہ گئے
زندگی! ایسے بھی ہم تیری ثنا کرتے رہے

بے طلب بڑھتا رہا ہر لمحہ قرضِ جاں کا بوجھ
بے سبب ہی ہر نفس خود کو ادا کرتے رہے

تم تو اے خوشبو ہواؤ! اُس سے مل کر آگئیں
ایک ہم تھے، زخمِ تنہائی ہرا کرتے رہے

ہاتھ میں پتھر نہ تھا چہرے پہ وحشت بھی نہ تھی
پھر بھی خود کو دیکھ کر ہم قہقہہ کرتے رہے

دور تک پھیلا دیئے کہسار، جنگل، وادیاں
رزق دی آنکھوں کو ہر منظر نیا کرتے رہے

زہر خود بوتے رہے اگلی ہواؤں میں کمالؔ
چند سانسوں کو بھی ہم بے ذائقہ کرتے رہے

دوسرا منزلہ، شام جی بلڈنگ، نور باغ، ڈونگری، بمبئی ۹

شفق

کبیر گنج ۔ سہسرام ۔ ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

خزاں گزیدہ

کاریں دھول اڑاتی ہوئیں دروازے پر رک گئیں۔

اگلی کار سے ایک بوڑھا مرد، عورت اور ایک جوان لڑکا اترا، انہوں نے گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا پھر ان کی نظریں ایک مکان پر ٹھہر گئیں چہار دیواری کے اوپر گھاس کی فصیل کھڑی تھی، چھپر کے کھپرے ادھڑے ہوئے تھے، دیواروں کا رنگ و روغن دھوپ اور بارش کی مسلسل یلغار سے اڑ کر عجیب سی صورت اختیار کر گیا تھا کہیں کہیں سے عہد رفتہ کی نشانی جھلک رہی تھی، ٹین کا سائبان گرد آلود ہونے کے باوجود جیوں کا تیوں تھا۔ پورے گھر کا باہری جائزہ لے کر ان کی نظریں دروازے پر پڑے زنگ آلود قفل پر رک گئیں۔

کنجی کہاں ہے ــــ ؟ نوجوان نے بوڑھے کی طرف دیکھا تو وہ بوڑھی کی طرف دیکھنے لگا جو نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ کنجی آئی ہے یا وہیں چھوٹ گئی ؟ نوجوان نے تیز آواز میں پوچھا تو بوڑھی عورت خیالوں سے چونک کر اپنا آنچل ٹٹولنے لگی۔ کنجی بھی چھوٹنے کی چیز تھی۔ اس نے آنچل سے کنجی کھول کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھ دی جیسے اس کی امانت اسے سونپ رہی ہو۔ نوجوان نے جلدی سے کنجی اچک لی اور تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

آج یہ دروازہ پھر کھلے گا ــــ بوڑھے نے بوڑھی کی طرف دیکھا تمہیں وہ دن یاد ہے جب اس میں قفل لگا تھا ؟ بوڑھی کی آنکھوں میں بادل سا گذر گیا۔ اس نے مضبوطی سے اپنے قدم دھرتی پر جمائے، ہاں شاید سیلاب آیا تھا یا بہت تیز آندھی اور رات کا وقت تھا یا گھٹا ٹوپ اندھیرا، عارف میری گود میں رو رہا تھا، تم نے قفل بند کر کے کنجی مجھے تھمائی تھی تو تمہارا ہاتھ کانپ رہا تھا، پھر تم نے ٹین کا بکس اٹھایا تھا اور ......

ہاں تب یہ گلی کچی تھی، اور نالی کا پانی گلی میں پھیل جاتا تھا۔

نوجوان قفل کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا مگر نہ جانے کتنے موسموں کی گرد اس میں داخل ہو کر بیٹھ گئی تھی کہ وہ کسی تبدیلی کو قبول نہیں کر رہا تھا، جب اینٹھتے اینٹھتے نوجوان کی انگلیاں دکھنے لگیں تو وہ کاروں کے پاس آ گیا جہاں وہ دونوں چپ کھڑے برسوں پیچھے دیکھ رہے تھے، انہیں اس کی بھی خبر نہیں تھی کہ کب میلے کچیلے بچوں نے کار کے ساتھ انہیں بھی حصار میں لے لیا ہے اور پڑوس کے کئی دروازوں پر کھڑے لوگ انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کنجی بدل تو نہیں گئی ؟ نوجوان نے جھنجھلا کر کہا، قفل نہیں کھل رہا ہے

کنجی کیسے بدل سکتی ہے بیٹا، اس کی حفاظت میرا ایمان تھا اور آج میں خوش ہوں کہ ....

افوہ ــــ نوجوان نے بات کاٹ دی، دروازہ کیسے کھلے گا اتنے دنوں میں بالکل جام ہو گیا ہے، کیا میں قفل توڑ دوں ــــ ؟

بوڑھی بوڑھے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا دونوں کی آنکھوں میں احتجاج تھا۔ جب انہوں نے یہ قفل بند کیا تھا تو کیا انہیں یہ امید تھی کہ ایک دن ایسا بھی ہوگا جب بلندیاں اُن کے قدموں میں ہوں گی اور رات کے گئے دن کے آ جانے میں ایسے واپس ہونگے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

آپ لوگ چپ کیوں ہیں، نوجوان کی تیز آواز نے انہیں جھنجھوڑ دیا۔ منا تھکا ہوا پریشان ہے ابھی تو اندر جا کر نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑے۔ اگر قفل کے ساتھ ہی زور آزمائی کرتے رہے تو..... ڈرائیور ..... اس نے اسباب سے لدی بڑی گاڑی کے ڈرائیور کو آواز دی، جلدی سے قفل توڑ دو۔

دروازوں پر کھڑے بڑوسی دھیرے دھیرے قریب آنے لگے تو بوڑھی کار میں چلی گئی پردے کھینچ دیے گئے، اندر بیٹھی ہوئی بہو نے ضد کر کے بچے کو اس کی گود میں دے دیا اور خود پردے کی اوٹ سے

باہر جھانکنے لگی۔

آپ شاید عابد حسین ہیں؟ اتنے دنوں بعد......

ارے تم مقبول، ارشد، کتنے بڑے ہو گئے تم لوگ جب میں گیا تھا تو تم ہاف پینٹ پہنے دن بھر دھول میں کھیلتے رہتے تھے بھائی نظام کیسے ہیں؟

ٹھیک ہی ہیں، آپ لوگ رہنے کے لئے آئے ہیں؟

بوڑھے کو اپنی رگوں میں خون کی گردش کا احساس ہوا، ابھی تو مسرت کی لہر کو پوری طرح محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ قفل ٹوٹ گیا، چرچرا کر دروازہ کھلا، تھوڑی سی گرد اڑی، نوجوان اپنے بیش قیمت کپڑوں کی پرواہ کئے بغیر اندر داخل ہو گیا، بوڑھے کے قدموں میں بھی تیزی آگئی، بوڑھی کے قدم بھی آنگن میں پل گئے۔ بوڑھے نے درودیوار پر ہتھیلیاں پھیریں، گرد اس کے کپڑوں سے لپٹ کر کچھ پوچھ رہی تھی، بوڑھی کی آنکھیں برس رہی تھیں پوتا حیرت سے دادی کو روتے دیکھ رہا تھا۔

ہم کتنے دنوں بعد اپنے گھر واپس آئے ہیں؟ بوڑھے کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے تم جاتے وقت بھی رو رہی تھیں اور آج بھی رو رہی ہو۔

درد کی زنجیر کا سلسلہ آج ٹوٹے گا۔

اندر کمروں میں گرد کی موٹی تہہ اور مکڑیوں کے جالے، اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے چوہے اور آنگن میں خود رو پودوں کا جنگل۔

بڑی محنت کرنی پڑے گی، نوجوان آستین کی گرد جھاڑتے ہوئے بولا، پھر ڈرائیور سے کہنے لگا، تم سامان اتارو نہیں ٹھہرو صرف فولڈنگ پلنگ لے آؤ تاکہ امی ابو بیٹھ سکیں تب تک ہم تم مل کر ایک کمرہ صاف کر لیں بلکہ حنا کو بھی لے آؤ۔

ٹھہرو دلہن کو میں لاؤنگی۔ بوڑھی کے پیروں میں نہ جانے کہاں کی تیزی آگئی۔

یہی ہمارا اصل گھر ہے بہو، بوڑھی کی آواز کانپ رہی تھی، آج تم پہلی بار اپنی سسرال میں قدم رکھ رہی ہو۔ اس دن کی تمنا برسوں سے میرے دل میں تھی، آج خدا نے پوری کی۔

جب املی کے درخت پر دھوپ پیلی پڑنے لگی اور فضا میں خنکی بڑھ گئی تو انہوں نے سکون کا سانس لے کر گھر کا جائزہ لیا۔ اب یہ گھر رہنے لائق ہو گیا ہے۔

یہاں اس جگہ میری چارپائی رہتی تھی اور یہاں تیرے ابو کی، ماں بیٹے کو بتا رہی تھی، آج تو یہاں سوئے گا اور اس جگہ بہو۔ پھر وہ بہو سے مخاطب ہوئی۔

یہاں تمہیں ویسا آرام نہیں ملے گا مگر یہاں بڑی پر سکون نیند آتی ہے کل تمہیں رشتہ داروں سے ملواؤں گی۔

نوجوان الیکٹرک سپلائی کے لئے تار پھیلا رہا تھا، پورٹیبل جنریٹر کی مدد سے بلب جگمگانے لگے اور سیلن زدہ گھر میں جیسے سورج اتر آیا۔

خبریں پر لگا کر اڑیں اور پورے محلّے کے دروازے کھلکھلا اٹھے چلتے ہوئے لوگ گھر میں تیز روشنی اور چہل پہل دیکھ کر ٹھٹھک جاتے۔

وہ بہت دنوں بعد وطن واپس آئے ہیں اب تو بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں یہ کار اور ٹیکر انہیں کا ہے۔

اس رات ماں باپ جاگتے رہے، بیتے ہوئے دن رینگ رینگ کر کمرے میں آجاتے اور آنکھیں برستی رہتیں۔

اب سو جائیے بہت رات ہو گئی۔ ڈاکٹر نے زیادہ جاگنے کو منع کیا ہے۔

تم بھی تو جاگ رہی ہو۔ آج کی رات اُن راتوں سے کتنی مختلف ہے جب لالٹین تک جلد بُجھا دینی پڑتی تھی، کیا ہمیں امید تھی کہ ایسی جگمگاتی رات بھی دیکھیں گے اس آنگن میں سورج بھی اترے گا۔

صبح ہوئی تو پڑوسیوں کی آمد شروع ہو گئی۔

یہ تم ہو بھائی عابد حسین، مجھے رات ہی خبر ملی مگر جاڑے کا دن اور یہ بڑھاپا، چاہ کر بھی نہ آسکا، تمہاری صحت تو ماشاء اللہ اب تک بہت اچھی ہے۔

بس اللہ کا کرم ہے، تم لوگوں سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا مگر کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی تھی اس پر عارف نے ایک اور اپارٹمنٹ خرید لیا ہے۔ ارادہ ہے کسی بڑی کمپنی کے ہول سیل ڈپو کا، چھوٹی کمپنیوں نے تو کئی آفر دئے مگر ہم اپنی ساکھ کے مطابق چیز چاہتے ہیں، اب ایک ہفتہ دس دن جو یہاں رہیں گے تو کاروبار بند ہی رہے گا، ملازموں کی فوج پر بھروسہ تو نہیں کیا جاسکتا...... اور تم لوگ سناؤ .... تمہارے بچّے کیا کر رہے ہیں۔

ان کے چہرے بُجھ گئے، ہمارے بچّے.... بس زندگی کا بوجھ ڈھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

عابد حسین کو پھر اپنے منجمد خون میں روانی کا احساس ہوا جیسے بہت دنوں کی گھٹن کے بعد دریچے کھلے ہوں اور ٹھنڈی ہوائیں پور پور

سہلا رہی ہوں۔ انہوں نے غور سے اُن چہروں کو دیکھا، ان آنکھوں کو دیکھا جن میں حسرت و یاس کی قندیلیں روشن تھیں۔

پھر سب کی نگاہیں دروازے پر ٹھہر گئیں، عارف آرہا تھا، بیش قیمت سوٹ میں ملبوس، چمکتے ہوئے سیاہ بوٹ، انگلیوں میں جگمگاتے نگینوں والی انگوٹھیاں اور ٹائی پن میں جگمگاتا ہوا ہیرا، وہ ایسے قدم رکھ رہا تھا جیسے راستہ شیشے کا ہو۔

آؤ بھئی عارف تمہیں اپنے دوستوں سے ملاؤں۔ یہ تمہارے رشید چچا ہیں یہ حمن ماموں یہ مقبول خالو، یہ اور یہ......

عارف نے انہیں ادب سے سلام کیا ہاتھ ملایا اور بہت ملائم لہجے میں کہنے لگا، میں جب یہاں سے گیا تھا تو اتنا چھوٹا تھا کہ یہاں کی کوئی چیز یاد نہیں مگر ابو کی زبانی آپ لوگوں کی باتیں سُن کر یہ خواہش تھی کہ اپنے عزیزوں سے ملوں اُن کی محبت پاؤں، اُن سے مشورے لوں، اُن کی قیمتی باتوں سے فیض اٹھاؤں، اور اس بار میں ہی ضد کر کے سب کو لایا ہوں کاروبار تو زندگی بھر کا ہے مگر پھر نہ جانے وقت ہمیں کہاں لے جائے۔ ابو کا ارادہ ہے کہ مُنّے کے عقیقے کی ایک چھوٹی سی تقریب کریں تاکہ عزیزوں سے ملنے کا بہانہ مل جائے، دوسری بات یہ کہ ہم تو اب یہاں کے لئے اجنبی ہیں آپ کے تعاوُن اور مشوروں کی ضرورت ہوگی۔

عورتیں آئیں تو ایک ایک کو پہچان کر ماں نے گلے لگایا۔ آنسو بہائے۔ بیٹیوں کی شادی کہاں کہاں کیں؟ کتنے بچے ہیں؟ شوہر کیا کرتا ہے! سسرال والے کیسے ہیں، مجھے تو سونے کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے جہاں کوئی دل کا حال سننے والا نہیں، دل چاہتا تھا اُڑ کر یہاں چلی آؤں، یہ میری بہو ہے ابراہیم سیٹھ کی بیٹی، اس کی شادی میں، میں منع کرتی رہی کہ کچھ دینے کی ضرورت نہیں مجھے صرف گوشت کا لوتھڑا چاہیئے اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر وہ کہاں ماننے والے۔ کہنے لگے آپ کچھ نہ کہئے میرے بھی تو ارمان ہیں۔ میں بھی چپ ہوگئی کہ اکلوتی بیٹی ہے ارمان بار بار نہیں نکلیں گے۔

یہ کار جہیز کی ہے ــــ؟ کسی نے پوچھا تو وہ کہنے لگیں، نہیں جہیز کی کار کے علاوہ دو اور کاریں وہیں چھوڑ دی گئی ہیں میں تو کہہ رہی تھی کہ ٹیکسی میں سامان کے ساتھ ہم لوگ بھی بیٹھ جائیں گے مگر عارف کہنے لگا کہ آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ بہن میں تو خدا سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ ایسی اولاد سب کو دے۔

لڑکیوں نے دلہن کو گھیر لیا ــــ اللہ یہ نیکلس کتنا خوبصورت ہے۔ بہت بھاری لگتا ہے۔

یہ خود کیا نیکلس سے کم خوبصورت ہیں .... دوسری نے لقمہ دیا۔

اب نظر مت لگاؤ۔ تیسری بولی۔

تو ابھی آپ کو نظر لگ جاتی ہے۔ پہلی نے معصومیت سے پوچھا۔

دلہن صرف مسکراتی رہی اور لڑکیاں چہکتی رہیں۔

یہ ساڑی تو باہر کی معلوم ہوتی ہے۔

یہ خود بھی باہر کی ہیں آنکھیں دیکھو نا کیسی نیلی نیلی ہیں۔

عارف بھائی نے آپ کو کہاں سے منگوایا ہے چین، جاپان سے؟

نہیں پرستان سے ...... سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

عقیقے کی چھوٹی سی تقریب کسی شادی کی تقریب سے کم ہنگامی نہیں تھی، دوسرے نوجوانوں کے ساتھ عارف خود مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود تھا معمولی حیثیت کے لوگوں کے لئے یہ پذیرائی اعزاز سے کم نہیں تھی۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکا، دراصل ہم خود یہاں مسافروں جیسے ہیں، کبھی آپ میرے یہاں تشریف لائیے میرے دروازے آپ کے منتظر رہیں گے۔

شہرت دور دور تک پہونچ گئی۔ اتنے بڑے لوگ اور غرور نام کو بھی نہیں، کیسے ٹوٹ کر ملتے ہیں، ہاں بھائی پھل دار درخت جُھک ہی جاتا ہے۔

ایک ہفتہ پلک جھپکتے گذر گیا اور سامان ٹیکسی میں لادا جانے لگا، لوگوں کی بھیڑ صبح ہی سے انہیں گھیرے ہوئے تھی۔

ہمارا تو جی چاہتا ہے کہ آپ یہیں رہ جائیے ــــ لڑکیاں دلہن سے کہہ رہی تھیں۔ کتنے اچھے دن گذرے آپ کے ساتھ۔ عارف بھائی چھوڑیں گے تب نا؟

وہ تو چھوڑیں گے مگر میرا جانا اس لئے ضروری ہے کہ اپنی پیاری سی نند کے لئے سندر سا لڑکا ڈھونڈ لاؤں۔ ہٹئے بڑی بے شرم ہیں آپ ..... وہ شرم سے گلنار ہوگئی۔

عارف دوستوں کو گلے لگا رہا تھا۔ میرے دوست میرے بھائی تم نے مجھے جو محبت اور اپنائیت دی ہے وہ میرے لئے بہت قیمتی ہے، میں پھر آؤں گا تم لوگوں کی محبت کھینچ لائے گی۔

کاریں روانہ ہوئیں، دیر تک ہاتھ ہلتے رہے، بچے کار کے ساتھ دوڑتے رہے، گلیاں ختم ہوگئیں اور کاریں ہموار سڑک پر نکل آئیں، آبادی پیچھے

[باقی صفحہ ۰۰ پر دیکھئے]

رؤف خیر

عاند کسی طرح کی بھی تحدید مت کرو
کیا دوست، دشمنوں پہ بھی تنقید مت کرو

بیعت کرو تو ایک ہی دستِ رسول پہ
دو رکعتی امام کی تقلید مت کرو

کھینچو بڑی لکیر، لکیروں کے درمیاں
چھوٹی کسی لکیر کی تردید مت کرو

بے رس جنھیں ہوائے زمانہ نے کر دیا
اب ان تلوں سے تیل کی اُمید مت کرو

جگنو ہے ہاتھ میں ید بیضا نہیں کوئی
اندھیرے ہے، اہانتِ خورشید مت کرو

جب دھوپ پی چکے ہو تو پھر دودھ بھی پیو
کس نے کہا کہ خیر سے تم عید مت کرو

بیت الخیر ۱۹/۲-۲-۱۰-۹، دلاور شاہ نگر
رسالہ بازار، گولکنڈہ - حیدرآباد - ۱

بشیر سیفی

حقیقتیں ہیں نہاں خواب کے لبادوں میں
میں جی رہا ہوں عجب خوشنما تضادوں میں

یہ کیا ضرور کہ حاصل بھی ہم کو ہو جائیں
لکھے ہیں جتنے مقاصد قرار دادوں میں

مری زبان بھی گویا زبان تیری ہے
چھپا ہوا ہے تو ایسے مرے ارادوں میں

میں دورِ امن میں کس سے سلامتی مانگوں
شریف لوگ تو مارے گئے فسادوں میں

بساطِ وقت کا سیفی میں بادشاہ سہی
گھرا ہوا ہوں کئی سمت سے پیادوں میں

بی ۱ / ۱۱۹۸ گلی نمبر ۵، مسلم ٹاؤن
راولپنڈی - (پاکستان)

شہنشاہ مرزا

اکیسویں[۲۱] صدی کا صاف چہرہ

گذرتے لمحوں کو
رکارڈ کرنے والی مشین
ایک کمپیوٹر ہے
لیکن کبھی کبھی
کمپیوٹر بھی دھوکا دے جاتے ہیں
صاف چہرے والوں کو
یہ بات معلوم ہونا چاہیئے

اکیسویں صدی کا سفر
مہمات سے پُر ہے
دیکھے اور ان دیکھے خطرات
اکثر آہنی دیواروں کو عبور کر جاتے ہیں
اور کمپیوٹر کی بتائی تفصیلات
اٹھارہویں صدی کی گپ بھی ثابت ہو سکتی ہے
کہ کمپیوٹر کی تعمیر و تشکیل
انسانی ذہن نے ہی کی ہے
اور انسانی ذہن
غلطیوں سے پرے نہیں

۸۲ - وکٹوریہ اسٹریٹ - لکھنؤ

انل ٹھکر

۸ اشوک نگر، ہبلی (کرناٹک)

اندھے رشتے

شام کے دھندلکے میں خاموش قبرستان، ہوائیں سائیں سائیں کر رہی ہیں، عید کا چاند نکلا ہُوا ہے کچھ ستارے ٹمٹما رہے ہیں، اس دھندلکے میں کچھ قبریں نظر آ رہی ہیں۔ اسٹیج کے ایک کنارے ایک ہیولی سا نظر آتا ہے کچھ لمحات کے بعد چاند دھیرے دھیرے ڈوب جاتا ہے۔ ایک ستارا آسمان سے گرتا ہُوا خلا میں کھو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں ایک قبر تڑختی ہے، اس میں سے ایک عورت کی روح اٹھ کر باہر آتی ہے اور اسٹیج کے کنارے بیٹھے ہیولے کی جانب بڑھتی ہے۔ اس روح کا صرف لباس ہی نظر آتا ہے۔ پس منظر میں کتوں کے غرّانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

مرد:۔ یہ کتے کیوں غرّا رہے ہیں؟

عورت:۔ ہڈی کے لئے

مرد:۔ ہڈی! کیسی ہڈی؟

عورت:۔ پسلی کی ہڈی

مرد:۔ پسلی کی ہڈی، وہ کس کام کی! نہ کھانے کے نہ چبانے کے نہ چوسنے کے کسی کام میں بھی تو نہیں آتی وہ! اُس پر گوشت کی تہیں بھی تو نہیں ہوتیں۔

عورت:۔ وہ غرّا رہے ہیں، وجود کے لئے۔

مرد:۔ وجود! کس کا وجود؟

عورت:۔ بُو کا!

مرد:۔ کس کی بُو؟

عورت:۔ جسم کی بو۔

مرد:۔ یہ کس کی پسلی ہے؟

عورت:۔ مرد کی میری قبر سے کرید کر نکالی گئی ہے۔

مرد:۔ تمہاری قبر میں مرد کی پسلی؟

عورت:۔ ہاں۔

مرد:۔ تمہارے ساتھ کوئی مرد بھی دفنایا گیا تھا؟

عورت:۔ نہیں۔

مرد:۔ تو۔

عورت:۔ تم نے سنا نہیں؟

مرد:۔ کیا؟

عورت:۔ خدا نے آدم کی پسلی سے حوّا کو بنایا تھا۔

مرد:۔ اوہ ۔ تو یہ تمہارے جسم کی پسلی ہے۔ موت سے پہلے تم شاعرہ تھیں؟

عورت:۔ نہیں۔ البتہ ایک شاعر کی صحبت میں کچھ گھڑیاں ضرور گزری تھیں

(کتے لڑنے لگتے ہیں)

مرد:۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔

عورت:۔ کیا؟

مرد:۔ پسلی کے ٹکڑے سے انہیں کیا حاصل ہوگا؟

عورت:۔ کچھ بھی نہیں۔ اس سے نہ تو ان کی پیاس بجھے گی، نہ دانتوں کی کھجلی کم ہوگی، نہ ہی بھوک کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔ اونہہ ــ کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔

مرد:۔ تو پھر؟

عورت:۔ پھر بھی یہ غرّائیں گے، لڑیں گے، نوچیں گے۔

مرد:۔ نوچیں گے کسے؟ اس پسلی کے ٹکڑے کو۔

عورت:۔ نہیں۔

مرد:۔ تو۔

عورت:۔ ایک دوسرے کو۔

مرد:۔ مگر کیوں؟

عورت:۔ انہیں تلاش ہے۔

مرد:۔ کس کی؟

عورت:۔ جسم کی۔

مرد:۔ پسلی کے ٹکڑے میں جسم کی تلاش!

عورت:۔ نہیں۔ ذرہ میں کائنات کی تلاش۔

مرد:۔ کیا معنی!

عورت:۔ ہر کسی کو کسی کچھ کی تلاش میں جینا ہوتا ہے، بھٹکنا ہوتا ہے۔

مرد:۔ سچ کہہ رہی ہو، جسم سے الگ ہونے سے پہلے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا کبھی سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا مگر اب فرصت ہی فرصت ہے اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے مجھے صرف ایک ہی چیز کی تلاش تھی روٹی ـــ

عورت:۔ کیا کرتے تھے؟

مرد:۔ کیا کچھ نہیں کیا!

عورت:۔ پھر بھی۔

مرد پیدا ہوتے ہی ماں کا انتقال ہو گیا۔

عورت:۔ کیسے؟

مرد:۔ تلاش۔ میرے باپ کو تلاش تھی دوائیوں اور ڈاکٹر کیلئے پیسوں کی۔

عورت:۔ پھر۔

مرد:۔ آٹھ دس سال کا ہوا تو باپ بھی ....

عورت:۔ سمجھی۔

مرد:۔ تب سے تلاش ہی تلاش رہی روٹی کی۔

عورت:۔ تم خوش نصیب تھے۔

مرد:۔ خوش نصیب!؟

عورت:۔ ہاں۔

مرد:۔ کیسے؟

عورت:۔ تمہیں ایک ہی چیز کی تلاش رہی۔

مرد:۔ اور تمہیں؟

عورت:۔ میری تلاش وقت کے ساتھ بدلتی رہی۔

مرد:۔ کیوں؟

عورت:۔ حالات، خواہشات۔

مرد:۔ کیا تمہیں وہ؟

عورت:۔ کچھ کوڑا کچھ کرکٹ

مرد:۔ کوڑا کرکٹ، کیوں؟

عورت:۔ خالی پن بھرنے کے لئے۔

مرد:۔ کیسا خالی پن؟

عورت:۔ راستے کا خالی پن۔

مرد:۔ کونسا راستہ؟

عورت:۔ ماں کی کوکھ سے قبرستان تک کا راستہ۔

مرد:۔ تم بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔

عورت:۔ (اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی) اس راستے سے گذر آنے کے بعد بھی میں یہ سمجھ نہیں پا رہی ....

مرد:۔ کیا؟

عورت:۔ چند قدموں کے راستے کو طے کرنے کے لئے انسان کیوں اس کوڑے کرکٹ کو سمیٹتے چلتا ہے۔

(کچھ پل خاموشی)

مرد:۔ تم کب پیدا ہوئی تھیں؟

عورت:۔ تب جب اس گھر کے خالی برتن ٹکرا رہے تھے۔

مرد:۔ خالی برتن ٹکرا رہے تھے!؟

عورت:۔ ہاں۔

مرد:۔ کیوں؟

عورت:۔ اس دن مہینے کی آخری تاریخ تھی۔

مرد:۔ ہوں (آہ بھرتا ہے)

(خاموشی)

عورت:۔ تمہیں معلوم ہے نا ـــــــــ مرد:۔ کیا؟

عورت:۔ انسان پیدا ہوتے ہی روتا ہے۔ مرد:۔ ہاں۔

عورت:۔ میں بھی روئی تھی۔ مگر میرے رونے کی آواز برتنوں کی اس آواز میں ایسے کھو گئی کہ میری آمد پر کسی نے توجہ تک نہیں دی تھی مگر....

(خاموشی)

مرد:۔ مگر کیا؟

عورت:۔ برتنوں کی وہ آواز میرے جسم و جاں میں اتر کر ایسے پھیل گئی کہ میرے جسم کی موت تک ہر مہینے کی آخری تاریخ کو مجھے احساس ہونے لگتا

مرد:۔ کیسا احساس؟

عورت:۔ میں ایک اندھیرے بند ڈبے میں سکڑی پڑی ہوں پھر کوئی دو ہاتھ میرے سر کو پکڑ کر کھینچنے لگتے ہیں۔ ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے تب ایک جھٹکے کے ساتھ میں اس اندھیرے ماحول سے نکل کر روشنی

سے بھرپور دنیا میں آجاتی ہوں، میرا جسم خون اور چکنے سیال سے لجلجا ہے، میرا رونے کو جی کرتا ہے میں روتی ہوں اور میرے رونے کی آواز خالی برتنوں کے ٹکرانے کی آواز میں تبدیل ہو کر ماحول میں بھٹکنے لگتی ہے۔

مرد: ۔ تمہارے پیدا ہونے سے گھر کے لوگ خوش نہیں تھے ؟

عورت: ۔ دوسروں کی بات چھوڑو البتہ امی نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

مرد: ۔ کیوں؟ اس نے لڑکی مانگی تھی ؟

عورت: ۔ نہیں۔

مرد: ۔ پھر ؟

عورت: ۔ اس نے ایک بوجھل درد سے چھٹکارا پا لیا تھا۔

مرد: ۔ اوہ۔

عورت: ۔ اس نے تو چھٹکارا پا لیا مگر میں ہر مہینے کی آخری تاریخ کو جنم کا یہ کوفت جھیلتی رہی۔

مرد: ۔ تمہارے والد ....

عورت: ۔ یہ لفظ میری زندگی میں چٹخے ہوئے آئینے کی مانند رہا۔

مرد: ۔ بہت نفرت کرتی تھیں اپنے والد سے ؟

عورت: ۔ اس انسان سے کرتی تھی جو اتفاقاً میرا باپ تھا۔

مرد: ۔ اتفاقاً ؟

عورت: ۔ ہاں۔

مرد: ۔ وہ کیسے ؟

عورت: ۔ والدین چننے کا حق کسی کو بھی عطا نہیں کیا گیا۔

مرد: ۔ ہوں۔

عورت: ۔ مذہب چننے کا اور اپنا نام رکھنے کا حق بھی نہیں دیا گیا پھر بھی کچھ لوگ اپنا نام بدلتے ہیں مذہب بھی بدلتے ہیں مگر والدین نہیں، وہاں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

مرد: ۔ سچ کہتی ہو۔

عورت: ۔ میں نے بھی اپنا نام بدلا تھا۔

مرد: ۔ کیوں ؟

عورت: ۔ بیچنے کے لئے۔

مرد: ۔ نام اور بیچنے کے لئے!؟

عورت: ۔ دنیا میں کیا کچھ نہیں بکتا۔

مرد: ۔ کیا کرتی تھیں تم ؟

عورت: ۔ کیا کچھ نہیں کیا !؟

مرد: ۔ (ہنس کر) واہ۔

عورت: ۔ (التجا بھرے لہجے میں) معصومیت کیا کچھ نہیں کیا، یہ خار و خس سے بھری وہ سڑک ہے جس پر سے زندگی میں ہر کسی کو گزرنا پڑتا ہے

مرد: ۔ افسانے لکھتی تھیں !؟

عورت: ۔ ہرگز! لکھ نہیں سکتا سوچ تو سکتا ہے۔

(جانے لگتی ہے)

مرد: ۔ کہاں جا رہی ہو ؟

عورت: ۔ بھٹکنے۔

مرد: ۔ کیوں ؟

عورت: ۔ ایک تڑپ ہے جو مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔

مرد: ۔ کیسی تڑپ ؟

عورت: ۔ وہ تڑپ جو نمازی کو پانچ وقت سجدے میں جھکاتی ہے وہ تڑپ جو آفتاب کے غروب ہوتے ہی شرابی کو میخانے کی راہ پر موڑ دیتی ہے، وہ تڑپ جو روح کو بادلوں کا کفن اوڑھ کر بیتی زندگی کے لمحات کی گھٹن کو پھر سے جھیلنے کو آمادہ کرتی ہے۔

(وہ خلا میں بڑھنے لگتی ہے)

مرد: ۔ کیا نام تھا تمہارا ؟

عورت: ۔ سلمیٰ جو مجھے روایات سے ملا تھا۔

مرد: ۔ کونسی روایات ؟

عورت: ۔ بچے کے پیدا ہونے کے بعد نام رکھنے کی روایات۔

مرد: ۔ اور دوسرا !

عورت: ۔ نشا جو ایک تاجر نے بخشا تھا بیچنے کے لئے

(خراماں خراماں بڑھتے ہوئے خلا میں گم ہو جاتی ہے)

مرد: ۔ یا اللہ! اچھا ہوا میری زندگی میں مجھے ایک ہی چیز کی تلاش رہی۔ یہ نجانے جستجو کے کس جنگل میں کھو گئی کہ آج بھی بھٹک رہی ہے شاید اس لئے کہا گیا ہے روح تڑپتی ہے ــــ روح بھٹکتی ہے۔

(دھیرے دھیرے اندھیرا چھانے لگتا ہے)

❁

اسعد بدایونی

(۱)

میں گذر رہا ہوں فریب خوردہ ساعتوں کے دیار سے
مرا رابطہ بھی کٹا ہوا ہے لہو کی چیخ و پکار سے

کسی اسپِ شعلہ خرام پر وہ بہت سی دھول اڑا گیا
وہ بہت سے پھول گرا گیا کسی تیغ تیز کی دھار سے

کبھی سوچنا، یہ فضائے دشت میں رقص کیوں ہے غبار کا
نہ سمجھ میں آئے تو پوچھنا کسی تنہا ناقہ سوار سے

میں گھنے درختوں کے سائے میں کسی آسرے پہ رکا ہوا
مجھے کوئی جیسے بلا رہا ہے فصیلِ ہجر کے پار سے

مرے خواب کتنے عجیب تھے، وہ نصاب کتنے عجیب تھے
میں الجھ گیا کسی پھول سے لپٹ گیا کسی خار سے

وہ نظر جو ایک سوال بن کے اتر گئی مرے ذہن میں
میں جواب اس کے رقم کروں گا زمیں پہ دشت غبار سے

(۲)

بدن کے طاقچے میں گر دیے گزرے زمانوں کی
بشارت دے کوئی شمع ہوس، آئینہ خانوں کی

اگر چہ قافلہ رخصت ہوئے مدّت ہوئی لیکن
صدائیں دشت میں زندہ ہیں اب بھی ساربانوں کی

بچھڑتے وقت میں نے اس سے کچھ بھی تو نہیں پوچھا
زمینوں سے جدا کب تھی حکایت آسمانوں کی

ابھی تو میں کسی دیوار پر تکیہ نہیں کرتا
ضرورت دھوپ کے موسم میں ہوگی سائبانوں کی

اصولوں سے زیادہ جان پیاری سب کو ہوتی ہے
سو میں نے بھی قصیدے شان میں لکھے کمانوں کی

● شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اختر امان

راستے منزل سفر کچھ بھی نہیں
پیڑ ہیں لیکن ثمر کچھ بھی نہیں

یہ عجب اک صورتِ حالات ہے
اپنا سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

کونسی اب فصل کاٹیں گے یہاں
ہم نے بویا عمر بھر کچھ بھی نہیں

جی ہی لیتے ہم کسی امید پر
دور تا حدِّ نظر کچھ بھی نہیں

حوصلے کی داد دو اختر امان
ہیں رواں، رختِ سفر کچھ بھی نہیں

● گلی نمبرا، ہم رس، ۲۵۶، جی ۹/۲ اسلام آباد
(پاکستان)

ابن کنول

۶۰۷، ۱۷، تیلیہ ہاؤس، نئی دہلی ۔ ۲۵

گزندہ

پورے شہر میں خوف وہراس برسات کے بادلوں کی طرح چھا گیا تھا، ہر شخص حیران و پریشان تھا کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس آسمانی عذاب کا سبب کیا ہے؟ کیوں ہر روز ایک شخص کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ہوا یوں تھا کہ ایک روز جب آفتاب کی روشنی عالم آب و گل کو منور کر چکی تھی، بازار اور دکانیں معمول کے مطابق پُر رونق ہونے لگی تھیں کہ فضا میں ایک عقاب تیز رفتار پرواز کرتا ہوا نظر آیا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس کے پنجوں میں ایک مارِ سیاہ لٹکا ہوا تھا تھوڑی دیر تک وہ عقاب بازار کے اوپر منڈلاتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ سانپ بازار میں خرید و فروخت کرتے ہوئے ایک شخص کی گردن پر جا پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ آدمی کسی کو مدد کے لئے پکارتا۔ سانپ نے اپنے زہریلے پھن سے اس کی پیشانی کو داغ دیا، ابھی کوئی دوسرا شخص اس کے قریب بھی نہ پہونچا تھا کہ عقاب زمین کی طرف جھپٹا اور سانپ کو اپنے پنجوں میں دبا کر غائب ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کوئی شخص بھی کوئی رائے قایم نہ کر سکا اور اس حادثہ کو محض ایک اتفاق سمجھا گیا۔

لیکن ــــ

روز فردا پھر ایک عقاب اس شہر پر منڈلاتا ہوا دکھائی دیا جس کے پنجوں میں مارِ سیاہ دبا ہوا تھا اور جب وہ عقاب شہر کے وسط میں پہونچا تو اس کے پنجوں سے نکل کر وہ سانپ ایک شخص کی گردن پر آ گیا ــ پھر وہی ہوا کہ اس نے اس آدمی کو ڈس لیا اور عقاب سانپ کو اپنے پنجوں میں دبا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ــ اسے بھی اتفاق ــ دوسرا اتفاق کہا جا سکتا تھا لیکن دوسرا اتفاق اہل شہر کے لئے تشویش کا باعث بھی بنا ــ

اور جب تیسرے روز بھی یہ حادثہ پیش آیا تو تمام افراد شہر کو اپنی گردنوں پر سانپ اور سروں پر عقاب اڑتے ہوئے محسوس ہونے لگے صاحب دانش غور و خوض میں مشغول ہوئے کہ اب اتفاق نہیں ہے ــ اتفاق مسلسل نہیں ہوتا پورے شہر میں اجتماعی مشورے ہونے لگے، مفتیانِ شہر نے اعلان کیا کہ اس شہر میں گناہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ شاید یہ خدا کے عذاب کی ایک شکل ہے کہ اس سے پہلے بھی آسمانی پرندوں نے کنکریاں برسائی تھیں اور جو لوگوں کے سروں میں اتر گئی تھیں۔ اے لوگو! عبادت گاہوں کی طرف رجوع کرو۔ شاید اس بلائے آسمانی سے نجات ملے ــ شہر کی عورتوں نے اپنے شوہروں کی جان کی امان کے لئے اپنے سروں کو برہنہ کر کے خدائے ذو الجلال کے روبرو دست دعا بلند کئے بازار بے رونق ہونے لگے ــ لوگوں کی آمد و رفت کم ہو گئی۔ پھر چند لوگوں نے یہ طے کیا کہ آئندہ جب بھی عقاب اپنے پنجوں میں سانپ لے کر آئے گا تو اسے کسی طرح ہلاک کر دیں گے ــ پھر یہی ہوا کہ جب عقاب نے اپنے پنجوں سے سانپ کو آزاد کیا تو اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا لیکن عقاب اُن کے حملہ کی زد سے بچ کر نکل گیا تاہم ان سب نے اس سانپ کو ہلاک کر دیا جو بازار میں موجود ایک شخص کی گردن میں لپٹ کر اس کی پیشانی کو اپنی زہریلی زبان سے چوم چکا تھا ــ سانپ کو ہلاک کرنے کے بعد سب نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب اہلِ شہر اس عذاب سے نجات پا گئے تھے ــ سب نے خوشیاں منائیں عبادت گاہوں میں سجدہ ہائے شکر ادا کئے گئے ــ بازار میں گھومتے افراد کے چہروں پر ایک بار پھر خوشی کی چمک لوٹ آئی ــ

اگلی صبح بہت سکون رہا، لوگ اپنے گھروں سے نکل کر بازاروں میں پہنچے۔ خوف تقریباً ختم ہو چکا تھا ــ لیکن یہ کیا ــ؟

اچانک پھر آسمان پر عقاب پرواز کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کے پنجوں میں بدستور سانپ دبا ہوا تھا اسی لمحہ عقاب کے پنجوں میں دبا ہوا سانپ ایک شخص کی گردن پر گرا اور اس نے اپنے زہر کو اس شخص کی پیشانی پر اگل دیا ــ عقاب نے اسے اپنے پنجوں میں اٹھا لیا لیکن قبل اس کے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے روپوش ہوتا ایک نوجوان نے بڑھ کر اپنی بندوق سے اس کو نشانہ بنایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عقاب اور سانپ دونوں ہی زمین پر آ گرے ــ افراط خوشی سے لوگوں نے نوجوان کو کاندھوں پر اٹھا لیا کہ اس کی حاضر دماغی، چستی اور چالاکی کے سبب ایک

عذاب اہلِ شہر کے سروں سے ٹل گیا ــــ اس روز گزشتہ روز سے زیادہ خوشیاں منائی گئیں کہ اب عقاب بھی ختم ہو چکا تھا ــــ

پھر کئی روز تک سکون رہا، نہ کوئی عقاب آیا اور نہ سانپ کسی کے اوپر گرا، سب خوش تھے، بازاروں اور دکانوں پر رونق ہونے لگی تھی اور لوگ گذرے ہوئے حادثوں کو بھولتے جا رہے تھے لیکن پھر ایک دن

آسمان پر کئی عقاب بیک وقت پرواز کرتے ہوئے نظر آئے۔ سب کے پنجوں میں مارِ سیاہ دبے ہوئے تھے ــــ اور جب وہ ایک مجمع کے اوپر پہنچے تو انہوں نے پنجوں میں دبے سانپوں کو چھوڑ دیا اور سانپوں نے کئی لوگوں کی پیشانیوں کو زہر آلود کر دیا ــــ عقاب پھر سانپوں کو لے کر غائب ہو گئے تھے

اس بار خوف ہوا کی طرح گلیوں اور گھروں میں گھس گیا تھا، ہر شخص پریشان تھا کہ اس کا بچنا مشکل ہے لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیے تھے بازاروں میں گھومنے والوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔

اس رات تمام اہلِ شہر ایک جگہ جمع ہوئے اور بہت دیر تک ــــ سوچتے رہے کہ اس عذاب سے نجات کا طریقہ کیا ہے۔ عقل حیران تھی، دست و پا بے بس تھے شاید سانپ اُن کا مقدر بن گئے تھے۔ ہر شخص اپنی گردن پر سانپ کی گرفت محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

سانپ انہیں کی گردنوں پر کیوں گرتے ہیں جن کے سروں پر اونچے مکانوں کی چھتیں نہیں ہوتیں ــــ جن کو زندگی کا تمام سفر پیدل طے کرنا ہوتا ہے ــــ جو موسموں کی تبدیلیوں کو اپنے جسموں پر برداشت کرتے ہیں ــــ سوچتے سوچتے جب ان کے ذہن تھک گئے تو سب نے فیصلہ کیا ہم سب جہاں پناہ کے روبرو جا کر اپنی اس مصیبت کا حال بیان کریں گے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں اس عذاب سے نجات دلائے کہ خدا نے رعایا کی سرپرستی و محافظت اس کے ذمہ کی ہے ــــ

دوسرے روز تمام اہلِ شہر ایک جلوس کی شکل میں جہاں پناہ کی رہائش گاہ پر پہونچے اور اپنا حال بیان کیا ــــ جہاں پناہ ان سب سے محبت اور شفقت سے پیش آئے اور کہا ــــ

"ہم جانتے ہیں کہ ہماری رعایا ایک عذاب آسمانی میں گرفتار ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے اور ایسا کیوں ہو رہا ہے تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو ہم تمہارے لئے فکرمند ہیں ــــ اور کوشش کریں گے کہ تم لوگوں کو جلد اس مصیبت سے نجات ملے ــ ہم نے اپنے وزیروں کی ایک جماعت کو اس کی تحقیقات کے لئے متعین کیا ہے"

جہاں پناہ کی اس بات سے سب خوش ہوئے کہ وہ اسے اپنا ناخدا جانتے تھے۔ سب نے بیک زبان جہاں پناہ کے اقبال کی بلندی کا نعرہ لگایا اور دعائے خیر دی ــ پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے ــ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ جہاں پناہ کے عالیشان محل کے چاروں دروازوں سے چار بلند پرواز عقاب اپنے پنجوں میں سیاہ سانپوں کو دبائے ہوئے نکلے اور مجمع کے اوپر چھا گئے ــ آئی ہوئی رعایا نے عالمِ غیظ و غضب میں جہاں پناہ کی طرف دیکھا وہ اب بھی کہہ رہا تھا "تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو ــــ ہم تمہارے لئے فکرمند ہیں۔"

خورشید افسر بسوانی

غور سے دیکھوں تو اپنا بھی پرایا سوجھے
اس سے بہتر ہے اِن آنکھوں کو نہ دنیا سوجھے

گھر سے نکلے ہو تو یہ سوچ کے آگے بڑھنا
جانے کس وقت کسے کون تماشا سوجھے

پیاس کم ہے تو ان آنکھوں کی طلب بھی کم ہے
تشنگی ہو تو سرابوں میں بھی دریا سوجھے

ایسی ظلمت ہے کہ اب سائے سے ہلکا ہے بدن
وہ اجالا ہے کہ خود ہاتھ نہ اپنا سوجھے

وہی وحشت، وہی خلوت ہے یہاں بھی افسرؔ
شہر جو دیکھ چکا کیا اسے صحرا سوجھے

● بسوان، ضلع سیتا پور (یو، پی)

محبوب راہی

زیرِ بحث ہوں بستی بستی محفل محفل میں
سب سے الگ تھلگ رہ کر بھی سب میں شامل میں

لوٹ آیا ہوں سمندروں کی تہہ سے خالی ہاتھ
ڈھونڈ رہا ہوں ہیرے موتی ساحل ساحل میں

خون آنکھوں میں، ہاتھ میں لے کر دو دھاری تلوار
کھڑا ہوا ہوں آپ ہی اپنے مدِّ مقابل میں

جانے کس کے اندیکھے خوابوں کی ہوں تعبیر
کس کی بے تاثیر دعاؤں کا ہوں حاصل میں

بھول بھلیاں ہے یہ دنیا میں سوچوں ہر پل
کس دروازے سے نکلوں کس سے ہوں داخل میں

اپنی ذات میں راہیؔ میں اک تنہا سب کچھ ہوں
اپنا رہبر، اپنا رستہ، اپنی منزل میں

● گلزار مسجد، پوسٹ آفس بارسی ٹاکلی ۴۴۴۴۰۱ ضلع آکولہ (مہاراشٹر)

پرکاش تیواری

یہ کس عالم میں یارب کھو گیا ہوں
خود اپنے آپ کو میں ڈھونڈتا ہوں

تمہارے ہجر میں زندہ کہاں ہوں
میں تو دن زندگی کے گن رہا ہوں

مجھے احساس کی آنکھوں سے دیکھو
میں اک پیکر تمہارے درد کا ہوں

اُجالے حسن کے بستے ہیں مجھ میں
اندھیروں کا انوکھا سلسلہ ہوں

کشش کیا ہے فضائے زندگی میں
بنا پر کے میں زنداں میں اُڑا ہوں

فقط قصہ نہیں، اے چشمِ دنیا
مجھے پڑھ، زندگی کا فلسفہ ہوں

مرے اندر تو اس کی آتما ہے
میں تو پرکاشؔ کب کا مر چکا ہوں

● ۲۱۵۹، لودھی روڈ کامپلیکس، نئی دہلی ۳

اظہر مسعود

ادبستان ، دین دیال روڈ ، لکھنؤ ۔ ۳

ایک مکالمہ

"یہ نوٹ تم نے لکھا ہے ؟" ابھی میں نے پردے کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اندر سے دہاڑ سنائی دی ۔ میری ملازمت کا پہلا دن تھا ۔ روشن مستقبل کے بہت سے خواب سجا کر میں نے جوائن کیا تھا ۔ حیرت کی بات ہے لیکن سچ ہے کہ میں نے اپنے باس کو نہیں دیکھا تھا ۔ پہلی دفعہ میری طلبی ہوئی تھی ۔

"جی میں نے لکھا ہے ۔" سہمی ہوئی نحیف سی آواز آئی ۔

"تم اپر ڈویژن اسسٹنٹ ہو !" سوال آواز میں کچھ دھیما پن

"جی ہاں ۔" آواز کچھ واضح ——

"تم کو اتنی تمیز نہیں کہ نوٹ کیسے شروع کیا جاتا ہے ؟" پہلے سے بھی زیادہ زوردار دہاڑ ۔

"جی جانتا ہوں ۔" آواز روہانسی

"ارے —— ایک تو جانتے نہیں اوپر سے کہتے ہو جانتا ہوں" دھاڑ اور تیز ۔ "جھوٹ بھی بولتے ہو ! !"

"نہیں صاحب —— میں جھوٹ بالکل نہیں بولتا"

"بدتمیز —— جھوٹ بول رہے ہو اور کہہ رہے ہو جھوٹ نہیں بولتا یعنی کی ڈبل جھوٹ !"

"صاحب میری خطا بھی تو معلوم ہو ۔" التجا

"بے وقوف بھی ہو ۔ اتنی دیر سے گلا پھاڑ رہا ہوں اور تم کو اب تک اپنی خطا نہیں معلوم ہوئی ؟ ؟"

"نہیں صاحب —— آپ نے بتائی ہی نہیں" گڑگڑاہٹ

"مجھے جھٹلاتے ہو ! ! !" چیخ

"نہیں حضور —— میری کیا مجال ؟" لرزہ

"میں نے تم سے نہیں کہا کہ تمہیں نوٹ شروع کرنے کی تمیز نہیں ؟"

"جی یہ تو کہا تھا" اعتراف

"تو پھر ؟ ؟" سوالیہ چیخ

"میں ممنون ہوں گا اگر آپ میری اصلاح فرما دیں ۔" گزارش

"ہاں ایسے بات کرو" آواز خاصی نیچی "تم نے کاغذ کے بالکل سرے سے نوٹنگ شروع کر دی ہے —— کہو ہاں ۔"

"جی ہاں ۔"

"تم جانتے ہو کہ نوٹ شیٹ کے سرے فائل کور کے باہر بھی نکل جاتے ہیں"

"جی"

"جی —— جی کیا ہوتا ہے ۔ کہو ہاں"

"جی ہاں"

"کثرت استعمال سے یہ سرے پھٹ بھی سکتے ہیں —— پھٹ سکتے ہیں کہ نہیں ؟"

"جی"

"پھر وہی جی ۔ کہو ہاں"

"جی ہاں"

"اگر سرے پر نوٹ کا حصہ ہو تو سرے کے ساتھ وہ حصہ بھی غائب ہو جائے گا کہ نہیں ؟" لہجہ خاصا نرم

"جی ہو جائے گا" لہجے میں قدرے اعتماد

"جی کے بچے تو پھر کیوں پہلی سطر سے نوٹ شروع کیا ؟" اچانک شعلہ باری ۔

"جی غلطی ہو گئی —— میں دوسرا لکھ دوں گا" رقت

دوسرا نوٹ لکھ دو گے ؟ —— تمہارا دماغ صحیح ہے کہ نہیں دوسرا نوٹ لکھ کر دفتر کا وقت اور حکومت کا پیسہ برباد کرو گے ؟" گرج

"جی تو پھر نہیں لکھوں گا" بے چارگی

"ہائیں —— کیا کہا —— نہیں لکھو گے ؟ ابھی سمجھا چکا ہوں

نوٹ تلف ہوگیا تو کس کے باداجان پورہ کریں گے میرے یا تمہارے؟

"جی ___ نوٹ لکھنا میرا فرض ہے اس لئے میرے ہی باداجان کریں گے۔"

"چپ رہو!" وقفہ "چپ کیا کھڑے ہو؟"

"جی"

"جی کیا ___ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو کیا سر پر سینگ نکل آئے ہیں میرے؟"

"جی نہیں"

کیا کہا؟ میرے سر پر سینگ نہیں ___ یعنی غائب ہو گئے یعنی تم نے مجھے گدھا (گدھا) کہا؟؟"

"نہیں سرکار ___ ایسی گستاخی بھلا مجھ سے کیوں کر ہو سکتی ہے!!"

"کیا اس کا مطلب ہے میرے سر پر سینگ ہیں؟"

"جی نہیں ___ ایسا بھی نہیں!"

"عجیب گو کھے ہو ___ تمہیں اس سے بھی انکار ہے کہ میرے سر پر سینگ ہیں اور اس سے بھی کہ نہیں ہیں۔!"

"جی نہیں ___ ۔ ایسا تو نہیں"

"پھر کیا بات ہے"

"جی ___ کچھ بھی نہیں"

کچھ بھی نہیں کی خوب کہی ___ یعنی میرے سر پر سینگ ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں، یہی مطلب ہے نا تمہارا؟؟"

"جی میرا مطلب قطعی نہیں!"

"پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟"

"جی یہی کہ نہ تو آپ کے سر پر سینگ ہیں اور نہ کبھی تھے۔"

"اچھا تو جھوٹی گواہی بھی دیتے ہو ___ سمجھ لو میاں ابھی پولیس بلا کر ہتھکڑی لگوا دوں گا!!"

"جی میں کچھ سمجھا نہیں!"

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"پچیس برس"

میری عمر تمہارے خیال میں کتنی ہوگی؟"

"یہی کوئی پچاس برس۔"

"آپ نے کم سے کم دس سال کی عمر میں ہوش سنبھالا ہوگا یعنی آپ کے ہوش سنبھالنے سے پینتیس سال پیشتر میں وجود میں آگیا تھا"

"جی"

"تمہیں کیسے معلوم کہ ان ۳۵ سال کے دوران میرے سر پر کبھی سینگ نہیں رہے؟"

"صاحب سینگ بھی کوئی داڑھی مونچھ تھوڑی ہیں کہ جب چاہیں بڑھا لیں اور جب چاہیں منڈوا دیں۔" عاجزی

"میرا سر دیکھ رہے ہو؟"

"جی دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا نظر آرہا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں!"

"نہیں نہیں ___ بتاؤ بتاؤ!!"

"بے ہودہ ___ دکھائی نہیں دیتا کہ میری پیشانی کی حد کھوپڑی کے وسط تک گئی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں ___ ایسا تو ہے"

"تو کیا جناب کے خیال میں خاکسار پیدائشی 'فارغ البال' ہے؟"

"جی نہیں ___ پہلے تو آپ کے بال رہے ہوں گے، بعد میں کسی وجہ سے گر گئے۔"

"تو سینگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا؟"

"جی بالکل ہو سکتا ہے۔"

"یعنی میرے سر پر سینگ تھے جو کسی وجہ سے گر گئے ___ یہی خیال ہے نا تمہارا؟"

"جی نہیں ___ ایسا تو میں نے نہیں کہا"

"پھر وہی مہمل جواب ___ نہ ہاں کہتے ہو نہ نہیں!!"

"جی ہاں"

"لاحول ولا قوۃ ___ جاؤ نکلو باہر۔"

"جی بہت اچھا ___ آداب عرض"

"ٹھہرو"

"جی؟"

"تو نوٹ کا کیا کرو گے؟"

"جی اسے یوں ہی رہنے دوں گا کہ دفتر کا قیمتی وقت اور سرکار کا پیسہ بچاؤں گا!!"

"ٹھیک ہے ___ اب جا سکتے ہو"

"اور سنو!"

[باقی صفحہ ۷۰ پر دیکھئے]

اکبر حمیدی

یہ سبزہ ہے۔ یہ گل ہے۔ یہ صبا ہے
چمن تقسیم ہوتا جا رہا ہے

ہماری داستاں کا ایک اک حرف
ہمارے خون سے لکھا ہوا ہے

جو تیرے گھر کی جانب جا رہا تھا
وہ رستہ جنگلوں میں کھو گیا ہے

کہاں سے کھیتیاں سیراب ہوں گی
ہر اک دریا سمندر ہو چلا ہے

یہ کیسا موسمِ گل ہے کہ جس میں
چمن پھولوں سے خالی ہو رہا ہے

یہ شب اس شہر پر بھاری ہے اکبرؔ
چراغوں کو ہوا کا سامنا ہے

● اسلام آباد کالج برائے طلبا اسلام آباد (پاکستان)

فرحت نواز

مختصر نظمیں

(۱)

تم کو اپنی ذات کے اندر کے موسم کا
حال کیا لکھوں
کیونکہ میں تو کئی رُتوں سے
اپنی ذات سے باہر بیٹھی
راہ تمہاری دیکھ رہی ہوں

(۲)

ندیا کی آغوش میں سویا چاند
نجانے کیسے سپنے دیکھ رہا ہے
دھیرے دھیرے کانپ رہا ہے

(۳)

مجھ کو اکثر یوں لگتا ہے
وقت بدلنے کی امّید میں
جیتے جیتے
ہم دونوں خود
دھیرے دھیرے بدل رہے ہیں

(۴)

ماں کہتی ہے
"شکل اگر اچھی نہ ہو تو
بات ہی اچھی کر لیتے ہیں"
وہ کہتا ہے
"شکل ہے تیری بے حد پیاری
پھول اور شہد کی مانند تیری باتیں ساری"
کس نے سچّی بات کہی ہے۔
آئینے کچھ تم ہی بتاؤ!

● مدیرہ "جدید ادب" پبلیکیشنز۔ خان پور۔ ضلع رحیم یار خان

ہندی - گجانند ساورکر

بتوسط بینک آف مہاراشٹر، عمری برانچ، رن پیپے نگر - آکولہ - ۴۴۴۰۰۱ (مہاراشٹر)

ترجمہ - بانو سرتاج

بتوسط قاضی اے۔ اے۔ سول لائنز - چندر پور - ۴۴۲۴۰۱ (مہاراشٹر)

فیصلہ

گھڑی کے پینڈولم کی مانند کیبن کا دروازہ ہل رہا تھا..... پیچھے ...... آگے ..... آگے ..... پیچھے۔ اُس کی مدھم سی آواز مکھرجی صاحب کے دل کا بوجھ اور بڑھا رہی تھی۔ وہ مضطرب تھے، کچھ نہیں سوجھ رہا تھا انہیں۔ پیشانی پر بہتی پسینے کی دھاروں کو پوچھنے تک کا ہوش انہیں نہیں تھا۔ اُن کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ڈرلنگ مشین دل میں سوراخ کر رہی ہو۔ پسینے کی چادر آہستہ روی سے بھوؤں سے گذر کر آنکھوں پر چڑھے چشمے کے فریم سے سامنے کا سب کچھ مبہم سا دکھائی دے رہا تھا۔ دھوئیں کے بادل میں گھرے ہوئے اجاڑ شہر جیسا۔

ابھی ایک گھنٹہ قبل جب وہ نیلو نرودل اینڈ کاٹن ٹیکسٹائلس کے اپنے عالیشان دفتر میں داخل ہوئے تھے تب ان کے چہرے پر بے پناہ چمک اور جوش تھا۔ انہیں سلام ٹھوکتے ہوئے انکا ہشاش بشاش چہرہ دیکھ کر سلیم کو اچھا لگا، یقیناً رات کی میٹنگ میں کوئی بہتر فیصلہ کیا گیا ہوگا۔ سلیم اسی خیال میں گم تھا کہ کیبن کی بیل بجی۔ سلیم فوراً وہاں حاضر ہو گیا۔

"سلیم، ذرا شروے، کالداتے اور دِگھے کو بلانا۔"

یہ سُن کر اس کے دل میں تجسس کا طوفان اٹھا۔ شروے، کالداتے اور دِگھے یونین کے لیڈر تھے۔ یقیناً ہی مزدوروں کی مانگیں پوری ہو گئی ہوں گی ...... یا کچھ نہ کچھ حل ضرور نکلا ہوگا۔ اسی لئے تو صاحب اتنی مستعدی سے انہیں بلوا رہے ہیں۔

پیغام پہونچا کر وہ لوٹ رہا تھا کہ نام دیو نے آواز دی ..... "کیا سلیم بھائی؟ سبیرے سبیرے آج کدھر؟"

"بڑے صاحب نے لیڈروں کو بلایا ہے۔ لگتا ہے اپنی مانگیں منظور ہو گئیں۔ صاحب بہوت خوش دکھائی دے رہے ہیں آج۔"

سلیم کی بات سننے کے لئے بہت سے مزدور دائرے میں اُس کے چاروں طرف اکٹھا ہو گئے تھے۔ مگر سلیم سب کو ٹال کر تیر کی طرح کیبن کی طرف واپس آیا۔

کیبن میں صاحب، شروے، کالداتے اور دِگھے بیٹھے تھے۔

"تم لوگوں کو میں نے اس لئے بلایا ہے کہ کل رات بورڈ آف ڈائریکٹرس کی میٹنگ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے میں نے تم لوگوں کی مانگیں رکھیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ مانگیں کسی بھی قسم کا اعتراض نہ کرتے ہوئے متفقہ رائے سے منظور کر لی گئیں۔ اہم نکتہ یہ بھی کہ مزدوروں کو اس سال ۲۹ دنوں کی بجائے ۳۲ دنوں کی تنخواہ بطور بونس دی جائے گی۔ میڈیکل الاؤنس ۱۱۰ روپے تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چار مہنگائی بھتے نقد رقم کی صورت میں فوراً ادا کیے جائیں گے۔ مزدوروں کے لئے رہائش گاہیں تعمیر کرنے کا مسئلہ فوری طور پر نہیں سلجھایا جا سکتا لیکن تب تک کمپنی ہر سال مکان کے کرایہ میں ۲۰ فیصدی الاؤنس کا اضافہ کر دے گی .... جو مزدور کنفرم ہو گئے ہیں انہیں سواری خریدنے کے لئے کمپنی بلا تاخیر ۸۰ فیصد رقم ایڈوانس دے گی ..... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جتنی مانگیں آپ لوگوں نے میرے سامنے رکھی تھیں اُس سے کہیں زیادہ تعداد میں مانگیں منظور ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی کچھ اور مشکلات ہوں تو مجھ سے کہیں۔ میں انہیں دور کرنے کی اپنی طرف سے حتی الامکان کوشش کروں گا۔"

وقفہ دینے کے بعد جیسے جملہ ختم ہو جاتا ہے اُسی طرح صاحب بولتے ہوئے رک گئے۔ اُن تینوں کی طرف دیکھا۔ کمپنی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے پیمانے پر مزدوروں کی مانگیں منظور ہوئی تھیں مگر ان کے چہروں پر کوئی خاص تاثر نہ تھا۔ یہ خبر سُن کر وہ اچھل پڑیں گے ..... یا تھینک یو سر ..... تھینک یو سر کہتے ہوئے ان پر شکریے کی بارش کر دیں گے ..... صاحب ایسا سوچتے تھے۔ مگر جیسے کسی عمارت کا کچا سلیب گر جائے اُسی طرح صاحب کی جو توقعات مجروح ہو گئیں۔ وہ تینوں اب بھی سنجیدہ تھے ..... ابھی تھوڑی دیر قبل کرسیوں پر بیٹھتے وقت ان کے چہروں پر امیدوں

اطمینان تھا مگر صاحب دیکھ رہے تھے کہ وہاں اب فکر نے لکیریں کھینچ دی تھیں۔ کچھ الٹا سیدھا بولا جائے پھر طول ہوا جائے کچھ اس طرح کے حالات تھے۔ ماحول میں ایک عجب طرح کا کھنچاؤ آگیا تھا۔ جسے دور کرنے کی غرض سے صاحب نے کہا...... "دیکھئے، اس کے علاوہ اور مانگیں ہوں گی آپ کی تو.... آگے دیکھیں گے۔ فی الحال انہی پر قناعت کیجئے۔" "قناعت..... کیسی قناعت" کالداتے نے قدرے اکھڑپن سے کہا۔

"یہ مانگیں جس طرح سے منظور ہوئی ہیں وہ آپ کے لئے قابلِ قبول نہیں یا اطمینان بخش نہیں؟"

"اطمینان ہوگا خاک! برخلاف اس کے ہمیں دکھ اس بات کا ہے آپ خوامخواہ مزدوروں کو سر پر بٹھا رہے ہیں۔"

سُرد ے کے اس طرح بدتمیزی سے بولنے پر صاحب کو بے حد غصہ آیا کہ سرد ے کو ڈانٹ دیں مگر پھر انہوں نے خود کو سنبھال لیا..... اور پہلے کی نسبت لہجے کو زیادہ نرم اور خوشگوار بناتے ہوئے بولے.... مزدوروں کی جائز مانگوں کو پورا کیا ہے اس میں مزدوروں کو سر پر بٹھانے کا کیا سوال؟ تم لوگوں کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

"غلط فہمی تو آپ کو ہو رہی ہے صاحب کیوں کہ آپ کو لیڈر اور مزدور کے درمیان کا فرق نہیں سمجھتا۔" بھویں اونچی کر کے کالداتے نے کہا۔

"کیا مطلب؟ صاحب کی آواز میں درشتی تھی۔

مطلب ایک دم سیدھا ہے مینیجنگ ڈائریکٹر یعنی راجہ۔ لیڈر یعنی وزیر اور مزدور یعنی پیادے۔ وزیروں کا مکمل تعاون حاصل ہونے پر بھی راجہ کو کیا ضرورت ہے پیادوں کو اتنا قریب کرنے کی؟" کیبن میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک خاموش بیٹھے دگھے نے کہا۔

"میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ تم لوگوں کو آخر کہنا کیا ہے۔ اس طرح گول مول بات نہ کرو۔ جو کچھ کہنا ہو وہ سیدھی سادی آسان زبان میں بولو۔" صاحب نے قدرے خفگی سے کہا۔ "سیدھی سادی یا تعلق آسان زبان میں کہا جائے تو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہم یونین کے لیڈر ہیں۔ مزدور نا سمجھ ہیں ہم جیسا انہیں کرنے کے لئے کہتے ہیں ویسا وہ کرتے ہیں تب پھر انہیں اعتماد میں لینے سے فائدہ؟ ہمیں اعتماد میں لیجئے۔ ہمیں قریب کیجئے۔ آخر ہم آپ ہی کے ہیں...... تمام مانگیں منظور نہ کرتے ہوئے صرف ایک دو مانگیں منظور کیجئے بونس صرف ۵۰ دن کا دیجئے۔ مہنگائی بھتہ بڑھائیے مگر دوسری مانگیں جیسے ہاؤس رینٹ، سواری کے لئے ایڈوانس وغیرہ ہوا میں رہنے دیجئے۔ اس کے عوض ہمیں پروموشن چاہئے نہ کمیشن۔ صرف ہمارے دس دس کینڈیڈیٹ کام پر لگا لیجئے اتنا کافی ہے۔ باقی سب ہم سنبھال لیں گے مزدور ہمارے کہنے کے خلاف نہ جائیں گے.... کالے ناگ کی طرح کالداتے نے تمام باتیں اُگل دیں۔

"اچھا تو یہ بات ہے" صاحب اس طرح بولے جیسے سب سمجھ گئے ہوں، پھر سنجیدہ ہو گئے۔ اپنے سکھ دکھ ایک طرف رکھ کر مزدوروں کے لئے کام کرنے والا پورا راؤ پاٹل انہیں یاد آگیا..... بولے ....." اس کا مطلب کہ آپ کے کینڈیڈیٹ اگر ہم نے کام پر لگا لیے تو ہم جو کہیں گے وہ آپ کو منظور ہوگا؟"

"بالکل صحیح!" تینوں نے ہم آواز ہو کر جوش سے کہا۔

"شرم نہیں آتی آپ لوگوں کو؟ جن ساڑھے بارہ ہزار مزدوروں نے آپ کو بھرپور اعتماد اور مکمل یقین کے ساتھ منتخب کر کے اس جگہ تک پہونچایا ہے انہیں آپ کوئی اہمیت نہیں دیتے...... وہ ہیں اس لئے آپ ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لوگ اتنے خود غرض ہوں گے۔ اسٹینڈ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ فرام مائی آفس۔"

لمحہ بھر کے لئے صاحب کا جی چاہا تھا کہ انھیں اور انہیں مارنا شروع کر دیں مگر خود پر قابو رکھ کر صرف الفاظ سے کام لینا انہوں نے بہتر سمجھا۔

"صاحب..... یاد رکھئے..... سابقہ ہم سے ہے۔" سُرد ے نے گرج کر کہا
"کیا کریں گے آپ؟ دھمکیاں دیتے ہیں؟ میں نے مان لو آپ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا اور مزدوروں کو بلا کر ان کی مانگیں منظور ہونے کی اطلاع دے دی... تو؟؟"

"....تو ..... صاحب! آپ کو یاد ہوگا مزدوروں کے چہیتے لیڈر بابو راؤ پاٹل کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا..... وہ مارا گیا.... وہ حادثہ نہیں تھا.... قتل تھا۔ جانتے ہیں آپ وہ قتل کس نے کیا؟ ہم تینوں نے۔ سوچ لیجئے.... غور کیجئے کہیں آپ کا بھی وہی حال نہ ہو....." بغیر رُکے کالداتے بولتا چلا گیا۔

"آئی سے گیٹ آؤٹ ..... گیٹ آؤٹ" صاحب کھڑے ہو کر حلق کے بل گرجے۔

بے شرموں کی طرح تینوں باہر نکل گئے۔ دروازہ ہل رہا تھا۔ صاحب کانپ رہے تھے۔ پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ انہیں کرسی پر بیٹھ جانے تک کا ہوش نہ تھا۔ دل کی گہرائیوں میں کچھ اُبل رہا تھا۔ پاؤں کسی انجانے خوف سے لرز رہے تھے۔

ایک ..... دو..... تین.... گھڑی نے ٹھوکے دیئے۔ اتنا

آوازسے صاحب حواسوں میں لوٹے..... بیٹھ گئے...سوچنے لگے.... یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ ہاتھ پاؤں کیوں کانپ رہے ہیں میرے؟ ایم ڈی وغیرہ سے ڈر کر کیا مجھے مزدوروں کا نقصان کرنا زیب دے گا؟ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ مزدوروں کے سامنے جا کر انہیں بتا دینا چاہئے کہ یہ تینوں کتنے حرامخور ہیں..... مزدوروں کے ساتھ کیسی دھوکہ دہی کرتے ہیں.... مگر مزدور جو کو جیسا اعتماد اپنے لیڈروں پر ہے کیا وہ ویسا اعتماد مجھ پر کریں گے؟ ہرگز نہیں کیوں کہ کوئی بھی ایم ڈی ہو اس کی امیج مزدوروں کے لئے ہٹلر جیسی ہوتی ہے۔ مزدوروں کا چھل کرنے والے.... انہیں روندنے والے۔

یہ خیالات ان کے دل میں اتھل پتھل مچا رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر باپوراؤ پاٹل کی تصویر کی طرف گئی۔ وہ دیکھتے ہی رہ گئے تصویر کو۔

باپوراؤ پاٹل میں کتنی سمجھ داری تھی۔ اپنا پن تھا۔ یونین کا لیڈر تھا مگر انسان بہت اچھا تھا۔ اس لئے کمپنی نے قرارداد پاس کر کے اس کا فوٹو ہال میں لگایا تھا۔

ویسے دیکھا جائے تو باپوراؤ پاٹل کمپنی کا ایک معمولی مزدور تھا۔ عمر میں بڑا، تجربہ وسیع، دل کا فراخ.... انسانیت، اپنا پن اور حق گوئی کا بہت بڑا اسٹاک رکھنے والا، ہر کسی کے دکھ سکھ کو اپنا ماننے والا، ہر ایک کے لیے اپنائیت سے سوچنے والا، مشکل وقت میں سب کی مدد کرنے والا.... تمام مزدوروں میں ہر دلعزیز

مزدوروں کی درخوست پر اس نے یونین کا نیتا بننا منظور کر لیا تھا۔ نیتا بننے کے دوسرے دن وہ ان سے ملنے آیا تھا...۔

"رام رام صاب!"

"نمسکار! بیٹھو۔"

"نائیں صاب۔ ہم ادھر ہی ٹھیک ہیں۔"

"باپوراؤ، اب تم لیڈر ہو گئے ہو، تمہیں کرسی پر بیٹھنا چاہئے۔"

"لیڈر ہو گیا تو کیا ہوا صاب! میں وہی جانا پہچانا باپوراؤ ہوں۔"

"اچھا جانے دو۔ بولو کیا کام ہے؟"

"کام کچھ نہیں صاب۔ مجھے لیڈر بننے کی ہوس نہ تھی۔ مزدور بھائی بولے اس لئے لیڈر بن گیا۔ نیا نیا کام ہے غلطی ولطی ہو گئی تو سنبھال لیجئے گا۔ آپ کا آشیرواد لینے آیا ہوں۔"

وہ ان کے پاؤں پہ سر رکھنے ہی والا تھا کہ انہوں نے اُسے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا تھا۔

"یہ کیا کرتے ہو باپوراؤ؟ تم ہم سے عمر میں بڑے ہو۔ سچ کہو تو ہمیں ہی تمہارے پاؤں پر سر رکھ کر آشیرواد لینا چاہئے۔"

"غریب کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں صاحب! اچھا میں چلتا ہوں۔"

باپوراؤ چلا گیا۔ وہ تو گڑبڑا ہی گئے تھے ذرا سے۔ یونین کے لیڈر اور ایم ڈی کا رشتہ آگ اور تیل کا۔ مگر یہ لیڈر نام کا آدمی آشیرواد لینے آیا اس کا کیا مطلب؟ ایسا موقع زندگی میں پہلی بار آیا تھا اس لئے وہ حیران تھے..... کچھ تسکین بھی ہوئی کہ چلو دنیا میں ابھی انسانیت نام کی کوئی چیز باقی ہے۔

باپوراؤ باقاعدگی سے ماہانہ میٹنگ کے لئے آیا کرتا، ادب سے بات کرتا بات کا ہر پہلو سمجھ لیتا۔ غور کرتا اور پھر حل پیش کرتا۔ جہاں تک ان کی یادداشت ساتھ دیتی تھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ باپوراؤ پاٹل کا پیش کردہ حل بورڈ آف ڈائریکٹرس کو نامنظور ہوا ہو..... ہر بار اس کی تجویز کا خیر مقدم کیا گیا... ... سراہا گیا۔

باپوراؤ پاٹل کے زمانۂ اقتدار میں اچانک کمپنی پر بُرا وقت آگیا۔ فارن کی ایک کمپنی نے نمونے دیکھ کر جو آرڈر دیا تھا اسے مدِ نظر رکھ کر کمپنی نے وسیع پیمانے پر مال تیار کیا مگر اسی دوران عالمی مارکیٹ میں مندی آجانے سے آرڈر دینے والی کمپنی نے ۲۵ فیصد کم قیمت پر ہی مال لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گوداموں میں مال رکھے رہنے سے بہتر کم قیمت ہی میں سہی مال سپلائی کر دینے کا آرڈر بورڈ آف ڈائریکٹرس نے دے دیا۔

کمپنی کی خستہ مالی حالت کو دیکھتے ہوئے مزدوروں کو حالیہ سال میں دیے جانے والے بونس اور مہنگائی بھتہ کی کٹوتی کے ساتھ ..۲ مزدوروں کو کام پر سے ہٹانے کے سوا دوسرا راستہ نہ تھا۔ ڈائریکٹرس کے اس فیصلے سے باپوراؤ کو آگاہ کرنا ضروری تھا.... ان کا دل نہیں ہو رہا تھا باپوراؤ سے یہ بات کہنے کو کیوں کہ ایک بار مزدوروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے باپوراؤ نے کہا تھا "صاحب! مزدوروں کے لئے یہ مل گھر جیسا ہے۔ کبھی کوئی مزدور کسی وجہ سے کم ہو جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے گھر کا آدمی مر گیا ہے۔"

باپوراؤ پاٹل کا یہ جملہ سویرے سے ان کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ باپوراؤ کو یہ خبر کیسے دیں؟ مگر ذمہ داری ان ہی کی تھی اس لئے کہنا ضروری تھا۔ دوسرا راستہ نہ تھا۔ باپوراؤ کو بلوایا۔ زبان کانپ رہی تھی لیکن آخر کسی طرح کہنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کیا....

"باپوراؤ۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ فارن کی اس کمپنی نے ۲۵ فیصد کم قیمت پر ہمارا مال خریدا ہے جس کی وجہ سے اس سال کمپنی کو بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا..... تم لوگوں کا واجب الادا بونس، مہنگائی بھتہ وغیرہ نہ دیتے ہوئے بھی مجبوراً ہمیں ..۲ مزدور کام پر سے الگ کرنے پڑیں گے؟

وہ رک گئے۔ دل متواتر دھڑک رہا تھا۔ باپو راؤ کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے چلا گیا۔ ایک شریف آدمی کے دل کو دکھانے کا خیال انہیں کچوچ رہا تھا۔

پہلے تو لگا مزدور ہڑتال کر دیں گے۔ نعرے لگائیں گے مگر ویسا کچھ نہیں ہوا۔ تمام دن گذر گیا۔ شام کو راؤنڈ کے لئے اٹھنے ہی والے تھے کہ کیبن کے باہر شور سنائی دیا.... اچانک باپو راؤ پاٹل چند اور مزدوروں کے ساتھ کیبن میں آیا۔ وہ تھوڑا گھبرا گئے.... یقیناً اب کچھ نہ کچھ ہوگا..... کیا بولیں گے یہ؟ کیا کریں گے یہ؟

صاحب! کمپنی کا نقصان یعنی ہمارا نقصان! ہمیں تمام سال مہنگائی بھتہ نہیں چاہئے۔ اس سال بونس بھی نہیں چاہئے آپ چاہیں تو ہماری پگار کم کر دیں مگر ہمارے مزدوروں کو کم نہ کریں۔ یہی ہم مزدوروں کی درخواست ہے۔"

وہ ششدر رہ گئے۔ مزدور اتنا سوچ سکتے ہیں؟ اتنا تیاگ کر سکتے ہیں؟... کیا کہیں انہیں کچھ سوجھتا نہ تھا۔

"تمہارا فیصلہ مجھے منظور ہے"۔ انہوں نے کسی طرح کہا تھا کہ سب نے ان کے نام کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ باپو راؤ پاٹل نے تو انہیں کاندھے پر اٹھا کر ناچنا شروع کر دیا.... وہ سوچنے لگے درحقیقت مجھے نعرے لگانے چاہئے تھے..... مجھے باپو راؤ کو کاندھے پر اٹھا کر ناچنا چاہئے تھا۔

باپو راؤ اس دن انہیں آسمان سے بھی عظیم نظر آیا۔ ڈائرکٹرس نے بھی دل کھول کر اس کی تعریف کی......

اسی دوران ایک دن باپو راؤ کے حادثے میں مارے جانے کی خبر مل میں پھیل گئی۔ اس خبر کو سنا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زمین ان کے قدموں تلے سے نکلی جا رہی ہو۔ لمحہ بھر تو اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا۔

ابھی پرسوں..... پرسوں ہی تو باپو راؤ گھر آکر گیا تھا۔ کتنا خوش تھا۔ ۸ تاریخ کو اس کی بیٹی کی شادی تھی دعوت نامہ لے کر آیا تھا۔ اس کے جانے پر سدھا نے کہا تھا

"کتنا شریف آدمی ہے۔ مزدور ہوتے پر بھی طور طریقے کتنے اچھے ہیں"۔

اور ۶ تاریخ کو اس کے حادثے کی خبر.... لمحہ بھر کے لئے محسوس ہوا.... گھر کا ہی کوئی آدمی وفات پا گیا ہو..... بھاری دل لئے اس کے گھر گئے.... اس کی بیٹی چندا جس کی ۸ تاریخ کو شادی تھی زار و قطار رو رہی تھی جیسے باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ جس لڑکی کی آنکھوں میں کل تک مہندی کی لالی رقصاں تھی اس کی آنکھوں میں آج بدقسمتی کا بسیرا تھا.... اسے دیکھ کر وہاں ٹھہرا رہنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

جو کچھ معلوم ہوا وہ کتنا دردناک تھا۔ شادی کا سامان لے کر باپو راؤ گھر لوٹ رہا تھا کہ ٹرک نے پیچھے سے دھکا دے دیا۔ موقع واردات پر وہ ختم ہو گیا۔

ٹرن.... ٹرن.... فون کی گھنٹی سے وہ حواسوں میں لوٹے۔ آنکھوں کی کوریں بھیگ آئی تھیں..... انہیں پوچھ کر ریسیور اٹھایا..."ہیلو میں مکھرجی بول رہا ہوں"۔

"میں سدھا بول رہی ہوں۔ روی پر آج کچھ نامعلوم لوگوں نے حملہ کیا"۔

"وہاٹ!" صاحب اس طرح اٹھے جیسے شاک لگا ہو۔

"کالج سے لوٹتے وقت رانا ڈے چوک کی گلی میں کچھ لوگوں نے اسے گھیر کر مارا پیٹا۔ آپ فوراً آئیں"۔

فون نیچے رکھتے وقت ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت زائل ہوتی سی محسوس ہو رہی تھی... چہرہ پسینے سے تر تھا.... اٹھے۔ کیبن کا دروازہ بند کرتے وقت اچانک باپو راؤ پاٹل کی تصویر کی طرف نظر گئی۔ وہ رک گئے۔ نہ جانے کیوں روز کی نسبت آج وہ فوٹو کچھ الگ سا لگ رہا تھا۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے من میں خیالات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ ...سلیم کہہ رہا تھا کہ سروے اور کالداتے کا چال چلن اچھا نہیں ہے۔ خاص طور سے سروے کا تو پورا گینگ ہے۔ نمبر دو کے دھندے ہیں۔ اپنے کالے کارنامے چھپانے کے لئے کمپنی میں نوکری کرتا ہے ورنہ کمپنی کی تنخواہ تو اس کا ایک دن کا خرچ ہے.... لیڈر بننے کے لئے اس نے مزدوروں پر دھونس جمائی تھی۔ باپو راؤ پاٹل کی اور اس کی جمتی نہ تھی.... باپو راؤ پاٹل حادثے کا شکار ہوا.... روی پر حملہ.... سروے کا صبح کا بولنا.... یہ تمام باتیں ذہن میں آتے ہی صاحب کو بریک پر رکھے پاؤں کی طاقت سلب ہوتی محسوس ہوئی۔

گاڑی پارک کرتے وقت محسوس ہو رہا تھا کہ روی کو کب دیکھیں کب نہ دیکھیں۔ گھبرائی ہوئی سدھا نے چند الفاظ ہی بول پائی تھی.... اس لیے روی کو دیکھے بغیر یہ جاننا مشکل تھا کہ کہاں کہاں لگا اور کتنا لگا؟

اندر داخل ہوتے ہی ڈاکٹر ورما سے مڈبھیڑ ہوئی..."کیسا ہے روی!" انہوں نے بے تابانہ دریافت کیا۔

"اوپری چوٹ ہے۔ اندرونی چوٹ نہیں ہے۔ اسے درد زیادہ

ہوتا اس لئے خواب آور انجکشن دے دیا ہے۔ اب فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہی از آؤٹ آف ڈینجر۔"

"تھینک یو"

"اوکے... میں چلتا ہوں... رات کو اگر ضرورت ہو تو مجھے فون کریں"

"اچھا۔"

ڈاکٹر کو سی آف کر کے وہ روی کے کمرے کی طرف مڑا...... مانسی اور سدھا اس کے پلنگ پر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ روی بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ سر پر اور ہاتھوں پر بینڈیج تھا۔ آہٹ پر سدھا نے مڑ کر دیکھا..... انہیں دیکھتے ہی بھاگتی ہوئی آئی اور ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور سمجھانے لگے۔

وہ رات غور کرتے ہوئے بیتی۔ سُردے اور کالداتے نے نمونہ دکھانے کی غرض سے تو روی کو نہ مارا ہوگا؟ آج وہ اتنے نامعلوم طریقے سے روی کو مار سکتے ہیں تو کل انہیں...... یا روی کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔ ان کی نظر مانسی کی طرف بھی جا سکتی ہے..... مانسی کا خیال آتے ہی ان کا دل دہل اٹھا۔ اچانک ہی مانسی کے چہرے میں انہیں باپو راؤ کی بیٹی چندا کا چہرہ دکھائی دینے لگا جو شادی کے دو تین دن ہی پہلے باپ کو کھو بیٹھی تھی۔ کل انہیں کچھ ہو گیا تو مانسی کا کیا ہوگا؟ عین کھلنے کے وقت پھول پنکھڑی پنکھڑی ہو کر بکھر جائے گا۔

اگر انہوں نے تنہا پا کر مانسی کو پکڑ لیا.....؟ اس پر ریپ کیا تو؟

تو...... سامنے سے دھڑ دھڑاتی آنے والی جی ٹی ٹرین اور پٹریوں پر بھاگتی مانسی..... فاصلہ کم.... بالکل کم.... دھڑ دھڑ.... ماحول میں ایک چیخ.... پھر سب کچھ معمول پر....

"نہیں....." وہ چیخ کر اٹھ بیٹھے۔ چہرہ پسینے سے تر تھا جیسے بارش میں بھیگا ہو۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ گھڑی میں رات کے تین بج کر تین منٹ ہو رہے تھے۔

"کیا ہوا ڈیڈی؟" لائٹ جلاتے ہوئے مانسی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ بولے۔

"ممی کو بلاؤں کیا؟"

"نہیں۔ تم سو جاؤ۔ آئی ایم آل رائٹ۔"

مانسی چلی گئی..... وہ سوچ رہے تھے میں اتنا ڈرپوک کیسے ہو گیا! اسے گنے تین آدمیوں سے گھبرا گیا۔ وہ کوئی ہٹلر تھوڑے ہی ہیں۔ وہ صرف دھمکیاں دے رہے ہیں..... مزدوروں کے سامنے جا کر ان کی پول کھول دینی چاہئے..... ان کا بھانڈا پھوڑ دینا چاہئے... کہاں تک سُنی جائیں ان کی دھمکیاں!..... یا پھر استعفیٰ دے کر تمام جھنجھٹوں سے نجات پائی جائے۔ مگر لوگ کیا کہیں گے؟ بے وقوف کہیں گے اور کیا؟ دنیا میں کسی بھی طرح رہو نام رکھنے والے ہوں گے ہی آخر.....

استعفیٰ! گذشتہ بائیس برسوں سے حالات کا مقابلہ کرنے والے مکھرجی استعفیٰ دیں گے؟ ناممکن! یہ تو بھاگو بائی کی علامت ہے۔ وہ تو...... جئیں گے تو عزت سے.... مریں گے تو عزت سے.... اس سے اچھا تو یہ ہے کہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کو تمام حالات سے واقف کرا دیا جائے۔ دیکھیں کیا کہتے ہیں وہ؟

دوسرے روز انہوں نے ڈائرکٹرس سے رابطہ قائم کرنا چاہا مگر کسی سے ملاقات نہ ہوئی۔ آفس سے کار کی طرف جاتے ہوئے کینٹین کے پاس کالداتے اور سُردے دکھائی دیئے..... بلی راستہ کاٹ جانے پر جیسا لگتا ہے بس ویسا لگا۔

آج چاہے کچھ ہو یا تو وہ ادائیگی کا آرڈر نکالیں گے یا بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ممبران کو صورتِ حال سے واقف کرا کے استعفیٰ دے دیں گے۔ گھر سے نکلتے وقت سدھا نے کہا تھا..."آتے وقت روی کے لئے کمپوز کی گولیاں لیتے آنا"۔

میڈیکل اسٹور سے کمپوز کی گولیاں خریدتے وقت اس پر لکھے الفاظ چمک رہے تھے....."پلیز ٹیک دی ایڈوائس فرام ڈاکٹر بفور یوز"۔

وہ مل میں آئے تو دیکھا مزدوروں کے غول کے غول ان کی طرف کچھ عجب نظروں سے دیکھ رہے ہیں.....

"سلیم! آج مزدوروں کو کیا ہو گیا؟"

"صاحب۔ بہت ڈینجر ہو گیا۔ کالداتے سُردے اور دوسرے نے مزدوروں کو آپ کے خلاف بھڑکایا ہے۔ وہ کہتے ہیں مزدوروں کی مانگیں تبھی پوری ہوں گی جب آپ کو کمیشن ملے گا۔

"کیا؟"

"ہاں صاحب"۔

سلیم کے جانے کے بعد انہوں نے سوچا کمیشن میں مانگ رہا ہوں! وہ۔ آخر انکی اتنی ہمت کیسے ہوئی؟ سالے اتنے چڑھ گئے ہیں یہ معلوم نہ تھا۔ اپنا الو سیدھا ہوتا نظر نہ آیا تو دوسروں پر الزام لگا دیا۔ آخر ان کی قوتِ برداشت کب تک ساتھ دے گی؟ کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔

ایک عزم کر کے وہ فون اٹھانے ہی والے تھے کہ گھنٹی بجی۔

"ہیلو، میں مکھرجی بول رہا ہوں"

"میں سوامی ناتھن بول رہا ہوں"

"یس سر!"

"مکھرجی گذشتہ میٹنگ میں مزدوروں کی جو مانگیں منظور ہوئی ہیں ان کی ادائیگی اب تک کیوں نہیں ہوئی؟ کل شُردے، دِگھے اور کالداتے آئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کو کمیشن چاہئے۔ آپ سے ہمیں یہ امید نہ تھی۔ ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ آپ اس حد تک گر جائیں گے۔ جاتے ہوئے شُردے اور کالداتے دھمکیاں دے گئے ہیں کہ اگر کل تک پے منٹ نہ ہوا تو مزدور ہڑتال کریں گے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ پوری طرح ذمہ دار ہوں گے۔ مجبور ہو کر ہمیں آپ کو برطرف کرنا پڑے گا۔"

لیکن سر.... ان کے آگے کچھ کہنے سے پہلے ڈائریکٹر کی آواز تیر کی طرح ان کے کانوں میں اتر گئی۔ "آئی ڈونٹ وانٹ اینی ایکس پلے نیشن۔ پے منٹ ہونا ہی چاہئے۔"

پھر فون ڈس کنکٹ ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لئے لگا کسی نے ان کا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہو۔

برطرف!.... بدنامی.... گذشتہ بائیس برسوں میں کسی کی ہمت نہیں ہوئی اور اب برطرف کرنے کی زبان.... اف! یہ سب سنتے وقت دل کی حرکت کیوں نہ بند ہو گئی۔ کان بہرے کیوں نہ ہو گئے؟ بیل بجائی.... سلیم.... اسٹینو کو بلاؤ۔"

اسٹینو آیا۔ یہ آرڈر ٹائپ کرو۔ ٹائپ ہو جائے تو سلیم سے بھیج دو

"یس سر"

پے منٹ کے آرڈر ٹائپ کر دینے کو دل نہ تھا مگر اب دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ شُردے اور کالداتے انہیں قربانی کا بکرا بنا رہے تھے۔.... خیر انہیں بھی دیکھ لیں گے.... ان کی خواہش کے مطابق عمل نہ کرتے ہوئے یا کسی طرح کا فریب نہ کرتے ہوئے وہ آرڈر اشو کر رہے ہیں.... نتیجہ! ردی پر حملہ.... سدھا.... مانسی کا کیا ہو گا؟ میری چھوڑو.... مجھے اپنی فکر نہیں۔

لیکن اگر.... انہوں نے سدھا.... مانسی کو گھیر لیا تو؟ اتنا خود غرض ہو گیا ہوں میں.... اتنا احسان فراموش ہو گیا ہوں میں؟ اتنا پتھر ہو گیا ہوں میں؟ اپنی خاطر انہیں قربانی کا بکرا بناؤں؟

"صاحب! یہ آرڈر...."

"سلیم، کیش ڈیپارٹمنٹ میں جا کر جیبے صاحب کو بولو کر کیش لے آئے بینک سے۔ کیش آنے کے بعد مجھے بتانا۔"

تمام اس گول گول گھوم رہا ہے.... وہ اس میں غوطہ کھاتے گہرائی میں جا رہے تھے پیچھے سے شُردے، کالداتے اور دگھے کی نظریں ان کا پیچھا کر رہی ہیں.... وہ گہرائی میں جا رہے ہیں....

دو کا گھنٹہ ہوا سلیم کو جیبے صاحب نے بلایا "سلیم، صاحب کو بول دو کہ کیش آ گیا۔"

سلیم آیا، کیبن کا دروازہ کھول کر اندر آیا.... "صاحب!"

الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے۔ جیسے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ہو.... کیوں کہ صاحب کی آنکھیں خلاء میں گھور رہی تھیں۔

چہرہ بے رنگ.... چشمہ ٹیبل پر پڑا ہوا، پین سامنے رکھے ہوئے کاغذ پر.... اور ہاتھ گھڑی کے پینڈولم کی طرح جھولتا ہوا،

یہ منظر دیکھ کر سلیم نے زور سے چیخ ماری۔

آفس کے تمام نوکر جمع ہو گئے اور سامنے کا منظر دیکھ کر اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ اور لوگوں نے دیکھا کمپوز کی خالی شیشی میز پر پڑی ہوئی ہے اور سامنے ہے مزدوروں کو بونس اور مہنگائی بھتے کی ادائیگی کے آرڈر۔ ❁

بقیہ صفحہ ۵۴ خزاں گزیدہ

چھوٹنے لگی تو دفعتاً انہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے بند مٹھی کی ریت آپ سے آپ گرتی جا رہی ہے، اُن کا دل بیٹھا جا رہا ہے۔

انہوں نے حسرت سے گذرتے مناظر کو دیکھ کر سوچا۔

اب پھر وہی پتھر کا شہر ہو گا، لوہے کی عمارتیں اور سڑکوں پر چلتے پھرتے روبوٹ۔ ❁

بقیہ صفحہ ۶۳ ایک مکالمہ

"جی"

"آئندہ خیال رکھنا"

"جی بہت اچھا"

اچانک پردہ ہٹا اور ایک بھیگی سا کلرک صورت آدمی کمرے سے نکلا۔ میں نے اُس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چپکے سے پوچھا "اے — کیا بہت خونخوار ہے؟

"کیا بکتے ہو!؟" وہی دہاڑ بجلی کی طرح تڑپ کر میرے کانوں پر گری اور روشن مستقبل کے میرے تمام خوابوں کو جلا کر راکھ کر گئی۔ ❁

عبید صدیقی

یقیناً ہم کو گھر اچھے لگے تھے
کہیں پہلے مگر اچھے لگے تھے

وہ دریا ہجر کا تھا تند دریا
اُداسی کے بھنور اچھے لگے تھے

اسے رخصت کیا اور اس سے پہلے
یہی دیوار و در اچھے لگے تھے

ہمارے ہاتھ میں پتھر کا آنا
درختوں پر ثمر اچھے لگے تھے

صعوبت تو سفر میں لازمی تھی
مگر کچھ ہم سفر اچھے لگے تھے

وہ چہرے جن پہ روشن تھی صداقت
لہو میں تر بہ تر اچھے لگے تھے

ہوا کا زور بھی اپنی جگہ تھا
سراسیمہ شجر اچھے لگے تھے

● ریڈیو کشمیر، سری نگر، کشمیر

اظہر عنایتی

دلوں سے آگ جو لگتی رہی مکانوں کو
مہ و نجوم جلا دیں نہ آسمانوں کو

مرے قبیلے میں کیا، شہر بھر سے مل دیکھو
کوئی بھی تیر نہیں دیتا بے کمانوں کو

شکستگی نے گرا دیں سروں پہ دیواریں
مخاصمت تھی مکینوں سے کیا مکانوں کو

یہی کرے گی کسی سمت کا تعین بھی
اسی ہوا نے تو کھولا ہے بادبانوں کو

یہ سوچتا ہوں وہ کیا حسن کار تیشہ تھا
جو ایسے نقش عطا کر گیا چٹانوں کو

جہاں ضدیں کیا کرتا تھا بچپنا میرا
کہاں سے لاؤں کھلونوں کی ان دکانوں کو

پڑوسیوں سے بھی اب گفتگو کا لطف نہیں
خموش کر گئیں پابندیاں زبانوں کو

● شیخ کا بھیرہ، رام پور، یو پی

اسلم کولسری

جیت گیا ہے وقت کا دھارا
تم بھی ہارے، میں بھی ہارا

میرے سپنے — ٹکڑے ٹکڑے
میری غزلیں — پارا پارا

لہروں سے بیزار ہو جیسے
ندیا کا خاموش کنارا

چاند کو گھائل کر دیتا ہے
ان آنکھوں کا نرم اشارا

میرے سنگ تڑپ کر دیکھو
کانپ رہا ہے تارا تارا

میرا سینہ — بوڑھا کاغذ
اس کی یاد جواں انگارا

سُن کے ویرانے میں اسلم
کون پھرے ہے مارا مارا

● الرحمت کلاتھ ہاؤس، غوثیہ بازار
حجمبر، ضلع اوکاڑہ (پاکستان)

کلیم احمد

۱۰ - بیت المکرم، ڈھاکہ - ۲ (بنگلہ دیش)

سپنوں کا قتل

اُسکی دائیں آنکھ جب پھڑکتی تو اس کے بیٹے کا خط آتا یا پھر وہ خود آنے والا ہوتا۔ لیکن دائیں آنکھ کو پھڑکتے ہوئے جب تیسرا دن ہو گیا اور مانک کا خط نہیں آیا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس کا بیٹا آنے کی تیاری کر رہا ہے اور ہو سکتا ہے کل صبح کی ٹرین سے چلا آئے یا پھر ابھی اسکی ڈھاکہ سے ایک ٹرین شام کے چار بجے آتی ہے۔ اگر مانک رات کی ٹرین سے چلا ہو گا تو اس وقت ——— وہ طرح طرح سے سوچتی ہوئی گھر کا دروازہ کھول کر اسٹیشن کو جانے والی سڑک کی جانب دیکھنے لگی۔

اسٹیشن سے گھر کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ اس لئے جب وسل بجاتی ہوئی کوئی ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوتی تو ٹرین کی آمد کا علم ضرور ہو جاتا اور جب ٹرین آجاتی تو گلی سے رکشا کے گذرنے کے شور سے یہ اندازہ ہو جاتا کہ ٹرین آگئی ہے اور اب لوگ رکشوں میں سوار اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا رہے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ اس لئے اگر کسی کونے میں ہلکا سا بھی شور ہوتا تو پورے شہر میں اس کی بازگشت سنی جاتی۔ پھر یہ تو ٹرین تھی اور یہاں سے اسٹیشن کا فاصلہ بس ایک فرلانگ کا تھا۔ رکشا والے کو اسٹیشن سے یہاں آنے کا ایک ٹاکا دے دو تو وہ خوش ہو جاتا۔ کیوں کہ ایک ٹاکا نا صرف زیادہ ہوتا بلکہ وہ دوڑتا ہوا اور سواری پکڑ لیتا۔ لیکن ابھی ٹرین نہیں آئی تھی۔ کیوں کہ سڑک پر سے اکا دکا رکشا گذر رہا تھا۔ معمول کی طرح آج بھی ٹرین لیٹ تھی۔

وہ دروازے سے لگی ہوئی اب تک سڑک کی جانب تک رہی تھی کہ اچانک اس کے نتھنوں میں مسالہ کے جلنے کی تیز بو آئی تو اسے خیال آیا کہ وہ مچھلی یوں ہی دھو کر دیگچی میں چھوڑ آئی تھی اور مسالہ جسے بھوننے کو کڑاہی میں ڈال آئی تھی شاید جل ہی گئی۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے اندر جانا چاہا کہ گلی میں کھیلتے ہوئے لڑکے سوپن پر اس کی نظر پڑی تو اس نے سوپن کو آواز دی۔ "سوپن سن جا" "جی خالہ جان" سوپن نے مخاطب ہوتے ہوئے وہیں سے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

بابا! اگر ٹرین آئے تو مجھے آواز دینا۔

اچھا! سوپن پھر سے اپنے کھیل میں مشغول ہوتے ہوئے بولا۔ اگر ٹرین آئی تو وہ ضرور آواز دے گا۔ پھر اچانک کھیلتے ہوئے اس چھوٹے لڑکے کو خیال آیا کیا مانک بھیا آرہا ہے۔ جو خالہ ٹرین کے آنے کا انتظار کرنے کو کہہ گئی فوراً تب ہی تو خالہ دروازے سے لگی کھڑی مانک بھیا کی راہ دیکھ رہی تھی پھر وہ گلی ڈنڈا ایک طرف پھینکتے ہوئے دوڑتا ہوا خالہ کے پاس گیا۔ خالہ۔ خالہ کیا مانک بھیا آرہا ہے۔

ہاں نیرا مانک بھیا۔ وہ آرہا ہے نا۔ جب ہی تو تجھے ٹرین دیکھنے کو کہہ آئی۔

"اوہ تب تو خوب مزہ آئے گا۔ ہم سب پھر ڈنگی پر مچھلیاں پکڑنے جائیں گے۔ جانتی ہو خالہ پچھلی دفعہ جو مانک بھیا آئے تھے تو ہم سب نے ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑی تھیں۔ پھر بو بونے اسے کوٹا اور پکایا تھا۔ کتنا مزہ آیا تھا۔ سوپن چٹخارہ لینے لگا تو اسے ہنسی آگئی اور ہنستے ہوئے سوپن سے کہا: "اچھا جا دیکھ اب ٹرین آگئی ہو گی۔

نا خالہ ٹرین ابھی نہیں آئی۔ ٹرین اگر آگئی ہوتی تو رکشا کی ٹرن ٹرن کی آواز نہ آتی۔ چھوٹے سوپن نے اس کی توجہ رکشا کی جانب کروائی تو اسے خیال آیا کہ اب بھی گلی سے اکا دکا ہی رکشا گذرنے کی آواز آرہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی ٹرین کے آنے میں کچھ دیر ہے۔ لیکن اس کو قرار کہاں۔ وہ تو بار بار دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

سوپن نے خالہ کو جو دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے دیکھا تو کہا۔ "خالہ فکر نہ کرو۔ مانک بھیا تو دور سے آتا ہوا نظر آجائے گا۔ پھر جب تک بھیا کا رکشا گلی میں داخل ہو میں تمہیں آکر بتا جاؤں گا۔ یہ کہتا ہوا سوپن تو باہر دوڑ گیا۔ لیکن وہ اسے دوڑتے ہوئے دیکھ کر اچانک اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی۔

وقت کا پنچھی کتنی تیز اڑان اڑتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنے سال بیت گئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ ہاں کل ہی تو وہ دفتر سے آئے

اور آتے ہی مانک کو گود میں اٹھاتے ہوئے بولے"۔ راحیلہ دیکھو مجھے دیکھتے ہی کیسا لپکتا ہے"۔

ہاں آپ کا بیٹا آپ کی طرف نہیں لپکے گا تو کسی دوسرے کی طرف ـــــ میرے اس جواب پر انہوں نے کتنی شریر نگاہوں سے دیکھا تھا اور کہا تھا۔ تمہارا بھی تو ہے" اور پھر ہم دونوں مانک کی جانب دیکھتے ہوئے ہنس پڑے۔ پھر ہنستے ہوئے انہوں نے کہا تھا" بھئی کیا پکایا ہے۔ جلدی لاؤ سخت بھوک لگی ہے"۔

آپ کپڑے تبدیل کریں بس قورمہ تیار ہوا۔

قورمہ پھر روہُو مچھلی کا۔ اب تو بھوک اور چمک اٹھی۔

انور کی طرح مانک بھی روہُو مچھلی کا قورمہ جو راحیلہ بیگم ناریل دے کر پکایا کرتیں بہت پسند تھا۔ وہ قورمہ بڑے شوق سے کھاتا۔ اور ایک روز اس نے قورمہ کی تعریف کرتے ہوئے اپنی ماں سے یہ کہا"ماں ـــــ جنت میں کیا اس سے بھی لذیذ کھانے اس کے بندوں کو ملیں گے" تو وہ حیران ہو گئی اور اس نے مانک کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

بابا جنت تو اچھے بندوں کی جگہ ہے۔ جہاں ان کے لئے خدا تعالیٰ نے دودھ کی نہریں اور میٹھے پانی کا چشمہ بہا رکھا ہے۔ انواع و اقسام کے میوے اور پھل و پھول کے درخت اگا رکھے ہیں۔

تب ماں بابا۔ وہ تو اچھے بندے تھے نا۔ مانک نے جب انور کی یاد دلائی تو اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے مانک کی طرف دیکھا اور کہا۔

ہاں بابا! ویسے ہی اچھے بندوں کے لئے تو جنت ہے۔ جو دیش اور اس کے لئے قربانی دیتے ہیں۔ شہید ہوتے ہیں۔

"تب ماں میں بھی بابا کی طرح شہید ہوں گا"۔ نہیں بیٹے نہیں۔ گھبرا کر اس نے بیٹے کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ میں ڈر جاتی ہوں۔

اچھا ماں تم اتنا کیوں ڈرتی ہو۔

ماں ہوں نا بیٹے اس لئے۔ ماں کا دل تو اتنا ذرا سا ہوتا ہے۔ ذرا سا میں دھڑ دھڑ دھڑکنے لگتا ہے۔ پھر بابا اب تو ہمارا دیش آزاد ہے ہم سادھن ہیں۔

تب ماں پھر تو یہ بڑی بات ہوئی نا۔ مانک نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تو ماں نے اسے کلیجے سے لگا لیا"۔ میرا اچھا سونا مانک چاند" وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ شاید کچھ دیر اور کہ سوپن نے آتے ہی کہا"۔ خالہ مانک بھیا تو نہیں آیا۔ تم نے خواہ مخواہ مجھے اتنی دیر ٹھہرائے رکھا۔ سوپن نے روٹھتے ہوئے کہا تو اس نے پیار کرتے ہوئے اسے بتایا"۔ ارے تو تو سچ مچ روٹھ گیا۔ تیرا مانک بھیا کل آئے گا۔ دیکھ نا بیٹے وہ صبح کی ٹرین سے ضرور آئے گا۔

سچ ـــــ سوپن نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جیسے اقرار کروایا کہ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔

ہاں سچی! اس نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا تو سوپن نے خوشی سے تقریباً اچھلتے ہوئے کہا"۔ تب خالہ بوبو کو بتا آؤں"۔ ارے سوپن سن" لیکن وہ چلبلا لڑکا اس کی بات سننے کو ٹھہرا نہیں دہلیز پھلانگتا باہر گلی کو لپکا۔

اسے جب روزی کا خیال آیا تو اس نے سوچا کہ وہ آجاتی تو منٹوں میں سارا کام نمٹا دیتی۔ روزی بڑی اچھی نیک بچی ہے۔ لیکن یہ شریر سوپن اسے سوپن پر غصہ آیا اور ساتھ اس کے کھلنڈرے پن پر ہنسی بھی۔ اس نے سوچا بالکل مانک جیسا نٹ کھٹ شریر ہے یہ لڑکا۔

اس کی دنیا مانک کے دم سے تھی۔ وہ ہنستا تو وہ بھی مسکرا دیتی وہ روتا تو اس کا کلیجہ شق ہو جاتا۔ جی چاہتا آسمان سے سارے تارے نوچ کر مانک کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ کیوں روتا ہے میرا چاند۔ چپ ہو جا دیکھ کتنے جھلمل کرتے تارے ہیں۔ لیکن ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھی کہ تارے آسمان پر ہیں اور اس کے پاس راکٹ نہیں۔ وہ تو ایک پرانی پیتل کی تھالی تھی۔ جس کی قلعی بیتے ہوئے دنوں کے ساتھ ماند پڑ گئی تھی۔

دیش آزاد ہوا تو چند دنوں کے لئے لوگوں نے اسے ماتھے پر بٹھایا۔ کیوں کہ وہ شہید کی بیوہ تھی۔ لیکن پھر گذرے ہوئے لمحوں کی طرح وہ بھی بھلا دی گئی اور پھر اس کا کوئی پرسان حال نہیں رہا۔ سچ جیسے وہ پرانی پیتل کی تھالی ہی ہو۔ دن تو خیر مانک کے ساتھ ہنستے بولتے گذر جاتا لیکن رات جو دن سے پہر دو پہر بڑی ہوتی وہ ہوتی اور اس کی یادیں۔

راحیلہ ـــ راحیلہ ـــ اٹھو راحیلہ میں یہ میں ہوں۔ اس کی ابھی آنکھ لگی تھی کہ بہت مانوس آواز اس کے کانوں میں سنائی دی۔ انور کی آواز سے کان آشنا تھے۔ انہیں اپنے قریب پا کر طبیعت کا وہ بوجھل پن نہ جانے کب رخصت ہوا اور وہ بڑی بشاشت سی بولی"۔ آپ ہاں راحیلہ میں لیکن یہ کیا تم ہو۔ نہیں یہ تم تو نہیں۔

میں......میں نہیں۔ وہ تحیر زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

ہاں۔ اپنا آپ تو دیکھو۔ کیا یہ تم ہو۔ نہیں یہ تم نہیں۔ تم میری راحیلہ

نہیں ہو سکتی۔ راحیلہ یہ تم تو ہرگز نہیں۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔ وہ سناٹے میں آگئی۔ پھر وہ بلبلا اٹھی: "یہ میں ہوں۔ میں ہی راحیلہ ہوں"۔ لیکن اس کو کوئی جواب نہیں ملا۔ اور اس کی آواز واپس اس کے پاس لوٹ آئی تو وہ بہت دیر تک گم سم سی چپ بیٹھی رہی۔ خود کو ٹٹولتی رہی کیا یہ سچ ہے میں نہیں؟ سناٹے میں کھڑ کھڑ کی آواز پر وہ چونک اٹھی۔ اس نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا انور کی قسطوں میں خریدی ہوئی سلائی مشین کے اندر کوئی چوہا کھڑ بڑ کر رہا تھا۔ یہ سلائی مشین اس کی ضد پر انور نے خریدی تھی۔ لیکن اب تک اس نے اسکا استعمال تک نہیں کیا تھا۔ وہ اٹھی اور سلائی مشین کو اٹھایا جھاڑ پونچھ کر دیکھا۔ سلائی مشین صحیح حالت میں ہے۔ گو اس کے اوپر کے کور میں چوہوں نے سوراخ بنا ڈالے تھے۔ لیکن مشین صحیح تھی اس نے سوئی میں دھاگہ ڈالا اور اپنے آپ سے مخاطب ہوئی۔ میں راحیلہ ہوں انور میں راحیلہ ہوں۔ آپ کا سپنا جھوٹا نہیں ہوگا میں آپ کے سپنے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گی۔ بس تھوڑا میری جان تم تھوڑا حوصلہ دینا۔

وقت کا پنچھی کئی صدیں پھلانگ گیا۔ مانک اسکول کی سیڑھیاں پھلانگتا کالج پہنچا اور پھر کالج سے ہوتا ہوا یونیورسٹی جا پہنچا۔ راحیلہ نے انور کی تصویر دیوار سے لٹکاتے ہوئے کہا۔ دیکھئے اب آپ کو مجھ سے شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اب ایک بات میری مانیئے۔ مجھے یہ سونا سونا آنگن اچھا نہیں لگتا۔ میں چاہتی ہوں روزی کو گھر لے آؤں۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ میرا دل بھی بہلا رہے گا۔ میں کہوں۔ میری سنتا کب ہے وہ۔ لیکن آپ کی بات وہ نہیں ٹال سکتا۔ آپ سے بہت ڈرتا ہے۔ کیوں آپ کو یاد نہیں جب وہ شرارتیں کیا کرتا تو میرا اتنا ہی کہنا کافی ہوتا۔ "اچھا آنے دے تیرے بابا کو"۔

خالہ — !

کون اس نے چونکتے ہوئے دروازے کی جانب دیکھا تو روزی ہاتھ میں کرشنا چوڑا کا پھول لیے کھڑی تھی۔

ارے اندر آ — اور یہ کرشنا چوڑا کیوں کرشنا چوڑا تجھے بہت پسند ہے؟

ہاں خالہ۔ دیکھو نا کیسا سرخ ہے جیسے ہمارے شہیدوں کا رنگ۔

اچھا ری تجھے تو بڑی باتیں بنانی آگئی ہیں۔ سمجھی! مانک سکھایا کرتا ہے۔

باہ رے مانک بھیا کیوں۔ آج کون سا دن خالہ تمہیں یاد نہیں۔

ارے سچ میں تو ایک دم بھول گئی تھی آج ہی تو انور ——

روزی نے کہا تو اسے یاد آیا ورنہ وہ تو مانک کے آنے کی خوشی میں سب بھول گئی تھی۔

روزی نے کرشنا چوڑا کے پھولوں کا گلدستہ انور کی تصویر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو خالہ تم پھر اُداس ہوگئیں"۔

نا رے بھلا میں کیوں اُداس ہوں۔ اس نے کہا لیکن چہرہ تو اندر کی اتھل پتھل کا وکاس ہوتا ہے۔ انور تو جیون ساتھی تھا۔ اس کی کمی تو ہر وقت محسوس ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی انور انھیں بے چین سا کر دیتا۔ اچانک روزی کے یاد دلانے پر وہ پھر سے بے چین سی ہوگئی تھی۔

آج اگر وہ ہوتے تو کیا کم خوش ہوتے۔ انہیں بھی اپنے بیٹے کے آنے کا انتظار ہوتا۔

کھٹ —— کھٹ کرتے ہوئے کسی نے دروازہ کا کنڈا ہلایا تو اس نے روزی سے کہا۔ "دیکھ کہیں شریر سوپن تو نہیں۔ بڑا وقت پر آیا ہے بازار لادے گا۔

اس نے کہا تو روزی نے دوڑتے ہوئے دروازہ کھولا لیکن دروازے پر بوڑھے کو کھڑا دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بوڑھے کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے اس کو بڑی مردہ سی آواز میں پکارا۔

ماں —! گوٹیلی گرام۔

ارے میری آنکھیں سچ کہتی ہیں۔ میرے مانک کے آنے کی اطلاع ہے۔ ٹیلی گرام پڑھ کب آرہا ہے وہ۔ اسے پڑھنا لڑکی کیا لکھا ہے۔ کل ہی آرہا ہے نا میرا چاند۔ اس نے قریب آکر پوچھا۔

بوڑھا ٹیلی گرام والا جو اب تک چپ کھڑا تھا۔ اس نے انتہائی دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔ "ماں —— ماں کو کال یونیورسٹی گنڈ د نکلے آنا میرا نیک سونار چھیلے راپا ربٹے گئے چھے۔

(ماں —— ماں کل یونیورسٹی کے ہنگامے نے ہمارے بہت سے سونا جیسے لڑکوں کو نگل لیا ہے) ❁

◯ زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے اس شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم آئندہ کے لئے مبلغ ۴۰ روپئے جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی۔ بھیجنے کی ہدایت کریں۔

ھیرا نند سوز

صحیفہ

غنیم ملکوں کے جیل خانوں میں قید
فوجی سپاہیو! جس جگہ بھی ہو تم
مجھے وہاں سے تم اپنی ساری صعوبتیں اور کرب تنہائیوں کے بھیجو
تمام دنیا کے اسپتالوں میں
زندگی اور موت کی کشمکش سے ہارے ہوئے مریضو!
مجھے تم اپنی اذیتوں
اور جسم و جاں پہ گذرتے لمحوں کی نشتریت کا حال لکھو
میں جاننا چاہتا ہوں اتنا
کہ زندگی جو خدا کی نعمت تھی آج کتنی گراں ہے تم پہ
خدا کی دھرتی پہ خشک سالی کی زد میں آئے ہوئے کسانو
جہاں بھی ہو تم
مجھے وہاں کے تباہ گاؤں کا منظر کر بتا دکھاؤ
اور اپنے اپنے برہنہ کھیتوں سے بھوک کی فصل کاٹ لاؤ
کہ مجھ کو لکھنا ہے اک صحیفہ
تمام مصیبتوں کا
تمام ایسی اذیتوں کا
ہوئی ہیں اب تک جو تم پہ نازل
بنام قسمت
بنام آفات ناگہانی
تمام شہروں کے قہوہ خانے
تمام گلیاں
تمام سڑکیں
میرا پتہ ہیں

میں اس صحیفے کو حشر کے دن
تمہارے سوکھے ہوئے لبوں
اور بھیگی پلکوں کے دستخط سے
ضرور پیش خدا کروں گا
بس ایک خدشہ ہے میرے دل میں
اگر کہیں وہ ہمارے دکھ کی زباں نہ سمجھا
تو کیا کریں گے ؟

شاعر
۲۶۱
فرید آباد ۱۲۱۰۰۶

اطہر فاروقی

لفظوں کا جرس

لفظوں کے دائرے
زندگی کے جرس سے نکل کر
ہواؤں میں اڑنے لگے
دائروں سے نکلتی ہوئی خودنمائی کی رو
اجنبیت کا عنوان بنتی گئی

لفظوں کا زیر و بم
اپنے اندر لیئے
خودپسندی کا طوفاں
سانسوں کی لہروں کے ساتھ
اوپر آتا رہا، نیچے جاتا رہا

اور
اک روز
لفظوں کا سیل رواں
تند جذبوں کے نیچے کہیں رہ گیا
خودپسندی کا ہر دائرہ ٹوٹ کر
بکھلے جسموں کی امواج میں بہہ گیا

۲۲۵ ستلج ہوسٹل۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی

افتخار امام صدّیقی

۱

کس نے کس کو چاہا ہے، کون کس کا ہوتا ہے
لفظ لفظ باتیں ہیں، حرف حرف دھوکا ہے

لوگ کیا رہے ہوں گے، شکل کیا رہی ہوگی؟
آدمی نہیں باقی، آدمی کا سایا ہے

سوچتی ہے خاموشی، بولتی ہے تنہائی
آدمی ہے کٹھ پتلی، زندگی تماشا ہے

یہ صدی صلیبوں کی، یہ صدی عذابوں کی
اس صدی کا قصّہ تو، اک صدی کا نوحا ہے

ابتدا سے اب تک کے سلسلے بتاتے ہیں
یہ جہاں مکمّل ہے، آدمی ادھورا ہے

۲

اس کی خوشبو مجھے چھو کر جو ذرا بھی گذرے
مجھ پہ پھیلی ہوئی غم کی یہ فضا بھی گذرے

جس نے بخشے مری آنکھوں کو یہ بادل آنسو
اس کے دل سے مری آہوں کی صدا بھی گذرے

اب تو انجان فضاؤں سے ہو رشتہ قائم
اب تو بے جان زمینوں سے ہوا بھی گذرے

آسماں پر تو ستارے ہیں، خدا سے پہلے
راستہ دیں یہ ستارے تو دعا بھی گذرے

ایک مدّت ہوئی خود کو نہیں سوچا میں نے
کوئی لمحہ تری یادوں کے سوا بھی گذرے

۳

ہم ایسے تنہا لوگوں کا، اب رونا کیا مُسکانا کیا
جب چاہنے والا کوئی نہیں، پھر جینا کیا مرجانا کیا

اک خواب وہ، دنیا جینے کا، اور شوق فلک ہوجانے کا
خوش خواب بہت تھے ہم بھی کبھی، اب خوابوں کا دہرانا کیا

آواز کسی کو دیں لیکن، اک نام تمہارا ہونٹوں پہ
ہر شکل سے ابھرو تم ہی تم، یوں خود کو مگر بہلانا کیا

سو رنگ میں جس کو سوچا تھا، سو روپ میں جس کو چاہا تھا
وہ چاند غزل تو روٹھ گئی، اب اس کا حال سنانا کیا

راتوں کا سفر ہے دن کیلئے، اور دن میں تمنّا راتوں کی
جب پاؤں میں رستے کھو جائیں، پھر رکنا کیا، گھر جانا کیا

مضامین انشائیہ کے خد و خال متعین کرنے میں اہمیت رکھتے ہیں۔

اداریہ میں آپ نے جن نکتوں کی وضاحت فرمائی ہے وہ آپ کی ناقدانہ بصیرت پر دال ہیں۔ واقعہ ہے کہ یونیورسٹی کے نصاب میں اموروفن کی تدریس کا وہ PROVISION عام طور پر نہیں ملتا جو آپ SUGGEST کر رہے ہیں۔ تجربات کے ساتھ ساتھ آپ کی اس تحریر سے بھی نکتہ رسی اور نفیسہ سنجی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ شمارے میں جواب آں غزل کے طور پر دو گیان چند کے مکتوب کے ردعمل کی حیثیت سے شامل ہے۔ بلا مبالغہ آپ کی جدت پسند طبیعت شاعر کے معیار و وقار میں اضافہ کر رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب شاعر دنیا کی بڑی زبانوں کے ادبی رسائل کی صف میں اپنی جگہ فروزاں بنائے گا۔ آپ بے شک لائق صد مبارکباد ہیں۔

لیکن عرض کروں کہ اس شمارے میں جہاں اتنی ساری خوبیاں موجود ہیں چند بہت بنیادی قسم کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ زبیر رضوی جیسے پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر کے یہاں قرأت لفظی سے بے نیازی کی مثال ملتی ہے۔ اس گیت "ایک مدہ تخلیق ہے جسے آپنے بڑا اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ پانچویں بند کے آخری مصرعے میں لفظ مہرباں بروزن سخنداں باندھا گیا ہے۔ اس کی توقع نہ زبیر رضوی صاحب سے کی جاسکتی تھی نہ ہی شاعر کے صفحات سے۔ اسی طرح جعفر ۱۵، پر مومن خاں شوق کی نظم "کتاب" کے تیسرے مصرعے میں قرأت لفظی سے بھونڈی بے نیازی طبیعت کو ناگوار گزرتی ہے۔ موصوف نے سطر کو بروزن سفر اور حرف کو بروزن صدف باندھا ہے جب کہ سطر کو بروزن زہر اور صدف کو بروزن برف باندھا جانا چاہئے تھا۔ گذارش ہے کہ تخلیقات کے انتخاب و اشاعت میں ادبیوں کے ناموں کو معیار نہ بنایا جائے تاکہ شاعر اپنا امتیازی وقار بنائے رکھے اور علامہ سیماب اکبرآبادی اور اعجاز صدیقی مرحوم کا شاندار ورثہ جس کے آپ قرار واقعی امین ہیں، برقرار رہ سکے۔

ترنم سہسرامی ——— ایجنسی ہمدرد، چوکھنڈی روڈ سہسرام (بہار)

شاعر کے قارئین ضعیف العمر بھی ہیں۔ خدارا، ہماری آنکھوں پہ ترس کھائیے۔

"فن شاعری کی تدریس کا مسئلہ" میں آپ نے میرے دل کی بات رقم فرمائی ہے۔ سمجھ دار کے لئے اشارہ کافی ہے۔ مجھے بھی عام فرسائی سے نجات ملی۔

شمارہ ۱۱ اور ۱۲ میں رونق شہری اور رئیس منظر نے میر سیفی کے اعتراضات (۴-۲۴) میں سے کچھ کے جوابات دینے کی کوششیں کی ہیں اور اس ضمن میں اساتذہ کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

آج کے شعراء کے یہاں جو خامیاں ہیں ان کی مثال اساتذہ کے یہاں ڈھونڈنکالنا کوئی مشکل امر نہیں ہے لیکن خامی، خامی ہے۔ غالب تو راہگزر کو تذکیر باندھا ہے۔ آج کتنے لوگ غالب کی پیروی کر رہے ہیں!

کیف احمد صدیقی مرحوم اک غزلیں موصوف کے سفر آخرت کی آگاہی کی غماز ہیں۔

ست پرکاش سنگھ ——— ۲۰، ۹۳، ۳ نئی جیدی گنج

یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی ہے کہ ۱۱ ماہ کے باغوں لگایا ہوا اللہ مرحوم کے ہاتھوں سینچا ہوا، پرورش پایا ہوا پودا آپ کی زیر نگرانی خوب پروان چڑھ رہا ہے۔ اور کس قدر کم مدت میں شاعر ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ادبی دنیا بڑے ملک کے چیدہ اور برگزیدہ رسائل میں اس نے ایک منفرد خصوصی مقام پا لیا ہے۔ آپ کی کامیاب سعی و کوشش جناب اعجاز صاحب کی روح کو جنت کی خوشگوار فضا میں کس قدر راحت عطا کر رہی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

خدا آپ کو اس سے کئی گنا کامیابی عطا کرے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دعا ہو سکتی ہے، درد دل کی صدا کیا ہے!

کنور سین ——— ۴/۱۳۔ اے۔ ویسٹ پٹیل نگر۔ نئی دہلی ۸

شاعر کا معیار اور رکھ رکھاؤ ہے کہ دن بدن منزل بہ منزل آگے بڑھ رہا ہے۔ ترتیب و تدوین بھی خوب ہے۔ مجھ تو تحقیق و تدوین کا سلسلہ سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ یاد رفتگاں میں ایک ذاتی اور مرتعش احساس ہوتا ہے۔ وہ بیتے اور ماضی سے متعلق حقائق و صدمات کو بیدار کرتی ہے۔ پھر آپ تو اس میں رفتگاں کے بارے میں اتنی معلومات بہم پہنچاتے ہیں کہ وہ زندہ و جاوید ہو جاتے ہیں۔ اس بار شمارہ نمبر ۹ میں محمد عیسیٰ تنہا پر مضمون بھی بہت پسند آیا اور پھر ان کا یہ شعر:

> کچھ شور ہو موقوف نہیں سننے ہو تنہا
> گر بات بھی کہیے تو بس انسان کے آگے

مرزا حامد بیگ ——— شعبۂ اردو، گارڈن کالج، راولپنڈی

شاعر کے شمارے مل گئے تھے، شکریہ۔ پرچہ شاندار ہے تو کیا اچھا ہو۔ میرے جملہ احباب کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ مجھے خصوصی طور پر اس کا تحقیقی مزاج بھاتا ہے۔ آثار، لمحہ لمحہ، اور زبان و بیاں کس بہت اچھے سلسلے ہیں۔

دلیپ سنگھ ——— ۴/۵۹ راجندر نگر، نئی دہلی

شاعر ہر مہینے کی پہلی تاریخوں کے ساتھ روانہ ہوتا ہے لیکن یہ بات تو مجھ سے پہلے مجھ سے زیادہ سمجھ دار لوگ متعدد بار کہہ چکے ہیں۔

بیرانند سوز ——— ۶-۱۰۱۷/۱۱ ،۲، فرید آباد (ہریانہ)

شمارہ نمبر ۳ / ۴ میں شائع شدہ میرے خط کے سلسلے میں جناب رونق شہری نے شمارہ نمبر ۷ اور جناب رئیس منظر نے شمارہ نمبر ۹ میں میرے اعتراضات کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے۔

جناب رونق شہری نے پہلے اس شعر سے

> نہ جانے کس سمت کی ہوا تھی کہ جس کی سیٹی پہ
> پتنگ کی ڈور کھ سے بہتر پینٹا تھا

میں فاعل کی عدم موجودگی کو جائز ٹھہراتے ہوئے اسے شعر کا حسن قرار دیا ہے۔ حالانکہ فاعل کی کمی ہی اس شعر میں محل نظر ہے۔ بعض اشعار میں فاعل محذوف ہو سکتا ہے لیکن یہاں اس کا حذف جائز نہیں۔ اگر نظم کا شعر ہوتا تو اور بات تھی۔ لیکن غزل میں یہ شعر ایک واضح فاعل کی موجودگی کا متقاضی ہے کیونکہ وہ کے علاوہ اس میں اور بھی فاعل ہو سکتے ہیں مثلاً

> نہ جانے کس سمت کی ہوا تھی کہ پاس والا
> ——— ایضاً ——— اس کا ساتھی
> ——— ایضاً ——— میرا بیٹا۔ وغیرہ
> پتنگ کی ڈور کھ سے بہتر پینٹا تھا

اس لئے یہاں وہ کی عدم موجودگی اسکے موجود ہونے کا جواز نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جناب شتر خانقاہی کی غزل کا حوالہ دیا ہے جہاں "مصل" یہ نے تخاطب کے طور پر استعمال ہوا ہے اس لئے اس میں فاعل یا مفعول کی تخصیص کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس طرح تو رونق شہری صاحب کو تو اقبال کے اس مصرعے "خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر" میں بھی فاعل تلاش کروانا چاہیں گے۔ ویسے اس شعر میں کہ کی جگہ وہ کر دینے سے شعر سنور سکتا ہے۔ انہوں نے میرے دوسرے اعتراض پر سوال اٹھایا ہے کہ کیا میں جناب مظفر ایرج کے اس مصرعے "مجھ پر منتر پھونکتے پھونکتے ہی جادوگر لوٹ گئے" میں ان سے پھونکت پھونکت لکھوانا چاہتا ہوں، حالانکہ میں نے اپنے خط میں ایسا کوئی خیال ظاہر نہیں کیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہندی لفظ کی "ے" گرانا جائز ہے مگر اس حد تک نہیں کہ ایک مصرعے میں ایک ساتھ دو بار "ے" حذف کر کے لطف کلام مجروح کر دیا جائے جس سماعت کے لئے لطف کلام لازمی ہے اور اس مصرعے میں "ے" کا حذف ہونا اس درجہ بار سماعت ہے کہ "پائے" کے ساکن رکن کی بجائے "ت" کا متحرک رکن حذف ہوتا ہے اور پھونکتے پھونکتے سے وزن پورا ہوتا نظر آتا ہے۔ غالب کے اس شعر "کلکتے" کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں - اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے کے پہلے مصرعے میں "کلکتے" اور "تو نے" کی "ے" گرتی ہے مگر ناگوار نہیں گذرتی "کلکتے" اور "پھونکتے" کی "ے" گرنے کا فرق بھی ملاحظہ ہو۔ مگر دوسرے مصرعے میں "میرے" اور "سینے" کی "ے" کا محذوف ہونا عیب لگ رہا ہے جناب جوش نے اس مصرعے کے بارے میں مذاقاً کہا تھا کہ "کلکتے جا کر میر سین" سے بھی ملے گا۔ اس کے علاوہ میرے اعتراض کا مقصد یہ بھی تھا کہ منتر صرف پھونکا ہی نہیں جاتا بلکہ پڑھا بھی جاتا ہے اور منتر پڑھنا نہ صرف اس لفظ کے صحیح مفہوم کے زیادہ قریب ہے بلکہ پڑھتے پڑھتے شعر کے وزن میں بہتر طور پر پورا اترتا ہے۔ اس لیے میں پھونکت پھونکت نہیں بلکہ پڑھتے پڑھتے کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

شمارہ نمبر ۹ میں جناب رئیس منظر فرماتے ہیں کہ تعقید لفظی لسانی نظام کی ایک خصوصیت ہے لیکن فنی مہارت اور ریاضت کی کمی اسے شعر کا عیب بنا دیتی ہے۔ مجھے ان کا استدلال قبول ہے اور بات یہ بھی ہے کہ اس مصرعے "دو مملکت کو انا کی بڑھائے جاتا ہے" میں روانی اور سلاست کے فقدان کی وجہ سے ہی تعقید لفظی کھٹکتی ہے اور انا کی بجائے خود واحد لفظ نظر آتا ہے۔ روانی اور سلاست کا فقدان اس مصرعے کا حقیقی نقص نہیں بنیادی نقص تعقید لفظی ہے جو روانی اور سلاست نہ ہونے کی وجہ سے اجاگر ہوا ہے جناب حسرت موہانی کے شعر میں روانی اور سلاست کا حسن ہی تعقید لفظی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ ورنہ بقول جناب رئیس منظر تعقید لفظی تو اس میں ہے میں نے بھی تو جناب اسعد بدایونی کے مصرعے کے بارے میں اتنا ہی عرض کیا ہے کہ اس میں تعقید لفظی ہے اس کے علاوہ رئیس منظر صاحب نے فرمایا ہے کہ "کس کا روشنی دیتا ہوا سا پیکر ہے" میں انہیں کوئی خاص خامی نظر نہیں آئی اور انہوں نے وضاحت چاہی ہے کہ "سا پیکر" میں کیا غلطی ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ "پیکر" سے پہلے "سا" لگنے سے سارا مصرعہ مبہم ہو گیا ہے کیونکہ الفاظ کی ترکیب صحیح نہیں رہی یا تو روشنی سی دیتا ہوا پیکر ہونا چاہیے یا پیکر سا روشنی دیتا ہوا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے رئیس صاحب "روشنی دیتا ہوا" کو ایک لفظ کے طور پر روشنی کے نعم البدل کے زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے ہوں لیکن اس سے بات بنتی نہیں۔

○ تر و تازہ — ترسیل پبلی کیشنز کی ایک اہم پیش کش۔ دس ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کا عکس۔ ہر فن کار کی تین تین کہانیاں اور ان پر تبصرہ نئے افسانے کی سمت و رفتار ایک نئے انداز سے۔ ترتیب کار: تاج انور۔ رابطہ: ترسیل پبلی کیشنز، متی مسجد، گیوال بگیہہ، گیا (بہار)

○ انشاء — [ماہنامہ] ف۔ س۔ اعجاز کی ادارت میں کلکتے سے شائع ہونے والا دلچسپ ادبی و معلوماتی رسالہ۔ زر سالانہ ۴۰ روپے۔ قیمت ۴ روپے۔ رابطہ: ماہنامہ انشاء، انشا پبلی کیشنز ۲۰، اے، کنائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳۔ ترسیل زر کا پتہ: ۲۵۔ بی، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

○ بے زبان ساتھی۔ وکیل نجیب کا نیا ناولٹ شائع ہو گیا ہے۔ علاقۂ دودرپھ سے کسی تخلیق کار کی اولین کتاب جو ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک، آر کے پورم، نئی دہلی ۶۶ نے شائع کی ہے۔ قیمت دس روپے۔

○ جلترنگ — ۱۹۸۵ء کی غزلوں کا انتخاب شائع ہو گیا ہے جس میں ڈھائی سو شعرا کی معیاری غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ مرتبین: مناظر عاشق ہرگانوی۔ شاہد نعیم۔ قیمت ۴۰ روپے۔ رابطہ: کوہسار، بھیکن پور، بھاگل پور (بہار)

○ آخری زمین — سرد والوں کے لیے مظہر الزماں خاں کا نیا ناولٹ شائع ہو گیا ہے قیمت تیس روپے۔ رابطہ: مکان نمبر ۲۵۲ اسپیشل سی کلاس، سی۔ آئی۔ ایل، کالچی گوڑا، حیدرآباد ۲۷ (اے پی)

○ پہچان — معیاری شعر و ادب کی تخلیقی رفتار کی شناخت کے لئے غیر مطبوعہ ادبی تحریروں کا کتابی سلسلہ فوٹو آفسیٹ پر شائع ہو گیا ہے۔ ادبی کتاب نمبر ۴ کے مشمولات میں جدید ادب۔ ایک بحث، ادب کے مختلف النوع موضوعات پر ۵ فکر انگیز مضامین جن میں نظام صدیقی کی ایک مکمل کتاب "نئی شعری لفظیات کا وجودی تناظر" بھی شامل ہے۔ ۸ شعرا کی نظمیں اور ان پر تجزیاتی مطالعات۔ خصوصی مطالعہ کے تحت جگدیش مہرزویدی، غلام محمد قاصر اور صبا اکرام پر مضامین۔ بمل کرشن اشک کی غیر مطبوعہ نظمیں مع تبصرہ۔ ۱۹۸۷ء کا ایک ادبی تحفہ۔ مدیر: نعیم اشفاق۔ معاون مدیر: عشرت بیتاب۔ قیمت مجلد: بیس روپے۔ غیر مجلد دس روپے۔ مراسلت کا پتہ: پہچان پبلی کیشنز، مصدی محلہ آسنسول ۴۰۲ ۷۱۳ (مغربی بنگال)

○ برف شجر آواز — مشہور شاعر حمید الماس کا نیا شعری کارنامہ۔ نئی نظم کا خوب سیرت منظر نامہ۔ قیمت تیس روپے۔ پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولہ مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی۔

○ درد و غم — نشیب و فراز اور قطعات سے بعد غمگین قریشی کا دوسرا مجموعۂ غزل شائع ہو گیا۔ نابینا شاعر کی بصیرت افروز غزلوں پر مالک رام، ظ۔ انصاری اور حفیظ میرٹھی وغیرہ کی گراں قدر آرا بھی شامل ہیں۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۱۵ روپے۔ پتہ: غمگین قریشی محلہ ڈھولی کال، شوکت علی روڈ، سہارنپور (یوپی)

○ آنکھ اور خواب کے درمیاں — "لفظوں کا پل" اور "نور ناچ" کے بعد ندا فاضلی کا تیسرا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے جس میں نظمیں، غزلیں اور گیت شامل ہیں۔ صفحات ۱۱۲، قیمت ۱۲ روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، اردو بازار، دہلی، مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال، بمبئی۔

○ شہر قلم — شوکت مجید کا اولین شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ صفحات ۱۰۲، قیمت ۲۵ روپے۔ ملنے کا پتہ: اردو فرسٹ ۲۲/۴۸ جلمبون پورہ [مدن پورہ] وارانسی۔

○ چٹخارے — عاصی سعیدی کی ۴۰ شگفتہ تحریروں کا اولین مجموعہ جس میں طنز و مزاح کے تازہ کار تخلیقی رنگ نئی لذتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ صفحات ۱۴۸، قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ: سعید محمد عرف ننے میاں، قصبہ و ڈاک خانہ ٹھاکر کلاں، ضلع مراد آباد (یوپی)

○ جامعہ — ماہنامہ جامعہ دہلی نے مشہور ادیب، مورخ، دانشور اور ماہر تعلیم سید محمد مجیب مرحوم کی یاد میں ایک ضخیم شمارہ شائع کیا ہے مجیب صاحب کی یاد میں۔ اس بہت اہم خصوصی نمبر میں ۲۱ وقیع مقالے جو مجیب صاحب کی شخصیت اور ان کے مختلف النوع کارناموں کا احاطہ کرتے ہیں۔ مجیب صاحب کے ۱۷ اہم مضامین جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے تھے۔ ۱۵ تصاویر میں مرکز نگاہ مجیب صاحب ہیں مجیب صاحب کی ۲ تحریروں کے عکس۔ ۳۴۴ صفحات کی یہ شخصی دستاویز ماہنامہ جامعہ کی طرف سے گراں قدر، قابل مطالعہ تحفہ ہے۔ قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ: ماہنامہ جامعہ — جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

○ بچوں کی کہانیاں — حصہ اول دوم اکبر رحمانی نے بچوں کے لئے بہت ہی آسان اور سادہ زبان میں سبق آموز کہانیاں تحریر کی ہیں۔ حصہ اول میں تین کہانیاں اور حصہ دوم میں چار کہانیاں شامل ہیں۔ بہار اسٹیٹ اردو اکاڈمی سے انعام یافتہ قیمت حصہ اول ۳ روپے حصہ دوم تین روپے۔ رابطہ۔ ایجوکیشنل اکاڈمی، اسلام پورہ، جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹر)

○ بازیچۂ اطفال — مہر رحمن نے بچوں کے لئے اسٹیج ڈرامے لکھے ہیں۔ ایسے ہی ۶ معیاری ڈراموں کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً اسکول پروگراموں اور مختلف انجمنوں کی جانب سے کامیابی کے ساتھ اسٹیج کئے گئے اور مقبول ہوئے۔ صفحات ۷۰، قیمت دس روپے۔ رابطہ: کرج امی نسار، سوتے آؤٹ، اکولہ بازار روڈ، یوت مال ۴۴۵۰۰۱ (مہاراشٹر)

○ کہرہ — معروف شاعر، ادیب اور نقاد عزیز اندوری کی نظمیہ شاعری کا اولین مجموعہ جس میں چھوٹی بڑی آزاد و پابند نظمیں ہیں اور یہ شاعری کا خوب سیرت منظر نامہ ہیں۔ پل پل تڑپتی ہوئی زندگی کا آئینہ خانہ ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، شمیم حنفی، عنوان چشتی، عتیق حنفی اور واحد جونپوری کی آرا کے ساتھ۔ صفحات ۱۴۳۔ قیمت ۲۲ روپے۔ پتہ: اردو بک ہاؤس، محمدی بلڈنگ، قدوائی مارگ، اندور۔ ایم۔ پی

○ العطش [جگن ناتھ آزاد نمبر] راج کمار چندن کی ایک ادبی کاوش، جگن ناتھ آزاد پر ایک شمارہ، ایک مطالعہ۔ شخصیت پر ۴ مضامین۔ جگن ناتھ آزاد پر ایک طویل نظم۔ شاعری پر ۴ مضامین۔ نثر نگاری پر ۳ مضامین۔ ایک طویل انٹرویو۔ اقبالیات کے تحت جگن ناتھ آزاد کی تین کتابوں پر تفصیلی مضامین۔ مشاہیر بنام آزاد، آزاد کی غیر مطبوعہ خطوط اور آخر میں آزاد کا منفرد کلام۔ صفحات ۱۰۸۔ قیمت ۲۰ روپے۔ پتہ: العطش ۳۲/۴ نئی چوگان جموں۔

○ انتخاب [خصوصی اشاعت] ڈاکٹر عزیز بری اور ابراہیم نیر کی ادارت میں بنگلہ دیش سے شائع ہونے والا ادبی ماہنامہ۔ اس ضخیم شمارے میں بنگلہ دیش اور ہندو پاک کے مشہور قلم کاروں کے مضامین نثر و نظم کے دھنگ رنگ سجے ہیں۔ حرف آغاز، آئینہ در آئینہ نعت و ذرش کے علاوہ ۷ مقالے، ایک رپورتاژ، ۱۸ نظمیں، ۱۴ افسانے، ۲۲ شعرا کی غزلیں، ۸ کتابوں پر تفصیلی تبصرے اور قارئین کے خطوط۔ صفحات ۱۹۰، قیمت ۵۰ روپے۔ پتہ: مرکز تخلیق ادب، ڈاکٹر ذاکر حق روڈ، سیکٹر اقلقا ماری، بنگلہ دیش

○ ہندی ڈرامے کا ارتقاء — ویدک دور سے ۱۹۴۷ء تک اردو زبان میں اپنے موضوع پر اولین تحقیقی کاوش۔ چار ابواب پر مشتمل مواد میں ابتدائیہ، ہندوستانی ناٹک کے متعلق روایات، ناٹیہ شاستر اور اس کا مصنف، ہندوستانی ناٹک کا عہد بہ عہد ارتقاء، ویدک دور میں ناٹک، پراکرت ڈرامہ، سنسکرت ڈرامہ۔ بھوبھوتی کے بعد سنسکرت ناٹک، سنسکرت ناٹک کے زوال کے اسباب۔ لوک ناٹک، ہندی ناٹک، بھارتیندو اور ان کا عہد، بھارتیندو عہد کے کچھ ناٹک کار، بھارتیندو عہد ناٹکوں کا مجموعی جائزہ۔ بھارتیندو عہد کے بعد ہندی ناٹک جے شنکر پرساد اور ان کے ناٹک، پرساد عہد کے چند ناٹک کار، پرساد عہد کے چند اہم ناٹک، پرساد عہد کے ناٹکوں کا مجموعی جائزہ۔ ہندی کا رنگ منچ، ہندی رنگ منچ کے چند ناٹک کار۔ ہندی میں ایکانکی ناٹک کار۔ ان عنوانات کے علاوہ بھی کئی ذیلی عنوانات۔ کتاب کے آخر میں بسوط اشاریہ کتاب کو اور زیادہ وقیع بناتا ہے۔ صفحات ۲۰۶۔ قیمت ۲۱ روپے۔ پتہ: مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی ۱۴ پرانا ڈن پروفیسر کالونی بھوپال ایم۔ پی

○ افکار گریزاں — جعفر آستانی کا اولین شعری مجموعہ جس میں نظمیں، غزلیں اور گیت شامل ہیں۔ نہایت ہی دیدہ زیب کتابت و طباعت اور نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ ایک قابل مطالعہ شاعری کی کتاب۔ صفحات ۲۱۶۔ قیمت بیس روپے۔ پتہ: ماہنامہ "شان ہند" فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی۔

○ کمان اور زخم — ممتاز نقاد اور شاعر فضیل جعفری کا وہ معرکہ آرا طویل تنقیدی مضمون جو ماہنامہ جواز (مالیگاؤں) میں بالاقساط شائع ہو کر ہند و پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بن گیا ہے۔ جدید اردو تنقید پر ایک گراں قدر مقالہ جو نئی تنقید کا رفتار پیما بھی ہے۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۳۵ روپے۔ پتہ: جواز پبلی کیشنز، ایم۔ اے روڈ، مالیگاؤں (ناسک) ۴۲۳۲۰۳

مُدیر
افتخار امام صدیقی

●

مُعاون
ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ ۳۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ تاعمر خریداری ۵۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۲۵۰ روپے (ہندوستانی)

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

اُردو کی نئی بستیاں

کہتے ہیں کہ اُردو زبان دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ دنیا کے تمام بڑے ممالک میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ اس زبان کا مزاج ایک ایسی تہذیب کا آئینہ دار ہے جو آج کے انسان کی نمائندگی ہی نہیں کرتا بلکہ زبانوں، بولیوں، مذاہب، تہذیبوں، فرقوں، صوبوں، نسلوں اور جغرافیائی فرق کے ساتھ ساتھ سرحدوں میں بٹی ہوئی دنیا کیلئے بھی موزوں ہے۔ ہندوستان کو ہم ایک دنیا ہی کہہ سکتے ہیں اور اسے دنیا کے لیے ایک استعارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اردو بھی ایک استعارہ ہی ہے وسعت کا اخوت اور قومی یکجہتی کا، اتحاد و اتفاق کا، لامحدودیت کا تغیر و تبدّل کا۔ اُردو کی شاعری، اس کا ادب یہ سب کچھ ایک ایسی دنیا کا تصوّر دیتے ہیں جو آج کے انسان کی ضرورت ہے جو کل کے انسان کے لئے بھی ناگزیر ہوگی۔ لیکن ہندستانی سیاست دانوں، رہنماؤں اور برسرِ اقتدار لوگوں نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ اس ملک کی تاریخ کو اس کے مشترکہ تہذیب و تمدن کو اس کی انفرادیت کو ختم کر کے ہی دم لیں گے چاہے ملک کا جو حال ہو جائے ورنہ تو اس حقیقت کا انکار کیسے ممکن ہے کہ ہندی کے ساتھ اردو کا وجود بھی اس ملک کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اردو ! جو ہندستان کے بطن سے پھوٹی اور پھر کل عالم میں سورج کی طرح روشن ہو گئی۔ ہندستان کی تقسیم کے بعد یہی اردو پاکستان اور پھر بنگلہ دیش میں بھی باقی رہی، مقبوضہ کشمیر میں بھی اردو ہے۔ میں ان تمام ملکوں اور علاقوں کو اردو کی نئی بستیاں کہتا ہوں اردو کی یہی بستیاں اب دنیا کے بے شمار چھوٹے بڑے شہروں میں پھیلتی جا رہی ہیں، عرب ممالک، لندن، کینیڈا، ناروے، روس، چین، امریکہ اور نہ جانے کہاں کہاں۔ اردو اب

بسمل پرتاپگڈھی

مرغوب علی

یوسف بیگ جمال

قاضی انتصار

ترتیب
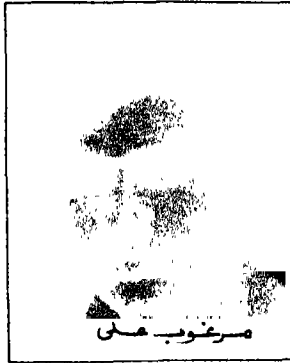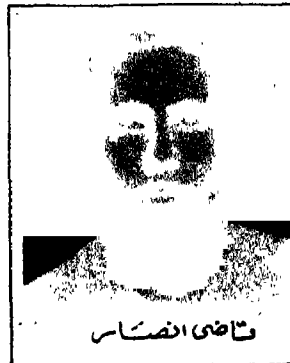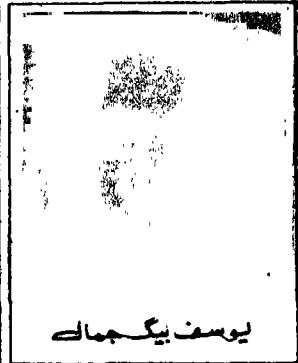
ہندستان و پاکستان سے نکل کر اپنی اپنی نئی بستیوں کی تشکیل و تعمیر میں مصروف ہے۔ اس کے بولنے والے اس کے ادیب و شاعر اس کے عقیدت مند نو آباد بستیوں میں اپنے اقتصادی مسائل سے جوجتے ہوئے اپنی زبان کے فروغ میں مشغول ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ اس سرزمین پر جہاں جہاں اردو بولنے والے ہیں وہ میرا ہی روپ ہیں، میری ہی آواز ہیں، میں ان تمام لوگوں کو خود میں محسوس کرتا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ عصر حاضر کو اُردو زبان کی ضرورت ہے یعنی ہماری ضرورت ہے۔ امن کی اگر کوئی زبان ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے اور میں اردو دنیا کے تمام قلم کاروں کو ایک اکائی میں جوڑنے کے لئے اس شمارے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہا ہوں تاکہ ہم ایک دوسرے کو محسوس کر سکیں، اپنی زبان میں تخلیق کیے جانے والے شعر و ادب کے ذریعہ اس دھرتی کو خوبصورت بنا سکیں۔ ملک، قوم اور مذاہب کے علاوہ زبان کا اپنا بھی ایک کلچر ہوتا ہے یہی کلچر زیادہ نمایاں اور غالب بھی رہتا ہے بلکہ شدید طور پر اثر انداز ہونے والا کلچر۔ ہمیں اپنے اپنے دائروں میں رہ کر اپنی اس زبان کے کلچر کو فروغ دینا ہے۔

اس شمارے میں "اردو کی نئی بستیاں۔ ا" کے عنوان سے ناروے کے چند افسانہ نگاروں کی تخلیقات پیش کی جا رہی ہیں، کسی معیار کو سامنے نہ رکھتے ہوئے ایک نئے سلسلے کی ابتدا کے طور پر، ہماری کوشش ہوگی کہ ہم اُردو کی تمام نئی بستیوں کے قلم کاروں کو شاعر کے ذریعہ پوری اردو دنیا تک پہنچائیں، شاعری، افسانہ، ناول، تنقید، تحقیق وغیرہ سب کچھ اس عنوان کے تحت پیش کیا جائے گا۔ رام لعل صاحب نے ہمارے ایک بے حد خوب صورت خواب کو تعبیر کا امکان دیا ہے ہم اس امکان کو اپنے خواب کی مکمل تعبیر کے لیے اہم ترین پیش رفت سمجھتے ہیں۔ آپ بھی ہماری اس پیش قدمی میں شامل ہو جائیے اور اپنی آواز جہاں تک ممکن ہو پہنچائیے تاکہ پوری اُردو دنیا میں ہماری آواز کی گونج سنی جا سکے۔ آپ سب کے عملی تعاون اور مفید مشوروں کا انتظار رہے گا۔

افتخار امام

آفاق فاخری
سیفی سرونجی
ملک زادہ جاوید
سرفراز شاکر

بازیافت

مثنوی فسونِ بابل [فارسی] از احمد خان صوفی صفحات ۴۰ مطبوعہ ۱۲۷۲ھ مطبع نظامی کانپور۔ [بشکریہ ابراہیم یوسف چوپان]

انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بھوپال ۱۹۴۹ء کی ایک یادگار تصویر میں [دائیں سے بائیں کرسیوں پر] صفیہ اختر، عصمت چغتائی، حامد سعید خاں، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، غلام ربانی تاباں، مہندر ناتھ، مجروح سلطانپوری۔
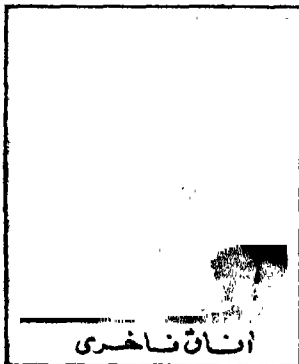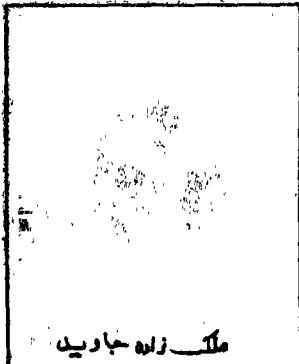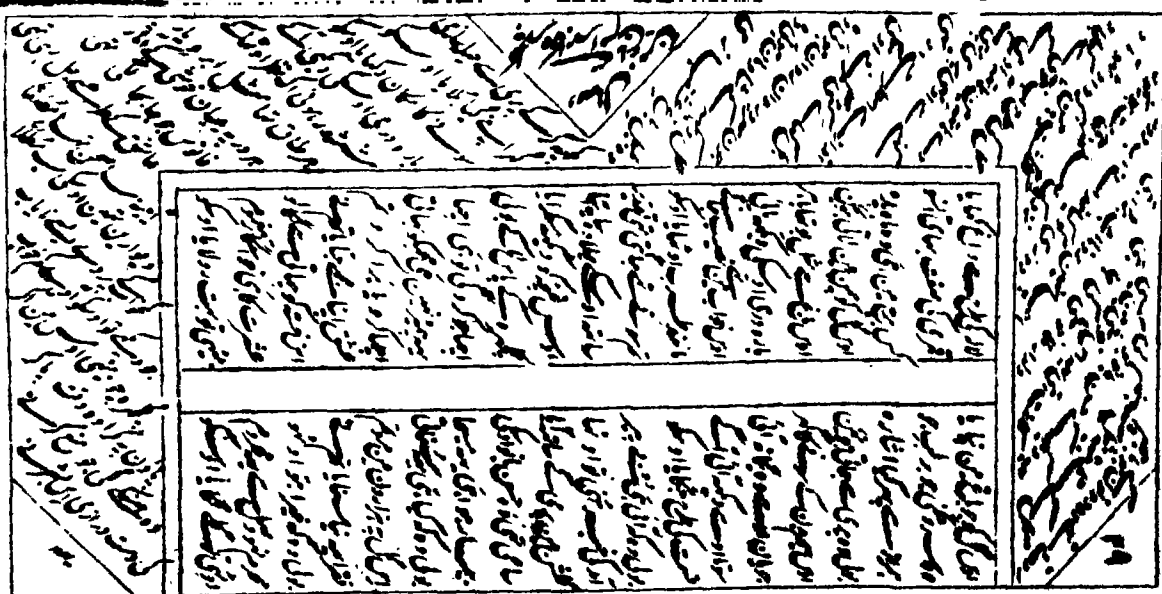
پچھلی صف میں ایستادہ [دائیں سے بائیں] اودیش کمار، محمد عسکری وکیل ایم۔ رشدی، ابراہیم یوسف، محمد عسکری، اشتیاق عارف، اختر سعید خاں، قمر جمالی، احسن علی خاں، اظہر سعید خاں، شاہ میر راہی، یوسف علی خاں، عادل رشید، شاہد لطیف۔ فرش پر بیٹھے ہوئے [دائیں سے بائیں] انجم سلمانی، صہبا لکھنوی، جاں نثار اختر، تاج بھوپالی، سندر لال۔

[بشکریہ ابراہیم یوسف
بھوپال]

مورخہ ۱۷ - مارچ ۱۹۴۶ء

مولوی گنج - لکھنؤ

عزیز القدر گرامی منش زاد لطفکم

سلام مسنون و دعائے اخلاص مشحون - ۱۹ اپریل کا
شکریہ - اعراض پیری کا علاج ہی کیا - مگر پیر ہی
پیس پوت ہوتی ہی رہتی ہے - لیت الشباب یعود
بہرحال تفضل خداوندی اور آپ حضرات کی دعاؤں سے
ابھی تک زندہ ہوں - اور اس ناخوشگوار عمر سے بیزار - آپ نے جناب شوکت میرٹھی مرحوم کے اس ارشاد کے
متعلق کہ "نہیں کے ساتھ ہے - کبھی عامیانہ محاورہ ہے
جو زیادہ تر لکھنؤ والوں کا تکیہ کلام ہے" - میرا
خیال دریافت کیا ہے - میری رائے میں نہیں ہے =
نیست کا ترجمہ ہے نہ حرف نفی است فعل، فقط
زبان اردو میں نہیں کلمہ نفی اور ہے کلمہ اثبات ہے
حسب موقع و محل کبھی دونوں کلمے ساتھ استعمال ہوتے ہیں
کبھی اظہار انکار میں حرف نہیں پر اکتفا کیا جاتا ہے
ہے محذوف رہتا ہے - نہ یہ عامیانہ محاورہ ہے
نہ لکھنؤ والوں کا تکیہ کلام - بلکہ :-

ع این نہ نیست کہ در شہر شما نیز کنند -

حضرت غالب مرحوم کی یہ دونوں غزلیں ملاحظہ ہوں

ع تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ع فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

افسوس! طعنہ بر بحر بیکراں زدہ -
خدا مغفرت کرے مرحوم کی اور لکھنؤ والوں کی
مغفور کی زندگی میں چھیڑیں چلا کرتی تھیں -
لہذا ایک اچھا وار یہ بھی کر دیا ہوگا
منشی سجاد حسین مرحوم مدیر اودھ پنچ -
حکیم مرحوم خلف امیر مرحوم وغیرہ لکھنؤ والوں
پر طرحی میرٹھ ایک اخبار میں جس کے
شوکت مرحوم اڈیٹر تھے - حملے کرتے رہتے تھے
میرا اس وقت ابتدائی زمانہ تھا - مگر میں
اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میری ایک غزل پر
جو شوکت مرحوم نے کسی پرچے میں غالباً ملاحظہ کی ہوگی
بہت تعریف کی تھی اور مجھے اسی زمانے میں ایک
خط بھی بھیجا تھا - آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
رہے نام اللہ کا -

اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہئے اور طبیعت کو خوش رکھنے کی
کوشش کیجئے - زیادہ دعا -

خیر اندیش
صفی عفی عنہ

صفی لکھنوی مرحوم ۳ جنوری ۱۸۶۲ - ۱۵ جون ۱۹۵۰ء بنام راغب مرادآبادی

غلام ربّانی تاباں

کس نے کہا کہ جانب صحرا نہ جائیے
دیوار و در کا قرض تو پہلے چکائیے

یاروں کی التفات فراواں ہے ان دنوں
پتھر برس رہے ہیں ذرا سر بچائیے

اچھی سہی خراب سہی زندگی تو ہے
جیسے بنے یہ بار امانت اٹھائیے

ایسا کبھی سنا بھی نہ تھا روشنی کا قحط
گھر میں دیا نہیں، نہ سہی گھر جلائیے

دل کا معاملہ ہے ہوائے جنوں کے ساتھ
دامن بچائیے کہ گریباں بچائیے

تیشے سے بیستوں کا رشتہ نہ ٹوٹ جائے
کچھ جہد رائگاں کے مزے بھی اٹھائیے

دنیا کے حادثات سے تاباں مفر کہاں
جینے کا شوق ہے تو جراحت بھی کھائیے

اے-۱۱۱، ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

وامق جونپوری

جسم بے سر لیے جب ہم سر محشر نکلے
سرنگوں شرم سے قوموں کے پیمبر نکلے

کبھی ہم اٹھ گئے خود اور کبھی اٹھوائے گئے
بدمزا ہو کے تری بزم سے اکثر نکلے

ابن آدم نے زمیں چھوڑی کہ فردوس ملے
ماہ پاروں کو بھی دیکھا تو وہ پتھر نکلے

کیا بہادر ہے کہ آپس میں لڑا مرتا ہے
کوئی لشکر ہو مقابل تو یہ لشکر سے نکلے

کتنے معصوم سے لگتے ہیں یہ شاہین بچے
بوئے خوں پاتے ہی جھپٹیں گے جہاں پر نکلے

سیدھے ہم چلتے رہے ہیں تو ملی ہے منزل
مڑ کے جو دیکھنے والے تھے وہ پتھر نکلے

کوئی ہے سب سے بڑا اور کوئی سب سے چھوٹا
جز ترے کون ہے جو سب کے برابر نکلے

اس نے روکا نہ کبھی ٹوکا ہمیں کون ہو تم؟
ہم تو اس شوخ کے پہلو سے برابر نکلے

کیا اگائے ہیں گل و لالہ چمن والوں نے
ہم سمجھتے تھے جنہیں پھول وہ پتھر نکلے

جنگ کے ذکر سے دل بیٹھ چکا ہے اتنا
قصے جانبازی کے سنواؤ تو کچھ ڈر نکلے

بھوکے مر جاؤ گے وامق جو بہت بولو گے سچ
اس زمانہ میں بڑے آپ قلندر نکلے

لال کوٹھی، پوسٹ آفس اکاجگاؤں، ضلع جونپور (یوپی)

رام لعل

شانتی نکیتن، ڈی۔۲۲۹۰ اندرانگر، لکھنؤ۔۱۶

اُردو کی نئی بستیاں

مجھے یوروپ کے مختلف ممالک کا دومرتبہ سفر کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ پہلا سفر میں نے ۱۹۷۸ء میں کیا تھا جس کے دوران میں نے ناروے اور انگلینڈ کی سیاحت کی۔ تھوڑا سا قیام سویڈن اور ڈنمارک میں بھی رہا اور میں وہاں کے کچھ دیہات، قصبوں اور شہروں کو دیکھ سکا۔ ماسکو میرے ٹرانزٹ میں تھا اور میں نے آتے اور جاتے وقت چند ہی گھنٹے ایرپورٹ پر گذارے تھے۔ اُس سفر کی مفصل روداد میرے سفر نامے "خواب خواب سفر" میں موجود ہے جس کی غالباً ابتدائی دس بارہ قسطیں ماہنامہ شاعر میں شائع ہوئی تھیں۔ دو قسطیں ماہنامہ افکار کراچی اور لندن کی طویل قسط اوراق لاہور میں چھپی تھی۔

دوسری بار یوروپ جانے کا موقع مجھے ۱۹۸۴ء میں ملا جب وہاں کے کیثر الثقافتی سنٹر کے سربراہ سید مجاہد علی جو ماہنامہ کارواں اوسلو کے مدیر بھی ہیں نے مدعو کیا اور اسی انجمن کے زیر اہتمام اوسلو میں میرے پہلے یوروپی سفر نامے کی تقریب تعارف بھی منعقد کی گئی تھی۔ اس سفر کے دوران میں نے ڈنمارک، مغربی جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس، انگلینڈ اور سویڈن کی خوب خوب گرد چھانی۔

'خواب خواب سفر' کی تعارفی تقریب کے دوران جب تارکین وطن نے مقالے پڑھے اور تقریریں کیں تو مجھ پر اچانک یہ بات منکشف ہوئی کہ میں نے بالکل انجانے میں تارکین وطن کے بارے میں کچھ ایسے حقائق قلمبند کر دیے ہیں جن پر اس سے قبل کسی اور مسافر ادیب نے اظہار خیال نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اپنے اندر کے افسانہ نگار کو بھی شریک سفر رکھا تھا جو وطن سے ہزاروں میل دور جا کر روٹی روزی کے لئے قسمت آزمائی کرنے والوں کے مسائل سے آنکھیں چرانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی صنف سفر نامہ نگاری میں طبع آزمائی کرنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ میں عادتاً اندرون ملک میں بھی سفر کرتے ہوئے ہمیشہ کہانیاں اور کردار ہی تلاش کرنے میں لگا رہا ہوں۔ اس لئے اپنا پہلا سفر نامہ تحریر کرنے کے دوران میں یوروپ کے مختلف ممالک خصوصاً ناروے جہاں میں نے زیادہ وقت گذارا تھا بے ساختہ ان لوگوں کے قریب چلا گیا تھا جو خوش بھی نظر آتے تھے لیکن وہ اپنے اندر کی اُداسی مجھ سے چھپا نہیں پاتے تھے۔ اُن کی برہمی، بے قراری اور انتہائی درجے کی بے تعلقی اور خاموشی کی بھی کئی کیفیتیں میرے سامنے آئیں جن کی وجہ سے پہلے تو مجھے صدمہ سا محسوس ہوتا تھا لیکن بعد میں میرے دل میں اُن کے لئے ہمدردی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ پھر میں نے ایک عادت سی ڈال لی کہ راہ چلتے ہوئے بھی کوئی ایشیائی چہرہ دیکھ کر اُس کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ عموماً وہ پاکستانی ہی نکلتے تھے۔ (ناروے میں آٹھ ہزار کے قریب پاکستانی آباد ہیں جب کہ پورے ملک کی آبادی صرف چالیس لاکھ ہے۔) ان کے ساتھ علیک سلیک کرتا، اپنا تعارف پیش کرتا، ان کی وطنیت اور نام اور کام دھام کے بارے میں پوچھتا۔ جس کا رویہ قدرے دوستانہ ہوتا اُس کے ساتھ کسی ریستوران میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ جو شخص ہندستانیوں یا اجنبیوں سے فوراً بے تکلف ہونے میں اجتناب برتتا اُس پر بھی میں خفا ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بڑی خوش خلقی سے اسے الوداعی سلام کر کے جانے دیتا اور اُسے جاتا ہوا دیکھ کر سوچتا رہ جاتا تھا۔

میرے پہلے سفر میں افسانہ نگاری کے میدان میں میری واحد دریافت سعید انجم تھا جو لاہور کا رہنے والا ہے اور جس کے ساتھ میں نے لاہور کی یادیں تازہ کرنے کے لئے چند گھنٹے ایک بار میں گذارے تھے۔ پھر وہ مجھ سے میری قیام گاہ پر ملنے کے لئے آیا پھر اُس نے اپنے گھر

پر مجھے ڈنر پر مدعو کیا اور بہت اچھی شراب پلائی اور پاکستان کے ادیب دوستوں کی نئی کتابیں دکھاتا رہا۔ پھر یوں بھی ہوا کہ وہ مجھے ہفتے میں دو تین بار کسی نہ کسی لائبریری یا سڑک پر تلاش کر لیتا تھا اور میرے ساتھ خوب گھومتا تھا۔

جب میں گذشتہ سال اوسلو پہنچا تو وہاں ائیرپورٹ پر سید مجاہد علی کے ساتھ سعید انجم بھی موجود تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ گذشتہ چھ برس میں کوئی مراسلت نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن میں اس کے افسانے پڑھتا رہا تھا جو کارواں میں ہی کبھی کبھی چھپ جاتے تھے۔ اس دوران میں اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی لاہور سے چھپ چکا تھا جس کے دوسرے ایڈیشن کی ایک جلد سید مجاہد علی نے میرے پاس تبصرے کے لئے بھجوا دی تھی اور میں نے بھی سعید انجم کو بتائے بغیر تبصرہ لکھ کر بھجوا دیا تھا جو میری اوسلو میں آمد سے قبل کارواں میں چھپ چکا تھا۔ کارواں میں کچھ اور افسانہ نگاروں کے افسانے بھی پڑھنے کو ملتے رہے تھے جو اوسلو کے ماحول کے بارے میں تھے۔ انہیں پڑھ کر اس لئے خوشی ہوتی تھی کہ نئی سرزمین پر جا کر بسنے والے پاکستانیوں میں جو لوگ افسانہ نگار بننے کی صلاحیتیں رکھتے تھے ان کا شعور رفتہ رفتہ بیدار ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس بار وہاں جانے پر مجھے کئی افسانہ نگار ملے جن سے ملوانے کا وسیلہ سعید انجم اور سید مجاہد علی ہی بنے۔ انہوں نے کئی افسانوں کی محفلیں منعقد کیں، اپنے افسانے سنائے، میرے ساتھ اسی ندومد سے بحثیں بھی کیں جس طرح ہم لوگ ہندوستان میں کیا کرتے ہیں۔ ان کے افسانے سن کر ہی مجھے خیال آیا کہ انہیں باہر کی دنیا سے بھی روشناس کرانا چاہیئے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ میں ان کے بارے میں کچھ اور لکھوں میں چاہتا ہوں کہ ان کے ماحول کے بارے میں بھی کچھ سطور نذر قارئین کر دوں تاکہ ان کو سمجھنے میں تھوڑی سی مدد اور مل جائے۔

ناروے میں ایشیائی تارکین وطن کی آمد ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء کے زمانے میں شروع ہوتی ہے۔ لیکن یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے قبل بھی کوئی ایشیائی وہاں جا کر آباد ہو چکا تھا تو وہ کون تھا اور اب کہاں ہے؟ جو لوگ چھٹی دہائی کے اواخر میں وہاں گئے ان میں سے بیشتر بھی یا تو کہیں اور نقل مکانی کر چکے ہیں یا اپنے وطن لوٹ گئے ہیں۔ پھر بھی پندرہ سے بیس برس تک مقیم ایشیائی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے پیشوں میں صنعتی کارخانوں میں مزدوری، مددگار کارکن، ہوٹلوں و ریستورانوں کی بیراگیری، صفائی، ٹرانسپورٹ کے محکمے میں ڈرائیونگ، ٹکٹ چیکنگ، (اس میں ریلوے کا محکمہ بھی شامل ہے) اور پبلک سیکٹر انتظامیہ میں ڈاک خانے کی ملازمت بھی شامل ہے لیکن ان پیشوں کو صرف ہمارے ایشیائی ممالک میں نچلے درجے کا تصور کیا جاتا ہے اس لئے کہ یہاں محنت کا معاوضہ بہت ہی کم ملتا ہے جب کہ یورپ کے ممالک میں اتنی اُجرت مل جاتی ہے کہ وہ ایک لاکھ سے چار لاکھ کا مکان، موٹر اور دیگر گھریلو سہولیات کے سارے جدید تکنیکی گڈگٹس خرید سکتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے بیشتر نے نارویجن زبان کے یونیورسٹی کی سطح کے کورس پاس کر کے تعلیمی پیشے بھی اختیار کر لئے ہیں ان کے علاوہ وہ چھوٹے پیمانے پر کئی طرح کے کاروبار بھی کرتے ہیں مثلاً فوڈ اسٹور، بک اسٹینڈ وغیرہ۔ طویل اوقات کے لئے وہ ولکھے KIOSK اور ہاٹ ڈاگ وغیرہ بیچنے والے کھوکھے بھی چلاتے ہیں۔ سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھ پر ملبوسات بھی بیچتے نظر آتے ہیں۔ وہ اوسلو کے علاوہ ناروے کے دیگر شہروں برگن، ستوانگر، موس، درامن وغیرہ میں بسے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے جن لوگوں کے اپنے مکان ہیں ان کے علاوہ کرائے کے مکانوں میں رہنے والے بھی یوروپی معیار کے مطابق رہتے ہیں۔ گھروں کے اندر سنتھیٹکس کے قالین اور اعلیٰ درجے کا فرنیچر ٹی وی، ریکارڈ پلیئر وغیرہ ہر چیز موجود ہے۔ اس کے علاوہ گھروں کو پھولوں کے گملوں سے سجا کر رکھنے کا شوق بھی ان میں جنون کی حد تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کے یہی ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر کبھی کبھی مقامی لوگ حسد کرنے لگتے ہیں اور اس خطرے کا احساس بھی کہ یہ لوگ اگر اسی رفتار سے اپنے مکان خریدتے رہے تو پھر یہاں سے کبھی واپس نہیں جائیں گے۔

تارکین وطن کو اپنے ملک سے نکالنے کا جذبہ ناروے میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ ایک تو مزید تارکین وطن کی آمد ہر دم متوقع رہتی ہے جب کہ ان کی آمد کو روکنے کے لئے سخت ترین قوانین بنا دیے گئے ہیں لیکن جو لوگ وہاں جا کر آباد ہو چکے ہیں ان کے بارے میں یہ سوال ایک قومی مسئلے کا جزو بنا لیا گیا ہے کہ یہ اپنے دیس کب واپس جائیں گے؟ اُن کی مستقل یا طویل مدتی رہائش کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے اُن کو اُجرتوں کے گریڈ دینے میں برابری کا سلوک نہیں روا رکھا جاتا، اُن کو ملازمتوں میں لیتے وقت ان کی تعلیمی یا تکنیکی صلاحیتوں کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے جس کے لئے ان لوگوں کے اندر انتہائی درجے کی برہمی یا اُداسی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہاں غیر ملکی کا مکان دو کی مختلف

انجمنیں بھی سرگرم ہیں جو تارکین وطن کے حقوق کے لئے جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔ بعض ٹریڈ یونین قسم کی مقامی لوگوں کی انجمنیں بھی ہیں جن میں تارکین وطن محنت کش بھی شامل ہیں۔ لیکن چونکہ ان ٹریڈ یونینوں کا تعلق سیاست سے گہرا ہوتا ہے اس لئے وہاں ووٹ حاصل کرنے کے لئے بھی ان سے ہمدردی کا اظہار کر دیا جاتا ہے لیکن بنیادی مسئلہ یعنی ان کی واپسی کا سوال اپنی جگہ بہر حال قائم رہتا ہے اور اس کے لئے تہذیبی تفاوت کے علاوہ رنگ و نسل کے مسائل بھی زیر بحث لے آئے جاتے ہیں۔

گذشتہ سال وہاں جانے پر جب مجھے چند باشعور افسانہ نگاروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب یہ لوگ اپنے وطن سے تلاش روزگار کے لئے روانہ ہوئے تھے تو ان کے تخلیقی سوتے تب تک نہیں پھوٹے تھے۔ ان میں سے کسی کو یہ یقین ہرگز نہیں تھا کہ وہ اجنبی سرزمین پر پہنچ کر کامگار کے علاوہ بھی کچھ بن سکیں گے۔ وہاں کے حالات نے ان کے ذہن و فکر کی پرورش کی۔ ان کو اپنے اظہار کے لئے ایک خاص لب و لہجہ دیا۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر کی مادری زبان پنجابی ہے لیکن تعلیمی استعداد اردو زبان کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔ وہ نارویجئن میں گفتگو کر لیتے ہیں اور اسی زبان کے اخبار بھی پڑھ سکتے ہیں لیکن یہ زبان ان کے لیے تخلیقی ذریعہ اظہار نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے ایک دو نسلوں کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے باوجود، ان تمام تخلیقی اظہار چونکہ ایک غیر ملکی سرزمین پر ہو رہا ہے اس حقیقت کے باوصف کہ وہ اردو میں لکھتے ہیں اُن کی تخلیقات پر پہلا حق اُسی غیر ملکی سرزمین کا ہے۔ یہی بات کم و بیش برطانیہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے لیکن اس وقت زیر بحث ناروے کا ملک ہے۔ جہاں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اردو پروگراموں کے لئے وقت مقرر ہے اس کام کے لئے جو تکنیکی ماہرین رکھے گئے ہیں ان میں اردو جاننے والے بھی ہیں۔ ایک ریڈیو اسٹیشن خصوصی طور پر تارکین وطن کی مختلف زبانوں میں پروگرام پیش کرتا ہے جس میں اردو کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اس کے علاوہ یونیورسٹیوں اور اسکولوں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے اور پڑھانے والے اساتذہ میں ۵ پاکستانیوں کے علاوہ نارویجئن اور ڈینش نسل کے اردو اسکالر بھی شامل ہیں۔

میں نے یہ مسئلہ کہ یورپین ممالک خصوصاً ناروے اور برطانیہ کے اردو و انگریزی اخبارات میں بھی اٹھایا تھا اور نارویجئن دانشوروں کے سامنے بھی اس پر اظہار خیال کیا تھا کہ اردو کے اُن نئے تخلیق کاروں کا تعلق ان کے نئے لب و لہجے، ماحول نگاری اور فکر و نظر کی بنیادوں پر اپنی اصل سرزمین سے ہرگز نہیں جڑتا ہے۔ وہ وہاں سے اگر آج پوری طرح نہیں کٹے ہیں تو کل یقیناً کٹ جائیں گے۔ اور پھر وہ اپنے وطن کی طرف برسوں بعد ٹھیک اس طرح اپنی جڑوں کی تلاش میں جائیں گے جس طرح ویسٹ انڈیز، فجی جزائر، ماریشس وغیرہ کے اصلاً ہندستانی باشندے بنارس، آگرہ، دہلی اور لکھنؤ کی گلیوں میں آکر بھٹکتے ہیں اور ناکام لوٹ جاتے ہیں۔ امریکی ناولسٹ ہیری الیکس کا ناول "روٹس" ROOTS بھی اسی المیے کو پیش کرتا ہے۔

آنے والے کل کے بارے میں تو یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ تارکین وطن کی آئندہ نسلیں اُردو کو بھلا چکی ہوں گی اور ان میں سے کچھ باصلاحیت ہیری یا نائپال پیدا ہو گئے تو وہ اُسی سرزمین کی زبان میں اپنے شاہکار پیش کریں گے جو ان کے سن شعور کی پرورش کرے گی لیکن اس عبوری دور میں جو ان لوگوں کے لئے خاصی ذہنی و جسمانی کشمکش کا دور ہے جو تخلیقات اُردو زبان کے توسط سے نئے ماحول کی جملہ کیفیتیں اپنے جلو میں لئے ہوئے سامنے آ رہی ہیں ان پر بھی ہند و پاک کے اُردو قارئین اپنی نگاہ رکھیں صرف اس نقطہ نظر سے کہ ہمارے ممالک کی سرحدوں سے بہت دور جو یاروں نے اپنی بستیاں جا بسائی ہیں ان کے ساتھ ہمارا کسی قسم کا رشتہ استوار ہو سکتا ہے۔ صرف جذباتی یا فکری بھی؟

جن افسانوں کو میں ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں ان پر الگ الگ بحث کرنے سے بات بہت طویل ہو جائے گی۔ میں صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ سعید انجم، شاہدہ وسیم، ارشد اقبال، شگفتہ انور، خالد حسین خالد، نوید امجد علی، معز شاہد اور ہرچرن چاولہ کے افسانوں میں وہ سب احتجاج، بیزاری اور برہمی اور بے بسی موجود ہے جن کے محرکات کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ میں آپ کے تاثرات جو آپ کے اپنے مطالعے کے بعد پیدا ہوں گے ان پر اپنی رائے کو اثر انداز نہ ہونے دوں۔ ❁

ہرچرن چاؤلہ
MOLIEFARET-50 A. 0750. OSLO-7. (NORWAY)

گنگا کو واپسی

وہ آزاد ہو چکا ہے اور میں ابھی تک قید بھگت رہا ہوں مگر ٹھہریئے میں یاد کر لوں کہ وہ مجھے کہاں ملا تھا۔ کہیں ملا تھا تبھی تو اس کی کہانی بن سکی ہے کیا کہا۔ میں بیچ میں اپنے آپ کو کیوں لے آتا ہوں۔ آپ اس کی کہانی سننے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ اس کی کہانی بیان ہو رہی ہے تو میں بھی ساتھ ہی بیان ہو رہا ہوں کیوں کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ میں اس میں اور وہ مجھ میں سمایا ہوا ہے۔

وہ آگیا مگر وہ آنا نہیں چاہتا تھا۔ بیٹے نے بہت سبز باغ دکھائے تھے مگر وہ دنیا دی لالچوں سے اوپر اٹھ کر صبر اور سنتوکھ کی دنیا میں داخل ہو چکا تھا۔ جب بڑی چیزوں کو چھوڑ کر چھوٹی چیزوں پر اکتفا کرنے کا طریقہ آجاتا ہے تو کسی بھی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو ویسے بھی جس عمر سے وہ گذر رہا تھا۔ میاں بیوی کا رشتہ بہن بھائی کے رشتے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی کو تو مرے بھی پانچ سال ہو چکے تھے۔ ایک بہن چھوڑ گئی تھی تو قصبے کی ساری عورتیں اس کی بہنیں ہو گئی تھیں۔ بیٹے نے لکھا تھا۔ یہاں آجاؤ۔ پنشن لگوا دوں گا۔ اس نے جواب دیا تھا۔ جتنی مجھے ضرورت ہے اتنی یہاں بھی مل رہی ہے۔ بیٹے نے پوتا ہونے کی خبر دی تھی تو اس نے سچا اور کھرا آشیرواد بھیج دیا تھا۔ وہاں وہ قصبے کے بچوں سے گھرا رہتا تھا اور سب بچے اسے چاچا کہتے تھے۔ کوئی بچہ بیمار ہوتا تو ڈاکٹر کو دکھانا، دوا دارو لانا، مندر میں ان کی صحت کے لئے پرارتھنا کرنا، انہیں امتحانوں کی تیاریاں کروانا اور سیر پر لے جانا اس کا روز کا معمول تھا۔

سات سال پہلے اس اسٹیشن پر تبدیل ہو کر آنے اور ریٹائر ہونے تک قصبہ اس کا اور وہ قصبے کا دوست اور ساتھی بن چکا تھا۔ آنے کے دو سال بعد، جب اسے بیوی نے داغ جدائی دیا تو وہ حرص و ہوا کے سارے بندھن توڑ کر صبر اور شانتی کے وسیع و عریض آکاش تلے آگیا تھا۔ سات سمندر پار بیٹھے بیٹے نے بہت سے تیر پھینکے مگر وہ ہر وار بچاتا گیا۔ بیٹے نے لکھا۔ تمہاری بہو بہت خوبصورت ہے۔ اس نے لکھا۔ مجھے کیا۔ تم جس خوبصورتی کی بات کرتے ہو۔ وہ اب میرے لیے مٹی ہے۔ بیٹے نے لکھا۔ وہ کھانے اتنے لذیذ پکاتی ہے کہ انگلیاں چاٹنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ میرا ذائقہ اب دانتوں یا زبان پر نہیں اوپر ذہن میں جا بسا ہے۔

"یہاں پیسے کی ریل پیل ہے"۔
"مجھے زیادہ کی خواہش نہیں"۔
"گھر بہت بڑا ہے"۔
"میں چھوٹے گھر ہی سے مَن لُشٹ ہوں"۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ہوم سگنل کے پاس ایک پرانی کوٹھری کو اس نے آباد کر لیا تھا۔ آس پاس چھوٹا سا باغیچہ لگا لیا تھا جو اسے کافی مصروف رکھتا تھا "میں پھولوں پودوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا"۔

اور وہ اپنے بیٹے کی التجاؤں پر کان دھرے بنا ننھے ننھے پھول سے بچوں کو صبح سویرے سیر پر لے جاتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبہ ہوتا اور بچوں کا غول جرنیلی ٹھنڈی سڑک پر سائکلوں، موٹروں، رکشاؤں اور ریڑھیوں کے ڈھیلے ہو کر گرے ہوئے پیچ، قینچے کیل کانٹے چنتا، اس کے ڈبے میں ڈالتا جاتا جو وہ واپس انہی کی چھوٹی موٹی گڑیوں، گیندوں، سائیکلوں، کھلونوں اور دوسری چیزوں کی مرمت وغیرہ پر استعمال کر لیتا۔ بٹنوں، کیلوں اور پیچوں سے بھرا چھنکتا ڈبہ اسے دلی مسرت عطا کرتا اور چھوٹے موٹے اوزار اسے روحانی خوشی بخشتے۔ جب کسی بچے کی سائیکل ٹھیک ٹھاک کر کے یا

کسی پھٹی ہوئی گڑیا کو سی کر بچے کی خوشی کو محسوس کرتا تو اُسے لگتا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا قلعہ فتح کر لیا ہو۔ بچوں کے ساتھ بندھا اُن کا معمول اُسے بہت پسند تھا اور قصبے کے لوگ اپنے بچے اس کے حوالے کر کے بے فکری کی نیند سوتے تھے۔

بیٹے نے بڈھے کو پھسلانے کے لئے قصبے کے کچھ لوگوں کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ "اب باپ بیٹے کا میل ہو ہی جانا چاہیے۔"

مگر بڈھا بہت چڑ تھا۔ بولا "میل ٹوٹا کہاں ہے۔ وہ تو اور کئی جگہوں سے ٹوٹ گیا ہے۔ بیٹا صرف وہی تو نہیں ہوتا جو بیوی کی کوکھ سے جنما ہو۔ بہن صرف وہ نہیں ہوتی جو اپنی ماں جائی ہو۔"

وہ اُنہیں سمجھاتا اور وہ سیدھے لوگ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ جاتے اُس نادان دو مہینے کے بچے کی طرح جو اور کچھ سمجھے نا سمجھے پیار کی زبان ضرور سمجھتا ہے۔ جب بیٹے کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو اُس نے کچھ لوگوں کو بیچ میں ڈال کر اُسے ہوائی جہاز کا واپسی ٹکٹ بھجوا دیا۔ اس نے کہا۔ بچہ دادا دادا پکارتا ہے۔ ولائتی بیوی پوچھتی ہے۔ تمہارے ہاں تو خاندان اکٹھے رہتے ہیں۔ کیا تمہارا اپنا کوئی بزرگ نہیں جس کی چھتر چھایا کا میں لطف اٹھا سکوں۔ یہ سچ تھا، جھوٹ تھا یا کوئی چال تھی مگر اُس پر تو نہیں قصبے کے لوگوں پر یہ چال چل گئی۔

"ایک بار بہو اور پوتے کو دیکھ آتے۔" ایک دن سردار حکم سنگھ نے کہا۔

"موہ بڑھ جائے گا۔ زنجیریں مت پہناؤ۔" اس نے فریاد کی۔

"واپس آجانا۔" سردار حکم سنگھ نے واپسی ٹکٹ اُسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ "جب جی چاہے۔"

اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ کیول ایک سا دھارن تنکا تھا جسے ایک طاقت دھکیل رہی تھی اور ایک طاقت کھینچ رہی تھی۔

ہوائی اڈے پر اُس کا بیٹا اور پوتا اُسے لینے آئے تھے۔ ایک چھوٹی سی ٹرنکی اور کٹا ہوا آدھا تھان جب اُس سے لے کر بیٹا کار کی ڈگی میں رکھنے لگا تو کچھ چیزیں چھنک اٹھیں۔ "کیا ہے؟" بیٹے نے پوچھا۔

"میرے اوزار۔"

"وہاں مستری ہو یا ترکھان۔" بیٹے کے سوال میں طنز صاف جھلک رہا تھا۔

"سب کچھ ہوں اور کچھ بھی نہیں۔" اس نے سوچا۔ بیٹا باہر رہ کر زیادہ ہوشیار ہو گیا ہوگا۔

کار دوڑنے لگی تو اُس نے بچے کو پچکارا۔ اٹھانا چاہا تو وہ سیٹ سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے بیٹے سے پوچھا۔ "اسے کیوں باندھ رکھا ہے؟"

"لڑھک نہ جائے۔"

"جسے لڑھکنا چاہیے اُسے باندھ رکھا ہے۔ جو لڑھک نہیں سکتا، اُسے کھول رکھا ہے۔" اُس نے کہا۔

بیٹے کو کچھ پلے نہ پڑا تو وہ خاموشی سے کار چلاتا گیا۔ شاید اُسے باپ سے اور کچھ نہیں پوچھنا تھا یا شاید اُسے جو کچھ پوچھنا تھا اس کے ایک رُخ کا اُسے پہلے ہی علم تھا۔ وہ باہر دیکھنے لگا۔ باہر سب کچھ مختلف تھا۔ اس کی چیزوں کی پہچان کی حدیں ایک جگہ آ کر رک گئی تھیں۔ اب نئی پہچان کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔ باہر چیزیں نئی تھیں پرانی تھیں، بڑی تھیں، چھوٹی تھیں، اچھی تھیں، بُری تھیں، خوبصورت تھیں، بدصورت تھیں۔ اس کے اندر سب فرق مٹ چکے تھے مگر ایک فرق ضرور واضح تھا۔ وہاں کی ایک ایک چیز سے وہ واقف تھا اور یہاں واقفیتیں بنانا تھیں جو اس کے لئے بے حد مشکل کام تھا۔ ذہن کی ڈکشنری میں کوئی مزید الفاظ رکھنے کی اب جگہ ہی نہیں تھی۔

وقت گذرتا گیا۔ اُسے لگتا جیسے اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے مگر وہ برداشت کرتا رہا ــــ اس کی انگریز بہو اُسے نام سے پکارتی تھی۔ صبح اٹھ کر دعا سلام اور نہ ہی چرن وندنا بلکہ ہیلو یا گڈ مارننگ کہتی تھی۔ اور اس کا آشیرواد دینے کو اٹھا ہوا ہاتھ ایک زخمی پرندے کی گردن کی طرح ایک طرف کو لڑھک جاتا تھا۔ بچہ جب ذرا بڑا ہوا تو اُسے ساتھ سُلانا چاہتا تھا۔ اس کے اندر مذہبی رہنماؤں، دیش بھگتوں، جنگ آزادی کے شہیدوں اور جاں نثاروں کی کہانیاں تڑپ رہی تھیں [illegible] آٹھ بجتے ہی اس کی بہو بچے کا ہاتھ پکڑ کر لہراتی "گڈ نائٹ" [illegible] اُس کے ایک پنگوڑے میں ڈال دیتی۔ دن کو بچہ چلڈرن ہوم [illegible] اور میاں بیوی دونوں کام پر نکل جاتے۔ سارا دن اکیلا گھر بھائیں بھائیں کرتا اُسے کھانے کو دوڑتا محسوس ہوتا ــــ ایک دن اُس نے اپنی گیلری سے باہر پارک میں اپنے جیسے کچھ بڈھوں کو بنچوں پر بیٹھے اور گپیں مارتے دیکھا تو وہ بھی اُن کے پاس جا بیٹھا مگر وہ کوئی ایسی زبان بولتے تھے جیسے ٹین کے ڈبے میں پڑے پتھر کوئی کھنکھنا رہا ہو۔ وہ اُن کی طرف ایک معصوم بچے کی طرح بے بس نظروں سے دیکھتا ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا رہتا۔ تھکتا، اُکتاتا، تنگ آتا تو اٹھ کر گھر پہنچ جاتا مگر بھائیں بھائیں

کرتا تو اُسے کہتے، میرے اندر تمہارے لئے کوئی کام ہی نہیں اور اُسے بتے دیکھے ہاتھ ایسے سُن سے محسوس ہونے لگتے جیسے انہیں لقوہ مار گیا ہو۔

ایک دن اس کا بیٹا اسٹور میں کچھ بنانے کا سامان لے آیا جس میں کپڑوں کی الماری، کھانے پینے کا سامان رکھنے کا بکس، سوٹ کیس اور دوسرا سامان رکھنے کے خانے بنتے تھے۔ جب اس کے بیٹے نے بتایا کہ اسٹور میں شیلف بنے گا تو وہ بہت خوش ہوا۔ چلو کچھ تو شغل ملا مگر ڈبہ کھولنے پر وہ پیچوں، کیلوں اور تختوں کا ایک مجموعہ نکلا جنہیں ایک شکل دینے کے لئے ساتھ کئی کاغذوں کو پڑھنا تھا مگر انہیں جوڑنے اور لگانے کے طریقے جس زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ وہ اُسے نہیں آتی تھی مگر اس کا بیٹا جب شیلف بنانے بیٹھا تو وہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے اُس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کوئی شیلف اُسے خود بنانا پڑتا تو وہ بڑی آسانی سے سوچ سمجھ کر کچھ نہ کچھ بنا لیتا مگر طریقہ پڑھ پڑھ کر بنانے کا کام تھا اس لیے وہ صرف بیٹے کو ہتھوڑی، کیل، پلاس وغیرہ پکڑانے کا کام ہی کر سکا جیسے وہ کسی مستری کو اینٹیں پکڑانے والا مزدور ہو۔

اپنے گاؤں میں وہ رہٹ کی ایک موٹی سی دھار تلے نہانے کا عادی تھا۔ یہاں وہ شاور کے نیچے کھڑا ہوتا تو اُس کی تسلی نہ ہوتی۔ سُرخ پیچ گھماتا تو تالو تک جھلسا دیتا تھا۔ اُسے کم کرتا اور نیلا پیچ گھماتا تو ٹھنڈا یخ بستہ پانی اس کی تیسی بجا ڈالتا۔ اُسے انگریزی گذارے موافق آتی تھی مگر اُس کی بہو انگریزی بھی ایسے لب و لہجے سے بولتی تھی کہ اُس کے کچھ بھی پلے نہیں پڑتا تھا۔ ایک دن گرم اور ٹھنڈے پانی کا توازن ٹھیک ہوگیا تو وہ بہت دیر تک جی بھر کر نہاتا رہا۔ باہر نکلا تو اُس کی بہو کسی دوسری زبان میں اُس کے بیٹے سے کچھ کہہ رہی تھی مگر اُس کے انداز سے لگتا تھا جیسے وہ جھگڑ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد اُس کے بیٹے نے کہا۔

"آپ گرم پانی بہت زیادہ استعمال کر لیتے ہیں، جس سے کچھ دیر کافی دیر تک گرم پانی نہیں آ سکتا۔"

وہ دو دن سے غسل خانے میں پانی کی کمی کی شکایت کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر اُدھر سے پیشگی شکایت سُن کر وہ خاموش ہو گیا۔ بیٹے نے دس ٹکٹوں کا ایک پیکٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ نیچے دائیں طرف والی گلی کے آخری سرے پر آپ کو ایک موٹا سا BAD لکھا ہوا بورڈ نظر آئے گا۔ وہاں اندر آپ کو بہت سے غسل خانے ملیں گے آپ وہاں چلے جایا کیجئے اور خوب جی بھر کر نہایا کیجئے۔

اُسے یہ صلاح بہت پسند آئی۔ دوسرے دن تولیہ، صابن اور تیل، وغیرہ لیے ٹکٹ لیا کر وہ باد پہنچا تو اُسے وہاں ہر عمر کے لوگ نہاتے نظر آئے مگر وہاں بچے تو نہیں بڈھے ہی بالکل ننگے نہا رہے تھے، باتیں کر رہے تھے یا اخبارات پڑھ رہے تھے۔ ننگوں کے حمام میں کپڑے پہنے وہ خود کو ننگا محسوس کرتا اور شرماتا ہوا حمام میں گھس گیا۔ بہت دیر نہانے کے بعد وہ باہر نکلا تو اُسے لگا جیسے مردوں کے ننگے بازار سے اُسے ایک عورت کی طرح گذرنا پڑ گیا ہے۔ مجبوراً وہ ہفتے میں چار بار، پھر دو بار اور پھر صرف ایک بار ہی جانے لگا۔

وہاں اُسے لگتا تھا جیسے وقت ایک خوبصورت رنگ برنگی گیند ہے جسے وہ ٹھوکریں لگاتا اپنے آگے لڑھکائے پھرتا ہے اور یہاں اُسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وقت ایک مست گھوڑے کی دُم سے بندھی رسی ہے جو اُس کے ہاتھوں سے بندھی اسے کھردرے راستوں پر گھسیٹتی پھرتی ہے۔ وہ سوچتا، کب یہ رسی ٹوٹے گی۔ وہ اٹھے گا اور کپڑے جھاڑ کر زخم سہلا کر اپنی راہ چل سکے گا

ایک شام اپنے بیٹے کے ساتھ ایک بہت بڑے پارک میں ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے اُسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"یہ جو سامنے اتنی بڑی عمارت ہے۔ یہ یہاں کے بادشاہ کا گھر ہے"۔ بیٹے نے کہا۔ مگر وہ پھولوں اور پھولوں سے بچوں کو دیکھتا رہا۔ ایسے وہ بوڑھا آدمی بہت اچھا لگ رہا تھا جس نے کچھ ہی دیر پہلے کھانے کی کوئی چیز جیب سے نکال کر قریبی درخت سے ایک گلہری کو بلایا تھا جو پتہ پتہ، ٹہنی ٹہنی اترتی، تنے پر سے چھلانگ لگا کر اس کے کندھے پر آ بیٹھی تھی اور اب اس کے ایک ہاتھ پر بیٹھی دوسرے ہاتھ سے چوگا لے رہی تھی۔

"بابا۔ آپ کی پنشن منظور نہیں ہو سکی"۔ بیٹے نے کہا۔ مگر وہ سُنی ان سُنی کئے اپنی ہی دنیا میں گم رہا۔

آپ روز ہی یہاں آ جایا کیجئے۔ مگر آئیے اب چلیں۔

بیٹا اٹھ کر کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا

کار ایک بڑی بلڈنگ کے مین گیٹ پر جا رکی۔ بیٹے نے گیٹ کھول کر سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں، تو وہ پیچھے پیچھے چڑھتا پانچویں منزل تک جا پہنچا مگر اُس کا سانس پھولنے لگا۔ بیٹے نے ایک طویل و عریض دفتر کا دروازہ کھول کر کونے میں ایک لمبوتری سی الماری سے ایک بالٹی، صابن کی ٹکیہ، جھاڑن اور لمبا سا برش نکالا۔ اور دفتر کا فرش دھونے لگا۔ اُس نے گھر میں بیٹے کو یہ کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ ابھی بیٹے کی مدد کرنے کے

بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بیٹے نے اُسے پلاسٹک کا تھیلا پکڑاتے ہوئے کہا۔ "پاپا۔ آپ ردّی کی ٹوکریوں کے تمام کاغذ اس میں الٹ دیں"۔

بیٹا فرش دھوتا رہا۔ وہ کاغذ الٹتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد اُس کے بیٹے نے ہاتھ روک کر کہنا شروع کیا۔ "پاپا آپ کی پنشن منظور نہیں ہو سکتی تا۔ میں نے سوچا۔ آپ روز ہی راستے میں پارک کی سیر بھی کر لیا کریں اور وقت گذاری کے لئے تھوڑا سا یہ شغل بھی ہو جایا کرے۔ اس طرح کچھ پیسے بھی آجایا کریں گے۔ مگر میں نے تو تم سے کبھی پیسوں کی کوئی مانگ نہیں کی"۔ اُس نے کہا۔

"پاپا۔ یہ بہت مہنگا ملک ہے۔ یہاں دو آدمیوں کا دُگنا، تین کا تگنا اور چار کا چوگن خرچ پڑتا ہے۔ یہ ہندستان نہیں، جہاں تین آدمیوں کا کھانا نے تو چوتھے کا اپنے آپ ہی نکل آتا ہے"۔

اس نے خاموشی سے وہ کام کرنا شروع کر دیا۔ راستے میں وہ پارک میں بیٹھتا تو آنکھوں کے آگے بالٹی، صابن کا ڈبہ، جھاڑن اور برش ناچتے محسوس ہوتے اور وہ جلدی ہی اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے کام پر پہنچ جاتا۔

ایک دن اُس کے بیٹے نے اُسے بتایا کہ دفتر نے شکایت کی تھی کہ اس کا کام تسلی بخش نہیں اور صفائی اچھی طرح نہیں ہوتی۔ وہ خاموش رہا مگر کام اور زیادہ تندہی سے کرنے لگا بچہ بھی کچھ بڑا ہو گیا تھا مگر اُسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ایک دن جب بچے کی چھوٹی سی سائیکل کا پہیہ نکل گیا تو وہ فوراً اپنے اوزار نکال کر اس کی مرمت کرنے بیٹھ گیا مگر اس کے بیٹے نے سائیکل اس کے ہاتھ سے چھین کر گیلری میں پڑے ٹوٹے پھوٹے سامان پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ٹھگ ٹھک لگا رکھی ہے۔ رہنے دیجئے اور آجائے گی"۔

اُس دن اس کا دل بہت دُکھی ہوا۔ اُسے لگا کہ وہ جو نہیں چاہتا اُسے کرنا پڑتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے اُسے نہیں کرنے دیا جاتا کچھ سوچ کر دوسرے دن وہ ایئر ایجنسی کے دفتر پہونچ گیا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول کر اپنی ٹکٹ پر دسویں دن جانے والی پرواز سے واپسی بُک کروا لی ـــــ پانچویں دن رات دیر گئے اس کا بیٹا اُسے تلاش کرتا پارک کے اسی بنچ پر پہنچا تو دیکھا بڈھا بنچ پر بیٹھا آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ اس نے کندھے سے جھنجھوڑ کر اُسے ہلانا چاہا تو وہ لڑھک کر ایک طرف جا پڑا مگر اُس کی آنکھیں کانچ بنی اب بھی آسمان کو گھورے جا رہی تھیں۔

چند دوستوں اور واقف کاروں کے درمیان بیٹھا زار و قطار روتا اُس کا بیٹا یہ سارا قصہ سُنا رہا ہے اور دسویں دن جانے والی اُسی فلائٹ کا اس کا واپسی ٹکٹ او ربجلی کی بھٹی میں بنی راکھ سے بچی کھچی اُس کے جسم کی باقی ماندہ ہڈیاں مجھے دیتے ہوئے کہہ رہا ہے "انکل آپ تو اُن کے پُرانے دوست تھے۔ آپ ہی اُن کے یہ پھول گنگا میں بہانے ہندستان لے جایئے۔ ❋

کرشن کمار طور

یہ زمیں آسماں زوال آمادہ
میں ہی کیا کل جہاں زوال آمادہ

اس کا ہر لفظ قائم و دوام پذیر
اور میرا بیاں زوال آمادہ

چاہے دل ہو کہ تتلیاں کہ پھول رُتیں
جو بھی کچھ ہے یہاں زوال آمادہ

ایک میں ایک اس کا نام جگنو ہے
باقی سب درمیاں زوال آمادہ

اپنے ہونے نہ ہونے کا ہے خوف اتنا
خیمۂ ہو گماں زوال آمادہ

دوستی، دشمنی، یہ انحراف، اثبات
طورؔ سب رائگاں زوال آمادہ

● ای/۱۳۴، کھنیارا روڈ،
دھرم شالہ۔ ۱۷۶۲۱۵ (ہماچل پردیش)

ظفر غوری

دنیا پیاس کا صحرا ہے
دریا دریا پہرہ ہے

ہاتھوں میں پھولوں کے جام
لہو لہو ہر چہرہ ہے

سر پہ بارش پتھر کی!
آنکھ میں خواب سنہرا ہے

اس کے روپ خزانے پر
سورج چاند کا پہرہ ہے

تن ہولی، من دیوالی!
بن رُت رنگ دسہرہ ہے

طاری کر سفاک سکوت
انساں شور سے بہرہ ہے

● ۴۴۴۲۔ سرائے کائستھان
پاٹن پول، کوٹہ (راجستھان)

ظفر ہاشمی

جو ہاتھ بھی سینے کو اٹھے تو دھنک رکھ دے
پھل دار درختوں کی شاخوں میں لچک رکھ دے

سوئے ہوئے زخموں کی ہر ٹیس ابھر آئے
آنگن کی ہواؤں میں اتنی نہ کسک رکھ دے

شانوں پہ تھکن لے کر پرواز میں رہتا ہے
اس طائرِ غمگیں کے ہونٹوں پہ چہک رکھ دے

بکھرے تو سمٹ جائے، ٹوٹے تو سنور جائے
موسم کے دماغوں میں جتنی بھی سنک رکھ دے

جب شام گزیدہ ہو تو زہرِ سحر پی لے
جب صبح گزیدہ ہو شاموں کی دمک رکھ دے

یا ڈوب ہی جاؤں میں یا بچ کے نکل آؤں
بے خواب نگاہوں میں کوئی تو پلک رکھ دے

● دھتکڈی ورکرس فلیٹس، بستوپور، جمشید پور (بہار)

سعید انجم

NEBBEJORDET-15, L-65, OSLO-12. (NORWAY)

جیل کی یاری

یہ کہانی تب شروع ہوئی جب شہباز ـــــ ظہیر کے گھر گیا اور اس وقت ختم ہوگئی جب ظہیر ـــــ شہباز کے گھر پہونچا۔ جس روز شہباز ظہیر کے گھر گیا اُس دن مئی کی پہلی تاریخ تھی اور جب ظہیر شہباز کے پاس پہونچا۔ وہ سترہ مئی تھی۔ یہ شاید اتفاق ہی تھا کہ یہ دونوں عام نہیں [illegible] دن تھے۔ یکم مئی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بین الاقوامی دن ہے۔ دنیا بھر کے مزدوروں کے ایکے اور اتحاد کا دن اور سترہ مئی ـــــ اگر آپ ناروے میں نہیں رہتے یا ناروے کے بارے میں کم جانتے ہیں تو آپ کو بتا دیں کہ یہ قومی دن ہے۔ ناروے کا قومی دن اس روز ناروے کے لوگوں نے ۱۸۱۴ء میں اپنا پہلا آئین بنایا تھا۔ اور ڈنمارک سے آزادی حاصل کی تھی۔ اس لئے بعض لوگ اسے ناروے کا یوم آزادی بھی کہتے ہیں

یاں تو شہباز اور ظہیر ـــــ دونوں پاکستانی تھے۔ ناروے میں رہتے تھے۔ کام کرتے تھے پیسے کماتے تھے اور گھر بھیجتے تھے۔ فارغ وقت میں ملاقاتیں ہوتیں گپ شپ ہوتی۔ سیر و تفریح کرتے۔ چھٹی اور زندگی کی شام کو دیر تک اکٹھے رہتے پھر اپنے اپنے گھروں میں جا کر سو جاتے اور خواب دیکھتے۔ کبھی دل لبھانے والے کبھی دل لرزانے والے۔ اچھے خواب خود تک محدود رکھتے اور بُرے خواب ایک دوسرے کو سناتے۔ اگر ڈر جاتے تو حوصلہ بڑھاتے۔ سگریٹ کا کش۔ الکحل کی چسکی اور کسی کلب ریسٹوران کا پھیرا اپنی حدود کے مطابق تسکین ہوتا تو باتیں کرتے۔ کبھی خوش ہو جاتے کبھی اداس۔ باتوں سے تنگ آجاتے تو چپ ہو جاتے۔ پھر فلمی گانے سنتے۔ گانوں سے تنگ آجاتے تو پھر باتیں شروع کر دیتے "بعض فلمیں گانوں کو تباہ کر دیتی ہیں" دونوں میں سے ایک کہتا ـــــ

"اچھا؟" دوسرا حیرانی سے پوچھتے کا منہ تکتا۔

"گانا سن کر جو تصویر ذہن میں بنتی ہے اُسے ہیرو ہیروئن کی حرکتیں تباہ کر دیتی ہیں وہ [illegible] پیش کی جاتی۔

اس وضاحت سے کبھی اتفاق ہوتا کبھی اختلاف۔ اگر اتفاق ہو جاتا تو پھر وہ دونوں سب ایسی باتیں کرتے جن پر اُن کا آپس میں اتفاق تھا خواہ اور حقیقت۔ لڑکیاں اور محبت۔ تنخواہ اور ٹیکس۔ مکان اور نوکری۔ دکان اور سرمایہ۔ اسلام اور پاکستان۔ یورپ اور شہری آزادیاں۔ اختلاف کی صورت میں اختلافی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ اخبار رسالے۔ ترقی اور تبدیلی۔ آزادی اور فوج۔ ریڈیو ٹی وی کے اثرات۔ ایران افغانستان۔ شہر اور گاؤں۔ امریکہ اور روس۔ سعودی عرب اور اسرائیل ووٹ۔ الیکشن۔ ہنگامہ، خاموشی۔ چپ اور پھر [illegible]۔

پاکستان سے کوئی خط آجاتا تو اسے کئی مرتبہ پڑھتے۔ اگر اس میں کوئی تقاضہ ہوتا تو کڑھتے لیکن اُسے پورا کرنے کے لئے دل و جان سے متحرک ہو جاتے۔ کبھی ہمارے خود کوئی فرمائش لکھ بھیجتے تو دھڑکتے دل سے جواب کے منتظر رہتے۔ خواہش پوری ہونے کی صورت میں رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ اگر فرمائش کے جواب میں کوئی عذر آجاتا تو تمام رشتوں پر سے اعتماد اٹھ جاتا۔ پھر بحث ہوتی۔ کون اپنا کون پرایا؟ ناروے میں کیا کھویا کیا پایا؟ اس نئے معاشرے سے کیا اپنائیں کیا رد کریں؟ عام طور پر بحث زیادہ نہ چلتی۔ وہ جلد ہی چپ ہو جاتے اور گانے سنتے۔ ناروے کے تجربے نے بتایا تھا کہ ہر اپنا کچھ پرایا بھی تھا۔ یہاں اگر کچھ پایا تھا تو کھویا بھی کچھ کم نہ تھا۔ اُن کا مشاہدہ تھا کہ ہر رد کرنے والی چیز میں کچھ اپنانے والا حصہ بھی تھا اور ہر اپنانے والی بات میں کچھ رد کرنے کے قابل۔ لیکن اس تقسیم کی حدود کہاں تھیں؟ اُن کے پاس کوئی پیمانہ موجود نہیں تھا جو انہیں اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کے دودھ اور پانی [illegible] کرنے میں [illegible]۔ اپنے ملک میں رہتے تو [illegible] ناروے کی [illegible] وقت نے انہیں دو زمانوں۔ دو ثقافتوں دو حوالوں دو رویوں۔ دو خطوں اور دو موسموں کے درمیان ہونے

والے ایک سخت مقابلے کی گیند بنا دیا تھا جسے دونوں طرف کے ماہر کھلاڑی اپنی پوری طاقت کے ساتھ زوردار ٹھوکریں لگاتے۔ وہ کھلاڑی جن کے ہاتھ پاؤں کی حرکات پر شہباز اور ظہیر کا کنٹرول نہیں تھا اور ہر ٹھوکر پر کروڑوں تماشائی تالیاں پیٹتے۔ وہ تماشائی جو نظر نہ آتے تھے لیکن اپنے موجود ہونے کا شدّت سے احساس دلاتے تھے۔ چنانچہ ان کی بحث زیادہ نہ چلتی۔ وہ جلد ہی چپ ہو جاتے اور گانے سنتے۔

"آج ویڈیو لائیں؟" شہباز گانا سنتے ہوئے بولا۔

"لعنت بھیجو یار" ظہیر نے ناگواری سے جواب دیا

"کیوں؟"

"فلمیں اب بور کرنے لگی ہیں"

"کوئی اچھی فلم لائیں گے"

"کون سی اچھی فلم؟"

"جس میں گانے اچھے ہوں"

"فلم تو گانے کو تباہ کر دیتی ہے"!

"کہاں تباہ کر دیتی ہے؟"

"گانا سن کر جو تصویر ذہن میں بنتی ہے اُسے ہیرو ہیروئن کی حرکتیں تباہ کر دیتی ہیں" ظہیر نے اپنی وضاحت پیش کر دی۔

"یہ تصویر جو ذہن میں بنتی ہے نا —— بڑا ذلیل کرتی ہے" یک دم شہباز تلخ ہو گیا۔

"میں سمجھا نہیں" ظہیر نے حیرانی سے کہا۔

ہمیں اُس تصویر ہی نے تباہ کیا ہے جو یورپ کے بارے میں ہمارے ذہن میں تھی اور ہمارے پاکستان میں رہنے والے دوستوں کے ذہن میں ہے۔

ظہیر زور سے ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ شہباز اُسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ آخر ظہیر بمشکل کہہ سکا "تمہارا مطلب ہے کہ ہم یورپ کی ذہنی تصویر کے ہیرو ہیروئن ہیں؟"

"صرف ہیرو ہیں؟" شہباز مسکراتے ہوئے بولا

"میرا خیال ہے ہم ولن ہیں!" ظہیر یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

آثار بحث شروع ہونے کے تھے لیکن مجھے بحث نہیں وہ کہانی سنانا تھی جو یکم مئی کو شروع ہوئی تھی۔ اس روز شہباز —— ظہیر کے گھر گیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ دنیا بھر کے مزدوروں کے ایکے اور اتحاد کے دن شہباز پہلی مرتبہ ظہیر کے گھر نہیں گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ جا چکا تھا۔ لیکن اس خاص دن جس مقصد سے شہباز وہاں گیا تھا وہ مقصد بالکل نیا تھا۔ شہباز کا خیال تھا کہ وہ مقصد اُن کی بحث کا منطقی نتیجہ تھا اور اُس کا ظہیر کے ہاں جانا دوستی کا تقاضہ۔ اُسی بحث کا منطقی نتیجہ کہ کون اپنا کون پرایا اور وہی دوستی جو اُن کے بُرے خوابوں سے ڈر جانے کے بعد حوصلہ دیتی تھی۔ ویسے شہباز نے اپنے گھر سے نکلنے سے پہلے اور نکلنے کے بعد خوب اچھی طرح سوچا تھا کہ وہ ظہیر کے گھر جائے یا نہ جائے۔ اُس کا مقصد واضح ہے یا غیر واضح — مناسب یا غیر مناسب — منفی یا مثبت؟

شہباز نے سوچا تھا کہ وہ اپنے پرائے کی بحث میں یہ تو ڈھونڈتے ہیں کہ اُن کا اپنا کون لیکن یہ نہیں سوچتے وہ کس کے اپنے۔ وہ یہ تو چاہتے ہیں کہ ناروے میں کوئی اُن کا ہو لیکن یہ کوشش نہیں کرتے کہ وہ خود کسی کے ہوں۔ جن کو وہ دوست کہتے ہیں اُن کو بھی وہ صرف اپنے بُرے خواب ہی سناتے ہیں۔ اچھے نہیں۔ اچھے خواب مل کر نہیں دیکھ سکتے تو نہ سہی۔ اچھے کام تو مل کر کئے جا سکتے ہیں۔ کون سے کام؟ اُس کا خیال تھا کہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہ ہوتی اگر پاکستان میں ہوتے کہ پاکستان میں حیثیت مختلف تھی۔ پاکستان میں تو سفید پوش تھے اور یہاں پر —— سیدھے سادھے مزدور ہیں۔ پاکستان میں ہوتے تو مزدور سے صرف اتنا تعلق ہوتا کہ ضرورت پڑنے پر اس سے مزدوری کا کام لیتے اور اگر ہو سکتا تو اُس کی اُجرت ادا کرتے لیکن ناروے میں تو خود مزدور ہیں۔ اپنے کام کی اُجرت لیتے ہیں۔ اپنے منہ سے نہ مانیں۔ معاشرہ کہتا اور سمجھتا ہے۔ اخبار ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ذکر آتا ہے تو مزدوری کے ناطے اور مزدور کے نام سے۔ کوئی حمایت کرتا ہے تو مزدور سمجھ کر۔ ایسی صورت حال میں سوچنا چاہئے کہ ہم کون ہیں۔ ناروے میں ہمارا کس برادری سے تعلق ہے؟ اگر ہم مزدور ہیں تو وہ سمجھنا سیکھنا اور کرنا چاہئے جو نارویجن مزدور اپنی بہتری کے لئے کرتے ہیں۔ ایک بات تو وہ ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ یوم مئی مناتے ہیں۔ جلوس نکالتے ہیں اور دنیا بھر کے مزدوروں سے یک جہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس بات کا کوئی تو گماں ہو گا کہ جلوس میں جانے والے شرم نہیں بلکہ فخر محسوس کرتے ہیں۔

شہباز کا خیال تھا کہ وہ ظہیر سے کہے گا کہ اگر وہ اپنے پرائے کی بحث میں یہ جان لیں کہ وہ خود مزدور ہیں تو یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ

اپنا کون ؟۔ مزدور کا اپنا سرمایہ دار تو ہو نہیں سکتا۔ وہ تو پرایا ہی رہے گا۔ مزدور کا اپنا تو مزدور ہی ہو سکتا ہے۔ اگر انہیں اپنوں کی تلاش ہے تو کم از کم اپنوں کے ساتھ مزدوروں کے جلوس میں تو چلنا چاہئے تاکہ وہ کوئی اچھا کام تو مل کر کر سکیں چاہے اچھے خواب وہ مل کر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ ایک نئی بات تھی جو شہباز کے ذہن میں آئی تھی۔ چنانچہ وہ پہلی دفعہ ایک نئے مقصد کے ساتھ ظہیر کے گھر پہونچا اور تبھی یہ کہانی شروع ہوئی۔ اُس دن مئی کی پہلی تاریخ تھی اور وہ ایک عام نہیں خاص دن تھا۔ مزدوروں کا بین الاقوامی دن۔ بین الاقوامیت دونوں دوستوں کو اچھی لگتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُن دونوں میں تھوڑی تھوڑی پائی جاتی ہے۔ ایک قوم کا فرد جب کسی دوسری قوم کے ملک میں جا کر کام کرنے لگے تو دونوں قوموں کے درمیان کچھ نہ کچھ وقوع پزیر ہو جاتا ہے۔ جو ہوتا ہے اُس کا تھوڑا بہت اثر اُس فرد پر بھی پڑتا ہے جو نقلِ مکانی کرتا ہے چنانچہ اس تھوڑے بہت اُن دونوں میں پائی جاتی ہے۔ باقی رہی قومیت۔ وہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ڈاک خانے۔ تھانے اور کچہری میں۔ ہر جگہ وہ اپنا پاکستانی پاسپورٹ ساتھ لے کر جاتے۔ —— آنے والے قوالوں کے شو کا ٹکٹ وہ مہنگا ہونے کے باوجود خریدتے۔ پاکستان بھیجی ہوئی رقم میں سے زکوٰۃ کی کٹوتی پر کبھی نہ بولتے۔ چودہ اگست کے جلسے میں شلوار قمیض پہن کر خوشبو لگا کر پہونچتے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد اُسی عزت و احترام کے ساتھ سفارت خانے کے کسی افسر کی تقریر سنتے جو صرف اس تقریب کی خاطر سویڈن سے ناروے بلایا جاتا۔ سفارت کا پچھلی حکومت کے دور میں عوام کو طاقت کا سرچشمہ بنانے کے موضوع پر بولتے تھے۔ نئی صورت حال میں اسلامی درس ہوتا لیکن شہباز اور ظہیر نے اپنے بیٹھنے اور سننے کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی تھی۔ ہاں کبھی کبھار وہ گفتگو کرتے وقت تبدیلی کو اپنا موضوع ضرور بنا لیتے۔

"بندے میں تھوڑی بہت تبدیلی تو آنی چاہئے" شہباز کہتا

"وہ مرد کیا ہوا جو بدل جائے" ظہیر جواب میں بولتا

"وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے" شہباز رائے دیتا

"چیز بدلتی ہے یار۔ مرد نہیں۔ مرد وہ ہے جو مرد رہے"

"میں کب کہتا ہوں کہ وہ نامرد ہو جائے" شہباز جواب دیتا "لیکن مرد کا بھی کچھ نہ کچھ بدلتا ہے۔ حلیہ۔ کپڑے اور عادات۔ اب ہم خود ہی کو دیکھ لیں۔ ہم نہیں بدل گئے کیا؟ فلم کے ہیرو جیسے کپڑے پہننے لگے ہیں"

آدمی اتنا تو بدلتا ہی ہے۔ ناروے کا اثر تو ہونا ہی چاہئے۔

ناروے کی ہر بات کا اثر تو نہیں ہوتا"

ہونا بھی چاہئے نہیں"

مگر کس بات کا اثر ہونا ضروری ہے ؟" شہباز نے پوچھا

"یہ سوچنا قطعاً غیر ضروری ہے" ظہیر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"قطعاً ضروری ہے" شہباز نے جواب دیا

سب آثار بحث کے نمایاں ہو گئے ہیں لیکن مجھے بحث نہیں کہانی سنانا تھی۔ وہی کہانی جو یکم مئی کو شروع ہوئی اور سترہ مئی کو ختم ہو گئی۔ سترہ مئی یعنی نارویجنوں کا قومی دن۔ اُس روز ظہیر۔ شہباز کے گھر پہونچا۔ صاف ظاہر ہے کہ ظہیر بھی شہباز کے گھر پہلی مرتبہ نہیں آیا تھا۔ وہ سترہ مئی سے پہلے بھی کئی مرتبہ وہاں جا چکا تھا لیکن اس روز اس کا وہاں جانا واقعی نیا تھا کہ وہ ایک ایسے مقصد کو لے کر وہاں جا رہا تھا جو اُس سے پہلے کبھی لے کر نہیں گیا تھا۔

شہباز نے اُس کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ تھری پیس سوٹ چمکتے ہوئے جوتے۔ آنکھوں پر لگی دھوپ کی عینک اور ڈبل ایج بلیڈ سے شیو کیا ہوا چہرہ۔ پورا سراپا کسی بنک ڈائرکٹر کی طرح رعب ڈالتا ہوا پیچھے ہٹاتا ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہلکی پھلکی شناسائی کی شعاعیں کسی گھسے ہوئے آوارہ مقناطیس کی معدوم کشش لئے۔ شہباز نے آنکھیں جھپکیں تو وہ مسکرایا "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تو یہ تم ہو ؟" شہباز نے سانس بھر کر کہا

"ہاں میں —— کیوں ؟"

"تم بولتے نہیں تو میں پہچانتا نہیں۔ یہ حلیہ تمہارا نہیں ہے۔ چہرہ تمہارا ہی ہے لیکن اُسے عینک نے ڈھانپ رکھا ہے۔ تمہاری آواز نکلی تو میں جان گیا کہ اپنا ظہیر ہے۔ کہاں مار کرنے کا ارادہ ہے"

"کمال ہے یار! —— مار کہاں کرنی ہے۔ کارنیول یو ہان چل رہا ہوں۔ میں نے سوچا ذرا سترہ مئی ہی منالیں" ظہیر نے بتایا۔

تب ظہیر کو یاد آیا کہ آج سترہ مئی ہے۔ ناروے کا یوم آزادی۔ نارویجنوں کے نہانے دھونے کا دن۔ خوش لباس نظر آنے کا دن۔ بینڈ باجوں والے بچوں کے جلوس اور سڑکوں پر اُن کو دیکھنے والوں کے ہجوم کا دن۔

"آؤ آؤ — اندر آؤ" شہباز نے دروازے سے ہٹ کر راہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم تیار نہیں ہوئے ؟" ظہیر نے حیرانی سے پوچھا

"نہیں یار!"

چائے کے لئے میز پر بیٹھتے ہوئے ظہیر نے ایک زوردار لیکچر دیا۔ ناروے میں رہنا ہے تو صرف جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی انسان کو ناروے ہی میں رہنا چاہئے۔ یوم آزادی تمام آزادی پسند انسانوں کا دن ہوتا ہے۔ نارویجن لیڈر اس لئے چودہ اگست کے موقع پر پاکستانیوں کے جلسے میں آجاتے ہیں۔ کسی ملک اور قوم کی آزادی کی خوشی میں شریک ہو کر انسان کچھ کھوتا نہیں پاتا ہی ہے۔ پھر آج کے دن کو منانے پر لگتا ہی کیا ہے؟ ذرا صاف ستھرے کپڑے ہی تو پہننے ہیں اور شہر کے مرکزی علاقے کا ایک چکر لگانا ہے۔ اسکول کے بچے بینڈ بجاتے گذرے تو تالی بجا دی۔ اب تو جلوس میں کہیں کہیں کوئی کالے بالوں والا بچہ بھی نظر آجاتا ہے۔ نسلی تعصب سے بھرے اس معاشرے میں کم از کم اُسی کی حوصلہ افزائی کر دی۔ نارویجن بھی خوش ہوتے ہیں اور اپنا من بھی راضی ہوتا ہے۔ خوش لوگوں کو دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا؟

شہباز چائے میں چینی گھولتے ہوئے سر ہلاتا رہا۔ اُسے ہنسی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی۔ یوں تو اُس کا سر اثبات میں ہل رہا تھا لیکن اُس کے ذہن میں یکم مئی گھوم رہی تھی جب وہ ظہیر کے گھر گیا تھا۔ تب ظہیر تیار نہیں تھا۔ تب ظہیر چائے میں چینی گھول رہا تھا۔ شہباز نے بھی تو اُسے یہی کہا تھا کہ ناروے میں رہنا ہے تو صرف جسمانی طور پر نہیں ذہنی طور پر بھی ناروے ہی میں رہنا چاہئے۔ مزدوروں کا دن ہر مزدور کا دن ہے۔ اپنوں کے جلوس میں انسان کچھ کھوتا نہیں پاتا ہی ہے۔ پھر یوم مئی منانے پر لگتا ہی کیا ہے؟ صرف جلوس ہی میں تو چلنا ہے۔ شہر کے مرکزی علاقے کا ایک چکر ہی تو لگانا ہے۔ ساتھی مزدوروں کے ساتھ ذرا ایک جہتی دکھا دی۔ نارویجن خوش ہو جائیں گے اور اپنا من بھی راضی ہوگا۔ خوش لوگوں کو دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا۔

اُس روز ظہیر نہیں گیا تھا۔ شہباز اکیلا ہی یوم مئی کے جلوس میں شامل ہونے کے لئے شہر کے مرکزی علاقے میں جا پہنچا تھا۔ اُسے دیکھ کر کئی نارویجن مسکرائے تھے۔ کچھ نے تو باقاعدہ خوشی کا اظہار بھی کیا تھا۔ پھر اُسے کچھ پاکستانی بھی ملے تھے۔ انہوں نے اپنے مطالبوں کے جھنڈے اُٹھا رکھے تھے۔ ایک پاکستانی نے آگے بڑھ کر اُس سے ہاتھ بھی ملایا تھا اور کہا تھا "یکم مئی کو بہت کم پاکستانی جلوس میں آتے ہیں۔ سترہ مئی کو دیکھنا سب بن سنور کر سڑکوں پر ہوں گے۔"

اب ایک پاکستانی جو اُس کا یار تھا اور اُس کے دعوت دینے پر بھی یوم مئی کے جلوس میں اُس کے ساتھ شریک نہ ہوا تھا۔ سترہ مئی منانے کے لئے بن سنور کر اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جانے کیلئے آیا تھا۔ حالانکہ شہباز نے ظہیر کے گھر سے اکیلے نکلتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اب یاری ختم۔ اسی لئے وہ جلوس کے بعد سے اُس کے گھر نہیں گیا تھا۔ ٹیلی فون بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اگر کہیں آتے جاتے سڑک پر سامنا ہو گیا تو منہ پھیر کر نکل جانا ہی بہتر ہوگا لیکن اب وہ اُس کے سامنے بیٹھ کر اُسی کی بنائی ہوئی چائے پی رہا تھا۔

"چلو یار۔ پھر تیار ہو جاؤ۔" ظہیر چائے پیتے ہوئے بولا

"نہیں بھائی — یکم مئی کو میں تمہارے گھر سے اکیلا نکلا تھا۔ آج تم میرے گھر سے اکیلے جاؤ گے۔" شہباز نے جواب دیا

ظہیر چائے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور گھور کر شہباز کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرا یہ فیصلہ ہے" شہباز قطعی لہجے میں بولا

"یاری ختم؟" ظہیر نے پوچھا

"ختم!" شہباز نے جواب دیا۔

ظہیر شہر کے مرکزی علاقے میں اکیلا ہی پہنچ گیا اور بینڈ باجے والے بچوں کے جلوس کو دیکھتا رہا اور تالیاں بجاتا رہا۔ اُسے دیکھ کر کئی نارویجن مسکرائے۔ چند ایک نے تو باقاعدہ خوشی کا اظہار کیا۔ اُسے کئی پاکستانی بھی ملے۔ وہ اچھے لباسوں میں چلتے پھرتے پورے ہجوم کا ایک حصہ لگ رہے تھے۔ وہ بھی ہجوم کا ایک حصہ بن گیا لیکن اُس کا ذہن اکیلا ہی رہا اور وہ اپنے آپ چلتا رہا۔ تھری پیس سوٹ ہینگر پر لٹک جائے گا۔ چمکتے ہوئے جوتے الماری میں رکھے جائیں گے۔ سورج چمکتا رہے گا۔ اوسلو ٹوریسٹوں سے بھر جائے گا۔ پھر موسم بدلنا شروع ہوگا۔ ٹوریسٹوں کی واپسی ہو جائے گی۔ دن چھوٹے ہو جائیں گے۔ کام کی مشقت اپنی طوالت سمیت جاری رہے گی۔ پاکستان سے خطوط آتے رہیں گے۔ بنک سے چیک جاتے رہیں گے۔

یہاں عمارتیں سڑکیں سب برف سے ڈھک جائیں گی۔ کام سے فارغ ہو کر سب اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جائیں گے اور ٹیلی ویژن دیکھیں گے۔ اسے ٹیلی ویژن پر ہونے والا ایک مکالمہ یاد آیا۔ وہ شہباز کے گھر صوفے پر بیٹھا تھا کہ اسکرین پر ایک صحافی نے اپنے ملک کے ایک وزیر سے پوچھا تھا "آپ سے یہ غلطی کیوں کر ہوئی؟"

وزیر نے وضاحت کی کہ غلطی تو ہو گئی لیکن اگلے روز پارلیمنٹ میں اس کا اعتراف بھی کر لیا گیا تھا۔ پھر وہ بولا "میں نے غلطی سے جو کچھ کہا وہ کہنا میرا مطلب ہرگز نہیں تھا۔" اس پر صحافی نے پوچھا تھا "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایسی غلطی دوبارہ نہیں ہو گی؟"

تب اُن دونوں کی نظریں اسکرین سے ہٹ کر آپس میں ملی تھیں۔

"جمہوری حکومت میں حکام پر گرفت تو ہو سکتی ہے نا!" شہباز نے تبصرہ کیا تھا

"یہاں پر کیا اپنائیں اور کیا رد کریں؟" ظہیر نے بے دلی سے کہا تھا

"رد کرنے کی چیزیں تو سامنے ہیں" شہباز نے پردہ اٹھا کر برف باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا "یہاں کا موسم یہ سردی اور برفیلی ہوائیں۔"

"اور کیا اپنانا چاہیئے؟" ٹی وی کے سامنے بچھے صوفے پر بیٹھا ظہیر مسکرایا

ملک کے وسائل کی تقسیم کا ایسا طریقہ کار جو پاکستان کے گرم موسم میں وہاں کے سب مزدوروں کو ایرکنڈیشنڈ گھر دے دے تاکہ وہ بھی صوفوں پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں نہ کہ ملک چھوڑنے کے خواب" شہباز نے جواب دیا تھا

ظہیر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ "یہ ناممکن ہے"

"ممکن ہے" شہباز زور دیتے ہوئے بولا

"قطعی ناممکن!"

"سو فیصد ممکن!"

آثار پھر بحث کے شروع ہو گئے۔ مجھے بحث نہیں وہ کہانی سنانا تھی جو یکم مئی کو شروع ہو کر سترہ مئی کو ختم ہو گئی تھی۔ یوم مئی شہباز نے اکیلے جلوس میں جا کر منا لیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اُس نے خود کو مزدور مان کر اور مزدوروں کا ساتھ دے کر بہت اچھا کیا ہے کہ ناروے میں اس کی یہی شناخت ہے پھر اُس کو یہ بھی خوشی ہوئی تھی کہ وہ کچھ ایسے پاکستانیوں سے بھی ملا تھا جو ہر سال یوم مئی کو مزدوروں کے عالمی دن کی حیثیت سے مناتے تھے پھر اُس نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ نارویجن بھی خوش ہوئے تھے۔

سترہ مئی کا دن ظہیر نے اکیلے ہی بچوں کے بینڈ باجوں والے جلوس کو دیکھ کر اور تالی بجا کر منا لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اُس نے آزادی کا دن منا کر آزادی پسند انسان ہونے کا اظہار کیا ہے۔ اُسے کئی دوسرے پاکستانیوں کو ہجوم میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ اچھے لباسوں میں وہ باوقار لگ رہے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ نارویجن بھی اُسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ لیکن یکم مئی اور سترہ مئی کے بعد اُن موقعوں پر خوش ہونے والے نارویجن اپنی اپنی مصروفیت کی پٹریوں پہ اپنی اپنی شغل گاڑی تلاش کرنے اپنے اپنے شنٹ پر ایسے علاقوں میں نکل گئے جہاں پاکستانیوں کا گزر نہیں تھا۔ ظہیر اور شہباز اپنی اپنی جگہ پہ پھر تنہا تھے۔ ایک دوسرے سے ناراض۔ وہ ایک دوسرے کے گھر گئے نہ انہوں نے ایک دوسرے کو ٹیلی فون ہی کیا۔ دونوں نے اپنی اپنی مردانگی کا اظہار ایک دوسرے سے دور رہ کر کر لیا۔ پھر ایک روز اتفاق سے دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ دونوں میں سے کسی نے منہ نہیں موڑا۔ بس بحث کی کون اپنا کون پرایا؟ ناروے میں کیا کھویا کیا پایا؟ یہاں کا کیا اپنائیں اور کیا رد کریں؟۔ یہ بحث چل نہ سکی کہ ہر اپنے میں کچھ پرایا پن بھی تھا۔ اگر انہوں نے کچھ پایا تھا تو کھویا بھی کم نہ تھا۔ اُن کے پاس کوئی ایسا پیمانہ موجود نہیں تھا جو اُن کو اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کے دودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے میں اُن کی مدد کرتا۔ چنانچہ وہ چلتے چلتے چپ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر بھی وہ چپ ہی رہے اور فلمی گانے سنتے رہے۔

"ہم پاکستان میں رہنے والے اپنے دوستوں کے ذہن میں بسی یورپین تصویر کے ہیرو ہیروئن ہیں" ایک نے دوسرے کو ہنسانے کے لئے کہا

"ہم صرف ہیرو ہیں" دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا

"میرا خیال ہے ہم ولن ہیں" شہباز سنجیدہ ہو گیا

ہیرو ولن بھی ہو سکتا ہے" ظہیر بھی سنجیدہ ہو گیا

"ہیرو ہیرو ہوتا ہے۔ ولن ولن ہوتا ہے" شہباز نے دلیل دی

بقیہ صفحہ ۳۳ پر دیکھئے

شاہدہ وسیم

SOGNSVEIEN-102, E 32, 0858, OSLO-8.
(NORWAY)

بازار

صدر کا علاقہ آگیا تھا۔ اترنا تو نہیں تھا لیکن دکانوں کی رونق چہل پہل اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ۔ سامنے دکانوں کے بڑے بڑے شوکیسوں کے پیچھے مصنوعی مرد عورتوں کو دیکھ کر جو اپنے جسموں کی نمائش کرتے ہوئے نت نئے فیشن کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ بلا رہے تھے۔ کہ یہ دیکھو یہ سڈول بازؤں میں یہ بلاوز کیسے خوبصورت لگتے ہیں ہاں یہ دیکھو یہ قیامت خیز سینوں کے ابھار میں یہ نرم ملائم خوبصورت جالی دار برا کیسے آفت مچاتے ہیں۔ ایک ہاتھ کولھے پر رکھے سنہری بالوں والی خوبصورت مصنوعی دوشیزہ ایک پیر کو ساکت کر دینے کے انداز میں تصویر بنی یہ بتا رہی تھی کہ کتنا خوبصورت اسکرٹ ہے" آؤ مجھ خرید لو کیوں کہ اسے پہن کر تم بھی اپنے ان کو ایسے ہی سکتہ دے سکتی ہو۔

مردانہ وجاہت کے نمونے بنے ہوئے یہ مرد، چوڑے سینے سجے ہوئے بالوں والے اونچے لمبے اطالوی حسن کے مصنوعی مجسمے کہہ رہے تھے: "آؤ۔ یہ نیکر پہن لو جن سے تمہارے تندرست جسم —— ہاں یہ پٹری دار بنیان اور منوگرام کڑھے ہوئے شرٹ۔ یہ یہ سب ان کو تڑپا دیں گے ... وہ تمہاری ان مضبوط باہوں میں (بازو عجیب انداز میں پھیلے ہوئے) پھنس کر رہ جائیں گی اب بتائیے دل کیسے نہ تڑپتا۔ میں بھی انسان تھی کوئی ہمالیہ کی چوٹی پر دو شرام کرتی دیو کنیا تو نہیں تھی، بس ان کے اشاروں پر چل گئی وہ سب کہہ رہے تھے" آؤ مجھے خرید لو" پھر تم بھی ایسے ہی میں نے پاس بیٹھے ہوئے اپنے صاحب بہادر کو دیکھا، اس وقت ان کے جسم کا پورا حدود اربعہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اور ان لڑکیوں کو دیکھ کر اپنا بھی۔ اور پھر میں اسی اسٹاپ پر اتر گئی۔ میاں بھی ساتھ ہی اتر پڑے۔ پٹری سے نہیں ٹرام سے۔ بولے۔ یہ کیا؟ یہاں کیوں اتر گئیں لائبریری کا اسٹاپ تو آیا ہی نہیں۔ میں نے کہا۔ اسے اتنی دور آئے ہیں، تو دو گھڑی کے لیے بازار میں ٹہل لیں۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ خیال رہے بازار کے نظریے سے نہیں چلے تھے۔ میں ہنسی، اسے تو کون خریداری کر رہا ہے۔ بس دو گھڑی کے لئے دکانوں پر نظر ہی تو ڈالنی ہے۔ وہ خاموشی سے ساتھ چلنے لگے۔ میں فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی دکانوں اور شوکیسوں پر نظر ڈالتی جاتی تھی۔ یہ کپڑوں کی۔ وہ پرس کی، آگے پرفیومس کی، جہاں پوسٹر لگا تھا، ایک مرد ایک خوبصورت عورت پر جھکا ہوا ہے، لگتا ہے بھنورا پھولوں کی خوشبوئیں لیتا پھر رہا ہے۔ اور آگے جوتوں کی دکان۔ وہاں کوئی ایسا پوسٹر نہیں نظر آیا کہ عورت نے کھینچ کر سینڈل مرد کے اوپر پھینکی ہو بلا اسٹول پر ایک لڑکی بیٹھی ہے اور ایک مرد جھک کر اس کے سینڈل کا اسٹرپ باندھ رہا ہے ..... اور آگے۔ اور آگے۔ مدر کیر آگئی۔ وہاں لوگ اندر آ جا رہے ہیں عورتیں اور مرد، کسی مرد کے ہاتھ میں بچے کی ڈوگن ہے تو کسی عورت کے۔ کوئی حاملہ عورت، مرد کا سہارا لیتے ہوئے۔ اور مرد ایسی سیکسی صورت بنائے ہوئے جیسے ..... میری نظر دکان کے باہر شوکیس پر پڑی وہ بستروں کی دکان تھی۔ رنگ برنگے خوبصورت بستروں پر مرد، عورت آدھے کھلے آدھے چھپے تو بنے سے لیٹے ہیں ساتھ ہی یہ جملہ بھی چسپاں کر دیا گیا ہے۔ ان بستروں پر لیٹ کر جنت کے شیتل اور مخمل کے جیسے نرم ملایم بستروں کا مزہ لیں۔ یا کہ آپ کے خوابوں کی بارآوری کے لیے مناسب جگہ اور میں اس حاملہ عورت اور اس کے ساتھ والے سیکس صورت مرد کو دیکھنے لگی۔ آگے بڑھی تو میک اپ کے سامان کی دکانیں تھیں قریب ہی زنانہ بار بر کی دکان تھی جہاں پوسٹر لگا تھا۔ ڈیانا جیسی نظر آئیں، ہم آپ کو ایسا ہی بنا دیں گے ساتھ ہی ڈیانا کی تصویر لگی تھی۔ قریب ہی دو بوڑھی عورتیں کھڑی میک اپ کی دکان کو اور اس فرنشر کی دکان کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں کہ ایک نے بڑے رنج سے اپنے جھری بھرے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر لپ اسٹک کی خوبصورت [illegible] ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ ساتھ والی بوڑھی نے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنے چھدرے ہوئے بالوں کو انگلی سے سنوارنے لگی۔ میں آگے بڑھ گئی۔ شیشے پر لکھا تھا۔ کولڈ اور قالین نصف قیمت میں۔ دل بے قرار ہو گیا، کہیں سونا بھی آدھی قیمت پر بکا ہے؟ پتہ نہیں کتنی تمنائیں جاگیں، تبھی اور میں دکان [illegible] کی شوکیس

میں لاکٹ انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ قیمت آدھی فیصد بھی جو جتا رکھی تو دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا ایک دل کی شکل کے بنے ہیرے پر نظر جا دیئی تو جم کر رہ گئیں لاکٹ کے چاروں طرف ننھے ننھے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے پیچھے پلٹ کر قیمت جو دیکھی تو وہ ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ سامنے کھڑی سیلس گرل مسکرا دی۔ یا پھر مجھے ہی ایسا لگا جیسے وہ میری بے بسی پر مسکرائی ہو۔ میں مرے مرے قدموں سے دکان سے باہر آئی اور لائبریری کی طرف چل دی۔ وہاں پہونچ کر میاں تو اخبار پڑھنے اوپر کی طرف چلے گئے۔ اور میں بک شلف سے کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگی لیکن جو بھی کتاب ہاتھ میں لیتی۔ اشفاق احمد قرۃ العین حیدر، پریم چند وغیرہ کی کتابوں پر ہیرے کے دل نما لاکٹ کی تصویر ہی نظر آتی۔ پتہ نہیں ان سب کا گٹ اپ کیسا تھا۔ مجھے تو ہر کتاب پر دل ہی دل چمکتا ہوا نظر آتا۔ کتاب کے نام کی جگہ دل مصنف کے نام کے ساتھ دل۔ لائبریری میں جی نہ لگا اور ہم لوگ گھر واپس آ گئے لیکن یہاں پہنچ کر بھی چین نہیں ملا۔ چولہے پر پتیلی چڑھائی اس میں بھنے کے لیے گوشت ڈالا تو لگا ساتھ ہی وہ ہیرے کا بنا ہوا دل بھی پتیلی میں چلا گیا ہے۔ گوشت بھون رہی تھی۔ دل جل رہا تھا۔ رنگ برنگی شعاعیں اس میں سے نکل رہی تھیں۔ نیلی۔ پیلی۔ سُرخ۔ سفید ہیرا بھی تو ایسے ہی رنگ بدلتا ہے۔ وقت جیسے تیسے بیتا۔ رات جب سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو بھی مجھے قرار نہ تھا۔ کروٹیں بدل رہی تھی، جب صبر کا یارا نہ رہا تو ڈرتے ڈرتے میاں سے بولی "وہ لاکٹ بہت خوبصورت تھا" ہاں تھا، لیکن قیمت بھی خوب اچھی تھی میاں نے سپاٹ سا جواب دیا۔ آگے کیا بولتی دل مسوس کر رہ گئی۔ ویسے میں تو نہ مہارانی کیکئی تھی اور نہ ہی کیکئی جیسی تریاہٹ کر اٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑ جاتی۔ پھر بھی پینترا بدل کر بولی۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ بہت مہنگا ہے۔ اب کے عید پر آپ نے کچھ دلانے کو کہا تھا چلیے وہ لاکٹ ہی دلا دیجیے۔ انہوں نے کہا سوچ لو بہت مہنگا ہے۔ میں نے بہت سی ضروریات سے آنکھیں پھیرتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں بار بار تو ایسی چیزیں خریدی نہیں جاتیں۔ اور انہیں سونے ہیرے وغیرہ خرید کر رکھنے اور آئندہ کی املاک اور بچت کے متعلق باور کرانا چاہا کہ کیسے یہ بھی بچت کا پرانا اور مجرب طریقہ ہے۔ پتہ نہیں انہوں نے سنا یا نہیں۔ وہ شاید میری سارے دن کی بے چینی اور اس گذرتی ہوئی رات کی بیتابی کو تاڑ گئے تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے حامی بھر لی۔ اور میں بھی خوش ہو گئی۔ اب مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ رات انہوں نے گھر کے بجٹ میں کہاں کہاں پر چھانٹنی کی تھی۔ کون کون سی ضروریات اور اخراجات پر قینچی چلائی تھی۔ میں تو ساری رات سہانے جگمگاتے خوبصورت سپنوں میں کھوئی رہی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی اُٹھ بیٹھی ورنہ عام طور پر بستر پر ہی پڑی دیر تک اینڈتی رہتی تھی۔ میاں بھی میری بے قراری کو نظروں ہی نظروں میں بھانپ رہے تھے جلد ہی تیار ہو گئے۔ میں نے بھی گھر کے ضروری کاموں کو نپٹایا اور ان کے ساتھ بازار نکل گئی۔ آج دُکانوں کے اشتہاروں میں نہیں بھٹکی بلکہ سیدھی زیورات کی دُکان پر پہنچی لاکٹ خرید اوہیں پہنا اور خوشی خوشی دُکان سے باہر آ گئی یہ دیکھے بغیر کہ میاں کی شکل لاکٹ کا بل دیتے وقت مثلث کے کس زاویے پر آ گئی تھی۔ باہر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں تیز تیز قدم رکھ رہی تھی کہ میاں بولے میں سامنے والے ٹیلی فون بوتھ سے عرفان کو فون کر کے آتا ہوں" اور وہ بوتھ کے اندر چلے گئے اور میں عورتوں مردوں کے سیلاب کو دیکھنے لگی۔ جو آ رہے تھے، جا رہے تھے، میں ہر آتی جاتی عورت کو دیکھتی تو نظریں خود بخود پھسل کر ان کے گلے تک پہنچ جاتیں اور پھر غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ گلے میں پڑے ہوئے اپنے لاکٹ کو ٹٹولنے لگتا۔ لوگ چلے جا رہے تھے بچوں کے ساتھ بیویوں کے ساتھ۔ بوڑھے بوڑھیوں کو سہارا دیتے ہوئے نوجوان اپنی ساتھیوں کے کمر میں ہاتھ دیے ہوئے۔ ایک گورا پورا اونچا، بہترین سوٹ میں ملبوس، ظاہری حالت تو ایسی ہی تھی اندر سے چاہے بالکل ہی پچپچا، ڈھیلا ڈھالا ہوگا۔ لیکن کسی کا اندرون کب نظر آتا ہے۔ ظاہری سجاوٹ ہی پہلے اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ قریب آیا اور نہایت ہی رومانوی انداز میں بولا آپ بہت سوئٹ ہیں، مجھے اس جملے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ میری احساس کمتری نمایاں ہو گئی۔ خاک بھی سوئٹ نہیں ہوں میں، سانولی رنگت، سیدھے بال، سادہ سا لباس جب کہ یہاں کی عورتیں گوری گوری، گھنگھریالے بالوں اور بھرے بھرے گلابی ہونٹوں والی تھیں۔ مجھے اپنی کم مائیگی پر دکھ ہوا لیکن سامنے سے آتے ہوئے سیاہ فارم مرد کے بازوؤں میں جھولتی گوری لڑکی کو دیکھ کر دل کو ذرا تسکین سی ہوئی۔ سوچا شاید پسند کے مفہوم کچھ اور رہے ہوں گے۔ بہرحال اُس مرد کی دی گئی کھلی دعوت کو نظر انداز کر کے میں دوسری طرف ہو گئی۔ ایسے یہاں اکیلے کھڑے رہنے میں کوئی حوا کی بیٹی بغیر آدم کے بیٹے کے جچتی بھی نہیں۔ نا سہی مستقل، وقتی راہ چلتی تو بنتی ہی رہتی ہیں۔ میں سڑک پار کر کے دوسری طرف ہو گئی۔ ایک عورت اپنے بچے کی دو کن سے کر گذری کہ اچانک دوسری طرف سے ایک مرد لپکا "ہائے ماریا تم" اس نے بھی چونک کر اُدھر دیکھا اتنے میں وہ مرد قریب آ گیا لڑکی کے چہرے پر خوشی کے

تارے چمکنے لگے اور دونوں بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگے لڑکا بولا تم نے شادی بھی کرلی"۔ ہاں اور کیا" —— اچھا انسان ہے۔ پھر لڑکا جھک کر بچے کے گال چھوتے ہوئے بولا یہ تو بہت پیارا ہے کس پہ ہے؟ تم پر یا پیٹر پر لڑکی ہنس کر بولی بولی، بچہ تو تمہارا ہے، کیا وہ پیٹر پر جائے گا ایسا ممکن ہے؟ دونوں ہنسنے لگے۔ اتنی دیر میں ایک اور شخص جلدی جلدی قدم بڑھاتا ان تک پہنچ گیا اور بولا مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟ اس وقت بنک میں بہت بھیڑ تھی اور تم کہہ رہی تھیں کہ بچے کے لیے آج ہی سامان لینا ہے۔ پھر وہ چونک کر دوسرے مرد کی طرف متوجہ ہوا تو لڑکی نے اس کا تعارف کرایا۔ پیٹر ان سے ملو یہ میرے ایک دوست ہیں۔ دونوں خوش دلی سے ہاتھ ملانے لگے۔

اب مجھے الجھن محسوس ہونے لگی تھی، بار بار نظریں ادھر اٹھ جاتیں جہاں میاں ٹیلی فون کرنے گئے تھے۔ پھر سوچنے لگی کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اس بھیڑ میں انھیں نظر ہی نہ آؤں۔ ٹرامیں، بسیں دھڑا دھڑ گذر رہی تھیں لوگ اترتے تھے چڑھتے تھے۔ بھیڑ کو دیکھ کر گھبرا بھی رہی تھی کبھی کبھی ہاتھ بڑھا کر لاکٹ کو بھی ٹٹولتی جاتی تھی۔ میں نے ٹرام کے سامنے والی لائن کراس کی اور کریڈٹ کاسن بنک کے قریب آگئی یہاں بھیڑ کچھ کم تھی۔ بنک سے لگی ہوئی سڑک آگے جا کر ایک پکچر ہال پر ختم ہوتی تھی جہاں کچھ عورتیں اور مرد ٹکٹ کے لیے قطار لگائے کھڑے تھے۔ ساتھ ہی پھولوں کی دکان تھی۔ جہاں ایک جوڑا پھولوں کا گلدستہ خرید رہا تھا۔ پکچر ہاؤس کی بالکل مخالف فٹ پاتھ پر دیوار کے سہارے ایک موٹا ٹماٹر جیسی سرخ رنگت والا آدمی بوتل ہاتھ میں پکڑے آڑھا ترچھا پڑا ہوا تھا۔ آس پاس کی زمین تر تھی، شاید بوتل سے رقیق بہہ نکلی تھی مجھے کراہت سی محسوس ہوئی اور میں اپنے بائیں جانب دیکھنے لگی، سڑک کی مخالف سمت پر ایک خوبصورت سی عمارت نظر آئی۔ غیر ارادی طور پر میں اسی طرف بڑھ گئی۔ لوگ وہاں بھی آجا رہے تھے۔ میں نظر اٹھا کر عمارت پر لکھے پوسٹر کو پڑھنے لگی جس پر شراب کی دکان کا نام لکھا تھا ساتھ ہی چمکیلے خوبصورت حروف میں تحریر تھا۔ "دنیا کی بہترین لذتوں اور روح کی تسکین کے تمام اشیاء مناسب داموں پر" میری نظریں اس تحریر سے پھسلی نیچے دیوار کے ایک کونے تک پہنچی جہاں کسی منچلے نے یہ جملہ لکھ دیا تھا "مرنے کے لیے ہر سامان ارزاں قیمت پر دستیاب ہے" میں وہاں سے ہٹ گئی اور آگے بڑھ گئی سامنے ایک کھلا میدان تھا جہاں بینچ پر چند بوڑھے اور بوڑھیاں ماضی کی تمام آسودگیوں سے مطمئن اور خود سے بیزار اپنے ہیٹوں کو چہرے پر ڈالے اپنی عمر رفتہ کو چھپائے دھوپ سینکنے میں مشغول اُس منزل پر پہونچنے کے لئے قطار لگائے بیٹھے تھے جہاں جانے کا ٹکٹ خریدنے کے لیے انھیں کچھ بھی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی۔

انسانی اعضا ران کا نظام اپنی ارتقائی منزل پر پہنچنے کے بعد دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہا ہے۔ لیکن دنیا کا رنگ و روپ لمحہ بہ لمحہ نکھرتا اور سنورتا جا رہا ہے، دنیا کی چمک دمک ہنوز جاری ہے۔ ❁

آذر بارہ بنکوی

انتظار

صداقتوں کے لطیف پیکر
گھروں سے باہر صفیں جمائے
جراحتوں کی دکاں سجائے
لہو میں تر
دردناک منظر

پھٹی پھٹی سی
اداس آنکھیں

نہ جانے کس انتظار میں ہیں
نہ جانے کیسے یقیں ہے ان کو
کہ اُس طرف سے
کوئی فرشتہ
کوئی مسیحا
ضرور آئے گا بن کے منصف
جو اُن کا فریاد رس بنے گا
جو داستانِ الم سنے گا

مگر وہ دیکھو....
اُسی طرف سے
گروہ پھر ایک آرہا ہے
تفنگ و تیر و تبر سنبھالے

● محلہ کٹرہ، امام باڑہ، بارہ بنکی (یوپی)

انوار رضوی

ایک نظم

چمک دکھا کر چھپی ہے بجلی
تو کالے بادل نے آن گھیرا
کہاں کی منزل
کہاں ہے رستہ
میں اندھے گونگوں کی بستیوں میں بھٹک رہا ہوں

چراغ لے کر پہاڑ آئے
تلاش کرتے ہو راکھ کے ڈھیر میں پتنگا
لہو میں لتھڑے شگفتہ لمحے
محبتوں کی کمیں گاہوں سے سانپ نکلے
تمہارے دامن میں خار الجھے
نہ میں نے سمجھا
نہ تم نے جانا
روایتوں کے گلے میں گھنٹی بندھے گی کیسے
چڑھائیوں پر ہوا بہت ہے
بدن کے سوراخ بند کر لو
بخار ٹوٹے تو میں بھی چکھوں پھلوں کی لذّت

اندھیرا چپ چاپ سن رہا ہے
اندھیرا اندر
اندھیرا باہر
بدن کے اوپر لپٹ گیا ہے
اندھیرا تقدیر بن گیا ہے

● ترقی اردو بورڈ، آر کے پورم، ویسٹ بلاک۔ ۸ نئی دہلی ۶۶

ارشد اقبال

C/O, SYED MUJAHID ALI, EDITOR 'KARWAN'
P.O BOX NO. 166, SENTRUM, 010q. OSLO-1.
(NORWAY)

عفریت

پھر شام ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے کہ اندھیروں کے اژدہے آسمانوں سے اُترنا شروع ہوں کیوں نہ روشنی کردی جائے اور موسیقی سے فضا میں ارتعاش پیدا کیا جائے تاکہ دلدل سے نکلنے والے سناٹوں کے طائر پھر سے دلدل میں جا گھسیں۔ اس سے پہلے کہ پڑوسی کی غلیظ آنکھوں سے نفرت چھلکنے لگے کیوں نہ کچھ دیر کے لئے کھلی اور آزاد فضا میں گھوما جائے۔

لیکن یہ کیا ؟

آنکھیں جو مسلسل پیچھا کیے جا رہی ہیں۔

مکروہ، غلیظ، فریبی، دغاباز جھوٹی آنکھیں۔

اژدھوں نے رینگنا شروع کر دیا ہے۔

سناٹے کے طائر نے اژدھے کے خوف سے چیخنا شروع کر دیا ہے۔

برف باری پھر سے شروع ہو چکی ہے۔

سردی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

فضا دھوئیں سے بھر گئی ہے۔

کہنے کو باتیں نہ رہیں اور سوچنے کو موجیں۔

زندگی مشکوک ہوگئی تو سبھی نے نعرہ لگایا SKAL, SKAL

اور پھر ایک ایک کرکے سبھی اژدہوں کے پیٹ میں جا کر سو گئے۔

برف باری ایک ہفتے سے ختم ہو چکی ہے۔

سردی بھی کم ہو چکی ہے۔

بھاری کوٹ اتر چکے ہیں۔

جلد ہی پہاڑ بھی برف کا لباس اُتار پھینکیں گے۔

درختوں پر نئی نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔

سبز و شاداب گھاس سے نیے قطعے بوٹے اور چاروں اور پھول۔ سنہری سنہری دھوپ ہوگی اور لوگوں کے کپڑوں سے بے نیاز جسم۔ سبھی نے نعرہ لگایا SKAL SKAL. اور پھر ایک ایک کرکے سبھی اژدہوں کے پیٹ میں جا کر سو گئے۔

درختوں پر نئی پتیاں نکلنا شروع ہو چکی ہیں۔

کلیاں بھی پھول بننے کے لئے بے چین ہیں۔

سورج نے دھرتی کو سنہری دھات کا زیور پہنانا شروع کر دیا ہے

موسم کا رقص شروع ہو چکا ہے۔

لیکن یہ کیا ؟

تتلیاں سونڈیاں بنتی جا رہی ہیں۔

پھولوں نے خوشبو دینے سے انکار کر دیا ہے۔

فضا دھوئیں سے بھر گئی ہے۔

کہنے کو باتیں نہ رہیں اور سوچنے کو سوچیں۔

زندگی مشکوک ہوگئی تو سبھی نے نعرہ لگایا SKAL, SKAL

اور پھر ایک ایک کرکے سبھی اژدہوں کے پیٹ میں جا کر سو گئے۔

گرمی شدت اختیار کر چکی ہے۔

درجہ حرارت پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے۔

پسینہ اس قدر بہہ رہا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ لوگ ابھی ابھی نہا کر نکلے ہیں ململ کے کرتے جسموں کے نشیب و فراز کو یوں ابھارتے ہیں جیسے مصور اپنے شاہکار کو تمام قیود سے آزاد کر دیتا ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ عریانی ہے۔ سبھی اپنی اپنی جگہ محظوظ ہوتے ہیں۔

یہ سورج بھی جانے کا نام نہیں لے رہا

آج یقیناً شیدا اچھو سے کبڈی جیت جائے گا۔

چاند بہت بڑا ہو گیا ہے لگتا ہے تیرہویں کا ہے۔

یہ ماں بھی کتنی سخت جان ہے سارا دن گھر میں جانوروں کی طرح کام کرتی ہے اور پھر بھی نہیں تھکتی۔ رات کے گیارہ بجنے والے ہیں اور تم ہے کہ ابھی تک پڑوسن سے باتیں کیے جا رہی ہے۔

چھوٹا اٹھا اور منڈیر کے کنارے کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔
دور سے گیدڑ کی آواز آئی اور کتّا بھونکا۔
چھوٹا ڈر کر بھاگا اور بستر پر چڑھ گیا۔
آٹھویں چھت سے گانے کی آواز آئی، گوری اسے من جانا پردیس۔
یہ احمد بھی کتنا عجیب شخص ہے جب سے اُس کے بھائی نے نار دے سے ٹیپ ریکارڈر بھیجا ہے اس نے پورے گاؤں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ لیکن کوئی بھی شکایت نہیں کرتا الٹا ہر شام اس کی چھت پر پہلے سے بڑی منڈلی جمع ہوتی ہے۔ شاید پورا گاؤں ہی خوش ہے۔
سارا گاؤں سو چکا ہے۔
لیکن یہ کیا؟
یہ تو سبھی کُھلی چھتوں پر سوئے ہوئے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی کے پاس بھی اژدھے کا گھر نہیں ہے۔
وہ یقیناً نہیں سوئی ہوگی۔
میں جو جاگ رہا ہوں۔
آخر کو کل جو ہم نے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔
اس اندھے کنویں پر جس میں جناتوں کی بستی ہے۔
میں کیا کہوں گا؟
باتیں کیسے ہوں گی؟
اُسے لاج آئے گی اور میں جھجکوں گا۔
نہیں نہیں مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھجکنے کی میں اُسے صاف صاف کہہ دوں گا کہ بس وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور مجھے اُس سے پیار ہو گیا ہے۔ پھر وہ بھی اقرار کرے گی اور پھر ہم دونوں مل کر ایک خواب دیکھیں گے ایک خوبصورت گھر کا اور شرارتی بچوں کا۔
کہنے کو باتیں نہیں اور سوچنے کو سوچیں۔
زندگی مشکوک ہو گئی تو سبھی نے نعرہ لگایا۔

SKAL, SKAL

ارے ارے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ آج تو تمہارا جسم دن ہے اتنی جلدی ڈرنک ہو گئے۔
میں نہ کہتی تھی کہ تم پینے کے معاملے میں احتیاط برتا کرو۔ اچھی خاصی محفل کا ستیاناس کر دیا۔
اژدھوں نے ہواؤں میں اُڑنا شروع کر دیا۔
برف باری شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔
سناٹے کے طائر نے سردی کی شدّت سے پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔
مسلسل برف باری نے زندگی کو مکمل طور پر مشکوک کر دیا۔
باہر تا حدِ نظر سفیدی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔
رنگوں کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں دُکھنے لگی۔
درد کے مسلسل اضافے نے آنکھوں کی پتلیوں کو سُکیڑ دیا۔
میں نے سوچا یہ خواب ہے۔ تب میں نے اپنے جسم کو ٹٹولا اور محسوس کیا۔ آنکھیں کھولیں تو اپنے جسم کو دیکھا اور اُس کا رنگ پہچانا۔
ایک رنگ کی زندگی وجود میں آ چکی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھے اپنی آنکھوں کو بچانا ہے تو مجھے اپنے جسم سے باہر آ کر اپنے آپ کو دیکھنا ہوگا ورنہ یہ آنکھیں مجھے کھونا پڑیں گی۔
آنکھیں جو رنگوں کی پہچان دیتی ہیں۔

SKAL کا لفظ پُرانے وقتوں میں اس برتن کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جس میں شراب پی جاتی تھی لیکن موجودہ دَور میں چیرز یا ٹوسٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

شگفتہ النور
RUGDEBERG-14. OSLO-12. (NORWAY)

دوسرا رُخ

جب دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے پانچ بجائے اور دروازے پر کسی نے زوردار بیل دی تو صوفے پر بیٹھی ہوئی عائشہ ایک دم چونک پڑی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خط کو ایک طرف رکھ دیا اور بھنور ہوتے خیالات کی دنیا سے باہر آگئی۔ اُسے یاد آیا کہ آج تو اُس نے اپنی ایک نارویجن سہیلی کو کھانے پر بلا رکھا ہے۔

"یہ نارویجن ــــ اُف! ــــ وقت کے کتنے پابند ہوتے ہیں"!

اس نے سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

سامنے آنیا ہاتھوں میں گلدستہ لیے مسکرا رہی تھی۔

صرف تین چار ماہ قبل ہی اُس کی اپنے کام پر آنیا سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہوگئی اور پھر یہ تعلق صرف فیکٹری تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی آنے جانے لگیں۔ اس تسلسل کا نتیجہ تھا کہ آج اُس نے آنیا کو اپنے یہاں کھانے پر بلایا تھا۔

آنیا نے پھولوں کا گلدستہ عائشہ کے ہاتھوں میں تھمایا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائینگ روم میں آگئیں۔ پھول گلدان میں سجاتے ہوئے اسے پھولوں کی خوبصورتی کا احساس ہوا۔ پھول واقعی دلکش تھے لیکن یہ احساس صرف چند لمحوں تک برقرار رہ سکا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اُسے پھولوں میں کوئی نقص نظر آیا تھا بلکہ کام سے آنے کے بعد سے اُس کا ذہن ابھی تک منتشر ہی تھا۔ دراصل اُسے اُسی روز کی ڈاک سے ایک خط موصول ہوا تھا جو اُس کی ایک عزیز سہیلی نے لکھا تھا اس میں جو کچھ باتیں لکھی تھیں جنہیں پڑھ کر عائشہ نہ صرف بے چین ہوگئی تھی بلکہ اُس پر کچھ بھی نہ کرنے کا دورہ سا پڑا تھا۔ یہ تو بس آنیا کے آنے کی ذمہ داری ہی تھی کہ اُس نے ہمت کر کے کھانا پکا لیا تھا۔

اُس نے گلدان میں پھولوں کو سجایا اور خوبصورت پھول لانے پر آنیا کا شکریہ ادا کیا۔ یہاں ایک دوسرے کے گھر جاتے ہوئے پھول لے کر جانا ایک اچھی روایت سمجھی جاتی ہے۔ یہاں بچہ، بوڑھا، جوان ــــ ہر کوئی پھولوں سے پیار کرتا ہے۔ کسی کی سالگرہ ہو یا کسی مریض کی عیادت کرنی ہو۔ پھول لے جانا اچھی عادت اور ایک اچھا تحفہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ اگر پھولوں سے پیار کرتے ہیں تو ان کی حفاظت کرنا بھی جانتے ہیں وہ دل میں ایک عجیب سی کسک لیے آنیا کے ساتھ صوفے پر آن بیٹھی۔

"اور سناؤ کیا حال ہے؟ آج تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی کیا؟"

عائشہ نے اپنے موڈ کو قدرے خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! صبح کچھ سستی سی محسوس کر رہی تھی مگر اب تو بالکل ٹھیک تمہارے سامنے بیٹھی ہوں"۔

آنیا نے معمول کے مطابق چہکتے ہوئے کہا "مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ بُجھی بُجھی سی ہو"۔

عائشہ کی نظر غیر ارادی طور پر میز پر پڑے ہوئے خط پر جا پڑی اور آنیا بھی عائشہ کی پیروی میں خط ہی کو دیکھنے لگی۔

"کیا اس خط میں کچھ ہے؟" آنیا نے پوچھا

"ہاں! ــــ میری ایک عزیز سہیلی نے پاکستان سے یہ خط لکھا ہے اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جنہوں نے مجھے بے چین کر دیا ہے"۔

عائشہ نے بات مختصر کی اور موضوع بدلنے کی خاطر اس سینڈل کی تعریف شروع کر دی جو آنیا اُس وقت پہنے ہوئی تھی "تمہیں اچھے لگے ــــ؟" آنیا نے خوش ہو کر عائشہ سے پوچھا اور پھر خود ہی کہنے لگی۔ یہ وہی تو ہیں جو پچھلے ہفتے میں نے خریدے تھے۔ آج پہلی مرتبہ تمہارے یہاں پہن کر آئی ہوں۔ اس ڈیزائن کے اور بھی سینڈل اس دُکان پر موجود ہیں اگر تمہیں پسند ہوں تو میں تمہیں دُکان کا نام اور راستہ بتا دوں گی"۔

اسی دوران دونوں سہیلیاں مختلف موضوعات پر باتیں کرتی رہیں لیکن عائشہ کی بے چینی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ جسے آنیا بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اُس نے بوتل سے اپنے گلاس میں کوک انڈیلتے ہوئے پوچھا "اگر

تم برا نہ مانو تو کیا میں تم سے یہ پوچھ سکتی ہوں کہ اس خط میں آخر کون سی ایسی بُری خبر آئی ہے جس نے تمہیں اتنا پریشان کر دیا ہے۔"؟

آنیا اور عائشہ کی دوستی اب اتنی گہری ہو چکی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے اس حد تک واقف ہو گئی تھیں کہ ایک دوسرے سے ذاتی سوالات بھی پوچھ لیا کرتی تھیں۔ اُن دونوں نے عورت ہونے کے ناطے ایک رشتہ دریافت کر لیا تھا۔ اب ان دونوں میں کوئی فرق رہ گیا تھا تو یہ کہ ایک نارویجن تھی تو دوسری پاکستانی۔

عائشہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر کہا جیسا کہ میں نے تم سے ذکر کیا تھا کہ جب میں بی۔ اے میں پڑھتی تھی تو ہم چار پانچ لڑکیوں کا ایک گروپ ہوتا تھا۔ ہم سب میں گہری دوستی تھی۔ بی۔ اے کے بعد کچھ نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا اور باقی کو مالی حالات اور کچھ دوسری وجوہ سے پڑھائی ختم کرنا پڑی۔ میں نے بھی ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سب کی شادیاں ہو گئیں۔ کسی کی پہلے کسی کی بعد میں لیکن اس دوران ہم سہیلیوں میں خطوط کے ذریعے رابطہ قائم رہا۔ میری شادی پر تو تین سہیلیوں نے شرکت بھی کی تھی اور کافی مزہ رہا۔ شادی کے ایک سال بعد میں اپنے میاں کے ساتھ ناروے آ گئی اور اس طرح میرا باقی سہیلیوں کے ساتھ پہلے جیسا رابطہ قائم نہ رہا۔ اور آج ان سہیلیوں میں سے ایک کا یہ خط آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ تبسم کو طلاق ہو گئی ہے۔

یہ کہتے ہوئے عائشہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے جسم سے کسی نے جان نکال لی ہو اُسے یوں لگا کہ اُس نے یہ الفاظ بول کر خود ہی اپنے آپ کو ماضی کے اُس بھیانک جنگل میں دھکیل دیا ہو جس سے نکلنے کے لئے اُس نے اَن گنت جتن کئے تھے۔

چار سال قبل اسی لفظ "طلاق" نے اُس کی زندگی میں کانٹے بھر دیے تھے۔ جب وہ اپنے میاں کے ساتھ ناروے آئی تھی اُس نے بجائے گھر بیٹھنے کے کام شروع کر دیا تھا۔ اُس کا میاں وسیم اِتنے آزاد خیالات کا حامی نہ تھا۔ شروع میں تو اُس کو عائشہ کا کام کرنا اچھا نہیں لگا مگر آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو گیا۔ وقت گذرتا رہا لیکن پھر اچانک ہی وسیم نے اُسے باہر آنے جانے پر ٹوکنا شروع کر دیا۔ اگر کبھی کبھار وہ کچھ رقم خرچ کر لیتی تو اُس کا باقاعدہ حساب مانگا جانے لگا۔ وسیم نے بات بات پر طنز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وسیم کے اس رویے کو وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ اپنی سی پوری کوشش کرتی کہ وسیم کو خوش رکھے۔ مگر حالات بہتر ہونے کے بجائے دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ اسی دوران عائشہ کو احساس ہوا کہ

اُس کے وجود کے اندر ایک اور وجود جنم لے رہا ہے ڈاکٹر کے اتفاق کر
پر تو وہ بہت خوش ہوئی تھی کہ شاید اب اس کے میاں کے رویے میں
تبدیلی آ جائے گی۔ لیکن اس خبر نے وسیم پر کوئی خاص اثر نہیں کیا۔ ہاں
کچھ دنوں کے لئے یہ ضرور ہوا کہ اُس کے رویے میں قدرے تبدیلی آ
اُسی دوران وسیم نے عائشہ کی نوکری چھڑوا دی اور اُسے باہر نکلنے
بھی منع کر دیا۔ لیکن ایک بار پھر وسیم کا رویہ اُکھڑا اُکھڑا سا رہنے لگا
رات کو دیر سے آنا تو روز کا معمول بن گیا تھا عائشہ سارا سارا دن اکیلی کڑھ
رہتی اور اپنی تقدیر پر آنسو بہاتی۔ ایک دن معمولی سی بات کو موضوع بنا کر
نے اچانک لڑنا شروع کر دیا۔ عائشہ نے لب کھولنا چاہے تو اُس کے زور
تھپڑ نے اُس کے ادھ کھلے لب ہی بند کر دیے اور وہ اُسے روتا ہوا چھ
کر باہر چلا گیا تھا۔

تب ایک دن عائشہ نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ ذلت برداشت نہیں کر
گی، یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک عورت ہے لیکن وہ غلام ہرگز نہیں۔ برداشت
اور صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے اُس نے سوچا وہ پاکستان چلی جائے گی۔
اُسے اپنا وجود کانپتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ اس کا جسم
درد کی شدت سے کانپ رہا ہے یا دکھ کی شدت سے۔ اُس نے فوراً ڈ
فون کیا مگر اس کے بعد جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھ
ڈاکٹر نے اُسے بتایا کہ اُس کا بچہ ضائع ہو چکا ہے جس کا اُسے افسوس ہے
عائشہ کو یوں لگا جیسے وہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ جیسے وہ کچھ سن ہی نہ ر
ہو! گذرتے ہوئے لمحے رک گئے ہوں! اُسے ایسا لگا کہ اُس کے وجود کا
ایک حصہ کاٹ دیا گیا ہو۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور تکیہ سے اپنا منہ
بھینچ لیا۔ وہ کسی کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی سے کچھ پوچھنا بھی نہیں
چاہتی تھی کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں کر ہوا۔

دوسرے دن وہ گھر آ گئی تھی۔ اس دوران وسیم نے اُس کو خوش
رکھنے کی کوشش کی اور تھوڑا بہت خیال بھی رکھا۔ عائشہ نے سوچا شا
وسیم کو اس واقعے سے دُکھ ہوا ہے، آخر وہ بچہ اُس کا بھی تو تھا لیکن
بھی وہ اس کے رویے سے کوئی خاص نتیجہ نکالنے سے قاصر رہی تھی
کچھ دنوں بعد عائشہ نے اپنے سابقہ فیصلے پر نظر ثانی کی اور وہ اُسی نتیجے
پہنچی کہ اسے پاکستان چلے جانا چاہئے۔ اب اس کے لیے یہاں رہنا محال ہو
گیا تھا۔ کیوں کہ اب پھر وہ پہلے جیسی تنہائی تھی، وہی کرب تھا۔ پہلے تو
اُسے یہ اُمید تھی کہ شاید بچے کی پیدائش کے بعد سب ٹھیک ہو جائے
گا جیسے بچہ ہی ایک سہارا تھا، لیکن اب وہ بہت تھک چکی تھی، اب

کچھ برداشت کرنا اس کے بس میں نہیں تھا اب اُس میں ایک نیا عزم اُبھر رہا تھا۔

وسیم نے اُسے پاکستان جانے سے روکا مگر عائشہ اپنے فیصلے کو بدلنے پر تیار نہیں تھی اور اس طرح وہ اکیلی پاکستان چلی آئی تھی۔ ابھی پاکستان آئے ہوئے اُسے دو ہی ہفتے ہوئے تھے کہ وسیم کی طرف سے اُسے کاغذ کا وہ پُرزہ ملا جس نے اُس کی پیشانی پر طلاق کا دھبہ لگا دیا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُسے کسی نے زندہ دفن کر دیا ہو۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ دیکھو! ـــــ کیا یہ وہی کاغذ کا پُرزہ ہے جس کو گواہ بنا کر باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتا ہے یا ایک عورت کو مرد کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ ـــ کہ لو اب تم اس کے مالک ہو ـــــ جو جی چاہے سلوک کرو۔ اور پھر یہی کاغذ کا پرزہ اُسی عورت کے ہاتھوں میں دے کر اُسے اپنے ہی گھر سے نکال دیا جاتا ـــــ کتنے مکروہ ہیں ہم لوگ کہ اپنی ہی بنائی ہوئی رسموں کو معاشرے کے رواج کے نام سے پکارتے ہیں کہ جیسے ہم کوئی اور مخلوق ہوں اور ہمارا اس معاشرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اس خبر نے عائشہ کے گھر والوں کو ہلا دیا تھا۔ بہن بھائی۔ ماں باپ سب کے دل بوجھل ہو گئے تھے۔ جاننے والوں نے افسوس کیا۔ کسی نے وسیم کو اور کسی نے عائشہ کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ رشتے داروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حملے کیے لیکن کسی نے اصلیت جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وقت کو تو گزرنا تھا گذرتا رہا۔ اگر کبھی وہ باہر نکلتی تو اُس کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا۔ اُس کے کپڑوں پر تبصرے کیے جاتے اُس کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھا جاتا۔ انہیں دنوں کسی نے مشورہ دیا کہ عائشہ کی دوسری شادی کر دی جائے۔

تب عائشہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ناروے واپس چلی جائے گی۔ قانونی طور پر وہ وہاں جا سکتی تھی۔ اُس کے وجود میں نفرت سی پھیل گئی تھی۔ وہ لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے بچنا چاہتی تھی جو ہر وقت اُس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ اُسے کمتر ہونے کا احساس دلاتی تھیں۔ گھر والوں نے بہت منع کیا مگر وہ کسی پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ آخر کوئی کب تک اس کا بوجھ اٹھائے گا۔ ماں باپ کے بعد بھائیوں اور بھابھیوں کے رحم و کرم پر پڑا رہنا اُسے منظور نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا وہ پڑھی لکھی ہے اور اپنی ذمہ داری خود اٹھا سکتی ہے یہی سوچ کر وہ ناروے چلی آئی تھی۔

پاؤں پر کوئی ٹھنڈی چیز گری جس نے اُسے ایک دم چونکا دیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ جس گلاس میں کوک انڈیل رہی تھی وہ بھرنے کی وجہ سے نیچے گرنا شروع ہو گیا تھا۔

"اوہ! سوری! اصل میں وہ ....." عائشہ کھسیانی سی ہو گئی۔ کیا اُس نے واقعی صرف ایک گلاس بھرنے کے دوران اپنے ماضی کی ساری داستان دہرا لی ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اچھا ہوا کوک گر گیا ورنہ آنیا جانے کیا سوچتی۔

کوک نیچے گرتے دیکھ کر آنیا نے کہا "کن خیالوں میں کھو گئی ہو؟ مجھے تمہاری دوست کو طلاق دئے جانے کا افسوس ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم اس بات کو اپنے دل پر لگا لو"

عائشہ کو آنیا کی بات سن کر بہت عجیب سا لگا۔ جیسے اُس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس کی اُسے توقع نہ ہو پھر اُس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ "ہوں! اُسے کیا پتہ کہ ہمارے معاشرے میں اور اُس کے معاشرے میں کتنا فرق ہے۔ ہمارے ہاں طلاق کا لفظ ایک بدنما داغ تصور کیا جاتا ہے۔ عورت کی محدود سی آزادی بھی صرف اس لیے صلب کر لی جاتی ہے کہ وہ طلاق شدہ ہے۔ ناروے میں تو جیسے یہ ایک عام بات ہو۔ کوئی کسی عورت پر فقرہ نہیں کستا کہ وہ طلاق شدہ ہے" لیکن آنیا سے وہ صرف یہی کہہ سکی "ہمارے یہاں طلاق کا لفظ کا ناپسند کیا جاتا ہے۔ شادی کے بعد جب عورت اپنی سسرال جاتی ہے تو پھر آخری سانس تک وہی اُس کا گھر ہوتا ہے"

"ہاں! میں جانتی ہوں" آنیا نے کہا۔ "تمہارے معاشرے میں مرد کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ عورت وہی کرتی ہے جو اُس کا مرد چاہتا ہے۔ میں ناروے میں مقیم ایسے لوگوں کو جانتی ہوں جن کی عورتیں گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں"

عائشہ نے آنیا کے لہجے میں چبھن محسوس کرتے ہوئے کہا "خیر! اب تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔ یہاں پر ایسی پاکستانی عورتیں بھی ہیں جو کام بھی کرتی ہیں اور اُن کا دوسروں سے ملنا جلنا بھی ہے۔ اور یہ مسئلہ صرف پاکستان کی عورتوں ہی کا نہیں بلکہ تیسری دنیا کی تمام عورتوں کا مسئلہ ہے۔ تیسری دنیا کے تمام ممالک کی عورتوں کے مسائل یکساں ہیں۔ وہاں کی ہر عورت چاہتی ہے کہ اُسے بھی آزادی ملے تاکہ وہ بھی فخر سے اپنا سر اونچا کر سکے تمہاری طرح ان بے بس عورتوں پر ترس کھا سکے جو آزادی سے محروم ہیں۔

اچانک عائشہ کو اپنے لہجے میں کڑواہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُس نے ماحول کو بدلنے کے لئے جلدی سے کہا "آؤ چل کر کھانا کھائیں۔ پیٹ

میں چوبے دوڑنا شروع ہوگئے ہیں۔ باتیں بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہیں گی۔"

آنیا بھی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں کھانے کی میز پر آبیٹھیں، عائشہ نے گرم گرم کھانا میز پر لگا دیا تھا، پھر دونوں ہی کھانے میں مصروف ہوگئیں۔ آنیا کو کھانا بہت پسند آیا۔ تیز مرچ کے باوجود وہ بڑے مزے لے لے کر کھانا کھاتی رہی۔

کھانے کے بعد آنیا نے ڈرائینگ روم کا رخ کیا اور عائشہ چائے کے لئے پانی رکھ کر اُس کے پاس چلی آئی۔ آنیا جیسے عائشہ ہی کی منتظر تھی۔ اُس کے بیٹھتے ہی وہ بولی "چلو میں مان لیتی ہوں کہ کچھ پاکستانی عورتیں کام بھی کرتی ہیں اور باہر بھی نکلتی ہیں۔ مگر تم خود بھی جانتی ہوگی کہ یہاں بہت سے پاکستانی ہیں۔ لیکن ان گھرانوں میں سے چند ایک عورتیں ہی گھر سے باہر نکلتی ہیں، تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف وہی عورتیں دوسروں سے ملتی جلتی ہیں جن کو ان کے شوہر اجازت دیتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ان کو شخصی آزادی نہیں ہے۔ پاکستانی عورتوں کی بات میں اس لیے کر رہی ہوں کہ تم میری دوست ہو اور پاکستانی بھی۔ میں تمہاری ذات یا تمہارے ملک کو نشانہ نہیں بنا رہی ہوں۔ میں تو صرف اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہوں اور چاہتی ہوں کہ خوشگوار ماحول میں گفتگو ہو۔"

عائشہ کو اُس کے اندازِ گفتگو پر ہنسی آگئی۔ اُسے لگا جیسے وہ ایک صحافی ہو اُس کا انٹرویو لے رہی ہو۔ اُس نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے اُس کے سوال کا جواب دیا۔ "تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہمارے یہاں بیوی کو اپنے خاوند کی بات ماننا پڑتی ہے۔ اگر خاوند اجازت دے تو وہ باہر جاسکتی ہے۔ مگر یہ سب تنگ نظری اور جہالت کے سبب ہے۔ اب جوں جوں لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں زندگی جینے کا شعور بھی پیدا ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اب میاں بیوی برابری کے اصول پر زندگی گزارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

آنیا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "اگر تم چاہو تو میں تمہاری ملاقات اپنی ایک سہیلی سے کرواسکتی ہوں۔ وہ ایک رسالے کے لئے مختلف لوگوں کے انٹرویو لیتی ہے۔ آج کل وہ غیر ملکیوں کے مسائل اور ان کے رسم و رواج کے متعلق معلومات جمع کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے تم چاہو تو اُسے کوئی چھوٹا موٹا انٹرویو دے دو۔"

پانی کے ابلنے کی آواز آنے لگی۔ عائشہ چائے بنانے کے لئے اٹھ کر چلی گئی۔ اُس کے لئے یہ ایک اچھا موقع تھا کہ وہ آنیا کی تجویز کے بارے میں غور کر سکے۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں اُس کے انٹرویو سے پاکستان کی بے عزتی نہ ہوجائے۔ وہ اپنے وطن سے بے حد محبت کرتی ہے۔ وہ تو صرف ان تنگ ذہن لوگوں کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ عورت کوئی بے جان شئے یا اُن کی زر خرید غلام نہیں ہے، وہ ایک نازک اور حساس انسان بھی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ چائے کے کپ آنیا کے پاس اٹھا لائی۔ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگیں۔ شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو سوچنے کا موقع دینا چاہتی تھیں۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟" آنیا نے آہستگی سے پوچھا

عائشہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ میں اس بات کا جواب کل دے سکوں گی کیا یہ ٹھیک رہے گا؟"

"جیسی تمہاری مرضی" آنیا نے شانے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔

چائے پینے کے بعد آنیا نے کھانے کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت مانگی۔ عائشہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اُس کے جانے کے بعد وہ پھر تنہا ہوگئی تھی، ایک بار پھر وہی خط اُسے گھور رہا تھا۔ اُس نے خط کو دوبارہ اٹھایا پڑھا اور پھر رکھ دیا۔ اُس نے اپنے اندر عجیب سا درد محسوس کیا۔ اُس نے سوچا کہ عورت کہیں کی بھی ہو اس کے احساسات و جذبات ایک سے ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیسا انصاف ہے کہ کسی طلاق شدہ عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک میں ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ وہاں طلاق شدہ عورت پر کوئی فقرہ نہیں کسا جاتا۔ اُسے اپنی زندگی گذارنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تبسم پر کیا گذر رہی ہوگی؟ ساری عمر عورت گھر بناتے بناتے تھک جاتی ہے مگر پھر بھی اس کا اپنا کوئی گھر نہیں؟ بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے ہدایت کی جاتی ہے کہ اب تیرا گھر وہ ہے جہاں تیرا شوہر رہے گا۔ اور جب اس کا اپنا وہ گھر بھی اس سے چھین لیا جاتا ہے تو اُس کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا جسے وہ اپنا گھر کہہ سکے۔ شوہر مر جائے تو تمام عمر بیوگی کا لبادہ اوڑھے برتن مانجھ مانجھ کر اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ مگر پھر بھی لوگوں کے منہ بند کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

عائشہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مردوں کو جھنجھوڑ ڈالے اور اُن کے سوئے ہوئے دماغوں کو ہلا کر جگا دے اور کہے کہ دیکھو! آج عورت کو تم نے کیا سے کیا بنا ڈالا ہے۔ تم اِسے آج بھی غلام سمجھتے ہو، اسے کمتر اور کمزور سمجھتے ہو، اسے پابند کئے ہوئے ہو، بے بس بنائے ہوئے ہو۔ اس کا دل عجیب سے احساسات سے بھر گیا جس میں نفرت تھی، جوش تھا، نیا ولولہ تھا۔ وہ تصویر کا دوسرا رُخ بیان کرنا چاہتی تھی جن میں وہ لوگ بھی تھے جو مذہب کی آڑ میں سب کچھ کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ جن کا ظاہر و باطن

باقی صفحہ ۳۶ پر دیکھئے

سردار شفیق

بدن میں دھول اُڑنے کی سی حالت ہر طرف تھی
بدلتے موسموں کی بادشاہت ہر طرف تھی

ذرا بے اعتدالی توڑ دیتی قلعۂ جاں
حصارِ جسم کے اندر بغاوت ہر طرف تھی

اسی خدشہ نے تیری جستجو سے باز رکھا
کدھر اٹھتے قدم لمبی مسافت ہر طرف تھی

پُرانے عہد سے باہر نکل کر میں نے دیکھا
نئی تہذیب پر گردِ قدامت ہر طرف تھی

ہوا کے ساتھ چلنا ہی پڑا اُس آدمی کو
وہ کیا کرتا کہ رشتوں کی تجارت ہر طرف تھی

قاسم پورہ، مئوناتھ بھنجن (یوپی)

بسمل پرتابگڈھی

عمریں سمیٹ دی گئیں سب امتحان میں
ہم بھی بسائے جاتے ہیں کیسے مکان میں

اندھا ہوں کیا اٹھاؤں میں ہاتھوں میں آئینہ
آواز بن کے گونجتا رہتا ہوں کان میں

تیشہ زنوں نے اپنے خدا سے کیا سوال
کس کے غموں کی آگ چھپی ہے چٹان میں

کب تک زمین یوں ہی اٹھاتی رہے گی سر
کب تک دھرا رہے گا عذاب آسمان میں

شاخوں میں پھل لگے تھے مگر اُن کا ذائقہ
محسوس کر رہا تھا میں اپنی زبان میں

مختار پان ہاؤس، دودیشور روڈ، احمد آباد

مرغوب علی

کون نگر ہے کون دشا رُت بدل گئی
تو آنکھوں سے دُور ہوا رُت بدل گئی

اپنے دیس کے جنگل میں تھا سکھ ہی سکھ
پنچھی جب پردیس گئے رُت بدل گئی

چاروں اور سے صحرا امنڈا آتا تھا
ڈالی پر اک پھول کھلا رُت بدل گئی

پھر آنکھوں میں سپنوں کے جگنو چمکے
پھر جیون میں رنگ اُگا رُت بدل گئی

میں چپ کے گہرے موسم میں جیتا تھا
جس دن سے تو مجھے ملا رُت بدل گئی

۹۴ دھرم داس، نجیب آباد (یوپی)

جنوں اشرفی

خوبصورت نہ خواب کی صورت
زندگی ہے عذاب کی صورت

زرد منظر چہار سو اپنے
سبز موسم سراب کی صورت

خواب آنکھوں نے چن لیا پھر سے
درد مہکا گلاب کی صورت

رہگذر ہے سوال کی مانند
ہر قدم ہے جواب کی صورت

شہر میں جھوٹ کی منادی ہے
سچ کو لکھنا سراب کی صورت

پی-۱۲، این بلاک اے نیو علی پور
کلکتہ-۵۳

شمیم یوسفی

ہماری آنکھوں میں خواب جو ہیں، تمہارے ہی خط و خال سے ہیں
مگر وہ لمحے کہاں ہیں آخر، جو ملتے جلتے وصال سے ہیں

درونِ دل کی اُداس راہوں پہ نقش اپنا ضرور ہو گا
نظر کی وسعت تک تو ہم بھی، سمجھ لو وہم و خیال سے ہیں

اُداس لمحوں کا ایک پیکر، ہمارے آگے کھڑا ہوا ہے
بتاؤ اس کو جواب کیا دیں کہ ہم تو خود ہی سوال سے ہیں

زمیں سے برگد کا پیڑ گر کر ندی کے اندر چلا گیا ہے
یہی سبب ہے کہ گرم سورج کی لُو سے ہم سب نڈھال سے ہیں

شمیم ہر شے تو چھن چکی ہے، خدا سے لیکن یہی دعا ہے
ہماری آنکھوں سے چھین لے وہ جو خواب وحشت مآل سے ہیں

سپرنٹنڈنٹ آفس، بھوجپور ڈویژن پوسٹ آفس، آرہ

یوسف بیگ جمال

سایہ کہیں ملا نہ کوئی آسماں ملا
دشتِ تپش میں ایک کھلا آسماں ملا

دشتِ یقیں میں خواب کا جو رنگ و روپ تھا
ویسا کہاں مجھے کوئی شہرِ گماں ملا

موجِ شفق کی صبح نہ تو کہکشاں کی شام
یہ اب دیارِ شوق میں کیسا سماں ملا!

حدِ مکاں ملے تو کھلے رمزِ لامکاں
ہر سمت ایک سلسلۂ بیکراں ملا

انجم شماریوں کے بھی لمحات کھو گئے
بے منظری کا ایسا بھی اک آسماں ملا

ڈاکخانہ بھدوہی، ضلع وارانسی (یوپی)

خالد حسین خالد

4-A, 615, KRINGSJA, STUDENT BY, OSLO-8.
(NORWAY)

پنڈولم

شور رفتہ رفتہ تھمتا گیا جیسے زور سے مینہ برستے برستے رم جھم میں بدل جائے۔ اندر گرمی کم ہونے لگی۔ ایک ایک کر کے لوگ باہر نکل رہے تھے، کل پھر ملنے کے وعدے ہو رہے تھے۔ وہ روز ہی ملتے ہیں اور پھر اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے چلے جاتے ہیں۔ وہ کب تک ایسے ہی ملتے رہیں گے اور پھر ان ملاقاتوں میں ہوتا بھی کیا ہے؟ ٹک ٹھک، ٹک ٹھک۔

ڈرن ڈرن زان زپ۔ اس نے تسمے بند کیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ نہا کیوں نہ لے۔ گھر میں باتھ تو ہے نہیں۔ ویسے بھی آج پسینہ بہت آیا ہے۔ اُس نے تسمے کھولے، کوٹ اتارا۔

——— بہت دن ہوئے کوئی خط نہیں آیا۔ چیک تو مل گیا ہوگا۔ مگر ابھی تک جواب نہیں آیا۔ وہ اسکول جاتا ہوگا نیلا کوٹ کالی پتلون پہنے۔ اُس کا بستہ کتابوں سے لدا ہوتا ہوگا۔ واپس آکر ماں سے لڑتا ہوگا۔ وہ بہت جھگڑالو ہے۔ اپنی من مانی کرتا ہے نا۔ اچھا کرتا ہے۔ کھیلنے چلا جاتا ہے۔ شام کو جب تک بُلانے نہ جاؤں گھر نہیں آتا اور پھر رات کو پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ اکثر پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہے۔ پھر اُسے اُٹھا کر بستر پر لٹاتی ہوں۔ کتابیں بستے میں بند کرتی ہوں۔ صبح جاگ کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ پوچھتا ہے ماں! میں کب سو گیا تھا۔ کئی بار پوچھتا ہے، ابا کب آئیں گے۔ بہت جلدی۔ اُسے بتاتی ہوں۔ پھر کہتا ہے ابّو مجھے ابا کی صورت بھولنے لگی ہے۔ پھر اندر جا کر تمہاری تصویر اٹھا لاتا ہے۔ کہتا ہے اب تو ابا کو آجانا چاہیئے۔ میں ابا کو بتاؤں گا، میں اپنی کلاس میں سب سے ذہین ہوں۔ میں غیر حاضری بھی تو کوئی نہیں کرتا۔ اِتی مِس شازیہ کہتی ہے، تم بہت اچھے شاگرد ہو۔ ہاں تمہیں گئے ہوئے چار سال تو ہوگئے ہیں۔ اب تمہیں گھر آنا چاہیئے"۔

ہاں مجھے گھر جانا چاہیئے۔ کل ہی چیف سے چھٹی کی بات کروں گا۔ دو ماہ کے بعد عید آرہی ہے، عید پہ مجھے گھر ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے بہت سے کھلونے لے کر جاؤں گا۔ موٹر کار، ہوائی جہاز، بہت خوش ہوگا کھلونے دیکھ کر۔

ہیدرسن مجھے گھر جانا ہے۔ چھٹی چاہیئے۔

دو مہینے؟

نہیں نہیں دو مہینے تو بہت تھوڑے ہیں تم خود ہی سوچو۔ چار سال بعد گھر جا رہا ہوں دو مہینے تو پلک جھپکتے گذر جائیں گے۔

ہاں چار مہینے۔ بہت بہت شکریہ۔ پی۔ آئی۔ اے یا ایس۔اے۔ ایس؟ ہاں پی۔ آئی۔ اے بہتر رہے گی جہاز تبدیل نہیں کرنا پڑتا۔

اسنے تولیے سے اپنا بدن خشک کیا، کپڑے پہنے اور باہر نکل آیا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے کوٹ کی جیب سے کنگھی نکالی اور بالوں کو سنوارنے لگا۔

اُس نے دوسروں کو الوداع کہا اور باہر نکل آیا۔

فلپس ——— نوردن انشورنس ——— ڈپلوم آئس ٹیکسیکو ——— نورسک آئل۔ دکانیں تو سب بند ہوگئیں! بریڈ بالکل ختم ہو گئے تھے۔ گرن لیڈ والی دکان کھلی ہوگی۔ مگر صرف بریڈ کے لئے اتنی دور..... ویسے بھی آج بہت تھک گیا ہوں، گھر جا کر کھانا تیار کرتے کرتے پون گھنٹہ لگ جائے گا، کیوں نہ آج کسی ریستوران میں کھا لوں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، سارے پیسے نکال کر گنے۔ بہت ہیں۔ وہ چلتے چلتے ایک ریستوران میں داخل ہو گیا۔ ریستوران میں خاصی بھیڑ تھی وہ ایک خالی میز پا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے کھانے کا آرڈر دیا۔

برف شروع ہو گئی ہے اب پانچ چھ ماہ تک موسم ایسا ہی رہے گا۔ کافی دنوں سے اکبر سے ملاقات نہیں ہوئی شاید نائٹ شفٹ کرتا ہے۔ اتنی دیر میں کھانا آگیا اس نے کھانا شروع کیا۔

ساتھ والی میز پر دو بوڑھے بہت اونچی آواز میں باتیں کر رہے

تھے، شاید آپس میں جھگڑ رہے تھے پھر اُن میں سے ایک اُٹھا۔ وہ سیدھا اسی کی طرف آ رہا تھا

"ہائے"

"ہائے" اس نے اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ہاتھ ملایا۔

"تم کہاں سے ہو؟"

"پاکستان سے"

اچھا بہت اچھا۔ میں بحری جہاز میں کپتان رہ چکا ہوں۔ کراچی گیا تھا۔ پچاس سال پہلے۔ اب تو کراچی بہت بدل گیا ہوگا۔ بمبئی بھی گیا تھا۔ میں وہاں کے سب لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ بوڑھے کپتان نے ہاتھ ملانے کے لئے پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے پھر ہاتھ ملایا۔ اتنے میں بیرا پاس سے گذرا تو اُس نے بیئر کا آرڈر دیا۔ کچھ دیر بعد بیرا پھر پاس سے گذرا تو وہ زور سے چیخا "میں نے ایک بیئر کا آرڈر دیا تھا" اس کا سگریٹ کہیں میز کے نیچے گر گیا وہ اُسے ڈھونڈنے لگا۔ ساتھ ساتھ بڑبڑانے بھی لگا۔ اتنے میں ڈورمین آیا اور اُس نے کپتان سے کہا کہ "تم اپنی سیٹ پر جا کر آرام سے بیٹھو، تم نے بہت پی لی ہے اب اور نہیں ملے گی" پھر وہ اٹھا جاتے وقت ہنستے ہنستے پھر ہاتھ ملایا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

"۔۔۔۔ میرا باپ بھی فوج میں تھا۔ سارا دن گھر بیٹھا رہتا ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم میں برما گیا تھا۔ اُس نے کئی خوفناک واقعات سنائے تھے۔ اکثر اس کا ایک دوست اسے ملنے آیا کرتا، دونوں فوج میں بہت عرصہ اکٹھے رہے تھے۔ وہ اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ فوج اور جنگ کی باتیں ضرور کرتے۔ آج کل تو فوج کی ملازمت بہت آسان ہو گئی ہے، ڈسپلن بس نام کو ہے مسلسل تین دنوں تک دونوں طرف سے گولوں کی بوچھار ہوتی رہی تھی۔ اگلی پوسٹوں میں سخت ابتری پھیل گئی ہے۔ بہت سے ساتھیوں سے رابطہ کٹ گیا تھا، سپلائی بند ہو گئی تھی۔ اور جب تین دنوں کی مسلسل گولہ باری کے بعد دونوں طرف سے جنگ تھمی تو حاضری لی گئی۔ بہت سے جوان غائب تھے۔ پھر سارے علاقے کا گشت کیا گیا۔ جھاڑیاں۔۔۔۔ ٹانگیں۔ بازو۔۔۔۔۔ گڑھے۔ خون۔۔۔۔ بوٹ۔۔۔۔۔ رائفلیں۔۔۔۔ کھڑیاں۔۔۔۔۔۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ نو بج رہے تھے۔ چلنا چاہئے۔ باہر خاصی ٹھنڈک ہے۔ ایسے موسم میں تو بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ زکام، بخار آسانی سے ہو جاتا ہے۔ پھر پڑے رہو مریض بن کر چارپائی پر۔۔۔۔۔۔ یار یاں۔۔۔۔ یاں یاں۔۔۔۔۔ ایمبولانس ہارٹ اٹیک۔۔۔۔۔۔۔۔ ایکسیڈنٹ۔۔۔۔ خودکشی۔۔۔۔۔ لڑائی جھگڑا۔۔۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔۔۔ "بس سٹاپ نزدیک ہی ہے مگر ابھی تو بس آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں" وہ رُکا۔ پھر چل دیا۔

آج ڈیوڑھی کا بلب روشن نہیں ہوا اُسے کسی نے جلایا ہی نہیں۔ یہ تو فیوز ہے۔ اُس نے چابی گھمائی۔ اندھیرے میں پوسٹ بکس میں ہاتھ ڈالا پھر خالی ہاتھ باہر نکال لیا۔ ایک تو یہ سیڑھیاں بعض اوقات اتنی لمبی ہو جاتی ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اُس نے اخبار اٹھایا۔ اخبار کی قیمت میں خصوصی رعایت کا اشتہار تھا۔

اُس نے کمرے کی بتی روشن کی۔ کپڑے تبدیل کئے اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ قریب رکھے ہوئے لیمپ کو جلایا، گھڑی کو چابی دی، الارم فکس کیا۔ پھر بستر پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

وہ بہت تھکا ہوا تھا، اخبار پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگا۔ پھر سو گیا۔ چار بجے جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ تو اخبار پڑھتے پڑھتے ہی سو گیا تھا۔ اخبار وہیں بستر پر پڑا تھا۔ اُس نے لیمپ بجھا دیا پھر خراٹے لینے لگا۔

وہ صبح جب گھر سے نکلا تو جہاز جانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اُس نے ٹیکسی لی۔ ٹیکسی ڈرائیور کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا مگر اُسے ایرپورٹ جانے والی سڑک ہی نہیں مل رہی تھی۔ پھر ایک دم اسے ایرپورٹ نظر آیا۔ اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں پیسے تھمائے اور جہاز کی طرف دوڑا، مگر جہاز کی سیڑھیاں اتار لی گئی تھیں اور دروازے بند ہو چکے تھے۔ وہ زور زور سے چلانے لگا "ٹھہرو ٹھہرو مجھے جانا ہے" اتنے میں جہاز کے چلنے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے ہاتھ بڑھایا اور گھڑی کا الارم بند کر دیا۔ ❁

بقیہ صفحہ ۲۰ جیل کی یاری

"نہیں! ہیرو ولن بھی ہو سکتا ہے اور ولن ہیرو ہو سکتا ہے"۔ آثار پھر بحث کے شروع ہو گئے مجھے آپ کو بحث نہیں وہ کہانی سنانا تھی جو یوم مئی کو شروع ہوئی تھی اور ابھی تک جاری ہے۔ ❁

نوید امجد

C/O, SYED MUJAHID ALI, EDITOR 'KARWAN'
P.O. BOX NO. 166. SENTRUM. 0102. OSLO-1.
(NORWAY)

کاغذ کی ناؤ

میری ڈائری میں صرف ایک ورق ہے پہلی نظر میں تو یہ ورق بالکل کورا دکھتا ہے۔ مگر یہ کورا ہے نہیں۔

میں اس ورق کو تنہائی میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ پہلی نظر میں مجھے بھی یہ کورا ہی دکھائی دیتا ہے مگر وہ صرف ایک لمحہ ہوتا ہے۔ شاید میں لمحہ کو غلط معنوں میں استعمال کر گیا ہوں۔

آپ یوں سمجھ لیں آنکھ جھپکنے میں جتنا وقت لگ سکتا ہے بالکل اتنے وقت کے لئے یہ ورق کورا دکھائی دیتا ہے — پھر اُس کے بعد یہ ورق کورا نہیں رہتا۔

سب سے پہلے اس پر دو بڑی بڑی نیلی آنکھیں اُبھر آتی ہیں اور ان آنکھوں کا پلکیں جھپکنا تو ایسے دِکھتا ہے جیسے رات اور دن گلے مل رہے ہوں پھر یہ آنکھیں برسنا شروع ہو جاتی ہیں۔

ٹپ ٹپ

ٹپ۔ ٹپ

قطرے موتیوں کی مانند ورق پر گرتے ہیں اور پگھل کر تحریر کی شکل بن جاتے ہیں۔

"ابھی میں کوزے میں بھرے شفاف پانی کی مانند ہوں کوزہ گر مجھ میں جیسا رنگ ڈالے گا میری رنگت تو وہی ہو گی" اس تحریر کو پڑھ کر میں کانپ جاتا ہوں اور وہ واقعہ میری نگاہوں کے سامنے رینگنے لگتا ہے۔ جس کے پس منظر میں مجھے یہ تحریر ملی تھی جو ابھی میں نے اوپر رقم کی ہے۔

وہ اگست کا پہلا اتوار تھا۔ گلاب کی ٹہنیوں سے پھول جھڑنا شروع ہو چکے تھے۔ اور رنگ بھری تتلیوں نے ہوا میں تیرنا شروع کر دیا تھا۔

اوسلو کا موسم ہمیشہ کی طرح غیر یقینی تھا۔ خاکستری رنگ کے گہرے بادل سورج کو اپنی آغوش میں لیے اونگھنے لگ جاتے تو وہ کسی شرارتی بچے کی مانند چپکے سے اُن کی آغوش سے باہر نکل آتا۔ اور دھوپ خلا سے زینہ زینہ اترتی زمین پر بسنے والوں سے لپٹ جاتی۔

گرمی — گرمی — !!

اُف بہت گرمی ہے۔

لوگ چیخ اٹھتے۔

تو اونگھتے ہوئے بادل ایک طویل انگڑائی لے کر جاگ پڑتے قہر بھری نظروں سے سورج کو دیکھتے اور پھر سے اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیتے۔ تب سردی کا احساس شدید ہو جاتا اور پہاڑوں سے آنے والی ہوائیں بدن میں سُوئیوں کی مانند چبھتی محسوس ہوتیں۔

سورج بادلوں کے ساتھ گذشتہ دو ہفتوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اور رنگ بھری تتلیاں سبز پتوں پر محوِ رقص تھیں ہر اتوار کی طرح اُس روز بھی شہر پر اُداسی کے سائے منڈلا رہے تھے اور لوگوں کے چہرے تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ کارل یوہان گھاٹا جو موسم گرما میں رنگ بھرے لبادوں کے شوخ رنگوں میں ڈوبا رہتا تھا اُس روز بہت اُداس نظر آ رہا تھا۔ بس اِکا دُکا لوگ ہی چہل قدمی میں مصروف تھے۔

میں نے ہفتے کی رات دیر تک دوستوں کے ساتھ گذاری۔ اتوار کو کام سے چھٹی تھی خیال تھا کہ سارا دن سو کر گزاروں گا مگر چرچ کی گھنٹیاں صبح دس بجے سے بجنا شروع ہو گئیں۔

ٹن — ٹن — ٹن — میری آنکھ کھل گئی۔

پانچ منٹ تک آوازوں کا شدید پتھراؤ ہوتا رہا۔ میں منہ کو رضائی میں چھپائے سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا مگر پتھراؤ اپنی تمام شدت کے ساتھ جاری رہا۔ پانچ منٹ کے پتھراؤ کے بعد ایک سخت خاموشی چھا گئی میں نے اٹھ کر ایک گلاس پانی پیا اور رضائی کو اچھی طرح جسم پر لپیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند نے ابھی پلکوں کا پہلا بوسہ لیا ہی تھا کہ آوازوں کا پتھراؤ پھر سے شروع ہو گیا۔

ٹن — ٹن — ٹن —

پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ آدھ گھنٹہ موت کی سی خاموشی
کے بعد پھر اُوپر سے شروع ہو گیا۔

ٹن ـــ ٹن ـــ ٹن

دن کے بارہ بج گئے

مجھے سونے کے خیال سے وحشت محسوس ہونے لگی اور میں کپڑے
تبدیل کر کے باہر نکل گیا۔ ایک گھنٹہ شہر کی خالی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے
کے بعد اچانک ذہن میں فروگنز پارک کا خیال آیا تو میں کارل یوہان کی
طرف چل پڑا اور ٹہلتا ہوا نیشنل تھیٹر کے قریب دو نمبر ٹرام کے سٹاپ
پر رک گیا سورج کی ٹکیا اپنی تمام تر حدت کے ساتھ خلا میں روشن تھی اور
بادل اُس کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔

اسلوٹس پارک SLOTTS PARKEN میں منشیات کی خرید و فروخت
معمول کے مطابق ہو رہی تھی۔ اُن سے ذرا پرے شاہی محل کے سامنے دو
گارڈ کالے رنگ کی وردیاں پہنے بندوقیں کندھوں سے لگائے بُت بنے
کھڑے تھے ٹھیک ایک بج کر گیارہ منٹ پر دو نمبر ٹرام آئی اور میں اُس میں
سوار ہو گیا۔ ٹرام میں تین بوڑھے مرد اور کچھ ادھیڑ عمر عورتوں کے علاوہ
کچھ بچے اور نوجوان کالے رنگ کی سیٹوں میں سمائے ہوئے تھے۔

نیلے رنگ کی ٹرام تھکے ہوئے بیلوں کی مانند چل رہی تھی۔ میرے پیچھے
کی سیٹ پر ادھیڑ عمر کا جوڑا غیر ملکیوں کے متعلق مسلسل بولے جا رہا تھا۔

غیر ملکیوں کو اب ہمارا ملک چھوڑ دینا چاہئے۔

ناروے میں بے روزگاری کی اصل وجہ یہ غیر ملکی ہی تو ہیں۔

جرمنی اور فرانس کی طرح ہمیں بھی ان کا ریٹ مقرر کر دینا چاہئے۔

پچیس ہزار کراؤن فی غیر ملکی۔

نہیں بیس ہزار

ہاں ٹھیک ہے۔ بیس ہزار کراؤن فی غیر ملکی۔

توبہ ان کے کالے بال دیکھ دیکھ کر اب تو میں عاجز آ چکی ہوں۔

حکومت کو چاہئے کہ کسی صورت ان کالے شیطانوں کو ملک سے نکال دے

اس قسم کی گفتگو جب سے میں ٹرام میں سوار ہوا تھا جاری تھی۔ وہ
بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے مگر میں سب سن رہا تھا۔

ان کی گفتگو سن کر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ کبھی جی میں آتا ایک زوردار
قہقہہ لگاؤں۔ اتنا زوردار کہ یہ ٹرام جہاز بن کر اڑ جائے۔

بھلا کوئی اُن سے پوچھے کہ آپ لوگوں کو کیا تکلیف پہنچی ہے۔

غیر ملکیوں کو ملک سے نکال دو!

ان کا ریٹ مقرر کر دو!

جیسے غیر ملکی انسان نہ ہوں منڈی کی کوئی جنس ہوں جیسے آلو یا
ٹماٹر۔ گوبھی یا مولے ـــ

یہ سبزیاں اور پھل کہاں سے آتے ہیں؟ اب واقعی مجھے اُن پر غصہ
آنا شروع ہو گیا تھا جی میں آیا انہیں اٹھا کر ٹرام سے باہر پھینک دوں۔
مگر ان کا بڑھاپا میرے سامنے ہاتھ جوڑے سسک رہا تھا کہ میں خاموش رہا
ویسے بھی اگلے اسٹاپ پر اُترنا تھا۔ میں نے سیٹ کے اوپر لگے کالے رنگ
کے بٹن کو دبا دیا ٹرام میں لگی لال رنگ کی دونوں بتیاں روشن ہوئیں
اور ٹرام رینگتی ہوئی ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ چند لوگ
ٹرام سے اتر آئے اُن سب کا رُخ فروگنز پارک کی طرف تھا۔ پارک
میں لوگوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ کچھ غیر ملکی سیاح گلے میں کیمرے لٹکائے
مجسموں کو دیکھ رہے تھے۔ میں چہل قدمی کرتا پارک کے وسط میں موجود
حوض کے کنارے بیٹھ گیا حوض کے منڈل کی منڈیر پر تھوڑے تھوڑے
فاصلے پر انسانی مجسمے ایستادہ تھے اور حوض کے بیچ جو مجسمہ نصب تھا
اُس میں پانچ مرد ایک بہت بڑی رکابی ہاتھوں میں اٹھائے کھڑے تھے رکابی
کے دہن سے پانی اڑ اڑ کر حوض میں گر رہا تھا پانی گرنے کی آواز میں جھرنے
کا سا ترنم تھا۔

میں نے آنکھیں موند لیں۔ ادھیڑ عمر کا جوڑا ابھی تک میری آنکھوں
کی پتلیوں پر لٹکا ہوا تھا۔

بیس ہزار کراؤن فی غیر ملکی۔

اچانک ٹھنڈے پانی کے چھینٹے میرے چہرے پر گرے میں نے گھبرا کر
آنکھیں کھول دیں۔ ادھیڑ عمر کا جوڑا پانی کے چھینٹوں میں کہیں بہہ گیا تھا۔
میرے سامنے چار یا پانچ برس کا بچہ کھڑا تھا۔ جس کا جسم کپڑوں سے مکمل طور
پر آزاد تھا اُس کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں پر پلکوں کا جال یوں ہل رہا تھا
جیسے رات اور دن گلے مل رہے ہوں۔

ہائے ـــ

اُس نے مجھے آنکھیں کھولتے دیکھا تو کہا۔

ہائے ـــ

میں مسکرا دیا

کیا یہ میرا پاگل پن تھا جو میں نے تم پر پانی پھینکا

میرے خیال میں تو اچھا ہوا۔ میں تو تقریباً سوچ چکا تھا ایک جن اور
چڑیل مجھے خواب میں پریشان کر رہے تھے۔

واقعی ـــــ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

ہاں ـــــ! مگر اب تو وہ بھاگ گئے ہیں۔ اگر تم نہ آتے تو وہ نجانے کتنی دیر اور مجھے پریشان کرتے۔

میری بات سن کر اُس نے خوشی سے نعرہ لگایا اور حوض میں ناچنے لگا۔ تھوڑی دیر یوں ہی ناچنے کے بعد وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔

اُسے قریب دیکھ کر مجھے میرا بچپن شدّت سے یاد آنے لگا۔ ساون کے مہینے میں جب مینہ برستا تو ہمیں کاغذ کی ناؤ سے کھیلنا بہت اچھا لگتا۔ میرا جی اُس کو کاغذ کی ناؤ بنا کر دینے کو چاہا۔ میں نے اپنے چاروں اور دیکھا مگر کاغذ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ اچانک مجھے تھیلے میں رکھی ڈائری کا خیال آیا۔ میں نے تھیلے سے ڈائری نکالی ایک ورق پھاڑا اور اس کی ناؤ بنا کر پانی میں بہا دی یہ تمہارے لیے ہے۔!

آ ہا! ـــــ یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ وہ ناؤ سے کھیلتا ہوا بولا میں مسکرا دیا اور پارک میں چہل قدمی کرتے لوگوں کو دیکھنے لگ گیا یہ تو خراب ہو گئی ـــــ

تھوڑی دیر بعد وہ نم آلود کاغذ لیے میرے سامنے آکھڑا ہوا اُس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں پکڑا کاغذ لیے ہاتھوں میں لیا تو وہ مسک گیا۔ میں نے ڈائری سے ایک اور ورق پھاڑا اس کی ناؤ بنائی اور پانی میں بہا دی۔

تم بہت اچھے ہو۔ اُس نے مجھے مشکور نگاہوں سے دیکھا اور ناؤ سے کھیلنے لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ناؤ بھی خراب ہو گئی تو میں نے نئی بنا دی۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا اور مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میری زندگی کے انمول واقعات جو اُس ڈائری میں رقم تھے میرے لمحوں کے عشق کی بھینٹ چڑھتے جا رہے ہیں۔

وہ بہت خوش تھا اور عجیب و غریب آوازیں نکال کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز سن کر وہ بچہ چونک گیا۔ مورٹن آواز پھر سے اُبھری تو وہ ناؤ ہاتھ میں پکڑے جس طرف سے آوازیں آ رہی تھیں اُس سمت بھاگ گیا اس کے بھاگنے سے ناؤ کھل گئی تھی۔ میری نظریں اُس کی پیٹھ پر جم کر رہ گئیں۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک ورق لہرا رہا تھا۔ وہ پھولوں کی کیاریوں کے پاس کھڑی ایک نوجوان عورت کے قریب جا کر رُک گیا۔ وہ عورت اُس پر جھک گئی۔ اور اُس کا بازو پکڑے اسی پر دیر تک جھکی رہی۔ کہیں مورٹن بھاگنے کی کوشش کرتا تو اُس کی گرفت اور مضبوط ہو جاتی۔ آخر اُس نے مورٹن کو چھوڑ دیا۔

وہ بھاگتا ہوا میرے ہی قریب آ رہا تھا پھر وہ میرے قریب آکے رک گیا

میں نہیں کھیلتا تمہارے ساتھ!

اُس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا ورق میری طرف اچھال دیا۔

کیوں ـــــ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

ماں کہتی ہے تمہارے ساتھ نہ کھیلوں تم گندے ہو ـ پاکس ہو۔ تم کالے شیطان ہو ـــــ

میں نہیں کھیلتا تمہارے ساتھ اگر اُس نے مجھے نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور پھولوں کی کیاریوں کے پاس کھڑی عورت کی طرف بھاگ گیا۔

پاکس کی گونج میرے چاروں اور بکھر گئی اور میں سوچنے لگا۔ کیا میں گندہ ہوں۔ میری گود میں پڑا کورا ورق پھڑپھڑایا۔ میں نے اس کورے ورق کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُسے غور سے دیکھا تو اُس کورے ورق پر ایک تحریر رقم ہونا شروع ہو گئی۔

ابھی میں کوزے میں بھرے شفاف پانی کی مانند ہوں۔ کوزہ گر مجھ میں جیسا رنگ ڈالے گا میری رنگت تو وہی ہو گی۔

یہ تحریر پڑھ کر میں کانپ گیا۔ ❋

بقیہ صفحہ ۳۰ دوسرا رُخ

مختلف ہے۔ ایک طرف تو وہ عورت کی آزادی کا نعرہ لگاتے ہیں تو دوسری طرف اُسی عورت کو بے بس اور حقیر بھی سمجھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اُسے اپنے وطن سے پیار نہیں تھا۔ اسے تو صرف ان سوئے ہوئے لوگوں کو جگانا تھا، جو جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے ہی بنائے ہوئے فرسودہ رسومات کے اسیر ہیں کہ وہ ان سے آزاد ہونا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ صبح وہ آنیا کو فون کرے گی کہ وہ انٹرویو کے لیے تیار ہے۔ اسے جیسے ایک یقین سا ہو چلا تھا کہ اس کا انٹرویو کوئی انقلاب نہ لائے گا مگر لوگوں پر اثر انداز ضرور ہو گا، ممکن ہے کہ اس کی آواز سے آواز ملانے والے کوئی تحریک بن جائیں اور پھر......

اور اب تو عائشہ کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے آج ہی اپنی زندگی کا آغاز کیا ہے۔ ❋

قاضی انصار

میں بھی اک روز مر کے دیکھوں گا
یہ بھی بہروپ بھر کے دیکھوں گا

غالباً کچھ ملے گی پھر تحریک
خواب شمس و قمر کے دیکھوں گا

کوئی آواز دے رہا ہے مجھے!
پھر کسی دن ٹھہر کے دیکھوں گا

چھت ٹپکنے سے گر ملی مہلت
نقش دیوار و در کے دیکھوں گا

کچھ جنوں میں کمی نہیں آئی
زخم کب اپنے سر کے دیکھوں گا

● قاضی پورہ، کھنڈوا (ایم پی)

سرفراز شاکر

کہانی جو بچپن میں کہتی تھی دادی
وہی آج میں نے تمہیں بھی سنادی

گلے مل کے ناچے ہے مٹی سے اکثر
ہے بیباک کیسی ہوا سیدھی سادی

جدھر جائیگی وہ اُدھر جاؤں گا میں
ہواؤں کے ہاتھوں میں کشتی تھمادی

سمندر کو میں نے تو پتھر سے مارا
مگر موج تھی بے حیا مسکرادی

مرے گھر میں اک ننھے بچے نے آکر
مجھے میرے بچپن کی صورت دکھادی

● سوانگی گیٹ، منگلیوں کی گلی، جودھپور

سیفی سرونجی

نہیں میں لائق علم و ہنر مگر لکھدے
مرے خدا مری تقدیر میں ہنر لکھدے

چلے گا جھوٹ ترا کب تلک زمانے میں
غزل میں اپنی کوئی شعر معتبر لکھدے

ہر ایک پل وہ ترے ساتھ ساتھ رہتا ہے
اسی کا نام محبت ہے بے خطر لکھدے

کہاں تلک میں رہوں شہر شہر آوارہ
مرے نصیب میں یارب کوئی تو گھر لکھدے

عظیم شخص ہے سیفی مری نظر میں وہ
جو اپنی زندگی دشمن کے نام پر لکھدے

● گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول، لیڑی، وودیشہ

عامر برقی اعظمی

نرگس نواز حسن و شعور وبیاں کی ہے
یعنی جناب آج بھی دنیا فغاں کی ہے

دنیا کہیں قفس کی کہیں آشیاں کی ہے
جلوے اسیر برق ہیں، یہ آسماں کی ہے

انسان درد شوق میں رکھتا کہاں کی ہے؟
یہ بات بھی حضور کسی بے زباں کی ہے

فطرت یہ اپنی کشتیٔ عمر رواں کی ہے
منزل کہیں ہے بات مگر کارواں کی ہے

رنگین میکدہ ہے، مے پُرزیاں کی ہے
یہ داستاں بھی آہ دلِ ناتواں کی ہے

● جے اے ایف۔۲۲۔ایل آئی جی، جی۔
۸ ایریا، مایا پوری، ہری نگر، نئی دہلی۔۶۴

آفاق فاخری

چہرہ شاداب، دل اُداس لگے
بیچ دریا میں بھی پیاس لگے

شاہراہوں کا قتل بھی اکثر
ایک دلچسپ سا قیاس لگے

صفحۂ زندگی پہ اب ہر شخص
جیسے تصویرِ التماس لگے

زندگی کی ہر ایک سچائی
فکر و فن کی مرے اساس لگے

جتنے تھے میرے قتل میں فاخر
سب مجھے اپنے روشناس لگے

● جلال پور ضلع فیض آباد (یوپی)

ملک زادہ جاوید

تمہارے بارے میں سوچا بہت ہے
محبت کے لئے اتنا بہت ہے

میں عالمگیر ہوں اپنی صدی کا
مجھے تاریخ سے شکوہ بہت ہے

بزرگوں سے کہو اب رحم فرمائیں
ہماری نسل پر قرضا بہت ہے

ہو تم شوق سے آئینہ لیکن
ہمارے پاس بھی چہرا بہت ہے

بھلا جاوید پر مت طنز کرنا
وہ شاعر ہو کے بھی سچا بہت ہے

● پروفیسرس فلیٹس، بابو گنج، فیض آباد روڈ، لکھنؤ

علی اصغر شاہد
C/O, SYED MUJAHID ALI, EDITOR 'KARWAN'
P.O. BOX NO. 166, SENTRUM. 0102. OSLO-1.
(NORWAY)

احساس کا سفر

سات بج کر اٹھائیس منٹ والی ٹرین اس نے مشکل ہی سے پکڑی تھی اُف خدایا! آج اگر لیٹ ہو جاتا تو بوڑھے فورمین کی بک بک ضرور سننی پڑتی۔

یہ سوچتے ہوئے اُس نے سامنے والی سیٹ پر اپنے آپ کو دھڑام سے گرا دیا۔ اور اکھڑی ہوئی سانسیں درست کرنے لگا۔

ٹرین میں اس وقت اکا دُکا مسافر ہی تھے جو پچھلے اور آخری اسٹیشن سے آ رہے تھے۔ ٹرین اُس وقت پوری رفتار سے چل پڑی تھی۔

اوسلو سے باہر وہ ایک چھوٹے سے قصبے سے ہر روز دو گھنٹے کا سفر اُسی ٹرین سے کر کے فیکٹری پہنچتا تھا۔ دو گھنٹے کام پر جاتے ہوئے اور دو گھنٹے گھر واپسی کا یہ سفر اُسے ایسا لگتا جیسے لمحے صدیاں بن گئے ہوں۔

اُس نے دل میں سوچا کہ اتنے لمبے سفر میں کوئی دوست ساتھ نہ ہو یا کوئی کتاب رسالہ پاس نہ ہو تو یہ سفر گذرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دوست؟ دوست تو اُس دُور دراز علاقہ میں ویسے بھی ملنا مشکل تھے کیوں کہ اس علاقہ میں غیر ملکی کم ہی رہتے تھے۔ اور نارویجنوں سے دوستی کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔

اور کتاب رسالہ؟ آج جلدی میں وہ کتاب رسالہ اٹھانا بھی بھول گیا تھا وقت گذاری کے لئے اُس نے یوں ہی ٹرین میں لگے مختلف اشتہاروں پر نظر دوڑائی۔ کوکا کولہ فیکٹری جس میں وہ گذشتہ پانچ سال سے کام کر رہا تھا کا اشتہار بھی تھا، لکھا تھا۔

HAVE A COKE AND A SMILE اُس کے ساتھ ہی ایک اخبار کا اشتہار تھا۔ لکھا تھا "KLASSEKAMPEN FOR BALANSENS SKYLD" طبقاتی جنگ۔ مساوات و برابری کے لئے۔

دوسری طرف ایک اور اخبار کا اشتہار تھا لکھا تھا VERDENS GANG دنیا کا سب سے بڑا اخبار (نارویجن میں) یہی الفاظ کئی زبانوں میں لکھے ہوئے تھے۔ اس اخبار کے اشتہار کو پڑھ کر وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگا۔ دراصل اُسے ایک روز پہلے کا وہ ٹی وی پروگرام یاد آ گیا تھا جس میں ٹی وی رپورٹر نے اس اخبار کے تمام اخباروں سے بڑا ہونے کے بارے میں مختلف اخبارات کے مدیران سے تبصرہ کرنے کو کہا تھا۔ اور ایک مدیر نے کہا تھا کہ "مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ناروے میں پڑھے لکھے اَن پڑھوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے"۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے منزل کی طرف رواں دواں تھی اشتہاروں سے اکتا کر اُس نے ٹرین میں موجود مسافروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اچانک اُس نے محسوس کیا کہ ٹرین میں موجود ساری سیٹیں پُر ہیں۔ سوائے اُن کے کہ جو اُس کے سامنے اور ساتھ والی ہیں۔ کچھ لوگ ان سیٹوں پر بیٹھنے کی بجائے کھڑے تھے۔ اُن میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت دروازے میں کھڑی کبھی شیشے سے باہر دیکھتی اور کبھی کلائی پہ بندھی گھڑی پر نظریں گاڑ دیتی۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی اخبار پھیلائے ڈنڈے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دو نوجوان لڑکیاں آپس میں قہقہے لگا رہی تھیں۔ ایک ساٹھ پینسٹھ برس کا بوڑھا اپنی ہٹلر نما مونچھوں پر بار بار شہادت کی انگلی پھیر رہا تھا۔ اور پاس کھڑے ایک نوجوان سے سرگوشیاں بھی کر رہا تھا۔

اُس نے محسوس کیا کہ بوڑھا کبھی اس کے کالے بالوں کو دیکھتا ہے کبھی خالی سیٹوں کو اور پھر ساری ٹرین میں دور تک دیکھ کر جب حدِ نظر تک کوئی خالی سیٹ نظر نہ آئی تو وہ دوبارہ نوجوان سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔

اُس نے سوچا شاید یہ بوڑھا یہاں پر بیٹھنا چاہتا ہے لیکن ان ساری سیٹوں پر میرے کالے وجود کو بچھا محسوس کر رہا ہے۔

اگلے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو اور بہت سے لوگ ٹرین میں سوار ہو گئے پر اگلے اور اس سے اگلے اسٹیشن پر سے بہت سے لوگ سوار ہوئے لیکن اس کے سامنے کی اور ساتھ والی سیٹیں خالی رہیں۔

احساس اور فکر یہ دو الفاظ اس کے ذہن میں گھومنے لگے۔ آدمی

نہ محسوس کرے نہ سوچے اور نہ فکر کرے تو زندگی میں پیش آنے والے بے شمار
حادثات و واقعات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جوں ہی آدمی چھوٹے چھوٹے
حادثات و واقعات کو محسوس کرکے سوچنا شروع کرتا ہے تو بڑے بڑے
حادثات و واقعات کے پسِ منظر سے واقفیت ہونے لگتی ہے اور ان
کی بنیاد کا پتہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔

اس نے سوچا۔ نہ جانے کتنی بار میں بھی اسی طرح کتاب یا رسالے
میں گم ٹرین کا یہ سفر کر چکا ہوں اور اس بات کا کبھی بھی احساس نہیں کیا
کہ میرے ساتھ والی سیٹ خالی کیوں ہے؟ اور جگہ ہونے کے باوجود
یہ سب لوگ کھڑے کیوں ہیں؟

جانے کیوں اُسے وہ واقعہ جو اگلے ہی روز اُسے ایک جاننے والے
نے سنایا تھا شدت سے یاد آگیا۔

اس نے بتایا تھا کہ میں آخری ٹرین سے سفر کر رہا تھا کہ راستے میں
ایک اسٹیشن سے ایک نارویجن ٹرین میں سوار ہوا اور میرے سامنے والی
سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں اس وقت اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک نظر
اُسے بھی دیکھا اور دوبارہ اخبار میں گم ہو گیا۔ چند لمحوں بعد کنڈکٹر نئے
سوار ہونے والوں کے پاس آکر ٹکٹ بیچنے لگا۔ جب اس نارویجن کی
باری آئی تو اُس نے ٹکٹ خریدنے سے انکار کر دیا۔ اور کہنے لگا "پہلے
اس پاکستانی کو ٹرین سے اُتارو۔ ویسے میں تو کہتا ہوں کہ ان کو اس
ملک ہی سے نکال دیا جائے لیکن اس وقت اتنا ہی کافی ہے کہ اُسے ٹرین
سے اُتارا جائے۔ یہ لوگ ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ جاؤ۔
اوسلو شہر میں جاکر دیکھو ہر طرف یہی لوگ چھا رہے ہیں۔ سارا شہر خرید
رہے ہیں۔ نئے یہودی ہیں۔ یہ سنئے ...." "لیکن ..... تم ......
ٹکٹ ....." کنڈکٹر نے لب کھولنا چاہے۔ مگر وہ اس کی ایک نہیں
سن رہا تھا مسلسل بولے جا رہا تھا۔

اب یہ ہماری اسمبلیوں میں پہنچ رہے ہیں۔ اپنے ملک میں تو انہیں
ووٹ کا حق نہیں اور ہمارے فیصلے کریں گے۔ کل ان میں سے کوئی
ہمارا وزیراعظم بھی بن جائے گا۔

کنڈکٹر اُسے ہکا بکا دیکھ رہا تھا۔ تمام مسافروں کی نظریں کبھی
اس اول فول بکنے والے نارویجن کی طرف جاتیں اور کبھی وہ میری طرف
نفرت بھری یا ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے اور پھر گردنیں ایسے نیچی
کر لیتے جیسے کچھ بھی تو نہیں دیکھ رہے۔ بہر حال ٹرین سے میں بھی نہیں
اترا۔ اور اُس نے بھی ٹکٹ نہیں خریدا..... ہٹلر نما مونچھوں والا

بوڑھا اب سرگوشیاں چھوڑ کر باقاعدہ بڑبڑا رہا تھا۔ اُس نے غور
سے سننے کی کوشش کی۔ وہ غیر ملکیوں کو گندی گالیاں بک رہا تھا۔

ٹرین کی رفتار بہت سست پڑ گئی تھی۔ لیکن پھر اچانک بہت
تیز ہو گئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اب یہ کبھی نہیں رکے گی۔ اس کے ذہن
کے کئی بند دریچے کھلنے لگے تھے۔ غصے سے وہ کانپنے لگا تھا۔ اسکا چہرہ
سرخ ہو گیا تھا اور ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

وہ تیز تیز سانس لینے لگا۔

سامنے کھڑا نوجوان ہٹلر نما ______ مونچھوں والے بوڑھے کی
طرف پیٹھ کرکے قہقہے لگاتی نوجوان لڑکیوں کی طرف بڑی دلچسپی سے
دیکھنے لگا تھا۔

درمیانی عمر کے آدمی نے اخبار بغل میں دبا لیا تھا اور دروازے
کے سامنے یوں تن کر کھڑا ہو گیا تھا جیسے ابھی ٹرین رکی تو بھاگنا
شروع کر دے گا۔ ادھیڑ عمر کی عورت گھڑی میں وقت دیکھ کر اخبار
والے کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

ٹرین میں موجود دوسرے مسافر جو کھڑے تھے وہ دروازے
کے قریب آنے لگے تھے اور جو بیٹھے تھے انہوں نے سیٹوں کے ہتھے مضبوطی
سے تھام لیے تھے۔

اگرچہ ٹرین کی رفتار کم نہ ہوئی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا منزل آگئی ہے
تمام مسافروں کو اترنا ہے۔ سفر ختم ہو گیا ہے...... لیکن وہ سوچنے لگا
اس کی منزل کب آئے گی؟ اس کا سفر کب ختم ہوگا؟ —

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالانہ
خریداری نومبر ۱۹۸۶ء کے اس شمارے کے ساتھ
ختم ہو چکا ہے۔ ازراہِ کرم آئندہ کے لیے مبلغ ۴۰ روپئے
جلد منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔ امید ہے کہ آپ تجدید خریداری
سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو
وی۔ پی۔ بھیجنے کی ہدایت کریں۔

دلّی اردو اکادمی کی کامیاب کوشش

دہلی۔ ——— دہلی اردو اکادمی نے دارالحکومت دہلی کے مدارس میں اردو ذریعۂ تعلیم کو رائج کرنے کے لیے حکومت ہند اور دہلی انتظامیہ کی جانب سے مقرر کیے گئے طریقے میں مزید کروانے کی جدوجہد میں کامیابی حاصل کرلی ہے جس کے نتیجے میں ایسے کلاسس اور اسکولس میں جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد چھ اور بیس ہو، کلاس اور اسکول میں پڑھانے کا انتظام کردیا گیا ہے۔

تاحال دہلی میونسپل کمیٹی اور میونسپل کارپوریشن کے علاوہ دہلی انتظامیہ کے اسکولوں میں ابھی اردو

چھٹا کا جسم ... پر شروع کیا گیا ہے۔ دہلی اردو اکادمی نے گزشتہ سال سکولوں کے لیے ۴۳ اساتذہ کا تقرر کیا تھا امسال حال ہی میں ۲۰ اساتذہ کا تقرر عمل میں آنے والا ہے۔

اردو قواعد — اشکال اور مسائل

لکھنؤ۔ مقامی اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر کے زیر اہتمام تین روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جامعہ ملیہ کے سابق وائس چانسلر اور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو زبان کی مقبولیت کے لیے ایک جامع اور مکمل قواعد کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا اور دانشوروں کو مشورہ دیا کہ وہ انفرادی طور سے اور اردو اداروں کی مدد سے اس اہم ذمہ داری کو ادا کرسکتے ہیں۔ جلسے کی صدارت لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے کی۔ سینٹر پرموشن آف اردو کی ڈائرکٹر فہمیدہ بیگم نے تفصیلی مقالہ "اردو اسم جمع میں اضافے کا رجحان" پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے بعد جنھوں نے قواعد لکھی ہیں بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔ کئی دانشوروں نے قواعد لکھنے کی کوشش کی مگر اردو کی مکمل اور جامع قواعد کی کمی پوری نہیں ہوئی۔ سینٹر کے پرنسپل ڈاکٹر ایس۔ اے۔ صدیقی نے بتایا کہ دو سطح شکل، پیشتر غیر اردو داں ساتذہ کو تعلیم دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا تاکہ غیر اردو داں میں اردو کو روشناس کرایا جائے اور ایک ایسی جیبی کو فروغ دیا جائے۔

غالب انعامات

غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۸۶ء کے لیے مندرجہ ذیل ادیبوں اور شاعروں کو مندرجہ ذیل انعامات سے نوازا ہے۔

۱۔ فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے تحقیق۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔

۲۔ ایڈلیس غالب ایوارڈ برائے ادبی خدمات بیگم صالحہ عابد حسین۔

۳۔ مودی غالب ایوارڈ برائے اردو شاعری۔ جناب مخمور سعیدی۔

۴۔ مودی غالب ایوارڈ برائے اردو نثر۔ جناب کشمیری لال ذاکر

۵۔ ہم سب غالب ایوارڈ برائے اردو ڈراما ایم۔ ایس۔ ستھیو

۶۔ سلطانیہ کلکشن ایوارڈ برائے اردو صحافت جناب احمد سعید ملیح آبادی

۷۔ ساحر مودی غالب ایوارڈ برائے اردو مزاح۔ جناب احمد جمال پاشا

۸۔ ہیم چند گپتا غالب ایوارڈ برائے خطاطی جناب ابوالجعفر زیدی

شروع کیا پانچ حضرات کو دس دس ہزار اور باقی کو پانچ پانچ ہزار روپے اور سندیں پیش کی جائیں گی۔

خدابخش ۱۹۸۶ء شعری دستاویز

پٹنہ۔ ——— نیاز فتحپوری نے ۱۹۴۳ء میں ۱۹۴۰ء تک کے اہم ترین زندہ غزلگویوں سے ان کی خود نوشت اور اپنا کیا ہوا انتخاب لے کر نگار کا وہ دستاویزی نمبر چھاپا تھا جو پچھلے سال خدابخش لائبریری نے اٹھتے شعراء کی اس عہد کی تصویر اور اس عہد تک اپنے ہاتھ کی تحریر شامل کرکے از سر نو غزل گو ۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز کے نام سے شائع کردیا۔ اب خدابخش لائبریری کی طرف سے اس کا دوسرا حصہ زیر ترتیب ہے جو دسمبر کے آخر تک چھپ کر جنوری میں شائع ہوجائے گا۔ اس میں ۱۹۴۱ء تا ۱۹۸۶ء کے غزل گو اور نظم گو شعراء دونوں کا اپنا کیا ہوا انتخاب کلام اور اپنی لکھی ہوئی مختصر خود نوشت کے ساتھ ساتھ ایک تصویر اور ایک ان کی اپنی تحریر کا عکس بھی شامل کیا جارہا ہے۔ نیاز کی اسکیم میں ۴۳ شاعر شامل تھے۔ ۱۹۸۶ء دستاویز میں ۲۴۳ شعرا شامل کیے جائیں گے لیکن ابھی تک چند جگہوں سے شاعرانہ تجاہل یا تغافل یا تفاخر کے تحت کوئی مثبت اقدام نہیں ہے

اقبال اعزاز جناب سردار جعفری کو پیش کیا گیا

بھوپال۔ ——— ستائیس بھارت بھون میں مدھیہ پردیش سرکار کی جانب سے اعلان کردہ پہلے اقبال اعزاز کی توصیفی سند اور ایک لاکھ روپے کی رقم کا چیک وزیر اعلیٰ شری موتی لال ووہرا کے ذریعہ جناب علی سردار جعفری کو پیش کیا گیا۔

اپنی صدارتی تقریر میں وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اردو ہندوستان کی نہایت شیریں اور قابل فخر زبان ہے اور علامہ اقبال نے اپنے کلام سے ہندوستان کے عوام کو اتحاد اور حب الوطنی کا جذبہ عطا کیا۔

اقبال اعزاز قبول کرنے کے بعد جناب علی سردار جعفری نے شکریہ ادا کرتے ہوئے قومی یکجہتی اور حب الوطنی سے متعلق اقبال کے نظریات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔

اعزازی تقریب کے بعد اقبال ادبی مرکز کے زیر اہتمام اقبال سیمینار کا افتتاح وزیر اعلیٰ شری موتی لال ووہرا نے کیا۔

کتب و رسائل

○ عکس در عکس۔ شاہد ساگری کا ستمی مجموعہ تصنیفات۔ ڈیمائی سائز، عمدہ طباعت، خوشنما گرد وپوش، قیمت چالیس روپے۔ رابطہ: بھوپال بک ہاؤس، مدھوارہ، بھوپال۔۱

○ لندن کی آخری رات: پروفیسر شکیل الرحمن کا ایک خوب صورت سفرنامہ، مغربی تمدن کے زوال کی وہ کہانی جو مسافر کے تجربوں میں شامل ہوئی۔ قیمت تیس روپے۔ پتہ: عصمت پبلی کیشنز، پروفیسر کوارٹرز کشمیر یونیورسٹی سری نگر، کشمیر۔

○ طیب: (ماہنامہ) مرکز علم دیوبند کا دینی، علمی و تحقیقی ماہنامہ شخصیت شاہ نمبر شائع کیا ہے۔ یہ خصوصی نمبر مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی ملی، دینی، تحریری، علمی اور صحافتی خدمات کا ایک مبسوط جائزہ۔ صفحات ۲۴۴ قیمت دس روپے۔ رابطہ: مدیر ماہنامہ طیب دیوبند ۲۴۷۵۵۴

○ ماشاء اللہ۔ نوجوان ادیبہ جلیلہ فردوس کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا اولین مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔ قیمت پندرہ روپے۔ پتہ: بیشارت پبلی کیشنز، اسلم چوک، گلبرگہ، کرناٹک۔

○ اوراق ۱ (ماہنامہ) ۱۹۸۶ء کا ایک منفرد ادبی تحفہ جو معیاری ادب کے قارئین کی تشنگی کو سیراب کرے گا۔ ۴۸۰ صفحات کے اس ضخیم خاص نمبر میں پہلا ورق کے ساتھ ۲ حمدیں، ۳ نعتیں، ۹ ہائیکوز، دو لمبے گیت، لسانیات رفتگاں، ۵ مضامین، گوشۂ انس معین، ۴۴ شعراء کی نظمیں، ۱۶ افسانے، ۸ انشائیے، ۳ طنزیہ ومزاحیہ، ۸ غزلیں، ۷ کتابوں پر تفصیلی تبصرے، ایک طویل انگریزی نظم کا ترجمہ، ساقی فاروقی کا خط اور غزل، آپس کی باتیں کے تحت ۳۴ مختصر وطویل خطوط پاک و ہند کے قلم کاروں کے تحریر کیے ہوئے۔ ۵ کتابوں پر ۵ "ہم سفر" کے تبصرے اور استطاریہ کے تحت ۵ قلم کاروں کی تخلیقات۔ مدیران: وزیر آغا اور سجاد نقوی۔ قیمت چالیس روپے۔ پتہ: اوراق چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان)

○ گونج: جدید افسانے میں تخلیقی بات کرنے والے چند ایک افسانہ نگاروں میں سے ایک معتبر نام اکرام بگ کا بھی ہے جنہوں نے افسانے میں ہیئتی تجربے کیے ہیں اور ہو رہا ہے۔ ان کا اولین افسانوی مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔ صفحات ۱۰۷، قیمت ۳۰ روپے۔ پتہ سلامتی پبلی کیشنز بی بی مسجد، مومن پورہ، گلبرگہ ۵۸۵۱۰۴ کرناٹک

○ ذکر رفتگاں: معروف ادیب و نقاد محمد ایوب واقف نے بعض اہم مشاہیر پر گاہے گاہے جو خاکے تحریر کیے تھے انہیں شائع کر دیا گیا ہے۔ شخصیت نگاری کے باب میں ایک اہم کتاب کا اضافہ۔ کتاب میں بیس خاکے شامل کیے گئے ہیں۔ معیاری کتابت وطباعت، صفحات ۲۰۸۔ قیمت چالیس روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی، علی گڈھ، بمبئی۔ انجمن ترقی اردو، راؤز ایوینیو، نئی دہلی۔ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

○ صہبائی ایک مختصر تعارف۔ شیخ امام بخش صہبائی شہید پر ایک مرتب اور مربوط تحقیقی کتاب جو معتبر نقاد محمد انصار اللہ کا گراں قدر کارنامہ ہے۔ کتاب کے آخر میں ماخذ کی فہرست اور مبسوط اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت ساٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ: بیت الابصار، سرسید روڈ سرسید نگر علی گڈھ۔

○ سعادت حسن منٹو [حیات اور کارنامے] ڈاکٹر برج پریمی نے تحقیقی و تنقیدی اسلوب میں منٹو پر ایک قابل مطالعہ کتاب تحریر کی ہے۔ منٹو کے افسانوں پر مشتمل کتابوں کے درمیان اپنی نوعیت کا ایک معیاری کام جو عظیم افسانہ نگار کی شخصیت اور فن کی تفہیم کے لئے ناگزیر ٹھہرے گا۔ صفحات ۳۹۴۔ قیمت ۷۵ روپے۔ تقسیم کار۔ دیپ پبلی کیشنز، "چیتنا" آزاد بستی، نئی پورہ، سری نگر (کشمیر)

○ لہو پکارے گا۔ عصری اردو شاعری میں نہایت ہی سفاک اور تلخ لہجے کو تخلیقی مزاج کا ذریعہ شاعری بنانے والے اندر سروپ دت نادان کا دوسرا شعری مجموعہ غبار رنگ ۱۹۷۹ء جس میں ۸۰ آزاد و پابند نظمیں اور ۳۲ غزلیں شامل ہیں۔ خوبصورت سرورق، دیدہ زیب کتابت وطباعت صفحات ۱۲۸۔ قیمت چالیس روپے۔ پتہ: D/299 پنچ وہار، نئی دہلی ۶۳

○ سورج مکھی۔ بنگلہ دیش کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار شام بارکپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ جس میں ۱۸ افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانے پر ہند و پاک اور بنگلہ دیش سے ۳۰ مقتدر ناقدین کے تاثرات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ صفحات ۱۲۸، قیمت تیس روپے۔ رابطہ: شام بارکپوری، بکر پیلس، کھلنا (بنگلہ دیش)

ترتیب

رحمٰن جامی

علی احمد جلیلی

نظام ہاتف

یوسف جمال

محفل اپنی

سال ۱۹۸۶ء کا یہ آخری شمارہ قارئین کی نذر ہے۔ ۱۹۸۵ء میں شاعر کو آفسیٹ کی طباعت اور متنوع تجربات سے آراستہ کرتے ہوئے ہم نے نہایت ہی حوصلہ مندی کے ساتھ ان خوابوں کو عملی روپ دینے کی سعی کی تھی جو ۱۹۳۰ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی نے دیکھے تھے اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۷ء تک قبلہ اعجاز صدیقی نے ان خوابوں کی رنگ آمیزی کے لیے اپنی پوری زندگی اردو زبان اور شاعر کے لیے وقف کر دی تھی۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۶ء تک شاعر نے قدم قدم پہ تو ثابت کر دیا کہ تیسری نسل اپنے پیش روؤں کی طرح اپنے وطن اور اپنی زبان و ادب کے لیے سرگرم عمل ہے اور آگے ہی آگے جا رہی ہے لیکن ۱۹۸۶ء ہمارے لیے سخت ترین حالات اور کڑے امتحان کا سال ثابت ہوا۔ ہم نے وعدہ کیا تھا اور ہماری خواہش بھی یہی تھی کہ شاعر کو اردو کے اسٹیریو ٹائپ ادبی رسائل کی فرسودہ نہج سے الگ کرتے ہوئے اسے زیادہ وقیع، معیاری مگر دلچسپ عصری اور تازہ کار بنائیں گے۔ ۱۹۸۵ء اپنے وعدوں کے دھنک رنگ شاعر کے صفحات پر سجاتے ہوئے ہم نے ۱۹۸۶ء میں قدم رکھا اور اس آخری شمارے تک کل ۶۲۸ صفحات میں اپنے قارئین کو اتنا کچھ پڑھنے کو دیا کہ دوسرے رسائل اپنی کتنی ضخامت میں اتنا اور ایسا مواد نہیں دے پاتے جو صرف اور صرف "شاعر" ہی کا حصہ ہے۔

شاعر کو آفسیٹ پہ شائع کرتے ہوئے ہمیں ہر سطح پر بڑھتے ہوئے اخراجات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اخراجات کا بڑھنا ناگزیر تھا لیکن اس میں اضافہ روز افزوں ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ ۱۹۸۶ء میں ایک خاص نمبر شائع کریں گے اور کچھ موضوعاتی نوعیت کے شمارے بھی شائع کریں گے لیکن یہ منصوبہ ممکن نہیں ہو سکا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں:۔

اردو کے سب سے بڑے ادبی ماہنامے کا مقدر تو وہی ہے جو اردو کا ہے۔ ہم مایوس تو نہیں، ہماری کوششیں بھی کم نہیں لیکن ہوئے

رونق شہری

قطب سرشار

شاہد ساگری

اسلم حنیف

رہا ہے کہ اُردو زبان وادب کی تمام تر سرگرمیاں ان لوگوں سے وابستہ ہوگئی ہیں جنہیں کچھ معلوم ہی نہیں کہ اُردو زبان کی بے لوث خدمت کرنے والے کون لوگ ہیں؟ کن لوگوں نے صحیح معنوں میں اس زبان کے لیے اپنی قربانیاں دی ہیں؟ کون لوگ زبان وادب کی تاریخ بنا رہے ہیں؟ مگر ایسے ہی کم علم لوگ اردو کے فعال اداروں میں عزت مآب بنے ہوئے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے اردو اساتذہ کو نہ تو اپنے ادب اور ادبی رسائل سے دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ اپنے شعبوں پر توجہ کرتے ہیں کہ شاعر جیسے ادبی رسائل آتے ہیں یا نہیں۔ ہندستان میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں قائم اُردو شعبے اور ان سے وابستہ اساتذہ کی کمی نہیں، بلا مبالغہ ان کی تعداد ہزاروں تک جاتی ہے۔ اُردو کے نامعلوم قارئین کے علاوہ بعض ادبا و شعرا رسالہ جاری رکھنے پر اصرار تو کرتے ہیں لیکن اپنے بقایاجات کی ادائیگی میں بے طرح تاخیر بھی کرتے ہیں۔ شاعر جیسے غیر تجارتی ادبی ماہنامے کو اگر بروقت زرِ سالانہ ارسال نہ کیا جائے تو دشواریوں میں اضافہ ہی ہوگا اور رسالہ وقت پر شائع نہیں ہو سکے گا۔ مختلف صوبوں میں قائم اردو اکاڈمیاں سرکاری احکامات کے تابع ہیں اور غیر معمولی کاموں کو بھی اپنے بندھے ٹکے ضوابط میں رکھ کر معمولی بنا دیتی ہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ کسی نے بھی یہ نہیں سوچا کہ آخر ادبی رسائل کیلئے کیا کیا جائے۔

شاعر ایک ادبی رسالہ ہی نہیں ایک تاریخی روایت بھی ہے۔ شاعر آپ کا اپنا رسالہ ہے آپ کی زبان ہے، آپ کی آواز ہے۔ ہماری درخواست پوری اُردو دنیا سے ہے کہ! شاعر کو اپنی ضرورت بنائیے۔ آپ کی طرف شاعر کے جو بقایاجات ہیں ان کی فوری طور پر ترسیل کیجیے۔ شاعر کے لیے خریدار فراہم کیجیے۔ تاعمر خریدار بنائیے، عطیات و اشتہارات کے حصول میں تعاون دیجیے۔ اپنے اسکول، کالج اور اداروں کے لیے شاعر کی نکاسی کا اہتمام کیجیے۔ اپنے شہر کے ایجنٹوں کو شاعر کی طرف متوجہ کیجیے۔

دشواریوں پر قابو پانا بے حد ضروری ہے کہ حالات دن بہ دن ناگفتہ بہ ہوتے جا رہے ہیں، مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈاک کی شرح میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ کاغذ کا بھاؤ آسمان پر ہے۔ ۱۹۸۷ء میں "غیاث احمد گدی نمبر" شائع کرنا ہے، ساتھ ہی کئی اہم موضوعاتی شمارے بھی شائع کرنے ہیں — مگر! یہ سب آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔

بازیافت

LUCKNOW

اودھ اخبار

26th APRIL 1870.

اشتہار

اردو کا مشہور و معروف اخبار

موسوم بہ

اودھ اخبار لکھنؤ کا سرورق

اودھ اخبار میں مرزا غالب، میر انیس، مرزا دبیر، مرزا شوق لکھنوی، میرزا تفتہ وغیرہ کا کلام چھپتا تھا اودھ اخبار کی متعدد پرانی فائلیں امر سنگھ کالج سری نگر میں موجود ہیں۔ منشی نولکشور نے یہ اخبار ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں جاری کیا تھا۔

اودھ اخبار نادر و نایاب ہے۔ [اکبر حیدری۔ سری نگر]

نیاز فتح پوری [م: ۲۴ رمئی ۱۹۶۶ء] ۱۹۵۴ء میں بھوپال کی ایک شعری نشست میں اپنا کلام سناتے ہوئے۔ [تصویر میں دائیں سے بائیں] میزبھوپالی، کوثر چاند پوری، اختر سعید مجدد نیازی اور اظہر سعید خاں نمایاں ہیں۔

[بشکریہ اختر سعید خاں ـ بھوپال]

مظہر امام

ہاتھ اٹھتے ہی کٹا، چلئے یہاں سے چلئے
کیا دعا، کیسی دعا، چلئے یہاں سے چلئے

باز ہے کوئی دریچہ، نہ کوئی در ہے کھُلا
کوئی جلوہ، نہ ادا، چلئے یہاں سے چلئے

اس کے گھر پر بھی وہی شہرِ خموشاں کا سماں
کوئی آہٹ، نہ صدا، چلئے یہاں سے چلئے

خواب، خوشبوئے طلب، رنگِ ہوس، نازِ وفا
سارا سرمایہ لُٹا، چلئے یہاں سے چلئے

پاؤں کے نیچے زمیں اب کسی محور پہ نہیں
آسماں سر سے لگا، چلئے یہاں سے چلئے

کوئی سایہ، نہ شجر، کوئی تمنّا، نہ امنگ
اڑ گئی سر سے رِدا، چلئے یہاں سے چلئے

اب تو دنیا ہے، نہ دیں، کوئی عقیدہ نہ یقیں
کوئی اچھّا، نہ بُرا، چلئے یہاں سے چلئے

اس چکا چوند میں سکوں کی پرکھ کیا کیجیے
کوئی کھوٹا، نہ کھرا، چلئے یہاں سے چلئے

خود کو کس طرح بچائیں کہ بہت دیر سے ہے
تاک میں خلقِ خدا، چلئے یہاں سے چلئے

دوستوں ہی کے قبیلے میں یہ کہرام نہیں
دشمنوں نے بھی کہا: چلئے یہاں سے چلئے

پسِ غبارِ ہوس، رات ڈھلتی رہتی ہے
نشے میں چور، سنبھلتی پگھلتی رہتی ہے

خبر یہی ہے کہ آغوشِ ہجر میں پہروں
تمہاری یاد بھی پہلو بدلتی رہتی ہے

یہ میں نے دیکھا ہے اکثر، بھٹی پرانی حیات
سرِ دریچۂ شب ہاتھ ملتی رہتی ہے

قفس سے ہم بھی نکلنے کو کب سے ہیں بے تاب
مگر وہ ساعتِ آخر جو ٹلتی رہتی ہے

وہ رنگ، رنگِ بہاراں ہے، کھِلتا رہتا ہے
وہ شاخ، شاخِ ثمر در ہے پھلتی رہتی ہے

ہے ایک کارزیاں شہر شہر دربدری
مگر یہی کہ طبیعت بہلتی رہتی ہے

پرتاپ پارک بلڈنگ، ریسیڈنسی روڈ سری نگر (کشمیر)

ایش کمار

۱۰۳۶ سیکٹر ۲ سی بوکارو اسٹیل سٹی ۸۲۷۰۰۱ (بہار)
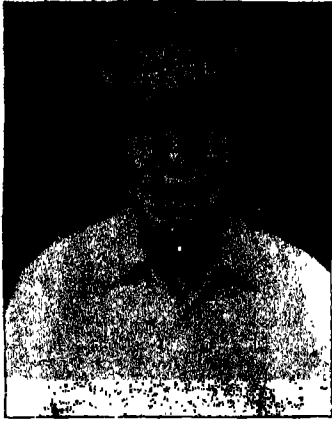
شاعری کیا ہے؟

شاعری کیا ہے؟ شاید آپ یہ سمجھیں کہ میں نے ایک بیہودہ سا سوال پوچھ لیا۔ کون نہیں جانتا کہ شاعری کیا ہے۔ کوئی بھی کتاب کھولیئے۔ بغیر پڑھے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ نثر ہے یا نظم۔ طباعت بھی ایسی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اتنی ہی سی بات ہوتی تو ہر ناقد، کم از کم مغرب کا ہر ایک ناقد شاعری کی کوئی نہ کوئی تعریف کیوں کر دیتا۔ اور پھر ہم کیوں وہیں کے وہیں رہ جاتے۔ یہ تو ہم جان لیتے کہ فلاں تحریر نثر ہے یا نظم، لیکن یہ جاننا کہ کیا یہ نظم اچھی ہے یا بُری اور اگر اچھی ہے تو کیوں؟ یہ ہر ایک کا حصّہ نہیں۔

شاعری کی بیسوں تعریفوں میں مجھے سب سے زیادہ سلیس اور سہل COLERIDGE کولرج کی تعریف جان پڑتی ہے یعنی "شاعری بہترین الفاظ ہیں، بہترین ترتیب میں"۔ شاید آپ یہ سوچیں کہ کولرج نے یہ کیا کہہ دیا کہ شاعری الفاظ ہیں۔ تعمق خیال۔ بلندی تخیل۔ گہرائی احساس کہتا تو کوئی بات تھی، الفاظ بھلا کیا ہوئے۔ کیسی بے تکی بات ہے۔

فرانس کے دو شاعر گفتگو کر رہے تھے۔ ڈیگس DEGAS نے ملارمے MOLLARME سے پوچھا کہ "میں کیا کروں۔ میرا ذہن شاعرانہ خیالات سے مملو ہے۔ لیکن شاعری نازل نہیں ہو رہی"۔ ملارمے نے جواب دیا "میرے پیارے ڈیگس! شاعری خیالات سے نہیں لکھی جاتی۔ شاعری الفاظ سے لکھی جاتی ہے"۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بھی کولرج کی تعریف پر مُہر لگاتے ہوئے کہہ دیا کہ "شاعری عمدہ ترین الفاظ اور عمدہ ترین ترتیب اور بحر METRE ہے کولرج۔ ملارمے اور ایلیٹ تینوں ہی عالمی سطح کے مشہور نقاد ہیں، ایسی بے تُکی بات نہیں کہہ سکتے۔

الفاظ کیا ہوتے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ بس لغت دیکھ لیجئے الفاظ کے معنی سمجھ میں آگئے۔ گُل کے معنی پھول۔ عندلیب کے معنی بلبل۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ ایک سائنس داں یا فلسفی کے لئے لغت کافی ہے۔ لیکن ادب اور خاص کر شاعری کے لئے کافی نہیں۔ لغت صرف ذہنی معنی INTELLECTUAL CONTENT دیتی ہے۔ عندلیب کے معنی بُلبُل تو ہوئے لیکن شاعری میں ان دو لفظوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جو میں ابھی واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

نصف صدی کے قریب میں نے مختلف کالجوں میں انگریزی شاعری پر لکچر دیے ہیں۔ اور میرا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ ہر نئی جماعت کو شاعری پر لکچر دینے سے قبل ایک لفظ بولوں اور طلبا کو کہہ دوں کہ ایک منٹ میں بغیر سوچے سمجھے جو کچھ انہیں سوجھتا ہے لکھتے جائیں۔ مثلاً میں نے کہا "نرگس" اور طلبا نے لکھنا شروع کر دیا۔ پھول، سفید، زرد، چھوٹا، خوشبو وغیرہ وغیرہ۔ کئی طلبا نے نرگس نام کی ایکٹرس کا ذکر کر دیا۔ کسی کو آنکھ کی سوجھی۔ جس کی نرگس سے اکثر مشابہت دی جاتی ہے۔ ایک پُر مذاق طالب علم نے "ہزاروں سال" لکھ دیا۔ جس سے اس کا اشارہ اقبال کے مشہور شعر کی طرف تھا۔

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے"

ایک طالبہ نے شملہ لکھ دیا۔ جس سے سب کو حیرانی ہوئی۔ جب اس سے پوچھا گیا تو وہ کہنے لگی کہ پچھلے سال شملہ میں رہتے ہوئے میں نے اپنی کوٹھی میں پچاس سے بھی زیادہ پودے نرگس کے لگائے تھے اور جب بھی مجھے نرگس کا خیال آتا ہے تو شملہ کی یاد بھی آتی ہے۔ اب ذرا سوچیئے کہ نرگس کے کیا معنی ہوئے، نرگس ایک پھول تو ہے جسے ہم سب جانتے ہیں، لیکن نرگس اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ وہ سب کچھ جو نرگس کا لفظ کہنے سے ہمارے دل و دماغ کو سوجھتا ہے، اور نیز یہ کہ مختلف آدمیوں کے لئے ان کے حالات، علمیت، شاعرانہ صلاحیت کے مطابق یہ لفظ مختلف معنی رکھتا ہے، اسی لیے تو ایک نظم ہر پڑھنے والے کے لئے مختلف ہوتی ہے اور کئی بار تو کوئی بھی پڑھنے والا شاعر کے اصل معنوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ کلامِ غالب کی چار درجن کے قریب شرح لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کے کئی شعر معمہ بنے ہوئے ہیں۔

اب فرض کیجیے کہ میں نے نرگس کے بجائے نارسیس NARCISUS کہہ دیا جو انگریزی زبان میں نرگس کا مترادف ہے نارسیس کہنے سے کسی کو ایکڑ لیس یا آنکھ کی نہیں سوجھے گی اور نہ ہی غالباً اس طالبہ کو شملہ کی۔ کیوں کہ وہ اپنے پودوں کو نرگس ہی پکارتی ہوگی نارسیس نہیں۔ نارسیس کہنے سے تو ہندستانی طلبا کے دماغ ہی بند ہو جائیں گے اور صرف پھول زدہ خوشبو تک ہی محدود رہیں گے۔ شاید ایک ایک آدھ طالب علم جو اس لفظ کا یونانی اشتقاق ETYMOLOGY جانتا ہو، اس نام کے اُس حسین نوجوان کی طرف اشارہ کر دے جو جذبۂ محبت سے بالاتر تھا، لیکن جب اُس نے اپنا عکس پانی میں دیکھا تو اتنا فریفتہ ہو گیا کہ وہیں کا وہیں ہو رہا اور آخر پھول بن گیا جسے ہم اُس کے نام پر نارسیس کہتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ لغت کے باوجود نرگس اور نارسیس میں کتنا فرق ہے۔ نارسیس کے جذباتی یا کنایتی EMOTIONAL OR EVOCATIVE معنی ہماری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتے کیوں کہ یہ ایک غیر ملکی زبان کا لفظ ہے اسی لئے تو شاعری غیر ملکی زبان میں نہیں ہو سکتی، شاعری اسی زبان میں ہوتی ہے جس میں ہم رونا یا ماں سے دودھ مانگنا سیکھتے ہیں۔

زینت ایک عورت کا نام ہے شاید آپ اس نام کی کسی عورت کو نہ جانتے ہوں تب بھی معنوی اور صوتی لحاظ سے آپ کچھ تصور کر سکتے ہیں کہ اس نام کی عورت کیسی ہوگی یا ہونی چاہیے۔ لیکن اگر زینت آپ کی بہن ہو یا بیٹی یا بیوی یا معشوقہ کا نام ہو تو اس نام کے معنی کتنے بدل جاتے ہیں ایک قدم آگے چلیے شکنتلا بھی ایک عورت کا نام ہے، جو شخص مہابھارت کی روایات سے بخوبی واقف ہے اور جس نے کالیداس کا ڈرامہ پڑھا ہے اس کے لئے شکنتلا کا لفظ اپنے اندر شگفتگی، خوبصورتی اور رومانیت کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے۔ گیٹے GOETHE نے جس نے یہ ڈراما پڑھا تھا یہاں تک کہہ دیا کہ اے شکنتلا! جب میں تیرا نام لیتا ہوں تو بہار کے پھول اور خزاں کے پھل نمودار ہو جاتے ہیں، وہ تمام ضیافتیں مہیا ہو جاتی ہیں جن سے میری روح مسحور ہوتی ہے، تیرے نام میں جہان اور جنت دونوں موجود ہیں۔

ایمرسن EMERSON نے لکھا ہے کہ ہر ایک لفظ ایک وقت نظم تھا، کئی لفظ اب تک بھی نظم ہیں، مثلاً چاند، بلبل، نرگس، آنسو وغیرہ وغیرہ۔ لغت کے الفاظ بے جان ہوتے ہیں، سائنس کے الفاظ بھی بے جان ہوتے ہیں لیکن شاعری کے الفاظ زندہ اور جاندار ہوتے ہیں، دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں، روح کو تازگی بخشتے ہیں، مسحور بھی کرتے ہیں، غمگین بھی، ہنساتے بھی ہیں، رُلاتے بھی ہیں، سُلاتے بھی ہیں، جگاتے بھی، کبھی دل کو تسکین دیتے ہیں تو کبھی جنگ کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

شاعری ایک جادو ہے اور وہ جادو انہیں الفاظ میں ہوتا ہے جو شاعر استعمال کرتا ہے۔ ایک لفظ بدل ڈالئے، جادو غائب۔ میکالے MACAULAY نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعری "سم سم کھل جا" کی مانند ہے علی بابا تو دروازہ کھول سکتا ہے لیکن قاسم، گیہوں، جَو، باجرا کہنے سے نہیں کھول سکتا غالب نے اسے طلسم قفل ابجد کہا ہے یعنی وہ قفل جو ایک ہی لفظ کے ترتیب دینے سے کھلتا ہے کسی دوسرے لفظ سے نہیں۔ کولرج نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ملٹن یا شکسپیر جیسے شاعر کا ایک لفظ بھی نکالنا یا کسی مترادف لفظ سے بدل دینا مینار PYRAMID کی ایک اینٹ ہاتھ سے نکالنے سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے۔ سکاٹ SCOTT نے ایک بار ورڈزورتھ WORDSWORTH کی ایک نظم کا ایک لفظ بدل دیا یعنی STILL ST MARY'S LAKE کی بجائے SWEET ST MARY'S LAKE کر دیا۔ کوئی چھوٹا موٹا شاعر ہوتا تو خوش ہو جاتا کیوں کہ SWEET، STILL سے زیادہ شاعرانہ لفظ ہے۔ بحر RHYTHM میں بھی فرق نہیں پڑتا لیکن ورڈزورتھ نے جھٹ روک دیا کہ SWEET سے نظم کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے، مجھے اس وقت جھیل کی خاموشی اپیل کر رہی تھی۔ نہ کہ مٹھاس۔ خاموشی ہی نظم کے ماحول میں موزوں ہے۔

غالب کا ایک مشہور شعر ہے ؎

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجہ　　اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

یوں تو ہر ایک لفظ اپنی جگہ اسی طرح قائم دائم ہے جیسے PYRAMID کی ہر اینٹ لیکن "چھیڑیے" لفظ کو لیجیے ایک معمولی غیر شاعرانہ سا لفظ ہے لیکن معنویت اور موزونیت سے اتنا ہی پُر ہے جتنا غالب شکوہ سے یا باجہ راگ سے۔ چھیڑیے تین معنی ہیں (باجہ کا)، راگ چھیڑنا (معشوق کا)، ذکر چھیڑنا یا دبے ہی ستانا، تینوں یہاں موزوں ہیں۔ اب کون سی زبان کا کون سا لفظ اس کی جگہ مناسب ہوگا؟ چھ ماہ کی مہلت ہے، آپ کوشش کر کے دیکھیں، اسی لفظ ہی سے ڈاکوؤں کا دروازہ یا قفل ابجد کھلے گا۔ راگ سے باجے کی طرح شکوہ سے پُر ہونا کیسی تمثیل ہے۔ اور پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ سوچتے جائیے۔

شعر اشارہ تو کرتا ہے لیکن کچھ واضح نہیں کرتا لفظ کے لغوی اور کنایتی معنوں کے علاوہ اس کا تیسرا حصّہ صوتی ہے۔ شاعری صرف مجازی یا ذہنی یا جذباتی الفاظ سے ہی نہیں بنتی، صوتی مناسبت بھی ضروری ہے، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اکثر الفاظ صوتی ہیں مثلاً گرج۔ کڑک۔ کھٹ کھٹ۔ سنسناہٹ۔ پتھر۔ چٹان۔ آندھی وغیرہ میکس مولر MAX MULLER اسے BOW NOW THEORY کہتا ہے اور سقراط سے منسوب کرتا ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ پھولوں کے نام اکثر نرم اور میٹھے ہوتے ہیں مثلاً گلاب، موتیا، چنبیلی یا انگریزی میں ROSE PAUSY DAISY وغیرہ۔ ایک نقاد لکھتا ہے کہ میں نے اشعار دو بار پڑھے پہلی بار تو میں صرف آواز کے لئے سننا چاہتا ہوں اور دوسری بار معنوں کے لئے۔ جو الفاظ عشقیہ شاعری کے لئے موزوں ہیں وہ المیہ یا رزمیہ کیلئے نہیں۔ شبلی نے لکھا ہے کہ سعدی رزمیہ شعر لکھنے کا اہل نہیں تھا اور نہ ہی فردوسی عشقیہ صرف اس لئے کہ اُن کی طبیعت کا رجحان اُدھر نہیں تھا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ان کو اس قسم کے الفاظ پر قابو نہیں تھا۔ انیس کے ان اشعار کو لیجئے۔

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی — رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی
کیا جانے کس نے روک لیا ہے دلیر کو — سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

اگر آپ ان اشعار کو ایک ایسے آدمی کے سامنے پڑھیں جو اُردو مطلق نہ جانتا ہو لیکن شاعرانہ ذوق رکھتا ہو تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ جوش اور غصّہ سے لبریز ہیں۔ شاعری نہ صرف دماغ اور آنکھوں سے پڑھی جاتی ہے بلکہ زبان اور کانوں سے بھی۔

علامہ اقبال صوتی لحاظ سے عظیم ترین شاعر ہیں، اس مصرع میں 'آ' کی آواز کا اثر دیکھئے

کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

آٹھ لفظوں میں پانچ میں 'آ' آیا ہے، اگر اسے ٹھیک طرح پڑھا جائے تو دراز کتنا لمبا ہو جائے گا، کام کی بہتات دکھانے کے لئے اور انتظار بھی، صدیوں انتظار کرنا پڑے گا خدا کو طلوعِ اسلام صوتی لحاظ سے مکمل نظم ہے۔ ؎ خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا 'بانگ درا' کی طرح گونجتی ہے، سوتوں کو جگاتی ہے۔

ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے — خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

"تو ہے" دو سادے سے لفظ ہیں لیکن ردیف بن کر ضربِ کلیم کا کام کرتے ہیں۔ الفاظ کی آواز سے ہی اقبال اعجاز پیدا کر دیتے ہیں۔

اب الفاظ کا چوتھا حصّہ لیجئے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ شاعری کے الفاظ زندہ اور جاندار ہوتے ہیں اب تک تو میں نے ان کی انفرادی حیثیت کا جائزہ لیا ہے لیکن ان کی سماجی حیثیت بھی ہوتی ہے اور سماجی حیثیت سے انہیں ایک نیک شہری کی طرح اپنے ہمسایوں کے ساتھ رابطہ اور میل جول رکھنا چاہیئے۔ کولرج نے کہا تھا "بہترین الفاظ بہترین ترتیب میں" ترتیب ان کی شہری حیثیت ہے ہر ایک لفظ اپنے اگلے اور پچھلے لفظ سے ہم آہنگی برتے، ارتعاش پیدا کر سکے، جھیل کے خرام کی طرح رواں ہو، کسی پہاڑ کے نالے کی طرح بے ہنگم چھلانگیں نہ لگائے۔ انگریزی میں اسے RHYTHM کہتے ہیں RHYTHM یونانی زبان کے لفظ RHUTHMS سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں بہاؤ، یہ بہاؤ کئی باتوں پر منحصر ہوتا ہے یعنی لفظوں کا صوتی پن، روانی، اونچ نیچ، چستی یا ڈھیلا پن۔ VOWELS کا طویل یا اختصار وغیرہ۔ ضروری نہیں کہ بہاؤ میں مٹھاس یا موسیقی ہو، ہاں! موضوع سے مطابقت ضروری ہے۔ رزمیہ نظم کا بہاؤ تیز اور طوفانی ہوتا ہے۔ مسرت آمیز نظم کبھی کبھی ناچنے لگتی ہے اور غمگین نظم سست رفتار ہوتی ہے کہانی رواں دواں بہاؤ میں لکھی جاتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کہتا ہے کہ بھدے الفاظ وہ ہوتے ہیں جو اپنے ساتھیوں سے میل نہیں کھاتے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس میل سے مٹھاس ہی پیدا ہو۔ غالب اور براؤننگ BROWNING کی اکثر نظمیں سخت اور کھُردری ROUGH AND RUGGED ہوتی ہیں کیوں کہ ان کا موضوع عمیق اور دشوار ہوتا ہے، وہ توجہ چاہتا ہے جس کے لئے تیزی نہیں دھیما پن چاہیئے، رُک رُک کر آہستہ سے چلنے کے لئے۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے

"عشق خانہ ویراں ساز" کو پڑھ کر دیکھئے کتنی رکاوٹ ڈالتا ہے۔ میں نے اقبال کا ایک سست مصرع لکھا تھا۔

کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اب یہ دیکھئے یہ مصرع کس طرح بھاگتا ہے۔

جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

اور پھر مقابلہ کیجئے اس مصرعے سے جو مشکل سے چلتا ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم

مردوں کی تین تلواریں ہیں جن پہ اقبال رک رک کر زور دینا چاہتے ہیں۔ اقبال کے اس مصرعے کو ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح پڑھئے اور سمجھئے۔ اسی طرح غالب کا یہ شعر لیجئے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل   جو تیری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

کتنا شکست رفتار ہے۔

میں نے الفاظ کے چار جزو بتائے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں اور شاعر انہیں جان بوجھ کر جس مقدار میں چاہے ملا لیتا ہے۔ یہ چینی اور پانی کا امتزاج نہیں کہ جب چاہا اور جس تناسب اور مقدار میں چاہا شربت بنا لو۔ اگر شاعر ایسا کرتا تو شیکسپیر ساری عمر میں ایک ڈرامہ بھی نہ لکھ سکتا۔ اور اقبال "کوہ ہمالیہ" سے آگے نہ بڑھ سکتا۔ شاعری قدرتی مرکب ہے ان اجزا کا جو شاعر کی روح سے نکلتا ہے، الہام کی طرح۔ بسا اوقات تو اس پر شاعر کا اپنا قابو بھی نہیں ہوتا۔ الفاظ ایک عظیم شاعر کے اندرون سے چشمے کی طرح ابلتے ہیں، پھول کے رنگ و بو کی طرح ابھرتے ہیں۔ گوئٹے کہتا ہے کہ نظم کا قافیہ موضوع سے ہی نکلتا ہے اگر شاعر ان کی طرف الگ الگ توجہ کرے تو پاگل ہو جائے اور کچھ بھی نہ لکھ سکے۔ شاعری درزی یا معمار کا ہنر نہیں کہ کپڑا لے اور اس کا کوٹ بنا دے۔ یا اینٹوں سے مسجد و مندر بنا دے۔

اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ہر ایک شعر یا نظم میں الفاظ کے چاروں جزو موجود ہوتے ہیں یا مساوی مقدار میں ان کو برتا جاتا ہے۔ نہ ہی یہ کہ ہر لفظ کنائی یا صوتی خاصیت رکھتا ہے۔ ورڈزورتھ اور میر کی اکثر شاعری سادہ الفاظ سے بنی ہے جن میں تشبیہی یا کنائیتی جزو کم ہوتا ہے لیکن RHYTHM یا روانی کا موضوع کے مطابق ہونا وہاں بھی لازمی ہے۔ RHYTHM کے بغیر شاعری ناممکن ہے۔ چاہے آج کل کی آزاد نظم FREE VERSE ہی کیوں نہ ہو۔

غالب کا یہ شعر لیجئے

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا   ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

دیکھئے کتنا پُر زور شعر ہے اور کتنے سادہ الفاظ سے بنا ہے، روانی ہی نے اسے شعر بنا دیا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ بلند ترین شاعری میں الفاظ اپنے مکمل مرکبات میں موجود ہوتے ہیں۔

میں نے اس مضمون میں کولرج کی تعریف "بہترین الفاظ بہترین ترتیب میں" کا حوالہ دیتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بہترین الفاظ کیا ہوتے ہیں اور بہترین ترتیب کیا ہوتی ہے۔ گو امر واقعہ یہ ہے کہ چینی کی مٹھاس کی طرح شاعری کی مٹھاس کا بھی چکھنے سے پتہ چلتا ہے، مضامین یا کتابوں سے نہیں۔ شاعری کے متعلق ایمیلی ڈکنسن EMILY DICKENSON نے کیا خوب کہا ہے کہ جب میں کوئی نئی کتاب پڑھتی ہوں اور یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرے سر کی کھوپڑی اڑ گئی ہے تو سمجھ لیتی ہوں کہ یہ شاعری ہے۔"

کولرج کے قول یعنی شاعری بہترین الفاظ ہیں، بہترین ترتیب میں کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ بہترین الفاظ کیا ہوتے ہیں اور بہترین ترتیب کیا۔ اب میں چند مثالیں دے کر مزید وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔ غالب کا یہ شعر لیجئے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

یہ شعر ہم نے کئی بار پڑھا ہے اور شاید خیال کرتے ہیں کہ بس ہم نے سمجھ لیا ہے۔ تشریح یا توضیح کی حاجت نہیں۔ آئیے ذرا دیکھیں کہ ہے کہ نہیں۔ پہلے "آتے ہیں" کو لیجئے، دو نہایت سیدھے لفظ ہیں۔ لیکن معنی خیز، غالب کہتا ہے کہ میرے مضامین یعنی اشعار خود بخود آتے ہیں لائے نہیں جاتے۔ ان دو لفظوں سے "آمد" اور "آورد" کی تمام بحث چھڑ جاتی ہے۔ ایک وقت تھا جب دو قسم کی اٹھنیاں رائج تھیں ایک چاندی کی اور دوسری نکل کی، کسی نے لکھ دیا۔ "دو قسم کی اٹھنیاں رواں ہیں۔ ایک چلتی ہے اور دوسری چلائی جاتی ہے"۔ اسی طرح شاعری بھی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک چلتی ہے دوسری چلائی جاتی ہے۔ غالب کی شاعری چلتی ہے لیکن اکثر شاعری کے اشعار تو چیخ چیخ کر کہتے ہیں۔

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

لیکن طوطی کی آواز نقار خانہ میں کون سنتا ہے۔

غالب کہتا ہے کہ اس کی شاعری خود بخود آتی ہے لیکن کہاں سے ؟ "غیب سے" غیب بھی جادو بھرا لفظ ہے۔ اس کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ میرے سامنے ایک اچھی خاصی لغت پڑی ہے جس میں غیب کے معنی ہیں۔ پوشیدگی، آنکھ سے اوجھل ہونا، موجود نہ ہونا۔ یہاں تینوں معنی موزوں ہیں۔ شاعری کسی پوشیدہ جگہ سے آتی ہے جس کا غالب کو بھی علم نہیں ورنہ وہ اُسے پکڑ کر گھسیٹ لاتا، وہ شعر نہیں کہتا، شعر اس سے کہے جاتے ہیں وہ بار بار کہتا ہے کہ میں شاعر بنا نہیں بنایا گیا ہوں۔

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما   مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب

میں شاعر کا رُتبہ حاصل کرنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ شعر نے خود خواہش کی اور میرا فن بن گیا

میرائی نظم از فیضِ حکیم است   (میری شاعری کی پختگی خدا کے فضل سے ہے)

لطفِ طبع از مبدا فیض دارم نہ غیر   (میرے دماغ کی گہرائی خدا کے فضل سے ہے اور کسی سے نہیں)

ایک خط میں وہ یہی دہراتا ہے کہ شاعری کی ملکہ نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے اپنا ہنر بناؤں۔ کلیات فارسی کی تمہید میں غالب لکھتا ہے کہ شاعری خود رو پھل پھول کی طرح ہے۔ وہی طاقت جو سبزے کو اگاتی ہے، درختوں کو ثمر ور کرتی ہے، ہونٹوں کو گانا سکھاتی ہے، شمع کو روشن کرنا، شراب کو نشہ دلانا، وہی شاعر کو نظم لکھنا سکھاتی ہے۔ شاعری کے لئے وہ ذیل کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

مے، اعجاز، دمِ عیسیٰ، نخلِ فردوس، جامِ جم اور بار بار وحی اور الہام [1]

غالب نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ افلاطون نے بہت پہلے ہی کہا تھا۔ ورڈز ورتھ WORDSWORTH نے کہا کہ شاعری زوردار جذبات کا فی البدیہ اُبلنا ہے۔ بائرن BYRON نے اسے لاوا سے تشبیہہ دی ہے جو خود بخود اُبل کر نکلتا ہے۔ ورنہ بھونچال آجائے۔ کیٹس کا کہنا ہے کہ "اگر شاعری درختوں پر پتّوں کی طرح خود بخود نہیں آتی تو اُس کا آنا بے کار ہے"۔ لیکن غالب کے لئے جو مغربی تنقید سے ناواقف تھا یہ نئی بات تھی اور اکثر اردو شعرا کیلئے یہ اب بھی نئی بات ہے۔

"آنکھ سے اوجھل ہونا یا موجود نہ ہونا" بھی نہایت موزوں ہے۔ نظم کسی پھول یا عمارت یا محبوب کے سامنے بیٹھ کر نہیں لکھی جاتی، اسکاٹ SCOTT کا دستور تھا کہ وہ کاغذ پنسل لے کر قدرت کے نظاروں میں گھوما کرتا تھا کہ شاید کوئی منظر نظم ہو سکے۔ ورڈز ورتھ نے اسے تنبیہہ کی کہ نظم اس وقت نازل ہوتی ہے جب نظارہ نظر سے اوجھل ہو جائے اور چند روز ماہ یا سال تخیل میں گھومتا رہے اور پھر دفعتاً نظم بن کر ٹپک پڑے ٹنٹرن ایبی TONTORN ABBEY کو کسی منظر نے نہایت مسحور کیا اسی وقت اس کے ہاتھ میں کاغذ پنسل نہیں تھے اور نہ ہی وہ لکھ سکتا تھا۔ پانچ سال تک وہ منظر اس کے دل و دماغ میں گھومتا رہا۔ پانچ سال بعد وہ پھر اسی جگہ گیا اور نظم ٹپک پڑی۔ لیکن وہاں نہیں بلکہ ٹنٹرن اور برسٹل کے راستے میں۔ وہ سوچتا رہا اور جادو بھرے الفاظ میں زبانی گنگناتا رہا، یہاں تک کہ نظم مکمل ہو گئی۔ بعد میں وہ اسی نظم کا ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کر سکا۔ کیٹس نے کئی بار بلبل کا درد بھرا گانا سنا ہوگا۔ لیکن جب اس نے ODE OF NIGHTINGALE لکھی وہ وینٹ ورتھ پلیس WENTWORTH PLACE میں شہتوت کے درخت کے نیچے ایک بنچ پر بیٹھا تھا بنچ اب بھی وہیں پڑا ہے۔ معلوم نہیں وہی ڈیڑھ سو سال پرانا ہے یا کوئی اور رکھ دیا گیا ہے ؟ میں بھی وہاں گیا تھا اور اس بنچ پر آدھ گھنٹے بیٹھا رہا تھا کہ شاید کوئی ODE ٹپک پڑے لیکن میرا غیب کیٹس یا غالب کا غیب نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب کیٹس نے وہ نظم لکھی نہ کوئی بلبل وہاں تھی۔ نہ کوئی گانا۔ کہاں ہے بلبل اس نظم میں ؟ کون کہتا ہے کہ وہ بلبل کے متعلق ہے، وہ تو کیٹس کے زخم خوردہ دل کے ٹکڑے ہیں، بلبل تو اس میں صرف کیل کی مانند ہے جس پر وہ نظم لٹکا دی گئی ہے۔ کیا علامہ اقبال نے کوہ ہمالیہ، ڈلہوزی میں بیٹھ کر لکھی۔ گو وہ وہاں اکثر جایا کرتے تھے۔

---

[1] علامہ اقبال نے بھی تو کہا ہے: "شاعری جزویست از پیغمبری"

شیلے SHELLY نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عظیم سے عظیم شاعر بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اب اس مضمون پر نظم لکھوں گا۔ نظم پھول کے رنگ کی طرح خود بخود نکلتی ہے۔ غالب نے بہادر شاہ ظفر کے ارشاد پر مہر نیمروز لکھنا شروع کیا۔ لیکن نہ وہ مکمل ہو سکی اور نہ ہی اچھی نظم بن سکی۔ اس کے قصیدے کسی کام کے نہیں، وہ جانتا تھا کہ شاعری اپنے لئے لکھی جاتی ہے۔ دوسروں کے لئے نہیں۔

ہر چہ می گوئیم بہر خویش گوئیم ما

شیلے نے کہا ہے کہ شاعر ایک بلبل کی طرح ہوتا ہے۔ جو اندھیرے میں اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے گاتی ہے۔ حالی نے شاعر کا ایک مور سے تقابل کیا ہے کہ مور کو جنگل میں دیکھنے یا اس کی تعریف کرنے والا کوئی نہیں ہوتا پھر بھی وہ مستی میں ناچتا رہتا ہے۔ گیٹے نے لکھا ہے کہ شاعر کو عوام کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ جس طرح ایک استاد اپنے شاگرد، ایک ڈاکٹر اپنے مریض یا ایک جج ملزموں کی رائے کی پرواہ نہیں کرتا۔ تبھی تو کسی نے کہا ہے

میں لکھتا ہوں اشعار اپنے لئے نہ ان کیلئے ہیں نہ اُن کے لئے

یہ تو تھا "آتے ہیں" اور "غیب سے" کی بابت۔ ذرا آگے چلئے "صریر خامہ" کے متعلق کئی سال ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں میرے ہم پیشہ ایک انگریز دوست جو اُردو زبان پر اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے اور اکثر میرے ساتھ اقبال اور غالب کا مطالعہ بھی کرتے تھے، ایک روز غالب کا یہی شعر میرے پاس لائے اور کہنے لگے کہ صریر خامہ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ میں نے کہا 'قلم کی آواز'۔ وہ طنزاً بولے۔ "کیا میں یہ بھی نہیں جانتا"؟ یہ تو میں نے لغت میں دیکھ لیا ہے۔ قلم کی آواز سے کیا مراد ہے؟ میرا قلم تو آواز نہیں کرتا؟ کیا آپ کا قلم آواز کرتا ہے؟ کیا یہ لفظ 'نوائے سروش' یعنی فرشتے کے نغمے کے ساتھ موزونیت کے لئے لکھا ہے؟ لیکن جب مضامین غیب سے آتے ہیں تو آواز یا نغمہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ انہیں تو چپکے سے آجانا چاہیئے تھا خاص کر جب قلم آواز ہی نہیں پیدا کرتا۔

یہ نہایت معقول اعتراض تھا، میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ فاؤنٹین پین یا پین ہولڈر کے رائج ہونے سے پہلے ہم لوگ سرکنڈے REED کے قلم سے لکھا کرتے تھے جو آواز کرتا ہے، ہمارے کاتب اب بھی اسی قلم سے لکھتے ہیں، غالب بھی اسی قلم سے لکھتے تھے۔

میری اس وضاحت سے وہ صاحب مطمئن نہیں ہوئے تو میں انہیں ضلع کچہری میں لے گیا جو ہمارے کالج کے عین سامنے تھی اور جہاں عرضی نویس تب بھی اُسی قسم کے قلم سے لکھتے تھے اسے دیکھ کر ان صاحب کو یقین ہو گیا لیکن وہ اتنا مرعوب ہوئے کہ زیادہ دیر تک وہیں ٹھہرے رہے۔ حالانکہ لوگ ایک انگریز کو اس طرح کچہری میں دیکھ کر ارد گرد جمع ہو گئے تھے اور عرضی نویس بھی کچھ سہم سا گیا تھا اُسے گمان ہونے لگا کہ شاید اس سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے کام کی دیکھ بھال ہو رہی ہے لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس نے ایک ادبی مسئلہ حل کر دیا ہے۔ مجھے اسی وقت سوجھا کہ قلم کی آواز صریر، صریر کر رہی تھی اور جب میں نے اپنے انگریز دوست کی توجہ اس آواز کی طرف مبذول کروائی تو وہ بے حد مسحور ہوئے۔

اب 'نوائے سروش' کو لیجئے، نہایت پُر لطف جملہ ہے۔ نوا کے معنی ہیں۔ آواز، راگ، نغمہ یہ سب شاعری کے لئے موزوں ہیں لیکن اس سے زیادہ معنی خیز لفظ سروش ہے۔ میری لغت میں اس کے پانچ معنی دئے ہوئے ہیں، فرشتہ، جبرئیل، غیب کی آواز، الہام، خوشی کی خبر لانے والا فرشتہ۔ یہ پانچوں معنی مناسب ہیں۔ غیب تو غالب ابھی کہہ چکا ہے۔ سروش اور الہام سے اس نے جا بجا شاعری کی تشبیہہ کی ہے۔

غالب آزردہ سروشیت کہ از مستیٔ قرب ہم بداں وحی کہ آوردہ غزل خواں شدہ است

یعنی پریشان غالب سروش یعنی فرشتہ کی مانند ہے۔ جو الہام سے شاعر بن گیا ہے اور سروش بھی کیسا جو خوشی کی خبر لاتا ہے۔ شاعری اور خوشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوشی ہی تو شاعری کا مقصد ہے۔ دو ہی مقصد ہیں شاعر کے، درس اور خوشی INSTRUCTION AND DELIGHT شاعری چاہے المیہ ہی ہو۔ غم غلط کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

اب دیکھئے! شاعری، غیب، صریر خامہ، نوائے سروش، کس طرح آپس میں جکڑے ہوئے الفاظ ہیں۔ ان کا الگ کرنا، ناخن کا گوشت سے جدا کرنے کے مانند ہے یا کولرج کے الفاظ میں PYRAMID سے خالی ہاتھ سے اینٹ نکالنے کی مانند ہے۔ میکلے اسی کو تو OPEN SESAME کا جادو کہتا ہے۔ صوتی لحاظ سے بھی یہ الفاظ بہترین ہیں۔ صریر کی طرف تو میں پہلے توجہ دلا چکا ہوں، فرشتہ کے لئے مجھے ان معنوں میں سروش سے بہتر کوئی لفظ نہیں سوجھتا۔ نہایت سُریلا اور موسیقی آمیز لفظ ہے۔ نوا سے میل کھاتا ہے اور غزل کے قافیے کا

بھی ہم جنس ہے۔

اگر ہم پہلے مصرع کو اس طرح پڑھیں: "یہ مضامین خیال میں غیب سے آتے ہیں" ۔ تو کیا ہوگیا؟ نظم، نثر بن گئی۔ وہی الفاظ ہیں۔ معنی، جذباتی، کنایتی یا صوتی لحاظ سے۔ یہی تو لفظ کی پہلی تین قسمیں ہیں جن کا ذکر میں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں کیا ہے۔ نثر میں تبدیل ہونے والے مصرع میں اب وہ جادو نہیں ہے کیوں کہ "بہترین الفاظ بہترین ترتیب میں نہیں ہیں"۔ ترتیب (RHYTHM) کے بغیر شاعری ناممکن ہے۔

اب میں چند ایسی مثالیں دوں گا جو موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ملتی ہوں تاکہ خوب سے خوب تر کی پہچان ہو سکے۔ ریڈیو پر یہ شعر اکثر سنا کرتا ہوں معلوم نہیں کس کا ہے۔

عشق کا ذوقِ تماشا مفت میں بدنام ہے — حُسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے

اچھا شعر ہے۔ عشق، ذوق، حُسن، بیتاب، جلوہ، شاعرانہ الفاظ ہیں، مشاعرہ میں خوب داد پائیں گے، سامعین جھوم اٹھیں گے لیکن موضوع میں خاص تازگی نہیں، حُسن کی خود نمائی عامیانہ سا مضمون ہے۔ بیان میں بھی کوئی انوکھا پن نہیں، اسے نثر میں تبدیل کر دیجئے وہی بات ہوگی جو شعر میں ہے۔ یہ شعر کسی تشبیہ یا کنایا کا بھی حامل نہیں۔ RHYTHM اس میں ضرور ہے ورنہ شعر ہی نہ ہوتا لیکن یہ شعر نہ احساس کو جگاتا ہے نہ تخیل کو۔ دیر پا بھی نہیں جو آپ کو گھنٹوں محظوظ رکھے۔ صرف ایک لفظ یعنی 'بیتاب' میں کچھ تازیانہ پن ہے اب اقبال کے اس شعر کو لیجئے۔

ظلمت کدہ خاک پہ شاکر نہیں رہتا — ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا

خود نمائی کا موضوع یہاں حسن سے نکل کر وسیع ہوگیا ہے، دانے سے مراد تمام دنیا ہے، ہر چیز ترقی اور تربیت کی طرف گامزن ہے، خود روئی اور خود نمائی چاہتی ہے، تشبیہ ملاحظہ ہو۔ دانے کا زمین سے اگنا، کتنی کوشش اور کشمکش کی ضرورت ہے یا کتنی بے تابی کی۔ اقبال اسے جنون کہتا ہے، ایک دھن سوار ہے، ہر ایک چیز کو آگے بڑھنے کے لئے اور پھر ظلمت کدہ خاک کتنی معنی خیز ترکیب ہے۔ دانہ کہاں سے کہاں آنا چاہتا ہے ایک مخصوص موضوع لامحدود بن گیا ہے۔

علامہ اقبال کا ایک اور شعر ہے — ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرہ ہے شہید کبریائی

وہی مضمون ہے لیکن صریحاً معلوم نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے اس کی تیز رفتاری QUICK RHYTHM متاثر کرتی ہے جیسے کوئی چیز بھاگ رہی ہو۔ پچھلے شعر میں 'جنوں' نے کچھ تیزی ظاہر کی تھی لیکن 'ظلمت کدہ' اور 'ہر لحظہ' نے 'دانے' کی نشو و نما کو سست بنا دیا لیکن یہ شعر رواں دواں ہے، معنی سمجھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے، پہلی بار پڑھئے، دوسری یا تیسری بار سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ذرہ اور کبریائی شعر کے معنی خیز الفاظ ہیں، معنویت اور کنایہ کی ایک دنیا لئے ہوئے۔

وہاں تو 'دانے' کا اگنا ہی تھا۔ یہاں 'ہر ذرہ'۔ ذرہ کیا ہوتا ہے؟ تصور کیجئے اور پھر ہر ذرہ کیا چاہتا ہے؟ نہ صرف بڑائی بلکہ خدائی۔ کبریائی کے دونوں معنی ہیں۔ یہاں دانے کے پودہ بننے کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ڈارون DARWIN کی تھیوری کے مطابق بندر کے انسان کا بلکہ ذرّے کے خدا کا۔ چھوٹی سی کوٹھری میں لامحدود خزانہ بند ہے نہ صرف سائنس کا بلکہ فلسفہ کا بھی۔

اب غالب کی طرف آئیے۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اقبال زمین سے آسمان تک اٹھا، ذرہ کو آفتاب ہی نہیں خدا بنا دیا۔ غالب بھی اڑنا جانتا تھا۔ اس کی بابت اقبال نے کہا تھا۔

فکرِ انساں پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا — ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

لیکن یہاں صوفی وجد میں خدا کو زمین پر اتار لایا ہے۔ صوفی کی اصطلاح میں خدا کو اکثر معشوق کہا جاتا ہے جو اپنا جلوہ دکھانا چاہتا ہے۔ صوفیوں کے عقیدے کے مطابق دنیا کیا ہے؟ خدا کے جلوے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہی ہے مطلب پہلے مصرع کا۔ دوسرا مصرع نہایت پُر زور ہے۔

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

کتنا پختہ یقین ہے یہ تمثیلی مصرع ہے۔ پہلے مصرع میں عقیدہ بیان کیا گیا ہے اور دوسرے میں اس کی تشریح۔ جو لوگ غالب کے فارسی

الفاظ اور بناوٹ پر اعتراض کرتے ہیں وہ ذرا غور فرمائیں کہ 'جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں' جو کچھ کہا گیا ہے یا 'صریر خامہ' یا 'نوائے سروش' کی تراکیب کے بغیر شعر کیا رہ جاتا۔ اختصار بھی شاعری کا ضروری حصہ ہے تبھی تو غالب نے کہا تھا:

میرے اجمال پہ کرتی ہے تراوش تفصیل

جہاں اقبال کے شعر نے شاعری کو فلسفہ بنا دیا ہے۔ وہیں غالب کے شعر نے فلسفہ کو شاعری۔ اور یہ غالب ہی کا حصہ ہے۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، چونکہ شاعری الفاظ ہوتی ہے، وہی الفاظ جو شاعر استعمال کرتا ہے اس کا ایک لفظ بھی ہم معنی لفظ میں تبدیل کرنا کولرج کے الفاظ میں اتنا مشکل ہے جتنا PYRAMID سے خالی ہاتھ سے اینٹ کا نکالنا، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اگر ہم ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کر سکتے تو کسی نظم کا دوسری زبان میں ترجمہ ناممکن ہے جہاں نہ صرف تمام الفاظ بدل جاتے ہیں بلکہ دوسری زبان کے الفاظ سے نظم کے مزاج ہی بدل جاتا ہے۔ نثر کی کتاب کی کتاب کا ترجمہ کر دیجئے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نظم کے ایک شعر کا بھی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ میں ذہنی معنی تو رہتے ہیں لیکن جذباتی، کنایتی یا صوتی معنی نہیں رہ سکتے۔ ہیملٹ HAMLET کا دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن شاعری کے لحاظ سے 'ہملٹ' وہی ہے جو شکسپیر نے لکھی ہے۔ جب پوپ POPE نے ہومر کا ترجمہ کیا۔ بہت مقبول ہوا۔ چھپنے سے پہلے ہی اس کی تمام جلدیں بک گئیں لیکن برڈلے BRODLEY نے پوپ سے سچ کہہ دیا کہ نہایت خوبصورت ترجمہ ہے مگر یہ ہومر نہیں ہے۔ ہومر کیسے ہو سکتا ہے۔ فٹز جیرالڈ FITZGERALD نے عمر خیام کا نہایت حسین ترجمہ کیا ہے۔ لیکن وہ عمر خیام نہیں۔ کوئی دوسری نظم ہے۔ ۱؎ مجھ سے جب ٹیگور کی شاعری کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ بیشک عظیم شاعر ہوگا کیوں کہ اسے نوبل پرائز ملا لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ میں بنگالی نہیں جانتا گو میں نے تقریباً اس کی تمام کتابیں انگریزی میں پڑھ لی ہیں۔ ترجمہ کی ہوئی شاعری کی بات اس نے خود ہی کیا ہے کہ وہ ویسی ہے۔ جیسے کسی دوسرے سے کہا جائے کہ وہ آپ کی پیٹھ کھرچ دے اور جس سے کبھی تسلی نہیں ہوتی۔ شیلے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شاعری کا ترجمہ کرنا ایسا ہے جیسے ایک پھول کو، اس کا رنگ اور خوشبو سمجھنے کے لئے کچل دینا۔ شاعری میں گیسو کی بجائے زلف یا گور کی بجائے قبر لکھ دیں تو شعر شعر نہیں رہتا LOCKS اور GRAVE کا تو کہنا ہی کیا۔ ❁

۱؎ پروفیسر نکلسن نے علامہ اقبال کی اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ جس سے اقبال کی شہرت انگلستان میں پھیل گئی۔ لیکن وہ شاعری کا ترجمہ نہیں تھا۔ بلکہ فلسفہ کا، جس کے لئے وہ کتاب مشہور ہے جس کا اقبال نے خود اعتراف کیا ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۲ کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے

ہے اس لیے کہ یہ شاعری کلاسیکی شاعری سے بہت مختلف ہونے کے باوجود اس کے سمجھنے میں حائل نہیں ہے، اس شاعری کے باہر بھی کلاسیکی شاعری کی زبان کے بہت سے الفاظ کے مفاہیم میں توسیع اور تبدیلی ہوئی ہے، مثلاً عشق کا جو مفہوم میر اور دوسرے کلاسیکی شاعروں کے یہاں ہے وہ اقبال کے یہاں نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کا مفہوم کیا ہے؛ ظاہر ہے اس سوال کا جواب ہم خود اقبال ہی کے کلام سے حاصل کر سکتے ہیں، اقبال کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کے عالمانہ مطالعے سے نہیں۔ بعینہٖ یہی صورت کلاسیکی شاعری کی ہے۔ کلاسیکی شاعری کی لفظیات کے مفاہیم تک ہم کلاسیکی شاعری ہی کے وسیلے سے پہنچ سکتے ہیں۔

ابھی عرض کیا گیا کہ اردو شاعری کی زبان میں تغیر کی رفتار بہت سست ہے، لیکن بہرحال منطقی طور پر ایک وقت ایسا آ سکتا ہے جب یہ زبان اتنی بدل جائے کہ اس کے مقابلے میں کلاسیکی شاعری کسی دوسری زبان کی شاعری معلوم ہونے لگے۔ اُس وقت البتہ یہ مسئلہ پریشان کن ہو سکتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے۔ لیکن اس وقت بھی اس مسئلے کا حل یہی ہوگا کہ کلاسیکی شاعری کی زبان کو سمجھ لیا جائے اور کلاسیکی شاعری کی زبان کو سمجھنے کے لیے پرانے وقتوں کے حالات کا مطالعہ اتنا مفید نہ ہوگا جتنا براہِ راست کلاسیکی شاعری کا ہمدردانہ مطالعہ۔ اس ہمدردانہ مطالعے کے نتیجے میں آج بھی اور آئندہ بھی کلاسیکی شاعری کے زمانی فاصلے اور لسانی مغائرت کا احساس مٹ سکتا ہے اور وہ نئے ذہن کے قاری کو بھی اپنے زمانے اور اپنی زبان میں اپنے دل کی آواز معلوم ہو سکتی ہے۔ ❁

جگن ناتھ آزاد

وہ ملے بھی تو کچھ ایسے کہ نہ ملنے کی طرح غنچۂ دل جو کھلا بھی تو نہ کھلنے کی طرح
ان بہاروں میں جراحت کا مداوا نہ کرو اب اگر زخم سلیں گے تو نہ سلنے کی طرح

○

وہ لوگ جو دبکے ہوئے بیٹھے ہیں گھروں میں
اک دن نکل آئیں جو یہی لوگ گھروں سے

○

ہوشیار اس سے کہ ہے آزادِ غیبت کا مریض جب ترے پاس آئیگا ہمدرد بن کر آئیگا
جو یہ چاہے گا کہ ہو اک دن ترے سر پہ سوار ابتدا میں پاؤں کی وہ گرد بن کر آئیگا

○

شعر کی پہچان یہ بھی ہے کہ شاعر کا خیال
ایک اشکِ گرم و آہِ سرد بن کر آئے گا

○

عمل کو دیکھنے والو! عمل کی دنیا میں
فقط خیال نے جادو جگائے ہیں کیا کیا

○

قربان اس پہ میرے تصور کا ہر لباس دیکھا ہے آج میں نے تجھے جس لباس میں

○

درونِ دل تھا ہمارا قلندروں کی طرح اگرچہ ہم نے بظاہر سکندروں کی طرح
نہ زیست اپنی بسر کر گداگروں کی طرح تجھے بنایا گیا ہے پیمبروں کی طرح

گھروں میں تھی جو مسرت وہ کس طرح سے ملے
کہ آج گھر ہی نہیں رہ گئے گھروں کی طرح

اے-۲۵، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں

وقار واثقی

خود کو یوں دیکھا نہیں تھا منتشر ہوتے ہوئے
اپنے گھر آیا ہوں میں آج، اُسکے گھر ہوتے ہوئے

آدمیت ہی نہیں، انسانیت بھی کھو چکے
لوگ اب بے سر نظر آتے ہیں سر ہوتے ہوئے

پھر نہ ہو یہ روزِ عاشورہ کی آمد کی خبر
آج کل کیوں ہچکچاتی ہے سحر ہوتے ہوئے

کیا یہ آوارہ مزاجی ہے تخیل کی کوئی
گھر نہیں لگتا ہے گھر، دیوار و در ہوتے ہوئے

راہ سیدھی ہو گی، لیکن کیسے لوں احساس وقارؔ
جانی پہچانی خود اپنی رہ گزر ہوتے ہوئے

رسول آباد۔ احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

رشید امجد

۱۸۵۔ اے ۔ ٹاک پورہ، راولپنڈی (پاکستان)

سمندر مجھے بلاتا ہے (۵)

اس نے آنسوؤں سے تر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولا ——— "بس وہ جو ایک نفسِ مطمئنہ ہے نا، وہ نہیں"

مرشد نے سر ہلایا ——— "رستے پر ڈولتے والوں کو نفسِ مطمئنہ نہیں ملتا"

اس نے حیرت سے پوچھا ——— "رستے پر ڈولنے والے؟"

"ہاں!" مرشد مسکرایا ——— "جب دنیا داری کا سلیقہ نہ ہو اور درویشی کا ظرف نہ ہو تو آدمی رستے پر ہی ڈولتا رہتا ہے"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو"

"بس کسی ایک طرف ہو جاؤ، درمیان میں لٹکتے رہے تو زندگی ایک عذاب بن جائے گی"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا ——— "لیکن کسی ایک طرف ہو جانا بھی تو میرے بس میں نہیں، میں تو اس کشمکش میں کرچی کرچی ہو گیا ہوں"

مرشد کچھ نہیں بولا

رستے کی ایک طرف کھکھلاتی دنیا ہے اور دوسری طرف سُرمئی دھند ——— میں اس دھند میں اترنا چاہتا ہوں، لیکن رستے کا دوسرا سرا نہیں چھوڑتا، اور میں شاید اسے چھوڑنا چاہتا بھی نہیں، میرے بچے اپنے معصوم ہاتھوں سے مجھے گدگداتے ہیں، ان کی لذت کا لمس ——— لیکن دور کہیں وہ سُرمئی سی دھند، اس کی تہہ میں اترنے والا راستہ کہاں جاتا ہے۔ وہ کون ہے؟ جو کبھی کبھی ایک جھلک دکھلا کر پکارتا ہے۔ میں اپنے نام کی پکار سنتا ہوں تو بے اختیار قدم ادھر اٹھنے لگتے ہیں، لیکن رستے کا توازن، ایک بے چینی ——— مجھے نفسِ مطمئنہ کب ملے گا؟

مرشد مسکرایا ——— "نفسِ مطمئنہ بھی بس ایک تصور ہی ہے جو ہاتھ آتا ہے لیکن پھر بھی نہیں آتا"

ایک طرف کھکھلاتی دنیا ہے، لذتیں اور محرومیاں، ساتھ ساتھ، بیوی کہتی ہے ابھی تک مکان نہیں بن سکا، ملازمت میں ترقی نہیں ہوئی۔ بچے اسکوٹر پر ریڑھے کی طرح لد کر اسکول جانے کی بجائے اب کار میں جانا چاہتے ہیں، میں بھی یہی سب کچھ چاہتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا، دفتروں میں رشوت دے کر خوشامد کر کے کام کروانا چاہتا ہوں لیکن طریقہ نہیں آتا، دفتر میں عام ساتھیوں سے لے کر سربراہ تک ہر ایک کو خوش رکھنا چاہتا ہوں لیکن کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور موجود ہے۔

مرشد اس کا شانا تھپتھپاتا ہے ——— "گڑبڑ باہر نہیں تمہارے اندر ہے، بس کسی ایک راستے کا انتخاب کر کے اسے قبول کر لو"

ہر قدم پر ایک نہ ایک چیز، ایک نہ ایک رستے کا انتخاب ———

شاید میں نے زندگی کا انتخاب بھی اسی دو دلی سے کیا ہے، اسی لئے زندگی مجھ سے گریزپا ہے، اور دوسرے کنارے پر اس سرمئی دھند میں جو چھپا بیٹھا ہے، اور جو کبھی کبھی مجھے پکارتا ہے کیا میں بھی اس کا اسی طرح کا گریز یا انتخاب ہوں؟ ان چاہا، زندگی ایک جبر ہے پیدا کرنے والے کے لئے بھی اور پیدا ہونے والے کے لئے بھی،

اور یہ رستے کے درمیان رہ کر ڈولنے میں بھی ایک عجب مزہ ہے ایک ایسی لذت جسے خود ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گر پڑنے کا خوف دونوں کناروں سے آتی آوازیں، ترغیبات اور اپنی اپنی طرف

اس سلسلہ کی پہلی تین کہانیاں 'شب خون' (الہ آباد) اور چوتھی کہانی 'سیپ' (کراچی) میں شائع ہوئی ہیں۔

گوشنشیں! اور یہ درمیان؟ یہ بھی عجیب جگہ ہے، شاید ہر چیز کا ایک درمیان ہوتا ہے یا شاید نہیں ہوتا۔ یہ محض ایک فریب ہے، ایک ایسی کیفیت جو خود طاری کردہ ہے، یا واقعی کوئی درمیان ہوتا ہو جہاں سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے اور یہ درمیان۔ یہ جھولتا رستہ جہاں میں کھڑا ہوں ایک زندہ حقیقت ہے۔ اس کے دونوں کناروں کی دنیائیں مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں، کلکاریاں مارتے بچے، لذت بھری دنیا——

اور دوسری وہ سرمئی دھند، جس کے پیچھے چھپا وہ، جو روشنی کی طرح پھیلتا سکڑتا ہے—— اور درمیان میں مَیں، سمجھ میں نہیں آتا کدھر جاؤں؟

ایک عجیب تذبذب ہے

جانا تو میں دونوں طرف چاہتا ہوں، لیکن ایک طرف جانے کا سلیقہ نہیں دوسری طرف کا ظرف نہیں——

زندگی بس ایک شرارہ ہے جو کہیں سے اُڑتا ہوا اور زمین کو چھوتے ہی پلک جھپکنے میں شعلہ بن جاتا ہے، رقص کرتا جو شعلہ جلاتا بھی ہے اور جنم بھی دیتا ہے

مرشد کچھ نہیں بولا، بس اسے دیکھتا رہا

"یہ بے دلی—— مجھے تو یوں لگتا ہے کہیں کسی جگہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے، شاید تم ٹھیک کہتے ہو" مرشد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا—— "مجھے یوں لگتا ہے ہماری اجتماعی موت واقع ہو چکی ہے"

"اجتماعی موت" اُس نے حیرت سے پوچھا—— "تو پھر یہ ہمارے درمیان مکالمہ کیا ہے"؟ مرشد لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا—— "اجتماعی موت تو ہو چکی ہے لیکن ابھی تک کہیں کہیں انفرادی احساس باقی ہے اسی لئے تو اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا، اصل کیا ہے اور عکس کیا ہے"؟

مرشد کی بات سن کر وہ دفعتاً چونک پڑا

"اصل اور عکس، یہی کہا نا تم نے؟"

مرشد نے سر ہلایا—— "ہاں"

بس میں سمجھ گیا، ساری گڑبڑ یہ ہے کہ میں جو ہوں وہ نہیں ہوں بلکہ اپنی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہوں"

مرشد سوچ میں پڑ گیا، بہت دیر چپ رہا پھر بولا—— "شاید یہی ہو، ہم سب اصل کی فوٹو کاپیاں ہی ہوں، یہ ہماری دنیا بھی اصل کی فوٹو کاپی ہو، لیکن جہاں اصل ہے کیا وہاں رہتے پر کوئی نہیں ڈولتا، وہاں نفسِ مطمئنہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے؟"

دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہ مرشد کے پاس تھا، نہ اس کے پاس! ❁

سمندر اب نہیں بلاتا

سمندر مجھے بلاتا ہے (۶)

سمندر جب اس کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا دروازہ کھولتا ہے تو دیکھتا ہے کہ مرشد سمندر کی لہروں پر تیرتا، کلکاریاں مار رہا ہے، سمندر اسے دیکھ کر ایک نعرۂ مستانہ لگا کر جھپٹ پڑتا ہے۔ وہ سر سے پیر تک سمندر ہو جاتا ہے۔

مرشد کہتا ہے—— "چلے آؤ"

وہ ایک لمحے کے لئے مڑ کر دیکھتا ہے، گھر، گھر میں سوتے بیوی، بچے، دنیاداری، فیصلے کا لمحہ طویل ہونے لگتا ہے لیکن مرشد آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور اسے اپنے ساتھ کھینچ لاتا ہے۔ سمندر دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پیچھے ہٹنے لگتا ہے اور دھیرے دھیرے اپنے کناروں میں لوٹ آتا ہے۔

حدِ نظر تک سرمئی دھند ہے جس میں وہ اور مرشد چلے جا رہے ہیں۔ مڑ کر دیکھنے کی خواہش لیکن کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

مرشد پوچھتا ہے—— "کیا بات ہے کسے ڈھونڈ رہے ہو"؟

وہ چند لمحے چپ رہتا ہے پھر کہتا ہے—— "صبح ہونے سے پہلے مجھے گھر لوٹنا ہے" مرشد ہنستا ہے—— "گھر ایک جال ہے تم اس سے باہر نکل کر بھی دوبارہ اس میں پھنسنے کی تمنا کرتے ہو"

جال تو ہر جگہ ہیں چھوٹے چھوٹے بڑے بڑے۔ کلاس روم میں لٹکے

اسے دیکھے جا رہے ہیں۔ وہ حاضری کا رجسٹر ایک طرف کرکے کھنکھارتا ہے، پھر کہتا ہے ـــ یہ جو فضا ہے نا یہ بھی ـــ ایک جال ہے جس سے آگے ہم نہیں جا سکتے۔ یہ سانس بھی چھوٹا سا جال ہے اور آدم کو آسمانوں کی وسعتوں سے نکال کر اس دنیا کے جال میں بند کر دیا گیا۔"

گھنٹی کی آواز سنتے ہی لڑکے اس کی بات ادھوری چھوڑ کر باہر نکل جاتے ہیں وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔

سانپ کو اکیلے ہی میں موقع مل گیا تھا۔

وہ ممنوع پھل کے ذائقے کو بدن پر محسوس کرتا ہے۔

یہ ذائقہ ـــ یہ ترغیب، لیکن وہ دونوں تو خود ہی ایک دوسرے کے لئے ترغیب تھے پھر گناہ کیسا؟

اور اس ترغیب نے تو خود اس کے جسم سے جنم لیا ہے، یہ اس کی زندگی بھی ہے اور موت بھی، وہ اس کے ہاتھ کو آہستگی سے سہلاتا ہے اور کہتا ہے ـــ "چلو بھاگ چلیں" وہ بڑی بڑی خماری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے، منہ سے کچھ نہیں بولتی، مشکی گھوڑا انہیں لئے اڑ جاتا ہے

وہ کہتی ہے ـــ "ذرا آرام نہ کریں، وہ تو بہت پیچھے رہ گئے"

پھر وہی ترغیب۔

وہ لمحہ بھر کے لئے ہچکچاتا ہے ـــ "منزل پر پہنچ جاتے تو ـــ"

وہ نیند بھری خماری آنکھوں سے اس کے بدن کو گدگداتی ہے ـــ

ترغیب وہی ترغیب ـــ

گھوڑے کو درخت سے باندھتے ہوئے وہ ترکش کو احتیاط سے اپنے قریب رکھتا ہے۔ بھاگتے ٹاپوں کی آواز اسے جھنجھوڑتی ہے تو وہ تیزی سے ترکش کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے ـــ

وہ کھلکھلاتی ہے۔

ہنہناتے مشکی گھوڑوں پر سوار وہ سارے اس کی کھلکھلاہٹ میں شریک ہوتے ہیں۔

وہی ترغیب وہی دھوکا

وہ جھکا کر سمندر کی باہوں میں آگرتا ہے، مرشد کہتا ہے ـــ "واپسی مبارک"

"لیکن ـــ" وہ بڑبڑاتا ہے "میں نے دھوکا کیوں کھایا؟"

مرشد مسکراتا ہے ـــ "دھوکا آدمی اپنے آپ ہی سے کھاتا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں، جو کچھ ہے وہ تم ہی تم ہو"

"تو کیا میں نے اپنے آپ کو ترغیب دی، گناہ کا راستہ دکھایا؟"

مرشد اور سمندر کچھ نہیں بولتے، بس ہنسے جاتے ہیں، وہ بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو جاتا ہے۔ تینوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ جاتے ہیں۔ لوٹ پوٹ ہوتے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

وہ بے خبر سو رہی ہے اور اس کا ترغیب دیتا جسم آنکھیں مار رہا ہے تو یہ میں ہی ہوں جو اپنے آپ کو گناہ پر اکسا رہا ہوں"

دفعتاً وہ جاگ پڑتی ہے ـــ "کیا بات ہے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ـــ کچھ نہیں" وہ گڑبڑا جاتا ہے۔

وہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے ہاتھوں سے بال سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے کہتی ہے ـــ پریشان کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں، وہ بڑبڑاتا ہے ـــ "یہ تو میرا مقدر ہے کہ مجھے ترغیب دینے والا، میرا قاتل مجھ ہی میں سے پیدا ہوگا"

وہ کھڑکی کے پاس آتا ہے۔ سمندر اور مرشد دونوں کا کہیں پتہ نہیں، وہ کچھ دیر خلا میں گھورتا رہتا ہے پھر مڑتے ہوئے کہتا ہے۔ "ہر شخص کا اپنا اپنا جہنم ہے جس کا انتخاب وہ خود ہی کرتا ہے اور اس کی آگ کو تیز کرنے کے لئے خود ہی اس میں ایندھن بھی ڈالتا رہتا ہے"

پھر وہ خود سپردگی کے عالم میں آہستہ آہستہ اس کی خماری آنکھوں اور کھلکھلاتے جسم کے بھنور میں ڈوبتا چلا جاتا ہے! ✺

● بقیہ صفحہ ۲۵ دوپہر بہت ●

اس کے بعد بدن میں پانی کا آخری قطرہ بھی بھاپ بن گیا ـــ اور وہ مر گیا ـــ حرملہ کے تیر سے نہیں، حصین بن نمیر کے نیزے سے نہیں، شمر کے خنجر سے نہیں ـــ بلکہ صرف بدن میں پانی کی کمی سے ـــ اس کے چہرے پر فتح کی ایک مسکراہٹ ابھر آئی ـــ یہاں تک کہ جب کئی تیز نکیلی چونچیں اس کے بدن کے مختلف حصوں میں پیوست ہوئیں تو بھی اس کے چہرے کی مسکراہٹ برقرار رہی ـــ اسے کسی قسم کی تکلیف کا احساس ہی نہ ہوا کیوں کہ وہ تو مر چکا تھا ـــ

اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائے ـــ آج وہ کتنی صفائی سے اپنے مستقبل کی تاریکی سے بچ نکلا ـــ لیکن وہ زور سے ہنس نہ سکا کیوں کہ وہ مر چکا تھا ـــ ایک مکمل موت ـــ اور پھر ایک تیز چونچ مسکراہٹ بھی لے گئی ✺

علی احمد جلیلی

ہم بھی کاغذ پہ ترا نام لکھا کرتے تھے
اور کچھ سوچ کے پھر پھاڑ دیا کرتے تھے

زندگی سے نہیں آج اپنی شناسائی تک
کل اُسے دُور سے پہچان لیا کرتے تھے

آج اندھیروں سے وہ سمجھوتہ کئے بیٹھے ہیں
آفتابوں کی جو تخلیق کیا کرتے تھے

یاد ہیں شہر کی وہ گلیاں اب تک
جب دریچے ہمیں آواز دیا کرتے تھے

جب تلک وقت کی نظروں میں نہیں آئے تھے
ہم علی کیسے سلیقے سے جیا کرتے تھے

● جلیل منزل، مکان نمبر ۲۳۴۷-۱-۲۲ سلطان پورہ حیدرآباد

رحمٰن جامی

لطف و کرم ہوا کہ تری بے رُخی ہوئی
ہر بات میں ہے زیست بھی تجھ سے ملی ہوئی

جو بات خود سے کی ہے ترے انتظار میں
محسوس یوں ہوا کہ ہے یہ بھی کہی ہوئی

ہے وقت بھی رُکا ہوا دینے کو تیرا ساتھ
ہر چیز اپنی اپنی جگہ ہے رُکی ہوئی

جب بھی نگاہ ملتی ہے سنتا ہوں غور سے
آنکھیں تمہاری لگتی ہیں کچھ بولتی ہوئی

وہ جمگھٹے ہیں اب نہ وہ محفل نہ رُت جگے
جامی بتاؤ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی

● ۱۲-۲-۸۳۰/۷/۱، ل کالونی، مرادنگر، حیدرآباد (اے پی)

عرش صہبائی

ہر گھڑی پیش ہے سفر مجھ کو
شام کیا اور کیا سحر مجھ کو

میں تو خانہ بہ دوش ہوں کب سے
کون سمجھے گا معتبر مجھ کو

زندگی مجھ سے کیا بسر ہوتی
زندگی نے کیا بسر مجھ کو

مجھ میں کوئی نہیں ہے بات ایسی
کون چاہے گا ٹوٹ کر مجھ کو

داستاں بن کے پھیل جاؤں گا
وقت کر دے گا منتشر مجھ کو

لب تک آئی نہ آرزو دل کی
رہ گیا کوئی سوچ کر مجھ کو

خود سے ملنے کی آرزو اے عرش
کر گئی کتنی در بہ در مجھ کو

● ایڈمنسٹریٹیو آفیسر، آل انڈیا ریڈیو، روہتک ۲۲۴۰۰۱

نیّر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ، لکھنؤ ۳۔۰۰۶ ۲۲۶

کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے

بیشتر زبانوں میں ادبیات کی ابتدا شاعری سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ دوسرے اصنافِ ادب سامنے آتے ہیں اور شاعری کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کلاسیکی ادب کی روایت قائم کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ روایت مستحکم ہو جاتی ہے اور ایک طویل مدت تک مستحکم رہتی ہے۔ خصوصاً شاعری کی کلاسیکی روایت کا استحکام زیادہ دیرپا ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں نثر کے اصناف زمانے کے رفتار کے ساتھ آگے بڑھتے اور متغیر ہوتے رہتے ہیں۔

کلاسیکی نثر کے مقابلے میں کلاسیکی شاعری کی گرفت ادب پر زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ شاعری کی کلاسیکی روایت بعد کے شاعروں کے لیے ایک معیاری نمونے کا کام کرتی ہے اور وہ حتی الامکان اسی روایت کی پیروی کرتے رہتے ہیں۔ یہ بعد کے شاعر کلاسیکی دور سے باہر ہونے کے باوجود اپنے کلام کے ذریعے اسی کلاسیکی روایت کو مستحکم کرتے اور کلاسیکی شاعری کو اپنے زمانے کے قارئین کے لیے بھی قابلِ فہم رکھتے ہیں۔

کم و بیش انھیں بعد والے شاعروں کے ساتھ شعر کی باضابطہ تنقید بھی وجود میں آتی ہے اور تنقیدِ شعر کے اصول و مبادیات کی چھان بین، معیاروں کی تلاش اور ان کی روشنی میں کلاسیکی شاعری کو پرکھنے کا عمل ہی عموماً شاعری میں تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنتا ہے کیوں کہ اس عمل کے نتیجے میں کلاسیکی شاعری کی بہت سی نئی خصوصیتوں کے علم کے ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ شاعری ازکار رفتہ ہو چکی ہے، بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ نہیں دے رہی ہے، نئے ذہن کی ترجمانی نہیں کرتی اور نئے دور کے سیاق و سباق میں اپنی معنویت زائل کر کے غیر مفید ہو چکی ہے۔ یہ تنقید کے متفقہ فیصلے نہیں ہوتے۔ ان میں سے ہر فیصلہ بحث و تمحیص کے دروازے کھولتا ہے اور اسی بحث کے دوران ادب میں مقصد اور افادیت کی بنیادی یا ثانوی اہمیت بھی معرضِ گفتگو میں آتی ہے۔ نقادوں میں کلاسیکی روایت کے حامیوں اور مخالفوں کے جتھے بن جاتے ہیں اور ان جتھوں میں باقاعدہ نظریاتی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اس جنگ میں کسی بھی فریق کی نظریاتی فتح یا شکست کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی اس بات کی کہ عملی طور پر اس جنگ کے نتیجے میں شاعری کا رُخ کچھ نہ کچھ ضرور بدل جاتا ہے۔ شاعری کی افادی اور جمالیاتی اہمیت پر بحث جاری رہتی ہے لیکن کلاسیکی شاعری کے بالمقابل ایک نسبتاً نئی قسم کی شاعری وجود میں آجاتی ہے۔ یہ نئی شاعری کلاسیکی شاعری سے لازماً بہتر نہیں ہوتی لیکن مختلف ضرور ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کو یہ اپنے زمانے کی شاعری محسوس ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں کلاسیکی شاعری کسی اور زمانے کی چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔

اجنبیت کا یہی احساس بڑھ کر کلاسیکی شاعری کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور اسی رکاوٹ کے نتیجے میں وہ سوال سامنے آتا ہے جو ہماری گفتگو کا موضوع ہے، کہ کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے؟

اس سوال کا بظاہر اور منطقی جواب یہ ہے کہ چونکہ کلاسیکی شاعری اس گذرے ہوئے زمانے کی پیداوار ہے جو ہمارے زمانے سے بہت مختلف تھا لہٰذا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں اس زمانے کو سمجھنا چاہیئے۔ لیکن یہ طریقِ کار بادی النظر میں جتنا مناسب معلوم ہوتا ہے عملاً اتنا ہی غیر مناسب اور دشوار بلکہ تقریباً محال ہے۔ کسی گذرے ہوئے زمانے کو سمجھنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس زمانے کے سیاسی، اقتصادی، سماجی، تاریخی حالات سے بخوبی واقف ہوں، اس زمانے کے ذہن اور مزاج سے آشنا ہوں اور اس زمانے کے افراد کے مسائل اور اقدار کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ مگر ظاہر ہے کلاسیکی شاعری کے قاری کے لئے یہ شرط بہت سخت ہے کہ پہلے وہ ازمنۂ گذشتہ کی تاریخ، سیاست، معاشیات، نفسیات وغیرہ کا عالم بنے، تب کہیں کلاسیکی شاعری کو ہاتھ لگائے۔

اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ بالفرض کوئی قاری یہ سب شرطیں پوری ہی کر دے تو بھی اپنے اس تمام علم کے نتیجے میں کوئی ایسی لوحِ طلسم اس کے ہاتھ نہ لگ سکے گی جس کی مدد سے وہ مختلف کلاسیکی شاعروں اور اُن کے تخلیقات کی روح کو پا سکے۔ بلکہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو یہ تمام علم حصولِ مقصد کی راہ میں حائل نظر آنے لگے۔ مثلاً جب وہ دیکھے گا کہ ایک ہی دور میں درد، میر، سودا اور میر ضاحک شاعری کر رہے ہیں اور ہر ایک کا انداز جدا گانہ ہے، اور اُسی دلی اور اُسی درباری ماحول کے عالمانہ مطالعے کے بعد جب اس کو ذوق اور غالب کی شاعری میں بُعد المشرقین نظر آئے گا تو خود اپنے علمی اکتسابات پر سے اس کا اعتماد اٹھنے لگے گا۔ مزید کوفت اُس کو اُس وقت ہوگی جب وہ دیکھے گا کہ ان علوم سے یکسر نا آشنا ایک عام قاری بھی کلاسیکی شاعری کو پڑھتا، سمجھتا اور اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ یہ عام قاری دورِ اخیر کی مغل تاریخ سے ناواقف ہے اور اُسے نہیں معلوم کہ احمد شاہ کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھرواکر اسے اندھا کر دیا گیا تھا، لیکن وہ یہ شعر پڑھ کر سر دھنتا ہے :

شہاں کہ کُحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی　　انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

اس عام قاری کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ شعر میر تقی میر کا ہے جو اس سانحے کے وقت احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ اسی طرح وہ شعر پڑھ کر بھی وجد کر سکتا ہے۔

چشمِ ما کور شد از جورِ جہاں بہتر شد　　تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما

[اچھا ہی ہوا کہ زمانے کے جور سے ہماری آنکھیں اندھی ہو گئیں تاکہ ہم یہ نہ دیکھ سکیں کہ ہماری جگہ غیر حکمرانی کر رہا ہے]

اور اسے خبر نہیں ہوتی کہ یہ شعر شاہ عالم بادشاہ نے غلام قادر روہیلے کے ہاتھوں آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد کہا تھا۔ جو چیز اس کو متاثر کر سکتی ہے وہ ان حالات کا علم نہیں ہے جن کے تحت یہ شعر کہا گیا، بلکہ خود اس شعر کی الم ناک رجائیت ہے۔ اور میر کے شعر کی تاثیر احمد شاہ کی ذات سے واقفیت کے ساتھ اُتنی مشروط نہیں ہے جتنی کحلِ جواہر، خاکِ پا، سلائیوں اور آنکھوں کے تلازمے سے واقفیت کے ساتھ۔ البتہ اگر قاری اس تلازمے اور سلائیاں پھرنے کی معنویت سے مانوس نہیں ہے تو یہ شعر اس کے لیے ایسا معمّا ہے جسے تاریخ کا علم حل نہیں کر سکتا، اس لیے کہ شعر کی کلید اس کے خارجی محرکات میں نہیں بلکہ شاعر کے استعمالِ الفاظ میں پنہاں ہے۔ اور اسی سے ہمیں اپنے سوال کا جواب مل سکتا ہے

دراصل کلاسیکی ۔ بلکہ کسی بھی ۔ شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ قاری کو اس شاعری کی زبان، استعمالِ الفاظ اور تلمیحات کا وقوف حاصل ہو اور وہ اس حقیقت کو ذہن میں رکھے کہ شعری زبان کا اظہار نثری زبان کے اظہار سے مختلف ہوتا ہے۔ عام بول چال کے الفاظ شعر میں ترتیب پاکر اپنے معنوی انسلاکات کی بدولت مختلف، منفرد اور وسیع تر مفہوم اختیار کر لیتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان مفاہیم میں مزید تبدیلی اور توسیع ہوتی رہتی ہے، اسی کے ساتھ شاعری کی زبان میں نئے الفاظ داخل اور بعض پرانے الفاظ یا اُن کے پرانے مفاہیم متروک ہوتے رہتے ہیں، لیکن عموماً اس ترک و اختیار کی رفتار بہت سست اور قریب قریب غیر محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ شاعری کی زبان کا تغیر اسی ترک و اختیار کا نتیجہ ہوتا ہے لہٰذا اس تغیر کی رفتار بھی بہت سست اور غیر محسوس سی ہوتی ہے۔

جہاں تک اُردو شاعری کا تعلق ہے تغیر کی یہ رفتار اور بھی سست رہی ہے۔ اُردو شاعری کو اپنی زبان بنانے میں کوئی خاص جدّ و جہد نہیں کرنا پڑی۔ کلاسیکی فارسی شاعری کی مکمل ارتقا یافتہ زبان کلاسیکی اردو شاعری کو ورثے میں مل گئی جو اُس کی ضروریات کے لیے کافی بلکہ بہت زیادہ تھی۔ اس طرح کلاسیکی اردو شاعری کو لسانی تجربوں اور زبان سازی کے مشکل اور دیر طلب مرحلوں سے گذرے بغیر شعری لفظیات کا بھرپور ذخیرہ اور ایک بنا بنایا شاعرانہ نظام دستیاب ہو گیا۔ اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری میں لسانی تجربوں اور زبان سازی کی باقاعدہ اور فطری روایت قائم نہ ہو سکی، چنانچہ آج بھی اردو شاعری کی زبان کم و بیش وہی ہے جو کلاسیکی اردو شاعری کی تھی۔ اگر غالب نے کہا تھا :

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہے

تو فیض کہتے ہیں :

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گذری　　قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ کلاسیکی شاعری اور بعد کی شاعری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جدید اور تجرباتی شاعری سے یہاں یہ بحث نہیں

[باقی صفحہ ۱۵ پر دیکھئے]

تسنیم قاسمی

آنکھوں میں بصیرت ہے تو منظر بھی ملے گا
تاریکی میں اک شہر منور بھی ملے گا!
کچھ دیر سلگتے ہوئے خیموں میں رہیں گے
پھر سب سے جدا سب سے الگ گھر بھی ملے گا
ایمان ہے قطرے پہ قناعت جو کرے گا
اس شخص کو ایک روز سمندر بھی ملے گا
چیخے کوئی معصوم تو میں دوڑ پڑوں گا
نیزے کی بلندی پہ مرا سر بھی ملے گا
آنکھوں میں چمک، ہونٹ مگر خشک ملیں گے
اور خون سے سینہ یہ مرا تر بھی ملے گا
اب اس کی شہادت کی نہیں کوئی ضرورت
وہ سینہ کہ جس سینے پہ خنجر بھی ملے گا
اک دن کیلئے اس کی رفاقت بھی بہت ہے
پھر جسم مرا برسوں معطر بھی ملے گا
اک درد تو تحریر کی صورت میں عیاں ہے
اک درد مرے سینے کے اندر بھی ملے گا

● کاکو کالج، دریاپور، پٹنہ - ۴ (بہار)

شفیع اللہ خاں راز اناوی

عجب ہے صنعت آرزو کی خوشبو
ہر آئینے میں ہے پتھر کی خوشبو
مری رگ رگ معطر ہو گئی ہے
فگار تن میں ہے نشتر کی خوشبو
ہمارے خون کے چھینٹے سجے ہیں
شمیم جاں ہے بام و در کی خوشبو
رگ و ریشہ میں راہوں کے ابھی تک
بھٹکتی ہے کسی رہبر کی خوشبو
تواریخ حیات جاوداں ہے
ترے نیزے پہ میرے سر کی خوشبو
پرندے خاک پر بیٹھے ہوئے ہیں
فضاؤں میں ہے بال و پر کی خوشبو
زمانہ قتل ہونا چاہتا ہے
ستم ہے آپ کے خنجر کی خوشبو
پرانی فائلوں میں راز گم ہے
نئے احکام سے دفتر کی خوشبو

● ایس۔ این۔ کالج، کٹرہ پردل خاں، اٹاوہ (۲۰۶۰۰۱)

رونق شہری

غم زدہ ہو آدمی، ماحول کچھ بیمار ہو
کرفیو کا ہو چکا اعلان جسم و ذہن میں
جیسے ہو امید جل کر راکھ ہونے کے لئے
اس سے ملنے کی للک مردہ نہیں ہوتی کبھی
بات کی تہہ میں اترنے سے گریزاں تو نہیں
حادثے بر وقت ہوں تو ذہن تازہ کار ہو
سر پہ جیسے ہر گھڑی لٹکی ہوئی تلوار ہو
اس کے لب پر اک دہکتا شعلۂ انکار ہو
ایسا لگتا ہے کہ اپنے بیچ ہی دیوار ہو
گفتگو اس کی بلا سے لاکھ دل آزار ہو
شعر کہتے وقت لگتا ہے یہی رونق مجھے
تیر کوئی جسم کے اس پار سے اُس پار ہو

● گولی گھر، جریا، ضلع دھنباد (بہار)

شاہد مسیح الزماں

"ادبستان" دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

دوپہر مہلت

دن بھر کی تپتی ریت پر پڑا وہ پیاس کی شدّت سے اپنے محسوسات کھو چلا تھا ـــــ اسے اب ریت کی تپش کا احساس نہ رہا تھا ـــــ وہ اب کراہ بھی نہیں رہا تھا ـــــ شاید کراہنے کی سکت نہیں رہی تھی ـــــ اسے اب امید بھی نہیں تھی کہ پانی کا کوئی قطرہ اس کے گلے کو تر کر سکے گا جیسے اب اس کا گلا دوبارہ تر ہونے کی منزل سے گزر چکا ہو ـــــ وہ جانتا تھا کہ یہ حدِّ نظر تک پھیلی، تپتی ریت اس سرزمین کا حصّہ ہے جہاں انسانیت کو اس کی انسانیت کی وجہ سے پیاسا رہنا پڑا ـــــ نفس کو اپنے نفس کی خاطر پانی کی قربانی دینا پڑی ـــــ

ان ڈیڑھ ہزار سال کی کروٹوں میں نفس میں اتنی قوت کہاں بچی جو مصلحت کو سمجھ کر نہر کے کنارے سے خیمے ہٹا لے ـــــ اس وقت تو ہاتھوں میں اتنا دم تھا کہ خیمے ہٹا لیے ـــــ آج شکستہ جسم میں اتنی سکت نہیں کہ دوبارہ نہر تک پہنچ سکے ـــــ آج کوئی سوالِ بیعت ہی نہیں ـــــ ورنہ وہ تو بیعت کرنے کو تیار ہے ـــــ

تھوڑی ہی دور پر سامنے ہی ایک اکہرے سیاہ، خشک پتھر پر جو بڑا سا نکیلی چونچ والا پرندہ بیٹھا ہے اس کی طرف سے کتنا بے نیاز ہے ـــــ اس کی گردن کے نیچے ڈھیلی ڈھیلی سُرخ کھال کتنی اچھی لگ رہی ہے ـــــ سیاہ سلک کا بدن پر چپکا جمپر جس کا گلا گردن تک بند تھا اور گلے پر سُرخ ڈھیلی ڈھیلی جالی کی جھالر، اسے اس رات پارٹی میں نینا یاد آ گئی ـــــ دن بھر کی حدّت میں پوشیدہ شام ہوتے خنکی کی مہک ماحول کو بوجھل کر رہی تھی ـــــ گہری سُرخ لپ اِسٹک سے دو انگاروں کے بیچ ایک سفید موتیوں کی لڑی چمکی اور چاندی کے دو ہاتھوں میں سے ایک کا بلوری شیشہ اس کے لبوں کو چھو گیا ـــــ عجیب بات تھی، گلے تک ڈھکا ہوا پوری آستین کا جمپر بظاہر بدن کی عریانیت کو مکمل ڈھانکے تھا، لیکن اس کی شوخ، چنچل، دلفریب چال ہر نگاہ کو بے چین کیے تھی ہر جذبے کو بھڑکا رہی تھی اور اُسے اچانک احساس ہوا کہ اگر نینا اپنے سب کپڑے اتار کر برہنہ ہو جائے تو شاید اتنی ننگی نہ دکھائی دے ـــــ شرابوں کا نشہ اب پوری طرح ماحول پر حاوی ہو چکا تھا، اب شاید جوانی میں لڑکھڑانے کی طاقت بھی نہ بچی تھی ـــــ اس نے جھومتی ہوئی میز، کرسیوں، کھمبوں کا سہارا لیتی نینا کو لڑکھڑا کر سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھا اور لوگوں کو کچلنے سے بچاتا وہ بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا ـــــ دن کے اجالے کے آثار کھڑکی پر پڑے پردے سے چھن کر کمرے کی خوبصورتی کو واضح کر رہے تھے ـــــ سامنے، آدھا میز پر، آدھا زمین پر لٹکتا وہ سیاہ سلک کا جمپر عجیب بے تکا سا لگ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ـــــ نینا اب اتنی برہنہ نہیں لگ رہی تھی ـــــ

ـــــ وہ یہاں کیوں لایا گیا ہے ـــــ ؟

یہ تو بے گناہوں کی آزمائش گاہ ہے ـــــ

یہ پیاس کی شدّت، یہ پانی سے محرومی،

یہ سب تو معصوموں کے لیے ہے ـــــ

لو، یہ اتنے بڑے بڑے پروں پر تیرتا ہوا ایک اور پرندہ دھیرے دھیرے نیچے آ رہا ہے ـــــ اسے دیکھ کر، سامنے سیاہ خشک پتھر پر بیٹھے پرندے نے پر پھیلا کر ایک بار جھرجھری سی لی اور اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ماحول کا سکوت چند لمحوں کو ٹوٹ گیا ـــــ

ـــــ اب وہ اٹھ کر گھر جانا چاہتا تھا ـــــ

پتّوں کی پھڑپھڑاہٹ اب اُسے گراں گذرنے لگی تھی ـــــ آٹھ گھنٹے ہونے کو آئے تھے ـــــ شروع میں بازی اس کا ساتھ دیتی رہی پھر اچانک پتّوں نے رُخ موڑ لیا ـــــ وہ لگاتار ہار رہا تھا، مگر یوں ہار کر بھاگنا اُسے گوارہ نہ تھا ـــــ پھر تین بازیاں اس کے ہاتھ رہیں، اور تب یوں ہی جیسے اُٹھنا اچانک لگا اور وہ بیٹھا رہ گیا ـــــ تین

پھر رات کے ساتھ، تین حصّہ تنخواہ بھی جا چکی تھی ——

"—— مونو کا نام کٹ گیا —— "

"—— کیوں —— ؟"

"—— تین مہینے سے فیس نہیں جمع ہو پائی ہے نا ——"

"—— آج کمبخت لائٹ کو کیا ہو گیا ہے —— ؟"

"—— تیسرے بل کی آخری تاریخ گذرے پندرہ روز بیت گئے دوپہر ہی میں وہ لوگ لائٹ کاٹ گئے تھے —— "

—— اس نے بغیر کچھ کہے الماری میں رکھی، پرانی کتابوں کے پیچھے سے ایک گہرے رنگ کی چپٹی بوتل نکالی —— نیچے کے خانے سے ایک گلاس اٹھا کر تین انگل بھر خود کو اس گلاس میں انڈیلا اور ڈھکن کھول کر اس گہرے رنگ کی چپٹی بوتل میں انڈیل لیا —— اور پھر میلی بوسیدہ چادر سے ڈھکی، جگہ جگہ سے ٹوٹی چارپائی پر بغیر تکیے کے بے سدھ ہو گیا —— سویا تو وہ پتہ نہیں کب سے نہ تھا، بس بے ہوش ہی ہوتا تھا —— نیند اس کے اعصاب کی بے چینی کے لیے ناکافی تھی۔

رفتہ رفتہ سامنے خشک پتھر پر بیٹھے پرندے کی بے نیازی دور ہوتی جا رہی تھی —— پاس آنے پر پتہ چلا کہ آسمان میں ایک نہیں دو بڑے پرندے چکّر کاٹ رہے ہیں —— نہیں، یہ تو تین، چار، سات، نہ معلوم کتنے ہیں —— ان کی گردن کے نیچے ڈھیلی ڈھیلی سُرخ کھال جیسے سُرخ گلابوں کے ہار لیے اس کے خیر مقدم کو آرہے ہوں ——

پندرہ بیس ضرور ہوں گے —— اس کے ہونٹ تک ڈھک گئے تھے —— اس نے اتارنا چاہا تو سب نے روک دیا —— فلیش بلب کی چمک سے بار بار آنکھیں چندھیا جا رہی تھیں —— رنگین تصویر میں کنفئی سوٹ پر سُرخ گلابوں کے ہار بہت خوبصورت آئے تھے

ہر طرف مسکراہٹوں کا جمگھٹ، خوش آمدید کے نعرے، ہاتھ، گلے، بوسے، اور ہر ہار —— مگر وہ جلد از جلد ماں کے پاس پہونچنا چاہتا تھا —— چلنے سے معذور، دل کا عارضہ لیے، وہ ہوائی اڈے پر نہ آ پائی تھی اور سب سے زیادہ اسی کو تو شوق تھا کہ بیٹا انجینیرنگ کی ڈگری لے کر لندن سے آئے اور اس کے بڑھاپے کا سہارا بنے بوڑھے باپ نے بھی آبائی زمینیں اسی امّید پر بیچ دی تھیں کہ بیٹا لوٹے گا تو ایسی نا معلوم کتنی جائدادیں ہو جائیں گی —— پر لندن بھی عجیب جگہ ہے، جہاں، جتنے ذرائع پیسہ کمانے کے انسان کو مہیا ہوتے ہیں استنے ہی طریقے خرچ کرنے کے بھی —— جوان دل میں اپنی جوانی کا احساس ہر لمحہ جگائے رکھنے کا خود فراموش ماحول ایک اوسط طبقے کے گھٹے ہوئے ماحول کے نوجوان کے لیے کتنا مضر ہو سکتا ہے، یہ اُس بوڑھے کی امیدوں اور امنگوں نے نہ اندازا —— وہ زمینیں بیچتا رہا، جائداد مٹاتا رہا، ایک حسین اطمینان بخش مستقبل کے سپنوں میں ——، اور اس کے سپنے گول، تکونی، چپٹی، چوکور بوتلوں میں محفوظ ہوتے رہے جینی، میگی، شرلی، لینا کے جوان جسموں کی بے چین مہک سے بستر، صوفہ، بنچ، قالین کو معطّر کرتے رہے —— اور پھر بچی ہوئی کوئی آدھے بسوے کی جگہ، جس پر ایک پُرانا بیری کا پیڑ لگا تھا —— وہ پیڑ جس سے بوڑھے کے گذشتہ ماضی کی بیش قیمت یادیں وابستہ تھیں —— جنھیں وہ بیچنا نہیں چاہتا تھا —— اور پھر وہ پُرانا بیری کا پیڑ، وہ بوڑھا، اس کے سپنے، اس کے حوصلے، اس کی امّیدیں، سب اس آدھی بسوہ زمین کے جُز بن گئے —— ماں نے حسرت سے اپنے لال کے مستقبل کی تاریکی دیکھی —— اور دل تھام کر اس کی تاریکی کا جُز بن گئی ——

مہینوں سے مکان کا باقی کرایہ، بنئے کے تقاضے، اسکول کی فیس جوڑا تو تنخواہ سے تین گنا ہو چکے تھے —— اور اس نے ہمّت کر کے پہلی کی شام کو تنخواہ کی تین گنا بازی لگا دی —— آٹھ دس ہاتھ، گھونسے، لاتیں تیز رفتار گاڑی —— شاید بائیں ٹانگ کی ہڈّی ٹوٹ گئی تھی ——

وہ درد سے بے ہوش ہو گیا ——

—— پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اچانک بند ہو جانے سے ماحول پر دہشتناک سکوت طاری ہو گیا —— اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں —— پرندے اور قریب آ چکے تھے، اُس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا —— یہ پرندے نہیں —— چاروں طرف سفّاک بھیانک چہرے، تگڑے، تندرست، تیر کمان، ترکش، شمشیر، خنجر، نیزوں سے لیس ——

"نہیں —— !" اُس نے چلّانا چاہا مگر سوکھی رگوں میں آواز پھنس کر رہ گئی ——

"میں شش ماہہ شیر خوار نہیں رہا ہوں، یہ تین پھلوں کا تیر مجھ پر مت چلانا —— نہیں —— میں اٹھارہ سال کا کڑیل جوان نہیں ہوں یہ نیزے کا وار میرے سینے پر مت کر —— میں اپنے نفس کی قربانی پہلے ہی دے چکا —— اے شقی، یہ خنجر میرے سوکھے گلے پر مت آزما —— میں حسین نہیں ہوں —— مجھے یوں شہید مت کر، میں جینا نہیں، مرنا چاہتا ہوں اے پسر سعد میں یزید کی بیعت کرنے کو تیار ہوں —— اپنے ساتھیوں سے کہہ دے وہ اپنے تیر، نیزے اور خنجر مجھ سے دور رکھیں —— کیوں کہ میں جینا نہیں مرنا چاہتا ہوں —— "

باقی صفحہ ۱۹ پر دیکھیے

یوسف جمال

دعا کی کشتی میں صدائیں

دعاؤں کی کشتی میں بیٹھی
تشویشوں کی موجوں سے
جنگ کر رہی ہیں
مری صدائیں
جن کے بابِ قبولیت سے
ٹکرانے سے قبل

یہی خدشہ ہے لاحق
تشویشوں کی امواج سے
قبولیت کے در تک
فاصلہ ہے جو بھی

اس کے درمیاں
کالی شب، بے چہرہ فضا کی
حدِ فاصل کھنچی ہوئی ہے ——
ایسی دھندلی راہگذر میں
قبولیت کے در تک کیسے پہنچ سکیں گی
مری صدائیں
بھول بھلیوں میں .... کھو جائیں گی
مر جائیں گی
مٹ جائیں گی
مری صدائیں
دعاؤں کی کشتی میں بیٹھی
حشر سے پہلے
اپنا حشر دیکھ رہی ہیں

عیدگاہ، نئی آبادی مراد آباد (یوپی)

نظام ہاتف

اعتراف

سپاٹ اعتراف میں
یہ سبز روشنی سی کیوں ؟
شکست نام پر شفیق انحراف کے طفیل
دمک یہ کوکبی سی کیوں ؟

نہارت و مفاہمت کا ہر لحاظ اجنبی ——
مصالحت کے نام پر یہ طمطراق بھی عجیب تھا
ثبوتِ باطنی نہ تھا

گریز میں قبول درد
اعتبار و اشتباہ
فربہ فربہ، تازہ تازہ روزِ حشر کی طرح !
انانیت میں جارحانہ خوف اپنے آپ میں
جیسے سمت کی تلاش
یہ ذریعۂ معاش

شرط شرط زندگی
وجہ خودکشی نہ تھی
اور پا سدائیاں بھی تھیں

انقباض و انبساط دھڑکنوں کے ذیل میں
باقیات کی طرح
نبض چھوڑتے گئے

گوشِ ہوس سے سماعتیں بھی چھین لی گئیں
اور ہم "خدا کی طرح" دیکھتے رہے فقط

راج گانگ پور ۷۷۰۰۱۷ (اڑیسہ)

اشہر ہاشمی

۳۱۔ روشن گلزار لین ، ہوڑہ ۔ ۷۱۱۱۰۱

نئی شاعری میں قاری کی تخلیقی شرکت

تخلیقی عمل ، ایک جملے میں، معلوم KNOWN سے معدوم UNKNOWN تک کا سفر ہے۔ آج کی شاعری میں اس سفر کا آغاز زندگی کی بے مقصدیت کی وحشت انگیز آگاہی سے اور اُس کا اختتام اسی آگاہی کے شائستہ اظہار پر ہوتا ہے۔ موجود سے غائب، وحشتناکی سے شائستگی اور ادراک سے اظہار تک کے تمام مراحل میں ایک سچا فن کار (لفظ کے صحیح معنوں میں) تنہا ہوتا ہے اور اُس کا فن پارہ نامکمل۔ چونکہ فن کار معلوم سے نامعلوم کی طرف جست لگاتا ہے اس لئے اس کی دریافت تک رسائی اور تخلیق کی تکمیل کے مرحلے میں قاری کی شرکت لازمی ہے۔ شرکت کی نوعیت اگر تخلیقی نہ ہو تو کمال کے باوجود فن کار کی تنہائی اور اکائی کے باوجود فن پارے کی عدم تکمیل اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اس جمود کو توڑنے یعنی قاری کی تخلیقی شرکت یقینی بنانے کے لیے فن کار کو بھی کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص اس کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ سفر معلوم سے معلوم تک کا نہیں ہو۔ اس کو کہیں حدیں پھلانگنی ہوتی ہیں کہیں پابندیاں توڑنی ہوتی ہیں اور کہیں اپنے نئے ضابطے بنانے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں غالب کی مثال سامنے رکھی جاسکتی ہے جس نے لفظوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں ایک نیا پن رکھا تھا۔ لفظ کی معنوی تہہ داری غالب کی منصوبہ بند کوشش کا حصہ تھی اور اسی لئے غالب کے اشعار یکے بعد دیگرے کئی معنوی تہیں کھولتے نظر آتے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

یہ عمل احساس اور اظہار دونوں سطح پر غیر معمولی اختراعی صلاحیتوں کے مالک فن کاروں کے یہاں ہی صورت گیر ہوتا ہے۔ غالب نے لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنایا تو کئی دہائی آگے نکل کر دم لیا۔ وہ طلسم اب ان معنوں میں ٹوٹ رہا ہے کہ غالب نے لفظ کو جو نئی معنوی جہتیں دی تھیں وہ عام قاری کے دائرۂ فہم میں سما رہی ہیں۔ "غالب شناسی" اور "تفہیم غالب" اب جاکر عام سی چیز بن رہی ہے۔ غالب اپنے عہد میں ناقدری کا شکار رہا۔ دلی ہو یا کلکتہ اسے بادِ مخالف کا ہی سامنا کرنا پڑا اگرچہ کہ ہر عصر تنقید ہمیشہ کسی بدنیتی کا شکار رہی ہے اور حقیقت کی دریافت کا بار آنے والی نسل پر لاد کر گذرتی آئی ہے اس لئے غالب کے بعد غالب کی صحیح قدر و قیمت کا تعین ہو سکا۔ غالب کا انفرادی رویہ آج کی شاعری کا عام یا اجتماعی نہیں رائج رویہ فرور ہے۔ شاعری تجربہ گاہ میں ہے۔ نئے نئے تجربات سے کچھ صحت مند دریافتیں بھی ہوئی ہیں ان میں لفظ کو معنوی تہہ داری عطا کرنے کے رجحان کی دریافت بہت اہم ہے

الفاظ کے سر پر نہیں اُڑتے معنی الفاظ کے سینے میں اتر کر دیکھو

آج کا شاعر نئے پن کی تلاش میں ہے۔ وہ جانی پہچانی حدوں میں رہ کر اپنی فنی صلاحیتوں کو زنجیر بند نہیں کرسکتا ہے۔ حدیں پھلانگ جاتا ہے تو آزاد غزل یا دو بحری غزل یا نثری غزل جیسی کوئی چیز دریافت ہوتی ہے [اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کی یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے کہ کسی نے نثری غزل لکھنے کی جرأت نہیں کی "کتاب" (لکھنؤ) کے الوداعی شمارے سے قبل کے کسی .... بلب شمارے میں ظفر صہبائی کی ایک نثری غزل چھپ چکی ہے۔]

نیا شاعر پابندیاں توڑنے پر آتا ہے تو نظموں میں کوئی نئی صنف ایجاد کرنے میں ناکام رہنے کے باوجود "سانیٹ" اور "ہائکو" جیسی مختصر نظمیں اپنا لیتا ہے۔ نئے پن کی تلاش بہرحال ہر کوشش میں موجود ہے اور بقول خلیل جبران "بغاوت کرنے والا عنصر میں ہوں کہ مجھے ہر وقت کسی نئی چیز کی تلاش رہتی ہے"۔ نیا شاعر حدیں توڑ کر نئے ضابطے بناتا ہے تو اس کا اعلان بھی کرتا ہے۔

یہ سفر معلوم سے معلوم تک کا ہے منیر میں کہاں تک ان حدوں کے قید خانوں میں رہوں

معلوم سے معلوم تک کا سفر مروجہ چوکھٹے میں فٹ بیٹھنے کا عمل ہے۔ ایک ہی تجربے کو دہرانے کا مرحلہ ہے یا صرف ایک لفظ میں تکرار ہے۔ جب کہ فن کا تقاضہ ہمیشہ کوئی نئی دریافت رہا ہے۔ "گھوڑا" مقبول فدا حسین کی پینٹنگس کی نئی دریافت ہے۔ گھوڑے کو انھوں نے ہر پہلو سے پینٹ کیا ہے۔ حسین کی پینٹنگس سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ گھوڑا انہیں کہاں ملا تھا مگر گھوڑا پینٹ کرنے لگے تو جو کچھ بھی کینوس پر پیش کرنا چاہا گھوڑے کی علامت قائم کر کے رنگوں اور لکیروں میں بکھیر دیا۔ نئی شاعری کی طلب بھی ایسی ہی کسی نامعلوم جزیرے کی دریافت ہے جس تک پہنچ کر شاعر اطمینان بخش مسرت سے ہمکنار ہوتا ہے اور قاری حیرت آمیز خوشی سے۔

شاعری میں نیا تجربہ، نیا مشاہدہ، نیا اسلوب، نیا پیرایۂ اظہار، نئی علامتیں ہوں یا پھر الفاظ کی نئی معنوی پرتیں۔ اس سمت میں پیشقدمی کی پہلی شرط ہی نیا پن ہے جو روایت کی توسیع سے آئے یا انحراف سے۔ نئی غزل محبوب سے بات کرتی ہے مگر صرف محبوب سے بات نہیں کرتی۔ نئی غزل انقلاب کے جذبے کا تخلیقی اظہار کرتی ہے مگر صرف "انقلاب زندہ باد" نہیں چیختی۔ نئی غزل روایت کی توسیع ہونے کے باوجود روایت سے الگ ہو گئی ہے اتنی الگ کہ اُسے آسانی سے پہچانا جا سکے۔ غزل اور نظم دونوں ہی اصناف میں آج کی شاعری زینہ بہ زینہ ان گنت تبدیلیوں سے بہ لحاظ ہئیت و مواد موجودہ صورت میں آسکی ہے جس میں بلا شبہہ فن کاروں کی تخلیقی کاوشوں کا ہاتھ ہی ہے۔

صرف اک خواب بھی جدید غزل　　ناز کر ہم سے بے کمالوں پر　　[بشیر بدر]

نئی شاعری عہد جدید کی مادی ترقی کے تمام اسباب و اثرات سے براہ راست آشنا ہے۔ نئی شاعری یوں اپنے عہد کا منظر نامہ تیار کرنے میں کامیاب رہی ہے کہ اُس سے نئے آدمی کو نفسیاتی کیفیات کے ساتھ تمام اخلاقی اور سماجی رویوں کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔

کوئی درمیاں سے نکلتا گیا　　نہ دیکھا کسی ہم سفر کی طرف　　[بانی]
وہ جلا جائے گا جو کھٹ پہ چراغ　　روشنی گھر میں نہ آنے دے گا　　[قیصر شمیم]
آوارہ مزاجی نے پھیلا دیا آنگن کو　　آکاش کی چادر ہے دھرتی کا بچھونا ہے　　[ندا فاضلی]
یوں برت کر یہ دنیا جیئے ہم　　جیسے مر کر دوبارہ جیئے ہم　　[محشر بدایونی]
ہر لمحہ نئی میز نئے کھانوں کی خوشبو　　دنیا ہمیں پابند وفا ہونے نہ دے گی　　[فضیل جعفری]
ڈھونڈتی تھیں شام کا پہلا ستارہ لڑکیاں　　کھیل کیا تھا بس کوئی خواہش کہیں جاگی کی تھی　　[شاہد حسن]
ایک خطّ جو میرے اندر ہے　　سبز ہوتے ہوئے بھی بنجر ہے　　[کامل اختر]
لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں، سُکھ ان سے عجب　　ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ　　[پروین شاکر]
خود جن کی ہتھیلی پہ ہوں سوراخ ہزاروں　　وہ دینا بھی چاہیں گے تو کیا دیں گے کسی کو　　[شمیم انور]

درج بالا تمام اشعار میں کوئی نہ کوئی نیا تجربہ ضرور نظم ہوا ہے۔ منزل کی دھن میں ہمسفروں کے رُخ اور ان کی رفتار کو دیکھے بغیر ان کے درمیان سے سر جھکائے نکلے جانا بانی کا تجربہ ہے تو چوکھٹ پہ چراغ جلا کے روشنی کی طلب پوری کر دینے کے ساتھ اندھیروں سے پہلو گیر بھی رکھنے کی سیاست قیصر شمیم کا مشاہدہ۔ درج بالا اشعار میں شاید کوئی شعر بھی کسی پرانے شعر کے نفسِ مضمون میں توسیع اس کی تنسیخ یا تردید پر مبنی نہیں ہے۔ ان اشعار میں تجربے کی ندرت اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ اثر انگیزی ہی کی ترقی یافتہ شکل شعر سے قاری کی وابستگی ہے لیکن مذکورہ اشعار میں سے کسی میں بھی یہ وابستگی محض ایک قدم آگے بڑھ کر قاری کو تخلیقی شرکت کی دعوت نہیں دیتی۔ نیا تجربہ ضرور نظم ہوا ہے مگر الفاظ کے ساتھ ایسا کوئی برتاؤ نہیں ہو سکا جو نئی معنوی جہتیں کھولے۔ لفظ پرت اندر پرت یا پھر اکہری مگر نئی معنوی کائنات کی سیاحت پر نہیں لے جاتا۔ اس کے برعکس دیگر اشعار کے [illegible] غالب کا یہ زباں زدِ عام شعر:

موت کا ایک دن معیّن ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

"گنجینۂ معنی کا طلسم" کے دعوے کی صداقت بیان کرتا ہے۔ شارحین نے اس شعر کی تشریح مختلف طریقوں سے کی ہے اور ہر تشریح اپنی جگہ درست ہے۔ واضح رہے کہ شارح یا ناقد قاری کے اعلیٰ ترین طبقے ہی کا فرد ہوتا ہے۔ اس شعر میں دراصل لفظوں کے ساتھ غالب کے منصوبہ بند برتاؤ اور اس برتاؤ پر غالب کی فن کارانہ گرفت نے ایک سیدھی سادی سی شے "بے خوابی" کو اس طرح شعر کے قالب میں ڈھالا ہے کہ لفظوں کا دروبست معنی کے نئے ابعاد سامنے لاتا ہے

لیکن جیساکہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ غالب کی ادق پسندی، ابہام پرستی اور ڈگر سے ہٹ کر چلنے کے انفرادی رویے نے جس روایت کی بنیاد ڈالی ہے وہ آج رائج رویہ ہے۔ نئی شاعری زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس سال پہلے کی شاعری سے قطعی مختلف ہے۔ بالخصوص ڈکشن نے اسے یکسر بدل ڈالا ہے۔ نئی شاعری میں معنی آفرینی کا شناخت نامہ بدل چکا ہے لفظ کا استعمال تجرباتی مراحل میں ہے کہ اس سے کتنے اور کیسے نئے مفاہیم نکالے جاسکتے ہیں شہریار کے یہاں خواب مستقبل کے معنی میں مستقلاً استعمال ہو رہا ہے۔ باقر مہدی لال رنگ کہنے کے بجائے کالے سے اپنی تخلیقی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں۔ بانی سبز کو سبز لکھنے کے بجائے فصل یا فضا لکھ کر بھی اپنا مدعا بیان کر جانے میں کامیاب ہی رہے۔ جب پس منظر یہ ہو تو شاعری میں قاری کی تخلیقی شرکت لازمی ہو جاتی ہے۔

ایسے میں اگر مثال کے طور پر درج ذیل اشعار پڑھنے کو ملیں تو قاری اور شاعر کے درمیان ایک فاصلہ اپنی موجودگی کا فوراً ہی احساس دلا دیتا ہے۔

ہنسی معصوم سی، کاپی پہ بچوں کی عبارت سی — ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی [بشیر بدر]

غزل کی غین کا نقطہ کہاں ہے — قدم رکھیں کہاں رستہ کہاں ہے [عادل منصوری]

قاری کو بشیر بدر کا شعر سُن کر گذر جانے میں ہی عافیت نظر آئے گی مگر چونکہ آج کی شاعری سننے سے زیادہ پڑھنے اور پڑھنے سے زیادہ غور و فکر کا تقاضہ کرتی ہے لہذا اس تقاضے کا اطلاق ہوتے ہی قاری کی نگاہ میں تین پیکر ابھرتے ہیں (۱) معصوم سی ہنسی (۲) کاپی پر بچوں کی عبارت اور (۳) ہرن کی پیٹھ پر بیٹھا پرندہ۔ دوسرا پیکر زیادہ اہم ہے۔ بچے کاپی پر بے مقصد عبارتیں کاڑھتے ہیں۔ قلم یا پنسل سے کچھ آڑا ترچھا بنا دیا۔ اس حرکت میں بے مقصدیت اور معصومیت کا امتزاج ہوتا ہے۔ ایسی ہی بے مقصدیت اور معصومیت اس مذکورہ ہنسی میں ہے مگر اس کا ردِّ عمل؟ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ وہ معصوم سی ہنسی جو صرف ہنسی تھی بے مقصد سی، جس میں "یلو سگنل" جیسا کوئی پیغام نہیں تھا بے ارادہ سی، جیسی کہ کاپی پر بچوں کی لایعنی عبارت جیسی کہ ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت۔ مگر بشیر بدر نے شرارت کے بعد ہرن کے ردِّ عمل کو مخفی رکھ کر قاری کو ایک پیغام دیا ہے کہ وہ اس شعر کی تکمیل اب اپنی تخلیقی شرکت سے کرے۔ پیٹھ پر بیٹھے پرندے کا چونچ مارنا لازمی ہے پرندے کی چونچ لگنے کے بعد ہرن قلانچیں بھرنے لگتا ہے اور جنگل کی تہذیب خوب جانتی ہے کہ ہرن کی قلانچوں اور خوشی کا رشتہ کتنا اٹوٹ ہے۔ قلانچیں اس شعر میں بھی بے پناہ خوشی کی مخفی علامت ہے۔ کسی معصوم، لایعنی، بے ارادہ، بے مقصد ہنسی نے شاعر کو ویسا ہی مسرور کر دیا ہے جیسے کہ جنگل کی وسعتوں میں قلانچیں بھرتا ہرن۔ یہاں ایک نامعلوم جزیرے کی دریافت مکمل ہوتی ہے۔ شعر کہہ کے شاعر کو اطمینان بخش مسرت ملتی ہے اور شعر تک پہنچ کر قاری کو حیرت آمیز خوشی۔

عادل منصوری کے شعر میں غزل کی غین کا ناموجود نقطہ قاری کو تخلیقی شرکت کی ترغیب دیتا ہے۔ آگے بڑھنے کے بے پناہ جذبے سے راستے کی گمشدگی کے تصادم کے ذریعہ موجودہ نظام کے خلاف احتجاج ہے جس میں کسی خواہش کو معرض وجود میں آنے سے قبل ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ ویسے خواہش اور اس کی تکمیل کے درمیان کا سارا سفر مکمل ہوتا ہے مگر غ کے نقطے کے بغیر عزل۔ لفظ "عزل" کا لغوی معنی اس شعر کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔ پھر وہی ایک نامعلوم جزیرے کی دریافت شاعر کو اطمینان بخش مسرت اور قاری کو مسرت آمیز حیرت حاصل ہونے کے عمل کی تجدید ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں شعر میں شاعر نے معلوم سے معدوم تک جست لگا کر وہ اکائی دریافت کر لی ہے جو شعر بن کر سامنے آتی ہے۔ قاری اس شعر کو اس مقام سے پکڑتا ہے، لفظوں کے سطحی استعمال کے اعتبار سے شعر جس کے بہت پہلے شروع ہوا اور شعر کی رو میں وہاں تک جاتا ہے جس سے بہت پہلے شعر ختم ہو چکا تھا۔ قاری کی یہی کوشش شاعری میں اس کی تخلیقی شرکت کا درجہ رکھتی ہے اور نئی شاعری کا ایک حصہ ضرور ایسا ہے جو بہر حال قاری کی تخلیقی شرکت کا طلب گار رہے۔ ❁

شاہدہ تبسم

نظر کے پاس کا منظر بھی دل کو لگتا تھا
بصیرتوں میں مگر اور بھی تماشا تھا
ستارے توڑ کے لانے کی ضد ہی اسکی تھی
اور اپنے قول سے پھرنے میں بھی وہ سچا تھا
ہوائے شام میں مستور ہو گیا ہوگا
سماعتوں پہ گراں گریہ جو کسی کا تھا
حصارِ گردشِ بے خانماں کی زد میں رہا
وہ ایک لمحہ کہ ہر آن مجھ میں رہتا تھا
میں پانیوں کے سفر میں بہت اداس رہی
وہ میرے ساتھ تھا اور اپنی راہ چلتا تھا
سوادِ خواہشِ دل آئینہ تراشِ نظر
ہر ایک عکس کا چہرہ لہو میں بھیگا تھا
رہینِ گل سخنی بھی کسی کے لب ٹھہرے
اور آستین میں خنجر بھی اس کو سجنا تھا
اس ایک رات کو میں پور پور گنتی تھی
پرانے خرابۂ ہستی اسی سے بچنا تھا
تمام عمر رہے گی مجھے اب اس کی تلاش
وہ ایک شخص کہ جو تجھ میں تجھ سے اچھا تھا

● ۵/۱۱۶۵ فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی (پاکستان)

محسن جلگانوی

یہ طے شدہ ہے کہ پت جھڑ میں ہے اجڑنا بھی
مگر زمین سے اپنی نہیں اکھڑنا بھی
ہمیشہ ٹھیک نہیں مصلحت سے چپ رہنا
کبھی کبھی تو کسی مسئلے پہ اڑنا بھی
تمام شہر کی نیندیں حرام کر دے گا
مہاجروں کا مسلسل پڑاؤ پڑنا بھی
نحیف چڑیا کو قربت میں جان کا جوکھم
پڑوسی ناگ سے اچھا نہیں جھگڑنا بھی
وجود سایہ میں پہنا دوں دھوپ موسم کو
کہ اب کی بار تو آندھی میں ہے اکھڑنا بھی
بہت ستائے گا پردیس کا جنوں موسم
مگر یہیں پہ سنورنا بھی ہے بگڑنا بھی
تعلقات پہ کچھ اور ہی گماں گذرے
ہجومِ شہر میں ہم سے اگر بچھڑنا بھی
بڑا ضمیر، بڑا ظرف چاہتا ہے میاں
یہ اپنے آپ کا اپنے خلاف پڑنا بھی

● ۸/۶۷۸ ریلوے بلڈنگ، ساؤتھ لال گوڈا، سکندرآباد

قطب سرشار

مشروطِ اعتماد ہوں پابند ہوں ابھی
مخلص رفاقتوں کی میں سوگند ہوں ابھی
کھلتا نہیں اگر تو معمّہ نہ جانیئے
مٹھی کی طرح اپنے تئیں بند ہوں ابھی
اُگتے ہیں حادثات کی مٹی سے قہقہے
زخموں سے چور چور سہی خند ہوں ابھی
لٹنے کا اب تو جیسے سلیقہ سا آ گیا
پیراہنِ دریدہ کا پیوند ہوں ابھی
زہراب ہے کہ جسم کی نس نس میں بھر گیا
تلخی اشتہار نہیں قند ہوں ابھی

● لکچرر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ جونیر کالج ظہیرآباد ۵۰۲۲۲۰

فاروق راہب
محلہ شانتی پوری، موتی ہاری۔ (بہار)

راستے کی واپسی

سیلاب کا زور آخر اتنا بڑھا کہ بند ٹوٹ ہی گئے!

دریا میں طغیانی تھی اور کنارے ڈھلتے جا رہے تھے۔ سب کچھ بہالے جانے کے لئے پانی کا ریلا بڑھتا آرہا تھا ــــ لیکن ہیجان انگیز نظارہ تک پہونچنے کے لئے ساحل ہی نہیں تھا!

اس کے اندر اٹھے ہوئے طوفان نے اسے توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا بس وہ فریم میں کسے ہوئے چکنا چور شیشے کی طرح تھی۔

سامنے دور دور تک پھیلے سبزے کے بیچوں بیچ کھڑے ہوکر طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا ہر منظر اس نے اپنی آنکھوں میں متعدد بار اتارا تھا اور زندگی سے بھرپور قہقہوں کی یورش سے اس نے شبنمی ماحول کو نغمگی بخشی تھی ــــ تب اس کے پاس جیون کی ساری شکتی تھی، جن کے سہارے وہ باہیں پھیلائے بہت دور تک بتا ہانپے دوڑ جایا کرتی!

مگر اب سب ہوتے ہوئے بھی کچھ تو نہ تھا ــــ چاروں طرف ہریالی سے بھرا ہوا میدان اسے ریگستان کی طرح سونا اور بھیانک لگ رہا تھا!

عمر کی ایک مضبوط سلاخ سے ٹوٹ کر اسے کتنا کمزور بنا دیا تھا! لیکن اپنے آپ کو اپنے آپ سے چھین لینے کی سعی لاحاصل میں وہ برابر کی شریک تھی!

اُس نے ایک جھٹکے سے کھڑکی کے پٹ بند کئے اور میز پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

اپنا ہی لہو شریانوں میں رک کر اسے زندگی سے کتنی دور لے جا رہا تھا! خون روتی آنکھوں کے دروازے سے ساری سرخیاں نکلتی جا رہی تھیں، مگر درد کی ٹھوکروں پر ٹکے ہوئے دماغ کی تمام نسوں کا تناؤ اپنی جگہ قائم تھا۔

اپنی سوچوں کے محدود دائروں میں گھر کر ذہن رفتہ رفتہ ماؤف ہوتا جا رہا تھا اور جسم پر زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔

اپنی پلکوں کے دائرے میں سمٹے نیلے خوابوں کے لئے ہی تو وہ اتنی دور نکل آئی تھی اور اپنی پہچان سب سے الگ بنائے رکھنے کی تگ و دو میں اسے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کبھی مہلت ہی نہ ملی ــــ اور آج جب اسکے سارے سپنے بوند بوند آنکھوں کے راستے بہتے جا رہے تھے تو کسی کی خاک و خون میں لتھڑی تمناؤں کی یاد دل میں کچوکے لگا رہی تھی۔

اپنی آرزوؤں کا تازہ مہکتا سرخ گلاب لئے جب وہ اپنے نئے گھر پر اپنے کھنڈر نما مکان کی دیمک زدہ دہلیز کو پار کر کے دھند میں ڈوبے کمرہ میں داخل ہوئی تو اس کے سواگت کے لئے دو کنکال کھڑے ہوئے ملے۔ اسے دیکھ کر ان کی نیم روشن آنکھوں کے نیچے سیے ہونٹ چہرے پر شاید مسکراہٹ کی دلیل میں ذرا کھنچ گئے آیا ــــ اور بس!

پھر وہی خاموشی کا سیلاب انہیں ڈھکنے کے لئے چلا آرہا تھا کہ بہت گہرے اندھے غار سے صدا سی ابھرتی محسوس ہوئی۔

"یہ گھر اب تمہارا"۔

"یہ گھر ہے یا قبر؟" وہ چیخ پڑی۔

اس کے دل کی تمام تر گہرائیوں میں سکڑی سمٹی ساری چیخوں کا ایکبارگی باہر نکل آنا لازمی بھی تھا، کیوں کہ اُس نے اپنی ساری تمناؤں کو ایک ایک کر کے صلیبوں پر لٹکا ہوا دیکھ لیا تھا اور گہری دھند میں پھنسی ہوئی گھٹن کے پنجوں کا دباؤ اپنے گلے پر محسوس بھی کرنے لگی تھی۔

کہاں سے چل کر وہ کہاں پہونچنا چاہتی تھی ــــ مگر پہنچی کہاں ــــ؟

وہ بہاروں سے سجے ہوئے اپنے جسم کا ٹوٹتا ہوا منظر اتنی جلد دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنا علم بغاوت بلند کیا اور ایک ماہ کے اندر ہی اپنی سرد جنگ کے دوران اس نے اعلان کردیا

کہ وہ اب یہاں نہیں رہ سکتی!

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

ایک زبردست آندھی سی تو اٹھی تھی جو انہیں خس و خاشاک کی طرح اڑا لے گئی۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے!" اندھے کنویں کی اتھاہ گہرائی سے ابھری اسی مدھم آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ "ابھی تو یہ نمودار ہوتی صبح کے ساتھ ٹھیک سے کھڑی بھی نہ ہو پائی ہے کہ تم اسے رات کے گہوارے میں ڈال دینا چاہتے ہو۔"

تب سے وہ اسی راستے پر آگے اور آگے بھاگتی رہی تھی لیکن اس کے اپنے ہی بنائے ہوئے اسپیڈ بریکر نے جب اسے سخت ٹھوکر ماری تو اس کے بھاگنے کا یہ سلسلہ اچانک ہی رک گیا تھا ___ اور اب وہ اپنی تنہائی کی زخمی ہتھیلیوں کی مدد سے اپنی چوٹوں کو سہلا رہی تھی!

جب دل و دماغ پر چھائے گرد و غبار کی تہیں ذرا ڈھیلی ہوئیں تو اس نے میز سے سر اٹھایا اور دراز سے البم نکال کر الٹنے لگی

اس کی ایک سال کی عمر سے لے کر شادی تک کی ساری تصویریں اس میں لگی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

پہاڑ جیسی مصیبتیں سہہ جانے والے جسم کی اپنی ہی کوکھ سے جنمے کیڑے کے ذریعہ دی گئی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی!

بیس سال کے طویل عرصے کے گذر جانے کا اسے احساس بھی نہ ہوتا اگر وہ بجلی کے جھٹکوں کا شکار نہ ہوتی! عروج و زوال کی کئی سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے کے دوران وہ اَن گنت بار مشکلات میں گھری تھی ___ مگر ایک بار بھی حوصلہ شکن نہ ہوئی!

لیکن اب اسے سب کچھ بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ کوئی شے اپنی جگہ پر نہ تھی جیسے وہ بے خیالی میں ریت کا محل تعمیر کر گئی ہو!

جو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکی تھی، وہی بات ہو گئی!

اور اب دل میں کسی کا اتارا ہوا خنجر کہرام مچائے ہوئے تھا۔

پھولوں کے شوق میں بھٹکی زندگی شعلوں میں کھڑی تھی اور اپنے ہی عضو کی غداری نے اسے اذیت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

بے وفا ساعتوں کی مہربانیوں پہ وہ جھنجھلاتی ہوئی اٹھی، البم کو بند کیا اور قدرے پرسکون جگہ کی تلاش میں کوئی قدم اٹھانا ہی چاہ رہی تھی کہ آہٹ ہوئی اور وہ پھر چیختی بلکتی ہوئی اس طرف دوڑی۔

"تم آگئے!"

اور اس کے سینے پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگی۔

"صبر سنی! صبر سنی!!"

وہ اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتا ہوا بولا۔

اسے ہم لوگوں کا ساتھ اتنی جلد چھوڑنا چاہئے تھا ___ ؟ لیکن کتنی جلدی کی اس نے بہو کی باتوں میں آکر، جیسے اس نے میری کوکھ سے جنم ہی نہ لیا ہو!

"وہ اپنی ہمسفر کے ساتھ جیون کی نئی راہ کی اور گیا ہے، اسے بھول جاؤ۔ انہیں موج مستی سے جینے دو۔"

"میں اسے کیسے بھول جاؤں جسے میں نے اپنا لہو دے کر پالا ہے۔"

اپنی مرضی سے جینے کا حق تو اسے دینا ہی ہو گا۔"

"ہم لوگ اس کے کوئی نہیں ہیں؟ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ ہماری اس سے امیدیں یونہی تھیں؟"

"اس کے لئے اتنا پریشان ہونے اور جان دینے کی ضرورت بھی کیا ہے!"

تقریباً جھنجھلاتے ہوئے سے لہجے میں وہ بولا۔

"اس نے وہی راستہ تو اپنایا ہے جس پر چل کر تم ایک دن یہاں تک آئی تھیں۔"

اس کے زخموں میں پھر ناخن ڈوب گئے!

وہ درد سے تلملائی اور تڑپ کر اس سے دور ہٹتی ہوئی اسے بھونچکی سی ایک ٹک دیکھنے لگی۔ چند ثانئے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کا احساس تو مجھے بھی ہے کہ مجھے میرے کئے کی ہی سزا ملی ہے۔"

پھر وہ اس کے قریب آئی اور اس کی چھاتی سے لگ کر بولی۔

"مجھے واپس لے چلو اپنے اسی پرانے مکان میں۔"

"وہاں تم اب ملبے کے ڈھیر میں کیا ڈھونڈنا چاہتی ہو!"

"نہیں مجھے لے چلو۔ میں اس میں پھر سے بہاروں کو لوٹاؤں گی تاکہ گذری ہوئی آتماؤں کو سکون حاصل ہو اور وہ مجھے معاف کر دیں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش تو ہو گئی، لیکن آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اسے ہولے ہولے تھپکی دیتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، بہت دیر ہی سے سہی! تم اپنی واپسی کے لئے راضی تو ہوئیں۔"

حدِ فکر و نظر سے دُور لے جا
خیالوں کے سفر سے دُور لے جا

فضا میں زہر شامل ہو گیا ہے
ہواؤں کے اثر سے دور لے جا

خدایا جنت و دوزخ سے دینا
مجھے اس خیر و شر سے دور لے جا

شگفتہ پھول مرجھانے لگے ہیں
کلی کو دیدہ ور سے دور لے جا

ہوا کے دوش پر اُڑنے لگا ہوں
مجھے دیوار و در سے دور لے جا

ہنر مندی مرا شیوہ ہے شاہد
مجھے ہر بے ہنر سے دور لے جا

ندیم اسٹور، ۱۱، قاذی کیمپ، بھوپال

اس کی یادیں اور میری زندگی
ریزہ ریزہ خواب، زخمی زندگی

خواہشوں کا اک سمندر دور تک
جس میں غوطہ زن ہے پیاسی زندگی

دشمنی، غیبت، عداوت، دھمکیاں
اس قدر نخرے ذرا سی زندگی

خون کے چھینٹے در و دیوار پر
موت ہے صیّاد، قیدی زندگی

آسماں پر نام لکھنے کی للک
اور زمیں پر خوف کھاتی زندگی

۱/۱ مدار تلہ لین (دپل خانہ) ہوڑہ ـ ۱

احسان یوں تو کب بھلا ہم پر تیرے نہ تھے
ایسے بھی زندگی کبھی تیور ترے نہ تھے
غیروں پہ انحصار تھا آخر وہی ہوا
جب پیاس بڑھ گئی تو سمندر ترے نہ تھے
مانگے کا جو خیال ہو کھاتا ہے چغلیاں
نواز رہا تھا جن سے وہ شہپر ترے نہ تھے
آئے تھے تیری سمت سے یہ اور بات ہے
میں جانتا ہوں دوست وہ پتھر ترے نہ تھے
یہ سرپھری ہواؤں کے بس میں تھے اے خلش
کشتی تری مفروری لنگر ترے نہ تھے

پتی ٹریڈنگ کارپوریشن، ٹیلہ گاج سنگھ، بالمقابل تاج ٹاکیز، ہینگ کی منڈی آگرہ

زخم کچھ ایسے دے کے گیا دارائی کا کرب
بھوگ رہا ہوں مدت سے تنہائی کا کرب
یہ تو سُرخ سلگتا سورج ہی جانے ہے
کتنا بھیانک ہوتا ہے تنہائی کا کرب
تیز ہوا میں تالی بجانے والے پتو!
بانجھ نہ کر دے پیڑوں کو شہنائی کا کرب
ذہن کا میرے روز بدل دیتا ہے موسم
شام ڈھلے سوندھا سوندھا تنہائی کا کرب
توڑ رہا ہے کیوں متحیر آئینے اسلم
غور طلب ہے تیری خود آرائی کا کرب

گنور، ضلع بدایوں (یوپی)

پرویز ید اللہ
۲۱۹۔ بہرام ، باندرہ (مشرق) ، ممبئی ۔ ۴۰۰۰۵۱

دُور درشن کی شال مکھیوں کا جال

دور درشن والوں کی بالواسطہ ستم ظریفیاں "مختلف کاریہ کرموں" کی شکل میں بھگت ہی رہے تھے کہ ایک دن "دوردرشن کیندر" کے بہت قریب سے درشن کرنے کا اتفاق بھی ہو گیا۔ اور یوں ہم اپنی بصارت و بصیرت ، دونوں کی خاصی درگت بنوا کر لوٹے۔ آبیل مجھے مار والے اس تماشے میں خدا گواہ ہے ہماری کسی خواہش کا دخل نہیں بلکہ ہماری شامت کو دعوت دینے میں ہماری "نصف بہتر بلکہ پون بہتر" کا ہاتھ تھا۔ دراصل بیگم صاحبہ کو بڑے زمانے سے اس بات کا قلق تھا کہ برسوں سے اردو ادب کے میدان میں پاپڑ بیلنے کے باوجود نہ تو ہمارے بیلے ہوئے پاپڑوں کو وہ درجہ حاصل ہو سکا نہ ہی ہمیں وہ مقام مل سکا جس کے کہ ہر دو "آئیٹم" ITEM ان کی نظر میں مستحق تھے۔ بیگم کی اس سخن فہمی کو آپ طرفداری پر محمول کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دہی والی اپنے کھٹے دہی کو میٹھا ہی کہتی ہے، تاہم اس سچائی کو ماں لینے میں آپ کو کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہم واقعی طنز و مزاح کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں پنج وقتہ سجدوں ، میں معروف ہیں البتہ پہلی صف میں شامل ہونے کا دعویٰ ہمیں بھی نہیں ، آخری صف میں یقیناً شامل ہیں ۔ "محمود" کے درجہ پر فائیز نہ سہی "ایازوں" کی قطار میں ضرور لگے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ جس بستی میں رہتے ہیں وہاں اُردو زبان اور اس کا ادب بخدا ہمارے توسط سے پہچانا جاتا ہے کیوں کہ اتفاق سے ہم بستی کے واحد اُردو ادیب ہیں چنانچہ اردو زبان اور اس کا ادب ہماری ذات اور غریب خانے سے شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود جہاں تک شہرت کا معاملہ ہے اہلیانِ بستی ہم سے زیادہ ہمارے پڑوسی بھتا جی سے واقف ہیں جو شیر بازار کے نامی گرامی دلال ہیں ان کے علاوہ حاجی خفقان بھی ہم سے زیادہ مشہور ہیں کیوں کہ شہر کے تقریباً تمام غیر سماجی عناصر اور دو نمبر کا کاروبار کرنے والے تاجر پیشہ حضرات سے ان کی گاڑی چھنتی ہے۔ سچ پوچھیے تو اڑوسی پڑوسی ہمیں عزت کی نظر سے زیادہ ہمدردی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ہمیں پچھلے دنوں ہوا۔ ایک روز بیگم صاحبہ حسبِ معمول کسی پڑوسن کے ہاں سے دُکھ درد بٹا کر لوٹیں تو یہ دردناک ماجرا سنایا کہ ان کی سہیلی نے جب اپنے شوہر نامدار سے ان کا تعارف کرواتے ہوئے ہمارے حوالے سے انہیں ایک اردو ادیب کی بیوی بتلایا تو پڑوسن کے شوہر نے اپنی بیوی کو تاکید فرمائی کہ تم اپنی سہیلیوں کو صرف چائے بسکٹ پر ٹرخا دیتی ہو لیکن انہیں کھانا کھلائے بغیر مت بھیجنا کیوں کہ شاستروں میں لکھا ہے کہ ادیبوں شاعروں اور ناداروں کے بال بچوں کی مدد کرنا ثواب میں داخل ہے ــــــ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ اس گداگرانہ سلوک کا جواب ساری بستی میں ہمارے نام کے ڈنکے بجوا کر ہی دیا جا سکتا ہے اور یہ ڈنکے صرف اسی صورت میں بج سکتے ہیں جب ہم ٹی۔ وی کے روشن اسکرین پر کسی دن اپنے ادب کے ساتھ دھڑلے سے نمودار ہو جائیں۔

اتفاق سے انہی دنوں جلتی پر تیل چھڑکنے کے لیے ہمارے وہ پڑوسی جن کی ساری ادبی لیاقت ہماری مختصر سی لائبریری کی مرہونِ منت تھی پتہ نہیں کس طرح دوردرشن والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک پروگرام میں جلوہ گر ہونے میں کامیاب ہو گئے ، پھر کیا تھا جنگل کی آگ کی طرح ساری بستی میں ان کے نام کے چرچے ہونے لگے ، چنانچہ اب بیگم بھی ہمیں شہرت کی اس آگ میں جھونکنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں لڑانے لگیں اور بالآخر ایک دن یہ خوشخبری لے آئیں کہ ان کی کسی سہیلی کی سوتیلی نند کے منہ بولے دیور جو دوردرشن کیندر میں فلور منیجر FLOOR MANAGER کے عہدے پر فائز ہیں اگلی اتوار کو ہم سے ملنے کو راضی ہو گئے ہیں خدا خدا کر کے اتوار کے دن فلور منیجر صاحب تشریف لائے لیکن

دورانِ گفتگو ہم میں کم سے کم اور ہمارے ڈرائنگ روم کے فلور میں
زیادہ سے زیادہ دلچسپی دکھاتے رہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ خود کو
آدمی کم اور فلور منیجر زیادہ سمجھتے ہیں۔ جب ہم نے اصل غرض و غایت
کی طرف ان کی توجہ مبذول کروائی تو بولے ___ پہلی مشکل تو یہ ہے
کہ آپ اُردو میں لکھتے ہیں اور اردو کو خود بڑی مشکل سے دوردرشن کے
پروگراموں میں وقت دیا جاتا ہے دوسری مشکل یہ ہے کہ آپ ایک
ادیب ہیں شاعر نہیں، شاعروں کو دوردرشن والے پھر بھی چانس دے
دیتے ہیں ایک تو شاعر حضرات اپنے ترنم سے ناظرین کو باندھ لیتے ہیں
دوسرے مشکل الفاظ کو اشاروں کنایوں کی مدد سے آدھا بجا کر دکھا کر
قابلِ فہم بلکہ قابلِ ہضم بنا دیتے ہیں ___ کیا آپ اپنا کوئی مضمون ساز
پر سنا سکتے ہیں ترنم کے ساتھ ___؟" اس انوکھے سوال پر ہمارا منہ اچانک
فق ہو گیا ہماری اس دگرگوں کیفیت کو بھانپ کر تسلی آمیز لہجے میں بولے
"خیر کوئی بات نہیں مجھے چونکہ آپ کا فلور بے حد پسند آیا میں آپ کو
کسی نہ کسی طرح دوردرشن کے فلور پر پہنچانے کی پوری کوشش کروں
گا آپ بھی تب تک کسی ہارمونیم طبلے والے کو پکڑ کر اپنے کسی مضمون کی دُھن
فٹ کروانے کی کوشش کیجیے ___!"

اُردو زبان اس کے ادب اور ہماری ادبی حیثیت سے زیادہ
ہمارے غریب خانے کا فلور چونکہ فلور منیجر صاحب کو پسند آیا تھا لہذا
ازراہِ فلور نوازی موصوف نے اگلے ہی مہینے ہمیں اُردو پروگرام "محفل
سوگواراں" میں کھپا دیا۔ بیس منٹ کے اس پروگرام میں اس روز جو مباحثہ
ہونے والا تھا اس کا موضوع تھا ___ "اُردو ادب میں طنز و مزاح"
ہمارے علاوہ اس بحث میں حصہ لے رہے تھے مشہور نقاد ڈاکٹر ص۔ فن
سنساری علامہ پچوڑ ہمدانی اور مشہور شاعر و دانشور جناب دلدار
ساماری ___!!

دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ جیسے ہی ہم وقت
مقررہ پر دوردرشن کیندر پہنچے میک اپ روم انچارج نے ہمیں یوں
اپنی تحویل میں لے لیا جیسے ہم آدمی کا بچہ نہیں مالِ غنیمت کی پوٹلی ہوں۔
اور سلوک بھی ظاہر ہے ویسا ہی کیا جیسا کہ مالِ غنیمت کے ساتھ کیا جاتا
ہے۔ سب سے پہلے ہماری چندیا پر بالوں کے نام پر بطور نمونے کے بچے
رہنے والے "باقیات الصالحات" کو مضحکہ خیز حد تک سنوارا پھر چہرے
کے ان حصوں پر لالی پاؤڈر کی تہہ جمائی جو داڑھی کے پھیلاؤ اور
مونچھوں کے گھماؤ پھراؤ کی زد سے محفوظ تھے۔ پھر ہمارے لباس
پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے فرمایا "آپ کا لباس کسی مُردے کے کفن
سے زیادہ اُجلا اور بے داغ ہے اور سفید رنگ سے ٹی وی کے اسکرین
کو خدا واسطے کا بیر ہے اچھا خاصا لباس پوش آدمی خواہ مخواہ
بے لباس نظر آنے لگتا ہے ___!

اس تشریح کے بعد موصوف نے میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی کھول
کر ایک عدد شطرنجی نما شال برآمد کی جو اس قدر میلی کچیلی تھی کہ اس
کا اصلی رنگ قریب قریب اپنی پہچان کھو چکا تھا پھر بڑی مہارت سے
اس وسیع و عریض شال کا ایک عدد خیمہ بنایا اور ہمیں اس کے اندر
داخل ہونے کی ہدایت فرمائی۔ ہم بمشکل تمام اس میں سما سکے اور جب
ان تمام مضحکہ خیز مراحل سے گزر چکنے کے بعد میک اپ روم میں چاروں
طرف لگے آئینوں میں خود کو دیکھا تو خورشید احمد جامی کا یہ شعر بے ساختہ
یاد آ گیا ___

ہر آئینہ میں کوئی اجنبی مقابل تھا
خود اپنے آپ کو پہچاننا بھی مشکل تھا

اس مشقِ ستم کے بعد میک اپ روم سے فلور منیجر صاحب نے فلور
تک ہماری رہنمائی فرمائی۔ جہاں دیگر شرکائے بحث پہلے سے موجود تھے۔
یوں تو سبھی سے ہماری صاحب سلامت تھی لیکن میک اپ کی تہوں نے
ہمیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بنا دیا تھا اس لیے اپنے تعلق سے ان حضرات
کی آنکھوں میں اجنبیت کا رنگ دیکھ کر ہم نے ایک بار پھر اپنا مفصل
تعارف کروا دیا۔ علامہ پچوڑ ہمدانی ہنستے ہوئے بولے ___ "اچھا ہوا آپ
نے اپنا تعارف کروا دیا ورنہ میں تو اس مغالطے میں تھا کہ ٹی۔ وی
سینٹر والے ہماری سنجیدہ بحث کو مزاحیہ ٹچ دینے کے لیے کسی عجوبے شیخ
کو پکڑ لائے ہیں کہیں سے ___!"

ہمارے نشستیں سنبھالتے ہی ٹی۔ وی کیمرہ حرکت میں آ گیا۔ بحث
کے کنوینر جناب دلدار ساماری نے اپنی لمبی لمبی زلفوں میں بڑے اسٹائل
سے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیاں گھماتے ہوئے بحث کا آغاز کیا ___
"جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں آج کی بحث کا موضوع ہے اُردو ادب
میں طنز و مزاح ___" علامہ پچوڑ نے فوراً ٹانگ اڑائی "قطع کلامی
کی معافی چاہتا ہوں آج کی بحث کا موضوع بظاہر ایک معلوم ہوتا ہے
لیکن اصل میں یہ تین الگ الگ موضوع ہیں پہلا موضوع ہے اُردو،
دوسرا ادب اور تیسرا طنز و مزاح ___!"

ڈاکٹر ص۔ فن سنساری نے جھٹ سے تائید فرمائی ___ "بالکل صحیح

ارشاد فرمایا آپ نے، دراصل ہمارے عزیز دوست دلدار سامری صاحب کے منتخب کردہ مباحثوں اور ایک ہی چھت کے نیچے مختلف اشیا مہیا کرنے والے ڈپارٹمنٹل اسٹورس میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے بہرحال میری حقیر رائے میں پہلے ہم اُردو کے موضوع پر کچھ گفت و شنید کریں گے، پھر ادب پر اور اس کے بعد طنز و مزاح پر —" ڈاکٹر صاحب کے اس خطرناک انکشاف پر دلدار سامری صاحب نے گڑبڑا کر مداخلت کی "میں آپ حضرات کی اس خیال آرائی سے صدفی صد متفق ہوں لیکن تنگیٔ وقت کو دیکھتے ہوئے ہم اگر صرف طنز و مزاح کے موضوع پر بحث کریں تو مناسب ہوگا —!" اتنا کہہ کر موصوف نے راست ہم سے خطاب کیا —" طنز و مزاح کو کچھ لوگ دوسرے درجے کا ادب کہتے ہیں کیا آپ اس سے متفق ہیں —؟" ہم نے جواب میں منہ کھولا ہی تھا کہ ایک عدد مکھی کسی بمبار طیارے کی طرح ہمارے کھلے ہوئے دہن میں لینڈ کرنے کے ارادے سے پتہ نہیں کدھر سے بھنبھناتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کا خطرناک ارادہ بھانپتے ہی ہم نے فوراً اپنا منہ بند کر لیا۔ ہماری اس حرکت کو علامہ نچوڑ نے غالباً مصلحت پر محمول کیا چنانچہ خود مورچہ سنبھال کر شروع ہو گئے —— "ادب میں درجہ بندی کی لعنت نے دراصل پچھلے چند برسوں میں بڑا زور پکڑا ہے ورنہ پہلے ادب صرف ادب ہوا کرتا تھا لیکن اب یار لوگوں نے اسے بھی مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ ادب برائے پروپگنڈہ، ادب برائے شہرت، ادب برائے جدّت، ادب برائے غیبت وغیرہ —" ڈاکٹر سنساری نے فوراً بات اچک لی اور آگے فرمایا —— "علامہ صاحب جو لوگ ادب کو مختلف خانوں میں الگ الگ درجوں میں تقسیم کرتے ہیں وہ اس قدر تنگ نظر ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں ادب دراصل "زچگی خانے" سے شروع ہو کر "مردہ خانے" میں دم توڑ دیتا ہے" —! اپنی بات ختم کر کے ڈاکٹر صاحب نے دیگر شرکائے بحث کو نظر انداز کر کے راست کیمرے کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ کنویز بحث نے ایکبار پھر ہمیں مخاطب کیا —— "اب میں ہمارے نوجوان طنز و مزاح نگار سے ایک بنیادی سوال پوچھتا ہوں طنز و مزاح دراصل ہے کیا —؟" ہم نے جواب دینے سے پہلے اس مکھی کو جو پہلے ہمارے دہن ناہنجار میں لینڈ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اب ہماری ناک کو طیران گاہ سمجھ کر بڑے اطمینان سے چہل قدمی کر رہی تھی ڈاکٹر سنساری کی طرف اڑاتے ہوئے عرض کیا — "طنز و مزاح دراصل ادب کی سب سے مشکل ترین صنف ہے —" ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ڈاکٹر سنساری نے اسی مکھی کو دوبارہ ہماری جانب ہنکا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ یلغار کرتی ہم نے سٹپٹا کر اپنا جملہ مکمل کرنے کی کوشش میں زبانی ٹھوکر کھائی — "طنز و مزاح دراصل ایک مکھی ہے ——" اتنا کہہ کر ہم نے پھیپھڑوں پر پورا زور ڈالا اور پھر پوری قوت کے ساتھ مکھی کی طرف پھونک ماری مکھی نے اس غیر متوقع جوابی حملے سے گھبرا کر علامہ کا رُخ کیا لیکن علامہ بھی شاطر ٹھہرے فوراً اپنے ہاتھ کے مورچھل سے اُسے دلدار سامری کی طرف بھگاتے ہوئے ہمارے نامکمل جملے کی اس طرح تکمیل کی —" نوجوان طنز و مزاح نگار نے بہت صحیح فرمایا طنز و مزاح یقیناً ایک مکھی ہے مگر معمولی مکھی نہیں بلکہ شہد کی مکھی، طنز کو اس کا زہریلا ڈنک سمجھئے اور مزاح کو شہد، چنانچہ طنز کے زہر کو اگر مزاح کے شہد میں لپیٹ کر پیش کیا جائے تو وہ بڑا کارگر ثابت ہوتا ہے —" اُدھر دلدار سامری صاحب نے کچھ دیر تک تو اس مکھی کے ناز نخرے برداشت کیے پھر اُسے ہماری طرف "ری ڈائرکٹ" (RE-DIRECT) کرتے ہوئے ڈاکٹر سنساری سے مخاطب ہوئے — "ڈاکٹر صاحب ساری اُردو دنیا جانتی ہے کہ آپ برِصغیر کے مانے ہوئے ماہر لسانیات ہیں کیوں نہ آپ کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھایا جائے میں نے دیکھا بلکہ سنا ہے کہ 'مزاح' کے تلفظ کے معاملے میں لوگ اکثر فاش غلطیاں کرتے ہیں کوئی اسے 'مُزاح' کہتا ہے تو کچھ لوگ اسے 'مَزاح' کہتے ہیں اور کوئی کوئی 'مُزاح' تک کہہ جاتا ہے، آپ یہ فرمائیے کہ اس میں صحیح تلفظ کون سا ہے —؟"

"تینوں صحیح ہیں —" فاضل ڈاکٹر نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا پھر آگے فرمایا —" ایک غلط العام ہے ایک غلط العوام اور ایک غلط العوام الناس —— البتہ ہر تلفظ کا انحصار مزاح کے مزاج اور معیار پر ہوتا ہے مثلاً جس مزاحیہ تخلیق میں زبان و بیان کی شائستگی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہو وہ "مِزاح" ہے جس میں سنجیدگی اور علمیت کی بھرمار ہو وہ 'مُزاح' ہے اور جس میں پھکڑپن ابتذال اور ہجو کا رنگ بدرجۂ اتم موجود ہو وہ "مُزاح" ہے ——" ڈاکٹر صاحب کی لسانیاتی گل افشانی کے ختم ہوتے ہی دلدار سامری صاحب نے ایک بار پھر ہمیں مخاطب کیا "آپ پچھلے دس پندرہ برسوں سے طنز و مزاح لکھ رہے ہیں کیا آپ ڈاکٹر صاحب کی اس عالمانہ رائے سے اتفاق کرتے ہیں —؟" موصوف کے سوال نے ہمیں بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ کیوں کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ رائے پوری توجہ کے ساتھ نہیں سن سکے تھے اس دوران میں چونکہ مکھیوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا اور ہم پوری

تندہی کے ساتھ ان سے نبرد آزمائی میں مصروف تھے ایسا لگتا تھا جیسے دوردرشن کیندر میں مکھیوں کی افزائش نسل اور ان کی پرورش و پرداخت پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی ہے تاکہ جن ناپسندیدہ پروگراموں کو بادلِ ناخواستہ پیش کرنا پڑتا ہے ان میں افراط تفریظ مچائی جاسکے چنانچہ ارباب دوردرشن کی پالتو مکھیوں کی فوج اس وقت ہماری خیمہ نما شال کو 'پانی پت' کا پاکٹ اڈیشن سمجھ کر اس پر صف آرا ہو چکی تھی ——

دلدار سامری صاحب ہمارے جواب کے منتظر تھے لہذا ہم نے بھی آئیں بائیں شائیں ہانک دیا —— مجھے ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ رائے سے مکھی برابر اختلاف نہیں ہے —" ہم نے اتنا ہی کہا تھا کہ مکھیوں کا ہراول دستہ میدان جنگ سے اڑ کر ہمارے چہرے پر حملہ آور ہو گیا ہم ان سے ڈوئیل لڑنے میں مصروف ہو گئے اور ہماری اس مکھی مار جنگ سے فائدہ اٹھا کر علامہ نے ایک بار پھر مورچہ سنبھال لیا۔ فرمایا "ڈاکٹر صاحب کی اس ٹھوس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا بلکہ خود ڈاکٹر صاحب بھی اگر چاہیں تو اپنی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتے حالانکہ موصوف اس معاملے میں بدنامی کی حد تک مشہور ہیں کہ ایک جگہ اپنی دی ہوئی رائے سے دوسری جگہ کھلم کھلا پھر جاتے ہیں، خیر یہاں میں ڈاکٹر صاحب کی ناقدانہ رائے میں اتنا اضافہ ضرور کرنا چاہوں گا کہ جس طرح موصوف نے مزاح کے تین زمرے بنائے ہیں اسی طرح میری رائے میں طنز کی بھی تین قسمیں ہیں ایک تو ہے طنز، دوسرا طنز اور تیسرا طنز —— جب کوئی بات غالب کے تیر نیم کش کے مانند پوری طرح جگر کے پاس پار نہیں ہوتی تو وہ طنز کہلاتی ہے اور جب کسی طنز نگار کا وار اوچھا پڑتا ہے تب وہ طنز کہلاتا ہے البتہ جب تیر بالکل ہی خطا کر جاتا ہے تب یہ ناکام عمل طنز کہلاتا ہے !"

اس عجیب و غریب تشریح پر دلدار سامری صاحب نے طنزاً کہا —— "آپ حضرات کی عالمانہ و ناقدانہ تشریح سے یہ ثابت ہوا کہ طنز و مزاح اصل میں زیر زبر اور پیش کا گورکھ دھندہ ہے" پھر ہم سے مخاطب ہوئے —— "کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں !" اب پانی بھی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور مکھیاں بھی؛ اس لیے ہم اپنے ہاتھ ہوا میں چلاتے ہوئے جھنجھلا کر بولے —" میں آپ حضرات سے قطعی متفق نہیں ہوں، طنز و مزاح نہ تو زیر، زبر اور پیش کا کھیل ہے نہ مکھی پر مکھی بٹھانے کی شعبدہ گری بلکہ یہ وہ خطرناک صنف ادب ہے جس میں مکھی پر ہاتھی کو بٹھایا جاتا ہے وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ نہ ہاتھی کو کوئی گزند پہونچے نہ مکھی کو۔ !" ہماری اس جارحانہ حرکت کا رد عمل یہ ہوا کہ ہمارے تن ناتواں کے اطراف لپٹے ہوئے "پانی پت" کے میدان میں کھلبلی مچ گئی جس کے نتیجے میں مکھیوں کی فوج طنز موج نے ایسی طوائف الملوکی مچائی کہ اس مرتبہ ان کی زد میں دیگر شرکائے بحث بھی آگئے چنانچہ مکھیوں کی اس ہٹلری یلغار سے بوکھلا کر کنوینر بحث نے شرکائے بحث کا شکریہ ادا کیے بغیر ہی پروگرام کے اختتام کا اعلان کر دیا —— !!

فلور سے باہر نکلتے ہی میک اپ روم انچارج نے فوراً اپنی شال اتروالی، انہیں غالباً خدشہ تھا کہ ہم ان کی شال لے کر چمپت ہو جائیں گے۔ ہم نے ان سے رازدارانہ لہجے میں کہا "لگتا ہے دوردرشن کیندر کی پالتو مکھیوں کو اس شال سے بڑا لگاؤ ہے —!"

وہ بولے —" اب آپ سے کیا پردہ، ہم لوگ بھی ان مکھیوں سے تنگ آگئے ہیں انہی کی وجہ سے اب لوگ ٹی۔ وی سینٹر کو مکھی سینٹر کہنے لگے ہیں، دراصل ان مکھیوں کی نقل و حرکت کو محدود رکھنے کے لیے ہی ہم پروگرام میں حصہ لینے والوں میں سے کسی ایک کو یہ شال اڑھا دیتے ہیں —!

ہم نے شکایتی لہجے میں پوچھا —" اور لوگ بھی اس پروگرام میں شریک تھے، صرف میرا ہی انتخاب کس لیے کیا گیا —؟" وہ بولے —— "آپ کے دوسرے ساتھیوں پر یہ شال کئی بار ڈالی جا چکی ہے، ان کو اس کا 'سکریٹ' معلوم ہے چنانچہ اب یہ شال صرف انہی لوگوں کو اڑھائی جاتی ہے جو پہلی بار ہمارے کیندر تشریف لاتے ہیں —!!"

جس روز یہ پروگرام 'ٹیلی کاسٹ' ہونے والا تھا، بیگم نے سارے محلے کو غریب خانے میں مدعو کر لیا لیکن عین وقت پر ارباب دوردرشن نے ہمارے پروگرام کی جگہ پرندوں کی بولیاں بولنے والے ایک غیر ملکی ٹولی کا پروگرام پیش کر کے بیگم کو کاٹنے اور ہمیں بھونکنے پر مجبور کر دیا۔ اگلی مرتبہ جب اس پروگرام کا نمبر لگنے والا تھا ایک مشہور نیتا اس دار فانی سے کوچ کر گئے جو انتخابات کے وقت اردو کی حمایت میں اور الیکشن جیتنے کے بعد اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، مرتے مرتے بھی اردو دشمنی نبھا کر یہ ثابت کر گئے کہ برق گرتی ہے تو بے چارے اردو والوں پر —— البتہ تیسری مرتبہ چونکہ اتفاق سے کسی لیڈر مہاشے کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کیا تھا نہ جانوروں کی بولیاں بولنے والے کسی غیر ملکی ٹولے نے نزول فرمایا تھا

باقی صفحہ ۳۹ پر دیکھیے

ایس۔ ایم عباس
مقام و پوسٹ آفس، ماڑی کلاں۔ ضلع جونپور، (یو۔پی)

یہ بتا چارہ گر

اور وہ چادر اس نے بھی اوڑھ لی تھی
وہی جو اُس کے آباد اجداد اوڑھتے آئے تھے
شاید اُس کے اسلاف کو اس چادر پر فخر رہا ہو، یوں خود بھی جب وہ تھوڑا با شعور ہوا تو اُسے اپنی اس وراثت پر فخر محسوس ہوا تھا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا، اُس کے دل میں اپنی اس پرانی چادر کے لئے ادب و احترام کا جذبہ بڑھتا چلا گیا، اور اپنی اس چادر کے خلاف وہ کسی سے ایک لفظ سننے کو بھی تیار نہ تھا۔

اس وقت، کون جانتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے موسم اتنا بدل جائے گا کہ اُسے اپنی اس وراثت کے لیے پریشانی و پشیمانی ہو گی اور یہ عزیز ترین امانت اُس کے شانوں پر بار بن جائے گی۔

وہ، یہ بات بچپن سے دیکھتا رہا تھا کہ اس کے باپ دادا خاص طور پر شادی بیاہ، مرنے جینے کے موقعوں پر وہ چادر مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لیتے اور دوسرے لوگوں سے مختلف انداز میں وہ اپنے کام انجام دیتے رہتے۔ ایسے ہی موقعوں پر وہ دیکھتا کہ شہر کے دوسرے لوگ انھیں اور کو دوسرے انداز سے انجام دے رہے ہیں تو وہ اُن کے اور خود کے بارے میں سوچتا رہ جاتا۔ رفتہ رفتہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ اُس کے پڑوسیوں میں مختلف قسم کے لوگ ہیں جو مختلف قسم کی چادریں اوڑھنے سے ہی مختلف ہو گئے ہیں۔

اور تب ہی اس کا معصوم ذہن اکثر سوچتا
وکیوں نہ اس کے پڑوسیوں نے بھی ایک ہی قسم کی چادر اوڑھ لی تھی؟

آخر ایک دن اُس نے اپنے باپ سے کہہ ہی دیا
"بابو جی! اگر سارے شہر کے لوگ سبھی تیوہار مل جُل کر سمان روپ سے منائیں تو کتنا آنند آئے گا"

اوہ! ہاں واقعی ـــ اس کے باپ کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا لیکن جیسے دوسرے ہی لمحے بجھ گیا ہو۔
"بیٹے بہ پہلے ایسا ہی تھا۔ جب آدمی کو وشواس تھا کہ سب ایک ہی ہے۔ آسمان ایک ـــ زمین ایک، سورج ایک، چاند ایک، ہوا ایک، پانی ایک، خوشی ایک، غم ایک اور آدمی بھی ایک ......
اُس نے دیکھا نہ جانے کیوں اس کے باپ کی آنکھیں بھیگ گئیں اور گلا رُندھ گیا تھا

"اُس وقت آدمی کو یہ یقین تھا کہ آتما ایک ہے پرماتما بھی ایک ہے، اور اُسی نے سب کو پیدا کیا ہے، نہ آتما بٹ سکتی ہے۔ نہ پرماتما!"
"اور آدمی، جب سچے دل سے آدمی کے گلے لگ جاتا تھا تو خدا اُس منظر کو دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ اُس وقت اس دھرتی پر، ہر طرف نور تھا۔ حسن تھا۔ خوشیاں تھیں۔ خوشبو تھی۔ سُکھ تھا۔ شانتی تھی"
"یقین کی خوشبو ـــ انسانیت کی خوشبو، پیار کی خوشبو لیے ہم بہت آگے تک بڑھتے رہے ہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ ہم ایک ستون کی طرح اٹل ہیں ہمیں کوئی جھکا نہیں سکتا۔ دبا نہیں سکتا، ہٹا نہیں سکتا"
"اُف کہاں گئے وہ دن!"
اُس کے باپ نے اُفق کے اس پار اس طرح دیکھنے کی کوشش کی جیسے وہ وہی منظر تلاش کر رہا ہو جب ہر طرف نور و نکہت کی بارش ہو رہی تھی اور کائنات مسکرا رہی تھی

اور ایک بار نجانے کس موقع پر اُس نے اپنے دادا سے بھی ایک ایسا ہی سوال پوچھ لیا تھا۔
"دادا جی! کیا سبھی لوگ ایک جیسی چادر نہیں لپیٹ سکتے تھے؟" اس کے دادا دو منٹ تک چپ رہے۔ پھر آہستہ سے بولے تھے
بیٹا! شاید یہ بات ممکن نہیں تھی، در اصل دنیا میں کچھ باتیں آدمی

کے بس میں نہیں، جیسے اس کا اپنا جنم لینا۔ اگر آدمی کے لئے اپنی پسند کے مطابق جنم لینا ممکن ہوتا تو ہر آدمی بڑے گھرانے ہی میں پیدا ہوتا، غریب ماں کی کوکھ ہمیشہ سونی ہی رہتی۔ اس طرح آدمی کے لئے یہ بات بھی ممکن نہیں تھی کہ سب ایک ہی چادر اوڑھ لیتے۔ زیادہ تر تو یہ چادر خاندان سے ملتی ہے۔ خاندان والوں کو جو چادر پسند رہی ہے اُسی کو آدمی نے پیدا ہونے پر خاموشی سے اوڑھ لیا ہے کم ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اس میں اپنی پسند کو دخل دیا ہے"

"پھر بیٹے!" دادا نے اُسے بڑے پیار سے سمجھانا شروع کیا

"چادر سے کیا ہوتا ہے۔ چادر تو بالکل ویسی ہی ہے جیسے جسم کا لباس، ہر آدمی اپنی پسند کے مطابق الگ الگ رنگ۔ طور و انداز کے کپڑے پہننے کے لئے آزاد ہے۔ لیکن اس کپڑے کے نیچے اس کا جسم، اس کی آتما تو ویسی ہی ہے جیسی دوسرے کی۔ کوئی بھی کپڑے کے بنیاد پر نہ چھوٹا ہے نہ بڑا۔ اگر چھوٹا بڑا ہو سکتا تو بس کردار و عمل، اصول و نظریات میں اور ہر چادر آدمی کو یہی جینے کا اندازہ سکھاتی ہے"

"اسی لیے الگ الگ چادریں اوڑھنے میں کوئی بُرائی نہیں، یہ چادریں تو اس گھاٹ کی طرح ہیں جو ایک ندی پر جا بہ جا بنے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی گھاٹ پر نہاتا ہے کوئی کسی پر لیکن ندی تو ایک ہی ہوتی ہے وہ ایک ہی سمت بہتی ہے اور آخر سمندر سے مل جاتی ہے"

اُس کا دادا بالکل گنوار تھا بہت معمولی پڑھا لکھا وہ معمولی کپڑے پہنتا، معمولی جھونپڑی میں رہتا۔ مٹی کا دیا جلاتا لیکن وہ اپنی اس سادہ و بے مصرف زندگی میں بھی بڑا مگن تھا۔

اس کا باپ، اس کے دادا سے زیادہ پڑھا لکھا تھا اس نے اوسط درجہ کا مکان بنایا تھا۔ گھر کی زینت کے لیے آرام دہ چیزیں فراہم کی تھیں اور اپنے کو، اپنے باپ سے اونچا سمجھتا تھا۔

اور وہ اپنے باپ سے بھی کچھ اور اونچا اٹھ گیا ہے اس کے پاس اعلیٰ تعلیم کی سند ہے، وہ حسین کالونی میں رہتا ہے۔ اس کے پاس خوبصورت فلیٹ ہے۔ خوبصورت فلیٹ کو اور بھی خوبصورت بنانے کے لیے جدید طرز کے قیمتی ساز و سامان۔ وہ اپنے، اور اپنے گھر و پیش کو سجانے سنوارنے کی کوشش میں ہمہ وقت خوب سے خوب تر کی جستجو میں منہمک ہے۔

لیکن سب کچھ سج جانے کے بعد، اُسے بہت کچھ بکھرا بکھرا نظر آتا ہے اب وہ ہر لمحہ ڈرا ڈرا۔ سہما سہما رہتا ہے۔

جیسے وہ اس کگار پر کھڑا ہو جو کسی بھی لمحہ ٹوٹ کر گر جائے گا اور اس کا وجود خوفناک موجوں کی نذر ہو جائے گا وہ اکثر دیکھتا ہے کتنی حسین کالونیاں جھلستے۔ خوبصورت فلیٹ اجڑتے معصوم زندگیاں خاک و خون میں لوٹتے۔

کتنی ہی سونی مانگیں۔ اجڑی گودیاں۔ مبہم صورتیں اس کے سامنے ہیں۔

اور یہ سب کچھ بس چادر اوڑھے رہنے کی پاداش میں ہی ہوا ہے۔ ہوتا ہے۔ آگے.... اور آگے؟؟

وہ کانپ جاتا ہے

اس نے اپنی چادر سمیٹ کر بغل میں دبا لی ہے اور ہر سمت بڑی حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ مضمحل۔ افسردہ۔ افسردہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی چادر کسی ایسی جگہ چھپا دے کہ آئندہ نسلوں پر اس کا سایہ نہ پڑ سکے۔

لیکن وہ نہیں سوچ پا رہا ہے کہ وہ کہاں جائے۔ کیا کرے؟ اپنے وہ داغ دھبے کیسے صاف کرے جو چادر اوڑھنے سے اس کے جسم پر پڑ چکے ہیں؟؟ اور اس کی شناخت بن چکے ہیں۔!

وہ دیر سے سر جھکائے کھڑا ہے

خاموش و لاچار ــــ بے یار و مددگار!

ہر طرف دھوپ بڑھ رہی ہے۔ گرم ہوائیں اس کے وجود کو جھلس رہی ہیں اور وہ لڑکھڑا رہا ہے

کاش! کوئی اس کا ہاتھ تھام لے!!

● بقیہ صفحہ ۷۳ دوردرشن کی شال، مکھیوں کا جال ●

اس لیے ارباب دوردرشن ہمارا پروگرام نہ چاہتے ہوئے بھی پیش کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن پروگرام دیکھنے کے بعد بیگم کے سارے منصوبوں پر پانی پھر گیا بلکہ شال پھر گئی۔ کیوں کہ سارے پروگرام میں ہم کم سے کم اور دوردرشن کیندر کی شال زیادہ سے زیادہ دکھائی گئی مع مکھیوں کی فوج کے چنانچہ پروگرام کے اختتام پر بیگم نے واویلا مچاتے ہوئے کہا "اگر تمہیں شال اوڑھنے کا اتنا ہی شوق تھا تو میری کشمیری شال ساتھ لے گئے ہوتے کم سے کم میری شال کی پبلسٹی ہو جاتی!!!

نوٹ: اس مضمون کے کردار، واقعات، مقامات، تمام فرضی ہیں صرف شال اور مکھیاں اصلی ہیں۔

مکتوبات

...ویدی ـــــــــ ۳ ڈالی باغ کالونی، لکھنؤ

...شمارہ ملا گوشۂ حامدی اچھا ہے۔ اگر تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے تو گوشہ جامع و مانع کیسے ہو سکتا ہے۔ حامدی سے میری پرانی شناسائی ہے بڑی خوبیوں کے انسان ہیں اور علم و شعری سنجیدگی کے حامل ہیں۔ ان سے بڑی توقعات ہیں۔

بھائی! اکثر لوگ میرے نام میں "واؤ" گوشت دیکھ دیتے ہیں۔ اس شمارے میں بھی یہی ہوا۔ میں تو سیدھا سادھا "جواد" ہوں۔

گوپی چند نارنگ ـ ڈی۔۲۵۲ سروودیا انکلیو نئی دہلی۔۱۷

پرسوں شاعر کا تازہ شمارہ ملا، گوشۂ حامدی کاشمیری آپ نے خوب نکالا، خوشی ہوئی۔ میری بدتوفیقی کہ آپ کے اصرار کے باوجود توجہ نہ کر سکا۔ اس لیے کہ کسی اور سے حامی بھر چکا تھا اور وہاں کام ابھی نہیں ہوا۔ بہرحال یہ گوشہ بھرپور ہے۔ سبھی مضامین کم و بیش اچھے ہیں۔ خود حامدی کا مضمون گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اتنا اچھا گوشہ نکالنے کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ست پرکاش سنگر ـ ۳۰۹۳ ـ سیکٹر ۲۸ ـ ڈی ـ چنڈی گڑھ

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ حامدی صاحب پر خوب اچھے مضامین دیے گئے ہیں۔ آخر میں آپ کی شاعری کا خوبصورت نمونہ بھی پسند آیا۔ مبارکباد۔

اسرار اکبر آبادی ـــ ۲/۳ منٹولہ ــــ آگرہ ــــ (یوپی)

شاعر نے جو صوری اور معنوی ترقی ان دنوں کی ہے وہ تمہاری ان تھک محنت اور لگن کی غماز ہے۔ "جرعات" نے ہمیشہ تجاہل کا سا کام کیا ہے۔ اور وقت کی ضرورت کے مطابق راہ کا تعین بھی کیا ہے۔ یہی مزاج شمارہ نمبر ۹-۱۰ کے جرعات کا ہے کبھی کبھی شاعر میں ایسے جملے اور مصرعے چھپ جاتے ہیں جن سے اس کو بڑا کچھ مجروح ہوتا ہے۔ اسی شمارے میں "طلاق مل گیا" ـــ "جو شاعر وغیرہ میں ڈال دی" وغیرہ جملے چھپ گئے ہیں۔ اردو میں طلاق مؤنث اور فریم مذکر مستعمل ہیں۔ صفحہ ۲۴ پر حامدی کاشمیری صاحب کا لولاب کے ایک سرسبز قطعۂ زمین پر نماز عصر ادا کرنے کے جواز میں یہ جملہ "جیسے لگا کہ یہاں خدا کا وجود ہے" قابل نظر ہے۔ خاص طور سے لفظ "یہاں"۔ "آندھ رشتہ" میں شام کا وقت ہے اور "عید کا چاند نکلا ہوا ہے" تحریر ہے۔ عید کا چاند جس وقت نظر آتا ہے وہ رات کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے۔ شام کا وقت نہیں ہوتا ہے۔ انل ٹھکر صاحب نے ستارے بھی ٹمٹماتے ہوئے دکھائے ہیں۔ اسی طرح کے اور بھی جملے اور الفاظ مانع ہو جاتے ہیں۔ تمہاری غزلوں میں بطور خاص تیسری غزل نے بہت متاثر کیا ہے۔ اور ہاں دوسری غزل کے اس شعر پر ـ

آسماں پر تو ستارے ہیں خدا سے پہلے
راستے دیں یہ ستارے تو دعا بھی گذرے

میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ ستاروں کے درمیان گیپ اور خلا کافی ہوتا ہے۔ ستارے دعا کو کیسے روک سکتے ہیں؟ یہاں تمہارا تخیل تمہارے جسم کی رنگت کی طرح حدود سے آگے نکل گیا ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ اپنے اس تخیل کو حد میں لاؤ یا پھر یوں ہی چھوڑ دو۔

ظہیر غازی پوری ـ بی۔ ایس۔ آر۔ ٹی کارپوریشن ہزاری باغ (بہار)

شاعر شمارہ ۹-۱۰ موصول ہوا۔ واقعہ ہے کہ آپ نے شاعر کو نئی آب و تاب بخش دی ہے۔ زیر نظر شمارے میں گوشۂ حامدی کاشمیری خاصے کی چیز ہے۔ حامدی کاشمیری نے قابل قدر ادبی خدمات انجام دی ہیں اس کا اعتراف بہرحال ضروری تھا۔

خلش اکبر آبادی ـ لپّی ٹریڈنگ کارپوریشن، پتنگ کی منڈی، آگرہ

اس ماہ کا شاعر نظر نواز ہوا ظاہری و باطنی حسن سے آراستہ ہر ورق نئی آب و تاب سے مزین تعریف و توصیف سے مستثنیٰ خدا اسے بے شمار سانسیں جینے کے لیے عطا فرمائے۔ شعری حصے کے انتخاب معیاری حدود کو چھوتا ہوا میری دانست میں آج کا کوئی بھی اردو رسالہ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اسعد بدایونی کی غزل اول میں سہو کاتب سے ایک شعر میں ایک لفظ "میں" حذف ہو گیا ہے (میں الجھ گیا کسی پھول سے میں لپٹ گیا کسی خار سے) ہونا چاہیے ویسے یہ غزل حکمت ناروائے جلی و خفی کی بری طرح شکار ہے آپ کی تینوں غزلیں خوبصورت ہیں تیسری غزل میں لسانی اور عروضی التزام قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ اس بحر و وزن میں اکثر شعراء دقت کا التزام نہیں رکھ پائے۔ ان تینوں غزلوں میں پہلی غزل کا یہ شعر روح میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے یہ آپ کے لہجہ کی انفرادیت کی علامت بھی ہے۔ غزل کا چوتھا شعر معانی کی بے کراں وسعتیں اپنے اندر لیے ہوئے ہے لیکن کیا اس میں "اک صدی کا نوحہ" کی جگہ "زندگی کا نوحہ" مناسب نہیں ہے؟ ہو سکتا ہے میرا مشورہ ناقابل اعتبار ہو۔ یہ تو میں نے صرف باہمی خلوص کی بنیاد پر اشارہ کر دیا ہے۔

غزل کا یہ شعر تو ہر لحظ گنگنانے کے لائق ہے ؎

ابتدا سے اب تک کے سلسلے بتاتے ہیں
یہ جہاں مکمل ہے آدمی ادھورا ہے

دو مصرعوں میں زمان و مکاں کی تاریخ کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

میر لائق علیخاں شاعر ـ ۲-۱۰-۲۹ ایف، وجے نگر کالونی۔ حیدرآباد

شاعر کے شمارہ نمبر ۱۰/۹ میں جرعات کے تحت۔ "احتجاج و طلب کے اسلوب کو بدلنے" میں آپ نے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ کاش آپ کے قارئین شاعر اسے بار بار پڑھ سکیں اور اپنے احباب کو بھی پڑھوائیں جنھیں اردو شعر و ادب سے شغف ہے اور جو اردو کو اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بطور قیمتی سرمایہ کے چھوڑنا چاہتے۔ آپ کے سمندر فکر میں جو صدف ہیں ان کے ایسے سچے موتی بہت ہوں گے۔ بہرحال! آپ ضرور بہ ضرور انھیں ٹٹولتے رہیے اور ہماری آنکھوں کی جوت بڑھاتے رہیے تاکہ ہم لوگ اپنی زبان کے لیے کوئی عملی کام کر سکیں۔

حسیب سوز ـــ امام باڑہ ـــ اللہ پور (بدایوں) ۲۴۳۶۳۱

شاعر کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے ـــ "گوشۂ حامدی کاشمیری" دیکھ کر دل خوش ہو گیا اگرچہ شاعر اس سے قبل اور بھی گوشے شائع کیے ہیں مگر اس گوشے نے انوکھا حسن پیدا کر دیا ہے۔

غزلیں۔ افسانے وغیرہ سب ہی معیاری ہیں، ہاں عہد... کی پہلی غزل "تیرا احساس کھرچ کر لے جائے" ضرور مشکوک ہے آپ مزید غور فرمالیں۔ ہو سکتا ہے میں ہی غلط ہوں۔

موسیٰ خان ـ ۱۰۸/۳، ماہلی کالونی ہلکر کیا ٹونڈ ملاڈ (ویسٹ)...

شاعر کا تازہ شمارہ اپنے گوشۂ حامدی کاشمیری میں حا... کاشمیری بحیثیت شاعر اور تنقید نگار کے اردو ادب میں خاص نظر آتے ہیں۔ ان پر مقالات مختصراً لکھے گئے ہیں۔ اور کوئی ناقدان پر معروضی تنقید نہیں کر سکا۔ پھر بھی شمس الرحمن فا... نے حامدی صاحب پر مناسب تنقید کی ہے۔

بطور مصرہ مریم، حامدی کاشمیری

ایک بلند، با اخلاق اور عمدہ شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ اور ہوتا اگر گوشۂ حامدی کاشمیری میں ان کے افسانوں پر بھی بحث کی جاتی۔ خیر! گوشۂ حامدی کاشمیری کے بعد اب یہ امید بندھی ہے کہ آپ آئندہ بھی کسی شاعر یا ادیب پر ایسا ہی کوئی گوشہ مرتب کریں گے۔ اس بار معمول سے زیادہ کہانیاں شائع ہوئی ہیں یہ ایک اچھی مثال ہے۔

کہانیوں میں رتن سنگھ، آمنہ ابوالحسن، اور شفق نے کافی... کیا۔ مگر پتہ نہیں انور خان جیسے تخلیق کار نے "تجالے" کہانی میں کیا کہنا چاہا ہے۔ آپ کی تینوں غزلیں عمدہ ہیں۔ آپ کی شاعری بہت خوبصورت اور نازک آبگینے جیسی ہے اور اپنے عصر کا... بیان کرتی ہے۔ بعض شعر تو بہت ہی خوبصورت ہیں!

ع کس نے کس کو چاہا ہے، کون کس کا ہوتا ہے
لفظ لفظ باتیں ہیں، حرف حرف دھوکا ہے

ع ایک مدت ہوئی خود کو نہیں سوچا میں نے
کوئی لمحہ تیری یادوں کے سوا بھی گذرے

ع ہم ایسے تنہا لوگوں کا، اب رونا کیا سکانا کیا
جب چاہنے والا کوئی نہیں، پھر جینا کیا مرجانا کیا

آپ نے ہم لوگوں کی تشنگی کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا... منظومات بھی معیاری ہیں۔ خاص طور پر فضا ابن فیضی، ظہیر غازی پوری، عبداللہ کمال، محبوب راہی، عبید صدیقی، اطہر فاروقی اور حیات... پرویز اختر۔ نزد امام باڑہ، مصدق امنی سرائے چاند پور (...

شاعر کا شمارہ ۹-۱۰ نظر نواز ہوا۔ گوشۂ حامدی کاشمیری خوب... نہیں بہت خوب ہے "ڈری ڈری ہوا" "تذکرگنندہ" عمدہ افسانے ہیں حالانکہ میں علامتی افسانوں سے زیادہ صاف اور سہل افسانے پسند کرتا... مگر اچھے فن پارے کو اچھا کہنا بھی جرم سمجھتا ہوں۔ انل ٹھکر... "اندھے رشتے" اپنا جواب نہیں رکھتا۔ واقعی اس عہد کو ایسی تحریروں... کی ضرورت ہے۔

شعری حصہ اچھا لگا۔ "احتجاج و طلب کے اسلوب بدلنے..." راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

onthly) ombay
Years of Publication ISSUE No.— 12 — 1986 Telephon No.
(Publishing Date 27-28)
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/5